ترتیب و تدوین ـــــ ڈاکٹر شوذب کاظمی
ضمیرِ حیات

علامہ ضمیر اختر نقوی کی حیات اور دینی، علمی، ادبی، تہذیبی خدمات

ترتیب و تدوین

ڈاکٹر شوذب کاظمی

(پروفیسر شعبۂ اردو) یونیورسٹی آف ایجوکیشن، ملتان

استاد شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن، ملتان

جملہ حقوق بحقِ ناشر محفوظ ہیں

نام کتاب : ضمیر حیات

ترتیب وتدوین : ڈاکٹر شوذب کاظمی

اشاعت : اوّل (۲۰۰۹ء / ۱۴۳۰ھ)

تعداد : ایک ہزار

کمپوزنگ : ریحان احمد 0300-2787252

قیمت : ایک ہزار روپے

ناشر : مرکزِ علوم اسلامیہ
I-4 نعمان ٹیرس، فیز-III، گلشنِ اقبال، بلاک-11
کراچی۔ فون: 021-4612868
0300-2778856

کتاب ملنے کا پتہ

مرکزِ علومِ اسلامیہ

I-4 نعمان ٹیرس، فیز-III، گلشنِ اقبال، بلاک-11

کراچی۔ فون:021-4612868
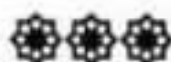
ڈھونڈا بہت ضمیر کو غوّاصِ فکر نے
اب تک تو اُس کے ہاتھ یہ گوہر نہیں لگا

ڈاکٹر خیالؔ امروہوی

اگر حیات کی معراج ہے تجھے مطلوب
ضمیرِ روشن و دلِ نکتہ داں پیدا کر

شاکر صدیقی

لباس سادہ تھا اور حلیہ فقیر کا تھا
مگر وہ انسان بڑے ہی اُجلے ضمیر کا تھا

شوکت ہاشمی

یہاں ہیں جسم بہت سے، ضمیر کوئی نہیں
یہ وہ قفس ہیں کہ جن میں اسیر کوئی نہیں

سعود عثمانی

ڈاکٹر شوذب کاظمی

۱۔ پروفیسر یونیورسٹی آف ایجوکیشن لاہور
۲۔ اُستاد شعبۂ اُردو گورنمنٹ کالج آف ایجوکیشن ملتان
۳۔ سابق اُستاد شعبۂ اُردو بلوچستان یونیورسٹی کوئٹہ
۴۔ معتمد اُردو اکادمی پاکستان ملتان
۵۔ ماہر اُمورِ ادبیاتِ عالم۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی اسلام آباد

maablib.org

ترتیب

حرفِ اوّل ------------------------- ۲۹

ڈاکٹر شوزب کاظمی

مقدمہ ------------------------- ۷۱

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

(۱) شخصیت

خوابوں کی تعبیر ------------------------- ۹۳

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

محبت کا خراج ------------------------- ۹۵

ڈاکٹر عالیہ امام

علامہ ضمیر اختر نقوی حیات و خدمات -------- ۹۶

آلِ محمد رزمی

علامہ ضمیر اختر نقوی برصغیر کے ممتاز دانشوروں کی نظر میں ۱۲۹

قائم رضا نقوی

ہشت پہلو شخصیت ------------------- ۱۳۵

عابد رضا رضوی

سچ بولنا اُن کا مذہب ہے ------------------- ۱۳۲

نسیم حسن امروہوی

انسانیت کا اجالا ---------------------- ۱۵۱
جاوید عباس جعفری
ایک عہد ساز شخصیت ------------------ ۱۶۰
ندیم شبلی ایڈووکیٹ
شخصیت کے کچھ پہلو ------------------ ۱۶۹
اسد عباس نقوی

تحقیق و تنقید

(۲) اردو مرثیہ پاکستان میں

ضمیر اختر نقوی کے تحقیقی کارنامے ---------- ۱۸۰
ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری
اردو شاعری کا روشن اور تابناک باب -------- ۱۸۵
جگن ناتھ آزاد
اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ -------- ۱۸۷
علی سردار جعفری
قابل قدر اور بیش قیمت دستاویز -------------- ۱۹۰
ڈاکٹر تنویر مسعود
ادبی کمال کا ثبوت ------------------------ ۱۹۳
سید ہاشم رضا

ادبی، علمی اور تحقیق کے جوہر ---------------- ۱۹۶
سلیم احمد
موضوع کی ضرورت اور اہمیت کا اعتراف ---- ۱۹۳
پروفیسر کرار حسین
یہ کام کچھ آسان نہ تھا ---------------------- ۱۹۹
پروفیسر ممتاز حسین
وسیع مطالعہ اور تحقیقی لگن -------------------- ۲۰۲
ڈاکٹر محمد علی صدیقی
ضمیر اختر کی سعیٔ پیہم ---------------------- ۲۰۳
پدم شری علی جواد زیدی
ایک منفرد کتاب ------------------------ ۲۰۶
پروفیسر مرزا علی اظہر برلاس
اردو مرثیے کا وقار ------------------------ ۲۰۹
ڈاکٹر منظر حسین کاظمی
پانچواں کارنامہ ------------------------ ۲۱۱
ڈاکٹر سبط حسن فاضل زیدی
ہمہ گیر اور بصیرت افروز کتاب -------------- ۲۱۳
جامی ردولوی
قابلِ صد آفرین ------------------------ ۲۱۶
سید علی مہدی

اردو مرثیے کا تاریخی سفر ---------------- ۲۱۸
پروفیسر محمد رضا کاظمی
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں ---------- ۲۲۱
پروفیسر سحر انصاری
علمی وادبی خدمات ---------------- ۲۲۵
پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد
ایک درخشاں ادبی علامت ------------ ۲۲۷
پروفیسر نعیم تقوی
ضمیر اختر کی اہم علمی وادبی کاوش ---------- ۲۲۹
ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی
تحریر و تقریر ---------------- ۲۳۲
ماجد حسنین رضوی
محبوب موضوع ---------------- ۲۳۵
ڈاکٹر جمیل جالبی
نعرۂ مستانہ ---------------- ۲۳۶
ڈاکٹر انور سدید
استفادہ ---------------- ۲۳۷
مشفق خواجہ
معتبر محقق ---------------- ۲۳۸
ڈاکٹر ہلال نقوی

ضمیر اختر، وسیع النظر دانشور ---------------- ۲۳۰
مہدی نظمی
ضمیر اختر نقوی کی شرافت نفسی اور اعلیٰ ظرفی ----- ۲۴۳
سید عاشور کاظمی
جامع اور تفصیلی کتاب -------------------- ۲۵۰
محسن اختر نقوی (ہالینڈ)
ضمیر اختر کی ریاضت ---------------------- ۲۵۱
ڈاکٹر تقام حسین جعفری
تحقیق و تنقید کا حسین امتزاج -------------- ۲۵۳
ڈاکٹر ظفر اقبال
اردو مرثیہ پاکستان میں ------------------ ۲۵۵
ورنن جیمز شوبل (امریکہ)

(۳) شعرائے اردو اور عشق علیؑ

یادگار صحیفہ -------------------------- ۲۵۸
ڈاکٹر کاظم علی خاں
شگفتہ طرز تحریر اور وسیع مطالعہ ------------ ۲۶۱
سید ہاشم رضا
اردو ادب کے علمی ذخیرے میں قابل قدر اضافہ ----- ۲۶۵
ڈاکٹر جمیل احمد رضوی

سخنِ حق ------------------------------ ۲۷۰
پروفیسر ڈاکٹر اسد اریب
بڑی کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی -------------- ۲۷۳
پروفیسر سید محمد نصیر
اردو منقبتی شاعری کا گلزارِ ارم -------------- ۲۸۴
پروفیسر طہیر نقسی
عشقِ علی کا چراغ -------------------- ۲۹۳
پروفیسر سردار نقوی
دریائے عشق کے دو کنارے -------------- ۲۹۸
پروفیسر وحید الحسن ہاشمی
یہ کتاب ہر لائبریری اور ہر گھر میں ہونی چاہیئے --- ۳۰۱
پروفیسر محمود الحسن رضوی
کسی کسی کو خدا یہ کمال دیتا ہے ------------ ۳۱۲
پروفیسر رشید حیدر رضوی
اردو منقبت نگاری پر پہلی کتاب --------- ۳۳۱
صوفی سید ابن حسن رضوی
دنیائے ادب میں ایک اور تحقیقی کتاب کا اضافہ -- ۳۳۹
تیر اسعدی
فکری خواب کی تعبیر ------------------ ۳۴۲
آل محمد رزمی

عشقِ علی پہ یہ کتاب اردو ادب کا ہے گلاب ------ ۳۵۸
علامہ ذوالفقار حیدر نقوی
شعرائے اردو کا وقار اور فضل و کمال ------------ ۳۶۷
سید ماجد حسین رضوی
شان دار کام کی داد، دی ہی نہیں جاسکتی -------- ۳۷۰
ساحر لکھنوی
ادبی کمال کا اعتراف ------------------- ۳۷۶
پروفیسر محمد رضا کاظمی
دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر -------- ۳۸۳
ڈاکٹر ماجد رضا عابدی
مدحتِ علی کا ذرجِ بے بہا --------------- ۴۰۳
علامہ ناصر مہدی رضوی
بین الکائناتی محفلِ منقبت ---------------- ۴۰۷
محمد علی سید
شاہکار کتاب -------------------- ۴۱۰
آلِ محمد رزمی
ایک گراں قدر اور اہم تصنیف -------------- ۴۲۳
اقبال کاظمی
محققانہ کاوشوں کا نتیجہ خیز ثمر ------------- ۴۳۹
سید محمود خاور

ایک عظیم دستاویز -------------------- ۴۴۳
سلیم فاروقی

غیر فانی شاہکار -------------------- ۴۴۷
سید ناصر رضا رضوی

روشن کل کی امید -------------------- ۴۵۰
وارث رضا

چند باتیں -------------------- ۴۵۷
سید نسیم حیدر زیدی جون پوری

تحقیقی کاوشوں کا جید مجموعہ -------------------- ۴۶۱
سید مراد علی جعفری

اہل علم وادب کے لئے مینارۂ نور -------------------- ۴۶۷
حیدر علی اختر

خوب سے خوب تر کی آئینہ دار کتاب -------------------- ۴۶۸
شاہد جعفر

مقالوں کے سرمائے میں منفرد اور قابلِ قدر کارنامہ -- ۴۶۹
پرویز بلگرامی

ایک صحافی کا تبصرہ -------------------- ۴۷۱
سید سجاد شبیر رضوی

موضوع کے اعتبار سے پہلی کتاب -------------------- ۴۷۵
سیّد حسن رضا زیدی

تحریر و تقریر کا کوثر ---------------------- ۴۷۷

سید کمال حیدر رضوی

(۴) ❁ خاندان میر انیسؔ کے نامور شعرا

اُردو مرثیے کی تاریخ کا ایک ضروری باب ----- ۴۸۰

ڈاکٹر نیر مسعود

قیمتی تحقیقی کام ---------------------- ۴۸۴

انتظار حسین

ذہنی بالیدگی اور روحانی مسرت ------------ ۴۸۵

ڈاکٹر سید جمیل احمد رضوی

غیر معمولی تلاش و تحقیق ----------------- ۴۹۲

سید معراج جامی

مرثیہ اردو ادب کی آبرو ہے --------------- ۴۹۴

پروفیسر محمود الحسن رضوی

علامہ ضمیر اختر نقوی کی ادبی مہم جوئی -------- ۴۹۸

نقاش کاظمی

ذوق و شوق بلکہ عشق و محبت --------------- ۵۰۴

شفیع عقیل

سنجیدہ اور باشعور مصنف ------------------ ۵۰۷

علی حیدر ملک

خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعرا پر تبصرہ ------- ۵۱۰
آل محمد رزمی

ہمہ جہت شخصیت ---------------------- ۵۲۲
سیّد قیصر حسین مشہدی

میر انیسؔ پر ضمیر اختر نقوی کی کتاب کی رونمائی -- ۵۲۸
حسن عابدی

(۵) ❁ اردو غزل اور کربلا

موضوع انوکھا اور اندازِ بیاں دلچسپ ہے ----- ۵۳۲
رئیسؔ امروہوی

تحقیق کی نئی راہوں کی نشان دہی ----------- ۵۳۳
پدم شری پروفیسر علی جواد زیدی

روایتی موضوع میں تازگی کا احساس -------- ۵۳۵
پروفیسر حسن عسکری کاظمی

ضمیر اختر نقوی کو اشعار کی پرکھ میں قدرت حاصل ہے ۵۳۹
کلیم رحمانی

غزل میں واقعاتِ کربلا کی علامتیں --------- ۵۴۴
نیلما سرور

یہ ایک اچھی کاوش ہے ---------------- ۵۴۹
ثناء الحق صدیقی

ضمیر کا تخلیقی سفر ---------------------------- ۵۵۱
آلِ محمد رزمی

(۶) ❁ میر انیسؔ کی شاعری میں رنگوں کا استعمال

رنگوں کی زبان ---------------------------- ۵۵۶
انتظار حسین

انیسیات میں منفرد کتاب ---------------------- ۵۵۹
ڈاکٹر شارب ردولوی

ایک منفرد اور عالمانہ کاوش ------------------ ۵۶۱
سحرؔ انصاری

اپنے موضوع پر بالکل نئی کتاب -------------- ۵۶۲
شفیع عقیل

نئے رنگوں کی تلاش ------------------------ ۵۶۳
پروفیسر ڈاکٹر شیخ انصار حسین

نئے نئے رُخ ------------------------------ ۵۶۵
ادیب سہیل

فکرِ انیسؔ کی ترجمانی رنگوں کی زبانی ------------ ۵۶۷
افضال حسین نقوی (فضل فتح پوری)

اردو ادب میں رنگوں کے حوالے سے پہلی کتاب - ۵۸۲
کوثر الٰہ آبادی

علامہ ضمیر اختر نقوی اور انیس شناسی ---------- ۵۸۳

آل محمد رزی

رنگوں کے حوالے سے ایک گراں قدر تحقیق -------- ۵۸۹

محمد عباس نقوی

تالیف و تدوین

(۷) جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے

اردو ادب کی گراں بہا خدمت ------------- ۵۹۶

سید ہاشم رضا

ادبی جہاد ------------------------------ ۶۰۰

پروفیسر سردار نقوی

جوش کی انفرادیت اور ضمیر اختر نقوی کی دیدہ ریزی ۶۰۸

ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی

جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے کا انگریزی ترجمہ ---- ۶۱۳

سبیح الحسن

ضمیر اختر نقوی کی کتاب ایم اے نصاب میں --- ۶۱۴

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

حسن ترتیب (جوش ملیح آبادی کے مرثیے) ---------- ۶۱۶

ڈاکٹر نیر مسعود

جوش کو مرثیہ نگار ثابت کرنے میں
ضمیر اختر صاحب کا بڑا ہاتھ ہے ---------- ۶۱۸
پروفیسر ڈاکٹر منظر حسین کاظمی

جوش ملیح آبادی کے مرثیے -------------- ۶۲۸
ڈاکٹر سبط حسن رضوی

جوش ملیح آبادی کے مرثیے -------------- ۶۲۸
مولانا مرتضیٰ حسین فاضل

جوش ملیح آبادی کے مرثیے -------------- ۶۲۹
پروفیسر محمد رضا کاظمی

جوش ملیح آبادی کے مرثیے --------------
روزنامہ جنگ کا تبصرہ

جوش ملیح آبادی اور ضمیر اختر نقوی ---------- ۶۳۰
ڈاکٹر شکیل رضا کاظمی

(۸) تقریب ''اعتراف و تحسین''

بین الاقوامی دولت مشترکہ ایوارڈ (لندن) ------ ۶۳۳
مولانا سید محمد رضا شبر

تقریب اعتراف و تحسین -------------- ۶۳۶
ڈاکٹر شوذب کاظمی

تقریب اعتراف و تحسین (بر مکان ناصر رضا رضوی) --- ۶۴۱

چند تاثرات ---------------------- ۶۴۷

پروفیسر سحر انصاری

نذرِ ضمیر اختر (مسدس اعتراف و تحسین) ------------ ۶۵۴

قسیم ابن قسیم امروہوی

اعتراف و تحسین پر تبصرہ ---------------- ۶۷۷

شفیع عقیل

کراچی کا ادبی منظر نامہ ---------------- ۶۷۸

علی حیدر ملک

(۹) خطابت

خلوص پیکر......عزیزم علامہ ضمیر اختر صاحب کے لئے --- ۶۸۲

مولانا مرزا محمد اشفاق شوق لکھنوی

خطیب الکوثر......علامہ ضمیر اختر ---------------- ۶۸۳

صادق امام زیدی ([illegible])

علامہ ضمیر اختر کی شخصیت کا احاطہ ---------------- ۶۸۴

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

لکھنؤ (۱۹۷۶ء) میں ضمیر اختر نقوی کی بے مثال خطابت ۶۸۵
سید مسعود حسین زیدی

کلام میر انیس علامہ ضمیر اختر نقوی کی خطابت کے آئینے میں ۶۹۵
ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

عزاداریٔ امام حسینؑ اور اقوام عالم ---------- ۷۱۸
محبت شجاع رانا

آسمان خطابت کے عظیم اختر ---------------- ۷۲۵
سید ممتاز حسین زیدی

فلک پہ پھیلے اندھیروں میں روشنی کا سفیر -------- ۷۳۱
ریحان احمد

خطابت کا روشن آفتاب ---------------- ۷۳۷
رائے کاظم حسین کھرل

علامہ ضمیر اختر نقوی کی تحریر و تقریر ---------- ۷۴۳
عمران رضا نقوی

علامہ ضمیر اختر نقوی کی ذات بابرکت اور انسانیت پروری ۷۴۵
طارق وحید

علامہ ضمیر اختر نقوی کی مجالس کے
آڈیو اور ویڈیو کیسٹ ---------------- ۷۴۸

(۱۰) ● صحافت

سہ ماہی القلم پر تبصرے

القلم ایک ادبی جریدہ ---------------- ۷۷۶
سید سجاد شبیر رضوی
ایک صحافی کا تبصرہ ---------------- ۷۸۴
سید سجاد شبیر رضوی
القلم سہ ماہی اور اعتراف و تحسین ---------- ۷۸۶
مکرم لکھنوی
نقد و نظر (جنگ کا القلم پر تبصرہ) ---------- ۷۹۸
شفیع عقیل
تہذیبی ورثہ کی حفاظت و فروغ ---------- ۸۰۰
پروفیسر ڈاکٹر سید جعفر رضا
ہمہ جہت رسالہ ---------------- ۸۰۲
ڈاکٹر سیادت نقوی
جریدہ القلم پر تاثرات ---------------- ۸۰۵
سید ظہور مہدی

القلم شمارہ نمبر۔۱ پر تبصرے ---------------- ۸۰۹

القلم شمارہ نمبر۔۲ پر تبصرے ---------------- ۸۱۸

القلم شمارہ نمبر۔۳ پر تبصرے ---------------- ۸۲۳

القلم شمارہ نمبر۔۴ پر تبصرے ---------------- ۸۳۱

القلم شمارہ نمبر۔۵ پر تبصرے ---------------- ۸۴۰

القلم شمارہ نمبر۔۶ پر تبصرے ---------------- ۸۵۳

القلم شمارہ نمبر۔۷ پر تبصرے ---------------- ۸۵۷

(۱۲) منظوم خراجِ تحسین

ضمیر اختر نقوی خود اپنی نظر میں ------------ ۸۶۲

مرثیے سے اقتباس

لکھنؤ میں ضمیر اختر کا استقبال ------------ ۸۶۵

ساغر لکھنوی

عزم و استقلال کے کوہ گراں ------------ ۸۶۷

تاثیر لکھنوی

مثالِ چشمۂ زم زم ------------------ ۸۶۹
نجمؔ فتح پوری

قطعہ تاریخ تصنیف (اردو مرثیہ پاکستان میں) ----- ۸۷۰
شاہد نقوی

فکر کا کارواں ________________ ۸۷۲
رہبر ہاشمی

جدید طرزِ خطابت ------------------ ۸۷۳
اقبال ظفر

تاجِ پیشانی ادب کا نگیں -------------- ۸۷۵
شاہد نقوی

روشن ضمیر ------------------------ ۸۷۶
ذیشان حیدر ذیشانؔ

حرفِ معتبر ------------------------ ۸۷۷
دُر حسن جلالوی

تاجدارِ سلطنتِ خطابت -------------- ۸۷۸
پروفیسر عقل صادق

خطابت کا پاسبان ------------------ ۸۸۰
علی اظہر رضوی

نذرِ علامہ ضمیر اختر ------------------ ۸۸۳
پروفیسر ظہیر نفسی

قطعاتِ ہدیۂ عقیدت ---------------- ۸۸۳
پروفیسر ڈاکٹر ظفر ہاشمی
شیریں بیاں ---------------- ۸۸۵
محسن فتح پوری
پیکرِ ذہانت ---------------- ۸۸۶
علی اظہر رضوی
درِ توصیف ---------------- ۸۹۰
سید محمد عباس صادق جعفری
احسانِ ضمیر بر نسلِ جدید ---------------- ۸۹۳
سید محمد عباس صادق جعفری
شانِ خطابت ---------------- ۸۹۷
سید ظہور مہدی
لفظ و معنی کا سمندر ---------------- ۸۹۹
ڈاکٹر ماجد رضا عابدی
قرطاس و قلم ---------------- ۹۰۱
محشر لکھنوی
نوائے ضمیر ---------------- ۹۰۲
علامہ شبیہ الحسن رضوی
نصابِ عشقِ علی ---------------- ۹۰۳
ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

ضمیر اختر نقوی کی خدمت میں ---------- ۹۰۳
سیّد آصف رضا رضوی

لوحِ محفوظ مودّت ---------------- ۹۹۶
مولانا کمال حیدر رضوی

منفرد اور بے مثال ---------------- ۹۰۸
قمر عباس قمر عظیم آبادی

(قطعات)

تاریخِ مرثیہ ہے ---------------- ۹۰۹
نسیم امروہوی

تذکرۂ شاہِ ولایت ---------------- ۹۰۹
نسیمؔ امروہوی

تاریخِ مرثیہ ---------------- ۹۱۰
سیف حسن پوری

عزائے زہراؑ ---------------- ۹۱۰
پروفیسر ظلِ صادق

جنت کے خریدار ---------------- ۹۱۱
ذکی عابدی

معجزے کی زباں ---------------- ۹۱۱
اقبال حسین اقبالؔ

تحقیق کے جھرنے ---------------------- ۹۱۱
سید حسن کاظمی

کون ہے بہتر ---------------------- ۹۱۲
حسن لکھنوی

قطعہ ---------------------- ۹۱۲
نیر مجیدی

قطعات ---------------------- ۹۱۲، ۹۱۳
۱۔ صدقے وقار ہے ۲۔ کلام میں اثر
مظہر پنجتنی

اے اہلِ نظر! ---------------------- ۹۱۳
شاہد نقوی

قطعہ در صنعتِ مقلوب ---------------------- ۹۱۴
سید اشتیاق حسین ساغر لکھنوی

تاریخ کا دفتر ---------------------- ۹۱۴
محسن نقوی امروہوی

در صنعتِ توشیح ---------------------- ۹۱۵
سید اشتیاق حسین ساغر لکھنوی

ضمیرِ علم ---------------------- ۹۱۷
محسن رضا

ضمیرِ فکر ---------------------- ۹۱۹
ڈاکٹر ریحان اعظمی

شہنشاہِ ادب ---------------------- ۹۲۲
نشاط واسطی

(۱۳) ❁ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت (حالات وکرامات)

یومِ شاہِ ولایت اور ضمیر اختر نقوی کی کتاب -- ۹۲۶
سید کمال نفیس

تحقیق اور تعصب ---------------------- ۹۲۸
عباس نقوی

(۱۴) ❁ تاریخِ مرثیہ نگاری

نوادراتِ مرثیہ نگاری (جلد اول و دوم پر تبصرہ) ----- ۹۳۰
ڈاکٹر تقی عابدی کاظمی

یہ کتاب منفرد ہی نہیں سنگِ میل ہے ------- ۹۵۹
ڈاکٹر شارب ردولوی

آپ تاریخِ مرثیہ لکھنے کا حق رکھتے ہیں ----- ۹۶۱
ڈاکٹر نیر مسعود

حافظہ، تلاش اور رسائی کا اعتراف ------- ۹۶۳
شمس الرحمٰن فاروقی

رہ نوردِ شوق ---------------------------- ۹۶۵
سید قمر حیدر قمر

(۱۵) ❁ انیس و دبیر

اُنسِ انیس ---------------------------- ۹۷۳
ڈاکٹر فرمان فتح پوری

رباعیاتِ انیس کی تدوین اور ضمیر اختر نقوی کا تحقیقی کام ۹۷۳
پدم شری علی جواد زیدی

انیس نما ---------------------------- ۹۸۷
پروفیسر عبدالقوی دسنوی (بھوپال)

"کلامِ ضمیر" کا اجمالی جائزہ ---------------- ۹۹۰
حسین مجتبیٰ (ضیاء ندیم)

"ماہِ نو" کا انیس نمبر ۱۹۷۲ء ---------------- ۹۹۸
ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

"ماہِ نو" کا دبیر نمبر ۱۹۷۵ء ---------------- ۱۰۱۳
ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کے خطوط سے اقتباسات ۱۰۱۷
ندیم شبلی ایڈووکیٹ

قابلِ قدر کام (ہر صدی کا شاعرِ اعظم میر انیس) ------- ۱۰۳۰
شفیع عقیل

The Study of Elegies of Mir Anis -- ۱۰۳۳
رضوانہ نقوی

اُردو کا عالمی تصور ---------------------- ۱۰۳۸
ڈاکٹر ضیاء الحسن

کتاب کلامِ ضمیر پر تبصرہ ---------------------- ۱۰۴۰
شفیع عقیل

کتاب احساس پر تبصرہ ---------------------- ۱۰۴۲
شفیع عقیل

شہید علمائے حق ---------------------- ۱۰۴۳
سید کمال حیدر رضوی

کتاب حضرت جعفر طیار پر تبصرہ ---------- ۱۰۴۵
وحید الحسن ہاشمی

کتاب حضرت اُمّ البنین پر تبصرہ ---------- ۱۰۴۷
وحید الحسن ہاشمی

مجالس ترابی ---------------------- ۱۰۵۰
تبسم نواز احمد

(۱۶) مشاہیر کے خطوط علاّمہ ضمیر اختر کے نام ۱۰۵۱

(۱۷) اشاریہ مضامین علاّمہ ضمیر اختر نقوی ۱۱۶۸

(۱۸) علمی و ادبی کتابوں میں ذکرِ علامہ ضمیر اختر نقوی ۱۱۸۰

ڈاکٹر شوذب کاظمی

حرفِ اول

''ضمیر حیات'' علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی مدظلہ پر دنیا بھر میں پچھلے پینتیس برسوں کے دوران نمایاں ہونے والے اظہارات کی یکجائی کا دستاویزی مواد بھی ہے اور اس وسیع ترمشن کا اہم سنگِ میل بھی جو مرکز علوم اسلامیہ کی نوخیز قیادت کی منزل روشن بن کر سامنے آیا ہے۔

آج کے عہد میں تدوین و ترتیب کے کاموں کی ضرورت واہمیت کو تمام شعبہ ہائے حیات کا حصہ گردانا گیا ہے اور عالمی سطح پر یہ احساس اجاگر ہوا ہے کہ بابِ آگہی کھولنے کے لئے ایسی نابغہ شخصیات پر دستیاب حوالہ جاتی مقالات و مواد کی شیرازہ بندی کر لی جائے جن کے افکار و اعیان نے قلوب و اذہان پر انقلاب آفریں ارتعاشات چھوڑے ہیں اور جنہیں اپنی ذات میں ادارے کا درجہ حاصل ہے۔ اس سے پہلے تدوین کے عمل کو نسبتاً ضمنی اور ثانوی حیثیت دی جاتی تھی اور موضوع پر روشنی ڈالنے والے اہم دستاویزی شواہد نظر انداز کر دیئے جاتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تحقیق کی راہیں مسدود ہو کر رہ گئیں۔ موجودہ صدی ہر شعبے میں سائنسی شعور کا تقاضا کرتی ہے اور اس تقاضے کی بجا آوری کے لیے تحقیقی و تنقیدی مواد کی ترتیب و تدوین کا خیر مقدم بھی لیکن یہ دشوار گزار عمل جن مسائل و مطالبات سے نبرد آزما ہونے کے بعد تکمیل کی منزل کو پہنچتا ہے

اُن کا سامنا کرنا فردِ واحد کے بس کی بات نہیں لہٰذا ''ضمیر حیات'' کی تکمیل کا سزاوار تحسین بھی میں خود کو نہیں بلکہ مرکز کے مختلف شاخوں سے وابستہ و متحرک اُن نوجوانوں کو سمجھتا ہوں جنہیں ڈاکٹر ماجد رضا عابدی، کمال حیدر رضوی، قائم رضا نقوی...... جیسی دلوں انگیز قیادت کے ذریعے حوصلہ میسر آیا اور انہوں نے آدابِ تحقیق کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے برسوں پر پھیلے اس دفینے کو کھوج نکالا۔ یہ الگ بات ہے کہ اِن نوجوانوں کی اصل رہنمائی کا سورج خود علامہ صاحب کی سینکڑوں تصنیفات و تالیفات سے طلوع ہوا جو اہلِ مرکز ہی کے لئے نہیں بلکہ اہلِ عالم کے لئے معیار کا درجہ رکھتی ہیں۔

جوشؔ ملیح آبادی کی عطا کردہ ترکیب ''ضمیرِ حیات'' کا مکمل پس منظر آپ کو اس کتاب کے مقدمے سے ہاتھ آئے گا، یہاں بس اتنا سمجھ لیجئے کہ جوشؔ کو اس تخلیقی تجربے پر اکسانے والی یہ روح پرور ترکیب پہلے پہل خود علامہ صاحب کے نجی بیں ترتیب پائی تھی کہ وہ اسم بامسمّیٰ شخصیت ہیں علامہ صاحب کا اسم تابندہ ''ضمیر'' اپنی معنویت میں وہ فکر انگیز تخلیق ہے کہ آدمی اس میں جتنا غور کرے ششدر و دنگ ہوتا جاتا ہے، چار حرفوں کے اس حیرت کدے میں قوسِ قزح کے رنگ، آسمانوں کی وسعت، سمندروں کی گہرائی و گیرائی جیسی صفات کی یکجائی دیکھنے میں آتی ہے، غرض جس جوہر کے دم سے حیات حیات کہلاتی ہے وہ ''ضمیر'' ہی ہے۔ تفہیم لفظی کے لحاظ سے ''ضمیر'' ہی احساسِ شعورِ باطنی اور نفسِ لوامہ کے نفسِ مطمئنہ کی جانب معراج کی منزل تاباں ہے۔ ''ضمیر'' کی ''حیات'' ہی زیب و گماں، الغزش و کج روی سے بچ نکلنے اور صبر و استقامت سے ہمکنار ہونے کا باعث ہے اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ''ضمیر'' شادابی و کامرانیِ حیات کی اصل روح ہے علامہ ضمیر اختر کے خانوادے کی علمی، دینی، روحانی اور ادبی خدمات کو ماہ و سال کے آئینے میں دریافت کرنے کی سعی کی

جائے تو بے ساختہ ہونٹوں پر یہ مشہور مصرع آجاتا ہے کہ

یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں

بلکہ خود علامہ صاحب کی ذاتِ بابرکت کے ذریعے تصنیف و تالیف، تحقیق و تدوین، ادب و شعر صحافت و خطابت اور تبلیغ عقیدہ کے شعبوں کو جو گوہرِ نایاب میسر آئے ہیں اس کا دائرہ بھی نصف صدی سے نزدیک تر محسوس کیا جاسکتا ہے۔

ملت کے اس بطلِ جلیل نے آزادی کے سال میں (۲۳ مارچ ۱۹۴۷ کو) نواح لکھنؤ میں جنم لیا تو ان کا نام ان کے والد گرامی سید ظہیر حسن نقوی کی نسبت سے سید ضمیر حسن نقوی رکھا گیا۔ شعر گوئی میں اختر تخلص اختیار کر لینے کے باعث آپ کا نام نامی ضمیر اختر معروف ہوا۔ آپ کی والدہ محترمہ بیگم بنت ظفر عباس نقوی ایڈووکیٹ اپنے عہد کی خطابت میں اس لحاظ سے منفرد اسلوب کی حامل خطیبہ تھیں کہ اس شعبے میں علومِ دینیہ و تاریخ اُن کی تقاریر کا محور و مرکز رہا کرتے تھے علامہ صاحب کی ابتدائی خطیبانہ تعلیم و تربیت انہی کے ذریعے ہوئی ہے۔ اسی ورثۂ مادری سے علامہ صاحب کے برادر بزرگ سید محسن اختر نقوی مدیر اعلیٰ کمیونٹی نیوز اینڈ ویوز مقیم نیو جرسی امریکا، چھوٹے بھائی سید تنویر نقوی صدر محمد میموریل فاؤنڈیشن لندن، ہمشیرگان پروین نقوی زوجہ سید علی اختر زیدی ذاکرۂ یورپ مقیم لندن، نسرین نقوی زوجہ سید ناصر رضا رضوی مقیم گلشن اقبال کراچی، کنیز مہدی نقوی زوجہ سید جلال اصغر معلّمہ پاکستان ایئر فورس کالج ماڑی پور بھی فیض یافتہ ہیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی مدظلہٗ کے جد محترم سید دیانت حسین نقوی قصبہ مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی کے رئیس تھے اُن کا ایک نمایاں کارنامہ نواب احمد حسین پریانواں مصنف تحفۂ احمدیہ اور تاریخ احمدی کو مذہب حقہ سے روشناس کرانا تھا۔ اس خاندانی پس منظر

کے اجمال کی تفصیلات آپ کو مقدمے کے علاوہ کتاب کے اس حصے سے فراہم ہوں گی جو "شخصیت" کے عنوان سے آغاز میں رکھا گیا ہے۔ شخصیت کے باب کو مطالعہ کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر عالیہ امام اور آلِ محمد رزمی جیسے مدبر وقد آور اہلِ قلم کے مقالات میں آپ آرا کا وہ توازن دریافت کر سکتے ہیں جو اُن کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کی تحریروں میں عام قارئین پر غلو کا شائبہ چھوڑتا ہے حالانکہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے برس ہا برس سے اس قندیلِ علم وخطابت کی چکاچوند سے محتاط رہ کر علامہ صاحب کی شخصیت کا گہرا مطالعہ ومشاہدہ کیا ہے اور اس سے اس حد تک اثر قبول کیا ہے کہ علامہ صاحب کے اسالیبِ حیات ان کی روح میں اتر کر رہ گئے ہیں۔ انہی میں سے بعض کو یہ اعزاز بھی حاصل رہا ہے کہ وہ ملک کے مختلف شہروں کے علاوہ عالمی سطح پر انعقاد پذیر ہونے والے اُن تاریخی جلسوں کے شاہد ہیں جہاں علامہ صاحب کی معجز بیانیوں کے انفرادی رنگ نمایاں ہوئے ہیں۔ علامہ صاحب کے ساتھ گزارے ہوئے صرف چار گھنٹوں کا تاثر مجتمع کرتے ہوئے ڈاکٹر فرمان فتح پوری جیسے متوازن فکر نقاد کو یہ کہنا پڑا کہ "میں علامہ ضمیر اختر نقوی کو اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھتا ہوں" اسی طرح شخصیت کا متوازن نقطہ دریافت کرتے ہوئے ڈاکٹر عالیہ امام نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ "علامہ ضمیر اختر نقوی اس عہد کے نئے کوہ کن ہیں جو تیشے لے کر نیا پیکر شیریں تراشنے کے لئے اس میدان میں اتر آئے ہیں"۔ آلِ محمد رزمی نے علامہ صاحب کو روشن فکر انسان قرار دیتے ہوئے اس انفرادی زاویے کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کے اندازِ بیان میں سجاوٹ کا میکانکی عمل نہیں ملتا۔

علامہ صاحب کے دستِ راست قائم رضا نقوی وہ نوجوان ہیں جنہوں نے لکھنؤ کی تاریخی مجالس تک میں آفتابِ خطابت کی کرنیں بکھرتے اپنی آنکھوں سے دیکھی

ہیں اور اُن تمام ہستیوں سے واقف رہے ہیں جو عالمی سطح کے ناقدین کا درجہ رکھتے ہوئے علامہ صاحب کے بارے میں مثبت آرا رکھتے ہیں۔ علاوہ ازیں اپنی مصروفیات کو بالائے طاق رکھتے ہوئے قائم رضا ملک کے ہر گوشے میں طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کرتے ہوئے پہنچتے ہیں اور اکثر مجالس میں علامہ صاحب کی پیش خوانی اپنے خوبصورت لحن کے ساتھ موضوع مجالس کی مناسبت سے اساتذہ کا کلام سنا کے کرتے ہیں۔ ان کی جوشیلی طبیعت اس وقت عروج پر ہوتی ہے جب علامہ صاحب فضائل سے گریز کر کے مصائب کے بیان پر آتے ہیں۔ ایسے میں قائم رضا کا ہاتھ اس زور سے ماتم کناں ہوتا ہے کہ چھاتی پھٹنے لگتی ہے ایسے میں تمام مجمع بھی محو ماتم ہو جاتا ہے بیان کے دوران مجمع کا گریہ کے علاوہ ماتم کی عبادت کا ادا کرنا بھی ہم نے صرف علامہ ضمیر اختر کی مجالس مصائب ہی میں دیکھا ہے جو عقیدے اور عقیدت کی معراج کا ایک انفرادی زاویہ ہے۔ اس کتاب میں قائم رضا نقوی نے بہ ہزار دقت وہ تمام مختصر آرا کی جمع آوری کا فریضہ سر انجام دیا ہے جو نایاب تھیں مگر "ضمیرِ حیات" کے لئے ضروری بھی۔ اس کالم کے حوالے سے برصغیر کے ممتاز دانشوروں کے علامہ صاحب کے بارے میں نادر خیالات سے قارئین کو آگاہی حاصل ہوتی ہے۔ آرا کا یہ مرقع بجائے خود ایک شاہکار ہے کہ اس میں جوشؔ، رئیسؔ، ورثن جیمز شوبل، اکبر حیدری، جگن ناتھ آزاد، علی سردار جعفری، سید ہاشم رضا، پروفیسر کرار حسین، پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، پدم شری علی جواد زیدی، مرزا علی اظہر برلاس، ڈاکٹر کلب صادق، ڈاکٹر فاضل زیدی، مولانا طاہر جرولی، ڈاکٹر منظر کاظمی، پروفیسر سحر انصاری، سعید حسنین عابدی، ماجد حسین رضوی، سید مسعود حسین زیدی اور ساغر لکھنوی جیسے دنیا بھر کے ناقدین اور تخلیق کاروں کے اظہاریے دیکھ کر بے ساختہ دل یہ ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے

کہ علامہ صاحب عوام الناس ہی کے نہیں، صرف بزرگ اور نوجوان نسل ہی کے مابین نہیں علمی، تحقیقی اور سنجیدہ طبقوں میں بھی مساویانہ مقبول ہیں۔ ان آرا میں ان کی محققانہ، تصنیفی اور خطیبانہ صلاحیتوں کا اعتراف بھی ہے (رئیس امروہوی) تحقیق کی حوصلہ افزائی میں علامہ صاحب کے بڑے دل کا بھی (ورتن جیمز شوبل) حافظے کے کمال کا بھی (ڈاکٹر اکبر حیدری) جامعات کی معاونت کا بھی (جگن ناتھ آزاد) علمیت کا بھی (علی سردار جعفری) تنقیدی بصیرت کا بھی (سید ہاشم رضا) محنت شاقہ کا بھی (پروفیسر کرار حسین) احتیاطِ بیان کا بھی (پروفیسر ممتاز حسین) وسعت مطالعہ کا بھی (ڈاکٹر محمد علی صدیقی) تحقیقی اپج کا بھی (پدم شری علی جواد صدر اردو اکیڈمی لکھنؤ) علمی و ادبی پیاس کا بھی (علی اظہر برلاس) انداز کی عالمگیریت کا بھی (ڈاکٹر کلب صادق) عظمت فکر کا بھی (ڈاکٹر فاضل زیدی) شیر جیسی گھن گرج کا بھی (شیر ہندوستان طاہر جرولی) دانش مندی کا بھی (ڈاکٹر منظر کاظمی) پاسداری انسانیت کا بھی (پروفیسر سحر انصاری) تنوعات علوم کا بھی (سعید حسنین لکھنؤ) روشن ضمیری کا بھی (آل محمد رزمی) اور اس بات کا بھی کہ "صرف اور صرف ضمیر اختر نقوی" برصغیر میں تاریخ خطابت کے سب سے عظیم خطیب ہیں (مسعود حسین زیدی)۔

عابد رضا رضوی نے علامہ صاحب کو اپنے مقالے میں ہشت پہلو شخصیت ثابت کیا ہے اور ان تمام خصوصیات کو ضمیر اختر کے پیکر میں یکجا دیکھا ہے جو کسی بڑی شخصیت میں ہونے چاہئیں۔ اس کے لئے انہوں نے دلائل کے لئے صرف اپنی ذات کے حوالوں ہی پر انحصار نہیں کیا بلکہ مشاہدہ و مطالعہ کو بھی یکساں اہمیت دی ہے۔

نسیم امروہوی کے ہم نام بھائی چمن کے پرمغز مقالے میں ذاتی احساسات کا غلبہ اس لئے محسوس ہوتا ہے کہ انہوں نے علامہ ضمیر اختر کو اپنی حیات نو کا باعث اُن سے

مسلسل قریب رہ کر محسوس کیا ہے۔ بے شمار ننھی ننھی زبانوں سے نانا اور دادا کہلوا کے اور چونسٹھ سال سے خود کو مرحوم سمجھنے والے بھائی چمن بقول شخصے اپنی شریک جنت کے ہمراہ ہر اس دور افتادہ مقام تک جوانوں کی طرح پہنچے ہیں جہاں علامہ صاحب کا خطاب ہو اور ان کے لئے پہنچنا ممکن ہو۔ طبیعت ظریفانہ پائی ہے اس لئے اپنی تحریر کو بھی تر رکھتے ہیں ملاحظہ کیجئے ان کے مقالے کے ابتدائی جملے ہی کتنا انفرادی مزاج رکھتے ہیں جو علامہ صاحب کی پیدائش کے سال ۱۹۴۷ء سے متعلق ہیں۔

"اس سال دو بڑے کام ہوئے۔ ایک بڑا کام پاکستان بنا اور دوسرے علامہ صاحب پیدا ہوئے"۔

بھائی چمن نے اپنے مقالے میں برصغیر کی خطابت کی تاریخ کے تناظر میں مثالوں سے علامہ صاحب کے انفرادیت آثار اسلوب خطابت کا تجزیاتی مطالعہ کیا ہے اور بتایا کہ دیگر علمائے ماضی و حال کے مقابلے میں ضمیر اختر نقوی کی ایک مجلس کا سواد دس مجالس کے برابر ہوتا ہے۔ انہوں نے علامہ صاحب کی پہچان حقیقت پسندی، صاف گوئی اور غلط بیانی سے نفرت بتائی ہے، علامہ صاحب کے صرف ایک جوہر "حق گوئی" کو مقالے کا عنوان بناتے ہوئے انہوں نے سید ضمیر اختر نقوی کو علم کا شہنشاہِ عالم کہا ہے اور ذرا بھی مبالغہ نہیں کیا۔

سید سجاد شبیر کے دو مقالات کتاب کے پہلے حصے میں شامل ہیں۔ ایک میں انہوں نے تمام تر معاشرتی و دینی تعصبات کے خاتمے کے لئے وہ حل پیش کیے ہیں جو ادب کے حوالے سے انہیں علامہ صاحب سے مختلف مکالمات سے ہاتھ آئے ہیں اور دوسرے مقالے میں انہوں نے ایک نایاب مکالمے کو دستاویزی شکل دی ہے جو علامہ صاحب کے تصور حیات و کائنات کو سمجھنے میں ممد و معاون ہے۔ اس کے مطالعے سے

پتہ چلتا ہے کہ علامہ صاحب اپنے خطاب میں ستائیس ہزار الفاظ فی گھنٹہ ادا کرنے پر قادر ہیں باوجودیکہ ان کا خطاب نہایت دھیمے لہجے سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ایک عالمی ریکارڈ ہے جو سوائے علامہ ضمیر اختر نقوی کے دنیا کے کسی خطیب کے پاس نہیں۔ اس مکالمے میں علامہ صاحب نے بلا تخصیص و تفریق عقیدہ یہ پیغام چھوڑا ہے کہ ہمیشہ علم کے لئے سرگرداں رہیں کہ یہی تمام مسائل کا حل ہے۔

سید جاوید عباس جعفری کے مقالے میں علامہ صاحب انسانیت کا اجالا قرار پاتے ہیں جنہیں نسلِ نو کے عقائد و نظریات پر اثرات مرتسم کرتے نصف صدی ہونے کو آئی ہے۔ جو اپنی ذات میں انسانیت کے لئے اخلاص، محبت، مہر و شفقت، ایثار و قربانی کے پھول کھلاتے گلستاں ہیں۔ بین الاقوامی شہرت کے حامل مقام پر متمکن ہونے کے باوجود طرحداری اور ریا سے تہی دامن ہر وقت پیار کی خوشبو بانٹتے ہوئے۔ گوشۂ اول کے آخری مقالے کی زینت علامہ ضمیر اختر نقوی کی قد آور شخصیت کے وہ زاویے ہیں جن پر علامہ صاحب کے سامعین کی نگاہ اس وقت جاتی ہے جب وہ وکیلِ اہلِ بیتؑ کا کردار منبر سے ادا کر رہے ہوتے ہیں۔ ایسی محافل روحانی، نورانی اور معجزاتی ہوتی ہیں کہ تبلیغِ دین کے فریضے کی انجام دہی کے دوران ایک الہامی اور وجدانی طلسم علامہ صاحب کا احاطہ کیے رکھتا ہے۔ اس مقالے میں اسد عباس نقوی نے علامہ صاحب کے طریقۂ تحقیق کے بارے میں بھی معلومات فراہم کی ہیں جس میں وہ علومِ قدیم سے نورانی کرنیں کشید کر کے انہیں جدید ترین سائنسی شعور پر مبنی افکار سے آمیز کر دیتے ہیں۔ جدید و قدیم رنگ کی آمیزش سے ترتیب پانے والی یہ کہکشاں سامعین کو عجیب و غریب ذائقۂ سموت سے علامہ صاحب کے اگلے خطاب تک سرشار رکھتی اور قلوب و اذہان کو تنویرِ معرفت سے بھر دیتی ہے۔ اس راہ سے علامہ صاحب وہ اسلوب ترتیب

دیتے ہیں جس میں آفاقی عناصر کی شمولیت اُن کے متنوع شعبہ ہائے علوم مثلاً سائنس، طب، فلسفہ، تاریخ، کمپیوٹر سے آشنا انداز کو عہد حاضر کا انفرادی اور مقبول انداز تو بناتی ہی ہے اس کے ساتھ ساتھ وہ کام بھی کر رہی ہے جو اگلی صدی اور اس کے بعد کی صدیوں میں محبان محمدؐ و آل محمدؐ کے کام آئے گا اور اُس وقت بھی یہ موضوعات دور از کار نہیں بلکہ تازہ معلوم ہوں گے جیسا کہ انیس و غالب کی شاعری کی صدیوں میں جتنی تفہیم کی جا رہی ہے اُن کی مہک میں روز افزوں اضافہ ہی دیکھنے میں آتا ہے۔

"ضمیر حیات" کا دوسرا نمایاں گوشہ تحقیق و تنقید کے عنوان سے ترتیب دیا گیا ہے۔ اس گوشے میں علامہ ضمیر اختر نقوی کی اولین ادبی حیثیت کو اُجاگر کرنے والے نادر مقالات جمع کئے گئے ہیں۔

اس گوشے کا پہلا حصہ علامہ صاحب کی تصنیف "اردو مرثیہ پاکستان میں" سے متعلق ہے علامہ صاحب کی اسی معرکتہ الآرا تحقیق نے بیس برس قبل مجھے علامہ صاحب سے تعارف کا موقع فراہم کیا۔ اس زمانے میں میری اہلیہ کے لئے اسی عنوان سے ذکریا یونیورسٹی ملتان کے شعبہ اردو میں تحقیق کے لئے موضوع منظور ہو چکا تھا۔ عرصۂ تحقیق ختم ہونے کو تھا اور مرثیے پر مواد کی اس خطے میں کمی تھی۔ تائید غیبی سے کراچی میں علامہ صاحب کے ناظم آباد والے گھر میں ان سے ملاقات ہوئی تو جیسے علمی مواد کی دستیابی کا کوثر عطا ہو گیا۔ ضمیر اختر کی مذکورہ تصنیف اس سے پہلے منظر عام پر آ چکی تھی اور پی ایچ ڈی کی سطح کے ملکی و عالمی محققین جن میں علامہ صاحب کے شاگرد ہلال نقوی بھی تھے مرثیے کے موضوعات کو علامہ صاحب کی مدد سے آگے بڑھا رہے تھے۔ علامہ صاحب نے اس کڑے وقت میں نہ صرف اپنے کتب خانے سے استفادے کا موقع فراہم کیا بلکہ تمام تشنگانِ علم سے متعارف بھی کروایا جو اس سلسلے میں معاون ہو سکتے

تھے۔ میں نے بیں پچیس برس پہلے کے اس قیمتی لمحے کو کبھی فراموش نہیں کیا اور ہمیشہ اپنی ذات پر احسان کی طرح سمجھا ہے۔ اس کتاب کے ذریعے جو ''ضمیر حیات'' کے عنوان سے شائع ہو کر آپ کے ہاتھوں میں ہے اگر اس قرض کے ادا ہونے کی صورتوں کا عشر عشیر بھی ظہور پذیر ہو جائے تو میرے لئے سعادت ہے۔ وہ دن اور آج کا دن میں علامہ صاحب کی بے پناہ شفقتوں کے حصار میں ہوں۔ ''اردو مرثیہ پاکستان میں'' کے حوالے سے اولاد حسین (للّن صاحب) شاعرؔ لکھنوی کے فرزند ارجمند مہدی نظمی نے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ کتاب پاکستان میں مرثیہ نگاری کی نئی ترقی کا ایک اچھا اور کامیاب نمونہ پیش کرتی ہے۔ سید عاشور کاظمی نے اس تحقیق کے تناظر پر بات کرتے ہوئے اس موضوع کو وسعت عطا کرنے والی علامہ صاحب کی دیگر تصانیف و تالیفات مثلاً تاریخ مرثیہ نگاری، میر انیسؔ حیات اور شاعری، جوشؔ کے مرثیے، شعرائے اردو اور عشق علی، خاندانِ میر انیسؔ کے مرثیہ نگار، اردو غزل میں واقعہ کربلا کو بھی حوالہ بنایا ہے اور علامہ صاحب کے ذوقِ تحقیق کو مہمیز دینے کے لئے اس موضوع کی توسیع کے کئی اہم تحقیق طلب موضوعات کی طرف توجہ دلائی ہے۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نے ''ضمیر اختر نقوی کے تحقیقی کارنامے'' کے عنوان سے دورِ انیسؔ و دبیرؔ پر علامہ صاحب کی گہری نظر ہونے کے دلائل بعض ذاتی حوالوں سے یکجا کیے ہیں اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ اردو مرثیہ پاکستان میں لکھ کر مصنف نے اردو ادب پر احسان کیا ہے۔ جگن ناتھ آزاد کی رائے میں اس کتاب کو اردو ادب کی بہترین کتاب کا درجہ حاصل ہے۔ علی سردار جعفری نے اپنے مقالے میں اسے اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کتاب نے قدیم و جدید مرثیے کا احاطہ کر لیا ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود (شعبہ فارسی لکھنؤ یونیورسٹی) کے مقالے کی رو سے ''اردو مرثیہ پاکستان میں'' ایک قابلِ قدر اور بیش

قیمت دستاویز ہے جو صدیوں تک تحقیق کی راہوں پر گامزن ہونے والوں کی رہنمائی کرتی رہے گی۔ "ضمیرِ حیات" کے اس حصے میں محمد رضا کاظمی، سحر انصاری، حمید الدین شاہد، نعیم تقوی، ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، ڈاکٹر جمیل جالبی، ڈاکٹر انور سدید، مشفق خواجہ، ڈاکٹر ہلال نقوی وغیرہم کی طویل ومختصر آرا نے چار چاند لگائے ہیں۔

مرحوم سید ہاشم رضا کو علامہ ضمیر اختر نقوی کے "ادبی کمال کا ثبوت" اسی کتاب سے ملا۔ انہوں نے کتاب کا مطالعہ دو حصوں میں کیا ہے پہلے حصے کو انہوں نے تاریخی اور دوسرے کو تخلیقی کہا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ان کے بھائی سید آل رضا ضمیر اختر نقوی کی بڑی قدر کرتے تھے۔ سلیم احمد کی تحریر میں یہ کتاب ایک کاوش قرار پاتی ہے جو اہلِ علم و تحقیق کے لئے ہمیشہ رہنمائی کا باعث ہوگی اور زمانے میں جدید مرثیے کی قدر و قیمت بڑھانے کا باعث بھی۔

جامعہ بلوچستان کے سابق وائس چانسلر اور نامور نقاد پروفیسر کرار حسین نے ضمیر اختر نقوی کے اس تحقیقی کارنامے کو ایسا فرضِ کفائی کہا ہے جو شوق کو عشق کی منزل سے ہمکنار کیے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ اسی طرح برصغیر کے ممتاز تنقید نگار ممتاز حسین کی دانست میں "اردو مرثیہ پاکستان میں" کا اسلوب بیان شائستہ اور جچا تلا ہوا ہے اس حوالے سے بلاشبہ یہ کتاب ایک کھلے ذہن کا کارنامہ ہے۔

پدم شری علی جواد زیدی صدر اردو اکادمی لکھنؤ نے اپنے مقالے کی راہ سے "ضمیر اختر کی سعی پیہم" کی داد یوں دی ہے کہ اسے ایک خوش آئند مستقبل کی ضمانت کہہ دیا ہے اور ان سے رثائی ادب کی توقعات بھی وابستہ کی ہیں اپنے مقالے "ایک منفرد کتاب" میں پروفیسر مرزا علی اظہر برلاس کا کہنا ہے کہ علامہ صاحب نے سالہا سال کی جستجو، عرق ریزی و تحقیق سے رثائی ادب میں وہ مقام بنا لیا ہے جس تک عام ذہن کی

رسائی انتہائی دشوار ہے۔ ڈاکٹر منظر کاظمی کے مقالے کے مطابق اس تصنیف کو اردو مرثیے کا وقار کہا جاسکتا ہے جو رثائی ادب کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کرتی ہے۔

ڈاکٹر سبطِ حسن فاضل کی نظر میں اشاریۂ میر انیسؔ، اشاریۂ مرزا دبیرؔ، جوشؔ کے مراثی جیسی معرکتہ الآرا تحقیقی کاوشوں کے بعد "اُردو مرثیہ پاکستان میں" علامہ صاحب کے معجز نما قلم کا "پانچواں کارنامہ" ہے جو تنِ تنہا فردِ واحد نے سرانجام دے کر ادارے کا کام کر دکھایا ہے۔ جامیؔ ردولوی مقیم لندن کی تنقیدی رائے میں اس کتاب کی حیثیت ایک ہمہ گیر اور بصیرت افروز کتاب کی ہے جس کے ذریعے پاکستان میں مرثیے کی تحریک نشاۃ ثانیہ کا عرفان حاصل ہوتا ہے۔ لندن ہی سے فراہم ہونے والا سید علی مہدی کا مقالہ وہ آخری دستاویز ہے جو اس تصنیف کے حوالے سے "ضمیرِ حیات" کا حصہ بنائی گئی ہے اس کی روشنی میں ضمیر اختر نقوی "قابلِ صد آفرین" ہیں کہ انہوں نے تحقیق کی اس دشوار گزار منزل کو پامردی سے قطع کیا۔

"ضمیرِ حیات" کے جس حصے میں علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی مدظلہٗ کی ایک اور ضخیم تصنیف "شعرائے اردو اور عشقِ علی" پر ناقدینِ عالم کا قیمتی سرمایۂ نقد دیگر ذرائع کے علاوہ اُن معاونات کو کام میں لا کر فراہم کیا گیا ہے جو کمپیوٹر سے تعلق رکھتے ہیں اس میں بھی بڑے ناموں کی کہکشاں جگمگاتی نظر آتی ہے جس میں سید ہاشم رضا، ڈاکٹر جمیل احمد رضوی، پروفیسر سید محمد نصیر، پروفیسر طہیر نفسی پروفیسر سردار نقوی، جناب وحید الحسن ہاشمی، محمود الحسن رضوی، رشید حیدر رضوی، ابنِ حسن رضوی، نیر اسعدی، علامہ صاحب ذوالفقار حیدر، سید ماجد رضوی، ساحر لکھنوی محمد رضا کاظمی، ڈاکٹر ماجد رضا عابدی، علامہ صاحب ناصر مہدی، محمد علی سید، اقبال کاظمی، سید محمود خاور، سلیم فاروقی، سید ناصر رضا، وارث رضا، نسیم حیدر جون پوری، سید مراد علی، حیدر علی اختر، شاہد جعفر، پرویز بلگرامی،

سجاد شبیر، سید حسن رضا، کمال حیدر و دیگر شامل ہیں۔ سید ہاشم رضا کی یہ رائے صائب ہے کہ علامہ ضمیر اختر نقوی نے "شعرائے اردو اور عشق علیؑ" کی صورت میں ایسا ادبی دستر خوان بچھا دیا ہے، جس کا ہر کونا اس مصرعے کے مصداق ہے۔

کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا اینجاست

انہوں نے علامہ صاحب کی دیگر تصانیف مثلاً اُردو غزل اور کربلا، شہید علمائے حق، آثنا عشر، مجالس رشید ترابی، سید حسین شرف الدین شاہ ولایت جیسی گراں قدر کتب لکھنے پر انہیں مبارک باد بھی دی ہے۔

ڈاکٹر جمیل احمد رضوی کے مقالے کا تجزیہ ہے کہ "شعرائے اردو اور عشق علیؑ" اردو ادب کے علمی ذخیرے میں قابل قدر اضافہ ہے کیونکہ اس دستاویز کے ذریعے متنوع زبانوں کے شعری ادب میں مناقب و قصائد حضرت علیؑ کی طویل روایات کی مختصر ترین تاریخ اسی کتاب کے ذریعے مرتب ہوئی ہے اسی مقالے میں علامہ صاحب کے شیعہ کالج لکھنؤ کے دورِ تحصیل علوم کا ذکر بھی تفصیل سے آیا ہے، جس کے مطالعے سے قارئین کو اندازہ ہوگا کہ علامہ صاحب لکھنؤ کو عروس البلاد اور مدینہ تہذیب کیوں کہتے ہیں۔

ڈاکٹر اسد اریب میرے ہم مستقر اہل قلم وخطیب ہیں جو کثیر التصانیف ہونے کے ساتھ بات کو کفایت لفظی سے کہنے کے قائل ہیں "سخن حق" تحریر کرتے ہوئے یہ محتاط رائے دیتے ہیں کہ اردو شاعری کے رثائی رُخ پر اس قدر گہری نظر رکھنے والا کوئی اور اہل قلم اب مشکل ہی سے مل سکے گا جتنی کہ علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی مدظلہ العالی کی ہے۔ انہوں نے دلائل سے "شعرائے اردو اور عشق علیؑ" کو کاوشِ اتحادِ فکر کی مضبوط کوشش کا نام دیا ہے پروفیسر سید محمد نصیر کے مقالے سے ابھرنے والی اس براہین آشنا رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ ضمیر اختر نہ صرف حضرت علیؑ کے عاشق ہیں بلکہ انہیں

تحقیق سے بھی بلا کا عشق ہے اور عشق کی ان دو انتہاؤں کا نقطہ اتصال علامہ صاحب کی اسی تصنیف میں نقطۂ عروج پر دکھائی دیتا ہے۔ تحقیق کے حوالے سے مقالہ نگار نے انہیں حقیقت آشکار "ترابی" کے لقب سے یاد کیا ہے۔

پروفیسر ظہیر نفسی کے تنقیدی شعور کے مطابق "شعرائے اردو اور عشق علیؑ" منقبتی شاعری کا گلزار ارم ہی نہیں انسائیکلو پیڈیا بھی ہے۔ اور اس سبد گل میں علامہ صاحب نے مختلف و متنوع باغوں کی خوشبو اپنے قارئین میں عام کرنے کی سعی بلیغ کی ہے جو اس سے پہلے اس انداز میں کبھی نہیں ہوئی۔ اپنے مقالے کے حوالے سے پروفیسر سردار نقوی کا کہنا ہے کہ عشق علیؑ کے دائمی روشن چراغ کی لو علامہ صاحب کی اس تصنیف سے دوچند ہو جاتی ہے اور قاری معراج مودت پالیتا ہے، وحید الحسن ہاشمی عہد حاضر کے نمایاں مرثیہ گو شاعر ہی نہیں ایک نابغہ بھی ہیں اپنے مقالے "دریائے عشق کے دو کنارے" میں یہ ثابت کیا ہے کہ ضمیر اختر نقوی جنہیں اردو ادب سے دلچسپی بھی ہے اور مذہب کے ارتقاء کا خیال بھی انہوں نے "شعرائے اردو اور عشق علیؑ" لکھ کر دریائے عشق کے دونوں کناروں پر قبضہ کر لیا ہے۔

پروفیسر محمود الحسن رضوی نے کتاب کے موضوعات کی اہمیت کا اندازہ کرتے ہوئے اپنے مقالے میں تجویز کیا ہے کہ یہ کتاب ہر لائبریری اور ہر گھر میں ہونی چاہیے کیونکہ علامہ ضمیر اختر نے اس کتاب کے ذریعے اردو ادب کے اس روشن وزریں باب کی تدوین کی ہے جو عرفان کے متلاشی لوگوں کے لئے ہی نہیں سارے عالم کے لئے افادیت رکھتی ہے۔ انہوں نے "شعرائے اردو اور عشق علیؑ" کو ناصبیت اور خارجیت کے معاشرے میں جڑ پکڑ جانے والے عناصر و عوامل کے عارضے کا تیر بہدف نسخہ بھی قرار دیا ہے بلاشبہ ضمیر اختر نے پانچ سو صفحات میں جو کچھ قلم بند کر دیا ہے وہ ایسی ہی

پانچ جلدوں کا موضوع تھا۔

اس لحاظ سے یہ کتاب ''شعرائے اردو اور عشقِ علیؑ'' کفایتِ لفظی اور اختصار کا شاہکار بھی ہے۔ محمود الحسن رضوی نے انکسارِ ذات کا اظہار کرتے ہوئے بھی فقہ وعقیدہ پر ثقہ کتب کے کئی حوالے اپنے مقالے میں یکجا کیے ہیں اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ صوفیائے کرام کے تمام سلسلے حضرت علیؑ پر منتہی ہوتے ہیں اس لئے ''شعرائے اردو اور عشقِ علیؑ'' کے موضوع کو کسی ایک مسلک یا فقہ کے لئے مخصوص خیال کرنا زیادتی ہوگی انہوں نے بتایا ہے کہ یہ تالیف بلا تخصیص مذہب وملت تشنگانِ علم کی سیرابی کا باعث ہے۔ رشید حیدر رضوی کے مقالے میں اس تالیف پر تجزیہ وتبصرہ کے علاوہ علامہ صاحب کی دیگر جہات سے متعلق معلومات بھی قارئین کو میسر آتی ہیں۔ انہوں نے ابواب وار کتاب کے مطالعے کا نچوڑ پیش کیا ہے جو خاصے کی چیز ہے۔ ابن حسن رضوی کے بقول ''شعرائے اردو اور عشقِ علیؑ'' اردو منقبت پر پہلی کتاب ہے۔ جس کے ذریعے عقائد کی بنیاد، ذکرِ علیؑ کے ماخذات اور اس احاطے میں آنے والے تمام مباحث سے تعارف حاصل ہوتا ہے۔ نیر اسعدی نے اختصار سے ابواب کتاب کی تفصیلات کا تعارف کرواتے ہوئے علامہ صاحب کی دیگر تصنیفات وتالیفات سے متعلق معلومات فراہم کی ہیں اور بتایا ہے کہ اس تناظر میں دیکھا جائے تو ''شعرائے اردو اور عشقِ علیؑ'' کے ذریعے ''دنیائے ادب میں ایک اور تحقیقی کتاب'' کا اضافہ ہوا ہے۔ جس میں شعرا کے کلام کے ساتھ ساتھ اسلامی اور ادبی تاریخ کو بھی یکجا کر دیا گیا ہے۔

آلِ محمد رزمی نے اس تالیف کو ''فکری خواب کی تعبیر'' قرار دیا ہے اور شاہکار کتاب بھی، ایک مقالے میں انہوں نے اس ضخیم کتاب کو موضوع بنایا ہے اور دوسرے میں اس مجلّے کو جو اس کتاب کے حوالے سے شائع ہوا اور الگ کتاب کی حیثیت رکھتا ہے

انہوں نے دونوں مقالات میں حضرت علیؑ کی صفاتِ جلیلہ، اوصافِ حمیدہ اور کمالات کا جائزہ لے کر ''شعرائے اردو اور عشقِ علیؑ'' پر یہ رائے ظاہر کی ہے کہ جن شعرا کا انتخاب علامہ ضمیر اختر نے اس حوالہ جاتی کتاب میں شامل کیا ہے انہوں نے کسی شاعرانہ تعلی سے کام نہیں لیا۔ آلِ محمد رزمی نے ان دینی ورثائی اصناف ادب کی مبادیات پر بھی روشنی ڈالی ہے جنہیں علامہ صاحب نے ہمیشہ تحقیق وتصنیف کا موضوع رکھا علاوہ ازیں ان اداروں کی کارکردگی کا تجزیہ بھی کیا ہے جو ایسے کاموں کے لئے قائم تو کیے جاتے ہیں ان کے لئے فنڈز بھی فراہم ہوتے ہیں مگر حاصلات پر نظر ڈالیں تو کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ ان اداروں کے مابین علامہ ضمیر اختر کی ذات گرامی ایک الگ ادارے کی حیثیت رکھتی ہے۔

علامہ ذوالفقار حیدر نقوی نے ''اردو شعرا اور عشقِ علیؑ'' پر جو اظہاریہ تحریر کیا ہے اس کا عنوان انہوں نے منظوم یعنی یہ شعر رکھا ہے۔

عشقِ علیؑ پہ یہ کتاب
اردو ادب کا ہے گلاب

اور واقعی اس کتاب میں علامہ صاحب کے شامل کردہ دو سو چورانوے سے زائد شاعروں اور ہزاروں اشعار سے ادب ومعرفت کی خوشبو ہی تو عام ہوئی ہے، سید ماجد حسین رضوی نے ''شعرائے اردو اور عشقِ علیؑ'' کی ایک ایک سطر کو جاذبِ دل ونگاہ پایا ہے۔ ساحر لکھنوی کا کہنا ہے کہ مدحِ علیؑ کے لئے اردو کی ہر صنفِ سخن نے اپنی آغوش ہمیشہ وا رکھی لیکن مدح ومنقبت نے ادب کے دامن کو عرفان وآگہی کے ایسے موتیوں سے بھر دیا جیسے اندھیری رات میں آسمان کا دامن تاروں سے بھرا ہوتا ہے۔

پروفیسر محمد رضا کاظمی جو رثائی ادب کے صاحبِ تصنیف نقاد ہیں اپنے مقالے میں

کہتے ہیں کہ علامہ ضمیر اختر نقوی کی تصانیف ہمیشہ موضوع سے تجاوز کر جاتی ہیں اور یہی ان کے حق میں بہتر ہوا کرتا ہے۔ وہ اس "ادبی کمال کا اعتراف" کرتے ہیں کہ اس کتاب میں علامہ صاحب نے عشق علی کا جذبہ اردو ہی نہیں دیگر عالمی زبانوں کے شعراء کے ہاں بھی دکھایا ہے۔

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی علامہ صاحب کے ہونہار شاگرد ہی نہیں متبادل کا درجہ بھی رکھتے ہیں اس لئے اگر ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات کے مصداق انکا اسلوب خاص علامہ صاحب کی تمام جہات پر بڑا تفصیلی اور ناقدانہ ہوا کرتا ہے "شعرائے اردو اور عشق علی" کے حوالے سے جو مقالہ انہوں نے تحریر کیا ہے اس میں بھی علامہ صاحب کی شخصیت سے لے کر تخلیقی تحقیقی و تصنیفی تمام زاویوں کا مکمل احاطہ کیا گیا ہے۔ کتاب کے جائزے میں نمایاں اور معتبر شعرا کی مثالیں بھی انہوں نے شامل مقالہ کی ہیں کہ اگر کوئی ایسا قاری جسے علامہ صاحب کی تصنیف دستیاب نہ بھی ہو تو وہ اس مقالے کی راہ سے مکمل کتاب کا لطف لے سکے۔ ان کی اس رائے کو وقیع جاننا چاہئے کہ عشق علی کا تعلق ہر فرقہ و مسلک سے ہے اور بحرِ ذخار میں ڈوبا ہوا ہے ان سب کی مثالیں اس کتاب میں موجود ہیں"۔ ناصر مہدی الرضوی نے ابواب کے عنوانات مقالے میں شامل رکھتے ہوئے "شعرائے اردو اور عشق علی" کو "مدحت علی" کا درج بے بہا کہا ہے۔ محمد علی سید نے کتاب کو تمثیلی انداز میں "بین الکائناتی محفل منقبت" قرار دے کر اس کا نقیب علامہ ضمیر اختر کو بتایا ہے جو مردہ روحوں کو زندہ کرنے کی صلاحیت سے مالا مال ہیں۔ مرثیہ فاؤنڈیشن کے سیکریٹری اقبال کاظمی بھی اپنی طبیعت کے تمام تر اختصاصات کے ساتھ کشادہ دلی سے "شعرائے اردو اور عشق علی" کو ایک گراں قدر اور اہم تصنیف تسلیم کیے بنا نہیں رہ سکے کیونکہ یہ تصنیف واقعی مستحسن، قابل رشک و تقلید کارنامہ ہے جو

صدیوں میں سرانجام پاتا ہے۔ سید محمود خاور کی نظر میں یہ کتاب ''محققانہ کاوشوں کا نتیجہ خیز ثمر'' ہے۔ جس کے شیریں ذائقے سے اہل معرفت تا ابدآباد سرشار ہوتے رہیں گے۔ سلیم فاروقی کا خیال یہ ہے کہ یہ عظیم دستاویز چودہ صدیوں کا احاطہ کرتی ہے اس لحاظ سے چہاردہ معصومینؑ کی تعلیمات کا لطف اپنے اندر لئے ہوئے ہے۔ سید ناصر رضوی نے اپنے مقالے کے ذریعے اس غیر فانی شاہکار پر اظہار خیال کرنے والوں کا شکریہ اراکین مرکز علوم اسلامیہ کی جانب سے ادا کیا ہے وارث رضا کو ''شعرائے اردو اور عشق علیؑ'' میں روشن کل کی امید بجا طور پر پوشیدہ نظر آئی ہے۔ سید نسیم حیدر زیدی جونپوری کی ''چند باتیں'' بشکل مقالہ اس کتاب کا حصہ بنائی گئیں ہیں جن کا نچوڑ یہ ہے کہ یہ انتخاب دراصل حسن آفرین علامتوں میں امیر کائنات کی نئے رخ اور نئے زاویے سے تلاش کی دستاویز ہے۔

سید مراد علی جعفری رئیس تحقیق دانش مشرق نے ''شعرائے اردو اور عشق علیؑ'' کو علامہ ضمیر اختر نقوی کی تحقیقی کاوشوں کا جید نمونہ پایا ہے جو ضخیم ہونے کے ساتھ توعات کی بھی حامل ہے۔ حیدر علی اختر کی رائے میں یہ کتاب ''اہل علم و ادب کے لئے منارۂ نور'' کی حیثیت رکھتی ہے جبکہ شاہد جعفر نے اسے ''خوب سے خوب تر'' کی آئینہ دار کتاب پایا ہے۔ پرویز بلگرامی نے ''شعرائے اردو اور عشق علیؑ'' میں وہ خصوصیات دریافت کی ہیں جو اعلیٰ سطح کے تحقیقی کام کے لئے شرط اول کی حیثیت و افادیت رکھتی ہیں اسی لئے تو انہوں نے اسے ''مقالوں کے سرمائے میں منفرد اور قابل قدر کارنامہ'' سمجھا۔ لاہور کے سید حسن رضا کا کہنا ہے کہ ''شعرائے اردو اور عشق علیؑ'' موضوع کے لحاظ سے پہلی کتاب ہے جو اہل معرفت کی پیاس بجھاتی ہے، گوشے کے آخر میں سید کمال حیدر رضوی جو خصوصاً اہل لاہور کے لئے علامہ صاحب کا عطا کردہ تحفہ ہیں انکا

مقالہ شامل کتاب کیا گیا ہے جو اس رائے کو دلیل فراہم کرتا ہے کہ "شعرائے اردو اور عشقِ علی" تحریر و تقریر کا کوثر ہے جس کے جام عرفان والوں کو عطا ہوئے ہیں۔

"خاندانِ میر انیس کے نامور شعراء" پر علامہ ضمیر اختر کے ذریعے جو دستاویز ترتیب پائی ہے اس پر ناقدین کے اظہاریے "ضمیر حیات" کے ایک الگ گوشے میں شامل ہیں جس کی جگمگاہٹ کا باعث انتظار حسین، ڈاکٹر جمیل احمد رضوی، سید معراج جامی، پروفیسر محمود الحسن رضوی، نقاش کاظمی، شفیع عقیل، علی حیدر ملک، آل محمد رزمی، قیصر حسین مشہدی اور حسن عابدی کے نادر و وقیع مقالات ہیں۔ اس فہرست کے چند نام تو ایسے ہیں جن کی رائے کو عالمی سطح پر اہمیت دی جاتی ہے جب آپ اس گوشے کو زیر مطالعہ لائیں گے تو اس تالیف کی قدر و قیمت آپ پر واضح ہوتی چلی جائے گی۔ انتظار حسین اسے ہزاروں صفحات پر پھیلا ہوا ایسا تفصیلی و تشریحی تذکرہ قرار دیتے ہیں جس میں علامہ ضمیر اختر نقوی نے تحقیق کی کٹھن منزلوں سے گزر کر تاریخ کے دھندلکوں سے اس خاندان کی شناخت کو دوبارہ اجاگر کیا ہے۔ ڈاکٹر سید جمیل احمد رضوی کے مطابق یہ مجموعہ تنقید رثائی ادب کے قارئین کی روحانی مسرت اور ذہنی بالیدگی کو سرمایہ عطا کرتا ہے۔

برطانیہ سے نکلنے والے "سفیر اردو" اور "ہائیکو ورلڈ" جیسے بین الاقوامی ادبی مجلوں کے مدیر سید معراج جامی نے "غیر معمولی تلاش و تحقیق" کے جواہر تدوین کے اس شہ پارے سے تلاش کر کے مقالے کا یہ نچوڑ پیش کیا ہے کہ علامہ ضمیر اختر نقوی نے ایک طرف تو خاندانِ میر انیس کے بیشتر گمنام شعرا کو حیاتِ دوام عطا کی ہے دوسری طرف غیر معمولی تلاش و تحقیق سے وہ غلط مبحث رفع کر دیئے ہیں جو اس موضوع سے متعلق اس سے پہلے پائے جاتے تھے۔

سید محمود الحسن رضوی کا طویل مراسلہ "ضمیر حیات" میں مقالے کے طور پر شامل

ہے اُن کا کہنا ہے کہ مرزا دبیر اور میر انیس نے جو دبستان چھوڑے ہیں اُن پر علامہ صاحب کی تصانیف سے پہلے کوئی کاوش منصۂ شہود پر نہیں آئی۔ نقاش کاظمی علامہ ضمیر اختر نقوی کی ادبی مہم جوئی کے قائل ہیں اور علامہ صاحب کی دیگر تصانیف مثلاً تلامذۂ ناسخ، تاریخ مرثیہ نگاری کی دس جلدیں، شہید علمائے حق وغیرہم کا تذکرہ کر کے انہیں ''ماہر انیسیات'' قرار دیتے ہیں تو شفیع عقیل اس تالیف کو ذوق وشوق بلکہ عشق ومحبت کا زندہ کرشمہ سمجھتے ہیں۔ علی حیدر ملک نے اسٹڈی سرکل کی اس نشست کا احوال مفصل بیان کیا ہے جس میں علامہ صاحب کی تصانیف ''خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا'' اور ''اردو غزل اور کربلا'' پر کلیم رحمانی، یاور امان، فرقان ادریسی، احمد زین الدین، شاہین بدر، ڈاکٹر ممتاز احمد خان، صبا اکرام اور دوسرے ناقدین نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے ان کی محنت اور ٹھوس کاموں کا اعتراف کیا۔ انہوں نے ایک الگ مقالے میں میر انیس اکیڈمی کی علامہ ضمیر اختر کے اعزاز میں منعقدہ اس تاریخی محفل کا بھی تفصیلاً ذکر کیا ہے جس کی صدارت سید ہاشم رضا نے کی تھی اس محفل میں پروفیسر سحر انصاری کے خطاب کے بعد محسن نقوی، ماجد رضا عابدی اور دیگر شعراء کا وہ منظوم نذرانۂ عقیدت بھی شامل تھا جسے آپ ''ضمیرِ حیات'' کے ایک اور گوشے میں ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ یہیں قسیم امروہوی نے وہ منظوم مقالہ بھی علامہ صاحب کو پیش کیا تھا جو مسدس کی شکل میں مذکورہ بالا گوشے کا اہم حصہ رکھا گیا ہے۔ آلِ محمد رزمی جو اول و آخر ایک اسکالر ہیں اس پر تبصرہ کرتے ہوئے بھی اپنے حوالہ جاتی انداز کو فراموش نہیں کر پائے اور انہوں نے عالمی ادب کا موازنہ اس تصنیف سے کیا تو نتیجہ یہ برآمد کیا کہ علامہ سید ضمیر اختر نقوی اردو مرثیے کے جوہری ہیں جنہوں نے خاندانِ انیس کے نامور شعرا کے جوہر کو بھی تحقیقی ذمہ داری کے ساتھ یکجا کیا اور ان شعرا کے چیدہ چیدہ حالات کو بھی ژرف بینی سے

مرتب کیا۔

سید قیصر حسین قیصر مشہدی ایم اے نے علامہ صاحب کے بیس سالہ تصنیفی عرصے کو نظر میں رکھ کر انہیں ہمہ جہت شخصیت کے نام سے یاد کیا ہے اور یہ سوال ابھارا ہے کہ آج ٹی وی، وی سی آر، اور ڈش انٹینا کے سم آلودہ مادیت کے پر آشوب دور میں علامہ صاحب کے علاوہ کون ہے جو خاندانِ انیس کے شعرا کے صرف نام ہی شمار کروا سکے گوشے کا ایک مقالہ حسن عابدی کا انگریزی زبان میں تحریر کردہ ہے جسے ڈاکٹر ماجد رضا عابدی نے ترجمہ کیا ہے۔ نقادِ محترم نے ''خاندانِ میر انیس'' کو قیمتی اور گراں قدر صحیفے کا نام دے کر بتایا ہے کہ اس کے ابواب پوری ایک صدی کا احاطہ کرتے ہیں۔

''ضمیرِ حیات'' میں علامہ صاحب کی تصنیف ''اردو غزل اور کربلا'' پر تنقید و تبصرہ کا حصہ رئیس امروہوی'' پدم شری علی جواد زیدی، پروفیسر حسن عسکری کاظمی، کلیم رحمانی اور نیلما سرور کی بیش قیمت آرا سے مزین و منور ہے۔

رئیس امروہوی نے کتاب کے ابواب کا تعارف کرواتے ہوئے موضوع کو انوکھا اور اندازِ بیان کو دلچسپ قرار دیا ہے تو پدم شری علی جواد زیدی نے ''اردو غزل اور کربلا'' کو تحقیق کی نئی راہوں کی نشان دہی'' کا مرکز و محور مانا ہے۔ حسن عسکری کاظمی اس حوالے سے روایتی موضوع میں بھی تازگی کا احساس کشید کرتے ہیں تو کلیم رحمانی نے غزل کے عہد بعہد تبدیل ہوتے ہوئے آفاق کو اپنے مقالے میں جگہ دی ہے اور واضح کیا ہے کہ ''اردو غزل اور کربلا'' میں ضمیر اختر نقوی نے تصنع، لفظوں کی بھرمار اور بے محل باتوں سے گریز کا عمدہ نمونہ قارئین کے سامنے رکھا ہے۔ اس حصے کی تکمیل نیلما سرور کے مقالے پر ہوئی ہے۔ جس میں اردو کی سدا بہار صنفِ سخن میں واقعاتِ کربلا کی علامتیں زیرِ بحث لائی گئی ہیں اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ ان کا جدید اردو غزل میں بہ افراط

استعمال لایا جانا عہد آفریں مثال ہے۔

کتاب کا جو حصہ علامہ صاحب کی تنقیدی بصیرت کے شاہکار ''میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال'' کے حوالے سے لکھے گئے مقالات کے لئے مخصوص رکھا گیا ہے اس میں آپ پروفیسر سحر انصاری، انتظار حسین، ڈاکٹر شارب ردولوی، ڈاکٹر شیخ انصار حسین، ادیب سہیل، افضال حسین نقوی المعروف فضل فتح پوری، کوثر الہ آبادی، عباس نقوی اور آل محمد رزمی کے اسالیب میں علامہ صاحب کی تنقیدی جہات کا اعتراف ملاحظہ کریں گے۔

انتظار حسین کا ''رنگوں کی زبان'' کے حوالے سے نئی صدی کے آغاز میں جو مقالہ ڈان میگزین میں چھپا تھا اس میں اُن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی کی زیر نظر کتاب شبلی نعمانی کے انداز نقد و نظر سے علیحدگی پر دلالت کرتی ہے۔ اس بات کے دلائل آپ کو اسی مقالے کے مطالعے سے ہاتھ آئیں گے۔

لکھنؤ سے پروفیسر ڈاکٹر شارب ردولوی کا جو مقالہ ''ضمیر حیات'' کے اس گوشے کی زینت ہے اُس میں انہوں نے اسے انیسیات میں منفرد کتاب کا نام دیا ہے۔ ڈاکٹر شیخ انصار حسین نے اپنے مراسلے ''نئے رنگوں کی تلاش'' میں براہ راست ضمیر اختر سے یہ بات کہہ کر حوصلہ افزائی کی ہے کہ ''یہ تصنیف ادب میں ایک ایسا اضافہ ہے جس نے رنگوں کو ایک نیا پیراہن عطا کر دیا ہے۔ ادیب سہیل نے اس تصنیف کے ''نئے نئے رخ'' اپنے سامنے رکھے ہیں اور بتایا ہے کہ یہ مقالہ میر انیس کے حوالے سے رثائی ادب میں ایک نئی جہت کی تلاش ہے۔ پروفیسر سحر انصاری اسے ایک منفرد اور عالمانہ کاوش سمجھتے ہیں۔

فضل فتح پوری جو ضمیر اختر نقوی کے ننھیالی بزرگوں میں سے ہیں یہ کہہ کر دعائیں

دیتے ہیں کہ ابھی تک اردو زبان میں رنگوں کی ماہیت اور حقیقت کے حوالے سے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تھا اس کا سہرا ضمیر اختر کے سر جاتا ہے کہ انہوں نے نہ صرف اس عظیم کام کو شروع کیا بلکہ بہت جلد پایۂ تکمیل کو بھی پہنچا دیا۔ کوثر الٰہ آبادی کا دعویٰ ہے کہ "میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال" اردو ادب میں رنگوں کے حوالے سے پہلی کتاب ہے۔ آل محمد رزمی نے علامہ ضمیر اختر نقوی کی انیس شناسی کو اسی حوالے سے بہ نظر غائر دیکھا ہے اور واضح کیا ہے کہ علامہ صاحب ایک تسلسل سے میر انیس کی فکری تخلیقات میں اتر کر ان کے پیغام کو سمجھنے، سمجھانے اور ان کی عظمت کو منوانے کی مساعی میں مصروف رہتے ہیں۔

محمد عباس نقوی نے مقالے "نقد و نظر" میں جتایا ہے کہ علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب اور میر انیس لازم و ملزوم قرار پا چکے ہیں۔

"جوش ملیح آبادی کے مرثیے" مدوّن کر کے ضمیر اختر نقوی نے جو علمی و ادبی اور دینی خدمت سرانجام دی ہے اس کا اعتراف ناقدین عالم نے کھل کر کیا ہے۔ "ضمیر حیات" کا ایک حصہ آپ کو موضوع سے مخصوص ملے گا۔ جس میں سید ہاشم رضا، پروفیسر سردار نقوی، ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، سبیح الحسن ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر نیر مسعود، ڈاکٹر منظر حسین کاظمی، ڈاکٹر سید حسن رضوی مولانا مرتضیٰ حسین فاضل، پروفیسر محمد رضا کاظمی، ڈاکٹر شکیل رضا کاظمی کے علاوہ قومی اخبارات و جرائد سے دستیاب ہونے والی آرا کو نمایاں رکھا گیا ہے۔ سید ہاشم رضا کا یہ جملہ تاریخی ہے کہ "آپ نے ہمارے دور کے سب سے بڑے شاعر جناب جوش ملیح آبادی کے مرثیے ترتیب دے کر اردو ادب کی گراں بہا خدمت کی ہے۔ آپ کی تحقیق اور محنت دونوں قابلِ داد ہیں"۔

پروفیسر سردار نقوی اس تالیفی کام کو ادبی جہاد قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی کا یہ کہنا درست ہے کہ "جوش کی انفرادیت اور ضمیر اختر نقوی کی دیدہ ریزی" دونوں ادب کا قیمتی سرمایہ ہیں، سید سمیع الحسن نے اسی تالیف سے مہمیز پا کر جوش کے مرثیے انگریزی کے قالب میں ڈھالنے کا عظیم فیصلہ کیا۔ اسی طرح ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری نے اس کتاب کو ایم اے اردو کے نصاب میں داخل کیا اس طرح اس کتاب کی راہ سے علامہ ضمیر اختر بھی اعلیٰ سطحی نصابات و دائرہ تحقیق کا موضوع قرار پائے۔ ڈاکٹر نیر مسعود کا اظہاریہ "حسنِ ترتیب" کے عنوان سے "ضمیرِ حیات" کی زینت ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ یہ مجموعہ عمدہ مرثیوں کا ہی نہیں اعلیٰ معیار کی شاعری کا بھی نمونہ ہے۔ ڈاکٹر منظر حسین کاظمی کا شاملِ کتاب مقالہ ثابت کرتا ہے کہ "جوش ملیح آبادی کو مرثیہ نگار ثابت کرنے میں ضمیر اختر صاحب کا بڑا ہاتھ ہے"۔ ڈاکٹر سبطِ حسن رضوی کے دلائل کا نچوڑ یہ ہے کہ رثائی ادب کی تاریخ و تحقیق میں پاکستان کے جواں سال ادیب اور خطیب ضمیر اختر نے جو کام کیا ہے وہ قابلِ توجہ اور لائقِ تحسین ہے۔ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل کی نظر میں یہ تحقیقی کتاب مرتب کر کے ضمیر اختر نقوی نے جدید مرثیے پر کام کرنے والے اسکالرز کے لئے نئی راہیں معین کر دی ہیں۔ ڈاکٹر محمد رضا کاظمی نے اسے اہم تحقیقی اور تاریخی کارنامہ سمجھا ہے جبکہ ڈاکٹر شکیل رضا کاظمی نے اس کتاب کے حوالے سے بعض منفرد باتیں نقاط وار پیش کی ہیں۔

آرٹس کونسل کی اس تاریخی تقریبِ اعتراف و تحسین کا مفصل احوال بھی "ضمیرِ حیات" میں الگ سے ملے گا جو علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی دینی، علمی، ادبی و تحقیقی خدمات کے سلسلے میں میر انیس اکیڈمی اور آرٹس کونسل کے اشتراک سے انعقاد پذیر ہوئی۔ اسی طرح ناصر رضا رضوی کے کاشانے پر منعقدہ محفل کی مکمل تصویر بھی کھینچ دی

گئی ہے۔ مولانا سید محمد رضا شبر نے علامہ صاحب کو ملنے والے بین الاقوامی دولت مشترکہ ایوارڈ لندن کا تعارف تفصیل سے کروایا ہے اور پروفیسر سحر انصاری صدر شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی نے "اعتراف و تحسین" کے عنوان سے لکھے جانے والے اس مسدس کی کمل کروادی ہے جو قسیم امروہوی نے علامہ صاحب کی حیات اور کارناموں کو تخلیقی تجربہ بناتے ہوئے تحریر کیا ہے۔ قسیم امروہوی کے اس مسدس کی جان ان چند بندوں میں ملاحظہ کی جاسکتی ہے۔

مغربی ملکوں میں جب پڑھنے مجالس پہنچے کیں وہ تقریریں ملی داد انہیں غیروں سے
نجی محفل میں جو عیسائی ادیب آنے لگے شمع افکار انہیں یہ جلا کر بیٹھے
اللہ اللہ ضمیر آپ کا یہ پایا ہے
مرثیہ قاری انجیل سے پڑھوایا ہے

کبھی ایسا بھی ہوا پہنچے جو مجلس میں ضمیر کسی نے دے دیا موضوع برائے تقریر
اس کی فی الفور بیاں کردی مناسب تفسیر مجلسیں ایسی ہیں تخلیق نہیں جس کی نظیر
یہ سلیقہ کسی آقا سے نہ آغا سے ملا
ذکر برجستہ کا فن نہج بلاغہ سے ملا

ہر اک عنوان کو منبر سے جلا دیتا ہے شعر پڑھتا ہے تو منظر یہ دکھا دیتا ہے
رنگ الفاظ سے تصویر بنا دیتا ہے پھر اسے طاق سماعت میں سجا دیتا ہے
سن کے احباب یہ کہتے ہیں کہ جوشیلا ہے
جو حسد کرتے ہیں ان کے لئے زہریلا ہے

اے قسیم اب سفر خامہ کرو ختم یہیں حرف آخر ہو وہ مقطع نظر آئے جو حسیں
بیت کا دوسرا مصرع ہو نشان تمکیں جس سے تاریخ برآمد ہو برائے تحسیں

ایک آئینۂ اوصاف نسب ہیں یہ ضمیر
اک خطیب، اہلِ قلم، اوجِ ادب ہیں یہ ضمیر

علامہ ضمیر اختر نقوی کو جن تخلیق کاروں نے منظوم خراجِ تحسین پیش کیا ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور یہ سرمایہ ایک الگ کتاب کا متقاضی ہے۔ "ضمیر حیات" میں صرف نسیم امروہوی، ساغر لکھنوی، تاثیر لکھنوی، نجم فتح پوری، شاہد نقوی، رہبر ہاشمی، اقبال ظفر، ذیشان حیدر، دُرحسن جلالوی، سیف حسن پوری، یکتا امروہوی، حسن کاظمی (لاہور)، اقبال حسین، ذکی کاظمی، حسن لکھنوی، نیر مجیدی، مظہر نجفی، ظلِ صادق، محسن نقوی، علی انصر، ظہیر نفسی، ڈاکٹر ظفر ہاشمی، علی اظہر رضوی، عباس صادق جعفری، ظہور مہدی، محشر لکھنوی، علامہ شبیہ الحسن رضوی، آصف رضا رضوی، کمال حیدر اور قمر عباس قمر عظیم آبادی کی منظومات شامل کی گئی ہیں یہاں مشتے از خروارے کے مصداق ڈاکٹر ماجد رضا عابدی کے کلام سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجیے۔

قلزمِ اوجِ معانی کا کنارا ہیں ضمیر   ادب و علم کا بہتا ہوا دھارا ہیں ضمیر
دورِ رفتہ کی خطابت کا نظارا ہیں ضمیر   بیتِ حیدرؑ پہ جو اُترا تھا وہ تارا ہیں ضمیر

بیتِ حیدر کو جو چوما تو سند پائی ہے
اس لیئے ان کی خطابت میں توانائی ہے

شوکتِ فکر کے مظہر بھی ضمیر اختر ہیں   لفظ و معنی کا سمندر بھی ضمیر اختر ہیں
مدحتِ آلؑ کے محور بھی ضمیر اختر ہیں   یعنی منبر کے دلاور بھی ضمیر اختر ہیں

خنجرِ فکر و تخیل نے جگر کاٹ دیئے
جنگِ حیدرؑ جو پڑھی تارِ نظر کاٹ دیئے

دورِ حاضر کی خطابت پہ ہے فیضانِ ضمیر   یعنی اک زندہ حقیقت ہے دبستانِ ضمیر

فلکِ علم کے تارے ہیں محبانِ ضمیر　　ماجد عابدی میں بھی ہوں ثناخوانِ ضمیر

میرا اسلوب اسی سیفِ زبانی کا اسیر
میرا ادراک اسی زمزمہ دانی کا اسیر

علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی مدظلہ العالی کی خطابت کے فن پر اہلِ علم ہستیوں کے علاوہ اُن سامعین و حاضرین نے بھی قلم اٹھایا ہے جو دنیا بھر میں ان کے خطاب کے دوران انفرادی زاویے محسوس کرتے ہیں۔ "ضمیرِ حیات" سے پہلے خطیب الکوثر کے زیرِ عنوان ندیم شبلی ایڈووکیٹ کی مرتب کردہ کتاب پہلے بھی مطالعے کی درک رکھنے والوں سے داد و تحسین کے ڈونگرے وصول کر چکی ہے۔

ضخامت بڑھ جانے کے باعث تکرارِ تالیف سے گریز کر کے "ضمیرِ حیات" میں علامہ صاحب کی خطابت سے متعلق سنجیدہ مقالات اور طویل اظہاریے ہی شامل کیے گئے ہیں۔ اس حوالے سے قلم کا قرض ادا کرنے والوں میں مرزا اشفاق حسین شوق لکھنوی، صادق امام، مسعود حسین زیدی، ماجد رضا عابدی، شجاع رانا، ممتاز زیدی، سید محمد عباس اور اعجاز ثقلین بخاری کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ جن میں ناقدین نے علامہ صاحب کے معیارِ زبان، تبحرِ علمی، ذکرِ مصائب، عنوانات عشرہ، خطابت کے آغاز و ارتقا کے مختلف زاویوں اور رنگوں کو اپنی گفتگو کا محور و مرکز رکھا ہے۔ اسی حصے میں علامہ صاحب کی مجالس کے آڈیو و ویڈیو کیسٹس اور ویب سائٹس کے سلسلے کی معلومات بھی فراہم کردی گئی ہیں۔

بطور صحافی علامہ صاحب کی خدمات کا بڑا حصہ "القلم" جیسے علمی، ادبی تحقیقی اور ثقافتی مجلّے کے ذریعے سامنے آیا ہے اس لیے "ضمیرِ حیات" میں ان کی طرزِ صحافت پر ایس اے ایچ نقوی، سجاد شبیر، بکرم لکھنوی، فضل فتحپوری، شفیع عقیل، حسن عابدی، ڈاکٹر سید

اک آئینۂ اوصافِ نسب ہیں یہ ضمیر
اک خطیب، اہلِ قلم، اوجِ ادب ہیں یہ ضمیر

علامہ ضمیر اختر نقوی کو جن تخلیق کاروں نے منظوم خراجِ تحسین پیش کیا ہے ان کی تعداد بہت زیادہ ہے اور یہ سرمایہ ایک الگ کتاب کا متقاضی ہے۔ "ضمیر حیات" میں صرف تسیم امروہوی، ساغر لکھنوی، تاثیر لکھنوی، نجمن فتح پوری، شاہد نقوی، رہبر ہاشمی، اقبال ظفر، ذیشان حیدر، دُر حسن جلالوی، سیف حسن پوری، یکتا امروہوی، حسن کاظمی (لاہور)، اقبال حسین، ذکی کاظمی، حسن لکھنوی، نیر مجیدی، مظہر نجفی، ظل صادق، محسن نقوی، علی افسر، ظہیر نفسی، ڈاکٹر ظفر ہاشمی، علی افسر رضوی، عباس صادق جعفری، ظہور مہدی، محشر لکھنوی، علامہ شبیہ الحسن رضوی، آصف رضا رضوی، کمال حیدر اور قمر عباس قمر عظیم آبادی کی منظومات شامل کی گئی ہیں یہاں مشتے از خروارے کے مصداق ڈاکٹر ماجد رضا عابدی کے کلام سے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے۔

قلزمِ اوجِ معانی کا کنارا ہیں ضمیر — ادب وعلم کا بہتا ہوا دھارا ہیں ضمیر
دورِ رفتہ کی خطابت کا نظارا ہیں ضمیر — بیتِ حیدرؑ پہ جو اُترا تھا وہ تارا ہیں ضمیر

بیتِ حیدر کو جو چوما تو سند پائی ہے
اس لیئے ان کی خطابت میں توانائی ہے

شوکتِ فکر کے مظہر بھی ضمیر اختر ہیں — لفظ ومعنی کا سمندر بھی ضمیر اختر ہیں
مدحتِ آل کے محور بھی ضمیر اختر ہیں — یعنی منبر کے دلاور بھی ضمیر اختر ہیں

خنجرِ فکر و تخیل نے جگر کاٹ دیئے
جنگِ حیدرؑ جو پڑھی تارِ نظر کاٹ دیئے

دورِ حاضر کی خطابت پہ ہے فیضانِ ضمیر — یعنی اک زندہ حقیقت ہے دبستانِ ضمیر

فلکِ علم کے تارے ہیں محبانِ ضمیر ماجد عابدی میں بھی ہوں ثناخوانِ ضمیر

میرا اسلوب اسی سیف زبانی کا اسیر

میرا ادراک اسی زمزمہ دانی کا اسیر

علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی مدظلہٗ العالی کی خطابت کے فن پر اہلِ علم ہستیوں کے علاوہ اُن سامعین و حاضرین نے بھی قلم اٹھایا ہے جو دنیا بھر میں ان کے خطاب کے دوران انفرادی زاویے محسوس کرتے ہیں۔ "ضمیرِ حیات" سے پہلے خطیب الکوثر کے زیرِ عنوان ندیم شبلی ایڈوکیٹ کی مرتب کردہ کتاب پہلے بھی مطالعے کی ورک رکھنے والوں سے دادو تحسین کے ڈونگرے وصول کر چکی ہے۔

ضخامت بڑھ جانے کے باعث تکرارِ تالیف سے گریز کر کے "ضمیرِ حیات" میں علامہ صاحب کی خطابت سے متعلق سنجیدہ مقالات اور طویل اظہاریے ہی شامل کیے گئے ہیں۔ اس حوالے سے قلم کا قرض ادا کرنے والوں میں مرزا اشفاق حسین شوق لکھنوی، صادق امام، مسعود حسین زیدی، ماجد رضا عابدی، شجاع رانا، ممتاز زیدی، سید محمد عباس اور اعجاز ثقلین بخاری کے اسمائے گرامی آتے ہیں۔ جن میں ناقدین نے علامہ صاحب کے معیارِ زبان، تبحرِ علمی، ذکرِ مصائب، عنوانات عشرہ، خطابت کے آغاز و ارتقا کے مختلف زاویوں اور رنگوں کو اپنی گفتگو کا محور و مرکز رکھا ہے۔ اسی حصے میں علامہ صاحب کی مجالس کے آڈیو وڈیو کیسٹس اور ویب سائٹس کے سلسلے کی معلومات بھی فراہم کر دی گئی ہیں۔

بطور صحافی علامہ صاحب کی خدمات کا بڑا حصہ "القلم" جیسے علمی، ادبی تحقیقی اور ثقافتی مجلّے کے ذریعے سامنے آیا ہے اس لئے "ضمیرِ حیات" میں ان کی طرزِ صحافت پر ایس اے ایچ نقوی، سجاد شبیر، بکرم لکھنوی، فضل فتحپوری، شفیع عقیل، حسن عابدی، ڈاکٹر سید

جعفر رضا، ڈاکٹر سیادت نقوی اور سید ظہور مہدی کے مقالات، مراسلات اور تبصروں میں آپ کو اقلیم کے شاروں کی تاریخی حیثیت متعین کرنے میں علامہ صاحب کی کاوشوں کی تفصیلات مہیا ہو سکیں گی۔

''ضمیرِ حیات'' کا ایک معتد بہ حصہ علامہ صاحب کی شاعری پر ناقدین کے تنقیدی مقالات سے ترتیب دیا گیا ہے جس میں ناقدین نے علامہ ضمیر اختر نقوی کی مرثیہ نگاری کے جائزے کا پہلو غالب رکھا ہے البتہ دیگر اصناف میں بھی علامہ ضمیر اختر نقوی کے شعری رجحانات کو فراموش نہیں کیا۔ اس حصے میں سلطانہ ذاکر ادا، ڈاکٹر محمد رضا، سید افضال حسین، ڈاکٹر سردار زیدی اور محمد عباس نقوی کے مقالات یکجا ہوئے ہیں جن کے مطابق علامہ صاحب نے ابتداء سے مرثیے پر گرفت رکھی ہے اور تمام محاسنِ شعری اپنے مراثی میں یکجا کر دیئے ہیں۔ علامہ صاحب کے ایک مرثیے ''سلیمانِ امامت'' کے بارے میں کیلیفورنیا امریکا میں مقیم سلطانہ ذاکر ادا کا کہنا یہ ہے کہ علامہ صاحب نے پینسٹھ بندوں میں طویل موضوع سمیٹ کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ معروف جدید مرثیہ نگار اور مرثیے کے ایک مقبول عشرے کے بانی شاعر کلیم آلِ عبا شاہد نقوی کا بیان ہے کہ کہاں مولانا جیسا فاضل رجل، عظیم محقق، مصنف اور مقرر اور کہاں مجھ جیسا معمولی شاعر۔

چہ نسبت خاک را با عالمِ پاک

علامہ صاحب نے مدحتِ سیدۃ نساء العالمین کا جو مرثیہ ''فاطمۃ الزہرا کا گھر'' کے عنوان سے کہا ہے اس کو فضل فتحپوری نے ایسا مرثیہ خاص کہا ہے جس کا لہجہ نہایت نفیس، پُر اثر اور حسنِ بیان کا حامل ہے یاد رہے کہ علامہ صاحب کا پہلا مرثیہ ''معجزہ'' اکیاسی بند کا، دوسرا سلیمانِ امامت پینسٹھ بند کا، تیسرا فاطمہ زہرا کا گھر یا بیت معمور جدید اردو

مرثیے کی روایت میں اس انداز کا اضافہ ہیں کہ ان میں تاریخی حقائق بھی تخلیقی تجربہ بنے ہیں لہذا تخلیقی حوالے سے بھی علامہ صاحب اپنے قارئین کے تاریخی شعور کو بہت کچھ نیا عطا کر رہے ہیں۔

''سید حسین شرف الدین شاہ ولایت حالات و کرامات'' علامہ ضمیر اختر نقوی کے میدان تصوف سے مکمل آگاہی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ ''ضمیر حیات'' میں اس حوالے سے سید کمال نفیس اور عباس نقوی کے مقالے اس تصنیف کا تعارف کرواتے ہیں سید کمال نفیس نے یوم شاہ ولایت پر منعقدہ محافل وذکر و سماع کا احوال بھی رقم کیا ہے جو حسب سالہائے گذشتہ منایا جاتا ہے۔ کمال نفیس بتاتے ہیں کہ اس کتاب میں حضرت شاہ ولایت کے علاوہ حضرت نظام الدین اولیا، علامہ حلی، حضرت شیخ سعدی اور حضرت امیر خسرو جیسی عظیم روحانی شخصیات کی حیات اور کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ عباس نقوی کا خیال ہے کہ یہ بھی علامہ صاحب کی دیگر تصنیفات و تالیفات کی طرح تحقیقی جواہر سے آراستہ کتاب ہے۔

''انیس و دبیر'' کے عنوان سے ''ضمیر حیات'' کے آخری حصے میں وہ گوشہ لایا گیا ہے جس میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، پدم شری علی جواد، ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری اور پروفیسر ڈاکٹر سلیم اختر کے وہ اظہاریے شامل کیے گئے ہیں جو انیس و دبیر پر علامہ ضمیر اختر نقوی کی الگ الگ تالیفات کا محاکمہ کرتے ہیں۔ لکھنؤ کے علی جواد زیدی نے رباعیات انیس کی تدوین کے ضمن میں ضمیر اختر نقوی کے تحقیقی کام کو سراہا ہے واضح رہے کہ علامہ ضمیر اختر نقوی کے مرتب کردہ اشاریے بعنوان ''کلید گنجینۂ انیس'' میں انیس کی کہی ہوئی پانچ سو چون رباعیات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ بھوپال کے پروفیسر عبدالقوی دسنوی نے انیسیات کے تناظر میں علامہ ضمیر اختر نقوی کے لئے ''انیس نما''

کا خطاب تجویز کیا ہے اسی طرح ڈاکٹر اکبر حیدری نے ماہِ نو کے انیس نمبر ۱۹۷۲ء کے لئے علامہ صاحب کی کاوشوں کو نظر میں رکھتے ہوئے عنوان مقالہ میں یہ بات لکھی ہے کہ راقم ضمیر اختر نقوی صاحب کو اس کام کے لئے دل سے ماہر انیسیات تسلیم کرتا ہے، اسی طرح انہوں نے ایک اور مقالے میں ۱۹۷۵ء کے ماہِ نو ہی کے دبیر نمبر کے لئے علامہ صاحب کی مساعی کے پیش نظر آغاز مقالہ ہی میں لکھ دیا ہے کہ "ضمیر اختر نقوی نے مرزا دبیر کی زندگی کے بعض تاریک پہلوؤں کو مستند حوالوں سے اجاگر کیا ہے"۔

مذکورہ انیس نمبر پر ڈاکٹر سلیم اختر کے تبصرے میں بتایا گیا ہے کہ علامہ صاحب کے فراہم کردہ بیشتر مقالات کا انداز تشریحی اور توضیحی ہے اور ان کے مطالعے سے کلام انیس کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ہی نہیں پڑتی بلکہ کئی نئے گوشے بھی اجاگر ہوتے ہیں۔

"ضمیر حیات" کا آخری گوشہ بھی جواہرات سے خالی نہیں ہے کہ اس میں اخبارات و رسائل میں آنے والے ذکر ضمیر اختر کے تراشے بڑی کاوش سے فراہم کر کے اس کتاب کی زینت بنا دیئے گئے ہیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی نے "انجمن یادگارِ انیس" کے قیام میں جس طرح حصہ لیا اس کا احوال پروفیسر سردار نقوی کا تحریر کردہ ماہنامہ جام جم جون ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا۔ یہ تراشہ مرکز علوم اسلامیہ کے نوجوانوں نے دہائیوں کی گرد جھاڑ کر ڈھونڈ نکالا ہے۔ جس سے پتہ چلتا ہے کہ علامہ ضمیر اختر کے بنا کردہ اس ادارے کے سرپرست فیض احمد فیض صدر پروفیسر کرار حسین، نائب صدر صابر تھاریانی معتمد تسیم امروہوی، شریک معتمدین ڈاکٹر یاور عباس اور ضیاالحسن موسوی اور مجلس مشاورت کے اراکین منظر کاظمی، ڈاکٹر احسن فاروقی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، پروفیسر ممتاز حسین، علی مظہر رضوی، سردار نقوی اور ذوالفقار بخاری منتخب ہوئے تھے۔ سعید حسنین عابدی کی جانب سے ہفتہ وار سرخی لکھنؤ

میں ۵ مئی ۱۹۸۱ء کو چھپنے والی رپورٹ فراہم ہوئی ہے جس کے مطابق خطیب ایمان، ضیغم پاکستان عالی جناب سید ضمیر اختر نقوی کے اعزاز میں ایک استقبالیہ کا اہتمام کیا گیا جس میں ہزاروں مومنین نے شرکت فرمائی۔ اسی طرح جوش کی دوسری برسی پر ملیح آباد میں جسٹس مرتضیٰ حسین کی صدارت میں جو سیمینار ہوا اس میں دیے گئے علامہ ضمیر اختر کے اس بیان کو روزنامہ قومی آواز نے شہ سرخی بنایا کہ جوشؔ نے اردو شاعری کی بے نمکی کو ختم کردیا۔ ۱۹۹۵ء میں علی حیدر ملک نے کراچی کا ادبی منظر تحریر کرتے ہوئے اخبار جہاں میں ایک تقریب اعتراف و تحسین کی تفصیلات شامل کیں جو "شعرائے اردو اور عشق علیؑ" کے حوالے سے منعقد ہوئی تھی۔ روزنامہ "ان دنوں" لکھنؤ نے ۶، اگست ۱۹۹۷ء کو حسینی فاؤنڈیشن کے زیر اہتمام ہونے والی مجلس ایصال ثواب برائے مولانا سید محمد ذکی مرحوم کے احوال میں علامہ ضمیر اختر کی شرکت اور خطاب کو بطور خاص موضوع بنایا یہ تراشا بھی "ضمیر حیات" کے آخری صفحات کی زینت ہے اس سے اگلے ماہ ایک بڑی تقریب میں علامہ صاحب نے تاریخی یادگاروں کے تحفظ پر زور دیا اور مزار انیس کی زبوں حالی پر افسوس کا اظہار کیا جسے "قومی آواز" نے سرخی کے ساتھ شائع کیا۔

انہی دنوں پروفیسر نیر مسعود کو صدارتی ایوارڈ ملنے کی تقریب علامہ ضمیر اختر نقوی کی صدارت میں ہوئی جسے روزنامہ صحافت نے اہم خبروں میں شامل رکھا۔ اس اخبار نے علامہ صاحب کو دیے جانے والے اس استقبالیہ کو بھی اداریے کا موضوع بنایا جس کا اہتمام ادارہ دبستان مرثیہ خوانی لکھنؤ نے کیا تھا۔ اس محفل کا احوال قومی آواز میں بھی شائع کیا گیا۔ یہ تراشے "ضمیر حیات" کے آخری حصے میں شامل ہیں اور شفیع عقیل کے وہ تبصرے بھی جو علامہ صاحب کی تصانیف پر وقتاً فوقتاً شائع ہوتے رہے۔ محمد علی کاظم

نے علامہ ضمیر اختر کی ملتان آمد پر توسیعی لیکچر اور محفل مسالمہ کا ذکر ایک تفصیلی مضمون میں کیا جو روزنامہ خبریں ملتان کی ۲۸، اپریل ۲۰۰۳ء اشاعت میں شامل ہوا اسے بھی کتاب کے اسی حصے میں شامل کر لیا گیا ہے۔ ضیغم رضوی نے آسمانِ خطابت کے آفتاب علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کے لئے ادارہ کرائم نیوز کے حسینؑ ایڈیشن کے حوالے سے تعاون پر اظہار تشکر کا تراشا فراہم کیا ہے۔ سید اعجاز ثقلین بخاری نے لاہور سے ہفت روزہ شہید لاہور کے ماہ جولائی کے چند تراشے ارسال کیے جو یوم امام حسنؑ کے حوالے سے علامہ صاحب کے خطاب کی تفصیلات پر مبنی ہیں۔ عباس نقوی نے فن خطابت کے اسرار و رموز پر جو مکالمہ علامہ ضمیر اختر سے کیا وہ مجلہ "فکرِ زینبؑ" میں چھپا یہ مکالمہ آپ انہی آخری صفحات میں موجود پائیں گے اور وہ مکالمہ بھی جو ان کا "جنت البقیع چند تاریخی حقائق" کے عنوان سے ہے اور اخبار ندائے حق کا سال ۲۰۰۲ء کے آخری روز کی اشاعت کا حصہ بنا اور وہ گفتگو بھی جو عباس اور علامہ صاحب کے مابین آدابِ عزاداری پر ہوئی اور ۴، مارچ ۲۰۰۳ء کو مذکورہ اخبار میں شائع ہوئی ایک اور خصوصی گفتگو بھی عباس نقوی کی جانب سے فراہم ہوئی ہے جو شہادتِ مولا علیؑ کے حوالے سے علامہ صاحب کی ہے اور ۲۲ نومبر ۲۰۰۲ء کو ندائے حق ہی میں چھپی ہے۔

جیو ٹی وی اور جنگ فورم میں علامہ ضمیر اختر اکثر اظہار خیال فرماتے رہتے ہیں "ضمیرِ حیات" کے آخر میں فورم کے میزبان محمد اکرم خان کی تحریر میں وہ مکالمہ شامل کیا گیا ہے جو "روشن خیال پاکستان اور مذہبی انتہا پسندی" کے موضوع پر ہوا تھا اور جس میں علامہ صاحب کے علاوہ ارجمند رحیم، طلعت حسین، ڈاکٹر طاہر، شاہد خان، روبینہ اشرف، اسد اللہ بھٹو، اکرام الحق، سید امیر احمد، شاہد محمود، سعید خان، عالیہ نثار، زاہد فاروق، شاہد نواب، شازیہ خان ڈاکٹر ہیر العل، سید زیاد احمد اور نگہت چوہدری بھی

شریک تھے۔

"ضمیرِ حیات" کے آخری صفحات پر فیصل آباد کے ندیم شبلی ایڈووکیٹ کا انتخاب خطوط ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری بنام علامہ ضمیر اختر نقوی، ملتان کے شاہد ملک کا مفصل احوال انیس سیمینار، لاہور سے وحید الحسن ہاشمی کا علامہ صاحب کی تصنیف سوانح حضرت جعفر طیار پر تبصرہ مطبوعہ پیام عمل، چوہدری تبسم نواز احمد کا مراسلہ بسلسلہ "مجالس ترابی" مرتبہ علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی، سید کمال حیدر کا تبصرہ برائے تصنیف علامہ صاحب بعنوان شہید علمائے حق بھی خاصے کی تحریریں ہیں۔

انشاء اللہ آپ "ضمیرِ حیات" میں توازن عنوانات کی داد اس کتاب کے مطالعے کے بعد ضرور دینا چاہیں گے اگر ایسا ہو تو مرکز علوم اسلامیہ کو خون تازہ کی سبیل فراہم کرنے والے نوجوانوں کو دعا دیجیے گا اور اگر کچھ کوتاہیوں پر اظہار خیال کرنا چاہیں تو مجھ ہیچمداں کا دامن تھامیے گا کہ "ضمیرِ حیات" کی تدوین و ترتیب کے خانے میں پیشانیٔ کتاب پر میرا ہی نام لکھا ہے البتہ یہ ضرور پیش نظر رکھیے گا کہ مدیر کوئی بھی ہو کسی بھی مجلّے یا اخبار کو اس کے موضوعات اور کارکنان کی محنت منفرد بناتی ہے کارکنان کی محنت و کاوش آپ کے ہاتھوں میں ہے اور کتاب کا موضوع پہلے ہی جوشؔ صاحب نے ایسی شخصیت کو قرار دے رکھا ہے جو تحقیقی، دینی، علمی، ادبی، آفاق کا جگمگاتا سورج ہے یعنی علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی اور ظاہر ہے ان کے اعیان و افکار پر کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔

"ضمیرِ حیات" کے حوالے سے باتیں ہو چکیں اب میں آپ سے کہ آپ دنیا کے کسی بھی خطے میں رہتے ہیں، کسی بھی مذہب کے ہیں اور کوئی بھی زبان بولتے ہیں، یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ایک بار صرف ایک بار پاکستان کے لکھنؤ ملتان میں آکر "ضمیرِ حیات

ناطق" کا عروج آشنا اور معرفت بھرا خطاب ضرور سنیں جہاں کے ہزاروں پر مشتمل مجمعوں میں حاضرین کی دل سے شرکت، تفہیم کا انداز علامہ صاحب کی جولانی طبع میں کچھ ایسے ان دیکھے اور ان سنے عناصر کی شمولیت کا ماحول ضرور بنا دیتا ہے جو "ضمیر حیات" کے ان صفحات میں زیر بحث نہیں آسکے اور آ بھی نہیں سکتے البتہ اس ماحول کو تھوڑا سا قریب لانے کے لئے میں آپ کو ملتان اور نواح کی چند مجالس میں لیئے چلتا ہوں جو گذشتہ دو برسوں میں انعقاد پذیر ہوئیں اور جن کے بعد سے سینکڑوں نوجوان عقیدت مندان کے لیئے دیدہ و دل فرشِ راہ کیے رہتے ہیں۔ بزرگانِ قوم اور روسائے ملت علامہ صاحب سے ماہ بہ ماہ کے خطابات میں کس قدر متاثر ہیں اس کی تفصیل ڈاکٹر ماجد رضا عابدی نے کتاب کے مقدمے میں دی ہے۔

گذشتہ سے پیوستہ برس جب کہ میں اسلام آباد میں پی ایچ ڈی کا تحقیقی مقالہ جمع کروانے کے بعد زبانی امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھا عین اسی رات جبکہ مجھے اسلام آباد روانہ ہونا تھا علامہ صاحب کے خطاب کا علم ہوا جو" قافلہ امام عالی مقام کی مدینے سے روانگی" کے موضوع پر تھا یہ سوچ کر کہ طویل سفر ہے ابتدائیہ سن کر ہی سفر اختیار کرلوں گا مگر علامہ صاحب کے خطاب کی تاثیر اور مجمع کا عالم وجد دیکھ کر رُک گیا اور خطاب کے آخر تک ہلنے کی ہمت نہ ہوئی۔ اس تاخیر کی کسر مجلس کے بعد فیصل آباد سے آئے ہوئے علامہ صاحب کے معتقد ندیم شبلی ایڈوکیٹ نے اپنی تیز رفتار ڈرائیونگ سے نکالی یہ تاخیر اگر واقع ہو جاتی تو میں امتحان کی اس اہم منزل سے کامیاب نہ گزر سکتا۔ وہ دن اور آج کا دن اس خطے میں ان کے کسی خطاب سے غیر حاضری ہونے نہیں پائی اس دوران علامہ صاحب کے حیران کن اسالیب خطابت سے آشنائی حاصل ہوئی کہ جن کی بدولت جاہل، عالم، بچہ، بڑا، امیر، غریب غرض ہر کوئی یہ

خواہش کرنے لگتا ہے کہ دیکھیں اگلے خطاب میں علامہ صاحب کا موضوع کیا ہوتا ہے اور وہ اسے کس طرح گرفت میں لاتے ہیں اور اگلے خطاب میں یہی خواہش عود کر آتی ہے۔

گذشتہ برس محرم کے بعد کے نیم عشرے میں علامہ صاحب نے اردو غزل کو موضوع قرار دیا عام خیال یہ تھا کہ دینی محفل میں یہ موضوع کس طرح تاثیر پیدا کر سکتا ہے مگر میں ہی کیا پورا مجمع حیرانی کے باوجود داد دینے پر مجبور تھا کہ ادب کی اس قدیم صنف سخن کا ربط کس خوبصورتی سے مجلس کے موضوعات سے ملا ہوا ہے۔ ایک مجلس سن کر ہی میں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ یہ شخص جو ہر طبقۂ فکر پر غالب آنے اور ہر فوری موضوع پر اظہار کی قدرت رکھتا ہے اس کا ایک لیکچر یہاں کی یونیورسٹی کے طلبہ و طالبات کو ضرور سننا چاہیے۔ علامہ صاحب سے ڈرتے ڈرتے اس ارادے کا ذکر کیا تو انہوں نے اگلی مجلس میں خود اعلان فرما کر بے پناہ حوصلہ افزائی کی۔ اگلے ہی روز بہاء الدین زکریا یونیورسٹی کے شہر میں واقع ایک پوسٹ گریجویٹ سنٹر میں لیکچر تھا۔ وقت سے پہلے ہی ان کے عقیدت مندوں سے سنٹر کھچا کھچ بھر گیا اور کالج انتظامیہ کو یہ فکر پڑ گئی کہ طلبہ و طالبات علامہ صاحب کے لیکچر کو اپنے محدود گنجائش کے لیکچر روم میں کیسے سن سکیں گے جبکہ عوام الناس کی تعداد اُن سے زیادہ ہے اور یہ فکر بھی دامن گیر ہونے لگی کہ ایک مخصوص مسلک فقہ سے تعلق کہیں اس ماحول پر منفی اثر انداز تو نہیں ہو جائے گا پہلے مسئلے کا حل لیکچر کو ہال میں Arrange کر کے نکالا گیا دوسرے کی طرف دھیان ہی نہیں گیا کہ علامہ صاحب نے ادب کے دبستانوں پر گفتگو کرتے ہوئے تمام مسالک کی کتب سے حوالے دیئے اور انداز آفاقی رکھا۔ اہل جامعہ اب بھی اس نظارے کی تکرار کے لئے ترستے ہیں جانے کب اس کا موقع فراہم ہوتا ہے البتہ علامہ صاحب کے ملتان میں ایک تسلسل سے خطاب ہوتے دیکھ کر ہم نے ایک بار پھر علامہ صاحب کو

اردو مرثیے کے ارتقاء کا موضوع دے دیا اور سفارش کے لئے ڈاکٹر ماجد رضا عابدی کو بھی ساتھ ملا لیا۔ اب کی بار ایک وسیع جگہ کا انتخاب کیا گیا اور وہ تھی بارگاہ حیدریہ کا دائرہ نما ہال جس میں سینکڑوں لوگ سما سکتے تھے لیکن جب خطاب کا وقت آیا تو مجمع کی تعداد اس تخمینے سے تجاوز کر گئی اور ہزاروں لوگوں کو ڈاکٹر ماجد رضا عابدی اور علامہ صاحب کی تقاریر صحنِ مسجد، صحنِ علم اور احاطہ بارگاہ سے باہر کھڑے رہ کر سننا پڑیں۔

ایک یادگار مجلس میں موضوع پر علامہ صاحب کی گرفت یوں دیکھی کہ فضائل کے دوران علامہ صاحب کا ہاتھ بلند تھا اور جملہ جاری نعرے لگ رہے تھے ہاتھ کے نیچے آنے تک جملے کی کیفیت اور مجمع کا ماحول تحسین ایک ثانیے میں گریہ کا ماحول بن چکا تھا۔

نواح ملتان کی ایک مجلس سابق اسپیکر قومی اسمبلی سید فخر امام کے مستقر قتال پور میں ہوئی انہی کی گاڑی ملتان سے علامہ صاحب کو لینے کے لئے آئی میں پچھلی سیٹ پر گن مین کے ساتھ بیٹھا تھا جبکہ علامہ صاحب اگلی نشست پر تھے۔ ہماری گاڑی کے آگے پیچھے ملتان کے روسا گردیزی اور گیلانی صاحبان کی گاڑیاں قتال پور کو رواں تھیں ایک گھنٹے کے اس سفر کے دوران جب علامہ صاحب مجھے اپنی گفتگو سے شرف یاب کر رہے تھے اچانک ڈرائیور نے علامہ صاحب سے پوچھا "آپ خطاب کے بعد کتنی دیر قتال پور میں رُکے رہیں گے" علامہ صاحب نے گہری نظروں سے اس کی طرف دیکھ کر الٹا سوال کر دیا "تمہارے پوچھنے کا مقصد کیا ہے" وہ گھبرا کر فوراً ہی حرفِ مطلب زبان پر لے آیا کہ مجھے تسیم عباس صاحب کا خطاب بہت پسند ہے جو مجلس میں آپ کے فوری بعد شیڈول کیا گیا ہے۔ علامہ صاحب نرم ہوئے اور فرمانے لگے چائے کی نشست پر کچھ دیر تو لگے گی۔ اطمینان رکھو اگر ہمارے خطاب کے بعد تمہارا یہ ارادہ برقرار رہا تو ضرور سننا ہمارے ساتھ لگائی گئی ڈیوٹی کے لئے تمہیں مالکان کی طرف سے کوئی گلہ نہیں

آئے گا" بات آئی گئی ہوگئی اور ہم قتال پور جا پہنچے جہاں ہزاروں کے مجمع کے علاوہ علامہ صاحب کے عقیدت مند بھی ملتان، فیصل آباد، لاہور، خانیوال اور دیگر علاقوں سے آئے ہوئے تھے۔ دیہات کے مجلسی آداب کے مطابق علامہ صاحب سے قبل کے ذاکر کی ذاکری شروع ہوتے ہی علامہ صاحب کو ان کے پیچھے اسٹیج پر بٹھا دیا گیا۔ ذاکر کے پڑھتے پڑھتے شام کے سائے چھا گئے اور برقی رو میں بھی فرق آنے لگا۔ اسپیکر کی خرابی سے ذاکر کو بھی اپنے اختتام کی طرف آتے ہوئے دشواری ہوئی اور جنریٹر بھی اسپیکر کی آواز بحال نہ کر سکا واضح رہے کہ دیہی ماحول میں مجمع مخلوط ہوتا ہے اور کنبے کے کنبے اپنے بال بچوں کے ساتھ مجلس میں شرکت کرتے ہیں ایسے میں اگر اسپیکر کام نہ کرے تو مجمع میں عورتوں اور بچوں کی آوازیں مجلسی ماحول کو یکسر تبدیل کر دیتی ہیں جب ذاکر کا ان آوازوں پر بس نہ چلا تو وہ اتر گیا اور بانی مجلس نے ایک دم علامہ صاحب کے خطاب کا اعلان کر دیا یہ ماحول ظاہر ہے علامہ صاحب کے خطاب کے لئے قطعی مناسب نہ تھا کہ وہ نہایت دھیمے لکھنوی انداز میں آغاز مجلس کرتے ہیں اور اپنی نرم گفتگو سے تبدریج ماحول کو اپنی گرفت میں لیتے ہیں۔ عجیب مشکل تھی جس کا حل فیصل آباد کے ندیم شبلی نے کچھ تعارفی کلمات کہہ کر نکالنا چاہا۔ پھر خانیوال کالج کے پرنسپل کے ایماء پر میں نے اپنا کلام سنا کر لاؤڈ اسپیکر کی بحالی تک علامہ صاحب کی پیش خوانی کا شرف حاصل کیا۔ علامہ صاحب زیب منبر ہوئے تو انہیں ایک چٹ تھما دی گئی کہ شہادت امام عالی مقام کو موضوع بنایئے اور مقصد کربلا اور شہدائے راہ حق کے تعارف پر بھی کچھ اظہار خیال فرمایئے۔

علامہ صاحب جانے کس موضوع کو اس مجلس کا عنوان قرار دینے والے تھے یہ چٹ پڑھ کر مجمع سے مخاطب ہوئے اور فرمایا اگرچہ کہ یہ کئی مجالس کا موضوع ہے اور شہادت

امام عالی مقام بھی میں خاص ماحول میں صرف عاشور کے روز پڑھتا ہوں تاہم چونکہ پہلا تعارف ہے اس لئے آپ کی توقعات کا احاطہ کرنے کی کوشش کروں گا چنانچہ یہی موضوع مجلس قرار پا گیا اور علامہ صاحب کا اس نئے موضوع پر کومل سُروں اور دھیمی آواز میں خطاب شروع ہوا مجھے حیرانی ہوئی کہ مختلف اللسان عورت مرد چند ہی لمحوں میں علامہ صاحب کی طرف پوری طرح متوجہ ہو چکے تھے ابھی موضوع پر علامہ صاحب نے ایک گھنٹے کے دلائل ہی دیے تھے کہ بانی مجلس نے علاقے کے ایک مقبول ذاکر کو علامہ صاحب کے پیچھے لا بٹھایا، ہمیں حیرانی ہوئی کہ روایات اور شیڈول میں یہ تبدیلی کیسی تو ایک دوست کی سرگوشی سے پتہ چلا کہ یہ ذاکر موصوف مجمع کے پیچھے علامہ نسیم عباس کے پہلو میں بیٹھے تھے اور اب ماحول کو متاثر کرتا دیکھ کر علامہ صاحب اور نسیم عباس صاحب کے درمیان قربانی کے لئے لائے گئے ہیں خیر ایک گھنٹے سے جاری علامہ صاحب کے خطاب پر ایک گھنٹہ اور گزر گیا اور دوسری طرف مجمع تھا کہ پوری محویت کے ساتھ مصروف عبادت تھا اور علامہ ضمیر اختر سے شہادت امام عالی مقام سننا چاہتا تھا۔ ذاکر کی حالت دیدنی تھی کہ وہ ایک گھنٹے سے خطاب کے خاتمے کی آس لگائے بیٹھا تھا مگر کچھ کہہ نہ سکتا تھا کہ بانی مجلس نے علامہ صاحب کے خطاب کے دورانیے کی کوئی حد مقرر نہیں کی تھی۔ مصائب تک آتے آتے مجمع نے گریہ سے ایک منزل آگے آکر ماتم بھی شروع کر دیا تھا جب شہادت کے بیان کی منزل آئی تو اُدھر تمام مجمع کھڑے ہو کر ماتم کناں تھا اور اِدھر علامہ صاحب شہادت امام عالی مقام کا منظر بیان کر رہے تھے یہ ایک ایسا معجزنما منظر تھا جو کسی نے دنیا کی کسی مجلس میں نہیں دیکھا ہوگا۔ گریہ و ماتم کی شدت کے دوران جانے کب علامہ صاحب کا بیان ان کی بے ہوشی کے باعث رک گیا مگر گریہ و ماتم کی صدائیں انہیں مہمان خانے سہارا دے کر

لے جانے تک مسلسل آتی رہیں بعد میں کیا ہوا واللہ اعلم بالصواب۔ چائے کا وقفہ تو بہت مختصر رہا مگر حیرت کی بات یہ تھی کہ ڈرائیور (جس نے مجھے اسٹیج پر دیکھ کر پہچانا کہ وہ انٹر میں میرا شاگرد رہا ہے) حاضر تھا جب واپسی پر علامہ صاحب نے اس کے گذشتہ پروگرام کے بارے میں پوچھا تو اس نے بتایا کہ "میری سیرابی تو کیا تمام مجمع کی سیرابی آپ کے خطاب سے ہو چکی۔ ذاکر تو بغیر پڑھے اتر چکا ہے اور علامہ نسیم عباس کے خطاب میں بھی دشواری معلوم ہوتی ہے"۔

ملتان کی ابتدائی مجالس میں علامہ ضمیر اختر بعض حلقوں کی جانب سے مصائب کم اور فضائل زیادہ پڑھنے کا اعتراض وارد ہوا جس پر علامہ صاحب نے صرف اتنا کہا "پچیس کی مجلس سنئے گا" اور پچیس محرم کو آپ نے حضرت سید سجادؑ کے مصائب پورے دو گھنٹے اس انداز سے پڑھے کہ معترض حلقے بھی معتقد نظر آنے لگے، ابھی حال ہی میں ہاشم رضا گردیزی کی فرمائش پر آپ نے جشن شہزادہ علی اکبر میں مذکورہ دورانیے ہی کے فضائل پڑھے اور اعلان کیا کہ اگلی مجلس اسی موضوع کا دوسرا حصہ ہوگی جس میں صرف حضرت علی اکبرؑ کے مصائب شامل کیے جائیں گے چنانچہ اگلی مجلس میں فضائل کا حصہ علامہ صاحب کی پیش خوانی کرنے والے خطیب علامہ صاحب ناصر عباس نے بیان کیا اور علامہ صاحب نے پورے دو گھنٹے مصائب کے لئے وقف کیے رکھے اور اس انداز میں کہ مجمع کی دلچسپی گذشتہ کی طرح برقرار رہی۔ مدینۃ الاولیاء اور پاکستان کے لکھنؤ کہلوانے والے ملتان میں آج علامہ ضمیر اختر نقوی کی انفرادیت خطابت کی مقبولیت کا یہ عالم ہے کہ یہاں کے نوجوان طبقے نے بزرگوں کو مجبور کر دیا ہے کہ علاقے کے دینی مدارس کو محض فقہی مباحث کے لئے مال امام پر وقف نہ رکھا جائے بلکہ علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی کی سرپرستی میں انہیں خطابت کی تدریس کے شعبوں، ادب اور کمپیوٹر کی

تعلیم تک توسیع دی جائے۔ حال ہی میں علامہ طالب جوہری کی زیرِ قیادت چلنے والے ایک ایسے ہی دینی ادارے باب العلوم کے کارپردازان نے اس خواب کی عملی تعبیر پانے کے لئے پہلا قدم بڑھایا ہے علامہ صاحب نے بھی کمال شفقت سے ایسے مدارس کے معائنے میں ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی اور مدارس کے علما کو بہترین تجاویز سے نوازا ہے جس کی عملی صورتیں جلد ہی نمایاں ہونا شروع ہو جائیں گی۔ اسی طرح خطہ ملتان میں مطالعے کے شوق کی بیداری کی خاطر یہاں کے نوجوانوں کے ساتھ علامہ صاحب نے قدیم کتب خانوں کے دورے کیے ہیں اور توقع ظاہر کی ہے کہ جلد ہی کتاب آشنائی کی مہک نئے ذہنوں کو خوشبودار کرنے لگے گی۔

آیئے "ضمیرِ حیات" کا مطالعہ علامہ صاحب کی اس دائمی تخلیقی آواز کی جلو میں شروع کریں۔

خورشیدِ بلاغت میں ضیا ہے مرے دم سے — رنگین فصاحت کی قبا ہے مرے دم سے
تہذیب و تمدن میں جِلا ہے مرے دم سے — روشن ادب و فن کی فضا ہے مرے دم سے

کاغذ ہی پہ کیا صرف قلم میں نے رکھا ہے
معیارِ خطابت کا بھرم میں نے رکھا ہے

منبر ہے مرا تختِ مرا تاجِ علم ہے — مجلس مرا دربار ہے یہ جاہ و حشم ہے
قبضے میں مرے دولتِ قرطاس و قلم ہے — یہ اوجِ مقدر مرے مولا کا کرم ہے

یہ ملک اور اس ملک سے جو کچھ بھی ملا ہے
سب فقرِ سلیمانؑ کی غلامی کا صلہ ہے

ڈاکٹر سید ماجد رضا عابدی جنہیں علامہ سید ضمیر اختر نقوی کے سب سے قریبی شاگرد علامہ ہونے کا رتبہ حاصل ہے۔ ان کے اعیان و افکار اور تخلیقی تحقیق و تنقیدی

جہات کا ہر لحاظ سے پھیلاؤ کرنے کے قائل ہے۔علامہ ہی کی طرح مختلف شعبوں میں دلچسپی کا اظہار ان کی ذات سے ہوتا ہے۔خطابت میں انہوں نے نہایت محنت وکاوش سے ایسا انداز نکالا ہے جو علامہ صاحب کے انداز سے قطعی مختلف اور کئی حوالوں سے نئی جہات اپنے اندر لیئے ہوئے ہے تلاوت آیات قرآنی یا دعاؤں اور درود کا ورد کرتے ہوئے جو خاص لحن وہ اختیار کرتے ہیں اسے سن کر سامعین کے دل روحانیت سے معمور ہو جاتے ہیں ماجد رضا ایک پُر گو شاعر ہیں اور مرثیہ نگاری کے حوالے سے ان کا ایک مجموعہ "حریم عقل" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے یہ مرثیے وہ کراچی کے ان عشروں میں پڑھتے رہے ہیں جو بطور خاص مرثیوں کے حوالے سے قائم کیے گئے ہیں مرثیہ پڑھنے میں انکا انداز مختلف اور پُر کشش ہے۔میں نے رثائی ادب سے متعلق ان کی جو تقاریر سنی ہیں اُن میں وہ شعری مثالوں کو بہ افراط لانے کے قائل ہیں جب مجالس میں ان کی زبانی مرثیوں کے بند کے بند سنتا ہوں تو اُن کے حافظے پر حیرت بھی ہوتی ہے اور خوشی بھی اور اسی خوشی میں ایک دعا بے ساختہ دل سے نکلتی ہے کہ خدا اس سرمایۂ قوم نوجوان مقرر کی توفیقات میں مسلسل اضافہ کرتا رہے کہ آج معدودے چند مقررین ایسے ہیں جو خطاب میں شعر و ادب کو اہمیت دیتے ہیں اور جو دیتے بھی ہیں وہ شعر کو صحیح ادا کرنے پر قادر نہیں ہوتے۔علامہ ماجد رضا سیوں بند پوری صحت سے ادا کرتے ہیں۔وہ تحت میں پڑھ رہے ہوں یا لحن سے کسی لمحے بھی شعر کی تاثیر سے توجہ نہیں ہٹاتے، یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں خطاب میں شامل نکتوں کا لطف الگ ہوتا ہے اور اس پر سوا تخلیقی ادب کا ایک دبستان اپنی جھلک دکھانے لگتا ہے۔

اس طرح آیات و احادیث، علمی نکتوں، ادبی شاہ پاروں کی تقریر میں آمیزش سے وہ اپنا ایک الگ انداز بنانے میں کامیاب رہے ہیں جو صرف ان کا ہے۔

علامہ ڈاکٹر ماجد رضا عابدی کی خطابت سے ہٹ کر جو زاویہ قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ وہ منظوم شاہ پاروں کو مختلف و متنوع راگ راگنیوں میں ترتیب دے کر سامنے لاتے ہیں جس سے ان کے ناظر کا سامع ان کے لحن کا بے ساختہ اسیر ہوتا چلا جاتا ہے۔ اگر وہ صرف اس جہت ہی کو اپنی پہچان رکھتے تو دنیا بھر کے سوز خوانوں پر چھائے ہوئے ہوتے کہ مرثیہ خوانی کے تمام رموز اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ ان کے اندر اُترے ہوئے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ کئی زبانوں پر دسترس رکھتے ہیں چنانچہ وہ اشعار عربی کے پڑھ رہے ہوں فارسی، ہندی یا اردو کے، اُن کے ادا کرنے میں خاص ملکہ رکھتے ہیں تحقیق کی دنیا سے ماجد رضا نے اس قدر توجہ سے رابطہ رکھا ہے پچھلی ایک دو دہائیوں سے مرکز کی جتنی مطبوعات منظر عام پر آئی ہیں اُن میں سے ایک بھی تحقیقی طریقے اور سلیقے سے خالی نہیں "ضمیر حیات" جیسے وسیع پراجیکٹ کے دوران بھی اُن کی پوری توجہ اس احتیاط پر رہی ہے کہ اس کی مختلف کمپیوٹر سینٹرز سے موصول ہونے والی کمپوزنگ قاری کے سامنے آئے تو اسے اس کی درست خواندگی میں دشواری محسوس نہ ہو۔ حالانکہ اتنے بڑے منصوبے میں جہاں درجنوں شعبوں کا عمل دخل ہو فروگذاشتوں کا ہو جانا غیر فطری نہیں لیکن یہ ماجد رضا ہیں جنہوں نے پوری ٹیم کو اس نکتے پر مرکوز رکھا ہے کہ علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی پر مکمل ہونے والی اس تاریخی دستاویز کے حسن میں کوئی کمی نہیں رہنی چاہیے۔ علامہ کی تمام تصانیف پر خود ماجد رضا کے تنقیدی مقالات آرا کا وہ نقطۂ توازن ہیں جسے علامہ ضمیر اختر نقوی کے پورے گلوب پر پھیلے ذکر خیر میں مرکزی اور اسناد کا درجہ حاصل ہے۔

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

مقدمہ

یہ عہد جس عہد میں ہم سانس لے رہے ہیں، یہ عہد علامہ ضمیر اختر نقوی کا عہد ہے۔ اس عہد کا کوئی اہم شاعر، ادیب اور دانشور ایسا نہیں جس نے علامہ ضمیر اختر صاحب کے فکر و فن اور ذات و صفات کو خراج تحسین پیش نہ کیا ہو۔

حضرت جوش ملیح آبادی تو خصوصی طور سے علامہ ضمیر اختر نقوی کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ ۱۹۷۹ء کی بات ہے کہ جب علامہ ضمیر اختر نقوی محرم الحرام کا عشرۂ اولیٰ اسلام آباد میں پڑھ رہے تھے ۹ محرم کو ایک مجلس اختر صاحب نے حسن ابدال میں منعقد کی تھی مجلس میں علامہ صاحب خطاب فرما رہے تھے، اس مجلس میں زیرِ منبر حضرت جوش ملیح آبادی بھی سیاہ شیروانی پہنے ہوئے تشریف فرما تھے۔ علامہ صاحب نے جوش کی رباعی پڑھ کر تقریر کا آغاز کیا، مجلس میں بہت زیادہ مجمع تھا اور زیادہ تر اسلام آباد کا تعلیم یافتہ طبقہ مجلس میں شریک تھا۔ علامہ صاحب کی تقریر کے بعد جب جوش صاحب سے فرمائش کی گئی کہ آپ مرثیہ پڑھیے تو جوش صاحب نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ "اب نقوی صاحب کی خطابت کے بعد میں مرثیہ نہیں پڑھوں گا۔ اتنی عمدہ تقریر کے بعد مرثیے کا خون ہوگا"۔ جوش صاحب علامہ صاحب کو ہمیشہ "حضرت نقوی" کے تعظیمی لفظوں سے خط میں مخاطب ہوتے تھے۔ جوش ملیح آبادی نے ایک

خط میں علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کے لئے یہ شعر لکھ کر بھیجا تھا:۔

تیرا وجود فخرِ ضمیرِ حیات ہے
تو محض ایک فرد نہیں کائنات ہے

علامہ ضمیر اختر نقوی نے جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیوں کو ترتیب دیا اور ایک علمی ادبی فرہنگ بھی کتاب میں شائع کی، کتاب کی کتابت کی پروف ریڈنگ علامہ طالب جوہری اور پروفیسر سردار نقوی نے کی تھی اس لئے کتاب میں ایک بھی غلطی نظر نہیں آتی، ہاں جوشؔ صاحب کے مرثیوں کے مختلف مسودوں میں لفظ بدلے ہوئے ملتے ہیں اس لئے کہ جب وہ دوبارہ مرثیہ پڑھتے تھے تو کہیں کہیں مصرعے اور لفظ تبدیل کرتے تھے۔ بعض لوگ ابھی تک انھیں تبدیل شدہ لفظوں میں اُلجھے ہوئے ہیں بہرحال یہ بھی ایک کام ہے۔ علامہ صاحب کا کام تھا کہ مرثیے محفوظ ہوجائیں اور یہ کام ہوگیا۔ جوشؔ کے مرثیوں کی اشاعت کے بعد جوشؔ کی شاعری کو "شریفانہ اعتبار" حاصل ہوگیا۔

اس عہد کا یہ عظیم کارنامہ ہے کہ ایک شاعرِ اعظم کو ایک خطیبِ اعظم نے اور ایک خطیبِ اعظم نے ایک شاعرِ اعظم کو علمی ادبی خراج پیش کیا۔

جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیوں کی کتاب جوشؔ صاحب کی زندگی میں شائع ہوئی اور علامہ ضمیر اختر نقوی نے جوشؔ کے مسدسوں کو جوشؔ کے مرثیے ثابت کردیا۔

کیا خوب جوشؔ صاحب نے ادیبِ اعظم علامہ ضمیر اختر نقوی کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے،

"اگر اللہ کا سا میرا مزاج ہوتا تو آپ کی زبان سے اپنی مدح سن کر آپ کے دامن کو موتیوں سے بھر دیتا" (۱۳ اپریل ۱۹۷۶ء)

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب اور جوش ملیح آبادی کے علمی ادبی مراسم لکھنؤ کے زمانے ہی سے تھے۔ علامہ صاحب نے لکھنؤ کے حسین آباد اسکول، جوبلی انٹر کالج اور عظیم درسگاہ شیعہ ڈگری کالج سے تعلیم حاصل کی، جامعہ ازہر مصر سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی لیکن اُن کا کہنا ہے کہ۔

"یہ ڈگریاں کس کام کی ہیں، نہ مجھے کسی کی غلامی کرنا ہے اور نہ ملازمت میں تو محمدؐ و آلِ محمدؐ کا ملازم ہوں اور اُن کی غلامی پر فخر ہے۔ انھوں نے ہم کو عزت اور دولت بھی کچھ عطا کیا ہے"۔

سچ پوچھیے تو ہزاروں طلبا اور اسکالر کو علامہ ضمیر اختر نقوی ڈگریاں دلوا چکے ہیں۔ طویل فہرست ہے علامہ صاحب کے شاگردوں کی جنھوں نے علامہ صاحب سے تعلیم پائی ہے اور اُن کی نگرانی میں پی ایچ ڈی کی ڈگریاں حاصل کی ہیں۔

کسی موقع پر اُن علمائے کرام کے نام بھی شائع کیے جائیں گے جنھوں نے علامہ صاحب سے خطابت سیکھی ہے اور اب صاحب روزگار ہیں۔

بہت سے ایسے کم ظرف بھی ہیں جو چھپ چھپ کر علامہ صاحب سے استفادہ کرتے رہے ہیں اور اب وہ بھی اپنے نام کے ساتھ بڑے بڑے خطابات لکھنے لگے ہیں۔ ایسے "جعل ساز" بھی ہیں جو علامہ صاحب سے علم عروض کے نکات سیکھ کر ماہر بنے ہیں لیکن "جعل سازی" کی بنا پر کوئی خاص شہرت اُن کے کلام کو حاصل نہ ہو سکی۔

علامہ صاحب کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے کسی علمی ادبی کام کے لئے قوم سے کبھی کوئی چندہ نہیں لیا۔ جب کہ مسلمان قوم اور خصوصاً ہماری قوم کے تمام کام "چندہ خوری" سے انجام پاتے ہیں۔ حد یہ ہے کہ جب آپ نے "القلم"

جیسا قیمتی اور ضخیم مجلہ شائع کرنا شروع کیا تو اس کے لئے بھی کبھی ملک و بیرون ملک چندہ نہیں کیا۔

بلکہ شہر کراچی کے تیسرے درجے کے شہری تک کے گھروں پر یہ رسالہ مفت جاتا ہے کہ وہ اتنی استعداد نہیں رکھتے کہ قیمتی رسالے کے ہر شمارے کی قیمت ادا کرسکیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کی شکل و صورت میں جو مردانہ و شیرانہ وجاہت موجود ہے اسی طرح وہ باطنی قوت میں بھی "شیر یزدانی" صفات کے وارث ہیں۔ علامہ صاحب کو قدرت نے جو روحانی، وجدانی قوتیں عطا کی ہیں اس کی وجہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ انھیں بے پناہ "احساسِ برتری" ہے اس بنا پر بعض کم علم حضرات اُن کی اس صفت سے یہ سمجھتے ہیں کہ اُن میں غرور ہے۔ بہت سے کم ظرفوں نے اُن کے اس عمل پر ردِّ عمل ظاہر کرکے اپنے آپ کو نحس کرلیا ہے۔ اور حسد کی مہلک بیماری میں مبتلا ہوگئے ہیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کے مزاج میں خیر اور امن کی روح اللہ تعالیٰ نے پھونک دی ہے وہ شر سے اور فساد سے نفرت کرتے ہیں اور اکثر "شرپسندوں" کو اپنی شریں طبع سے خیر کی طرف لائے ہیں اور اب بھی اس کارِ خیر میں مصروف رہتے ہیں۔

رضویہ سوسائٹی اور انچولی (سادات سوسائٹی ہیں نمبر) کے نوجوان علامہ صاحب کو اپنے گھر کا بزرگ تصور کرتے ہیں اور عرصہ چالیس برس سے صاحب بصیرت اور محبانِ اہلِ بیتؑ نوجوان علامہ صاحب کو "ضمیر بھائی" کے پرخلوص رشتے سے مخاطب کرتے ہیں۔ بعض نوجوان جن کی اکثریت ہے وہ یا تو قبلہ، سرکار، علامہ صاحب یا پھر "بھیا" کے خوبصورت، پُراثر اور وجیہہ لفظوں کے ساتھ علامہ صاحب

کا ذکر کرتے ہیں۔

علامہ صاحب کے علمی ادبی دربار میں اکثر بہت سے قومی "بہروپئے" بھی آتے رہے ہیں لیکن اُن کی حیثیت "خارش زدہ" کی سی ہے کہ وہ علامہ حضرات کے گھروں کی دیواروں سے کمر کھجلاتے رہتے ہیں اور اس انتظار میں رہتے ہیں کہ چند سکّے اُن کی طرف پھینک دیئے جائیں۔ علامہ صاحب ایسے لوگوں کے لئے ایک فلاحی ادارہ کھولنا چاہتے ہیں تاکہ ان کے شر کی وجہ سے جو قوم کو نقصان پہنچا ہے اُس کا ازالہ کیا جاسکے۔ علامہ صاحب اکثر ان کی ہمدردی میں نرمی کے الفاظ استعمال کرتے ہیں۔

علامہ صاحب نے سید علی رضوی مرحوم (کسٹم کلکٹر) کے تعاون سے ایک ادارہ قائم کیا جس کا نام "مکتبۂ زید شہید" تجویز ہوا اور اس ادارے کے تحت علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب نے ممتاز معروف علمائے کرام مثلاً آیت اللہ شیخ صدوقؒ، آیت اللہ شیخ مفیدؒ، آیت اللہ علامہ حلیؒ، آیت اللہ ابو جعفر کلینیؒ، آیت اللہ علامہ محمد باقر مجلسی کی سوانح حیات لکھیں اور شائع کی ہیں۔ اس سلسلے میں آئندہ آیت اللہ مولانا شیخ محمد مصطفےٰ جوہر اعلیٰ اللہ مقامہٗ اور حضرت علامہ رشید ترابی اور محسن الملت آیت اللہ محسن نواب صاحب لکھنوی کی سوانح حیات بھی زیر اشاعت ہیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کے بڑے بھائی حضرت سید محسن اختر نقوی صاحب عرصۂ چالیس برس سے یورپ اور امریکہ میں قیام پذیر ہیں اور انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے فزکس میں ایم ایس سی اور پرنسٹن یونیورسٹی امریکہ سے اعلیٰ ڈگریاں اور کمپیوٹر کی ماسٹر ڈگریاں حاصل کی ہیں انھوں نے لاکھوں روپے کی ملازمتیں امریکہ ولندن میں کرنے کے باوجود ذکرِ اہلِ بیتؑ کو اپنا شعار بنایا ہوا ہے وہ انگریزی زبان میں فضائل و مصائب امام حسینؑ پڑھنے والے دنیا کے پہلے "ذاکر

واری ہو جاتے ہیں۔

کراچی کے بڑے بڑے مرثیہ گو شعرا نے شاعری کا فن علامہ صاحب سے سیکھا ہے۔ اس پر تفصیلی گفتگو ایک الگ مقالے میں ہو گی۔ جن شعرا کو مصرعے پر مصرع لگانا نہیں آتا تھا انھوں نے علامہ صاحب سے یہ فن سیکھا ہے۔ اب بھی بہت سے حضرات "علم عروض" علامہ صاحب سے سیکھتے ہیں۔ اور باقاعدہ تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس وقت پاکستان میں یہ علم علامہ صاحب کے علاوہ کسی کو نہیں آتا۔

جیو ٹی وی پر پروگرام "الف" میں ایک مذاکرہ ہوا، جس کا موضوع تھا "پاکستان میں مذہبی رواداری" علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی مدظلہ العالی سے درخواست کی گئی کہ مذاکرے میں ایک ہندو پنڈت، پنڈت گرداس آچاریہ، عیسائی پادری فادر رچرڈ پاسکل اور مفتی منیب الرحمان شرکاء ہیں اور ایک دانشورانہ اور عالمانہ نقطۂ نظر سے بات کرنے کے لئے علامہ ضمیر اختر نقوی کو دعوت دی گئی، میں علامہ صاحب کو لے کر اسٹوڈیو پہنچا، پروڈیوسر نے صدر دروازے پر استقبال کیا، کانفرنس روم میں پہنچے وہاں مفتی صاحب پنڈت صاحب اور فادر پاسکل پہلے سے موجود تھے۔ پروگرام کے میزبان انیق احمد ابھی نہیں پہنچے تھے۔ دس منٹ بعد انیق احمد کمرے میں داخل ہوئے۔ واضح رہے کہ میں تقریباً عرصہ بارہ یا پندرہ برس سے علامہ ضمیر اختر نقوی سے بہت قریب ہوں اس عرصے میں علامہ صاحب کے حوالے سے کئی مشہور ادبی، فنی، مذہبی اور دیگر شعبوں سے تعلق رکھنے والی شخصیات سے میرا تعارف ہو چکا تھا، لیکن اس بارہ پندرہ برس میں انیق احمد صاحب سے کوئی شناسائی اور کوئی ملاقات بھی نہ ہوئی لیکن اس دن جب انیق صاحب کمرے میں داخل ہوئے اور بے ساختہ "علامہ صاحب نے جس انداز سے انیق احمد کو مخاطب کیا" کیوں بھئی اتنی دیر کردی

تم نے" اور پھر انیق احمد یہ کہہ کر علامہ ضمیر اختر صاحب سے بغلگیر ہو گئے "ارے ضمیر بھائی...... ضمیر بھائی کتنا عرصہ ہو گیا آپ سے نیاز حاصل ہوئے" اور پھر شرکاء کی طرف مخاطب ہو کر کہا "ارے بھئی ضمیر بھائی میرے استاد ہیں میں نے ان سے بہت کچھ سیکھا ہے"۔

میں خیالات میں غرق ہو گیا۔ یا خدا علامہ صاحب کی شخصیت کن کن شعبوں میں کس گہرائی اور گیرائی کے ساتھ اثر انداز ہے کہ آج دنیا کے مختلف شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد علامہ ضمیر اختر نقوی کی فکر کو لئے ہوئے اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہیں۔ یہ تو ایک مثال تھی ایسی سینکڑوں مثالیں میرے ذہن میں ہیں جس کو لکھوں تو دفتر کے دفتر درکار ہوں اور یہ کام میں ضرور کروں گا۔

انڈیا کے سفر میں بھی میں علامہ ضمیر اختر نقوی کے ہمراہ تھا پاکستان میں ویزے کے حصول سے لے کر اور انڈیا روانگی کے لئے لاہور ائیر پورٹ ہو یا دہلی ائیر پورٹ ہو یا پھر لکھنؤ پہنچ کر چار باغ اسٹیشن سے پیر بخارا کا سفر ہو اور پھر لکھنؤ میں قیام، الٰہ آباد میں قیام، مصطفےٰ آباد میں قیام ہو یا رائے بریلی میں قیام یا دیگر شہروں میں قیام ہر جگہ ادبی اور مذہبی دنیا کی قد آور شخصیات چاہے وہ ڈاکٹر نیّر مسعود ہوں، یا پروفیسر کاظم علی خاں، ڈاکٹر انیس اشفاق ہوں یا علی احمد دانش آل انیس، الٰہ آباد میں شمس الرحمان فاروقی ہوں یا ڈاکٹر جعفر رضا، ڈاکٹر کلب صادق ہوں، یا مرزا محمد اطہر، مرزا محمد اشفاق شوق لکھنوی ہوں یا مولانا حمید الحسن کوئی شخصیت ایسی نہیں تھی جو علامہ صاحب کی فکر اور ذہن و تخیل کی بلندی کی قائل نہ نظر آتی ہو۔

صبح کا وقت تھا ہم پیر بخارا لکھنؤ میں علامہ ضمیر اختر نقوی کی خالہ مرحومہ کے دولت کدے پر ٹھہرے ہوئے تھے دروازے پر دستک ہوئی نوکر نے ایک کارڈ دیا،

لکھا تھا ''پروفیسر کاظم علی خاں'' پروفیسر صاحب اندر تشریف لائے علامہ صاحب نے تعارف کروایا تو پروفیسر کاظم علی خاں مجھ سے مخاطب ہوئے اور فخریہ انداز میں کہا ''میاں ہم تمہارے استاد کے استاد ہیں''۔ میں نے پھر سوچا ''یا اللہ ایسا شاگرد مجھے بھی بنادے کہ استاد خود شاگرد سے ملاقات کرنے کے لئے آئے اور شاگرد پر فخر کرے''۔

پروفیسر کاظم علی خاں مرزا دبیر پر بہت سا کام کر چکے ہیں اور مزید کوئی کام ہو رہا تھا اور اسی پر علامہ صاحب اور پروفیسر صاحب میں گفتگو جاری تھی اور علامہ صاحب دبیر پر نادر معلومات کا اظہار کر رہے تھے اور پروفیسر کاظم علی خاں صاحب ہمہ تن گوش تھے۔

لکھنؤ میں جب علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب پہنچ جاتے ہیں۔ محرم نہ بھی ہو تو محرم شروع ہو جاتا ہے۔ مجلسوں کا آغاز ہو جاتا ہے ہر درگاہ اور ہر امام باڑے کے منتظمین علامہ صاحب کی قیام گاہ پر حاضر ہو کر مجلسوں کا وعدہ لیتے ہیں اور پھر عالم یہ ہوتا ہے کہ علامہ صاحب جہاں جہاں مجلس پڑھتے ہیں مجمع پیچھے پیچھے ہوتا ہے ایک درگاہ سے دوسری درگاہ اور مجمع ساتھ ساتھ، درگاہ حضرت عباسؑ ہو، یا مسجد ابوذر، ڈپٹی صاحب کا امام باڑہ ہو یا درگاہ کاظمین، غرض لکھنؤ کا کوئی محلہ اور کوئی امام باڑہ ایسا نہیں کہ جہاں علامہ صاحب مجلس نہ پڑھیں ایک ایک دن میں تین تین مجالس اور ہر مجلس میں مدرسۂ ناظمیہ، سلطان المدارس اور شیعہ کالج کے طلباء بڑی تعداد میں موجود۔ کئی مجالس ایسی تھیں جن میں بیک وقت ڈاکٹر کلب صادق صاحب، مولانا مرزا محمد اطہر صاحب، مولانا مرزا محمد اشفاق صاحب، مولانا حمید الحسن صاحب، بشانہ بشانہ تشریف فرما ہوتے۔

واقعات لکھنے بیٹھوں تو صفحات کا انبار لگ جائے یہ باتیں کسی اور وقت کے لئے اٹھار کھتا ہوں۔ ایک صفت پیغمبری کی حامل شخصیت کا احاطہ کسی ایک انسان کے بس کی بات نہیں، ایسی ذات کہ جس کے ڈانڈے چہار دانگ عالم میں پھیلے ہوئے ہوں، اس شخصیت کے صفات کے احصاء کے لئے ایک بورڈ بیٹھے اوران کی شخصیت، علمیت، فکری ارتقا، تخیل کی بلندی، خدمات، مقام ومرتبہ، علمی کارنامے، تحقیق، تنقید، تالیف، تصنیف، تراجم، غرض شخصیت کے ہر جہت پر گفتگو ہو۔ علامہ ضمیر اختر نقوی کی شخصیت علم کے کئی شعبوں پر پھیلی ہوئی ہے، آپ کا اوّلین حوالہ ادب ہے، خطابت تو آپ نے ادبی کاموں کو آگے بڑھانے کے لیے شروع کی اور اب نوعیت یہ ہے کہ آپ نے خطابت کے دائرے کو اتنی وسعت دے دی کہ اس میں ادب بھی سما گیا، مذہب بھی سما گیا، قرآنی افکار، تاریخی حقائق وانکشافات، جدید سائنس، فکر و فلسفہ، اور فلسفے کے حقائق کو اس قدر آسان بنادیا کہ فلسفہ سے الجھن محسوس نہیں ہوتی، کمپیوٹر کی معلومات، جدید علوم و ایجادات کا ذکر، لسانیات عالم پر گفتگو، حالات حاضرہ، عالمی سیاست، غرض خطابت کا Canvas بہت وسیع کر دیا ہے اور خطابت کے Trend کو بھی بدل دیا ہے لہٰذا اب منبر پر آنے والا یہ سوچ کر آئے کہ اس کی خطابت میں اگر اتنی وسعت ہے تو منبر پر بیٹھے۔

سید ہاشم رضا مدظلہ العالی کے دولت کدے پر علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کے ہمراہ میں بھی تھا، گفتگو ہوتے ہوتے نُصیریوں کے موضوع پر آ گئی، ہاشم رضا صاحب نے علامہ صاحب سے نُصریوں کی تاریخ کے بارے میں دریافت کیا، علامہ ضمیر اختر نقوی نے جنگ نہروان کا واقعہ بیان کیا کہ حضرت علیؑ نے اپنے ایک صحابی نُصیر کو نہر کی گہرائی معلوم کرنے کے لیئے یہ کہہ کے بھیجا کہ نہر پر جا کر آواز دینا مُجمہ ابن کرکرہ

ابن مرمرہ اور جو بھی برآمد ہو اس سے نہر کی گہرائی معلوم کر لینا۔ نصیر کا یہ کہنا تھا کہ ایک عظیم، جسیم، شحیم کیکڑہ برآمد ہوا اس کے استفسار پر نصیر نے سوال کیا تو کیکڑے نے کہا تو کیسا صحابی ہے کہ اپنے صاحب کی معرفت نہیں رکھتا ارے جو علیؑ نہر کی تہوں میں بسنے والے ایک کیکڑے کے نام اور شجرے سے واقف ہے کیا وہ نہر کی گہرائی سے واقف نہ ہوگا، بس نصیر یہ سن کر واپس آیا اور علیؑ کے قدموں پر گر کے کہا" آپ خدا ہیں" "سید ہاشم رضا محو حیرت تھے اور آخر میں انھوں نے داد و تحسین کے بعد علامہ ضمیر اختر صاحب سے مخاطب ہو کر کہا" آپ جب بھی آتے ہیں میری معلومات میں اضافہ ہوتا ہے"۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی خدماتِ اور ان کا Work پوری دنیا میں پھیل چکا ہے، اردو دنیا کا کوئی ادیب کوئی دانشور ایسا نہیں ہے کہ جس کے ذخیرہ معلومات میں علامہ ضمیر اختر نقوی کی طرف سے دیئے گئے علم کے موتی شامل نہ ہوں۔ چھوٹی سوچ، پست اور کمینی فطرت رکھنے والے لوگ اگر علامہ صاحب کی معرفت نہیں رکھتے تو میں اسے علامہ ضمیر اختر نقوی کے فضائل میں شمار کرتا ہوں کیونکہ اگر ایسے ایسے پست قد، پست فکر، پست ذہن اور پست سوچ رکھنے والوں کو علامہ صاحب کا Work سمجھ میں آجاتا تو یہ علامہ صاحب کے لیئے نقصان دہ ہوتا، لہٰذا اچھا ہے کہ ایسے لوگ ان قیمتی خدمات میں مخل نہیں ہو رہے ہیں اور انھوں نے اپنی ایک الگ دنیا بنائی ہوئی ہے، ایک کھیا بنایا ہوا ہے جہاں سب ایک ساتھ بیٹھتے ہیں اور ان کا یہ ساتھ اور اُن کا یہ اتحاد معاشرے کے لیئے اسلئے مفید ہے کہ کوڑے کے لیئے ایک مخصوص جگہ متعین ہو تو صفائی اور ستھرائی رہ سکتی ہے اور اگر ایسی جگہ نہ بنائی گئی تو یہ کوڑا جگہ جگہ پھیل جائے گا تو ہم ذاتی طور پر ایسا کوڑا دان بنانے والوں کے شکر گزار ہیں کہ انھوں نے

معاشرے کی گند اور کوڑا اپنے یہاں اکٹھا کیا ہوا ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کی شخصیت اور فن پر مسلسل اہلِ فکر مضامین قلم بند کر رہے ہیں۔ اور یہ سلسلہ آج سے نہیں بلکہ علامہ صاحب کے دورِ نوجوانی سے جاری ہے۔ علامہ صاحب نے دانشوروں سے اس وقت داد تحسین لی ہے جب انسان مستقبل کی راہیں متعین کرنے کے لئے منصوبہ بندی کر رہا ہوتا ہے۔ اخبارات اور رسائل کی Clippings اور Cuttings جو محفوظ ہیں جن میں علامہ صاحب کے مختلف ممالک کے دوروں کی خبریں، مذاکروں میں علامہ صاحب کے Lectures کی خبریں، علامہ صاحب کے بیانات، مختلف تقاریب کی خبریں، مجالس کی رپورٹ، علامہ صاحب کی صدارت میں ہونے والے جلسوں کی کارروائی اور دیگر خبریں ہیں اگر ان Cuttings کی نمائش کی جائے تو ایک میل طویل پنڈال درکار ہوگا۔

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کی خطابت کے حوالے سے ان کے کراچی کے سامعین کے مضامین ایک کتابی شکل میں لاہور ہائیکورٹ کے سینئر وکیل ندیم شبلی ایڈووکیٹ نے تالیف کر کے شائع کئے ہیں اس کی دوسری قسط جو لاہور کے سامعین کے آراء اور مضامین پر مشتمل ہے وہ جلد ہی منظرِ عام پر آنے والی ہے۔ گذشتہ تیس ۳۰ برس میں جو مضامین اور آراء علامہ صاحب کے لئے لکھے گئے وہ مختلف جگہوں پر پھیلے ہوئے تھے، مثلاً کسی رسالے میں، یا کتابوں کے اجرائی مجلّوں میں جس میں "اردو مرثیہ پاکستان میں" کا افتتاحی مجلّہ اور "شعرائے اردو اور عشقِ علی" کا افتتاحی مجلّہ شامل ہے ان کے مضامین اور کئی دوسرے ادبی مجلّوں اور اخبارات میں شائع ہونے والے مضامین جو علامہ صاحب کی ذات اور فن سے متعلق ہیں ان میں سے انتخاب کو ایک کتاب کی شکل میں یکجا کر کے پیش کیا جا رہا ہے، لیکن یقین مانیے کہ یہ ذخیرہ اتنا

وسیع ہے کہ اس کو سمیٹنا ایک آدمی یا چند آدمیوں کے بس کی بات نہیں اس کے لئے ایک بورڈ بیٹھے تب یہ کام مکمل ہو سکتا ہے۔ ڈاکٹر شوذب کاظمی (ملتان) کا یہ کام آپ کے سامنے ہے، پرویز بلگرامی (ایڈیٹر ڈائجسٹ سچی کہانیاں) اپنے انداز سے اس کام کو انجام دے رہے ہیں، محمد عباس نقوی (صحافی، ایڈیٹر ندائے حق) بھی ایک دوسرے زاویے سے مصروف کار ہیں، ندیم شبلی ایڈووکیٹ فیصل آباد اور لاہور میں اس کام کو ایک مختلف جہت سے انجام دے رہے ہیں۔ اس طرح مختلف شعبوں میں یہ کام ہوتا رہا تو شاید ایک دن وہ آئے کہ علامہ ضمیر اختر نقوی کی شخصیت، ان کے فن، اُن کے ہنر، اُن کی فکر اور ان کے Work کا احاطہ ممکن ہو سکے۔ ویسے اب تک جتنا کام علامہ صاحب کی خطابت کے حوالے سے ہوا ہے ویسا کام کسی خطیب کی حیات میں نہیں ہوا اور نہ ہی مرنے کے بعد۔

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کی زندگی عمل سے عبارت ہے آپ کی حیات شدید جدوجہد، علم کی لگن، عمل پر یقین، صبر وضبط اور قوائے ذہنی کے مکمل استعمال کی جیتی جاگتی تصویر ہے۔ میں نے جہاں تک علامہ صاحب کی حیات اور روز وشب کا مطالعہ کیا ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ علامہ صاحب مسلسل تحقیق کتر بیونت کے عمل میں مصروف کار رہتے ہیں۔ نت نئے خیالات، جدید مضامین، جدید موضوعات ہر وقت آپ کے ذہن میں گردش کرتے رہتے ہیں۔ اور اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب آپ کسی مجلس میں تقریر کرتے ہیں۔ میں بارہ پندرہ برس سے مسلسل علامہ ضمیر اختر صاحب کی تقاریر سن رہا ہوں اور آج تک کوئی تقریر ایسی نہیں ہے جو علامہ صاحب نے دہرائی ہو۔

کشادہ پیشانی، دراز گیسو، ستواں ناک، بڑی بڑی بادامی آنکھیں، درمیانہ قد،

متوسط جسم کے مالک، موقع محل کی مناسبت سے شیروانی کے رنگ کا انتخاب، دھیمے لہجے میں گفتگو لیکن منبر پر شیر کی طرح گرجتے ہیں۔ یہ بات علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کے لیئے رائے عامہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ ایک مرتبہ کوئی شخص علامہ ضمیر اختر نقوی کی تقریر سن لے یا اُن سے ملاقات کرلے وہ اُن کا اسیر ہو جاتا ہے، اُن کی تقریر کا دیوانہ ہو جاتا ہے اور پھر کسی کی تقریر نہیں سنتا۔ اور یہی کہتا نظر آتا ہے۔

تمہارے حلقہ بگوشوں میں ایک ہم بھی ہیں

علامہ ضمیر اختر نقوی کا فنی سفر بہت طویل ہے۔ عالم نوجوانی سے علامہ ضمیر اختر نقوی تحقیقی اور تنقیدی مشاغل میں مصروف کار ہیں اور اس نوجوانی میں انھوں نے اپنے عہد کے بڑے بڑے دانشوروں سے دادِ سخن لی ہے۔ ڈاکٹر کاظم علی خاں (پروفیسر شیعہ کالج لکھنؤ) اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔ یہ خط ۱۳ فروری ۱۹۷۷ء کا ہے۔

"آپ نے ادبی میدان میں اتنی کم عمری میں جو کچھ کیا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔ مجھے فخر ہے کہ آپ کی پوشیدہ ادبی صلاحیتوں کو میں آپ کے طالب علمی کے دور میں ہی پہچان چکا تھا اور آپ سے بہت کچھ توقعات رکھتا تھا۔ خدا کا شکر ہے میرے توقعات کو اب آپ بہ خوبی پورا کر رہے ہیں"۔

رضویہ سوسائٹی میں جب علامہ صاحب رہائش پذیر تھے تو اس عہد کے مشہور ادیبوں، دانشوروں، شاعروں، سوز خوانوں اور نوحہ خوانوں کی بیٹھک علامہ صاحب کے گھر پر رہتی تھی اور مخصوص اوقات تھے مثلاً سہ پہر کو شعراء اور ادباء جن میں آل رضا مرحوم، نسیم امروہوی مرحوم، نجم فتح پوری مرحوم، عزم جونپوری مرحوم، پروفیسر سردار نقوی مرحوم، سید یوسف حسین (فرزند میر عارف)۔ سید اصغر حسین (فرزند بابو

صاحب فائق) پھر شب میں سوز خوان جن میں آفتاب علی کاظمی مرحوم، اختر وصی علی مرحوم، مظاہر کاظمی مرحوم، ان محفلوں کے چشم دید گواہ سید فائق حسین اور محسن نقوی (بھائی محسن امروہوی) موجود ہیں۔ اس طرح اس عہد کے ہر حلقے میں علامہ ضمیر اختر نقوی کی شہرت تھی رضویہ سے علامہ صاحب کی منتقلی کے بعد اس جیسی نشست پھر کوئی اپنی رہائش گاہ پر نہ بنا سکا۔ گو کہ کچھ لوگ کوشش تو کرتے ہیں لیکن اس پائے کی شخصیات کہاں سے لائیں گے۔

عبدالرؤف عروج مرحوم تقریباً روز شام کو ضمیر اختر نقوی صاحب کے گھر پر رضویہ سوسائٹی میں آیا کرتے تھے۔ وہ میر خلیق پر کتاب لکھ رہے تھے اس سلسلے میں ضمیر اختر صاحب سے Discuss کرتے تھے۔ وہ علامہ ضمیر اختر صاحب کے بے حد مداح تھے روزنامہ ''حریت'' کے ادبی صفحے کے لئے اکثر ضمیر اختر صاحب سے فرمائشی مضمون لکھوا کر شائع کرتے تھے۔ ضمیر اختر صاحب سے حوالہ جاتی کتابیں بھی عاریتاً لے جاتے تھے، خانہ فرہنگ ایران سے کتابیں منگوانے کی خواہش کرتے تو ضمیر اختر صاحب اسلام آباد سے ڈاکٹر سبط حسن رضوی مرحوم کی وساطت سے خانہ فرہنگ کے فارسی تذکرے منگوا کر عبدالرؤف عروج کو تحفتاً پیش کرتے۔

۱۹۷۱ء میں جب علامہ ضمیر اختر نقوی نے میر انیس کی صد سالہ برسی کی تحریک شروع کی تو سب سے پہلے مجلّہ ''یادگار انیس'' شائع کیا۔ عبدالرؤف عروج نے ۱۲، اپریل ۱۹۷۱ء کے روزنامہ حریت میں علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کی تالیف پر ایک مضمون لکھا اور رضویہ سوسائٹی میں علامہ صاحب کے گھر پر بھی تشریف لائے۔

عبدالرؤف عروج لکھتے ہیں:-

''میر انیس ان اردو شاعروں میں نمایاں حیثیت رکھتے ہیں۔

جنھوں نے شعر و ادب کو غزل کے دلدل سے نکال کر زندگی کی توانا اور صحت مند قدروں کی سمت آگے بڑھایا ہے۔ جن لوگوں نے ان کے مرثیوں کا مطالعہ کیا ہے اُن پر یہ حقیقت پوری طرح واضح ہوگی کہ اردو نے آج تک اتنا بڑا نظم نگار پیدا نہیں کیا ہے، اس سال پورے ملک میں میر انیسؔ کی صد سالہ برسی منائی جارہی ہے اور اس سلسلے میں بعض علمی اور ادبی اداروں کی جانب سے تیاریوں کا بھی آغاز ہو چکا ہے۔ مجلّہ یادگار انیسؔ (مرتبہ۔ ضمیر اختر نقوی) اس سلسلے کی کڑی ہے۔ اگرچہ یہ مجلّہ مختصر ہے لیکن اس سے انیسؔ کے بارے میں تمام بنیادی باتوں کا علم ہو جاتا ہے، ضمیر اختر نقوی نے مجلّے میں جہاں انیسؔ کے حالات اور بعض واقعات درج کیے ہیں وہیں مشاہیر علم و ادب کی وہ آراء بھی درج کر دی ہیں جو انیسؔ کے بارے میں وقتاً فوقتاً دی جاتی رہی ہیں اس کے لئے ان تمام کتابوں کی تفصیل بھی پیش کر دی گئی ہے جو گذشتہ سو سال کے عرصے میں لکھی گئی ہیں یہ مجلّہ انیسؔ کی شخصیت اور فن پر ایک طرح کا مکمل خاکہ ہے۔ ہمیں امید ہے کہ انیسؔ کی شخصیت فن اور شاعری پر کام کرنے والے اس مجلّہ کو ضرور پیش نظر رکھیں گے"۔

علاّمہ صاحب کے والد سید ظہیر حسن نقوی ابن دیانت حسین نقوی بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک تھے اُن پر تفصیلی مضمون "القلم" کے شمارہ ۳ میں تحریر کر چکا ہوں۔ لانبا قد، سفید ریش، سفید بال، بڑی مُہری کا پاجامہ، مخصوص لکھنوی نعلین، داہنے ہاتھ میں عقیق کی انگوٹھی، شیروانی اور ٹوپی زیب تن و سر کئے ہوئے اور بڑی پر وقار

چال کے مالک اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ Scheduled life کے قائل تھے۔ صبح ناشتے میں ایک گلاس دودھ پیتے تھے، دوپہر کو مختصر کھانا اور پھر مغرب کے بعد رات کا کھانا۔ یہی وہ پرہیزگاری تھی کہ سید ظہیر حسن نقوی کی عمر بوقتِ انتقال ۸۹ برس تھی اور وہ بالکل چاق و چوبند تھے۔ رضویہ سوسائٹی سے مکان منتقل کیا تو علامہ ضمیر اختر نقوی نے اپنی لائبریری گلشنِ اقبال میں موجود رہائش گاہ پر منتقل کر دی اور خود فیڈرل بی ایریا بلاک ۲۰ میں اقامت پذیر ہوئے۔ ظہیر حسن نقوی علامہ ضمیر اختر نقوی کے ساتھ ہی رہتے تھے اس لیے کہ اُن کو عزاداری اور مجلس سے عشق تھا گو کہ ان کے دو صاحبزادگان امریکہ اور لندن میں مقیم ہیں لیکن وہ اپنے منجھلے بیٹے سید ضمیر اختر نقوی کے ساتھ ہی آخری عمر تک رہے۔ فیڈرل بی ایریا کے بعد علامہ صاحب دوبارہ رضویہ سوسائٹی منتقل ہو گئے اور جس سڑک پر انجمن غمخوارانِ عباسؑ کے صاحب بیاض علی ضیا رضوی کا مکان تھا اسی سڑک پر ضیاء بھائی کے سامنے والے مکان میں رہائش اختیار کی۔ اب علامہ صاحب کی لائبریری اور دور ہو گئی دو تین سال کے بعد یہی فیصلہ ہوا کہ جہاں لائبریری ہے یعنی گلشنِ اقبال میں ہی منتقل ہوا جائے تاکہ روز روز کے سفر سے بچا جا سکے چنانچہ علامہ ضمیر اختر نقوی معہ اپنے والد کے گلشنِ اقبال منتقل ہو گئے اور ظہیر حسن نقوی تا دمِ حیات وہیں اپنے بیٹے (ضمیر اختر نقوی) کے ساتھ رہے۔ انتقال سے چند ماہ قبل اُن کے داماد سید ناصر رضا رضوی اپنے خسر سید ظہیر حسن نقوی کو بہ اصرار اپنے گھر لے گئے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ظہیر حسن نقوی کو اپنے نواسوں حسین رضا اور عباس رضا سے بڑی محبت تھی خصوصاً چھوٹی نواسی سائرہ رضا تو اپنے نانا سے بہت قریب تھیں اور نواسے نواسیاں بھی اپنے نانا سے حد درجہ پیار اور انسیت رکھتے تھے۔ سید ظہیر حسن نقوی کے انتقال کے بعد اُن کی چھوٹی

نواسی سمائنہ جو اس وقت مشکل سے ۴ یا ۵ برس کی ہوگی اس کی حالت میں نے دیکھی کہ وہ بالکل خاموش ہوگئی تھی اور راتوں کو اٹھ اٹھ کے روتی تھی کہ میں نے ابھی ابا (ضمیر حسن نقوی) کو خواب میں دیکھا ہے۔

یہ محبتیں، یہ رشتے، یہ الفتیں اور یہ خلوص آج کل ناپید ہے اس لئے لوگ ان محبتوں کو سمجھ نہیں پاتے، دوسرے یہ کہ اکثر بزرگوں میں وہ جاذبیت اور محبت کی کشش نہیں ہوتی کہ بچے اُن سے مانوس ہوں لہٰذا وہ بزرگ جو ان محبتوں سے محروم ہیں وہ یہ چاہتے ہیں کہ ہمیں یہ محبتیں نہیں ملیں تو کسی کو نہ ملیں اور اگر کسی کو یہ محبتیں مل رہی ہیں تو اس سے حسد کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ واحد علامہ صاحب کی ذات ہے جو عصر حاضر کے سب سے عظیم خطیب، سب سے عظیم محقق، مصنف، مؤلف ہونے کے ساتھ ساتھ مرثیہ نگار شاعر بھی ہیں۔ علامہ صاحب سوز خواں نہیں لیکن فنِ سوز خوانی کے اسرار و رموز اور تاریخ سے علامہ صاحب سے زیادہ کسی کو واقفیت نہیں ہے، علامہ صاحب نوحہ خواں نہیں ہیں لیکن نوحہ خوانی کی تاریخ قرآن و سیر کی روشنی میں علامہ صاحب سے زیادہ کوئی نہیں جانتا۔ یعنی بیک وقت علامہ صاحب کی ذات ادب، مذہب، تہذیب، ثقافت، تاریخ، تنقید، قرآن، حدیث، سیرت اور دیگر علوم پر سند کی حیثیت رکھتی ہے۔

حاسدوں کی تمام تر مخالفتوں اور حسد کے باوجود علامہ صاحب کا پیغام، ان کی فکر، اُن کی شہرت، ان کا علم، اُن کی مستند تحقیق، اُن کی اعلیٰ خطابت، اُن کی شخصیت کا سحر، اُن کی ہر دلعزیزی، اُن کی روحانیت، اُن کی معرفت، اُن کا آلِ محمدؐ سے خلوص، اُن کی تحریک تحفظ عزاداری علم و تفکر و تدبر دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچ چکے ہیں۔

اب یہ بے سُرے لوگ اپنے بھونڈے راگ الاپتے رہیں، اپنی نام نہاد دور جہلی

ساحری دکھاتے رہیں، یہ لوگ کبھی بلند اقبال نہیں ہو سکتے۔ یہ پست اقبال لوگ ہیں اور یہ لوگ آسمانِ معاشرت کے انجم منحوس ہیں۔ خدا سب کو ان کی نحوست سے محفوظ رکھے۔

میں یہاں لاہور اور ملتان کے علم پسند مجمعوں اور سامعین کا تذکرہ ضرور کروں گا۔ میں ان لوگوں کو ذہین لوگوں میں شمار کرتا ہوں جس طرح علامہ صاحب کے علم اور اُن کی فکر کو اہلِ پنجاب نے سمجھا ہے اور اس کی قدر کی ہے میں انھیں سلام کرتا ہوں۔ ملتان والوں نے ہر ماہ علامہ صاحب کی فکری نشست کا اہتمام کیا ہے جس میں مختلف موضوعات پر علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کے لیکچرز ہوتے ہیں، ہر لیکچر ہر مجلس میں پچیس، تیس ہزار سے کم کا مجمع نہیں ہوتا۔ ان سامعین میں جامعات کے پروفیسرز، دانشور، محققین، طلباء اور مدارس کے مہتمم خواہ وہ اہلِ سنت ہوں یا اہلِ تشیع، سب برابر سے شریک ہوتے ہیں۔ کراچی کے اہلِ تشیع نام نہاد سرمایہ دار جو دو چار لاکھ روپے کما کر اپنے آپ کو ماڈرن سمجھانے لگتے ہیں وہ ذرا جا کر ملتان کے اہلِ تشیع سرمایہ داروں کو دیکھیں اور اُن سے تربیت حاصل کریں کہ وہ ارب پتی ہونے کے باوجود اپنے آپ کو عزاداری کا ایک ادنیٰ سا رکن سمجھتے ہیں اور علم اور مجلس عزا کے شائق ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب سے علامہ صاحب نے ملتان میں مجالس اور لیکچرز دینا شروع کیا ہے وہ سرمایہ دار طبقہ جو مجلسوں میں شاذ و نادر ہی نظر آتا تھا اب یہ عالم ہے کہ جہاں بھی علامہ صاحب کی تقریر ہو خواہ لاہور اور ملتان کے کسی چھوٹے علاقے میں یا بڑے علاقے میں ہر جگہ یہ جاگیردار اور سرمایہ دار نظر آتے ہیں اور ذاکرین کو اپنے سر کا تاج سمجھتے ہیں، ذاکرین کی قدر کرتے ہیں، فضول سوالات اور بے جا اعتراضات کے بجائے علمی مباحث اور فکری سوالات کرتے ہیں اور اپنی کوٹھیوں پر

علامہ صاحب کے آ جانے کو اپنے لیئے باعثِ فخر اور وجہ برکت سمجھتے ہیں۔ کراچی کے نو دولتیے ملتان کے اِن خاندانی اور پشتی رئیسوں سے نشست و برخاست اور گفتگو کی تربیت لیں، اِس کے بعد وہ اس منزل پر پہنچیں گے کہ کوئی عالم ان کو منہ لگائے۔

یہ جو کچھ بھی Matter علامہ صاحب کی شخصیت اور فن کے حوالے سے پیش کیا جا رہا ہے یہ بہت مختصر ہے اور ان میں زیادہ تر وہ چیزیں شامل ہیں جو دنیا کے ادب و مذہب کے کسی نہ کسی رسالے یا مجلّے میں شائع ہو چکے ہیں، غیر مطبوعہ مضامین و مقالے اس سے کہیں زیادہ ہیں جو گاہے بگاہے شائع کئے جاتے رہیں گے اور حاسدین کے دلوں پر آرے چلتے رہیں گے۔

میں نے علامہ صاحب کی ذات اور ان کے علم سے بہت کچھ سیکھا ہے اور میں خود بھی اپنے آپ کو Explore نہیں کر سکتا تھا اگر علامہ صاحب کی ذات سے مجھے واسطہ نہ ہوتا۔ میں مضامین لکھ سکتا ہوں یہ بھی علامہ صاحب نے مجھے بتایا، میں شاعر ہوں اور مرثیے لکھ سکتا ہوں یہ بھی علامہ صاحب ہی کی وجہ سے معلوم ہوا۔ میں خطابت کے میدان کا آدمی ہوں یہ بھی علامہ صاحب ہی کی ذات نے ادراک کروایا۔ نوحہ خوانی، سوز خوانی، تلاوتِ قرآنی، مطلب کہنے کا یہ ہے کہ علامہ صاحب کا وجدان، اُن کی قوتِ ادراک اور اُن کی تیز نظر اور دور اندیش نظر اس چھپے ہوئے جوہر کو بھی تلاش کر لیتے ہیں جو عام نظروں سے پوشیدہ ہوتا ہے۔

یہ علامہ صاحب کی شخصیت اور فن سے متعلق دوسری کتاب ہے جو پیش کی جا رہی ہے، پہلی کتاب ندیم شبلی ایڈوکیٹ (فیصل آباد) نے ترتیب دی اور شائع کی، جس میں علامہ صاحب کے کراچی سے تعلق رکھنے والے سامعین کی آراء شامل تھیں۔ دوسری کتاب جو لاہور کے سامعین کے آراء پر مشتمل ہے وہ بھی ندیم شبلی صاحب تیار

کر چکے ہیں وہ بھی جلد منظرِ عام پر آنے والی ہے اور انشاء اللہ یہ سلسلۂ اعتراف فن و ہنر اسی طرح جاری رہے گا۔

اللہ خوش ہونے والوں کو خوش رکھے اور جلنے والوں کو خوب جلائے۔

ارے او جلنے والے کاش جلنا ہی تجھے آتا
یہ جلنا کوئی جلنا ہے کہ رہ جائے دھواں ہو کر
(یاسؔ یگانہ چنگیزی)

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی
اکتوبر ۲۰۰۳ء

٩٣
شخصیت

ڈاکٹر فرمان فتحپوری

خوابوں کی تعبیر

علامہ ضمیر اختر نقوی کی ادبی خدمات کے سلسلے میں آج کی اس محفل میں علامہ ضمیر اختر نقوی کی کتابوں کے حوالے سے علم وادب کے جتنے مسائل زیر بحث آگئے ہیں، میں اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں یہ کہتا ہوں کہ اتنے مسائل کسی کتاب کی تعارفی تقریب میں کبھی زیر بحث نہیں آئے۔ یہ اس محفل کا واقعی ایسا حاصل ہے کہ فلسفے کے حوالے سے، عشق کے حوالے سے، سماجیات اور سیاسیات کے حوالے سے اور عقائد اور دین کے حوالے سے میں نے جتنی کارآمد باتیں اس محفل میں سنیں، کم سے کم کسی کتاب کی تعارفی تقریب میں اس طرح کی باتیں سننے میں نہیں آئیں۔ یہ باتیں کیوں ہوئیں؟ ایسی عالمانہ باتیں، ایسی حق اور صداقت اور علم وادب سے بھری باتیں کیوں ہوئیں؟ وجہ یہ ہے کہ موضوع گفتگو عظیم سے عظیم تر ہوگا تو گفتگو بھی بڑی ہوگی، وسیع اور روشن ہوگی۔ اس محفل میں ایک جوش وخروش پایا جارہا ہے جبکہ چار گھنٹے مسلسل گزر چکے ہیں اور محفل پر کوئی جمود طاری نہیں ہوا، آپ کو کسی قسم کی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ علامہ ضمیر اختر نقوی کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کے تنوع، ان کی ادبی رنگارنگی اور ذوقِ علم وادب سے اتنی شاخیں پھوٹ رہی ہیں کہ آپ تقریروں کا لطف لیتے رہے۔ میں علامہ ضمیر اختر نقوی کو اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھتا ہوں۔

ڈاکٹر عالیہ امام

محبت کا خراج

جہل و تاریکی و نفرت و زرگری کے اس ماحول میں علم و ادب کی محفل، کتابوں کے اجرا کی تقریب کا انعقاد کیا معنی رکھتا ہے؟ لیکن میں نے تاریخ پر نگاہ ڈالی تو مجھے جواب ملا کہ جہل کے ریگ زاری میں علم کی جوت جگائی جاتی ہے۔ مجھے تاریخ سے جواب ملا کہ دہکتے ہوئے انگاروں ہی میں حق اور صداقت کے پھول کھلائے جاتے ہیں، علم کی محبت سے روشنی کا دیا جلایا جاتا ہے، ایک تنہا انسان علم کی لو کو تیز تر کرتا ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی ادراک و آگہی کی باڑھ پر آیا ہوا دھارا ہیں۔ میں ان کو دل کی گہرائیوں سے محبت کا خراج پیش کرتی ہوں۔ علامہ ضمیر اختر نقوی اپنی زندگی کے سرد و گرم سے گزرے اور ایسے مراحل بھی آئے کہ جب وہ آگ اور خون کے دریا سے گزرے ہیں لیکن وہ پگھلے نہیں ہیں بلکہ فولاد بن گئے ہیں، صرف فولاد نہیں بنے بلکہ سونا بن گئے ہیں، صرف سونا نہیں بنے بلکہ کندن بن گئے ہیں، صرف کندن نہیں بنے ہیں بلکہ اس کندن کو ریزہ ریزہ کر کے آپ کے لیے علم و ادب کے سونے کی دکان سجا دی ہے، سچے موتیوں کی دکان سجا دی ہے۔ اب آپ کا کام ہے کہ آپ ایک جوہری کی طرح ان موتیوں کو اپنے سینے میں بسالیں۔ علامہ ضمیر اختر نقوی اس عہد کے نئے کوہ کن ہیں جو نئے تیشے لے کر نئی پیکر شیریں تراشنے کے لیے اس میدان میں اتر آئے ہیں: ''بساطِ رقص بسیط ہو اور کوہ کن کی جیت ہو''

———

تحریر: آلِ محمد رزمی

علامہ ضمیر اختر نقوی

حیات و خدمات

علامہ ضمیر اختر نقوی عرصہ سینتیس ۳۷ سال سے علم و ادب کی خدمت اور تحقیق و جستجو میں مصروف ہیں۔ قلم قبیلے سے ان کا رشتہ بہت پرانا ہے۔ وہ ایک طویل عرصے سے لکھنے لکھانے میں مصروف اور فن، مذہب، ادب اور مرثیہ نگاری پر تحقیقی کام کر رہے ہیں اور ستائش کی تمنا اور تنقید سے بے نیاز ہو کر انتہائی خود اعتمادی سے مذہب اور ادب کی خدمت میں نیک جذبوں کے ساتھ مصروف ہیں وہ بہت کچھ لکھ رہے ہیں، خواب سے تعبیر تک کے مرحلے میں یعنی تحریر سے طباعت تک کے طویل فاصلے کو طے کرنے والا اس کرب کو سمجھ سکتا ہے جو ہماری قوم کی اجتماعی بے حسی اور غیر ذمہ داری کی وجہ سے ہماری قوم کے لکھنے والوں کو پیش آتی ہے، ہنر کا کرب کسی بے ہنر کو کیا معلوم، علامہ ضمیر اختر نقوی ایک آہنی عزم کے مالک اور مستقل مزاج اور روشن فکر انسان ہیں اور اسی روشن فکری کی وجہ سے وہ سالہا سال سے جرم خود آگہی کی سزا پا رہے ہیں۔ اگرچہ روشن فکری ایک ایسی ذہنی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو آفاقی معیار کی تلاش، قاعدہ کلیہ کی جستجو اور عمومی نتائج کے حصول میں سرگرم رکھتی ہے۔ یہ کیفیت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ تاریخی حقائق سے چشم پوشی یا جانبداری سے کام لیا جائے۔ علامہ ضمیر اختر

نقوی اہلِ علم، اہلِ دل اور اہلِ ظرف آدمی ہیں لہٰذا وہ ان سب باتوں سے آسانی سے رنجیدہ نہیں ہوتے۔

اپنے فنی و ادبی سفر کے آغاز میں ہی علامہ ضمیر اختر نقوی کو یہ احساس تھا کہ ان کی ذات جس تہذیبی پس منظر سے نمو حاصل کر سکتی تھی اس کا شیرازہ بکھر چکا ہے، قوم کی تہذیبی انفرادیت کی بازیافت کے بغیر عرفانِ ذات اور عرفانِ ذات کے بغیر کسی منزل تک پہنچنا دشوار اور اہداف کا حصول ناممکن ہے۔ ان کا تعلق لکھنؤ کی گنگا جمنی تہذیب سے ہے وہ اپنے تہذیبی پس منظر سے الگ ہو کر نہ اپنے ادبی سفر کا آغاز کرنا چاہتے تھے اور نہ تقریری سفر کا، علامہ ضمیر اختر نقوی بنیادی طور پر IRATIONAL سکالر اور دانشور کی حیثیت سے صاحبِ طرز، صاحبِ عقل، شائستہ خطیب بھی ہیں کیونکہ کوئی بھی دانش ور قوتِ گفتار اور سلیقۂ اظہار کے بغیر اپنے مافی الضمیر، اپنے علمی و فکری و نظریاتی مشاہدات و تجربات کو بیان نہیں کر سکتا۔ اس طرح وہ BASICALLY خطیب بھی ہیں اور دانش ور بھی، ایک اہلِ نظر، ایک اہلِ فکر، ایک محقق، ایک نقاد، ایک خطیب فنِ مرثیہ نگاری کے ماہر کی حیثیت سے برصغیر پاک و ہند و مغربی ممالک میں ان کی شخصیت اور ان کا فن تعارف سے بے نیاز ہے۔

تقسیمِ ہند کے بعد ان کا مطالعاتی، مشاہداتی، تجرباتی اور تخلیقی عمل جاری و ساری ہے، اور اس جمالیاتی مشاہدہ <AESTHETIC EXPERIENCE> کا شعور انسان میں مشکل سے پیدا ہوتا ہے جو علامہ ضمیر اختر نقوی کے یہاں ۳۷ سال کے قلیل عرصے میں پایا جاتا ہے یہ ان کے تفکرِ شب و روز کا ثمرہ اور واردات و مشاہدات کا حاصل ہے۔

یہ امر باعثِ حیرت ہے لیکن مسلّم ہے کہ اس کائنات میں حیاتِ انسانی کا مطلوب و مقصد یا نصب العین و ہدف ایک دوسرے سے مختلف ہے اگر اجتماعی طور پر کچھ لوگوں کا

مقصد یا نصب العین ایک ہو بھی تو اول یہ شے عارضی و ناپائیدار ہے دوسرے یہ کہ انفرادی طور پر ہو سکتا ہے کہ اس کا مقصد اور ہدف کچھ اور ہو لیکن جہاں تک علامہ ضمیر اختر نقوی کا تعلق ہے ان کی زندگی کا ہدف صرف فضائل و مناقب و مصائب آلِ محمدؐ کا انتخاب ہے اور اپنے اس انتخاب کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنچا کر اپنے مخصوص رنگ تحریر و تقریر کی شکل میں پیش کرتا ہے خواہ یہ فضائل و مصائب قرآنی آیات میں ہوں، حدیثوں میں ہوں یا مرثیہ کی شکل میں ہوں، وہ علم و ادب کے اس بحر بیکراں کی غواصی کر کے دُرِ نایاب تلاش کر کے اہلِ فکر تک پہنچاتے ہیں، غواصی کا یہ عمل اتنا آسان نہیں، ان کے اردگرد ایک طرف معاشی کشمکش ہے، دوسری طرف نفسیاتی گھٹن، تیسری طرف بے تعلق اشیاء میں ربط و تعلق کی تلاش اور چوتھی طرف امید و بیم کی کیفیت۔ علامہ ضمیر اختر نقوی بحیثیت ایک عالم اور بحیثیت ایک فنکار تلاشِ مسلسل میں مصروف اور ادب اور زندگی کے درمیان رشتے جوڑنے میں مشغول رہتے ہیں۔ ان رشتوں کو جوڑنے میں وہ اپنی اقدار کو بھی پیشِ نظر رکھتے ہیں۔ علم، ادب اور زندگی ایک مثلث ہے، ادب اور زندگی کا اصل رشتہ محض قدروں کے حوالے سے ہی ممکن ہے۔ اس طرزِ احساس کی بدولت پیدا شدہ علامتیں قومی روایات بن جاتی ہیں اور جب تک ہم اپنی روایات میں رہ کر تخلیقی تجربے کرتے رہیں گے اس وقت تک زندہ علامتیں ہماری روحانی آسودگی کا سبب بنتی رہیں گی۔ علامہ ضمیر اختر نقوی کی تلاش ایک روایت بھی ہے اور ایک علامت بھی۔ ان کی تقریروں میں اپنا تحقیقی مزاج ہے، قدیم و جدید خطیبوں سے جداگانہ رنگِ خطابت میں انھوں نے ایک جدید علمی تقویم کے نقوش اُبھارے ہیں اور معارفت کے عناصر کو نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے اپنے سامعین کو روحانی ایمانی، فکری و حسی آسودگی سے مالا مال کر دیا ہے۔

اگر ہم لکیر کے فقیر بنے رہیں اور تلاش و جستجو اور مشاہدات و تحقیقات سے کنارہ کش ہو جائیں تو یہ کنارہ کشی ہماری علمی موت بن سکتی ہے جو بہ الفاظ دیگر تخلیقی صلاحیتوں کی موت ہے۔ ہم ایک موت سے اپنے روح کے بنجر پن کو چھپائے پھر رہے ہیں۔ ہماری روح کا یہ بنجر پن خود ہماری بے حسی و تغافل کا نتیجہ ہے۔ ہمارے منبروں سے جو کچھ بیان ہو رہا ہے اس بیان میں نہ کوئی ندرت ہے، نہ تحقیق، نہ کوئی پیغام ہے، نہ کوئی نیا پن ہے نہ اچھوتے موضوعات آخر ہم کب تک لکیر کے فقیر بنے رہیں گے بدلے ہوئے حالات اور اس کے رخ کو دیکھتے ہوئے ہمارے خطباء کو تاریخ کے وسیع و عریض جنگل کی سیر کرنا چاہیے اور احادیث کے گہرے سمندروں میں غوطہ لگانا چاہیے، قرآن کے مفاہیم و مطالب اور اس کے عمیق ترین موضوعات پر بھی غور و فکر کرنا چاہیے، ادب کے وسیع و عریض صحرا کی بھی خاک چھانی چاہیے، روایت و درایت، معقولات و منقولات کی روشنی میں اپنی خطابت کو جلا بخشنی چاہیے، میں یہ دیکھ رہا ہوں کہ سوائے علامہ ضمیر اختر نقوی کے ہر شخص پرانی لکیروں کو پیٹ کر اپنا پیٹ بھر رہا ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی تفسیر، حدیث اور تاریخ کا مدبرانہ شعور رکھتے ہیں، انھوں نے اپنے مطالعے اور تحقیقی تجربے اور مشاہدے کے تسلسل فکر کے ساتھ تقریر و تحریر میں اس طرح پیش کیا ہے کہ آنے والے عہد میں اس چراغ سے بہت سے علمی چراغ روشن ہوں گے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کے انداز بیان میں لفظوں کی سجاوٹ کا میکانکی عمل نہیں ملتا جو لکھنؤ کی خطابت کا خاصہ ہے بلکہ ان کے یہاں جا بجا بے ساختگی ہے، ان کا انداز بیان سادہ، شائستہ، شگفتہ اور سلیس ہے۔ وہ دو ٹوک بات کہنے کے عادی ہیں۔ انھوں نے اوائل عمری سے سن شعور تک کا زمانہ اودھ کی آغوش میں بسر کیا، لہٰذا اودھ کی گنگا جمنی

تہذیب و ثقافت و تاریخ اور وہاں کی علمی شخصیات خطیبوں، ادیبوں، شاعروں، عمارتوں، عجائبات، کتب خانوں، علمی اثاثوں، علما و تاریخی شخصیتوں اور وہاں کے اہل فن کے بارے میں مکمل آگہی و معلومات رکھتے ہیں۔ وہ ایک علمی و عملی انسان ہونے کے ناطے مذہب و ادب کے بارے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور بہت کچھ لکھ رہے ہیں اور بہت کچھ لکھیں گے، ذاتِ واجب ان کے قلم کو مزید جولانی و توانائی عطا فرمائے۔ یہاں ان کے فن خطابت کے بارے میں کچھ عرض کرنا مقصود ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی تقریروں کے جدید موضوعات:

علامہ ضمیر اختر نقوی نے علمی، ادبی و تحقیقی خطابت کی بنیاد رکھی ہے، یہ اپنے طرز کی جدید خطابت ہے، اُن کی خطابت تقلیدی نہیں ہے بلکہ اُنھوں نے اپنی خطابت میں معارفت، علم اور تحقیقی شعور کو اہم عناصر قرار دیا ہے۔ یہ طرز خطابت اُن کا اپنا ہے اُنھوں نے اپنی خطابت پر کسی قدیم و جدید خطیب کا اثر کبھی پسند نہیں کیا، کسی فن میں جدید طرز کی ایجاد مشکل ترین کام ہے لیکن وہ اپنی فکر میں سو فیصد کامیاب ہیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی جدتِ فکر کا اندازہ اپنی کی تقریروں کے موضوعات سے ہوتا ہے، ایک موضوع کا انتخاب پھر موضوع کو تمہید سے مصائب تک برقرار رکھنا کوئی آسان کام نہیں، اُنھوں نے اپنی انفرادیت سے اپنے عہد میں معاصر خطباء سے ممتاز حیثیت حاصل کی ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی نے خطابت کا آغاز ۱۹۵۸ء میں لکھنؤ سے کیا تھا، ۱۹۶۷ء میں وہ ہجرت کر کے لکھنؤ سے کراچی آئے اور رضویہ سوسائٹی میں قیام کیا اور یہیں سے اُنھوں نے پاکستان میں خطابت کا آغاز کیا۔ رضویہ سوسائٹی میں اُن کا عشرۂ اربعین ہر سال بڑے ذوق و شوق سے سنا جاتا ہے۔ اس عشرے کے سال بہ سال عنوانات

بالترتیب درج ذیل ہیں۔

''قرآن اور سیرتِ آئمہ'' (۱۹۸۲ء)، ''عظمتِ قرآن'' (۱۹۸۳ء)، ''قاتلانِ حسینؑ کا انجام (۱۹۸۴ء)''، ''محسنینِ اسلام'' (۱۹۸۵ء)، ''حضرت علیؑ اور تاریخ اسلام'' (۱۹۸۶)، ''امام اور اُمت'' (۱۹۸۷ء)، ''اسلام کا طرزِ معاشرت'' (۱۹۸۸ء)، ''عورت اور اسلام'' (۱۹۸۹ء)، تاثراتِ زیارات ، کربلا و نجف (۱۹۹۰ء)، ''علم زندگی ہے'' (۱۹۹۳ء)، ''معصومینؑ کا علم لسانیات'' (۱۹۹۵ء)۔

لاہور میں عشرہ محرم میں حسینیہ زینبیہ میں آپ کی مجلس کا عنوان تھا ''علوم آلِ محمدؐ'' عشرۂ محرم کی دوسری مجلس میں امام بارگاہ آلِ عمران خواجگان نارروالی اکبری گیٹ میں آپ کی تقریر کا عنوان تھا ''شریعت کا اثر و نفوذ'' عشرۂ محرم کی تیسری مجلس منعقدہ امام بارگاہ سجادیہ شیخوپورہ کا عنوان تھا ''زندگی اور بندگی'' علامہ ضمیر اختر کی ایک مجلس کا عنوان ''آنسو'' تھی آپ نے سب سے پہلے سورۂ بنی اسرائیل نمبر ۱۰۹ سے آنسو کو کلامِ پاک سے ثابت کیا اور مجلس کا آغاز کچھ اس طرح کیا ''نماز و عبادات و دعا کے اوقات میں انسان آنسو کا سہارا لے کر اپنی عبادات و دعا کو مستجاب کرانے کی کوشش کرتا ہے۔ بہتی ہوئی آنسو کی دھاریں، آنسوؤں سے بھیگی ہوئی پلکیں خضوع و خشوع کی نشانی ہوتی ہیں اپنے گناہوں پہ پشیمانی انسان کی آنکھوں سے ٹپکے ہوئے یہ آنسو ہی اس کی بخشش کا سبب بن جاتے ہیں، قرآنی آیات میں کہیں تبسم کا ذکر نہیں۔ آپ نے اس کے استدلال میں پھر سورہ توبہ کی آیت ۸۲ کا حوالہ پیش کیا آپ نے فراق یوسف میں آنسوؤں کا حوالہ دیا پھر ایک اور عنوان آنسو اور تاریخ اسلام قائم کیا اس طرح تاریخ اسلام میں جہاں بھی آنسو اور گریہ کا ذکر تھا آپ نے مستند سیر و کتب و تاریخ کے حوالے سے بیان کیا پھر آپ نے اپنی تقریر میں درج ذیل دیگر عنوانات قائم کیے آنسو اور

صوفیائے کرام، آنسو اور شعرائے اردو، شہادت حسینؑ پر رسالت مآب کے آنسو، غم حسینؑ میں حضرت علیؑ کے آنسو، غم حسینؑ میں حضرت فاطمۃ الزہرا کے آنسو، شہادت حسینؑ کی خبر سن کر حضرت امام حسن مجتبیٰ کے آنسو امام حسینؑ اور آنسو، حضرت زین العابدینؑ اور آنسو، حضرت امام محمد باقرؑ اور آنسو" حضرت امام جعفر صادق اور آنسو، حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام کا گریہ، شہادت حسینؑ پر حضرت امام رضاؑ کا گریہ، شہادت حسینؑ پر حضرت قائم آل محمد علیہ السلام کا گریہ آپ نے ملاحظہ فرمایا آنسو بظاہر ایک معمولی سا عنوان تھا لیکن آپ نے اس پر ایک طویل تقریر فرمائی اور از اول تا آخر آنسو کے موضوع سے نہ ہٹے اور آیات و احادیث، اور دیگر علماء اہلسنت کے حوالے سے آنسو کی اہمیت کو ثابت کیا۔

قدیم عنوانات میں جدید رنگ کی آمیزش:

اسی طرح آپ کی تقریر کے دیگر عنوانات میں بظاہر قدامت نظر آتی ہے لیکن جدید رنگ کی آمیزش نے حُسن پیدا کر دیا ہے۔ عناصر اربع پر چار تقریریں فرمائیں، آگ ہوا، پانی اور مٹی آپ نے جب آگ کو اپنی تقریر کا سرنامہ کلام بنایا تو آگ کی تاریخ، اس کی اہمیت و افادیت و ضرورت بیان کی اور اسی آگ کو مصائب کو عنوان بھی بنایا اسی طرح کوہ طور سے کربلا اور شام غریباں تک آگ کے موضوع پر مکمل ماخذ مصادر کے ساتھ گفتگو رہی اور اسی طرح ہوا مٹی اور پانی پر بھی تقاریر فرمائیں۔

آپ نے رنگ، آواز، چراغ، ہاتھ، شیر، فضہ، گھوڑا، ہاتھی، ذوالجناح اور ناقہ وغیرہ کو اپنی تقریر کا عنوان قرار دیا، جب آپ نے گھوڑے کے موضوع پر تقریر فرمائی تو گھوڑوں کی پوری تاریخ بیان فرمائی پوری دنیا کے گھوڑوں کا اور ان کی خصوصیات و عادات کا تذکرہ کیا لطف یہ ہے کہ مکمل حوالہ جات کے ساتھ آخر میں حضرت عباسؑ اور

امام حسینؑ کے گھوڑے پر مجلس کو مصائب کے ساتھ ختم کیا۔ آپ نے ناقہ کو عنوان بنایا تو اونٹوں کی قسمیں بیان کیں ناقہ صالح اور حضرت رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے ناقہ کے متعلق بیان فرمایا اور اسی عنوان پر فضائل و مصائب تمام کئے۔ جانوروں پر حیوان اور قرآن کے عنوان سے آپ کا ایک پورا عشرہ موجود ہے۔ آپ جس بھی موضوع کو اپنی تقریر کا موضوع قرار دیتے ہیں اس سے پورا پورا انصاف کرتے ہیں اور کہیں بھی سامعین کو یہ محسوس نہیں ہوتا ہے کہ کوئی چیز بھرتی کی ہے، ہر چیز مکمل اسناد کے ساتھ پیش کی جاتی ہے آپ کی ایک بڑی معرکۃ الآرا تقریر "ذوالفقار کے موضوع پر ہے جس میں آپ نے ذوالفقار کی پوری تاریخ بیان فرمائی، شان نزول اور ذوالفقار کی عظمت اور بڑی سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ علامہ سید ضمیر اختر مجالس کے موضوعات کے انتخاب میں اپنا جواب نہیں رکھتے اور موضوع کو نبھانا بھی خوب جانتے ہیں، اسی سال مئی ۱۹۹۳ کا ذکر ہے کہ ناچیز اپنے جد حضرت ثامن آلائمہ حضرت امام علی رضا علیہ السلام کی زیارت کے لئے گیا، مشہد مقدس میں شیخ حر عاملی میں جہاں روزآنہ مجالس برپا ہوتی ہیں اور محدث فقہ جعفریہ آیت اللہ شیخ شبیر حسن نجفی دام مجدہ خطاب فرماتے ہیں۔ حضرت آیت اللہ نے علامہ سید ضمیر اختر نقوی کو مجلس پڑھنے کی دعوت دی موسم بہت سخت تھا، باہر بارش ہورہی تھی اور ہال میں خاصی سردی تھی علامہ نقوی نے تاریخ آستانہ قدس کو سرنامہ کلام قرار دے کر جو مجلس پڑھی ہے وہ ایک یادگار مجلس ہے مولانا موصوف نے آستانہ قدس کی تاریخ کہ کس عہد میں تعمیر ہوا۔ کس عہد میں اس کی تزئین مزید ہوئی اس کے اندر جو چڑھاوے رکھے ہیں وہ کس کس بادشاہ نے نذر کئے، آستانہ قدس کی لائبریری کی تفصیلات، آستانہ قدس کے عجائب گھر اور اس میں رکھی ہوئی چیزوں کا ذکر، آستانہ قدس کے جواہرات وزیورات کا تذکرہ بڑی تفصیل سے فرمایا اور اتنے دلخراش

مصائب بیان فرمائے کہ گریہ وزاری اور آہ و بکا کی آواز میں گرجتے ہوئے بادلوں اور برستی ہوئی برسات کی آواز دب گئی۔ بڑی یادگار اور مقبول مجلس تھی۔

علامہ ضمیر اختر گذشتہ کئی سال سے ماہ رمضان المبارک میں تفسیر قرآن بھی کر رہے ہیں اور سورۂ رحمن پر نہایت مفصل، مکمل اور مدلل گفتگو کر چکے ہیں۔ علامہ صاحب کا انداز تحریر بھی بڑا سادہ اور دلنشیں ہے قاری ایک رکوع یا اس کے کچھ حصہ کی تلاوت کرتا ہے اور علامہ صاحب اس کا ترجمہ، اس کی تاویل اور شان نزول، بیان فرماتے ہیں اور مختلف مفسرین کے حوالے سے اپنی دلیل کو مستحکم بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ اول تو ہمارے یہاں تفسیر قرآن سننے کا شوق سرے سے ہے ہی نہیں۔ بس یہ شوق خوجہ اثنا عشری تک محدود ہے۔ کاش ہم میں قرآن فہمی، اور قرآن شناسی کا شوق بھی پیدا ہو سکتا۔ علامہ ضمیر اختر صاحب ایک عرصہ سے اس امر کے لئے کوشاں ہیں کہ مومنین کرام میں قرآن فہمی کا ذوق پیدا ہو جائے۔

علامہ ضمیر اختر قرآن فہمی کے ساتھ ساتھ، قرآن اور عزاداری، تاریخ عزاداری، قاتلانِ حسینؑ کا انجام، مستند تاریخ کربلا، قرآن کی قسمیں، سیرت معصومینؑ، عشرہ حضرت فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا کے موضوعات پر بھی مسلسل خطاب فرماتے رہے ہیں علاوہ ازیں علامہ صاحب نے اپنی تقریر کے سلسلے میں لکھنؤ کے چار سفر کئے علاوہ ازیں آپ نے ہندوستان، ترکی، ایران، عراق، سعودی عرب، انگلستان، ہالینڈ، امریکہ، بلجیم، فرانس، اور جرمنی میں بھی مجالس عزا سے خطاب فرمایا ہے۔ آپ کے حج کے دوران، جدہ، مکہ، مدینہ اور عرفات اور منیٰ میں تاریخی مجالس سے خطاب فرمایا اور تاریخ سیرت و کتب کے حوالے سے یہ ثابت کیا کہ یہاں پر کس کس دور میں مجالس عزا برپا ہوئیں کس اہتمام و احترام سے ہوئیں اور کس کس نے خطاب فرمایا۔ آپ کی ایک

تقریر جس کا عنوان "گل نرجس" تھا خاصی مقبول ہوئی اس مجلس میں آپ نے گل نرجس کی تاریخ وصفات بیان کی اور حضرت نرجس خاتون کے فضائل بیان فرمائے۔
آپ کی تقاریر، تاریخ فدک، عالم اور عابد بھی قابل ذکر ہیں۔ آپ نے رنگ، عناصر اربعہ، پھل، اور جانور کے علاوہ پرندوں کے موضوع پر بھی تقریریں فرمائیں لطف یہ ہے کہ اسی موضوع پر فضائل اور مصائب دونوں بیان فرماتے ہیں آپ کی ایک تقریر کا عنوان تھا "بیماری" اس میں آپ نے بیان فرمایا کہ اہل بیت الطاہرین علیہم السلام کو کسی طرح کا مرض نہیں ہوتا آپ نے حضرت ابو طالبؑ کی توحید، حضرت ابو طالبؑ کی نعت گوئی، حضرت ابو طالبؑ کی شجاعت، حضرت ابو طالبؑ کی قربانی علاوہ ازیں خلقت کائنات" ولایت علیؑ، فضائل درود، بنی عباس کی سازش، خدیجہؑ اور علیؑ کے متعلق بیان فرمایا تفسیر قرآن میں آپ نے حروف مقطعات، یٰسین اور قرآن، سورۂ قدر اور اسی سورۂ قدر کے ذیل میں فاطمہ بنت اسد اور نبی کی پرورش پر گفتگو کی، تاریخ نجف، نماز، فروع دین پر تفصیلی بحث فرماتے ہیں استدلال کے ساتھ اہل بیتؑ افضل ہیں یا نماز پر بحث کی، اور معصومین کے فضائل ومصائب بیان فرمائے۔

علامہ ضمیر اختر کی ادبی مجالس:

حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے مسدس کی تشریح انیس و دبیر و جوشؔ پر علیحدہ علیحدہ خطاب فرمایا مرثیہ انیس مع تشریح، معروف مرثیہ گو شاعر حضرت فیضؔ بھرتپوری کے مجلس چہلم میں معراج شاعری کے عنوان سے تاریخی خطاب فرمایا، معروف شاعر احمد نوید اور حسنین جعفری کے والد ماجد کی مجلس چہلم میں فلسفہ عبادت اور شاعری کے موضوع پر جو خطاب فرمایا وہ مجلس اب تک اہل نظر کے حافظہ سے محو نہیں ہوئی۔
میر انیس کی صد سالہ برسی پر آپ کی تاریخی تقریر اور معروف دانشور سید ضیاء الحسن موسوی

عبقاتی کا وہ تاریخی جملہ مجھے اب تک یاد ہے "ضمیر اختر ہمارا قومی سرمایہ ہیں ان کی قدر کیجئے اور حفاظت کیجئے"۔

علامہ ضمیر اختر کا زورِ بیان اور حسنِ بیان

علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی خطابت پر مرثیہ اور ادب کا اثر بڑا گہرا ہے، وہ اُردو غزل پر واقعہ کربلا کے مرتب ہونے والے اثرات کے سلسلے میں ایک کتاب اُردو غزل اور کربلا کے عنوان سے تحریر کر چکے ہیں۔ علامہ سید ضمیر اختر نے قلی قطب شاہ امامی، آبرو، حاتمی، مرزا سودا، میر تقی میرؔ، میر حسنؔ، جعفر علی حسرتؔ، قلندر بخش جراتؔ، حیدر بخش حیدریؔ، شیر علی افسوسؔ، خلیفہ محمد علی سکندر، گدا علی گداؔ، مرزا پناہ علی بیگ افسردہ، احسان، ضاحک، میر حسن، مرزا جعفر علی فصیحؔ، دلگیرؔ، میر خلیقؔ، میر ضمیرؔ، مرزا دبیرؔ، میاں مسکینؔ، میر انیسؔ، میر مونسؔ، میر انسؔ، میر سلیسؔ، میر وحیدؔ، پیارے صاحب رشیدؔ، دولہا صاحب عروجؔ، عارفؔ، خبیر لکھنوی، لڈن صاحب فائزؔ، قدیم لکھنوی، شدید لکھنوی، فضل لکھنوی، واجد علی شاہ اختر، سید ناظم حسین ناظرؔ، آغا شاعر قزلباش، نجم آفندی، جوشؔ ملیح آبادی، جمیل مظہری، سید آلِ رضا، نسیم امروہوی اور عصر حاضر کے مرثیہ گو شعرا کا بڑا تفصیلی مطالعہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں علامہ نقوی نے خطیب اعظم، جدید طرز خطابت کے بانی شمس الواعظین مولانا سید سبط حسن اعلی اللہ مقامہٗ کے مسودات کا بھی بڑی ژرف بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ علاوہ ازیں نجم الحسن نثار اور نادر الزمن مولانا سید ابن حسن نونہروی، عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین صاحب کو بھی برسہا برس سنا ہے۔ لکھنوی ماحول سے نکل کر جب وہ پاکستان آئے تو انہوں نے علامہ رشید ترابی کو سُنا۔

علامہ رشید ترابی مرحوم نے خطابت کے ایک نئے مدرسہ کی بنیاد ڈالی۔ برصغیر میں مسلمانوں کی خطابت کا جائزہ لینے والے یہ بات مانیں گے کہ ترابی صاحب کا جدید

نسل پر گہرا اثر تھا اور نئی نسل کو قدیم روایات سے قریب لانے میں جتنا علامہ رشید ترابی کا ہاتھ ہے اتنا کسی اور ذاکر کا نہیں ہے۔ علامہ سید ضمیر اختر چونکہ ذہین آدمی ہیں لہذا انہوں نے علامہ رشید ترابی اور علماء وشعراء لکھنؤ کی خطابت وشاعری کا مطالعہ اور موازنہ کرنے کے بعد خطابت کے ایک نئے اسکول کی بنیاد رکھی یہ نیا مدرسہ جس کی بنیاد علامہ نقوی نے ڈالی ہے۔ اب کیسے چلے گا یہ کہنا مشکل ہے اور قبل از وقت کیونکہ اس اسکول خطابت میں پیروڈی کے امکانات معدوم ہیں اور پرانے اور گھسے پٹے مسودات سے کام نہیں چل سکتا۔ اگر پاکستان میں خطباء کی کساد بازاری نہ ہوتی تو بہت سے خطبا جو علامہ رشید ترابی مرحوم اور دیگر خطیبوں کی نقل کر کے مجلس پڑھ رہے ہیں یا اپنے ماسلف علماء کی مجالس کی کتابیں رٹ کر محرم کما رہے ہیں انہیں کوئی نہیں پوچھتا لیکن بدقسمتی سے آبادی کے تناسب سے خطباء کی تعداد خاصی کم ہے اور پھر یہاں خطابت کا کوئی اسکول مدرسۃ الواعظین کی طرز کا نہیں ہے جو دینی مدرسوں سے فارغ التحصیل بچوں کو خطابت کی تربیت دے سکتے۔ یہی وجہ ہے آج کل ہمارے خطباء میں خودرو خطیبوں کی تعداد زیادہ ہے جن کا دینی تعلیم یا دینی مدرسوں سے کبھی کوئی دور کا بھی واسطہ نہیں رہا ان خودرو خطیبوں کا مصادر وماخذ یا مستند خطباء کی آڈیو ویڈیو کیسیٹس ہیں یا مستند خطباء کی مجالس کی کتابیں ایک رجحان خطباء میں یہ بھی پایا جاتا ہے کہ سندھ کے خطباء پنجاب کے خطباء کی مجالس کو مناسب ترمیم کے ساتھ سنائیں اور پنجاب کے خطباء کراچی کے خطباء کی مجالس کو تھوڑی بہت تبدیلی کے ساتھ پنجاب میں سنائیں، اسی طرح پاکستان کے خطیب حضرات ہندوستان کے خطیبوں کے موضوع ومواد کو پاکستان میں پیش کریں اور ہندوستان کے خطیب حضرات پاکستان کے خطیبوں کی مجالس کی کتابوں اور کیسٹوں کو وہاں اپنی زبان میں سنوائیں۔ میرے ایک دوست خطیب جب عشرہ محرم پڑھ کر

پاکستان سے جانے لگے تو انہوں نے صرف پچاس کیسٹیں اور بہت سی مجالس کی کتابیں پاکستان کے خطیبوں کی خریدیں میں نے پوچھا کہ یہ کیا لے جا رہے ہو تو وہ فرمانے لگے نوٹ ہیں میں نے کہا کہ میں مطلب نہیں سمجھا تو انہوں نے کہا یہ نوٹ ہیں ڈالر ہیں، پونڈ ہیں اسی سے آئندہ سال عشرہ محرم میں لندن اور پورے ہندوستان میں مجلس پڑھوں گا وہ بچے، کھرے اور صاف گو آدمی تھے تو انہوں نے کہا کہ میاں ہم جیسے بی اور سی گریڈ کے خطباء عموماً ایسے ہی کرتے ہیں۔ خیر چلیں اس طرح محبت اور خیر سگالی کا جذبہ بڑھے گا، بات ہو رہی تھی علامہ سید ضمیر اختر کے اسکول خطابت کی تو میرا خیال یہ ہے کہ وہی اس اسکول خطابت کے موجد اور شاید وہی خاتم ہوں گے کیونکہ اس اسکول سے وابستگی و تعلق کے لئے تاریخ اور ادب کا گہرا مطالعہ درکار ہے اپنے تہذیبی سانچوں کی بازیافت اور اقدار و روایات سے روشناسی بھی ضروری ہے۔ علامہ ضمیر اختر نے اپنا بڑا قیمتی وقت کتابوں کی COLLECTION اور مطالعہ میں صرف کیا ہے ایک طرف وہ مجالس کی تیاریوں میں مصروف رہے دوسری طرف قلم کو ہاتھ سے نہیں رکھا۔ ہر دونوں محاذوں پر بڑی سنجیدگی، بڑے خلوص، بڑی دلجمعی، بڑی لگن اور بڑے جذبہ کے ساتھ جہاد میں مصروف ہیں یہ جہاد قلمی و لسانی ان کے مستقبل کے لئے انتہائی مفید ہے۔

علامہ سید ضمیر اختر نقوی نے جنگ خندق، سورہ احزاب کی روشنی میں جزیرہ خضرہ سورہ قدر کی روشنی میں، اور مختلف غزوات پر تفصیلی تقاریر فرمائی تھیں چونکہ مرثیہ گو شعراء کے یہاں بھی رموز خطابت اپنے پورے عروج پر تھے لہٰذا انہوں نے معروف خطباء لکھنؤ اور مرثیہ نگاری کی طرح ان عنوانات کو جو مرثیہ نگاری کے لوازم ہیں مثلاً رنگ، لباس، گھوڑا، تلوار، موسم، وغیرہ کو مرثیہ سے مستعار لے کر اپنی تقریر کا عنوان بنایا۔ خطابت میں ان عنوانات کی تخلیق کا مقصد اپنے قیمتی ورثے کو محفوظ رکھنا ہے۔ علامہ

ضمیر اختر کی خطابت میں روانی ہے شیریں بیانی ہے سلاست ہے طلاقت ہے سادگی ہے شگفتگی ہے، تلاش ہے جستجو ہے۔ مشاہدہ ہے مطالعہ ہے دریافت ہے، تحقیق ہے، معجز بیانی ہے علم ہے ادب ہے، شعور ہے، شاعری ہے، مرثیہ ہے، تاریخ ہے، حدیث ہے، قرآن ہے، تفسیر ہے، محاکات ہیں، صنائع ہیں بدائع ہیں، علوم عقلیہ اور نقلیہ ہیں، زبان و بیان ہے اسلوب ہے اور سب سے بڑھ کر عنوان کی انفرادیت وندرت ہے میں نے علامہ نقوی کی خطابت کی جن مذکورہ بالا صفات کا تذکرہ کیا ہے وہ قافیہ پیمائی نہیں اظہار حقیقت ہے میں نے علامہ موصوف کی جن صفات خطابت کا ذکر کیا ہے وہ محض ان کی خطابت کا ایک رخ ہے زندگی میں اگر کبھی فرصت کے لمحات میسر آئے تو کبھی تفصیل سے مولانا سید ضمیر اختر نقوی کی شخصیت وخطابت پر گفتگو ہوگی۔

ایک عنوان میں سمٹ آئیں گے عنوان کئی
داستان جب کبھی تحریر تمہاری ہوگی

علامہ سید ضمیر اختر اور اُن کی مجالس کے موضوعات:

یہاں ہم مولانا ضمیر اختر صاحب کا ایک عشرہ جس کا نام سرنامہ کلام ''معجزہ اور قرآن'' ہے۔ ان تقاریر میں ہم جستہ جستہ اقتباسات آپ کے مطالعہ کے لئے ہدیہ کر رہے ہیں لیکن اس سے پہلے میں اس عنوان کے متعلق کچھ بتاتا چلوں۔ علامہ ضمیر اختر صاحب کی تقریر کا وصف امتیازی یہ ہے کہ وہ پہلے عنوان سے متعلق توجیہ وتشریح و تفصیل بتاتے ہیں اور عنوان کے انتخاب کے اسباب وعلل پر روشنی ڈالتے ہیں تاکہ سامعین کرام عنوان کے پس منظر وپیش منظر کو کما حقہ سمجھ سکیں۔ گذشتہ نصف صدی سے جہان بشریت و مادیت کا اس قدر غلبہ ہو چکا ہے کہ مذہب اذکار رفتہ اور معجزات کو تقویم پارینہ اور ذہنی اختراع قرار دیا جا رہا ہے اور ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت سر

سید احمد خان سائنس کی ترویج و تبلیغ اور مغربی تعلیم کی مدح وستائش میں اس قدر آگے نکل گئے کہ وہ اسلام کی جامع و ہمہ گیر تعلیمات اور انبیاء و آئمہ کے معجزات کو دقیانوسیت اور فرسودیت سمجھ کر اس کی غیر محسوس طریقہ پر مخالفت کرنے لگے اور علی گڑھ کالج کے بہت سے اساتذہ جو اُن کے ہم خیال و دست نگر تھے اُن کے ان نظریات کی تبلیغ میں مصروف ہو گئے اور پورے برصغیر میں اُن کے اِن نظریات کو پھیلایا جانے لگا۔ اس کی ایک وجہ سر سید احمد خان کی مغرب پرستی یا مغربی تعلیم سے متاثر ہونا تھا اور دوسری وجہ ان سے اسلام سے کما حقہ عدم واقفیت تھی انہوں نے اسلام کو اس کے حقیقی مدعا و مفہوم کے ساتھ سمجھا ہی نہیں تھا یا یہ مغربی عیسائیوں کی کوئی سازش تھی جو سر سید احمد خان کے ذریعہ کی جا رہی تھی یا پھر سر سید احمد خان نے اسلام کو مغرب کے حوالے سے سمجھا تھا جہاں روحانیت کی گنجائش نہیں ہے اور اسی روحانیت کے فقدان نے عیسائیت کو صرف گرجوں اور بائبل تک محدود کر دیا ہے اور آج عیسائیت اپنی اصل ڈگر سے ہٹ چکی ہے دنیائے شیعت میں اس قسم کی بدعت علی گڑھ میں ملازمت کرنے والے ایک شیعہ عالم نے پھیلائی اور انہوں نے منبر سے نہ صرف معجزات پڑھنے چھوڑ دیئے بلکہ اس امر کا پروپیگنڈہ کیا کہ بجائے معجزات کے قرآن سے منطقی و عقلی دلیل کی جائے یا اصلاح و عمل کی بات کی جائے اس گمراہ کن پروپیگنڈہ کے نتیجے میں بہت سے شیعہ خطباء نے منبر سے معجزات بیان کرنے ترک کر دیئے اور اُسے خلافِ عقل سمجھتے ہوئے عوام کو بھی یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ وہ معجزات وغیرہ جیسے توہمات میں مبتلا ہونے کے بجائے حقائق و درایت سے کام لیں اور اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی پروپیگنڈہ مغربیت کے زیر اثر پلنے اور پنپنے والے دانشور اور خطباء مغرب پرستی اور سطحیت و پستی کی دلیل ہے اور یہ بات اصل میں علامہ ضمیر اختر عامۃ المسلمین اور خصوصاً عامۃ المومنین کو سمجھانا چاہتے

تھے اور وہ اس سازش کے جواب کو اپنی تقریر کی وساطت سے عوام الناس تک پہنچانا چاہتے تھے کہ وہ اسلام کی حیثیت سے بھی سوچتے ہیں اور عصری تقاضوں اور خارجی سازشوں سے بھی بے بہرہ نہیں ہیں وہ اسلام کے خلاف ہونے والی سازشوں کا مکمل ادراک رکھتے ہیں اور یہ بھی سمجھتے ہیں کہ یہ سازش بیرونی محاذ سے کبھی کامیاب نہیں ہو سکتی بلکہ اس سازش کو اگر کامیابی حاصل ہو سکتی ہے تو اندرونی محاذ پر اور اندرونی محاذ پر سازش کو کامیاب کرانے کا ایک ہی ذریعہ و وسیلہ ہے وہ ہے مجالس عزا کیونکہ اس اجتماع میں مومنین بڑی کثیر تعداد میں شریک ہوتے ہیں اور مجلس کے اثر کو بھی دوسرے اجتماعات و محافل کے مقابلے میں زیادہ قبول کرتے ہیں کیونکہ وہ ذاکر حسین کو مقتدر و محترم اور ثقہ سمجھتے ہیں اور وہ سادہ لوح مومنین یہ سمجھتے ہیں کہ خطیب یا ذاکر جو کہہ رہا ہے یہ بالکل درست کہہ رہا ہے یہ بالکل درست کہہ رہا ہے مخالفین اسلام یا مخالفین دنیائے شیعت نے پورے تجزیے و تجربے کے بعد عامۃ المومنین کو یہ باور کرانے کی کوشش کی معجزہ، فضائل، تولا اور تبرا وغیرہ پڑھنے کا دور نہیں رہا، معجزات کی نفی، اصلاح و عمل کے پُر فریب نعروں سے فضائل اہل بیتؑ سے چشم پوشی وغیرہ، علامہ ضمیر اختر نے قرآن اور معجزہ کو اپنے عشرہ کا سرنامہ کلام اسی لیے بنایا کہ عامۃ المسلمین یہ سمجھ لیں کہ سازش کیا ہے، قرآن کی اہمیت، افادیت، ضرورت اور عظمت کیا ہے اور معجزہ کا مدعا و مفہوم و معنی کیا ہیں اور اس کی ضرورت اور صداقت کو عقلی اور منطقی استدلال کو اہم مصادر و ماخذ کے ساتھ پیش کر کے عامۃ المومنین کو اس فکری فریب اور سازش علمی سے نجات دلانے کی تا حد بصیرت کوشش کی آپ نے قرآن کو سراپا معجزہ قرار دیتے ہوئے فرمایا۔ قرآن پاک میں لفظ معجزہ کے لیے آیات اور بینات جیسے لفظ استعمال کیے گئے ہیں یعنی کھلی ہوئی دلیلیں، معجزہ لفظ عجز سے نکلا ہے اور اگر کوئی معجزہ کو سمجھ لے تو عجز کہاں رہتا ہے اور جو چیز

عقل انسانی کو محدود دائرے میں آجائے وہ معجزہ نہیں ہو سکتا نہ اسے ریسرچ کے ذریعے سمجھا سکتا ہے نہ تجزیے و مشاہدہ کے ذریعے پروردگار عالم نے اپنے انبیاء کرام علیہم السلام، آئمہ الطاہرین علیہم السلام اولیاء اور اوصیاء کرام کو معجزات عطا فرمائے اور صاحبان تقویٰ کو بھی معجزہ عطا کرتا ہے جو اپنے انبیاء و آئمہ پر سچے دل سے ایمان رکھتے ہیں اور ان کی عظمت و بزرگی کے قائل ہیں یہاں ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ پروردگار عالم نے اپنے ان انبیاء و آئمہ کے معجزات کیوں عطا فرمائے اور آئمہ کو معجزات کی ضرورت کیوں پیش آتی ہے۔ اگر ہم اس فلسفے کو سمجھ لیں تو سر سید احمد خان کے فکری اسکول کی جانب سے معجزات کی عظمت کو گھٹانے کی سازش خود بخود ناکام ہو جاتی ہے کیونکہ سائنسی ارتقاء و ایجادات اور اس کی روز افزوں ترقی معجزات کی نفی کرتی ہے لیکن اس سائنسی اختراعات کے باوجود انسان معجزات کا متمنی رہتا ہے اگر یہ معجزات نہ ہوتے تو انسان اپنے خدا کی غیبی امداد پر یقین نہ رکھتا، اگر یہ معجزات نہ ہوتے تو شاید بنی نوع انسان قطعی مطلق العنان اور سرکش ہو جاتا اور خدا کے برگزیدہ بندوں پر یقین نہ رکھتا اور ایمان نہ لاتا سر سید احمد اسکول کے مبلغین، جس سائنسی ترقی و اختراعات و ایجادات کا پرچار کر رہے ہیں اگر سچ پوچھیں تو خود یورپ کے اہل فکر و نظر میں معجزات کے قائل ہیں خود حضرت عیسیٰ کے معجزات، مردوں کو زندہ کر دینا، کوڑھ کے مریض کو شفا بخشنا، علاوہ ازیں، یوحنا، متی، مرقس، لوقا اور دیگر حوارین کے معجزات اور عیسائی فرقے کے ایک عظیم مجذوب جیرا ڈ مجیلا کے معجزات پر پوری ایک کتاب موجود ہے جبکہ خود عیسائی معجزات کے قائل ہیں اور سائنس کی موجودہ ترقی کے علمبردار ہیں۔

وہ خود معجزات کے قائل ہیں تو سر سید احمد خان اور ان کے فکری اسکول کے مبلغ شیعہ خطباء معجزات کی مخالفت یا اس کی افادیت میں کمی کرنے کی سعی لاحاصل کیوں کر رہے

ہیں کہیں یہ اسلام اور شیعت کے خلاف سازش تو نہیں؟ ورنہ حضرت ختمی مرتبت کا معجزہ شق القمر، معجزہ معراج، طوفان نوح، سنگریزوں کا کلمہ پڑھنا، سورج کا پلٹنا، عصائے موسیٰ، یہ سب معجزہ نہیں تو اور کیا ہے۔

علاوہ ازیں آج بھی آئمۃ الطاہرین و بزرگان دین کے مزارات مقدسہ سے حاجت روائی نہیں ہوتی تو یہ اس کی بدتوفیقی اور بدقسمتی کی بات ہے۔

اسی طرح آپ نے اپنے ایک عشرہ کا عنوان محسنین اسلام قرار دیا اور اس عنوان میں آپ نے رسول امی، عظمت ابو طالب، عروس القرآن اور ذکر اہل بیتؑ جیسے عنوانات قائم کئے اور اس میں بھی آپ نے عامۃ المومنین کو اس سازش سے باخبر کیا جو محسنین اسلام کے خلاف بڑے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہورہی ہے اور ہوتی آئی ہے۔ آپ نے سامعین کے اذہان سے یہ فکر کھرچ پھینکنے کی کوشش کی کہ رسولؐ کے بارے میں یا ابو طالبؑ کے بارے میں یہ سوچنا بھی کفر ہے کہ وہ علم رکھتے تھے یا نہیں یا ابو طالب مسلمان یا صاحب ایمان تھے یا نہیں، آپ نے تاریخ کے چہرہ سے نقاب اٹھاتے ہوئے کہا کہ ان برگزیدہ ہستیوں کے خلاف سازش کا سلسلہ صدیوں پر محیط ہے اور یہ وہ اموی سازش ہے جو بنی ہاشم کی عظمت و ثقاوت و مرتبے کے خلاف ایک عرصہ سے جاری ہے آپ نے ان سازشوں کے پس منظر اور تاریخی حوالوں سے عظمت بنی ہاشم و محسنین اسلام بیان فرمانے کے لئے پہلے اس موضوع کا پس منظر بیان فرمایا کیونکہ پس منظر کو سمجھے بغیر واقعات کو سمجھنا اور کسی نتیجے تک پہنچنا دشوار ہے، لہٰذا آپ نے منطقی اور استدلالی طریقہ سے استنباط کیا ہے۔

۱۹۹۰ء میں آپ نے اپنے دورۂ کربلا و نجف سے واپسی پر ایک عشرہ کا عنوان "تاثرات کربلا و نجف" قرار دیا۔ آپ نے زیارت کی اہمیت اور فلسفہ سے آگاہ کیا اور

تاریخ سیر و کتب، اور روایات و اقوال آئمہ کی روشنی میں زیارت کے ثواب کے متعلق تفصیل بیان فرمائی اور اپنے تاثرات اس احسن طریقے سے بیان فرمائے کہ مومنین نے عشرے کے کیسٹ محفوظ کر لیے اور یہ عشرہ گائیڈ بک کا کام دیتا ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کا خداداد حافظہ و ذہانت:

علامہ سید ضمیر اختر نقوی کو ذات واجب نے بے پناہ صلاحیت، خداداد حافظہ اور ذہانت سے نوازا ہے۔ وہ جو کچھ پڑھتے ہیں اس کے مکمل متن و ماخذ و مصادر کو اپنے حافظے میں محفوظ رکھتے ہیں، حاضر جواب اور تجربہ کار خطیب ہیں تاریخ کی مکمل تفصیل پر گہری نظر رکھتے ہیں اور سُنی سنائی باتوں کے بجائے کتابوں کے مکمل حوالے کے ساتھ عنوان کو بیان فرماتے ہیں۔

علامہ سیّد ضمیر اختر نقوی کے حالاتِ زندگی:

نام : سیّد ضمیر اختر نقوی

والد ماجد : سیّد ظہیر حسن نقوی

والدہ ماجدہ: سیدہ محسنہ بیگم بنت سید ظفر عباس نقوی ایڈووکیٹ اپنے وقت کی معروف خطیبہ تھیں اور علومِ دینیہ و تاریخ پر بڑی گہری و وسیع نگاہ رکھتی تھیں۔

خاندانی پس منظر:

آپ کے دادا سید دیانت حسین نقوی قصبہ مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی کے رئیس تھے۔ آپ کے دادا کے متعدد کارناموں میں ایک کارنامہ نواب احمد حسین پریانواں (مصنف تحفۂ احمدیہ اور تاریخ احمدی) کو مذہب حقہ سے روشناس کرانا تھا۔

برادران وہمشیر گان:

علامہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب کے تین بھائی ہیں سب سے بڑے بھائی سید محسن اختر نقوی مقیم نیوجرسی امریکہ خود صاحب طرز خطیب اور مصنف ہیں ان کی معروف کتاب ٹریجڈی آف کربلا لندن اور امریکہ دونوں مقامات سے شائع ہو چکی ہے۔ آپ انگریزی اور اُردو دونوں زبانوں میں مجالس عزا سے خطاب فرماتے ہیں۔ علامہ موصوف کے چھوٹے بھائی سید تنویر اختر نقوی انگلینڈ میں مقیم ہیں علامہ موصوف کی تین بہنیں ہیں ایک بہن کنیز مہدی جو اُردو زبان میں ایم اے ہیں اور کراچی یونیورسٹی سے اُردو مرثیہ کی ثقافتی حیثیت میں پی ایچ ڈی کر رہی ہیں اور ماری پور آرمی اسکول میں مدرس ہیں دوسری بہن محترمہ پروین فاطمہ زوجہ سید علی اختر زیدی۔ انگلینڈ میں مجالس عزا سے خطاب فرماتی ہیں اور یورپ کی معروف ذاکرہ ہیں سب سے چھوٹی بہن نسرین فاطمہ سید ناصر رضا رضوی کی زوجہ ہیں اور نوحہ اور سوز خوانی اور ذاکری کرتی ہیں۔

ناصر رضا رضوی معروف سماجی شخصیت اور ادارہ مجلس المسلمین کے چیئرمین، انیس اکیڈمی کے سکریٹری اور امام بارگاہ چہاردہ معصومین انچولی سوسائٹی کے مینیجنگ ٹرسٹی ہیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کے ایک ماموں معروف دانشور، سید منتظر عباس نقوی اسلام آباد کے معروف ومصروف خطیب ہیں۔

علامہ ضمیر اختر صاحب کی پہلی مجلس:

علامہ ضمیر اختر نقوی نے اپنی زندگی کی پہلی مجلس ۱۹۵۸ء میں ۸ محرم کو اپنے آبائی وطن مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی میں پڑھی ۱۰ بجے صبح حضرت عباس علمدار کی نذر کی مجلس تھی۔ بغیر کسی پیشگی تیاری کی کتاب ہاتھ میں لے کر معجزات حضرت عباسؑ بیان

فرمائے اور پھر مصائب سرکار ابوالفضل العباسؑ بیان فرمائے مصائب میں بڑی رقت ہوئی جس سے آپ کی ست بندھی اور بزرگوں نے ہمت افزائی کی اور سراہا۔ چونکہ آپ کی والدہ ماجدہ خود ذاکرہ تھیں لہٰذا آپ کی خطیبانہ تربیت غیر محسوس طریقے پر ہوتی رہی۔ آپ چھوٹی چھوٹی مجالس پڑھتے رہے اس طرح آپ نے ۱۹۵۸ء میں متعدد مجالس سے خطاب فرمایا اس طرح آپ کی فطری جھجک بے باکی میں بدلتی چلی گئی اور ہمت بندھتی اور بڑھتی چلی گئی۔

علامہ ضمیر اختر کی خطابت کے ۳۷ برس:

جیسا کہ پہلے عرض کیا جا چکا ہے کہ موصوف نے پہلی مجلس ۱۹۵۸ء میں پڑھی۔ اب ہم آپ کی ۳۷ سالہ خطابت کا اجمالی جائزہ نذر مومنین کر رہے ہیں۔

۱۹۵۹ء میں دوسرے سال آپ نے لکھنؤ میں اس دور کے معروف خطیب مولانا سید کلب حسین صاحب قبلہ عرف کبن صاحب کی ایک مجلس جس کا عنوان والفجر تھا ایک بڑی مجلس میں کتاب دیکھ کر پڑھی اس مجلس میں آپ میں قطعاً خوف و جھجک ختم ہو چکا تھا۔ اس مجلس کو خاصا پسند کیا گیا اور مومنین نے اس مجلس کی تعریف و توصیف کی اور ہمت افزائی کی اس کے بعد آپ نے باقاعدہ گھروں اور عزاخانوں میں مجالس پڑھنے کا سلسلہ جاری رکھا۔

۱۹۶۰ء میں آپ نے اپنی زندگی کی پہلی تاریخی مجلس لکھنؤ کی تاریخی مسجد تحسین میں پہلی محرم کو پڑھی لکھنؤ کا علمی و مجلسی ماحول آپ کی خطابت کے لئے سودمند ثابت ہوا مجلس کے اختتام پر ہر شخص نے تاحدِ بصیرت اپنی گراں قدر آراء پیش کیں اور مفید مشوروں سے نوازا اور مجلس کے عنوان اور جزئیات زیرِ بحث آئے یہ ایک بڑی مجلس تھی اس مجلس کے بعد آپ نے خطابت کے میدان میں مستقل مزاجی سے قدم رکھا اور

باقاعدہ مجالس کی تیاری شروع کر دی۔

۱۹۶۱ء میں آپ نے افضل محل لکھنؤ میں ایک بڑی مجلس سے خطاب فرمایا اس مجلس کے لئے آپ نے پیشگی تیاری کی تھی مجلس کا عنوان ''علوم آل محمدؐ'' قرار دیا آپ نے اس موضوع پر تقریباً دو گھنٹے خطاب فرمایا اس تقریر کے بعد آپ لکھنؤ کے باذوق اور علم دوست سامعین کی توجہات کو اپنی جانب مبذول کرانے میں خاصے کامیاب ہو گئے یہ مجلس آپ کی خطابت کی راہ میں بڑی اہم ثابت ہوئی اس مجلس کے بعد معروف شاعر سید بادشاہ حسین ''دروانہ'' آبادی،

معروف خطیب للن صاحب کے صاحبزادے مولانا شریف الحسن ناظر مرحوم جو لکھنؤ کے معروف خطیب تھے ان حضرات نے بڑی ہمت افزائی کی اور مفید مشوروں سے نوازتے ہوئے اس سلسلے کو باقاعدہ جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔ لکھنؤ میں اس وقت سب سے معروف ومقبول و پسندیدہ خطیب علامہ سید کلب حسین کبن صاحب تھے لہٰذا آپ نے کبن صاحب کے علاوہ دیگر معروف خطیبوں مولانا سید غلام عسکری صاحب، خطیب الایمان مولانا مظفر حسین طاہر جرولی اور مولانا نجم الحسن نثار کو بڑی توجہ اور پابندی سے سنا اور ان کی خطابت، ان کے اسلوب اور ان کے مواد کو پیش نظر رکھتے ہوئے ان کی ہمیشہ سے یہی کوشش رہی کہ خطابت میں اپنے لئے علیحدہ راہ منتخب کریں اور اپنے لئے خود موضوع کا انتخاب کریں اور اپنی مجلس تیار کریں۔

خطابت کی وادی میں قدم رکھتے ہوئے مطالعہ کی طرف آئے تو تفسیر میں مولانا مقبول حسین دہلوی اعلی اللہ مقامہ کا ترجمہ وحواشی ''سلسبیل فصاحت'' مولانا ظفر مہدی صاحب کا نہج البلاغہ کا ترجمہ، نواب صاحب پریانواں کی تمام تصانیف، تحفۂ احمدیہ، انوار المطالب، تاریخ احمدی وغیرہ کا مطالعہ کیا اور ان سے متاثر ہوئے اور اس طرح

اپنی علمی استعداد میں اضافے کے لئے کوشاں رہے۔

۱۹۶۲ء میں ڈپٹی محمد عظیم صاحب کے امام باڑہ وزیر گنج لکھنؤ میں ذی قعدہ و ذی الحجہ کے مہینے میں تذکرہ چہاردہ معصومین کے نام سے شروع ہوا۔ یہ لکھنؤ کا منفرد و قابل ذکر و عجوبہ روزگار پروگرام تھا جس کے بانی مسعود حسین زیدی عرف منن بھائی تھے ان مجلسوں میں ہندوستان کے چوٹی کے خطیب شرکت کرتے تھے۔ ان مجالس میں فضائل و مصائب کا ایک خزانہ لٹایا جاتا تھا۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے ان مجلسوں سے درس حاصل کیا۔ پیلی کوٹھی آغا میر کی ڈیوڑھی پر انجمن شمشیر حیدری کی جانب سے ایک مجلس برپا ہوئی اس مجلس کی خطابت کے لئے علامہ ضمیر اختر صاحب سے رجوع کیا گیا اور موضوع حدیث کساء رکھا گیا۔ علامہ صاحب نے حدیث کساء کے موضوع پر پوری تیاری کے ساتھ ایک شاندار و مدلل تقریر کی اس تقریر کی ایک خاص وانوکھی بات یہ تھی کہ اس کے فضائل کا موضوع حضرت فاطمہؑ زہرا تھیں اور مصائب کا ربط حضرت زینب سلام اللہ علیہا سے پیدا کیا گیا۔ اس تقریر کا لکھنؤ میں خاصا اور خاصے دن چرچا رہا۔ اس تقریر کے بعد آپ سے مختلف مقامات پر تقریر کے لئے وعدے لئے گئے۔ ایک مجلس آپ نے نواب صاحب شیش محل کے امام باڑہ میں عزاداری کے عنوان پر کی یہ تقریر بھی بہت کامیاب و مقبول رہی اس کے بعد متعدد مجالس کے وعدے لئے گئے۔ لکھنؤ کے عزادار و وضع دار سامعین جو اپنے ذوق و علمی مزاج کی وجہ سے خاصے مشہور ہیں اور ایک اچھے تنقید نگار و مبصر بھی ہیں۔ انہوں نے علامہ کی تقریری کو اپنی آراء و مشوروں سے سنوارا۔

لکھنؤ جو کئی صدیوں سے عزاداری کا مرکز رہا ہے اور مجلس و آداب مجلس کی وجہ سے خاصی شہرت رکھتا ہے ڈپٹی عظیم صاحب کے امام باڑہ میں مجالس کا عظیم الشان پروگرام

منعقد ہوتا تھا اور یہ مجالس اکھاڑے کی مجالس کہلاتی تھیں ہندوستان کے تمام صف اول کے خطباء یہاں تشریف لاتے اس وقت ہندوستان کے چوٹی کے ذاکر اس میں مولانا شمس الحسن بجنوری، مولانا فیاض حسین ولید پوری، مولانا اخلاق مہدی زید پوری، مولانا وزیر حسین عابدی صاحب کلکتوی، مولانا سلیمان عباس صاحب بنارس، مولانا ملا طاہر صاحب، مولانا کلبِ صاحب قبلہ، مولانا محسن نواب صاحب، مولانا ابن حسن نونہروی، مولانا ابرار حسین پاروی، مولانا طاہر جرولی، مولانا حافظ علی صابر، مولانا مرزا محمد عالم، مولانا غلام عسکری صاحب، مولانا مرزا محمد اطہر، مولانا مرزا محمد اشفاق وغیرہ ہم ان سب مقررین کو ایک ایک موضوع جس میں توحید سے لے کر امام زمانہ تک کے موضوعات شامل ہیں خطاب فرماتے تھے یہی خطابت کی تربیت گاہ تھی اس تربیت گاہ نے علامہ ضمیر اختر صاحب کی خطیبانہ تربیت میں بڑا فعال و موثر کردار ادا کیا۔ علامہ ضمیر اختر نے ان تقریروں سے اکتساب فیض کیا۔ اور دوسرے سال ۶۳۔۱۹۶۲ء سے رجب میں درس گاہ کربلا کے نام سے ایک نیا پروگرام ڈپٹی صاحب کے امام باڑہ لکھنؤ میں شروع ہوا ان مجالس کے بانیان میں دیگر حضرات کے علاوہ علامہ ضمیر اختر صاحب بھی شامل تھے۔ اس عشرہ میں پانچ مجالس خطیب الایمان مولانا مظفر حسین طاہر جرولی اور پانچ مجالس سے دیگر ذاکرین خطاب فرماتے تھے۔ شہید انسانیت جیسی متنازع کتب پر سیر حاصل گفتگو ہوئی اس طرح شہید انسانیت کی غلط روایات و خلاف عقائد مواد کی اصلاح اور اس کے خلاف دلائل اور مصادر و ماخذ پیش کئے جاتے اس طرح ان مجالس نے مومنین میں تحقیقی و تحریری شعور پیدا کیا ان مجالس نے شہید انسانیت کے پورے کیس کی حقیقت عوام پر واضح کر دی جس سے مومنین میں ایک مزاجی کیفیت پیدا ہوئی کہ منبر سے صحیح فکر پیدا کرنا چاہیے اور عقائد کے معاملہ میں محتاط اور واضح ہونا

چاہیے۔

علامہ ضمیر اختر صاحب ایک طرف خطابت کے میدان میں آگے بڑھتے رہے اور دوسری طرف مطالعہ کی جستجو میں شہر کی مختلف لائبریریوں کی طرف رجوع کرتے رہے آپ نے امیر الدولہ پبلک لائبریری، لکھنؤ یونیورسٹی کی لائبریری، رفاہ عام لائبریری، شیعہ کالج کی لائبریری اور مشہور افسانہ نگار علی عباس حسینی کے ذاتی کتب خانہ میں اپنے مطالعہ کی تشنگی کو بجھانے میں مسلسل مصروف رہے۔ اس طرح آپ میں مطالعہ و تحقیق کا اعلیٰ ذوق و بے پناہ شوق پیدا ہوا۔

ان کتب خانوں میں آپ نے صرف و نحو، معانی و بیان، عروض، علم ہیئت، فقہ و اصول فقہ، علم کلام، منطق، فلسفہ، الٰہیات، طبیعیات، فقہ، علم الکلام، علم الرجال، تفسیر و تاریخ و احادیث و شعر و ادب کا مطالعہ کیا۔ شعر و ادب میں آپ کو صنف مرثیہ سے خاصہ لگاؤ پیدا ہوا اور یہی لگا آگے چل کر فن مرثیہ پر متعدد کتابیں لکھنے کا پیش خیمہ بنا۔ اسی اثناء میں آپ کے خطیب ایمان مولانا مظفر حسین طاہر جرولی سے گہری دوستی ہوگئی اور آپ نے ان کا حلقۂ دوستی اختیار کرنے کے ساتھ ساتھ دیگر علماء کی محفلوں میں بھی شرکت اختیار کی اس طرح حجۃ الاسلام علامہ علی ناصر سعید المعروف بہ آغا روحی سے بھی قریبی مراسم پیدا ہوگئے اور سرکار ناصر الملت کے شریعت کدہ پر روزآنہ شام کو بیٹھک جمتی جس میں سرکار سعید الملت اعلی اللہ مقامہٗ، جناب مہذب لکھنوی، ملا طاہر صاحب طاب ثراہ مضطر زید پوری، اور سرکار نصیر الملت اعلی اللہ مقامہٗ کے علاوہ شہر کے دیگر علماء و خطباء و شعراء و ادبی شخصیتیں شرکت کرتیں اور علمی و ادبی موضوعات زیر بحث آتے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کا اسلوب:

جب ہم نے علامہ ضمیر اختر نقوی سے ان کی موجودہ طرز خطابت کے منفرد اسلوب

کے بارے میں استفسار کی کہ آپ کا انداز بیان نہ ہندوستانی خطباء کی طرح واقعات و تمثیلوں پر مشتمل ہے نہ پاکستانی خطباء کی طرح گھن گرج پائی جاتی ہے۔ آپ نے یہ اسلوب کیسے اختیار کیا۔ مولانا نے کہا کہ خطیب ایمان مولانا مظفر حسین طاہر جرولی کی شادی میں کراچی سے خطیب اعظم مولانا سید محمد دہلوی اعلی اللہ مقامہ لکھنؤ تشریف لائے اور ولیمہ کی تقریب سے خطاب فرمایا۔ میں شیعہ کالج لکھنؤ میں زیر تعلیم تھا۔ مولانا سید محمد دہلوی نے اس تقریب ولیمہ کے علاوہ شہر میں متعدد مجالس ومحافل سے خطاب فرمایا۔ میں نے اپنے کچھ رفقاء کے ساتھ مل کر مولانا سید محمد دہلوی صاحب کو شیعہ کالج میں خطاب کی دعوت دی۔ یہ تقریر ایک منفرد و یادگار تقریر تھی اس تقریر کا موضوع قلم تھا، قلم کے موضوع پر حضرت خطیب اعظم نے شاندار خطاب فرمایا اور اہل علم سے بے پناہ داد حاصل کی۔ یہ خطابت لکھنؤ کے انداز خطابت سے ذرا مختلف تھی اس میں انفرادیت اور ذرا CHANGE تھی جسے نمایاں طور پر محسوس کیا جا سکتا تھا۔ خطیب اعظم مرحوم کی اس تقریر میں تبرا کے گوشے نمایاں تھے۔ علاوہ ازیں لکھنؤ میں خطیب ایمان مولانا مظفر حسین طاہر جرولی کی تقریر میں مناظرانہ رنگ سب سے نمایاں تھا۔ ضمیر اختر صاحب نے یہ تجربہ کیا اگر سید محمد دہلوی صاحب کے زبان و بیان طنز و نشتر طاہر جرولی صاحب کے تبرائی رنگ ومناظرانہ رنگ اور مولانا کلبِ صاحب قبلہ کی علمی، ادبی، سلیس وسادہ تقریر تینوں کی آمیزش کر لی جائے تو ان تینوں کے امتزاج سے ایک نیا اسلوب STYLE تخلیق کیا جا سکتا ہے۔ لہٰذا انہوں نے ان تینوں خطباء کے اسلوب سے ایک نیا اسلوب تیار کیا جو لکھنؤ میں بھی مقبول ہوا کیونکہ لکھنؤ میں ایک گروہ مناظرہ پسند کرتا تھا اور دوسرا خالص علمی موضوع کو پسند کرتا تھا لہٰذا اس اسلوب میں ہر طرح کے سننے والے کے لئے مواد موجود تھا بلکہ علم وادب کا ذوق رکھنے والوں کے لئے بھی چاشنی موجود تھی

اس طرح علامہ ضمیر اختر نے ایک نئے اسٹائل کو متعارف کرایا۔

۱۹۶۲ء، ۱۹۶۳ء میں علامہ ضمیر اختر باقاعدگی سے باہر مدعو کیے جانے لگے، اور آپ کو سیتاپور، بارہ بنکی، الہ آباد، نزید پور، رائے بریلی، مصطفےٰ آباد سے مجالس کی دعوت دی گئیں۔

علامہ ضمیر اختر صاحب نے آگرہ کی سالانہ مجالس سے بھی فیض حاصل کیا جہاں ہر سال آگرہ کی سالانہ مجالس میں ہندوستان کے چوٹی کے علماء و خطباء شرکت فرماتے تھے، ان کے انداز خطابت و موضوعات سے بھی خاصا تجربہ حاصل کیا۔ اقبال منزل مہاراجہ محمود آباد کی کوٹھی میں حضرت جوشؔ ملیح آبادی اعلی اللہ مقامہٗ کو سُنا، علاوہ ازیں ضمیر لکھنوی، مہذب لکھنوی، شدید لکھنوی اور دیگر شعرا کے مرثیوں کو پابندی سے سماعت فرمایا۔ مرثیوں کی مجالس سے بھی آپ کے ادبی ذوق میں اضافہ ہوا۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کا علمی وادبی ذوق:

جیسا کہ پہلے تحریر کیا جاچکا ہے کہ مولانا موصوف کی تربیت میں سرکار ناصر الملت اعلی اللہ مقامہٗ کی رہائش گاہ پر سرشام جمنے والی نشست کا بڑا دخل ہے علاوہ ازیں کاظم ہوٹل میں روزانہ جمنے والی شعراء کی نشست جس میں پابندی سے سالک لکھنوی، منظر لکھنوی، تصویر لکھنوی اور دیگر نامور شعراء تشریف لاتے تھے۔ ان اکابر و بزرگ شعراء کی ادبی محفلوں نے بھی علامہ ضمیر اختر صاحب کے علمی و ادبی ذوق کو نکھارا اور معیار کو بلند کیا۔ ان شعراء کی رفاقت و صحبت کا نتیجہ یہ نکلا کہ مولانا موصوف نے لکھنؤ کے مزاج کے خلاف بلکہ بغاوت کرتے ہوئے مجلس میں ادب بھی شامل کر دیا جو لکھنؤ میں آداب مجلس کے خلاف سمجھا جاتا تھا لکھنؤ میں سوائے نجم الحسن نثار کے کوئی بھی خطابت میں ادب کو شامل نہ کرتا تھا۔ اس اضافہ کے بعد علامہ ضمیر اختر صاحب نے اپنے اسلوب

میں چار فکری اسکولوں کے اسلوب کو بہم کردیا۔ اب تقریر میں زبان و بیان، طنز و نشتر، علمی موضوعات، سادگی، مناظرہ اور تبرا کے ساتھ رزم و بزم و ادبی نکات و تبرکات بھی پیش کرنے لگے۔ علامہ ضمیر اختر نے نجم الحسن نثار سے متاثر ہو کر اپنی تقریر میں رزمیہ گوشے، خیبر و خندق و بدر و احد کے واقعات کو بھی اپنی خطابت میں شامل کرلیا۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی ہجرت:

علامہ ضمیر اختر نقوی ۱۹۶۷ء میں پاکستان آئے۔ یہ ہجرت مولانا موصوف کی خطابت کے لئے مژدہ جانفزا ثابت ہوئی اور بڑی کارآمد ثابت ہوئی۔ پاکستان میں اس وقت خطابت کے افق پر علامہ رشید ترابی اعلیٰ اللہ مقامہ کا سورج بڑی آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ ان کا انداز بیان ہندوستان کے تمام خطباء سے منفرد و جداگانہ تھا اور عصری تقاضوں کے عین مطابق تھا۔ تقریر میں علمی موضوعات کے ساتھ ساتھ تسلسل فکر پایا جاتا تھا۔ ضمیر اختر صاحب نے علامہ رشید ترابی صاحب کو بڑی توجہ وانہماک، دلجمعی، پابندی اور تحقیقی انداز سے سُنا اور اُن سے اکتساب فیض کیا اس طرح ان کے تحقیقی ذوق کو مہمیز کرنے میں علامہ رشید ترابی اعلیٰ اللہ مقامہ کی خطابت کا بڑا دخل ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی تحریری ابتداء:

علامہ ضمیر اختر نقوی مذہبی مضامین مولانا مجتبیٰ حسین کانپوری، مولانا سید سبط الحسن ہنسوی، ادبی مضامین میں سید مسعود حسن ادیب، پروفیسر احتشام حسین، علی اختر تلہری خواجہ عبداللطیف انصاری، ضیا الحسن، موسوی، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل کی تحریروں سے خاصے متاثر ہوئے اور ان حضرات کی نگارشات کا بڑی ژرف بینی سے مطالعہ کیا اور یہیں سے آپ کو لکھنے کا شوق پیدا ہوا۔ ۱۹۶۷ء میں پندرہ روزہ "ارشاد" کے خصوصی

نمبروں کے لئے طویل مقالے تحریر کئے اور بزرگ شعراء کے تبرکات کو پیش کرتے رہے اس طرح ۱۹۶۷ء میں تحریر و تقریر دونوں کا قافلہ آگے بڑھتا رہا۔ اور علامہ موصوف تقریر کے ساتھ تحریری خدمات بھی بڑی پابندی سے انجام دینے لگے۔

پاکستان میں علامہ ضمیر اختر کی خطابت:

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب نے ہجرت کے بعد پاکستان میں باقاعدگی سے خطابت کا آغاز کیا اور اس سلسلے کی نمایاں مجلس ۱۹۶۷ء میں انجمن غم خواران عباس کی شب بیداری میں پڑھی جس کا عنوان تھا "کیا اسلام بزور شمشیر پھیلا؟" اس مجلس میں مومنین کی بڑی تعداد نے شرکت کی تھی۔ علاوہ راجہ صاحب محمود آباد کے داماد امیر امام حر، مولانا علی حاکم صاحب، جناب عزت لکھنوی، جناب ضیاء الحسن موسوی اور حضرت مجز جونپوری بھی موجود تھے ان حضرات نے اس مجلس کو بے حد سراہا اور بے پناہ داد دی۔ اور خطابت کا سلسلہ جاری رکھنے کی تلقین کی اور اس طرح پاکستان میں اس کامیاب مجلس کے بعد بے شمار مجالس کے دعوت نامے ملے اور آپ نے بے شمار مجالس سے خطاب فرمایا اور اس طرح آپ کی خطیبانہ مصروفیات میں روز افزوں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

۱۹۶۸ء میں آپنے سب سے پہلا عشرہ امام بارہ جعفریہ گولیمار میں پڑھا اور مسلسل پانچ سال تک پڑھتے رہے اس طرح ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۳ء تک آپ گولیمار میں خطاب فرماتے رہے ان عشروں کی کامیابی کے ساتھ ساتھ امام بارگاہ شاہ ولایت علی بستی، محفل زہرا علی بستی میں مختلف مومنین کی دعوت پر خطاب فرمایا۔

اور اس کے ساتھ ساتھ مسجد اثنا عشری، مرکزی امام بارگاہ لیاقت آباد، عابدیہ امام بارہ بی ون ایریا لیاقت آباد، شاہ نجف مارٹن روڈ میں مجالس سے خطاب فرماتے رہے۔

اس اثناء میں جن لوگوں نے آپ کا بھرپور ساتھ دیا ان میں سید کفایت حسین سوز خوان، سید فائق حسین سوز خوان، اختر وصی علی، مظاہر حسین کاظمی، عزت لکھنوی، سید علی سید امروہوی، وزیر جعفری، مولانا علی کرار نقوی، شبیہ الحسن کاظمی، ظفر کاظمی، منظری زیدی کے نام آتے ہیں۔ یہ حضرات نہ صرف عزادار و وضع دار لوگ ہیں بلکہ ان کا شمار کراچی کے معروف عزاداروں اور پرانے سامعین میں ہوتا ہے۔ ان کی گراں قدر آراء و مشورے قافلہ خطابت کو آگے بڑھانے میں معاون ثابت ہوئے۔

کراچی میں علامہ رشید ترابی کا سورج نصف النہار پر تھا، علامہ ابن حسن جارچوی، مولانا مصطفےٰ جوہر صاحب قبلہ، مولانا علی حاکم، مولانا ابن حسن نجفی، مولانا مرزا احمد عباس، مولانا محمد تقی سبار نپوری وغیرہ کراچی میں مجالس سے خطاب فرمایا کرتے تھے۔ علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب نے مسلسل بیس برس تک بغیر کسی نذرانے و معاوضے کے مجالس سے خطاب فرمایا۔ آپ پابندی سے جمعرات و اتوار کو مجالس سے خطاب فرماتے تھے۔ نذرانہ نہ لینے کے سلسلے میں علامہ کو مختلف ذاکروں کی جانب سے مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی مخالفت مولانا علی حاکم صاحب نے کی انہوں نے کہا کہ ضمیر اختر صاحب مفت مجلسیں پڑھتے ہیں جس سے بانیان مجلس کا مزاج و دماغ خراب ہوتا ہے۔

مجلس کا پہلا نذرانہ:

علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی مجلس کا پہلا نذرانہ عباس خلیلی صاحب کی جانب سے ملا ان کے دولت کدہ پر منعقد ہونے والی صفر کی سالانہ مجلس میں آقائی شریعت اعلیٰ مقامہ نے اپنے دست مبارک سے مولانا موصوف کو نذرانہ کا لفافہ دیا۔ اس طرح کراچی میں مولانا نے پہلی بار مجلس کا نذرانہ لیا۔ اس کے بعد جہاں بھی نذرانہ نہ ملا مولانا نے انکار

نہیں کیا لیکن کبھی مجلس کاٹے نہیں کیا تھا۔ اکثر مجلس بغیر نذرانے کے پڑھتے رہے۔

میر انیس کی صد سالہ یادگار:

۱۹۷۳ء میں تھیوسوفیکل ہال اور رضویہ سوسائٹی میں میر انیس کی صد سالہ یادگار کا اہتمام کیا گیا۔ امام بارگاہ شاہ کربلا رضویہ سوسائٹی میں ایک عظیم الشان تقریب منعقد کی گئی اور راولپنڈی میں لیاقت ہال میں میر انیس کی صد سالہ یادگار کا مرکزی جشن منعقد ہوا۔ اس جشن میں ڈاکٹر سبط حسن، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل، جناب ضیا الحسن موسوی، جناب آل رضا ڈاکٹر محمود حسین مرحوم (وائس چانسلر کراچی یونیورسٹی) پیار علی الانہ (وزیر تعلیم حکومت سندھ) جناب نجم آفندی، زیڈ اے بخاری، جناب ہاشم رضا، ڈاکٹر احسن فاروقی وغیرہ نے شرکت فرمائی۔ اس جشن میں علامہ ضمیر اختر صاحب نے شاندار مقالے پڑھے اس طرح اس جشن میں شریک ہونے والے دانشوروں سے آپ کے مراسم پیدا ہوئے اور گاہ بگاہ ان حضرات کے ساتھ ملاقاتیں و ادبی نشستیں ہوتی رہیں ان میں سے اکثر حضرات علامہ ضمیر اختر کے گھر پر آتے تھے۔ اور اسی زمانے میں آپ کا خطابت سے زیادہ ادب کی طرف جھکاؤ پیدا ہوا۔

علامہ ضمیر اختر اور تصنیف و تالیف:

مولانا ضمیر اختر صاحب ۱۹۶۷ء سے آج تک قلم قبیلے سے وابستہ ہیں اور مسلسل اور مختلف موضوعات پر بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور بہت کچھ زیر طباعت و پیش قلم ہے۔
آپ کی تصانیف پر ایک نظر۔

(۱) اردو مرثیہ پاکستان میں (۲) میر انیس حیات و شاعری (۳) یادگار نجم آفندی (۴) یادگار آل رضا (۵) اشاریہ مرزا دبیر (۶) مراثی جوش (۷) اردو غزل و کربلا

(۸) ترجمہ آئمہ اثناء عشر (۹) سوانح حضرت خدیجہؑ (۱۰) علی اور علم (۱۱) سوانح شرف الدین شاہ ولایت حالات و کرامات۔ (۱۲) شعرائے اُردو اور عشق علی (۱۳) شہید علمائے حق (۱۴) مجالس ترابی ۵ جلدیں)۔

۱۹۷۳، ۱۹۷۴، ۱۹۷۵ء اور ۱۹۷۶ء میں اسلام آباد، راولپنڈی، لاہور، کراچی، پشاور صوبہ سندھ، بلوچستان و پنجاب میں مختلف مقامات پر مجالسِ عزا سے خطاب فرمایا۔

علامہ ضمیر اختر کا دورہ یورپ:

علامہ ضمیر اختر نقوی نے پاکستان و ہندوستان کے علاوہ یورپ اور دیگر عرب ممالک میں بھی مجالس عزا سے خطاب فرمایا کیونکہ آپ کی شہرت پاکستان سے نکل کر غیر ممالک تک پہنچ چکی تھی۔

۱۹۷۵ء میں علامہ نقوی نے ہالینڈ کے دارالحکومت میں ڈن ہیگ کے مقام پر عشرہ سے خطاب فرمایا علاوہ ازیں، فرانس، جرمنی، بلجیم میں مجالس پڑھیں۔

۱۹۷۶ء میں انگلینڈ، لندن، اور لکھنؤ میں مجالس عزا سے خطاب فرمایا۔

۱۹۸۶ء میں جدہ میں عشرہ پڑھا اور حج بیت اللہ کی سعادت حاصل کی۔

۱۹۸۹ء میں امریکہ میں نیویارک، نیوجرسی، واشنگٹن اور دیگر اسٹیٹس میں مجالس سے خطاب فرمایا۔

۱۹۷۶ء سے ۱۹۸۰ء تک کاظمین، ڈرگ روڈ، انجمن حیدریہ کی شب بیداری اور انجمن غم خواران عباس کی شب بیداریوں سے خطاب فرماتے رہے۔

۱۹۸۰ء میں انچولی میں انجمن رضائے حسینی کے عشرہ کی بنیاد پڑی۔ ۹۱-۱۹۹۰ تک مسلسل ہر سال رضویہ اور انچولی کے عشرے پڑھتے رہے۔ ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۳ تک

مسلسل لاہور میں متعدد مرکزی مجالس سے خطاب فرمارہے ہیں۔

امام بارگاہ بختیاری کرشن نگر، امام بارگاہ شاد باغ، امام بارگاہ آلِ عمران موچی دروازہ، حسینیہ زینبیہ لٹن روڈ، جامعۃ المنتظر ہال ماڈل ٹاؤن، قصر بتول شادمان ٹاؤن، امام بارگاہ تکیہ مراثیاں گوالمنڈی، عزا خانہ جعفریہ، جعفریہ کالونی، دربار امیر خواجگان نارووال موچی دروازہ کے علاوہ لاہور کے دیگر عزاخانوں میں مجالسِ عزا سے خطاب فرماتے ہیں۔

علامہ ضمیر اختر اور عالمی دانشور:

علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی خطیبانہ حیثیت کے علاوہ ان کی ایک مسلمہ ادبی حیثیت و شخصیت ہے آپ نے معروف علماء حضرات، آیت اللہ العظمیٰ خوئی طاب ثراہ، آیت اللہ جلالی، آیت اللہ عبدالعزیز طباطبائی سے ملاقات فرمائی۔ ان کے علاوہ دنیا کے معروف دانشوروں سے بھی ملاقاتیں کیں جن میں چند اسمائے گرامی یہ ہیں۔ ڈاکٹر اکبر حیدری نیر مسعود، ایرانی ادیب و دانشور آقای تسبیحی، ایرانی اسکالر ڈاکٹر علی اکبر، نائب حسین نقوی مرتب مراثی انیس، تنویر احمد علوی، کیفی اعظمی، جوش ملیح آبادی، فیض احمد فیض، مشفق خواجہ، ابن صفی، حضرت نسیم امروہوی، مولانا مرتضیٰ حسین فاضل، آلِ رضا، ضیا الحسن موسوی، نجم آفندی وغیرھم۔

ڈاکٹر سلیم اختر

"کلید گنجینۂ انیس" کے عنوان سے ضمیر اختر نقوی نے کلام انیس کے ساتھ ساتھ انیس کے بارے میں کتب اور مقالات کا ایک جامع اشاریہ مرتب کیا ہے جو انیس کے ناقدین، اساتذہ اور طلبہ کے لئے سود مند ثابت ہوگا" (صحیفہ لاہور)

قائم رضا نقوی

علامہ ضمیر اختر نقوی

برِصغیر کے ممتاز دانشوروں کی نظر میں

جوشؔ ملیح آبادی

"اگر میرا اللہ کا سا مزاج ہوتا تو میں آپ کے دامن کو موتیوں سے بھر دیتا۔"

رئیسؔ امروہوی

"برادر عزیز جناب سید ضمیر اختر نقوی ماشاء اللہ محقق بھی ہیں مصنف بھی اور مقرر بھی اور ان کی شخصیت کی تینوں جہات قابل قدر ہیں"۔

مسٹر ورنن جیمز شوبل (اسکالر ورجینیا یونیورسٹی امریکا)

"میں نے امام حسینؑ کی عزاداری کے موضوع پر امریکا میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔ میرا یہ کام بھی آسان نہ ہوتا اگر ضمیر اختر صاحب کی تقاریر اور کتابوں سے استفادہ نہ کرتا۔ وہ ایک قابل قدر ذریعہ معلومات ہیں"۔

ڈاکٹر اکبر حیدری (صدر شعبہ اُردو کشمیر یونیورسٹی سری نگر)

"ضمیر اختر نقوی اک اچھے محقق اور بہترین خطیب بھی ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں جب لکھنؤ آئے تھے یہاں کے سخن فہم حضرات اور ناقدین کے علاوہ پڑھے لکھے لوگوں کا خاصا مجمع ان کی مجالس ہمہ تن گوش ہو کر سنتا تھا۔ مجلسیں کیا پڑھتے ہیں گویا منبر پر جادو جگا

رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے انھیں روشن دماغ سے سرفراز کیا ہے۔ ان میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو کسی ذہین، مشاق اور جینئس انسان میں ہونا چاہیئے۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کے دماغ میں وہ نادر اور نایاب چیزیں محفوظ ہیں جن سے وقتاً فوقتاً ہم دور افتادگان بھی فیض یاب ہوتے ہیں وہ ایک ادارہ اور ایک انسٹی ٹیوٹ سے کم نہیں ہیں"

جگن ناتھ آزاد (شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی کشمیر)

"ضمیر اختر نقوی کے علمی اور ادبی کارناموں سے پاکستان اور ہندوستان کی تمام یونیورسٹیاں اور تمام اہلِ نظر مستفید ہو رہے ہیں"۔

علی سردار جعفری (بمبئی)

"ضمیر اختر نقوی کے علمی اور تحقیقی کارنامے ہر لحاظ سے بلند پایا اور قابلِ قدر ہیں"۔

سیّد ہاشم رضا

"میں ضمیر اختر نقوی کی تخلیقی اور تنقیدی قابلیت کا معترف رہا ہوں۔ صاحب نظر حضرات اس معاملے میں مجھ سے اتفاق کریں گے، میرے بھائی سیّد آلِ رضا، ضمیر اختر نقوی کی بڑی قدر کرتے تھے۔"

پروفیسر کرار حسین

"اگر ضمیر اختر نقوی کی محنت کی داد نہ دی جائے تو یہ ایسی ناقدری ہوگی جو احسان فراموشی کی حدود کو چھوتی ہے۔"

پروفیسر ممتاز حسین

"ضمیر اختر نقوی کا اسلوب بیان شائستہ اور، جچا تُلا ہوا ہے"۔

محمد علی صدیقی

''ضمیر اختر نقوی، وسیع مطالعہ اور تحقیقی لگن کی قابلِ رشک مثال ہیں۔''

پدم شری علی جواد زیدی (صدر اُردو اکیڈمی لکھنؤ)

''ضمیر اختر نقوی کی سعی پیہم ایک خوش آئند مستقبل کی پیامی ہے وہ ایک اچھے محقق ہیں تحقیقی مواد کو سلیقے سے یکجا کرنے اور پیش کرنے کی صلاحیت قابلِ قدر ہے۔''

پروفیسر مرزا علی اظہر برلاس

''ضمیر اختر نقوی نے علمی اور ادبی خزانوں کی کھوج میں جس عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیا ہے اس کو وہی حضرات محسوس کر سکتے ہیں جنھوں نے اس میدانِ خارزار میں کبھی قدم رکھا ہو۔''

مولانا ڈاکٹر کلبِ صادق

''میرے قابلِ فخر اور عزیز دوست ضمیر اختر نقوی کو اللہ تعالیٰ نے بیک وقت ذہانت اور حافظہ دونوں چیزوں سے نوازا ہے میں نے اُن کی تقریر لندن میں سُنی، لکھنؤ اور کراچی میں بھی سننے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے دنیائے خطابت میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوالیا ہے۔ میں ضمیر اختر نقوی سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔''

ڈاکٹر پروفیسر فاضل زیدی (صدر شعبہ اُردو سکرنڈ گورنمنٹ کالج سندھ)

''میں ضمیر اختر نقوی کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔''

شیرِ ہندوستان مولانا طاہر جرولی (مرحوم)

''مجھے کلکتے کے مومنین نے ''شیرِ ہندوستان'' کے خطاب سے نوازا ہے لیکن مومنین

نے ضمیر اختر نقوی کو ضیغم پاکستان کا خطاب عطا کیا۔ یہ شیر مجھ سے زیادہ بہادر اور شجاع نکلا۔"

ڈاکٹر پروفیسر منظر کاظمی

"ضمیر اختر نقوی مجھے صرف اس لئے پسند ہیں کہ میں نے ان کی شخصیت میں جو بالغ النظری، دانش مندی قوت ایمانی، جرأت اور حقیقت پسندی کا امتزاج دیکھا ہے وہ اس دور جدید میں عنقا ہے۔"

پروفیسر سحر انصاری (شعبۂ اردو کراچی یونیورسٹی)

"مقام شکر ہے کہ ضمیر اختر نقوی صاحب "ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں" کے ذیل میں آتے ہیں۔"

سعید حسنین عابدی (لکھنؤ)

"عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ریسرچ اسکالر کسی ایک مضمون ایک ادب یا ایک معاشرے پر تحقیق کر کے پی ایچ ڈی کی سند حاصل کرتے ہیں۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ضمیر اختر نقوی صاحب مختلف ادیان، قرآن، تفسیر، حدیث، تواریخ اسلام، ادب وغیرہ پر بہت اچھی تحقیق اور وسیع نظر کے حامل ہیں ان کے موضوعات بالکل منفرد اور انوکھے ہوتے ہیں ان کی تقریریں سُن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ علم کا نہ رُکنے والا ایک اُبلتا ہوا چشمہ ہے۔"

ماجد حسین رضوی (رضویہ سوسائٹی)

"جناب ضیاء الحسن صاحب موسوی نے ایک جلسے میں حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا: "ضمیر اختر نقوی قوم کا ایک بہت بڑا سرمایا ہیں ان کی قدر کیجئے۔" آج بھی میرے کانوں میں اس باعظمت شخصیت کے جملے گونج رہے ہیں۔"

آلِ محمد رزمی

سید ضمیر اختر نقوی کا تعلق لکھنؤ کی گنگا جمنی تہذیب سے ہے ادبی و مذہبی حلقوں میں ان کا نام تعارف سے بے نیاز ہے قلم سے ان کا رشتہ بہت پرانا ہے وہ گزشتہ ربع صدی سے لکھنے لکھانے میں مصروف ہیں اور مرثیہ نگاری پر تحقیقی کام کر رہے ہیں اور ستائش تمنا اور تنقید سے بے نیاز خود اعتمادی سے ادب کی خدمت میں نیک جذبوں کے ساتھ مصروف ہیں وہ ایک روشن فکر انسان ہیں اور اسی روشن فکری کی وجہ سے وہ سالہا سال سے جرم خود آگہی کی سزا پا رہے ہیں اگر چہ روشن فکری ایک ایسی ذہنی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو آفاقی معیار کی تلاش، قاعدہ کلی کی جستجو اور عمومی نتائج کے حصول میں سرگرم رکھتی ہے یہ کیفیت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ تاریخی حقائق سے چشم پوشی یا جانبداری سے کام لیا جائے۔

ضمیر اختر نقوی تاریخ کا بھی گہرا شعور رکھتے ہیں وہ اپنے تجربے اور مشاہدے کو اپنی تقریر و تحریر میں اس قدر پر تاثیر انداز میں سموتے ہیں کہ سامع یا قاری بے ساختہ داد دینے پر مجبور جاتا ہے ان کے یہاں جا بجا بے ساختگی ان کے "Behaviour of Writing" سادہ، شائستہ، شگفتہ اور سلیس ہے، وہ دو ٹوک بات کہنے کے عادی ہیں انھوں نے اوائل عمری سے سن شعور کا زمانہ اودھ کی آغوش میں بسر کیا، لہٰذا اودھ کی گنگا جمنی تہذیب و ثقافت و تاریخ اور وہاں کے اہلِ فن کے بارے میں مکمل آگہی و معلومات رکھتے ہیں۔ وہ ایک علمی و عملی انسان ہونے کے ناطے مذہب، عزائیہ، مرثیہ نگاری اور خصوصاً شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے بارے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور بہت کچھ لکھ رہے ہیں۔

ضمیر اختر نقوی ایک آزاد خیال اور نگارنگ شخصیت ہیں ان کے یہاں مذہب کا

Basic Conceptعام ڈگر سے ہٹ کر ہے۔ نہ جانے کیوں وہ علمی و تحقیقی کام کو موخر کر کے خطابت کے میدان میں کود پڑے ہیں لیکن اس میدان میں بھی انھوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ راہ اختیار کی ہے اور عام ڈگر سے ہٹ کر خطابت کو نزاعی اور اختلافی موضوعات سے ہٹا کر تاریخی و علمی موضوعات کی طرف لانے کی کوشش میں ایک عرصے سے مصروف ہیں دیکھئے وہ اس جہاد میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں۔

سیّد مسعود حسین زیدی (صدر شیعہ کانفرنس لکھنؤ)

"ہندوستان و پاکستان کی خطابت اب تہی دست ہو چکی ہے۔ ضمیر اختر نقوی واحد خطیب اعظم ہیں جنھوں نے فنِ خطابت کی لاج رکھ لی ہے۔ جسے سننا ہے سن لے اب اس میدان میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ صرف اور صرف ضمیر اختر نقوی برصغیر میں تاریخ خطابت کے سب سے عظیم خطیب ہیں"۔

ساغر لکھنوی:

ض.......... ضوفشاں تحقیق کے ہے آسماں پر مثلِ شمس
م.......... مردِ میداں ہے تجسس کا یہی جادو بیاں
ی.......... یاورِ حق آگہی ہمدردِ ملت شیر دل
ر.......... رونقِ بزمِ ادب، باطل شکن عزمِ جواں
ا.......... آبروئے پاک ہے توضیح کی منزل میں یہ
خ.......... خاصِ آلِ عبا کا ہے ازل سے مدح خواں
ت.......... تبصرے تنقید کا تقریظ کا بھی ہے قمر
ر.......... رہبرِ راہِ ادب ساغرؔ ہے یہ عرشِ آسماں

ضمیر اختر — صنعت توشیح

عابد رضا:

ہشت پہلو شخصیت

پروردگار عالم نے اپنی اس کائنات کو ہر قسم کی رنگینی سے آراستہ کیا اور اس رنگینی سے لطف اندوز ہونے کے لیئے اشرف المخلوقات یعنی حضرتِ انسان کو پیدا کیا اور انسان کی طبیعت و مزاج کو دیکھتے ہوئے اس پر اپنے کچھ احکامات صادر فرمائے تا کہ زندگی کے ہر شعبے میں اعتدال باقی رہے۔ ان احکامات پر عمل کروانے کے لیئے اپنے ہادی اور مصطفیٰ بندے اپنے سوچے سمجھے منصوبے کے تحت بھیجتا رہا۔ یہ احکامات کبھی تو صحیفوں کی صورت میں نازل ہوتے رہے اور کبھی ملائکہ حسبِ ضرورت خدا کے ابدی پیغامات وہدایت لے کر اس کائنات میں آتے رہے۔ ایک دور تھا جب یہ سارے احکامات و پیغامات باقاعدہ کسی کتاب کی صورت میں نہیں تھے۔ پھر پروردگار عالم نے اسی انسان کو شعور و آگہی بخشی، چونکہ پروردگار جس سے چاہتا ہے، اپنا کام لے لیتا ہے۔ چاہے اس کا کوئی مذہب ہو۔ دنیا کے سارے علوم چاہے ان میں قرآن مجید ہو، بائبل ہو، عہد پارینہ کی داستانیں ہوں، قصص انبیاء ہوں، فاتحینِ عالم کے تذکرے ہوں، غم امروز، غم حالات ہوں، چاند تک رسائی، خلاؤں کی تسخیر کا علم، علم طبعیات، کیمیا، حیاتیات، عمرانیات، اقتصادیات، سیاسیات، فلسفہ و نجوم، سماجیات و ادبیات وغیرہ وغیرہ..... غرض یہ کہ ان سارے علوم کو زینت بہ کتاب اسی انسان نے کیا۔ یہ سارا کام کسی فردِ واحد کا نہیں ہے، بلکہ اس کام کو سمیٹنے کے لیئے لاکھوں نفوس نے شب و روز

محنت کی۔ بہر حال کتاب بن گئی اور پھر خوب صورت سے شیلف کی نذر ہو گئی۔

کتاب تو بن گئی، اب اس بے بہا علوم کو پڑھے کون؟ عوام الناس کو کون بتائے کہ کتاب کیا ہے، علم کیا ہے، اس پر روشنی کون ڈالے۔ روشنی تو وہ ڈالے جو خود مطالعہ کرے۔ چونکہ اکثر ہوتا تو یہی ہے کہ جس نے کسی بھی کتاب کی صرف ایک سطر پڑھی اور گھر سے نکل پڑا کہ چلو اپنی ایک گھنٹے کی تقریر تو بن گئی، ہاں! دو گھنٹے اپنی لیپا پوتی پر ضرور برباد کریں گے کہ فلاں خطیب وس کوٹ جس رنگ کی پہنتا تھا، ویسی ضرور ہو۔ کپڑے تو جسم پر چاہے جیسے بھی ہوں لیکن اس کا غم نہیں، وہ تو چال میں اکڑ پیدا کر کے کسر نکال لیں گے۔ ہاں البتہ ٹوپی اپنے پیسے کی نہیں خریدیں گے، کیونکہ یہ احساس بھی ہے کہ اگر پہلی تقریر بیٹھ گئی تو ٹوپی کی رقم ضائع ہو جائے گی لہٰذا وہ اپنے کسی قریبی عالم سے مستعار لے لیتے ہیں۔ اس میں بھی راز ہے کہ اس کو بھی تو بتانا مقصود ہے کہ ہم تمہاری ٹکر پر آگئے ہیں۔ عالم سے تو ٹکر کیا لینا تھی، ہاں! لفظ علامہ سے ٹکرا گئے اور بے چارہ لفظ علامہ کمزور ہوتا تو اس سا لفظ ڈر کے مارے ان کے ساتھ چپک گیا۔ پھر یوں ہوتا ہے کہ وہ لفظ ان سے تمام عمر ڈرتا ہے اور یہ اس لفظ سے اور بے علمی میں اپنی ساری زندگی جہالت کی نذر کر دیتے ہیں، صرف آواز کے خطیب، اور جب تک (ECO) ساؤنڈ سسٹم نہ ہو تو پڑھ نہیں سکتے، پتا جو ہے دودھ سے پانی الگ ہو جائے گا اور آواز بھی ایسی کہ جیسے کوئی کمانڈر اپنی کمک کو زوردار گرج کے ساتھ سلوٹ کا حکم دیتا ہے۔ راقم الحروف کیا کرے کہ یہ لہجہ تحریر میں نہیں آسکتا۔ ورنہ ایسے نام نہاد خطیبوں کے جھرمٹ میں کب کہاں کسی کی دال گلے گی!

علم پھر علم ہے۔ دوسرے لفظوں میں جب چودھویں کا چاند چڑھتا ہے تو ستارے خود بخود ماند پڑ جاتے ہیں۔ اس چاند کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کہے کہ کہاں گئی تمہاری

جھوٹی روشنی، اب کیوں نہیں چمکتے، ایسا ہی ایک چاند اکثر مجھ سے کہتا ہوا سنائی دیتا ہے۔ خوش قسمتی سے ہم نے بھی سنا ہے اس چاند کو، دیکھا ہے۔ وہ ہیں علم وادب کے چاند سید ضمیر اختر نقوی، محقق، دانش ور، شاعر، خطیب اور جانے کیا کیا۔ یعنی یوں سمجھئے کہ سارے القابات ضمیر اختر نقوی کے سامنے ننھے ننھے ستارے محسوس ہوتے ہیں۔
ضمیر اختر نقوی نے مسلسل کتب بینی میں درِ علم سے متمسک رہ کر مطالعے کا وہ حال کر دیا ہے کہ مطالعہ ان کے گھر کا غلام بن کر رہ گیا ہے۔ یہ صرف تحریر ہی نہیں، بلکہ آپ بھی ان کی کسی محفل یا مجلس میں شریک ہوں دیکھیں تو دنیا آپ کو بھی چھوٹی نظر آئے گی۔ اس کو آپ ضمیر اختر نقوی کی شخصیت کا کمال سمجھ سکتے ہیں۔ میں تو کہوں گا کہ آپ ضمیر اختر نقوی کو چھوڑیں، بلکہ آپ اس چاند کی روشنی کی ہلکی سی جھلک دیکھنا چاہتے ہیں تو ان کے شاگرد سید ماجد رضا عابدی سے ملیں تو آپ کو احساس ہوگا کہ اتنی کم سنی میں علم و ادب کے کمال کے جوہر، اخلاقیات کی بلندی، زبان کی شیرینی، ردھم مضبوط اور آبِ کوثر سے دھلا ہوا گلا۔ کیا کیا خوبیاں میں بیان کروں (من آنم کہ من دانم)۔

میں چونکہ ماجد رضا عابدی کو جانتا ہوں، بلکہ یوں سمجھئے کہ وہ مجھے جانتے ہیں، یہ میرے لیے رتبے کا باعث ہے اس لئے ماجد رضا کی لاکھوں میں سے تین، چار خوبیوں سے پردہ اٹھایا ہے، ورنہ ایسے کتنے ہی درخشندہ ستارے ضمیر اختر نقوی کا حصار کیے ہوئے ان سے روشنی لیتے ہوئے اور جھک جھک کر سلامی دیتے نظر آتے ہیں چاہیے تو یہ تھا کہ جس طرح گزشتہ ادوار میں قومی شخصیات کی حکومت یا سلطانِ وقت عزت و تکریم کیا کرتے تھے اور وظائف مقرر کر دیا کرتے تھے، ضمیر اختر نقوی جیسے بلند پایہ خداداد صلاحیت رکھنے والے عالمِ دین اور ریسرچ اسکالر کے لیے اور ان سے کام لینے کے لیے سرکاری سطح پر اہتمام ہوتا۔ اس کے برعکس ہوتا یہ ہے کہ ان کے راستے میں ہر

طریقے سے کانٹے بچھائے جاتے ہیں۔ مجلس و محفل میں جہاں بچے کھرے مومن شرکت کرتے ہیں، وہاں کچھ شر پسند پروفیشنل بھی ہوتے ہیں۔ قبلہ دو نمبر سامعین کو برداشت نہیں کرتے۔ چونکہ جھوٹی داد و تحسین ان کو پسند نہیں، اس لیے قبلہ ان لوگوں کو زیادہ منہ نہیں لگاتے، اور جب ان لوگوں کو کچھ نہیں ملتا تو وہ اُلٹے سیدھے پروپیگنڈہ شروع کردیتے ہیں اور حسب روایت ذلیل و خوار ہو کر اپنے گھر کے کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ چھپ کر اس لیے بیٹھتے ہیں کہ ان سے اکثر لوگ پوچھتے ہیں کل تک تو تم واہ واہ اور سبحان اللہ کیا کرتے تھے اور آج اوٹ پٹانگ بکتے پھرتے ہو لہٰذا وہ پھر باہر نکلنا ہی بند کردیتے ہیں۔ بہر حال یہ سلسلہ جاری ہے، اسی وجہ سے اکثر کم ظرف و ذلیل لوگ خاندانی لوگوں کے خلاف جھوٹے پروپیگنڈہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں اور وقتی طور پر اپنا قد بہت اونچا محسوس کرنے لگتے ہیں اور خود کو فریب دیتے چلے جاتے ہیں، دشمنی صرف قبلہ کی سچ گوئی کی وجہ سے ہے۔

اندازہ لگایئے کہ مجھ حقیر سے ناخواندہ شخص نے ضمیر اختر نقوی سے محض دو، تین ملاقاتوں میں ان کی زندگی سے متعلق چیدہ چیدہ گوشے محفوظ کر لیے۔ اگر میرا مطالعہ مزید وسیع ہوتا تو انشاءاللہ! قبلہ پر ضرور کچھ لکھتا۔ چونکہ جو کچھ میں تحریر کر رہا ہوں تحریر کے زمرے میں نہیں آتا، اپنی کم علمی کا اعتراف کرتے ہوئے اور یہ محسوس کرتے ہوئے کہ میں ضمیر اختر نقوی صاحب کو خراج عقیدت کیسے پیش کروں، کیونکہ لکھا اسی کے لیے جاتا ہے جس نے بھی کچھ کر کے دکھایا ہو یا کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ قبلہ کی زندگی سے متعلق میرے پاس بڑے بڑے الفاظ تو نہیں اور نہ میں حد سے زیادہ کسی کو ماننے کا قائل ہوں، لیکن پھر بھی میری ایک نظر ہے، اپنا ایک خیال ہے، سوچ ہے، ایک فکر ہے۔ میں نے جو محسوس کیا، دیکھا، لکھ دیا۔ لباس، چہرہ، چال ڈھال، گفتگو کا انداز

بالکل لکھنوی تہذیب کا مرقع۔ سیکڑوں لوگوں کو اس در سے استفادہ کرتے ہوئے ہم نے دیکھا اور اکثر کو خیانت کرتے ہوئے بھی دیکھا کہ فلاں مضمون ہم نے ضمیر اختر نقوی صاحب سے نہیں لیا، فلاں حوالہ وہاں سے نہیں لیا، یہ مرثیہ وہاں سے نہیں، یہ انداز وہاں سے نہیں چرایا، یہ کاپی نہیں کی، وہ کاپی نہیں کی۔ بہر حال اس میں ان لوگوں کا قصور نہیں ہے کیونکہ یہ تو زمانے کی ہوا ہے، اگر وہ ایسا نہیں کریں گے تو زمانہ ان پر لعنت ملامت کرے گا کہ کیسے ست آدمی ہو، ابھی تک آپ نے خیانت نہیں کی۔

بہر حال جب آپ ان سے ملیں گے تو آپ کو احساس ہوگا کہ شاید آپ نے اپنی زندگی میں ایسا قدرت کا عظیم شاہکار کم ہی دیکھا ہوگا۔

ان کی نجی زندگی ان کی سرکاری، یعنی ادبی زندگی سے بھی وزنی ہے۔ آپ یہ سمجھیں گے کہ صرف کثرتِ مطالعہ سے قبلہ اتنی عظیم ہستی بن گئے۔ میرے خیال میں ایسا ہرگز نہیں ہے، کیونکہ ہم نے پڑھے لکھے جاہل بھی بہت دیکھے ہیں۔ ضمیر اختر نقوی خود خاندانی سادات ہیں اور ان کو انتہائی ادبی ماحول میسر رہا۔ خاندانی اور شریف لوگوں میں پرورش پائی۔ آج تک دنیا کا کوئی موضوع، کوئی مسئلہ ان سے بچ کر نہیں گیا۔ گزشتہ سطور میں میں نے جتنے علوم کے تذکرے کیے، قبلہ سے آپ جب چاہیں بحث کر سکتے ہیں۔ اندازِ خطابت اتنا پُرکشش کہ آپ ایک بار سن لیں تو پھر کہیں دوسری جگہ جا نہیں سکتے۔ سب سے بڑی بات تو یہ کہ مجمع میں اکثر سامعین سے واقف ہوتے ہیں۔ اکثر کے گھر مجلس یا میلاد پڑھنے کے بعد ٹیلی فون پر رائے لیتے ہیں کہ پروگرام پسند آیا یا نہیں، اگر پسند آیا ہے تو دریافت کرتے ہیں کہ بھئی ایسی کون سی بات پسند آگئی۔ اگر جواب انکار میں ہے تو بالکل برا نہیں مانتے بلکہ دریافت کرتے ہیں کہ تقریر کا کون سا گوشہ پسند نہیں آیا، پھر اس حصے کی وضاحت کرتے ہیں۔ یہ سارا کام ان کا بہترین

منتظر ہے۔

قبلہ مختلف مجالس یا محافل میں اپنی جانب سے تبرک تقسیم کرتے ہیں۔ خیر، یہ کوئی انوکھا کام نہیں ہے۔ انوکھا کام یہ ہے کہ تبرک کی قسم کا خاص خیال رکھتے ہیں کہ تاریخ کی مناسبت سے تقسیم ہو۔ سیب اور انار کی تقسیم انھی کی قائم کردہ مجالس یا محافل میں دیکھی گئی ہے۔ خصوصاً امام رضا علیہ السلام کا وہ اپنے مومنین کے لیے تحفہ جو امام ضامن کہلاتا ہے، اپنی تاریخ کا حامل ہے۔ اس موقع پر اپنے گھر سے سیکڑوں کی تعداد میں امام ضامن تیار کرکے لانا، نہ جانے کتنے دن پہلے ہی سے وہ اس کی تیاری شروع کرتے ہیں تاکہ صحیح وقت پر اس کی تقسیم عمل میں آئے اور تقسیم کیا عمل میں آتی ہے بلکہ وہ منظر تو دیدنی ہوگا جب خود آپ وہ روح پرور منظر دیکھیں گے۔ اس کے لئے قبلہ خود تمام حاضرین سے پہلے مقام مجلس پر تشریف لاتے ہیں۔ جیسے ہی سامعین کی آمد شروع ہوتی ہے، قبلہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس مومن کے پاس جاتے ہیں اور وہ امانت اس کے سیدھے بازو کے سپرد کردیتے ہیں۔ جیسے ہی مومنین کا سلسلہ بڑھتا رہتا ہے قبلہ بھی اپنے عمل کو تیز کرتے چلے جاتے ہیں، یہاں تک کہ تمام مومنین فیض یاب ہوجاتے ہیں۔ ایسا آپ نے کبھی نہ پڑھا ہوگا، نہ سنا ہوگا، نہ دیکھا ہوگا۔

اگر آپ کو ان کی خوبیوں کا اندازہ کرنا ہے تو ان کے پروگرام میں امام بارگاہ کے کسی بھی گوشے میں خاموش بیٹھ کر پروگرام شروع ہونے سے پہلے ان کو بغور دیکھیں۔ پہلی بات تو یہ کہ قبلہ پروگرام شروع ہونے سے پہلے تشریف لے آتے ہیں اور مجلس نوحہ ماتم مکمل ہونے تک حاضرین میں موجود رہتے ہیں۔ ہاں! تو میں ذکر کر رہا تھا کہ آپ کو بغور دیکھیں، پھر آپ کو ان کے قد کا اندازہ ہوگا۔

جو حقیر نے محسوس کیا، ایک جھلک حاضر ہے:

مائک، موی کیمرا، ٹیپ ریکارڈ، اسٹیج یا منبر، دریاں یا کرسیاں وغیرہ اپنے سامنے ترتیب دلواتے ہیں۔ یہ سارے کام اس خاموشی سے کرتے ہیں کہ آپ کو احساس بھی نہ ہوگا کہ یہ کون ترتیب دلوار ہا ہے۔ اس سارے سامان کی سیٹنگ ایسی نہیں ہوتی کہ جیسی آپ کہیں اور برسوں سے دیکھ رہے ہوتے ہیں، بلکہ انتہائی پُر سکون ماحول میں یہ کام ہوتا ہے، عام لوگوں کی طرح نہیں کہ عجیب ہڑ بونگ ہوتی ہے۔ کوئی شخص کتنا ہی بارعب یا سخت گیر کیوں نہ ہو، ضمیر اختر نقوی کے ٹھنڈے اور میٹھے لہجے کے سامنے وہ بے بس ہو جائے گا کہ آخرکار اس کو اپنا لہجہ تبدیل کرنا ہی پڑے گا۔ یہ سارا میٹھا اور نرم لہجہ قبلہ کا عام زندگی میں ہے لیکن منبر پر وہ منبر کا حق ادا کرتے ہیں۔

آپ نے سیکڑوں لوگوں کو پان کھاتے ہوئے دیکھا ہوگا۔ کبھی قبلہ کو بغور دیکھیں، خاص طور پر کبھی ایک بڑے پان سے ان کو ۱/۴ کرتے ہوئے دیکھیں تو آپ کو ان کے ہاتھوں کی نفاست اور گھماؤ دیکھ کر رشک آئے گا۔ کسی سے کوئی بات کہلوانی ہو تو ایسا طریقۂ کار کا استعمال کرنا کہ آپ بغیر کسی اشتعال کے سب کچھ کہہ جائیں گے، آپ کو احساس بھی نہ ہوگا کہ قبلہ نے آپ سے کیا پوچھ لیا ہے۔ قبلہ کے سامنے آپ کسی کی غیبت نہیں کر سکتے، کیونکہ جیسے ہی آپ نے یہ سلسلہ شروع کیا تو قبلہ کے ذرائع ابلاغ اتنے تیز ہیں کہ یہ صاحب معاملہ کو وہیں بلوا لیتے ہیں اور پھر غیبت تراش سے کہتے ہیں کہ اب آمنے سامنے بات کریں، اور یہ اکثر اس کوشش میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں۔

نسیم حسن امروہوی (بھائی پٹن)

سچ بولنا اُن کا مذہب ہے

ڈاکٹر علامہ سید ضمیر اختر نقوی ۱۹۴۷ء کی پیدائش ہیں۔ ۱۹۴۷ء کی اس لیے بڑی اہمیت ہے کہ اس سال دو بڑے کام ہوئے، ایک بڑا کام پاکستان بنا اور دوسرے، علامہ صاحب پیدا ہوئے۔ کسی کی تعریف کرنا بہت آسان بات ہے اگر اس تعریف میں حقیقت نہ ہو تو وہ تعریف پھر ڈالڈا گھی ہے۔ میری تعریف سے علامہ صاحب کا قد بڑا نہیں ہو جائے گا، روشنی روشنی کو پہچانتی ہے۔ علامہ صاحب دن اور میں رات، ہر شخص کو اپنے جذبات کا اظہار کرنے کا حق ہے۔ یہ میں گارنٹی سے کہہ سکتا ہوں کہ علامہ صاحب کی والدہ نے ان کو دودھ نہیں پلایا، بجائے دودھ کے علم پلایا ہے۔ علامہ صاحب عام شخصیتوں سے الگ ایک ہستی ہیں۔ علم کو خوب صورت کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے حافظہ بنایا ہے۔ میں تو کچھ بھی نہیں ہوں۔ مگر مجھ کو اس بات کی حیرت ہے کہ میں نے بڑے پڑھے لکھے لوگ دیکھے مگر علامہ صاحب جیسا حافظہ نہیں پایا۔ علم اور حافظہ مثل بہن بھائی کے ہیں اور ایک دوسرے سے بہن بھائی جیسا رشتہ ہے۔ میں چیلنج کرتا ہوں، میں پڑھا لکھا تو نہیں ہوں، میری ہندوستان اور پاکستان میں بڑے پڑھے لکھوں سے نشستیں اور ملاقاتیں ہی بچپن سے میری غذا ہیں۔ ہندوستان کے نام ور شعرا سے میری ملاقاتیں رہی ہیں جن کی میرے پاس کوئی گنتی نہیں ہے۔ جو بات میں

نے علامہ صاحب میں پائی، وہ کسی اور خطیب میں نہیں پائی۔ علم ہی ان کی فکر ہے۔ کتابیں علامہ صاحب کی زینت نہیں ہیں بلکہ علامہ صاحب کتابوں کی زینت ہیں۔ جس کتاب کو چھو لیتے ہیں، اس کتاب کی زینت بڑھ جاتی ہے۔ آدمی کی قسمت بدلنے اور گناہ معاف ہونے میں دیر نہیں لگتی۔ میری علامہ صاحب سے ملاقات ہوئی تو میں علامہ صاحب کے سامنے سوالیہ نشان بن گیا۔ چند ہفتوں میں علامہ صاحب نے مجھ کو پرکھنے کے بعد اپنے قریب کر لیا۔ یہ ان کے بڑے ہونے کی بات ہے۔ علامہ صاحب محبِ اہل بیتؑ ہیں، باعمل عاشقِ حسینؑ ہیں۔ ایک بات علامہ صاحب کی مجھے بہت اچھی لگی کہ پابندی کے ساتھ ہر جمعرات کو حدیث کسا سنتے ہیں مولوی ہو یا خطیب، یہ دوسروں کو تو باعمل ہونے کی ہدایت کرتے ہیں اور خود اس پر عمل نہیں کرتے ہیں۔ جیسے مولوی، خطیب، ڈاکٹر اور ماسٹر بد اخلاق ہوتے ہیں علامہ صاحب میں بد اخلاقی کے جراثیم نہیں پائے جاتے بلکہ وہ محبت کا جواب محبت سے دیتے ہیں۔

علامہ صاحب کی ایک کرم فرمائی ہے۔ میرے اندر جو ایک بیماری بچپن سے لگی ہوئی تھی، اس بیماری سے علامہ صاحب نے مجھے چند ہی ہفتوں میں شفایاب کر دیا۔ یہ بیماری احساسِ کمتری کی تھی، مجھے یہ احساس تھا کہ مجھ سے زیادہ جاہل، بے پڑھا لکھا آدمی نہ ہندوستان میں ہے، نہ پاکستان میں۔ علامہ صاحب نے کہا کہ بھی ایسی کوئی بات نہیں ہے اکبر بادشاہ بھی پڑھا لکھا آدمی نہیں تھا، اس کے باوجود بادشاہوں میں اکبرِ اعظم کہلایا۔ جیسے اندھیرے پر روشنی حاوی ہے، ویسے ہی علامہ صاحب تاریخ پر حاوی ہیں۔ اکبر بادشاہ کی پوری بادشاہت کی تاریخ انھوں نے زبانی مجھے اس طرح سنائی کہ جس طرح فیکس مشین سے کاغذ نکل رہا ہو۔ جب گفتگو کرنے پر آتے ہیں تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے موسلا دھار بارش ہو رہی ہو۔ علامہ صاحب کے پاس اردو

کے ہزاروں لاکھوں جملے ہر وقت وردی پہنے تیار کھڑے رہتے ہیں۔

علامہ صاحب مجھے بھائی چمن کہتے ہیں۔

علامہ صاحب کی بڑی محبت تھی۔انھوں نے مجھ سے پوچھا:"بھائی چمن! یہ اتنا لمبا سفر تم نے کیسے طے کیا؟ تم نے اس سفر میں کیا کیا؟ سوسائٹی سے کیا لیا؟ ادب سے کیا لیا؟ سوسائٹی کو کیا دیا؟ علم کیوں نہ حاصل کر سکے؟ تمہارے اندر تو بہت ہی خوبیاں چھپی ہوئی ہیں یا تم خود اس خوبیوں کو چھپائے ہوئے ہو۔تم ایک کتاب لکھو!"

میں نے کہا:"علامہ صاحب! آپ مذاق کرتے ہیں، مذاق بھی کتابوں ہی کا۔میں کہاں اور کتاب کہاں! مجھ سے کتاب تو کتاب، کتاب پکڑنی بھی نہیں آتی ہے"۔

کہنے لگے:"تم سے مذاق نہیں کر رہا۔حقیقت بیان کر رہا ہوں"۔

مجھے ان کے اس جملے میں حقیقت یوں نظر آئی کہ علامہ صاحب نے عزیزی ماجد رضا اور عزیزی کمال حیدر یہ دونوں علامہ صاحب کے بہت اچھے شاگرد ہیں، انھیں علامہ صاحب نے ہدایت فرمائی کہ بھائی چمن جو کہیں۔اسے ٹیپ کرلو۔

کئی دن بعد مجھے یقین آیا کہ علامہ صاحب مذاق نہیں کر رہے۔

۶۴ سال سے میں اپنے آپ کو مرحوم ہی سمجھ رہا تھا اور علامہ صاحب چاہتے تھے کہ میں مرکر پھر سے زندہ ہو جاؤں۔رقم کرنے والا کبھی مرتا نہیں ہے۔اگر یہ کتاب وجود میں آئی تو میرے خاندان کے جو لوگ مرے ہوئے ہیں۔وہ زندہ ہو جائیں گے اور جو زندہ ہیں، وہ زندہ رہیں گے۔

علامہ صاحب کی محبت میرے اور میرے خاندان کے لیئے آب حیات بن گئی، علامہ صاحب کی شخصیت میں، گفتگو میں، تقریر میں، بے تکلف دوستوں میں ہنسی مذاق میں تین چار جملے انھی کے لیئے اردو نے پیدا کیے ہیں۔وجاہت، لیاقت، صداقت، جس

کے پاس جتنا علم ہے، اس کو شرمندہ نہیں کرتے، اسی کے علم کے حساب سے گفتگو کرتے ہیں۔ اس میں بہت احتیاط برتتے ہیں۔ جی تو نہیں چاہ رہا کہ ان کا موضوع ختم کروں، زیادہ لکھنے سے لوگ پھر حسد کرنے لگیں گے۔

اصل میں موت کو لوگ سمجھتے نہیں۔ موت زندگی بسر کرنے کے اصول بتاتی ہے موت اصل میں زندگی کی ماں ہے۔ اسی صورت سے علامہ صاحب زندہ رہنے کے اصول بتاتے ہیں۔ علامہ صاحب نے مجھ کو حلقے میں لے کر ۶۲ سال سے بکنے کے علم میں تھا، مجھ کو علم کی جھلک دکھا کر مجھے ہوش میں لے آئے۔ کتاب کے سلسلے میں مجھ کو اتنے عنوان دیے ہیں کہ میں نیم پاگل سا ہو گیا ہوں۔ ایک عنوان شادی کے بارے میں بھی دیا ہے کہ پہلی شادی کب ہوئی۔ کیوں ہوئی اور کیسے ہوئی، کتنی محبتیں کیں، اس میں کتنی اصلی تھیں اور کتنی جعلی تھیں، اصلی محبت تو میں نے اپنے ماں باپ سے بھی نہیں کی، اصلی کا تو نام نکال دیں۔ میری پوری زندگی ہی جھوٹ پر کھڑی ہے۔ سچ تو میں لوگوں میں دیکھتا رہتا ہوں۔ یہ علامہ سے وعدہ کرتا ہوں کہ کتاب میں کوئی بات جھوٹ نہیں لکھوں گا، خدا کو حاضر ناظر جان کر کہہ رہا ہوں۔

۱۹۵۲ء سے مجالس، تقریریں سنتا آیا ہوں۔ شروع کے تو مجھے مقرروں کے نام نہیں معلوم کیوں کہ کافی عرصہ ہو گیا ہے، مرحوم للّن صاحب، بشیر احمد صاحب فاتح ٹیکسلا، پنڈت نیک رام مرحوم، ابن حسن جارچوی مرحوم، علامہ رشید ترابی مرحوم، میں گارنٹی سے کہتا ہوں کہ یہ ۱۵ منٹ کی مجلس کو ۴۵ منٹ تک پھیلا کر اور پھر مصائب پڑھ کر مجلس کا اختتام کر دیتے تھے۔ میں علامہ صاحب کا قطعاً فیور Favor نہیں کر رہا ہوں۔ علامہ ایک تقریر دس مجلسوں کے برابر کرتے ہیں اس صورت سے جس صورت سے بادل سمندر سے پانی لے کر اڑتا ہے اور تمام دنیا میں برستا ہے اور سمندر میں کمی واقع نہیں

ہوتی۔ اس لیے یہ مثال پیش کر رہا ہوں کہ رمضان میں علامہ صاحب کی تفسیر قرآن کی مجالس، جو علامہ صاحب ہر سال بیان کرتے ہیں، میں نے اس مرتبہ مسلسل ۲۹ تقاریر سنی ہیں۔ میں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جس خطیب کے پاس علم ہوتا ہے وہ مصائب کم پڑھتا ہے۔ یہ میری ذاتی رائے ہے کہ تقریروں کے معاملے میں حاتم طائی ہیں۔ کھلے عام بانٹتے ہیں اور ذرا سی کنجوسی نہیں کرتے کیونکہ جب آمد زائد ہوتی ہے تو وہاں خرچہ بھی زیادہ ہوتا ہے۔

علامہ صاحب اعصاب کے بڑے مضبوط ہیں۔ نہ تو ان پر کسی کی تعریف کا کوئی اثر ہوتا ہے اور جب کوئی ان کی غیبت کرے تو اس کا بھی ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ اور میں مولا علی کی قسم کھا کر کہہ سکتا ہوں کہ ان کا مشغلہ صرف پڑھنا لکھنا ہی ہے۔ جتنا اہل بیت عظام پر وہ کام کر رہے ہیں، اتنا کوئی بھی نہیں کر رہا ہوگا۔ انھوں نے ایک تقریر میں یہ کہا کہ یہاں سے لے کر ہندوستان، ہندوستان سے لے کر امریکہ کا کام لا دیا میرے کام کو۔ یہ بات میری سمجھ میں اس وقت آئی ہے جب ان کے پاس روز آنہ جاتا ہوں، صرف قلم ہے اور وہ ہیں۔ بہت محنت و خلوص سے علم کو اس صورت سے سینچ رہے ہیں جس طرح کوئی مالی اپنے باغ کی پرورش کرتا ہے۔ جو لوگ اُن کی غیبت کرتے ہیں وہ لوگ علامہ صاحب سے حسد کرتے ہیں، اس کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے۔ سونا پیتل نہیں ہو سکتا، پیتل سونا نہیں ہو سکتا۔

حقیقت پسندی، صاف گوئی، غلط بیانی سے نفرت، یہ علامہ صاحب کی پہچان اور زندگی ہے۔ مطالعہ ان کی شرط ہے، سچ بولنا ان کا مذہب ہے۔ علامہ صاحب مطالعہ نہیں کرتے بلکہ مطالعے کی آنکھ میں جھانک کر دیکھتے ہیں، جب تک مطمئن نہیں ہوتے قلم نہیں اُٹھاتے۔ میری کم علمی، میری تعریف علامہ صاحب کی شخصیت کو دوبالا نہیں

کرسکتی، میں مجبوراً جرأت کر رہا ہوں اور اپنے آپ کو خوش کر رہا ہوں۔ تعریف کرنا علامہ صاحب کی کمزوری نہیں ہے۔ یہ صدی ختم ہونے کے قدم چوم رہی ہے۔ علامہ صاحب اس صدی کے بڑے انسان ہیں۔ اس صدی کے بڑے بڑے آدمی بقول علامہ کے گزر گئے۔ علامہ صاحب کتنے خوش نصیب انسان ہیں کہ اگلی صدی سے ملاقات کریں گے انشاءاللہ اور اپنے علم سے آنے والی صدی کا استقبال کریں گے اور اپنے علم کا آنے والی صدی سے تعارف کرائیں گے۔ رسولؐ کی حدیث ہے کہ جھوٹا ہم میں سے نہیں ہوسکتا۔ حافظہ علامہ صاحب کی ایسی خدمت کرتا ہے جیسے ایک اچھی اولاد اپنے باپ کی خدمت کرتی ہے۔ حافظے کی مثال ایسی ہے جیسے انسان روح کو نہیں دیکھ سکتا۔ پڑھے لکھے انسان کا بینک بیلنس حافظہ ہوتا ہے۔ حافظہ نہیں ہو تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ لاکھوں کتابیں الماریوں میں بند ہیں۔ علم سچا ہو، معتبر ہو تو ذہانت اس کو مرنے نہیں دیتی۔ علم کی پہچان ذہانت، ذہانت کی پہچان علم ہے۔ علم اتنا دیانت دار اور امانتی ہے کہ انسان کو پھر وہ مرنے نہیں دیتا۔ کروڑوں کتابیں جو اس وقت حیات ہیں، جن لوگوں سے منسوب ہیں، وہ دنیا میں حیات ہیں اور حیات رہیں گے۔ جب امام حسینؑ مدینے سے چلے تو کئی ناقوں پر خوشبو لدی ہوئی تھی، خوشبو تعارف کی محتاج نہیں ہوتی۔ ضمیر اختر اس صدی کی خوشبو ہیں، تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔

حقیقتاً بات یہ ہے کہ میری علامہ صاحب سے ملاقات صرف دو مہینے کی ہے۔ علامہ صاحب میں ایک بات میں نے دیکھی کہ جتنا مطالعہ کرتے ہیں، اتنا ہی علم کی روشنی سے وہ فلسفے میں، منطق میں ان کی اپنی بھی پیداوار ہے۔ صرف اتنا نہیں ہے کہ جو پڑھا وہی پڑھ دیا بلکہ اس میں اپنی علم اور ذہانت بھی شامل ہوتی ہے۔ منبرِ رسولؐ ایک بڑی متبرک، بڑی دیانت داری کی اور بڑی جرأت کی سیٹ ہے، اس پر بولنا ہر ایک کا

کام نہیں ہے۔ موضوع سمجھانے کا انداز، گفتگو کا انداز بڑی دیانت داری اور محبت سے علامہ صاحب سمجھاتے ہیں جو بہت ہی مشکل کام ہے۔ محبت اہلِ بیتؑ میں مکمل ڈوبے ہوئے ہیں۔

یہ جو کچھ بھی میں کہہ رہا ہوں، میں یہ سمجھ رہا ہوں کہ مجھے اہلِ بیتؑ سے حکم مل رہا ہے حیرت ہے کہ کراچی میں کچھ خطیبوں کی پالیسی اور سیاست ہے کہ علامہ صاحب کی چہ میگوئیاں، الزامات، یہ ڈیوٹی ہے لوگوں کی کہ کسی صورت سے ان کو بدنام کرتے رہو، اور شاباش ہے علامہ ضمیر اختر صاحب کو کہ ان کا یقین اہلِ بیتؑ میں اور پختہ ہوتا جاتا ہے جتنی ان کی مخالفت ہوتی ہے۔ میں نے اتنا صابر آدمی اپنی عمر میں نہیں دیکھا۔ وہ اتنے طاقت ور آدمی ہیں کہ ہر پروپیگنڈے سے، قلم سے وہ کبھی مرعوب نہیں ہوتے۔ اتنی بڑی اپوزیشن پارٹی میں نے کسی کی نہیں دیکھی، جتنا لوگ ان پر الزامات لگا رہے ہیں، اتنا ہی ان کا ضمیر، ان کے پنجے مضبوط ہوتے جا رہے ہیں اور ان کے قلم کی رفتار دن بدن بڑھتی جا رہی ہے، نہ سونے کا ٹائم مقرر ہے نہ کھانے کا ٹائم مقرر ہے۔ قلم ایسے چلتا ہے جیسے مشین کا کوئی اہم پرزہ کام کرتا ہے۔ اللہ سے، رسولؐ سے اہلِ بیتؑ سے اتنے مطمئن ہیں کہ وہ دنیاوی طاقت کو نظر بھر کر نہیں دیکھتے۔ کچھ لوگ ان کے پاس ایسے بھی آتے ہیں جن کو وہ سمجھتے ہیں کہ یہ مخالف ہیں، مگر ان کو بھی وہ خالی ہاتھ نہیں بھیجتے۔ وہ ان کے سوالوں کے صحیح صحیح جواب دیتے ہیں اور قرآن سے اہلِ بیتؑ سے صحیح جواب دیتے ہیں۔ حالانکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس کا کیا مقصد ہے۔ ان کی نظر میں محبت، عداوت، شفقت سب کچھ چھپا ہوا ہے۔ وہ ایک نظر میں جان لیتے ہیں کہ آنے والے کا کیا مقصد ہے۔ اور بڑے پن کی میں نے یہ بات دیکھی کہ اسے نہ تو شرمندہ ہونے دیتے ہیں، نہ محسوس ہونے دیتے ہیں۔

آنکھ ان کی ایسی ہے کہ جیسے جہاز میں لگا بلیک باکس ہر بات کو نوٹ کرتا ہے، ہیچ کرتا ہے۔ انسان کو بھی بھی میں نے یہ نوٹ کیا کہ علامہ صاحب بھی چشمہ لگا کر نہیں دیکھتے۔ انسان کے اور اپنے بیچ میں شیشہ بھی نہیں رکھنا چاہتے۔ سب کو دیکھنے کا ان کے پاس ایک ہی نمبر ہے کہ وہ بغیر چشمے کے دیکھتے ہیں۔ بدقسمت ہے یہ قوم کہ اس نے ان کو قریب سے نہیں دیکھا۔

اس صدی کا شہنشاہ عالم ہے۔ علم کا شہنشاہ عالم ہے۔ بڑے آدمی ایک صدی کے اندر ہی آتے ہیں۔ بڑے لوگ، شاعر، خطیب روز آنہ نہیں آتے ہیں۔ مجھے اتنی تو شرمندگی ہے کہ جو کچھ بھی میں لکھوا رہا ہوں، اس سے مجھے ان کی تعریف کر کے سکون نہیں ہو رہا۔ اللہ مجھے ذہانت دے، عرفان دے! اگر میں خود پڑھا لکھا ہوتا تو بہت سی کتابیں پڑھ کر اچھے اچھے جملے محفوظ کر کے علامہ صاحب کی شان میں رقم کرتا۔ میں نے آج تک کوئی کتاب نہ پڑھی، نہ پڑھوائی۔ ان کے اندر ایک بات میں نے دو مہینوں کے دوران محسوس کی کہ بڑی ایمان داری سے آدمی کے متعلق رائے قائم کرتے ہیں۔ اس میں کسی قسم کی جذباتیت، کوئی انا کا مسئلہ نہیں ہوتا۔ اگر کوئی مخالف صحیح بات کہہ رہا ہے تو وہ اس پر بحث برائے بحث نہیں کرتے۔ یہ ان کے بہت پڑھے لکھے ہونے کی بات ہے کہ کوئی مخالف اگر صحیح بات کہہ رہا ہے تو اسے مان لیتے ہیں، اپنی بے عزتی محسوس نہیں کرتے۔ پورے پاکستان میں جو آج کل خطیب ہیں، وہ علامہ صاحب کی ڈیوڑھی سے ملاقات کر چکے ہیں۔ اگر یہ بات غلط ہے تو کوئی صاحب چیلنج کریں۔ مجھے فخر حاصل ہے کہ کہ مجھے دنیا بغیر پڑھا لکھا سمجھتی ہے، باقی اپنے پرائے اور تیس سال سے میں انکم ٹیکس میں سروس کرتا ہوں۔ مجھے آج تک خدا کی قسم! دشمن، دوست، عزیز اور رقیب کسی نے یہ نہیں کہا کہ یشن بے وقوف آدمی ہے۔ تو جب مجھے کسی نے بے وقوف

نہیں کہا تو آج تک میں اپنے وجود سے زیادہ نہ بحث کرتا ہوں، نہ بات چیت کرتا ہوں۔ یہ جو کچھ بھی میں نے علامہ صاحب کے متعلق لکھا ہے کم لکھا ہے۔ میری نشست علامہ صاحب کے پاس قدرتی طور سے ہوئی اور میں اب اپنے آپ کو بغیر پڑھا لکھا سمجھتا ہی نہیں ہوں۔ ان دو مہینوں میں علامہ صاحب نے مجھے ایسے بھر دیا ہے کہ جیسے کبوتر بچے کو بھر دیتا ہے۔

جیسے میں شہد چاٹتا ہوں۔ ۶۳ سال ۱۰ مہینے اندھیرے میں کاٹے ہیں اور یہ ۲ مہینے میرے روشنی کے ہیں۔ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے میری آنکھ اب بنی ہے۔

ڈاکٹر صفدر حسین کے ایک خط سے اقتباس

۲۰ جنوری ۷۲ء ..... ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب ..... السلام علیکم!

"آپ کی ترقی علم و اقبال سے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔ اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آپ نے خود میری ہی ذمہ داری سنبھال لی ہے"

یکم مئی ۱۹۷۱ء

"میں آج کل کثرت مشاغل اور عدیم الفرصتی کے باعث یکسوئی سے محروم ہوں۔ ادبی مشغلہ بھی معطل ہے۔ ایک سال بعد ریٹائرمنٹ ہوگا۔ اس وقت اگر صحت نے موافقت کی تو کچھ علمی منصوبہ تکمیل پذیر ہو سکے گا۔ ورنہ اللہ اللہ خیر سلا!

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

سید جاوید عباس جعفری

انسانیت کا اجالا

مکتب تشیع کی تاریخ میں جن لوگوں نے اپنی زندگی ترویج علوم آل محمدؑ علیہ السلام اور ملت کے نوجوانوں کی دینی اور اخلاقی اصلاح کے لئے وقف کی انکا نام مکتب تشیع کی تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا گیا ہے۔ اور بہت کم لوگ ہوتے ہیں جنہیں یہ اعزاز نصیب ہوتا ہے کہ انکی با مقصد زندگی دوسروں کے لئے ایک مثال بن جائے اور لوگ انکو اپنا آئیڈیل بنالیں عہد حاضر میں ملت کے تعلیمی وفکری انحطاط اور پستی کا مشاہدہ یوں تو دنیوی و دینی علوم وفنون کے تمام ہی شعبوں میں کیا جا سکتا ہے۔ مگر ان تمام علوم میں بہتر علم، علم دین ہے کیونکہ علم دین کا تعلق ہماری روحانی زندگی سے ہے آخرت ونجات ہے اسی پر ہماری تمام زندگی موقوف ہے۔ حضرت امام محمدؐ باقر علیہ السلام نے فرمایا جو شخص دین سے علم حاصل کر کے مستفید ہوتا ہے وہ ستر ہزار عابدوں سے بہتر ثواب حاصل کرتا ہے۔ حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام نے فرمایا جاہل شیعوں کو جہالت سے بچانے والا ایک عالم فقیہ، ہزاروں عابدوں سے افضل ہے۔ کیونکہ عابد صرف اپنی نجات کی کوشش کرتا ہے اور عالم خود اور دوسرے بندگان خدا کو شیطان کے دھوکے اور مکروفریب سے محفوظ رکھتا ہے۔ امام کے فرمان کے مطابق علم سکھانے والے علماء بھی شفاعت کا باعث ہونگے اور لاکھوں لوگوں کی شفاعت کریں گے علم دین ہم تک آئمہ طاہرین کے ذریعہ ہی پہنچا یہی وہ وارثان قرآن ہیں کہ جنہوں

نے ہم کو جہالت کی تاریک وادیوں سے نکال کر علم کی روشنیوں سے ہمارے دلوں کو منور کیا ہے اور صراط مستقیم کی شاہراہ پر رواں کر دیا ہے اور اسکے باوجود کہ حضرت محمد مصطفےٰ صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی شہادت کے بعد امام اول باب مدینۃ العلم حضرت علی علیہ السلام سے لیکر بارہویں امام مہدی علیہ السلام کی غیبت تک جو ظلم و ستم ان پر اور ان کے ماننے والوں پر ڈھائے گئے اور آج تک ڈھائے جارہے ہیں۔ ایسے علماء ،خطباء اور شعراء ہمارے درمیان موجود رہے ہیں اور موجود ہیں کہ جنہوں نے قرآن حدیث اور اقوال آئمہ علیہ السلام کو بہت خوبصورت انداز سے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے جو ایک معجزہ سے کم نہیں ہے۔ عہد حاضر میں اس بات کی ضرورت شدت سے محسوس ہورہی ہے کہ علماء خطباء و شعراء حضرات اپنے قلم و زبان کی طاقت ادھر اُدھر کے موضوعات میں صرف کرنے کے بجائے امامت کا حقیقی چہرہ آشکار کریں۔ میرے خیال میں تو چند لوگ ہی یہ کام کر رہے ہیں اور ان میں سب سے نمایاں نام جناب ضمیر اختر نقوی صاحب کا ہے کہ جن کے عقائد اور نظریات اہلبیتؑ کے نظریے کی نمائندگی کرتے ہیں اور وہ گذشتہ چالیس برس سے مسلسل اپنی زندگی نوجوان نسل کے عقائد و نظریات کو درست کرنے میں بسر کر رہے ہیں سید ضمیر اختر نقوی جنہیں ہم پیار سے ضمیر بھائی کہتے ہیں۔ میری اور ضمیر بھائی کی دنیاوی اخوت کی روداد کئی سالوں پر محیط ہے جو ایک ضخیم کتاب کی صورت میں اسوقت میرے سامنے کھلی ہے اس کی ورق گردانی کرتا ہوں تو کتاب کے ہر ورق پر ایک گلستاں کھلا نظر آتا ہے اخلاص کا گلستاں ،محبت کا گلستاں ،مہر و شفقت کا گلستاں ،قربانی و ایثار کا گلستاں ،خلوص کی دل موہ لینے والی خوشبوؤں سے معطر اور سدا بہار رنگوں سے آراستہ ہنستا گلستاں ،اس گلستاں کے کس کس پھول کو خیالات کی مالا میں پروؤں اور اس کے کس کس رنگ کو حروف میں آشکار کروں

اجالے کو قید کیا جا سکتا ہے نہ خوشبوؤں کو زنجیر۔ کسی محبوب ہستی کے ساتھ یگانگت کا رشتہ جب گہرا اور قوی ہو جائے تو یہ سوال خاصا مضحکہ خیز لگتا ہے کہ اس رشتے کی ابتداء کب ہوئی تھی ایسے موقع پر یہی لگتا ہے کہ اس رشتۂ محبت کا آغاز زندگی کے آغاز کے ساتھ ہی ہو گیا تھا۔ یہ شاید 1983 کی بات ہے کہ جب ضمیر اختر نقوی صاحب سے بالمشافہ ملاقات ہوئی جب یہ ہمارے ہی محلے میں قیام پذیر تھے۔ انکی شفیق شخصیت میں ایسا سحر تھا کہ مصافحہ اور معانقہ کرتے ہی دل کے دریچے وا ہو گئے اور میں پہلی نگاہ ہی میں گھائل ہو کر رہ گیا۔ دھان پان سی شخصیت کے مالک ضمیر بھائی کی آنکھوں میں مجھے ایمان اور مومنانہ حیا کی ایسی چاندنی کھلی نظر آئی اور انکے چہرے پر خلوص و محبت سے معمور انسانیت کا اجالا میں نے اسطرح بکھرا ہوا دیکھا کہ مجھے یہی محسوس ہوا کہ میرا دل خود بخود منور ہو گیا ہے میں بھی اس اجالے میں پہلی دفعہ داخل ہوا تھا۔ سوچتا ہوں کہ کتنا تھوڑا وقت گزرا ہے اس اجالے میں کہ جیسے پیاسے کو سمندر کے پانی سے محض چند قطرے لیکن یہ قطرے بھی کتنے فرحت بخش ہیں۔ طمانیت کے گہرے احساس کے ساتھ محبت اور عقیدت کا یہ تعلق جس نے مجھے یہ سوچنے پر مجبور کر دیا ہے کہ قوموں کے اپنے وجود کا اظہار اپنی شخصیتوں سے ہوتا ہے۔ جنہیں قدر و منزلت اور عزت و احترام سے نوازا جاتا ہے یہی وہ لوگ ہیں جو انسانوں کو مایوسیوں کی اندھی کھائیوں سے نکال کر عمل و یقین کی روشن بلندیوں تک لیجاتے ہیں۔ کثیر الجہت شخصیت کے مالک ہمارے ضمیر بھائی کہ جن کی شخصیت کا احاطہ کوئی ایک لکھنے والا کر بھی نہیں سکتا کیونکہ انکی شخصیت کے کئی حوالے ہیں اور ہر حوالہ معتبر ہے میرے ذہن میں جو تصویر مشاہدے کے بعد ضمیر بھائی کی واضح ہوئی کہ وہ ایک عزم، ایک مشن ایک مکتب فکر، ایک تحریک اور ایک عہد کا نام ہیں۔ وہ ہر روپ میں دلفریب شخصیت کے حامل فرد نظر آتے ہیں وہ

اپنی نجی زندگی میں کسی دورنگی کے قائل نہیں ہیں ہر بات واضح ، دو ٹوک ، مدلل اور غیر جذباتی کرتے ہیں انکی طویل علمی ، ادبی ، مذہبی خدمات کا ایک زمانہ معترف ہے ایسے ہی نام تاریخ کا جھومر ہوتے ہیں ۔ ہم مسلسل دیکھ رہے ہیں کہ ضمیر بھائی کے پاس نہ تو جاگیر ہے نہ زمین نہ سرمایہ نہ اقتدار لیکن وہ اسکے باوجود بے حد تونگر اور بے حد غنی واقع ہوئے ہیں انکی حیات کا ایک ایک لمحہ ہم جیسوں کی کئی عمروں پر محیط ہے ۔ بین الاقوامی شہرت کی حامل ایک قد آور اور نامور شخصیت کے مالک ہوتے ہوئے بھی میں نے انکے مزاج میں طرحداری نہیں دیکھی زیادہ تر سفید لباس اور اوپر سے شیروانی ہی پہنتے دیکھا ہے شیروانی انہیں اسطرح بجتی ہے کہ جیسے انہی کی قامت زیبا کے لئے تخلیق ہوئی ہے ۔ ضمیر بھائی کی روزمرہ کی مصروفیات اور شب و روز کے معاملات کا میں کئی برس سے مشاہدہ کر رہا ہوں وہ صبح سے شام تک بلکہ رات گئے تک یا تو مطالعہ کر رہے ہوتے ہیں یا پھر قوم کے لئے کسی نئی کتاب کی تخلیق اور کچھ ناگزیر مصروفیتیں ایسی بھی ہیں جو وہ کسی سے بانٹ بھی نہیں سکتے اور کئی غیر ضروری کام بھی ہوتے ہیں جو لوگ انہیں سونپ کر اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ ہلکا کر لیتے ہیں ۔ اتنی اعصاب شکن اور تھکا دینے والی مصروفیات کے باوجود انکی پیشانی پر میں نے کبھی شکن نہیں دیکھی ۔ ضمیر بھائی کی ساری زندگی لفظوں کی رفاقت میں گذری ہے چاہے وہ تحریر ہو یا تقریر زندگی کے ہر مرحلے پر یہ لفظ ضمیر بھائی کے وفادار دوست اور رفیق بن کر رہے ہیں ۔ ضمیر اختر نقوی ایک فرد کا نہیں ایک اسلوب حیات کا نام ہے ۔ اس اسلوب حیات کے لئے اگر ایک لفظ کا انتخاب کیا جائے تو وہ سوائے عبادت کے کوئی دوسرا لفظ نہیں ہوسکتا کیونکہ عبادت حسن نیت بھی ہے اور حسن عمل بھی اور ضمیر بھائی کی زندگی حسن نیت اور حسن عمل کا بہترین امتزاج ہے ۔ زندگی کے عام معمولات انجام دینے میں بھی ضمیر بھائی ایک منفرد انداز

رکھتے ہیں۔ جس میں وضع داری اور شائستگی و وقار کو درجہ کمال حاصل ہے۔ لکھنوی تہذیب سے تعلق رکھنے والے ضمیر بھائی کے رہن سہن میں نشست و برخاست میں رویوں میں اور برتاؤ میں خوراک میں لباس میں اور سب سے بڑھ کر بول چال میں بہت رکھ رکھاؤ اور تہذیب پائی جاتی ہے۔ جس میں منکسرانہ وقار کا عنصر غالب ہے اس عنصر سے میں نے انکی گفتگو کو کبھی خالی نہ پایا۔ جب تک وہ قریب رہتے ہیں اپنائیت اور چاہت کی ایک دلاویز خوشبو بکھری رہتی ہے، دوست احباب کی محفل میں انکا طرز گفتگو ہمیشہ ایک سا رہتا ہے فطرت کی مانند سنجیدہ، پھول کی طرح شگفتہ ہلکے پھلکے قہقہوں سے آراستہ شستہ، شائستہ اور باوقار بے ساختگی کے باوجود نپے تلے الفاظ جیسے کسی نفیس مشین سے یکساں وضع کے آبگینے ڈھل ڈھل کر نکل رہے ہوں دوستیاں نبھانے تعلق جوڑنے اور لوگوں کو سمیٹ کر رکھنے کا فن انھیں خوب آتا ہے وہ لوگوں کو بکھرنے نہیں دیتے ویسے بھی ضمیر بھائی کے دوستوں، مداحوں اور چاہنے والوں کی کمی نہیں ہے فرش سے عرش تک کے لوگوں میں انکا حلقہ، تعارف اور قبیلہ، رفاقت دور دور تک پھیلا ہوا ہے ہر ایک چاہتا ہے کہ وہ ان سے ملے وہ ان کے پاس ٹھہریں وطن میں ہوں یا پردیس میں ملاقاتوں کا بھاری بھرکم شیڈول تیار رہتا ہے۔ میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ اندر سے کبھی کسی سے خائف نظر نہیں آئے یہ بے خوفی یہ شجاعت یہ اطمینان قلب عشق علیؑ کے بغیر کسی طرح ممکن نہیں ہے اللہ تعالیٰ کی ذات اور اہل بیتؑ پر غیر متزلزل ایمان ہی وہ حقیقت ہے کہ جس نے ضمیر بھائی کو خوف، تحریص، ترغیب لالچ جیسے گھٹیا احساسات وجذبات سے بلند کر دیا ہے میں نے انکی شخصیت میں کبھی تضاد نہیں دیکھا ضمیر بھائی کی شخصیت کا ایک اور نمایاں پہلو انکی ذات میں فکر و عمل کا ہم آہنگ ہونا ہے اسی لئے انکی خطابت بھی بے لاگ اور لگی لپٹی کے بغیر ہوتی ہے کیونکہ لگی لپٹی رکھنا

انکی دانش کے بھی خلاف ہے اور دیانت کے بھی جو کہتے ہیں وہ کرتے ہیں انکی فکر تحریر تقریر میں غیر معمولی ہم آہنگی پائی جاتی ہے وہ ملت کے مفاد میں اپنی رائے کو کبھی دباتے یا چھپاتے نہیں ہیں وہ ہر اس بات کو کہہ دینے کی ہمت رکھتے ہیں جو سچ ہو۔ حکمرانوں، رئیسوں اور اہل شوکت کی دہلیز پر جبیں سائی کو طرۂ امتیاز سمجھنے والوں کے اس پست قد دور میں ضمیر بھائی جیسا غیور درویش ملنا مشکل ہے میں نے کوئی دوسری ایسی شخصیت نہیں دیکھی جو بڑی بڑی پیشکشوں کو اتنی آسانی سے ٹھکرا دے ان ترغیبات کو اتنی آسانی سے ٹھکرانے کے سبب وہ کھل کر ہر ایک کی گرفت کرتے ہیں اور اپنی رائے بغیر کسی ذہنی تحفظ کے بیان کرتے ہیں۔ مگر انکی تنقید تخلیق کی زبان میں ہوتی ہے بعض لوگ انھیں ہوا کا رخ دیکھ کر چلنے کی نصیحت کرنے لگتے ہیں مگر انکی نظر میں آزادی اظہار کی بھی ایک قیمت ہوتی ہے جو کبھی مخالفتوں سے ادا کی جاتی ہے کبھی ذاتی نقصان سے اور یہی وجہ ہے کہ ضمیر بھائی کے چند مخالفین بھی اسی آزادی اظہار نے پیدا کیے مگر جو قیمت ادا کرنے پر آمادہ رہتے ہیں ان سے یہ آزادی اظہار کوئی نہیں چھین سکتا حقیقت یہ ہے کہ ضمیر بھائی نے خطابت کو انڈسٹری اور تجارت کی سطح سے اٹھا کر ایمان اور اصول کے اس گمشدہ معیار پر پہنچا دیا ہے جو آج سے تیس پینتیس برس پہلے کے عظیم خطباء نے قائم کیا تھا جن میں کئی بڑے بڑے نامور علماء اور خطباء کے نام لئے جا سکتے ہیں۔ بہت سی خصوصیات میں سے جو خصوصیت ضمیر بھائی کو اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتی ہے وہ انکی اصول پسندی ہے انہوں نے جذبات کے آگے ہمیشہ دلیل کو اپنایا انہوں نے بطور خطیب وقتی فائدے اور سستی شہرت کو رد کرتے ہوئے طویل المیعاد منصوبہ بندی کی ہے وہ خطابت میں ادھر ادھر کی باتوں میں وقت ضائع کرنے کے بجائے اپنے مقصد کے حصول کو مقدم رکھتے ہیں تا کہ جب اس درس گاہ حسینؑ سے کوئی

بھی محبِ حسینؑ اٹھ کر جائے تو اپنے دل میں علم کی ٹھنڈک محسوس کرے قدرت کی عطا کردہ خوبیوں نے ضمیر بھائی کو ایک سحر انگیز خطیب بنایا ہے انکی تحریروں کو دوام بخشا ہے حافظے کے معاملے میں محمدؐ و آل محمدؐ کا ان پر خاص کرم ہے۔ تیز حافظے اور علم کی بدولت سوال کرنے والوں کے جوابات ضمیر بھائی کی نوک زباں پر رہتے ہیں۔ ضمیر بھائی کی مجالس کے موضوعات پر نظر ڈالیں تو ان میں بڑی انفرادیت نظر آتی ہے اور وہ حقیقتاً موضوع کا حق ادا کر دیتے ہیں تقریباً پانچ ہزار موضوعات پر دس ہزار تقاریر تو یقیناً کر چکے ہیں بقول غالب

ریگ در بادیۂ عشق روانست ہنوز
(عشق کے صحرا میں ریت چلتی ہی چلی جا رہی ہے)

اس پُر آشوب دور میں کہ جہاں خطابت میں آبلہ پائی محض شوق نہیں جہاد ہے۔ کیونکہ کچھ سطحی فکر رکھنے والے انکی تقریروں کو اعتراضات کی زد پر اور قدغن کی سان پر رکھتے ہیں۔ جب کہ اہلِ علم میں انکی تقریر کو پسندیدگی کی سند حاصل ہوتی ہے اور وہ انکی مجالس کو حصول علم کا بڑا ذریعہ سمجھتے ہیں بہر حال انہی خارزاروں سے گزرنا انہی کا کمال ہے بعد ختم مجلس اکثر لوگ انکے ارد گرد بیٹھ کر سوال کرتے ہیں اور وہ دیکھتے ہی دیکھتے ان کو اس طرح سمجھاتے ہیں کہ سوال کرنے والا خود کو سبک اور ہلکا پھلکا محسوس کرنے لگتا ہے۔ اور اطمینان سے سرشار ہو جاتا ہے انکی خطابت کی خاص بات موضوع کا احاطہ اور دھیمے اور منطقی انداز کی قوت استدلال ہے اگرچہ کسی ممتاز دینی درسگاہ کے فارغ التحصیل نہیں ہیں مگر کئی مجالس میں انکی تقریروں کے دوران اگر فقہ کی کوئی بات درمیان میں آجائے تو فقہی مسائل پر بھی گفتگو کرتے سُنیں تو انکے علم و فضل اور قرآن اور معصومینؑ کی احادیث کے برمحل حوالوں قوت استدلال اور انکی منطقیت سے مجھے

ہمیشہ یہ احساس رہا کہ جیسے وہ کسی ممتاز دینی درسگاہ کے فارغ التحصیل جید عالم اور فقیہ ہوں انکے مدلل تحلیل تجزیے اور قوت بیان سے متاثر ہونا ناگزیر ہے۔ غرض یہ کہ جس موضوع پر بھی تقریر کرتے ہیں اور قلم اٹھاتے ہیں انکے متعلق ایک ایسی جامعہ العلوم شخصیت کا تاثر پیدا ہوتا ہے کہ جس نے علمی شعبے میں تخصیص کا درجہ کمال حاصل کیا ہے یہ ساری کرامات ودیعت الٰہی تو ہیں ہی مگر اس میں انکے مرحوم والدین کی تربیت اور لکھنؤ جیسے تہذیبی اور فیض بخش شہر کی نوازشات کا بہت دخل ہے ضمیر بھائی کی والدہ مرحومہ بھی ایک نامور خطیبہ اہل بیتؑ تھیں تو جہاں انہوں نے والدین سے سادات کی تہذیبی اخلاق ومجلسی قدریں وراثت میں پائیں وہیں انہوں نے لکھنؤ میں بڑے بڑے جید علماء وخطباء کو قریب سے دیکھا اور انکی مجالس سننے کا شرف حاصل کیا ضمیر بھائی کی تعلیم تربیت لکھنو میں ہوئی یہی وجہ ہے کہ لکھنو سے انکا بڑا جذباتی لگاؤ ہے انکے نام کے ساتھ لکھنؤ کا ذکر لازم وملزوم ہے۔ بقول ساحر لدھیانوی:

نام میرا جہاں جہاں پہنچا
ساتھ پہنچا ہے اس دیار کا نام

ضمیر بھائی کو قریب سے دیکھنے والا ہر فرد ان سے سوائے محبت کے کچھ کر ہی نہیں سکتا۔ انکی علمی شہرت ہر فرد کو اتنا متاثر کرتی ہے کہ اوپر سے نیچے تک ہر فرد ان سے متاثر نظر آتا ہے۔ میر انیس سے ضمیر بھائی بہت زیادہ متاثر ہیں کہ جن کی الہامی شاعری نے اردو زبان کو درجہ کمال تک پہنچایا ہے اور جن کے مرثیے تاریخ میں ادب کا درجہ رکھتے ہیں اور مرثیہ ضمیر بھائی کی تحقیق کا بھی خاص موضوع ہے۔ اسی لئے وہ دوران مجلس میر انیس کے اشعار کو شعر خوانی کی فنکارانہ صلاحیت کے ساتھ برمحل استعمال کر کے اپنی نثری گفتگو کو پرتاثیر بنانے میں ماہر ہیں یقیناً ضمیر بھائی کی ادبی حیثیت اور خطابت

بہت اونچے درجے پر طے شدہ ہے دوران تقریر ان کی کیفیت کا مشاہدہ کریں تو آپ کو محسوس ہوتا ہوگا کہ جیسے ان پر الہام ہو رہا ہو علم کا ایک دریا ہے کہ جو بہتا ہی چلا جا رہا ہے رکنے کا نام ہی نہیں لیتا ضمیر بھائی کی مثال آفتاب کی مانند ہے جو اس لئے نہیں نکلتا کہ دنیا سے اپنی روشنی کی قیمت وصول کرے بس وہ تو سب کو فیض ہی پہنچا رہے ہیں ان جیسی فیاض اور غنی دل شخصیت بہت کم ہوتی ہیں کاش ہم اب بھی ان جیسی شخصیتوں کی قدر کرنا نہیں سیکھے تو تاریخ ہم کو کبھی معاف نہیں کرے گی اور ہمارا نام بھی ان ناقدروں میں لکھا جائے گا جو پچھلے ادوار میں گذر چکے ہیں جن پر ہم تف کرتے ہیں اگر ہم نے بھی یہی رویہ اپنایا تو ہماری آئندہ نسلیں بھی ہم پر تف کریں گی آیئے دعا کریں کہ خداوند عالم محمدؐ و آل محمدؐ کے صدقے میں ضمیر بھائی کو لمبی عمر عطا کرے اور انکی تحریر و تقریر سے ہم کو استفادہ کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ (آمین)

مصاحب علی خطیبؔ کامٹی ضلع ناگپور (بھارت) کے ایک خط سے اقتباس

۲ فروری ۱۹۸۲ء

آپ کا ترتیب دیا ہوا نسخہ "جوش ملیح آبادی کے مرثیے" زیر مطالعہ ہے۔ اس کتاب کو دیکھ کر اندازہ لگتا ہے کہ آپکو اس کتاب کی ترتیب و تزئین میں بہت سی دشوار گزار منزلوں سے گزرنا پڑا ہوگا، بہر حال آپ کی یہ کد و کاوش آنے والی نسلوں کے لئے ایک سنگ میل اور مشعل راہ ثابت ہوگی...... اور جدید مرثیے پر پی ایچ ڈی کرنے والے اسکالرس کے لئے ایک ٹھوس مواد اور عظیم سرمایہ ثابت ہوگا۔

ندیم شبلی ایڈووکیٹ:

ڈاکٹر پروفیسر سیّد ضمیر اختر نقوی

ایک عہد ساز شخصیت

میں نے لکھ دیا تھا قبلہ سورج ہیں سورج کے آگے چراغ کی کیا حقیقت......!

قبلہ کو سمجھنے سے پہلے مجھے بھی سمجھنے کی ضرورت ہے، میری جستجو، میری تلاش صاحب علم افراد ہیں، جاہلوں سے میں مخاطب نہیں ہوتا، یہ سال ۲۰۰۰ء کا قصہ ہے میں مولانا طالب جوہری صاحب آف کراچی کی مجلس ماڈل ٹاؤن لاہور سن کر واپس عامر ہوٹل آرہا تھا یہ عشرۂ ثانی کے سلسلے میں منعقد مجلس تھی لیکن جتنا عرصہ مجالس سنتے ہوا تھا دل کی پیاس اور تشنگی نہ بجھ پا رہی تھی، اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ میں ملک کے نامور وکیل بیرسٹر جناب محترم اعتزاز احسن صاحب سابق صوبائی وزیر قانون، سابق وفاقی وزیر قانون، سابق وفاقی وزیر داخلہ، سابق سینیٹر اور موجودہ ایم۔این۔اے کے ساتھ دس ۱۰ سال تک بطور کولیگ کام کر چکا ہوں اور اُن کی شفقت، محبت اور سرپرستی مجھے حاصل رہی، جن کی توجہ و راہنمائی کی بدولت میں پہلے ایک اچھا انسان اور پھر ایک کامیاب وکیل بنا، اعتزاز احسن صاحب کی Vision اور دلائل کے آگے کوئی نہ ٹھہر سکتا تھا اور اعلیٰ عدالتوں میں لوگ خصوصی طور پر ان کے منطقی دلائل سننے آتے تھے، البذا مقدمات کی قانونی موشگافیوں اور حالات و واقعات کو سمجھانے کا فن انہیں خوب آتا ہے مگر مذہب اور تاریخ کی جان کاری کروانا ایک علیحدہ فن ہے، البذا عرصہ دراز سے اور کثرت سے

مجالس سننے کے باوجود دل کی تشنگی برقرار تھی، میں ماضی میں علامہ نصیر اجتہادی صاحب، عرفان حیدر عابدی صاحب، پروفیسر عبدالحکیم صاحب، گلفام ہاشمی صاحب، تسیم رضوی صاحب جیسے نامور علماء کو بھی سن چکا تھا، مگر بات وہاں کی وہاں تھی جہاں سے شروع کی تھی۔ لہٰذا یہ اسی رات کا قصہ ہے میں جب عامر ہوٹل کی طرف آ رہا تھا تو جین مندر کے پاس ٹریفک بلاک تھی میرے دریافت کر نے پر پولیس مین نے بتلایا کہ آگے مجلس ہو رہی ہے جس وجہ سے راستہ بند ہے میں نے اپنی کار کو پارک کیا اور سوچا کہ چلو یہاں ''خیمہ سادات'' میں بھی مجلس سنتے ہیں کیونکہ اس سے قبل میں نے کبھی بھی خیمہ سادات امام بارگاہ کی زیارت نہ کی تھی، میں امام بارگاہ میں داخل ہوا تو لوگوں کا ایک جم غفیر وہاں جمع تھا مگر مکمل سناٹا تھا لوگ ورطۂ حیرت میں مجلس سننے میں مگن تھے، منبر پر ایک Full of Personality شخص مجلس پڑھ رہے تھے، میں بھی پیچھے کھڑا ہو گیا، مصائب جاری تھے اور کربلا میں امام مظلوم حضرت امام حسینؑ کی شہادت پڑھی جا رہی تھی اچانک مجھے محسوس ہوا کہ میں ''کربلا'' کے میدان میں انبیاء علیہ السلام اور فرشتوں کے درمیان کھڑا یہ منظر دیکھ رہا ہوں، منظر یہ تھا کہ مولائے کائنات حضرت علیؑ گھوڑے پر بیٹھے دیکھ رہے ہیں اور حسینؑ کا گلا کاٹ کر سر تن سے جدا کیا جا رہا ہے اور پھر خونِ حسینؑ سے کربلا کی زمین پر **لا اِلٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ** کی تحریر لکھی جا رہی ہے اور کٹے گلے سے بھی یہی صدا آ رہی ہے، حق کی اس عظیم فتح پر اور باطل قوتوں کے عبرت ناک شکست پر مولائے کائنات کا سر فخر سے بلند ہے، اچانک میرے سمیت پورا مجمع چیخ و پکار کرنے لگا جیسے کوئی ماں اپنے جوان اور اکلوتے لختِ جگر کی موت کی اچانک خبر سن کر چیخ و پکار کرتی ہے پھر کچھ عرصہ کے لئے میرے حواس گم ہو گئے، سانس رک گیا میں کربلا میں ہوں.............!

پھر جب میں نے اپنے آپ کو سنبھالا تو دعا کی صدا بلند تھی ''خدا کوئی غم نہ دے سوائے غمِ حسینؑ کے'' مجلس آخری تھی اور اختتام پذیر ہو چکی تھی میں نے سامعین میں سے کسی سے پوچھا، قبلہ کا نام کیا ہے تو معلوم ہوا آپ ڈاکٹر ضمیر اختر صاحب آف کراچی ہیں اور یہاں عرصہ دراز سے عشرۂ ثانی پڑھ رہے ہیں میں ہوٹل واپس آ گیا مگر کربلا کا منظر میرے ساتھ ساتھ تھا، میں نے غور کیا سوچا یہ شخص کتنا عظیم ہے جس نے مجھے جیتے جی کربلا دکھا دی، مجھے مولائے کائنات اور حسینؑ مظلوم اکٹھے کربلا میں دکھا دیئے ہیں، رات انہیں سوچوں میں گم ہو گیا، صبح عدالت عالیہ میں مقدمات سے فارغ ہو کر خیمہ سادات پہنچا تو معلوم ہوا کہ نقوی صاحب کراچی جا چکے ہیں، وہاں میری ملاقات امام بارگاہ خیمہ سادات کے متولی جناب حسن رضا صاحب شہید سے ہوئی، میں نے مولانا کے وڈیو کیسٹ کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے نہایت محبت سے کہا کہ میں اپنے بیٹے علی حیدر ربوبی سے کہہ کر دلوا دوں گا اور شام کو آنے کا کہا میں اکثر ہائیکورٹ سے کیس کر کے واپس فیصل آباد چلا جاتا ہوں، مگر اس دن میں شام تک لاہور میں رک گیا اور پھر شام کو علی حیدر ربوبی صاحب سے ملاقات ہوئی، خوب صورت نوجوان آنکھوں میں محبت اور شرارت کی یکساں چمک، فوری طور پر پچھلے سال کے کیسٹ میرے حوالہ کر دیئے، اور سال ۲۰۰۰ء کے کیسٹ کے بارے میں وعدہ کیا کہ فراہم کر دیئے جائیں گے میں نے ۱۹۹۹ء کی ۱۰ مجالس بسلسلہ عشرۂ ثانی جناب قبلہ علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب ریکارڈ کروائیں اور ہال روڈ لاہور سے ارجنٹ کام کروا کر اصل کیسٹیں واپس کر دیں، پھر کیا تھا گھر میں جملہ احباب کو جمع کیا دعوت کا اہتمام کیا کافی دوست آئے اور قبلہ کی ۱۹۹۹ء میں کی گئی پہلی تقریر سننے لگے، سب ورطہ حیرت سے سن رہے تھے یاد رہے کہ میرے جملہ احباب اہل سنت مسلک سے تعلق

رکھتے ہیں جو قبلہ کی تقریر سن کر نہ صرف حیران تھے بلکہ سوچوں میں گم ہو گئے تقریر میں اتنے وزن دار دلائل تھے کہ سب کے سب یہ کہنے پر مجبور ہو گئے کہ علی حق ہیں اور حسین زندہ باد ہیں حسین سب کے ہیں پھر کیا تھا جملہ احباب نے فیصلہ سنا دیا کہ روز آنہ ایک مجلس قبلہ کی سنی جائے گی، جو لوگ مجلس میں جانا گناہ کبیرہ اور جرم سمجھتے تھے وہ خود بضد تھے کہ قبلہ کی تمام کی تمام ۱۰ مجالس سنی جائیں گی، کھانے پکتے رہے مجالس ہوتی رہیں، عقائد بدلتے گئے سب کربلا میں حسین کے ساتھ کھڑے تھے، تاریخ کا اس سے بڑا معجزہ اور کیا ہو سکتا ہے حق کی اس سے زیادہ فتح کیا ہو سکتی ہے کہ TV پر کیسٹ سن کر کوئی ایمان اور عقیدہ بدل لے، نہ ساتھ رہ کر نہ کردار دیکھ کر نہ کسی شخص کے بارے میں اس کے حالات زندگی جان کر مگر صرف اور صرف اس کی تقاریر سن کر علم و تحقیق کے تابع ہو کر اکثر نے کہہ دیا کہ آج سے قبل ہم فلاں صاحب کو ہی سب سے بڑا خطیب سمجھتے تھے مگر قبلہ کو سن کر یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ ان سے بڑا خطیب اور مقرر ہم نے تا زندگی نہیں سنا ہے۔ میرا بھی یہی خیال تھا اور ہے کہ بات کو Explain کرنے یعنی سمجھانے کا فن قبلہ سے زیادہ کسی کو نہیں آتا ہے، دل و دماغ کو ہر تشنہ سوال کا جواب مل چکا، کوئی تشنگی باقی نہیں ہے، سال ۲۰۰۱ء سے جملہ دوست احباب فیصل آباد سے خصوصی طور پر لاہور خیمہ سادات میں قبلہ کی مجلس سننے جا رہے ہیں اور ہر سال یہ سلسلہ تا حال جاری ہے سب قبلہ صاحب کے دیوانے اور عاشق ہو چکے ہیں یاد رہے یہ ایسے ''کٹر'' لوگ تھے کہ خدا خود بھی انہیں آ کر کہتا کہ علی اور حسین کو مانو تو شاید ''خواب'' کا بہانہ بنا کر انکار کر دیتے مگر قبلہ کی محض TV پر تقاریر سن کر سب یک جان ہو کر علی علی اور حسین حسین کر رہے ہیں اور پکے حسینی عزادار بن چکے ہیں یہ کیسے ہوا، کس نے کیا، صرف اور صرف قبلہ صاحب کے با اثر دلائل سے بھرپور تقاریر نے یہ معجزہ برپا کر دیا، جو آج کے خود

پرست، خود غرض، بے ضمیر دور میں معجزہ دکھاتے ہیں، اس شخصیت اس کردار کا نام ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی ہے، کاش ان کی صلاحیتوں کو ملکی سطح پر استعمال کیا جاتا، تو آج سب علی والے ہوتے، حق پرست ہوتے، کیونکہ سب میں سب ہے، قبلہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ پہلی ملاقات جو جناب حسن رضا صاحب شبیہ عزا کے گھر میں ہوئی، اس کا اگر تذکرہ نہ کروں تو بات مکمل نہ ہوگی اور تشنہ رہ جائے گی۔

یہ سال ۲۰۰۱ء کے عشرہ ثانی کا واقعہ ہے میں اپنے عزیز دوستوں اشرف صاحب، شوکت صاحب، جیلانی صاحب، شفقت رضا صاحب کے ساتھ قبلہ کی مجلس سننے لاہور خیمہ سادات گئے ہوئے تھے مجلس کے بعد حسن رضا صاحب سے میں نے درخواست کی کہ ہم فیصل آباد سے آئے ہیں اور قبلہ صاحب کو سلام کرنا چاہتے ہیں تو انہوں نے فوری طور پر ہمیں کمرے کے اندر آنے کو کہہ دیا، تو ہم نے کمرے کے اندر عجب منظر دیکھا، قبلہ زمینی فرش پر بیٹھے ہوئے تھے اور نہایت محبت شفقت سے لوگوں سے مخاطب تھے حسن رضا صاحب نے ہمارا تعارف کروایا، تو بڑی محبت اور گرمجوشی سے ملے، سب کو گلے لگایا اور پھر ہمارے ساتھ ایسے گھل مل گئے کہ ہمیں لگا جیسے صدیوں پرانا تعلق اور رابطہ ہے، میں نے جملہ احباب فیصل آباد کا تعارف کروایا، سب کے نام بتائے اور بتایا کہ سب برادران اہل سنت ہیں قبلہ مزید گرمجوشی سے ملے اور محبت سے پیش آئے پھر کیا تھا اگلی مجلس کے بعد جب ملاقات ہوئی تو قبلہ میرے تمام دوستوں کے نام لے لے کر پکار رہے تھے حالانکہ صرف ایک چند لمحوں کی ملاقات ہوئی تھی، سب دوست بڑے حیران ہوئے اور میں نے بھی محسوس کیا کہ قبلہ نے کیا حافظہ اور پہچان پائی ہے، اور چہرہ شناسی کی اس سے بڑی مثال کیا ہو سکتی ہے کہ جملہ احباب اب مذہب حق کے سچے اور پکے پیروکار بن چکے ہیں۔ مولائے کائنات کا کیسا کرم ہے

نقوی صاحب پر بھی کہ وہ بھی اپنے جدِ علیؑ کی طرح مومن کی پہچان رکھتے ہیں!

اس کے علاوہ قبلہ نقوی صاحب کی کچھ ایسی باتیں جو انہوں نے اپنی تقاریر میں کیں تھیں ضبط تحریر میں لانا چاہتا ہوں جو بعد میں سچ اور حقیقت کا روپ دھار گئیں، مثلاً مولانا نے اپنی ایک مشہور تقریر میں کہا تھا، پہاڑ پر چڑھے ہوئے انسان جاہل ہیں اور جتنے پہاڑی علاقے ہیں سب ڈوب جائیں گے۔ پھر تاریخ میں سبق ہے کہ افغانستان میں جو لوگ جہالت کر رہے تھے اُن کا کیا انجام ہوا اور کیسے کاغل جیسے پہاڑی علاقے میں ڈیم کے پشتے ٹوٹ جانے سے سیلاب آگیا جبکہ اس سے قبل کسی بلند پہاڑی علاقے میں سیلاب کی مثال نہ تھی۔

ایسی ہی ایک مجلس میں قبلہ مولانا نے کہا تھا کہ اگر عزاداری حسینؑ پر اعتراض ہوتا رہا تو یہاں غیر مسلموں کے تہوار منائے جائیں گے اور پھر پوری قوم گواہ ہے کہ کس طرح یہاں بسنت منائی جارہی ہے اور کسی "مجاہد" نے آج تک بسنت منانے والوں پر گولی نہیں چلائی اور نہ ہی گرنیڈ پھینکا جبکہ شیعہ مجالس پر فائرنگ بھی ہوتی رہیں ہیں اور گرنیڈروں سے بھی حملے ہو چکے ہیں کیسی عجیب بات ہے حسینؑ پر اعتراض کرنے والے بسنت نائٹ بھولے ہوئے ہیں اور کشمیر میں مسلسل ناکامیوں پر بھی قبلہ کہہ چکے ہیں کہ کشمیر کا جہاد کرنے والے دراصل حسینؑ کا جہاد بھولے ہوئے ہیں، یہ کہہ دوں تو غلط نہ ہوگا کہ قبلہ وقت کے "ولی" ہیں اور اُن پر باتیں اوپر سے وارد ہوتی ہیں، اُن پر اُترتی ہیں۔

کلچر اور مذہب کی ہم آہنگی اور ضرورت پر قبلہ سے بڑھ کر کوئی Explain نہیں کر سکتا ہے اور نہ ہی مذہب اور کلچر کے لازم وملزوم ہونے کی نسبت اُن سے بہتر کوئی مثالیں دے سکتا ہے بات کو سمجھانے کا فن ایک عظیم فن ہے اور قبلہ اس فن کے "دیوتا"

ہیں، کیونکہ بات کو زبان سے جاری کر کے سامعین کے دل و دماغ میں اتر کر سمجھانے کا انداز ایسا ہے کہ کثیر مجمع میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں ہوتا جو بات کی تہہ تک نہ پہنچا ہو، بلکہ بچہ بھی بات کو سمجھ رہا ہوتا ہے قبلہ کو اگر معراج خطابت کا درجہ دیا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اُن کے سامعین جانتے ہیں کہ قبلہ شاید واحد مقرر/خطیب ہیں جو دوران خطابت اپنی گھڑی کو نہیں دیکھتے ہیں بلکہ ان کے مدنظر فقط اور فقط یہ بات ہوتی ہے کہ مجمع کا ہر کوئی فرد اُن کی بات کو اچھی طرح سمجھ جائے اتنی لگن سے کون ہے جو آج کے پرآشوب دور میں پیغام کو آگے پہنچا رہا ہے کیونکہ کراچی ہو یا لاہور بڑے بڑے علماء کرام و ذاکرین سامعین کو محض فلسفہ سنا کر چل دیتے ہیں اور لوگوں کو فلسفیانہ رنگ میں اُلجھا کر معاملات میں مزید بگاڑ پیدا کر رہے ہیں، اس سے نہ تو مذہب کو کوئی فائدہ پہنچ رہا ہے اور نہ ہی ملت کی بھلائی ہو رہی ہے اور ایسے میں یہ مذہب محض رونے دھونے کا مذہب بن کر رہ گیا ہے، حالانکہ یہ انقلاب اور تبدیلی لانے والا مذہب ہے، کیونکہ انقلاب آئمہ کرام کا مقصد اور شعار رہا ہے لہٰذا تبدیلی کی اشد ضرورت ہے اور یہ صرف اسی صورت میں ممکن ہے جب قبلہ نقوی صاحب جیسے پرعظیم اور انقلاب آفرین شخص کی خدمات کو بروئے کار لایا جائے اور اس سلسلے میں پورے ملک میں ایک متحرک تحریک چلائی جائے تاکہ پوری قوم نقوی صاحب کے افکار اور راہنمائی سے Guid Line لے سکے، تاکہ ملک و ملت کی بھلائی ہو اور اس کی عزت بحال ہو پائے، میری شدید خواہش ہے کہ قبلہ نقوی صاحب پاکستان کے ہر چھوٹے بڑے شہر میں آئیں اور ان کے لیکچرز نہ صرف عوام الناس کو سننے چاہئیں بلکہ مجالس پڑھنے والے علماء کرام و ذاکرین کو بھی اُن سے مستفید ہونا چاہیے تاکہ بات بہتر طور پر آگے چل سکے۔ کیونکہ میری دانست میں مجالس محض غم حسین منانے کے لئے منعقد نہیں کی جاتیں بلکہ امام عالی

مقام کی فکر کو اجاگر کرنے کا بھی ایک وسیلہ ہیں یقیناً امام مظلوم کا پیغام یہی ہے کہ ظلم اور حسینیت اکٹھے نہیں رہ سکتے، اور اگر آج امام حسینؑ کے پیروکار ظلم کے خلاف احتجاج نہیں کرتے تو وہ مجرمانہ غفلت کا مظاہرہ کر رہے ہیں اسی طرح اگر قوم تا حال قبلہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب کو نہیں پہچان سکی، تو اس سے دکھ کی بات اور کیا ہو سکتی ہے جس اعلیٰ مقام کے وہ حقدار ہیں انہیں آج تک وہ اعلیٰ مقام نہیں ملا، حالانکہ وہ ہر طرح سے اس کے حقدار ہیں اور اگر قوم کسی ایسے شخص کو نہیں پہچان سکی ہے جو ہر لحاظ سے قوم کی راہنمائی کا حقدار ہے تو پھر اس سے بڑا ظلم موجودہ دور میں کیا ہو سکتا ہے کیونکہ اگر حق والے ہی کسی حقدار کے حق کو نہ پہچانیں تو پھر حسینیت کا کیا مقصد ہے؟

یقین کریں قبلہ نقوی صاحب کے متعلق لکھتے ہوئے لفظوں کے استعمال کی احتیاط حد لازم ہے کہ کہیں قلم سے کوئی ایسا کم قیمتی لفظ بھی نہ نکل جائے کہ آپ کے معیار کو نہ چھو سکے۔ باتیں اتنی ہیں کہ اگر لکھتا رہوں تو بھی اختتام کو نہ پہنچ پائیں کیونکہ قبلہ نقوی صاحب بڑے آدمی ہیں، قلم اور لکھاری چھوٹے ہیں۔ آج کے کسی قلم یا لکھاری میں اتنی سکت ہی نہیں ہے کہ قبلہ نقوی صاحب کی ذات کا مکمل احاطہ کر سکے، پھر بھی انسان کوشش تو کر سکتا ہے اور ایسی ہی ایک کوشش میں کر رہا ہوں پتہ نہیں یہ ایک کامیاب کوشش ہے بھی کہ نہیں کیونکہ میں عرصہ ۲۰ سال سے مختلف نوعیت کے کیس لکھوا رہا ہوں مگر قبلہ نقوی صاحب کا "Case" سب سے منفرد ہے، جس کی نہ تو میں مکمل تیاری کر سکا ہوں اور نہ ہی مکمل دسترس کے ساتھ لکھ رہا ہوں، یعنی وکیل ہو کر بھی Confuse ہوں جو نقوی صاحب کے بڑے پن کی واضح دلیل ہے اور بے شک بڑے لوگوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں اور میں ایک چھوٹا آدمی اور حقیر انسان ہوں، لہٰذا جو کچھ لکھ پایا ہوں حاضر خدمت کر رہا ہوں، کیونکہ نقوی صاحب کے علم اور انداز تقریر میں وہ لذت اور

چاشنی ہے کہ دل چاہتا ہے وہ بولتے جائیں اور سامعین سنتے جائیں، مگر ایسا ممکن نہیں ہے کاش ایسا ہوتا! جو دل و دماغ پر چھا جائے اس ہیرے کا نام ہے ڈاکٹر پروفیسر سید ضمیر اختر نقوی! ایک عہد ساز شخصیت..... ایک نام..... جو کافی ہے.........!

ندیم شبلی ایڈووکیٹ

ممبر کمیشن برائے انسانی حقوق پاکستان

ڈاکٹر کاظم علی خاں کے ایک خط سے اقتباس

۱۴، فروری ۱۹۷۷ء

''آپ نے ادبی میدان میں اتنی کم عمر میں جو کچھ کیا ہے وہ لائق صد تحسین ہے۔ مجھے فخر ہے کہ آپ کی پوشیدہ ادبی صلاحیتوں کو میں آپ کی طالب علمی کے دور میں ہی پہچان چکا تھا۔ اور آپ سے بہت کچھ توقعات رکھتا تھا۔ خدا کا شکر ہے میرے توقعات کو اب آپ بہ خوبی پورا کر رہے ہیں۔ محنت، خلوص اور ایمان داری سے کام کرتے رہیے انشاء اللہ آپ کبھی گھاٹے میں نہ رہیں گے۔ مخالفین کی باتوں کو جوش کے بجائے ہوش سے سنئے، صحیح اور غلط میں امتیاز رکھیے...... مخلصین کی حوصلہ افزائیوں پر مسرور ضرور ہوں مطمئن نہ رہیں___ لیجئے اب آپ کہیں گے کہ خط میں بھی لیکچر دے کر آپ کی طبیعت کو بے مزہ کرنے لگا......

اسد عباس نقوی

علامہ ضمیر اختر نقوی

شخصیت کے کچھ پہلو

اک ضربِ عشق ہے دلِ بیدار کے لیے
اک سان ہے ضمیر کی تلوار کے لیے

میں اسد عباس نقوی علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کی مجالس ایک طویل عرصے سے سن رہا ہوں۔ اور یہ دیکھ رہا ہوں کہ آپ کی مجالس نورانی، روحانی اور معجزاتی ہوتی ہیں کیونکہ اس وقت آپ وکیل اعظم عزاداری حسینؑ خطیب اعظم، ادیب اعظم، محقق اعظم اس دور کے آپ ہیں اور کیوں نہ ہوں کیونکہ لکھنؤ کی تہذیب اور عزاداری آپ میں رچ بس گئی ہے یہ تمام عظمتیں آپ کے خاندان میں پائی جاتی ہیں۔ آپ کی والدہ گرامی مرحومہ ایک پائے کی خطیب تھیں۔ محمدؐ و آلِ محمدؐ نے ان کی مجالس پڑھنے کا صلہ علامہ صاحب کی شکل میں دیا اور علامہ صاحب علم کا وہ چراغ ہیں کہ پوری قوم اس علم کے چراغ سے فائدہ لے رہی ہے۔ میں نے اوپر لکھا ہے کہ آپ کی مجالس، نورانی، روحانی اور معجزاتی ہوتی ہیں کیونکہ میں خود یہ سب دیکھ رہا ہوتا ہوں۔ آپ کی شخصیت دیکھنے میں نازک سی ہے اور بات کا انداز بھی بہت نازک ہے آپ کے قریب رہنے والے ہر سامع آپ سے سوائے محبت شفقت اور آپ کی عاجزی کے گن گاتا ہے آپ حق گو ہیں بہت سادہ طبیعت کے مالک ہیں لیکن جب آپ منبر پر آتے ہیں تو آپ کا انداز ہی

کچھ اور ہوتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ علم کے شہر کا دروازہ جو نجف میں ہے اس دروازے کا رخ قبلہ کی جانب کھول دیتے ہیں اور ایسے ایسے نقطے آپ کے ذہن میں ڈال دیتے ہیں کہ کسی خطیب سے بھی کبھی نہیں سنے اس کی مثال میں یوں دوں گا کہ میرے والد محترم سید محمد شاہ ان کی عمر ۷۵ سال ہے اور وہ انڈیا سے لے کر پاکستان تک کے ہر بڑے خطیب کو سن چکے ہیں جن میں علامہ حافظ کفایت صاحب، فاتح ٹیکسلا علامہ بشیر انصاری صاحب، علامہ مولانا علی نقی (نقن صاحب)، علامہ رشید ترابی وغیرہ شامل ہیں۔ میرے والد گرامی فرماتے ہیں کہ جو ریسرچ اور مودت محمدؐ و آل محمدؐ کی آپ کے پاس ہے وہ کسی کے پاس نہیں ملتی میں مزید روشنی ڈالتا چلوں کے آپ کا ریکارڈ ہے کہ آپ ایک گھنٹے میں ستائس ہزار لفظ بولتے ہیں اور علم بولتے ہیں اور خوب بولتے ہیں آپ ۵ ہزار سے زائد مضامین پر ۱۰ ہزار سے زائد تقاریر کر چکے ہیں۔ یہ شیعہ قوم کے لیئے بڑے فخر کی بات ہے۔ قبلہ ایک وقت میں ادیب بھی ہیں شاعر بھی ہیں محقق بھی ہیں۔ اس کے علاوہ علم قدیم کی بات دور جدید میں کرتے ہیں اور بہت خوبصورت انداز میں کرتے ہیں کہ سامعین بہت لطف اندوز ہوتے ہیں کیونکہ جب آپ علم جدید کو علم قدیم سے ملاتے ہیں اور آئمہ کے قول بیان کرتے ہیں جو علم جدید آج ہے اس کی بنیاد ہمارے آئمہ نے چودہ سو سال قبل ڈالی تو ہمارا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے آئمہ پر ریسرچ کرنا اور ان کے قول و فعل پر ریسرچ کرنا کوئی آسان کام نہیں دنیا میں در در جانا پڑتا ہے۔ یقیناً یہ کام بہت مشکل ہے لیکن اس مشکل کام کا بیڑا قبلہ صاحب نے اٹھا رکھا ہے محمدؐ و آل محمدؐ کی محبت و مودت آپ سامعین کے دلوں میں اس خوبصورت انداز سے ڈال دیتے ہیں کہ دل پھٹنے لگتا ہے میں یوں کہوں گا کہ قبلہ مودت کے موتی بکھیر دیتے ہیں اب یہ سامع پر منحصر ہے کہ وہ مودت کے کتنے ہیرے موتی

سمیٹ سکتا ہے یہ تو تھی مودت کی بات اس کے بعد آتا ہے محمدؐ و آل محمدؐ کے غم میں رونا۔ جب مصائب کی طرف آتے ہیں تو خدا کی قسم واقعہؑ کربلا کا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے اور آنکھوں سے آنسوؤں کا سمندر جاری ہو جاتا ہے۔ جو ہیرے موتی مودت کے آپ کے پاس ہوتے ہیں اور جو آنسو آپ کی آنکھوں سے نکلتے ہیں وہ تمام کے تمام بی بی سیدہ اپنے ساتھ لے جاتی ہیں اور روز محشر ان کا صلہ جنت کی صورت میں ملے گا۔ یہ جنت یہ ہیرے موتی ہم سامعین کو کون دلا رہا ہے اس خوبصورت ہستی کو علامہ ضمیر اختر نقوی کہتے ہیں۔

میرے آٹھویں امام کا قول ہے کہ جاہل شیعوں کو جہالت سے بچانے والا ایک عالم فقہ کے ہزاروں عابدوں سے افضل ہے۔ جنت و جہنم دونوں کا تعلق عقیدے سے ہے اب سے دو تین سال پرانی بات ہے کہ کچھ داخلی و خارجی محاذوں پر شیعیت کے خلاف سازشیں ہو رہی تھیں یعنی شیعیت میں وہابیت ایک سوچے سمجھے پلان سے گھس چکی تھی جس میں حکومتی اور غیر ملکی دونوں طاقتوں کے ذریعے عزاداریٔ حسینؑ کا اصل حلیہ بدلنا چاہتے تھے۔ یعنی ماتم داری، زنجیر زنی، علی ولی اللہ نذر و نیاز وغیرہ پر کھلی سازش ہو رہی تھی۔ اور ان کے خلاف ڈالروں اور ریالوں کی جھنکار کام کر رہی تھی ایک طرف یہ طاقت تھی اور دوسری طرف امام کا سپاہی علامہ ضمیر اختر نقوی نے ان سب کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور اپنے علم کے زور سے عزاداری اور عزاداروں کو تحفظ دیا جو نوجوان شیعیت کے دو حصوں میں بکھر چکے تھے انہیں صحیح راستہ دکھایا۔ یہ وہ دور ہے کہ اگر کوئی عزاداروں کو بتانا بھی چاہتا تو داخلی گروپ اس عالم کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے پھرتے اور ڈراتے دھمکاتے لہٰذا ایسے میں شیرِ منبر سے یہ بیڑا اکیلے ہی اٹھایا اور منبر سے ان لوگوں کو علمی پیغام دیا اور کہا کہ اگر عزاداری کے خلاف کام کرو گے تو ضمیر اختر

سیسہ پلائی ہوئی دیوار بنے گا یہ وہ دور ہے کہ جب کوئی عالم منبر سے ان کے خلاف بات کرتے ہوئے گھبراتا تھا۔ لیکن علامہ صاحب نے کسی بات کی پرواہ نہ کرتے ہوئے حق کو بیان کیا اور آخر کار فتح حق کی ہوئی اس وقت کراچی کے تمام مرکزی امام بارگاہوں میں آپ کی مجالس لوگ جوق در جوق محمدؐ و آل محمدؐ کے فضائل آپ کی زبانی سننے آتے ہیں اور مجلس سے علم ہی علم لے کر جاتے ہیں آپ کی اُردو اتنی خوبصورت ہے کہ ایک ایک جملہ اپنی حیثیت آپ رکھتا ہے۔ شیعہ قوم کو اس عظیم سپوت کا دل سے احترام و محبت کرنا چاہیے کیونکہ ضمیر صدیوں میں بنتے ہیں اور اگر ضمیر سے کسی کا ضمیر بن جائے تو اس سے زیادہ خوشی کی بات کیا ہوگی۔ اگر ہر مسلمان اپنے ضمیر سے پوچھے کہ حق کیا ہے تو صرف اور صرف ضمیر ہی بتا سکتا ہے کہ حق محمدؐ و آل محمدؐ کیا ہے اس بات کا اقرار ہمارے معاشرے کے بڑے بڑے شخص نے کیا ہے کہ عزاداری کا سب سے بڑا وکیل علامہ ضمیر اختر صاحب ہی ہیں آپ کی روشن فکری اور بالغ نظری ہے جو آپ کو ایک بار پوری توجہ سے سن لے وہ بس اسی عزا کا ہو جاتا ہے قبلہ کو جو لوگ مسلسل سن رہے ہیں وہ مودت اہلبیت کے سمندر میں تیر رہے ہیں بلکہ وہ علم کی فضاؤں میں اڑ رہے ہیں میں تو یوں بھی کہوں گا کہ علامہ صاحب محمدؐ و آل محمدؐ کی طرف سے شیعیت اور عالم اسلام کے لیئے ایک انمول تحفہ ہیں۔ قبلہ صاحب بھی اپنا حق ایسے ہی ادا کرتے ہیں جیسے کرنے کا حق ہو محمدؐ و آل محمدؐ کی مودت ہمارے دلوں میں راج کرتی ہے اور علم علیؑ ہمارے دماغ کو روشن کرتا ہے اور یہ مودت ہی ہماری بخشش کا سبب ہے۔ آج تک عزاداروں کا جو مقام قبلہ نے بتایا ہے وہ کبھی کسی عالم نے نہیں بتایا اور یہ سن کر سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے کہ ہمارے لیئے ہمارے آئمہ نے ہمیں کیا کیا عطا کیا ہے۔

میں تمام مومنین سے گزارش کروں گا کہ وہ اس عظیم شخصیت کی قدر کریں۔ کیونکہ

علامہ صاحب خطابت کے آسمان پر علم کے سورج کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس سورج سے جتنا بھی فائدہ لیا جائے وہ کم ہے اور فائدہ لینا ہی قوم کی بھلائی ہے۔ چالیس سال سے خطابت کا یہ سورج اپنی آب و تاب سے چمک رہا ہے اور اپنی مجالس سے قوم کو مودت محمدؐ و آل محمدؐ دے رہا ہے اگر جائزہ لیا جائے تو ان چالیس برسوں میں مسلسل تنوع ارتقاء و دور بینی مستقبل شناسی حالات حاضرہ سے مکمل و مستحکم واقفیت منبر پر حق بات کہنے کا حوصلہ اور دفاعِ حقوق محمدؐ و آل محمدؐ ادا کرنا بہت مشکل کام ہے اس حق گوئی کی وجہ سے کچھ جاہل لوگ مخالفت بھی کرتے ہیں مگر آپ کسی کی پرواہ کیے بغیر حق بات منبر سے ادا کرتے رہتے ہیں آپ کی مجلس معجزاتی والہامی ہوتی ہے آپ دورِ حاضر میں رہتے ہوئے سو سال آگے کی بات کرتے ہیں۔ آپ کے موضوع سائنس، طب، فلسفہ، تاریخ، اور کمپیوٹر سے متصل ہو کر سفر کرتی ہے آپ نے اپنی ساری زندگی محمدؐ و آل محمدؐ کے لیئے وقف کر دی ہے میں اکثر آپ کی خدمت میں آپ کے گھر جاتا ہوں تو آپ ہمیشہ کتابوں میں ڈوبے ہوئے پائے گئے آپ نے محمدؐ و آل محمدؐ پر بہت سی کتابیں لکھی ہیں کچھ شائع ہو چکی ہیں اور کچھ تیاری کے مرحلے میں ہیں۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آپ ایک خطیب اعظم ہونے کے ساتھ ساتھ ایک عظیم عزادار بھی ہیں آپ اپنے خرچ سے سال بھر میں ۸۵ مجالس کراتے ہیں جن میں اماموں کی شہادتوں پر مجالس اور ولادتوں پر میلاد وغیرہ ہوتے ہیں۔ میں نے آج تک کوئی عالم ایسا نہیں دیکھا جو پائے کا خطیب بھی ہو اور چوٹی کا عزادار بھی ہو اور کیوں نہ ہوں لکھنؤ کی تہذیب میں آنکھ کھولی ماں باپ کی تربیت نے مودت اہل بیتؑ سے سرشار کر دیا آپ کے والد گرامی کی شکل اکثر میری نگاہوں میں آجاتی ہے۔ میں نے اپنی زندگی میں اتنی نورانی شخصیت نہیں دیکھی اسی طرح قبلہ بھی اپنی شخصیت آپ ہیں۔ قبلہ کی تعریف کے لیئے اردو لغت

کے تمام جملے بھی اگر لکھے جائیں تو وہ کم ہیں کیونکہ اس عظیم شخصیت کا ہم حق ادا نہیں کر سکتے یہ ہمارے بس کی بات نہیں۔

یہ تو تھی قبلہ کی بات اب ہم آتے ہیں قبلہ کے ایک شاگرد کی طرف یعنی علم کے اس چراغ سے جو جو چراغ جلے ہیں ان میں سے ایک کا ذکر کردوں جن کو میں بہت قریب سے جانتا ہوں۔ اس علم کے چراغ کا نام ہے ڈاکٹر ماجد رضا عابدی جنہوں نے PHD یونیورسٹی آف کراچی سے کیا ہے خطیب اہلِ بیتؑ ہیں۔ ماجد صاحب کے حدیث کساء پڑھنے کا انداز سب سے جدا ہے اور حدیث کساء کا اردو میں ترجمہ لحن کے ساتھ پڑھنے کا انداز آج تک کسی اور کا نہیں ہے اس سے آگے بڑھتے ہیں سوز خوانی میں آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے اس قدر دل کش انداز میں سوز خوانی کرتے ہیں کہ انسان جھوم جھوم جائے نوحہ خوانی میں بھی ان کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ میں دیکھتا ہوں کہ آج کل نوحہ خواں گانوں کی طرز پر نوحے پڑھتے ہیں جبکہ ماجد رضا کا اپنا ہی خوبصورت اور دل کش انداز ہے اور آگے بڑھتے ہیں۔ مرثیہ نویس ہیں اور گیارہ مرثیے خود لکھ چکے اور بہت بہترین شاعر بھی ہیں۔

میں نے ایک مرثیہ خود جا کر شاہد نقوی جو کہ شاعر اہلِ بیتؑ ہیں اور استاد شعراء میں ان کا شمار ہے یہ مرثیے کا پروگرام ان کے گھر منعقد تھا لہٰذا مرثیہ سنا اس پروگرام میں کراچی کے بڑے بڑے شاعر بھی موجود تھے ہر شاعر نے، ہر ہر سامعین نے دل کھول کر ماجد صاحب کو داد دی مرثیہ ختم ہوا تو میں نے شاہد نقوی سے کہا کہ حضور آپ کی سرپرستی چاہیئے بہت اچھے شاعر ہیں ماجد صاحب اس پر شاہد نقوی صاحب نے کہا کہ یہ تو اس مقام پر ہیں کہ اب انھیں ہماری سرپرستی کی ضرورت نہیں ہے جب اتنا بڑا شاعر یہ بات کہہ دے تو آپ اندازہ لگا سکتے ہیں ماجد صاحب کتنے بڑے شاعر ہو سکتے ہیں

ان کی ایک کتاب بھی شائع ہو چکی ہے جس کا نام "حریم عقل" ہے جو کہ مرثیوں کا مجموعہ ہے اس کتاب کے پڑھنے کے بعد آپ کو کلیم آل عبا شاہد نقوی، ڈاکٹر محمد رضا کاظمی، وحید الحسن ہاشمی صاحب، سید نصیر رضا رضوی سید حیدر نواب جعفری (لکھنوی)، پروفیسر کانپوری، پروفیسر ظلِ صادق، جناب خطیب اہلبیت کمال رضوی صاحب نے بہت پذیرائی کی ہے اور اب خطابت کی طرف قدم رکھا ہے اور بہت خوب رکھا ہے بہت خوبصورت انداز خطابت ہے۔ ان تمام کامیابیوں کے پیچھے ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کی سرپرستی ہے کہ علامہ ضمیر اختر نقوی کی نگاہ جوہر شناس نگاہ ہے کہ انھوں نے ہیرے پر نگاہ ڈالی اور اس ہیرے میں نکھار پیدا کیا اور اسے بہتر طریقے سے تراشا یہ باتیں تو اپنی جگہ آپ ہیں اصل میں ماجد صاحب کا محمدؐ و آل محمدؐ سے دلی لگاؤ اور جو جذبہ ان کے دل میں ہے یہ سب نظر کرم ہے پنجتن پاک کا آخر میں زیارت ہوتی ہے زیارت اس قدر خوبصورت اور دل کش آواز میں پڑھتے ہیں کہ دل اَش اَش کر اٹھتا ہے اس کے بعد جناب علامہ کمال حیدر رضوی دوسرے شاگرد ہیں اور آج کل لاہور میں اپنی خوبصورت خطابت کا لوہا منوایا ہوا ہے اور پاکستان کے بڑے خطیبوں میں ان کا بھی شمار ہوتا ہے۔ جناب قائم رضا بھی اس کاروان کے ایک فرد ہیں اور ان کے ذمہ زیارت تابوت اور علم ذوالجناح وغیرہ سجاتے ہیں اور ایسے سجاتے ہیں بالکل حقیقی منظر لگتا ہے۔ محمدؐ و آل محمدؐ کی مودت میں ڈوبے ہوئے ہیں اور علامہ ضمیر اختر نقوی کے سب سے پرانے ساتھیوں میں سے ہیں ان کی محمدؐ و آل محمدؐ کی خدمت اور مت دیکھ کر دل سے ان کے لیے دعائیں نکلتی ہیں مولا ان سب کو سلامت رکھے بلکہ میں تو یوں کہوں گا کہ مرکزِ علوم اسلامیہ کا ہر فرد اپنی ایک حیثیت رکھتا ہے یوں کہ لکھ سکتا ہوں کہ مرکز علوم اسلامیہ علم کا ایک گلدستہ ہے اور اس گلدستہ میں ہر ہر فرد ایک علمی پھول ہے

جن کی خوشبو سے عزاداری حسینؑ اور مجلسِ حسینؑ مہک رہی ہیں۔

میں نے اوپر لکھا ہے کہ محمدؐ وآلِ محمدؐ کی طرف سے شیعیت اور عالمِ اسلام کے لیے قبلہ ایک انمول تحفہ ہیں بس آپ کی محنت کا صلہ آپ کو محمدؐ وآلِ محمدؐ ہی دے سکتے ہیں۔

اور آپ کے اس کارواں کے ہر ہر فرد کو ان کی ان کاوشوں کا صلہ محمدؐ وآلِ محمدؐ ہی دے سکتے ہیں۔

سیّد اشتیاق حسین ساغرؔ لکھنوی

در صنعتِ توشیح

ض۔ ضو فشاں تحقیق کے ہے آسماں پر مثلِ شمس
م۔ مردِ میداں ہے تجسس کا یہی جادو بیاں
ی۔ یاورِ حق آگہی ہمدردِ ملت ، شیر دل
ر۔ رونقِ بزمِ ادب باطل شکن ، عزمِ جواں
ا۔ آبروئے پاک ہے توضیح کی منزل میں یہ
خ۔ خاصِ آلِ عبا کا ہے ازل سے مدح خواں
ت۔ تبصرے تنقید کا تقریظ کا بھی ہے قمر
ر۔ رہبر راہِ ادب ساغرؔ ہے یہ عرشِ آسماں

ضمیراختر

تحقیق و تنقید

سہیل شاہ:

ضمیر اختر

علوم آلِ نبیؐ کی شمعیں جلا رہے ہیں ضمیر اختر
دلوں سے تاریکیٔ جہالت مٹا رہے ہیں ضمیر اختر

فضائلِ سیدہؑ سنا کر حقیقتِ مرتضیٰؑ بتا کر
مُقصّروں کے دلوں پہ خنجر چلا رہے ہیں ضمیر اختر

جو چاہو تم سے علیؑ ہو راضی نہ ہو عقیدے پہ سودے بازی
سبق یہی تو ہمیں مسلسل پڑھا رہے ہیں ضمیر اختر

خطابتوں کے امیر بن کر حسینیت کے سفیر بن کر
بھٹکنے والوں کو حق کا رستہ دکھا رہے ہیں ضمیر اختر

خطاب جب بھی کہیں ہو کرنا، خطابِ زینبؑ سے لفظ چُننا
نئے خطیبوں کو ڈھنگ یہ بھی سکھا رہے ہیں ضمیر اختر

چراغ ذکرِ وفا جلا کر پیام کرب و بلا سنا کر
سہیلؔ اذہانِ بے ضمیری جگا رہے ہیں ضمیر اختر

اُردو مرثیہ پاکستان میں

ضمیر اختر نقوی

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

ضمیر اختر نقوی کے تحقیقی کارنامے

جناب سید ضمیر اختر نقوی صاحب کے نامِ نامی سے کون واقف نہیں ہے۔ ان کی ذات کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ انھوں نے رثائی ادب میں اپنی انفرادیت کا لوہا چہار دانگ عالم میں منوایا ہے۔ ان کا شمار ہندوستان اور پاکستان کے ممتاز اور چوٹی کے محققین میں ہوتا ہے۔ گزشتہ کئی برسوں سے انھوں نے اُردو مرثیے میں وہ حیرت انگیز انکشاف کیے ہیں جن سے اُردو تنقیدی ادب مالا مال ہو رہا ہے۔

موصوف سے میرا غائبانہ تعارف ۱۹۷۳ء میں اس وقت ہوا جب کہ میں جناب پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کے کتاب خانے میں قلمی مراثی کے مطالعے میں مصروف تھا۔ ایک دن ادیب مرحوم نے مجھے ''ماہِ نو'' کراچی کے انیس نمبر (اضافی شمارہ، مطبوعہ ۱۹۷۲ء) کی زیارت کرائی۔ اس شمارے میں جناب ضمیر اختر صاحب کے دو گراں قدر تحقیقی مقالے درج ہیں۔ پہلا ''میر انیس کے حالاتِ زندگی'' اور دوسرا ''کلید گنجینۂ انیس''۔ دونوں مضامین سیر حاصل اور معلوماتی ہیں۔ جہاں تک پہلے مضمون کا تعلق ہے، میں یہ بات بلا خوفِ تردید کہہ سکتا ہوں کہ آج تک کسی نے میر انیس کے حالاتِ زندگی اس قدر جامع، مربوط اور سلسلے وار نہیں لکھے ہیں جیسے کہ نقوی صاحب نے قلم بند کیے ہیں۔ انھوں نے مضمون کی ترتیب میں نادر اور نایاب

کتابوں سے استفادہ کرکے تحقیق کے تقاضوں کو بے کم وکاست پورا کیا ہے۔ موصوف کا دوسرا مقالہ پہلے کی بہ نسبت بہت ہی ضخیم اور بلند پائے کا ہے، یہ ۷۸ صفحوں پر پھیلا ہوا ہے۔ ''کلید گنجینۂ انیس'' کے تحت جو عنوانات موضوع کی مناسبت سے دیے ہیں، وہ ذیل میں درج کیے جاتے ہیں:

(۱) مرثیہ گوئی کا ادواری ارتقا: اس کے تحت فاضل مقالہ نگار نے سال ۱۹۷۱ء تک چار سو تینتالیس (۴۴۳) اردو مرثیہ گو شعرا کا اشاریہ مرتب کیا ہے۔

(۲) صریر کلک: اس میں موصوف نے انیس کی زندگی، شخصیت اور فن وکلام پر ۴۷ نادر اور نایاب کتابوں کی اہمیت وافادیت واضح کی ہے۔

(۳) کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں: نقوی صاحب نے اس موضوع کے ذیل میں ان تذکروں اور کتابوں کی نشان دہی کی ہے جن پر میر انیس پر تنقیدی مضامین شائع ہو چکے ہیں، ان کی تعداد ۵۹ ہے۔

(۴) گلہائے مضامین: اس میں ان مضامین کی تفصیل بیان کی گئی ہے جو ۱۹۰۶ء سے ستمبر ۱۹۷۱ء تک ''مخزن'' لاہور، ''زمانہ'' کانپور، ''صدائے عالم'' دہلی، ''ادیب'' الہ آباد، ''ہمایوں'' لاہور وغیرہ جیسے نادر زمانہ رسائل واخبارات میں چھپ گئے ہیں۔ اس کے بعد انیس کے مراثی، رباعیات، سلام اور نوحہ جات وغیرہ کے اشاریے ملتے ہیں۔

راقم الحروف کو ضمیر اختر نقوی صاحب کے تحقیقی کارناموں میں جو چیز سب سے زیادہ پسند آئی ہے، وہ ہے رثائی ادب میں ان کی اشاریہ سازی۔ وہ پہلے محقق ہیں جنھوں نے اشاریہ سازی کا ڈول ڈالا ہے اور اس فن میں انھیں ید طولیٰ حاصل ہے۔ مرثیوں کا اشاریہ مرتب کرنا سب سے مشکل کام ہے۔ یہ ایک آدمی کا کام نہیں ہے، اس کے لیے باقاعدہ عملے اور دفتر کا ہونا ضروری ہے۔ جہاں تک معلوم ہو سکا، ضمیر اختر صاحب

نے اشاریہ کا کام تن تنہا انجام دیا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس فن میں وہ ایک انجمن، ایک ادارہ اور ایک انسٹی ٹیوٹ سے کم نہیں ہیں۔ انھوں نے میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے مجموعۂ مراثی کے اشاریے مرتب کر کے اُردو ادب میں وہ کارنامہ انجام دیا ہے۔ جس کی مثال رثائی ادب میں کہیں اور نہیں ملتی۔ جس دیدہ ریزی اور محنتِ شاقہ سے وہ مرثیے پر کام کر رہے ہیں، اس پر مجھے رشک آتا ہے۔

انیسؔ اور دبیرؔ کا مطبوعہ مجموعۂ کلام ہندوستان اور پاکستان میں کسی جگہ تمام کا تمام نہیں مل سکتا۔ نہ معلوم انھوں نے کہاں کہاں سے مختلف مطبعوں کی انیسؔ کی چھ اور دبیرؔ کے دفترِ ماتم کی تمام نایاب جلدیں تلاش کر کے حروفِ تہجی کے اعتبار سے یہ اشاریے مرتب کر کے شائع کیے ہیں۔ انیسؔ کی پانچویں اور چھٹی جلد مطبعِ دبدبۂ احمدی لکھنؤ عرصۂ دراز سے عنقا کے برابر ہیں۔ موصوف نے ان دونوں جلدوں کے تمام مرثیے بڑی چھان بین کر کے اشاریے میں شامل کیے ہیں۔

ضمیر اختر صاحب نے اشاریۂ مراثیِ انیسؔ اور اشاریۂ مراثیِ دبیرؔ (مطبوعہ اُردو پبلشرز لکھنؤ، ۱۹۷۷ء) میں انیسؔ کی چھ اور دفترِ ماتم کی چودہ جلدوں کے علاوہ ان دونوں عظیم شاعروں کے مختلف مجموعوں کی تفصیلات بھی بیان کی ہیں۔ انھوں نے اشاریوں میں مرثیوں کے مختلف مطلعے اور الحاقی کلام کی بھی نشان دہی کی ہے۔ غرض یہ کہ اس قسم کے اشاریے رثائی ادب میں انھی کی دین ہیں۔ ان مضامین کے علاوہ ہم نے پاکستان کے مختلف رسائل اور اخبارات سے موصوف کے مضامین بڑی دلچسپی سے پڑھے ہیں۔ ان میں "جامِ نو" کراچی (جون ۱۹۷۱ء) "شیعہ" لاہور (فروری ۱۹۷۲ء) "ارشاد" کراچی (فروری ۱۹۷۲ء)، "اردو سہ ماہی" کراچی (۱۹۷۳ء) اور دبستانِ انیس، راولپنڈی (مطبوعہ دسمبر ۱۹۷۲ء) وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔

ضمیر اختر نقوی ایک اچھے محقق اور ہونہار شاعر کے علاوہ ذاکر آلِ محمدؐ بھی ہیں۔ ۱۹۸۶ء میں جب لکھنؤ آئے تھے تو یہاں کے سخن فہم حضرات اور ناقدین کے علاوہ پڑھے لکھے لوگوں کا خاصا مجمع ان کی مجلسیں ہمہ تن گوش ہو کر سنتا تھا۔ مجلسیں کیا پڑھتے ہیں، گویا منبر پر جادو جگا رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے انھیں اعلیٰ اور روشن دماغ سے سرفراز کیا ہے۔ ان میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو کسی ذہین، مشاق اور جینیس انسان میں ہونی چاہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کے دماغ میں وہ نادر اور نایاب چیزیں محفوظ ہیں جن سے وقتاً فوقتاً ہم دور افتادگان بھی فیض یاب ہوتے ہیں۔ حال میں انھوں نے شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیوں کو جس محنت، خلوص اور سلیقے سے اپنے معرکہ آرا مضمون کے ساتھ مرتب کر کے شائع کیا ہے، اس کے لیے وہ واقعی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ لوگوں کو یہ نہیں معلوم تھا کہ جوشؔ مرثیے بھی کہتے تھے۔ لے دے کے وہ صرف "حسینؑ اور انقلاب" کے نام سے واقف تھے۔

خوشی کا مقام ہے کہ ہمارے نوجوان شاعر اور محقق و نقاد جناب ضمیر اختر نقوی صاحب کی رثائی ادب میں ایک اور کتاب "اُردو مرثیہ پاکستان میں" شائع ہوئی ہے۔ اس میں پاکستان کے تقریباً ۱۰۰ مرثیہ نگاروں کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر نقد و تبصرہ شامل ہے۔ کتاب بڑی عرق فشانی اور دیدہ ریزی سے ترتیب دی گئی ہے۔

کتاب کی ایک امتیازی شان یہ ہے کہ اس میں جوشؔ ملیح آبادی، جناب آلِ رضا، جناب راجا صاحب محمود آباد، شاعرِ اہلِ بیتؑ جناب نسیمؔ امروہوی اور جناب نجمؔ آفندی صاحب کے حالاتِ زندگی اور ان کے کلام پر سیر حاصل ریویو کیا گیا ہے اور وہ وہ نکات بیان کیے ہیں جن سے اُردو مرثیے میں چار چاند لگ گئے ہیں۔

کتاب کا ایک شان دار باب آرزوؔ لکھنوی کی مرثیہ نگاری پر ہے۔ لوگ آج تک

آرزو کو ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے ہی جانتے تھے۔ ضمیر صاحب کے ذوق تجسس کی داد دیجیے کہ انھوں نے آرزو کے قلمی مرثیے کہاں کہاں سے دریافت کیے ہیں۔

کتاب کا ایک اور شان دار باب "پاکستان میں اندازِ عزاداری" ہے۔ اس موضوع پر موصوف نے تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔ راقم الحروف کی واقفیت کے لیے یہ باب واقعی ایک قابلِ قدر اضافہ ہے۔ ہم لکھنؤ کی عزاداری میں سالہا سال تک شریک رہے ہیں۔ ہمارا خیال تھا کہ اس قسم کی عزاداری صرف لکھنؤ تک ہی محدود ہے۔ اب ضمیر صاحب کی تصنیف سے معلوم ہوا ہے کہ خاص کر کراچی اور لاہور میں بھی اسی انداز کی عزاداری ہوتی ہے۔ یہ باب پاکستان کی تہذیب و تمدن میں ایک قابلِ فخر سرمایہ ہے۔

غرض یہ کہ "اردو مرثیہ پاکستان میں" ہر لحاظ سے بلند پایہ اور گراں مایہ اضافہ اور موضوع پر حاکمانہ قدرت کی بیّن شاہد ہے۔ آیئے پڑھیے۔ لطف اندوز ہوئیے، اپنی معلومات میں اضافہ کیجیے اور مصنف کے اسلوبِ بیان اور اندازِ تحقیق کی دل کی گہرائیوں سے داد دیجیے۔ یہ کتاب لکھ کر مصنف نے اُردو ادب پر بڑا احسان کیا ہے۔

یہ ضمیر اختر محقّق نے کیا تفصیل سے
تذکرہ شاہِ ولایتؑ کا زہے زورِ قلم
مُستند ہر لفظ، ہر فقرہ، ہر اک اس کی سطر
ہر ورق یکتا ہے، تاریخی حوالوں کی قسم

یکتا امروہوی

جگن ناتھ آزاد

(صدر شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، کشمیر)

''اُردو مرثیہ پاکستان میں''

اُردو شاعری کا روشن اور تابناک باب

جناب ضمیر اختر نقوی کی مرتب کی ہوئی کتاب ''جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے'' میری نظر سے گزر چکی ہے۔ جس سے مرثیے کے موضوع کے ساتھ ان کے تعلق خاطر کا پتہ چلتا ہے۔ اب ان کی نئی تصنیف ''اُردو مرثیہ پاکستان میں'' میرے سامنے ہے۔ یہ کتاب اس دقت نظری اور جگر کاوی پر روشنی ڈالتی ہے، جس سے اس موضوع پر مزید تحقیق کرنے کے لیے ضمیر اختر صاحب نے کام لیا ہے۔ میں نے اپنے قیام کراچی کے دوران اس کتاب کے اکثر حصوں کا بنظر غائر مطالعہ کیا ہے اور مجھے یہ ہر اعتبار سے ایک غیر معمولی کتاب نظر آئی ہے۔ جب تک میں نے اس کتاب کو نہیں دیکھا تھا، مجھے اس بات کا خیال نہیں آسکتا تھا کہ اُردو مرثیے نے پاکستان میں ایک دبستان کی صورت اختیار کرلی ہے۔ اُردو شاعری کا یہ روشن اور تاب ناک باب اس طرح بھرپور صورت میں پہلی بار اُردو دنیا کے سامنے آرہا ہے۔ ضمیر اختر نقوی نے اس موضوع پر اتنی ضخیم کتاب لکھنے میں جس کاوش اور دل سوزی سے کام لیا ہے، وہ کتاب کی ایک ایک سطر سے ظاہر ہے۔ اس کتاب میں تذکرہ نگاری کا انداز بھی ہے اور مرثیہ نگاری کی تاریخ، مرثیہ نگاری پر تبصرہ اور تنقید بھی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ یہ کتاب اُردو ادب کی تاریخ میں ایک بہترین کتاب تسلیم کی جائے گی۔ میری دلی خواہش ہے کہ یہ کتاب جلد از جلد چھپ کر منظر عام پر آئے تا کہ پاکستان اور ہندوستان کی یونیورسٹیوں کے شعبہ ہائے اُردو اور ان کے علاوہ اس موضوع سے دلچسپی رکھنے والے تمام اہل نظر اس سے مستفید ہو سکیں۔

فاضلؔ زیدی کے ایک خط سے اقتباس

۱۳ مارچ ۱۹۸۰ء

جناب ضمیر اختر نقوی صاحب..... آداب!

آپکی کتاب "اشاریہ مراثی مرزا دبیرؔ" کو میں نے بہت توجہ اور شوق سے پڑھا۔ آپ نے بڑی محنت کی اور بڑا مفید کام کیا۔ اسے مراثی مرزا دبیر کی قاموس کہنا بالکل بجا ہے۔ میں اس کی اشاعت پر آپ کو مبارک باد دیتا ہوں اور آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس کے مطالعہ کا شرف بخشا...... آپ مراثی پر جو کام کر رہے ہیں خدا کرے وہ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے۔ یہ کام ایک ادارے کے کرنے کا ہے۔ جسے آپ تنہا انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی ہمت مردانہ ستائش سے بالاتر ہے۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ میں آپ کا دعا گو ہوں" اور اس سلسلے میں ہر خدمت کے لئے ہمہ وقت حاضر ہوں۔

میں آپ کا منت پذیر ہوں کہ آپ نے مجھے مرزا اوجؔ کے مجموعہ مراثی "معراج الکلام" کے مطلعے اور قلمی مراثی اوجؔ کے مطلعے عنایت فرمائے۔ قلمی مراثی اوجؔ کے بقایا مطلعے جو آپ کے احباب نے آپ کو بھیجے ہیں، وہ بھی اگر مجھے مرحمت فرما دیں تو میں انھیں بھی شامل مقالہ کر لوں گا۔ مجھے آپ کے کرم کا انتظار رہے گا"

علی سردار جعفری (بمبئی)

"اُردو مرثیہ پاکستان میں"

اُردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ

میری نظر میں مرثیہ، انیسؔ کے بعد آگے نہیں بڑھا۔ انیسؔ نے مرثیے کو اس پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا جس کے بعد راستے بند ہو گئے۔ اس کے آگے ترقی ناممکن تھی، لیکن نئے عہد میں انیسؔ کے بعد جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیوں میں ارتقائی صورت نظر آتی ہے۔ جوشؔ نے مرثیے میں نئی راہیں نکالی ہیں، نئی آرائش کی ہے، نئے خیالات اور اس میں نئے مضامین ڈالے ہیں۔ انھوں نے مرثیے کو نئی سمت دی ہے۔ جوشؔ کے مرثیے ان کی عظیم شاعری کا ایک حصہ ہیں۔

اس عہد میں لکھے جانے والے مرثیے میری نظر سے نہیں گزرے۔ آلِ رضا صاحب کے مرثیے بھی میں نے نہیں پڑھے، اس لیے ان کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ راجا صاحب محمود آباد کا ایک مرثیہ میں نے برسوں پہلے سنا تھا، انھیں کی زبان سے، اس بات کو بھی چالیس برس ہو گئے، بہت پرانی بات ہو گئی۔ راجا صاحب مرثیہ بہت اچھا کہتے تھے۔ نجمؔ آفندی کے مرثیے میں نے اپنے بچپن میں سنے تھے۔ نجمؔ آفندی کے مرثیوں سے زیادہ ان کی نظمیں قابلِ توجہ ہیں۔ ان کی ایک نظم مجھے اب تک یاد ہے۔ وہ ہمارے یہاں بلرام پور آتے تھے۔ یہ نظم مجھے سن کر ہی یاد ہو گئی تھی:

ملکِ عرب کا تپتا جنگل دھوپ سے ذرہ ذرہ بے کل
قہر کی گرمی وقت ستم کا خشک ہے پانی دیدۂ نم کا
رو برضا ہیں چند مسافر راہِ طلب میں صابر و شاکر
مصحفِ حق کے بکھرے پارے فرشِ زمیں پر چاند ستارے

لیکن نجم آفندی کے یہاں جوشؔ والی وسعت و عظمت نہیں تھی۔

فیضؔ نے بھی ایک مرثیہ "نذرِ امام" کے عنوان سے لکھا ہے، لیکن اسے مرثیہ کہنا صحیح نہیں ہوگا۔ مرثیے کے جو تمام لوازمات ہوتے ہیں، وہ اس میں نہیں ہیں۔ ہاں! اس میں فیضؔ کا خاص انداز ضرور موجود ہے، مفہوم کے اعتبار سے اسے مرثیہ کہا جا سکتا ہے۔

میں نے بھی اپنی ابتدائی شاعری کے دور میں چار، پانچ مرثیے مسدس کی شکل میں کہے تھے۔ اس میں سے ایک مرثیہ "شمعِ ہدایت" کے نام سے چھپا ہے۔ غالباً یہ میرا پہلا مرثیہ ہے جو میں نے چندرہ، سولہ سال کی عمر میں ۱۹۲۸ء یا ۱۹۲۹ء میں کہا تھا۔ میرے مرثیوں میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ میں نے مرثیے انیسؔ کے انداز میں کہے تھے جس کا اعتراف یوں کیا تھا:

ملتا نہیں دماغ جو طبعِ نفیس کا ایک خوشہ چیں ہوں باغِ جنابِ انیسؔ کا

انیسؔ نے جس جگہ مرثیے کو پہنچا دیا، جوشؔ جہاں مرثیے کو لے گئے، اب ان لوگوں سے بڑا شاعر آئے تو مرثیے میں روشن امکانات نظر آ سکتے ہیں اور ایسا بھی نہیں کہ عظیم مرثیہ گو اب پیدا نہیں ہو سکتا۔ ظاہر ہے قدرت تو اس معاملے میں فیاض ہے، لیکن موجودہ عہد تک جوشؔ کے مرثیوں کی شاعرانہ عظمت جس معراجِ کمال پر نظر آتی ہے، دوسرے شاعروں کے لیے ناقابلِ رسائی ہے۔

جوشؔ کے عظیم مرثیے دستیاب نہیں ہوتے تھے۔ ضمیر اختر نقوی نے "جوشؔ ملیح آبادی

کے مرثیے" کتابی صورت میں یک جا کر کے بہت بڑا کام کیا ہے۔ مرثیوں میں بہترین مقدمہ، فرہنگ اور مرثیوں کی خوبصورت ترتیب قابلِ قدر ہے۔ یقیناً یہ بہت اہم کام تھا جسے ضمیر اختر نقوی نے پیش کیا ہے۔

جیسا کہ میں نے پہلے کہا کہ اس عہد میں لکھے جانے والے مرثیے میری نظر سے نہیں گزرے، میں پاکستان میں اردو مرثیے کی ترقی سے بالکل بے خبر رہتا اگر ضمیر اختر نقوی کی کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں" نہ دیکھتا۔ یہ تحقیقی کام یقیناً بہت بڑا کام ہے۔ یہ تصنیف ہر لحاظ سے بلند پایہ اور قابلِ قدر ہے۔ ضمیر اختر نقوی نے قدیم مرثیہ اور جو مرثیہ اس وقت لکھا جا رہا ہے، اس کا احاطہ کر لیا ہے۔ ضمیر اختر نقوی نے بہت مبارک کام کیا ہے۔ ادب شناس اس کتاب کو پڑھیں گے اور یہ کتاب ہمیشہ اور ہر دور میں پسند کی جائے گی۔ ضمیر اختر نقوی کی یہ کتاب اردو ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

ڈاکٹر محمد رضا کاظمی

برادرم! ضمیر اختر نقوی..... تسلیمات

ابھی آپ کی نادر الوجود تصنیف "سوانح حیات حضرت جعفر طیارؑ" کا سرور، دل و نظر میں باقی ہے۔ میں نے آج تک اس محسنِ اسلام کی کوئی سوانح اردو میں نہیں دیکھی اور نہ عربی فارسی کتابیات ہی کی فہرست میں دیکھی۔ تاریخی حصے کا کیا کہنا! تہذیبی اور ادبی حصہ بھی لاجواب ہے۔ قدما کا طریقہ تھا کہ اپنے موضوع کو تفسیر، حدیث، مغازی، سیر و تاریخ کے مصادر کے مطابق لکھتے تھے۔ آپ کی تصنیف میں یہ سب کچھ ہے، اس پر مستزاد رثائی ادب کے ذخیرے سے حضرت جعفر طیارؑ کے متعلق مراثی و بند۔ ایک مجلد میں اتنا کچھ یقیناً ایک بیش بہا تحفہ ہے۔ آپ کی تصنیف ایک نمونہ ہے ایسے نیک، صالح و تحقیقی کتب کے لیے۔

ڈاکٹر نیر مسعود
(شعبۂ فارسی، لکھنؤ یونیورسٹی، لکھنؤ)

"اُردو مرثیہ پاکستان میں"

قابلِ قدر اور بیش قیمت دستاویز

اُردو مرثیے کی بدقسمتی یہ ہے کہ اسے انیسؔ کے سوا کوئی ایسا شاعر نہیں ملا جس نے صرف مرثیہ گوئی کی بدولت تاریخِ ادب میں مستقل جگہ بنائی ہو۔ اُردو کے ممتاز ترین شاعروں کا ذکر ہوگا تو میرؔ، غالبؔ، انیسؔ اور اقبالؔ کے نام پہلے ذہن میں آئیں گے۔ ان کے بعد ان اصناف کا خیال آئے گا جن میں ان شاعروں نے طبع آزمائی کی ہے۔ البتہ جب تاریخِ ادب میں خصوصی طور پر ان اصناف کا ذکر ہوگا تب کچھ اور شاعروں کے نام بھی ذہن میں آئیں گے جنھوں نے ان اصناف میں امتیاز حاصل کیا ہے۔ مثلاً امجدؔ حیدرآبادی اور جگت موہن لال، رواںؔ بہت اچھے رباعی گو شاعر تھے، جب ہم تاریخ ادب میں رباعی کے باب میں آئیں گے تو امجدؔ اور رواںؔ کا ذکر ناگزیر ہوگا، لیکن جب ہم پورے اُردو ادب کو ایک واحدہ مان کر اس کے اکابر کا شمار کریں گے تو ہمیں ان دونوں ماہر رباعی گویوں کا شاید خیال نہ آئے اور ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہوں گے کہ اُردو میں صنفِ رباعی کمال کے درجے تک نہیں پہنچ سکی، گویا امجدؔ اور رواںؔ کو تاریخِ ادب میں نہیں بلکہ تاریخِ ادب کے بابِ رباعی میں مستقل جگہ حاصل ہوئی ہے اور ان کا ذکر تاریخِ رباعی میں ناگزیر سہی، تاریخِ ادب میں ناگزیر نہیں ہے۔ میر انیسؔ

تاریخ مرثیہ ہی میں ہیں، تاریخ ادب میں بھی ناگزیر ہیں، اسی لیے ان کی بدولت مرثیے کو اُردو ادب میں وہ مقام حاصل ہوا جو رباعی کو حاصل نہ ہو سکا۔ ظاہر ہے کہ مرثیہ، انیس و دبیر کے بعد ختم نہیں ہوا، لیکن ان دو بڑے استادوں کے اٹھ جانے کے بعد اس میدان میں ایک سناٹا سا ضرور چھا گیا جس میں ایک عرصے تک انیس و دبیر کی گونج سنا دیتی رہی، آخر وہ بھی ہلکی ہوتے ہوتے ختم کے قریب پہنچی۔

یہی وہ وقت تھا جب ہندوستان میں مرثیہ گوئی کی نشاۃِ ثانیہ کی داغ بیل پڑی۔ تقسیم ہند کے بعد سید آلِ رضا، نسیم امروہوی، جوش ملیح آبادی، نجم آفندی وغیرہ کی پاکستانی مہاجرت کے ساتھ نشاۃِ ثانیہ کی یہ تحریک بھی پاکستان منتقل ہو گئی۔ وہاں یہ تحریک تسلسل کے ساتھ جاری ہے، تاہم ابھی تک ہندوستان میں یقیناً اور غالباً پاکستان میں بھی عام خیال یہی تھا کہ مرثیہ گو شعرا اگرچہ پاکستان میں ہندوستان سے زیادہ ہیں لیکن ان کی تعداد اور کلام اتنا نہیں ہے کہ مستقل تحقیق و تنقید کا موضوع بن سکے۔ اس غلط فہمی کو دور کرنے کا سہرا ضمیر اختر نقوی کے سر ہے۔

ضمیر اختر نقوی نے خود کو اُردو مرثیے کی تحقیق اور تنقید کے لیے وقف کر دیا ہے۔ میر انیس اور تاریخ مرثیہ ان کے خصوصی موضوع ہیں، لیکن ان کی تازہ کتاب "اُردو مرثیہ پاکستان میں" انھیں جدید مرثیے کے متخصص کی حیثیت سے پیش کرتی ہے۔ انھوں نے اس کتاب میں سو سے زائد پاکستانی مرثیہ نگاروں کا تذکرہ لکھنے کے علاوہ صنفِ مرثیہ کی پس منظری تاریخ، ہندوستان کے موجودہ مرثیہ نگاروں اور پاکستان کے مختلف شہروں میں عزاداری کے بیان سے اپنے موضوع کو مزید مربوط اور مستحکم کر دیا ہے۔

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد یہ اُمید رکھنا بے جا نہ ہوگا کہ مستقبل میں اُردو مرثیے کو پھر وہی وقار حاصل ہوگا جو ماضی میں اسے انیس و دبیر کی بدولت حاصل ہوا تھا۔ اس

وقت اس کتاب میں شامل بیشتر مرثیہ نگار نئے مرثیے کے اولیں معماروں میں شمار ہوں گے، لیکن ظاہر ہے کہ زمانہ ان میں سے بہتوں کو اسی طرح فراموش کردیتا جس طرح اس نے اردو کے بہت سے ابتدائی مرثیہ نگاروں کو فراموش کیا۔ ضمیر اختر کی کتاب سے یہ اندیشہ دور ہوگیا اور یہی ان کا بڑا کارنامہ ہے۔

''اردو مرثیہ پاکستان میں'' اس وقت بھی ایک قابلِ قدر اور بیش قیمت دستاویز ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ اس کی قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

☆ ☆ ☆

پروفیسر سید مظفر حسن ظفر جونپوری

ایک ادارہ

آپ جس لگن اور دل سوزی سے ''اردو ادب'' کی عموماً اور ''رثائی کاوشِ قلم'' کی خصوصاً خدمت کر رہے ہیں، اس کا اعتراف نہ کرنا کفرانِ حقیقت ہے۔

میں آپ کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ جو کام ایک ادارے کو کرنا چاہیے تھا، وہ آپ نے تنہا کر ڈالا، اور لطف یہ کہ خوش اسلوبی کے کسی گوشے کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ آپ کی کاوشوں کو سوچ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ

ایں سعادت بزورِ بازو نیست

تا نہ بخشد ، خدائے بخشندہ

سیّد ہاشم رضا

"اردو مرثیہ پاکستان میں"

ادبی کمال کا ثبوت

میں ضمیر اختر نقوی سلمہٗ کی تخلیقی اور تنقیدی قابلیت کا معترف رہا ہوں، لیکن انھوں نے یکے بعد دیگرے "جوش کے مرثیے" اور "اردو مرثیہ پاکستان میں" ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک جیسی گراں بہا کتابیں پیش کر کے اپنے ادبی کمال کا ثبوت پیش کیا ہے۔

زیرِ تبصرہ تصنیف "اردو مرثیہ پاکستان میں" کے دو حصے ہیں۔ پہلے حصے میں قیامِ پاکستان سے پہلے اردو کے مرثیوں پر تبصرہ ہے اور دوسرے حصے میں جدید مرثیوں پر۔ پہلے حصے میں جو مرثیے کی تاریخ ہے، وہ تو بہت سی تصانیف میں ملے گی لیکن دوسرے حصے میں جو کچھ لکھا گیا ہے اور جس سلیقے سے لکھا گیا ہے، وہ اس سے پہلے میری نظر سے نہیں گزرا۔ مجھے امید ہے کہ صاحبِ نظر حضرات اس معاملے میں مجھ سے اتفاق کریں گے۔

میں اپنی سروس کے سلسلے میں صوبۂ بمبئی سے منتقل ہو کر صوبۂ سندھ جنوری ۱۹۳۹ء میں آیا۔ اس زمانے میں ایامِ عزا میں کراچی میں مجالس صرف ایک امام باڑے میں منعقد ہوتی تھیں جو کھارادر میں تھا۔ دوسری مجلس لیڈی ہارون کے گھر پر منعقد ہوتی تھیں۔ ان مجالس میں اساتذہ کے مرثیے پڑھے جاتے تھے۔ یہ قیامِ پاکستان کا فیض ہے کہ اب کراچی کے ہر حصے میں امام باڑے ہیں، اور ہر سال نئے نئے اور لاجواب

مرثیے ان حضرات کی زبانی سننے میں آتے ہیں جنھوں نے دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مرثیے کہے ہیں۔

میرے بھائی سید آلِ رضا ضمیر اختر نقوی کی بڑی قدر کرتے تھے اور اس تصنیف میں ضمیر اختر نقوی نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے اس سے ضمیر اختر نقوی کی ارادت اور معاملہ فہمی کا بین ثبوت ملتا ہے۔ میرے مرحوم بھائی کراچی میں پاکستان بننے کے بعد منتقل ہوئے۔ میں مرحوم کی ڈائری سے دو اقتباس پیش کرتا ہوں جو ان مقاصد کو واضح کرتے ہیں جن کے تحت انھوں نے مرثیے کہے۔

پہلا اقتباس: مرحوم نے اپنی ڈائری میں "میرا موضوعِ مرثیہ گوئی" کے عنوان سے پانچ سرخیاں متعین کی ہیں:

(۱) انسانیت (۲) اسلام (۳) نفسِ (۴) کربلا (۵) حسینیت

دوسرا اقتباس: نوزائیدہ پاکستان میں تقسیمِ برصغیر کے پہلے تحت اللفظ مرثیہ خوانی کا رواج نہیں تھا۔ میں نے اس کا آغاز کراچی میں مذکورہ ذیل رباعیوں، سلام اور اپنے پہلے مرثیے سے کیا جو ۱۹۳۹ء میں نیوتنی اور لکھنؤ میں کہا تھا:

کلمہ حق کی ہے تحریر دلِ فطرت میں

رباعی

تسکینِ دو اندوہِ نہاں مجلس ہے | غم اپنا بہلتا ہے جہاں، مجلس ہے
اللہ رے! غریب الوطنی کا عالم | ہم پوچھتے پھرتے ہیں، کہاں مجلس ہے

☆ ☆ ☆

جو کیف ہے، ہمدم! نہ کبھی چھوٹے گا | زندہ ہیں تو یہ غم نہ کبھی چھوٹے گا
گھر چھوٹ گیا، گھر کا محرم چھوٹا | شبیرؑ کا ماتم نہ کبھی چھوٹے گا

سلام

مٹاتے ہیں مسلمانوں کو یہ کافر جفا والے / بہت یاد آئے ہم کو اس بلا میں کربلا والے
دلوں پر تا قیامت حکمراں ہیں کربلا والے / فنا کو اس طرح سے فتح کرتے ہیں بقا والے
کوئی سمجھے نہ سمجھے، ہم تو سمجھے اور سمجھیں گے / علی والے، نبی والے، نبیؐ والے، خدا والے
زمانے کے طبیبوں کو مبارک ان کی تدبیریں / ہمارے پاس بھی نسخے ہیں، کچھ خاکِ شفا والے
بڑے صحابہ، بڑے سادات گزرے ہیں زمانے میں / یہ سب اپنی جگہ لیکن ہمارے کربلا والے
اشارہ گلشنِ جنت کا تھا شاہِ شہیداں سے / ادھر آ، اے مرے خونیں کفن گلگوں قبا والے!
عجب کیا ہو تقاضا مجلسِ ارضِ خراساں میں / کسی کو یاد ہیں اشعار کچھ آلِ رضا والے

۱۹۴۸ء سے، جب سید آلِ رضا نے کراچی میں اپنا پہلا محرم کیا اور ''ہم پوچھتے پھرتے ہیں، کہاں مجلس ہے'' والی کیفیت بیان کی، ۱۹۷۸ء تک جب انھوں نے داعیِ اجل کو لبیک کہا، تیس برس کے عرصے میں کراچی میں عزاداری اور مرثیہ نگاری کو وہ فروغ حاصل ہوا جس کی نظیر برصغیر کی تاریخ میں سوائے مرزا دبیر اعلی اللہ مقامہٗ اور میر انیس اعلی اللہ مقامہٗ کے دور کے لکھنؤ میں کہیں اور نہیں ملتی۔ لکھنؤ میں مرثیہ نگاری آسمانِ شاعری کی بلندیوں تک پہنچ گئی۔ میر انیس کا یہ دعویٰ صحیح تھا: ''ہم آسمان سے لائے ہیں ان زمینوں کو''۔ یہ شاہانِ اودھ کا فیض تھا جنھوں نے اسلام اور اردو کی خدمت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا، اور اب یہ مملکتِ خداداد پاکستان کا فیض ہے کہ کراچی، حیدرآباد، سکھر، ملتان، لاہور، سرگودھا، راولپنڈی، پشاور اور کوئٹہ میں ہر مکتبِ فکر کے شعرائے کرام ہر سال نئے نئے مرثیے اور سلام کہتے ہیں اور خوب سے خوب تر کہتے جاتے ہیں:

سلام اس پر کہ جس کے نام لیوا ہر زمانے میں / بڑھا دیتے ہیں ٹکڑا سرفروشی کے فسانے کا

سلیم احمد

ادبی، علمی اور تحقیق کے جوہر

ضمیر اختر کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ علمی اور ادبی حلقوں میں وہ عزت و احترام کے ساتھ جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اس کم عمری میں انھوں نے اپنا اعتبار اور مقام پیدا کیا ہے اور ادبی، علمی اور تحقیق کے جوہر کو اس طرح نمایاں کیا ہے کہ کوئی اس سے انکار نہیں کر سکتا۔

''اردو مرثیہ پاکستان میں'' ضمیر اختر کی ایک ایسی کاوش ہے جس کی داد نہ دینا سراسر ظلم کے مترادف ہے۔ اس کام کے کرنے میں ان کو جتنی محنت کرنی پڑی ہوگی، اس کا اندازہ کتاب کی فہرست مشمولات دیکھ کر ہی کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب میں ضمیر اختر نے عہد قدیم سے عہد حاضر تک مرثیے کے سارے دقیق پہلو سمیٹ لیے ہیں اور خصوصاً پاکستان میں مرثیے کی موجودہ صورت حال پر ایک ایسی دستاویز تیار کر دی ہے جو اہلِ علم و تحقیق کی ہمیشہ رہنمائی کرتی رہے گی۔ خصوصاً یہ بات انتہائی قابلِ توجہ ہے کہ جدید مرثیے کو ابھی تک تحقیق و تنقید کا موضوع نہیں بنایا گیا تھا۔ ضمیر اختر نے اس موضوع پر کتاب لکھ کر جدید مرثیے کی صورت حال کو نمایاں اہمیت کے ساتھ پیش کیا ہے جس کی وجہ سے جدید مرثیے کی قدر و قیمت بہت ہی زیادہ بڑھ گئی ہے۔

میں ضمیر اختر کے اس کارنامے پر انھیں مبارک باد دیتا ہوں اور دست بدعا ہوں کہ جس محنت اور عقیدت سے انھوں نے مرثیے پر یہ کام کیا ہے، اللہ تعالیٰ اسے شرف قبولیت سے نوازے۔ یہ ایک ادبی کام تو ہے، ایک دینی کام بھی ہے۔

پروفیسر کرار حسین

موضوع کی ضرورت اور اہمیت کا اعتراف

پچھلی نصف صدی میں ہمارے معاشرے کی ساخت اور سمت میں جو بنیادی تبدیلیاں رونما ہوئیں، ہمارے ادب کے تمام اصناف نے بھی ان کا اثر کچھ غیر شعوری اور بہت کچھ شعوری محرکات کے نتیجے میں قبول کیا۔ جب طرز احساس بھی بدلا اور ارادے بھی بدلے تو اگرچہ ہیئت قائم بھی رہی لیکن قلب و ماہیت بڑی حد تک ضرور ہوگئی۔

میر انیس اور مرزا دبیر کو رخصت ہوئے ایک صدی سے کچھ اوپر زمانہ گزر گیا۔ بیسویں صدی کے نصف آخر میں پہنچتے پہنچتے اُردو کی قدیم ترین صنف شاعری مرثیہ میں جو مزاج اور آہنگ نمایاں ہوا، وہ اس مزاج اور آہنگ سے بہت مختلف اور ممتاز ہے جو میر انیس اور مرزا دبیر کے عہد میں اُردو مرثیے نے حاصل کیا تھا۔ آخر میں انیسویں صدی کے نصف اوّل کا لکھنؤ اور بیسویں صدی کا نصف آخر کا کراچی بھی تو دو مختلف دنیائیں ہیں۔ اس وقت ان تبدیلیوں کے متعلق بحث کرنا مقصود نہیں، بات صرف یہ ہے کہ زمانے نے جب اپنا ورق الٹا تو قدیم مرثیے کے سرمائے پر بھی وہ افتاد پڑی کہ۔

ورق بر ورق ہر سوئے بردباد

اس سرمایے میں سے کم تر ہمارے پاس موجود ہے، بہت کچھ ضائع ہو چکا اور کچھ اب بھی کونوں کھدروں میں پڑے ہوئے پرانے بستوں میں دیمک کی نذر ہو رہا ہے۔

اس زمانے میں کہ آثارِ قدیمہ کی کھوج لگانا اور آئندہ نسلوں کے لیے زمانۂ حال کی دستاویزات کو محفوظ کرنا تہذیب کے ضمیر کی پکار بن چکا ہے۔ کیا ہمارا یہ فرض نہیں ہے کہ قدیم مرثیے کے سرمائے کا جو کچھ حصہ اب بھی دستیاب ہو سکتا ہے، اس کو اور جو مرثیے کا ادب ہمارے زمانے میں تخلیق کیا جارہا ہے، اس کو جمع کرنے اور محفوظ کرنے میں سعی بلیغ کی جائے تاکہ اپنے آپ کو زیادہ گہرائی سے سمجھنے اور اپنی رفتار کو تنقیدی شعور سے متعین کرنے کا موقع ضائع نہ ہو۔

عزیزی ضمیر اختر نقوی نے اس زمانے کے تمام مرثیہ گو شاعروں کا ایک بسوط تذکرہ مع نمونۂ کلام مرتب کر کے ایک فرضِ کفائی ادا کیا۔ ''اردو مرثیہ پاکستان میں'' میں تمہید کے طور پر اُردو مرثیے کی مختصر تاریخ بھی انھوں نے دی ہے۔ اس کام کے لیے جتنی محنت انھیں کرنی پڑی ہوگی، اس کا تصور کرتے ہوئے میں محض یہ کہہ سکتا ہوں کہ اگر اس صنفِ ادب سے ان کا عقیدت مندانہ شوق عشق کے درجے تک پہنچا ہوا نہ ہوتا تو یہ کارنامہ وجود میں نہیں آسکتا تھا۔

کتاب کے موضوع کی ضرورت اور اہمیت کا اعتراف نہ کرنا ایسی خود فراموشی ہوگی جو تاریخ اور ثقافت کی شریعت میں جرم ہے، اور اگر ضمیر اختر کی محنت کی داد نہ دی جائے تو یہ ایسی ناقدری ہوگی جو احسان فراموشی کی حدود کو چھوتی ہے۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

''میں ضمیر اختر نقوی کو فنِ مرثیہ کا ممتاز ماہر اور زبردست محقق سمجھتا ہوں۔ پاکستان میں اُن کے دم خم سے اردو مرثیہ پروان چڑھ رہا ہے۔ خدا ان کو بطفیل آلِ عبا سلامت رکھے۔''

پروفیسر ممتاز حسین

یہ کام کچھ آسان نہ تھا

ضمیر اختر نقوی کا تعلق لکھنؤ سے ہے۔ ان کا تعلق بایں معنی گہرا بھی ہے کہ ان کی شخصیت میں لکھنوی ثقافت کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ وہ اردو مرثیے کی تاریخ پر ایک گہری نظر رکھتے ہیں۔ انھوں نے ابھی حال میں ایک کتاب مرتب کی ہے جس کا نام ہے "جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے"۔ اس کتاب میں انھوں نے جوشؔ کی مرثیہ نگاری کا تنقیدی احاطہ کیا ہے۔ اس سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ جدید مرثیے میں جو تبدیلیاں رونما ہورہی ہیں، ان کے بارے میں ان کا رویہ مخاصمانہ نہیں بلکہ ناقدانہ ہے۔

پاکستان بننے کے بعد سے اس ملک میں جہاں شاعری کی اصناف میں نئی نئی چیزیں پیش کی گئی ہیں، وہاں مرثیہ نگاری کی طرف بھی ہمارے شعرا نے خاصی توجہ دی ہے۔ اگر بعض شخصیتوں کو صرفِ نظر کیا جائے، جو خاصی قدامت پسند ہیں، تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ آج جس انداز کے مرثیے لکھے جارہے ہیں وہ ان تبدیلیوں کے حامل ہیں جو دوسرے اصنافِ سخن میں بھی ملتی ہیں۔ غزل جس تیزی سے اسلوب تبدیل کررہی اور نئی حسیات کا اظہار اپنے دامن میں کررہی ہے، اسی تیزی کے ساتھ پاکستان میں مرثیہ نگاری کا تناظر بھی بدلتا جارہا ہے۔ آج جو مرثیے لکھے جارہے ہیں، ان میں نہ تو رونے رُلانے پر زور ہے اور نہ مصائب وشدائد کے بیان پر بلکہ تاریخی نقطۂ نظر حق وباطل کی جنگ کا اپنایا جارہا ہے۔ اسی طرح واقعاتِ کربلا کو بھی نئے سانچے میں ڈھالا جارہا

ہے۔ حسینی کردار کی عظمت پر زور دیا جاتا ہے اور انھیں تاریخِ اسلام میں ایک انقلابی عمل کی حامل شخصیت گردانا جاتا ہے۔ یہ تو صحیح ہے کہ واقعات کربلا سے ملوکیت کے ارتقا کو نقصان نہیں پہنچا لیکن ملوکیت اسلام میں ایک مذموم شے ضرور بن گئی۔ اس نقطۂ نظر کو تقویت پہنچانے میں ڈاکٹر اقبال کی شاعری کو بھی بہت دخل ہے۔ بسا اوقات تو یہ بھی سوچنا پڑتا ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے امام حسین علیہ السلام کی شخصیت وعظمت سے متعلق جو کچھ کہا ہے، اس پر کوئی اضافہ جوش ملیح آبادی بھی نہیں کر سکے۔ نئی نسل کے شعرا اقبال کے انھیں خیالات سے متاثر ہیں اور وہ واقعات کربلا کی ایک نئی تفسیر لکھ رہے ہیں۔

ضمیر اختر نقوی کی کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں" اس وقت زیرِ نظر ہے۔ لکھنوی ہونے کی وجہ سے وہ کچھ دبستانیت میں زیادہ مبتلا ہو گئے ہیں۔ بہر حال یہ ان کا اپنا نقطۂ نظر ہے۔ کچھ نہ کچھ زبان کا اختلاف کراچی، لاہور اور کوئٹہ میں ملتا ہے۔ اس نسبت سے جہاں کچھ فرق زبان اور بیان میں ہے، وہاں خیال کی نوعیت میں بھی ہوا ہے لیکن مجموعی فضا ایک ہی ہے۔ کراچی سے خیبر تک جو شعرا مرثیے لکھ رہے ہیں، خصوصاً نئے شعرا، انھوں نے ایک نیا طرز اپنایا ہے۔ وہ آہ و شیون کو زندگی کے ایک جان دار اور توانا عمل میں تبدیل کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور ایک نئے خلوص اور عقیدت کا اظہار امام حسین علیہ السلام کی شخصیت سے متعلق ان کے مرثیوں میں ابھرتا ہوا ملتا ہے، چنانچہ ضمیر اختر نقوی نے حتی الوسع ان مختلف علاقوں کے شعرا کے مرثیوں کو سامنے رکھتے ہوئے کچھ تو ان کے حالات زندگی بیان کیے ہیں، پھر ان کے مرثیے کے نمونے پیش کیے ہیں ان کی مرثیہ نگاری پر مختصر مگر جامع تنقید و تبصرہ بھی کیا ہے۔ کتاب کے شروع میں ایک طویل باب "دکنی مرثیے سے جدید مرثیے تک" حوالۂ قلم کیا ہے، جس میں ایک تاریخی جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کام کچھ آسان نہ تھا، اس کی تکمیل میں انھوں نے کافی وقت

صرف کیا ہے اور موضوع کا حق مکمل طور سے ادا کیا ہے۔

اُردو ادب کے مورخ کے لیے ضمیر اختر نقوی کی یہ کتاب ایک اہم ضرورت کو پورا کرتی ہے۔ ان کا اسلوب بیان شائستہ اور، چا تُلا ہوا ہے۔ انھوں نے بہت زیادہ تو نہیں لیکن خاصا ایسا کام اس کتاب میں کیا ہے، جس کا تعلق تحقیق سے ہے، چنانچہ بہت سی نئی باتیں بھی مرثیہ نگاری اور مرثیہ نگاروں سے متعلق ملتی ہیں۔ اُمید ہے کہ اس کتاب کی پذیرائی نہایت کھلے دل سے کی جائے گی، کیونکہ یہ ایک کھلے ذہن کا کارنامہ ہے۔

☆☆☆

یوسف کاظمی ایڈووکیٹ

(لاہور ہائی کورٹ)

"جناب محترم ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب وہ بے مثال خطیب ہیں جو اسلام کے مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد کے لئے کوشاں ہیں۔ اپنی تقاریر سے، علمیت سے، مطالعۂ تاریخ اور ریسرچ سے انھوں نے وہ مقام پیدا کرلیا ہے کہ شیعہ قوم کے علاوہ پڑھے لکھے اہلِ سنت بھی اُن کی تقاریر سننے آتے ہیں اور اکثر بذریعہ خطوط سوالات کرکے کئی چیزوں کی وضاحت بھی کراتے ہیں۔ لاہور میں چار برسوں کے اندر انھوں نے اپنے بے شمار مداح پیدا کرلئے ہیں۔ یہ مقبولیت کم خطیبوں کے حصے میں آئی ہے۔ انھوں نے کبھی فرقہ واریت کو ہوا نہیں دی اور نہ ہی مقبولیت حاصل کرنے کے لئے اشتعال انگیزی کی ہے"۔

(۲۳، جولائی ۱۹۹۳ء کو لاہور میں ایک پریس کانفرنس کا بیان)

ڈاکٹر محمد علی صدیقی

وسیع مطالعہ اور تحقیقی لگن

ضمیر اختر نقوی ان معدودے چند ادیبوں میں سے ہیں جو صنفِ مرثیہ پر کمال سنجیدگی کے ساتھ ان تھک کام کر رہے ہیں، اور وہ بجا طور پر خوش ہو سکتے ہیں کہ ان کی مخلصانہ کوششیں بارآور ہونا شروع ہو گئیں ہیں۔ ان کی باریک بیں نگاہ نے انیس اور دبیر شناسی کا دائرہ وسیع تر کیا ہے۔ وہ ایک نہیں متعدد نئی جہتوں پر کام کر چکے ہیں اور توقع کی جانی چاہیے کہ اپنا سفر جاری رکھیں گے، اس طرح مرثیہ گوئی اور مرثیہ شناسی کے لیے زیادہ بہتر فضا تیار ہو سکے گی۔

ان کی تازہ ترین تصنیف "اُردو مرثیہ پاکستان میں" فی الحقیقت جدید اُردو مرثیے کا مبسوط ترین تذکرہ قرار دی جا سکتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اُردو ادب سے محبت کرنے والے عموماً اور دلدادگانِ مرثیہ خصوصاً ضمیر اختر نقوی صاحب کی تصنیف کے بارے میں اظہارِ تحسین کیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔ ضمیر اختر نقوی کی تازہ ترین تصنیف اپنے مصنف کے وسیع مطالعے اور تحقیقی لگن کی قابلِ رشک مثال ہے۔

پدم شری علی جواد زیدی
(صدر اُردو اکادمی، اتر پردیش، لکھنؤ)

ضمیر اختر کی سعیِ پیہم

اعتقادی ادب اس لیئے اہم نہیں ہے کہ وہ اعتقادی ہے بلکہ اس لیئے کہ اس میں جمالیاتی اقدار موجود ہیں۔ مذہب و عقائد ہوں یا علوم و فنون، ان میں جو ذخائر صدی بہ صدی جمع ہوتے رہے ہیں، ان کی مذہبی اور علمی قدر و قیمت کچھ ہی ہو، لیکن ادب کی تاریخ میں ایک گوشہ اپنانے کے لیئے انھیں نقد و نظر کے ادبی معیاروں پر پورا اترنا ہوگا۔ ہمارا رثائی ادب بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے بلکہ ایک زمانے میں تو "بگڑا شاعر مرثیہ گو" کی طنزیہ مثل بھی گڑھ لی گئی تھی۔ یہ بات اس کے باوجود کہی جاتی رہی ہے کہ عربی میں مرثیہ ایک مستقل صنف کی حیثیت رکھتا ہے، پھر بھی اس کے جواز میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس کا تعلق اُردو کے ابتدائی مراثی کے اس دور سے ہے جو شعری خصوصیات سے کم اور خوش عقیدگی سے زیادہ متاثر تھا۔ اس کے علاوہ اس دور کے مرثیوں پر بھی ناقدانہ اور مبصرانہ نظر نہیں ڈالی گئی تھی بلکہ مفروضے اور سنیکچے پر ضرب المثل کی مہر لگادی گئی تھی۔ اب جب پرانے ذخیرے ہمارے سامنے آئے ہیں تو معلوم ہوا ہے کہ رثائی ادب کے ارتقائی منازل کو سمجھنے میں معاون ہونے کے علاوہ ان سے لسانیات پر بھی نئی روشنی پڑتی ہے۔

اب تک حاصل شدہ مواد کی بنا پر رثائی ادب کی جو مختصر سی تاریخ مرتب ہوئی ہے،

اس سے یہ صاف ظاہر ہو چکا ہے کہ اُردو مرثیہ اپنی ہیئت ترکیبی کے اعتبار سے عربی اور فارسی مرثیوں سے جداگانہ ایک صنف ابھری ہے جو مغربی زبانوں میں بھی اس سے ملتے جلتے اصناف مثلاً ایلجی، ریلک، ٹریجڈی ڈرج وغیرہ سے جزوی مماثلتوں کے باوجود الگ ہے، اس لیے اس سارے سرمائے پر از سر نو نگاہ دوڑانا اور ذرا وقتِ نظر سے پرکھنا ضروری ہو گیا ہے۔ اس کے لیے دو سطحوں پر کام کرنا ہوگا۔ ایک تو مراثی کے جو ذخیرے برصغیر کے مختلف گوشوں میں بکھرے پڑے ہیں اور بے توجہی اور لاعلمی کی بنا پر ضائع ہو جانے کے خطرے سے دوچار ہیں، ان کو یکجا کر لیا جائے اور مناسب طریقے سے محفوظ کر لیا جائے۔ اُردو کے عام ادب کی طرح مراثی نے بھی تین اہم مراکز میں مختلف ارتقائی منزلیں طے کی ہیں، دکن، دلی اور لکھنؤ۔ لکھنوی مرثیے پر علامہ شبلی کی رونمایانہ کتاب "موازنۂ انیس و دبیر" نے پوری صنف کو خالص اعتقادی صنف سے بلند کر کے ادبی حیثیت کا مالک بنا دیا۔ اس کے بعد سے لکھنؤ اور دکنی مراثی پر کچھ کام ہوا ہے۔ دہلوی مراثی پر راقم الحروف نے ایک تفصیلی کتاب مرتب کر لی ہے۔ انیس و دبیر کے شاگردوں پر بھی کام ہوا ہے۔ لیکن گزرے ادوار اور موجودہ دور پر ابھی بہت کچھ کام کرنا ہے۔

مجھے بے حد مسرت ہے کہ عزیز مکرم ضمیر اختر نقوی نے ان خلاؤں کو پُر کرنے کا حوصلہ مندی سے آغاز کیا ہے۔ پاکستان میں مرثیوں پر صفدر حسین صاحب نے قدرِ اوّل کا کام کیا تھا، لیکن ان کی وفات کے فوراً بعد نئی نسل سے ضمیر اختر کی سعی پیہم ایک خوش آئند مستقبل کی پیامی ہے۔ وہ قدیم مرثیوں پر بھی کام کر رہے ہیں۔ اور دہلوی مرثیہ نگاروں کو بھی پیشِ نظر رکھے ہوئے ہیں، لیکن ان کی زیرِ نظر تصنیف "اُردو مرثیہ پاکستان میں" ایک اور اہم مرکز اور شعبے، یعنی پاکستان میں مرثیہ نگاری پر بھرپور تحقیق کی

بھی حیثیت رکھتی ہے اور جدید مرثیے پر تفصیلی جائزے کی بھی ۔اس تصنیف کی وساطت سے ہمیں یہ معلوم ہوا کہ پاکستان میں مرثیے کی روایت نہایت مستحکم ہے اور اس کی ترتیب باصلاحیت ہاتھوں میں ہو رہی ہے۔

میں ضمیر اختر کو اس اہم تصنیف کی تکمیل پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں اور یہ یقین رکھتا ہوں کہ ان کی آنے والی تصنیف مزید اور وقیع مواد سے ہمیں روشناس کرائے گی۔ ان میں اچھے محقق کی لگن، محنت کرنے کا جذبہ اور تحقیقی مواد کو سلیقے سے یک جا کرنے اور پیش کرنے کی صلاحیت ہے۔ان سے رثائی ادب کو بڑی توقعات وابستہ ہیں۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

جناب ضمیر اختر نقوی صاحب پاکستان کے جوان شاعر، ناقد، اور ہونہار محقق ہیں۔ پاکستان میں جتنے بھی انیس نمبر اور دبیر نمبر شائع ہوئے ہیں۔ان تمام شماروں میں وہ باعتبار مضامین چھا گئے ہیں۔انھوں نے ماہِ نو میں مراثی انیس کا اشاریہ شائع کر کے ایک ادارے کا کام تنہا انجام دیا ہے، زیر نظر کتاب "گلگشتِ گلستانِ دبیر" میں نقوی صاحب نے بڑی جانفشانی اور دیدہ ریزی سے مراثی دبیر کا اشاریہ مرتب کیا ہے ___ دفتر ماتم کی جلدیں نایاب ہیں۔ ضمیر اختر صاحب لائق صد مبارکباد ہیں کہ انھوں نے دفتر ماتم کی بھی جلدوں سے اشاریہ مرتب کر کے دبیریات میں ایک قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ یہ اشاریہ بھی مراثی انیس کے اشاریہ کی طرح مرثیہ پر کام کرنے والوں کے لئے مشعل راہ ثابت ہوگا۔

(پیش لفظ اشاریہ مراثی مرزا دبیر)

پروفیسر مرزا علی اظہر برلاس

ایک منفرد کتاب

سید ضمیر اختر نقوی سلمہٗ کی ذاتِ ستودہ صفات سے کون واقف نہیں، اور جن کو اس جواں سال ادیب سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا وہ بھی ان کی ادبی کاوشوں سے واقف ضرور ہوں گے۔ کراچی کی کوئی ادبی محفل ایسی نہیں جس میں مرثیے کا ذکر ہو اور ضمیر اختر نقوی کا نام نہ لیا جائے، سالہا سال کی جستجو اور عرق ریزی و تحقیق سے موصوف نے رثائی ادب میں اپنا ایسا مقام پیدا کیا ہے جس تک پہنچنا بہت مشکل ہے اور ان کی انفرادیت کا لوہا ادبی حلقوں نے بطیب خاطر مان لیا ہے۔ خداوند عالم نے انھیں ذہنِ رسا عطا کیا ہے اور محنت شاقہ نے اسے چار چاند لگا دیے ہیں۔ وہ تنقیدی ادب کے لیے انتہائی مفید ثابت ہوں گے۔ ہر قاری محوِ حیرت ہوتا ہے کہ اس جواں سال ادبی مورخ اور ناقد نے کس قدر پاپڑ بیلے ہوں گے تب جا کر دکن سے لے کر دہلی اور لکھنؤ کے اساتذہ کا کلام جمع کیا ہوگا پھر ان مرثیوں پر تحقیقی و تنقیدی جائزہ لکھ کر بہت بڑا کارنامہ انجام دیا ہے۔

ضمیر اختر صاحب نے اُردو ادب میں دس، بارہ کتابوں کا اضافہ کیا ہے مگر موجودہ کتاب اس لیے منفرد ہے کہ مرثیہ نگاری کے مختلف ادوار میں جو تبدیلیاں ہوئی ہیں یا ہو رہی ہیں، اس میں ان کی نشاندہی کی ہے، یعنی اس کتاب کو پڑھنے کے بعد انسان گزشتہ اور موجودہ دور کی مرثیہ نگاری کی تاریخ سے واقف ہو جاتا ہے۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے (۱۹۴۷ء) کے بعد سے اُردو ادب میں جہاں اور تبدیلیاں ہوئی ہیں، وہاں غزل اور مرثیہ بھی متاثر ہوا ہے اور ہونا بھی چاہیے تھا، اس لیے کہ تاریخِ عالم ثابت کرتی ہے کہ متمدن دنیا کے ہر دور میں زمان و مکان کے لحاظ سے ادب میں تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں، یہی وجہ ہے کہ دنیا کا ہر ادب اپنے دور کی عکاسی کرتا ہے۔ فطرتِ انسانی کسی حد تک قدامت پسند ہونے کے ساتھ ہی ساتھ ماحول اور زمانے کی دستبرد سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یونان و روحتہ الکبریٰ، عرب و ایران کے ادب میں مختلف ادوار اپنی خصوصیات کے ساتھ صاف نمایاں ہیں، اسی طرح انگریزی ادب، جس سے ہم زیادہ قریب رہے ہیں۔ اپنی قوم کے عروج و زوال اور مختلف زمانوں کی خصوصیات کی صاف صاف نشاندہی کرتا ہے۔ اُردو ادب بھی اس اصول سے محفوظ نہیں رہ سکتا تھا۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے مرثیے کو عروج پر پہنچایا مگر انیسویں صدی کے ہندوستان اور بیسویں صدی کے پاکستان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ یہ ناممکن تھا کہ سیاسی اور سماجی انقلاب کا اثر پاکستانی ادب پر نہ پڑتا، بلکہ میرے خیال میں جن اساتذہ نے مرثیہ نگاری کے ذریعے نئے رجحانات کی عکاسی کی ہے، انھوں نے اس کلیے کو ثابت کیا ہے کہ کوئی ادب کسی زمانے میں اپنے ماحول اور نئے رجحانات سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

میں ضمیر اختر صاحب سلمہٗ کو مبارک باد دوں گا کہ انھوں نے ۱۶۱۱ء (محمد قلی قطب شاہ) سے لے کر اس وقت تک کے رجحانات کی نشاندہی کر کے بہت بڑا فرض ادا کیا ہے اور پھر اس قدر جلد کہ صرف تقریباً سترہ روز میں یہ کتاب مکمل کر لی۔ یہ ایسا کام انجام دیا ہے کہ اگر کہن سال اور مشاق اساتذہ بھی کرتے تو ان کے لیے بھی باعثِ فخر ہوتا۔ انھوں نے علمی اور ادبی خزانوں کے کھوج میں جس عرق ریزی اور جاں فشانی

سے کام لیا ہے، اس کو وہی حضرات محسوس کر سکتے ہیں جنھوں نے اس میدانِ خارزار میں بھی قدم رکھا ہو۔ میں اس جواں سال ادبی مورخ کے لیے صرف یہی دعا کر سکتا ہوں کہ خدا ان کے زورِ قلم کو اور زیادہ کرے تاکہ دنیا ان کی کاوشِ قلمی سے مستفید ہوتی رہے۔

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب وہ واحد خطیب ہیں کہ جن کا ایک کثیر حلقہ ایسا ہے جو صرف علامہ صاحب ہی کی تقاریر سنتا ہے اور علامہ صاحب جہاں بھی خطاب کریں چاہے وہ ایک دن میں چار یا پانچ جگہ ہی کیوں نہ ہو ہر جگہ مقامی سامعین کی کثیر تعداد کے علاوہ وہ خاص حلقہ ضرور پہنچتا ہے۔ پچھلے برسوں میں کراچی میں علامہ صاحب کی مجالس میں ریکارڈ مجمعے ہوئے۔ ۲۰۰۳ء کے محرم میں امام بارگاہ شہدائے کربلا کراچی میں علامہ صاحب کی تقریرات ۱۲ بجے ہوتی تھی اور کثرتِ سامعین اور موضوع کے اعتبار سے یہ عشرہ پاکستان بھر میں سب سے اوّل رہا۔ اسی عشرے کی ایک مجلس میں لکھنؤ کے خطیبِ عصر حضرت مولانا محمد اشفاق صاحب مدظلہ العالی (جو امام بارگاہ رضویہ کراچی میں عشرۂ محرم کی مجالس سے خطاب فرمارہے تھے) بھی تشریف لائے تھے۔

ڈاکٹر منظر حسین کاظمی

اُردو مرثیے کا وقار

ضمیر اختر نقوی مجھے صرف اس لیے پسند ہیں کہ میں نے ان کی شخصیت میں اس کم سنی میں جو بالغ النظری، دانش مندی، قوت ایمانی، جرأت اور حقیقت پسندی کا امتزاج دیکھا ہے وہ اس دورِ جدید کے گم راہ نوجوانوں میں عنقا ہے۔

ضمیر اختر نقوی نے ادب میں اُردو مرثیے کو اپنا مرکزی موضوع بنایا ہے اور اپنی ذاتی کاوشوں سے اُردو مرثیے کا وقار پیش کرنے میں منہمک ہیں۔ پاکستان میں اگر ضمیر اختر نقوی نے اُردو مرثیے کو سنبھالا نہ دیا ہوتا تو وہ زمانے کی کج رفتاریوں کے ہاتھوں افسانہ بن جاتا۔ میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے عہد میں مرثیہ اپنے معراجِ کمال کو پہنچ گیا تھا اور انھیں پاک ہستیوں کے باعث مرثیہ "اُردو ادب" کی ایک لافانی صنفِ سخن بن چکا ہے، لیکن جدید مرثیہ نگار جو وقت کی آواز پر لبیک کہہ رہے ہیں، ان کو نظر انداز بھی نہیں کیا جاسکتا۔ عام تاثر یہ ہے کہ میر مونسؔ، میر انسؔ، میر نفیسؔ، مرزا اوجؔ وغیرہ کے بعد جناب نسیم امروہوی اور جناب آلِ رضا لکھنوی پر پہنچ کر مرثیے نے دم توڑ دیا۔ ضمیر اختر نقوی نے پاکستان میں نئے مرثیہ نگار اور ان کے مراثی کی طویل فہرست پیش کر کے نہ صرف ایک ضرورت کو پیش کیا بلکہ مرثیے سے اپنے والہانہ عشق کا ثبوت بھی فراہم کر دیا۔

ضمیر اختر نقوی غالباً دس کتابیں تصنیف کر چکے ہیں اور اب ان کتابوں کو منظرِ عام پر لانے کا سلسلہ شروع کر چکے ہیں۔ ان کی جس قدر بھی کتابیں میری نظر سے گزری

ہیں، ان میں یہ ضخیم کتاب بھی ادب میں اپنا مقام حاصل کرے گی۔ اس کتاب میں چار ابواب قائم کیے گئے ہیں جن میں قدیم مرثیہ نگاری کا ذکر کرتے ہوئے مصنف جدید مرثیہ گوئی تک اس کے پیچ پس منظر میں بڑھتا چلا گیا ہے اور اپنے ہر بیان اور رائے کی تائید میں دستاویزی شہادت پیش کی ہے۔ فاضل مصنف نے موضوع و محل کی مناسبت سے بڑے نادر افکار کا انتخاب کیا ہے۔ جس سے مرثیے کے ارتقا کی ایک تدریجی تاریخ مرتب ہو گئی ہے، مرثیہ کیا ہے، مرثیہ کسے کہتے ہیں اور یہ کہ یہ کوئی اکتسابی یا فطرت کے مبداء فیاض کی لطیف ترین روحانی نعمت ہے جو صرف خوش نصیبوں کے شعور و احساس کو ہی ودیعت ہوتی ہے۔ اگر یہ سب حقائق اس کتاب میں واضح نہ کر دیے جاتے تو فن کاروں کے ذہن و شعور پر یہ بات غالب رہتی کہ زمانے نے ان کے ساتھ ناانصافی کی ہے۔ فن کاروں کی قدر ان کی زندگی ہی میں کر کے ایک اچھی روایت کو جنم دیا گیا ہے۔ ضمیر اختر نقوی نے نہ صرف پاکستان کے ہر خطے کے مرثیہ نگاروں کا ذکر کیا ہے بلکہ کراچی کی یادگار عزاداری، سوز خوانی اور نوحہ خوانی کا بھی حوالہ دیا ہے۔ کتاب کا اصل موضوع پاکستان کے مرثیے نگار اور ان کی مرثیہ نگاری ہے، مرثیہ نگاروں کے حالات زندگی اور ان کے کلام کا تنقیدی جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ کتاب کے آخر میں جدید مرثیہ نگاروں کے سلسلۂ شاگردی کے شجرے پیش کیے گئے ہیں، جو ریسرچ کرنے والے حضرات کو مدد دیں گے مجھے یقین ہے کہ ملک کے ارباب ذوق، خصوصاً مراثی سے دلچسپی رکھنے والے حضرات اس کتاب سے بے حد بہرہ اندوز ہوں گے۔ یہ صرف طلبائے شعر و ادب کے لیے بلکہ تمام اہلِ ادب حضرات کے لیے بھی اہم ترین کتاب ہے۔'' اُردو مرثیہ پاکستان میں'' ضمیر اختر نقوی کا ایک ایسا کارنامہ ہے جسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

☆☆☆

ڈاکٹر سیّد سبطِ حسن فاضل زیدی
(صدر شعبۂ اردو، سکرنڈ گورنمنٹ کالج، سندھ)

پانچواں کارنامہ

عزیزی ضمیر اختر نقوی صاحب کا ایک کارنامہ میر انیسؔ کے مراثی کا اشاریہ دیکھ کر بخدا! مجھے بہت مسرت ہوئی تھی، اور میں ان کی ژرف نگاہی کا قائل ہو گیا تھا۔ ان کا دوسرا کارنامہ مراثیِ دبیر کا اشاریہ لکھنؤ سے کتابی صورت میں شائع ہو چکا ہے، اور ضمیر اختر صاحب کی مہربانی سے اس کی زیارت بھی کر چکا ہوں، ایسی جاں کاہ محنت ضمیر اختر صاحب ہی کر سکتے ہیں۔ ضمیر اختر صاحب کا تیسرا کارنامہ جوشؔ ملیح آبادی کے مراثی کی ترتیب اور اشاعت ہے۔ شروع میں جوشؔ صاحب کی مرثیہ نگاری پر ضروری گفتگو کی گئی ہے جس کے مطالعے سے ضمیر اختر صاحب کی ناقدانہ قابلیت کا صحیح اندازہ ہو جاتا ہے اور جوشؔ صاحب کے مراثی کے محاسن آئینہ ہو جاتے ہیں۔

ضمیر اختر نقوی صاحب نے ازراہِ کرم اپنی زیرِ طبع کتاب ''اردو مرثیہ پاکستان میں'' اشاعت سے پہلے مجھے دکھائی۔ ان کا یہ پانچواں کارنامہ دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ اللہ اکبر! ضمیر اختر صاحب نے تن تنہا ایک ادارہ کا کام کر دکھایا ہے۔ یہ کتاب اردو مرثیہ کا ایک مبسوط تذکرہ ہے جس میں مرثیے کے ادوار قائم کر کے اس کے ارتقا سے تفصیلی گفتگو کی گئی ہے اور ہر اہم مرثیہ نگار کا ذکر کیا ہے، خصوصاً ۱۹۴۷ء تک کے اردو مرثیہ نگار شعرا کے حالات جمع کیے ہیں اور ہر شاعر کی خصوصیاتِ مرثیہ نگاری بیان کی

ہیں، گویا ضمیر اختر صاحب نے پاکستان کے مرثیہ گو شعرا کا قاموس تیار کر دیا ہے۔ یہ محنت ہر ستائش سے بالاتر ہے۔

مجھے یقین ہے کہ پاکستان کے مرثیہ گو شعرا کا یہ تذکرہ بہت دلچسپی سے پڑھا جائے گا اور ضمیر اختر صاحب کو ان کی داد دی جائے گی۔ میں ضمیر اختر صاحب کو اس کامیاب پیشکش پر دلی مبارک باد دیتا ہوں اور ان کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔

☆☆☆

عبدالستار ایدھی

میرے لئے یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب نے اب تک ۱۱۸ کتابیں لکھی ہیں۔

ان کی نئی کتاب ''شعرائے اردو اور عشقِ علی'' جو چھپ گئی ہے، اس کتاب کی افتتاحی تقریب کے سلسلے میں میرا یہ پیغام ہے کہ ادب اور مذہب کے حوالے سے ہمارے علما نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں، لیکن یہ موضوع ایسا ہے جس پر ہمارے علما اور دانش وروں، سبھی کو سنجیدگی سے توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

جامی ردولوی (لندن)

ہمہ گیر اور بصیرت افروز کتاب

شعرا اور نثر نگار دو گروہوں میں منقسم ہیں جو ایک ہی راہ میں قدم بقدم چلتے رہے ہیں۔ بسا اوقات اکثریت ایسے لوگوں کی ہوتی ہے جن کو مذہب سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی ہے۔ کبھی کبھی وقتی مجبوری کے تحت مجلس میلاد یا جلوس میں شرکت کر لیتے ہیں لیکن نہایت بے دلی کے ساتھ۔ وہ مذہب میں انہماک رکھنے والے افراد کو ''اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ'' قرار دے کر نظر انداز کرتے ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ عالی دماغوں کی اکثریت اسی طبقے سے تعلق رکھتی ہے۔ اردو میں بیسیوں عظیم شاعر گزرے ہیں، لیکن گنتی کے صرف دو شاعر انیس و اقبال ایسے ہیں جنھوں نے مذہب کو اپنا موضوع فن قرار دیا، یہ اور بات ہے کہ یہ دو سب پر بھاری ہیں۔ نثر نگاروں کا بھی یہی حال ہے۔ مذہب سے متعلق امور پر لکھنے والوں کی تعداد نہایت مختصر ہے اور میدان اہل قلم میں ان کی کاوشوں کو ثانوی قرار دیا جاتا ہے۔ اس صورت حال میں ضمیر اختر نقوی کا مذہبی انہماک، ادبی صلاحیت اور کدوکاوش شمع ہدایت کی حیثیت رکھتی ہے۔

غزل میں غالب کے بعد کوئی شاعر ان کے درجے کا پیدا نہیں ہوا، لیکن تغزل زمانے کے ساتھ تغیر پذیر ہوتا رہا اور ہر دور میں ممتاز شعرا پیدا ہوئے جو بجائے خود امتیازی شان کے مالک تھے۔ ان کو پڑھتے ہوئے اس میں میر و غالب کا تصور نہیں ہوتا۔ شاد عظیم آبادی، فانی، جگر، فراق اور فیض کی غزلیں آپ اپنی نظیر ہیں۔ مرثیہ نگاری

میں ایک جمود پیدا ہو گیا، اس کا ارتقائی تسلسل ٹوٹ گیا، کیونکہ میر انیس کی ضرب اتنی عمیق تھی، ان کے فن کا تاثر اتنا گہرا تھا کہ لوگ انھیں کا اندھا دھند اتباع کرتے رہے۔ کسی کی کسی اور رنگ میں لکھنے کی جرأت نہ ہوئی۔ پہلی بار جوش نے ۱۹۱۸ء میں اپنے انداز میں "آوازۂ حق" لکھ کر جدید مرثیے کی بنیاد ڈالی اس کے بعد اور لوگوں نے بھی نئے انداز کے طرز جدید میں مرثیے لکھنا شروع کیے۔ جوش نے متعدد مرثیے لکھے ہیں جو ان کی فنی مہارت کے علم بردار ہیں، مگر جوش مرثیہ گو شاعر نہیں ہیں۔ یہ چند مرثیے ان کے ذخیرۂ شاعری میں مشتے از خروارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے اٹھارہ دیوانوں میں کوئی مرثیے کا دیوان نہیں ہے۔ وہ جذباتی انسان تھے۔ جب کسی نفسیاتی یا معروضی محرک سے ان کا جذبۂ مذہبی بے چین ہو جاتا تھا تو مرثیہ لکھ ڈالتے تھے۔ اگر جوش کا مخصوص موضوع مرثیہ ہوتا اور ان کے اٹھارہ دیوانوں میں سے کم از کم چھ دیوان مرثیوں اور سلاموں پر مشتمل ہوتے تو جدید مرثیے کو بزم ادب میں وہی حیثیت حاصل ہوتی جو نئی غزل اور جدید نظم کو حاصل ہے۔ ویسے شاید ہی کوئی ایسا شاعر ہو جس نے مرثیہ یا سلام نہ لکھا ہو۔ لندن کے ایک مشاعرے میں فیض احمد فیض نے بھی ایک مختصر مرثیہ سنایا تھا، لیکن جب تک ایک ممتاز شعری ذہانت کا شاعر مرثیے کو نہیں ملتا، لوگ مجلسوں میں انیس و دبیر کے مرثیے پڑھتے رہیں گے۔ یہ بھی آپ نے نہ دیکھا ہوگا کہ کسی ادبی محفل یا مشاعرے میں میر و غالب کی غزلیں سنائی جاتی ہوں یا لوگوں کو ان کے سننے کی تمنا ہو، لوگ ہم عصر شعرا کا کلام سنتے سناتے ہیں۔ لیکن مجلس میں جب کوئی نو تصنیف مرثیہ سنایا جاتا ہے تو لوگ ہمیشہ انیس سے اس کا تقابل کرتے ہیں۔ یہ بڑی عبرت آموز صورت حال ہے کہ ابھی تک انیس کا خمار سروں سے نہیں اترا۔

ضمیر اختر نقوی کی پیش نظر کتاب نہایت دلچسپ، ہمہ گیر اور بصیرت افروز ہے۔ یہ

جان کر بڑی خوشی ہوئی کہ پاکستان میں مرثیے کی نشاۃ ثانیہ ہو رہی ہے، اور یہ بات ایک حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے کہ اُردو زبان وتہذیب کے لحاظ سے دلی اجڑ کر لکھنؤ بسا تھا، اب لکھنؤ اجڑ کر کراچی آباد ہوا ہے۔ یہ بات انتہائی باعث مسرت ہے کہ پاکستان میں اور خصوصاً کراچی میں کثیر تعداد میں سے مرثیہ گو شعرا ہیں۔ اب مجھے یہ احساس ہونے لگا ہے کہ کم از کم پاکستان میں مستقبلِ قریب میں جدید مرثیے کو وہ درجہ حاصل ہو جائے گا کہ لوگ اس کو ذوق وشوق سے پڑھنے لگیں اور انیس سے تقابل کرنا چھوڑ دیں گے۔

ضمیر اختر نقوی نے قدیم وجدید مرثیے کی تاریخ باتصویر مرتب کرنے میں جو محنت کی ہے، اس کی جتنی بھی داد دی جائے کم ہے۔ آئندہ لکھنے والے ہمیشہ ان کو دعا دیں گے کہ انھوں نے ان کے لیے راہ ہموار کر دی اور کام آسان کر دیا۔ اس ابتدائی کوشش میں صرف تذکرہ لکھا جا سکتا ہے، اور ضمیر اختر نقوی نے اس فرض کو پورے طور سے ادا کیا ہے جو پاکستان میں مرثیہ نگاری کے مستقبل کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

☆☆☆

ضمیرِ علم و ادب قصرِ جستجو کا چراغ
اودھ کا اخترِ تہذیب لکھنؤ کا چراغ
بہ نورِ نخلِ سیادت بہ نسبتِ ایماں
علومِ آلِ پیمبرؐ کی آبرو کا چراغ

کمال حیدر رضوی

سیّد علی مہدی (لندن)

قابلِ صد آفرین

مرورِ ایام، فصیلِ زمان و مکان کی بنا پر تاریخ نویس تاریخِ انسانی کا جائزہ لینے میں اکثر تصورات، تخیلات، دلائل و براہین، حقیقت و مجاز، واقعات یا محض قصہ و کہانی جیسے متضاد امتزاج کے سہارے صرف ایک مبہم سا خاکہ تاریخِ انسانی کا مرتب کر دیتے ہیں۔ عین الیقین و حق الیقین کے معیار پر چند ہی حقائق پورے اترتے ہیں۔ اسی حقیقت کی روشنی میں گزشتہ چند صدیوں میں ذہنِ انسانی میں جو علمی و ادبی تدریجی ارتقا ہوا، اس کا کماحقہ احاطہ کرنا بھی امرِ دشوار ہے۔

قطب شاہی دور یا اس سے بھی قبل مرثیہ گوئی کا ہندوستان میں آغاز ہوا، اور انیسؔ و دبیرؔ کی جادو بیانی کی منازل سے گزر کر منزل بمنزل آلِ رضا و جوشؔ کی گل افشانی تک پہنچا۔ ہر دور کا عنوان ایک مگر طرزِ بیان ہر دور کی سوسائٹی کے ذوق کا ہم آہنگ۔ جس طرح نامِ حسینؑ تا قیامت زندہ ہے، اسی طرح حسینؑ کے مدح سرا بھی قائم و دائم ہیں۔ خدا جانے اب سے سو برس بعد مرثیہ نگاری کا کیا رنگ ہوگا!

گلستانِ شعر و سخن میں مرثیہ ایک ایسا گلِ صد رنگ ہے کہ جس کی حُسن و زیبائی کے باب میں لب کشائی سے قبل اس بیان کی ابتدا و انتہا کا تعین بھی دشوار ہے۔ ضمیر اختر نقوی کے پیشِ نظر غالباً سب سے زیادہ دشوار یہ امر ہوگا کہ اردو مرثیہ نگاری کی ابتدا و انتہا کا احاطہ کس طرح کیا جائے۔ قابلِ صد آفرین ہیں ضمیر اختر نقوی کہ اس دشوار منزل کو

پامردی سے قطع کیا۔ مرثیہ نگاری آج بھی جاری ہے اور جاری رہے گی۔ ضمیر اختر نقوی نے موجودہ دور کے معروف مرثیہ نگاروں کے تذکرے کے بعد قلم روک لیا۔ اب یہ آنے والی نسلوں کے مصنفین کا کام ہے کہ جہاں ضمیر اختر نقوی نے قلم روکا ہے، وہ اس سے آگے قدم (قلم) بڑھائیں مگر ضمیر اختر نقوی جیسی دماغ سوزی، عرق ریزی، تحقیق و جستجو اور لگن کے چیلنج کو بھی قبول کریں۔

دس سطور کو دس الفاظ میں اس طرح ڈھال دینا کہ نفسِ مضمون کی جاذبیت قائم رہے، ایک ایسا فن ہے کہ ہر اسپِ خامہ اس میدان میں جولانی نہیں کرسکتا۔ ضمیر اختر نقوی نے پانچ سو صفحات میں جو قلم بند کردیا، وہ ایسی ہی پانچ جلدوں کا مضمون و موضوع تھا۔ اہلِ نظر غور فرمائیں کہ دکن کی مرثیہ نگاری سے بات شروع کرنا، انیس و دبیر کے دور سے گزر کر آلِ رضا و جوش تک پہنچنا اور بہ تکمیل تذکرہ ہر دور کے معروف و غیر معروف مرثیہ گو کا تذکرہ، مختصر سوانح حیات، نمونۂ کلام، فنِ مرثیہ گوئی سے وابستہ دوسرے متعلقہ پہلو اجاگر کرنا ایک بحرِ ناپیدا کنار کا تصور ذہن میں لاتے ہیں۔ ضمیر اختر نقوی نے اس سمندر کو ایک حسین جامے میں بند کردیا ہے۔

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

ضمیر اختر نقوی نے فنِ مرثیہ گوئی پر احسان کیا ہے۔

☆☆☆

پروفیسر محمد رضا کاظمی

اُردو مرثیے کا تاریخی سفر

اگر میں کہوں کہ جناب ضمیر اختر نقوی کی کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں" کا عنوان ہی مغالطہ خیز ہے تو یہ اس کی قدح نہیں، مدح ہوگی۔ اس کتاب میں قیام پاکستان کے قبل کی مرثیہ نگاری کا جو تمہیدی بیان ہے، وہ خاصا ضخیم اور خاصا مفید ہے۔ دکن میں اُردو شاعری کا ارتقا مرثیے کے ساتھ ساتھ ہوا، اس لیے دکنی مرثیے پر تحقیقی حتیٰ کہ تنقیدی مواد بھی نایاب نہیں، لیکن دہلی میں مرثیہ نگاری کے رواج پر کوئی مربوط تحریر کم از کم میری نظر سے نہیں گزری۔ ہندوستان میں جناب علی جواد زیدی دہلی کی مرثیہ نگاری کے موضوع پر ایک کتاب تصنیف کر رہے ہیں۔ ضمیر اختر نقوی نے اپنی کتاب میں دہلی سے متعلق باب بیشتر غیر مطبوعہ مسودات کی بنیاد پر لکھا ہے جو معلومات اور تحقیقی کاوش کا لحاظ سے قابلِ قدر ہے۔ انھوں نے اس موضوع کی دلچسپی، وسعت اور اہمیت کو اجاگر کیا ہے، اور یہ دہلی کی مرثیہ نگاری کے موضوع پر ایک خوش آئند تقویم ہے۔ خان آرزو، سودا، ذوق اور ظہیر کی مرثیہ نگاری کا بیان نہایت خوش اسلوبی سے ہوا ہے۔ ضمیر اختر نقوی کا خیال ہے کہ خان آرزو کو مسدس مرثیہ کہنے کا خیال، سودا سے آیا۔ ضمیر اختر نقوی کی اپنی تحقیق کی روشنی میں شاہ حاتم مسدس مرثیہ کہہ چکے تھے، اس لیے میری ناچیز رائے میں خان آرزو کا سودا کی نسبت سے شاہ حاتم سے اثر قبول کرنا زیادہ قرین قیاس ہے۔ ان چند نکات کے علاوہ، جو بہر حال دونوں جانب سے ظنیات کے

دائرے میں ہیں، ان کی تحقیق ٹھوس ہے، ذوق کے مرثیے مطبوعہ، "نیا دور" لکھنؤ، ۱۹۷۴ء کی طرف ان کی نشان دہی بہت مستحسن ہے۔ ہم دونوں کے مشترکہ دوست ہلال نقوی کو ذوق کے جو دو مرثیے دستیاب ہوئے ہیں، ان کی تحقیق کے سلسلے میں یہ مرثیہ ممد و معاون ثابت ہو سکتا ہے۔ ذوق کے جو دو بند ضمیر اختر نقوی نے نقل کیے ہیں، ان میں نہ تو ان کی غزلوں کی ٹکسالی اُردو ہے اور نہ ان کے قصیدے کے تکلفات ہیں، اس لیے ذوق کے آہنگِ شاعری کے مختلف ادوار یا انداز کو سمجھنے کے لیے یہ مرثیہ بہت کارآمد ہو سکتا ہے۔ کاش وہ اس بات کے اختتام پر آغا شاعر قزلباش کا ذکر زیادہ تفصیل سے کرتے تاکہ ان کے طرز اور پاکستان کے دو مشہور مرثیہ نگار ڈاکٹر یاور عباس اور شاداں دہلوی کے حوالے سے اسلوب کے سفر کو کچھ اور واضح کیا جا سکتا۔

جب ضمیر اختر نقوی دکن سے شروع کر کے کراچی پہنچ جاتے ہیں تو کتاب کا عنوان بہت معنی خیز ہو جاتا ہے۔ اُردو مرثیے کا سفر پاکستان اور ہندوستان میں مختلف خطوط پر جاری ہے۔ میں نے جدید اُردو مرثیے میں جوش اور جمیل مظہری کے اختتامی دور کے مراثی کے متعلق لکھا تھا کہ مراثیِ جوش میں زیادہ زور سماجی انصاف کے حصول پر ہے، اور مراثیِ جمیل مسلمانوں میں داخلی مفاہمت کی کمی اور ایک مثبت کردار کی طرف ان کی رہ نمائی کے پیشِ نظر لکھے گئے ہیں۔ گویا جوش کے مرثیے سیاسی تشکیل کے بعد تعمیری مراحل کے عکاس ہیں اور جمیل مظہری کے مرثیے مسلمانوں کی اقلیتی سیاست کے آئینہ دار ہیں۔ یہ تقسیم کے فوراً بعد کا حال ہے۔ آئندہ نسلیں اپنے مراثی کے ضمنی پس منظر میں یقیناً مختلف ہوتی جائیں گی۔ اس رخ سے دیکھیں تو ضمیر اختر نقوی کی زیرِ نظر کتاب کو ایک سنگِ میل کی حیثیت حاصل ہے۔ جدید سے جدید تر نسل کے مرثیہ گو شعرا کا ذکر اس تالیف میں ملتا ہے۔ صرف دو نام ایسے ہیں جن تک ان کی رسائی تو ہو گئی لیکن اس

وقت جب ان کی کتاب طباعت کے آخری مراحل میں تھی۔ ایک جناب رشید منظر، شاید اس لیئے کہ وہ ایک طویل مدت سے ریاست ہائے خلیج میں برسرِ کار ہیں، دوسرا نام رشید منظر کے استاد کا ہے۔ بنگال کے حوالے سے ضمیر اختر نقوی، ناطق لکھنوی تک تو پہنچ گئے لیکن ان کی رسائی مولانا رضا علی وحشت لکھنوی کے اس مرثیے تک نہ ہوسکی جو انھوں نے ریڈیو پاکستان ڈھاکا سے پیش کیا تھا۔ استثنا میں صرف دو ناموں کا نکلنا ہی یہ ظاہر کرتا ہے کہ جناب ضمیر اختر نقوی نے کس وسیع پیمانے پر تلاش و جستجو سے کام لیا ہے۔

اپنی تصنیف کی غرض وغایت بیان کرتے ہوئے ضمیر اختر نقوی صاحب فرماتے ہیں:

''میں نے اس کتاب کو تذکرہ نگاری کے انداز پر تحریر کیا ہے۔ تنقید سے دامن بچاتے ہوئے یہ کام آئندہ کے لیئے چھوڑ دیا گیا ہے۔ تنقید اسی وقت مناسب ہوتی جب تمام مرثیہ نگاروں کا کلام شائع ہو گیا ہوتا''

تمام رباعی گو شعرا کا کلام شائع ہو جانا ایک دشوار مرحلہ ہے چہ جائیکہ تمام مرثیہ نگار شعرا کا کلام۔ مرثیے پر تنقید کا آغاز شبلی نے کیا تھا اور فوق نے ان کا جواب دیتے ہوئے تنقید سے زیادہ تحقیق کے سہارے کو مضبوط پایا، اس وجہ سے بنیادی شعری ذوق کی تربیت کے لحاظ سے آج بھی شبلی کا کارنامہ فوق کے کارنامے پر فوق رکھتا ہے۔

مقامِ شکر ہے کہ جناب ضمیر اختر نقوی تنقید سے اپنا دامن بچانے میں کامیاب نہیں ہوئے اور تذکرہ نگاری کے پیرائے میں کہیں یہاں وہاں نہایت بلیغ تنقیدی اشارہ کرتے نظر آتے ہیں جس سے کتاب کی اہمیت وافادیت، اس کی گراں مایگی میں اضافہ ہوا ہے۔

پروفیسر سحر انصاری

(سابق صدر شعبۂ اُردو، کراچی یونیورسٹی)

ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں

اُردو مرثیے کی حیثیت ایک ایسی صنف کی ہے جسے خالص اُردو کی دین کہا جاسکتا ہے۔ مرثیے کے تاریخی عوامل اور اس کے ارتقا کے باب میں اس قدر لکھا جاچکا ہے کہ مزید تفصیل کی چنداں ضرورت نہیں، لیکن اب بھی بعض محققوں نے ''راہِ مضمونِ تازہ بند نہیں'' کے مصداق یہ ضرور ثابت کیا ہے کہ گم شدہ کڑیوں کو ملانے اور صحیح متون کی روشنی میں درست نتائج اخذ کرنے کی گنجائش بہرحال موجود ہے۔

سید ضمیر اختر نقوی اصلاً ایک انیس شناس کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں لیکن مرثیے سے ان کی مجموعی اور عملی شغف کو دیکھ کر یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ وہ مرثیہ شناسی کے ضمن میں بجائے خود ایک ادارے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ میر انیس کی صد سالہ تقریبات کے موقع پر پاکستان کے تقریباً تمام اہم ادبی رسائل کو ضمیر اختر نقوی کا عملی تعاون حاصل رہا اور بعض رسالوں کی تو مکمل ترتیب ان کے ذمے رہی۔ اس کے بعد ان کی دلچسپی میں برابر اضافہ ہوتا رہا تا آنکہ اب ''پاکستان میں اُردو مرثیہ'' جیسی ضخیم، مفید اور اہم کتاب ہمارے سامنے موجود ہے۔

زیرِ نظر کتاب کا ایک اجمالی جائزہ یہ ظاہر کرنے کے لیے کافی ہے کہ ضمیر اختر صاحب نے کس قدر محنت، اور دیدہ ریزی سے سارا مواد فراہم کیا ہے، اور اس پر مستزاد ان کی

تحقیقی و تنقیدی نگاہ جس نے رثائی ادب کی عام تنقید سے مختلف اسلوب اختیار کر کے ایک قسم کی تازہ کاری کا آغاز کیا ہے۔

اُردو میں مرثیے کا ابتدائی سرمایہ قدیم دکنی سے دستیاب ہونے لگتا ہے، دکن کے بعد شمالی ہند کے بعض تہذیبی مراکز میں بھی مرثیہ پر خاص توجہ دی گئی، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ نہ صرف اس عظیم موضوع کو شاعری کے ایک منفرد پیرائے میں ڈھال دیا گیا، بلکہ اگر آج ہم اپنی تہذیبوں کے معاشرتی اجزا کا سراغ لگانا چاہیں تو یہی مرثیے ایک اہم ماخذ ثابت ہوں گے دکنی دور سے قیامِ پاکستان تک کا رثائی ادب بہرحال کسی نہ کسی شکل میں زیرِ بحث آتا رہا ہے۔ اگرچہ ضمیر اختر نقوی کی اس کتاب سے اندازہ ہوتا ہے کہ بہت سی کڑیاں گم تھیں اور اب بھی بعض کی تلاش اور ان کا ارتباط نہایت ضروری ہے، لیکن پاکستان بننے کے بعد کے مرثیے گو شعرا کے حالات و تخلیقات کو یک جا کرنا اور ان کے مرثیوں پر فنی اور تحقیقی اعتبار سے تبصرہ کرنا یقیناً ایک دشوار امر تھا۔ ہمیں مسرت ہے کہ ضمیر اختر نقوی صاحب نے اس ضمن میں رونمایانہ نوعیت کا کام کیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ جب بھی جدید مرثیے پر کوئی تحقیقی یا تنقیدی کام کیا جائے گا "اُردو مرثیہ پاکستان میں" ایک حوالے کی کتاب کے طور پر کام آئے گی۔

جدید مرثیہ بجائے خود آج کل موضوعِ بحث بنا ہوا ہے۔ اس کی اوّلیت کا سہرا کئی حضرات کے سر علیحدہ علیحدہ باندھا جا چکا ہے، لیکن ضمیر اختر نقوی لکھنؤ میں جدید مرثیے کے آغاز کے تحت مرزا اوج کا حوالہ دے کر جوشؔ ملیح آبادی کے تفصیلی تذکرے سے اپنی کتاب کا باب تحقیق وا کرتے ہیں۔ ضمیر اختر نقوی جوشؔ کے مرثیے کتابی صورت میں شائع کر چکے ہیں، اور انھیں حق حاصل ہے کہ وہ جوشؔ کے مرثیے کے وہ پہلو ادبی دنیا کے سامنے پیش کریں جو ان کے مرثیوں کی "عدم دستیابی" کی وجہ سے اوجھل رہے ہیں۔

علاوہ ازیں انھوں نے جدید مرثیے کے معماروں کے تحت سیّد آلِ رضا، نسیم امروہوی، راجا صاحب محمود آباد، نجم آفندی کا تفصیلی مطالعہ پیش کیا ہے۔

ضمیر اختر نقوی نے مرثیہ نگاری کے ارتقا اور اپنے خاص مزاج کی روشنی میں ''دبستانِ کراچی'' کا تعین کیا ہے۔ اس سے وابستہ شعرا کے تذکرے اور نمونہ کلام کو انھوں نے جس انداز سے پیش کیا ہے، اس سے ان کی تحقیق و جستجو اور دقتِ نظر کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پنجاب کے مرثیہ نگاروں کا بھی تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ہر شہر کے نمائندہ مرثیہ گو شعرا کے حالاتِ زندگی اور کلام پر توجہ دی ہے۔ کوئٹہ اور چاٹگام کے بھی مرثیہ نگاروں کا تذکرہ اس کتاب میں شامل ہے۔

ضمیر اختر نقوی اس کتاب کی ترتیب و تدوین میں کن مراحل سے گزرے اور ان کے پیشِ نظر کیا کیا سرمایہ رہا ہے، اس کا اندازہ اس کتاب کے پیش لفظ سے ہوتا ہے۔ اسی میں انھوں نے لکھا ہے کہ ''کاغذ کی گرانی کے سبب کچھ حصے حذف کرنے پڑے اور ایک پورا باب ''جدید مرثیہ کیا ہے؟'' نکال دینا پڑا، حالانکہ اہم باب تھا''۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انھیں علمی کام سے جنون کی حد تک لگاؤ ہے، ورنہ اس قسم کے نامساعد حالات دل برداشتہ کرنے کے لیے کافی ہیں۔ مقامِ شکر ہے کہ ضمیر اختر نقوی صاحب ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں'' کی ذیل میں آتے ہیں۔

''اردو مرثیہ پاکستان میں'' اپنی ترتیب، تزئین اور طباعت کے لحاظ سے بھی قابلِ توجہ ہے۔ اس میں متعدد تصاویر اور مرثیہ نگاروں کی شاگردی کے سلسلوں کو درج کر کے اس کتاب کو مزید مفید اور دیدہ زیب بنا دیا گیا۔ کتاب کے ناشر سیّد احسن علی رضوی صاحب اہلِ علم کے شکریے کے مستحق ہیں کہ نفع اندوزی کے اس دور میں انھوں نے ایسی سنجیدہ تحقیقی کتاب شائع کرنے کی ہمت کی۔

مجھے یقین ہے کہ ضمیر اختر نقوی صاحب کی اس علمی کاوش کو اہلِ علم و ادب قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ اور اس کی خاطر خواہ پذیرائی کریں گے۔

رفیق رضوی (کراچی)

محترم و معظم جناب علامہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب قبلہ دامت برکاتہٗ

سلام مسنون۔ امید ہے مع متعلقین مع الخیر ہوں گے!

''القلم'' کا شہرہ تو سنا تھا مگر شومیٔ قسمت زیارت سے محروم، قرض ادھار تیسرا شمارہ ہاتھ آیا مضمون مضمون، ورق ورق، سطر سطر، لفظاً لفظاً، حرف حرف دو دن میں پڑھ ڈالا یقین اتنا متحیر کن اور جاذب ہے یہ مجلّہ، گو مجھ جیسے ایرے غیرے کی توصیف و ستائش سے آپ کی ذات اور آپ سے وابستہ تحریریں یقیناً بلند ہیں لیکن وہ ضعیفہ بھی تو قصص کا جزو ہے جو سوت کی آنٹی لے کر یوسف کو خریدنے گئی تھی۔

آپ کی فکری کاوش ''مرثیہ بعنوان سلطانِ امامت'' پڑھتا رہا۔ دل نے عداوی کاوش علامہ صاحب یہ مرثیہ مجھ ندیم کے نام سے موسوم کر کے شائع کر دیتے تو میرے بعد میرے بچے تک ان کو دعا دیتے حق یہ ہے کہ عام پیرایۂ گفتار، تمہید، آغاز، بصوت، آہنگ، اسالیب، تسلسل، انداز، استعارات، کنایات، بلاغت، پرواز فکر، تشبیہ، مضامین، سلاست، آواز، وہ کون سی خوبی ہے جو اس مرثیے میں موجود نہیں ہر مصرعہ برجستہ ہر بیت لاجواب:

وہ اور ہیں جو گم ہیں سرابوں کی فضا میں ۔۔۔ میں سانس بھی لیتا ہوں کتابوں کی فضا میں

ہیں یہ وہ جواہر جو چمک کھو نہیں سکتے ۔۔۔ الفاظ خدا کے ہیں، غلط ہو نہیں سکتے

بڑھ بڑھ کے صف لشکر کفار پہ آئی
وہ ہو گئی تلوار جو تلوار پہ آئی

المختصر یہ مرثیہ خوب ہی نہیں بہت ہی خوب ہے۔

پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد

علمی وادبی خدمات

جناب ضمیر اختر نقوی میرے پرانے ملنے والوں میں سے ہیں، لیکن گزشتہ چند برسوں سے ان کی علمی وادبی خدمات سے روشناس ہونے کے بعد میں ان سے اور وہ مجھ سے قریب تر ہو گئے ہیں۔ وہ نہایت خاموشی سے اُردو زبان و ادب کی ٹھوس خدمت کر رہے ہیں۔ اور نام ونمود کی پروا کیے بغیر بڑی لگن کے ساتھ اپنے کام میں منہمک رہتے ہیں۔ شروع ہی سے اُردو مرثیہ اور میر انیس ان کے پسندیدہ موضوع تحقیق رہے ہیں جن پر ان کی گہری نظر ہے۔ جب ضمیر اختر نقوی صاحب کی دو کتابیں "تاریخ مرثیہ نگاری" اور حیات میر انیس" شائع ہو کر منظرِ عام پر آئیں گی تو ان کی تحقیقی اور ادبی صلاحیتیں اور اجاگر ہوں گی۔

اس کتاب کے لیے انھوں نے ایک ایسے موضوع کا انتخاب کیا ہے۔ جس پر ان سے پہلے کسی کی نظر نہیں گئی تھی۔ یہ ضخیم تذکرہ بڑی محنت وقابلیت اور تحقیق وکاوش سے قلم بند کیا گیا ہے۔ اس کے پیش لفظ میں مصنف نے کتاب کی نوعیت اور اہمیت پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے جس کے مطالعے سے اس کے موضوعات اور ابواب کا مجمل خاکہ پیشِ نظر ہو جاتا ہے۔

اس کتاب میں ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۷ء پاکستان میں مرثیہ نگاری کا جائزہ لیا گیا ہے۔ مرثیے کے ارتقائی تسلسل کی وضاحت کے لیے پہلے باب میں دکن، دہلی اور لکھنؤ میں

مرثیہ گوئی کی تاریخ وارتقا پر سیر حاصل مواد یکجا کر دیا گیا ہے۔ دوسرے باب میں ان مرثیہ نگاروں کی شخصیت کے خدوخال پر اظہار خیال کرتے ہوئے ان کے مرثیوں کی خصوصیات بیان کی گئی ہیں جو تقسیم ہند کے بعد پاکستان آگئے تھے۔ تیسرے باب میں شہر کراچی میں عزاداری کی تفصیل پیش کر کے کراچی کے مرثیہ گو شاعروں کے مختصر حالات، ان کی مرثیہ نگاری کی خصوصیات اور نمونہ کلام دیا گیا ہے۔ چوتھے باب میں پنجاب کے مرثیہ نگاروں کا تذکرہ اور مرثیوں کے اقتباسات ہیں۔

زیر نظر کتاب کو فنِ مرثیہ نگاری پر دستاویزی حیثیت حاصل ہے۔ مرثیہ نگاری کا اُردو ادب میں دیگر اصناف سخن کی طرح ایک انفرادی اور نمایاں مقام ہے، اس لیے اس موضوع پر ایک کتاب کی ضرورت مدت سے محسوس کی جا رہی ہے۔ مجھے دلی مسرت ہے کہ جناب ضمیر اختر نقوی نے نہ صرف اس کمی کو پورا کیا ہے بلکہ اپنے موضوع کا کوئی گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا۔ دبستانِ دہلی کی مرثیہ نگاری جو تا حال ہماری آنکھوں سے اوجھل تھی، وہ بھی اس کتاب کی اشاعت سے منظرِ عام پر آگئی ہے۔

مجھے یقین ہے کہ ان کا یہ علمی کارنامہ قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور مرثیہ گوئی کے مختلف گوشوں کو اجاگر کرنے میں دیگر محققینِ ادب کے لیے یہ کتاب بڑی ممد و معاون ثابت ہوگی۔

☆☆☆

پروفیسر نعیم تقوی

ایک درخشاں ادبی علامت

اُردو میں رثائی شاعری نے میر انیس اور مرزا دبیر کے عہد میں اتنی جامعیت اختیار کی کہ زندگی کے تمام پہلوؤں پر محیط نظر آنے لگی۔ مولانا حالی اور علامہ اقبال فنِ مرثیہ نگاری کے رثائی پہلوؤں سے شعوری اور لاشعوری طور پر اکتساب کرتے ہوئے جامعِ وقت کی حیثیت اختیار کر گئے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ انیس و دبیر جیسے صاحبانِ طرز اور قادر الکلام افراد بعد میں پیدا نہیں ہوئے۔ مگر اقتضائے وقت کو سمجھتے ہوئے جوش ملیح آبادی نے جدید مرثیہ نگاری میں ایک نئی روح پیدا کی۔ جوش کی صدا اس صدی تک محدود نہیں بلکہ اسے بقائے دوام حاصل ہے۔ اس کے علاوہ نئے مرثیہ نگاروں کے لیے انھوں نے ایک روشن باب اور کھول دیا جس سے مذکورہ صنف کے آثار و علائم تابندہ تر ہو گئے ہیں۔

پاکستان میں اُردو مرثیہ نگاری کے فروغ اور اہمیت و جامعیت پر ''اُردو مرثیہ پاکستان میں'' ایک ایسی مبسوط کتاب ہے جس میں عزیزم ضمیر اختر نقوی نے اپنی اعلیٰ تحقیقی اور انتقادی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اُردو زبان کو ایک مایۂ ناز ارمغانِ ادب و عقیدت پیش کیا ہے۔ بعض ناقدین کے نزدیک یہ ایک مبسوط تذکرہ ہے۔ تذکرے کی اہمیت و افادیت مسلم مگر فنی طور پر اس شاہکار کو تذکرہ نہیں کہا جاسکتا اور نہ یہ صرف ایک تحقیقی کاوش ہے، بلکہ اس میں جابجا ایسی عبارت بھی ملتی ہے جس

سے انتقادی شعور کا پتہ چلتا ہے۔ الفاظ کا دروبست اور جملوں کی ساخت بسا اوقات ایک بین ادبی محاکے کی صورت بھی اختیار کرگئی ہے، لہٰذا میرے نزدیک یہ کتاب تحقیق وتنقید کے مختلف زاویوں سے مرصع ہے۔

بحیثیت محقق سیّد ضمیر اختر نقوی معاصرین میں امتیاز رکھتے ہیں۔ آج کل مختلف کتابوں کو سامنے رکھ کے مضامین کو ایڈٹ کرنے والا بھی محقق کہلانے لگا ہے۔ میرے نزدیک محقق کے لیے ضروری ہے کہ تخلیق کاری سے عاری نہ ہو اور ایک حد تک انتقادی نظر بھی رکھتا ہو۔ جب کوئی فن کار اس منزل سے آگے بڑھ جاتا ہے تو تنقید نگاروں کی صف میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ تنقید نگاری ادب میں سب سے مشکل کام ہے۔ جناب ضمیر اختر نقوی نے جس تیزی سے ارتقائی منازل طے کی ہیں، اسے میں انعام خداوندی سے تعبیر کرتا ہوں۔ اس عمر میں ان کی تخلیقات اتنی معیاری ہیں کہ بعض مشہور قد آور فنکار ان کے سامنے بونے نظر آتے ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ ان کی یہ سعیِ کامگار بھی پاک وہند میں اپنی اہمیت وافادیت کے سبب اہلِ علم سے تحفۂ تحسین حاصل کرے گی۔

مجھے یہ اظہار خیال کرتے ہوئے بے پایاں مسرت ہے کہ عزیزم ضمیر اختر نقوی اس عہد میں میر انیس اور فنِ مرثیہ نگاری کے حوالے سے برصغیر میں ایک درخشاں ادبی علامت ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی
(ایم۔اے۔ پی ایچ۔ ڈی)

ضمیر اختر کی اہم علمی و ادبی کاوش

ضمیر اختر نقوی وہ بالغ نظر نوجوان ہیں جنھوں نے مرثیہ نگاری کے سلسلے میں مسلسل محنت اور کاوش سے ایک عظیم کام سرانجام دیا۔ بکھرے ہوئے موتیوں کے دانوں کو اپنی ژرف نگاہی سے چنا اور اس طرح ایک کتاب کی شکل میں سلک قلم میں پرو کر زبان اردو کے گلے میں ہار بنا کر ڈال دیا تا کہ مستقبل کا ادیب یہ سمجھ لے کہ مرثیہ کے فن سے بے رُخی بھی برتی نہیں جا سکتی۔ میں ان کی کم عمری کے باوصف ان کی جانکاہی کا قائل ہو گیا کہ انھوں نے انیس کے ایک ایک مصرع کی صحت اور حفاظت کو اپنی حرزِ جاں بنا لیا۔ یہ ان کی تلاشِ علمی ہے کہ انھوں نے اپنی بلند حوصلگی کے ساتھ مرثیوں کی تلاش جاری رکھی اور اس طرح کئی ہزار مرثیے انھوں نے محفوظ کر لیے۔ نہ صرف انیس کے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مرثیوں کا جمع کرنا ان کی زندگی کا مشن رہا ہے اور ہے، بلکہ جس مرثیہ نگار کا کلام ملا، اس کو محفوظ کر لیا اور پاکستان میں مرثیہ گوئی کے سلسلۂ فکر کی ترویج اور اشاعت ان کی زندگی کا مشن بن گیا۔ بلاشبہ اس صنف ادب میں لوگ قدم بڑھاتے ہوئے ڈرتے ہیں (اس لیے کہ انیس و دبیر اعلی اللہ مقامہٗ نے بجا طور پر ان زمینوں پر طبع آزمائی کی جو الہامی کیفیات کے ساتھ ان کے دل پر اتریں، کاغذ پر لکھی گئیں اور سننے والوں کے دلوں پر نقش ہو گئیں)، اسی لیے موجودہ دور میں مراثی نگاری

میں پانچ پانچ ، سات سات مرثیوں سے زیادہ تعداد نہ بڑھ سکی۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ انھی بزرگان کا فیض ہے کہ اس صنف میں آلِ رضا، نسیم امروہوی اور جوش جیسے پختہ فکر اور دقیق النظر حضرات نے اپنے لیئے ایسے راستے نکالے جس سے مرثیہ نگاری کے سبب ہمارے ادب میں چار چاند لگ گئے۔ ان حضرات کی طبع آزمائیاں فکر و عمل کی نئی راہوں کا پتہ دیتی ہیں اور ان کی جودت فکر بیان کے نئے نئے گوشے نکالتی ہے۔

ضمیر اختر نے اپنے سلیقے کو اپنا رہبر بنایا اور ڈھونڈ کر گم نام چہروں کو سامنے لا کھڑا کیا۔ یہ ان کا احسان ہے کہ پاکستان میں تمام مرثیہ نگار حضرات کی کاوشوں کو مرتب کر کے " اردو مرثیہ پاکستان میں" کے نام سے ارباب علم کے سامنے پیش کر دیا۔ انھوں نے رثائی ادب پر نہایت وضاحت سے روشنی ڈالی ہے اور اپنی پیہم سعی سے اس کے تمام گوشوں کو اجاگر کیا ہے۔ مرثیہ نگاری میں شہرت پسندی کا جذبہ کار فرما نہیں ہوتا، بلکہ اظہار اخلاص و عقیدت کے ساتھ بیان میں اس لیئے نیاز مندانہ اظہار زیادہ ہوتا ہے کہ جس کی مصیبتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔ وہ خود دل کے حال کو خوب جانتا ہے اس لیئے وہ مرثیے کو وجہ شہرت نہیں بناتا۔ بس یہی سبب ہے کہ اس پروپیگنڈے کے دور میں اس کی کاوشیں نظر کے سامنے نہیں آتیں اور آئیں بھی تو کیسے، جبکہ ہمارے یہاں ایک یونیورسٹی نے تو قطعی طور پر مرثیہ گوئی کے مطالعے کو "چہار درویش" اور "فسانۂ عجائب" کے برابر بھی نہیں سمجھا۔ نئی نسل کا تصور کیا اور ان کو پتہ کیا کہ انیس و دبیر نے اپنی پوری زندگیاں کس طرح ادب کی خدمت کے لیئے مخصوص کر دیں۔ حالی نے جس نظم گوئی کی طرف پرزور طریقے سے متوجہ کیا، اس راہ کو انیس پہلے سے دکھا چکے تھے، کہ انھوں نے غزل کو ہاتھ نہیں لگایا اور یہی بات آگے چل کر شبلی نے ظفر علی خاں سے کہی تھی۔

ضمیر اختر نقوی کی کتاب "فن مرثیہ گوئی" پر ایک لاجواب علمی کوشش ہے اور واقعی ہم

سے زیادہ تو وہ یونیورسٹی ہی قابلِ تعریف ہے جس نے۔ ایم ۔اے میں "مرثیہ گوئی" کو داخلِ نصاب تو کرلیا۔ میں ضمیر اختر کی کاوش و محنت اور ژرف نگاہی کی داد دیتا ہوں، اور ان کے سلیقے کی تعریف اس لیے بھی کرتا ہوں کہ یہ بھی لکھنؤ کی ایک جھلک ہے۔

☆☆☆

فاضل زیدی کے ایک خط سے اقتباس

۴، مارچ ۱۹۸۰ء

آپکی کتاب "اشاریہ مراثی مرزا دبیرؔ" کو میں نے بہت توجہ اور شوق سے پڑھا۔ آپ نے بڑی محنت کی اور بڑا مفید کام کیا۔ اسے مراثی مرزا دبیر کی قاموس کہنا بالکل بجا ہے۔ میں اس کی اشاعت پر آپ کو مبارکباد دیتا ہوں اور آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے اس کے مطالعہ کا شرف بخشا...... آپ مراثی پر جو کام کر رہے ہیں خدا کرے وہ پایہ تکمیل کو پہنچ جائے۔ یہ کام ایک ادارے کے کرنے کا ہے۔ جسے آپ تنہا انجام دے رہے ہیں۔ آپ کی ہمت مردانہ ستائش سے بالاتر ہے۔ اللہ آپ کا حامی و ناصر ہو۔ میں آپ کا دعا گو ہوں" اور اس سلسلے میں ہر خدمت کے لئے ہر وقت حاضر ہوں۔

میں آپ کا منت پذیر ہوں کہ آپ نے مجھے مرزا اوجؔ کے مجموعہ مراثی ""معراج الکلام"" کے مطلع اور قلمی مراثی اوجؔ کے مطلعے عنایت فرمائے۔ قلمی مراثی اوج کے بقایا مطلعے جو آپ کے احباب نے آپ کو بھیجے ہیں، وہ بھی اگر مجھے مرحمت فرمادیں تو میں انھیں بھی شامل مقالہ کرلوں گا۔ مجھے آپ کے کرم کا انتظار رہے گا"

ماجد حسین رضوی (رضویہ سوسائٹی)

تحریر و تقریر

سید ضمیر اختر نقوی صاحب باعتبار صفات، خصوصی محقق، نقاد، ادیب اور صاحب فکر و کاوش منظر عام پر تابندہ ہیں۔ فلک علم و ادب کے اس درخشندہ ستارے کو (اللہ نظر بد سے محفوظ رکھے۔ آمین) اس کم سنی میں پاک و ہند کے بڑے بڑے ادبا، شعرا اور علماً انتہائی قدر اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ موصوف کے شعری ذوق اور ادبی صلاحیتوں کے متعلق مجھ جیسا جاہل کیا کہہ سکتا ہے یا کیا لکھ سکتا ہے۔ میری زبان قاصر اور میرا قلم عاجز ہے۔ بڑی بڑی باعظمت شخصیتوں نے اپنے اپنے زاویہ نگاہ سے ایک رائے قائم کی ہے مجملہ ان شخصیتوں کے فضائل مآب جناب ضیاء الحسن صاحب موسوی اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے رضویہ امام بارگاہ میں شاعر اہل بیت جناب نجم آفندی صاحب مرحوم کی یاد کے ایک جلسے میں حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا: "ضمیر اختر سلمہٗ قوم کا ایک بہت بڑا سرمایہ ہیں، ان کی قدر کیجئے اور ان کی حفاظت کیجئے"۔ آج بھی میرے کانوں میں اس باعظمت شخصیت کے جملے گونج رہے ہیں۔ "ان کی قدر کیجئے اور ان کی حفاظت کیجئے"۔

دور بین نگاہیں ناقدردانِ علم و ادب کے لیے ایک اشارہ کر گئیں۔ معظم و محترم جناب ضیاء الحسن صاحب موسوی کی نگاہوں سے ضمیر اختر نقوی صاحب کو دیکھئے اور ان کی مرتبہ شناسی کا اندازہ لگایئے۔ دوسری مثال اس عظیم انسان شاعر انقلاب جناب جوش ملیح

آبادی کی ہے کہ جس عظیم انسان کے لیے کنور مہندر سنگھ بیدی اپنے مرثیہ جوش میں یوں کہتے ہیں:-

میٹھے وہ بول بولنے والا چلا گیا　　موتی خرد کے رولنے والا چلا گیا

زلفوں کے پیچ کھولنے والا چلا گیا　　وہ بوئے گل کو تولنے والا چلا گیا

بوئے گل کو تولنے والے جوش اپنے ایک خط میں ضمیر اختر نقوی صاحب کو اس طرح لکھتے ہیں: "اگر اللہ کا سا میرا امزاج ہوتا تو آپ کی زبان سے اپنی مدح سن کر آپ کے دامن کو موتیوں سے بھر دیتا۔" جناب جوش کی اس گراں قدر تحریر سے جناب ضمیر اختر نقوی صاحب کی قدر و قیمت کا اندازہ نہیں لگایا جا سکتا۔ سچ ہے۔

قدر گوہر شاہ داند یا بداند جوہری

اللہ نے ضمیر اختر نقوی صاحب کو تحریر و تقریر کی دونوں صلاحیتیں عطا کی ہیں اور بحمد اللہ! دونوں صلاحیتیں بامِ عروج پر ہیں۔ آپ کی تقریر میں علم کی گہرائی ہوتی ہے ایسی گہرائی جسے ذہن قبول کرے اور قلب و روح کو آسودگی حاصل ہو۔ موصوف اپنی تقریر میں دینی علوم کے نکات، شعر و ادب کی عظمت و اہمیت اور تاریخ اسلام کی حقیقتوں کو انتہائی شرح و بسط کے ساتھ پیش فرماتے ہیں جس سے تشنگانِ علم سیراب ہوتے ہیں۔

اس دور ابتلا میں جب کہ شعر و ادب کا معیار گرتا چلا جاتا ہے اور بد ذوقی بڑھتی چلی جاتی ہے۔ ایسے ماحول میں جناب ضمیر اختر نقوی صاحب نے اپنا موضوع "مرثیہ اور فروغِ مرثیہ" قرار دیا ہے۔ موصوف کی جستجو اور کاوش قابلِ قدر اور لائقِ صد تحسین ہے۔ موصوف نے اپنی جد و جہد سے ثابت کر دیا ہے کہ جب تک روئے زمین پر اُردو زندہ ہے، جب تک سطحِ ارض پر ادب کا چراغ روشن ہے، اس وقت تک صنفِ مرثیہ بھی

اپنی تابانی کے ساتھ قائم و دائم ہے۔

میری دعا ہے کہ بارالہا ان پر علوم دینی و دنیوی کے اسرار آشکار فرمائے اور ائمہ طاہرین علیہم السلام ان کی جہد مسلسل کو قبول فرمائیں، آمین!

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

لاہور میں علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب نے ۱۰ برس عشرۂ اولیٰ سے خطاب کیا اور اب کراچی میں عشرۂ اولیٰ کے بعد لاہور میں عشرۂ ثانی سے خطاب کرتے ہیں پورا پنجاب وہاں خصوصیت سے علامہ صاحب کی تقاریر سننے اُن دنوں لاہور میں امنڈ آتا ہے۔ بلا مبالغہ سرکاری اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ پندرہ سے بیس ہزار کا مجمع ہوتا ہے اور مرکزی شاہراہ ۲ کلومیٹر تک بند کرنا پڑتی ہے یہی حال ملتان کا ہے۔ ملتان کے سامعین ہزاروں کی تعداد میں شریک ہوتے ہیں اور خاص بات ملتان کی یہ ہے کہ محرم سے ہٹ کر مسلسل اب تک مجالس ہو رہی ہیں اور ہر ماہ تین یا چار خطاب علامہ صاحب کے ملتان میں ہو رہے ہیں اور سامعین کثیر تعداد میں شریک ہوتے ہیں۔ ربیع الاوّل سے لے کر اور تادمِ تحریر (شوال ۱۴۲۳ھ) تک ملتان میں علامہ ضمیر اختر نقوی کے لگ بھگ چالیس ۴۰ خطابات ہو چکے ہیں۔ یہی حال اور شہروں کا بھی ہے خود لکھنؤ میں جب علامہ ضمیر اختر نقوی پہنچ جاتے ہیں تو عالم ہی کچھ اور ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر محرم نہ بھی ہو تو محرم ہو جاتا ہے مجالس شروع ہو جاتی ہیں اور ایک امام باڑے سے دوسرے امام باڑے سامعین ساتھ ساتھ پہنچتے ہیں۔ لندن، امریکہ، اور امریکہ کی مختلف STATES میں ہر جگہ علامہ صاحب کی مقبولیت بام عروج پر ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی

(سابق وائس چانسلر، کراچی یونیورسٹی)

محبوب موضوع

جناب ضمیر اختر نقوی کی نئی تصنیف "اردو مرثیہ پاکستان میں" جدید مرثیہ گو شعرا کا ایک ایسا تذکرہ ہے جس میں کم وبیش سارا مواد براہِ راست یا خود شاعروں سے حاصل کیا گیا ہے یا ان کے قریبی دوست احباب اور عزیز و اقارب سے۔ نقوی صاحب نے اس مواد کو محنت و محبت سے گوندھ کر ایک خوب صورت ہار کی صورت میں پیش کردیا ہے۔ مرثیہ ضمیر اختر صاحب کا محبوب موضوع ہے اور زیرِ نظر تصنیف میں انھوں نے اپنے موضوع کا یقیناً حق ادا کیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ ان کی یہ تصنیف نہ صرف قبولیتِ عام حاصل کرے گی بلکہ اہلِ نظر بھی اسے قدر کی نظر سے دیکھیں گے۔

☆☆☆

فضل قدیر (مدیر ماہِ نو) کے ایک خط سے اقتباس

۱۷، جون ۸۵ء

برادر دیا ستھو دیا ستھو کام جاری رکھیے...... کاش فرہنگ دبیر بھی بن جائے تو جان پڑ جائے...... الٰہی زورِ قلم اور زیادہ۔ "افق پہ چھایا ہوا ہے ضمیر" نہ معلوم یہ مصرع ہوا یا نہیں۔ لیکن بہرحال آپ اس صنفِ ادب پر چھائے ہوئے ہیں۔

انور سدید

نعرۂ مستانہ

''اچھا مضمون پڑھ کر بھی جعفر طاہر پر ایسی والہانہ کیفیت طاری ہوتی۔'' ماہِ نو'' کے میر انیس نمبر میں ایک جامع مضمون میر انیس کے سوانح پر ضمیر اختر نقوی کا شائع ہوا تھا۔ اس قسم کا ایک مطالعہ جعفر طاہر نے غالباً رسالہ سیپ میں پیش کیا تھا۔ جعفر طاہر کو اصرار تھا کہ ضمیر اختر نقوی کا مضمون بہتر ہے جبکہ شیر افضل جعفری مُصر تھے کہ جعفر طاہر کا مقالہ نسبتاً اچھا ہے۔ اب مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ شیر افضل جعفری محض جعفر طاہر کا دل رکھنے کے لیے انھیں بہتر قرار دے رہے تھے یا واقعی ان کی رائے میں اسے استحقاق حاصل تھا۔ بہر حال دونوں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ رہے تھے، تم نے دونوں مضمون پڑھے ہیں، ایمان سے بتاؤ کہ کون سا مضمون اچھا ہے؟ میں نے بے اختیار ضمیر اختر نقوی کے سوانحی مضمون کا نام لے دیا تو جعفر طاہر نے اسی بے اختیاری سے ایک نعرۂ مستانہ سر کیا اور ایک بھاری بھرکم گالی دے کر شیر افضل جعفری کو للکارا، ''لو سن لو! انور سدید بھی میرا ہم رائے ہے۔''

(انور سدید کے مضمون ''سید جعفر طاہر'' سے اقتباس، مطبوعہ ماہنامہ اوراق لاہور، ''بہار نمبر'' ۱۹۸۴ء)

مشفق خواجہ

استفادہ

ضمیر اختر ہمارے ان نوجوان محققین میں سے ہیں جنھوں نے بہت کم عرصے میں کئی اہم موضوعات پر قابلِ قدر کام کیا ہے۔ ضمیر صاحب کا موضوع اُردو مرثیہ ہے۔ انیس و دبیر پر ان کے کام کی حوالہ جاتی اہمیت اتنی زیادہ ہے کہ ان دونوں شاعروں پر کام کرنے والوں کے لیے ضمیر صاحب کے کام سے استفادہ کرنا ضروری ہے۔

ضمیر صاحب کی تازہ ترین تحقیقی کاوش "اُردو مرثیہ پاکستان میں" ہے جو اپنے موضوع پر پہلی جامع تصنیف ہے۔ ہمارے ادبی جائزوں میں عام طور پر جدید مرثیے کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ ضمیر صاحب نے اس کوتاہی کی تلافی نہایت عمدہ پیرائے میں کی ہے۔ اس کتاب میں جدید مرثیہ اور مرثیہ نگاروں کے بارے میں بہت سی قابلِ قدر معلومات ملتی ہیں اور ہم بہت سے ایسے شاعروں سے بھی متعارف ہوئے ہیں جن کے بارے میں کسی دوسری جگہ کچھ نہیں لکھا گیا۔

☆☆☆

ڈاکٹر ہلال نقوی

معتبر محقق

گزشتہ ایک صدی میں اردو ادب کی بہت سی تاریخیں لکھی گئی ہیں، لیکن ان تاریخوں کے لکھنے والے یا تو احساسِ کم تری کا شکار رہے ہیں یا وہ اس توانا صنفِ سخن سے بے خبر ہیں جسے مرثیہ کہا جاتا ہے۔ اگر ادبی دیانت داریوں کے تمام تقاضوں کا پاس کیا جائے تو میرے نزدیک عصرِ حاضر کے تحقیقی اور تنقیدی سفر کی سب سے اہم منزل، مرثیہ شناسی کی منزل ہونی چاہیے تھی۔ "اردو ادب" کی اب تک جتنی تاریخیں لکھی گئی ہیں، وہ اردو غزل کی تاریخ ہیں، انھیں ہم ادب کی جزوی تاریخ کہہ سکتے ہیں۔ (قطعِ نظر نثر کے) غزل، مرثیہ، نظم، مثنوی، واسوخت، ہجو، ہرثیہ، ان سب کی مشترکہ قوت کا نام اردو ادب ہے۔ جب تک ان تمام اصناف کو پیشِ نظر نہیں رکھا جائے گا، ادب کی تاریخ لنگی، بے راہ، ادھوری، نامکمل، خام اور غیر معتبر ہوگی۔ ادب کی تاریخ لکھنے والے کی بنیادی شخصیت ایک محقق کی ہوتی ہے، اور محقق کا فرضِ اولین ہی یہ ہے کہ وہ اپنے دور کی ادبی رفتار سے مکمل طور پر واقف ہو۔ یہ کہنا کہ "عصرِ حاضر میں" مرثیے کی تاریخ کیا بنے گی اس لیے کہ مرثیے کی نہ کوئی مرکزیت ہے اور نہ اس کا کوئی مقام، تو اس سوال کا جواب ہے ضمیر اختر نقوی کی کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں"۔

ضمیر اختر نقوی کو میں گزشتہ بارہ برس سے جانتا ہوں۔ میں ان کے بہت قریب رہا ہوں۔ میں نے ان کے تحقیقی حوصلے دیکھے ہیں، ان کے قلم کی طاقت کو محسوس کیا ہے۔ ان کا سونا، ان کا جاگنا، ان کی رفتار، ان کا کردار سب تحقیق سے وابستہ ہے (خصوصاً مرثیے کی تحقیق سے)۔ میں نے اتنا گہرا، اتنا کھرا اور اتنا معتبر محقق کم دیکھا ہے۔ میں انھیں دیکھ کر حیران ہوں کہ اس قدر کمزور اور ناتواں جسم کے محقق نے تحقیق کی اتنی بڑی اور بھاری چٹان کو کس طرح اپنے دل و دماغ کے ہاتھوں پر اٹھا رکھا ہے۔

"اردو مرثیہ پاکستان میں" اس اعتبار سے بھی عصر حاضر کی بے مثال تحقیقی کتاب ہے کہ انھوں نے اسے تصویروں سے مزین کر کے تحقیقی سفر کو ایک نیا رُخ دیا ہے اس کتاب میں جس قدر تصویریں شامل ہیں، اگر ان کو علیحدہ کر لیا جائے تو جدید مرثیے کی منہ بولتی تاریخ بن جائے جس میں سامعین، منبر، مرثیہ نگار سب ہی موجود ہوں گے۔

سعید حسنین عابدی (لکھنؤ)

عام طور پر یہ دیکھا گیا ہے کہ ریسرچ اسکالرز کسی ایک مضمون، ایک ادب یا ایک معاشرے پر تحقیق کر کے پی ایچ۔ ڈی کی سند حاصل کرتے ہیں۔ میں نے جہاں تک غور کیا ہے، مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ضمیر اختر نقوی صاحب مختلف ادیان، قرآن، تفسیر، حدیث، تواریخ اسلام، ادب، مرثیہ نگاری وغیرہ پر بہت اچھی تحقیق اور وسیع نظر کے حامل ہیں۔ ان کے موضوعات بالکل منفرد اور انوکھے ہوتے ہیں۔ ان کی تقریریں سن کر یہ محسوس ہوتا ہے کہ علم کا نہ رکنے والا ایک ابلتا ہوا چشمہ ہے۔

مہدی نظمی (فرزند مولانا ظفر الحسن صاحب شاعر لکھنوی)

ضمیر اختر، وسیع النظر دانشور

ہندوستان و پاکستان ان دونوں ملکوں یا آزاد و خود مختار ان دونوں خطوں کے ادب شاعرانہ افکار اور فنون لطیفہ میں ارتقا کی جھلکیاں تو تلاش کی جاسکتی ہیں اور کی جاتا جائینگی لیکن جمہوریہ ہند میں فنون لطیفہ، شاعری اور ادب کی عمارت جس بنیاد پر قائم ہے پاکستان کا ادبی اور لسانی کاشانہ بھی اسی بنیاد پر اپنے فنی محاسن کے ساتھ بدستور قائم ہے اور اس بنیاد میں کوئی تبدیلی یا کوئی تغیر ابھی تک نہیں آیا ہے وہی غزل اور قصیدہ ہے وہی مرثیہ مثنوی اور رباعی ہے وہی افسانہ اور کہانی ہے وہی داستان ڈرامہ اور انشائیہ ہے، یہی نہیں بلکہ ہندوستان و پاکستان کے ارباب علم و دانش کے مابین میل جول کی وہی روائتیں ہیں جو اپنے رنگ میں دجلہ جیحوں کے پانیوں سے نہیں گنگا اور جمنا کے پانیوں سے ملتی ہیں، جس طرح میر اور غالب کے کلام سے فیضیاب ہونے کا قدرتی حق پاکستان کو پہنچتا ہے اسی طرح اقبال کے کلام سے لطف اندوز ہونے کا قدرتی حق ہندوستان کو بھی ہے، شاعر اور شاعری کے مابین وطنیت خصوصیت سے جارحانہ قوم پرستی کی کوئی گنجائش نہیں ہے یہ بات اس بنیاد پر کہنا پڑ رہی ہے کہ پاکستان کی تاریخ ادب مرتب کرنے والے بعض اہل قلم جن میں ضمیر اختر ایسے وسیع النظر دانشور بھی شامل ہیں اپنے تحت الشعور میں مخفی خواہشوں اور پوشیدہ تقاضوں کے تحت یہ کوشش کر رہے ہیں کہ جوش ملیح آبادی، نسیم امروہوی، آل رضا، قمر جلالوی، نجم آفندی اور ایسے ہی بہت

سے شاعروں ادیبوں اور مصنفوں کو ہندوستان کی تاریخ ادب سے توڑ لیں اور پاکستان کی تاریخ ادب میں مدغم یا ضم کردیں، بے شک بہت سے شاعر اور بہت سے ادیب بعض سیاسی حالات کے دباؤ کو انگیز نہ کرسکے اور ہندوستان سے ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے لیکن حق شہریت کی یہ سیاسی تبدیلی ان کی وطنیت کے قدرتی حق کو سلب کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکی اور ان کی وطنیت ان کے ناموں سے ان کی موت کے دن تک جدا نہیں ہوسکی جوش کی وطنیت ملیح آبادی رہی اور نسیم کی وطنیت امروہہ۔ نئی زمین میں نئے پودے ہی بار آور ہوتے ہیں، بوڑھے پیڑوں کی جڑیں نئی زمین کو نہیں پکڑتیں، سب جانتے ہیں کہ میر حسن اور میر تقی میر دہلی چھوڑ کر لکھنؤ چلے گئے امیر مینائی اور داغ حیدرآباد کی زمین کا پیوند بن گئے لیکن نہ میر حسن اور میر تقی میر لکھنوی بن سکے نہ امیر مینائی اور داغ حیدرآبادی قرار پائے اس لئے جوش، آل رضا، قمر جلالوی، نسیم امروہوی کو "پاکستانی مرثیہ گو" شعرا کی فہرست میں شامل نہیں کیا جاسکتا، ان کی مرثیہ نگاری کا شعور جتنا ہندوستانی ہے اتنا پاکستانی نہیں ہے، ان سب شاعروں کی مرثیہ نگاری ہندوستان کی آب وہوا میں پیدا ہوئی۔ یہیں اس کے بچپن اور جوانی کے دن گزرے اور یہیں رہ کر اس نے اپنا اوج اور اپنی معراج حاصل کی۔

پاکستان کے معروف محقق اور تنقید نگار ضمیر اختر نے اپنی کتاب اردو مرثیہ پاکستان میں، جن مرثیہ نگاروں کا تذکرہ کیا ہے ان کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ان سب کے تذکرے کا یہ مختصر مقالہ متحمل نہیں ہوسکتا اس کتاب کے بعض مندرجات سے جن میں Chauvinism یا جارحانہ وطن پرستی کی جھلک دکھائی دیتی ہے مجھے سخت اختلاف ہے لیکن اس کے باوجود یہ کتاب پاکستان میں مرثیہ نگاری کی نئی ترقی کا ایک اچھا اور کامیاب جائزہ پیش کرتی ہے۔

اس مقالے میں جن مرثیہ نگاروں کے بارے میں گفتگو کی گئی ہے ان میں رئیس امروہوی، سردار علی سردار ہلال نقوی، امید فاضلی اور ساحر لکھنوی شامل ہیں، یہ مرثیہ نگار بھی پاکستانی مرثیہ نگاری کے نمائندہ شاعر ہیں اور ان کی مرثیہ نگاری پر گفتگو پاکستانی مرثیہ نگاری کے مختلف پہلوؤں کا احاطہ کرنے کے لیے کافی ہے۔

ضمیر اختر نے اپنی کتاب "اردو مرثیہ نگاری پاکستان میں" صادقین کا تذکرہ نہیں کیا۔

ڈاکٹر یاور عباس کے تذکرے کے بغیر یہ مقالہ مکمل نہیں سمجھا جاسکتا، ڈاکٹر یاور عباس نے نہ صرف یہ کہ پاکستان میں مرثیہ کو زندگی اور مرثیہ نگاروں کو ذوق وشوق دیا ہے۔ بلکہ انہوں نے خود بھی کئی کامیاب مرثیے کہے ہیں ان کا ایک مرثیہ بعنوان "معرکہ حق و باطل" جدید رنگ کی مثال میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ جس میں انہوں نے امام عالی مقام کی سیرت پر تبصرہ کیا ہے ضمیر اختر کا کہنا ہے کہ اس مرثیے کے بعض مصرعے بہت ہی اچھے ہیں۔ مثلاً

نام حسینؑ صبر کی طاقت کا نام ہے
میدان کربلا ہے کسوٹی اصول کی

بہر حال اس مختصر سے مقالہ میں پاکستان کے مزید مرثیہ نگاروں کا تذکرہ ممکن نہیں ہے، آخر میں ایک بار پھر میں یہ اصرار کروں گا کہ پاکستانی مرثیہ نگاروں کے مراثی میں آہنگ بھی ہے، فصاحت بھی ہے زبان وبیان کی خوبیاں بھی ہیں تشبیہات اور استعارے بھی ہیں وہ سب کچھ ہے جو کسی بھی مرثیے میں ہونا چاہیے لیکن کوئی وجہ امتیاز نہیں ہے۔

سیّد عاشور کاظمی (لندن)

ضمیر اختر نقوی کی شرافتِ نفسی اور اعلیٰ ظرفی

پاکستان میں سید ضمیر اختر نقوی نے مرثیے پر بہت کام کیا ہے۔ اس موضوع پر ان کی بہت سی کتابیں مثلاً تاریخ مرثیہ نگاری، میر انیس (زندگی اور شاعری)، جوش ملیح آبادی کے مرثیے، شعراء اردو اور عشق علی، اردو مرثیہ پاکستان میں، خاندانِ انیس کے مرثیہ نگار، اردو ادب میں واقعہ کربلا کے تاثرات وغیرہم شائع ہو چکی ہیں۔ جدید مرثیہ کے ضمن میں انہوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ مرزا اوج نے مرثیے کو جدید نہج پر لے جانا چاہا تھا اور شاد عظیم آبادی اور اکا دکا شاعروں نے اس راستے پر چلنے کی کوشش کی۔ لیکن ان کوششوں کے باوجود مرثیہ میر انیس اور مرزا دبیر کے حصار سے باہر نہ نکل سکا تا آنکہ ۱۹۱۸ء میں جوش کا پہلا مرثیہ آوازۂ حق سامنے نہ آیا۔ ضمیر اختر نقوی کے الفاظ میں صورت حال کی وضاحت یوں ہوتی ہے۔

> ''جدید مرثیے کا آغاز لکھنؤ میں مرزا اوج کی مرثیہ نگاری سے شروع ہو چکا تھا۔ لیکن بہت کم شعراء اس طرف متوجہ ہوئے تھے، اس کے باوجود ہم اگر اس عہد کے مرثیہ نگاروں کے مرثیوں کا گہرا مطالعہ کریں تو ہم کو ایسے اشعار بھی مل جاتے ہیں جیسے دولہا صاحب عروج نے ایک مرثیے

میں کہا ہے۔

ظلمت کدے میں ہوں پہ تجلی پسند ہوں
میں ہوں عروج کیوں نہ ترقی پسند ہوں

لیکن اس دور میں مرثیے کے مقصد اور عظمت کو برقرار رکھتے ہوئے ۱۹۱۸ء میں سب سے پہلے جوش ملیح آبادی نے مرثیے کا انداز بدل دیا۔ پہلا مرثیہ "آوازۂ حق" لکھنے کے بعد ۱۹۴۲ء میں جب جوش نے "حسین اور انقلاب" لکھا تو جوش کے دوش بدوش جدید مرثیہ ہندوستان کے دوسرے شہروں میں لکھا جانے لگا۔ پٹنہ میں جمیل مظہری نے اس طرف توجہ دی لیکن جدید مرثیہ کا مرکز لکھنؤ رہا سید آل رضا، زائر سیتاپوری، نسیم امروہوی نے اس تحریک میں حصہ لیا"۔ (اردو مرثیہ پاکستان میں)

صاحبو، خطائے بزرگان گرفتن خطاست لیکن کیا کریں بن کہے بھی رہا نہیں جاتا۔ لکھنؤ مرثیہ کا مرکز تو یقیناً رہا لیکن جدید مرثیہ لکھنؤ میں کب پروان چڑھا۔ اور کب لکھنؤ جدید مرثیے کا مرکز بنا، یہ ہمارے محدود مطالعے سے باہر کی بات ہے۔ ہوسکتا ہے۔ (اور یقیناً ایسا ہوگا) کہ لکھنؤ میں جدید مرثیہ گو شعراء کے جدید مرثیے ضمیر اختر نقوی کے وسیع مطالعے کی زد میں آگئے ہوں۔ لیکن ہم ایسے عام قاری کی چشم نابینا ان تک نہ پہنچ سکی ہو۔ اس لئے کہ ہم نے تو جدید مرثیے کو لکھنؤ میں ہمیشہ مسدس کے قفس میں اسیر دیکھا۔ حتی کہ سید آل رضا نے جب اپنا مرثیہ (جو قدیم مرثیے کی حدود سے باہر نکلنے کی ایک قابل ستائش کوشش تھی) لکھنؤ میں پڑھا تو خود مسدس کہہ کر پڑھا۔ رہا سوال کہ سید آل رضا اور حضرت نسیم امروہوی کس حد تک جدید مرثیے کو آگے بڑھانے میں کامیاب ہوئے۔ اس پر گفتگو بعد میں ہوگی۔ اس وقت تو بات یہاں سے آگے بڑھائی جاتی ہے

کہ جوش کی آواز پر علامہ جمیل مظہری نے لبیک کہا اور ۱۹۳۰ء میں پہلا مرثیہ "عرفانِ عشق"، "عشق کیا ہے غم ہستی سے رہا ہو جانا" کہا۔ اس مرثیے میں جہاں غالب و اقبال کے فکری اثرات تھے وہاں جوش کے نعروں کی گونج بھی تھی اور جوش سے رجحاناتی ہم آہنگی بھی تھی۔

نجم آفندی اس دور میں اپنی نظموں اور بالخصوص نوحوں میں وہی بات کہہ رہے تھے، ان کے نوحوں میں غم والم کے ساتھ ساتھ انقلاب اور آزادی کی گونج شامل ہوگئی تھی۔ ان کے نوحوں کا مجموعہ ۱۹۳۹ء میں شائع ہوا تو جوش کی آواز کو تقویت پہنچی۔

پاکستان کے محقق سید ضمیر اختر نقوی کی کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں" کے مطابق مصنف کے رائے میں پاکستان کے حوالے سے جدید مرثیہ کے معمار درج ذیل حضرات ہیں جن پر انھوں نے مضامین بھی لکھے ہیں ا۔

جوش ملیح آبادی	پہلا مرثیہ ۱۹۱۸ء
نسیم امروہوی	پہلا مرثیہ ۱۹۲۳ء
راجہ صاحب محمود آباد	پہلا مرثیہ ۱۹۳۲ء
سید آلِ رضا	پہلا مرثیہ ۱۹۳۹ء
نجم آفندی	پہلا مرثیہ ۱۹۴۳ء

یوں تو سارے مضامین مصنف کی تحقیقی کاوش اور عقیدت و محبت کا خوبصورت امتزاج ہیں لیکن راجہ صاحب محمود آباد پر ایک قابل ذکر مضمون ضمیر اختر نقوی کی شرافت نفس اور اعلیٰ ظرفی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ راجہ صاحب محمود آباد و قیامِ پاکستان کے گنے چنے محسنوں میں تھے لیکن اُن کے ساتھ وہی سلوک کیا گیا جو تاریخِ اسلام میں محسنوں کے ساتھ روا رکھا گیا۔ لوگ رسولؐ کے اجرِ رسالت سے منحرف ہو گئے۔ راجہ

صاحب کے احسانات کا بدلہ کون دیتا۔ پاکستان کے خواص نے راجہ صاحب کو شعوری کوشش کے تحت فراموش یا نظر انداز کیا۔

کون نہیں جانتا کہ راجہ صاحب نے ہندوستان کی تحریک آزادی کے دور میں حصول پاکستان کے لئے تن من دھن سب کچھ قربان کر دیا۔ اس دور میں راجہ صاحب لکھیم پور کھیری کے ایک جلسہ عام سے خطاب کر رہے تھے کہ ایک شخص نے سوال کیا۔ "راجہ صاحب آپ جس پاکستان کی بات کر رہے ہیں وہ اگر بن گیا تو آپ کی ریاست تو اس میں شامل نہیں ہوگی۔ آپ کیا کریں گے؟" راجہ صاحب نے برجستہ جواب دیا "میں اپنی ریاست کو مسلمانوں کے لئے قربان کر دوں گا اور اپنے لئے چائے کی دکان کھول لوں گا لیکن پاکستان بن کر رہے گا"۔

ل نوٹ: عاشور کاظمی نے اپنی بات کی تردید یہاں پر خود کر دی ہے۔ یہ سب جدید مرثیے لکھنؤ میں کہے گئے اور وہیں پڑھے گئے۔ (ادارہ)

چنانچہ پاکستان بن گیا۔ اور راجہ صاحب نے سب کچھ لٹا دیا۔ پاکستان میں راجہ صاحب نے کبھی کسی چیز کا مطالبہ نہیں کیا تھا کہ بساط سیاست کے شاطروں نے انہیں یوں نظر انداز کیا کہ جیسے ان کا پاکستان کے حصول سے کوئی تعلق ہی نہ ہو۔

میں خود عینی شاہد ہوں کہ سکندر مرزا کے دور میں صدر کے مسلسل اصرار پر ایک روز راجہ صاحب صدر پاکستان سکندر مرزا سے ملنے آگئے۔ اقبال امام ان دنوں صدر کے باڈی گارڈ تھے۔ راجہ صاحب اقبال امام (ٹمن بھائی) کو پسند کرتے تھے۔ (یہ وہی اقبال امام ہیں جن کی شادی بعد میں سکندر مرزا کی صاحب زادی سے ہوئی تھی)۔

ٹمن بھائی نے راجہ صاحب کو صدر کی کار میں بٹھایا اور وکٹوریہ روڈ الفنسٹن اسٹریٹ اور صدر کراچی کی ساری متروکہ عمارتیں دکھائیں اور راجہ صاحب سے ڈرتے

ڈرتے کہا۔

"حضور آپ جس جس عمارت کو پسند فرمائیں، صدر مملکت وہ آپ کو الاٹ کرنا چاہتے ہیں"۔

راجہ صاحب نے یہ پیشکش ٹھکرا دی اور ایک عجیب بات کہی۔

"میری طرف سے مرزا صاحب کا شکریہ ادا کردیجئے اور ان سے کہیئے کہ وہ مجھے خوش کرنا چاہتے ہیں تو اس مملکتِ خداداد کی بے لوث خدمت کریں۔ حاکم بن کر نہیں بلکہ خادم بن کر"۔

یہ تھے راجہ صاحب اور ان کا کردار۔ ان کی علمی اور ادبی شخصیت اس سے جدا ہے جو اس بات کی متقاضی ہے کہ ان پر تفصیل سے لکھا جائے۔ اس کتاب کے دامن میں اتنی وسعت نہیں ہے کہ راجہ صاحب کی شخصیت اور ان کی علمی و ادبی حیثیت کا احاطہ کیا جاسکے۔ اس سلسلے میں ضمیر اختر نقوی نے اپنی مذکورہ بالا کتاب میں اور ضیاء الحسن موسوی نے "ایک تھا راجہ" میں کسی حد تک یہ حق ادا کر چکے ہیں، اس کے باوجود

حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

راجہ صاحب کے ایک مرثیے کا عنوان "پانی" ہے اس موضوع پر راجہ صاحب سے پہلے کوئی مرثیہ نہیں ملتا۔ اُن کے بعد ۱۹۷۱ء میں جوش نے اور ۱۹۷۲ء میں نسیم امروہوی نے مرثیے کہے۔ جوش بہرحال جوش ہیں۔ نسیم امروہوی کی قادر الکلامی بھی مسلّم ہے۔ لیکن راجہ صاحب نے جس خوبصورتی سے پانی، بادل، خشک زمین، رواں دواں نہریں، بہتے دریا، مہکتے پھول، لہلہاتے چمن، زندگی کی تب و تاب اور پانی، ساری علامات و استعارات کا استعمال کیا ہے وہ اپنی جگہ منفرد ہے۔

ضمیر اختر نقوی نے اس مرثیے کے تناظر میں جوش اور نسیم امروہوی کے اسی

موضوع پر مرثیوں کا حوالہ دیتے ہوئے راجہ صاحب کے مرثیے کو منفرد قرار دیا ہے۔'' اردو مرثیہ'' میں علی عباس حسینی نے کہا ہے کہ اگر مرثیے سے الگ کر کے اس نظم کو دیکھا جائے تو اس موضوع پر ایک حسین نظم تسلیم کی جا سکتی ہے۔ بقول ضمیر اختر نقوی۔

'' اس مرثیے میں راجہ صاحب محمود آباد نے موضوع کے ربط کے ساتھ واقعہ کربلا کی طرف اس طرح گریز کیا ہے۔ بالفاظ دیگر گریز کی چابک دستی نے اسے مرثیہ بنا دیا''۔

مقام افسوس ہے کہ ابھی تک راجہ صاحب کے مرثیے شائع نہیں ہوئے۔ تاریخ کا کتنا بڑا المیہ ہے کہ سیاست دانوں نے انہیں نظر انداز کیا۔ اہل ادب نے انہیں نظر انداز کیا۔ اور سب سے بڑا ظلم یہ کہ ان کی اپنی قوم نے انہیں نظر انداز کیا۔ جن حضرات نے راجہ صاحب کے سارے مرثیوں کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کے مراثی، مرثیوں کی تاریخ میں بھی ایک خوشگوار اضافہ کرتے ہیں اور اردو ادب کی کائنات میں بھی پاکستان میں اردو مرثیہ کا ایک ماحول بن چکا ہے۔ کیا ضمیر اختر نقوی، ڈاکٹر ہلال نقوی، یا کوئی اور اہل فکر و نظر اس طرف متوجہ ہوگا۔

ضمیر اختر صاحب نے راجہ صاحب کو جو خراج عقیدت پیش کیا ہے وہ میری ہی نہیں ہر درد مند دل کی آواز ہے لیکن جب جدید مرثیے کے معماروں کی بات آتی ہے تو بات عدل و انصاف کی سرحدوں میں داخل ہو جاتی ہے۔ مجھے یقین ہے ضمیر اختر صاحب بھی اس سے اتفاق کریں گے کہ عدل و انصاف میں عقیدت، محبت یا نفرت کا گزر ممکن نہیں۔

ان کی قدرت کلام، سلاست، روانی، استعارات کا استعمال، جدید علوم کی چاشنی، فکر کی ضیا پاشی سب کچھ ناقابل تردید ہے مگر یہ بھی غلط نہیں کہ ان کا میدان سیاست تھا،

شاعری نہیں۔ شاید یہی سبب تھا کہ انہوں نے اپنی حیات میں کبھی اپنے مراثی شائع کرانے کی طرف توجہ نہیں دی، ورنہ تو یا مران کی زندگی میں محال نہیں تھا۔

مرثیہ کے افق پر پاکستان اور کراچی کے حوالے سے ایک ماوِ متور کا نام بھی نظر انداز نہیں کیا جاسکتا اور وہ ہے سید آلِ رضا کا نام نامی۔ آلِ رضا نے پہلا مرثیہ ۱۹۳۳ء میں کہا تھا جو روایتی مرثیے کے مروجہ اصولوں سے ہٹ کر تھا، یہ وہی دور تھا جب جوش، جمیل مظہری اور نجم آفندی کا طوطی بول رہا تھا، آزادی کی تحریک دن بدن تیز ہورہی تھی، دلوں میں انقلاب کی امنگیں چہروں پر نور بن کر چمکنے لگی تھی اور حسینؑ اس متوقع انقلاب کے ہیرو تھے۔ آلِ رضا نے خود تسلیم کیا ہے کہ وہ نجم آفندی سے بہت متاثر تھے، ڈاکٹر ہلال نقوی نے وحید الحسن ہاشمی اور ضمیر اختر نقوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ:۔

"وہ نجم صاحب کی شاعری سے بہت متاثر تھے اور فرمایا کرتے تھے کہ اگر نجم آفندی کے نوحے نہ ہوتے تو میں جدید مرثیہ نہ کہہ سکتا"۔

(بیسویں صدی اور جدید مرثیہ)

بہ حوالہ "مرثیہ نظم کی اصناف میں، جدید مرثیہ اور آغا سکندر مہدی"

(لندن ۳۰، اکتوبر ۱۹۹۴ء)

ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی (ایم۔ اے، پی ایچ۔ ڈی)

علامہ ضمیر اختر نقوی کے متعلق جن قابلِ ذکر چوٹی کے مشاہیر نے اظہار خیال کیا ہے ان کی صفوں میں شامل ہونے کی جرأت کرنا گویا بڑھیا کا سوت کی انٹی لاکر یوسفؑ کے خریداروں میں شامل ہونا ہے۔

محسن اختر نقوی (ہالینڈ)

جامع اور تفصیلی کتاب

تمہارا خط اور کتاب "اُردو مرثیہ پاکستان میں" ملی، کتاب بہت عمدہ ہے۔ اتنی جامع اور تفصیلی کتاب شاید اس موضوع پر اور اُردو انتقادیات میں ابھی تک نہ ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں کہ تنقید نگاری میں یہ ایک گراں قدر اضافہ ہے۔ تصویریں بہت قیمتی ہیں شعرائے اُردو کی اتنی بہت سی تصاویر پہلی مرتبہ ایک جگہ جمع کی گئی ہیں۔

تمہاری محنت کتاب کی ایک ایک سطر سے ظاہر ہے البتہ قیمت بہت کم رکھی گئی ہے۔ سو روپے ہونی چاہیے تھی۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر کاظم علی خاں (شیعہ کالج لکھنؤ)

لائقِ صد تحسین

آپ نے ادبی میدان میں اتنی کم عمر میں جو کچھ کیا ہے، وہ لائقِ صد تحسین ہے

(ضمیر اختر کے نام ایک خط سے اقتباس)

ڈاکٹر مقام حسین جعفری (ایم۔اے، پی ایچ۔ڈی)

ضمیر اختر کی ریاضت

سید ضمیر اختر نقوی ایک باصلاحیت نوجوان ہیں جن سے اُردو ادب اور قوم کو بہت سی اُمیدیں وابستہ ہیں۔ صاحب موصوف انیسؔ اور مرثیے کے شیدائی ہیں۔ اس موضوع پر ان کی متعدد کتابیں شائع ہو کر برصغیر ہندو پاکستان کے محققین اور ناقدین سے خراج تحسین وصول کر چکی ہیں۔

کتاب ''اُردو مرثیہ پاکستان میں'' ۱۹۸۲ء میں شائع ہوئی۔اس کا سرورق بھی نہایت دیدہ زیب ہے اور اس کی کتابت بھی خوب ہے۔اس کتاب میں مرثیہ، اس کے ارتقا، پاکستان کے مشہور مرثیہ نگاروں کے حالات پر سیر حاصل تبصرہ کیا گیا ہے۔جس کے مطالعے کے بعد ضمیر اختر کی ریاضت، دیدہ ریزی اور ژرف نگاہی کا قائل ہونا پڑتا ہے۔مرثیہ نگاروں پر تنقید کرتے وقت انھوں نے اسے ملحوظِ خاطر رکھا کہ ہر مرثیہ نگار کی بنیادی خصوصیات اجاگر کی جائیں۔تنقید کا یہ پہلو بڑی اہمیت کا حامل ہے اور مجھے خوشی ہے کہ ضمیر اختر اس سے بخوبی عہدہ برآ ہوئے۔اس کتاب کے آخر میں جدید مرثیہ نگاروں کے سلسلۂ شاعری کے شجرے جدید مرثیوں کی فہرست، ہندوستان کے جدید مرثیے، اُردو مرثیے پر کام کرنے والوں کے لیے نہایت کارآمد ثابت ہوں گے۔

ضمیر اختر نقوی کی کتاب مرثیہ نگاری اُردو ادب میں ایک اہم اضافہ ہے جس سے اہلِ ذوق بقدرِ لب و دنداں مستفید ہوتے رہیں گے۔ اس کتاب کی افادیت میں انشاء اللہ روز بروز اضافہ ہوتا رہے گا۔

سیّد مصحف رضا نقوی

(رائے بریلی، یوپی، بھارت) ۳؍جنوری ۱۹۹۹ء

مائی ڈیئر بھائی ضمیر سلام شوق قبول ہو۔ امید ہے کہ خیرت سے ہوں گے۔ ظہیر چچا کی خدمت میں میرا آداب پہنچا دینا۔ ختم ہوتی ہوئی روایات، وضع داریوں اور تہذیب کے ازلی گواہ ہیں۔ اللہ ان کی عمر دراز کرے اور ان کا سایہ ہم سب پر برقرار رکھے۔ ایمن کے ہاتھ جو کتاب تم نے روانہ کی تھی وہ مجھ کو پونے دو ماہ بعد انھوں نے دی یعنی "خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا"۔ اس کتاب کے بھیجنے کا بہت بہت شکریہ۔ خط لکھنے کا عادی اب نہیں رہ گیا ہوں اس لئے کہ اس قدر یادیں دل و دماغ پر چھا جاتی ہیں کہ کہاں تک لکھتا رہوں۔ تم سے تقریباً ۲۵ سال بعد تفصیلی ملاقات ہوئی۔ تمہارے کام تم کو تمہاری زندگی میں ہی منفرد کر رہے ہیں۔ اللہ تمہارے کام یعنی تحریر و تقریر میں اور جلا بخشے۔ ادب، تحقیق، تاریخ میں تم بہت گہرائی تک اتر چکے ہو۔ بڑی بڑی Universities اور Academies وہ کام نہیں کر پا رہی ہیں جو تم تنہا انجام دے رہے ہو۔

محرم ۱۴۱۹ھ کا عشرہ پڑھنے کے بعد مولانا ممتاز علی صاحب کراچی سے واپس لکھنؤ آئے تو ان کی زبانی بھی تمہاری مصروفیات کا علم ہوا۔ خوشی اس بات کی ہے کہ تم نے اپنے آپ کو ایک ایسے رستے پر ڈال دیا ہے جو اپنے وقت کا بہترین مصرف ہے۔ صبح و شام چہاردہ معصومین کی زندگیوں کے حوالے سے جو کام انجام پا رہے ہیں وہ اس مادہ پرستی کے دور میں تمہاری شرافت، نجابت اور آلِ محمدؐ سے والہانہ لگاؤ کا آئینہ دار ہے۔

مولانا ممتاز صاحب نے کراچی کی واپسی پر "القلم" کی ایک کاپی دلوائی تھی۔ ماشاء اللہ بہت معیاری رسالہ ہے۔ پڑھنے کے بعد دل و دماغ روشن ہو جاتا ہے۔ خداوند عالم تم کو خوب لمبی عمر عطا کرے اور تمہارے ذوق و شوق میں بہ روز اضافہ ہوتا رہے۔ تشنگانِ علم و معرفت کے لئے تمہاری ذات ایک سرچشمے سے کم نہیں ہے۔ تمہارے حوصلوں کو بلندی عطا ہو صدقے میں پنجتن کے۔

ڈاکٹر ظفر اقبال (شعبۂ اردو، کراچی یونیورسٹی)

تحقیق و تنقید کا حسین امتزاج

معاصرانہ واقعات، علوم و افکار اور شخصیات کی تحقیق میں ہمارے محققین قدرے تن آسانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ عموماً سنی سنائی باتوں اور خط و کتابت کی روایت پر بھروسا کرنا ایک وتیرہ بنتا جارہا ہے۔ اس ذیل میں عام محقق اور ناقد ہی نہیں بلکہ "بزعم خویش" محققین گرامی بھی شریک ہیں۔ گزشتہ اور قدیم ادوار کی چھان پھٹک میں جتنا وقت صرف کیا جاتا ہے۔ اگر اتنا ہی وقت معاصر شخصیات کے فکر و فن پر صرف کیا جائے تو تحقیق و تنقید، دونوں کا پایۂ اعتبار بلند ہو جائے۔ معاصرین کے فن اور شخصیت پر لکھنے کا باقاعدہ آغاز مالک رام نے کیا۔ ان کی تحریر کردہ "تذکرۂ المعاصرین" کی کئی مجلدات اس کی گواہ ہیں، لیکن انھوں نے بھی حصول معلومات کے لیے ثانوی ماخذ پر انحصار کیا ہے۔

ضمیر اختر نقوی کی کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں" دیکھی اور پھر پڑھی تو طبیعت باغ باغ اور دماغ روشن ہو گیا۔ دراصل تحقیق بڑے جان جوکھم کا کام ہے اور تنقید میں پتّا بہت مارنا پڑتا ہے تب کہیں جا کر کوئی سلیقے کی کتاب لکھی جاتی ہے۔ ضمیر اختر کی کتاب تحقیق و تنقید کا حسین امتزاج ہے۔ ایک سو سولہ (۱۱۶) مرثیہ گو شعرا کے احوال و آثار کو اس درجہ بلیغ پیرائے میں بیان کرنا انھی کا حصہ ہے۔ پھر انھوں نے اظہار بیان

کے لیے جو اسلوب اختیار کیا ہے، وہ نہ تو شاعرانہ ہے اور نہ خطیبانہ، نہ شوخ ہے اور نہ بے حد عالمانہ، ان سب کے بین بین ہے۔ اسلوب کی اس شگفتگی نے کتاب کی نثر میں ثقل پیدا نہیں ہونے دیا ہے بلکہ ایسی روانی اور سلاست کے پھول پروئے ہیں کہ جن کی خوشبو سے سطور قابلِ مطالعہ اور بین السطور باعثِ خرد افروز ہیں۔ گویہ کتاب تذکرے کے انداز پر مرتب کی گئی ہے لیکن اس میں تذکروں کے تمام عیوب ساقط اور تمام محاسن موجود ہیں۔ پاکستان میں اُردو مرثیہ پر ایسی جامع اور کامل کتاب اس امر کا بین ثبوت ہے کہ مرثیہ انیسؔ و دبیرؔ کے ساتھ ہی ختم نہیں ہوگیا، بعد کے شعرا نے اس کی معنوی وسعت میں نہ صرف خاطر خواہ اضافہ کیا ہے بلکہ فکرِ جدید، عصرِ حاضر کے تقاضوں کو نت نئے عنوانات کے تحت رثائی ادب میں ضم کرنے کا شعور بھی رکھتی ہے۔

انشاءاللہ! ضمیر اختری یہ کتاب حوالے کی معتبر کتب میں شمار ہوگی۔ خدا انھیں قائم الدوام رکھے، آمین!

حسن عباس نقوی ایڈیشنل ڈپٹی کمشنر میانوالی کے ایک خط سے اقتباس

۲۸ دسمبر ۸۰ء

آپ کی مرتب کردہ کتاب "جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے" پڑھی۔ آپ نے واقعی کمال کردیا اور ایسے نایاب مرثیے اتنی خوبصورتی سے شائع کرادیے کہ یہ کام آپ کے علاوہ اور کوئی نہیں کرسکتا تھا۔ اب خدا کرے حضرت جوشؔ کے وہ مرثیے بھی آپ کو دستیاب ہوجائیں جن کا حوالہ آپ نے یہاں دیا ہے۔

"اُردو مرثیہ پاکستان میں"

مسٹر ورنن جیمز شوبل (اسکالر)
ورجینیا یونیورسٹی امریکہ کی نظر میں

I Came to Karachi in 1983 in order to do docotoral research on the subject of Azadari in Pakistan. I found Zamir Akhtar's book, Urdu Marthiyah Pakistan mei to be a most helpful and valuable tool in that research. I have made particular use of the chapter on Azadari in Karachi. I found it useful both as asource of information and as focus for developing directions of inquiry into this important religious and cultural phenomenon.

Mr. Akhtar's book should be seen as a welcome addition to the literature on this subject, both by those whose interest is in the History of Religions and those who are interested in the History of Urdu literature.

Vernon James Schubel
University of Virginia
(America)

"اُردو مرثیہ پاکستان میں"

مسٹر ورنن جیمز شوبل (اسکالر)

ورجینیا یونیورسٹی امریکہ کی نظر میں

"پاکستان میں عزاداری" کے موضوع پر اپنا تحقیقی مقالہ مکمل کرنے کی غرض سے میں ۱۹۸۳ء میں وارد کراچی ہوا میں نے یہاں آکر ضمیر اختر نقوی صاحب کی کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں" پڑھی اور اس کتاب کو میں نے اپنے کام کے لئے بے حد مفید پایا۔ اپنے پی ایچ ڈی کے مقالے کے سلسلے میں ضمیر اختر نقوی کی کتاب میں "کراچی کی عزاداری" کے موضوع پر جو باب ہے اس باب سے میں نے خاص طور پر استفادہ کیا ہے۔ میں نے اسے ایک قابل اعتماد ذریعہ معلومات نیز اس سانحۂ عظیم کے اہم مذہبی اور ثقافتی پہلوؤں پر تحقیقی نظر ڈالنے کے لئے مفید طلب پایا۔ جناب ضمیر اختر نقوی کی یہ کتاب رثائی ادب میں ایک اہم اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اہم تصنیف ان کے لئے بھی مفید و گراں قدر ہے جو تاریخ مذہبیات سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ان کے لئے بھی جن کی دلچسپی تاریخ ادب اردو کے مطالعہ تک محدود ہے۔

ورنن جیمز شوبل

ورجینیا یونیورسٹی امریکہ۔

۲۵۷
شعرائے اُردُو
اور
عشقِ علیؑ
ضمیر اختر نقوی

ڈاکٹر کاظم علی خاں (لکھنؤ)

یادگار صحیفہ

پاکستان کے خوش بیان نوجوان خطیب، ادیب، ناقد و محقق عزیزی ضمیر اختر نقوی جواپنی پُر مغز و موثر تقریروں اور عالمانہ تحریروں کی بدولت نہ صرف ہندوستان و پاکستان بلکہ انگلستان اور امریکہ سمیت دوسرے اور ملکوں میں بھی ایک ممتاز و نمایاں مقام اور نام حاصل کر چکے ہیں۔ شیعہ کالج لکھنؤ کے اُن باصلاحیت سابق طالب علموں میں ہیں جن پر یہ ادارہ بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔ ضمیر اختر نقوی کے تیز رفتار قلم نے اُردو کے علمی و ادبی سرمائے میں اب تک متعدد یادگار کتابوں کا اضافہ کیا ہے۔ اُن کا شمار ہندو پاک کے کامیاب، مشہور اور مقبول ذاکروں میں ہوتا ہے۔ علمی و ادبی موضوعات کے ساتھ ساتھ وہ اسلامی تاریخ پر بھی وسیع و عمیق نظر رکھتے ہیں۔ تصنیف و تالیف سے بے پناہ شغف کی بدولت اب تک اُن کی یادگار کتابیں چند زیرِ طبع ہیں جو شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ اُن میں قابلِ ذکر یہ ہیں:

(۱) اُردو مرثیہ پاکستان میں (۲) اردو غزل اور کربلا
(۳) جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے (۴) میر انیسؔ حیات اور شاعری
(۵) تاریخ مرثیہ نگاری (۶) خاندان میر انیسؔ کے نامور شعرا
(۷) دبستان تاریخ

عزیزی ضمیر اختر نقوی جو شیعہ کالج لکھنؤ میں میرے شاگرد رہے ہیں اپنی طالب

علمی کے دور ہی سے تحریر و تقریر کا بو اصاف ستھرا اور گہرا شغف رکھتے ہیں۔ اُن کی تازہ ترین و ضخیم زیر طبع کتاب "شعرائے اُردو اور عشق علی کتابت شدہ اوراق کی صورت میں جب میرے مطالعے میں آئی تو میری زبان سے بے اختیار یہ دعا نکلی: "اے وقت تو خوش کہ وقت ما خوش کردی۔۔!"

یہ ضخیم و فکر انگیز کتاب جو عزیزی ضمیر اختر نقوی کے ایسے کامیاب خطیب و ادیب کی مذہبی، ادبی اور علمی کاوشوں کے ایک یادگار اور سدا بہار صحیفے کی حیثیت رکھتی ہے اپنے دامن میں مذہب اور ادب سے شغف رکھنے والے قارئین کے لئے تلاش و تحقیق کا ایسا دلچسپ و مفید ساز و سامان رکھتی ہے جس کی بدولت یہ مذہبی، علمی اور ادبی حلقوں میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کرے گی۔ اس کتاب میں اس کے باصلاحیت مصنف نے اُردو کے بہت سے مشہور و معروف شاعروں کے احوال اور ادبی آثار کو اپنے موضوع کے دائرے میں رہتے ہوئے نہایت خوش اسلوبی سے پیش کیا ہے۔ اس کتاب میں درج ذیل شاعروں کا نام و کلام شامل ہے:

میرؔ، سوداؔ، نظیرؔ، سوزؔ، میر حسنؔ، مصحفیؔ، جراتؔ، انشاءؔ، ممنونؔ، غالبؔ، ذوقؔ، مومنؔ، ظفرؔ، ظہیر دہلوی، ناسخؔ، آتشؔ، واجد علی شاہ اخترؔ، امیرؔ لکھنوی، رندؔ لکھنوی، نظمؔ طباطبائی، ذاکر حسین یاسؔ لکھنوی، ریاضؔ خیرآبادی، مولانا حسرتؔ موہانی، آرزوؔ لکھنوی، صفیؔ لکھنوی، عزیزؔ لکھنوی، بیخودؔ موہانی (سابق اُستاد اُردو شیعہ کالج لکھنؤ) اور کاظم حسین محشرؔ لکھنوی۔

اس کتاب میں دکن کے شعری سرمائے اور عہد حاضر کی شاعری کو شامل نہیں کیا گیا ہے شاید یہ موضوعات نقش ثانی کے لئے چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ یہ کتاب موضوع اور مواد کے اعتبار سے اپنے دامن میں ایسے متعدد گوشے رکھتی ہے جو ایک ایسے گرما گرم

علمی مباحثے کا موضوع بن سکتے ہیں جس میں قارئین مصنف سے اتفاق کے ساتھ ساتھ اختلاف بھی کر سکتے ہیں۔ کسی کامیاب کتاب کی شہرت اور مقبولیت کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ اس کا سواد کس حد تک علمی اور ادبی حلقوں کے لئے بحث اور مباحثے کے دروازے کھولتا ہے۔ اور ضمیر اختر نقوی سلمہٗ کی یہ کتاب اس اعتبار سے بھی شہرت حاصل کرے گی۔

مجھے امید ہے کہ ضمیر اختر نقوی آئندہ بھی اپنی علمی اور ادبی سرگرمیوں سے اُردو کے ادبی سرمائے میں اضافے کرتے رہیں گے۔ میری دلی دعائیں اس کام میں اُن کے ساتھ ہیں۔

نور علی نور:

علامہ ضمیر اختر نقوی کا مرثیہ ”نقوشِ معجزات“

معجزے کے تمام فلسفے کو ڈاکٹر علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب نے جس علمی خوبصورتی سے اپنے مرثیہ میں نظم کیا ہے وہ اپنی جگہ معجزے کا درجہ رکھتا ہے۔

علامہ صاحب کی تقریر و تحریر میں کائناتی سچائیاں جس الہامی انداز میں بیان ہوتی ہیں اُن پر اکثر شاعری کا گمان گزرتا ہے، اور اب جب علامہ صاحب کی شاعری پیشِ نگاہ ہے تو عقل حیران ہے کہ اسے کیا کہا جائے۔ یعنی جس کی تحریر و تقریر شاعری ہو اس کی شاعری کیا ہوگی۔ میں اپنی کوتاہ علمی کا اعتراف کرتے ہوئے ڈاکٹر علامہ ضمیر اختر قبلہ کی معجزنما شخصیت کا ممنون ہوں کہ جنھوں نے اپنی تحریر، تقریر اور شاعری کے ہر ہر حوالے سے شعورِ انسانی کو علم کی ایک ایسی صبح عنایت کی ہے جس کی روشنی نورِ آلِ محمدؐ سے مشتق ہے۔

سیّد ہاشم رضا

شگفتہ طرزِ تحریر اور وسیع مطالعہ

ایک عاشقِ مولائے کائنات کا شعر ہے:-

دو علی مولا ہیں میرے، ایک خالق، اک امام
اک خدائی کے لیے، اک ناخدائی کے لیے

میں سیّد ضمیر اختر نقوی صاحب کو مبارک باد دیتا ہوں کہ انھوں نے اپنی تصنیف "شعرائے اُردو اور عشقِ علی" میں لاتعداد عاشقانِ امیرالمومنینؑ کے اشعار درج کیے ہیں۔ ان میں اُردو کے علاوہ عربی اور فارسی کے مقتدر شعرا کے اشعار بھی شامل کیے ہیں۔ انھوں نے ایک ایسا ادبی دسترخوان بچھا دیا ہے جس کے ہر کونے پر "کرشمۂ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جا" والی بات ہے۔ انھوں نے اپنے کینوس کو اتنا وسیع کیا ہے کہ اگر اسے شعرائے عالم اور عشقِ علی کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا۔

۸ر نومبر ۱۹۹۳ء کو جب وہ میرے غریب خانے پر تشریف لائے تو انھوں نے از راہِ کرم اس تصنیف کے علاوہ اپنی مندرجہ ذیل تصانیف عطا فرمائیں۔

۱۔ اُردو غزل اور کربلا

۲۔ شہید علمائے حق

۳۔ ائمۂ اثنا عشر

۴۔ علامہ رشید ترابی مرحوم کی دس مجالس کا مجموعہ پانچ جلدوں میں ''علم معصوم'' ''قیامت اور قرآن'' اور ''کتاب حکمت اور ملک عظیم'' کے عنوان پر۔

۵۔ سید حسین شرف الدین شاہ ولایت کے حالات و کمالات۔

میں حیرت میں پڑ گیا کہ انھیں اتنی گراں بہا کتابیں لکھنے کا وقت اور حوصلہ کیسے ملا جن کے پڑھنے اور سمجھنے کے لیے بڑی دل جمعی اور وقت درکار ہے۔ ان کی تقریروں کی دھوم پاکستان اور ہندوستان، دونوں ملکوں میں ہے۔ ان کا طرزِ تحریر بہت شگفتہ ہے، ان کا مطالعہ بڑا وسیع ہے۔ وہ اپنے مطالب عام فہم زبان میں بیان کرتے ہیں۔ وہ عشقِ محمدؐ و آلِ محمدؐ سے سرشار ہیں۔ ان کا یہ دعویٰ بجا ہے کہ ''اس دورِ ناسپاس و محروم سماعت میں علیؑ کا تذکرہ ہر حساس اہلِ نظر کا فرض بھی ہے اور ضرورت بھی، اور یہی جذبہ، یہی ارادت، یہی معرفت، یہی محبت اور یہی عشقِ علیؑ میرا سرمایۂ حیات اور ایماں ہے''۔ میری دعا ہے کہ جس کسی کو ان کی تصانیف پڑھنے کی سعادت حاصل ہو، وہ بھی اسی جذبے، اسی ارادت، اسی معرفت اور عشقِ علیؑ سے مالا مال ہو جائے۔

۱۹۳۳ء میں، میں جب آکسفورڈ میں طالب علم تھا، میری ملاقات ایک پارسی طالب علم سے ہوئی جس کا نام D.F KARAKA تھا۔ وہ بڑے اچھے مقرر تھے، اور اسی سبب سے انھیں آکسفورڈ یونین کا صدر منتخب کیا گیا۔ وہ پہلے ایشیائی تھے جنھیں یہ اعزاز حاصل ہوا۔ ان سے پہلے بندرا نائکے جیسے، جو سیلون کے وزیر اعظم بنے، طالب علم اس عہدے کے لیے منتخب نہ ہو سکے۔ D.F KARAKA کا ایک مضمون بعنوان "I GO TO ALI" ہندوستان کے "ILLUSTRATED WEEKLY OF INDIA" میں شائع ہوا۔ یہ وہ خوش نصیب تھے جنھیں جناب

امیرؑ کی زیارت خواب میں ہوئی اور ان کی عقیدت اتنی بڑھی کہ وہ نجف اشرف پہنچے اور جناب امیرؑ کی قبرِ مطہر پر زیارت میں شامل ہوئے۔ نجف اشرف سے واپسی کے بعد وہ دن میں متعدد مرتبہ یا علیؑ کہتے تھے اور جب ایک دن ان کی ماں نے پوچھا "بیٹے! یہ کون ہیں جن کا نام تم بار بار دہراتے ہو؟" تو انھوں نے جواب دیا، "یہ بہت بڑے آدمی تھے جو میری ہر مصیبت میں میرے کام آتے ہیں"۔ ماں نے کہا، "تو پھر یہی نام دہراتے رہو"۔

اہل سنت والجماعت میں کچھ حضرات ہیں جنھیں تفضیلیا کہا جاتا ہے۔ یہ حضرات جناب امیرؑ کو ان کے پیش رو تین خلفا سے افضل سمجھتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی مرحوم جب کراچی تشریف لائے تو میرے غریب خانے پر آئے۔ انھوں نے کہا کہ ایک دن حضور نظام نے بھرے دربار میں مجھ سے پوچھا، "آپ تفضیلیے ہیں؟" میرا جواب اثبات میں تھا۔ نظام مرحوم، عثمان علی خاں نے پوچھا، "تو پھر سقیفہ بنی ساعدہ میں جو دو ورجن مہاجر اور انصار جمع ہوئے تھے، انھوں نے جناب امیرؑ کو خلیفہ کیوں نہ منتخب کیا؟" خواجہ صاحب کا جواب تھا۔

"حضور نے میری رائے پوچھی تھی جو میں نے کم وکاست عرض کردی۔ میں ان بزرگ حضرات کے بارے میں کیا کہوں جنھوں نے حضرت علیؑ کو پہلا خلیفہ منتخب نہیں کیا، لیکن اگر میں اس وقت حاضر ہوتا تو میں جناب امیرؑ کا نام پیش کرتا"۔ نظام مرحوم نے پوچھا، "پہلے خلیفہ تو درکنار، جناب امیرؑ دوسرے تیسرے خلیفہ بھی نہ بنے، وہ چوتھے نمبر پر آئے"۔ خواجہ صاحب کا جواب تھا، "ہمارے رسولؐ سب سے افضل تھے، حالانکہ وہ پہلے رسولؐ نہ تھے۔ وہ حضرت آدمؑ، حضرت نوحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت موسیٰؑ، حضرت عیسیٰؑ کے بعد چھٹے نمبر پر آئے، لیکن کیا وہ ان سب نبیوں سے افضل نہ

تھے؟" نظام مرحوم اس جواب سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے خواجہ صاحب کو گلے لگالیا، وہ خود تفضیلیے تھے۔

مجھے یقین ہے کہ ضمیر اختر صاحب کی تصانیف پڑھ کر بہت سے حضرات میر عثمان علی خاں اور D.F. KARAKA کی طرح عاشقِ امیرؑ بن جائیں گے۔ میں ضمیر اختر نقوی سے کہتا ہوں کہ ماشاءاللہ! سبحان اللہ! جزاک اللہ!

☆☆☆

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

ضمیر اختر نقوی ایک اچھے محقق اور ہونہار تنقید نگار کے علاوہ ذاکر آلِ محمد بھی ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں جب لکھنؤ آئے تھے تو یہاں کے سخن فہم حضرات اور ناقدین کے علاوہ پڑھے لکھے لوگوں کا خاصا مجمع ان کی مجلس ہمہ تن گوش ہو کر سنتا تھا۔ مجلس کیا پڑھتے ہیں، گویا منبر پر جادو جگا رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے انھیں اعلیٰ اور روشن دماغ سے سرفراز کیا ہے۔ ان میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو کسی ذہین، مشاق اور جینیئس انسان میں ہونا چاہئیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کے دماغ میں وہ نادر و نایاب چیزیں محفوظ ہیں جن سے وقتاً فوقتاً ہم دور افتادگان بھی فیض یاب ہوتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل احمد رضوی

اُردو ادب کے علمی ذخیرے میں قابلِ قدر اضافہ

""شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ"" کتاب کے مصنف علامہ ضمیر اختر نقوی وطنِ عزیز کے معروف خطیب، ادیب اور مورخ ہیں۔ خطابت کے ساتھ ساتھ ان کا قلم کے ساتھ بھی گہرا رشتہ ہے۔ اُردو شاعری میں ""تاریخِ مرثیہ"" ان کا خاص میدان ہے۔ اس میں ان کو تخصص حاصل ہے۔

زیرِ حوالہ کتاب ایک ضخیم دستاویز ہے، جس میں حضرت علی علیہ السلام کی منقبت گوئی کے گلدستے کو خوب صورت انداز میں سجایا گیا ہے۔ اس میں ایسے خوش نما پھول جمع کیے گئے ہیں، جن کی رنگارنگی اور بوقلمونی دیکھنے والے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ ان کی خوشبو کے اثرات سے اثر لینے والا اپنے قلب و روح میں فرحت و انبساط اور تزکیہ و طہارت کی کیفیات کو محسوس کرتا ہے۔

اگر کتاب کی فہرستِ مضامین پر نظر ڈالی جائے تو ہمیں یہ تفصیل نظر آتی ہے۔ اس کے سات ابواب میں۔ پہلے باب کا عنوان ""قرآن میں حضرت علیؑ کے فضائل اور منقبت کے محرکات"" ہے دوسرے باب میں عربی شاعری اور مدحتِ علیؑ کو زیرِ بحث لایا گیا ہے۔ تیسرے باب کا موضوع فارسی شاعری اور ثنائے علیؑ ہے۔ چوتھا باب اُردو

منقبت نگاری کے ارتقا پر مشتمل ہے۔ اس کے ذیلی عنوانات یہ ہیں: منقبت نگاری ارتقا حیدر آباد سے لکھنؤ تک، دکنی زبان میں منقبت نگاری، دہلوی منقبت نگاری کا، غالب کی فارسی منقبت نگاری، لکھنؤ کا تمدن اور مذہب، دبستان لکھنؤ کی منقبت نگاری۔

پانچواں باب شعرائے اردو اور عشق علی کا احاطہ کرتا ہے۔ شعرا کے نام یہ ہیں:۔

امیر خسرو، محمد قلی قطب شاہ، ولی، میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، نظیر اکبر آبادی، میر سوز، قائم چاند پوری، شیخ غلام ہمدانی مصحفی، شیخ قلندر بخش جرأت، انشاء اللہ خاں انشا، ممنون دہلوی، مرزا اسد اللہ خاں غالب، شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی، مومن خاں مومن دہلوی، بہادر شاہ ظفر دہلوی، شیخ امام بخش ناسخ، خواجہ حیدر علی آتش، واجد علی شاہ اختر، امیر لکھنوی، برق لکھنوی، رشک لکھنوی، بحر لکھنوی، منیر شکوہ آبادی، قلق لکھنوی، صبا لکھنو ی، امانت لکھنوی، رند لکھنوی، نظم طباطبائی، میرزا ذاکر حسین یاس لکھنوی، ریاض خیر آبادی، حسرت موہانی، آرزو لکھنوی، صفی لکھنوی، ثاقب لکھنوی، عزیز لکھنوی، بے خود موہانی اور محشر لکھنوی۔ چھٹا باب اردو مرثیہ نگار شعرا اور مدحت علی کے مباحث کا احاطہ کرتا ہے۔ اس کے بعد خصوصی باب میر انیس اور حضرت علی کی مدحت کے بارے میں ہے۔ ساتویں باب کا عنوان "عہد جدید میں عشق علی کی مثالیں" ہے۔ اس میں جن شعرا کو شامل کیا گیا ہے، ان کے نام یہ ہیں:۔

خواجہ الطاف حسین حالی، میر مہدی مجروح، اکبر الہ آبادی، صفیر بلگرامی، شاد عظیم آبادی، علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی۔ آخر میں کتابیات ہے جو ۲۸۳ کتب پر مشتمل ہے۔

اس کتاب کو اردو میں مدحت علی علیہ السلام کے ایک ایسے دائرۃ المعارف (ENCYCLOPAEDIA) سے تشبیہ دی جا سکتی ہے جس کے مباحث جامعیت کے ساتھ کثیر البحث بھی ہوں۔ پیرایہ بیان میں کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی

زبان کا استعمال ابلاغ کی اثر آفرینی کو بڑھا دیتا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نہ صرف اُردو ادب اور شاعری کے بہت سے نئے گوشوں کو سامنے لاتی ہے، بلکہ اس کو عصرِ حاضر میں شائع ہونے والا اُردو شعرا کا ایک ایسا گراں قدر تذکرہ کہا جا سکتا ہے۔ جس میں فاضل مصنف نے کئی مقامات پر اردو ادب کے تذکرے اور تاریخ نگاروں سے بنیادی ماخذ و مصادر کی بنیاد پر اختلاف کیا ہے، کئی ایک پر گرفت کی ہے اور ٹھوس شواہد کی بنا پر اپنی تنقیدی رائے کا اظہار کیا ہے۔ یوں محسوس ہوتا ہے کہ مصنف کو اس موضوع پر اتنا عبور حاصل ہے کہ وہ اس میدان میں درجۂ اجتہاد پر فائز نظر آتے ہیں اور پورے اعتماد کے ساتھ علمی نتائج کا استنباط کرتے چلے جاتے ہیں۔

پیش نظر کتاب میں علامہ ضمیر اختر نقوی کے قلم کی روانی کو اس طرح بھی دیکھا جا سکتا ہے کہ ان کے سامنے مختلف جہتوں سے انفارمیشن آتی ہے۔ جس کو وہ اپنے مقام پر نہایت منظم اور مربوط انداز میں بیان کرتے ہیں۔ مثال کے طور پر دوسرے باب میں کتاب "عبقات الانوار" کے علمی پہلو پر بحث کرتے ہوئے ان کا قلم ایک ماہر فہرست ساز (CATALOGUER) کا روپ دھار لیتا ہے، اور وہ اس کتاب کی مختلف جلدوں اور ان کے محتویات کو توضیحی انداز میں بیان کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی کہنہ مشق فہرست نگار کسی کتب خانے میں بیٹھا ہوا ایک کم یاب اور قابلِ قدر مخطوطے کی وضاحتی فہرست سازی کا کام کر رہا ہے۔ اسی طرح مرزا اسد اللہ خاں غالب کی منقبت گوئی کو زیرِ بحث لاتے ہوئے انھوں نے صفحہ ۳۸۲ پر ایک عنوان "غالب کا شاہکار قصیدہ" قائم کیا ہے۔ اس مقام پر وہ غالب کے اشعار کی تشریح ساتھ ساتھ کرتے چلے جاتے ہیں، یوں ان کا قلم شارحِ غالب کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ اس طرح علامہ ضمیر اختر نقوی کی اس کتاب میں مختلف دوسرے رنگوں کی نشان دہی کی

جا سکتی ہے۔

فاضل مصنف شیعہ کالج، لکھنؤ میں پڑھتے رہے ہیں۔ ان کی شخصیت پر لکھنویت کے گہرے نقوش دیکھے جا سکتے ہیں۔ اسی طرح ان کی اس کتاب میں جا بجا اس مظہر کی عکاسی ہوتی ہے۔ وہ لکھنؤ کو "عروس البلاد" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ (صفحہ ۲۵۱)، وہ اس کو "مدینۂ تہذیب" بھی کہتے ہیں (صفحہ ۳۱۶)۔ جہاں لکھنؤ کا ذکر آتا ہے، وہاں ان کے بیان میں خطابت کی زبان عروج پر دکھائی دیتی ہے۔ اس کا بہترین نمونہ کتاب کے (صفحہ ۲۵۱) پر نظر آتا ہے۔ یہ فطری بات ہے کہ جس ماحول میں کسی شخصیت کا بچپن گزرتا ہے اور جہاں اس کی تعلیم و تربیت ہوتی ہے، اس کے گہرے اثرات اس کی شخصیت پر پڑتے ہیں۔ پھر یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ شاہانِ اودھ کے زمانے میں لکھنؤ نے اسلامی تہذیب و ثقافت کے مرکز کی حیثیت اختیار کر لی تھی جہاں سے بہت سی نابغۂ روزگار شخصیات نے جنم لیا۔ اس مرکز کے تربیت یافتہ افراد نے علم و فن اور شعر و ادب کے شعبوں میں بیش قیمت خدمات انجام دیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی نے مباحث کے دوران مختلف مقامات پر مزید تحقیق کے لیے اشارے بھی کیے ہیں۔ ان اشاروں سے ہماری جامعات کے وہ طلبا استفادہ کر سکتے ہیں جو ادبیاتِ اردو کے میدان میں تحقیقی موضوع کے انتخاب کے لیے سرگرداں رہتے ہیں۔ خواجہ حیدر علی آتش کے بارے میں علامہ ضمیر اختر نقوی لکھتے ہیں کہ اردو ادب میں آتش پر ابھی تک کوئی معیاری تحقیق سامنے نہیں آئی (صفحہ ۵۳۷)۔ اسی طرح باب ششم "اردو مرثیہ نگار اور مدحتِ علی" کے آخر میں بھی مزید تحقیقی کام کے لیے نکات درج کیے گئے ہیں۔ اصولِ تحقیق میں یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ جہاں محقق اپنے موضوع کے ساتھ انصاف کرنے کی کوشش کرتا ہے، وہاں وہ مزید تحقیق کے لیے

نشان دہی کرتا ہے کہ انھوں نے نہایت غور و فکر کے ساتھ تحقیق طلب مسائل کی جانب توجہ دلائی ہے۔

آخری میں یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ اس کتاب کے شائع ہونے سے اردو ادب کے علمی ذخیرے میں بہت قابلِ قدر اضافہ ہوا ہے۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے اردو میں منقبت گوئی کے ذخیرے پر نہایت گہری ناقدانہ نظر ڈال کر ایسے موتی تلاش کیے ہیں جن کی آب و تاب دیکھنے والوں کے لیے جاذبیت اور کشش رکھتی ہے۔ ان کا انداز بیان اتنا پر کشش ہے کہ قاری پڑھتے ہوئے زیرِ مطالعہ بحث کو سمیٹ کر دم لینا چاہتا ہے۔ جس طرح علامہ ضمیر اختر نقوی کی تقریر سامعین کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے اور وہ پورے انہماک کے ساتھ ان کے بیان کی طرف متوجہ رہتے ہیں۔ اسی طرح ان کی تحریر بھی قارئین کو اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔ اس خوب صورت اور گراں مایہ پیشکش پر ہم مصنف کو ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ کتاب معنوی حسن کے ساتھ ظاہری خوب صورتی سے بھی آراستہ ہے، تاہم اس کے دوسرے باب ”عربی شاعری اور مدحتِ علیؑ“ میں جہاں امام شافعی کے عربی اشعار نقل کیے گئے ہیں، ان میں کتابت کی چند غلطیاں رہ گئی ہیں۔ اسی طرح کی نشان دہی کتابیات کے سلسلہ نمبر میں بھی کی جاسکتی ہے۔ امید ہے کہ کتاب کی دوسری اشاعت کے وقت اس جانب توجہ دی جائے گی۔

کوثر نقوی

ضمیر اختر صاحب وقت سے بھی آگے ہیں۔ ۱۹۸۸ چل رہا ہے اور وہ ۲۲۵۱ میں ہیں۔ خدا کرے وہ وقت سے پیچھے ہو جائیں۔

پروفیسر ڈاکٹر اسد اریب (ملتان)

سخنِ حق

آج سے نہیں، تقریباً ۲۵ برس سے مسلسل دیکھ رہا ہوں، رثائی ادب اور تہذیب کے حوالے سے جناب ضمیر اختر نقوی ایک نمایاں شخص کی حیثیت سے مجھے نظر آتے ہیں۔ میر انیس ہوں یا اُردو مرثیہ ہو یا برصغیر کا لکھنوی تمدن ہو، یہ سب باتیں ان کا خاص الخاص موضوع بحث رہی ہیں، اور اب ''شعرائے اُردو اور عشق علی'' اسی سلسلۂ فکر میں ان کی یہ تازہ تالیف ہمارے سامنے ہے۔

اس جہت میں مجھے کامل یقین ہے کہ اُردو شاعری کے مطالعے کے اس رُخ پر اس قدر گہری نظر رکھنے والا کوئی اور اہلِ قلم اب مشکل سے ہی مل سکے گا۔ انھوں نے اُردو کے تہذیبی مطالعے پر جس قدر محنت کی ہے، کوئی دوسرا شخص معاصر اہلِ قلم میں ان کی برابری کا دعویٰ نہیں کرسکتا۔ یہ کتاب ان کے تحقیقی مزاج پر ایک اور روشن دلیل ہے۔ امیر المومنین حضرت علی کی بارگاہِ محبت میں اُردو کے نامور شعرا نے اب تک جو کہا اور ان سے اظہارِ عقیدت میں اب تک جو کچھ لکھا، وہ اس کتاب سے باہر نہیں ہے، بجز ان ہزار شعرا کے جن کا کلام تشہیر نہ پاسکا یا جن کی مخطوطوں تک ابھی رسائی نہیں ہوسکی۔ بہرحال یہ امر مسلّم ہے کہ اُردو شاعری کا شاید ہی کوئی نامور معروف استاد ایسا ہوگا جس نے حضرت امیرؑ یا پنجتن پاک کی منقبت میں کچھ نہ کہا ہو بلکہ انیسویں صدی کے پہلے نصف تک اساتذۂ قدیم کی غزلوں میں بھی اس نسبت اظہار کے بہت سے قرینے ہمیں

جا بجا ملتے ہیں، مگر یہ موتی جو کہ اب تک ادھر اُدھر بکھرے پڑے تھے، جناب ضمیر اختر نقوی کا یہ ایک قابلِ قدر کارنامہ ہے کہ ان موتیوں کو انھوں نے ایک سلکِ گہر میں ٹانک دیا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تاریخِ ادب اور تحقیق و تنقید کے ندیم اس "الفہرست" سے ضرور فائدہ اٹھائیں گے اور اس موضوع پر مزید غور و فکر کے نتیجے میں ان پر سماجی عمل اور تہذیب و تمدن کے اثر و نفوذ کے بہت سے نئے گوشے نمایاں ہوں گے۔

جہاں اُردو کے نئے تعلیمی نصاب سے اُردو کے قدیم تہذیبی مزاج اور اس کی مستحکم روایتوں کو قبلِ ہجرت کا گناہ کہہ کر اس کے ترک کی دعوت دی جا رہی ہے، جہاں مقامی تفوق کے نام پر ادبِ اُردو سے فانیؔ، جگرؔ اور اصغرؔ کو بے دخل کیا جا رہا ہو، وہاں یاسؔ یگانہ، صفیؔ، آرزوؔ، نجم آفندی، ثاقبؔ اور عزیزؔ لکھنوی کو اب کون پوچھے گا؟ لیکن میں کہتا ہوں کہ جب کسی بھی حیاتیاتی معاشرے میں امتیازی رجحانات جنم لینے لگتے ہیں تب کیڑے مکوڑے اور بے بال و پر طیور اور وحوش و انعام بھی اپنا تشخص تلاش کرنے لگتے ہیں۔ وہاں مشترک معاشرت کی ایک ایسی اکائی کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی جائے جس کی بنیاد پر عملِ ارتقا کے اعتبار سے ایک مضبوط تمدن اور روشن تہذیب نے اپنی عمارت تعمیر کی ہو۔ تو یہ کہاں کا انصاف ہوگا؟ کیا یہی وہ نفسیاتی محرکات ہیں جن کے نتیجے میں ایک نئی طبقاتی جنگ اور جدلیاتی معاشرہ سر اٹھاتے ہیں۔

مقامیت اپنی جگہ ایک مُسلّم حقیقت سہی۔ کوئی زبان، تہذیب اور مذہب جس جگہ کے لیے سفر اختیار کرتے ہیں، جہاں مقیم ہوتے یا قرار پکڑتے ہیں، وہاں کے مقامی اثرات کا قبول کرنا ان کے لیے ناگزیر فطری عمل ہے، لیکن التزاماً ایسا نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک خودکار آہستہ رو مگر دیرپا تہذیبی عمل ہے۔ اگر التزاماً اور ارادتاً ایسا کیا گیا تو بہت سی تہذیبی اکائیاں باہم ٹکرا کر فتنہ و فساد کا باعث بن جائیں گی، لہٰذا ہمارے اہلِ قلم کا فر

حرفِ اولین اب یہ ہے کہ اتحادِ فکر، مفاہمت اور یکجائی کی ان بنیادوں کو تلاش کریں جن پر صدیوں سے ہماری معاشرت قائم ہے۔

اس سارے تناظر میں جناب ضمیر اختر نقوی کی یہ کاوش اتحادِ فکر کی ایک مضبوط کوشش ہے۔ اُردو تہذیبی مزاج اور شاعری کی صدیوں سے ترقی پذیر منہاجِ فکر کے ایک قابلِ قدر پہلو کو نمایاں کرنا ان کا یہ ایک بڑا ادبی کارنامہ ہے۔

معاصر عزیز جناب ضمیر اختر کی یہ تالیف "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" ایک ایسی مصدقہ دستاویز ہے جسے پڑھ کر ہمیں معلوم ہوگا کہ اہلِ بیتؑ سے محبت اور اس محبت و مودّت کا اظہار ہماری شاعری کی روایت کا حصّہ رہا ہے۔ اُردو کے شعرا خواہ وہ کسی بھی مسلک و مذہب کے پیروکار ہوں، اہلِ بیتؑ سے نسبت اور اظہارِ عقیدت کو عام کرتے رہے ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر ڈاکٹر نعیم تقوی (مرحوم)

علامہ ضمیر اختر نقوی کی اعلیٰ تحقیقی صلاحیتوں سے میں ہمیشہ متاثر رہا ہوں۔ اس دور میں جن موضوعات پر وہ شب و روز محنت کر رہے ہیں، ایک حد تک نقش و نگارِ طاقِ نسیاں ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کی ذہنی کاوشوں سے نہ صرف پاکستان بلکہ برِصغیر میں انشاءاللہ! روشن انقلاب آئے گا اور مرثیے کے فن کو جائز مقام حاصل ہوگا۔

پروفیسر سیّد محمد نصیر

بڑی کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی

تحقیق اور تدقیق کے الفاظ جتنے زیادہ ثقیل ہیں، اس سے زیادہ کٹھن کام اس ڈگر پر چل کر پنگھٹ تک پہنچنے کا ہے اور یہ کام بغیر عشق کے ممکن ہی نہیں ہے۔ ضمیر اختر نہ صرف حضرت علی کے عاشق ہیں بلکہ انھیں تحقیق سے بھی بلا کا عشق ہے۔ ضمیر اختر سر پر عمامہ پہن کر علامہ نہیں بنے، وہ تو بس علم حاصل کرتے رہے، وہ تو بس عشق میں مبتلا رہے اور جنون کی حدوں کو بھی پار کر گئے۔ مستقل پڑھ رہے ہیں، مستقل لکھ رہے ہیں، ایک کے بعد ایک کتاب ان کی شائع ہو رہی ہے۔ پھر دوسرے ان کو عالم نہ مانیں تو کیا کریں! جو کام اداروں کا ہوتا ہے، محققوں کی پوری ٹیم کا ہوتا ہے، وہ کام ضمیر اختر تن تنہا انجام دے رہے ہیں۔ اس وقت اُردو ادب اور اسلامیات کا کون سا ایسا پروفیسر ہے جس نے اتنا کام کیا ہے؟ لوگوں کو بس نام کی فکر ہوتی ہے اور ایسے لوگوں کو نہ فکر کی فکر ہوتی ہے اور نہ وہ فکر کرنا جانتے ہیں۔ ضمیر فکر کرتے ہیں، وہ نہ صرف دھول سے اٹی کتابوں کو چھانتے ہیں بلکہ غیر مطبوعہ تحریروں کو ڈھونڈنے کے لیے در در کی خاک چھانتے ہیں۔ وہ صحیح معنوں میں تراب ہیں، انھیں اپنی مٹی، اپنے لوگوں سے پیار اور ان ہستیوں سے عشق ہے جو دنیا کی مانگ سنوارنے اور بنی نوع انسان کو استحصال کے آہنی پنجوں سے نکالنے کے لیے ملوکیت کے بت کدے میں حق کی اذان دیتے رہے۔

عقیدہ تو ماننے کا نام ہے اور علم جاننے کا۔ علم حاصل کرنے کے بعد ہی دراصل

عقیدہ عقیدت کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ حضرت علی کو وہ صرف امام نہیں مانتے بلکہ انھیں مولا جانتے ہیں۔ مولا کے معنی جاننا ہوں تو مولانا روم سے پوچھیے۔ مولانا روم جواب دیں گے:۔

کیست مولا آنکہ آزادت کند
بند رقیت زپایت برکند

"مولا کے کیا معنی ہیں؟

تو سنو! مولا وہ ہے جو تجھے آزاد کرے، مولا وہ ہے جو تیرے پاؤں سے غلامی کی زنجیریں کاٹ دے" (شعرائے اُردو اور عشقِ علی صفحہ ۱۳)

"شعرائے اُردو اور عشقِ علی" ضمیر اختر نقوی کی کتاب ہے۔ اس کتاب کے انتساب پر نظر ڈالیے تو ان کی فکر اور زاویہ نظر کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ خود لکھتے ہیں۔ "اقبال کا پیغام ملت اسلامیہ کے نام یہی ہے کہ اپنے ہوش وخرد، اپنی قوت ادراک کو تیز کرنے کے لیے اپنی عقل کو نورِ علی سے صیقل کرتے ہوئے سرمایہ علم وادب حاصل کیا جاسکتا ہے۔

یہ ہے، اقبال! فیض ذکرِ نام مرتضیٰ جس سے
نگاہ و فکر میں خلوت سرائے لامکاں تک ہے

یہ انتساب حضرت ابوذر غفاری کے نام، میثم تمار کے نام، حضرت حجر ابن عدی کے نام، حضرت قنبر کے نام، حضرت ابن السکیت کے نام،...... تاریخ اسلام میں یہ وہ نام ہیں جنھوں نے ملوکیت کے خلاف علم جہاد بلند کیا، ریاستی جبر و استبداد کے سامنے جنھوں نے کبھی سر نہیں جھکایا، جنھوں نے جام شہادت نوش کیا، جو سنگ و آتش کے سلگتے بازاروں میں عشقِ علی کا اظہار کرتے رہے اور جو آج بھی ظالم و جابر سلطان کے

سامنے کلمۂ حق ادا کرنے کی جرأت پیدا کرتے رہتے ہیں۔ ضمیر اختر چاہتے تو اس کتاب کو کسی ایسے نام سے معنون کر دیتے کہ خلعت انعام میں پاتے۔ شاہی مہمان بن کر عمرے یا حج کی سعادت حاصل کرتے، پلاٹ الاٹ کراتے۔ جوش کی زبان میں یہ وہ لوگ ہیں جو خونِ حسینؑ سے اپنے لقمے تر کرتے ہیں، لیکن ضمیر اختر نام کے ہی ضمیر نہیں۔ باضمیر بھی ہیں۔ وہ علیؑ کی پیروکار ہیں، اس لیے انھیں دولت سے کوئی سروکار نہیں۔ وہ آج بھی معمولی سے فلیٹ میں رہتے ہیں جو گھر کم اور مرکزِ علومِ اسلامیہ زیادہ ہے۔ وہ نانِ شعیر تو نہیں کھاتے لیکن ارہر کی دال اور روٹی زیادہ شوق سے کھاتے ہیں۔

دارا و سکندر سے وہ مردِ فقیر اولیٰ
ہو جس کی فقیری میں بوئے اسد اللّٰہی

وہ صرف علم حاصل کرتے ہیں اور اس علم کی روشنی سے اندھیرے کا جگر چاک کرتے رہے ہیں۔

اس کتاب کی کتابیات پر نظر ڈالیے۔ اس کتاب کی تالیف میں ۱۸۲ کتب اور مخطوطات سے مدد لی گئی ہے جن میں دس قلمی مخطوطات شامل ہیں۔ ان مخطوطات تک پہنچنے کے لیے جہاں انھوں نے برٹش میوزیم لندن کا خزانہ چھانا، وہیں ان لوگوں کے گھروں پر بھی دستک دی جہاں وہ مخطوطات موجود ہیں۔

یوں تو اس کتاب کا بڑا حصہ شعرائے اردو سے متعلق ہے لیکن عربی شاعری اور مدحتِ علیؑ، فارسی اور ثنائے علیؑ پر بھی دو باب ہیں۔ چونکہ ان کی سوچ منطقی ہے اس لیے سب سے پہلے باب میں قرآن میں حضرت علیؑ کے فضائل اور منقبت کے محرکات سے بحث کی گئی ہے۔ ضمیر اختر کہتے ہیں:-

''حضرت علیؑ کی مدح میں منقبت گوئی کا آغاز ملکِ عرب میں رسولِ اکرمؐ کے

سامنے ہو چکا تھا" حسان بن ثابت شاعر رسولؐ اللہ کے لقب سے مشہور تھے اور وہی حضرت علیؑ کے پہلے مداح شاعر ہیں۔ حضرت علیؑ کی شان میں ان کے قصائد کے بہت سے اشعار بھی درج ہیں۔ غدیر خم کے موقع پر حسان بن ثابت نے فی البدیہہ کئی اشعار پڑھے جن میں ایک شعر کا ترجمہ ہے:۔ "پس فرمایا نبیؐ نے کہ اے علیؑ! بس بہ تحقیق میں نے پسند کیا تم کو اپنے بعد امام اور ہادی"۔

اس باب میں پانچ چھ اور عربی کے بڑے شعرا کا تذکرہ اور مناقب شامل ہیں۔ اگر اس کتاب میں صرف منقبت کہنے والے شعرا کا ذکر ہوتا اور ان کے اشعار نقل کیے جاتے تو حضرت علیؑ کی شان میں منقبت کا خزانہ تو ایک جگہ جمع ہو جاتا لیکن شاید کتاب اتنی دلچسپ اور وقیع نہ ہوتی کہ پڑھنے والا جی لگا کر پڑھتا اور نہ اس کی اتنی اہمیت ہوتی۔ اس کتاب میں آپ کو عرب، عجم اور برِ صغیر ہندو پاک کی تاریخ نظر آئے گی، اسلامی تاریخ کے روشن اور تاریک پہلو دکھائی دیں گے، مسلم علما اور شعرا کی فکر آپ کی سوچ کو جلا بخشے گی۔ اس کتاب میں آپ کو حسان بن ثابت اور امام شافعی سے لے کر مولانا روم اور شیخ سعدی تک، حافظ شیرازی سے لے کر جامی تک اور اُردو میں لعل شہباز قلندر سے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز تک، محمد قلی قطب شاہ سے ولی دکنی تک، میر سے لے کر غالب اور اقبال سے لے کر جوش تک تمام اہم شعرا کے حالات زندگی نظر آئیں گے۔ اس کتاب کی خصوصیت یہی ہے کہ اس میں عرب اور عجم کے تعصبات کا معاشرتی تجزیہ بھی ملتا ہے اور ان تعصبات کو ختم کرنے کی کوشش بھی ملتی ہے۔ دِلّی بستی ہوئی یہیں نظر آتی ہے اور اجڑتی ہوئی بھی۔ اودھ کی تہذیب اپنی تمام تر جزئیات کے ساتھ آپ کو مسحور بھی کرے گی اور اس کا زوال دیکھ کر آپ مغموم بھی ہوں گے۔ منقبت میں کس طرح تبدیلیاں ہوتی رہیں، اس کے رنگ کس طرح بدلتے رہے، حضرت علیؑ کے

اوصاف کو کس طرح مختلف ادوار میں بیان کیا گیا، کن نئے نئے پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی، اس روشنی سے خود کس طرح چراغ روشن کیے گئے، یہ سب کچھ اس کتاب میں اس طرح سمو دیا گیا ہے کہ پڑھنے والے کی نظر (VISION) میں بڑی گیرائی، گہرائی اور وسعت آجاتی ہے۔ اس کتاب کو پڑھ کر صرف روح کو بالیدگی حاصل نہیں ہوتی بلکہ ذہن میں کوندا لپکنے لگتا ہے، فکر کو مہمیز ملتی ہے اور فکر کے نئے سوتے پھوٹنے کے امکانات پیدا ہوتے ہیں۔ یہاں تھوڑے سے اقتباسات شاید آپ کو میرا ہم رائے بنا دیں اور اگر آپ کو اختلاف ہے تو بھی کتاب پڑھنے کو جی ضرور چاہے گا۔

امام شافعی اسلامی تاریخ کا بہت بڑا نام ہے۔ آپ امام مالک کے شاگرد، امام احمد بن حنبل کے استاد اور اہلِ سنت کے فقیہ تھے۔

ایک روایت کے مطابق امام ایک مجلس میں حضرت علی کا ذکر رہے تھے کہ ایک شخص نے کہا: "لوگوں نے علی کا ساتھ اس لیئے چھوڑا کہ وہ کسی کی پروا نہیں کرتے تھے"۔ شافعی نے جواب دیا: "حضرت علی میں چار خصلتیں ایسی تھیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی کسی میں پائی جائے تو وہ دنیا اور اہلِ دنیا کی پروا نہیں کرتا۔

۱۔ علی زاہد تھے اور زاہد دنیا اور اہلِ دنیا کی پروا نہیں کرتا۔

۲۔ علی عالم تھے اور عالم بھی کسی کی پروا نہیں کرتا۔

۳۔ علی شجاع تھے اور شجاع بھی کسی کی پروا نہیں کرتا۔

۴۔ علی شریف واشرف تھے اور شریف واشرف بھی کسی کی پروا نہیں کرتا"۔

کیا یہ اقتباس ہمیں دعوتِ فکر نہیں دیتا۔ انسان کو پرکھنے کی کسوٹی عطا نہیں کرتا، ہمیں حضرت علی کے نقشِ قدم پر چلنے کے لیئے نہیں اکساتا؟

انہیں خصوصیات کے پیشِ نظر امام شافعی نے خود ایک شعر میں کہا ہے:-

"سوا علیؑ کی رفعت وشان میں یہی کافی ہے کہ لوگوں کو ان کے خدا ہونے کا شک و شبہ ہو گیا اور میں (شافعی) مرتے وقت تک نہیں جان سکا کہ میرا پالنے والا علیؑ ہے یا اللہ ہے"۔

آج اگر کوئی یہ شعر کہتا تو مرتد کہلاتا۔

عرب اور عجم کے درمیان نسلی تعصب ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، اور اسی لیے رسولؐ نے آخری حج کے خطبے میں اعلان کیا تھا کہ عجم پر عرب کو کوئی فضیلت حاصل نہیں ہے، فضیلت کا معیار صرف تقویٰ ہے۔ ایرانی بھی نسلی تعصب کا انتہائی شکار رہے ہیں، یہاں تک کہ فردوسی اپنے شاہ نامے میں کہتا ہے:۔

"اونٹ کا دودھ پینے والے اور سوسمار کا گوشت کھانے والے عربوں کی نوبت اب یہاں تک پہنچی ہے کہ وہ ایرانیوں کے تخت کی تمنا اور آرزو کر رہے ہیں۔ اے گردش کرنے والے آسمان! تجھ پر تف ہو"۔

ضمیر اختر کہتے ہیں:۔

"اگر حضرت علیؑ کی ذاتِ گرامی نے اسلام کی تصویر پیش نہ کی ہوتی تو عجب نہیں اسپین کی طرح ایران بھی دوسرا اسپین بن جاتا اور ایران میں بھی مسلمان نام کو نہ رہتے۔

اس کتاب میں علامہ سید محسن امین کا ایک اقتباس ہے۔ وہ کہتے ہیں:

"اہلِ ایران جو اسلام میں داخل ہوئے، وہ شروع میں شیعہ نہ تھے۔ تقریباً سب کے سب علما و اکابرِ اہلِ سنت ایران ہی کے گزرے ہیں، جیسے بخاری، ترمذی، نسائی، ابنِ ماجہ، رازی وغیرہ وغیرہ۔ مذکورہ علما کی کتابیں مناقبِ حضرت علیؑ سے چھلک رہی ہیں۔

ایران کے شیعہ اہلِ سنت اور صوفی شعرا نے عشقِ علیؑ میں سرشار ہو کر اپنی عقیدت کا

اظہار جس اسلوب سے کیا ہے، وہ مودت کی بہترین مثال ہے۔ مشہور دانش ور خلیل جبران نے لکھا ہے کہ یہ فارس کے لوگ تھے جنھوں نے جواہر اور سنگ ریزوں میں فرق کیا، یہ ایرانی ہی تھے جنھوں نے عظمتِ علویہ کا ادراک حاصل کیا (مجلۃ العرفان)۔ یہی تاریخی عوامل تھے اور حضرت شہر بانو کی امام حسینؑ سے شادی تھی جس کی وجہ سے شیعہ فرقے کی ایران میں اکثریت ہوئی۔ یہاں مولانا روم، شمس تبریزی، شیخ سعدی، حافظ شیرازی، جامی کے کئی مناقب پیش کیے گئے ہیں جن میں فکر رسا بھی ہے، کیف و مستی بھی ہے، خیال انگیزی بھی ہے۔ اور جمال آفرینی بھی۔

اردو کے تو تمام شعرا کے ساتھ ضمیر اختر نے طویل سفر طے کیا اور راستے میں رک کر دم بھی نہیں لیا۔ جن شعرا کا تو میں نے نام بھی نہیں سنا اور جو کہیں چھپ نہ پائے، انھوں نے ان کا کلام بھی چھان مارا جو معمولی پتے کے آدمی کے بس کی بات نہیں تھی۔ انھیں تو ادب سے، اسلام سے اور حضرت علیؑ سے عشق ہے، اس لیئے وہ انعام اور صلے کی پروا کیے بغیر اپنے کام میں لگے رہے۔ انھوں نے تو یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ہندوستان میں حضرت علیؑ کے عہد میں اسلام آیا اور اردو زبان کی تشکیل میں حضرت علیؑ کی منقبت نگاری نے کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ دریائے سندھ کے کنارے ہمیں تاریخ سندھ کے گم نام گوشوں سے بھی پردہ اٹھتا نظر آتا ہے۔ وہ تاریخ طبری و تاریخ الکامل ابن اثیر طبع مصر کا حوالہ دیتے ہوئے کہتے ہیں:-

> "دریائے سندھ کے کنارے خلیفہ عباسی منصور دوانیقی کے حکم سے اولاد رسول حضرت عبداللہ الاشتر بن محمد کا خون بہایا گیا۔ ان کے بیٹے کو ایک ہندو راجا نے پناہ دی۔ وہ ہندو راجا ہشام بن عمر ثعلبی والی سندھ کے لشکر کے ہاتھوں قتل ہو گیا لیکن سیّد زادے کو اس کے حوالے

نہیں کیا۔انھیں حالات کے تحت سندھ میں اُردوزبان کی تشکیل ہوئی"۔

سیّد جلال الدین سرخ بخاری اور حضرت لعل شہباز قلندر اور اس کے بعد آنے والے صوفیا نے ہی سندھ میں اسلام کی ترویج کی اور اپنی منقبت کے ذریعے سندھ میں علی بالا ولی کا نام دوبالا ہوا جو کثرتِ استعمال سے بلاول بنا۔ اس کے بعد انھوں نے دکن دہلی اور لکھنؤ تک اُردو منقبت نگاری کا جائزہ لیا ہے۔ حضرت علی کے مداحوں میں سب سے بڑے نام میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ اور جوشؔ کے ہیں اور وہی ضمیر اختر کے کیا۔ اُردو پڑھنے والوں کے سب سے بڑے ممدوح ہیں۔ دراصل غالبؔ اور اقبال کو پڑھ کر ہی عشق کے معنی سمجھ میں آتے ہیں۔ غالبؔ کا ایک شعر ہے:

کانٹوں کی زباں سوکھ گئی پیاس سے یارب!
اک آبلہ پا وادیِ پُر خار میں آوے

ضمیر اختر لکھتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کی بنیاد کاروانِ عشق ہے۔ ضمیر اختر نقوی نے لکھا ہے کہ وہ قرآن کو عشق کہتے ہیں، خدا کے رسولؐ کو عشق کہتے ہیں، علی خیبر شکن کو عشق کہتے ہیں، صبرِ حسینؑ کو عشق کہتے ہیں اور اس عشق کا محور حضرت فاطمہ زہراؑ کو قرار دیتے ہیں اور آخر میں ان کا درج ذیل شعر پیش کرتے ہیں:۔

مادر آں مرکزِ پرکارِ عشق
مادر آں کارواں سالارِ عشق

میرا اپنا خیال ہے کہ اقبال کا تصورِ عشق عظمتِ آدم ہے اور اقبال کا پورا فلسفۂ خودی اور ان کی کتاب "RECONSTRUCTION OF RELIGIOUS THOUGHT IN ISLAM" میرے اس موقف کی دلالت کرتی ہے۔

ضمیر اختر نقوی بہت وسیع النظر آدمی ہیں۔ ان کے اپنے عقائد ہیں، مسلک ہے،

عقیدت ہے، لیکن وہ دوسروں کے عقائد پر کیچڑ نہیں اچھالتے۔ وہ کہتے ہیں:

> "جب سماج میں زوال کے آثار نظر آتے ہیں تو عقائد کے اختلافات علمی اور تحقیقی سطح سے گزر کر ذاتی رنجشوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ان کا مقصد تلاشِ حق کے بجائے ذاتیات کی تشفی اور انتقام ہو جاتا ہے"۔

میرا اپنا خیال ہے کہ عقائد کے اختلاف پر علمی اور تحقیقی سطح پر گفتگو ایک علیحدہ دائرۂ کار ہے جس کی ضرورت اس کتاب میں نہیں تھی، کیونکہ اس کتاب کا عنوان ہی "شعرائے اُردو اور عشقِ علی" ہے اور یہی عنوان اس کتاب کا دائرہ متعین کرتا ہے، خطوط اور حدود کا تعین کرتا ہے، لیکن ضمیر اختر نقوی نے میر، غالب، اقبال اور دوسرے شعرا کے مذہب اور مسلک کے بارے میں بھی بات کی ہے جو ان حدود سے باہر رہی ہے اور شاید اس کتاب کی اپیل کو بھی کم کر دے۔ دوسری بات جس سے مجھے اختلاف ہے، وہ صوفیت کے بارے میں ہے اور نظیر اکبرآبادی سے متعلق قائم کردہ رائے کے حوالے سے ہے۔ اول تو اس مسئلے کو اس کتاب میں زیرِ بحث لانے کی ضرورت ہی نہیں تھی، اور جب بات کی ہی گئی ہے تو میں یہ عرض کروں گا کہ ضمیر اختر اس سلسلے میں خود تضاد کا شکار ہیں۔ ایک جانب وہ تمام صوفی شعرا کی تعریف بھی کرتے ہیں، ان کی کہی ہوئی منقبت کو اعلیٰ مقام بھی دیتے ہیں جو صحیح ہے، لیکن دوسری جانب صوفیت کو بدعت بھی کہتے ہیں اور یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ نوابینِ اودھ کے دور میں اس بدعت کو ختم کیا گیا۔ میرا اپنا خیال یہ ہے کہ اناالحق کا نعرہ لگانے والے یہی صوفی بڑے وسیع المشرب اور اعلیٰ پائے کے نہ صرف انسان تھے بلکہ انھیں عام انسانوں سے بے انتہا محبت تھی، اور اسی لیے وہ حضرت علی کو بلند ترین مقام دیتے ہیں اور انھیں کے اثر سے اسلام کی اشاعت زیادہ

ہوئی۔ انھوں نے اپنے برِ صغیر کے کلچر کو سمجھا، اسی میں رنگے اور اسی لئے وہ عوام میں اتنے زیادہ مقبول ہوئے۔ ہر مذہب پر زمین اور اس کے کلچر کا اثر ضرور پڑتا ہے۔ میر انیس کے مرثیے خود اتنے زیادہ مقبول نہ ہوتے اگر وہ پورے واقعۂ کربلا کو برِ صغیر کے کلچر میں نہ رنگ دیتے۔ رہی بات نظیر اکبر آبادی کی تو وہ عوامی شاعر تھے۔ ضمیر اختر خود مانتے ہیں کہ "نظیر اکبر آبادی کو جو خصوصیت اُردو کے تمام قدیم شعرا سے ممیز کرتی ہے، وہ اپنے عہد کی ہو بہو ترجمانی یا تصویر کشی ہے۔ ہندی الفاظ کے استعمال کے لحاظ سے وہ اپنا جواب نہیں رکھتے"۔ وہ خود یہ بھی جانتے ہیں کہ وہ تنگ نظری سے مبرّا صوفی مشرب، قائلِ وحدت الوجود تھے۔ انھوں نے ان پر ایک الگ باب بھی تحریر کیا ہے۔ ان کی منتخب مناقب اور نظمیں بھی اسی کتاب کی زینت ہیں، لیکن پھر تاریخ اودھ تک آتے آتے اور مغلیہ دور کا دورِ اودھ سے مقابلہ کرتے کرتے انھوں نے یہ لکھ ڈالا "نظیر اکبر آبادی کا کلیات انھی خرافات سے بھرا پڑا ہے۔ نظیر اکبر آبادی نے ہولی پر نظمیں لکھی ہیں۔ اس کے علاوہ دیوالی، راکھی، کرشن کنھیا کے ناچ گانے، بسنت کے موضوعات پر نظمیں تصنیف کی ہیں جو کلیات کی زینت ہیں"۔

یہی تو ہندوستانی کلچر کی ہو بہو ترجمانی یا تصویر کشی کہلائے گی۔ میرا اپنا خیال ہے کہ اودھ کا کلچر ان کی رگ رگ میں اتنا رچا بسا ہے اور ان کو اس سے اتنا جذباتی لگاؤ ہے کہ وہ خود اس معاملے میں تھوڑی سی عصبیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ مگر سوال یہ ہے کہ ہم میں سے کون ہے جو سو فیصد معروضی ہو سکتا ہے اور وہ بھی ادب پر؟ ادب میں تو موضوعیت در آنا بالکل قدرتی ہے۔ نظریہ جاری و ساری تو ضرور رہتا ہے لیکن نقطۂ نظر تو الگ الگ ہوتا ہی ہے۔

جزئیات کو چھوڑیے اور کُل پر نظر ڈالیے تو یہ کتاب ہر اعتبار سے وقیع نظر آتی ہے۔

اس میں ان کی فکر میں جو وقت نظر ہے، وہ بھی دکھائی دیتی ہے، عشق کا درد مشترک بھی صاف دکھائی دیتا ہے۔ کتاب کی زبان بھی ان کے مزاج کی طرح نرم اور سادہ ہے۔ ضمیر اختر اپنے منھ سے کبھی اپنی بڑائی تو دور رہی، اپنی بات بھی نہیں کرتے اور اس لیے اس کتاب میں "میں" نظر نہیں آتا۔ آج کے اس دور میں جہاں جاہل افلاطون بنے گھومتے ہیں، بونے دوسروں کی تعریف کر کے یا اپنوں سے بڑوں کو چھوٹا دکھا کر اپنا قد بڑا کرنے کی کوشش کرتے ہیں، وہاں ایسے لوگ کم نظر آتے ہیں۔ آج جہاں لوگ اپنا کردار ادا کرنے کے بجائے خود ایک اہم کردار بننے کی کوشش کرتے ہیں، وہاں دوسروں کی نظر میں ضمیر اختر جیسے لوگ خود بخود بڑے بن جاتے ہیں اور ایسے ہی لوگ کوئی بڑا کام کر بھی پاتے ہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد (مراد آباد، انڈیا)

قابل صد احترام ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی

خلوص وسلام

علی گڑھ میں آپ کے علم وفضل کی تعریف پروفیسر ابوالکلام قاسمی، طارق چھتاری ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی اور ڈاکٹر شافع قدوائی وغیرہ سے سنتا رہا ہوں۔ یہاں مراد آباد میں آپ کے عقیدت مندوں میں عروض داں ڈاکٹر عارف حسن خان اور جواں سال ادیب قمر عباس بھی ہیں جن کی زبان آپ کی اور آپ کے رسالے کی تعریف کرنے میں تھکتی نہیں ہے۔

براہ کرم مجھے بھی اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کرنے کی زحمت کریں۔

پروفیسر ظہیر نقوی

شعرائے اُردو اور عشقِ علی

اُردو منقبتی شاعری کا گلزارِ ارم

جی تو یہ چاہتا تھا کہ اس کتاب حقیقت و معرفت اور صحیفۂ عقیدت و مودّت پر تفصیل وار اور جامع انداز میں ایک طویل مقالہ لکھتا اور اس کے شایانِ شان تنقید کا حق ادا کرتا، اس کے جملہ محاسن بیان کرتا، اس کی خصوصیات پر روشنی ڈالتا، اس میں اُردو شعر و ادب کی ترقی کے لحاظ سے جو امکانات پوشیدہ ہیں، ان کی نشان دہی کرتا...... اس کے ساتھ ہی ساتھ کتابت اور سرخیوں سے متعلق ان معمولی فروگزاشتوں کی طرف بھی توجہ دلاتا جو اگر چہ اتنی ارفع و اعلیٰ کتاب اور ایسی وسیع و عظیم تالیف کے ملیح و صبیح چہرے پر خال سویدا کی حیثیت ہی رکھتی ہیں، و تاہم نہ ہوتیں تو بہتر ہوتا...... اس کے علاوہ کچھ ایسی تجاویز بھی پیش کرتا جن کی روشنی میں اس کتاب کے اگلے ایڈیشن کو مناسب ترمیم و اضافہ کے ساتھ شائع کیا جاتا تو اس کی افادیت اور بڑھ جاتی اور اس طرح اس کارِ ثواب میں مَیں بھی حصے دار بن سکتا تھا، لیکن بدقسمتی سے بعض مصروفیات و مشکلات سدِ راہ ہوئیں اور یوں کوشش کے باوجود میں ایسا نہ کر سکا۔ بہر حال اس کتاب کی غیر معمولی اہمیت اور مولانا ضمیر اختر نقوی سے تعلقِ خاطر کے پیشِ نظر سرسری طور پر ہی سہی، کچھ نہ کچھ اظہارِ رائے ضروری سمجھتا ہوں۔

سب سے پہلے جس چیز نے مجھے جذباتِ تحسین و آفرین سے سرشار کر دیا، وہ ہے

خود مولانا ضمیر اختر نقوی صاحب کا مولائے کائنات حضرت علیؑ اور چہاردہ معصومین علیہ السلام کے لیئے بے پایاں جذبۂ عشق و محبت۔ ماشاءاللہ! مولانا نے کس قدر حیرت انگیز ذوق وشوق اور انہماک اور استغراق کے ساتھ مختلف زبانوں کے ادب کا مطالعہ کر کے مولائے کائنات سے متعلق منظومات کے گل ہائے رنگارنگ کی گل چینی فرمائی اور پھر کمالِ ہنرمندی اور خوش سلیقگی کے ساتھ برسوں اس ذخیرۂ عظیم کی ترتیب وتزئین فرمائی اور آخر میں اس کی تبویب وتدوین کا جاں گداز کام سرانجام دیا اس طرح بالآخر یہ منقبتی شاعری کا انسائیکلوپیڈیا منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ سچ تو یہ ہے کہ مولانا نے شیدائیانِ اُردو کے لیئے عموماً اور عاشقانِ حضرت علیؑ کے لیئے خصوصاً منقبت کا محض ایک دستۂ گل یا سبدِ گل پیش نہیں کیا بلکہ ایک وسیع وعریض تختۂ گل تا حدِ نظر پھیلا دیا ہے کہ جو کوئی ان گل ہائے عقیدت ومودّت کو نگاہِ بصیرت سے دیکھے تو جھومنے لگے اور مشامِ معرفت سے سونگھے تو مست ہوجائے اور اگر پائے اشتیاق سے گل گشت کرنا چاہے تو دیر تک سیر کرتا پھرے لیکن طبیعت سیر نہ ہو۔ مگر نہیں! اس کتاب کے لیئے یہ تشبیہ بھی کافی نہیں۔ حق تو یہ ہے کہ مولانا نے اُردو، عربی اور فارسی کی منقبتی شاعری کے گلزارِ ارم اور فردوسِ گم گشتہ کو ڈھونڈ نکالا ہے۔ جس میں حسین الفاظ وتراکیب کے قصر، نادر تشبیہات واستعارات کے باغات، لطیف اشارات وکنایات کی حوریں مثالی فصاحت وبلاغت کی نہریں اور ولائے عشقِ علیؑ کے جام ومینا وخم سرِ صاحبِ عقیدت ومودّت کو ہی نہیں بلکہ ہر سخن فہم اور ادب نواز شخص کو مست وسرشار کر دیتے ہیں۔ یہ بات میرے لیئے نہایت حیران کن ہے کہ ایسی کتاب مرتب کرنے کا خیال، جس میں حضرت علیؑ کے فضائل ومناقب اتنی کثرت سے بیان کیے گئے، ..ں ضمیر اختر صاحب کو کیوں اور کیسے آیا یہ بھی دراصل عطائے مولا علیؑ اور فیضانِ چہا .. دہ معصومینؑ ہے، ورنہ

سیکڑوں سالوں میں ہزاروں شاعر اور لاکھوں عقیدت مند گزر گئے۔ کسی کو یہ خیال نہ آیا۔ کسی کو یہ توفیق نہ ہوئی دراصل یہ انعامِ خاص قدرت و مشیت الٰہی نے مولانا ضمیر اختر کے لیئے اپنے خزانے میں چھپا رکھا تھا، کسی اور کو کیسے مل سکتا تھا؟ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ عربی، فارسی اُردو زبانوں کے شعری ادب کے سمندروں میں چھپے ہوئے منقبت و مدحتِ علیؑ کے ان گہر ہائے شاہوار کو مولانا نے برسوں کی شناوری اور غواصی کے بعد حاصل کیا اور ''شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ'' کے اچھوتے اور نرالے نام سے ایک ضخیم اور دیدہ زیب کتاب کی صورت میں دنیائے ادب کے سامنے پیش کر دیا۔ یہ کتاب نہیں، ایک جادو ہے جو سر چڑھ کر بولتا ہے۔ سرسری طور پر عربی، فارسی اور اُردو شاعری کا جائزہ لینے سے یہ اندازہ نہیں ہوتا کہ شعرا نے مولائے کائنات حضرت علیؑ کی ذاتِ گرامی پر عقیدت و مودّت کے ایسے ایسے رنگا رنگ پھول اور اتنے قیمتی موتی نچھاور کیے ہیں۔ اگرچہ اس مجموعے میں شامل ہر شہ پارہ بجائے خود نہایت مسحور کن ہے، لیکن مولانا ضمیر اختر نقوی نے جتنی بڑی تعداد میں جس انداز سے ان منظومات کو سجا کر پیش کیا ہے تو یہ ذخیرۂ منقبت و مدح سرائی کا ایک طلسم ہوش ربا بن گیا ہے۔ جو کوئی ایک بار محض ورق گردانی کی نیت سے اس میں داخل ہو، وہ گھنٹوں تک دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو کر مبہوت اور مسحور اس کی وادیوں اور شہروں کی سیر کرتا پھرے اور چاہے بھی تو باہر نکلنے اور اسے چھوڑنے کی کوئی راہ اور جواز نہ پائے۔ ہر ہر عنوان اور ہر ہر باب ''کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست'' کی کیفیت پیدا کر رہا ہے۔ ہر منقبت پڑھ کر بے اختیار زبان سے واہ اور سبحان اللہ کی صدائیں نکلتی ہیں اور دل شعرا کے زورِ بیان اور قدرتِ کلام پر جھوم جھوم جاتا ہے اور مولانا ضمیر اختر نقوی کی اس سعیٔ بلیغ کو داد دیتا اور ھل من مزید کی تکرار کرتا ہے۔ میری رائے میں تو یہ بھی حضرت علیؑ کا ایک معجزہ ہی

کہا جائے گا کہ جن مسلمانوں کے ایک خلیفہ نے عرصۂ دراز تک حضرت علی کی شان اقدس میں گستاخی کی کوشش کی، انھی مسلمانوں نے حضرت علی کی مدحت و منقبت کو ذریعۂ شہرت و عظمت دنیوی سمجھا اور وسیلۂ بخشش و نجات اخروی جانا۔ یہ مبارک کام اور کار خیر مولانا ضمیر اختر کے لیے مشیت الٰہی نے واقعی مختص کر رکھا تھا، یہ انھی کا حصہ تھا:

ایں سعادت بزور بازو نیست

تا نہ بخشد، خدائے بخشندہ

دوسری جس چیز نے مجھے مسحور و متحیر کر دیا، وہ اس کتاب کا نام ہے، "اُردو شعرا اور عشق علی"۔ واہ! کیا حسین اور بلیغ نام ہے، صوتی و معنوی ہر اعتبار سے نہایت منفرد اور اثر آفریں۔ اگرچہ اس میں اللہ کے کلام کے علاوہ عربی اور فارسی کے شعرا کا کلام ہے، مگر بہر حال خصوصیت اور کثرت کلام کے اعتبار سے اُردو شعرا کا ہی سابقہ "عشق علی" کے ساتھ موزوں، برمحل اور خوب صورت نام رکھا گیا ہوگا۔ یہ نام مولانا ضمیر اختر نقوی کی خوش ذوقی اور اختراع پسندی کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ کہنے کو تو اُردو شعرا کے ساتھ عشق علی کے بجائے محبت علی، الفت علی، ولائے علی، ثنائے علی، جیسے بے شمار لاحقات کا اضافہ بھی کیا جا سکتے تھے۔ مگر "عشق علی" میں جو بات ہے، وہ کسی اور لفظ میں نہیں ہو سکتی تھی۔ بہت سے لوگوں نے اسی انداز میں سوچا ہوگا اور بہت سے متبادل نام تجویز کیے ہوں گے مگر جو رمز "شعرائے اُردو اور عشق علی" میں ہے، اسے اہل نظر اہل خبر ہی سمجھ سکتے ہیں۔ بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ "عشق" کا لفظ قرآن مجید میں نہیں آیا اس لیے "عشق" کا لفظ محب یا محبت سے کم تر ہے۔ بعض لوگ "عشق" کے لفظ پر اس لیے چونکتے ہیں کہ اس لفظ میں رومانویت اور نفسانیت کا شائبہ ہے جو حضرت علی کی ذات اقدس کے شایان شان نہیں۔ بعض لوگ تصوف کے عشق حقیقی و عشق مجازی کے

حوالے سے اس لفظ کو غیر موزوں اور بے محل سمجھیں گے، کیونکہ نہ حضرت علیؑ کو مجازی محبوب قرار دینا مناسب ہے اور نہ حضرت علیؑ کو حقیقی محبوب یعنی اللہ تعالیٰ گردانا جائز ہے۔ مگر جو لوگ حضرت علیؑ کی ذات گرامی کی معرفت سے بہرہ مند ہیں، جو شیعہ فلسفۂ ولایت سے کماحقہ آگاہ ہیں یا جو تصوف کی اصل روح کے رمز آشنا ہیں، وہ ''عشقِ علیؑ'' کی اصطلاح کی اہمیت جانیں گے۔ مزید وضاحت کے لیے اتنا اشارہ کافی سمجھتا ہوں کہ جو گہرائی اور گیرائی ہندی لفظ ''بھکتی'' میں ہے، اس سے زیادہ گہرائی اور گیرائی اور اس سے زیادہ جذب و بے خودی اور اس سے زیادہ سرمستی و سرشاری لفظ ''عشق'' میں پنہا ہے۔ جس طرح ''رام بھکتی'' اور ''کرشن بھکتی'' کی اصطلاحوں میں ہندو مذہب، ثقافت اور ادب کی روایات کی ایک وسیع دنیا چھپی ہوئی ہے، اسی طرح ''عشقِ علیؑ'' کی اصطلاح میں مسلمانوں کی مذہبی، ثقافتی اور ادبی روایات کا جہان بے کراں پوشیدہ ہے۔ اگر ہم نصیری کے عقیدہ ''علی اللہ'' کے حوالے سے بھی دیکھیں تو عشقِ مجازی و عشقِ حقیقی باہم بغل گیر ہو جاتے ہیں۔ غرض جب میں ''شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ'' کے عنوان پر غور کرتا ہوں تو مولانا ضمیر اختر نقوی کے حُسن و ذوقِ انتخاب پر عش عش کرنے لگتا ہوں۔

تیسری بات جسے سراہے بغیر میں نہیں رہ سکتا، وہ اس کتاب کا تنوع، بوقلمونی، رنگا رنگی اور ہمہ گیری ہے۔ اس ایک کتاب میں مختلف ابواب اور عنوانات کے تحت اُردو زبان تو کیا، فارسی اور عربی زبانوں میں بھی ایک ہی جلد میں اتنی منقبتیں جمع نہ کی گئی ہوں گی چند سال پیشتر شفیق بریلوی صاحب نے سرورِ کائنات آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نعتوں کا ایک عظیم الشان مجموعہ مرتب کیا تھا۔ اگر اس کتاب سے ''شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ'' کا موازنہ کیا جائے تو میری رائے میں مولانا ضمیر اختر نقوی صاحب

کی کوشش زیادہ وقیع اور عظیم قرار پائے گی، کیونکہ اس میں نہ صرف شعراء کے کوائف اور ان کے کلام پر اجمالی طور پر تنقید کی گئی ہے بلکہ ادبی اور شعری تحریکات و روایات کا جائزہ بھی پیش کیا گیا ہے۔ جس سے مولانا ضمیر اختر کے ادبی ذوق اور ناقدانہ صلاحیت کا بین ثبوت ملتا ہے۔ اگر چہ اس مجموعے کو باضابطہ طور پر کسی یونیورسٹی کی طرف سے کسی بڑے ادبی محقق، ڈاکٹر، پروفیسر کی رسمی رہنمائی میں مرتب نہیں کیا گیا تو بھی یہ بلاشبہ نہ صرف ڈی لٹ کا مقالہ قرار دیا جاسکتا ہے، بلکہ میری رائے میں تو کسی یونیورسٹی کو چاہیے کہ وہ اس مقالے پر مولانا ضمیر اختر کو ڈی۔ لٹ کی اعزازی سند پیش کرے۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آئندہ اس کتاب کے مختلف موضوعات پر لوگ پی ایچ۔ ڈی کیا کریں گے اور مولانا ضمیر اختر کے لگائے ہوئے منقبت کے اس گلستانِ بے خزاں کی خوشہ چینی اور گل چینی باعثِ فخر سمجھیں گے۔

چونکہ یہ کتاب اُردو زبان میں نقشِ اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے اس میں فطری طور پر کچھ ترمیم و اضافہ کی گنجائش بہرحال نظر آتی ہے۔ اس مختصر سے مضمون میں تفصیل کی گنجائش نہیں، سرسری طور پر چند باتیں بطورِ مثال عرض کرتا ہوں۔ مثلاً بعض ابواب کی ترتیب میں اگر عشق، محبت، مودّت وغیرہ اور مدح، منقبت، ثنا وغیرہ کی تشریحات ہو جاتیں تو بہتر ہوتا۔ بعض شہ سرخیوں اور ذیلی سرخیوں پر بھی توجہ کی ضرورت ہے۔ صفحات نمبر ۱، ۵۷ اور ۲۸۷ پر ''شعرائے اُردو اور عشقِ علی'' درج ہے جو اصل کتاب کا عنوان بھی ہے۔ یہ عنوان پہلے صفحے پر تو ضروری ہے مگر بعد کے دو صفحات پر اصل کتاب کے عنوان کی تکرار ناقابلِ فہم ہے۔ اس کے علاوہ صفحہ نمبر ۲۸۷ سے پانچویں باب کی ابتدا ہوتی ہے جبکہ کسی دوسرے باب کی ابتدا میں یہ اہتمام اور یہ تزئین نظر نہیں آتی۔ یا تو ہر باب کی ابتدا اسی انداز میں ہوتی پانچویں باب کی ابتدا بھی

صرف صفحے کی پیشانی پر دوسرے ابواب کی طرح درمیانی سرخی سے ہوتی۔ اسی طرح باب چہارم اور باب ششم میں شعرا کے نام سرخیوں کے بغیر آئے ہیں اور غالباً اسی وجہ سے مرزا دبیر جیسے عظیم شاعر نگاہوں سے اوجھل ہو جاتے ہیں، جبکہ باب پنجم میں شعرا کے نام نہ صرف جلی سرخیوں بلکہ شہ سرخیوں میں درج ہوئے ہیں۔ اگلے اڈیشن میں اس کی تلافی ہو تو بہتر ہوگا۔ اگرچہ مولانا ضمیر اختر نقوی نے تمام عربی، فارسی اور اُردو شعرا کے کلام کا احاطہ کرنے کی پوری کوشش کی ہے، مگر بعض شعرا اور ان کے کلام کا تذکرہ یا تو نظر انداز ہو گیا یا تشنہ رہ گیا۔ مثلاً فارسی شعرا میں ملا کاشی کے مشہور و معروف ہفت بند کا صرف ایک شعر ضمناً آیا ہے۔ اس معرکتہ الآرا شہ پارے کے محاسن پر مولانا ضمیر اختر صاحب کی رائے متوقع تھی۔ ذخیرۂ مناقب نامی کتاب میں اور بھی کئی فارسی اور اُردو شعرا توجہ کے مستحق ہیں۔ اسی طرح فضل حق کی مثنوی "مولا علیؑ" اور عبدالعزیز خالد کی نظم "بوتراب" سے چند اشعار بطور اقتباس دے دیے جاتے تو بہت خوب ہو جاتا۔ ایک اور اہم منقبت عربی کی ہے جو غالباً مولانا ضمیر اختر نقوی کی نگاہِ انتخاب سے نہیں گزری اور وہ ہے ایک طویل ترین قصیدہ جو مولائے کائنات حضرت علیؑ کی شان میں بڑے والہانہ انداز میں کہا گیا ہے۔ یہ قصیدہ ایک عربی شاعر عبدالمسیح کی تصنیف ہے جو انطاکیہ کا رہنے والا تھا، بڑے پائے کا ادیب و شاعر تھا۔ اس نے بعد میں مصر میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ وہاں اس نے ایک رسالہ "العمران" نکالا جس میں مستند اور اعلیٰ ترین ادبا و شعرا کا کلام اور مقالے شائع ہوتے تھے۔ ایک بار اتفاقاً اسے "نہج البلاغہ" پڑھنے کا موقع ملا۔ وہ مولائے کائنات کے خطبات پڑھ کر حیران و ششدر رہ گیا کہ کوئی انسان ایسی فصاحت و بلاغت کے ساتھ بھی خطاب کر سکتا ہے چنانچہ اس نے حضرت علیؑ کی سوانح حیات اور تخلیقات کا بنظر غائر مطالعہ کیا اور پھر جوش

عقیدت میں ایک قصیدہ کہنا شروع کیا جو ۱۹۱۷ء میں شروع ہو کر ۱۹۱۹ء میں جا کر ختم ہوا۔ اس قصیدے میں پانچ ہزار اشعار ہیں۔ یہ قصیدہ "العمران" میں قسط وار شائع ہوا۔ اُردو زبان میں اس عظیم الشان شہ پارے کا تذکرہ حشمت حسین جعفری (حیدر آباد، سندھ) کی تصنیف شہاب ثاقب میں کیا گیا ہے۔ مندرجہ بالا منقبتوں کے علاوہ بعض بریلوی مسلک کے شعرا کی منقبتیں بھی قابلِ توجہ ہیں۔ مثلاً مولانا اسد القادری کی مثنوی (یا مسدس) "مرقع شہادت اور مذاق بدایونی کے سہرے میں جو حضرت علی اور حضرت فاطمہؑ کی شادی کے سلسلے میں ہے، بڑی والہانہ عقیدت کا اظہار ملتا ہے۔ اس سہرے کا یہ مصرع "خدا کے گھر کا شہزادہ، نبیؐ کے گھر کی شہزادی" حضرت علی سے والہانہ عشق کا برملا اظہار کر رہا ہے۔ اس سہرے میں جو کیف و سرور ہے، وہ ناقابلِ بیان ہے۔ دو اشعار اور ان کی تضمین ملاحظہ ہو:

کلام اللہ خود شاہد ہے جس کی پارسائی کا — گلِ رنگیں مہک اٹھا وہ باغِ مصطفائی کا
جہاں میں ہر طرف شہرہ تھا اس نغمہ سرائی کا — علی نوشہ بنا سہرا بندھا مشکل کشائی کا

ملا خلعت نبیؐ سے خلق کی حاجت روائی کا

حقیقت پا نہیں سکتے جو غافل ہیں زمانے کے — سمجھ میں آ نہیں سکتے رموز اس آستانے کے
عجب اسرار تھے اس شاہ کو نوشہ بنانے کے — پہنایا شہؐ نے خرقہ فقر کا بدلے اشہانے کے

دیا تاج اس کو ہر شاہ و گدا کی پیشوائی کا

آخر میں بلا خوفِ تردید یہ کہوں گا کہ مولانا ضمیر اختر نقوی کی تالیف "شعرائے اُردو اور عشقِ علی" کہنے کو تو محض ایک کتاب ہے مگر دراصل یہ ہزاروں کتابوں کا نچوڑ ہے۔ دیکھنے میں اگرچہ یہ تو سو بارہ صفحات پر مشتمل ہے، مگر درحقیقت یہ ایک ایسا کوزہ ہے جس میں ایک نہیں ہزاروں دریائے مودت و منقبت سمو دیئے گئے ہیں۔ اگر مولانا ضمیر اختر

صاحب زندگی بھر کچھ نہ کرتے تو بھی یہ کتاب اتنی عظیم، اتنی وقیع اور اتنی اہم ہے کہ ان کا یہ ایک ہی کارنامہ بعض بڑے بڑے ادیبوں اور شاعروں کی زندگی بھر کی کاوشوں پر بھاری ہوتا، بلکہ میں یہاں تک کہنا چاہتا ہوں کہ مولانا ضمیر اختر صاحب نے یہ کتاب تالیف کرکے نہ صرف قبولیتِ عام کے دربار میں ایک ممتاز مقام حاصل کرلیا ہے بلکہ جنت الفردوس میں اپنے لیئے ایک قصرِ زریں حاصل کرلیا ہے۔ اس کے علاوہ مجھے یقین ہے کہ جو کوئی حسنِ عقیدت سے اس کتاب کا مطالعہ کرے گا، اسے حضرت علی ساقیِ کوثر کی حیثیت سے شرابِ طہور کے جام سے ضرور سیراب فرمائیں گے، انشاء اللہ!

بادۂ عشقِ علی سے جس کا دل سرشار ہے ۔۔۔ دور اس سے آفت و بیماری و آزار ہے
حوضِ کوثر پر کہیں گے دے کے جام ہے علی ۔۔۔ پی لے، پی لے تو ہمارا عاشقِ غم خوار ہے

عباس حیدر زیدی

قبلہ ضمیر اختر نقوی السلام علیکم

میں نے آپ کی بہت ساری تقاریر سنی ہیں اور آپ کا بہت بڑا مداح ہوں۔

آپ نے دو تین سال قبل امام بارہ خیمہ سادات لاہور میں ۱۹ رمحرم کو ڈیڑھ گھنٹے کی تقریر امام حسین علیہ السلام کی جنگ پر کی تھی۔ جس میں روزِ عاشور امام علیہ السلام کی جنگ تفصیل سے پڑھی تھی۔ میرے کراچی میں رشتہ دار وہ تقریر اتنی ہی تفصیل سے سننا چاہتے ہیں۔ آڈیو میرے پاس ہے لیکن لاہور میں ہے۔ اور میں بھی آپ سے وہ تقریر دوبارہ live سننا چاہتا ہوں۔ برائے مہربانی جامعہ السبطین میں کسی روز تفصیل سے امام علیہ السلام کی جنگ پڑھ دیں۔ امید ہے آپ ہماری یہ خواہش ضرور پوری کریں گے۔ میں اور میرے رشتہ دار آپ کے انتہائی شکر گذار ہوں گے۔

شکریہ: عباس حیدر زیدی

پروفیسر سردار نقوی

عشقِ علیؑ کا چراغ

''شعرائے اردو اور عشقِ علیؑ'' نامی کتاب ایک ایسا ادبی شاہکار ہے جس میں عقیدت کے پھولوں کی بہار جلوہ افروز ہے۔ یہ کتاب ایک ایسی تاریخی دستاویز ہے جس میں صدیوں کی خوشبو کولمحوں کے گلابوں میں بسا دیا گیا ہے۔ یہ ایک ایسا صحیفۂ تحقیق ہے جس کا ہر ورق صاحب کتاب کے ذوقِ تحقیق کا قصیدہ ہے۔ ضمیر اختر نقوی کی یہ کتاب دراصل اس انسانیت کے ضمیر کی آواز ہے جو حق اور عدل کا پرستار اور ظلم و فساد سے بے زار ہے۔ یہ کتاب دعوتِ فکر ہے، دعوتِ انقلاب ہے، یہ انسانیت کے کمال کی شناخت کی کوشش اور اس کمال سے محبت اور عقیدت کی دعوت ہے۔

کسی کتاب کی حقیقت اور معنویت کا ادراک صاحب کتاب کی شخصیت کو سمجھے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا، اس لیے کہ کتاب اور صاحب کتاب ایک وحدت ہے، ایک ناقابل تقسیم وحدت جو ایک دوسرے کے تعارف کا قرینہ اور ایک دوسرے کی تفہیم کا وسیلہ ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب کے مصنف سید ضمیر اختر نقوی ایک کثیر الجہات شخصیت کے حامل ہیں۔ وہ ادیب ہیں، خطیب ہیں، عالم ہیں، محقق ہیں، لیکن ان کی شخصیت کا جوہر محمدؐ و آلِ محمدؐ کی مودت اور ان سے عقیدت ہے۔ یہی مودت اور عقیدت جب منبر خطابت سے لب کشا ہوتی ہے تو خطابت کا چمن مہک اٹھتا ہے اور جب دامنِ قرطاس پر جلوہ دکھاتی ہے تو لفظوں کے چراغ روشن ہو جاتے ہیں۔

ضمیر اختر نقوی کے علمی اور ادبی کارناموں کی تاریخ تقریباً ربع صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ میر انیس اور مرزا دبیر کی صد سالہ یادگار کے موقع پر انھوں نے "ماہِ نو" نامی رسالے کے انیس اور دبیر نمبر مرتب کر کے اپنی علمی اور تحقیقی صلاحیتوں کا لوہا منوالیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ان کی یہ کاوشیں کلاسیکل مرثیے کی معنویت کو اجاگر کرنے اور اس عظیم ادبی اور تہذیبی ورثے کو جو ایک جنتِ گم گشتہ کی حیثیت اختیار کرتا جا رہا تھا، از سرِ نو بازیافت کرنے کی کوشش بلکہ ایک کامیاب کوشش کی حیثیت رکھتی ہے۔ پاکستان میں کلاسیکل مرثیے کی نشاۃِ ثانی کی تاریخ میں ضمیر اختر نقوی کا نام سنہرے حروف سے رقم کیا جائے گا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے جدید مرثیے کے فروغ میں نہایت اہم اور بامعنی کردار ادا کیا ہے۔

ان کی کتاب "اُردو مرثیہ پاکستان میں" جدید مرثیے کی تحقیق و تنقید کے باب میں خشتِ اوّل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کتاب پر تبصرہ فرماتے ہوئے عالی جناب پروفیسر کرار حسین رقم طراز ہیں۔

> "کتاب کے موضوع کی ضرورت اور اہمیت کو نظر انداز کرنا ایسی خود فراموشی ہوگی جو تاریخ اور ثقافت کی شریعت میں جرم ہے، اور اگر ضمیر اختر نقوی کی محنت کی داد نہ دی جائے تو یہ ایسی ناقدری ہوگی جو احسان فراموشی کی حدود کو چھوتی ہے"۔

مرثیے کے حوالے سے ضمیر اختر نقوی صاحب نے بڑی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں جس کا ثبوت ان کی متذکرہ بالا تصنیفات کے علاوہ "جوش ملیح آبادی کے مرثیے" اور "اُردو غزل اور کربلا" نامی کتابیں ہیں، لیکن ان کی تحقیقی اور علمی کاوشوں کا دائرہ صرف مرثیے تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ انھوں نے شہید علمائے حق کے موضوع پر

بھی کئی نادر کتابیں تحریر کی ہیں جو ان کی علمی بصیرت اور تحقیقی مہارت کا روشن ثبوت ہیں۔

جس طرح قبلہ نما کا رخ قبلے کی طرف ہوتا ہے، اسی طرح ضمیر اختر نقوی کی ہر تخلیقی و تحقیقی کاوش کا رخ محمدؐ و آلِ محمدؐ کی عقیدت اور مودت کی طرف ہے۔ ان کی تقریر ہو یا تحریر علمی مضامین ہوں یا تحقیقی مقالے، ان سب کا قبلہ ایک ہی ہے اور وہ ہے محمدؐ و آلِ محمدؐ کی مودت جس کا علامتی اظہار عشقِ علیؑ ہے۔ عشقِ علیؑ ضمیر اختر نقوی صاحب کی شخصیت کا ایک رخ یا اس کی ایک جہت ہی نہیں بلکہ ان کی تمام شخصیت کا حاصل اور اس کا جوہر ہے۔ بالفاظِ دیگر یہی عشق ان کی تمام شخصیت کا تعارف اور اس کی معنویت کی حیثیت رکھتا ہے۔

اپنی زیرِ تبصرہ کتاب کی تدوین کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں:

"اس دورِ ناسپاس اور محروم سماعت زمانے میں علیؑ کا ذکر ہر حساس اور اہلِ نظر کا فرض بھی ہے اور ضرورت بھی اور یہی عشقِ علیؑ میرا سرمایۂ حیات اور ایمان ہے"۔

ضمیر اختر نقوی قابلِ مبارک باد ہیں کہ ان کا سرمایۂ حیات عشقِ علیؑ ہے۔ مزید قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ وہ اس بات کا شعور بھی رکھتے ہیں کہ عشقِ علیؑ کی دولت وہ بے بہا دولت ہے، جس کے سامنے دنیا کی ہر دولت و اقتدار ہیچ ہے، اس لیے کہ عشقِ علیؑ وہ روشنی ہے جو حیات و کائنات کی حیثیت و معنویت کو اجاگر کر کے انسان کو اس کی زندگی کی صحیح قدر و قیمت سے آگاہ اور اس کائنات میں اس کے مقام و منصب سے متعارف کراتی ہے اور اس کے لیے جہد و عمل کی ایسی راہیں کھولتی ہے جو اسے انسانیت کے کمال کی طرف لے جاتی ہیں۔ اس سے بھی زیادہ قابلِ تعریف بات یہ ہے کہ ضمیر اختر نقوی اس بیش بہا سرمائے کو اپنی ذات تک محدود نہیں رکھنا چاہتے بلکہ اسے دوسروں میں تقسیم کرنا چاہتے ہیں کہ یہی قرآن کے حکمِ انفاق کا تقاضا اور ایمان

اور تقویٰ کی پہچان ہے۔ ضمیر اختر نقوی کی تمام مساعی، ان کی ہر تحریر و تقریر کا مقصد اسی دولتِ عشق کو لوگوں میں تقسیم کرنا ہے اور یہ کام وہ پوری آگاہی اور ذمے داری کے ساتھ انجام دے رہے ہیں جیسا کہ وہ رقم طراز ہیں۔

"حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں کہ اپنے بچوں کی تربیت محبتِ علیؑ پر کرو، لہٰذا حضور سرورِ کائناتؐ کے فرمان کی روشنی میں زندگی کا جو لمحہ حضرت علی علیہ السلام کی محبت وارادت و معرفت و غلامی میں بسر ہو، وہی کامیاب و کامران زندگی ہے۔ عشقِ علیؑ میں اگر کوئی شخص مرجائے تو وہ شہید مرتا ہے۔ اس کتاب میں اپنی زندگی کے چراغوں کو گل کرکے عشقِ علیؑ کے چراغ جلانے والوں کا تذکرہ بھی ہے اور ان شعرا کے خلوصِ دل کا خراج بھی ہے جنھیں گردشِ ایام، یورشِ آلام، ریاستی جبر کا لامتناہی سلسلہ اور ظلم واستبداد کی لاکھوں تلواریں علیؑ سے دور نہ کرسکیں اور جو ہر دور میں باطل کے ایوانوں میں محبتِ علیؑ کی شمعیں روشن کیے رہے"۔

ضمیر اختر نقوی کے یہ مختصر سے جملے اگر ایک طرف اس معرفت کے آئینہ دار ہیں جو انھیں عشقِ علیؑ کی عظمت اور معنویت کے باب میں حاصل ہے تو دوسری طرف اس تاریخی بصیرت کی نشان دہی کرتے ہیں جو ان کے تحقیقی شعور کا ثمر ہے۔ قرآن وحدیث کی تاکید واصرار کے باوجود ظالم و جابر حکمران لوگوں کو عشقِ علیؑ کی دولت سے محروم رکھنے و جہل کی تمام طاغوتی طاقتیں عشقِ علیؑ کے چراغ کو بجھانے کے درپے ہیں، لیکن ضمیر اختر جیسے صاحبانِ علم ومعرفت ایسی تمام طاقتوں کو یہی سمجھانے کی کوشش کررہے ہیں کہ۔

نورِ خدا ہے کفر کی حرکت پہ خندہ زن
پھونکوں سے یہ چراغ بجھایا نہ جائے گا

اگرچہ اس کتاب کا نام ''شعرائے اُردو اور عشقِ علی'' ہے لیکن اس کے مضامین کی گیرائی اور گہرائی اس سے کہیں زیادہ ہے۔ اس میں قرآن وحدیث کے حوالوں سے عشقِ علی کی سند پیش کی گئی ہے اور عبقات الانوار جیسی کتابوں سے اس کی عظمت اور ضرورت پر استدلال پیش کیے گئے ہیں۔ ان مضامین کو ضمیر اختر صاحب نے جس حُسن وصراحت سے بیان کیا ہے، اس کے متعلق یہی کہا جا سکتا ہے کہ یہ اس کی دین ہے، جسے پروردگار دے۔

ضمیر اختر نقوی نے اس کتاب کا انتساب ان ہستیوں کے نام کیا ہے جو تاریخ میں عشقِ علی کی عظمت اور معنویت کی علامت ہیں۔ یہ انتساب بجائے خود نہایت فکر انگیز ہے۔ یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ عشقِ علی وہ زبردست تخلیقی قوت ہے کہ جب وہ لفظوں میں ڈھلتی ہے تو شعر وادب کے وہ شاہکار ظہور میں آتے ہیں جن کا انتخاب اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے، اور جب یہ تخلیقی قوت عمل کے روپ میں ظاہر ہوتی ہے تو تاریخ انسانی کے افق پر انسانیت کے وہ شاہکار طلوع ہوتے ہیں جن کے برگزیدہ ناموں سے اس کتاب کا انتساب کیا گیا ہے۔

خلاصہ یہ کہ یہ کتاب جس عقیدت اور بصیرت کے ساتھ لکھی گئی ہے، وہ حد درجہ لائقِ تحسین ہے۔ اس کتاب کی اہمیت کا اعتراف اعلیٰ اور پاکیزہ انسانی اقدار سے محبت کا تقاضا ہے، اور اعلیٰ اور پاکیزہ اقدار سے محبت ہر انسان کی طبعی شرافت اور فکری نجابت کی کسوٹی ہے۔

☆☆☆

پروفیسر وحید الحسن ہاشمی

دریائے عشق کے دو کنارے

محمدؐ و آلِ محمدؐ کی ذات اور حق کے لیئے ان کی قربانیاں تاریخِ انسانیت کا وہ نقطۂ عروج ہے۔ جس تک پہنچنے اور حاصل کرنے کے لیئے اہلِ جہاں مدتوں سے کوشاں ہیں۔ اُردو شاعری نے اپنے حافظے میں ان تمام واقعات و حادثات کو سمیٹ کر کبھی نعت، کبھی منقبت اور کبھی مرثیے کی شکل میں ہمارے سامنے پیش کردیا۔ اُردو مرثیہ، جو خالصتاً اُردو کی چیز ہے، اپنے اندر وہ سب کچھ رکھتا ہے۔ جس کی آج کے دور کو ضرورت ہے۔ جدید دور میں وہی رثائی اظہار نظم اور غزل کی صورت میں رونما ہو رہا ہے آج ہم جسے مزاحمتی ادب کہتے ہیں۔ اس کی بنیاد چودہ سو برس قبل ہی پڑ گئی تھی۔ عربی اور فارسی زبان کے شعرا نے کبھی پوشیدہ، کبھی کھلم کھلا اس کا اظہار بھی کیا، وہی روایت براہِ راست اُردو شعرا کو ملی اور انھوں نے تشبیہوں اور استعاروں میں اپنا مافی الضمیر عوام تک پہنچانے کی کوشش کی۔ چونکہ اُردو کے نقاد مغرب کے نقادوں کی طرح آزاد خیال نہ تھے، اس لیئے وہ صحیح معنوں میں شعر کے اصل مفہوم کو نہ سمجھ سکے اور روایتی بیان کر کے سبک دوش ہو گئے۔

اس دور میں جناب ضمیر اختر نقوی بیک وقت دو سمتوں میں کام کر رہے ہیں۔ انھیں اُردو ادب سے بھی دلچسپی ہے اور مذہب کے ارتقا کا بھی خیال ہے۔ ''شعرائے اُردو عشقِ علیؑ'' کتاب لکھ کر انھوں نے دریائے عشق کے دونوں کناروں پر قبضہ کرلیا ہے اور

جس کام کو شیخ ممتاز حسین جونپوری نے ادھورا چھوڑ دیا تھا، اسے بطریقِ احسن مکمل کر دیا۔ کتاب کا ہے کو ہے، عشقِ علی کا انسائیکلو پیڈیا ہے۔ جس قدر مواد اس کتاب میں جمع کر دیا گیا ہے، اس کی نظیر دنیائے اُردو میں ملنی مشکل ہے اور اشعار کی جس رنگ اور جس نہج سے تشریح کی گئی ہے، اس سے مصنف کی بالیدگیِ فکر کا اندازہ ہوتا ہے۔ یہ شعور باطنی استعداد علمی کی بخشش نہیں ہے بلکہ عطائے ایزدی ہے۔

جناب ضمیر اختر نقوی صاحب منبر ہیں مگر ملائیت سے کوسوں دور ہیں۔ وہ اہلِ زبان نہیں، آلِ زبان ہیں، انھیں خبر ہے کہ شعر خیال میں کہاں جنم لیتا ہے اور کاغذ تک آتے آتے کتنے ہفت خواں طے کرتا ہے، یہی سبب ہے کہ انھوں نے شعر کی ماہیت اور اس کی اصل غایت پر نگاہ رکھی، اور پھر ان اشعار کا اہلِ بیتؑ کی سیرت و کردار سے ایسا اٹوٹ رشتہ قائم کیا ہے کہ اکثر نقادوں کے خواب و خیال میں بھی یہ نکات نہیں آسکتے تھے۔

جناب ضمیر اختر نقوی نے یہ کتاب مختلف نقطۂ نظر سے تحریر کی ہے۔ عشقِ علی تو وہ موضوع ہے جس پر دنیا کا ہر شاعر اور ادیب متفق ہے۔ برصغیر پاک و ہند میں یہ کوششیں شروع ہوئیں کہ منقبتِ اہلِ بیتؑ سے کنارہ کشی کی جائے۔ مصنف نے اس کتاب میں یہ التزام کیا ہے کہ صرف شیعہ شعرا ہی نہیں بلکہ اہلِ سنت اور ہندو شعرا کی منقبتوں کے نمونے پیش کر دیے تاکہ دنیا کو یہ معلوم ہو سکے کہ علی کسی گروہ، کسی قبیلے اور کسی حلقے سے تعلق نہیں رکھتے بلکہ یہ خدا کا وہ انمول تحفہ ہے جو حضورؐ کی وساطت سے عام انسانوں تک پہنچا ہے اب اگر اس مرکزِ علم و ادب سے کوئی اکتسابِ فن کرتا ہے تو بڑا خوش نصیب ہے اور اگر اغماض برتتا ہے تو اپنا نقصان کرتا ہے۔

مصنف نے چلتے چلتے اس الزام کے بُت کو بھی توڑ دیا کہ منقبت، لکھنوی فضا کی پیداوار ہے، چونکہ لکھنؤ کے بادشاہ شیعہ عقائد رکھتے تھے، اس لیے منقبتی شاعری کو اسی

دور میں عروج حاصل ہوا۔ مصنف نے عرب، عجم، دکن، دہلی اور لکھنؤ سے کوسوں دور کے شعرا کا کلام پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ منقبت تو اس وقت بھی کہی جا رہی تھی جب شاہان اودھ پیدا ابھی نہیں ہوئے تھے۔ لکھنوی شاعری سے نفرت کی وجہ شیعیت نہیں بلکہ لوگوں کا وہ سکون و تحمل اور وہ تن آسانیاں تھیں جو معاشرے نے انھیں مہیا کی تھیں اور جن سے دیار غیر کے لوگ نا آشنا تھے۔ اس سلسلے میں خود مصنف ہی کی تحریر ملاحظہ ہو:

> "جب سماج میں زوال کے آثار نظر آتے ہیں تو عقائد کے اختلافات علمی اور تحقیقی سطح سے گر کر ذاتی رنجشوں کی شکل اختیار کر لیتے ہیں اور ان کا موقف تلاش حق کے بجائے ذاتیات کی تشفی اور انتقام ہو جاتا ہے۔ اودھ کے عروج سے حسد پیدا ہو رہا تھا۔ اسی حسد کی وجہ سے تحفۂ اثنا عشریہ ایک مناظرے کی کتاب لکھ کر محدث دہلوی نے اختلافات کو اور ہوا دی" (صفحہ ۲۶۷)۔

یہ سوال کہ مصنف نے اس کتاب کو جوش ملیح آبادی پر کیوں ختم کر دیا اور درمیان میں بہت سے منقبت نگاروں کو چھوڑ دیا، زیادہ اہم اس لیے نہیں ہے کہ یہ ایک ادبی کتاب ہے، شعرا کی تاریخ نہیں ہے۔ مصنف نے جتنا اور جو کچھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے، وہ ذخیرہ کم نہیں ہے۔ جس روانی اور شگفتگی سے یہ سارا ماجرا بیان ہوا ہے اور جس انداز میں یہ گنجینۂ بے بہا تیار ہوا ہے، وہ تعریف سے بالا ہے۔ ہر لفظ اور ہر جملہ اپنی پوری معنویت کے ساتھ جلوہ گر ہوا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ حدیث دیگراں حدیث دل بن کر سامنے آگئی ہے۔ تحقیق و تنقید دو الگ الگ محاسن ادب ہیں، لیکن ضمیر اختر نقوی نے دونوں رویوں کو ایسا گھلا ملا کر پیش کیا ہے جیسے دریا میں روانی یا جسم میں جان ہوتی ہے۔

☆☆☆

پروفیسر محمود الحسن رضوی:

یہ کتاب ہر لائبریری اور ہر گھر میں ہونی چاہیے

مجھ جیسے تہی دامنِ علم کا یہ منصب کہاں کہ اردو کے نامور اور معروف قدیم و جدید عرفا اور شعرا کے والائے مولا علی سے معطر اظہارِ عقیدت کے لاتعداد گلزاروں سے معرفت و عشقِ علی کے مختلف رنگ اور ڈھنگ کے منتخب پھولوں کی خوشبو سے مہکتے ہوئے اس گلدستے کے متعلق کچھ لکھ سکوں۔

پیشِ نظر صحیفے کے مدوّن سید ضمیر اختر نقوی کی ذات محتاجِ تعارف نہیں۔ آپ عوام میں ایک شعلہ بیان خطیب اور مناظر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ اس لیے اکثر حضرات آپ کے زورِ بیان سے تو واقف ہیں لیکن شرح خواندگی کی کمی اور عدم دلچسپی کی وجہ سے نسبتاً بہت کم حضرات کو آپ کی قوتِ تحریر کا اندازہ ہے، حالانکہ ادبی حلقوں میں آپ ایک مخصوص مقام حاصل کر چکے ہیں۔ جن حضرات نے آپ کی ''جوش کے مرثیے'' اور ''اردو مرثیہ پاکستان میں'' جیسی گراں بہا کتابوں کا مطالعہ کیا ہے، وہ آپ کی تحقیقی اور تنقیدی لیاقت اور بالغ نظری کا اعتراف کیے بغیر نہ رہ سکے۔ موصوف نے خود کو مذہبی، بالخصوص اہلِ بیتِ رسولؐ سے متعلق شاعری کی تحقیق و تنقید کے لیے وقف کر کے وجہ تخصیص حاصل کیا ہے۔

سید ضمیر اختر نقوی صاحب نے لکھنؤ کی مرثیہ خوانی، قصیدہ خوانی اور منقبتی مجلسوں اور محفلوں کے روح پرور ادبی ماحول میں پرورش و پرداخت اور نشو و نما پائی اس لیے خاندانِ نبوت کی ذواتِ مقدسہ کی محبت آپ کے دل و دماغ میں رچ بس گئی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ محبت محمدؐ و آلِ محمدؐ آپ کی گھٹی میں پڑی ہے تو غلط نہ ہوگا، اور اسی لیے آپ نے اپنی تمام تر صلاحیتوں اور توانائیوں کو اہلِ بیتِ رسالت کے فضائل و مصائب بیان کرنے اور ان کے پیغام کو عام کرنے کے لیے وقف کر دیا ہے اور بڑی دل جمعی کے ساتھ اپنے مشن کے لیے کام کر رہے ہیں۔ لکھنوی اثرات کے تحت آپ کے انداز میں نزاکت اور بیان و طرزِ نگارش میں شگفتگی اور اہلِ زبان کا نکھار ہے، لیکن ساتھ ہی اس مخصوص ماحول کا اثر ہے کہ آپ میں مذہب میں انتہا پسندی اور لکھنؤ سے محبت شدت پسندی کا رنگ اختیار کر گئی پروفیسر ممتاز حسین صاحب نے آپ کی تصنیف ''اردو مرثیہ پاکستان میں'' پر تبصرہ فرماتے ہوئے تحریر کیا کہ ''موصوف لکھنوی ہونے کی وجہ سے دبستانیت میں زیادہ مبتلا ہو گئے''۔ زیرِ نظر مجموعے میں بھی موصوف کا یہ انداز برقرار ہے۔ اپنے علاقے کے شعرا کا تذکرہ اور تہذیب و تمدن کی خوبیاں بیان کرنا اور احساسِ برتری میں مبتلا ہونا بھی محلِ نظر نہیں، لیکن دوسرے علاقوں سے صرفِ نظر کرنا اور عیب جوئی کی حد تک نکتہ چینی بھی مستحسن نہیں، جیسا پیشِ نظر مجموعے میں روہیل کھنڈ، پنجاب، راجپوتانہ، سندھ کے اردو شعرا اور بالخصوص نجم آفندی اور استاد قمر جلالوی جیسے شعرا سے اغماض، نظیر اکبر آبادی جیسے عظیم المرتبت شاعر کی کلیات پر تنقید کہ وہ خرافات سے بھرا پڑا ہے، نیز منقبت گو شعرا میں شیعہ سنی کی تخصیص، تصوف سے بے زاری اور میلاد و محافل کا ہندوؤں تہواروں کے تبادل ہونا ایک تہی مغز کی سمجھ سے بالاتر ہے

(صفحات ۲۶۶۔۲۶۸)

بہر حال یہ ایک حقیقت ہے کہ اُردو میں منقبت کے موضوع پر ابھی تک کوئی قابلِ ذکر تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔ علمی و ادبی اداروں سے یا کسی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں بھی اُردو منقبت نگاری پر اب تک کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔ سید ضمیر اختر نقوی کا زیرِ نظر مجموعہ اس موضوع پر بڑی حد تک ایک کامیاب اور وقیع کاوش ہے۔ آپ نے اپنے اہم دفینے کو ایک زندہ خزینے کی صورت دی جس میں اُردو شاعری کے مختلف ادوار کے جواہر نگاروں کی تصویر کشی کے ساتھ منقبت گوئی کا ارتقائی جائزہ بھی ہے اور اسالیب کا ذکر بھی۔ آپ نے اکثر قدیم شعرا کے اشعار کی تشریح کے ساتھ متروک الفاظ کے معنی بھی دے دیئے ہیں تاکہ قاری کو مدحتِ مولا علیؑ کے اشعار کی باریکیوں کو سمجھنے میں آسانی ہو۔ موصوف نے منقبت نگاری کے محاسن اور معیار کو پوری طرح سمجھا اور برتا ہے۔

سید ضمیر اختر نقوی اُردو میں رثائی ادب اور رزمیہ شاعری پر تقریروں، مباحثوں اور تالیفات سے اپنی حیثیت منوا چکے ہیں۔ زیرِ نظر مجموعے میں گو کہیں کہیں تنقید نگاری کے ساتھ خطیبانہ، تبلیغی اور مناظرانہ انداز نظر آتا ہے۔ تاہم منقبت گوئی پر علمی و ادبی معیار اور خوبیوں کی وجہ سے اُردو ادب میں یہ منفرد کتاب سنگِ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ نے اُردو ادب کے اس زریں باب کی تدوین کی ہے جو اپنی اہمیت اور افادیت کی وجہ سے موصوف کا نام روشن کرتا رہے گا۔ یوں بھی پاکستان میں ناصبیت اور خارجیت کی تجدید عمل میں آئی ہے، اس لیے اس کی اشد ضرورت تھی کہ یہ مجموعہ شائع ہوتا تاکہ عام اُردو داں طبقے کو پتہ چل سکے کہ مدحتِ علیؑ اور عشقِ علیؑ شیعوں کی اجارہ داری نہیں اور اسے شیعہ سنی میں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ مولا علیؑ کی تو یہ معجز نمائی ہے کہ نہ صرف مسلمانوں بلکہ برصغیر پاک و ہند کے لاتعداد ہندو اور سکھ اُردو شعرا نے بھی آپ کی شان میں منقبتی اشعار کہے ہیں۔ یہ بات دوسری ہے کہ اس مجموعے میں صرف ایک ہندو شاعر کا کلام

شریک اشاعت ہوسکا اور شریمتی دیوی روپ کماری، ماتھر اور کنور مہندر سنگھ بیدی کا کلام بھی جگہ نہ پاسکا۔ حقیقت یہ ہے کہ جس میں عشقِ علیؑ نہ پایا جائے، وہ شیعہ مسلمان تو درکنار سُنّی مسلمان بھی نہیں ہوسکتا، البتہ اسے ناصبی منافق اور خارجی کہا جاسکتا ہے، کیونکہ بقول حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت علیؑ کی شان میں تین سو آیات قرآنی نازل ہوئیں اور آپ کی عظمت کی گواہ رسول اکرمؐ کی لاتعداد حدیثیں ہیں جن میں ایک غیر متنازعہ اور متفقہ حدیث یہ ہے کہ۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! میں تمہیں وصیت کرتا ہوں اپنے بھائی اور اپنے چچا کے بیٹے علی ابن ابی طالبؑ سے محبت کرنے کی، کیونکہ علی ابنِ ابی طالبؑ سے مومن کے علاوہ کوئی محبت نہیں رکھے گا اور علی ابنِ ابی طالبؑ سے کوئی بغض نہیں رکھے گا سوائے منافق کے۔

(ذخائر العقبیٰ، علامہ محب طبری، صفحہ ۹۱، مطبوعہ مطبعۃ السعادۃ، قاہرہ، ۱۳۵۶ھ)

اس حدیث کی اسناد اور راویوں کے متعلق مولانا مرزا جعفر حسین صاحب نے "معیارِ ایمان ونفاق" کے عنوان پر ایک کتاب تحریر کی ہے جس میں اس حدیث کے لاتعداد حوالے دیئے ہیں اس لیئے نہ صرف یہ کہ متعدد صحابہ کرام عشقِ علیؑ سے سرشار تھے بلکہ آپ کو ختمی مرتبتؐ کے بعد سب سے افضل جانتے تھے، جیسا کہ شیخ ابوزہرہ مصری کی مشہور کتاب "حیاتِ ابوحنیفہ" ترجمہ شائع کردہ معارف اعظم گڑھ نے صفحہ ۱۹۷ پر "تفضیلِ علیؑ کا عقیدہ" کے عنوان کے تحت تحریر کیا ہے کہ۔

شیعہ کے نزدیک حضرت علیؑ، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے اختیار کردہ خلیفہ اور تمام صحابہ سے افضل تھے۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ

حضرت علیؓ کے افضل صحابہ ہونے کے عقیدے میں شیعہ منفرد نہ تھے بلکہ صحابہ بھی اس کے قائل تھے۔ چنانچہ عمار بن یاسرؓ، مقداد بن اسود، ابوذر غفاریؓ، سلمانؓ فارسی، جابر بن عبداللہ، ابن ابی کعبؓ، حذیفہؓ، بریدہؓ، ابوایوبؓ، سہلؓ بن حنیف، عثمان بن حنیف، ابوالہیثمؓ، خزیمہؓ بن ثابت، ابوالطفیلؓ، عامر واثلہؓ، عباسؓ بن عبدالمطلب اور ان کے بیٹے اور تمام بنی ہاشم تفضیل علیؓ کا عقیدہ رکھتے تھے۔ ابتدا میں زبیر کا بھی یہی خیال تھا، پھر اس سے رجوع کرلیا۔ بنوامیہ میں بھی بعض لوگ اس کے قائل تھے، مثلاً خالد بن سعید بن عاص اور عمر بن عبدالعزیزؒ"۔

اس کتاب کے باب "امام ابوحنیفہ کے سیاسی افکار" کے تحت صفحہ ۲۹۰ پر تحریر فرمایا کہ۔

"آپ (ابوحنیفہؒ) کی داستانِ حیات کے تذکرے میں ہم نے جو واقعات بیان کیے، ان سے دو باتوں کا پتہ چلتا ہے۔ امام ابوحنیفہ کی رائے میں حضرت علیؓ سے جو لڑائیاں لڑیں، ان سب میں حق و صواب حضرت علیؓ کی جانب تھا۔ حضرت علیؓ کے مخالفین کی کوئی تاویل ان کی نگاہ میں قابلِ تسلیم نہ تھی۔ نیز ابوحنیفہ کے بیٹے حماد اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ انھوں نے فرمایا علیؓ ہمیں عثمان سے زیادہ عزیز ہیں اور یہ کہ آپ کا طبعی رجحان و میلان حضرت علیؓ کی اس اولاد کی جانب تھا جو حضرت فاطمہؓ کے بطنِ اطہر سے تھی، اور یہی میلان آپ کی ابتلا کا سبب ہوا اور ابتلا بھی ایسا شدید کہ آپ کے

شہید ہونے میں تھوڑی کسر رہ گئی''۔ امام ابوحنیفہ سے دریافت کیا گیا: ''آپ یومِ جمل کے بارے میں کیا ارشاد فرماتے ہیں؟'' تو انھوں نے کہا: ''حضرت علیؓ کا رویہ اس میں مبنی بر انصاف تھا۔ وہ سب مسلمانوں سے زیادہ اس حقیقت سے آگاہ تھے کہ اہلِ بغی و فساد سے حرب و پیکار کے بارے میں اسلامی لائحہ عمل کیا ہے''۔

مولانا مودودی نے بھی اپنی کتاب ''خلافت و ملوکیت'' کے باب ہشتم ''خلافت اور اس کے متعلق مسائل میں امام ابوحنیفہ کا مسلک'' میں مستند حوالوں سے یہی اظہارِ خیال کیا ہے۔ جلیل احمد رانا نے اپنی کتاب اسبابِ شہادت الامام اعظم ابوحنیفہ، شائع کردہ مجلسِ رضا رجسٹرڈ، لاہور کے صفحہ ۱۳ پر تحریر فرمایا کہ۔

''تعلیم دقائق کتاب و سنت و معارف کے من جملہ شیوخ اس فن کے آپ کو امام الائمہ زبدۂ خاندانِ نبویؐ، قدوۂ دودمانِ مرتضوی، امام محمد باقر رضی اللہ عنہ سے خاص نسبت تھی اور بیعت بھی انھی سے تھی۔ مقاماتِ علیہ کی سیر حضرت ابن رسول اللہ صلی علیہ و آلہ وسلم مجمع الحق امام ہمام جعفر صادق رضی اللہ عنہ، چنانچہ امام ابی یوسف اور وکیع سے منقول ہے کہ ابوحنیفہ جعفر صادق رضی اللہ عنہ کے مزارِ پُر انوار پر بڑی عقیدت سے جاتے تھے عتبہ (آستانہ) عالیہ کی خود جاروب کشی کرتے اور مجاوروں کو کچھ دیتے''۔

امام شافعی کی اہلِ بیتؓ سے والہانہ محبت و عقیدت اور منقبت نگاری کا تذکرہ اس کتاب کے صفحہ ۸۵ پر دیکھا جا سکتا ہے۔ امام احمد بن حنبل فرماتے تھے کہ صحیح حدیثوں

میں حضرت علی کے جتنے فضائل ہیں وہ کسی کے بھی نہیں۔ ان کا یہ قول تواتر سے منقول ہے کہ "خلافت نے علی کو شرف نہیں بخشا بلکہ علی نے خلافت کو عزت دی" (تعمیر حیات ندوۃ العلما لکھنؤ، ۱۰ مارچ ۱۹۹۲ء) امام نسائی نے خصائص نسائی "مناقب مرتضوی" میں حضرت علی کی شان میں ۱۹۱ احادیثیں نقل کی ہیں۔

صوفیائے کرام کے تمام سلسلے، بلا نقشبندی کے، حضرت علی پر منتہی ہوتے ہیں، آپ ہی کے در سے صوفیا اور فقرا کو عرفان و آگہی کا رزق ملتا ہے، قادری، چشتی، سہروردی، شطاری اور دیگر سلسلوں کے عام شعرا نے مولا علی کی شان میں معرکتہ الآرا قصائد کہے ہیں اور حیدریوں اور قلندریوں کا تو وظیفہ حضرت علی کی منقبت رہی ہے۔ البتہ سلسلۂ نقشبندیہ کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حضرت ابوبکرؓ پر منتہی ہوتا ہے، جبکہ وہ بھی امام حضرت صادق ان کے نانا حضرت قاسم اور مومن قریش حضرت محمد بن ابوبکر سے متعلق ہے جو باب مدینۃ العلم سے فیض یاب ہوئے، کیونکہ آپ کی پرورش جناب امیر علیہ السلام ہی نے کی اور وہ حضرت علی کے عشق میں ہی رتبہ شہادت پر فائز ہوئے۔ بر صغیر میں اسی سلسلے کے سرخیل اور شیعیت کی مخالفت کے علم بردار مجدد الف ثانی بھی، جیسا کہ اس صحیفے کے صفحہ ۱۸۸ پر موصوف کے ملفوظات سے واضح ہو رہا ہے، محبت علی کو جزو ایمان سمجھتے تھے، جیسا کہ جناب نے ایک مکتوب میں تحریر کیا کہ "حضرت علی امیر المومنین علیہ السلام کی محبت اہل سنت والجماعت کی شرط ہے، اور جو شخص یہ محبت نہیں رکھتا، وہ اہل سنت سے خارج ہے، اس کا نام خارجی ہے"۔

مجدد الف ثانی کے مکتوبات کا حوالہ دیتے ہوئے حکیم مولوی انیس احمد صدیقی نے اپنی کتاب "مسلک اعتدال"، شائع کردہ مجلس اشاعت اسلام (مسلک شاہ ولی اللہ، لاہور ۱۳۹۹ھ)، صفحہ ۶۲ پر تحریر فرمایا:

"شیعہ صاحبان ائمہ اثنا عشر کو معصوم سمجھتے ہیں اور بارہ اماموں کے متعلق اکابرینِ اہلِ سنت والجماعت کا عقیدہ اور تحقیق ہے کہ یہ حضرات قصرِ ولایت کے سلاطین ہیں اور بارگاہِ ایزدی میں قربِ ولایت کے اعلیٰ مناصب و مقام پر فائز ہیں اور ائمہ اربع امام اعظم ابوحنیفہ، امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ کے بھی پیشوا اور امام ہمام ہیں"۔

اولیاء اللہ اہلِ سنت کے نزدیک محفوظ ہیں، یعنی یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی حفاظت و حمایت میں ہیں۔ اسی سلسلے کے دوسرے بزرگ شاہ ولی اللہ فیض الحرمین میں تحریر فرماتے ہیں "میری طبیعت اور میرے فکر کو جب اپنے حال پر چھوڑ دیا جائے تو دونوں حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو فضیلت دیں اور دونوں کو حضرت سے شدید محبت ہے۔" اور اسی کتاب میں شاہ صاحب کا یہ قول بھی نقل ہے: "تفضیلِ شیخین (یعنی حضرت ابوبکر و حضرت عمر کا حصول خلافت کے لحاظ سے افضل ہونا) کا عقیدہ ایک چیز ہے کہ میرے ذاتی میلانات کے خلاف مجھے اس کے ماننے کا حکم ہوا ہے" (رودِ کوثر، شیخ محمد اکرام، صفحہ ۵۵۲)۔ یعنی دل سے حضرت شاہ ولی اللہ بھی تفضیلِ علیؑ کے قائل تھے۔

وصی رسول الثقلین صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم حضرت علی علیہ السّلام کے لاتعداد معجزوں میں یہ بھی ایک نمایاں معجزہ ہے کہ آپ کے بازوئے شمشیر زن سے مغلوب، زخم خوردہ جاہلیت اور سپر انداز استسلام کرنے والے طلقا اور مفتوحین تک وصال رسول اکرم کے بعد اپنے فاتح حریف سے بدلہ لینے کے لیے بے چین نظر آئے اور حکمرانوں کی سیاسی ضرورت اور کمزوریوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ریاستی معاملات میں اثر و نفوذ حاصل کرلیا اور جلد ہی اس پر قبضہ کر کے ملک عضوض (شکستی بادشاہت، انقلاب معکوس کے

بانیوں اور شاہانِ بنو اُمیہ (احیائے دین مولانا مودودی ص ۳۶) نے اسلام کے نام پر اپنے دورِ حکمرانی میں حضرت علی ابن ابی طالبؑ کے خلاف دریدہ دہنی کی بدعت کی ابتدا کی۔ بنی عباس کے دور میں بھی ناصبیت کا انداز برقرار رہا اور اس طرح تقریباً سو سال پر محیط دور اپنے میں حضرت علیؑ کے مداحوں کو کسی بھی بہانے گرفتار کر لیا جاتا، سزا دی جاتی اور ڈرے لوگ حضرت علیؑ کے حق میں زبان کھولنے اور قلم چلانے سے ڈرتے تھے کیونکہ چشم زدن میں ان کی گردن اڑا دی جاتی، انھیں دیواروں میں زندہ چن دیا جاتا، لیکن اس کے باوجود ہر دورِ استبداد میں عشقِ علیؑ میں سرشار میثم تمار اور حجر بن عدی جیسے دل والے اور قنبر، ابنِ سکیت اور کمیل ابنِ زیاد جیسے متوالے افراد بھی پیدا ہوتے رہے جو موت سے لاپروا ظالم و جابر حکمرانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مشکل کشائے دو جہاں کی مدح سرائی کرتے۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے:

فرازِ دار سے میثم بیان دیتے ہیں
رہے گا ذکرِ علیؑ، ہم زبان دیتے ہیں

اور ذکرِ علیؑ اس آب و تاب اور تسلسل کے ساتھ باقی رہا کہ نہ صرف علما، حکما، فضلا، دانش وروں اور شعرا کی محفلوں میں خطیبِ منبرِ سلونی کا ذکر رہا بلکہ "قاہرہ سے دہلی کے بازاروں اور گلی کوچوں میں شیرِ خدا کی شجاعت و سخاوت کے کارنامے اور معجزات بیان ہوتے رہے ہیں"۔ اور آج عالمِ اسلام کے چپے چپے اور چار دانگ عالم میں عشقِ علیؑ کے زمزمے سنائی دیتے ہیں۔

اُردو جیسا کہ کہا جاتا ہے کہ لشکروں کے پڑاؤ میں برج بھاشا اور فارسی کے اختلاط سے معرضِ وجود میں آئی، لیکن یہ حقیقت بھی بڑی اہم ہے کہ مقامی بولیوں کو ایک دوسرے کے قریب لانے میں صوفیوں، حیدریوں اور مولائیوں کی محفلوں اور ان کے

مزارات پر عرس اور میلوں میں، جہاں عشقِ علیؑ کے چرچے عام ہوتے ہیں، باہمی اختلاط کی بدولت اُردو کو فروغ نصیب ہوا۔ اس لیئے یہ کہنا بھی صحیح ہے کہ اُردو زبان کی ترویج واشاعت میں عشقِ علیؑ کے فیض وکرامت کو بھی بڑا دخل ہے۔ عشقِ علیؑ کا اظہار مختلف ذریعوں اور طریقوں سے ہوا۔ صوفیائے کرام اور فقرا کی حال وقال کی محفلوں نے بھی ذکرِ علیؑ کو عام کیا۔ حیدری اور قلندری فقرا کی علی علی کی صدائیں برصغیر پاک وہند کے شمال سے جنوب اور شرق سے مغرب تک گونجتی رہی ہیں۔ ایک دہائی قبل بلاتفریق مذہب وملت، "دمادم مست قلندر، علی کا پہلا نمبر" عوام کی زباں زد تھا۔ پاکستان کے جنگی نغموں میں ذکرِ علیؑ لازمی تھا۔ آج کل نہ صرف پاکستان بلکہ یورپ وامریکا میں استاد نصرت فتح علی خاں کی قوالی کے یہ بول "آج نہیں تو کل سارے علی علی کہیں گے" نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلموں میں بھی مقبول ہوئے ہیں۔

اس مجموعے کو مکمل کرنے کے لیے متقدمین سے متاخرین تک کے منقبتی اشعار اور قصیدوں کی تلاش میں سید ضمیر اختر صاحب نقوی کو نہ جانے کتنی صعوبتیں برداشت کرنی پڑی ہوں گی، آپ نے کتنی کتابیں جمع کی ہوں گی۔ مختلف لائبریریوں کی خاک چھاننے کے ساتھ صاحبانِ ذوق کے ذاتی کتب خانوں سے مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کلام کے حصول میں پیش آنے والی دقتیں اور پھر ان کے انتخاب کے لیے شب بیداریاں، اس وقیع خدمت کے لیے موصوف کو کتنی محنت کرنی پڑی ہوگی اور کتنے اخراجات برداشت کیے ہوں گے، اس کا اندازہ وہی حضرات کر سکتے ہیں جو خود بھی تحقیقی کاموں میں مشغول ہیں۔ اس مجموعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ضمیر اختر نقوی صاحب کی گوہر شناس غواص طبیعت نے مدحتِ علیؑ کے بحرِ ناپیدا کنار سے خوش رنگ لولو ومرجان اور گوہر ہائے دل افروز وروح تاب جمع کر دیئے ہیں۔ یہ عاشقانِ علیؑ کی ذمے داری ہے

کہ وہ اس گلدستے کی خوشبو کو گھر گھر پہنچائیں۔ یہ کتاب ہر لائبریری کیا، ہر گھر میں ہونی چاہیے۔ امید ہے کہ موصوف آئندہ اشاعتوں میں مزید اضافے کرکے اسے ایک انسائیکلوپیڈیا کی شکل دے دیں گے۔

قدر ناشناسی ہوگی، اگر اس ضمن میں اس صحیفے کے تحقیقی اور فکر انگیز پیش لفظ کا تذکرہ نہ کیا جائے جو اس قحط الرجال میں ایک ابھرتے ہوئے قلم کار اور محقق کی نشان دہی کرتا ہے۔ آل محمد رزمی صاحب نے، جو خود بھی ریسرچ اسکالر ہیں، بڑی بالغ النظری سے اس مجموعے کے موضوعات پر روشنی ڈالی ہے اور مرثیے اور منقبت میں فرق واضح کرتے ہوئے مولا علیؑ کے دعوے دار روسا و امرا کی بے حسی کی طرف بھی توجہ دلائی ہے۔ پاکستان میں ناصبیت اور خارجیت کی تجدید اور اس کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے دور میں ضرورت تو اس کی ہے کہ محبانِ اہل بیتؑ جو محافل و مجالس کے انعقاد کے اخراجات کے لیے بڑی حوصلہ مندی کا مظاہرہ کرتے ہیں، وہ نشر و اشاعت کی طرف بھی توجہ فرمائیں اور مذہب حقہ کی حقانیت سے متعلق زیادہ سے زیادہ کتابوں کی اشاعت کی سرپرستی کریں اور بنیادی کتابوں کو مفت مختلف لائبریریوں اور تعلیمی اداروں میں پہنچائیں تاکہ مذہب، تاریخ اور ادب سے ناواقف افراد ملت ناصبیت اور خارجیت کی فریب کاریوں سے محفوظ رہ سکیں۔

میجر سید علمدار حسین سیّد دہلوی (راولپنڈی)

۶ مارچ ۱۹۹۹ء

جناب نقوی صاحب السلام علیکم!

''پیام عمل'' میں حضرت جعفر طیارؑ کی سوانح حیات پر تبصرہ پڑھا۔ جناب جعفر طیارؑ پر اتنا کم مواد چھپا ہے اور جو کچھ چھپا ہے اسے یک جا کرنا یقیناً قابلِ تحسین کاوش ہے۔

رشید حیدر رضوی

کسی کسی کو خدا یہ کمال دیتا ہے

سیاست دوراں اور واقعات عالم سے باخبر رہنے کا تجسس عادت سی بن گیا ہے۔ اپنے ملکی ابلاغ عامہ کے ذرائع سے آپ بخوبی واقف ہیں، لہٰذا بی۔بی۔سی سننا مجبوری اور ضرورت بن گیا ہے۔ ساتھ ہی بی۔بی۔سی سے اچھے ادبی پروگرام بھی سننے کو مل جاتے ہیں۔ انھی پروگراموں کے توسل سے تیرہ، چودہ سال پہلے غالباً اواخر ۱۹۸۰ء کا واقعہ ہے۔ اناؤنسر نے ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب کا انٹرویو نشر کرنے کا اعلان کیا تو میں ہمہ تن گوش ہوگیا۔ اس زمانے میں ضمیر اختر نقوی برطانیہ تشریف لے گئے تھے۔ تعارفی کلمات میں بی۔بی۔سی نے ضمیر اختر نقوی کی خدمات، جو انھوں نے صنف مرثیہ کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں فرمائی ہیں، کو خراج تحسین پیش کیا۔ طویل اور پُر مغز انٹرویو سننے کے بعد میں علامہ ضمیر اختر نقوی کی زندگی کے اس گوشے سے بھی واقف ہوا جس سے میں بے بہرہ تھا۔ میں تو موصوف سے ایک خطیب، مقرر اور ذاکر حسینؑ کی حیثیت سے متعارف تھا۔ آپ کی عالمانہ تقریریں سننے کا اکثر و بیشتر اتفاق ہوا تھا۔ اور میں ان سے اس حد تک بہت متاثر تھا کہ انھوں نے مجالس عزا میں خطابت کو نئی جہت سے روشناس کرایا ہے۔ ان کی تقاریر سے خداداد ذہانت کا اظہار ہوتا ہے، اور وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ علمی مواد اپنے سامعین تک پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس عمل کو بروئے کار لانے کے ضمن میں ان کو مجالس عزا میں خطابت

میں انقلابی تبدیلیاں لانے کا فخر بھی بجا طور پر حاصل ہے۔ مثلاً ابتدا میں طویل عربی خطبہ جو ہر ذاکر کا سرنامہ کلام ہوتا تھا، انھوں نے یکسر ختم کر کے سامع کی فکر سے بوجھ بھی کم کیا ہے بلکہ اس وقت کو انھوں نے قیمتی افکار کو حاضرین تک منتقل کرنے کا ذریعہ بھی بنایا۔ دوسری اہم چیز یہ ہے کہ پوری تقریر موضوع پر قائم رہتی ہے۔ تواتر اس طرح قائم رہتا ہے کہ سننے والا مبہوت ہو کر ایک فکر انگیز حسرت سے ہم کنار رہتا ہے اور ضمیر صاحب کی لامحدود معلومات اور تبحرِ علمی پر رشک آنے لگتا ہے۔ مصائب رسما رونے رُلانے کے لیے نہیں بلکہ اس طرح بیان کیے جاتے ہیں کہ بیان مربوط رہ کر سننے والوں کی معلومات میں اضافے کا سبب بنتا ہے اور رقت اتنی ہوتی ہے کہ وہیں مجلس کی مقبولیت کا احساس ہو جاتا ہے۔

برٹش براڈ کاسٹنگ کارپوریشن کے انٹرویو سے ضمیر اختر نقوی صاحب کی زندگی کا ادبی رخ بے نقاب ہوا۔ مجھے اپنا یہ تاثر اور تصور، جو بہت عام ہے، دھندلا پڑتا ہوا محسوس ہوا کہ اچھے خطیب اور مقرر بہتر ادب تخلیق نہیں کر سکتے۔ ہماری مذہبی روایات میں بھی اور عام طور پر بھی دیکھا گیا ہے اور مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ جتنے مشاہیر ذاکر خطیب گزرے ہیں تو وہ اچھے ادیب نہ ثابت ہو سکے۔ جن علما اور فقہا کی علمی اور قلمی خدمات تھیں، وہ کامیاب خطیب اور ذاکر بن کر نہ اُبھر سکے۔ اس سلسلے میں دو مثالوں پر میں اکتفا کروں گا۔ آپ غور و فکر کے ذریعے جہاں تک چاہیں دائرہ وسیع کر لیں، یہی کلیہ قائم رہے گا۔ پہلی مثال عمدۃ العلما جناب مولانا کلبِ حسینؑ صاحب علی اللہ مقامہٗ المعروف کبن صاحب قبلہ کی سامنے ہے۔ وہ اپنے وقت کے بے مثل خطیب اور ذاکرِ حسینؑ تھے اور شامِ غریباں کی مجلس پڑھنے کا تو اوّل و آخر انھوں نے حق ادا کر دیا۔ آج تک کوئی جواب پیدا نہیں ہوا لیکن تصنیف کی حد تک ان کا ذکر نہیں آتا۔ برخلاف انھیں

کے ہم عصر عالم دین سید العلما سید علی نقی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہٗ المعروف نقن صاحب قبلہ جو ہماری قوم کے بے مثل ادیب تھے اور مذہبی موضوعات پر ان کی لاتعداد کتابیں ہمارا قومی سرمایہ ہیں، لیکن وہ کبھی بھی اچھے ذاکر یا خطیب بن کر نہ ابھرے۔

پھر جناب ضمیر اختر نقوی صاحب کے متعلق معلومات میں جیسے جیسے اضافہ ہوا، میری حیرتوں میں بھی اضافہ ہوا کہ یہ مرنجاں مرنج شخصیت کتنی غیر معمولی صفات کی حامل ہے۔ موصوف بہترین خطیب، شعلہ بیان مقرر اور مقبول ذاکر حسینؑ ہیں۔ اب تک دنیا کے کئی ممالک میں مجالس عزا میں ساڑھے پانچ ہزار سے زائد تقاریر کر چکے ہیں۔ علمیت اور ادب کی طرف آیئے تو اس کم عمری میں ۱۲۰ سے زائد کتابیں تصنیف فرما چکے ہیں جس میں کتابچے بھی ہیں اور ہزار صفحات پر مشتمل ضخیم کتابیں بھی۔ کچھ بہت اچھی اور قابل ذکر کتابوں کے ترجمے بھی کیے ہیں۔ چنیدہ اور اہم کتابوں کے جن کے ترجمے بہت ضروری ہیں۔ مثلاً ایک انگریز پادری کی کتاب کا ترجمہ کیا، اس پادری نے ائمہ اثنا عشر کی سوانح لکھی تھی۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوا کہ آپ ایک اچھے مترجم بھی ہیں، اور یہ ادراک کرتے ہوئے گونا گوں مسرت بھی ہوئی کہ ضمیر صاحب کی عمیق نظر مذہب کے حوالے سے انگریزی ادب پر بھی ہے آپ کے اشعار پڑھ کر احساس ہوا کہ قدرت نے آپ کو اس صنف سے بھی محروم نہیں رکھا اور موصوف اچھے اشعار کہنے پر بھی قدرت رکھتے ہیں لیکن روایتاً شاعری نہیں کرتے، اگر زندگی کے کسی موڑ پر شعر کہنے پر آ گئے تو کئی بڑے شاعروں کو پیچھے چھوڑ جائیں گے۔

مرثیے کی صنف میں پاکستان میں جو کچھ بھی کام ہوا ہے، اس میں بڑا حصہ ڈاکٹر صاحب کی کاوشوں کا مرہون منت ہے۔ آپ نے اس صنف میں جو تحقیق و جستجو فرمائی ہے اور ترویج و اشاعت میں جو حصہ لیا ہے، وہ تو اب تحریک بن گئی ہے۔ اس سے نہ

صرف ماضی کے مرثیہ نگاروں کی کاوشوں کو دوام مل گیا ہے بلکہ کہنے والوں کی ہمت افزائی بھی ہوئی ہے اور اس سے افق پر ہر روز نئے ستارے ہویدا ہونے لگے ہیں۔ اس کام کو میں تو صدقۂ جاریہ سے تعبیر کرتا ہوں۔

سیرت ائمہ معصومین علیہم السلام پر دیگر سیرت نگاروں اور قلم کاروں نے بھی کتابیں لکھی ہیں اور علامہ ضمیر اختر نقوی نے بھی سب نے کاوش فرمائی ہے اور اپنی اپنی اہلیت اور صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر سوانح مرتب کیں، لیکن یہ لکھنا آسان اس وجہ سے ہے کہ چہاردہ معصومین علیہم السلام کی سوانح مرتب کر کے قابلِ تعریف کام کیا ہے، کیونکہ ان کی سیرت اور حالاتِ زندگی پر مواد ملتا ہے۔ پھر تاریخ ذوالجناح، تاریخ ذوالفقار اور تاریخ فرات علیحدہ علیحدہ تصنیف فرما کر اپنے آپ کو ضمیر اختر صاحب نے مورخ بھی تسلیم کرا لیا ہے اب میں علامہ ضمیر اختر نقوی پر زیادہ کیا لکھوں، اس کے لیے طویل مقالہ لکھا جائے تو ان کی کاوشِ پیہم کا احاطہ ہو سکتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ انھوں نے اتنی کم مدت میں مختلف اصناف ہائے سخن میں جو کارہائے نمایاں انجام دیئے ہیں تو کبھی قبلہ آئینے کے سامنے بیٹھ کر خود حیران رہ جاتے ہوں گے کہ کیا یہی ہستی ہے جو سب کام تنہا انجام دے رہی ہے۔ اور آئینے کا ذکر آ گیا تو اعجاز رحمانی کا شعر سن لیں جو علامہ ضمیر اختر نقوی پر صادق آتا ہے۔

جو آئینے کو بھی حیرت میں ڈال دیتا ہے
کسی کسی کو خدا یہ کمال دیتا ہے

قوم کے مشہور دانش ور اور ادیب جناب آلِ محمد رزمی صاحب نے مجھے اس کتاب پر تبصرہ لکھنے کی ترغیب دی۔ ''شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ'' کتاب کا چرچا سن رہا تھا۔ کتاب رزمی صاحب نے مجھے عنایت کی کہ وہ اکثر مجھے اچھی کتابیں دیتے رہے ہیں،

صرف پڑھنے کے لیے، تبصرہ کا مطالبہ پہلی مرتبہ کیا۔ اپنی بے بضاعتی اور کم علمی کے پیشِ نظر میں نے معذرت طلب کی، لیکن رزمی صاحب نے مجھے جب یہ بتایا کہ علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کی یہی خواہش ہے تو مجھ سے انکار کرتے نہ بن پڑی۔

اردو ادب میں حضرت علیؑ کی مدح گوئی پر کوئی تحقیقی کام اب تک نہیں ہوا تھا "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" اس موضوع پر پہلی کتاب ہے۔ اکثر ایسا ہی ہوتا آیا ہے کہ کوئی علمی، ادبی، تحقیقی اشاعت کے لیے بڑے بڑے منصوبے بنتے ہیں، ادارے تشکیل دیے جاتے ہیں، کمیٹیاں اور انجمنیں بنائی جاتی ہیں لیکن کام پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچتا۔ دیکھنے میں آیا ہے کہ وہ کام پایۂ تکمیل پا گئے جن کا بیڑا انفرادی طور پر کسی نے اٹھایا تھا۔ ایسے دور میں جبکہ سرمایہ دار حضرات علمی، ادبی کاموں پر سرمایہ کاری کرنے کو تیار نہیں ہیں، یہ کام اور زیادہ مشکل ہو گئے ہیں، لیکن ضمیر اختر صاحب کی "لغت" میں تو "ناممکن" ہے ہی نہیں وہ جو چاہتے ہیں، کر گزرتے ہیں لہٰذا باوجود مشکلات کے کتاب شائع کر کے آپ کے ہاتھوں تک پہنچا دی۔

کتاب کا نام جو سرورق پر درج ہے، اس بات کی غمازی کر رہا تھا اور میں ہی نہیں ہر شخص یہ تاثر لے گا کہ اُردو کے شعرائے کرام کے کلام جو مدحتِ علی علیہ السلام میں کہے گئے ہیں، وہ جناب ضمیر اختر صاحب نے یکجا کر کے شائع کر دیے ہیں۔ گو اپنی جگہ یہ بھی ایک بڑا اہم کام ہے، لیکن کتاب کھول کر عنوانات اور فہرست مضامین پر نظر ڈالی تو حیران رہ گیا کہ اُردو شعرا تو بہت بعد میں آتے ہیں، ابتدا قرآن حکیم سے ہو رہی ہے۔ امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے فضائل کے سلسلے میں جن عنوانات کے تحت کتاب اللہ کے ذریعے ایمان افروز دلائل پیش کیے جا رہے ہیں، وہ ایسے منفرد انداز میں ہیں کہ کم از کم میری نظر سے تو پہلے کبھی نہیں گزرے تھے اور اس طرح طبیعت کو جو

سرور اور ایمان کو جو تقویت حاصل ہوئی، اس کا اجر تو ضمیر اختر نقوی صاحب کو آخرت میں ملے گا، لیکن یہ مدلّل انداز بیان اور پیش کردہ مواد ضمیر اختر نقوی کی عمیق نظر، وسیع قابلیت اور قرآن فہمی پر دلالت کرتا ہے کہ قرآن میں امیر المومنینؑ کے گھوڑے اور تلوار کی تعریف بھی تلاش کرلی۔ پھر آپ غور فرمائیں کہ مُلّائیت سے بھرپور فکر تو اس بات پر مذبذب ہے کہ درود میں آل کے ساتھ مولا علیؑ شامل ہیں کہ نہیں۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے قرآن وحدیث سے بھی ثابت کردیا کہ اللہ تعالیٰ اور ملائکہ علی علیہ السلام پر درود پڑھتے ہیں اور سات برس تک خلقتِ کون ومکاں سے پہلے ملائکہ نے حضور ختمی مرتبت اور مولائے کائنات حضرت علیؑ پر متواتر درود پڑھا۔ یہ بھی لمحہ فکر یہ ہے کہ یہ سات برس ہماری دنیا کے ماہ وسال نہیں ہیں، کیونکہ وہاں کا ایک دن بھی ہماری دنیا کے ایک ہزار سال کے برابر ہے۔ تو حساب کرلیں، وہ ایک سال ہماری دنیا کے تین لاکھ پینسٹھ ہزار سال کے برابر ہے، وہ سات سال ہماری دنیا کے پچیس لاکھ پچپن ہزار سال کے برابر ہوئے۔ اتنے عرصے تک ختمی مرتبت اور مولا علیؑ پر ملائکہ نے متواتر درود پڑھا، سبحان اللہ!

دوسرا باب جو عربی شاعری اور مدحتِ علیؑ کے عنوان پر ہے، وہ چند مشہور عربی شعرا کے حضرت علیؑ کی منقبت میں اشعار پر مشتمل ہے۔ اس میں گو سب ہی اشعار اپنی جگہ معرکتہ الآرا ہیں، لیکن جناب اسماعیل حمیریؒ کے متعلق پورا مضمون مومنین کے لیے معلومات میں اضافے کا باعث ہے۔ تاریخ پیدائش ووفات میں کاتب کی غلطی کھٹکتی ہے لیکن یہ چنداں اہمیت کی حامل نہیں ہے، قاری اپنے ذہن سے اصلاح کرلیتا ہے۔ جو واقعات اس عظیم مدح گو شاعر کے بیان کیے گئے ہیں۔ وہ اُردو داں طبقے کی معلومات کی رسائی سے کوسوں دور تھے۔ بالخصوص علامہ مجلسیؒ نے بحار الانوار میں سہیل

ابن ذبیان سے جو روایت نقل فرمائی ہے، اس سے اس عظیم المرتبت شاعر کے مدارج کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور حمیریؒ کیوں نہ اتنے ارفع مراتب پر فائز ہوں جس ہستی نے امیر المومنینؑ کے "معلومہ فضائل" اتنی کثرت سے اشعار کے قالب میں ڈھالے ہوں کہ اپنے تئیں دعویٰ کرنے کی منزل پر ہو کہ حضرت علیؑ کے فضائل سے اللہ تعالیٰ اور اس کے حبیبؐ کے سوا کون پوری طرح واقف ہے، کون و مکاں میں ذات واجب اور پیغمبرؐ آخر الزماں کے سوا کسی کو بھی میرے مولا کی نہ پوری معرفت تھی، نہ کسی ذی روح کے بس کا تھا کہ وہ امیر المومنینؑ کے فضائل کا احصا کر سکے۔ مولانا اولاد حیدر فوق بلگرامی نے سیرت امیر المومنین علیہ السّلام میں یہ واقعہ تحریر فرمایا ہے کہ جب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم معراج پر تشریف لے جا رہے تھے تو راستے میں آپ نے دیکھا کہ عماریوں کی ایک قطار ہے، جس پر کتابیں لدی ہوئی ہیں، یہ مشرق سے مغرب کی جانب رواں ہیں۔ آپ نے روح الامین سے استفسار فرمایا، "یہ کیسی کتابیں ہیں؟ ان میں کیا مرقوم ہے اور کہاں جا رہی ہیں؟" جبرئیلِ امینؑ نے جواب فرمایا، "رسولؐ اللہ"! میں جب سے خلق ہوا ہوں، یہی دیکھتا رہا ہوں کہ عماریاں رواں دواں ہیں، کتابوں کے مندرجات سے لاعلم ہوں"۔ تب حضور ختمیؐ مرتبت نے ایک عماری کو روک کر ایک کتاب کا مطالعہ فرمایا جو فضائل علی علیہ السّلام پر مبنی تھی۔ دوسری، تیسری، چوتھی، غرض ہر کتاب میں فضائلِ علیؑ پر مشتمل مواد تھا۔ پھر دوسری، تیسری اور جس عماری سے جو کتاب بھی اٹھائی، اس میں علیؑ کے فضائل ہی کو پایا، تو آپ تصور فرمالیں۔ فضائلِ مولائے کائنات سے مالا مال وہ عماریاں آج بھی گزر رہی ہیں۔ جس وقت میں یہ مضمون تحریر کر رہا ہوں، اس وقت بھی گزر رہی ہوں گی اور جس وقت آپ میرا مضمون ملاحظہ فرما رہے ہوں گے، اس وقت بھی اور تا قیامت تک گزرتی رہیں گی۔ تو کیسے کسی عاجز

بندے کی یہ مجال ہے کہ فضائلِ امیر المومنین کا احاطہ کر سکے؟

بات کہیں سے کہیں جا پہنچی۔ میں عربی زبان کے شعرا کا ذکر کر رہا تھا جن کی مدحت اور منقبت کو شاملِ کتاب کیا گیا ہے۔ ہر شاعر کے متعلق لکھنا طوالت کا باعث ہوگا، لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ "شعرائے عرب میر انیس کی نظر میں" لکھ کر ادب میں محققین کے لیے نئی سمت کا تعین کیا ہے۔ اس سے میر انیس کی عربی ادب پر جو نظر تھی، اس کا احوال بھی سامنے آتا ہے۔ نامعلوم وجوہات کی بنا یا ضخامت بڑھ جانے کے خوف سے ضمیر اختر صاحب نے ائمہ طاہرین علیہم السلام کے ادوار کے کچھ مشہور عربی شعرا کو نظر انداز فرما دیا ہے، مثلاً جعفر بن عفان، کمیت ابو امارہ، عبداللہ بن غالب، ابراہیم بن عباس۔ اسی طرح چوتھی صدی ہجری کے عربی شعرا ابو الفارس، علی بن اسحاق بغدادی، علی بن محمد منصور طلحہ بن عبید اللہ، احمد بن حسین ہمدانی اور علی قاشی الاخسر کے کلام بھی مدحتِ مولا سے مالا مال ہیں لیکن ان کا کلام اس کتاب کی زینت نہ بن سکا۔ یہ میرا ایقان ہے کہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی جیسے وسیع المطالعہ اسکالر کی نظر کتاب کو مرتب کرتے وقت مذکورہ شعرا کے کلام پر ضرور رہی ہوگی، اغلب یہی ہے کہ طوالت اور کتاب کی ضخامت کا خیال مانع رہا ہوگا۔

تیسرے باب میں فارسی شعرا اور ثنائے علی پر قلم اٹھاتے ہوئے ابتدا ایک اچھوتے انداز سے کی ہے یعنی "قرآن اور ایران"۔ یہ ندرتِ خیال بھی ضمیر صاحب کا حصہ ہے۔ اس ذیل میں پورا مضمون معرکتہ الآرا ہے اور عجم پر قرآن حکیم کی تین آیتوں سے استدلال فرما کر سیر حاصل گفتگو کی ہے اور ایرانیوں کی فضیلت اہلِ عرب پر ثابت کرنے کے لیے حضرت صادق آلِ محمدؐ کی حدیث مبارک کو بنایا ہے۔ امام فرماتے ہیں: "اگر قرآن عجم پر نازل ہوتا تو اہلِ عرب اس پر ایمان نہ لاتے لیکن عرب پر نازل

ہوا ہے اور عجم اس پر ایمان لے آئے ہیں، یہ عجمیوں کی ایک فضیلت ہے"۔ اہلِ ایران کی عربوں پر برتری ثابت کرنے کے لیئے جناب ضمیر اختر صاحب کا قرآنی استدلال، احادیث رسولؐ، اقوالِ ائمہ کو جمع کرنا اپنی جگہ، لیکن صرف اس پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مفکرین اور دانش ور حضرات کی تحریروں کو بھی اپنے موقف کی پختگی کے لیئے اتنی خوبصورتی سے سمو دیا ہے کہ جہاں تکذیب کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ پروفیسر خواجہ لطیف انصاری کی تحریر سے اقتباس میں مسلمانوں میں علم و حکمت کی آمد کی وجہ بھی ایرانی نظر بتائی، نیز مشہور عربی دانش ور جبران خلیل جبران کی تحریر کے اقتباس سے تو یہ ثابت ہو گیا کہ اہلِ عرب حضرت علیؑ کی صحیح معرفت اس وجہ سے حاصل نہ کر سکے کہ وہ جواہر اور سنگریزوں کا فرق نہیں پہچانتے جبکہ ایرانی پہچانتے ہیں، ان کو حضرت علیؑ کی معرفت نصیب ہوگئی۔ علامہ محسن امین کی تحریر کے سہارے ضمیر اختر صاحب نے اکابر علمائے اہلِ سنت کی فہرست بھی گنوا ڈالی جو الّا چند کے سب کے سب ایرانی ہی تھے۔ اجتہادی استدلال کے ساتھ اس گراں مایہ تحریر پر، جس سے ایرانیوں کی عربوں پر برتری ثابت ہوتی ہے، اہلِ ایران کے لیئے باعثِ ممنونیت ہونا چاہیے۔ ایران کے نامی گرامی شعرا تقریباً سب کے سب اس کتاب میں بارگاہِ مرتضوی میں اپنے نذرانۂ عقیدت کے ساتھ حاضر ہیں، ترجمہ بھی بہت خوب ہے۔ مجھے پتہ نہیں کہ عمر خیام نے حضرت علیؑ کے حضور کچھ کہا تھا کہ نہیں۔ اگر وہ اس سعادت سے بہرہ ور ہوتا تو اس کا کلام بھی ضمیر اختر صاحب ضرور شامل کرتے۔

چوتھے باب کو پڑھ کر بڑی طمانیت کا احساس ہوا کہ ضمیر صاحب نے ایک تاریخی غلط فہمی کا ازالہ فرمایا اور اس مسئلے کو کتاب میں شامل کر کے اہم کارنامہ انجام دیا ہے اور انجانی سازشوں کے تحت معاندانہ تشہیر پر خطِ تنسیخ کھینچ دیا ہے۔ ہر سال یوم باب

الاسلام منا کر اور اخبارات کے رنگین صفحات پر طویل مضامین میں یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ محمد بن قاسم جب سندھ پر حملہ آور ہوا تھا تو اس کے ساتھ ہی اسلام بھی برصغیر اور سندھ میں روشناس ہوا۔ جناب ضمیر اختر نقوی صاحب نے اپنے مخصوص محققانہ انداز میں یہ ثابت کر دیا کہ اسلام سندھ میں دورِ امیر المومنین علیہ السلام میں آ چکا تھا اور عربوں کی سندھ میں اور سندھیوں کی عرب میں آمد و رفت جاری تھی، اہلِ سندھ میں تبلیغات کا نفوذ ہو چکا تھا۔ امام زین العابدین علیہ السلام کی ازواج میں ایک سندھی خاتون کا ہونا اس کا بیّن ثبوت ہے۔ نیز حضرت زید شہیدؒ کے ہمراہ شہادت پانے والوں میں ایک سندھی مجاہد کی شمولیت بھی اس بات کا کھلا اعلان کر رہی ہے۔ پھر حضرت عبداللہ الاشتر جو حضرت امام حسن علیہ السلام کے صاحب زادے حضرت حسن المثنیٰ کے پوتے تھے۔ آپ کو خلیفۂ وقت منصور دوانقی کے حکم سے شہید کیا گیا۔ حضرت عبداللہ الاشتر اپنے پدرِ بزرگوار حضرت محمد نفسِ ذکیہؒ کی شہادت کے بعد سادات پر جو مظالم ہو رہے تھے، ان سے بچنے کی خاطر سندھ تشریف لائے تھے، لیکن یہاں بھی اولادِ رسولؐ کو چین سے نہ رہنے دیا اور خلیفہ منصور دوانقی کے گماشتوں نے حضرت عبداللہ الاشتر کو شہید کر کے لاش دریا میں بہا دی۔ ان کا کلفٹن پر عظیم الشان مزار آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔ آپ کے کم سن فرزند کو ہندو راجا نے، جو محبِ اہلِ بیتؑ تھا، اپنی پناہ میں لے لیا۔ خلیفۂ وقت اس شہزادے، نیز سیدانیوں کو گرفتار کر کے بلوانا چاہتا تھا تا کہ ان کو بھی اذیتیں دے کر ہلاک کیا جائے۔ ہندو راجا سے بار بار مطالبہ کیا گیا، لیکن اس نے آلِ رسولؐ کی حفاظت سے ہاتھ نہ اٹھایا اور مسلسل انکار پر حملہ کیا گیا۔ وہ قتل ہو گیا، اس طرح ہندو راجا اس کم سن سید زادے اور سیدانیوں کی حفاظت میں خود قتل ہو گیا اور اس کی ریاست کو اسلامی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔

جناب ضمیر اختر نقوی نے اس واقعے کو موضوع سے ہٹ کر شامل کتاب کیا، یہ دلیرانہ اقدام ہے۔ راجا اور کمانڈر کے نام غالباً ضروری تنقید اور قضیے کے خوف سے حذف کر دیے ہیں کیونکہ معاملہ متنازعہ اور گمبھیر ہے۔ جناب جی، ایم سید نے اپنی کئی کتابوں میں لکھا ہے کہ راجا داہر محبِ اہلِ بیتؑ تھا اور سادات کی زندگی اور عزت بچانے کی سزا میں اسے محمد بن قاسم سے قتل کروا کر اس کی ریاست پر قبضہ کر لیا گیا جس کی سزا فوراً خود اپنے چچا حجاج بن یوسف کے ہاتھوں قتل کی شکل میں ملی۔ میں یہ نہیں کہتا کہ علامہ صاحب نے کسی خوف کے پیشِ نظر فاتح و مفتوح کے نام نہیں لکھے، کیونکہ یہ ایسے ضمیر ہیں کہ ان کی ایک تقریر میں اپنے کانوں سے میں نے محمود غزنوی کو ڈاکو لٹیرا کہتے سنا ہے۔ تقریر کا ماحصل یہ تھا کہ محمود غزنوی نے اسلام کی کوئی خدمت انجام نہیں دی۔ وہ صرف لوٹ مار کی غرض سے ہندوستان پر حملہ آور ہوتا رہا۔ آپ کی تقریر سن کر میں اس سوچ میں پڑ گیا تھا اور نتیجہ اخذ کرنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ ایک طرف تو ائمہ طاہرین کی اولاد و سادات عظام، صوفیائے کرام اخلاق و محبت اور علومِ الٰہی کے ذریعے تبلیغ اسلام کر رہے تھے تو دوسری جانب یہ لٹیرے نفرتیں پھیلا کر اس عمل کی بیخ کنی میں مصروف تھے۔ کاش یہ نام نہاد مسلمان بادشاہ ہندوستان پر قابض نہ ہوتے تو آج پورا برِ صغیر صحیح تبلیغات کے ذریعے مشرف بہ اسلام ہو چکا ہوتا!۔ برِ صغیر میں صوفیا، مشائخ و سادات جن کا کلام مدحت و منقبت علیؑ میں دستیاب ہے صرف ان کا تذکرہ اس کتاب میں موضوع کی بنا پر آسکا ہے۔ خانوادہ علیؑ کے لاتعداد حضرات نے اس دور میں ہجرت فرمائی ہے، برِ صغیر کو اسلام کی روشنی سے تاب ناک کیا، لیکن اس کتاب میں ان کا ذکر اس وجہ سے نہ آسکا کہ ان کا کلام مدحتِ علیؑ میں نہ تھا۔ ان میں بارہ بنکی میں سید سالار مسعود غازی، شرف الدین شاہ ولایت امروہہ میں، نور شاہاں

راولپنڈی میں، حضرت عبداللطیف بری امام سندھ میں سید صدرالدین شاہ کی صوبۂ سرحد میں شامل ہیں۔ منگورہ کے قریب پیر بابا جو آج تک صاحب کرامت ہیں، میں نے ان کے عظیم الشان مزار پر اپنی آنکھوں سے کرامتوں کا مشاہدہ کیا۔ ان سب بزرگان کے مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ بھی مرید ہیں اور آج بھی قبور کی زیارات کے لیے آتے ہیں۔ علاوہ ازیں اور سادات کے، جن کے مزارات مرجع خلائق ہیں، میرے ذہن میں اس وقت اسمائے گرامی نہیں ہیں۔ تو یہ کام بھی حضرت ضمیر اختر نقوی جیسے محقق کا ہی ہوسکتا ہے کہ ان کے حالات زندگی اور ان کی تبلیغات پر تحقیق کرکے ایک جامع کتاب مرتب کریں تاکہ عامۃ الناس کو برصغیر میں اشاعت اسلام کے سلسلے میں ان بزرگان دین کی خدمات اور صحیح حالات و واقعات کا علم ہوسکے، ورنہ عام لوگ تو مسلمان بادشاہوں کو اسلام کی اشاعت کا ذمے دار سمجھتے ہیں۔

پیش لفظ میں آل محمد رزمی صاحب نے صحیح لکھا ہے کہ شعرا کی فہرست میں ایسے بے شمار اسمائے گرامی آپ ملاحظہ فرمائیں گے جن کا کلام یا نام ہم تک نہیں پہنچا۔ یہ بات رزمی صاحب نے ساتویں باب کے ذیل میں کہی ہے، مگر میں اس ضمن میں اتنا اضافہ چاہوں گا کہ یہ بات اس باب تک مختص نہیں۔ ہر باب میں ایسے شعرا اور ان کا کلام موجود ہے جو عام آدمی، کم از کم مجھ جیسے کم علم کی دسترس سے باہر تھا، حالانکہ ایسے شعرا بھی کتاب میں ہیں کہ جن کا نام سنا، کلام بھی اکثر پڑھا تھا لیکن معنوی تعارف نہ تھا۔ اب اس کتاب کے صدقے کوائف و مختصر حالات زندگی اور وہ معروضی حالات کہ جب شعر کہے گئے، پڑھ کر لطف دوبالا ہوگیا۔ سودا کے کلام سے بہت سے عقدے کھلے اور یہ بھی علم ہوا کہ منقبت اہل بیت کی کوشش اس دور میں بھی جاری تھی اور نہ صرف علما اس جہاد میں مصروف تھے بلکہ شعرا بھی اپنی زمین میں برسرپیکار تھے۔ اس دور میں بھی

معاویہ کو پانچواں خلیفۂ راشد بنانے کی سعی جاری تھی اور یزید کو بھی قابلِ تعریف گروانے کی سازشیں کی جا رہی تھیں جو آج بھی جاری ہیں۔

ہم جیسے لوگ جو فارسی سے نابلد ہیں، ان کے لیے یہ ایک نعمتِ غیر مترقبہ کہ کوئی فارسی کا کلام مع ترجمہ سنا دے یا لکھ کر دے دے۔ غالب کے فارسی کلام کی شہرت سنا کرتے تھے۔ اب کتاب کے طفیل مرزا غالب کے فارسی منقبتی کلام کو مع سلیس ترجمہ پڑھنے کی سعادت حاصل ہوئی تو اندازہ ہوا کہ غالب اپنے فارسی کلام پر کیوں نازاں تھے۔ اللہ غریقِ رحمت کرے کہ وہ مداحِ اہلِ بیتؑ تھے، عشقِ علیؑ میں ہمیشہ سرشار و غرق رہتے تھے اور مولا علیؑ نے ان کو صلے میں ابدی شہرت عطا فرمائی۔ ان کی قادر الکلامی اردو کے برابر ہی فارسی پر تھی۔ غالب نے اپنے فارسی کلام کے ایک شعر میں اس طرح کا اظہارِ خیال کیا ہے کہ "میرے جیسا قیمتی موتی کوئی اور زمانے میں نہیں ہے۔ میں اپنے آپ کو حضرت علیؑ کی رہ گزر کی خاک میں ڈالتا ہوں کہ یہ موتی علیؑ کے قدموں سے مس ہو جائے"۔ انتہائے عقیدت سے بھرپور ان کی اس فکر اور تمنائے غالب کو وہ منفرد منصب، شرف اور اردو ادب میں وہ مقام عطا ہوا کہ وہ اردو کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کیے گئے، اور غالب ایسے مقام پر فائز ہو گئے جس کے لیے متفق علیہ رائے ہے کہ اتنا بڑا شاعر آئندہ بھی پیدا نہیں ہو سکتا۔ غالب کے متعلق اپنی تحریر میں ڈاکٹر ضمیر اختر صاحب نے اس عظیم شاعر کے مسلک کے متعلق غلط فہمی بھی دور کر دی ہے۔ یہ بہت اچھا کیا، ورنہ غالب کے سنی ہونے کا شوشا اکثر چھوڑا جاتا ہے۔

لکھنؤ کا تمدن اور مذہب کے عنوان سے ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب نے تہذیب و ثقافت کا جس حسین انداز میں نقشہ کھینچا ہے، وہ پڑھنے سے ہی اندازہ ہو سکتا ہے، ساتھ ہی شاہانِ اودھ کی انتظامی صلاحیت، نظم و نسق اور وسیع النظری پر طائرانہ نظر بھی

ڈالی ہے کہ کس طرح شیر و بکری ایک گھاٹ پر پانی پیتے تھے۔ بادشاہوں کا مذہب اسلام تھا لیکن ہندو رعایا ہر طرح مطمئن اور خوش تھی، نیز فرقۂ شیعہ اثنا عشری سے علانیہ بادشاہوں کا تعلق ہونے کے باوجود اہلِ تسنن کو نہ کبھی کسی قسم کی شکایت ہوئی، نہ ان کا مذہبی استحصال بھی کیا گیا، ڈھائی سو سال کی حکومت میں فرقہ وارانہ فسادات بھی کبھی نہیں ہوئے۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے پاکستان کے وجود میں آنے کے چھیالیس سال میں اس نوعیت کے فسادات کی تعداد بھی بیان کر کے شیعانِ حیدرِ کرار کے لیئے لمحۂ فکریہ پیدا کر دیا ہے۔ اب بھی ہمارے کچھ عاقبت نااندیش ہم مسلک پاکستان بننے کے جواز کے حق میں تاویلات پیش کرنے میں آگے آگے ہوتے ہیں۔

لکھنؤ کے تمدن پر سیر حاصل گفتگو کے بعد مذہب پر لکھتے ہوئے ضمیر اختر صاحب نے نہایت مختصر پیرائے میں شیعیت اور اس کے عقیدے کی بنیادی باتیں بھی بیان فرمادی ہیں اور وہ بھی انتہائی دل نشیں انداز میں مذہب حقہ کے اہم بنیادی عقائد کا تذکرہ فرمایا ہے تاکہ غیر متعلق لوگوں کو صحیح تعارف ہو جائے۔

حضرت امیر خسرو کے متعلق مضمون صرف ان کے عقائد پر ہی نہیں بلکہ نظام الدین اولیا الشائخ کے عقائد پر بھی روشنی ڈالتا ہے بالخصوص نظام الدین اولیا کے ملفوظات "راحت المحبین" سے حضرت علی علیہ السلام کی فضیلت پر نثر کا نمونہ۔ "اولیات امیرالمومنین حضرت علی علیہ السلام کے ذیل میں جن خیالات کا اظہار ہوتا ہے، اس سے ہر دو حضرات کے عقیدے کی واضح تشریح موجود ہے۔ حضرت امیر خسرو کے کلام کا نمونہ کتاب میں وافر تعداد میں تفصیل سے موجود ہے۔ جس میں ابہام کی گنجائش ہی نہیں رہ جاتی، پھر بقول جناب ضمیر اختر نقوی: "کہا جاتا ہے کہ قوالی بھی امیر خسرو کی ایجاد ہے، یہی وجہ ہے کہ کوئی ایسا قوال نہ ہوگا جو ان کے بولوں کی تان لگا کر سننے والوں کو

وجد میں نہ لاتا ہو۔ قوال حضرات کے بزرگوں سے یہ روایت چلی آئی ہے کہ حضرت امیر خسرو نے "قول رسولؐ" کے لفظوں سے استفادہ کر کے راگ ایجاد کیا تھا، وہ قول یا حدیث پیغمبر اسلام نے بروز غدیر خم اپنی اُمت پر واجب قرار دی تھی۔

"من کنت مولا فھذا علیؑ مولا"

اس حدیث مبارکہ کو امیر خسرو نے موسیقاروں اور قوالوں کے لیے اس طرح راگنی میں باندھا کہ لوگوں پر وجدان کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے اور محفل سماع میں بیٹھیوں کو "حال" آنے لگتے ہیں۔ وہ سب ہمارے ہم مسلک نہیں ہوتے، غیر ہی ہوتے ہیں اور دشمنان علیؑ غصے میں تڑپتے ہیں، تاؤ کھاتے ہیں، اپنے بچوں کو نصیحتیں کرتے ہیں کہ سماع فعل حرام ہے، اس کے قریب نہ پھٹکو۔ خیر، وہ تو دشمنوں کے گروہ سے متعلق ہیں، کبھی اپنے کردار کا بھی ہم ادراک کرنے کی کوشش کریں کہ ہم نے تصوف سے جو راہِ فرار اختیار کی اور سماع کی محفلوں میں شرکت سے گریز کیا اور اس ادارے کی سرپرستی سے ہاتھ کھینچ لیا تو اس سے فوائد سے زیادہ نقصانات ہوئے ہیں۔ بحث بہت طولانی ہو جائے گی، لیکن کوئی حقیقت پسند انکار نہیں کر سکتا کہ ہمارے اس عمل سے وہابیت کو تقویت پہنچی ہے، کیونکہ مشترک اقدار تو یہی تھیں ورنہ نماز کے لیے تو مسجدیں علیحدہ پہلے بھی تھیں، اب بھی ہیں۔ روزے کے سحر و افطار کے اوقات جداگانہ ہیں، حج کے مناسک میں فرق ہے، زکوٰۃ کے نصاب میں یکسانیت مفقود ہے، خمس کا دوسروں میں تصور تک نہیں، جہاد ہمارے مسلک میں غیبت امام میں جائز نہیں تو اتحاد فکر کہاں رہ جاتا ہے؟ قدر مشترک جیسا میں نے پہلے بیان کیا، اس کو ہم نے خود شجر ممنوعہ قرار دے لیا۔

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کی یہ کتابیں گوناگوں موضوعات کا احاطہ کیے ہوئے ہے اور میں تبصرہ کرتے کرتے اصل عنوان سے بھٹک جاتا ہوں۔ اُردو شعرا جو کتاب کا

اصل مقصود ہیں، اس پر میں کچھ نہیں لکھ سکا ہوں، مضمون بھی طویل ہو گیا ہے، لہٰذا بہت اختصار سے چند سطور میں اپنا مطلب بیان کرنے کی سعی کروں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب نے دہلی اور لکھنؤ کے قابلِ ذکر اُردو شعرا کے منقبتی کلام کے نمونے نہایت عمدگی کے ساتھ کتاب میں جمع کر کے ادبی دنیا میں اپنا مقام بنالیا ہے، اکا دکا شعرا دونوں شہروں کے علاوہ بھی تبرکاً شامل ہیں، لکھنؤ کے ایک عظیم منقبت گو شاعر حضرت فضل لکھنوی کے کلام کا شامل نہ ہونا باعث تعجب ہے۔ ان کی تخلیقات یقیناً اس کتاب میں اچھا اضافہ ثابت ہوتیں۔ علاوہ ازیں کچھ اور بھی شعرا کی عدم موجودگی کھٹک رہی ہے، مثلاً یاس یگانہ چنگیزی، استاد قمر جلالوی، نجم آفندی، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر وغیرہم۔ یہ وہ شعرا ہیں جن کا کلام مدحت و منقبت علیؑ میں آسانی سے دستیاب ہے، پنجاب کے شعرا تو بکسر ہیں ہی نہیں۔ سندھ کے ہفت زباں شاعر بچل سرمست کا اُردو میں منقبت علیؑ میں کلام شائع ہو چکا ہے۔ ثابت علی شاہ اپنے سندھی مرثیوں کی وجہ سے سندھ کے میر انیس کہلاتے ہیں، ان کا منقبت علیؑ میں فارسی کلام موجود ہے۔ میں نے یہ تفصیلات آئندہ اڈیشن میں شمولیت کے پیش نظر ضمیر اختر نقوی کی توجہات مبذول کرانے کی خاطر لکھ دی ہیں۔ قاضی نذر الاسلام صوبہ بنگال کے شاعر تھے۔ بنگالی زبان ہی میں شعر کہتے تھے، بین الاقوامی شہرت کے حامل ہیں، مداحِ علیؑ تھے، واقعات کربلا اور منقبت اہلِ بیتؑ میں بہت کلام بنگالی میں موجود ہے۔ بنگلہ دیش کے وجود میں آنے سے پہلے اکثر ان کے اُردو ترجمے کراچی کے اخبارات میں شائع ہوتے تھے۔ اس کو شائع کرنے کا جواز ہے کہ برصغیر کے شاعر تھے خوشحال خاں خٹک جو صوبہ سرحد کے پشتو کے سب سے بڑے شاعر تسلیم کیے جاتے ہیں، وہ بھی ہر صاحب دل دانش ور کی طرح مداحِ مولائے کائنات تھے۔ ان کے منقبتی کلام کے

اُردو میں ترجمے علامہ ضمیر اختر صاحب کی باریک بیں نظروں سے پوشیدہ نہیں ہوں گے۔ آئندہ کسی کتاب میں یا کسی کتاب کے اڈیشن میں بنگالی اور پشتو کے باب میں یہ کلام بھی شائقین کے لیے پُرکشش ہوگا۔

"شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" کے باب میں ابتدا حضرت امیر خسرو سے ہوئی اور محمد قلی قطب شاہ، ولی دکنی، میر تقی میرؔ، مرزا رفیع سوداؔ، نظیرؔ اکبر آبادی، میر سوزؔ، قائمؔ چاند پوری، میر حسنؔ، مصحفیؔ، جراتؔ، انشاؔ، ممنونؔ دہلوی سے سلسلہ مرزا غالبؔ تک اور پھر آگے ذوقؔ، مومنؔ، بہادر شاہ ظفرؔ، ظہیرؔ، ناسخؔ، آتشؔ، واجد علی شاہ پھر لکھنوی شعرا امیرؔ، برقؔ، رشکؔ، بحرؔ، قلقؔ، صباؔ، امانتؔ، رندؔ، یاسؔ، آرزوؔ، صفیؔ، ثاقبؔ، عزیزؔ اور محشرؔ تک جاتا ہے۔ حسرت موہانی، بے خود موہانی کا کلام ہے۔ گویا اُردو کے تقریباً بڑے شعرا کے کلام کے نمونے موجود ہیں۔ سب نے مولائے کائنات کے حضور گل ہائے عقیدت پیش کر کے اپنی عاقبت کو سنوارا ہے اور آخرت کے لیے زادِ راہ اکٹھا کیا ہے۔ سب کا کلام اچھوتے انداز میں دل کی گہرائیوں سے کہا گیا ہے جس سے احساس کو جلا اور ایمان کو تقویت ملتی ہے۔ اگر سب کا تذکرہ علیحدہ علیحدہ کیا جائے اور سارے مدح خوانوں کے کلام کے اوصاف، ترکیبات اور خصوصیات پر مختصر بھی لکھا جائے تو ایک کتاب مرتب ہو جائے گی اور باعثِ طوالت ہوگا۔ میں تو بس نظیر اکبر آبادی کے بارے میں کچھ ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اظہارِ خیال کر کے تخفیفِ زحمت چاہتا ہوں۔

حالاتِ زندگی میں جیسا ضمیر اختر نقوی نے تحریر فرمایا ہے کہ نظیر اکبر آبادی کے والد سنی تھے، لیکن خود نظیر مذہباً شیعہ تھے اور اس کا اظہار بھی برملا ان کے کلام سے آشکارا ہے۔ تبدیلی مسلک بربنائے تحقیق ہوئی ہوگی، پھر شیعہ ہوئے بھی تو ایسے کٹر کہ پچاس روز متواتر مجالسِ عزا برپا کرتے تھے، تعزیہ داری تو ہوتی ہی تھی۔ سینہ کوبی، اشک باری

سے ایمان کی پختگی اور عقائد کا پتہ چلتا ہے۔ اُردو ادب میں نظیر کا جو مقام ہے، وہ کسی سے پوشیدہ نہیں، لیکن ضمیر اختر صاحب نے ان کے کلیات میں شامل ہندوؤں کے تہواروں پر نظموں کی موجودگی کی وجہ سے لکھا ہے کہ نظیر کا کلیات انھیں خرافات سے بھرا پڑا ہے۔ اس سلسلے میں میرا اپنا مطمحِ نظر یہ ہے کہ نظیر نے یہ کلام "نظریہ ضرورت" کے تحت کہا ہوگا، اس کے معروضی حالات اسی کے متقاضی تھے، ہندو شعرا رسولِ اکرمؐ، اہلِ بیتؑ واقعات کربلا اور مولا علیؑ کی شان میں منقبتیں، سلام، نوحے اور قصیدے لکھ رہے تھے تو نظیر نے بھی خیر سگالی کے طور پر لکھ دیا ہوگا۔ اور اگر یہی سب کچھ خرافات ہے تو اس سے میرزا علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی بھی نہیں ہیں۔ میں تو ان کے لیے بھی یہی کہوں گا کہ ان دو حضرات نے بھی خیر سگالی اور ہمت افزائی کے طور پر لکھا ہوگا تاکہ عقیدتاً اسے کوئی نام دیا جائے۔

اُردو، فارسی، عربی شعرا جن کے منقبت علیؑ میں کہے ہوئے کلام کے چیدہ چیدہ نمونے اس کتاب میں دیے گئے ہیں، ان کے جمع کرنے میں علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کو جو محنت شاقہ کرنی پڑی ہوگی، اس کا اندازہ کرنا ہر ایک کے بس کا نہیں۔ کئی ممالک، یہاں تک کہ لندن تک کے کتب خانوں کو علامہ نے کھنگال ڈالا ہے تب جا کر یہ تاریخی کارنامہ انجام دیا جاسکا ہے۔ کسی شاعر کے دیوان تک رسائی کے بعد اس میں سے منقبت کے اشعار تلاش کرنا بھی جان جوکھوں کا مسئلہ ہے۔ اس میں وقت، محنت اور مالی وسائل، یہ سارے عوامل اپنی جگہ اہمیت کے حامل ہیں۔ کسی مضمون، افسانے، ناول، شعروں کے مجموعے پر تو تنقید کی جاسکتی ہے، لیکن ضمیر اختر صاحب کا یہ عظیم کام تو ستائش اور تعریف کا مستحق ہے۔ اس کتاب کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی ضرورت ہے۔

میں اس کتاب کی اہمیت اور اس کے دور رس نتائج کے پیشِ نظر اہلِ بیتؑ کے

مداحوں اور مولائے کائنات امیر المومنین حضرت علی علیہ السلام کے چاہنے والوں کو مشورہ دوں گا کہ ہر شخص حسب استطاعت یہ کتابیں خرید کر ملکی اور غیر ملکی لائبریریوں میں تقسیم کردے کہ کتب خانوں میں کتاب ہمیشہ کے لیے محفوظ بھی ہو جاتی ہے اور لاتعداد شائقینِ کتب اس سے استفادہ بھی کرتے ہیں۔ مختلف نقطہ ہائے نظر کے کتب بیں حضرات جب یہ منقبتی اشعار پڑھ کر محظوظ ہوں گے تو یہ آپ کے لیے باعثِ ثواب بھی ہوگا اور صدقۂ جاریہ بھی۔

اپنے مضمون کو اختتام تک پہنچاتے ہوئے علامہ ضمیر اختر صاحب کو اتنی اچھی کتاب لکھنے پر تہنیت پیش کرتا ہوں اور بارگاہِ ایزدی میں دعا گو ہوں کہ صحت، درازی عمر اور وسائل میں ترقی عطا فرمائے کہ وہ ایسے کام بار بار کرتے رہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن (لاہور)

مکرمی و محترمی علامہ ضمیر اختر نقوی

السلام علیکم!

میں آپ کی بے پناہ محبتوں اور شفقتوں کا احسان مند ہوں۔ آپ جس طرح اپنی تحریروں سے علم و ادب کی آبیاری فرما رہے ہیں اس کی جتنی بھی مدح سرائی کی جائے کم ہے۔ اُمید ہے کہ آپ کا یہ علمی سفر اسی طرح جاری و ساری رہے گا اور آپ اپنے افکار و نظریات سے ادب کو مالا مال کرتے رہیں گے۔

صوفی سیّد ابنِ حسن رضوی

اُردو منقبت نگاری پر پہلی کتاب

بلند پایہ محقق اور نامور خطیب سیّد ضمیر اختر نقوی کی تالیف، "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" ولائے علیؑ کی تشنگی کے صحرا میں دریا کا سماں پیش کرتی ہے۔ ان کی یہ آشفتہ سری اس دور میں کسی جہاد سے کم نہیں۔ ایسے دور میں جب علیؑ جیسی عظیم وقدر آور شخصیت کی نفی کی جارہی ہو، ان کی نورانی وروحانی حیثیت کو چھپایا اور جھٹلایا جارہا ہو، ان کے اوصاف وفضائل کے بحرِ بے کراں پر بند باندھنے بلکہ سراب ثابت کرنے کی کوشش کی جارہی ہو، تعصب وتنگ نظری کے نقار خانے میں کان پڑی آواز سنائی نہ دے رہی ہو اور تاریخ، سیر وکتب وتفاسیر واحادیث کی کتابوں سے ایک ایک کرکے علیؑ کے فضائل نکالے جارہے ہوں اور یہ سازش داخلی وخارجی دونوں سطحوں بلکہ حکومتی سطح پر بھی ہورہی ہو اور اس مقصد کے لیے قلم، ذہن، ضمیر، فکر، وفاداریاں، منبر، محراب، ہاتھ اور جبہ ودستار تک خریدے جارہے ہوں، غیر تو غیر، خود علیؑ کے ماننے چاہنے والے اور بابِ مدینۂ علم سے تمسک وتعلق رکھنے کا دعویٰ کرنے والوں کا عمل بھی غیروں سے مختلف نہ ہو اور جہانِ بشریت کے سامنے علم کے اس لولوئے تاب دار اور گوہرِ آب دار کے فضائل کو پیش کرنے میں پس وپیش سے کام لیا جارہا ہو تو ایسے حالات میں یہ کتاب صحرا میں اذان

سے کم نہیں۔

زیرِ نظر کتاب ضمیر اختر نقوی کی علیؑ سے طرف داری وفاداری کا بیّن ثبوت ہے۔ علیؑ دشمنی کے اس دور میں عشقِ علیؑ کی بات کرنا آسان نہیں۔ انھوں نے نئی نسل کو اپنے ادبی اعتقادی سانچوں کی بازیافت کی دعوت دی ہے۔ موجودہ عہد میں قلم کی راہ چلنا اور ہنر کی گرد ہونا آسان نہیں۔ انھوں نے اپنے ہم عصروں کی طرح لب و گوش پر خاموشی نہیں سجائی اور نہ کسی مصلحت کوشی سے کام لیا، بلکہ علیؑ شناسی اور علیؑ سے وفاداری کا برملا اظہار کیا اور ''شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ'' جیسی کتاب لکھ کر پڑھنے والوں کو قلم دار اور تحریر رسن سے آزاد و بے خوف ہو کر دعوتِ فکر دی۔ یہ ان کی عظمتِ فکر کے انداز ہیں جو انھیں سبک لوگوں میں گراں اور اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتے ہیں۔ ضمیر اختر نقوی نے نہ صرف شاعری کے اعلیٰ معیارات کے حوالے سے عشقِ علیؑ کو اجاگر کیا ہے بلکہ اُردو کے ان نام ور شعرا کے مخفی شعری خزانوں کو بھی منظرِ عام پر لائے ہیں جن سے نئی نسل واقف نہیں، اور اس میں بھی انھوں نے صرف معیاری کلام ہی کو جگہ نہیں دی بلکہ صرف ان شعرا کے کلام کو درخورِ اعتنا جانا ہے جو واقعی اس بات کے مستحق ہیں اور جنھوں نے حضرت علیؑ کی بارگاہ میں نمک حق تہنیت ادا کیا ہے۔

ضمیر اختر نقوی سنبھل کر لکھتے ہیں۔ عشقِ علیؑ ان کا ایمان اور ان کی تحریروں کا سرمایہ ہے۔ وہ اپنے نظریات و معتقدات کے اظہار میں کسی مصلحت و ابہام و الجھاؤ سے کام نہیں لیتے بلکہ انھوں نے صاف صاف اپنے قاری پر واضح کر دیا ہے۔ یہ ایک اچھی علامت ہے۔ ضمیر اختر نقوی کی اس حوالے سے تخلیقی و تحقیقی صلاحیتوں کا اعتراف نہ کرنا قطعی غیر منصفانہ بات ہوگی کہ انھوں نے ایک ایسی صنف کو متعارف کرانے میں پیش رفت کی ہے جسے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت فراموش کیا جا رہا تھا یعنی ''منقبت''

چونکہ منقبت کا تعلق علیؑ اور اولادِ علیؑ سے ہے، لہٰذا اس سے چشم پوشی کی گئی اور منقبت کو اُردو ادب میں وہ مقام حاصل نہ ہوسکا جس کی وہ اہل تھی۔ اگرچہ منقبت کہنے والوں میں نمایاں اسمائے گرامی ان شعرا کے ہیں جن کا تعلق مکتبِ تشیع سے نہیں ہے، لیکن آج ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت علیؑ کی ذاتِ گرامی کو مسلک اور فرقوں میں تقسیم کرکے نہ صرف اسلام کی علمی اساس پر ضربِ کاری لگائی جارہی ہے بلکہ اُردو شاعری کو بھی دھڑوں میں تقسیم کیا جارہا ہے۔ اس فکری سطحیت وعصبیت پر جتنا بھی افسوس کیا جائے کم ہے، ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ نعت کی طرح منقبت کو بھی اس کا جائز مقام دیا جاتا۔ ضمیر اختر صاحب نے اس دبے پاؤں چلنے والی سازش کو محسوس کیا اور اپنی کتاب میں منقبتوں کو مناسب مقام عطا کیا، کیونکہ منقبت بھی نعت کی طرح ہماری مذہبی وتہذیبی روایت کا تسلسل ہے۔ اس قطعی اہمیت کے حامل اور ایمان افروز اور دل آویز تسلسل کو قائم رکھنے میں جن شعرا نے نمایاں کردار ادا کیا ہے، ان میں اکثریت کا تذکرہ اس کتاب میں موجود ہے۔

اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ذکرِ علیؑ شاعر کو معتبر بناتا ہے اور عشقِ علیؑ اس کی فکر کو صیقل کرتی ہے۔ تاریخِ ادبِ اُردو گواہ ہے کہ میرؔ وغالبؔ وانیسؔ ودبیرؔ ونظیرؔ، آتشؔ وسوداؔ واقبالؔ وجوشؔ کو جو دوسرے شاعروں پر برتری وفوقیت حاصل ہے، یہ عشقِ علیؑ اور معرفتِ علیؑ ہی کی بدولت ہے، اسی لیے تو میرؔ صاحب نے کہا:

جو حیدری نہیں ، اسے ایمان ہی نہیں

اور کبھی فرماتے ہیں:

قبلہ علیؑ ، امام علیؑ ، مقتدا علیؑ

اور کبھی لوگوں کو مشورہ دیتے ہیں:

یا علی ، یا علی کہا کر تو

وہ اپنا عقیدہ کسی سے نہیں چھپاتے۔ فرماتے ہیں:

حیدری ہوں ، حیدری ہوں ، حیدری

کبھی بارگاہ مولائے کائنات میں اس طرح نذرانہ عقیدت پیش کرتے ہیں:

پارسا ہیں جو جواں پیر بدلی کہتے ہیں — جو ولایت ہیں رکھے، شاہ ولا کہتے ہیں
سالکِ مسلکِ دل راہ نما کہتے ہیں — ایک مولا کہیں ہیں، ایک خدا کہتے ہیں
یا علی جو تجھے کہتے ہیں ، بجا کہتے ہیں

میر صاحب عشقِ علی کی دولت سے مالا مال تھے یہی وجہ ہے کہ میر صاحب کو اردو غزل کا امام کہا جاتا ہے۔ میر ببر علی انیس کو "خدائے سخن" کا اعزاز ملا تو ولائے علی کی بدولت، اور آج تک دنیائے مرثیہ پر ان کے خانوادے کی حکمرانی ہے۔ مرزا دبیر اور دیگر مرثیہ گو شعرا کی محمدؐ و آلِ محمدؐ سے معرفت محتاجِ تعارف نہیں۔ غالب جیسا ہمہ گیر و آفاقی شاعر بھی اس منزل پر معرفتِ علی کے نتیجے میں پہنچا ہے۔

غالب ہے رتبہ فہم تصور سے کچھ اور بھی پرے
ہے عجز بندگی جو علی کو خدا کہوں

اردو شاعری کے شاعرِ آخر الزماں جناب جوش ملیح آبادی بھی ولائے علی میں سرشار ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہیں:

جوش ! ہم ادنیٰ غلامانِ علیِ مرتضیٰ
حکمت سے پیش آتے ہیں جہاں بانی کے ساتھ

جوش ملیح آبادی کی معرفت کی ایک ادنیٰ جھلک اور ملاحظہ فرمائیں:

اے مرتضیٰ! اے مدینۂ علم خدا کے باب! — اسرارِ حق ہیں تیری نگاہوں پہ بے نقاب

ہے تیری چشمِ فیض سے اسلام کامیاب
ہر سانس ہے مکارمِ اخلاق کا شباب

نقشِ وجود میں وہ تیرے سوز و ساز ہے
فرشِ حرم کو جس کی تجلی پہ ناز ہے

ضمیر اختر نقوی نے شعرائے اُردو کے ساتھ منقبت کی تعریف، معنی اور مفاہیم، قرآن اور مدحِ حضرت علی علیہ السلام اور فضائل کے مختلف پہلوؤں اور جہات کو اجاگر کیا ہے، علاوہ ازیں عربی شعرا کی مدحت پر ۴۰ صفحات اور فارسی شاعری اور ثنائے علی پر ۴۲ صفحات تحریر کیے ہیں۔ کیا اچھا ہوتا کہ عربی فارسی شعرا اور عشقِ علی پر علیحدہ علیحدہ کتابیں تحریر کی جاتیں اور ان اشعار کا اُردو میں ترجمہ بھی پیش کیا جاتا تاکہ اس دور کے اُردو شعرا عربی و فارسی شعرا کے کلام کی گہرائی و گیرائی، بلند فکری، علوئے فکر، ان کے فن کی پختگی، ندرت، جمالیت، درحریت اور عقیدت کا ادراک کر سکتے۔ کیونکہ عربی و فارسی کا خزانہ مدحت اُردو سے بہت زیادہ ہے۔ عربی و فارسی شعرا نے حضرت علی علیہ السلام کے بارے میں جو پیکر محسوسات تخلیق کیے ہیں، وہ فن کارانہ مہارت و انفرادیت کے آئینہ دار و مظہر ہیں اور فضائل و منقبتِ علی کا سمندر بھی جس کو نظم کرتے وقت ان شعرا نے قرآن و حدیث سے پورا پورا استفادہ کیا، اور یہ منقبتیں صرف شاعری ہی نہیں بلکہ قرآن و احادیث کی تفسیریں بھی ہیں۔ ان اشعار کے ترجمے سے اُردو شعرا کو اپنے پیکرِ احساسات سجانے میں خاصی مدد ملے گی۔ اگرچہ اُردو شعرا نے بھی بارگاہِ مولائے کائنات میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرنے میں کسی بخل سے کام نہیں لیا، لیکن جس طرح عربی شعرا نے مولائے کائنات کی ایک ایک فضیلت کو اپنے اشعار کے قالب میں ڈھالا ہے۔ فارسی اور اُردو شاعری کا دامن اس سلسلے میں خالی ہے اور پھر وہ بلاغت بھی نہیں ملتی۔ اگرچہ میرؔ و غالبؔ، ناسخؔ و آتشؔ، انیسؔ و دبیرؔ، اقبالؔ و جوشؔ نے عقیدت و

سوزت کے پلّے کو قدرے گراں کرنے کی کوشش کی ہے، لیکن نئی نسل نے اس سلسلے میں کوئی نمایاں کردار ادا نہیں کیا۔

مذکورہ شعرا کی شاعری میں جو فکری و نظریاتی اور تہذیبی اور تخلیقی ذہن کارفرما نظر آتا ہے، اس کے مظاہر اس کتاب میں جابجا موجود ہیں جسے ضمیر اختر صاحب نے بڑی ذمے داری و ژرف بینی اور نہایت سلیقے اور اہتمام سے مرتب کیا ہے۔ یہ ایک قابلِ قدر کتاب ہے جسے پڑھ کر اردو شاعری کا معیاری شوق رکھنے والے اور خصوصاً موالیانِ حیدرِ کرار کی ذات حضرت علی علیہ السلام سے عقیدت و معرفت، بصیرت و بصارت، عرفان و آگہی اور وجدان میں اضافے کا سبب ہوتا ہے۔ جن اشعار کو بطور حوالہ اس کتاب میں پیش کیا گیا ہے، ان اشعار کی چمک دمک اور حسنِ تابش ابدالآباد تک قائم و دائم رہے گی اور عصبیت کی دھند چھٹنے، فکرِ انسانی کے ارتقا اور انسان سے آگاہ کرنے کے عمل میں تیزی کے ساتھ معمورۂ عالم کی اس معتبر، مقدس اور محترم ترین ہستی (علیؑ) کی شخصیت، اس کے اوصافِ حمیدہ و صفاتِ جلیلہ، کردار و عمل، اس کی روحانیت و بزرگی اور اس کے علمی کمالات کارناموں کے حیات بخش ثمرات اس دنیا پر روز بروز واضح و مرتب ہوتے جائیں گے۔ جب اس عہد کے انسانوں سے ہوسِ زر، تعصب و تنگ نظری، فکری محدودیت و سطحیت اور مفاد پرستی کے بادل چھٹ جائیں گے تو انھیں خود احساس ہوگا کہ ان کی عملی تشنگی کا سبب، اس کی جہالت کی وجہ بابِ مدینۂ علم سے دوری اور حقوقِ انسانی کے اس عظیم پاسباں سے چشم پوشی اور اس کی عظمت سے انکار اور عدمِ استفادہ ہے۔ حضرت علیؑ کی پُرعظمت و نورانی شخصیت کی حیاتِ طیبہ سے ناواقفیت کے نتیجے میں مسلمان اسلام و ایمان کے اصل مدعا و مفہوم سے آشنا نہ ہو سکے اور یہی وجہ ہے کہ گزشتہ نصف صدی سے ادبا و شعرا نے حضرت علی علیہ السلام پر کوئی مبسوط کتاب

نہیں لکھی اور نہ کوئی قابلِ ذکر منقبت کہی۔ اس کی ایک وجہ اذیت و عدمِ معرفت اور دوسری وجہ تعصب و معاد ہے، اور یہ فکر اردو زبان کے حق میں کسی زہر ہلاہل سے کم نہیں۔ جس زبان کے ادبا و شعرا تعصب و تنگ نظری کا شکار ہو جاتے ہیں، اس زبان کا علمی سرمایہ گھٹ کر رہ جاتا ہے۔

ضمیر اختر صاحب نے ادبی دیانت داری سے کام لیتے ہوئے شاعرِ آخر الزماں جوشؔ ملیح آبادی پر اپنی کتاب کا اختتام کر دیا ہے۔ اگرچہ جوشؔ کے ہم عصر شعرا میں جمیل مظہریؔ، نجم آفندیؔ، قمر جلالویؔ، فضلؔ، سالکؔ، اختر شیرانیؔ، یگانہؔ، کاملؔ اور مانی جائسی نے بھی کچھ نہ کچھ حضرت علی علیہ السلام کی بارگاہ میں نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے، لیکن یہ نہ ہونے کے برابر ہے اور کوئی طویل و قابلِ ذکر منقبت نہیں ہے جسے اردو ادب میں کوئی نمایاں مقام حاصل ہو سکا ہو۔ ہم موجودہ عہد کے شعرا اور خصوصاً مرثیہ گو شعرا سے یہ امید رکھتے ہیں کہ وہ حضرت علیؑ کے رزم و عزم، علم و حکمت، مجاہدہ و شہادت، حقوقِ انسانی کے سلسلے میں ان کی سعی، عدل و انصاف کے قیام کی کوششوں، ان کی عظمتوں، طہارتوں، تقدسوں اور مطلق احساسات کے گوناگوں انواع اور آپ کی بے نظیر شخصیت کے بارے میں غور و فکر فرمائیں گے، ان کی حیاتِ طیبہ کا قطعی غیر جانب داری سے مطالعہ فرما کر حضرت علی علیہ السلام پر کوئی قابلِ ذکر منقبت کہہ کر نہ صرف اپنے ہم عصروں میں خود کو ممتاز کریں گے بلکہ محمدؐ و آلِ محمدؐ کی نگاہ میں سرخ رو ہوں گے اور اس طرح رثائی ادب میں بھی ایک گراں قدر اضافہ فرمائیں گے۔ اگر موجودہ عہد کے شعرا نے اپنی ذمے داری کو محسوس کیا تو کوئی وجہ نہیں کہ بہت جلد "شعرائے اردو اور عشقِ علیؑ" کا دوسرا حصہ منظرِ عام پر آ جائے۔

مولانا ضمیر اختر جو صرف اخلاص و للّٰہیت کے تحت عبادت سمجھ کر غیر تجارتی بنیادوں

پر، یعنی نفع و نقصان سے بے نیاز ہو کر مدحِ اہلِ بیت کر رہے ہیں یا ان کے مدح خوانوں کا تذکرہ کرتے رہتے ہیں، ان کا یہ جذبہ و ذمہ داری قدر و لائقِ ستائش و مبارک باد ہے۔ اُمید ہے کہ وہ اپنے تحریری سفر کے قافلے کو اسی طرح آگے بڑھاتے رہیں گے۔

اس کتاب کی اہمیت و افادیت مُسلَّم ہے۔ موصوف نے "شعرائے اُردو اور عشقِ علی" کے صفحہ نمبر ۹۱ پر اسماعیل حمیری کا سنِ ولادت ۱۰۵ھ اور وفات ۱۹۹ھ تحریر کیا ہے۔ یہ تاریخ شاید غلط ہے یا پھر کاتب کے سہو کا نتیجہ ہے۔

کتابت کی اغلاط سے قطع نظر، یہ کتاب اپنے موضوع و مواد و انفرادیت و سرورق کے لحاظ سے ایک معیاری کتاب ہے جس کے مطالعے سے یہ پتہ چلتا ہے کہ مولانا ضمیر اختر نقوی صرف تقریر کے ہی نہیں بلکہ تحریر کے بھی آدمی ہیں اور جامع الکمالات شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ ایک تربیت یافتہ مذہبی ذہن اور تحقیقی مزاج رکھتے ہیں، اور یہی رجحان و مزاج اس کتاب کا محرک بھی ہے اور روح بھی۔ پروردگارِ عالم ان کی تحریری توفیقات میں مزید اضافہ فرمائے!

وحید الحسن ہاشمی (لاہور)

۹، اگست ۱۹۹۹ء

قبلہ محترم ضمیر اختر صاحب..... تسلیمات!

خدا کا شکر ہے کہ آپ پاکستان میں گرہن سے قبل آ گئے ورنہ مغربی نجومیوں نے تو دل دہلا دیئے تھے۔ لندن میں آپ کی مختصر تقریر کا احوال میرے ایک دوست موسیٰ نظامی نے تحریر کیا ہے خدا آپ کو زندہ رکھے اور یوں ہی لفظوں کے پھول جگہ جگہ نچھاور کرتے رہیں۔

نیّر اسعدی

دنیائے ادب میں ایک اور تحقیقی کتاب کا اضافہ

علامہ ضمیر اختر نقوی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں، ایک ہر دل عزیز خطیب، بہترین محقق اور عمدہ شاعر ہیں۔ ان کی فکر کی جولانیاں ان کی تحریر و تقریر، دونوں میں موج زن ہیں کہ باب شہرِ علم ان کی فکر کا مخزن ہے۔ یہ عشقِ علی سے سرشار ہیں، یوں حق بات کہنے کے سزاوار ہیں۔ عاشقِ نفسِ صاحب معراج ہیں اور خود منکسر المزاج ہیں۔ اپنی تہذیب کے آئینہ دار ہیں، توسنِ فکر کے شہسوار ہیں۔ ان کی تحریر حرفِ معتبر ہے۔ ان کی تاریخ اسلام پر نظر ہے، اس لیے تحقیق و تالیف ان کا مستقل مستقر ہے۔ چونکہ آپ تاریخ ادب اور تاریخ اسلام پر گہری نظر رکھتے ہیں، اس لیے آپ کی کئی تحقیقی کتابیں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر مقبولِ خاص و عام ہو چکی ہیں۔ ان کتابوں میں "اردو غزل اور کربلا"، "جوش ملیح آبادی کے مرثیے"، "میر انیس...... حیات اور شاعری"، "تاریخِ مرثیہ نگاری"، "خاندانِ میر انیس کے نامور شعراء" بھی رثائی ادب کا بہترین سرمایہ ہیں۔

زیرِ نظر کتاب "شعرائے اردو اور عشقِ علی" الحاج ضمیر اختر نقوی کی ایسی تالیف ہے کہ جس کے لفظوں میں ولائے علی کا ایک سمندر موج زن ہے۔ یہ کتاب سات ابواب اور ایک

خصوصی باب پر مشتمل ہے۔

کتاب کے سات ابواب میں پہلے "تین باب" قرآن میں حضرت علی کے فضائل اور منقبت کے محرکات، "عربی شاعری اور مدحتِ علی" "فارسی شاعری اور ثنائے علی" جناب ضمیر اختر نقوی کی علمی اور تحقیقی فکر کی آئینہ دار ہیں۔

چوتھا باب "اردو منقبت نگاری کا ارتقا" ایک ایسا باب ہے۔ جس میں منقبت نگاری کے ارتقا کے ساتھ اسلامی تاریخ بھی سمائی ہوئی ہے۔

پانچواں باب "شعرائے اردو اور عشقِ علی" کتاب کا اصل باب ہے۔ جس میں امیر خسرو سے لے کے محشر لکھنوی تک اہم شعرا کے حالات اور مولائے کائنات کی مدح میں ان کا کلام شامل ہے۔ جس میں ضمیر اختر نقوی کی تحقیقی فکر نے چار چاند لگا دیے ہیں۔

چھٹے باب "اردو مرثیہ نگار شعرا اور مدحتِ علی" میں مرثیوں میں مدحِ علی کے بندوں کے علاوہ مرثیہ گو شعرا کی مدحِ علی میں رباعیات و قطعات و مناقب تحریر کی گئی ہیں اور مرثیہ گو شعرا کے حالاتِ زندگی بھی چیدہ چیدہ رقم کیے ہیں۔

خصوصی باب "میر انیس اور حضرت علی کی مدحت" پر مشتمل ہے۔ میر انیس سے جناب ضمیر اختر نقوی صاحب کو خاص عقیدت ہے اور انھوں نے میر انیس پر کافی کام کیا ہے۔ اس خصوصی باب میں میر انیس کا وہ کلام شامل ہے جو حضرت علی کی ولادت، عہدِ طفلی و عہدِ شباب کے کارناموں اور عقدِ علی و زہرا پر کہا گیا ہے۔ اس کلام کے آئینے میں حضرت علی کی سیرت اور سوانح حیات کا عکس ملتا ہے۔

ساتواں باب "عہدِ جدید میں عشقِ علی کی مثالیں" سر سید کی عشقِ علی میں ڈوبی ہوئی تحریر اور حالی، میر مہدی مجروح، اکبر الہ آبادی، صفیر بلگرامی، شاد عظیم آبادی، علامہ اقبال اور جوش ملیح آبادی کے عشقِ علی سے سرشار کلام سے مزین ہے۔

"شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" کے مختصر جائزے کے بعد ہم کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ضمیر اختر نقوی نے مختلف شعرا کے کلام کے ساتھ اسلامی اور ادبی تاریخ کو بھی ایک حد تک اس ۹۱۲ صفحات کی ضخیم کتاب میں یک جا کر کے ایک اہم کارنامہ انجام دیا ہے، اس لیے الحاج ضمیر اختر نقوی صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے دنیائے ادب کے عشقِ علیؑ سے سرشار کافی سرمائے کو محفوظ کر دیا ہے۔

میں ایک دفعہ پھر محترم جناب ضمیر اختر نقوی صاحب کو "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" کی طباعت پر دلی مبارک باد پیش کرتا ہوں، کہ بہر حال یہ ایک مشکل کام انھوں نے بخیر وخوبی انجام دے کر دنیائے ادب کو اسلامی اور ادبی تاریخ سے مزین ایک ایسی کتاب دی ہے۔ جس کی ہر سطر عشقِ علیؑ کا ایک دریا ہے اور ہر صفحہ عشقِ علیؑ کا سمندر ہے۔

☆☆☆

علامہ فروغ کاظمی

پیغمبر اکرمؐ کا یہ ارشاد بھی ہے کہ جس شخص کا اخلاق زیادہ اچھا ہے وہ مجھے زیادہ محبوب ہے اور قیامت کے دن وہ مجھ سے زیادہ قریب ہوگا، نیز، امیر المومنین حضرت علی علیہ السّلام نے فرمایا ہے کہ لوگوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کرو کہ جب تک تم زندہ رہو لوگ تمہاری ہم نشینی کی تمنا کریں اور جب دنیا سے رخصت ہو جاؤ تو لوگ تمہارے غم میں آنسو بہائیں۔

ان ارشادات وفرمودات کی روشنی میں جب ہم علامہ ضمیر اختر کی لطیف و پرکشش سیرت وشخصیت کی ہمہ گیری کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں ان کی زندگی کا کوئی پہلو ایسا نظر نہیں آتا جو اعلیٰ ترین انسانی واخلاقی قدروں سے خالی ہو۔

آلِ محمد رزمی

فکری خواب کی تعبیر

''شعرائے اردو اور عشقِ علی'' میں حضرت علی علیہ السلام کی تاریخ ساز شخصیت کی زندگی کے مختلف پہلوؤں اور فضائل کو اجاگر کیا گیا ہے اور شعرائے کرام کے نذرانۂ عقیدت کے حوالے سے تاریخ کے NOTICEABLE اور SUBSTANTIAL PERSON کے اس عظیم کردار کے ذریعے ہم میں انسانی فطرت کے متعلق وہ تحیر آمیز احساس بیدار ہوتا ہے جو زندگی کی رحریت، مقصدیت اور روحانیت سے بھری صورتوں اور شخصیتوں کی نشان دہی کرتا ہے۔ جس سے زندگی و کائنات کی تازگی کا احساس برقرار بیدار رہتا ہے۔ تاریخ کے یہ کردار جب انسانی سطح اور زمانی خصوصیات سے بلند ہو کر خود زندگی کی کسی نہ کسی لازوال کیفیت کے حوالے سے امر ہو جاتے ہیں تو ہمیں ان میں دیومالائی عظمت کا احساس ہو جاتا ہے، اور یہی وہ احساس ہے جو ڈاکٹر علی شریعتی جیسے مدبر و مفکر کو کہنے پر مجبور کرتا ہے کہ علی ایک دیومالائی حقیقت ہے۔

امام علی .... خانہ زادِ لامکاں، امامِ انس و جاں، پیشوائے دو جہاں، افضلِ کون و مکاں، کاروارِ کن فکاں، دستگیرِ بے کساں، عظمتوں کا آسماں، ماحصلِ ایماں اور آفتابِ اہلِ عرفاں ہیں۔

امام علیؑ .... تاریخ انسانی کا مرکزی نقطہ، محور اتحاد، آفتاب ہدایت شہنشاہ ولایت منبع فضائل، علم کی معنویت، صاحب سیف وقلم اور تاریخ ساز اور عہد آفریں شخصیت ہیں۔

امام علیؑ .... اپنی شخصی وجاہت، اپنے اوصاف حمیدہ، اپنے حسب ونسب، اپنی صفات جلیلہ اور اپنی ذاتی خوبیوں کے اعتبار سے دنیا کے معزز ومحترم انسان ہیں جن کی پاکیزگی وطہارت پر آیۂ تطہیر گواہ جن کی عظمت پر آیۂ مباہلہ شاہد، جن کی فضیلت میں حدیث غدیر، حدیث وراثت، حدیث مثیت اور حدیث منزلت گواہ ہے۔

امام علیؑ .... جو علم میں آدمؑ کے وارث، حلم میں نوحؑ کے ثانی اور ہیبت میں موسیٰؑ کے مثل ہیں۔

امام علیؑ .... کلام کے امام، اسرار ومعانی کا دریائے بے کراں اور فضیلتوں کا سمندر ہیں۔

امام علیؑ .... جن کی مودت اجر رسالتؐ، جن سے عقیدت فرض وسنت، جن سے محبت رکھنا نسبی شرافت کی دلیل اور جن سے عشق ایمان کا حاصل ہے۔

امام علیؑ .... چودہ سو سال گزر جانے کے بعد بھی جس کے چاہنے والے اور جس سے عشق کرنے والے شعرا کے اشعار سے گلشن مدحت کے پھول مہک رہے ہیں اور جن سے عقیدت رکھنے والوں کی عقیدتوں کے گلاب چودہ صدیوں کے بعد کھل رہے ہیں۔

امام علیؑ .... کی شخصیت نہ صرف اپنے زمانے کے شعرا کو متاثر کرتی ہے بلکہ آنے والے دور کے شاعروں کو بھی متاثر کرتی ہے اور باب علم ودانش آج بھی زمان ومکان کے سمندر میں غوطہ زن ہو کر حقائق کے موتی تلاش کرنے کی کوشش میں مصروف ہیں۔

امام علی .... جن کے فضائل و کارنامے زندہ و تابندہ ہیں جن پر ہزاروں قلم اٹھ کر ناتمام رہ گئے ہیں۔

امام علی .... علم کا وہ چراغ ہیں جو قیامت تک اربابِ دانش اور حق کے متلاشیوں کی راہوں کو روشن کرتے رہیں گے۔

امام علی ...... زمین پر سونے جَو کی روٹی کھانے، خُرمے کے پیوند لگے لباس پہننے دن کو مزدوری اور کارِ امامت انجام دینے اور شب کو عبادتِ خدا میں بسر کرنے والا یہ خدا صفات بندہ، انسانی تاریخ کے افق پر چمکتا ہوا ایسا آفتاب ہے جسے ہر دور کے اہلِ علم واہلِ قلم، باضمیر انسان، انصاف پسند، غیر جانب دارانہ طبائع، انسان مشرب اور شعرائے کرام نذرانۂ عقیدت وہدیہ سلام پیش کرتے رہیں گے اور ہر دور، ہر علاقے، ہر رنگ ونسل اور مذہب وفرقے کے لوگ اس کے افکار سے رہنمائی ورہبری حاصل کرتے رہیں گے، علم کی ترقی، ذہنِ انسانی کے ارتقا، فکری بیداری، بالغ نظری کے ساتھ امام علی کے افکار ونظریات کی اصابت معتبر ترین ہوتی چلی جائے گی۔

"شعرائے اُردو اور عشقِ علی" امام علی کے چاہنے اور ماننے والوں کے مطالعے کے لیے ہدیہ ہے۔ اس کتاب کے مصنف علامہ ضمیر اختر نقوی نے یہ کتاب محض اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے نہیں لکھی بلکہ عقیدت کے ساتھ ان کا مقصد یہ بھی تھا کہ علی کے چاہنے والوں کو علی شناسی کی دعوت بھی دیں تا کہ امام علی سے محبت وعقیدت رکھنے والے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ فضائلِ علی سے آگاہ ہو سکیں۔ یہ کتاب فضائلِ علی کا مجموعہ اور فضیلتوں کا سمندر ہی نہیں بلکہ مولائے کائنات کی شخصیت کا شعور وادراک ان کی طرزِ زندگی کو شاعری کے حوالے سے سمجھانے کی اچھی کاوش ہے، اور یہ کوشش کرنے والا ایک ایسا شخص ہے جو اپنی ذات میں ایک انجمن اور ایک ادارہ ہے۔

علامہ سید ضمیر اختر نقوی ہماری قوم کے اُن گنے چنے افراد میں سے ہیں جن کی تخلیقی قوت، تحریری و تحقیقی صلاحیت، تبحرِ علمی، طرزِ خطابت، علمی و ادبی خدمت اور ذمّے داری و دیانت کے پیشِ نظر ہم انھیں قومی سرمایہ قرار دے سکتے ہیں۔

آپ کی ادبی خدمات، صائب النظری اور صلابت رائے کے پیشِ نظر عصرِ حاضر کے بیشتر اربابِ کمال اور اصحابِ فکر و نظر آپ کے مداح و معترف اور قدر دان ہیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کا اندازِ تحریر بہت رواں اور سلیس۔ انتہائی سادہ و پر وقار، تفہیم کا انداز نہایت عمدہ، استنباط و استدلال منطقی و عقلی اور تقدیم کا اسلوب حد درجہ پُر کشش ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی نے ''شعرائے اُردو اور عشقِ علی'' لکھ کر جو ادبی کارنامہ انجام دیا ہے، وہ اپنی ہمہ گیر افادیت و فضیلت کے لحاظ سے پڑھنے کی شے اور سمجھنے کی چیز ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ ہمارے ثقہ نقادان کی اس کوشش کو بھی ضرور سراہیں گے اگرچہ ہمارے عہد کے نقادوں میں بھی ہر نقطۂ نظر کے لوگ (PEOPLE OF ALL SHADES OF OPINION) ہیں، لیکن اگر ان ناقدین نے خلوصِ نیت (HONESTY OF PURPOSE) کے ساتھ اس کا مطالعہ کیا اور آزاد مشربی (ADIAPHORISM) کا مظاہرہ کیا تو علامہ ضمیر اختر کی گراں قدر (MAGNIFICENT) ادبی خدمات کو ضرور سراہیں گے۔ ذاتِ واجب علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی صلاحیتوں اور توفیقات میں اضافہ فرمائے اور وہ ہمیشہ اتنے عظیم تحقیقی کارنامے انجام دیتے رہیں اور سدا کامیابیاں و کامرانیاں ان کے ادبی شہ پاروں اور شاہکار مذہبی کتابوں کا استقبال کریں!

یہ مجلّہ جو آپ کے ہاتھوں میں ہے، ''شعرائے اُردو عشقِ علی'' کی تقریبِ رونمائی کے موقع پر پیش کیا جا رہا ہے جو علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی خدمت میں اراکینِ مرکزِ

علوم اسلامیہ اور ادبی اکادمی کا خلوصِ دل کا خراج و اعتراف بھی ہے، اور اس کتاب کے حوالے سے برصغیر کے ممتاز اہلِ قلم اور شعرا کی آرا و اعتراف و تنقید پیش کرنا بھی مقصود ہے جو ادبی مذاق کا منطقی عمل ہے اور اس کا کچھ مقصد ہوتا ہے اور یہ مقصد فنی کارناموں کی تشریح اور مذاق کی درستی ہے۔ صحیح معنوں میں تنقید پوری فنی تحریک کا جزو ہے۔ قوتِ تنقید کیا ہے، اس کی کیا اہمیت ہے، اس کا مقصد، اس کا میدانِ عمل کیا ہے، انسانی تہذیب اور کلچر کی ترقی میں اس نے کیا حصّہ لیا ہے، شخصی اور سماجی دماغ اور زندگی کو سدھارنے میں تنقید کی کیا قیمت ہے، یہ ایک علیحدہ بحث ہے۔

زیرِ نظر مجلّے میں ہم نے اہلِ قلم کی تعریف و تنقید، دونوں کو پیش کیا ہے۔ یہاں ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کتاب کی تصنیف اور اس کی اشاعت کے بعد مجلّے کے اجرا اور تقریبِ رونمائی کا کیا مقصد ہے۔ سیدھا سا جواب یہ ہے کہ تہذیبی سانچوں کی بازیافت و روایات کا قیام ہے۔ چند اہلِ ذوق و اہلِ فکر و نظر کا اجتماع اور چند لمحوں کی رفاقت بھی آج کے پُر آشوب دور میں بہت غنیمت ہے۔ اس تقریب کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ ادبی جمود قائم نہ ہونے پائے اور مل بیٹھنے کے مواقع فراہم ہوں۔ اور ویسے بھی اس قسم کی تقاریب ہماری ثقافت کا حصہ ہیں ورنہ اس تقریب پر جو اخراجات آئے ہیں، اس رقم سے مزید ایک کتاب اور چھپ سکتی ہے، لیکن قلمی قدردانی، اعتراف اور اپنی ثقافت و روایت کو زندہ رکھنا اور نئی نسل تک ان امانتوں کو پہنچانا ہمارا ادبی فریضہ ہے اور یہی احساسِ فرض اس کا محرک ہے۔ یہ وقت جہاں اہلِ قلم سے جرأت و صداقت کا مطالبہ کر رہا ہے، وہیں قوم کے باشعور و باحیثیت افراد اور قومی اداروں اور انجمنوں سے بھی کہ حقیقت پسندی اختیار کریں، اپنے فرائض کا احساس کریں۔ نہ جانے کیوں اس کنارے سے اس کنارے تک فکر و دانش کے تمام مراحل، اور ادراک و خرد کے تمام خاکے

عرفان و وجدان واحساس سے عاری ہیں، ذہنوں کا کھوکھلا پن، فکری سطحیت، ذمے داری کا عدم احساس، ہمارا خود اپنی ذات کے حصار میں مقید ہونا، مفاد و انا، حسد و بے جا تنقید اور کسی کے کام کو نہ سراہنا اور توصیف و تعریف کے دو لفظ کے لیے بھی بخل سے کام لینا ہماری عادت بن چکی ہے۔ ہم ایک تاریخ ساز لمحے سے گزر رہے ہیں۔ تاریخ سازی میں جہاں تخلیقی فنکار کا رول ہوتا ہے، وہیں اداروں، انجمنوں اور صاحبِ ثروت حضرات کی بھی ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ اپنے اپنے شعبے اور اپنی اپنی حیثیت میں اہلِ علم واہلِ قلم کی ہمت افزائی کریں، ان کے کرب کو سمجھیں۔ ایک ایسے دور میں جب لکھنے والے کو بے شمار مسائل درپیش ہیں، خود اس کی ذات مفہوم سے محروم ہوتی جارہی ہے اگر ہماری قوم اور ہمارے ادارے مصلحتوں سے قطع نظر کریں، اگر ہماری قوم کے ذی حیثیت افراد اپنی ذمے داریوں کو محسوس کرلیں تو آج ہماری قوم میں لکھنے والوں کا قحط نہ ہو اور نہ معیاری ادب کی تخلیق کی راہ میں کوئی رکاوٹ ہو۔

آج تک ہم اُردو زبان میں اپنے ائمۃ الطاہرین علیہم السلام کی کوئی جامع اور معیاری سوانح حیات منظرِ عام پر نہ لاسکے، واقعۂ کربلا پر کوئی مستند و مکمل کتاب پیش نہ کرسکے، شہدائے کربلا کی زندگی پر کوئی مفصل کتاب نہ لکھ سکے، اہلِ بیت الطاہرین کے فرمودات کو ترتیب نہ دے سکے، کربلا والوں پر کہے گئے مرثیے کو مجتمع نہ کرسکے، جبکہ مرثیہ ہی وہ نقطۂ اتحاد تھا جہاں مسلمانوں کے تمام مکاتبِ فکر کے علاوہ ہندو، سکھ اور عیسائی بھی کربلا والوں کے حضور اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کرنے کو شرف و سعادت سمجھتے تھے اور مجلسِ حسینؑ میں بلا تفریق رنگ و نسل لوگ شرکت کرتے تھے۔

ہم نے مرثیے سے اپنا رشتہ توڑ کر لوگوں سے خود کو دور کرلیا ہے۔ آج پاکستان میں کتنے شاعر ہیں جن کا بین الاقوامی سطح کے مرثیہ گو شعرا میں شمار ہوتا ہو۔ جناب وحید الحسن

ہاشمی جناب پروفیسر سردار نقوی، جناب شاہد نقوی، جناب قیصر بارھوی اور جناب شاداں دہلوی کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر نام سامنے نہیں آتا۔

گزشتہ چند دہائیوں سے ہماری قوم میں ہر شعبے کے افراد ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ دانش وروں میں سید محمد تقی، سید ہاشم رضا، کرنل سید غفار مہدی، پروفیسر کرار حسین، ڈاکٹر سید سبط حسن رضوی، ڈاکٹر سید علی رضا نقوی، پروفیسر حسن عسکری رضوی، جسٹس علی نصرت، آغا مرتضیٰ پویا، ڈاکٹر علی سعید رضا نقوی کا دم غنیمت ہے۔ کراچی سے خیبر تک ہمارے ادیبوں میں کوئی معتبر نام نہیں ملتا۔ اس ضمن میں پروفیسر سردار نقوی، وحید الحسن ہاشمی کا نام لیا جا سکتا ہے۔ افسانوی ادب میں لے دے کر خواجہ احمد عباس و انتظار حسین کا نام پایا جاتا ہے۔ جبکہ ایک وقت وہ تھا کہ برصغیر میں ادب پر ہماری اجارہ داری تھی۔ زیادہ نہیں، گزشتہ نصف صدی سے لے کر ایک، دو تہائی تک ڈاکٹر اعجاز حسین (الٰہ آباد یونیورسٹی)، پروفیسر علی رضا سن (وائس چانسلر، الٰہ آباد یونیورسٹی)، سید مسعود حسین ادیب (پدم شری)، پروفیسر احتشام حسین اور آج بھی ہندوستان میں ڈاکٹر علی جواد زیدی، ڈاکٹر سید عقیل حسین رضوی، علی سردار جعفری، ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر نیر مسعود، ڈاکٹر کاظم علی خاں اور پروفیسر مرزا محمد اشفاق الحق ادب کے مہر درخشاں ہیں۔

پاکستان میں بھی مولانا مرتضیٰ حسین فاضل مرحوم، سید ضیاء الحسن موسوی مرحوم، ڈاکٹر وزیر الحسن عابدی مرحوم، ڈاکٹر مظہر علی خاں مرحوم، ڈاکٹر صفدر حسین مرحوم، پروفیسر سجاد باقر رضوی مرحوم، ڈاکٹر آغا محمد باقر مرحوم، نسیم امروہوی مرحوم، پروفیسر مجتبیٰ حسین مرحوم، ڈاکٹر احسن فاروقی مرحوم، حسن عسکری مرحوم، ڈاکٹر نعیم تقوی مرحوم کے بعد ادب پر ہماری اجارہ داری ختم ہو گئی۔ ان دانش وروں اور ادیبوں نے اپنی سعیِ پیہم اور اپنے تبحرِ علمی سے جو مقام بنایا تھا، وہ وقار ختم ہو چکا ہے اور یہ خانہ بالکل خالی پڑا ہے

اور ہم نے گزشتہ چند دہائیوں سے کوئی بڑا ادیب، کوئی بڑا شاعر، کوئی بڑا دانش ور، کوئی بڑا صحافی، کوئی بڑا افسانہ نگار، کوئی بڑا محقق، کوئی بڑا تنقید نگار، کوئی بڑا مفسر، کوئی بڑا مرثیہ نگار اور کوئی بڑا غزل گو شاعر پیدا نہیں کیا ہے۔

پڑھنے والوں کا میں ذکر کیا کروں اور کیوں کروں جبکہ ہم سب جانتے ہیں کہ ہمارے یہاں مطالعے کا ذوق نہ ہونے کے برابر ہے، جبکہ دنیا میں مطالعے کو بلکہ ادب کو بھی عبادت کا درجہ دیا جاتا ہے۔ دانش ور اور ادیب ہر مذہب قوم کا سرمایہ ہوتے ہیں۔ ان ادبا کی تخلیقات برسوں برسوں کی ریاضت کا نتیجہ ہیں۔ کتنا حوصلہ ہے ان لکھنے والوں کا کہ وہ ایک ایک انکشاف کو، ایک ایک نکتے کو اور ایک ایک حوالے کو برسوں ہی ذہن میں تازہ رکھتے ہیں تب کہیں جا کر ایک مضمون لکھتے ہیں۔ رثائی ادب سے تعلق رکھنے والے ادبا و شعرا بھی بحرِ عشقِ پنجتن میں ڈوب کر خلوصِ دل کا خراج ادا کرتے ہیں۔ ان شعرا اور ادبا نے ادب کی آبرو کی خاطر اور مدحِ اہل بیتؑ میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ بات کہاں سے کہاں نکل آئی ذکر تھا کہ ہم میں لکھنے والوں کا خلا پیدا ہو گیا ہے۔ ناول نگاروں میں قرۃ العین حیدر کا نام جبکہ محققین، تنقید نگاروں، ڈراما اور سفرنامہ لکھنے والوں کا خانہ یکسر خالی ہے۔ غزل کہنے والوں میں جون ایلیا، حسن رضوی اور نقاش کاظمی کے علاوہ کوئی نمایاں نام نظر نہیں آتا۔ صحافت میں بھی سلامت علی، آغا مسعود، یاور عباس، ایس۔ ایم رضوی، رضا علی عابدی، نیر زیدی، فرہاد زیدی، آغا مرتضیٰ پویا اور حسن عسکری کاظمی کے علاوہ کوئی نمایاں نام نہیں ملتا۔ ذرائع ابلاغ میں ٹیلی ویژن کے شعبے میں پاکستان کے تمام سینٹروں میں کوئی نمایاں علمی شخصیت اور قابلِ ذکر نام نہیں ہے۔ ریڈیو پاکستان کی صورت حال بھی اس سے مختلف نہیں ہے۔

ہمارے وہ علما جن کا تعلق قلم قبیلے سے بھی ہو، انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ ان میں

علامہ طالب جوہری، علامہ محمد رضی، علامہ سید رضی جعفر اور مولانا سید ابن حسن رضوی کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر نام نہیں ملتا۔ ان تمام علما نے کوئی بڑا اور مکمل کام نہیں کیا، لیکن جب ہم اپنے گرد کتابوں کے ان انبار کو دیکھتے ہیں جسے گزشتہ صدی میں ہمارے علمائے کرام نے تحریر کیا تو ہمیں عصرِ حاضر کے علما کی تصانیف نہ ہونے کے برابر لگتی ہے۔ جب کوئی سرپھرا کسی ادبی کام کا ڈول ڈالتا ہے تو اسے ماضی کے ادبی کارناموں اور اس کے خالقوں کی طرف دیکھنا پڑتا ہے۔ نہ صرف دیکھنا پڑتا ہے بلکہ انھیں اور ان کے کارناموں کو تولنا بھی پڑتا ہے۔ جب ہم رثائی ادب پر نگاہ ڈالتے ہیں تو آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ اللہ اللہ! کیا کیا علما تھے، کیا کیا ادیب اور کیا کیا شاعر۔ علما ایسے کہ ان کی تحریر کے ہر لفظ کو بوسہ دینے کو دل چاہے۔ ادیب ایسے کہ اگر ان کے کارناموں کو ذہن میں رکھ لیں تو ہر جملے پر مرحبا کہنے کو دل چاہے، شاعر ایسے کہ ان کے ہر شعر پر صلِ علیٰ اور سبحان اللہ کہنے پر مجبور ہوں۔

جہاں تک ہمارے قومی اداروں کا تعلق ہے، ان میں دو تین نام نمایاں نظر آتے ہیں۔ ان میں سرفہرست اسلامک ریسرچ سینٹر کراچی، مصباح القرآن ٹرسٹ، لاہور، دارالثقافتہ الاسلامیہ پاکستان کراچی اور جامعہ تعلیمات اسلامی پاکستان کراچی ہے۔

اسلامک ریسرچ سینٹر، خراسان اسلامک ریسرچ سینٹر کا دوسرا نام ہے۔ جب یہ سینٹر خراسان اسلامک ریسرچ سینٹر کے نام سے کام کرتا تھا۔ جعفری صاحب کے دور میں جو کام ہوا تھا، وہ قدرے غنیمت تھا۔ تاہم اتنی کثیر رقم خرچ کرنے کے بعد اس سینٹر سے کوئی قابلِ ذکر ملکی یا بین الاقوامی معیار کی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی، اور سوائے افراد کے پرورش کرنے کے عامۃ المومنین کے لیے کوئی علمی، فکری، مذہبی اور ادبی کام نہیں ہوا۔ اس سینٹر پر جو لوگ مسلط تھے، وہ صرف اپنی شخصیت و سیاست کی روٹی

کھار ہے تھے۔ اگر اسلامک ریسرچ سینٹر میں ابتدا ہی سے اہل و مناسب و معقول و باصلاحیت و تجربہ کار لوگ ہوتے تو آج اس سینٹر کا یہ انجام نہ ہوتا کہ کوئی اسے امام بارگاہ بنانے پر مصر ہے، کوئی علم لگانے پر، کوئی شادی ہال بنانے پر، کوئی کرائے سینٹر چلانے پر، کوئی نرسری لگانے پر اور کوئی اسے قبرستان میں تبدیل کرنا چاہتا ہے اور کوئی کتابیں لے کر علیحدہ ہو گیا اور اپنے گھر پر ہی سینٹر کا بورڈ لگا کر اسلامک ریسرچ سینٹر حقیقی کا دعوے دار ہے، کوئی اُردو کا قرآن لکھ کر شہرت چاہتا ہے۔

جہاں تک مصباح القرآن ٹرسٹ لاہور کا تعلق ہے، تفسیر نمونہ اس کے نمایاں کاموں میں سے ایک ہے۔ پروفیسر منظور حسین یاد سے بہت سی اُمیدیں وابستہ تھیں، لیکن تفسیر نمونہ کے بعد اس ادارے نے بھی کوئی نمایاں کام انجام نہیں دیا۔ فصل خطاب یا علامہ سید علی نقی نقوی کی کچھ قدیم کتابوں کی از سرِ نو طباعت کوئی کارنامہ نہیں جبکہ اس ادارے کو خاصے ذی حیثیت لوگوں کی سرپرستی اور ایران کے مجتہدین کا تعاون بھی حاصل ہے۔

دار الثقافۃ الاسلامیہ اور جامع تعلیمات اسلامی کی مطبوعات صرف تراجم تک محدود ہیں اور ان کتابوں میں نظریاتی و فکری لٹریچر زیادہ پایا جاتا ہے۔ ان اداروں کا دم غنیمت ہے کہ کسی حد تک کتابوں کی کمی اور ضرورت کو پورا کر رہے ہیں۔ ان میں بہت سی کتابیں قابلِ ذکر ہیں ان کتابوں کی طباعت و کتابت بھی خاصی معیاری ہے، لیکن ان اداروں نے رثائی ادب کی طرف توجہ نہ دی۔ اس کی وجہ ان اداروں کے ارباب حل و عقد کی برصغیر کی ثقافت اور عصری تقاضوں سے عدم واقفیت ہے جبکہ حجۃ الاسلام مولانا یوسف نفسی صاحب نے تو کچھ عرصے لکھنؤ میں بھی تعلیم پائی ہے لیکن کسی تلخ تجربے کی وجہ سے لکھنؤ کے تہذیبی ورثے سے انھیں دلچسپی نہیں ہے۔

رہ گئے چھوٹے پبلشر، احمد بک ڈپو، محفوظ بک ڈپو، خراسان بک ڈپو وغیرہ تو یہ وہی کتابیں چھاپتے ہیں جن سے ان کی اصل رقم سو فیصد منافع کے ساتھ نکل آئے اور چونکہ یہ مارکیٹ کے لوگ ہیں، لہٰذا مارکیٹ کی طلب اور رسد کے درمیان توازن قائم رکھتے ہیں۔ قرآن، تحفۃ العوام، جنتری، دعاؤں کی کتابیں مخزن العملیات اور اسی قسم کی کتابوں پر زور دیتے ہیں۔ اسی طرح پاک محرم ایسوسی ایشن کے عہدے دار بھی مومنین کے چندے کی رقم سے اپنا نام روشن کرتے ہیں، کتابچے شائع کر کے مومنین کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

ان اداروں میں ایک معتبر نام مجلسِ ترقی کا بھی ہے جس نے اپنے محدود وسائل اور کسی بیرونی امداد اور فنس کی رقم کے باوجود چند معیاری کتابیں شائع کی ہیں اور یہ پروفیسر مولانا سید عنایت حسین جلالوی مرحوم، ڈاکٹر سید ندیم الحسن رضوی کے اخلاص و للہیت کا نتیجہ تھا۔ اب یہ ادارہ بھی گوشۂ گم نامی میں جا چکا ہے۔ اس کے ساتھ ہی مکتبۂ زید شہید کی کارکردگی کی تعریف نہ کرنا بھی بے انصافی ہوگی جو علمائے کرام کی سوانح حیات بلا قیمت شائع کر رہا ہے اور کسی ستائش وصلے کے بغیر اپنا کام انجام دے رہا ہے۔ جس طرح صحافت کے میدان میں ہمارے صحافی نہ ہونے کے برابر ہیں، اسی طرح اخبارات بھی نہ ہونے کے برابر ہیں۔ جو چند قومی اخبارات وقتاً فوقتاً شائع ہوتے ہیں، ان میں ہفت روزہ رضا کار اور ہفت روزہ ندائے اسلام کے سوا زیادہ تر اخبار خبرنامے ہوتے ہیں یا باہمی افتراق و انتشار کا مجموعہ جس میں پریشاں فکری و پریشاں نظری کی آبیاری کے علاوہ ایک دوسرے کی ذات پر کیچڑ اچھالنے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ علاوہ ازیں جو قومی جرائد شائع ہوتے ہیں، ان میں پرانے مضامین کی بھرمار ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں گزشتہ کئی سال سے کراچی کی ماتمی انجمنوں نے محرم میں

مجلّے کے اجرا کا جو سلسلہ شروع کیا ہے، وہ اشتہار کے حصول کا ذریعہ، ماتمی انجمنوں کے عہدے داروں کی فوٹو، چند پیغامات اور کچھ نئے اور کچھ پرانے مضامین پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان میں سوائے معین العزا کے مجلّے "پیغام وفا" کے علاوہ کوئی معیاری مجلہ نہیں ہے۔ انجمن معین العزا نے اپنے مجلّے کی شخصیت کے لیے سرکار وفا حضرت ابوالفضل العباس کا انتخاب کیا ہے اور گزشتہ تین سال سے وہ سرکار کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر مضامین شائع کر رہی ہے۔ ماتمی انجمنوں کی تنظیم مرکزی تنظیم عزا کا ترجمان اخبار، تنظیم عزا کی فعالیت بھی صرف ایام عزا تک برقرار رہتی ہے، اور یہ اخبار بھی اشتہار اور قومی خبروں کے مجموعے کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں۔ اس سلسلے میں مرکزی تنظیم عزا کے جنرل سیکریٹری شمس الحسن شمسی صاحب کی انتہائی کوششوں کے باوجود قوم کے عدم تعاون کی وجہ سے اسے نہ معیاری بنایا جاسکا، نہ REGULAR کیا جاسکا۔ قوم کی عدم دلچسپی کے نتیجے میں ۲۶ دسمبر کو تاج العلما مولانا محمد تقی سہارن پوری کے سانحۂ ارتحال کی خبر کسی اخبار میں شائع نہ ہوسکی اور وہ سرمایہ دار جوان کی دعاؤں کے طالب اور ان کے تعویذوں کے حاجت مند رہتے تھے، ان کی طرف سے بھی کوئی اشتہار شائع نہیں ہوا۔ یہ کتنا بڑا المیہ ہے کہ جب بھی ہمارا کوئی ادیب و شاعر مرتا ہے تو ریڈیو اور ٹی۔ وی اس کی کوئی خبر نہیں دیتے جس کی مثال حضرت نجم آفندی کا سانحۂ ارتحال ہے، وہ باوجود انتہائی کوشش کے ریڈیو اور ٹی۔ وی نے ان کے مرنے کی خبر نہیں دی۔

اسی طرح جو ادارے لندن اور امریکا میں ہیں، ان سے علاقائی لوگوں کو تو فائدہ پہنچ سکتا ہے اور وہ انگریزی زبان میں جو لٹریچر شائع کرتے ہیں، اس سے انگریزی زبان جاننے والے تو استفادہ کر سکتے ہیں مگر برِ صغیر کے کروڑوں اُردو زبان بولنے والے شیعوں کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ ایران سے جو کتابیں شائع ہوئی ہیں یا جن

ایرانی علما کی کتابوں کا یہاں ترجمہ ہو رہا ہے، پاکستان کے شیعوں کی ضرورت (REQUIREMENT) نہیں ہے۔ ہمارے خلاف لٹریچر یہاں چھپ رہا ہے۔ اس کی جوابی کارروائی کے لیے جس قسم کی کتابوں کی ضرورت ہے، وہ ایرانی کتابوں سے پوری نہیں ہو سکتی۔ کچھ لوگ ذاتی طور پر قومی ضرورت کے پیشِ نظر گاہ گاہ کتابچے چھاپتے رہتے ہیں جن میں نمایاں نام پروفیسر سید زین العابدین، سید محمد رضا رضوی، سید رشید حیدر رضوی، سید محمود الحسن رضوی وغیرہ ہیں۔ اگر یہ سب حضرات مجتمع ہو کر کوئی مستقل اور بڑا کام کریں تو بہتر ہوگا۔ لٹریچر کے سلسلے میں ہمارے ٹرسٹ کی کارکردگی بھی صفر ہے۔ کراچی کے بڑے بڑے ٹرسٹ مثلاً رضویہ ٹرسٹ، خیر العمل، باب العلم اور دیگر ٹرسٹس صرف وہ کام کرتے ہیں جس سے ٹرسٹ کی آمدنی میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو، لہٰذا اس سلسلے میں روضۂ مبارک کی شبیہ بنانے اور علم نصب کرنے کے سلسلے میں تمام ٹرسٹ خوب سے خوب تر کی جستجو میں رہتے ہیں، لیکن یہ ٹرسٹ کسی قسم کا علمی و ادبی کام انجام نہیں دیتے۔ شہر کراچی کے تمام ٹرسٹس کے اربابِ حل و عقد سے استدعا ہے کہ وہ اس سلسلے میں بھی ہمدردانہ غور فرمائیں۔ اہلِ ثروت حضرات سے گزارش ہے کہ وہ ایسے ادارے قائم کریں جہاں سے مذہبی، دینی اور ادبی کتابیں شائع ہوں جو سستے داموں فروخت کی جائیں اور لکھنے والوں کی ہمت افزائی کی جائے تاکہ قوم میں لکھنے والے پیدا ہو سکیں۔ اس سلسلے میں ائمۃ الطاہرین علیہم السلام کی سوانح حیات، مرثیے اور منقبت کے مجموعے اور دیگر تعلیمی اور مذہبی کتابیں شائع کریں تاکہ عامۃ المومنین میں لکھنے اور پڑھنے کی تشویق پیدا ہو سکے۔ عامۃ المومنین سے گزارش ہے کہ مطالعے کا شوق پیدا کریں اور لکھنے والوں کی ہمت افزائی کے لیے کتابیں ضرور خریدیں بلکہ پڑھیں بھی۔ اہلِ علم و اہلِ قلم سے گزارش ہے کہ آنے والی نسلوں کی تربیت کو اپنا

ایمانی فریضہ سمجھ کر انجام دیں اور اپنے بعد SECONDLINE بنانے کے لیے کوشش کریں۔ ماتمی انجمنوں سے گزارش ہے کہ وہ اس سلسلے میں آگے آئیں اور سال میں اپنے مجلّے کے ساتھ ایک، دو کتابیں بھی شائع کریں، اپنے انجمن کے دفتروں میں دارالمطالعہ قائم کریں اور مذہبی معلومات پر مشتمل معلوماتی مقابلوں کا انعقاد بھی کریں۔ قومی اداروں سے گزارش ہے کہ وہ علمی، ادبی، مذہبی کتب کی مختلف زبانوں میں اشاعت کے لیے کوشش کریں، پاکستان کے مذہبی وسیاسی حالات اور ضروریات کو بھی پیشِ نظر رکھیں اور قوم اور ہمارے مذہب کے خلاف ہونے والے پروپیگنڈے کا بھی جواب دیں اور استدلال وحقائق، افہام وتفہیم کو بھی پیشِ نظر رکھیں۔

اُمید ہے کہ قوم کے اہلِ فکر ونظر، اہلِ ثروت حضرات، ادارے اور انجمنیں میری ان معروضات پر ہمدردانہ غور فرمائیں گے اور انھیں تنقید نہ بھی سمجھا جائے تو تنقید بھی زندگی کی طرح قیمتی ہے اور تنقید سے کنارہ کشی ایک قسم کی خودکشی ہے۔

''شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ'' کے مصنف علامہ سید ضمیر اختر نقوی قابلِ ستائش ہیں۔ ان کی علمی وادبی اور مذہبی خدمات کا اعتراف نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ وہ تنہا ایک ادارے کے برابر کام کر رہے ہیں اور مرکزِ علوم اسلامیہ کے پلیٹ فارم سے لکھنے والوں کو متعارف بھی کرا رہے ہیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی تحریر میں دو چیزیں شدت سے متاثر کرتی ہیں، اولاً روایت سے محبت اور ثانیاً اس روایت کے احترام کو برقرار رکھتے ہوئے صحت مند جدیدیت کی طرف مثبت رغبت۔ اسی طرح ان کی شخصیت میں بھی دو خوبیاں ہیں، دوسروں کو سراہنے کا جذبہ اور کام کی لگن، یہی وجہ ہے کہ ان کے ادبی کارناموں کا اعتراف دنیا کے بڑے بڑے دانش وروں نے کیا ہے اور خود ان کی تخلیق ''اُردو مرثیہ پاکستان میں''

"جوش ملیح آبادی کے مرثیے"، "اُردو غزل اور کربلا"، "شعرائے اُردو اور عشقِ علی"، اور "خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا" موخرالذکر دو کتابیں اس صدی کی آخری دہائی کے دو مستند ادبی صحیفے ہیں۔

وہ ہماری قوم کے خوش قسمت ترین مفکر و دانش ور ہیں جنھیں اپنے فکری خواب کو تعبیر کی حدوں تک پہنچانے کا موقع خود ان کی زندگی میں مل گیا اور دنیا بھر کے اربابِ دانش کو ان کے فکر و فن کے مختلف گوشوں کو نئے زاویوں سے پرکھنے کا موقع ملا۔ ان کے معترفین میں مسز ورنن ہمیز شوئل ورجینیا یونیورسٹی امریکا، حضرت جوش ملیح آبادی، ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری، ڈاکٹر کاظم علی خان (لکھنؤ)، جگن ناتھ آزاد (کشمیر)، ڈاکٹر جمیل جالبی سابق وائس چانسلر (کراچی یونیورسٹی)، علی سردار جعفری (بمبئی)، ڈاکٹر نیر مسعود (لکھنؤ یونیورسٹی)، سلیم احمد، سید ہاشم رضا، پروفیسر کرار حسین، پروفیسر ممتاز حسین، ڈاکٹر محمد علی صدیقی، ڈاکٹر علی جواد زیدی، (صدر اُردو اکیڈمی، اتر پردیش) انور سدید، پروفیسر مرزا علی اظہر برلاس، ڈاکٹر کلبِ صادق (لکھنؤ)، پروفیسر منظر حسین کاظمی، ڈاکٹر سبطِ حسن فاضل زیدی مرحوم، جامی ردولوی (لندن)، مشق خواجہ، ڈاکٹر ہلال نقوی، سید علی مہدی (لندن) پروفیسر محمد رضا کاظمی، پروفیسر سحر انصاری، سید حسین عابدی (لندن)، پروفیسر خواجہ حمید الدین شاہد، ڈاکٹر نعیم نقوی، ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، جمیل احمد رضوی (پنجاب یونیورسٹی)، ڈاکٹر اسد اریب (ملتان)، وحید الحسن ہاشمی (لاہور)، پروفیسر ظہیر نفسی، سید محمود الحسن رضوی، سید ماجد حسین رضوی، شاہد جعفر، حیدر علی اختر، نسیم امروہوی، سید رشید حیدر رضوی، ذوالفقار حیدر نقوی، ماجد رضا عابدی، کمال حیدر رضوی، ناصر مہدی، سجاد شبیر، اقبال کاظمی، نیر اسعدی، محمد علی سید اور دیگر اہلِ فکر و نظر شامل ہیں۔

میں مرکزِ علوم اسلامیہ پاکستان اور انیس اکادمی کے اراکین و عہدے داران کو ہدیۂ تحریک و تہنیت پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے ''شعرائے اُردو اور عشقِ علی'' جیسی معیاری کتاب کی اشاعت کی سعادت حاصل کی۔

علی محمد تقی (کادو پورہ، بارہ مولا کشمیر)

۱۴ اکتوبر ۲۰۰۱ء، (کادو پورہ، بارہ مولا کشمیر)

محترم نقوی صاحب۔ السلام علیکم!

میں نے آج تک آپ کی تین کتابیں پڑھی ہیں ''شعرائے اردو اور عشقِ علی''، خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا'' اور'' مراثی جوش'' کاش ایسا موقع ہاتھ آ جاتا کہ مجھے اُن ہاتھوں کو چومنے کی سعادت نصیب ہوتی جن ہاتھوں سے ''شعرائے اُردو اور عشقِ علی'' لکھی گئی ہے۔

آپ کی تین کتابیں پڑھنے کا بے حد مشتاق ہوں ''اردو غزل اور کربلا''، ''کلیاتِ میر حسن'' اور'' تاریخ مرثیہ نگاری''۔ آپ فی الحال اُردو غزل اور کربلا اور کلیاتِ میر حسن بھیج دیجیے۔ اس بات کی بھی جانکاری دیجیے کہ کیا تاریخ مرثیہ نگاری کی کوئی جلد چھپ گئی ہے؟۔ یہ کتابیں کشمیر میں بالکل نایاب ہیں۔

مجھے امید ہے کہ جناب اولین فرصت میں بھیجنے کی زحمت گوارا کریں گے۔ قیمت و ڈاک خرچ کتنا ہی کیوں نہ ہو پارسل واپس نہیں جائے گا۔ اگر آپ چاہیں گے تو میں رقم پیشگی بھی بھیجوں گا لیکن رقم کی جانکاری آپ کو دینی ہوگی۔

والسلام: علی محمد تقی

علامہ ذوالفقار حیدر نقوی

عشقِ علیؑ پہ یہ کتاب
اُردو ادب کا ہے گلاب

علامہ سید ضمیر اختر نقوی کا نام ملک اور بیرونِ ملک خطابت، ادب، تحقیق، تفسیرِ قرآن، تصنیف، تالیف اور تنقید کے حوالے سے جانا اور پہچانا جاتا ہے۔ ان کی تقریر اور تحریر کا موضوع صرف اہل بیتِ رسولؐ ہیں۔ مجموعی طور پر ان کا WORK دیکھ کر لگتا ہے کہ یقیناً انھیں اللہ کی تائید حاصل ہے، ورنہ اس دور میں اتنا بڑا کام انسان کے بس میں کہاں!

انھوں نے بہت لکھا ہے اور جو بھی لکھا ہے، خوب لکھا ہے۔ یوں تو لکھنے والے بہت سے ہیں مگر علامہ ضمیر اختر نقوی کو ایک خاص انفرادیت حاصل ہے اور وہ انفرادیت معرفت اہل بیت رسولؐ ہے جو قدرت نے بطور خاص انھیں عطا کی ہے۔ وہ تاریخ کے بحرِ بے کراں کے مشاق غواص ہیں، اور اس غواصی کا مقصد فضیلت اہلِ بیتؑ کے موتیوں کی تلاش ہے جو ایسا پاکیزہ کام ہے کہ اس کے عامل کی انفرادیت و فضیلت کو مان لینا ہی علامت ایمان ہے۔

حضرت علیؑ کی شان میں جو آیات و احادیث آئی ہیں، لگتا ہے کہ ان آیات

واحادیث نے ضمیر اختر نقوی کے دل میں گھر کر لیا ہے۔ ان کے دماغ میں علیؑ کے سوا کوئی سودا سماتا ہی نہیں ہے۔ جو طاقت زبان اور قوت قلم ان کے پاس ہے، اگر اسے دنیا کے لیے ذرا سا بھی استعمال کرتے تو دنیا کے ہر آسائش زیر قدم ہوتی، مگر انھوں نے دنیا سے رخ پھیر لیا ہے۔ ان کے پیش نظر مولاؑ کا یہ قول رہتا ہے: "دنیا سراب ہے۔ جو اس کے پیچھے بھاگا، تباہ ہو گیا اور جو دنیا سے منھ موڑے، دنیا اس کے پیچھے ہو لیتی ہے"۔ دنیا اور مراعات دنیا سے انھیں کوئی غرض نہیں۔ کوٹھی، بنگلے گاڑیاں، امرا و وزرا سے تعلقات، یہ سب ان کی نظر میں ہیچ ہیں۔ وہ بوریا نشیں، درویش منش سید ہر وقت اپنے مولاؑ کے لیے کام کر رہا ہے۔ متقی کے ایک معنی یہ بھی ہیں کہ تجھ سے تیرا مولاؑ راضی ہو جائے اور وہ ہر وقت اس جستجو میں رہے کہ کسی طرح میرے مولاؑ کے فضائل کائنات کے گوشے گوشے تک پہنچ جائیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی کل کائنات ان کا عظیم الشان کتب خانہ ہے جس سے وہ بچوں کی طرح پیار اور بڑوں کی طرح احترام کرتے ہیں۔ یہیں بیٹھ کر کبھی کسی نوجوان کو ایم۔اے کروا رہے ہیں تو کسی ملک کے رہنے والے کو پی ایچ۔ڈی کا مقالہ تیار کروا رہے ہیں غرض ان کی ذات سے تقریباً پوری دنیا میں وقتاً فوقتاً علم کے چراغ روشن ہوتے رہتے ہیں۔ نہ تو ان کے سونے کا کوئی وقت مقرر ہے، نہ کھانے پینے کا۔ ہر وقت ان کا دروازہ کھلا رہتا ہے چاہے دن ہو یا آدھی رات، لوگ جمع رہتے ہیں اور علمی مسائل پر بحث جاری رہتی ہے۔ اگر وہ دن کے مسلسل جاگنے کے بعد سو رہے ہوں اور کوئی انھیں گہری نیند سے اٹھا دے اور کوئی علمی مسئلہ پوچھ لے تو اٹھنے کے بعد وہ آنے والے سے بے زاری کا اظہار نہیں کرتے بلکہ ان کی آنکھوں میں تشکر کے جذبات ہوتے ہیں۔ گویا مسئلہ پوچھنے کے لیے اٹھا دینے والے کے احسان مند ہو رہے ہیں۔

ان کا حلقۂ احباب اتنا نکھرا ہوا ہے کہ شاید ہی اس دور میں کسی کو نصیب ہو۔ وہ دوست ہیں، وہ بھائی ہیں، وہ بیٹے ہیں، وہ ماموں ہیں اور وہ چچا ہیں، مگر یہ سب حیثیتیں ثانوی ہیں۔ ان کی پہلی حیثیت صرف وکیلِ آلِ محمدؐ کی ہے۔ ملتے ہیں، بات کرتے ہیں مگر ان کا قلم رکنے نہیں پاتا۔ کیسے ہی حالات ہوں، مگر قرطاس پر ان کے قلم کا سفر جاری رہتا ہے۔ علامہ سید ضمیر اختر نقوی کے علاوہ میری نظر سے کوئی شخصیت ایسی نہیں گزری جس کے لیئے کہا جائے کہ علم ہی اوڑھنا ہے، علم ہی بچھونا۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کے عظیم الشان تحقیقی کام نے جہاں ایک طرف ان کے ملک اور بیرونِ ملک لاتعداد مخلص دوست پیدا کیے ہیں تو دوسری طرف ان کے حاسدوں نے بھی جنم لیا ہے۔ اور قرآن گواہ ہے کہ حاسدوں کا پیدا ہو جانا ہی کسی شخصیت کی عظمت کی دلیل ہوتا ہے، مگر انھیں اس بات کی قطعی پروا نہیں ہے کہ کون ان کے کام سے خوش ہو رہا ہے، کون جل رہا ہے۔ انھیں تو صرف قوم کو شعور دینا ہے، معرفتِ علیؑ کا شعور۔ اس کے علاوہ کسی بات کو وہ قابلِ اعتنا نہیں سمجھتے۔ لگتا ہے کہ خدا نے ان کا دل خون سے نہیں، محبتِ علیؑ سے بنایا ہے۔ مرثیے میں ان کو خاص شغف ہے۔ اس میں بھی ان کی نفسیات کو دخل ہے۔ چونکہ مرثیہ سرتاپا اہلِ بیتؑ سے متعلق ہوتا ہے اس لیئے ان کے لیئے دلچسپی کا باعث ہے اور وہ مراثی جو اہلِ بیتؑ سے ہٹ کر ہیں ان کی نظر میں قابلِ اعتنا نہیں۔ غرض نہ ان کا تعلق کسی مذہبی گروہ سے ہے، نہ سیاسی پارٹی سے، نہ سیاست سے کوئی غرض، نہ سیاست دانوں سے، نہ وزیروں سے ملنے کی آرزو، نہ مشیروں سے، نہ امام بارگاہوں کے ٹرسٹی حضرات کی خوشامد، نہ دولت مندوں کی، نہ انھیں اپنے آرام کا خیال، نہ روٹی کی فکر، نہ کوٹھیوں کی آرزو، نہ جائیداد کے حصول کی تمنا، نہ در پہ دربان، نہ موت کا خوف۔ انھیں تو جنون ہے............ "عشقِ علیؑ کا

جنون"...... اور یہی جنون انسان کو ولایت عطا کرتا ہے اور اسی جنون سے قطب، ابدال، قلندر" بنتے ہیں۔

"شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" علامہ ضمیر اختر نقوی کی نئی تصنیف ہے۔ لفظ عشق کو علیؑ کے ساتھ دیکھ کر لگتا ہے لفظ عشق کے برسوں سے پریشان موتی کو اس کے صحیح مقام پر جڑ دیا گیا ہے۔ عرصے سے دنیا "عشق" کے معنی و مفاہیم سمجھنے سے قاصر تھی۔ آج اس لفظ کو علیؑ کے ساتھ دیکھیے تو لگتا ہے کہ لفظ عشق نے علیؑ کے ساتھ آتے ہی اپنے اندر پنہاں معنی و مفاہیم کو ظاہر کرنا شروع کر دیا ہے۔ واقعی یہ لفظ حضرت علیؑ کے لیے ہی تخلیق ہوا ہے اور ان کے نام کے ساتھ ہی جچتا ہے۔

تنقید نگاروں نے ادب کے ہر گوشے پر کام کیا ہے اور بہت سی کتابیں لکھی گئیں اور ہر کتاب کسی نہ کسی طور پر اپنے اندر افادیت لیے ہوئے ہوتی ہے، مگر پورے وثوق سے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ آج تک "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" جیسی کوئی کتاب نہیں لکھی گئی۔ اس کتاب کی سیکڑوں خصوصیات ہیں جو اسے ادب پر لکھی جانے والی کتابوں سے ممتاز کرتی ہیں۔ مثلاً آج تک کسی تنقید نگار نے شعرا کے مذہب پر بحث نہیں کی، حالانکہ شعر کو سمجھنے اور اس کے تمام معنی و مفاہیم پا لینے کے لیے شاعر کو سمجھنا ضروری ہوتا ہے، شاعر کی نفسیات کیا ہے۔ یہاں تک بحث ہوتی ہے۔ نفسیات جاننے کے لیے شاعر کا تخلص دیکھا جائے تخلص سے شاعر کی نفسیات پتہ چلتی ہے۔ مثلاً تخلص اگر "جوش" ہے تو معلوم ہوگا کہ شاعر کے اندر ولولہ ہے کہ کوئی دنیا دریافت کر لینے کی جستجو ہے، اس کے سینے میں کوئی انقلاب پوشیدہ ہے۔ اگر تخلص "عدم" ہے تو معلوم ہوگا کہ شاعر دنیا سے بے زار ہے وغیرہ وغیرہ۔ غرض جب یہ اصول طے ہے کہ شعر کی بلاغت کو سمجھنے اور معنی مفاہیم کو پا لینے کے لیے شاعر کا مطالعہ انتہائی باریک بینی سے کیا

جائے گا تو پھر شاعر کے مذہب پر بحث کیوں نہ ہو؟ تاکہ یہ پتہ چلے کہ کس عقیدے کا تھا، وہ کون لوگ تھے جن سے متاثر تھا، کسی مذہب پر تھا یا لا مذہب تھا تو اس کے محرکات کیا تھے اور اگر کسی مذہب پر تھا تو وہ کون سا مذہب تھا، کن شخصیتوں کی تعظیم کرتا تھا، کن کو اچھا اور کن کو برا جانتا تھا۔ ...... مگر آج تک ادب کا یہ اہم گوشہ تشنۂ تحریر رہا۔

کسی تنقید نگار نے شعرا کے مذہب پر کیوں نہیں لکھا؟ اس کے دو ہی سبب ہو سکتے ہیں یا تو ان تنقید نگاروں نے عمداً ایسا نہیں کیا یا ان کو مذہبی معلومات سے بالکل ناواقفیت تھی، حالانکہ اس سے پہلے بہت سی کتابیں لکھی گئی ہیں اور ان پر پی ایچ۔ ڈی بھی ہوا ہے۔ مثلاً اُردو شاعری پر وہابی تحریک کے اثرات، اُردو شاعری پر سکھوں کے اثرات، اُردو شاعری پر ہندوؤں کے اثرات، اُردو شاعری پر مغلوں کے اثرات، اُردو شاعری پر محدث دہلوی کے خاندان کے اثرات، مگر آج تک اُردو شاعری پر شیعوں کے اثرات یا اُردو شاعری پر اہلِ بیتؑ کے اثرات نہ لکھی گئی، حالانکہ یہ کتاب دیکھنے کے بعد یہ بات اچھی طرح سمجھی جا سکتی ہے کہ اُردو شاعری اگر کسی سے متاثر ہے تو وہ صرف اہلِ بیتؑ رسولؐ ہیں، اور کیوں نہ ہو اہلِ بیتؑ اور عشقِ علیؑ نے اُردو شاعری کو ایسی دل کشی عطا کی ہے جو دنیا کی کسی زبان کے ادب میں نظر نہیں آتی۔ یہ علامہ ضمیر اختر نقوی کا اعجازِ قلم ہے کہ وہ ایک بات ثابت کر رہے ہوتے ہیں تو دس باتیں خود بخود ثابت ہوتی چلی جاتی ہیں۔ وہ کوئی اصول طے نہیں کرتے بلکہ کسی بات پر بحث کے دائرے کو اتنا مضبوط کر دیتے ہیں کہ اصول خود بخود طے ہوتے چلے جاتے ہیں جیسا کہ ابھی ہم نے طے کیا تھا کہ اُردو ادب میں جو نکھار ہے، وہ عشقِ علیؑ کے سبب ہے۔ اب آپ عشقِ علیؑ میں کہے گئے اشعار اور دنیائے ادب پر راج کرنے والے ایک سو چھپن شعرا کو ادب سے علیحدہ کر کے دیکھیے تو اُردو ادب ایک ویران کھنڈر کے سوا کچھ نہ رہے گا۔ یہ

بات یقیناً حیرت زدہ کر دیتی ہے کہ لوگ اس دنیا میں آتے ہیں، چلے جاتے ہیں، بڑے بڑے امرا اور بادشاہوں کے نام مٹ گئے، مگر ادب کے حوالے سے غالبؔ، میرؔ، واجد علی شاہ اخترؔ کا نام باوجود ہزار مخالفتوں کے مٹ نہ سکا اور ان کی شہرت روز بروز بڑھتی ہی چلی گئی۔ احادیث سے یہ بات ثابت ہے کہ وہ شخص دنیا میں نام چھوڑ جائے گا جو اہلِ بیتِ رسولؐ کے لیے کوئی خدمت انجام دے۔ اس اصول کو سامنے رکھیے تو معلوم ہوگا کہ اس کتاب کے ذریعے علامہ ضمیر اختر نقوی نے دنیائے اُردو پر حکمرانی کرنے والے عظیم شعرا کی نام وری کا راز دریافت کرلیا ہے۔

اس کتاب میں دو سو چورانوے شعرا کے کلام کو شامل کیا گیا ہے۔ صرف اُردو کے ایک سو پینسٹھ شعرا کے تقریباً پانچ ہزار سات سو تیس اشعار سے بحث کی گئی ہے۔ عربی اور فارسی کے قصائد اس کے علاوہ ہیں۔ کتاب میں اُردو شعرا کے علاوہ سات عربی زبان کے، دس فارسی کے شاعر جن کا تعلق ایران، ترکی اور افغانستان سے ہے، سات اولیائے کرام اور پانچ بادشاہوں یا دربار کے اعلیٰ عہدے دار شعرا کے کلام پر انتہائی منطقی بحث کی گئی ہے۔ محققِ اعظم ضمیر اختر صاحب نے اس کتاب میں جن شعرا کے کلام کو شامل کیا ہے، ان میں اکثر غیر شیعہ خاندانوں کے تھے مگر بعد میں شیعہ ہوئے۔ یہی وہ لمحہ ہے جہاں وہ اپنے قاری کے لیے ایک لطیف فکر فراہم کرتے ہیں اور ایک ٹھوس دلیل قائم کرتے ہیں کہ دنیائے علم و ادب میں وہی باقی رہا جو یا تو شیعہ ہو یا شیعہ ہو جائے۔ ان دو باتوں کے سوا تیسری بات کہی ہی نہیں جا سکتی۔ اسے اتفاق کہیے، واقعہ یا منشائے ایزدی۔

آل عبقات صدر المحققین حضرت علامہ سید ناصر الملت اعلیٰ اللہ مقامہٗ کا قصیدہ جو ایک ادب پارہ ہے، تشریح و ترجمہ کی آب و تاب کے ساتھ کتاب میں شامل ہے۔ دیگر

عربی، فارسی، اُردو اور اولیائے کرام کے کلام، اس پر منطقی بحث، ان کے مذہبی عقائد، حضرت علی علیہ السّلام سے ان کا قلبی لگاؤ، ان کی سوانح حیات، نشست و برخاست، ان کے خلوت وجلوت کے حالات، ان کے شہروں کی جغرافیائی معلومات غرض لگتا ہے علامہ ضمیر اختر نقوی نے کتاب تصنیف نہیں کی بلکہ ایک شاہکار تخلیق کر دیا ہے۔ اُردو کے تقریباً پانچ ہزار سات سو تیں اشعار اس کتاب کی زینت ہیں، گویا یہ کتاب ہر طرح کے علمی جواہر سے آراستہ ہے۔ ایک طرف تو شعرا کے حالات، تاریخ ولادت وفات تحقیق کے ساتھ درج ہے جس سبب سے اہم ورشعرا کی تاریخ کہنا بے جا نہ ہوگا تو دوسری طرف کتاب کا مواد ہر طرح کی ادبی تشنگی کو دور کرتا ہے، اس لیے کتاب کو ادبی انسائیکلوپیڈیا بھی کہا جا سکتا ہے۔ کتاب نہیں بلکہ بغض علی کے پھیلتے ہوئے اندھیرے کو دور کرنے کے لیے علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب نے ایک شمع روشن کی ہے۔ ادب پر اب تک لکھی جانے والی کتب میں اس کتاب کو وہی حیثیت حاصل ہے جو تمام پھولوں میں گلاب کو ہوتی ہے۔

نو سو بارہ صفحات پر مشتمل اس کتاب کی جلد سرخ رنگ کی ہے۔ یہ رنگ، ہیبت، جلالت، قدر و عزت، جاہ و جلال، حسن و جمال، طاقت، غلبہ، مقناطیسیت، برتری کے خواص رکھتا ہے۔ سرخ رنگ اگر بہت زیادہ سرخ ہو جائے تو سیاہ نظر آتا ہے جو سادات کے عمامے، قرآن کے حروف، حجر اسود اور کعبے کے غلاف کا رنگ ہے۔ سرخ رنگ کسی کو بھی اپنی جانب متوجہ کرنے کی پوری صلاحیت رکھتا ہے۔ یہ رنگ انسانی چہرے پر زندگی، خوش حالی اور روحانیت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ اللہ نے امام حسین کے لیے بچپن میں اسی رنگ کا لباس جنت سے حضرت جبرئیل کے ذریعے بھجوایا تھا، اور پھر کربلا کے میدان میں علی کے لال نے اپنے پاکیزہ خون سے اسلام کے زرد پڑتے چہرے کو

قیامت تک کے لیے سرخ رو کر دیا۔

کتاب پر سنہرے حروف سے "علیؑ" لکھا ہے۔ یقیناً انسانیت کے اس عظیم محسن کا نام ہے ہی اس قابل کہ اسے جب لکھا جائے، سنہرے حروف سے ہی لکھا جائے۔ اور علیؑ کے نام کے نیچے "ضمیر اختر" لکھا ہوا ہے۔ آپ روحانی نگاہ سے دیکھیے تو یہ منظر نظر آئے گا جیسے ایک غلام اپنے آقا کے قدموں پر سر رکھے ہوئے ہے اور یہ التجا کر رہا ہے کہ میرے آقا! مال و دولت نہیں چاہتا، بس چاہتا ہوں کہ تیری معرفت کے صحیفے کی آیات میرے قلب پر نازل ہوتی رہیں۔ میرے آقا! مجھے اپنے رنگ میں رنگ دے۔ اور آقا نے خوش ہو کر اپنے غلام کے وجود کو اپنے نور سے منور کر دیا ہو۔ امیر خسرو نے کہا تھا "موہے اپنے ہی رنگ میں رنگ دیو ری" تب ہی تو "ضمیر اختر" کا نام بھی سنہرے حروف سے لکھا ہوا ہے۔ یہ سنہرا روپ "ضمیر اختر" کو ان کے مولاؑ نے عطا کیا ہے۔ ہاں! میرا عقیدہ ہے کہ ایسا ہی ہے۔ خود علامہ ضمیر اختر نے اپنے نوحے کے مصرع میں دعا بھی کی تھی:

تاریخ ادب میں میرا پرچم ہو سنہرا

ان کی دعا مستجاب ہوئی، ان کا پرچم سنہرا ہوا اور اس کی تاب ناکی دور دور تک پھیل گئی۔ مولائے کائنات فرماتے ہیں، "جس نے ہمارے دفاع میں ایک لفظ بھی لکھا، ہم اس کے سر پر سنہرا تاج سجائیں گے"۔ یہ روحانی باتیں ہیں، جنت و کوثر کی طرح نظر نہیں آتیں۔ دنیا پرست نگاہوں کو ان انعامات کا ادراک کہاں! اگر عارفانہ نظر رکھنے والے ان بخششوں کو بہت قریب سے دیکھ لیتے ہیں۔ سبحان اللہ! سنہرا تاج وہ بھی تاج دار حل اتیٰ کے ہاتھوں سے۔ زہے قسمت! زہے نصیب!

لال رنگ کی جلد پر سنہرے حروف سے "علیؑ" لکھا دیکھیے تو لگتا ہے کہ علامہ ضمیر اختر نقوی

نے اپنے خونِ جگر کے قرطاس پر فکر کے سونے سے عشقِ علیؑ لکھ دیا ہے۔ یہ کتاب آپ کی نشست گاہوں اور کتب خانوں کو زینت بخشے گی اور اپنے پڑھنے والوں کی روح کو بالیدگی اور شخصیت کو نکھار عطا کرے گی۔ صاحبِ لوح و قلم سے دعا ہے کہ استاذی المحترم محققِ اعظم سید ضمیر اختر نقوی کو زندہ رکھے اور ان کا سیپ قلم فضائلِ اہلِ بیتؑ کے موتی اگلتا رہے۔

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

علامہ ضمیر اختر نقوی مد ظلہ العالی شیعہ قوم میں ایک LEGEND کی حیثیت رکھتے ہیں۔ سرکار علامہ کو خطابت کا TREND SETTER کہا جاتا ہے۔ علامہ صاحب نے پاکستان سے ہندوستان اور برطانیہ و امریکہ تک خطابت کے وہ نئے موضوعات متعارف کروائے ہیں اور اُن پر گفتگو کی ہے جن کے بارے میں ایک عام خطیب بولنا تو در کنار سوچ بھی نہیں سکتا۔ ذوالجناح، ذوالفقار، خاک، پانی، رنگ، (طبعیات کی روشنی میں) مشک، ماں، ممتا، نیزہ، تیر، اور ان جیسے لاتعداد موضوعات ہیں جن پر علامہ صاحب کی ایک نہیں کئی کئی تقاریر موجود ہیں۔ میں خود باقاعدگی سے علامہ صاحب کو عرصہ ۱۵ برس سے سن رہا ہوں میں حلفیہ کہہ رہا ہوں کہ میں نے ان پندرہ برسوں میں علامہ صاحب کی ہزاروں مجلسیں سنی ہیں لیکن کوئی تقریر کسی کا REPEATATION نہیں ہے یہ براہِ راست عطائے سیدہؑ ہے اور علامہ صاحب کو شاہزادیِ کونینؑ سلام اللہ علیہا سے ایک خاص ربط و انس ہے یا یوں کہیے کہ نام شہزادی فاطمہ زہرا سلام اللہ علیہا علامہ صاحب کا حرزِ جاں، وردِ نفس اور حصارِ فن ہے

سیّد ماجد حسین رضوی

شعرائے اُردو کا وقار اور فضل وکمال

تعمیل حکم کے لیے دھڑکتے دل اور کانپتے ہاتھوں سے قلم اٹھا تو لیا لیکن ایسے نادر روزگار دستاویز، صحیفۂ علم وادب اور گراں بہا تالیف وتصنیف پر ایک جاہل کیا لکھ سکے گا یا کہہ سکے گا۔ دل کی دھڑکن اور ہاتھوں کا رعشہ گواہ ہے کہ ایک جاہل کیونکر کہنے کی جرأت کرسکتا ہے۔ ایسی باعظمت شخصیت جن کی تحقیق وتدقیق، تحریر وتقریر سے پاک و ہند کی سرزمین پر اہلِ بصیرت جو عصبیت سے پاک ہیں، وہ موصوف کی کدوکاوش، جستجو اور علمی وادبی خدمات کے معترف ہیں، ہاں! البتہ تکرار میں افادیت ہے (یہ جملہ علامہ رشید ترابی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہٗ کا ہے)۔ آج سے چودہ، پندرہ سال قبل جناب ضیاء الحسن موسوی صاحب قبلہ اعلیٰ اللہ مقامہٗ جو علم وادب کی دنیا میں محتاجِ تعارف نہیں، مرحوم کی صحافت نگاری بھی عروج پر تھی۔ علمائے ایران وعراق، مرحوم کے قدرداں تھے، علم وتحقیق سے اچھی طرح واقف تھے۔ نجف کے مدارس کے لیے سلیبس کو ترتیب دینے کے لیے موسوی صاحب سے مشورہ کیا جاتا تھا۔ یہ منزلت کو سمجھنے کے لیے کافی ہے۔ جناب موسوی صاحب اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی نگاہ سے جناب ضمیر اختر صاحب قبلہ کو دیکھیے۔ ضمیر اختر صاحب قبلہ کی علمی صلاحیت ذہانت اور زورِ قلم کا اندازہ لگاتے ہوئے ایک بہت بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ "ضمیر اختر سلمہٗ قوم کا سرمایہ ہیں، ان کی قدر کیجئے اور ان کی حفاظت کیجئے۔" یہ تھی موسوی صاحب قبلہ

کی جوہر شناسی۔ میں موصوف صاحب قبلہ کے اس قول کو اکثر دہرایا کرتا ہوں۔ ضمیر اختر صاحب قبلہ کی علمی کاوشیں، بلند پایہ تصانیف اور جد وجہد پر قوم کا ردعمل پوشیدہ نہیں۔ قوم "قدر اور حفاظت" سے بے نیاز و بے اعتنا ہے، گلہ شکوہ کس کا کیا جائے؟ خدائے سخن میر انیس کو کہنا پڑا:۔

عالم ہے مکدر، کوئی دل صاف نہیں ہے
اس عہد میں سب کچھ ہے پر انصاف نہیں ہے

انسان اور شخصیت کی تعمیر میں خاندان، ماحول اور روایات کا بھی دخل ہے۔ موصوف نے لکھنؤ کی سرزمین پر بڑے بڑے علما، خطبا اور ذاکرین کی تقاریر سنی ہیں، ان کے انداز اور رکھ رکھاؤ کو قریب سے دیکھا ہے، اسی تہذیب و تمدن میں زندگی کے ابتدائی دور گزارے ہیں، مشاہدے اور تجربے حاصل کیے ہیں، پھر اللہ نے ذہنی تخلیقی قوتیں عطا کی ہیں۔ آپ کی قابلیت، صحیح رائے اور عزم مستحکم سے علم وادب کی دنیا واقف ہے۔ بڑے بڑے دانش ورو، ادیبوں اور نقادوں سے خراج تحسین وصول کر چکے ہیں۔ "شعرائے اردو اور عشق علی" مستقبل قریب میں شہرۂ آفاق تصنیف وتالیف ہوگی۔ اس کی ایک ایک سطر جاذب دل ونگاہ ہے۔ مجھ جیسے جاہل کی نگاہ سے ایسی تخلیق کاری نہیں گزری۔ شعرا اور ان کے متعلق مستند تاریخ، ماحول اور ثقافت کا نقش قابل صد تحسین ہے۔ معرکتہ الآرا قصیدے اور منقبتیں شکوہ لفظی اور بلند خیالی کے ساتھ جلوہ گر ہیں۔ شعرائے عرب وعجم کے کلام نے ایک سنہرے باب کا اضافہ کردیا ہے، ساتھ ہی کتاب کے سرورق پر شعرائے عرب وعجم کا ذکر نہ کر کے شعرائے اردو کی منزلت، وقار اور فضل وکمال کو برقرار رکھنے کی حسین کوشش کی گئی ہے۔ اس ذہانت، جودت طبع اور دور اندیشی کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ صاحبان شعروادب اس

نکتے سے ضرور محظوظ ہوں گے۔

میرا خیال ہے کہ جہاں ہر محبِ اہلِ بیتؑ کے گھر میں کلام پاک ترجمہ مولانا حافظ فرمان علی صاحب اعلی اللہ مقامہٗ اور خدائے سخن میر انیس کے مرثیے کی ایک جلد ہوتی ہے، وہاں "شعرائے اردو اور عشق علیؑ" کی ایک جلد ہونی چاہیے۔ آخر میں یہ عرض کرتا چلوں کہ میری تحریر غیر مربوط ہے، بیان کج مج ہے، وجہ رعبِ شخصیت ہے۔

☆☆☆

ڈاکٹر عباس رضا نیر (لکھنؤ یونیورسٹی)

۸ محرم ۱۴۲۸ھ / ۲۰۰۷ء

گرامی قدر علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب

آداب!

کیسے یقین کروں کہ میں کراچی میں ہوں۔ ابھی تک آپ سے ملاقات نہیں ہوئی اس وقت آپ تشریف لا رہے ہیں۔ لیکن مجھے محفل خراسان پہنچنا ہے۔ کل پھر حسینی سفارت خانہ حسینی میں آپ خطاب کر رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں ایک کپ چائے آپ کے ساتھ پینے کا شرف حاصل ہو جائے۔

آپ سے ملاقات کرنے کے لیے بے قرار ہوں۔ میری نئی کتاب "ادبی میزان" آپ کی خدمت میں حاضر ہے۔ مولا کرے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں۔ میٹرو چینل پر آپ اور حیدر نواب جعفری کے خصوصی حوالے سے میں نے کچھ باتیں کی تھیں آپ کو اطلاع ہوئی ہوگی...... عباس رضا نیر

ساحر لکھنوی

شان دار کام کی داد دی ہی نہیں جا سکتی

مولائے کائنات، روحِ حیات، حلّالِ مشکلات، معین الانبیاء، سلطان الاوصیاء، افتخارِ خلیل، استادِ جبرئیل، ممدوحِ ملائک، مخدومِ خلائق، مظہر العجائب، چراغِ حرم، صاحبِ تبلیغ و قلم، فخرِ عالم و آدم، اشجعِ عالم، شاہِ مرداں، شیرِ یزداں، فاتحِ خیبر، خواجۂ قنبر، ساقیِ کوثر، بت شکن، اژدر فگن، گردوں رکاب، ابوتراب، کُلِ ایمان، شاہِ انس و جاں، مولودِ کعبہ، صاحبِ نہج البلاغہ، خطیبِ منبرِ سلونی قبل ان تفقدونی، طرۂ تاجِ شرف، شاہِ نجف، قوتِ پروردگار، ضیغمِ کردگار، صاحبِ ذوالفقار، یعسوب الدین، امیر المومنین، قسیمِ نار و جنت، صاحبِ تاجِ ولایت، صدر نشینِ بزمِ غدیر، جنابِ امیر، جانشینِ رسولؐ، روحِ بتولؑ، وصیِ احمدِ مختار، حیدرِ کرار، لافتیٰ، مشکل کشا، غالبِ کل غالب، علی ابن ابی طالبؑ وہ ذاتِ اقدس و اعلیٰ جو سرورِ کائنات، فخرِ موجودات، پیغمبرِ خاتم، رسولِ اکرم حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد کائناتِ آدم و عالم کی عظیم ترین ہستی، تخلیق کا شاہکار اور انسانیت کا افتخار ہے جس کے لیے "بعد از نبی بزرگ توئی قصہ مختصر" کہہ کر اس کی مدح میں عجز و عاجزی کے اظہار کے سوا انسانی امکانات میں کچھ بھی نہیں، اور یہ کہنا کوئی شاعرانہ مبالغہ نہیں کہ:۔

کتابِ فضلِ علی را کم است آبِ بحار
کہ تر کنم سرِ انگشت و صفحہ بشمارم

ایسی عظیم ہستی کی مدح میں دنیا بھر کی مختلف زبانوں میں کیا کچھ کہا گیا ہے اور نظم و نثر کا کیسا عظیم الشان ذخیرہ جمع ہوا ہے، اس کا اندازہ کرنا بھی ممکن نہیں۔ اگر صرف اُردو ہی میں مدح و منقبت کے سارے جواہر پارے اکٹھے کیے جائیں تو فکر و فن اور مودت و عقیدت کا ایسا خزانہ جمع ہو جائے گا جس کے مقابل کسی ایک موضوع پر دنیا بھر کے شعر و ادب کو جمع کر لیا جائے تو بھی اس کے برابر نہیں ہو سکتا۔

مدح علیؑ کے لیے اُردو کی ہر صنفِ سخن نے اپنی آغوش ہمیشہ کشادہ رکھی، خواہ وہ قصیدہ ہو یا ابیات، مثنوی ہو یا مرثیہ، قطعات و رباعیات ہوں یا نظم و غزل۔ قصیدہ تو ہوتا ہی ہے مدح سرائی کے لیے۔ جن صاحبانِ ایمان اور اہلِ ولا شعرا نے قصیدے میں شاہانِ دنیا کے جاہ و جلال، شان و شکوہ اور طمطراق سے صرفِ نظر کر کے اپنی فکر کا رُخ مولائے کائنات کی مدح و ثنا کی طرف موڑ دیا، ان کی اپنی جلالتِ شعری کے آگے تمکنتِ شاہی ماند پڑ گئی۔ اور منقبت، اس کی تو اصل ہی مدحِ علیؑ و آلِ نبیؐ ہے۔ مثنوی ہو تو اس کا آغاز بھی اکثر حمد و نعت و منقبت ہی سے ہوتا ہے۔ قطعات مدحِ علیؑ ہی سے خوش قطع ہوتے ہیں اور رباعی کے چار مصرعوں کو اسی مدح سے چار چاند لگ جاتے ہیں۔ غزل کو دیکھیے تو وہ اپنے محبوبانہ بناؤ سنگار اور حسن و جمال کے نکھار کے ساتھ عشوہ طرازیاں کرتی نظر آتی ہے۔ اس کا کام ہی محبوب سے باتیں کرنا ہے۔ مگر اس کا دل بھی عشقِ علیؑ سے سرشار ہے۔ بہت سے مداحوں نے غزل میں بھی محض تلمیحاً ہی نہیں، صراحتاً بھی مدحِ علیؑ کے اشعار شامل کیے ہیں۔ مثلاً میرے جدِ امجد استاد الاساتذہ حضرت فاخر لکھنوی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی بیشتر غزلوں کے مقطعوں میں مدح و منقبت کے مضامین ملتے ہیں۔ یہ انھیں پر موقوف نہیں، ان کے علاوہ بھی شعرائے متقدمین و متاخرین اسی طریق پر کاربند رہے ہیں۔ اُردو کی عظیم ترین صنفِ سخن، یعنی مرثیے کا

دامن بھی اس سے خالی نہیں، حالانکہ مرثیہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک الم انگیز نظم ہے جس کی اصل بیان مصائب ہے۔ اس کے چہرے میں اور پھر آگے چل کر رجز اور ساقی نامہ میں مدح علی کے امکانات کی ایک دنیا آباد ہے۔ مرثیہ نگاروں نے اس میدان میں کیسے کیسے جوہر دکھائے ہیں، اس باغ میں کیسے کیسے پھول کھلائے ہیں اور اس مصائب زار میں مدح کے کیسے کیسے دریا بہائے ہیں۔ یہ اہل نظر سے مخفی نہیں۔ یہی صورت سلام کی صنف میں بھی پائی جاتی ہے۔

اس صنف سخن، یعنی مدح ومنقبت نے اُردو کے دامن تہی کو ایسے آب دار موتیوں سے بھر دیا جیسے اندھیری رات میں آسمان کا دامن تاروں سے بھرا ہوتا ہے۔ اگر عشق علی سے مملو مدح ومنقبت کو الگ کر دیا جائے تو اُردو کے سر پہ سجا ہوا شعر وادب کا تاج زرنگار کشکول گدائی بن کر رہ جائے۔

اتنے عظیم شعری وادبی سرمائے سے کچھ انتخاب کرکے انتخاب کا حق ادا کر دینا تقریباً ناممکن ہے۔ سبب یہ ہے کہ کچھ شعرا اپنی شہرت عام کی بنا پر طالب علم اور محققین کی توجہ اپنی طرف مبذول کرا لیتے ہیں اور ان کا کلام منظر عام پر آ جاتا ہے اور اکثر زباں زد ہو جاتا ہے، مگر ان سے کہیں بڑی تعداد ان شعرا کی ہے جن کی تخلیقات تو فکری اور فنی اعتبار سے کسی سے کم نہیں مگر مقبولیت عام ان کا نصیب نہیں، اس لیے ان کا بہترین کلام بھی عوام اور قارئین کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ چنانچہ کلام کا انتخاب تو درکنار، سارے مداح اور منقبت نگار شعرا کی مکمل فہرست بنانا بھی ممکن نہیں، مگر اس سلسلے میں جتنی بھی کوشش کی جائے، وہ مستحسن اور مشکور ہے۔ اسی طرح کی ایک سعی مشکور جناب علامہ ضمیر اختر نقوی کی ہے جو "شعرائے اُردو اور عشق علی" کے نام سے منصۂ شہود پر آئی ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کو لکھنے لکھانے کا شوق بھی ہے اور ذوق بھی، اس لیے وہ مسلسل لکھتے پڑھتے رہنے کے عمل سے زندگی کے ہر لمحے کو بہترین مصرف میں لاتے ہیں، لکھنا لکھانا بھی زیادہ تر اُس پاکیزہ ادب سے متعلق ہے جس کو شعر و ادب کی آبرو کہنا چاہیے۔ ان کے ذوقِ جستجو کا اصل میدان مرثیہ ہے۔ اور مرثیہ وہ صنفِ سخن ہے کہ جس کو اپنی طرف متوجہ کرلے بلکہ اپنے آپ میں جذب کرلے، اس کے ذوقِ سخن کو سنوار کے اور حسنِ زباں کو نکھار کے اسے اپنے وقت کا سرشار اور مرزا رسوا بنادے تحریر کا سلیقہ اور تقریر کا ڈھنگ سکھادے، سوائے اُن کے جو ذوقِ سلیم کے معاملے میں بالکل ہی کورے ہوں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کا مرثیے سے گہرا شغف ان کی تصنیفات اور تالیفات سے ظاہر ہے۔ انھیں رثائی ادب اور دیگر اصنافِ شعر و ادب سے متعلق کتابیں، مخطوطات وغیرہ جمع کرنے کا بے حد شوق ہے جو ان کے شوقِ تحقیق کے لیے مضبوط بنیاد فراہم کرتا ہے اور ''شعرائے اُردو اور عشقِ علی'' جیسی خوبصورت کتابوں کی تخلیق کا سبب بنتا ہے۔

انھوں نے اس تازہ کتاب کا موضوع تو ''شعرائے اُردو اور عشقِ علی'' متعین کیا، مگر اس کے کینوس کو پھیلاتے پھیلاتے وہ اسے اُردو کی سرحدوں سے باہر لے گئے۔ مدحِ علی کا آغاز قرآن مجید اور عربی و فارسی شاعروں سے ہوتے ہوئے اُردو شعرا تک آئے ہیں اس طرح قرآن مجید اور عربی و فارسی شاعری میں مدحِ علی کے کچھ گوشے تو سامنے آئے، مگر اس کا ایک نقصان بھی ہوا یعنی کتاب کی ضخامت میں سے ڈیڑھ سو سے زائد صفحات، جو مزید اُردو شعرا کے تذکرے اور مدحِ علی میں ان کے کلام کے نمونوں کے لیے استعمال میں آکر موضوع کی جامعیت میں اضافہ کرسکتے تھے، کتاب ان سے محروم رہ گئی اور اُردو شعرا کی محدود تعداد محدود تر ہوگی۔

بہر حال اس میں شک نہیں کتاب کے حجم و ضخامت کی پابندیوں کے باوجود انھوں نے صرف معروف شعرا پر اکتفا نہیں کی ہے بلکہ کچھ نسبتاً کم معروف شعرا کا کلام بھی اس میں شامل کیا ہے۔ مزید یہ کہ انھوں نے صرف انتخاب ہی نہیں پیش کیا ہے، بلکہ شعرا کا تعارف اور ان کے کلام پر تبصروں سے کتاب کو اور بھی وقیع اور مفید بنا دیا ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ مدحِ علی ایک سمندر ہے اور شعرا اس کی موجوں کی طرح ہیں جن کا شمار ممکن نہیں۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جیسا کہ میں نے اپنے ایک مرثیے کی ایک بیت میں کہا ہے کہ:

سبھی کے نام تو کوئی گنا نہیں سکتا
یہ ایک بحر ہے، کوزے میں آ نہیں سکتا

ہزاروں شعرا کے لاکھوں اشعار میں سے ایک خاص موضوع پر اشعار تلاش کرنا اور ان کو ترتیب دینا دوقت نظر کے ساتھ محنت شاقہ بھی چاہتا ہے۔ اس کام میں کتنی عرق ریزی کرنا پڑتی ہے اس کو وہی سمجھ سکتے ہیں جنھوں نے کبھی اس خارزار میں قدم رکھا ہے، اس لیے مولف موصوف کی تلاش و جستجو اور تحقیق و تدقیق کی داد نہ دینا بڑا ظلم ہے، گو اس شاندار کام کی داد دی ہی نہیں جا سکتی۔

بہر حال ایک آدھ گوشے کی تشنگی ضرور کھٹکتی ہے۔ مثلاً مرثیہ گوئی کے ایک بڑے خاندان، یعنی خاندانِ اجتہاد کے کسی شاعر کا کلام شامل نہیں سوائے لسان الشعرا مولانا اولاد حسین صاحب، مولوی للّن صاحب شاعر اعلی اللہ مقامہٗ کے، دوسرے ماضی قریب میں جوش، آلِ رضا اور نسیم امروہوی تک پہنچتے پہنچتے ان کا قلم رک گیا اور نجم آفندی جیسا مداح مرثیہ نگار اور قصیدہ گو نظر انداز ہو گیا۔

مجھ کو اس بات سے بھی اتفاق نہیں کہ عہدِ موجود میں کسی نے مدحِ علی نہیں لکھی۔ ہر مرثیہ نگار اور ہر شاعر کسی نہ کسی انداز میں مدحِ علی کرتا ہے۔ یقیناً مداحی کا معیار تعداد

اشعار نہیں ہے، یعنی یہ ضروری نہیں کہ اگر کسی نے ہزار دو ہزار اشعار کی مثنوی یا چار پانچ سو اشعار کا قصیدہ کہا ہے تو بس اس نے مداحی کی ہے۔ مدح میں ایک شعر بھی ہو تو مدح کہلائے گا۔ اس میں شک نہیں کہ بعض جدید مرثیہ گو شعرا نے حد سے بڑھی ہوئی جدیدیت کے نام پر غیر متعلق موضوعات کو مرثیہ قرار دے کر مدح کے ساتھ مدح کو نظر انداز نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ قصیدے کہنے والے نے قصیدے کہے ہیں۔ دہلی سے مہدی نظمی مرحوم کا مجموعہ "عصری قصائد" کے نام سے شائع ہوا۔ اس کے علاوہ آج کے بیشتر شعرا بلا تفریق مذہب وملت مدح علی میں منقبتیں کہتے ہیں، اس لیے توقع ہے کہ ضمیر اختر نقوی انشاء اللہ! اس کام کو آگے بڑھائیں گے اور اس موضوع پر ان کی دوسری جلد بھی منظرِ عام پر آئے گی۔ ان کا یہ کام داد وتحسین کا بھی مستحق ہے اور اجر وثواب کا بھی۔

بیدر نواب جعفری

۶ رجولائی ۱۹۷۷ء..... لکھنؤ۔ انڈیا..... محترم ضمیر اختر نقوی صاحب تسلیمات!

"آپ جو بھی وہاں فروغ مرثیہ خوانی کے لئے کوشش کر رہے ہیں وہ قابلِ ستائش ہے۔ آج کل کے دور میں اتنی صداقت اور مستقل مزاجی بہت کم پائی جاتی ہے جیسی میں نے آپ میں پائی، اس وقت آپ کی صورت میرے سامنے ہے اور ناظم صاحب کے امام باڑے کا منبر اور اس پر آپ کی خطابت کے انداز، مومنین کا آپ کی زبان سے نکلے ہوئے ایک ایک لفظ پر صلوٰۃ بلند کرنا۔ واہ واہ کی صدائیں ہر طرف سے بلند ہونا میری نظروں کے سامنے ہے۔ اولڈ بوائز کی مجلس میں آپ کی نہ سن سکا جس کا مجھ کو آج تک افسوس ہے"۔

پروفیسر محمد رضا کاظمی

ادبی کمال کا اعتراف

حضرت ضمیر اختر نقوی کی فہرست تصانیف نظر میں رکھیے، بیشتر ان موضوعات پر ہیں جو دین و ادب کی سرحد پر واقع ہیں۔ ان کی تازہ ترین تصنیف "شعرائے اُردو اور عشقِ علی" کو میں کئی لحاظ سے زیادہ اہم پاتا ہوں۔ وہ جذبات، وہ تصورات جو ادب، عظیم ادب کا محرک بنے ہیں، ان کی نشان دہی، ان کی تشریح تنقید کا بنیادی فریضہ ہے۔ ترقی پسند تحریک کے دوران نظریات کی ترویج و تشریح بہت ہوئی مگر بعد میں یہ رجحان تقریباً ناپید ہوگیا۔ تقریباً اس لیے لکھ رہا ہوں کہ عزیز حامد مدنی نے جدید اُردو شاعری میں اسی زاویے سے تنقید کی ہے۔

ضمیر اختر نقوی کی تصانیف ہمیشہ موضوع سے تجاوز کر جاتی ہیں اور یہ ان کے اور ناظرین کے حق میں بہتر ہوا کرتا ہے۔ عشقِ علی کا جذبہ یہاں صرف اُردو شعرا نہیں عربی اور عجمی شعرا کے یہاں بھی دکھایا گیا ہے۔ ذکرِ علی کی مخالفت سب سے زیادہ اس دور میں ہوئی جب اسلام کی تہذیبی زبان عربی تھی، اور اس کی بنا اس لیے ہوئی کہ قرآن کے ساتھ اس کی وابستگی تھی، مغازی اخبار و احادیث تک تدوین میں یہ مخالفت نظر آتی ہے۔ اگر آیاتِ قرآنی میں اہل بیت کی فضیلت نہ ہوتی، امیر المومنین کی فضیلت نہ ہوتی تو امرائے بنو امیہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہوتے۔ درباری مفسرین کی مجبوری یہ تھی کہ دورانِ تفسیر ان آیات کی تاویل ضروری ہوگئی۔ اسی تردید کے جذبے نے حق

پرستوں کو متوجہ کیا اور علیؑ کے ذکر کو رفیع کیا۔ مفسرین نے سب سے زیادہ زور آیۂ ولایت کے خلاف صرف کیا ہے۔ سو وہاں بھی موجودہ تالیف ہمیں جناب حسان ابن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس قصیدۂ مدحیہ تک لے جاتی ہے جو اسی آیت کے نزول کے موقع پر آنجناب نے ذات ختمی مرتبتؐ کی موجودگی میں پیش کیا تھا۔

شعرائے ایران نے صفوی دور سے پہلے اور صفوی دور کے بعد بھی ولائے علیؑ کے جذبے سے کام لے کر ادب کی کشش انگیزی کا سامان کیا، اور ہر معاشرے کی تبدیلی میں یہ جذبہ مثبت اقدار کی نگرانی کرتا رہا ہے۔ میں بھی موضوع سے تجاوز کر جاؤں گا، اس لیے کہ ایران کے فارسی شعرا کے ذکر سے پہلوتہی کر کے، جو اس کتاب میں تفصیلاً درج ہیں، میں اُردو کے ان عظیم شعرا کا ذکر کروں گا جن کا استحقاق اُردو سے زیادہ فارسی میں ہے۔ فاضل مصنف نے غالب کے جذبۂ حب علیؑ کو بہت عمدگی سے بیان کیا ہے، ان کے غلو کی مثالیں دی ہیں اور اس کی تشریح کی ہے، اور تقریباً آخر میں انھوں نے غالب کے اس عذر کو پیش کیا ہے:۔

دینِ حق دارم ، معاذ اللہ! نصیری نیستم

اس مصرع کا مقابلہ اقبال کے اس تردد سے کیجیے:۔

کوئی کہ نصیری خموشم

یہ مثالیں ہمیں اس سوال تک لے آتی ہیں کہ عشق علیؑ کی جگہ شعرائے اُردو کے طرزِ احساس میں کیا ہے۔ اسے عرب و عجم کے طرزِ احساس سے کچھ مختلف ہونا تھا اور یہ ہوئی اس کی تاریخی تشریح تو چند سطروں کے بعد آئے گی پہلے دیکھیے کہ حوصلین کے دور آخر میں زبان خلق میں ڈھل کر یہ جذبہ ہم سے کیا کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ زبان خلق کی جتنی مستند شاعری استاد ذوق نے کی ہے، کسی نے نہیں کی ہے۔ ان کا یہ شعر فاضل مصنف

نے پیش کیا ہے:

اے ذوق! نہ کر نور میں آمیزشِ ظلمت
کیا کام تبرا کا محبت میں علی کی

گویا تاریخ کا پہیہ دورِ اموی کے بالکل مقابل آ گیا۔ ذوق کو معمولی شاعر کہنے کی جو دیرینہ روش ہے، میں نے ہمیشہ اس کی مخالفت کی ہے، لیکن یہ اقرار کرنے پر میں بھی مجبور ہوں کہ غالب اور ذوق کا فرقِ مراتب سب سے زیادہ ولائے علی کے موضوع پر جھلکتا ہے۔ غالب کے تفضیلی نہ ہونے کے عذر کے باوجود ان کے یہاں ولائے علی کی صورت وہ نہیں جو ذوق کے یہاں ہے یعنی غالب کے یہاں حبِ علی ذوق کے مطلوبہ معنوں میں نظارۂ خدا نہیں ہے، بہت پیچیدہ جذبہ ہے۔ غالب صدی کے دوران جوش ملیح آبادی نے لکھا تھا کہ غالب کی فطری بغاوت بہت قوی جذبہ تھا جسے حبِ علی نے ہمیشہ پامال کیا۔ لیکن جو بات انھوں نے اس موقع پر نہیں لکھی اور وہ جانتے ہوئے نہیں لکھی، وہ یہ ہے کہ کہیں کہیں فکری بغاوت اور ولائے علی غالب کے یہاں ایک قالب میں ڈھل گئے ہیں۔ عشق و عقل کی رزم آرائی کو غالب اس نقطۂ عروج پر لے آئے تھے:

بزم ترا شمع و گل خستگی بوتراب
ساز ترا زیر و بم واقعۂ کربلا

حضرت ضمیر اختر نقوی نے موجودہ تالیف کو جوش پر تمام کر دیا ہے۔ اس سے بات آگے نہیں جائے گی، لیکن "شعرائے اردو اور عشقِ علی" کے پیشِ نظر، یہ جاننا تاریخی دلچسپی سے خالی نہیں کہ عشقِ علی کے یہ تین دھارے جنھیں ذوق، غالب اور اقبال کے ذریعے فاضل مصنف نے ہم تک پہنچایا ہے، اس کی تاریخی توجیہ کیا ہے۔ انھوں نے

اس سوال کا اس حد تک لحاظ رکھا ہے کہ ''شعرائے اُردو اور عشق علی'' میں انھوں نے شعرائے اُردو کے تین دائروں کی جانب متوجہ کیا ہے: قصیدہ نگار شاعر مثلاً غالب، غزل نگار شعرا مثلاً ذوق اور مرثیہ نگار شاعر مثلاً انیس۔ انیس کی مثال ہی کسی کو کلام نہیں۔ ''تاب سخن'' میں، میں یہ وضاحت کر چکا ہوں کہ غزل کی اعلیٰ شکل نہ ہوتے ہوئے ذوق کی غزل، غزل کی ضمیری، روایتی اور نمائندہ حیثیت کی مثال ہے۔ رہا سودا کے مقابل غالب کو نمائندہ قصیدہ نگار کہنا تو اس کی تائید کلیم الدین احمد کے اس قول سے ہوتی ہے کہ خواہ غالب کے قصیدے، قصیدے کے روایتی تقاضوں کو نہ پورا کرتے ہوں، شاعری کے تقاضوں کو بدرجۂ اتم پورا کرتے ہیں، لیکن یہ کہنے کے باوجود کلیم الدین احمد غالب کے سب سے اعلیٰ قصیدے سے صرفِ نظر کر گئے:

دہر جز جلوۂ یکتائیِ معشوق نہیں

ایسا کلیم الدین احمد نے کیوں کیا، اس کا جواب بہت طوالت میں لے جائے گا۔ لیکن اسے یوں سمجھیے کہ محمد حسن عسکری اور سلیم احمد نے غالب کی تشبیب کو مدح سے برتر جانا ہے، اور ان کی رائے کی بازگشت انتظار حسین کے یہاں بھی نظر آئی جنھوں نے مراثیِ انیس کے تقابل میں درج بالا جذبات کی تائید کی۔ ممدوح سے قربت نہ ہو تو مدح گوارا نہیں ہوتی۔ لاف دانش غلط و نفع عبادت معلوم۔ ''شعرائے اُردو اور عشقِ علی'' میں ضمیر اختر نقوی نے کئی صفحے اسی قصیدے کی تشریح میں صرف کیے ہیں۔ اور اگر ان کی کتاب صرف اسی حصے پر مشتمل ہوتی تو بھی یہ ایک بہت بڑی خدمت کہلاتی۔

سلیم احمد کا مذکورہ رویہ ہمیں اس سوال تک واپس لے آتا ہے کہ شعرائے اُردو کے یہاں مذکورہ تین رویے کیونکر ممکن ہوئے۔ اس کا جواب جنوبی ایشیا میں اسلامی فتوحات کی خصوصی نوعیت سے ہے۔ سات سو سال کے مسلم اقتدار کے بعد ہندو سماج سالم شکل

میں برآمد ہوگیا۔ جنوبی ایشیا کے مسلم حکمراں اس تبلیغی جوش کے حامل تھے جس کی نظیر ہمیں اسلامی اندلس میں نہیں ملتی۔ گرچہ راجندر پرشاد کا یہ اقرار بھی پیشِ نظر ہے کہ مسلمان حکمراں حتیٰ کہ اورنگ زیب کے یہاں بھی جارحیت کا وہ جذبہ نہیں ملتا جو انگریز مورخین ہمیں سکھا گئے تھے، لیکن یہ خاص بات کہ برصغیر میں تبلیغ کے دو دھارے تھے ایک بادشاہ کا ایک فقیر کا۔ یہ بحث دور ازکار ہے کہ کس دھارے کی تبلیغ موثر تھی۔ اصل بات دو دھاروں کا وجود تھا۔ مسلمانوں کا واسطہ صرف ہندو راجا سے نہ تھا، ہندو سادھو سے بھی تھا۔ مسلمانوں کی تلوار شہری تہذیب کو جنم دیتی رہی اور ان کی رواداری دیہی تہذیب کو بساتی رہی۔ اس کے نتیجے میں برصغیر کے مسلمانوں کی مذہبی حسیت ایک ایسے مقام پر آ گئی جہاں ولائے علی بہت بڑا جذباتی سہارا بن گئی۔ جنوبی ایشیا میں طاقت کا توازن ایسا ابھر کر آ رہا تھا جس نے مسلمانوں کو فتوحات کی ماہیت پر غور کرنا سکھایا، اور اس تامل کا پہلا مرحلہ تھا غزوات وفتوحات میں امتیاز۔

وہ رزم جو ذاتِ ختمی مرتبت کی موجودگی اور خوشنودی سے سرفراز تھی، وہ فتح خیبر سے مختص ہوگئی اور بنو امیہ کے اقتدار نے مشرق وسطی کی ریاستوں میں جو ایک نوع کی مادیت کو پروان چڑھایا تھا، وہ صورت جنوبی ایشیا میں تادیر قائم نہ رہ سکی، بلکہ علی اور اولادِ علی پر مظلوم کے سبب تصوف کے دوش بدوش ولائے علی کا جذبہ پروان چڑھتا رہا اور جس طرح انا الحق کا نعرہ اسلامی معاشرے میں حق کا نعرہ بن کے ابھر رہا تھا، ولائے علی بھی احتجاج کی شکل تھی۔ حیدریم قلندرم مستم۔ اور یہیں سے وہ تین دھارے بہے جو بالترتیب زیرِ نظر کتاب میں ذوق، غالب اور اقبال کے یہاں دکھائی دیتے ہیں۔ ذوق واقبال کو پہلے دیکھیں۔ ولائے علی کا جذبہ شعرائے تشیع سے مخصوص نہ رہا، تصوف ہی نہیں، تسنن کا بھی لازمہ بن گیا۔ ذوق کے یہاں اس نے پرخلوص عقیدت کی صورت

اختیار کی اور اسی اخلاقی حکمت کا آئینہ دار بن گیا، سیاسی احتجاج نہیں فکری احتجاج۔ غالب نے جس نصیریت سے برات کا اظہار کیا، وہ مسلمانوں کی ادبی حسیت میں کیسے داخل ہو گئی۔ یہ بات سب سے زیادہ غالب کے ذریعے سمجھ میں آتی ہے۔ نصیری مسلک اسلام کے خمیر سے اٹھا ہوا ایک ایسا شرک ہے جو الحاد کو آئینہ دکھاتا ہے۔ الحاد کا رو جب معقول سے محسوس کی سطح پر آیا تو نصیریت کا اظہار (اظہار نہ کہ یقین) کارگر ہو گیا۔ نصیری مسلک منطق سے عاری اور مبالغے سے مملو ہو کر اس شعری لطافت کا حامل ہو گیا جسے ہم غالب کے بلند ترین افکار میں دیکھتے ہیں جہاں غالب نے بزم اللہ کا شکوہ کیا ہے، شعر مکرر نقل کرنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں تک پہنچنے کے بعد یہ کہنے کی حاجت نہیں رہتی کہ یہ غالب ہی کا وجدان تھا جس نے اقبال کو "یزداں بکمند آور اے ہمت مردانہ" کا زینہ عطا کیا۔

اب رہ گئے انیس تو اس سلسلے میں فاضل مصنف نے ایک باب تحریر کیا ہے "اردو مرثیہ نگار اور مدح علیؑ"۔ یہ زیر نظر کتاب کا کلیدی باب ہے۔ اس میں حضرت ضمیر اختر نقوی نے انتہائی مہارت کے ساتھ یہ دکھایا ہے کہ مدح علیؑ اور رثائے حسینؑ کی تحلیل کا منظر پیش کیا ہے اور اس میں شک نہیں کہ یہاں ان کی مساعی تعریف سے بالا ہیں۔ اس باب کے ذریعے انھوں نے میاں دلگیر اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی مرثیہ نگاری سے بحث کی ہے اور وہ کڑی فراہم کردی ہے۔ جس کے ذریعے دکنی اور دہلوی مرثیے کا بکائی لہجہ لکھنوی مرثیے کا رزمیہ لہجہ کیونکر بنا۔

اب رہا اپنے پرانے دوست مقتدا حضرت ضمیر اختر نقوی کے ادبی کمال کا اعتراف تو یہ ایک ایسا حق ہے جسے میں تسلیم تو کر سکتا ہوں ادا نہیں کر سکتا، اور یہ حق اس وقت ادا ہوگا جب میر انیس پر ان کی موعودہ کتاب منظر عام پر آئے گی۔ ان کی ہر نئی

کتاب یہ اشارہ کرتی ہے کہ ان کا سفر بلندیوں کی جانب ہے اور ان کی ہر کتاب سابقہ کتاب سے بہتر ہوتی ہے بایں صورت میر انیس پر ان کی کتاب کا شائع نہ ہونا ایک ایسے احساسِ محرومی کو جنم دیتا ہے جسے اہلِ ادب ہی جان سکتے ہیں۔ انھوں نے اس کتاب کا وعدہ تک کیا تھا جب وہ اور میں دونوں جوان بلکہ نوجوان تھے۔ اب یہ بزرگی کے سائے جو ہمارے سروں پر منڈلا رہے ہیں ہمارے ہر وعدے کو مسلسل یاد دلا رہے ہیں۔

☆☆☆

پروفیسر محمد حیات خاں سیال

گورنمنٹ کالج جھنگ..... ۳ر دسمبر ۱۹۸۱ء

محترم ضمیر نقوی صاحب!

اتفاقاً مقامی نیوز ایجنسی پر جوش کے مرثیے پر نظر پڑی، میں کئی دنوں سے جوش کے مرثیے تلاش کر رہا تھا۔ آپ نے بڑا احسان کیا کہ ان مرثیوں کو ترتیب دے دیا۔ کتاب بھی خوبصورت چھپی ہے۔ اسی دوران میرے دوست سید حسن عباس نقوی ملے وہ جوش کے مرثیے دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور اسی وقت مقامی بک سیلر سے کاپی حاصل کر لی۔ وہ بتا رہے تھے کہ آپ سے ان کی ملاقات بہاولپور میں ہوئی تھی۔ شاید آغا سکندر مہدی کے ہاں۔ اس زمانے میں وہ اسسٹنٹ کمشنر تھے آج کل میانوالی میں تعینات ہیں۔

اپنے پبلشرز سے کہیں کہ مجھے اطلاع دے کہ کون سی کتابیں چھپ چکی ہیں، آپ جس تندہی سے کام کر رہے ہیں اس کی داد دینا پڑتی ہے، خصوصاً محبانِ اہل بیت کے لئے یہ کتابیں بڑی نعمت ہیں۔ مخلص..... محمد حیات خاں

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

آج کے اس نفسانفسی کے ماحول میں جہاں بے شمار کمزور، کھوکھلی اور خود ساختہ شخصیات اپنی بقا اور نام کے لیے دوسری شخصیت کا وجود برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس ماحول میں علامہ سید ضمیر اختر نقوی جیسی عظیم و بلند و قربانی سے پُر، دوسروں کے دکھ درد میں شریک، بے لوث و بے غرض ہو کر کام کرنے والی اور MOST LEARNED شخصیت کا وجود میرے نزدیک مجازاً پیمبرانہ وجود ہے، ختمِ نوعِ انسانی پر احسانِ خداوندی ہے اور حقیقتاً ایک معجزہ ہے۔

کشیدہ قامت، گندمی رنگ، ستواں ناک، بادامی آنکھوں اور خوبصورت گیسوؤں والے ہمارے ضمیر بھائی جن کو میں اکثر "قبلہ" اور کبھی کبھی ضمیر بھائی کہا کرتا ہوں اور وہ مجھے کبھی ماجد، کبھی بیٹا اور کبھی بھیا کہتے ہیں۔ ان کا ہر طرزِ تخاطب مجھے جان سے زیادہ پیارا ہے۔ ان طرز ہائے تخاطب میں ان کی دلی محبتیں، شفقتیں اور خلوص شامل ہے جو ان کو قدرت کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں۔

ضمیر صاحب سے میری باقاعدہ ملاقات جب بھی ہوئی ہو، جو بات حیران کن ہے، وہ یہ کہ جب میں ان سے ملا، میرے ذہن کے خلیوں میں ایک قسم کی

FREQUENCY کی SIGNALING سی ہوئی اور یوں لگا جیسے میرے ذہن کی ضمیر صاحب سے مل گئی ہو اور ایسا معلوم ہوا جیسے صدیوں سے میری ملاقات ضمیر صاحب سے ہے۔ پھر ان کا مشفقانہ انداز گفتگو اور محبانہ طرز کلام ہر کسی کو اپنی طرف جذب کرتا ہی ہے اور کوئی بھی ان سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ ضمیر صاحب کی شخصیت ایک ایسے گلستان کی مانند ہے، جس میں قسم باقسم کے رنگ اور پھول بکھرے ہوئے ہیں، کہیں خوش اخلاقی کی بو ہے، کہیں مشفقانہ خو ہے، کہیں عزم وہمت کے رنگ ہیں، کہیں ایثار اور قربانی سنگ سنگ ہیں۔ علم وفن کی وجہ سے شخصیت باوقار ہے اور اس وجہ سے مزاج وکیفیت ہمہ وقت پُر بہار ہے۔ جہاں جنروری کا مرانی کا غرور ہے، وہاں عجز وانکساری کا دل میں نور ہے، جہاں مزاج کا مختلف النوع رنگ ہے، وہاں حلم وبردباری کا ڈھنگ ہے، میدان خطابت کے شہسوار، اقلیم تحقیق وتنقید کے تاج دار، مسکن ومنبع تہذیب وعلم وادب یعنی ''لکھنؤ'' سے محبت ہے تو مدینہ ونجف وکربلا کی مودت ہے، آل محمدؐ کی حضوری ہے، اہلبیت سے دوری ہے، گویا اس شعر کی مجسم تصویر ہیں:۔

مت سہل ہمیں جانو! پھرتا ہے فلک برسوں
تب خاک کے پردے سے انسان نکلتا ہے

آج کے علم وادب کے میدان میں یہ بات عام ہے کہ کسی کا نام دو چار کتابوں میں آ گیا یا کسی کو ذرا سی شہرت حاصل ہوگئی تو اس سے بڑا بقراط وافلاطون کوئی نہیں ہوتا اور زعم جاہ ومنصب اس کو مغرور بنا دیتا ہے اور وہ کسی کو اپنا ہم مرتبہ نہیں جانتا۔ ہمارے یہاں اکثر ادیب اور شعرا اس زعم برتری میں مبتلا ہیں، لیکن ضمیر صاحب ان تمام آلائشوں سے پاک ہیں اور ان تمام نام نہاد خصوصیتوں سے مبرا ہیں۔ ضمیر صاحب کے حلقۂ احباب میں ذہین، نفیس، سرمایہ دار، مفلس، بڑے سرکاری عہدوں پر فائز،

سادہ لوح، چالاک، کم پڑھے لکھے اور اعلیٰ تعلیم یافتہ، غرض ہر قسم کے لوگ شامل ہیں، لیکن ضمیر بھائی کا حسنِ سلوک سب سے یکساں ہے۔ وہ کوشش کرتے ہیں کہ اپنے حلقۂ احباب کے ہر فرد سے خود ملیں، اور اس سلسلے میں ان کو یہ بات مانع نہیں ہوتی کہ کوئی کوٹھی میں رہ رہا ہو یا کوٹھری میں، وہ سب کو برابر جانتے ہیں۔ ضمیر بھائی کے نزدیک دوستی اور پختہ دوستی کا معیار ذہانت اور ہنر وری ہے۔ ہر وہ شخص جو ذہین ہے اور ہنر مند ہے ان کا دوست ہے اور وہ دل سے اس کی قدر کرتے ہیں۔

ضمیر اختر صاحب جس محفل میں پہنچ جائیں، اس محفل کی رونق بن جاتے ہیں اور وہاں علمی و ادبی گفتگو شروع ہو جاتی ہے۔ ایسی ایسی باتیں اور معلومات ضمیر صاحب ایسی آسانی سے اور سہل الفاظ میں بتا دیتے ہیں کہ جن کو حاصل کرنے کے لیے سیکڑوں کتابوں کی عرق ریزی کرنا پڑے۔ ان کی محفل میں بیٹھ کر وقت ایسے گزر جاتا ہے کہ معلوم نہیں ہوتا۔ ان کے انداز گفتگو، رکھ رکھاؤ، نشست و برخاست، ان سب باتوں کی کیا تعریف کی جائے۔ بس یہ شعر ان سب باتوں کا ترجمان ہے۔

گفتگو وہ کہ چہکتی ہوئی بلبل رُک جائے
خامشی وہ کہ کوئی پھول کھلا ہو جیسے

ضمیر صاحب جب تقریر کرتے ہیں تو ان کی تقریر میں روانی کے ساتھ تسلسل بھی ہوتا ہے۔ اسی روانی اور تسلسل میں پوری تقریر میں وہ کئی مسائل حل کرتے چلے جاتے ہیں۔ موضوع سے متعلق تمام سوالات اور تمام گوشے ان کے ذہن میں محفوظ ہوتے ہیں لہٰذا ان کی تقریر اپنے موضوع کا حق ادا کرتی ہے اور یہی انداز تحریر کا بھی ہے، یعنی ضمیر بھائی سوال اٹھاتے ہیں اور اس کا جواب دیتے جاتے ہیں۔ اس طرح ان کی تقریر دلچسپ اور پُرکیف ہوتی جاتی ہے۔

ضمیر صاحب بہت عمدہ اور بھرپور شاعر بھی ہیں۔ انھوں نے شاعری کی ابتدا غزل سے کی اور اتنی غزلیں کہیں کہ ایک مختصر سا دیوان مرتب کیا جاسکتا ہے، سلام بھی کہے ہیں اور بہت عمدہ سلام کہے ہیں۔ اس کے علاوہ میر انیس کی صد سالہ برسی کے موقع پر انیس پر جو مسدس کہے ہیں، وہ بہت خوبصورت اور پُر کیف ہیں۔ اگر ضمیر صاحب شاعری ہی کرتے تو جوش کے بعد آج جو خلا ہے، وہ شاید ضمیر اختر نقوی کی صورت میں پورا ہوتا۔ اب اس سے اندازہ کیجیے کہ جو آدمی اتنی بڑی قربانی دے، یعنی شاعری آسان کام ہے بہ نسبت تحقیقی نثر کے اور پھر جو شخص باطنی طور پر بھی شاعر ہو اور بھرپور شعر کہتا ہو، وہ یہ میدان اور متوقع شہرت چھوڑ دے تو یہ اس کی شخصیت کی عظمت اور بلندی اور بڑے پن کا منہ بولتا ثبوت ہے اور غالباً اسی قربانی کے صلے میں قدرت نے ضمیر بھائی کے قلم کو اعتبار دیا اور اسے سند کی منزلوں تک پہنچایا ہے۔

علم و ادب کے میدان میں تحقیق اس طرح ہے جیسے راہِ خارزار سے ننگے پیر گزرنا، یعنی قدم ذرا سا بہکا اور پاؤں زخم کھا گیا۔ ایسی راہ پر چلنے کے لیے ہمت، ارادہ، جواں مردی، استقلال واستحکام اور عدل پسند ہونا ضروری ہے۔ یہ تمام صفات علامہ ضمیر اختر نقوی کے حصے میں آئی ہیں، اس لیے وہ اس راہِ خارزار سے گزرتے ہیں اور اس طرح کہ اس خارزار میں پھول بوتے ہوئے تاکہ آنے والوں کے لیے یہ راہ سہل ہو جائے۔ تحقیق کا جہاں تک تعلق ہے، وہ ضمیر بھائی کا مزاج ہے۔ عام زندگی میں بھی کسی بھی مباحثے یا گفتگو کے وقت کسی ایسی رائے کا اظہار نہیں کرتے یا کوئی ایسی بات نہیں کرتے جس کے بارے میں روایتاً، درایتاً اور تحقیقاً مسلّم ہونے کا یقین نہ ہو اور اس مزاج کی وجہ سے تحقیق کے میدان کی شخصیت بن گئے ہیں۔

ضمیر صاحب کا حافظہ خداداد حافظہ ہے اور ایسا حافظہ ہزاروں میں کسی ایک کو

نصیب ہوتا ہے۔ کوئی بات، کوئی روایت، کوئی دلیل، کوئی بیان ہو، ضمیر صاحب کا حافظہ COMPUTER کی طرح کام کرتا ہے اور فوراً وہ بتا دیتے ہیں کہ یہ چیز فلاں کتاب میں ہے، فلاں شخص نے اس کو یوں بیان کیا۔ جتنی کتابوں کے نام اور ان میں موجود مواد کے بارے میں ضمیر صاحب کو علم ہے، میری دانست میں کوئی ایسا شخص نہیں جو ایسی معلومات رکھتا ہو۔

ہر دور کے ادب کی بڑی شخصیات کے فن و ہنر کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہر شخصیت کے عروج کا کوئی سبب، کوئی راز ضرور نظر آئے گا اور تحقیق کی جائے تو معلوم ہوگا کہ غالبؔ میرؔ، سوداؔ، نظیرؔ، انشاؔ، مصحفیؔ، جرأتؔ، انیسؔ و دبیرؔ، ناسخؔ، ذوقؔ، آتشؔ، واجد علی شاہ اخترؔ۔ اقبالؔ اور جوشؔ جیسی شخصیات نے اس راز کو پالیا تھا جس سے ان کو یہ عروج اور مرتبہ ادب میں حاصل ہوا۔ اور وہ راز کوئی ایسا چھپا ہوا بھی نہیں ہے، وہ راز ہے، ''معرفتِ محمدؐ و آلِ محمدؐ'' اور خصوصیت کے ساتھ معرفتِ جنابِ سیدہؑ۔ جب بھی کسی شاعر اور کسی ادیب نے سرِ تسلیم اس در پر خم کیا، اس کو یہاں سے معراج عطا ہوئی اور وہ عرشِ ادب پر قاب قوسین کی منزلیں طے کرتا ہوا رتبہ عالی تک پہنچا۔ علامہ ضمیر اختر نقوی بھی اس راز کے شناساؤں میں سے ہیں اور ان کے دل کو پروردگارِ عالم اور ائمۂ طاہرین علیہ السلام نے اپنی محبت کے لیے چن لیا ہے۔ ان کی فکر، ان کی سوچ، ان کا خیال، ان کا تخیل، ان کی جودتِ طبع کا ہر جوہر، ان کا موجدانہ طرزِ کار...... غرض ان کی ہر چیز آلِ محمدؐ کے لیے وقف ہے۔ ان کی فکر، ان کی خطابت کا ان کی شاعری کے دائرے کا نقطۂ پرکار دخترِ رسولؐ جنابِ فاطمہ زہراؑ کی ذاتِ والا گرامی ہے، یہی وجہ ہے ان کی فکر کا ہر پہلو، زبان سے نکلا ہوا ہر جملہ اور قلم سے بنا ہوا ہر لفظ معتبر، مستند، دور اندیش اور صدیوں پر محیط ہوتا ہے۔ یعنی یہ کلیہ ہوا کہ قدرت اس جہاں میں اسی کو

اعتبار عطا کرتی ہے جو محمدؐ و آل محمدؐ کو معتبر جانتا ہو۔ میرے نزدیک اس دور کے سب سے بڑے عارف محمدؐ و آل محمدؐ علامہ ضمیر اختر نقوی ہیں۔ آل محمدؐ کی معرفت حاصل کرنا اور اس میں ڈوب جانا بلکہ یوں کہوں تو مناسب ہے کہ معرفت کسے کہتے ہیں، یہ ہم نے ضمیر صاحب سے سیکھا۔

ضمیر صاحب نے کبھی اس بات کی پروا نہیں کی کہ جو کام اور خدمتیں وہ کر رہے ہیں، کوئی خوش ہوگا یا ناراض، کسی قسم کے مالی فوائد اس سے حاصل کیے جا سکتے ہیں۔ بس وہ تو ہر خطرے اور ہر مخالفت سے بے خوف و بے پروا ہو کر ادب کی اور آل محمدؐ کی خدمت میں مصروف ہیں۔ ان کے پیش نظر ان کی کسی کتاب کے قارئین کی بڑی تعداد کا ہونا یا ان کی تقریر میں سامعین کا بڑی تعداد میں ہونا معنی نہیں رکھتا، بلکہ ان کا مطمح نظر یہ ہوتا ہے کہ ہزاروں میں سے اگر کوئی ایک بھی وہ فکر بجھ کر اکتساب علم و ہنر کی راہ پر گامزن ہو جائے تو ان کے نزدیک ان کی کاوش کا سب سے بڑا انعام یہی ہوتا ہے۔ ان کے افکار سے، ان کے IDEAS سے، اُن کی جدت طرازی سے ہزاروں لوگوں نے فائدہ اٹھایا اور اٹھا رہے ہیں۔ جب سے مستقلاً میری آمد و رفت ضمیر صاحب کے یہاں شروع ہوئی، میں نے یہی دیکھا کہ ایک شخصیت ایک ادارے کا کام کر رہی ہے۔ یعنی دسیوں لوگ روزانہ آ جا رہے ہیں اور مختلف موضوعات پر بحث و مباحثہ کر رہے ہیں اور کوئی نہ کوئی فکر لے کر اٹھ رہے ہیں۔ کوئی ایم۔اے کے مضامین کے انتخاب کے بارے میں سوال کر رہا ہے تو اس کو اس کی ذہنی اُپج کے مطابق مضامین بتائے جا رہے ہیں اور THESIS مکمل کروا رہے ہیں۔ کوئی اپنا پی ایچ۔ڈی کا خالی کشکول لیے بیٹھا ہے اور اس کشکول کو ضمیر صاحب کے لب ہائے شیریں بیاں سے نکلے ہوئے موتیوں سے بھر رہا ہے۔ پاکستان کے علاوہ ہندوستان، جرمنی، ایران، انگلستان وغیرہ

سے دانش وران مختلف علمی موضوعات پر DISCUSSION کے لیے گاہے
بگاہے آتے رہتے ہیں۔

آج جبکہ علم وفن پسندی ناپید ہوتی جارہی ہے اور SPIRIT OF APPRECIATION ماند پڑتی جارہی ہے اور کوئی کام بلا مقصد دنیوی نہیں ہورہا اور دنیوی جاہ ومنصب حاصل کرنے کے لیے لوگ اپنے عقیدوں میں تغیّر وتبدل کررہے ہیں، اس ماحول میں ''شعرائے اُردو اور عشق علیؑ'' جیسی عظیم کتاب کی تصنیف واشاعت علامہ ضمیر اختر نقوی کا ایسا کارنامہ ہے جس سے اُردو ادب کی پاکیزگی میں چار چاند لگ گئے ہیں اور ایک ایسا ''احسان'' ہے جو صدیوں نہ اتارا جاسکے گا۔ اس کتاب سے محققین کو تحقیق کی نئی راہیں میسر آئیں گی، تفسیر قرآن کرنے والوں کو تفسیر کا خاکہ بنانے میں مدد ملے گی کہ تفسیر صرف معصومینؑ کے اقوال وارشادات کی روشنی میں لکھی جاتی ہے۔ نئی معلومات کے متلاشیوں کو اس کتاب کے ہر صفحے پر چونکا دینے والی معلومات حاصل ہوں گی۔ لسانیات پر کام کرنے والوں کو زبان وبیان سے متعلق نئے گوشے ملیں گے تشریحات نظم ونثر کے فن سے واقفیت حاصل ہوگی۔ ادب سے متعلق کتب کے بارے میں تفصیلی فہرست بھی اس کتاب میں موجود ہے۔ اس کے علاوہ سیکڑوں چیزیں ایسی ہیں جو قاری کے ذوق کو تسکین پہنچانے کا سامان رکھتی ہیں۔ کتاب کے اوراق الٹتے چلیے اور تجزیہ کرتے چلیے۔

سب سے پہلے فہرست نظر آئے گی۔ اس کتاب سے قبل اتنی تفصیلی، طرز جدید کی حامل، متنوع فہرست کبھی کسی کتاب کی زینت نہیں بنی۔ یہ فہرست ابواب بذات خود ایک مختصر، جامع اور معلوماتی کتابچے کی حیثیت رکھتی ہے۔ علامہ صاحب نے جس خوبصورت انداز اور جتنی تفصیل سے منقبت کی تعریف تحریر کی ہے، کسی بھی کتاب میں

اتنی جامع تعریف و تفصیل نہیں ملے گی۔ قدیم شعرا اور منقبت نگار اس تعریف کو سمجھتے تھے، اسی وجہ سے ایسی ایسی تخلیقات ہمارے سامنے ہیں جو شاہ کار کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن شاید جدید منقبت نگار شعرا اس تعریف سے کماحقہٗ واقفیت نہیں رکھتے جبھی ایسی کوئی چیز اور ایسی تخلیق سامنے نہیں آئی یا کوئی ایسا شعر بھی نہیں ملتا جو کسی بڑے شاعر کے کلام کے مقابلے میں رکھا جا سکے۔

ضمیر صاحب نے اس کتاب میں ادب، شاعری، اُردو اور عشقِ علیؑ کے وسیع دائرے میں رہتے ہوئے کئی عنوانات کو اپنا موضوعِ بحث بنایا ہے۔ وہ جب لکھ رہے ہوتے ہیں تو اپنے موضوع سے متعلق تمام معلومات اور تمام گوشے ان کے ذہن میں محفوظ ہوتے ہیں اور موضوع کی وسعت ان کی ذہن کے فکری پھیلاؤ سے زیادہ نہیں رہتی یہی وجہ ہے کہ ان کی ہر کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ وہ اپنے موضوع سے متعلق چھوٹی سے چھوٹی معلومات کو بھی قابلِ اعتنا جانتے ہیں۔ عشقِ علیؑ کے حوالے سے LITERATURE کے دائرے میں رہتے ہوئے جہاں مواد ملا، انھوں نے اس کے حوالے سے بحث کی ہے، یہی وجہ ہے کبھی وہ قرآن میں مدحتِ علیؑ بیان کرتے ہوئے ایک مفسرِ قرآن نظر آتے ہیں، کبھی وہ عرب و ایران اور ہندوستان کی تاریخ بیان کرتے ہیں تو ایک تاریخ داں کی حیثیت سے سامنے آتے ہیں، جب عربی، فارسی اور اُردو شاعری کی اصناف اور زبان و بیان پر بحث کر رہے ہوتے ہیں تو ایک ماہر لسانیات سامنے آتا ہے، جب مسلمانوں کے اجتماعی حالات لکھ رہے ہوتے ہیں تو اتحاد بین المسلمین کے سب سے بڑے داعی کے طور پر سامنے آتے ہیں جب کسی نظم کی تشریح کر رہے ہوں تو ان سے بڑا شارح کوئی نظر نہیں آتا۔ کسی بھی شاعر کے کلام اور اس کے الحاقیات اور حالاتِ زندگی لکھتے وقت

ان کی تخلیقی صلاحیتیں بلندی پر پہنچ کر کام کرتی ہیں اور وہ ایک عظیم و مستند و معتبر محقق نظر آتے ہیں غرض کسی بھی عظیم کتاب کا جو بھی لازمہ ہوتا ہے، ضمیر صاحب اس کو برتتے ہیں اور اسی وجہ سے ان کی کتابیں نہ صرف موجودہ بلکہ آنے والی صدیوں کے لیے گنج گراں مایہ کی حیثیت رکھتی ہیں۔

کتاب کا نام ہے "شعرائے اُردو اور عشقِ علی" عشقِ علی بذاتِ خود کتاب کا ایک موضوع ہے تو اس پر جہاں جہاں سے بھی معلومات ملیں گی، وہ موضوع کا حق ہوں گی اور ان کا ادا کرنا مصنف پر لازم آتا ہے اور اس فرض کو بھی ضمیر صاحب نے بحسن وخوبی انجام دیا ہے۔ عربی اور فارسی شعرا کے ابواب میں جتنی دلچسپی اور تازگی ضمیر صاحب نے پیدا کی ہے، یہ ان کی قلم پر گرفت کا ایک بین ثبوت ہے، ورنہ عربی اور فارسی شاعری میں وہ تری اور تازگی نہیں ہے جو اُردو شاعری کا خاصہ ہے۔ ان ابواب کے ذیل میں انکشافات و معلومات ہیں۔ مثلاً حسان بن ثابت نے رسولؐ اللہ کے حکم سے شعر کہے اور ان کی ہجو گوئی پر رسول خوش ہوتے تھے، ان ہجویات کا نمونہ کتاب میں موجود ہے۔ حسان بن ثابت نے حضرت عمر کے سامنے شعر پڑھے اور ان کے منع کرنے پر ان کو بہترین جواب دیا (صفحہ ۸۱)۔ حسان بن ثابت کا کلام کیسے تالیف ہوا، کہاں سے چھپا، کس کس ملک میں اس کے قلمی نسخے موجود تھے وغیرہ جیسے تحقیقی پیراگراف بھی موجود ہیں۔ امام شافعی کا حُبِ علی اور ان کے مناقب، ابن ابی الحدید معتزلی کی مدح و عشقِ علی، ان تمام شعرا کو میر انیسؔ کا خراجِ عقیدت پیش کرنا، یہ اور ان جیسے پیراگراف اور ابواب بہت دلچسپ ہیں اور ان میں مزید وسعت بھی ذہن پر بوجھ نہ تھی۔ ان کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ ڈیڑھ سو صفحات ضائع کیے گئے ہیں، ادبی بددیانتی ہوگی۔

حضرت علی کی ذات والاصفات ہندوستان میں صدیوں سے اتحاد بین المسلمین کا

سبب رہی ہے اور ہر شیعہ و سنی شاعر اور ادیب حضرت علیؑ کی ذات سے متاثر ہوا اور ان کے مناقب لکھ کر بقائے دوام حاصل کرتا گیا، اور یہ بات مسلمہ ہے کہ عشق علیؑ ہی واحد موضوع ہے جو اتحاد بین المسلمین کا سبب ہو سکتا ہے، لیکن جب اس موضوع کو نزاعی بنایا گیا، تعزیہ داری اور اہل بیت اطہار کی فضیلت کو رد کرنے کے لیے تحفۂ اثنا عشریہ جیسی کتاب لکھ کر اتحاد ختم کرنے کی کوشش کی گئی تو عشق علیؑ ایک سیلاب کی مانند ابھرا اور کتب ہائے فضائل علیؑ کا ایک انبار لگ گیا۔ "عبقات الانوار" کے عنوان سے ضمیر صاحب نے تاریخ کتب ہائے فضائل علیؑ اور تاریخ شیعیت کے ایک باب پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور اس ذیل میں ایسی ایسی کتابوں کے نام آئے ہیں جو قارئین کے لیے یقیناً نئی ہوں گی، مثلاً: "نزہہ اثنا عشریہ"، "حسام الاسلام"، "احیاء السنہ"، "بوارق موبقہ"، "طعن الرماح"، "بارقۂ ضیغمیہ"، "ضربت حیدریہ"، "تشئید المطاعن" جیسی عظیم کتابیں منصۂ شہود پر آئیں۔

عشق علیؑ کے وجوب میں علامہ صاحب نے جا بجا قرآن و حدیث سے دلیلیں قائم کی ہیں اور شعرا کے کلام کو قرآن و حدیث سے سند عطا کی ہے۔ ان تمام باتوں سے یقیناً قارئین میں کتب بینی کا شوق اور بڑھے گا اور ہر شخص اپنے قلب میں عشق علیؑ کی بالیدگی محسوس کرے گا۔

اُردو ادب کی تاریخ میں تین دبستان ایسے ہیں جہاں سے اُردو پروان چڑھی: دکن، دہلی اور لکھنؤ۔ "دکن میں اُردو" (نصیر الدین ہاشمی)، "دہلی کا دبستانِ شاعری" (نورالحسن)، "لکھنؤ کا دبستانِ شاعری" (ابواللیث صدیقی)، یہ کتابیں اس کی دلیل میں کافی ہیں۔ دکن میں ولی دکنی کے بعد اُردو نے ارتقا کی طرف سفر شروع کیا، دہلی میں اُردو نے غالب اور داغ کی موجودگی میں اس سے آگے کی بات کی، جب لکھنؤ علم و

ادب کا مرکز بنا تو وہاں ناسخ کی فکر نے زبان کی تراش خراش کی، شاعری میں پیغام کو داخل کیا، پرانے افکار کو منسوخ کر کے جدت طرازی سے کام لیا اور انیس و دبیر تک آتے آتے اُردو کو وہ ارتقا حاصل ہوا کہ اُردو کو آج دنیا کی تیسری زبان کا درجہ حاصل ہے۔ اُردو ادب پر جو کتاب بھی لکھی جاتی ہے، اس میں ان تین دبستانوں کے حوالے سے بات کی جاتی ہے۔ یہ اور بات ہے کہ آگرے میں نظیر اکبرآبادی ہیں یا لکھنؤ سے امیر مینائی اور دہلی سے داغ رام پور آجائیں، بلگرام میں صفیر بلگرامی ہوں، امروہہ میں سعادت امروہوی ہوں یا دو، چار شاعر لٹ پٹ کر عظیم آباد چلے جائیں، اکبرالہ آباد میں ہوں یا حسیر شکوہ آباد میں، اسی طرح کلکتے، مدراس، اورنگ آباد، چاند پور وغیرہ میں اگر کوئی ایک شاعر موجود ہے تو اس کا ذاتی اور انفرادی ذکر ہوگا نہ کہ اس کے شہر کو ایک دبستان کا درجہ دے دیا جائے۔ مثلاً عظیم آباد، شاد عظیم آبادی کی وجہ سے مشہور ہے لہٰذا اس کا ذکر شاد عظیم آبادی کی وجہ سے ''شعرائے اُردو اور عشق علی'' میں موجود ہے۔ رہی کاٹھیاواڑی، گجراتی، پوربی، دیہاتی، سندھی ملنگ اور دوسرے لوگوں کا ذکر نہ ہونے کی بات تو یہ انتہائی کمزور اعتراض ہے اور شاید معترض نے کتاب کا نام پڑھے بغیر ہی کتاب کا مطالعہ شروع کیا۔ وہ مطلع ہوں کہ کتاب کا نام ''شعرائے اُردو اور عشق علی'' ہے لہٰذا اس میں اُردو شعرا کا ذکر ہی آئے گا، اور فاضل معترض سے درخواست ہے کہ وہ کاٹھیاواڑی، گجراتی اور سندھی شعرا پر اس تحقیقی کام کا آغاز کریں، کیونکہ اُردو کی بلندی، رنگارنگی اور وسعت میرے خیال سے ضمیر صاحب کو فرصت نہ لینے دے گی کہ وہ اُردو کے علاوہ کسی اور زبان کی بات کریں۔

''شعرائے اُردو اور عشق علی'' اس وجہ سے بھی ایک عظیم اور قیمتی کتاب ہے کہ اس میں کئی شعرا کا غیر مطبوعہ کلام شامل ہے۔ جن شعرا کا غیر مطبوعہ کلام ہے، ان میں

نظم طباطبائی کا ایک غیر مطبوعہ قصیدہ ہے۔

سرور وعیش آگے بڑھ چلے ہیں لامکاں ہو کر
فلک پیچھے رہا جاتا ہے گردِ کارواں ہو کر

میرزا ذاکر حسین یاس لکھنوی کا غیر مطبوعہ قصیدہ شاملِ کتاب ہے:۔

ہے ازل سے مرے دل کو کسی محبوب کی چاہ
چاہ بھی وہ جو دکھاتی ہے مجھے صورتِ چاہ

آرزو لکھنوی جیسے عظیم شاعر کا غیر مطبوعہ کلام بھی کتاب میں موجود ہے۔ یہ قصیدہ آرزو نے جب کہا جب وہ اٹھارہ سال کے تھے:۔

ہمیشہ وصف لکھ کر تیزیِ شمشیرِ حیدرؑ کا
دمِ تحریر لیتا ہوں قلم سے کام خنجر کا

ثاقب لکھنوی کے غیر مطبوعہ قصائد بھی اس کتاب میں شامل ہیں:۔

خزانہ تھا مسرت کا ملالِ ابرِ باراں میں
اگے اشکوں سے لیکن پھول کھلتے ہیں گلستاں میں

☆ ☆ ☆

پلہ نہ جھکا اوج سے بھی چرخِ بریں کا
کچھ خاک کے ذرّوں سے بڑھا وزن زمیں کا

☆ ☆ ☆

وہ آ گئیں صراحیاں شرابِ لالہ فام کی
امانتیں لیے ہوئے قدح کشوں کے نام کی

☆ ☆ ☆

دو وقت آکے پھر گئے نہیں یہ بات کام کی
یہ کیا غضب ہے، ساقیا! نہ صبح کی، نہ شام کی

اس قصیدے کے تین خوبصورت شعر ملاحظہ ہوں:-

سوار دوشِ مصطفیٰ علی ہیں آج، اے حرم!
جہاں میں بات رہ گئی ترے بلند نام کی
جدارِ کعبہ جھک چلی تھی کفر کے دباؤ سے
پناہِ دیں کو بھیج کے خدا نے روک تھام کی
صنم پرستیاں مٹیں ، خدا پرست آگیا
بن آئی مدتوں کے بعد مسجد الحرام کی

اس کے علاوہ ثاقب لکھنوی کی کچھ رباعیات کو بھی پہلی مرتبہ کسی کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ ایک خوبصورت رباعی ملاحظہ ہو:

کس طرح سنبھالے قلب ہے نوش اپنا
دل کس لیے ظاہر نہ کرے جوش اپنا
اللہ رے ! مولودِ حرم کی الفت
کعبے نے بھی پھیلا دیا آغوش اپنا

میر حسن کی چند غیر مطبوعہ غزلیں بھی کتاب کی زینت ہیں۔

امیر خسروؔ کے دین و مذہب اور ان کے نظریات کے متعلق مختلف کتب میں مباحث موجود ہیں اور ان کے کلام میں الحاق کر کے ان کے نظریات کو غلط انداز سے دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے قارئینِ اردو ادب پر اس گتھی کو سلجھا کر ایک احسانِ عظیم کیا ہے۔ امیر خسروؔ کی دریافت شدہ تصانیف کی تعداد تیس (۳۰) ہے اور

دریافت شدہ اشعار تیس ہزار ہیں۔ نثری تصنیفات میں بھی انھوں نے مولا علی کے فضائل بیان کیے ہیں جن کی مثالیں ''شعرائے اردو اور عشقِ علی'' کے صفحہ ۲۹۱ پر موجود ہیں۔ طوطیِ ہند امیر خسرو موسیقی کے ماہروں میں سے تھے۔ محفلِ سماع کے لیے انھوں نے کئی راگ ایجاد کیے جن میں سب سے مشہور و معروف راگ حضور کی ایک حدیث جو حضرت علی کی فضیلت میں ہے ''من کنت مولا فھذا علیٌ مولا'' پر بنایا گیا ہے۔ اس حدیث کو راگ میں بٹھایا اور آج تک ہر محفلِ سماع کا آغاز امیر خسرو کے اسی راگ سے ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ وروان بحر میں محفلِ سماع کے لیے منقبتیں کہی ہیں:۔

امیر المومنین را می پرستم
امام المتقین را می پرستم

اس کے علاوہ امیر خسرو کے دو بیت (قطعات) بھی غیر مطبوعہ اس کتاب میں شامل ہیں۔ امیر خسرو کو فارسی زبان پر بھی عبور حاصل تھا اور انھوں نے مندرجہ ذیل مطلعوں کے ذیل میں بہترین قصائد حضرت علی کی شان میں کہے:۔

بیچارے بندۂ مومن بہ مہر خواجۂ قنبر
امام حاضر و غائب امیر المومنین حیدرؑ

☆ ☆ ☆

سزاوار خلافت در تمامی مشرق و مغرب
نمی دانم کسے غیر نمید انم علی ابنِ ابی طالبؑ

کتاب ''شعرائے اردو اور عشقِ علی'' کا ایک خاص وصف جو اسے ادب کی دوسری تمام کتابوں سے ممتاز و سرفراز کرتا ہے، وہ ''محمد قلی قطب شاہ'' اور ''ملا وجہی'' کے ابواب ہیں۔

"قلی قطب شاہ شیعہ مسلک کے پیرو تھے۔ انھوں نے اپنی تخت نشینی کے فوراً بعد اپنے سکے پر علم حضرتِ عباسؑ کے نشان کا اضافہ کیا"۔ "انھوں نے گولکنڈہ میں حسینی علم بھی ایستادہ کیا" عاشور خانے کی وسطی محراب میں ایک کتبہ لگوایا گیا جس میں بادشاہ نے اپنا نام "غلام علی" لکھوایا ہے" (بحوالہ شعرائے اُردو اور عشقِ علی)

یہی عقائد و نظریات تھے جن کی وجہ سے ادب کے ناقدین اور تبصرہ نگاروں نے کبھی بھی قلی قطب شاہ کا ذکر احترام سے نہیں کیا۔ جب بھی ان کے بارے میں جملے لکھے گئے، اس انداز سے لکھے گئے: "سلطان محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ کا پانچواں بادشاہ تھا" یا "محمد قلی قطب شاہ شیعہ عقائد کا پیرو تھا" وغیرہ۔ علامہ ضمیر اختر نقوی "شعرائے اُردو اور عشقِ علی" میں پہلی بار اس لہجے کو شائستہ آداب تحریر دیا اور محمد قلی قطب شاہ کا ذکر اس انداز سے کیا:

"سلطان محمد قلی قطب شاہ گولکنڈہ کے پانچویں بادشاہ تھے"، یا "محمد قلی قطب شاہ شیعہ عقائد کے پیروکار تھے" وغیرہ، مُلّا وجہی کے ساتھ بھی یہی رویہ قبل ازایں رکھا گیا، ان کے ساتھ روا رکھے گئے اس لہجے کو بھی ضمیر صاحب نے ادبانہ انداز سے تحریر کیا ہے۔

خواجہ الطاف حسین حالی کا ذکر "شعرائے اُردو اور عشقِ علی" میں عشقِ علی کے حوالے سے یقیناً اچنبھا ہوگا، کیونکہ انھوں نے خصوصیت کے ساتھ کوئی ذکر مولائے کائنات کا نہیں کیا، لیکن جیسے پہلے بتایا جا چکا کہ ادب کی ان ہستیوں کو شہرت ہی جب ملی جب انھوں نے اہلِ بیتِ اطہار سے تمسک اختیار کیا اور ان کے مناقب لکھے، گو حالی کے نواسے خواجہ غلام الثقلین مرحوم کے مطابق "حالی کے والدین شیعہ تھے، بچپن ہی میں والد کا انتقال ہو گیا۔ حالی نے اہلِ سنت والجماعت میں تعلیم پائی"

(بحوالہ شعرائے اُردو اور عشقِ علی)

حالی نے حضرت علیؑ کے چند نعتیہ اشعار کا اُردو ترجمہ کیا ہے۔ یہ اشعار ہجرت نبویؐ سے متعلق ہیں جن کا منظوم ترجمہ کتاب کے صفحہ ۸۳۶ پر درج ہے۔ حالی اہل بیتِ رسولؐ کی عظمت و بزرگی و مرتبہ کے قائل تھے اور انھوں نے اپنی مسدس، مثنوی اور غزلوں میں ذکر آلِ رسولؐ کو ضروری جانا ہے۔ حالی کا ایک خوبصورت شعر ملاحظہ ہو:-

جو پوچھے کوئی مَل اتی فی علی؟
تو کہہ دو کہ ہاں! مَل اتی فی علی

(بحوالہ شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ)

"شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" میں شعرائے اُردو کے غزلیہ کلام سے زیادہ مثالیں لی گئی ہیں اور سلاموں کو شامل نہیں کیا گیا ہے، مرثیے کا ایک مختصر باب شامل کر دیا گیا ہے تا کہ اس کام کی طرف ادیبوں کی توجہ ہو جائے۔ مرثیہ اور منقبت علیؑ ایک بہت بڑا موضوع ہے اور اس کے لیے علیحدہ کتاب کی ضرورت ہے، یہاں اس باب کا مقصد غالباً یہ ہے کہ مرثیہ جس نے اُردو زبان و شاعری کو بلندی، پاکیزگی اور وسعت عطا کی، وہ بھی عشقِ علیؑ کے موضوعات سے بھرا پڑا ہے۔ اُمید ہے کہ جدید مرثیہ گو اس طرف توجہ دیں گے اور کوئی قابلِ ذکر تخلیق مولائے کائناتؑ کے فضائل کے حوالے سے جدید مرثیوں میں بھی نظر آئے گی۔

شعرائے ماسبق نے اپنی غزل کے مقطعوں میں جا بجا ذکرِ علیؑ کیا ہے اور اس کے علاوہ غزل کے شعروں میں کسی نہ کسی جہت سے مولائے کائنات کا ذکر آ جاتا ہے۔ مثالیں پیش کرنے سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ ادب کی کسی کتاب میں بھی جب کسی ادیب کا کوئی جملہ نقل کیا جاتا ہے تو اس ادیب کے ہی تمام حروف و الفاظ لکھے جاتے ہیں اور ان میں کمی و بیشی نہیں کی جاتی، اسی طرح اگر کسی شاعر کا کلام دیا جا رہا ہو تو اس کو

یعنہٖ جس طرح شاعر نے کہا اس طرح ہی دیا جاتا ہے۔ اس کا کوئی شعر تبرائی یا اختلافی کہہ کر نکال دینا یا اس میں کچھ بڑھا دینا ادبی بددیانتی ہوتی ہے۔ مصنفین اور محققین یہاں تک خیال کرتے ہیں اگر کسی شاعر کا کلام کسی قلمی نسخے سے نقل کیا جارہا ہو اور اس میں چند الفاظ سمجھ میں نہیں آرہے ہوں تو اس کی جگہ خالی چھوڑ دی جاتی ہے اور اپنی طرف سے اس جگہ کوئی چیز داخل نہیں کی جاتی۔ لہٰذا کتاب "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" میں جن GIANTS OF URDU LITERATUER کا ذکر ہے، ان کی ہیبت، جلالت اور منزلت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ان کا کلام تحریر کیا جائے ، اور اس میں سے وہ شعر نکال دیے جائیں جو کسی کی دانست میں اختلافی ہوں۔ ادب میں کچھ بھی اختلافی اور اتفاقی نہیں ہوتا۔ ادب، ادب ہوتا ہے اور جو چیز ادب میں داخل ہو جائے، پھر تا قیامت اسے کسی قسم کا الزام دے کر باہر نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی بہترین مثال سوداؔ کی ہے۔ سوداؔ کا کلام ہجو گوئی سے بھرا پڑا ہے اور ناقدین نے سوداؔ کے بارے میں یہی جملے لکھے: "سوداؔ کو ادب میں ہجو گوئی کے حوالے سے بڑی شہرت حاصل ہے"۔ سوداؔ کے بعد ہجو گوئی بھی ایک فن بن گیا۔ کتاب ہٰذا میں کچھ مسائل اس ہجو گوئی کے حوالے سے حل کیے گئے ہیں، اس سلسلے میں "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" کا صفحہ نمبر ۲۱۱ ملاحظہ ہو۔

عشقِ علیؑ کا تعلق شیعوں سے ہی نہیں بلکہ ہر فرقہ اور ہر مسلک اس کا قائل ہے اور اس بحرِ ذخار میں ڈوبا ہوا ہے اور ان سب کی مثالیں "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" میں موجود ہیں۔ اس ضمن میں جو مباحث شیعہ عقائد سے متعلق کتاب ہٰذا میں کی گئی ہیں، ان کی خصوصیت کے ساتھ شدید ضرورت تھی۔ لاہور سے ایک انسائیکلوپیڈیا "دائرہ معارفِ اسلامیہ" کے نام سے نکلا ہے۔ اس کے "ش" والے حصے میں لفظ "شیعہ" کے

ذیل میں جو تفصیل ہے، اس کا ایک جملہ یہ ہے: ''شیعہ حقیقتاً ایک سیاسی فرقہ تھا، اور اس کا وجود حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؑ کے زمانے میں سیاسی وجوہات کی بنا پر عمل میں آیا'' (دائرۂ معارف اسلامیہ پنجاب یونیورسٹی، جلد ۱۲، صفحہ ۹۲)۔ اب اس مملکت میں جس کا بانی قائداعظم محمد علی جناح جیسا اثنا عشری شیعہ ہو، جس کی تشکیل و استحکام میں راجا صاحب محمود آباد جیسے شیعہ رئیسِ اعظم شخص کا کروڑوں روپیہ خرچ ہوا ہو اور جس کے پیسوں سے افواج پاکستان نے ایک عرصے تک پیٹ بھرا ہو، ابنِ حسن جارچوی اور سید محمد دہلوی جیسے علما تحریک و تشکیلِ پاکستان میں شریک تھے اور ان کے علاوہ ہندوستان کی شیعہ ریاستوں کے لاکھوں عوام کی کدوکاوش تشکیلِ پاکستان کے سلسلے میں شامل رہی اور انھوں نے اس تحریک کے لیے اپنا خون پسینہ بہایا اور اس ملک میں لکھی جانے والی ایک تصنیف میں شیعوں کے بارے میں یہ لکھا جا رہا ہو ''تفو بر تو، اے گردشِ دوراں! تفو''۔ لہٰذا ''شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ'' میں ادب کے حوالے سے اُردو کے شاعرانِ اعظم کے عقیدوں کے حوالے سے اور شیعی عقائد پر تفصیلی بحث کر کے علامہ صاحب نے تمام ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا جواب بھی دیا ہے۔ اس ذیل میں عقائد الشیعہ کے حوالے سے ''لکھنؤ کا تمدن اور مذہب'' کے عنوان کے ذیل میں تفصیلی بحث کی گئی ہے۔

بات بہت طویل نہ ہو جائے اس لیے گفتگو کو اسی جگہ واپس لاتا ہوں یعنی کتاب میں شاعروں کی غزلوں اور مقطعوں میں محبتِ علیؑ کا اظہار، طوالت کے پیشِ نظر چند مثالوں پر اکتفا کروں گا۔

شیخ امام بخش ناسخ:-

پیشتر کعبہ ہی تھا، قبلہ بھی تجھ کو کر دیا
اے حرم! تجھ میں جو فخرِ مرسلاں پیدا ہوا

مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ:۔

غالب ! ہے رتبہ فہم تصور سے کچھ پرے
ہے عجز بندگی جو علی کو خدا کہوں

میر تقی میرؔ:۔

جو حیدری نہیں، اسے ایمان ہی نہیں
ہو گر شریف مکہ مسلمان ہی نہیں

☆ ☆ ☆

حاصل ہے، میر ! دوستیِ اہل بیت اگر
تو غم ہے کیا نجات کے اپنی حصول کا

شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ

نکلے یہ صبح حشر تو رنگ اس کا جوں شفق
ہو سرخ دوستی سے محمدؐ کی آل کی

☆ ☆ ☆

زبان ریختہ بھی کی زبانِ پارسی اس نے
محبت ذوق کو از بسکہ ہے شاہِ ولایت سے

علامہ محمد اقبالؔ:۔

بے جرأتِ رندانہ ہر عشق ہے روباہی
بازو ہے قوی جس کا، وہ عشق یداللٰہی

☆ ☆ ☆

دل میں ہے مجھ بے عمل کے داغ عشق اہل بیت
ڈھونڈتا پھرتا ہے ظل دامنِ حیدرؑ مجھے

شبیر حسن خاں جوشؔ :-

تیرا ہی کرم ہے کہ یہ جوشِ وہم سوز
اس کفر پہ بھی مشعلِ ایماں ہے ، یا علی !

یاسؔ یگانہ چنگیزی جیسا بڑا غزل گو شاعر جس پر غزل کا تا حال اختتام ہو چکا، اس شاعر کا بھی ذکر کتاب میں موجود نہیں، کیونکہ یگانہ کے صرف دو اشعار کے علاوہ کوئی قابلِ ذکر تخلیق عشقِ علی کے حوالے سے موجود نہیں ہے۔

قارئین کو معلوم ہونا چاہیے کہ ضمیر صاحب کی کتابوں میں ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ ہر کتاب اپنی ما سبق کی ایک نئی کڑی ہوتی ہے۔ ضمیر صاحب نے پچھلے "انجم" میں نجم آفندی کے حالات و واقعات اور شاعری پر تفصیلی مواد فراہم کیا ہے۔ اس کے علاوہ پاکستان اور ہندوستان میں نجم آفندی پر جو پی ایچ۔ڈی ہو رہے ہیں، ان کا سارا مواد ضمیر اختر نقوی نے ہی فراہم کیا ہے۔ نجم آفندی اپنی وفات سے قبل اپنا سارا کلام مع اپنے حالات زندگی کے ضمیر صاحب کے سپرد کر گئے تھے۔ اس میں رباعی، مثنوی، سلام، قصائد، نظمیں، سب کچھ شامل ہے۔ نجم آفندی پر جو کچھ ضمیر اختر صاحب لکھ سکتے ہیں، ان سے بہتر کوئی نہیں لکھ سکتا، میں خود ضمیر صاحب کی تالیف کی ہوئی کتاب نجم آفندی پر ایک مکمل کتاب کا مسودہ دیکھ چکا ہوں جو عنقریب شائع ہوگی، لہٰذا میں یہ سمجھتا ہوں کہ ضمیر صاحب کی ہر کتاب ایک دوسرے سے مربوط ہوتی ہے۔ "میر انیس...... حالات و واقعات"، "خاندان میر انیس کے نامور شعرا" "اردو غزل اور کربلا" "دبستانِ تاریخ" ہر کتاب کا دوسری سے ربط خاص ہے جس کا ایک صاحب فہم قاری ہی ادراک کر سکتا ہے۔

عربی لغت میں تنقید کے معنی ہیں مرغی کا اپنے پنجوں سے مٹی کرید کر بکھیرنا اور اس

میں سے دانہ چننا۔ یوں کہہ لیجیے کہ مٹی میں سے گوہر کی تلاش کرنا تنقید کہلاتا ہے۔
کتاب ''شعرائے اردو اور عشقِ علی'' کی حیثیت بیک وقت تنقیدی و تحقیقی ہے اور اس میں کوئی بھی SUBSTANDARD شاعر شامل نہیں ہے۔ ہر شاعر کا اپنے عہد میں اور آج تک ایک مقام اور مرتبہ ہے۔ اور یہ کہہ دینا کافی ہوگا کہ اس کتاب میں جن شعرا کا ذکر کیا گیا ہے، وہ اردو ادب کے لعل و زمرد و عقیق ہیں اور ان کے کلام کا معیار وہ ہے جس پر حرف گیری نہیں کی جا سکتی اور نہ تنقیص کا کوئی پہلو نظر آتا ہے۔
عشقِ علی کے موضوع سے ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو یہ کتاب اردو شعرا کا بے مثل اور گراں قدر انسائیکلو پیڈیا ہے۔

جعفر زیدی (فرزند فیض بھرتپوری)

۲۶ اپریل ۱۹۸۱ء ... از افریقہ

''آپ کا یورپ کے ممالک کا سفر اور اس دوران مجالس جو آپ نے پڑھیں، میں سننا چاہتا تھا۔ انشاء اللہ واپسی پر چھٹیوں میں اطمینان سے گفتگو ہوگی اور میں وہ تمام مجالس سننا چاہتا ہوں جو آپ نے مختلف ممالک میں جا کر پڑھی ہیں۔ بھئی یہ ضرور تحریر کریں جو انٹرویو آپ کا BBC London سے نشر ہوا اس کا ٹیپ کہیں سے دستیاب ہو سکتا ہے یا نہیں۔ واقعی یہ ایک سند ہے اور اس سفر کا حاصل بھی ہے۔ اس لیے کہ تقریر سے زیادہ مرثیے سے محبت آپ کا خاصہ ہے۔ اس دور میں مرثیہ نہ لوگ سمجھتے ہیں نہ شوق سے سنتے ہیں اور نہ اس انداز میں کہتے ہیں۔ مرثیے کے لیے سخت ترین دور ہے اس دور میں اس صنفِ سخن کو سینے سے لگائے رکھنا ''کارے دارد'' ہے۔ میں ان مراثی کی زیارت نہ کر سکا جو برٹش میوزیم سے آپ لائے ہیں۔ میں چھٹیوں میں پہلا کام یہی کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کی مجالس سنوں اس کے بعد بچو اور جوش کے مرثیوں پر تبصرے دیکھنے کی خواہش ہے اب یہ کام وطن پہنچ کر ہی ہوگا انشاء اللہ۔

علامہ ناصر مہدی الرضوی (فرزند مولانا محسن نواب مرحوم محسن الملت)

مدحتِ علیؑ کا دُرجِ بے بہا

صاحب نہج البلاغہ کی مدح کے بکھرے ذخائر سے مدحت کے گہرِ آب دار جس عرق ریزی سے ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب نے "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" کے دُرجِ بے بہا میں محفوظ کر دیے ہیں، اس کے لیے وہ قابلِ صد مبارک باد ہیں۔

"شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" پر نقد و نظر اور اتنے کم وقت میں مگر کتاب کے مطالعے نے میرے شعور میں کیف، شدت اور وسعت کا وہ اظہار دے دیا جو اپنی ادائگی سے بے نیاز ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی اس تحقیقی کاوش میں ایک انضباطی اصول (REGULATIVE PRINCIPLE) کی کارفرمائی ہے۔ اس میں ثنویت (DUALISM) نہیں بلکہ موضوعیت ہے جو ایک سچے محقق کی پہچان ہے۔

موضوعِ کتاب چھ ابواب اور ایک خصوصی باب پر مشتمل ہے۔

پہلا باب: قرآن میں حضرت علیؑ کے فضائل اور منقبت کے محرکات۔

دوسرا باب: عربی شاعری اور مدحتِ علیؑ

تیسرا باب: فارسی شاعری اور ثنائے علیؑ

چوتھا باب: اُردو منقبت نگاری کا ارتقا۔ اس باب میں اودھ کے حکمرانوں، خصوصاً شاہِ اودھ "نصیر الدین حیدر نے ائمہ طاہرینؑ کی سیرت پر محفلیں منعقد کر کے اسلامی

تہذیب کو محفوظ کر دیا" کے عنوان سے بڑی پُرمغز تحقیق کی گئی ہے۔ ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے زوال کے بعد اسلامی ثقافت کو جو انحطاط ہوا تھا اور مسلم اقلیت ہندو اکثریت کے رسم و رواج کو اپنا رہی تھی، اس کو کس خوش اسلوبی سے دوراندیش بادشاہ نے مسلم ثقافت کے رنگ میں رنگ دیا اور ہندو اکثریت بھی مسلمانوں کے تہوار میں شریک ہونے لگی۔

پانچواں باب: "شعرائے اُردو اور عشقِ علی" ہے جو اصل کتاب کا موضوع ہے۔

چھٹا باب: اُردو مرثیہ شعرا اور مدحتِ علی۔

خصوصی باب: میر انیسؔ اور حضرت علی کی مدحت۔

ڈاکٹر صاحب نے "شعرائے اُردو اور عشقِ علی" میں مندرج ہونے والے تقریباً ہر شاعر کی، چاہے وہ دبستانِ دہلی، دبستانِ لکھنؤ سے تعلق رکھتا ہو، حضرت علی سے عقیدت اور ارادت کے پس منظر میں اس کے حالاتِ زندگی بھی قلم بند کیے ہیں جو اس امر پر مبنی ہیں کہ عربی، فارسی اور اُردو کے نامور شعرا کے ممدوحین میں بعد ختم الرسل حضرت علی کا نام نامی سرِ فہرست ہے۔ عشقِ علی کی حد نہیں! مدحت کی انتہا نہیں! ایک پردہ اٹھتا ہے تو ہزار پردے نظر آتے ہیں۔ شخصیت کے حوالے سے حقیقت کا ادراک کرنے والوں نے شخصیت کو شکست کھاتے دیکھا تو اس وہم میں گھر گئے کہ شخصیت کے ساتھ حقیقت بھی شکست خوردہ ہے، مگر حضرت علی کی شخصیت ماورائے فہم شخصیت ہے، وہ شاہد و مشہود کی وہ شخصیت ہیں، جس کو صوفیائے کرام نے اپنے صوفیانہ ادب میں اتحاد سے تعبیر کیا ہے یعنی وجودِ مطلق کا شہود اس طرح کہ تمام موجودات ذاتِ حق کے ساتھ متحد ہیں۔ اور خود ربّ العزت نے حضرت علی کو شاہد منہ فرمایا (سورۂ ہود، آیات ۱۷) ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی ایک تاریخ ساز محقق ہیں۔ فاضل محقق کی تحقیق جن نگاہوں سے گزر کر نظم و نثر کا ہر حصہ

ایک ادبی شہ پارہ بن جاتا ہے۔ تاریخی سیاق کی شہادت اور قدرآفرینی کا ایسا حسین ارتکاز (ATTENTION) ڈاکٹر ضمیر اختر صاحب کی تحقیق میں شامل ہے جو ارتقائے مسلسل کی طرف رواں دواں ہے۔

"شعرائے اُردو اور عشقِ علی" میں اُردو کے علاوہ فارسی اور عربی کے شعرا کا کلام بھی اپنے اسی موضوع کے اعتبار سے بہت وسیع ہے، اس طرح کتاب میں بظاہر جامعیت نہ ہو کر موضوعیت زیادہ ملتی ہے مگر بہت سا کلام شاید نقشِ ثانی کے لیے چھوڑ دیا گیا ہے۔ ڈاکٹر ضمیر اختر کا حُسنِ تحریر اس بات کی غمازی کرتا ہے کہ موصوف مرکزِ زبان و ادب لکھنؤ کی ایک منفرد نمائندہ شخصیت ہیں۔ خدا لکھنؤ کو اور ڈاکٹر ضمیر اختر کو آباد رکھے!

وحید الحسن ہاشمی

۹ ستمبر ۱۹۹۵ء......لاہور

گرامی قدر ضمیر اختر صاحب......تسلیم!

آپ کی محبت و شفقت کا میں شروع ہی سے معترف ہوں شعرائے حق کی سرپرستی علمائے فن کا وتیرہ رہا ہے۔ آپ کے اس عمل نے مولانا سبطِ حسین جونپوری مرحوم اور مولانا محسن نواب مرحوم کی یادوں کو از سرِ نو تازہ کر دیا ہے۔

آپ کا عشرہ قائم کرنا اور مرثیہ کہنا اور دوسرے اصحاب سے کہلوانا بڑی سعادت ہے اس طرح مرثیے کی کھوئی ہوئی عظمت واپس آجائے گی۔ ماجد سلمہٗ رزمی سلمہٗ دونوں نوجوان شعرا ابھر رہے ہیں۔ اگر آپ کی تربیت شامل حال رہی تو یہ دونوں خوب خوب چمکیں گے۔ سردار نقوی اور شاداں دہلوی بھی آپ کے عشرے میں شریک ہو جائیں تو بہتر ہے......فقط......وحید الحسن ہاشمی

محمد علی سیّد

بین الکائناتی محفلِ منقبت

"شعرائے اردو اور عشقِ علیؑ" کتاب نہیں، ایک نہایت پاکیزہ، پُرشکوہ، عظیم الشان، بین الاقوامی بلکہ بین الکائناتی محفلِ منقبت ہے جو مولائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی شان میں منعقد کی جارہی ہے۔ گزشتہ ڈیڑھ ہزار برس کے ہر دور ہر زمانے اور قبیلے کے بہت سے نام ور شاعر زبان ومکاں کی قیود سے آزاد ہو کر امیر المومنینؑ کے قدموں میں اپنے گل ہائے عقیدت نچھاور کرنے کے لیے یہاں جمع ہیں۔

اس محفلِ منقبت کا آغاز ربِ کائنات اللہ جل شانہٗ کے خصوصی پیغام سے ہو رہا ہے۔ اگرچہ رب العالمین خود بھی اس محفل میں موجود ہے، لیکن اس کا پیغام سردار ملائکہ حضرت جبرئیلؑ رحمۃ للعالمین، سردار دو جہاں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے پاس لائے تھے اور ان کے دربار دُربار سے اس محفل تک پہنچا ہے۔ یہ پیغام وہ ہے جو حکم کا درجہ رکھتا ہے اور جس پر خود کو تسلیم کر دینے سے دنیا و آخرت کی فلاح ممکن ہے۔ یہ پیغام:

"تمہارا ولی، اللہ ہے اور اس کا رسولؐ اور وہ ایمان دار ہیں جو نماز پڑھتے ہیں اور حالتِ رکوع میں زکوٰۃ دیتے ہیں"۔

یہ پیغامِ الٰہی نہ پہلا ہے، نہ آخری۔ امیر المومنینؑ کے بارے میں اس طرح کے پیغامات بار بار آتے رہے ہیں، حتیٰ کہ مفسرِ قرآن حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے کہا کہ اللہ کی کتاب میں جس قدر آیات حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی شان میں نازل ہوئی

ہیں، اتنی کسی کی شان میں نازل نہیں ہوئیں۔

مولانا ضمیر اختر نقوی نے جو محفل سجائی ہے، اس میں صرف شاعری نہیں، بڑے بڑے عالم، فاضل، مفکر، مجتہد، مرجع، مجدد، محدث، امام، صوفی، قلندر، درویش، عابد، زاہد مجذوب، قطب، ابدال، اولیا، دنیا کے بڑے بڑے بادشاہ، شہزادے، حکمراں، راجے مہاراجے، محل نشیں، سپہ سالار اور فوجی، سبھی جمع ہیں۔ مولا علیؑ کے یہ دیوانے شمع امامت کے پروانے اپنے اپنے جذبوں، عقیدتوں، محبتوں، ارادتوں کے مہکتے ہوئے رنگارنگ پھولوں کے گلدستے ہاتھوں میں تھامے دم بخود کھڑے ہیں۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ سوچ رہا ہے کہ۔

میں کیا ہوں فرشتوں کی طاقت ہے تو کیا ہے
یہ خاص وہ بندے ہیں کہ مداح خدا ہے

مولائے کائنات کے مداحوں کا ہجوم اتنا زیادہ ہے کہ محفل کا ایک بڑا حصہ میری نگاہوں سے اوجھل ہے۔ ہندی، سنسکرت، سندھی، گجراتی، پشتو، لاطینی اور انگریزی زبانوں کے شعرا غالباً اسی حصے میں کہیں موجود ہوں۔ اس محفل میں ہندوستان، پاکستان اور ایران کے گاؤں، دیہات اور قصبوں میں مدحت امیرالمومنینؑ سے سرشار ہزاروں، لاکھوں فقیر اور ملنگ نظر نہیں آرہے ہیں لیکن مولا علیؑ کے مداحوں کی نظر آنے والی تعداد بھی اس قدر زیادہ ہے کہ اس کے لیے مولانا ضمیر اختر نقوی صاحب مبارک باد کے مستحق ہیں۔ اس سے پہلے اتنی بڑی تعداد کبھی ایک جگہ جمع نہیں ہوئی۔

اس محفل کی نظامت کے فرائض مولانا ضمیر اختر نقوی کی قسمت میں لکھے تھے۔ ضمیر اختر نقوی کی نظامت نے محفل کا رنگ دوبالا کر دیا۔ محفل میں شریک بیشتر شاعر گزشتہ زمانوں سے تعلق رکھتے ہیں اور ایک عام سطح علم و مطالعہ رکھنے والا ان کے

بارے میں بہت کم جانتا ہے۔ ضمیر اختر نقوی صاحب بڑی ذمے داری کے ساتھ، بے حد دلچسپ، سادہ اور انتہائی آسان زبان میں نہ صرف شاعر کا تعارف کراتے ہیں بلکہ اس کے کلام کا اُردو ترجمہ بھی ساتھ ساتھ کرتے جاتے ہیں۔ یہ کام ضمیر اختر نقوی صاحب جیسے کثیر المطالعہ، ہمہ جہت عالم ہی کے لیے ممکن تھا۔

جس محفلِ منقبت کے شعرائے کرام کی تعداد سیکڑوں میں ہو، وہ چند گھنٹوں میں ختم نہیں ہوسکتی۔ پھر اس کے شعرا سیکڑوں ہیں تو سامعین وقارئین کی تعداد لاکھوں، کروڑوں سے متجاوز ہے، اس لیے یہ محفل برسوں جاری رہے گی۔ سامعین وقارئین بدلتے جائیں گے۔ یہ محفل جاری رہے گی حتیٰ کہ اس بابرکت محفل کے مہمانِ خصوصی ظہور فرمائیں کہ یہ محفل انھی کی سرپرستی میں انھی کی خوشنودی کے لیے برپا کی گئی ہے۔

تقریر وتحریر میں یہی فرق ہوتا ہے۔ تقریر کتنی ہی اچھی سہی، اس کے اثرات بہرحال محدود ہوتے ہیں۔ تحریر بامقصد ہو تو زمان ،مکان اور امکان کے لامحدود راستوں پر سفر کرتی رہتی ہے۔ محلے، گاؤں قصبے، شہر، ملک، انسان تہذیبیں، معاشرے اور نسلیں انھی تحریروں کے ذریعے زندہ رہتی ہیں۔ مولانا ضمیر اختر نقوی صاحب کی یہ کتاب ایک زندہ تحریر ہے اور مردہ روحوں کو زندہ کرنے کی صلاحیت سے مالا مال۔

حیدر نواب جعفری

۲۲؍اگست ۱۹۷۷ء..... لکھنؤ۔انڈیا

ضمیر میاں! یہ حقیقت ہے کہ میں نے آپ کا جیسا پُرخلوص انسان نہیں دیکھا۔ قدرت نے آپ کو علم کی دولت سے نوازا تو ساتھ میں اخلاق کو بھی آپ کی جاگیر بنادیا۔

آل محمد رزمی (ریسرچ اسکالر)

شاہکار کتاب

"شعرائے اُردو اور عشق علیؑ" علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی سعی پیہم کا نتیجہ ہے۔ آپ مذہبی، قومی، علمی و ادبی حلقوں میں تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ آپ اُردو کے نامور خطیب اور بلند پایہ محقق ہیں اور ایک خاص علمی اور تحقیقی مزاج کے حامل ہیں اور گزشتہ چونتیس سال سے علمی و تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں۔ یوں تو موصوف نے مختلف موضوعات پر قلم اُٹھایا اور اس میں شک نہیں کہ ہر میدان میں آپ کی رائے متوازن، وقیع اور بصیرت آمیز ہوتی ہے، لیکن آپ کی دلچسپی کا خاص موضوع مرثیہ۔ تاریخ اور ادب ہے۔ زیرِ نظر کتاب "شعرائے اُردو اور عشق علیؑ" میں آپ نے بارگاہِ مرتضوی میں خلوصِ دل کا خراج پیش کرنے والے شعرا کے نذرانے اور ان کے حالاتِ زندگی کا جائزہ لیا ہے۔ دنیا کا ہر اہلِ فکر و نظر اور انسان مشرب اس امر کا معترف ہے کہ حضرت علی علیہ السلام کی ذاتِ گرامی عالمِ اسلام بلکہ دنیائے انسانیت کا وہ بیش بہا سرمایہ ہے جسے اگر اسلام کے CANVAS سے لمحے بھر کے لیے ہٹا لیا جائے تو روحِ اسلام مضطرب ہو جائے گی۔ آپ اس معمورۂ عالم کی وہ عظیم اور منفرد شخصیت ہیں جن کی عظمت و بلندی، جامعیت و ہمہ گیری، جن کی سحر انگیزی و کشش، جن کے اوصافِ حمیدہ وصفاتِ جلیلہ، جن کے کمالِ علم اور عالمی و آفاقی برتری کے اپنے بے گانے، دوست دشمن، سبھی معترف ہیں اور کسی کو ان کی دیومالائی وسحر انگیز شخصیت اور ان کے بلند

امتیازات اور نمایاں خصوصیات سے انکار نہیں ہے۔

حضرت علی کی زندگی اور سیرت، نفسِ انسانی کے ایک ایک گوشے سے بڑی گہری وابستگی رکھتی ہے۔ ان کی تاریخ ساز شخصیت میں ایک ایسا جامع، ہمہ گیر اور بلیغ پیغام موجود ہے جو انسان کے جذبۂ سوز و گداز اور احساسات کے تاروں ہی کو نہیں چھیڑتا، اس کی عبرت پذیری کی قوتوں کو بھی جگاتا اور اس کے فکری نہاں خانوں میں بھی تلاطم پیدا کرتا ہے۔ حضرت علی کی سیرت تپتے ہوئے جذبات اور سلگتے ہوئے احساسات سے اس لیے رشتہ بدامن ہے کہ وہ خود بھی شہید ہیں اور اپنے خاندان کے بے شمار شہدا کے پیش رو بھی ہیں۔ آپ اور آپ کے خاندان کی خدا کی راہ میں تاریخ ساز جدوجہد اور قربانیوں کی داستانوں کا ایک نہ ختم ہونے والا طویل سلسلہ ہے۔ عرب کے معروف شاعر ابوالعلاء معری نے کیا خوب کہا ہے کہ "علی اور خاندانِ علی کا خون افق کا پیراہن بن گیا ہے جو صبح و شام شفق کی صورت میں نظر آتا ہے"۔ حضرت علی کی سیرت کا یہ پہلو جذبات میں جو طوفان پیدا کرتا ہے، اس کی مثال تاریخ میں کہیں نہیں ملتی۔ حضرت علی کی سیرت کو تخیل کی دنیا سے بھی الگ نہیں کیا جاسکتا اور طبقۂ شعرا جو معاشرے کے دیگر افراد کے مقابلے میں زیادہ حساس ہوتا ہے اور دوسروں کے مقابلے میں اس کی قوتِ تخیل و مشاہدہ بھی زیادہ ہوتی ہے۔ حضرت علی کی شخصیت و کمالات سے متاثر کیوں نہ ہوتا۔ شاعر ایک فن کار اور معاشرے کا اچھا تجزیہ نگار ہوتا ہے۔ شاعر کو اپنی جولانی اور پرواز کے لیے ایک وسیع میدان اور ایک پنہاور فضا اس سیرت میں ملتی ہے۔ شاعر کبھی ان کی شجاعت و بہادری کے کارناموں کو اپنی شاعری کا موضوع بناتا ہے اور کبھی ان کی جاں بازی، ایثار و قربانی کو موضوعِ سخن بناتا ہے۔

حضرت علی کی ذاتِ اقدس کو ہر شخص نے نامۂ بصیرت دیکھا۔ ان کی سیرت انسان

کی قوت فکر و تدبر سے بھی کچھ کم تعلق نہیں رکھتی۔ عرفان، ایمان، انسان، شریعت، طریقت اخلاق، معاشرت، وحدانیت، رسالت، اقتصادیات، حکومت، عدل و انصاف، علم و ادب، قرآن، ادب فقہ، کے باب میں آپ کی گراں قدر آرا کسی سے پوشیدہ نہیں۔ آپ نے ان مسائل پر جن خیالات کا اظہار فرمایا ہے، تاریخ انسانیت واسلام میں ان کو اولیت حاصل ہے، اور اہل سنت کے معروف عالم دین و دانش ور عباس محمود العقاد کے قول کے مطابق خلفائے راشدین میں حضرت علی شاید واحد شخص ہیں جنھیں حکما و فلاسفہ کے زمرے میں شمار کیا جاتا ہے۔

حضرت علی کی سیرت علم و ادب و فن کے بھی شانہ بشانہ چلتی ہے۔ وہ ایک عظیم فقیہ، بہترین شاعر اور بلند پایہ ادیب تھے۔ انھوں نے ادب و فن میں ایسی راہیں کھولیں جو ہزاروں سال گزرنے کے باوجود آج بھی مشعل راہ ہیں۔ آپ کے پاکیزہ فطری ادبی ذوق کی دنیائے ادب آج بھی اسی طرح ثنا خواں ہے، جس طرح چودہ صدی پہلے تھی۔ جذبہ واحساس، فکر و تدبر اور ادب و فن کے علاوہ نفسِ انسانی کے اور بھی بے شمار پہلو ہیں۔ حضرت علی کا نام ایک پرچم کی حیثیت رکھتا ہے، جس کے نیچے ہر مسلمان آکر کھڑا ہو جاتا ہے۔ یہ نام ایک ایسی صدا ہے، جو ہر طالب انصاف کی زبان سے نکلتی ہے۔

دنیا کا ہر غیر جانب دار شخص، ہر انصاف پسند، ہر حساس، ہر اہل فکر و نظر، ہر ماہر قانون، ہر محدث و مفسر، ہر مورخ و مصلح، ہر فلاسفر و سیاست داں، ہر مفکر و دانش ور، ہر شاعر و ادیب، حضرت علی کی سیرت وزندگی کے ہر گوشے سے کسی نہ کسی اعتبار سے وابستہ ہے، ان کی سیرت کا یہی وہ امتیازی نشان ہے جو دوسرے لوگوں کی سیرتوں میں کم ملتا ہے۔ ایک مورخ تو اس نشان کو ابھارنے میں کوتاہی کر سکتا ہے مگر قلوب انسانی اس سے رابطہ قائم کرنے کی کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیتے ہیں۔ ایک شاعر جب کسی شخصیت

کو اپنا موضوع سخن بناتا ہے تو اس کے تمام محاسن و خصوصیات، اس کے عمل و کردار، اس کی خوبیوں اور اچھائیوں کا کماحقہٗ احاطہ و احصا کرتا ہے اور تاریخ کے مطالعے و مشاہدے اور چھان پھٹک کے بعد اپنے ممدوح کی شان میں اپنے خیالات پیش کرتا ہے۔ ایک عالم، محدث، فقیہ جب کسی کے بارے میں اپنی رائے پیش کرتا ہے تو وہ مصادر، مآخذ اور روایات کے تواتر و تحقیق کو پیش نظر رکھتا ہے۔ ایک مورخ جب نفسِ انسانی کے مختلف گوشوں اور پہلوؤں کا تجزیہ کرنے بیٹھتا ہے تو اسے پھونک پھونک کر قدم رکھنا پڑتا ہے، کیونکہ نفسیاتی اسباب و عوامل کی گتھیاں ایک دوسرے سے کچھ اس طرح الجھی ہوئی ہے کہ انھیں آسانی سے کھولا نہیں جاسکتا۔ نفسیاتی اسباب و عوامل جتنے محدود اور باعتبار تعداد جتنے کم ہوں، منزل مقصود تک پہنچنے میں اتنی ہی سہولت ہوتی ہے۔ اگر کسی ایسے HERO کا تذکرہ ہو جو صرف فکر و تدبر، جذبات و احساسات کی سرحد سے گزر کر خیالی فضا میں پہنچ جائے تو مشکل اور بڑھ جاتی ہے، لیکن اگر کسی HERO کی سیرت نفسِ انسانی کے ان محدود گوشوں اور پہلوؤں کی حدوں کو پھلانگ کر لامحدود وسعتوں اور پنہائیوں میں داخل ہو جائے تو مرحلہ مشکل ترین اور مورخ یا محقق کی ذمے داریاں ناقابلِ بیان حد تک کٹھن ہو جاتی ہیں۔

حضرت علیؑ کی ذات والا صفات انسانیت کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ ہر مذہب کے اہلِ علم آپ کو آپ کے کمالات کی وجہ سے قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ آپ کی دیو مالائی و معجزنما شخصیت کو دیکھ کر آپ پر خدائی کا شبہ کرنے لگے بلکہ ایک فرقے نصیری نے تو آپ کو خدا مان لیا۔ حضرت علیؑ مسلمانوں کے فرقوں کے مذاہب فکر کا منبع و سرچشمہ ہیں اور ان تمام فرقوں کے لیے مرکز و محور کی حیثیت رکھتے ہیں جس کے اردگرد کسی نہ کسی نوعیت سے یہ سب لوگ گھومتے نظر آتے ہیں۔ مسلمانوں

کا شاید ہی کوئی فرقہ ہو جس کا معلم اوّل حضرت علیؑ کو قرار نہ دیا جا سکتا ہو یا جس کی بحث وتمحیص کا موضوع ان کی ذات نہ ہو۔ علمائے کلام وتوحید، علمائے تفسیر وحدیث، علمائے ادب وبلاغت، علمائے فقہ وشریعت، ان سب کے حضرت علیؑ بلا استثنا استاد تھے۔ حضرت علیؑ بہترین شاعر تھے، ان کے اندر شعر گوئی، فہم شعر، تنقید اور شعرا کے کلام پر تقابلی نظر کا ادیبانہ اور اعلیٰ جوہر بدرجۂ اتم موجود تھا۔ وہ کلام کے حُسن وقبح اور اس کے اتار چڑھاؤ اور شعر وشاعری کی نکتہ سنجیوں سے پوری طرح باخبر تھے۔

حضرت علیؑ کو جن علوم وفنون میں پیشوائی اور اوّلیت کا مقام حاصل ہے، وہ یہ ہیں:
توحید اسلامی، تفسیرِ قرآنی، قانونِ اسلامی، علم نحو اور فنِ انشا۔ یہی چیزیں درحقیقت اسلامی دائرۃ المعارف کی ٹھوس اور مستحکم بنیادیں ہیں۔ عدالت وقضا کے مسائل میں جہاں نصوص اور صریح احکام کا دامن تنگ ہوتا، حضرت علیؑ عربی زبان کے قواعد واصول بھی مرتب فرماتے حضرت علیؑ نہ صرف باب مدینۃ العلم تھے، بلکہ شجاعت میں بھی پورے عرب وعجم میں ان کا کوئی ثانی نہ تھا۔ حضرت علیؑ کا عسکری فن اس مردِ مجاہد اور بطلِ جاں باز کا فن تھا جو میدانِ حرب میں سے کفن باندھ کر پوری بے جگری کے ساتھ نبرد آزمائی کرتا اور اپنی شجاعت ودلیری کا نمونہ اور اسوہ قائم کرتا کہ عرفان کے مسئلے میں حضرت علیؑ کی تعلیمات چودہ صدی سے اہلِ سلوک وصوفیائے کرام اور درویش فقرا کے لیے مشعلِ راہ بنی ہوئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے تمام اولیائے اللہ اور صاحبِ سلوک انھیں شہنشاہِ ولایت قرار دیتے ہیں۔ اور اپنا سلسلہ امام حسنؑ وامام حسینؑ کے حوالے سے حضرت علیؑ سے ملاتے ہیں۔ علاوہ ازیں حضرت علیؑ کی معجز نما اور سحر انگیز شخصیت اور ان سے صادر ہونے والے معجزات وکرامات نے پوری دنیا کے مسلمانوں اور دیگر مذاہب کے علاوہ منکرین کو بھی حیرت زدہ کر رکھا ہے۔ اگر مسلمان ان کی شخصیت

وصفات اوران کی شجاعت وکرامات سے متاثر ہیں تو مستشرقین ان کی علمیت اور ہمہ گیر و جامع شخصیت سے مرعوب ہیں۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

تیرے حضور شمعِ امامت لیئے ہوئے
قدسی کھڑے ہیں دفترِ قدرت لیئے ہوئے

ادب کے ہر طالب علم نے، خواہ اس کا تعلق کسی زبان سے ہو، آپ کی پرعظمت شخصیت، آپ کے طرز زندگی، آپ کے اسلام وایمان کی کیفیت اور آپ کے مجاہدات اور جنگوں کے بارے میں غور وفکر اور گہرا مطالعہ کیا ہے اور اپنے اشعار میں آپ کی شخصیت، اوصاف، کمالات، رزم، عزم، علم وحکمت، شجاعت و بہادری، معجزات و کرامات اور مجاہدہ وشہادت کا تذکرہ کیا ہے اور اس بات کا اظہار واعتراف کیا ہے کہ امام علی عظمتوں، طہارتوں، تقدسوں اور مطلق احساسات کے گوناگوں انواع کے رب النوع کی حیثیت کے حامل ہیں۔ آپ کی شخصیت وہ بے نظیر شخصیت ہے کہ جس کے سامنے دوست محبت والفت کے ساتھ اور آپ کے دشمن اور مخالفین حیرت کے ساتھ کھڑے ہیں۔ آپ میدان جنگ ہی میں شجاع و دلیر نہیں تھے بلکہ ہر موقع ومقام پر دلیر تھے..... خلوص وصاف دلی، وجدان کی پاکیزگی، عظیم الشان قلبی سکون واطمینان میں، ستم گروں اور جابروں سے جنگ میں، ان تمام میدانوں میں سب سے بڑے دلیر تھے۔ آپ کی سرسبز وشاداب شخصیت بہار کا ایک ایسا جھونکا ہے جو لادینیت کے قید خانے میں بادِ صبا اور مادیت کی دھوپ میں شجرِ سایہ دار اور ملوکیت و کفر کے خزاں رسیدہ ماحول میں نوید بہار ہے۔ آپ کے دوستوں، آپ کے عقیدت مندوں، آپ کے چاہنے اور ماننے والوں، آپ کے غلاموں، مستانوں اور موالیوں نے آپ کے متعلق بہت کچھ لکھا ہے اور اپنی تحریروں سے کتب خانے بھر دیئے ہیں۔ اس کے ساتھ

ساتھ غیر اسلامی مفکروں اور دانش مندوں نے بھی اپنی فکر و بصیرت کے مطابق آپ کے حضور اپنا نذرانہ پیش کیا ہے اور اپنی عقیدتوں اور چاہتوں کا اظہار کیا ہے۔ یہاں ہم ان لاکھوں اقوال اور لاکھوں اشعار اور ان لاکھوں تحریروں کو پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ ہم صرف چند ناموں پر اکتفا کرتے ہیں: مشہور و معروف عیسائی مورخ جبران خلیل جبران، شبلی شمیل، جارج جرداق، میخائل نعیمہ، تامس کارلائل، ہارون کارادوو، گابریل دانگیری، نرسیسیان، سلمان کتانی ریز وغیرہم چوتھی صدی ہجری کے معروف عالم دین اور ادیب و شاعر علامہ سید شریف رضی کہتے ہیں۔

"حضرت علیؑ فصاحت کا سرچشمہ اور بلاغت کا مخزن و منبع تھے، فصاحت و بلاغت کی چھپی ہوئی باریکیاں آپ ہی سے ظاہر ہوئیں اور آپ ہی سے اس کے اصول و ضوابط سیکھے گئے اور خطیب و متکلم کو آپ کی مثالوں پر چلنا پڑا اور ہر واعظ بلیغ نے آپ کے کلام سے خوشہ چینی کی"۔

حضرت علیؑ کی ان صفات جلیلہ، اوصاف حمیدہ اور کمالات کا سرسری جائزہ پیش کرنے کا مقصد صرف یہ تھا کہ دنیا کے مختلف مذاہب اور مختلف زبانوں کے شعرا نے جو حضرت علیؑ کی مدح و منقبت کی ہے، انھوں نے کسی شاعرانہ تعلی سے کام نہیں لیا بلکہ علیؑ ایک انسان کامل، امین وحدت، تاریخ کی ایک زندۂ جاوید شخصیت و حقیقت ہیں۔

حضرت علیؑ کی حیات طیبہ کے مختصر مطالعے کے بعد ہم واپس اپنے موضوع کی طرف آتے ہیں۔ جیسا کہ ابتدا میں تحریر کیا تھا کہ علامہ ضمیر اختر نقوی نے یہ کتاب ۱۹۶۷ء میں تحریر فرمائی، اس وقت اس کتاب کی ضخامت دو سو صفحات تھی۔ ابھی یہ کتاب طباعت کے مرحلے میں داخل نہ ہوئی تھی کہ آپ نے میر انیسؔ اعلی اللہ مقامہٗ اور مرثیے

پر کام شروع کردیا۔ میر انیس کے بعد آپ نے مرزا دبیر اعلیٰ اللہ مقامہٗ پر اپنی تحقیق شروع کردی۔ بالترتیب اردو مرثیہ نگاری سے لے کر مراثی جوش ملیح آبادی تک ایک طویل عرصہ گزر گیا اور اس کتاب کو شائع کرنے کی نوبت نہ آئی۔ لیکن گاہ گاہ اس کتاب کی طرف بھی توجہ فرماتے رہے اور بتدریج اس کتاب کی ضخامت میں اضافہ ہوتا رہا اور علامہ موصوف نے بڑی دل جمعی اور لگن کے ساتھ ہنگامی بنیادوں پر شب و روز کی مساعی جمیلہ سے اس نامکمل کتاب کو مکمل کیا، لیکن اس عرصے میں اس کتاب کے سلسلے میں تحقیق و ماخذ و مصادر کی جمع آوری کا سلسلہ علی التواتر رہا۔

جہاں تک اس کتاب کا تعلق ہے میں پورے وثوق کے ساتھ یہ بات کہہ سکتا ہوں کہ اردو ادب کی تاریخ میں اس موضوع پر اتنی جامع و وقیع کتاب نہیں آئی جس میں تحقیق کا کماحقہٗ حق ادا کیا گیا ہو۔ علامہ ضمیر اختر نقوی کا اسلوب دل نواز اور موضوع ہمہ گیر ہے۔ انھوں نے اپنی تحریر کی وساطت سے اس موضوع کی کمیت و کیفیت میں قابلِ ذکر اضافہ کیا ہے اور ایک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے اس موضوع پر لکھی جانے والی کتابوں اور کہے جانے والے اشعار کا بڑی ژرف بینی سے مطالعہ کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے ایک غلط فہمی کا ازالہ بھی ہوتا ہے جو ہمارے ادبا، متقدمین اور عصر حاضر کے ادبا و نقاد نے پھیلا رکھی ہے اور منقبت اور مرثیے کو ایک کرنے کی عمداً یا غیر محسوس کوشش کی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے قارئین کرام پر یہ حقیقت آشکار ہو جاتی ہے کہ مرثیہ اور منقبت دو علیحدہ علیحدہ صنف شاعری ہیں اور دونوں کی شاعرانہ ترکیب و ہیئت ایک دوسرے سے قطعی مختلف ہے۔

منقبت:

منقبت میں اپنے ممدوح کی تعریف و توصیف بیان کی جاتی ہے، اس میں غم کا تاثر

نہیں ملتا۔ اس کا اسلوب غزل سے ملتا جلتا ہے۔ منقبت کی تکنیک اور ہیئت (FORM) وہی ہے جو غزل کی ہے، مطلع ہوتا ہے، قافیہ اور ردیف کا التزام کیا جاتا ہے، مقطع کا اہتمام ہوتا ہے، غزل کی مکمل تعریف ذرا سے تغیر کے ساتھ منقبت پر پوری اترتی ہے۔ جس طرح غزل کا ہر شعر اپنے اندر ایک جداگانہ مفہوم رکھتا ہے اور نہ اس میں تسلسل عیب ہے لیکن یہ کلیہ نہیں ہے۔ مختلف شعرا نے منقبت میں مختلف تجربے کیے ہیں۔ "منقبت" مثنوی اور مسدس کی شکل میں بھی کہی گئی ہے اور مخمس کی شکل میں بھی اور سلام و غزل کی ہیئت میں بھی۔ لیکن جہاں تک مرثیے کا سوال ہے، مرثیے اور منقبت کے موضوع جداگانہ ہیں اور اس سلسلے میں یہ غلط فہمی معروف دانش ور ڈاکٹر گیان چند جین، صدر شعبۂ اردو جامعہ عثمانیہ دکن بھارت نے پیدا کی۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں اس امر کا اظہار کیا کہ نعت اور منقبت علی ایک ہی چیز ہے اور ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ اسی سے غلط فہمی کی گنجائش بھی پیدا ہوئی کہ مرثیہ اور منقبت ایک ہی چیز ہے اور منقبت مرثیے کے سراپا کا حصہ ہے، جبکہ اردو زبان کا ایک معمولی طالب علم بھی جانتا ہے کہ نعت صرف اور صرف بانی اسلام خاتم النبیین سید المرسلین حضرت ختمی مرتبت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شان میں کہی جاتی ہے اور منقبت حضرت علی علیہ السلام اور دیگر ائمۂ الطاہرین علیہ السلام کی شان میں کہی جاتی ہے۔ کچھ شعرا نے دیگر بزرگان دین کے متعلق بھی منقبت کہی ہیں۔

مرثیہ:

تاریخ ادب میں مرثیے کی روایت بہت قدیم ہے۔ اگرچہ دنیا کی دیگر زبانوں میں مرثیے کا وہ مفہوم نہیں جو اردو ادب میں پایا جاتا ہے۔ تاہم ہر زبان اور ہر دور میں مرثیہ کسی سانحے یا حادثے کے نتیجے میں پہنچنے والے صدمۂ غم کے اظہار کا وسیلہ سمجھا جاتا تھا اور

سمجھا جاتا ہے۔ مرثیہ، غم والم، درد و فراق، دنیا کی بے ثباتی کا تذکرہ ہر ادب میں پایا جاتا ہے۔ شاعری میں غم کا تصور بہت پرانا ہے۔ مغرب میں شوپنہار کو فلسفۂ غم کا پیغمبر مانا جاتا ہے اس کے نزدیک زندگی غم والم کی زندگی ہے کیونکہ اس میں احتیاج ہے، انسان اپنی آرزوؤں تک نہیں پہنچ سکتا، اور اگر بالفرض ایک آدھ خواہش پوری ہو بھی جائے تو اس کا ردعمل بڑا تلخ ہوتا ہے۔ تاریخ ادب عربی و فارسی میں خاقانی کا ایوان مدائن، سعدی کا مرثیۂ بغداد، جمال الدین اصفہانی کا قصیدہ آشوب روزگار بہت مشہور ہے۔ مرثیے کی ہیئت اور اجزائے ترکیبی میں (۱) تشبیب یا چہرہ (۲) آمد (۳) سراپا (۴) رجز (۵) جنگ (۶) شہادت (۷) دعا یا اختتامیہ ہوتا ہے، جبکہ منقبت کی ہیئت اس سے قطعی مختلف ہوتی ہے۔ اُردو ادب میں مرثیے کا موضوع حضرت امام حسین علیہ السّلام کی ذات گرامی اور واقعۂ کربلا ہے۔ مرثیہ واقعۂ کربلا کے محرکات، پس منظر و پیش منظر، عوامل، مقاصد و اہداف، حالات و واقعات، جذبۂ ایثار و قربانی، جرأت و استقامت، شجاعت و شہادت، دین داری و انسان مشربی، قرآن و شریعت کی بالا دستی، حق کی فتح، ابطالِ باطل، تہذیب و اقدار اور سیرت و کردار سے بحث کرتا ہوا تمدن و تاریخ اور سیاست و معاشرت اور عصری حالات تک آپہنچا ہے۔ ہر دور کے شعرا واقعۂ کربلا کا تاحدِ بصیرت مطالعہ و مشاہدہ کر رہے ہیں اور نت نئے گوشے تلاش کر کے مرثیے کے CANVAS کو مزید کشادہ کر رہے ہیں جبکہ اس کے مقابلے میں منقبت کا CANVAS ابھی اس قدر وسیع نہیں ہوا ہے۔

دراصل منقبت اور نعت کو ایک قرار دینا یا مرثیہ و منقبت کو ایک سمجھنا فضائل علی کو چھپانے کی غیر محسوس سازش و کوشش ہے جو کچھ مخصوص نظریے کے حامل افراد کے مذموم منصوبے کا حصہ ہے، جبکہ اُردو ادب کے وسیع قالب میں اس تنگ نظری کی کوئی

گنجائش نہیں ہے اور نہ اس سے پہلے ہمارے جید شعرا نے اس سازش کو کبھی پنپنے دیا۔ اُردو ادب کے دامن پر تنگ نظری کا داغ لگانے والے ادب میں گروہ بندی کے جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اس غیر محسوس سازش کے نتیجے میں نعت کو دنیائے ادب نے قبول کرلیا۔ دوسری طرف مرثیہ اپنی گوناگوں خوبیوں، تاثر و تاثیر، جامعیت و ہمہ گیری اور واقعۂ کربلا کی اہمیت و عظمت کے پیشِ نظر خاصا مقبول ہوا اور اس صنف میں ہر مکتبۂ فکر کے لوگوں نے طبع آزمائی کی اور اس کی وسعت اور تعداد میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے، لیکن منقبت میں کچھ ایسے پہلو بھی نمایاں ہوتے ہیں جن سے کچھ مخصوص لوگوں اور مخصوص نظریے کے حامل افراد کے نظریات و جذبات و احساسات مجروح ہوتے ہیں اور وہ حق کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں بلکہ اپنی عزیز روایات کو عزیز رکھتے ہوئے نہجِ اسلاف اور فکرِ اخلاف سے کام لیتے ہوئے منقبت کی صنف کے خلاف ریشہ دوانیوں میں مصروف رہے اور مصروف ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ منقبت میں تبرّا بھی ہوتا ہے جس سے ان کے مذہبی جذبات مجروح ہوتے ہیں، جبکہ تبرّا صرف اظہارِ برأت کا نام ہے اور اس میں ان لوگوں کی ہجو کی جاتی ہے اور ان لوگوں سے بے زاری کا اظہار کیا جاتا ہے جنھوں نے اسلام یا اہلِ بیتؑ کے خلاف سازشوں میں عملی حصہ لیا یا انسانی اقدار و تہذیب کو مٹانے کی کوشش کی۔ ہم نہیں سمجھتے کہ کہیں اسلام و اہلِ بیت یا انسانیت کے مسلّمہ اصولوں کے خلاف ریشہ دوانیاں کرنے والا کسی تعریف و توصیف یا انعام و اکرام یا عزت و تکریم کا مستحق ہو۔ زیرِ نظر کتاب "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" میں فاضل محقق علامہ ضمیر اختر نقوی نے اس غلط فہمی کو دور کرنے کی پوری کوشش کی ہے، اور منقبت کی حمایت میں متعدد دلیلیں پیش کی ہیں۔ آپ نے پوری تحقیق اور پورے شعور کے ساتھ منقبت کی حیثیت، اہمیت، افادیت، عظمت اور ضرورت کی وضاحت کی

ہے اور تبرا اور مناظرانہ پہلو کی منطقی و عقلی توجیہات پیش کی ہیں، کیونکہ فنِ منقبت نگاری ہو یا نعت گوئی، سلام ہو یا مرثیہ خوانی، اس سے ادب میں اچھا اضافہ ہوتا ہے اور ادب انسان کے اخلاق کو بلند اور عقلِ خام کو پختہ کرتا ہے۔ منقبت میں تجربات کے بہت سے مواقع ہیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی نے اس وسیع و وقیع موضوع کو بہترین انداز میں سمیٹا ہے اور عربی و فارسی کے شعرا کو الگ کر کے صرف اُردو کے شعرا کی منقبت کے نمونے پیش کیے ہیں۔ اگر آپ عربی و فارسی کے شعرا کی منقبت کی تفصیل پیش کرتے تو اس موضوع کے لیے پچیس سے تیس ضخیم جلدیں درکار ہوتیں اور اگر صرف اُردو کے شاعروں کی منقبت کو ہی جمع کیا جاتا تو بھی یہ کتاب چودہ سے بیس جلدوں پر مشتمل ہوتی۔ ضمیر اختر نقوی صاحب نے سمندر کو کوزے میں سمیٹ کرتے ہوئے اس تفصیل بتشریح موضوع کو صرف ایک جلد میں سمٹ کر ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ علاوہ ازیں علامہ نقوی نے صرف متقدمین اُردو شعرا کے نذرانۂ عقیدت کو پیش کیا ہے اور اس کتاب کا آغاز قرآن سے کر کے اقبال و جوش پر اس موضوع کو سمیٹ دیا ہے اور عصرِ حاضر کے شعرا کو شامل نہیں کیا ہے۔

شعرائے عصرِ حاضر اور منقبت:

عہدِ جدید کے شعرا نے حضرت علیؑ کی شان میں کوئی قابلِ ذکر منقبت نہیں کہی ہے سوائے اہلِ سنت کے دو محترم معروف شعرا کے عصرِ حاضر کے شعرا میں منقبت گوئی کے حوالے سے معتبر و نمائندہ نام فضل حق صاحب کا ہے۔ حضرت علیؑ کی مدح میں ان کی منقبت مثنوی کی شکل میں ہے اور اس میں کل تین ہزار اشعار ہیں۔ اس منقبت میں فضل حق صاحب نے بڑی ذمے داری اور محنت، بڑے خلوص و مستند سیر و کتب کے

حوالے سے واقعات نگاری کا حق ادا کیا اور بیسیوں اہم مصادر و ماخذ سے استفادہ کر کے تحقیق و عقیدت کا حق پوری طرح ادا کیا ہے۔ عصر حاضر کے شعرا میں دوسری قابلِ ذکر منقبت اُردو کے معروف شاعر جناب عبدالعزیز خالد کی ہے جو چار سو اشعار پر مشتمل ہے۔ ان اشعار میں عقیدت و ارادت کے ساتھ ساتھ صنعت لفظی، آرائشِ بیان اور لفظوں کی سجاوٹ کا میکانکی عمل بھی کسی حد تک پایا جاتا ہے۔ عبدالعزیز خالد صاحب نے اپنے تجربہ و مشاہدہ اور اپنی تحقیق و مطالعہ کو اس منقبت میں دل کش پیرائے میں انتہائی پُر تاثیر انداز میں سمویا ہے۔ ان دونوں منقبتوں کو پڑھ کر سامع یا قاری بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کوئی خاص قابلِ ذکر منقبت اس دور کے شعرا نے نہیں کہی متقدمین میں اقبال اور جوشؔ کی منقبتیں اس سلسلے کی آخری کڑی ہیں۔ خصوصاً شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی "طلوعِ فکر" اُردو ادب کا وہ عظیم شاہکار ہے جس کے مطالعے سے روح میں تازگی اور فکر میں بالیدگی پیدا ہوتی ہے۔ اس منقبت کے مطالعے سے حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی سوائے کائنات سے محبت و عقیدت کا پتہ چلتا ہے اور یہ منقبت ان کی شاعرانہ انفرادیت و فن کارانہ مہارت کی آئینہ دار ہے۔

"شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" کے موضوعات:

علامہ ضمیر اختر نقوی نے اس کتاب میں ترتیب و تہذیب، ندرتِ خیال، اعتبارِ نظر اور خلوصِ فکر اور موضوع کی انفرادیت کا خاص خیال رکھا ہے۔

پہلے باب میں قرآن میں حضرت علیؑ کے فضائل اور منقبت کے محرکات کی تفصیل بیان کی ہے اور منقبت کی تعریف، معنی اور مفاہیم پر روشنی ڈالنے کے بعد مدحِ علیؑ کو قرآن سے ثابت کیا ہے۔ علاوہ ازیں حضرت علیؑ کے علم، ان کے شجرۂ طیبہ، ان کا سراپا

مستقیم، لسان صدق اور امام مبین ہونا، ان پر ملائکہ کے درود پڑھنے، ان کی ولایت، قسیم جنت والنار شاہد منہ ہونا، ان کے سراپا، ان کی ذوالفقار کی تعریف ان کے گھوڑے کی تعریف کو قرآن حکیم سے ثابت کیا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان عربی شاعری اور مدحت علیؑ ہے جس میں حضرت حسان بن ثابت، امام شافعی، کمیت بن زید اسدی، اسماعیل حمیری، دعبل خزاعی، عبدالحمید ابن ابی الحدید معتزلی کا نذرانۂ عقیدت پیش کیا گیا ہے۔

تیسرے باب میں فارسی شاعری اور ثنائے علیؑ کے عنوان پر بحث کی گئی ہے۔ اس میں قرآن اور ایران، سلطان ابوسعید ابوالخیر، فردوسی، حکیم سنائی، شیخ فریدالدین عطار، مولانا روم، حضرت شمس تبریز، شیخ سعدی، حافظ ملا جامی اور شاہ نعمت اللہ کا نذرانۂ عقیدت بحضور حضرت علیؑ پیش کیا گیا ہے۔

چوتھے باب میں اُردو منقبت نگاری کا ارتقا پیش کیا گیا ہے۔ اس میں حضرت لعل شہباز قلندر، سید جلال الدین حیدر سرخ بخاریؒ، حضرت خواجہ غریب نوازؒ، خواجہ بختیار کاکیؒ، مخدوم جہانیان جہاں گشت، جمال الدین یوسف گردیزی، شمس الدین گردیزی، شہاب الدین گردیزی، حضرت بوعلی شاہ قلندر، نظام الدین اولیا، حضرت چراغ دہلی اور خواجہ گیسو دراز کی منقبتیں ہیں۔ دکنی زبان کے منقبت نگاروں کا تذکرہ کرتے ہوئے آپ نے قلی قطب شاہ، ملا وجہی، غواصی، سلطان عادل شاہ، رستمی، ملا عشرتی، سید احمد ہنر، درگاہ قلی خاں درگاہ، موتمن الدولہ سالار جنگ، سراج اورنگ آبادی کے نذرانۂ عقیدت کا تذکرہ کیا ہے۔ دہلی کے جن منقبت نگاروں کی منقبتیں پیش کی گئی ہیں، ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔

سلطان تیمور گورگانی، نصیر الدین ہمایوں، بیرم خان، مجدد الف ثانی، قاضی نوراللہ

شوستری، عرفی، صالح ترمذی کشفی، نعمت خاں عالی، مرزا حیدر لکھنوء، ابو نصر قطب الدین، فائز دہلوی، آبرو دہلوی، شاکر ناجی دہلوی، شاہ حاتم دہلوی، سعادت امروہوی، یکدل دہلوی، زکی دہلوی، جبار علی بقل، سودا، میر تقی میر، فغاں دہلوی، بیان دہلوی، بیدار دہلوی، حسرت دہلوی، اثر دہلوی، ہدایت دہلوی، انگار دہلوی، قدرت دہلوی، بقا دہلوی، لالہ سکندر سنگھ، فارغ دہلوی، ظاہر دہلوی، قریں دہلوی، عشق دہلوی، عاجز دہلوی، قدوی لاہوری، میر غلام حسن ضاحک، مغل بادشاہ شاہ عالم آفتاب، فراق دہلوی، قاسم دہلوی، سید دہلوی، احسان دہلوی، سعادت یار خاں رنگین، مرزا اسلیمان شکوہ دہلوی، طپش دہلوی، افسوس دہلوی، حیدر بخش حیدری، شاہ نصیر الدین نصیر دہلوی وغیرہ ہم۔ اسی باب میں تین اہم موضوعات غالب کی فارسی منقبت نگاری اور لکھنؤ کی منقبت نگاری ہے جس میں آتش، ناسخ، عاشور لکھنوی، مرزا محمد تقی ہوس، امیر مینائی، تسلیم لکھنوی اور جلال لکھنوی کے وہ اشعار پیش کیے ہیں جو انھوں نے مولا علی کی شان میں کہے ہیں۔

پانچواں باب شعرائے اُردو اور عشق علی ہے جو اس کتاب کا نام اور اصل موضوع ہے۔ یہ باب حضرت امیر خسرو کی منقبت سے شروع ہوتا ہے اور محمد قلی قطب شاہ، ولی دکنی میر تقی میر، مرزا محمد رفیع سودا، نظیر اکبر آبادی، میر سوز، قائم چاند پوری، میر حسن، شیخ غلام ہمدانی مصحفی، قلندر بخش جرأت، انشاء اللہ خاں انشا، ممنون دہلوی، مرزا اسد اللہ خاں غالب، شیخ محمد ابراہیم ذوق دہلوی، مومن خاں مومن، بہادر شاہ ظفر، ظہیر دہلوی، امام بخش ناسخ، خواجہ حیدر علی آتش، واجد علی شاہ اختر، اسیر لکھنوی، برق لکھنوی، رشک لکھنوی، منیر شکوہ آبادی، قلق لکھنوی، صبا لکھنوی، امانت لکھنوی، رند لکھنوی، نظم طباطبائی، یاس لکھنوی، ریاض خیر آبادی، حسرت موہانی، آرزو لکھنوی، صفی لکھنوی،

ثاقب لکھنوی، عزیز لکھنوی، بے خود موہانی اور محشر لکھنوی پر ختم ہوتا ہے۔ یہ باب انتہائی اہم اور اس میں اُردو زبان کے اہم ترین شعرا کی عظیم ترین منقبتیں موجود ہیں۔

چھٹے باب کا عنوان ہے اُردو مرثیہ نگار شعرا اور مدحت علی۔ اس باب میں اُردو مرثیے پر منقبت نگاری کے اثرات کی بڑی کاہش وکاوش کے ساتھ تجزیہ وتحقیق کی گئی ہے۔ متفرق مرثیوں کا آغاز اور اس میں احسان علی احسان، افسردہ، گدا، ماتم، عزا، دلگیر، میر ضمیر، میر خلیق، مرزا فصیح، تعشق، مرزا دبیر، میر مونس، میر انیس، میر نفیس، میر عشق، مرزا اوج، صفیر بلگرامی، مشیر لکھنوی، عظیم، منظور فیض آبادی، محمد تقی اختر، واحد علی تسخیر، انجم جرولی، میر وحید، محب علی سلیس، ماتم شکارپوری، شمیم امروہوی علی میاں کامل، پیارے صاحب رشید، نصرت لکھنوی، شاد عظیم آبادی، ثابت لکھنوی، دولہا صاحب عروج، منے صاحب ذکی، مولانا اولاد حسین شاعر لقن صاحب، خبیر لکھنوی، فراست زید پوری، شدید لکھنوی، مہذب لکھنوی، نسیم امروہوی، آل رضا، جعفر طاہر، فضل حق، عبدالعزیز خالد کی منقبتیں پیش کی ہیں اسی باب میں ایک خصوصی باب کا اضافہ کیا گیا ہے۔ جو خدائے سخن میر ببر علی انیس اعلی اللہ مقامہ کی مناجات ومنقبت پر مشتمل ہے۔

ساتواں باب معروف شخصیتوں اور شاعروں کے نذرانۂ عقیدت پر مشتمل ہے۔ اس باب میں سرسید، خواجہ الطاف حسین حالی، میر مہدی مجروح، اکبر الٰہ آبادی، صفیر بلگرامی، شاد عظیم آبادی، شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال اور بیسویں صدی کے عظیم ترین شاعر شاعر انقلاب حضرت جوش ملیح آبادی کی مدحت ومنقبت شامل ہے۔ شعرا کی فہرست میں ایسے بے شمار اسمائے گرامی آپ ملاحظہ فرمائیں گے جن کا نام یا کلام ہم تک نہیں پہنچا۔ علامہ سید ضمیر اختر نقوی نے محنت شاقہ اور مطالعہ وتحقیق کے بعد اس اہم ترین موضوع پر شعرائے متقدمین اور چند عصر حاضر کے شعرا کی مدحت ومنقبت

پیش کرکے سراللہ العالمین امیرالمومنین، مصور اشکال ماطین، میر عالمین، استاد جبرئیل امین، دارائے حیات مشکل کشائے کائنات حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کے حضور خود اپنے خلوص دل کا خراج اور اُردو ادب کے نام ور شعرا کا نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔ اس قدیم دستاویز میں سے بھی صرف اقتباس و انتخاب کرکے فضائل علیؑ کے گہرے سمندروں سے موتی نکالنے اور رنگ و خوشبو و روشنی بکھرانے کی کوشش کی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ علامہ ضمیر اختر نقوی نے اپنے انداز بیان کی پُرخلوص ندرت اور جمالیت اور حریت کا خاص خیال رکھا ہے اور مفکرانہ شعور و اظہار کے ساتھ ان تبرکات کو جو سینہ بہ سینہ، قلب در قلب یا آثار قدیمہ کے طور پر کتب خانوں میں تہ در تہ گرد میں اٹے ہوئے تھے، اس متاع بے بہا اور ادبی امانت کو صاف کرکے، تزئین و ترتیب کے ساتھ نئی نسل کی مقدس امانت سمجھ کر اُردو ادب کے اہل نظر و باذوق قارئین تک پہنچانے کا التزام و اہتمام کیا ہے اور عشق علیؑ میں سرشار موالیان حیدر کرار کو فضائل کے الہامی چشموں تک پہنچا دیا ہے تاکہ وہ اس نورانی کلام اور اس کے حیات بخش ثمرات سے اپنا دامن مراد بھر سکیں اور مناقب کے زر و جواہر سے اپنا گوہر مراد حاصل کر سکیں۔

مرثیے کی ابدیت و آفاقیت:

گزشتہ کچھ دنوں سے اُردو ادب میں بھی نظریات کا شاخسانہ کھڑا کرکے اُردو ادب کے ارتقا کو روکنے کی شعوری کوشش ہو رہی ہے اور ایک ایسے وقت میں جب لادینیت کی تیرہ و تار فضا اور اُردو دشمنی کے ہولناک ماحول میں اُردو زبان کے خلاف طرح طرح کی سازشیں ہو رہی ہوں اور ہندوستان میں اُردو پر ہندی کو مسلط کیا جا رہا ہو اور پاکستان میں بھی اُردو کی سرکاری سطح پر پذیرائی نہ ہو رہی ہو، اُردو کی ابدی و آفاقی و ہمہ گیر صنف مرثیہ کو مذہبی صنف یا رونے رلانے کی شاعری یا کسی ایک فرقے تک محدود

کر دینا اُردو ادب سے کھلی دشمنی کے مترادف ہے۔ ماضی میں ہر مذہب و فرقہ سے تعلق رکھنے والے شعرا اُردو زبان سے مخلص تھے۔ برادران اہلِ سنت نے ہزاروں مرثیے، منقبتیں اور سلام کہے ہیں۔ اسی طرح اہلِ حدیث مسلک کے متعدد شعرا بھی اس میدان میں پیچھے نہیں رہے۔ رہ گئی یہ بات کہ مرثیہ رونے رلانے کی شاعری، تو اس سلسلے میں ہم معروف دانش ور، ادیب و محقق و شاعر جناب مولانا کوثر نیازی کا ایک قول پیش کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر یہ رونے رلانے کی شاعری ہے تو یہ وہ آنسو ہیں جن سے انسان کی روح وضو کرتی ہے۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ نفرت کی بھٹیوں میں تپائے ہوئے فرقہ وارانہ نعروں یا گروہ بندیوں سے مرثیے پر کوئی اثر پڑتا ہے یا نہیں۔ تو ہم یہ دیکھ رہے کہ اہلِ سنت کے بے شمار حساس و غیر جانب دار شعرا بارگاہِ حضرت امام حسینؑ میں اپنا نذرانۂ عقیدت بشکلِ مرثیہ پیش کر کے اہلِ فکر و نظر میں ممتاز ہیں۔ ان میں حضرت صبا اکبرآبادی اور اُمید فاضلی جیسے بزرگ شعرا کے اسمائے گرامی بھی شامل ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ ایک خالص ادبی صنف ہے، اور اس اعتراض کو علامہ نقوی نے بڑی حد تک دور کرنے کی کوشش کی ہے۔

علامہ نقوی نے اپنی کتاب میں تمام مرثیہ گو شعرا کو شامل نہیں کیا ہے اور نہ ان کی منقبت کو مکمل طور پر پیش کیا ہے، کیونکہ اگر وہ ایسا کرتے تو یہ ایک علیحدہ موضوع اختیار کر لیتا اور اس کے لیے بھی کئی ضخیم جلدیں درکار ہوتیں بلکہ صرف ان مرثیہ گو شعرا کا انتخاب کیا ہے جو اُردو ادب میں ستون کی حیثیت رکھتے ہیں، اور اس امر کی وضاحت کی ہے کہ منقبت مرثیے کا حصہ نہیں ہے بلکہ منقبت سے مرثیے بنائے گئے ہیں۔ اس سلسلے میں بڑی خوش اسلوبی سے انھوں نے مرثیے اور منقبت کا فرق واضح کیا ہے اور مرثیے میں سے منقبت گوئی کو علیحدہ نکال لیا ہے اور صرف انتخاب پر اکتفا کیا ہے، وہ بھی اہم

ترین اور چیدہ چیدہ شعرا کو موضوعِ قلم بنایا ہے ورنہ تفصیل کے لیے ابھی کم از کم پندرہ جلدیں درکار ہوتیں علامہ نقوی نے لگی لپٹی کے بغیر اور مصلحت کوشی سے کام لیے بغیر بے ساختہ اور دو ٹوک یہ بات کہی ہے کہ کوئی شاعر یہ کہہ کر منقبت کو نظر انداز نہیں کرسکتا کہ اس صنفِ شاعری کا تعلق شیعہ شعراء سے ہے۔ اُردو ادب میں فرقہ و نظریات کی تقسیم کبھی نہیں رہی اور نہ اس بنیاد پر شاعری کا کارواں آگے بڑھا ہے، بلکہ شاعر جو فطری طور پر حساس ہوتا ہے اور اپنے پہلو میں دردمند دل رکھتا ہے، اس کی حسینؑ سے والہانہ محبت اور ارادت و عقیدت ایک فطری چیز ہے۔ اگر انسانی نکتۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو حضرت علیؑ کی شخصیت اور ان کی صفاتِ جلیلہ و اوصافِ حمیدہ اور ان کی کرامات ہمہ گیری ہر اہلِ نظر کو ان کی جانب متوجہ و ملتفت کرتی ہے، لہٰذا شاعری میں اگر فرقہ واریت و نظریات کی تفریق کی گئی تو یہ ناانصافی و دشمنی ہوگی۔ منقبت سے دل آزاری کا شاخسانہ تقسیم ہند کے بعد کی بات ہے۔ تاریخِ اُردو ادب شاہد ہے کہ ہمارے صوفیائے کرام نے، جن کا تعلق مسلکِ اہلِ سنت سے تھا، ہمیشہ بارگاہِ مرتضوی میں قصائد و منقبت کہی ہیں۔ ان بزرگانِ دین کی دین داری و کاوش کا نتیجہ ہے اور ان کی روشن فکری و غیر جانب داری ہی کی وجہ سے اُردو ادب اتنے گراں بہا سرمائے کا مالک ہے۔ علامہ نقوی شاید یہ اسلوب و لہجہ اور دو ٹوک رویہ کبھی اختیار نہ کرتے، اگر یہ کتاب ہندوستان میں تحریر کی جاتی، کیونکہ ہندوستان کے شعرا میں نظریات کی بنیاد پر ابھی تقسیم عمل میں نہیں آئی ہے اور وہاں کے ہندو شعرا بھی مدحِ اہلِ بیتؑ کو اپنے لیے توشۂ آخرت سمجھتے ہیں۔

گزشتہ ۳۵ برسوں سے کچھ دیناری درباری تنگ نظر شعرائے آمین چاکری کی مدح کرنے والوں میں شامل ہو کر حضرت علیؑ کی توہین و بے ادبی کا جو سلسلہ شروع کر رکھا

ہے، اس سے حضرت علیؑ جیسی معتبر و محترم و مقدس و روحانی و نورانی شخصیت کا تو کچھ نہیں بگڑے گا البتہ ان مخصوص نظریات کے حامل شعرا کا شیرازہ بکھر جائے گا اور اُردو ادب میں ان کا نام بھی باقی نہیں رہے گا بالکل اسی طرح جیسے سوائے علیؑ کی منقبتوں کے تاریخ اُردو ادب میں کسی اور کی منقبت باقی نہیں رہی اور وہ منقبتیں وقت کے ساتھ ساتھ نذرِ طاقِ نسیاں ہو گئیں، کیونکہ کسی بھی معتبر شخصیت کے مقابلے میں اگر سازش کر کے کسی غیر معتبر شخصیت کو لایا بھی جائے تو اہلِ نظر اس کی طرف نگاہِ تجاہلانہ ڈالنا بھی پسند نہیں کرتے ہر شخصیت کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے، اس کی سحر انگیز شخصیت و جاذبیت لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہے، زبردستی سے کسی کو اپنی طرف متوجہ نہیں کیا جاسکتا۔ اُردو ادب میں جس پست ترین سیاست کو جنم دیا گیا ہے، یہ حضرت علیؑ کے ماننے اور چاہنے والوں کے لیے اذیت ناک بھی ہے اور ناپسندیدہ بھی اور اس سازش و سیاست کو عصرِ حاضر کے شعرا نے بھی محسوس کیا، لیکن انھوں نے بربنائے مصلحت ان باتوں کا دفاع نہیں کیا جبکہ ادب عصبیت و مصلحت سے ماورا ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں موجودہ صدی کے سب سے بڑے شاعر حضرت جوشؔ ملیح آبادی فرماتے ہیں: ''علیؑ کی حق پرستی کی تاب نہ لا کر مسلمانوں کی ایک جماعت کثیر نے اُن سے منھ پھیر لیا اور یہاں تک کہ انھیں آخر کار یہ کہنا پڑا کہ دنیا نے مجھے ذلیل کر دیا، ذلیل کر دیا، ذلیل کر دیا اور اس قدر کہ میرا اور معاویہ کا تقابل کیا جانے لگا''۔ اسی جگہ جوشؔ ملیح آبادی فرماتے ہیں: ''ان (علیؑ) کے کام گار حریف اپنے تمام کر و فر کے ساتھ وقت کے سمندر میں ڈوب چکے ہیں لیکن ان کی (علیؑ) زندگی کی تمام ناکامیوں کے باوجود ان کا نام تاریخِ انسانیت کی پیشانی پر آج تک دمک رہا ہے اور وہی لوگ جنھوں نے ان کی طرف سے منھ موڑ لیے تھے، ان کی موت کے بعد جب کسی بلا میں گرفتار ہو جاتے ہیں تو ''علیؑ'' کے نعرے

لگانے لگتے ہیں"۔

زیرِ نظر کتاب "شعرائے اُردو اور عشقِ علی" مداحی یا منقبت کی تاریخ بلکہ تاریخِ ادب اُردو میں ایک اضافہ ہے، کیونکہ اس کتاب میں صرف منقبت کا ذکر نہیں ہے بلکہ منقبت گو شعرا کے حالاتِ زندگی بھی ہیں اور ان شعرا کے حالات بھی جو اب تک اُردو ادب کے قارئین کی نگاہوں سے اوجھل تھے۔ ان شعرا و ادبا کے افکار و اشعار اور حالاتِ زندگی پڑھ کر کتاب کی وسعت و آفاقیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ یہ ادبی دستاویز کس قدر اہم و وقیع ہے، کیونکہ پی ایچ۔ ڈی کرنے والے طالب علم کو بھی کسی ایک موضوع اور کسی ایک شخصیت کو منتخب کرنا پڑتا ہے اور وہ اس کے کوائف، حالاتِ زندگی اور اس کے آثار و اخبار جمع کر کے سند حاصل کرتا ہے، جبکہ اس کتاب میں بے شمار شعرا کے حالاتِ زندگی، ان کے علمی آثار و تبرکات اور ان کے شاعرانہ اسلوب پر تحقیق کی گئی ہے بلکہ اس کا پورا حق ادا کیا گیا ہے اور ان کے اردگرد اور ان کے ماحول، ان کی وابستگی اور ان کے فن کے متعلق بھی بحث کی گئی ہے۔ ان شعرا و ادبا کی نگارشات ہماری نگاہوں سے اوجھل تھے۔ اس کا سہرا علامہ ضمیر اختر صاحب کے سر جاتا ہے کہ انھوں نے سالہا سال کی تحقیق و جستجو اور چھان پھٹک کے بعد اُردو ادب کے قارئین و ناقدین کے سامنے قدیم و جدید دور کے مستند شعرا کو پیش کیا جن سے آج ادب کا طالب علم واقف نہیں ہے۔ انھوں نے ان شعرا کی شاعری کے رموز و علائم سے ہی ہمیں آگاہ نہیں کیا بلکہ ان کے نظریات و افکار و تبرکات سے بھی ہمیں روشناس کرایا ہے۔

علامہ سید ضمیر اختر نقوی نے اپنے اسلوب اور اختراعات سے بہت متاثر کیا ہے۔ ان کا دائرہ تحقیق وسیع ہے۔ انھیں تخلیقی انداز برتنے کا سلیقہ آتا ہے۔ وہ "اُردو غزل اور کربلا"، "اُردو مرثیہ پاکستان میں" اور "مراثیِ جوشؔ" جیسی شہرۂ آفاق کتابوں کے

مصنف و مولف ہیں۔ انھوں نے مرثیے پر خصوصی توجہ دی اور آج بھی ان کی تحقیق کا موضوع ومحور اردو مرثیہ ہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ان کی تخلیقی رفتار میں اضافہ ہو رہا ہے جس سے یہ امید بندھ چلی ہے کہ وہ صرف خطابت تک ہی محدود ہو کر نہیں رہ گئے ہیں بلکہ علمی وادبی میدان میں بھی سرگرم عمل ہیں اور ان کا سفر جاری ہے اور ان میں کوئی جمود اور ٹھہراؤ پیدا نہیں ہوا ہے۔ ہمیں توقع ہے کہ وہ مرثیے کے موضوع پر یا دیگر ادبی موضوعات پر قارئین ادب کو مزید نئی جہات سے آشنا کریں گے اور اسی طرح پردۂ گمنامی میں زندگی بسر کرنے والے شعرا کی شاعری اور ان کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتے رہیں گے۔

علامہ سید ضمیر اختر صاحب پر یہ لکھنؤ کا فیضان ہے کہ ان کے یہاں صنعت لفظی، آرائش بیان اور لفظوں کی سجاوٹ کا میکانکی عمل ملتا ہے جو لکھنؤ اسکول کا خاصہ رہا ہے۔ علامہ سید ضمیر اختر نقوی کا نام قلم قبیلے میں تعارف سے بے نیاز ہے۔ وہ متعدد موضوعات پر بہت سی کتابیں لکھ چکے ہیں، بہت سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں، بہت سی پیش طباعت ہیں اور بہت سی زیرِ قلم ہیں۔ معروف دانش ور و ماہرِ تعلیم ڈاکٹر کاظم علی خاں، پرنسپل شیعہ کالج لکھنؤ انڈیا نے ان کی اس تصنیف کو ایک یادگار صحیفہ قرار دیا ہے۔ آپ کی علامہ سید ضمیر اختر نقوی کے بارے میں گراں قدر آرا اس کتاب میں موجود ہیں۔

علامہ نقوی کی اہل بیتؑ اور خصوصاً حضرت علیؑ سے ارادت وعقیدت فطری ہے۔ توارث وماحول کے علاوہ ان کی اپنی تحقیق اور پھر وہ وکیلِ آلِ محمدؐ کی حیثیت سے تقریر وتحریر دونوں میدانوں میں سرگرم عمل ہیں۔ حضرت علیؑ کی دیومالائی شخصیت کی سحرانگیزی کا کیا کہنا! دنیا میں آپ کی زندگی اور اس کے روشن آثار کی پیروی اور افکار ونظریات سے روشنی، علم کے مختلف شعبوں، تاریخ، ادب، فلسفے اور مذہب میں آپ کی

بلندی و برتری اور اس کے بحرِ بے کنارے سے اپنی پیاس بجھانے والے آج بھی اپنی علمی تشنگی کو دور کرنے کے لیے آپ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ آپ سے عقیدت و ارادت کا یہ عالم ہے کہ اُردو کے بیشتر شعرا کے ناموں میں آپ کا اسمِ مبارک، لقب یا تخلص شامل ہے، مثلاً اسد اللہ خاں غالبؔ میں "اسد" مولا علیؑ کا نام ہے اور آپ کو غالب علی کلِّ غالب کہا گیا ہے۔ لفظ غالب یہیں سے مستعار یا تبرکاً لیا گیا ہے۔ میر ببر علی انیسؔ، میر تقی میرؔ، حیدر علی آتشؔ، امام بخش ناسخؔ میں "امام" یا "میر" سب مولا کی ذات سے منسوب الفاظ ہیں۔ جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ نعت رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور منقبت دو الگ الگ صنف ہیں۔ جب ہم نعت کا مطالعہ کرتے ہیں تو اس میں حضرت علیؑ کا تذکرہ ملتا ہے جو ذاتِ رسولؐ اور ذاتِ علیؑ کے ایک ہونے کی دلیل ہے۔ علیؑ مظہرِ صفاتِ خدا بھی ہیں اور مظہرِ صفاتِ رسولؐ بھی۔

آخر میں علامہ سید ضمیر اختر نقوی کو خراجِ تحسین پیش کرتا ہوں کہ ایک ایسے دور میں جب مطالعے کا ذوق یکسر ختم ہو چکا ہو، معیاری وعلمی و ادبی کتابوں کی طباعت واشاعت ادبی جہاد سے کم نہیں، جبکہ ماضی میں ہمارے روسا و امرا جن میں علمی ذوق بھی تھا اور مذہبی غیرت وحمیت بھی تھی، ایمانی و انسانی تقاضوں کے تحت نہ صرف لکھنے والوں کی، ہمت افزائی کرتے تھے بلکہ معاونت بھی جبکہ آج حالات اس سے قطعی مختلف ہیں۔ ہمارے امرا و روسا کا مذہب سے رسمی اور واجبی سا تعلق ہے اور یہی وجہ ہے کہ قوم میں لکھنے والے پیدا نہیں ہو رہے ہیں۔ اس کی تمام تر ذمے داری اداروں، انجمنوں اور امرا کے سر جاتی ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ معیاری ذوق اور مطالعے کا شوق رکھنے والے اہلِ نظر قارئین کرام اس کتاب سے ضرور استفادہ فرمائیں گے۔

☆ ☆ ☆

اقبال کاظمی (مرثیہ فاؤنڈیشن)

"شعرائے اُردو اور عشقِ علی"

ایک گراں قدر اور اہم تصنیف

جناب ضمیر اختر نقوی کا نام نامی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ وہ پاکستان کے نام ور اور مقبول خطبا اور ذاکرین میں شامل ہیں۔ موصوف کی خطابت میں چونکہ تحقیقی، تاریخی اور ادبی رنگ بہت نمایاں ہے، اس لیے ان کا شمار پاکستان کے صاحب طرز خطیبوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تقاریر برصغیر پاک و ہند اور دیگر ممالک میں بڑی دلچسپی سے سنی جاتی ہیں۔ جناب ضمیر اختر نقوی کا نام ان کی تحقیقی، تنقیدی اور ادبی تصنیفات و تالیفات کی بدولت دنیائے ادب، بالخصوص رثائی ادب میں ایک اہم محقق، ناقد اور ادیب کی حیثیت سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

شعرائے اُردو اور عشقِ علی ایک گراں قدر اور اہم تصنیف ہے جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ آج کے اس نفسا نفسی کے دور میں جبکہ ہوا اور ہوس میں گرفتار دنیا مال و منال کی تلاش میں سرگرداں ہے، اُردو شاعری میں عشقِ علی کی تلاش ایک ایسا مستحسن اور قابلِ رشک و قابلِ تقلید کارنامہ ہے۔ جو صاحبانِ فکر و نظر کو مزید جستجو اور تحقیق کی طرف راغب کرے گا۔ دنیائے ادب بجا طور پر اُمید کر سکتی ہے کہ اہلِ تحقیق و تنقید بھی اس طرف متوجہ ہوں گے تاکہ شعر و ادب کی دنیا پر حضرت علی علیہ السلام کے فیوض و برکات کے مزید گوشے روشن ہو سکیں۔ مولائے کائنات کی ذاتِ اقدس تو ایک بحر

ذخار علم وسعارف ہے جو پورے عالم انسانیت کے لیئے مشعلِ راہ ہے۔ ہر عہد کے صاحبانِ فکر و نظر نے اس ذاتِ والا صفات کی بارگاہ میں ہدیۂ عقیدت پیش کیا ہے اور ذہنِ انسانی ہنوز معرفتِ علیؑ میں کوشاں ہے۔ حیرت اور افسوس تو ہوتا ہے اس عہد کی جہالت اور عصبیت پر کہ جب منبرِ کوفہ کا یہ عظیم المرتبت خطیب "سلونی" کی صدائیں دے رہا تھا تو سوال کرنے والوں نے اپنی ڈاڑھی کے بالوں کی تعداد جاننا چاہی۔ تصور کیجیے کہ اس وقت حضرت علیؑ پر کیا گزر گئی ہوگی، حضرت نے کس درجہ صبر کیا ہوگا۔ "نہج البلاغہ" میں جگہ جگہ مولائے کائنات نے زمانے کی جہالت اور ناپرسی کا ماتم کیا ہے اور اپنی تنہائی پر نوحہ کیا ہے۔

شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ ۹۱۲ صفحات پر پھیلی ہوئی ایک ضخیم کتاب ہے جس کی تالیف میں ۸۴ کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔ کتاب سات ابواب (پہلا باب قرآن میں حضرت علیؑ کے فضائل اور منقبت کے محرکات، دوسرا باب عربی شاعری اور مدحتِ علیؑ، تیسرا باب فارسی شاعری اور ثنائے علیؑ، چوتھا باب اُردو مرثیہ نگار اور عشقِ علیؑ، ساتواں باب عہدِ جدید میں عشقِ علیؑ کی مثالیں) پر مشتمل ہے۔ مندرجہ بالا ابواب اور ان کے ذیلی ابواب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ جناب ضمیر اختر نقوی نے اس کتاب کی ترتیب و تالیف میں حد درجہ محنتِ شاقہ اور عرق ریزی سے کام لیا ہے، جس کی ستائش ہر قاری پر فرض ہے۔ پہلے، دوسرے اور تیسرے ابواب کی شمولیت نے جو عربی و فارسی میں حضرت علیؑ کے فضائل و مناقب سے متعلق ہیں، کتاب کی وسعت میں بڑا اضافہ کر دیا ہے۔ اگرچہ ان ابواب کی شمولیت کی وجہ سے کتاب کا اصل موضوع، یعنی شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ اختصار کی زد میں آ گیا ہے، اس لیئے عین ممکن ہے کہ ناقدین مختلف ادوار، بالخصوص جدید دور سے شعرا کے انتخاب کے بارے میں جناب

ضمیر اختر نقوی سے اختلاف کریں۔ ظاہر ہے کہ کتاب کا موضوع اتنا وسیع و عریض ہے جو ایک کتاب کے قالب میں نہیں سما سکتا، اس کے لیے کتابیں درکار ہیں اور بڑی عمیق تحقیقی کاوشوں کی ضرورت ہے۔ جناب ضمیر اختر نقوی صفحہ ۱۹ پر خود فرماتے ہیں کہ۔

"پوری کتاب میں صرف غزل اور قصائد، رباعیات و متفرقات سے منقبت حضرت علی علیہ السلام کا انتخاب کرنے کے بعد تجزیہ اور تبصرہ تحقیق نقطۂ نظر سے کیا گیا ہے۔ اگر صرف مرثیے کی تاریخ سے منقبت کے نمونوں کا انتخاب کیا جائے تو کم سے کم پچاس ضخیم جلدیں درکار ہوں گی"۔

اس انتخابی کوشش میں قوی امکان ہے کہ کچھ اہم شعرا کا تذکرہ نہ ہو سکا ہو اور کچھ غیر اہم کم تر اہمیت کے شعرا کا ذکر شاملِ کتاب ہو گیا ہو، اس لیے شعرا کے انتخاب اور ان کے منتخب کلام کے سلسلے میں اعتراضات وارد ہو سکتے ہیں اور ناقدین جناب ضمیر اختر نقوی کے تجزیوں اور تبصروں سے بھی اختلاف کر سکتے ہیں۔ لیکن ان ممکنہ اعتراضات اور اختلافات سے قطع نظر جو بات میرے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت کی حامل ہے، وہ یہ کہ جناب ضمیر اختر نقوی نے اُردو شاعری پر عشقِ علی کے اثرات کی تلاش اور جائزہ لے کر اُردو ادب کی تاریخ میں نئے باب کا اضافہ کیا ہے جو ادب کے قاری کو اپنی طرف ضرور متوجہ کرے گا اور اہلِ نظر اس نقطۂ نظر سے بھی اُردو شاعری کو پڑھنے اور سمجھنے کی کوشش کریں گے۔ جناب ضمیر اختر نقوی اس پیش روی پر ہزار ہا تحسین اور مبارک باد کے مستحق ہیں۔

ایں سعادت بزورِ بازو نیست
تا نہ بخشد ، خدائے بخشندہ

چنانچہ مقصدِ کتاب بیان کرتے ہوئے جناب ضمیر اختر نقوی نے خود فرمایا ہے کہ:

''اس دورِ ناسپاس اور محرومِ سماعت زمانے میں علیؑ کا تذکرہ ہر حساس واہلِ نظر کا بھی فرض ہے اور ضرورت بھی، اور یہی جذبہ یہی عقیدت یہی ارادت ، یہی معرفت اور یہی عشقِ علیؑ مرا سرمایۂ حیات اور ایمان ہے۔ اور زیرِ قلم کتاب کا مقصد و مدعا و مفہوم بھی یہی ہے تا کہ نئی نسل کے ذہنوں میں ذکرِ علیؑ سے نئی صبح کا احساس پیدا ہو اور ہم اپنے عرفا و شعرا کے نذراتِ عقیدت سے متاثر ہوسکیں''۔

محترم کاظم علی خاں لکچرار شیعہ کالج لکھنؤ نے اس کتاب کے دیباچے میں بجا طور پر تحریر فرمایا ہے کہ ''یہ ضخیم و فکر انگیز کتاب عزیزی ضمیر اختر نقوی کے ایسے کامیاب خطیب کی مذہبی، ادبی اور علمی کاوشوں کے ایک یادگار اور سدا بہار صحیفے کی حیثیت رکھتی ہے''۔ آگے چل کر مزید فرماتے ہیں کہ ''موضوع اور مواد کے اعتبار سے اپنے دامن میں ایسے متعدد گوشے رکھتی ہے جو ایک گرما گرم علمی مباحثے کا موضوع بن سکتے ہیں جس میں قارئین مصنف سے اتفاق کے ساتھ ساتھ اختلاف بھی کر سکتے ہیں''۔ محترم جناب کاظم علی خاں سے کامل اتفاق کرتے ہوئے کہ ''شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ'' ایک سدا بہار صحیفہ ہے، میں جناب ضمیر اختر نقوی کو اس منفرد اور گراں مایہ تصنیف پر پورے خلوص اور دل کی گہرائیوں سے ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں۔

شعرا کے انتخاب اور نتیجہ کلام سے قطعِ نظر کرتے ہوئے بغیر کسی تنقیدی ادعا کے اور پورے خلوصِ نیت کے ساتھ صرف دو امور کی جناب ضرور متوجہ کرنا چاہوں گا۔ پہلی بات تو یہ کہ چونکہ موضوعِ کتاب عشقِ علیؑ ہے، اس لیے انتخابِ کلام میں جناب ضمیر اختر نقوی کو صرف عشقِ علیؑ سے سروکار رکھنا چاہیے تھا اور ایسے اشعار سے گریز ضروری تھا جو کسی کی دل آزاری کا موجب ہوں۔ ویسے بھی یہ اشعار ان کے موضوع سے خارج

تھے۔ ایسے اشعار اگرچہ خال خال ہیں۔ مگر ان کی شمولیت سے کتاب کی افادیت متاثر ہوئی ہے۔ اگر ایسے شعار شاملِ کتاب نہ ہوتے تو بہت اچھا ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ ان مواقع پر ضمیر اختر نقوی ادیب پر ضمیر اختر خطیب غالب آگیا ہے۔ حضرت علیؑ کی ذات والاصفات تو پوری نوعِ انسانی کی میراث ہے۔ بلاتفریق مذہب و ملت سب منصف مزاج انسانوں نے اس عظیم ہستی کو خراجِ تحسین پیش کیا ہے اس لیے مداحانِ علیؑ کے بارے میں ان کے عقائد اور مذہب کی بحث چھیڑنا میری ناقص رائے میں کچھ اور پاکیزہ جذبہ ہے۔ جس نے ہر اہلِ بصیرت کو متاثر کیا ہے۔ حیرت ہوتی ہے کہ جناب ضمیر اختر نقوی کی نظر ہندو مداحانِ علیؑ کی طرف کیوں نہیں گئی۔

دوسرا ضروری امر جس کی طرف جناب ضمیر اختر نقوی کو متوجہ کرنا مقصود ہے، وہ یہ ہے کہ ''اردو مرثیہ نگار شعرا اور مدحتِ علیؑ'' کے عنوان سے جو باب شاملِ کتاب کیا ہے وہ تشنہ اور ناکافی ہے خاص طور پر جدید دور پر پوری توجہ نہیں دی گئی چونکہ تاریخ مرثیہ گوئی اور رثائی ادب کی تحقیق و تنقید سے جناب ضمیر اختر نقوی کو خصوصی شغف اور تعلق ہے اور ان کے ذاتی کتب خانے میں نادر مطبوعہ و غیر مطبوعہ مراثی کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ اس لیے مرثیہ فاؤنڈیشن خصوصی طور پر ان سے توقع کرتا ہے کہ وہ رثائی ادب اور عشقِ علیؑ کے موضوع پر تفصیل سے اظہار خیال فرمائیں گے اور اس سلسلے میں ایک نئی کتاب تصنیف کرنے کی زحمت گوارہ فرمائیں گے تاکہ مشتاقانِ ادب اور عاشقانِ علیؑ شاداب ہو سکیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کمیت اور کیفیت کے اعتبار سے رثائی ادب میں عشقِ علیؑ کا سرمایہ دوسری اصنافِ سخن کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے اور اس کے دامن میں فصاحت و بلاغت کا ایک بحرِ ذخار موج زن ہے۔ عشقِ علیؑ کے ضمن میں پوری اُردو شاعری رثائی ادب کا پاسنگ بھی نہیں ہے۔

آخر میں ایک بار پھر جناب ضمیر اختر نقوی کو اس گراں قدر اور اہم تصنیف پر مبارک باد پیش کرتا ہوں اور بارگاہِ خداوندی میں دعا کرتا ہوں کہ موصوف کے زورِ قلم میں روز بروز اضافہ ہو اور وہ بہتر سے بہتر کتابیں تصنیف و تالیف فرماتے رہیں۔ مرثیہ فاؤنڈیشن کے رکن کی حیثیت سے ہماری استدعا ہے کہ وہ اپنی توجہات رثائی ادب پر برابر دیتے رہیں تاکہ ان کے نوکِ قلم سے مرثیے کی خدمت کا سلسلہ جاری و ساری رہے۔ موجودہ دور میں صنفِ مرثیہ زمانے کی عدم توجہی اور اربابِ حل و عقد کی غفلت اور مصلحت کوشیوں کا شکار ہے، اس لیے تمام ادب دوستوں اور عاشقانِ اُردو کا فرض ہے کہ وہ اُردو مرثیے کو اس کا جائز مقام دلانے کی کوششوں میں ہاتھ بٹائیں تاکہ اُردو زبان صنفِ مرثیہ کے طفیل زبانوں کے خاندانوں میں اپنی انفرادیت اور اہمیت برقرار رکھ سکے۔

"شعرائے اُردو اور عشقِ علی" پر مندرجۂ بالا تاثرات اور گزارشات کے بعد میں حصولِ ثواب و سعادت کی خاطر اس مضمون کو اپنے اس شعر پر تمام کرتا ہوں کہ یہ عاجز بھی مدحِ علی میں نوعِ انسانی کے عجز و نارسائی میں شامل ہے:

ابھی ممکن کہاں توصیفِ حیدر
ابھی انسان کوشش کر رہا ہے

حیدر نواب جعفری

۲۱ راگست ۱۹۸۳ء... لکھنؤ۔ انڈیا

"ضمیر میاں آپ کی تقریر کی آواز جیسے آج تک کانوں میں گونج رہی ہے۔ آپ ہندوستان کیا آئے معلوم ہوا تھا کہ جیسے محرم آ گیا ہے۔ آج بھی ہر زبان پر آپ کا تذکرہ ہے۔ ماشاءاللہ آپ کی نظر کلامِ انیس یا دیگر مرثیہ گو حضرات کے کلام پر اس طرح ہے کہ جیسے ہر انسان کی کتابِ زندگی اس کے سامنے ہو۔ آپ اپنی تقریر میں برمحل مرثیہ کے بند اس طرح استعمال کرتے ہیں۔ جس سے تقریر کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ یہ آپ کا حصہ ہے ایسے تحقیقی بیانات کم سننے میں آتے ہیں"۔

سیّد محمود خاور

"شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ"

محققانہ کاوشوں کا نتیجہ خیز ثمر

گزشتہ چند برسوں سے اُردو میں متعدد موضوعات پر بڑی تعداد میں بھاری اور غیر معیاری، ہمی طرح کی کتابیں شائع ہو رہی ہیں اور اس بہتات میں چند ایک اپنے متن، موضوع اور انداز تحریر، تحقیق اور مواد کے اعتبار سے نہایت اہم ہوتی ہیں جبکہ بیشتر غیر تخلیقی غیر معیاری اور غیر اہم ہوتی ہیں۔ میں ذاتی طور پر شعر و ادب کو پسند کرتا ہوں لیکن کثرت سے چھپنے والے شعری مجموعوں کو بدشگونی سمجھتا ہوں، کیونکہ عہدِ حاضر میں قارئین کا شاعری کے نشے اور تخیلاتی دنیا سے زیادہ تعمیری، اصلاحی، تحقیقی، تنقیدی، سائنسی اور معلوماتی موضوعات پر کتابوں کی زیادہ ضرورت ہے تاکہ وہ وقت اور زندگی کی دوڑ میں شامل ہو کر عصری تقاضوں کو پورا کرسکیں۔ بیشتر کتابیں ذاتی شہرت و تسکینِ انا کی خاطر شائع ہوتی ہیں یا پھر خالصتاً کسی بھی ضرورت کے تحت ان کی اشاعت عمل میں آتی ہے۔

اہل بیتؑ کے حوالے سے بھی پچھلے سالوں میں خاصہ لٹریچر منظرِ عام پر آیا ہے، خصوصاً مرثیہ نگاری کو فروغ ہوا اور اس موضوع پر ہونے والے کام سے گویا اس کا احیا عمل میں آیا ہے۔ زیرِ تبصرہ کتاب "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" ممتاز ذاکر، خطیب،

ادیب، محقق اور شاعر اہل بیت جناب ضمیر اختر نقوی کی محققانہ کاوشوں کا نتیجہ خیز ثمر ہے اور ضمیر اختر نقوی کی مذہبی، علمی و ادبی سعی کی ایک یادگار اور سدا بہار صحیفے کی حیثیت رکھتی ہے۔

ضمیر اختر نقوی کی اس سے قبل متعدد کتابیں شائع ہو کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔

اُردو ادب کی زیادہ تر مثنویوں میں، خواہ وہ کسی بھی موضوع پر ہوں، ابتدا میں حضرت علی کی منقبت اور مدح ضرور ہوتی ہے یا پھر ان کے فضائل اور اوصاف بیان کیے گئے ہیں۔ ''مقصد'' عنوان کے تحت کتاب کی وجہ تصنیف بیان کرتے ہوئے ضمیر صاحب لکھتے ہیں:

> ''زیر نظر کتاب کی اشاعت ضابطۂ تحریر میں لانے کا مقصد و مدعا صرف اور صرف یہ ہے کہ جہانِ بشریت کو اولیائے کرام، صوفیائے عظام، عرفا، ادبا اور شعرا کے خیالات اور ان کی نگاہ میں حضرت علی کی جو وقعت اور منزلت ہے، اس سے مسلمانانِ عالم کے بزرگوں، جوانوں اور بچوں کو روشناس کرایا جائے اور عشق علی جیسی متاع بے بہا اور گراں قدر نعمت کو پوری تاب ناکی اور آن بان سے زندہ و باقی رکھا جائے''۔

''شعرائے اُردو اور عشق علی'' کافی ضخیم، یعنی ۹۱۲ صفحات پر مشتمل کتاب ہے۔ جس میں عشق علی سے متعلق تمام تر مواد اور شاعری کو یک جا کرنے کی کامیاب کوشش کی گئی ہے اور لاتعداد قدیم و متوسط دور کے شعرا کا حضرت علی سے متعلق کلام شامل کیا گیا ہے، لیکن تعجب کی بات یہ ہے کہ ان میں بیشتر شعرا کا تعلق لکھنؤ سے ہے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہو برسہا برس لکھنؤ شیعہ حضرات یا ذکر اہل بیت کا گڑھ اور مرکز رہا ہے۔

پوری کتاب متفرق ذیلی عنوانات کے تحت سات ابواب پر مشتمل ہے۔ شعرا کا بطور

نمونہ یہ کلام دیا گیا ہے، وہ کہیں کم اور کہیں زیادہ ہے۔ سب سے پہلے جو بات کھٹکتی ہے، وہ یہ کہ کتاب کے موضوع اور مواد کو صرف حضرت علیؑ کی ذات تک محدود کر دیا گیا ہے کیا ہی اچھا ہوتا کہ جناب ضمیر اختر نقوی کتاب کا نام "شعرائے اردو اور عشق اہل بیتؑ" رکھ کر اس کے موضوع کو مزید بے کراں اور بے پایاں وسعت بخشتے اور اس طرح کتاب کی وقعت و اہمیت مزید بڑھ کر تاریخی نوعیت کی ہو جاتی۔ اسی طرح اگر اس میں ہندو اور دیگر غیر مسلم شعرا کا کلام بھی شامل کر لیا جاتا تو نہ صرف کتاب ہمہ گیر و ہمہ جہت بن جاتی بلکہ اہل بیتؑ کا مقام و مرتبہ بلند اور جاوداں ہو جاتا۔

میری ان دو باتوں کی تصدیق جناب کاظم علی خان کی اس تحریر سے ہو جاتی ہے جو "یادگار صحیفہ" کے زیر عنوان کتاب میں شامل ہے۔ موصوف لکھتے ہیں:

> "اس کتاب میں دکن کے شعری سرمائے اور عہد حاضر کی شاعری کو شامل نہیں کیا گیا ہے، شاید یہ موضوعات نقشِ ثانی کے لیے چھوڑ دیے گئے ہیں۔ کسی کامیاب کتاب کی شہرت اور مقبولیت کا ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ اس کا مواد کس حد تک علمی اور ادبی حلقوں کے لیے بحث اور مباحثے کے دروازے کھولتا ہے"۔

جناب کاظم علی خان کی اس بات سے مجھے اتفاق ہے اور واقعی ضمیر اختر نقوی نے کتاب میں بعض دروازے کھولے ہیں لیکن بحث مباحثے کے بجائے متنازعہ اور نہایت حساس موضوعات کو چھیڑ دیا ہے۔ مثلاً صفحہ نمبر ۱۹۶ پر ایک حوالے کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ خاندانِ تیمور، یعنی اکثر مغلیہ تاجدار شیعہ تھے اور مصلحِ تقیہ کے لباس میں تھے۔ اسی طرح صفحہ نمبر ۱۹۰ پر حضرت نور اللہ شوستری کا اکبر جیسے بادشاہ سے لاہور کے قاضی القضاۃ کا عہدہ قبول کرتے وقت اپنی شرائط بسلسلۂ فقہ

مذہب جعفری طے کرواتا محلِ نظر ہے، جبکہ بعدازاں شوستری بحکم شاہی قتل کر دیے گئے تھے۔ صفحہ نمبر۱۹۲ پر عرفی شیرازی کے جسد خاکی کے ایک غلط فہمی کے باعث نجف اشرف پہنچ جانے کو عشقِ علی سے تعبیر کرنا اور کہنا کہ عرفی زندگی میں نہ سہی موت کے بعد نجف اشرف پہنچ گیا وغیرہ وغیرہ۔

ضمیر اختر نقوی کا انداز تحریر دل کش اور معلومات آفریں ہے۔ جس شاعر کا کلام شاملِ اشاعت ہے، اس کے بارے میں مکمل معلومات سے آراستہ معروضی نوعیت کے مضامین کتاب کی جان ہیں، کیونکہ ان مضامین میں شاعر کے حالاتِ زندگی، شاعری اور دیگر موضوعات پر اچھا خاصا مواد اکٹھا کیا گیا ہے، جس سے ریسرچ اسکالر کو بڑی مدد ملے گی، لیکن چند اہم اور نام ور شعرا مثلاً حسرت موہانی اور ریاض خیر آبادی پر نہایت مختصر مضامین ہیں بلکہ غیر معروف مگر شیعہ شعرا پر طویل مضامین موجود ہیں۔ اسی طرح دو غیر مسلم شعرا میر جیون انگار دہلوی اور لالہ مکند سنگھ فارغ دہلوی جن کا مدحِ علیؑ کے باب میں کل شعری سرمایہ صرف ایک شعر ہے۔ انھیں بھی شاملِ اشاعت کرلیا گیا ہے، لیکن ان فروعی باتوں کے باوجود کتاب کی وقعت اور اہمیت کم نہیں ہوتی اور بر اعتبار سے ''شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ'' ایسا قابلِ قدر اور وقیع مجموعہ ہے جسے تحقیق اور حوالہ جاتی کتب کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ مصنف نے موضوع پر خوب محنت اور عرق ریزی سے کام کیا ہے، جس کے لیے وہ قابلِ مبارک باد ہیں۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ آئندہ بھی اسی نوعیت کی محققانہ اور معلوماتی کتابوں کی منصفانہ انداز میں تصنیف کا کام جاری رکھیں گے۔

کتاب کے دوسرے باب کا مضمون ''عربی شاعری اور مدحتِ علیؑ'' نہایت سیر حاصل اور عمدہ مضمون ہے۔ داستانِ لکھنؤ کے معروف شاعر مرزا جعفر علی خان اثر

لکھنوی جیسے عاشق اہل بیت شاعر کا تذکرہ اس مجموعے میں نہ پا کر دکھ کے ساتھ تعجب ہوا کہ ضمیر صاحب کی نظر سے اتنا اہم شاعر کیسے چوک گیا۔

قلمی کتابت سے آراستہ یہ کتاب صاف ستھرے انداز میں چھپی ہے۔ جلد بندی اور سرورق میں معیار ملحوظ رکھا گیا ہے اور اس کے ناشر مرکز علوم اسلامیہ ہیں۔

ڈاکٹر احراز نقوی

۳۰ رجولائی ۱۹۷۱ء ... لاہور

مکرمی ضمیر اختر صاحب! تسلیمات عرض کرتا ہوں۔ امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ آپ کا پرچہ "یادگار انیس" مجھے بھائی ہادم سیتاپوری کے توسط سے موصول ہوا۔ پرچے کی ترتیب و تالیف تو اپنی جگہ پر، وصف خصوصی اس کا یہ ہے کہ اس پرچے نے فقط چند اوراق کی مدد سے انیس کے مقام اور منزلت کی نشاندہی بڑی حسن و خوبی سے کی ہے اور اس کے بعد ملک کے تمام لکھنے والوں کو انیس پر کچھ کام کرنے کے لئے اور اس کے فکر و فن پر خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے بھی آمادہ کیا جائے۔

شاید یہ آپ کے علم میں نہیں ہے کہ گزشتہ سال شہر لاہور میں بھی ایک انیس اکاڈمی قائم ہوئی ہے اور انیس کے سلسلے میں کچھ کام تقسیم ہوا تھا۔ میرے حصے میں انیس پر لکھے گئے مضامین کی ترتیب اور انتخاب سپرد ہوا تھا مجھے اس کام کی تشہیر سے بحث نہیں ہے۔ میں فقط کام کا قائل ہوں اور وہ میں نے اچھا خاصا کر بھی ڈالا ہے۔ انشاء اللہ یہ مجموعہ انیس کے باب میں ایک اہم مطالعہ ثابت ہوگا۔

مقصود تحریر محض یہ ہے کہ آپ مضامین کی فراہمی کے سلسلے میں کچھ تعاون کیجئے۔ آپ نے اپنے تازہ شمارے میں ایک احتشام حسین صاحب کے مضمون کا انیس اور عالمی ادب کا اقتباس دیا ہے۔ کیا یہ مضمون آپ عارضاً ہمیں دے سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ مضامین کے تراشے یا ان کی نشاندہی کر سکتے ہوں تو بڑی نوازش ہوگی۔ ہم سب کی امداد باہمی سے کوشش یہی ہونی چاہیے کہ انیس پر فقید المثال کام ہو جائے ایسا کہ ہمیشہ یاد رہے۔ یہ موقع ہے اس سے فائدہ اٹھانا چاہیے

سلیم فاروقی

ایک عظیم دستاویز

علامہ ضمیر اختر نقوی کی شخصیت طالبانِ علم وفن کے لیے کسی تعارف کی محتاج نہیں ہے۔ انھیں مذہبی اور ادبی، دونوں حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ آپ نامور خطیب اور بلند ریسرچ اسکالر ہیں۔ انھوں نے عمرِ عزیز کا بیشتر حصہ علمی و تحقیقی کاموں میں صَرف کیا ہے اور یہ سعادت کسی کسی ہی کو نصیب ہوتی ہے۔ نقوی صاحب گزشتہ چونتیس سالوں سے مختلف موضوعات پر ریسرچ کر رہے ہیں۔ زیرِ نظر کتاب "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" نقوی صاحب کی ایسی کاوش ہے جو انھیں رہتی دنیا تک زندہ رکھے گی۔ اس کتاب میں انھوں نے امیرالمومنین حضرت علی ابنِ ابی طالبؑ کے حضور نذرانۂ عقیدت پیش کرنے والے شعرا کے کلام اور ان کے حالات کا ایک جائزہ پیش کیا ہے۔

دنیا کی آبادی ہزار گنا ہو جائے، اس میں آدم سے لے کر اب تک کے تمام نفوس کو بھی جمع کر لیا جائے اور اس کا ایک ایک فرد لکھنے پر مامور کر دیا جائے تو بھی وہ مولودِ کعبہ، ابوالایمان حضرت ابوطالب کے فرزند، پیغمبرِ اسلام حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے داماد، بھائی، جانشین اور جنابِ فاطمۃ الزہراؑ کے شوہر اور شہیدِ کربلا حضرت امام حسینؑ کے پدرِ بزرگوار حضرت علیؑ کی ذات کا احاطہ کرنا تو دور کی بات ہے، صرف ان کے علمی فضائل بیان کرنے سے بھی قاصر ہوگا۔ وہ جن کی شان میں قرآن مجید میں اللہ

جل شانہٗ نے آیہ تطہیر، آیہ صالح المومنین، آیہ ولایت، آیہ مباہلہ، آیہ نجویٰ، آیہ اذن واعیہ، آیہ اطعام، آیہ بلغ وغیرہ نازل فرمائی ہوں اور پیغمبر اسلام حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احادیث مدینہ، سفینہ، نور، منزلت، خیبر، خندق، طیر، ثقلین اور غدیر میں جن کی شان بیان فرمائی ہو، کوئی عام انسان بھلا ان کی تعریف کیسے کرسکتا ہے سوائے اس کے کہ:

سارے عالم کو جزیرہ ٹھہراؤں
ایک انساں کو سمندر لکھوں

دنیا کا ہر ذی ہوش انسان بلالحاظ مذہب وملت اس بات کا معترف ہے کہ امیر المومنینؑ کی عظیم المرتبت ہستی نہ صرف عالم اسلام بلکہ پوری انسانیت کے لیے ایسا بیش قیمت خزانہ ہے جسے نفی کر دیا جائے تو عالم اسلام تہی دست ہو جائے۔ اسلام کا وہ بطل جلیل جو نہ صرف شجاعت و مردانگی میں یکتا تھا بلکہ علم فلسفہ، علم تاریخ، علم جمادات و نباتات، علم منطق، علم ہندسہ، علم نجوم و جفر سمیت تمام علوم جدید و قدیم کا منبع تھا، مجموعۂ اوصاف تھا۔ آپ کی تعریف اگر کسی انسان نے کی ہے تو اس نے کسی شاعرانہ تعلی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ اس نے حقیقت بیان کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی نے زیرِ نظر کتاب کے سات ابواب تحریر کیے ہیں، اور یہ سات ابواب گویا چودہ صدیوں پر محیط ہیں کہ ان میں قرآن مبین سے لے کر عصر حاضر تک جو کچھ امیر المومنینؑ کی شان میں کہا گیا، اس کا نچوڑ موجود ہے۔ تاریخ ادب میں اس موضوع پر اتنی جامع اور وقیع کتاب اب تک نظر نہیں آئی۔ علامہ نے جس محنت شاقہ اور لگن سے اس کتاب کے لیے تحقیق کی ہے، وہ انھی کا حصہ ہے۔ ان کا انداز اور اسلوب بہت دل کش اور عام فہم ہے اور ادب کا ادنیٰ سے ادنیٰ طالب علم بھی اس سے

استفادہ کرسکتا ہے۔ مصنف نے ترتیب وندرت کا خیال رکھتے ہوئے پہلے باب میں قرآن مجید میں حضرت علیؑ کی منقبت سے ابتدا کی ہے گویا امیر المومنینؑ کے تمام اوصاف حمیدہ کو قرآن سے ثابت کیا ہے۔ دوسرے باب میں آپ نے عربی زبان کے شاعروں کا جائزہ پیش کیا ہے، تیسرا باب فارسی شعرا اور ثنائے علیؑ پر محیط ہے چوتھے باب میں اُردو منقبت نگاری کی درجہ بہ درجہ ترقی کا احوال ہے جس میں مشہور زمانہ بزرگانِ دین کی منقبتیں ہیں۔ پانچواں باب انتہائی اہم ہے۔ وہی اس کتاب کا موضوع بھی ہے یعنی "شعرائے اُردو اور عشق علیؑ" یہ باب حضرت امیر خسرو سے شروع ہوتا ہے اور محشر لکھنوی مرحوم پر ختم ہوتا ہے۔ اس میں اُردو کے عظیم ترین شعرا کی منقبتیں موجود ہیں۔ چھٹا باب اس لحاظ سے اہم اور گراں قدر ہے کہ مصنف نے بہت تحقیق اور جاں سوزی کے ساتھ اسے قلم بند کیا ہے اور اُردو مرثیے پر منقبت نگاری کے اثرات کی بہت باریک بینی سے تحقیق کی ہے۔ اسی باب میں شہنشاہِ سخن میر ببر علی انیس کی مناجات اور منقبتیں بھی ہیں جو طالبانِ ادب کے لیے کسی بیش بہا تحفے سے کم نہیں ہے۔ ساتویں باب میں معروف شخصیات اور شعرا کا نذرانۂ عقیدت ہے۔ اس میں سرسید اور علامہ اقبال سے جوش ملیح آبادی اور عصر حاضر تک کے شعرا کی منقبتیں ہیں۔

یہ کتاب دراصل ایک دستاویز ہے اس مدحت ومنقبت کی جو زمانۂ قدیم سے لے کر آج تک مولائے کل، امیر المومنین حضرت علی ابن ابی طالبؑ کی شان میں کہی گئی ہیں۔ یہ علامہ ضمیر اختر نقوی کی طرف سے طالبانِ ادب اور عاشقانِ علیؑ کے لیے ایک بے مثال تحفہ ہے۔

☆☆☆

سیّد ناصر رضا رضوی

غیر فانی شاہکار

علامہ سیّد ضمیر اختر نقوی کا شمار اُردو ادب کے معروف اور معصروف ادیب، محقق، تنقید نگار اور خطبا میں کیا جاتا ہے۔ وہ کوئی تیس، پینتیس برس سے تحقیق و تصنیف کی شاہراہ پر گام زن ہیں۔ ''شعرائے اُردو اور عشق علی'' سے پہلے بھی ان کے تحریری شہ پاروں کے متعدد مجموعے شائع ہو چکے ہیں جنھیں شائع کرنے کا شرف میر انیس اکادمی اور مرکزِ علوم اسلامیہ پاکستان کو حاصل ہے۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے تحریر کے فن میں بتدریج ترقی کے مراحل طے کیے ہیں۔ وہ اپنی سعی و جستجو اور مطالعہ و مشاہدہ سے موجودہ مقام تک پہنچے ہیں۔ ان کی جودتِ طبع نے شعلۂ مستعجل بننے سے عمداً گریز کیا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ ان کے ہاں وہ پختگی پیدا ہو گئی ہے جو غور و فکر کے تسلسل اور کہنہ مشقی کے بغیر ممکن نہیں۔ ان کی تحریر کے موضاعات ہمہ جہت ہیں۔ وہ مذہبیات، انتقادیات، سوانح حیات اور ادبیات، ہر موضوع پر لکھ چکے ہیں، لیکن رثائی ادب میں ان کی نگارشات و تحقیق کو بین الاقوامی شہرت حاصل ہے۔ مرثیہ گو شعرا اور شاعری شخصیت اور اس کے علم و فکر کا جتنا گہرا اور اچھا مطالعہ ضمیر اختر نقوی کے یہاں پایا جاتا ہے، کسی اور کے یہاں مشکل سے ملتا ہے قحط الرجال کے اس دور میں ان کا دم بڑا غنیمت ہے۔ یہ میری ہی نہیں، ادبی حلقوں کی متفقہ رائے ہے۔

''شعرائے اُردو اور عشق علی'' ان کا غیر فانی شاہکار ہے، جس کے ہر لفظ میں ان شعرا کی

عقیدت اوران کے دل کی دھڑکن سنائی دیتی ہے۔ جن کا انتخاب علامہ سید ضمیر اختر نقوی نے کیا ہے۔ حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السلام کی پاک سیرت اور مقدس زندگی پر ہر دور اور ہر زبان میں نظم ونثر کی شکل میں بہت کچھ کہا اور لکھا گیا ہے۔ آپ کی شخصیت اتنی متبرک سحر انگیز و جاذب ہے کہ ہر دور کے ارباب دانش نے اسے اپنا موضوع بنایا ہے۔ جتنا اس موضوع کا مطالعہ کیا جاتا ہے، اتنے ہی آپ کے اوصاف وفضائل کے ادراک کے ساتھ نوعِ انسانی پر علم وعرفان وآگہی، یقین وایمان کے دریچے کھلتے جاتے ہیں۔ شعرائے اُردو کا بارگاہِ حضرت علیؑ میں نذرانۂ عقیدت کا جتنا معیاری انتخاب اس کتاب میں ملتا ہے، کسی اور کتاب میں یکجا نظر نہیں آتا۔ مرکزِ علوم اسلامیہ نے اس کتاب کی قدر واہمیت کے پیشِ نظر اسے نہایت حسین پیکر میں پیش کیا ہے۔

اراکین مرکزِ علومِ اسلامیہ ان تمام علما، دانش وروں، ادبا و شعرا کے ممنون ومتشکر ہیں جنھوں نے اس کتاب کے بارے میں اپنی گراں قدر آرا ہمیں ارسال فرمائی ہیں یا اپنا منظوم نذرانۂ عقیدت ہمیں بھیجا ہے یا دامے، درمے ہمارے ادارے کی معاونت فرمائی ہے۔ ہم خاص طور پر جناب سید ہاشم رضا، جناب جمیل احمد رضوی (پنجاب یونیورسٹی، لاہور)، جناب ڈاکٹر اسد اریب (ملتان)، جناب وحید الحسن ہاشمی (لاہور) جناب سید ماجد حسین رضوی، جناب مولانا صوفی سید ابن حسن رضوی (خیر پور)، جناب سید محمود الحسن رضوی، جناب پروفیسر ظہیر نفسی، جناب شاہد جعفر، جناب پروفیسر سردار نقوی، جناب سید رشید حیدر رضوی، جناب اقبال کاظمی، جناب پروفیسر محمد رضا کاظمی، جناب مراد علی جعفر (رئیس تحقیق دانشِ مشرق)، جناب نیر اسعدی، ناصر مہدی رضوی (خلف محسن الملت سید علامہ محسن نواب رضوی اعلی اللہ مقامہٗ)، جناب سید ماجد رضا عابدی، جناب محمد علی سید، جناب سید سجاد شبیر رضوی اور جناب پرویز بلگرامی کے

علاوہ ان شعرائے کرام کے بھی شکر گزار ہیں، جن کی نظمیں اس مجلّے کی تزئین و توقیر کا باعث ہیں خصوصاً شاعرِ ملت جعفریہ نجم فتح پوری مرحوم، جناب سید اقبال ظفر نقوی (خویش عمدۃ العلماء مولانا سید کلب حسین اعلی اللہ مقامہٗ) جناب مظہر مجتبیٰ مرحوم، جناب نیر مجیدی لکھنوی، جناب قمر عباس قمر عظیم آبادی، جناب ماجد رضا ماجد، جناب سید شبیہ الحسن رضوی (اسلام آباد) اور جناب ڈر حسن جلالوی کے علاوہ اراکینِ مرکزِ علوم اسلامیہ اور خصوصاً محققِ دوراں علامہ سید ضمیر اختر نقوی دام مجدہٗ کے جو اپنی ذات میں ایک کائنات ہیں اور جن کی سرپرستی میں میر انیس اکادمی اور مرکزِ علوم اسلامیہ دینی، علمی اور ادبی خدمات انجام دے رہا ہے۔

☆ ☆ ☆

مظفر حیدری

۱۵ راگست ۱۹۷۸ء

عالی جناب محترم سید ضمیر اختر نقوی صاحب

تسلیمات مسنونہ! امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے استاد محترم جناب علامہ نجم آفندی اعلی اللہ مقامہٗ کے متعلق "النجم" میں آپ کا مقالہ "علامہ نجم آفندی، حیات اور شاعری" میری نظر سے گزرا۔ مرحوم سے آپ کی ارادت و عقیدت میرے شکریے سے بالاتر ہے۔ تقریباً ۲۷ء سے میں قبلہ نجم صاحب کی سوانح عمری کو ضبطِ تحریر میں لانے کے لئے کوشاں رہا مگر اس کی نوبت نہ آسکی۔

وارث رضا

''شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ''

روشن کل کی امید

اکثر و بیشتر ایسا ہوتا ہے کہ ہم اپنے مروجہ مذہبی طریقوں سے اپنی پسندیدہ مذہبی شخصیت کی آفاقیت کی طرف توجہ نہیں دے پاتے، اور پھر اپنے اسی عقیدت بھرے جذبے کو صحیح جان کر اسی تناظر میں چیزوں کو دیکھنے کے عادی ہو جاتے ہیں۔ اس طریقے سے ہمیں یقیناً قلبی و روحانی تسکین فراہم ہو جاتی ہے، مگر دوسری جانب ہم ناوانستگی میں اپنے عقیدے کی بنا پر مضبوط استدلال رکھتے ہوئے بھی اپنے موقف میں کمزور نظر آ رہے ہوتے ہیں۔ اس کی سادہ سی وجہ عقیدے میں جذبات کی انتہائی معراج ہوتی ہے۔ اس میں کوئی کلام نہیں کہ جذبات کی آمیزش عقل و دانش کو ہضم کر جاتی ہے۔ جس دین کی اساس ہی عقل و دانش و علم و فکر پر ہو تو اس میں جذباتیت کا شکار ہونا کیا معنی رکھتا ہے؟ علم و ادب کے متعلق حضرت علیؑ کا یہ قول۔

''تسلیم و رضا بہترین مصاحب اور علم شریف ترین میراث ہے اور
علمی و عملی اوصاف تو بہ تو خلعت ہیں اور فکر صاف شفاف آئینہ ہے''

اپنے اندر تمام اسرار و رموز اور عقل و فہم لیے ہوئے ہے۔ ہماری اس ضمن میں کوشش و فکر ہی یہ ہونی چاہیے کہ ہم حضرت علیؑ کو فکر و دانش اور فلسفہ و حکمت کے حوالے

سے دنیا کے سامنے پیش کریں کہ اسی طرح حضرت علیؑ کو پیش کیا جانا چاہیے۔ جس کی واضح مثال ڈاکٹر علی شریعتی کی کتابیں اور ان کی فکر ہے۔ اگر ہم حضرت علیؑ کو فکر و دانش و علم و فکر کے حوالے سے عقل کی بنیاد پر دیکھیں تو نہ جانے حضرت علیؑ کی شخصیت اور ان کی دانش کے کتنے پرت ایسے ہوں کہ جن کا ہم احاطہ بھی نہ کر پائیں، بلکہ حضرت علیؑ کے ایک ایک عمل کو فکری سطح پر جانچنے میں عام آدمی کی عقل نہ صرف حیران بلکہ معدوم ہونے لگتی ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی اس بات سے کہ:

''کون علی؟ وہ علی جن کے متعلق تیرہ سو سال سے بولا، سوچا اور لکھا جارہا ہے۔ مگر اب تک اس سمندر کی تھاہ ملی نہ کنارہ''۔

انکار تو کیا البتہ علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی نظر کی گیرائی و گہرائی اور وسعتِ مطالعہ کا قائل ہونا پڑے گا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ ''شعرائے اردو اور عشقِ علیؑ'' کی ابتدا ہی علامہ سید ضمیر اختر نقوی نے کوزے میں سمندر سمیٹنے کی جو کامیاب کوشش کی ہے، اس میں حضرت علیؑ کی فکر و دانش کے تمام باب پوشیدہ اور تمام تر تعریف مضمر ہے۔ ''شعرائے اردو اور عشقِ علیؑ'' عنوان و مواد کے اعتبار سے ایک انفرادیت رکھتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ ضمیر اختر نقوی نے ادب کے حوالے سے ہی علیؑ کی شخصیت کو دیکھنے یا دکھانے کی کوشش کیوں کی ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جہاں سے بات شروع کی جانی چاہیے۔ کسی بھی معاشرے کا ادب اپنے اندر معاشرے میں رونما ہونے والی سچائی و بدی کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ ادب معاشرے کے خدوخال سنوارنے اور معاشرت کی اخلاقی، تعمیری اور تہذیبی سوچوں کی بہتر آبیاری کے فرائض میں کوشاں رہتا ہے، یہی نہیں بلکہ معاشرے میں ظہور ہونے والے رجحانات و میلانات کی گواہی کا وہ موثر ذریعہ

ہے جو مستقبل کی تاریخ بننے کے ساتھ ساتھ بیتے زمانے کے رجحانات کی آگہی کا ایک موثر ترین ذریعہ ہے۔ کسی بھی خطے کا ادب بغیر تحقیق اور بلا خوف و خطر معاشرے کے بگاڑ پر اپنی تنقید پیش کر دیتا ہے، وہ مستقبل کی پیش بینی وسیع تناظر میں دیکھنے اور آنے والے خطرات کے بروقت ادراک کا شعور رکھتا ہے، وہ معاشرے کا محاکمہ کرنے میں وسیع النظر ہونے کے ساتھ ساتھ روشن کل کی نوید دیتا ہے۔ ہر اچھے تعمیری ادب کا یہ خاصہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے ماضی سے حال کی بہتری اور حال سے مستقبل کے روشن ہونے کو زیادہ اہمیت دے۔ اس تناظر میں وہ زمانی نظر و فکر میں ایک روشن چراغ ہوتا ہے۔ جہاں بھی معاشرے بے راہ روی کا شکار ہوئے ہیں، اس میں وہاں کے ادب کے غیر سنجیدہ اور غیر تعمیری رویے زیادہ کارفرما رہے ہیں۔ علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب چونکہ بنیادی طور سے علم و فکر اور تہذیب و ادب سے آگہی رکھتے اور قوموں کی ترقی و تنزلی میں تہذیب و ادب کی اہمیت و کردار کو مکمل طور سے سمجھتے ہیں، بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ وہ حال اور مستقبل کی نسل کو علم و ادب کے ذریعے ماضی سے مربوط کرنے کی خواہش میں شعوری کوشش کر رہے ہیں تو بے جا نہ ہوگا، "شعرائے اردو اور عشق علی" علامہ ضمیر اختر نقوی کی انھی سوچوں کے زیر اثر لکھی گئی وہ تاریخی دستاویز ہے جو آنے والے کل میں استعارہ اور نشان ثابت ہوگی۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کے تصنیف و تالیف کے کام اور دوسری جانب منبر کی طرف مراجعت، ایک ایسا سوال ہے کہ جس کا جواب ہمیں شعوری تناظر میں ہی تلاش کرنا پڑے گا۔ ضمیر اختر نقوی بنیادی طور پر ادب کے آدمی ہیں۔ منبر نہ ان کا مسئلہ رہا اور نہ ہو سکتا ہے، کیونکہ طبعاً منبر پر براجمان خاص مکتبۂ فکر کے فروعی نہیں تو پھر کیونکر منبر والے حضرات اپنے حصے میں انھیں شریک کریں؟ جبکہ ایسا ہوا بھی، ہو بھی رہا ہے اور شاید

کسی ایسے علم و فکر دینے والے کے ساتھ ہوتا ہے۔ کافی غور و فکر اور مشاہدے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا میرے لیے اطمینان کا باعث ہوا کہ ضمیر اختر نقوی ایسے عالم و مفکر کا اس ماحول میں جگہ بنانا نہ صرف دشوار بلکہ روایت کو توڑنے کے مترادف ہی ہے، کیونکہ ہمارے یہاں روایتی ذاکرین عموماً تقریر کے فن پر زیادہ اکتفا کرتے ہیں جبکہ درس و تدریس کی طرف یا تو ان کا رجحان نہیں یا وہ عمداً اس طرف رجوع نہیں کرتے اور شاید وہ اسی لیے ارادتاً اپنے سامع کو کتابوں کی طرف لانا نہیں چاہتے۔ دوسری طرف ضمیر اختر نقوی صاحب کا معاملہ اس کے برعکس ہے۔ وہ نہ صرف منبر سے علم و فکر کی باتیں بتاتے ہیں بلکہ نوجوان نسل کو اس پر آمادہ کرتے ہیں کہ وہ فکر و عمل کے دائرے میں آئیں، کتابوں کو ٹٹولیں اور علم کو کھنگالیں۔ علامہ ضمیر اختر نقوی کی علم دوستی کی یہ فکر بھی ان کے علم و ادب سے لگاؤ اور لکھنوی تہذیب کی آئینہ دار ہے، جو کہ ہمارے مروّجہ طریقوں سے بہتر طور نہ صرف مختلف بلکہ سکّہ بند حضرات کے لیے ناقابلِ قبول بھی ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کا یہ کارنامہ کسی طور انقلاب سے کم نہیں کہ انھوں نے مذہب کے حساس موضوعات میں شعور کی رو سے کام لیا اور علم و ادب کے ذریعے مذہب کو مربوط کر کے ایک وسیع تناظر میں اس کتاب کو پیش کیا۔ مثال کے طور پر ان کی کتابوں کے چند موضوعات (۱) اُردو غزل اور کربلا (۲) اُردو مرثیہ پاکستان میں (۳) خاندانِ انیس کے نامور شعرا اور زیرِ تبصرہ کتاب وغیرہ اپنے اندر مذہب کا وسیع تناظر رکھنے کے ساتھ تہذیبی تسلسل اور بین الاقوامیت کا پہلو لیے ہوئے ہیں۔

''شعرائے اُردو اور عشقِ علی'' میں بھی علامہ ضمیر اختر نقوی نے شعوری کوشش کی ہے کہ وہ متنازع موضوعات سے ہٹ کر اصل حقائق سے اہلِ علم کو آگاہ کریں جبکہ کتاب میں غلط فہمیوں، مثلاً: عبدالحلیم شرر کی بات کا جواب، محدث دہلوی کے اختلاف کی

وضاحت، دبستان لکھنو کے شاعروں کے بارے میں مولانا عبدالسلام ندوی کی شکایات کا ازالہ یا اسی طرح ابوالخیر کشفی کی ناسخ کے بارے میں رائے کی تصحیح وغیرہ شامل ہے۔ اسی طرح انھوں نے ''شعرائے اردو اور عشقِ علی'' میں مختلف مشہور شعرا کی منقبت کے ذریعے حضرت علی کی مدحت کے علاوہ ان کے فلسفہ وحکمت، معاشرت، انسانی نفسیات، جرأت اور طرزِ زندگی کے بارے میں نقطۂ نظر کو شعوری طور سے پیش کیا ہے جو یقیناً کسی بھی طور حضرت علی کی مخصوص طرزِ فکر تک محدود نہ رکھنے کی وہ کوشش ہے جو آنے والے کل میں مستقل حوالے کا کام دے گی۔ مثلاً یہ چند شعر:

لغزشِ پا کو ہے بلد، نغمۂ یا علی مدد
ٹوٹے گر آئینہ، اسد! سمجھ کو خوں بہا سمجھ

(غالب)

نکلے یہ صبحِ حشر تو رنگ اس کا جوں شفق
ہو سرخ ذوقؔ سے محمدؐ کی آل کی

(ذوق)

یہ نہ ہوتا تو زمینِ شعر بھی ہوتی نہ خلق
اس لیے ناسخ جو مداحِ شہِ لولاک ہے

(ناسخ)

گر حادثاتِ دہر سے غم ہے تو اے ظفر!
کر جا کے التجا شہِ خیبر شکن کے پاس

(بہادر شاہ ظفر)

یہ ہے، اقبال! فیضِ ذکرِ نامِ مرتضیٰ جس سے
نگاہِ فکر میں خلوت سرائے لامکاں تک ہے

(اقبال)

پرکھے گا تیرا علم ہی اس کائنات کو — جانچے گی تیری عقل ہی خونِ حیات کو

وہ تو ہے جو کھرچ کے نقوشِ صفات کو — دیکھے گا اک حکیم کے مانند ذات کو

بے حد کو جس خانۂ حد سے چھڑائے گا

تو کبریا کو دامِ عدد سے چھڑائے گا

(جوشؔ)

اس کے علاوہ غالبؔ کا یہ مشہور زمانہ شعر:

ہستی کے مت فریب میں آجائیو، اسدؔ!

عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ہے

حضرت علیؑ کے فلسفۂ زمان و مکان، دنیا کی علت و اہمیت اور انسان کی نفسیاتی کیفیات کے بارے میں فکری استدلال کی وکالت کرتا ہوا نظر آتا ہے۔

''شعرائے اُردو اور عشق علیؑ'' علامہ ضمیر اختر نقوی کا وہ علمی، ادبی اور تاریخی کارنامہ ہے جس کی آج کے دور میں پہلے سے زیادہ ضرورت ہے کہ آج کے مصروف دور میں اس علم و حکمت کے ذخیرے کو اکٹھا کرنا ہی ایک کٹھن کام تھا، جبکہ علامہ ضمیر اختر نقوی نے علم و ادب و شعر کی مختلف اصناف کی تاریخ و تشریحات سے آنے والی نسل کے کام کو آسان کر دیا ہے اس کتاب کی ترتیب و تالیف سے ضمیر اختر نقوی نے مذہب و علم و ادب کی دوستی کا حق ادا کر دیا ہے اور ایک ایسا کام کر دکھایا ہے جو کہ ایک وسیع سرمایہ رکھنے والے ادارے کی ذمے داری تھا۔ یقیناً سوچنا اور لکھنا مشکل کام ہے جبکہ کتاب کا چھاپنا اس سے زیادہ مشکل ہے، بلاشبہ علامہ ضمیر اختر نقوی اس ضمن میں مبارک باد کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے علم و تجربے کو آنے والی نسل کو منتقل کرنے کی ایماندارانہ کوشش کر رہے ہیں۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے اس کام کے تسلسل کی ذمے داری نہ جتاتے

ہوئے موجودہ نسل پر عائد کر کے اس بات کا اقرار کیا ہے کہ وہ موجودہ نسل سے کسی طور مایوس نہیں۔

"شعرائے اردو اور عشق علی" کی صورت میں تحقیقی کام نے علامہ ضمیر اختر نقوی کی روشن خیال مذہبی، علمی و ادبی فکر کی ایک ایسی لو ہے جو یقیناً آنے والے کل کو روشن تر کر دے گی۔

علامہ فروغ کاظمی

علامہ ضمیر اختر نے بھی سیرت رسول کا اتباع کرتے ہوئے اور مخالفین کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنے مقاصد کی بازیابی کے لئے استقامت اور ثابت قدمی کو اپنا شعار بنایا جس کا نتیجہ کامیابی و کامرانی کی شکل و صورت میں آج دنیا کے سامنے ہے۔

تحقیق کی اعصاب شکن منزلوں سے گزر کر آپ نے جو علمی و ادبی کارنامے انجام دیئے ہیں انھیں فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ خصوصاً رثائی ادب اور مرثیہ نگاروں پر آپ کی بڑی گہری اور بلیغ نظر ہے اور اس سلسلے میں آپ کی گراں قدر خدمات قابل ستائش ہیں۔

موجودہ دور کے ذاکروں اور خطیبوں کی صف میں بھی آپ کی شخصیت نمایاں ہے۔ دلچسپ اور سحر انگیز انداز بیان کی تہہ میں علوم و معارف اور تحقیقی شعور کا عنصر کارفرما نظر آتا ہے نیز یہ محسوس ہوتا ہے کہ برجستگی و بے ساختگی اور شگفتگی و سلاست کا ایک سمندر ہے جو ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔

آپ کی قلمی کارگزاریوں کے نتیجے میں مختلف نوعیت کی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں اور آپ کی ایمان افروز تقریروں کے متعدد مجموعے بھی اشاعت پذیر ہو کر عوام سے خراج تحسین حاصل کر چکے ہیں۔

سید نسیم حیدر زیدی (جونپوری)

چند باتیں جو حقیقت ہیں

کتاب "شعرائے اُردو اور عشق علی" محترم الحاج علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی کوششوں کی انوکھی جدید تخلیق اور مفکرانہ انداز کے لحاظ سے ایک عظیم ترین دستاویز ہے۔ کتاب کو پڑھنے کے بعد جب محترم جناب سید ضمیر اختر نقوی کی شخصیت پر نظر ڈالی تو پتہ چلا کہ آپ ہندوستان و پاکستان، امریکا اور دیگر ممالک میں ایک خوش بیاں خطیب، ادیب محقق اور کائنات تاریخ کی نبض پر اپنی انگلیاں رکھنے والے انسان کی حیثیت سے اپنی عالمانہ تحریروں اور موثر تقریروں سے اپنا لوہا منوا چکے ہیں، لیکن یہ پتہ نہ تھا کہ محترم اپنی ذات میں جدید تخلیق کا سمندر بھی رکھتے ہیں جو نت نئی تخلیقات کا باعث بنا رہتا ہے۔ جب مجھ پر یہ انکشاف ہوا تو میں ذو استعاراتی طلسم خانے میں داخل ہو گیا۔ پھر اس کتاب کی تخلیق اور ہم آہنگی پر دیکھنا اور سوچنا شروع کر دیا تو منکشف ہوا کہ زندگی علمی اور تاریخی حقیقت میں کتنی عجیب اور کتنی حیرت نما ہے۔ آزادی اپنی جگہ کوئی شے نہیں ہے۔ جتنی پابندی آپ اختیار کرتے جاتے ہیں، اتنے آپ آزاد ہیں، اسی طرح ہر عقاری میں ایک مجبوری اور سکون میں ایک اضطراب کا عمل موجود ہے۔ خواہش وخواب اور تخلیق کی دنیا سمندر کی طرح متلاطم اور ہیل انگیز ہے۔ بادبان میں اس کے ظرف سے زیادہ ہوا نہیں سما سکتی اور طوفان میں مقابلے کے لیے اتنی ہی حکمت اور قوت درکار ہوتی ہے جتنا سفر درپیش ہو۔

جناب ضمیر اختر نقوی نے "شعرائے اردو اور عشق علی" میں بتایا کہ یہ انتخاب دنیائے بقائے ذات وحیات کے سیل کا سکون ہے جس کے معجزنما حسن آفریں علامتوں میں "شعرائے اردو اور عشقِ علی" کو نئے رخ اور نئے زاویے سے تلاش کیا ہے۔ جن شعرائے عشقِ علی سے سرشار ہو کر اشعار نظم کیے، ان کی اضافت ذاتی سے حقیقت کا انکشاف ایک حقیقت کا تجربہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح زندگی پھیلاؤ اختیار کرتی چلی جاتی ہے، جتنا زندگی میں شریک ہوتے چلے جاتے ہیں۔ زندگی جو قانون رکھتی ہے، تخلیق اس قانون سے باہر نہیں۔ زندگی ہو کہ شعر، دونوں اپنے جلال و جمال میں اضطراب کا سکون اور سکون کا اضطراب بن جاتے ہیں اور یہ صرف اور صرف نام علی کا وصف ہے کہ اسے لاکھ محدود کیا جائے، پھر بھی وسعت ہی وسعت دکھائی دیتی ہے۔

شاعری کی زبان میں کتاب "شعرائے اردو اور عشقِ علی" یوں بھی جا سکتی ہے کہ:

کار عشق آزمایا کرے کوئی
ضبط کو ضابطہ کرے کوئی

یعنی کار عشق شاعر کا سمندر ہے اور ضبط کو ضابطہ بنا کے عشقِ علی سے سرشار ہو کے شاعری شاعر کی معراج ہے اور اس سمندر کے غواص کو سید ضمیر اختر نقوی کہتے ہیں، اس لیے کہ اس جدید تحقیق کے سمندر میں جب بھی آپ غوطہ زن ہوئے تو ہاتھ لولو و مرجان سے بھرے پائے گئے۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کا بیان، آپ کی تحریر، بیک وقت دونوں سماعت میں طلاحت اور قلب و ذہن کی جلا اور ٹھنڈک ہیں۔ یہ در آلِ محمدؐ سے وابستگی، عقیدت اور محبت کی گواہی ہے جس میں دل کا اخلاص اپنے کمال کے ساتھ موجود ہے:

کوئی اپنے سوا نہیں موجود
اور ہے تو ہوا کرے کوئی

یا پھر:

اپنے سوا نہیں ہے کوئی ماسوا کا رنگ
دیکھا ہے ہم نے آگ جلا کر ہوا کا رنگ

اس عشق میں دوئی نہیں وحدت ہے، اس تنہائی میں خواجہ سرائی نہیں بلکہ عشقِ علی کی کیمیائی ہے جو رشتوں اور رابطوں کو ضبط کے ضابطوں کے ساتھ مسلسل POTENTISE کرنے کے عمل سے گزر رہی ہے۔

اس کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ جن عرفا و شعرائے عشقِ علی کی سرگزشت کو اپنے کلام کے ذریعے پیش کیا، ان میں ایک تو وہ ہیں جو اپنی ذات وصفات اور کلام عشقِ علی سے بے حد مشہور و مقبول ہوئے، دوسرے وہ ہیں جو اپنی ذات وصفات اور کلام عشقِ علی سے تاریخ انسانیت کو روشناس تو کر گئے لیکن خود شہرت و مقبولیت نہ پا سکے اور سپردِ خاک ہو گئے۔ ان کی مثال ان پھولوں کی سی ہے جو جنگل میں مسکرا کے کھلتے ہیں اور خود ہی کملا کے گر جاتے ہیں لیکن ان کے حُسن کا دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ پس سرورِ کائنات کو یہ کیسے گوارا ہوتا کہ میرا بھائی، میرا وزیر، میری محبت کا مرکز، میرا قوتِ بازو، قرآنِ کل، صاحبِ ایمان کا ولی یعنی حضرت علی ابن ابی طالب علیہ السّلام کی سیرت وصورت، رفتار و گفتار پر اپنے تخیلات کے قلم سے رنگ افشانی کرنے والے صاحبِ سیف وقلم کے ممدوح ہوتے ہوئے اس دنیا سے معروف و مقبول ہوئے بغیر کیسے اٹھ سکتے ہیں، اس لیے یہ در محمدؐ کا فیض ہے کہ علامہ سید ضمیر اختر نقوی نے ان شعرا کے نام، ان کی ذات وصفات، ان کے کلام کو ۸۷ ابواب میں درج کر کے سلسلہ وار ۱۸۲ کتابوں سے استفادہ کرتے ہوئے تاریخ کے دامن میں نئے انداز سے سجا دیا جو ایک دشوار گزار مرحلہ تھا۔

اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہر ادیب، ناقد اور محقق کو بیک وقت تقریر و تحریر، دونوں پر ملکہ حاصل نہیں ہوتا۔ لیکن اس دور کی عظیم ہستی جنھیں علامہ سید ضمیر اختر نقوی کہتے ہیں، بیک وقت تقریر اور تحریر دونوں پر یکساں عبور رکھتے ہیں۔ چونکہ آپ نے اپنی ذات کو محمدؐ و آلِ محمدؐ کے لیئے وقف کر دیا ہے، اس لیئے آپ کو ان کی محبت کا وہ ثمر مل گیا جس کا ہر تخم اک مکمل شجر ہے، جس کے سائے میں بیٹھنے والے کے لیئے فکر عبادت ہے، جس کے ہر کام تجربے سے انجام پاتے ہیں، اعمال آگہی سے پورے ہوتے ہیں، علم فہم سے حاصل ہوتا ہے، فہم شعور سے ملتا ہے اور شعور بصیرت کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جس کا جیتا جاگتا ثبوت اس کتاب میں کچھ اس طرح موجود ہے کہ فصاحت کو حسنِ بیاں، انداز تکلم کو زباں، دریائے معنی کو طبع رواں اور درج دہاں کو دُرِ مقصود سے بھر دیا ہے۔

صرف دو چند باتیں جو حقیقت ہیں، حقیر نے قلم بند کردیں اس یقین کے ساتھ کہ مطالعے کے شوقین حضرات و قارئین کرام اس کتاب سے ضرور استفادہ کریں گے۔

ڈاکٹر قمقام حسین جعفری

۳۰ ر اکتوبر ۱۹۸۳ء ..... کراچی

جناب ضمیر اختر نقوی صاحب ..... آداب! مجلس میں شرکت نہ کرنے کا افسوس ہے اسی بہانے آپ سے ملاقات ہوجاتی اور آپ کی بیش بہا کتاب "اردو مرثیہ پاکستان میں" پر مبارک باد پیش کر دیتا۔ آپ کی محنت اور مرثیے سے شغف کی جتنی داد دی جائے وہ کم ہے اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ (آمین)

سیّد مراد جعفری (رئیسِ تحقیق دانشِ شرق، پاکستان)

علامہ ضمیر اختر نقوی کی تحقیقی کاوشوں کا جیّد مجموعہ

"شعرائے اُردو اور عشقِ علی علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی تحقیقی کاوشوں کا ایک جیّد مجموعہ ہے۔ ۹۱۲ صفحے کی یہ کتاب آسمانِ عصمت وولایت کے پہلے ماہتابِ درخشاں، مسلم اوّل شہ مرداں، امامِ انس وجاں، ساقیٔ کوثر، شہر یارِ فکر، دنیائے اسلام کی عالی قدر شخصیت اور راہِ خدا کے عظیم مجاہد اور حقوقِ انسانی کے پاسباں حضرت علی ابنِ ابی طالبؑ اور ان کے مکتب سے دوستی ومحبت رکھنے والے شعرائے کرام کے نذرانۂ عقیدت اور ہدیۂ تہنیت کا انتخاب ہے۔ یہ کتاب عربی، فارسی اور اُردو کے مشاہیر شعرا کے منتخب کلام پر مشتمل ہے جو عظیم ہونے کے ساتھ تنوع کی بھی حامل ہے۔ فاضل مولف نے کتاب کی ترتیب میں اصل موضوع کے ساتھ ساتھ موضوع کے ذیل میں مختلف عنوانات بھی قائم کیئے ہیں۔ اس کتاب کی تکمیل میں ضمیر اختر نقوی صاحب کو کتنی کٹھن وادیوں سے گزرنا پڑا ہوگا۔ اس کا اندازہ صرف وہی لوگ کر سکتے ہیں جو مذہبی، تاریخی اور ادبی تحقیق وتنقید کی راہ سے گزر چکے ہیں اور جن کی قوتِ اخذ وانتخاب خام مواد کے ڈھیر سے نفیس اجزا کو منتخب ویکجا کر دینے کا فریضہ ادا کر چکی ہو۔

ضمیر اختر صاحب ایک عرصے سے تحقیق وتحریر کی دشوار گزار وادیوں میں سفر کر رہے

ہیں۔ ان کا یہ سفر بے مقصد نہیں، بلکہ وہ ایک عظیم مقصد کے پابند ہیں اور ان کا ہدف رثائی ادب ہے۔ وہ اس سلسلے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور بہت کچھ لکھ رہے ہیں۔ تقریر سے تحریر تک ان کے یہاں مقصد کی بلندی بہت واضح نظر آرہی ہے۔ آج جبکہ فضائل علی سے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت چشم پوشی کی جارہی ہے، آج جبکہ معاشرے میں حب ذات، حرص و خود غرضی، تفرقہ و انتشار، منافقت و عصبیت، بہتان و بدیانتی پورے عروج پر ہے اور انسان کائنات کی ان عظیم ہستیوں سے روشناس ہونے کے بجائے خود اپنے آپ سے بیگانہ ہو چکا ہو اور خود اپنی ذات میں مقید اور اپنے مسائل کے حصار میں گھرا ہوا ہو تو یہ مشکل ہے کہ وہ حق و باطل میں تفریق کر سکے اور پورے شعور اور پورے خلوص و اتحاد و اتفاق، یکسوئی و یک دلی و محبت کے ساتھ اپنے اکابرین، اپنے رہنماؤں اور اپنے دینی رہبروں کے بارے میں سوچ سکے اور ان کے کردار و عمل کی روشنی میں اپنے مسائل کا حل ڈھونڈ سکے عزت و عظمت کی بلندیوں پر فائز ان ذوات مقدسہ سے اجتناب و انحراف کا نتیجہ یہ نکلا کہ آج مسلمان ٹکڑیوں میں بٹ کر رہ گیا ہے، اور سیرت علی اور ان کی تعلیمات سے روگردانی کے نتیجے میں ہم قعر مذلت میں گر کے قصۂ پارینہ بن چکے ہیں۔ دنیا نے حضرت علی علیہ السلام سے چشم پوشی کر کے اور ان کی عظیم تعلیمات کے حیات بخش ثمرات سے استفادہ نہ کر کے خود اپنی زمین پر جہنم کشید کر لیا ہے جس کے نتیجے میں زندگی کے سارے پیمان و پیمانے شکستہ ہو چکے ہیں۔ علی کو اپنے جیسا انسان سمجھنے والے علی کو تعجب کی منزلوں میں تلاش کریں۔ علی سطحی عقل و فکر رکھنے والوں کی سمجھ میں نہیں آسکتے۔

تاریخ ادب عربی و فارسی و اردو کا مطالعہ کرنے والے اس بات سے بخوبی آگاہ ہیں کہ جن شعرا نے علی شناسی پر اپنی شاعری کی بنیاد ڈالی اور جو اپنی پرواز فکر کو آستانۂ علی

تک لے گئے اور جنھوں نے باب مدینۂ علم پر جبیں سائی کی، وہ تاریخ ادب میں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔ اُردو شاعری میں میر تقی میرؔ، اسد اللہ خاں غالبؔ، نظیرؔ اکبر آبادی، میر ببر علی انیسؔ، مرزا سلامت علی دبیرؔ، علامہ اقبال اور جوشؔ ملیح آبادی کو جو مرتبہ و منزلت حاصل ہے، وہ اُردو کے کسی شاعر کو حاصل نہیں۔ خود میر صاحب اس کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:-

سگ کو میرؔ! میں اس شیرِ حق کا ہوں کہ جس کو سب
نبی کا خویش و بھائی حیدرِ کرار کہتے ہیں

میرؔ صاحب صرف خود کو علی کے در کا سگ ہی نہیں کہتے بلکہ ان کی مدح خوانی کو اپنی نجات کا ذریعہ بھی سمجھتے ہیں:

فکرِ نجات میرؔ کو کیا، مدح خواں ہے وہ
اولاد کا علی کی، محمدؐ کی آل کا

میرؔ صاحب اور ہمارے دیگر متقدمین و متوسطین شعرا نے مدحِ علی کی وساطت سے خود کو زندہ رکھا اور تاریخ ادبِ اُردو میں ان کا نام ہمیشہ زندہ رہے گا اور ان کا تذکرہ محافل و مجالس میں آج بھی نہایت عقیدت و احترام سے کیا جاتا ہے۔ میر انیسؔ اعلی اللہ مقامہٗ آج بھی زندہ ہیں، مرزا سلامت علی دبیرؔ آج بھی زندہ ہیں، میر تقی میرؔ آج بھی زندہ ہیں۔ ان کے قصائد سن کر آج بھی مسلمان ولائے علی علیہ السلام کے جذبے سے سرشار ہو جاتا ہے۔ ان شعرا نے حکومتوں اور امرا کے مزاج کی کبھی پروا نہیں کی اور اپنے عقائد کے معاملے میں کبھی کسی سے سمجھوتا نہیں کیا بلکہ ہمیشہ اس کا برملا اظہار کیا، اور درِ علی سے وابستہ ہونے کی وجہ سے وہ آج بھی زندہ ہیں اور تا قیامِ قیامت زندہ رہیں گے۔

اُردو کے ایک اور بڑے شاعر نظیرؔ آبادی علی کو تعجب کی منزلوں پر تلاش کرتے ہوئے

کہتے ہیں:

حیرت میں ہوں کہ حیدرؑ صفدر کو کیا لکھوں

غالب کہتے ہیں:

غالب ندیم دوست سے آتی ہے بوئے دوست
مشغولِ حق ہوں بندگیِ بوترابؑ میں

میر انیس، جو شہنشاہِ اقلیم تھے، کسی غیر کی مدح کرنا اپنی توہین سمجھتے تھے۔ خود انیس کہتے ہیں:

غیر کی مدح کریں شہؑ کے ثنا خواں ہو کر
مجرئی اپنا حشم کھوئیں سلیمانؑ ہو کر

علامہ اقبال اپنے ایمان کا سرمایہ عشقِ علیؑ کو قرار دیتے ہیں:

مسلم اوّل ، شہِ مرداں علیؑ
عشق را سرمایۂ ایماں علیؑ

ایک اور جگہ علامہ اقبال کہتے ہیں:

نجف میرا مدینہ ہے ، مدینہ ہے مرا کعبہ
میں بندہ اور کا ہوں امتِ شاہِ ولایت ہوں

جوش ملیح آبادی محبت اہل بیتؑ کی وجہ سے، کس مرتبے کے حامل تھے، خود جوش صاحب سے سنیں:-

مجھ سے دو عالم ضوفشاں ، مجھ پر دو عالم منجلی
ظاہر میں رندِ بادہ کش ، باطن میں درویش و ولی
میری ردائے فقر میں بوئے حسینؑ ابن علیؑ

گفتار میں کافر گری ، افکار میں پیغمبری

میں حیدری ہوں ، حیدری

میں حیدری ہوں ، حیدری

ان شعرا نے حضرت علی علیہ السلام کی شخصیت کی معرفت حاصل کی ، ان کی تعلیمات سے فیض حاصل کیا، ان کے روحانی کمالات سے عرفان حاصل کیا اور خود کو ان کے در سے وابستہ کر کے ان کے نام سے اپنا نام روشن کیا اور تاریخ ادب کے زندہ پائندہ شاعر بن گئے۔ خواہ وہ حسان بن ثابت ہوں یا امام شافعی ، کمیت بن زید اسدی ہوں یا اسماعیل حمیری ، دعبل خزاعی ہوں یا فرزدق ، ابی الحدید معتزلی ہوں یا فردوسی ، سنائی ہوں یا عطار ، مولانا روم ہوں یا عرفی ، نظیری ہوں یا شمس تبریز ، سعدی ہوں یا حافظ ، جامی ہوں یا شاہ نعمت اللہ ، دکن کے شعرا ہوں یا دلی کے ، لکھنؤ کے شعرا ہوں یا لاہور کے ، ہر شخص نے تا حد بصیرت بارگاہ علی میں اپنا نذرانۂ عقیدت پیش کیا۔ ان تمام شعرا کے ہدیۂ تہنیت کو علامہ ضمیر اختر نقوی نے بڑی مہارت فن سے منتخب و مرتب کیا ہے۔ انھیں اپنی زبان پر پوری قدرت حاصل ہے۔ ان کی رواں دواں نثر ، ان کا مطالعہ ، ان کا تحقیقی مزاج اور فکر سے معمور انداز بیان انھیں اپنے ہم عصروں میں ممتاز کرتا ہے اور ایک منفرد مقام دیتا ہے۔ اُمید ہے کہ ہمارے قطعی غیر جانب دار و ثقہ نقاد ان کی اس کوشش کو پسند کریں گے اور ان کی تخلیقی و تحقیقی صلاحیتوں کا اعتراف کریں گے۔ ضمیر اختر نقوی نے نہ صرف اُردو زبان کے مشاہیر شعرائے کرام کے کلام کا انتخاب کیا ہے ، بلکہ ان شعرا کے کلام کو بھی تلاش کیا ہے جن سے موجودہ نسل واقف نہیں ہے۔ اگر چہ وہ اپنے وقت کے معروف شعرا تھے ، لیکن ادبی بے ذوقی اور تحقیق کے فقدان کی دبیز گرد نے بڑے بڑے باکمال شعرا کے چہروں کو ڈھانپ دیا ہے ، مگر ضمیر اختر

صاحب نے تلاش بسیار کے بعد برصغیر کے متعدد کتب خانوں کی خاک چھان کر اور دریائے سخن میں غواصی کے بعد ان نادر و نایاب موتیوں کو حاصل کر کے اپنی کتاب کی زینت بنایا ہے۔ جن شعرا کا کلام پیش کیا ہے، ممکن حد تک ان کی مختصر سوانح حیات بھی تحریر کر دی ہے تاکہ تحقیق کا حق ادا ہو سکے، اگرچہ اس دور میں اس قسم کی تلاش و جستجو کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے اور اسے ادبی تجارت کے منافی قرار دیا جاتا ہے اور صرف وہی مواد منظر عام پر آتا ہے۔ جس کا تعلق ذہنی تعیش یا حالات حاضرہ سے ہو۔ دوسری طرف عوام میں مطالعے کے ذوق کا فقدان پیدا ہو چکا ہے اور یہ فقدان اس حد تک بڑھ چکا ہے کہ لوگ اپنی فکری اساس بھی کھو بیٹھے ہیں اور فکری یہ معطلی کسی زندہ قوم کی علامت نہیں ہوتی بلکہ ذہنی و فکری سطحیت کی دلیل ہے۔

امید ہے کہ قوم کے سنجیدہ حلقوں میں یہ کتاب پسند کی جائے گی اور والائے مولا اور عشق علی میں سرشار مومنین مرکز علوم اسلامیہ کی اس خدمت کو پسندیدگی کی نظر سے دیکھیں گے۔

ڈاکٹر سبط حسن رضوی

جناب ضمیر اختر صاحب...... سلام و آداب........

"امید ہے کہ آپ اپنی ادبی سرگرمیوں میں مصروف ہوں گے۔ زبان و قلم کی جولانیوں کی نعمت بیک وقت بہت کم لوگوں کو حاصل ہوتی ہے۔ خطیب اور ادیب ایک ہی شخصیت میں کمتر جمع ہوتے ہیں۔ دنیا تو نہیں پہچانے گی چہ جائیکہ قدر شناسی کرے لیکن آپ اپنے آپ کو پہچانئے۔ خداوند عالم آپ کو صحت و سلامتی کے ساتھ ان خدمات کو جاری رکھنے کی ہمت اور توفیق دے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔

دعا گو...... سید سبط حسن رضوی

حیدر علی اختر

اہلِ علم وادب کے لیئے مینارہ نور

عربی، فارسی اور اُردو ادب کے سمندروں سے مدحِ علی کے صدف چنا خطیب معصومین حضرت ضمیر اختر کا ایسا کارنامہ ہے جو رہتی دنیا تک اہل علم وادب کے لیئے مینارۂ نور ثابت ہوگا۔ اور یہ کارنامہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ موصوف عشقِ علی کے جذبے سے سرشار ہیں۔ یہ جذبہ اس وقت تک اپنے کمال کو نہیں پہنچتا جب تک معرفتِ علی رگ و پے میں لہو بن کر رواں دواں نہ ہو۔ مجھے یقین ہے کہ اس تحقیقی اور تاریخ ساز تالیف ''شعرائے اُردو اور عشقِ علی'' کا مطالعہ اہل ادب کے لیئے نہ صرف علم نظر ہے بلکہ باعث افتخار بھی ہے۔

خطیب معصومین حضرت ضمیر اختر نہ صرف لاثانی مقرر ہیں بلکہ لاتعداد کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ ان کی تقریر و تحریر کا ہر جملہ سننے اور پڑھنے والوں کے لیئے اپنے علم میں اضافے کا باعث ہوتا ہے۔

بارگاہِ رب العزت میں میری دعا ہے حضرت ضمیر اختر طویل عمر پائیں تا کہ یہ اپنے تحقیقی کارناموں سے نہ صرف اپنے لیئے بلکہ ہمارے لیئے بھی زادِ راہ پروانۂ نجات فراہم کرتے رہیں۔

شاہد جعفر

خوب سے خوب تر کی آئینہ دار کتاب

مدحِ مولائے کائنات کا سفرِ تخلیقِ کائنات سے جاری ہے اور تا شامِ ابد جاری رہے گا۔ ادبِ عالیہ کا ایوان مدحِ علیؑ کی تابانیوں سے جگمگا رہا ہے۔ اس کرۂ ارض پر بولی جانے والی ہر زبان ذکرِ ابوترابؑ کے سرمائے سے مالا مال ہے۔ چونکہ شاعری اظہار کا موثر ترین ذریعہ ہے، اس لیے اُردو ادب میں یہ ذریعۂ اظہار اپنے کمال پر ہے اور اس کمال کو اوج مدحِ علیؑ کے سبب نصیب ہوا ہے۔

ذکرِ علیؑ بحرِ بے کراں ہے اور اس بحرِ ذخار سے گہر تلاشنے کی سعادت بہت کم صاحبانِ نظر کے حصے میں آتی ہے۔ ذاکرِ معصومینؑ جناب ضمیر اختر نقوی ان چند خوش نصیبوں میں سے ایک ہیں جنھیں مشیت نے اس عظیم منصب کا اہل گردانا ہے۔ ''شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ'' جیسا تحقیقی کام کرنے پر میں جناب ضمیر اختر نقوی کو ہدیۂ تبریک پیش کرتا ہوں کہ ان کے تحقیقی کاموں میں کتاب خوب سے خوب تر کی آئینہ دار ہے۔ ہر چند کہ یہ اس عہد کی ایک ناقابلِ فراموش تالیف ہے مگر بقول غالب:

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہیے اس بحرِ بے کراں کے لیے

پرویز بلگرامی

مقالوں کے سرمائے میں منفرد اور قابلِ قدر کارنامہ

اس مقالے کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ اس سے بھی ہو سکتا ہے کہ یہ خالصتاً مذہبی نہیں، ادبی حیثیت کا حامل ہے۔ اسے جس ادبی ذوق اور شعور کی رونمائی میں محبت اور لگن کے ساتھ مرتب کیا گیا ہے، اس کی تعریف نہ کرنا حوصلہ شکنی ہے۔ شعرا کے حالات اور کلام کو فراہم کرنے کے لیے جوئے شیر لانے سے زیادہ محنت کرنا پڑتی ہے، اس کے بعد بھی خاطر خواہ کامیابی نہیں ہوتی۔ نقوی صاحب کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے حب علی سے سرشار شعرا کو تلاش کر کے ان کے کلام کو اردو دنیا میں پیش کر دیا۔ ان شعرا میں بیشتر ایسے ہیں جن کے اس نوعیت کے کلام کا علم ادبی دنیا کو نہیں تھا۔ ایسے مواد فراہم کرنا کارے دارد تھا، لیکن محترم ضمیر اختر نقوی نے بڑی حد تک راہ کی تمام مشکلات سے مقابلہ کیا اور مطالعہ و رابطہ کے ذریعے جو کچھ معلوم ہو سکا، اس کو چھان پھٹک کر مقالے میں شامل کر لیا۔ ان کی کوشش، محنت اور تلاش کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ انھوں نے بہت بڑی تعداد میں ادبی تاریخ، تذکروں اور مخطوطات کا مطالعہ کیا اور اس سے جوہر کشیدہ کیا۔ تحقیقی کام کرنے والوں کو حیرت انگیز اور مایوس کن تجربہ اس وقت ہوتا ہے جب کتابوں کا ڈھیر کھنگالنے کے بعد بھی مدد نہیں ملتی۔ ضمیر اختر نقوی کو بھی

انھی دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا ہوگا، پھر بھی اتنی بڑی تعداد میں منتخبہ بالا قبیل کے اشعار یکجا کر دینا قابلِ تعریف ہے۔

اردو کے شعرا پر روشنی ڈالنے سے قبل عربی وفارسی کے شعرا کے نذرانہ عقیدت کو پیش کرنا پھر اس سے قبل حضرت علی علیہ السلام کی مدح قرآن المجید کے آئینے میں پیش کرنا ایک نمایاں کارنامہ کہا جاسکتا ہے، کیونکہ دقیق انداز میں ایسی باتیں مذہبی کتابوں میں تو لکھی جاتی ہیں مگر عام فہم انداز میں کتابوں میں ایسا بہت کم لکھا گیا ہے۔

"شعرائے اردو اور عشقِ علی" ایسے ایسے جواہرات سے مالا مال ہے جسے مقالوں کے سرمائے میں یقیناً پسندیدگی کی نظر سے دیکھا جائے گا۔

☆ ☆ ☆

ڈاکٹر سبطِ حسن رضوی

۲۵ مئی ۱۹۷۶ء ... اسلام آباد

جناب ضمیر اختر نقوی صاحب ..... سلام مسنون

"ماہِ نو" کا "انیس نمبر" دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کی محنتیں ضائع نہیں ہوئیں اور اس امر کا افسوس ہوا کہ دبستانِ انیس آپ کی صلاحیتوں سے خاطر خواہ استفادہ نہ کرسکا۔ دبستان کا رسالہ ابھی پریس میں ہے اگر کوئی مواد آپ کے پاس تازہ اور ہو تو ضرور روانہ کر دیں خواہ وہ نظم کا ہو یا نثر کا۔

"ادارۂ باب مدینۃ العلم سے شائع ہونے والا رسالہ "سید الساجدین" دیکھا بہت پسند آیا اور اس میں آپ نے جو کتابی حوالے دیے ہیں وہ بڑی اچھی بات ہے۔ اس سلسلے کو جاری رکھیے۔ میں بھی اس کارِ خیر میں شاہ حماد صاحب کے ساتھ شامل ہوسکوں"۔

سیّد سجاد شبیر رضوی (نمائندہ وکلائے شیعہ، لاہور)

ایک صحافی کا تبصرہ

علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے۔ ادب کے حوالے سے علامہ صاحب کا شمار برصغیر کے نامور ریسرچ اسکالرز میں ہوتا ہے اور خطابت میں علامہ صاحب نے ایک الگ ہی مقام پایا ہے۔ علامہ صاحب کی تقریر اس لحاظ سے منفرد ہوتی ہے کہ علامہ کی گفتگو کا اپنا ایک منفرد انداز ہے اور آپ کی تقریر تاریخی حوالے سے اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ چونکہ میرا تعلق شیعہ صحافت سے ہے اور میں ابھی اپنا مقام بنانے کی جدوجہد میں سرگرداں ہوں تو ایسے میں علامہ ضمیر اختر نقوی سے میری ملاقات کافی تقویت کا باعث ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر مجھے علامہ صاحب کی مزید شفقت ملی تو میں ضرور اپنا ایک مقام بنالوں گا۔ ڈاکٹر صاحب کی محفل میں جب کوئی نوجوان بیٹھتا ہے تو وہ خالی نہیں اٹھتا بلکہ کچھ حاصل کر کے اٹھتا ہے۔

مجھے علامہ صاحب سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا مگر دل میں ایک ڈر اور خوف بیٹھا ہوا تھا کہ میں اتنی بڑی ادبی شخصیت سے سوال و جواب کس طرح کروں گا جن کے پاس لفظوں کا سمندر موجود ہے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کی خواہش کا اظہار مولانا اظہار حیدر نقوی سے کیا تو مولانا نقوی مسکرا کر کہنے لگے، "اگر آپ ڈاکٹر صاحب سے ایک دفعہ مل لیں گے تو پھر ان کو کبھی نہیں بھول پائیں گے" لہٰذا مولانا اظہار نقوی نے فون پر میری بات ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی سے کروائی۔ فون پر میں نے ڈاکٹر صاحب سے

انٹرویو کا وقت مانگا تو ڈاکٹر صاحب کہنے لگے۔ ''میرے گھر کے دروازے ملت کے ہر نوجوان کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔ آپ کی جب مرضی ہو، آپ فون کر کے آجائیے''۔ مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ میں نے اپنی زندگی میں تقریباً ڈیڑھ سو شخصیات کے انٹرویو کیے ہیں مگر آج تک کسی نے پہلی مرتبہ وقت نہیں دیا بلکہ اپنے کو مصروف ظاہر کرنے کی ناکام کوشش ضرور کی ہے۔

میں دوسرے دن ڈاکٹر صاحب کے دولت کدے پر روانہ ہوا۔ میرے ساتھ مولانا اظہار نقوی صاحب بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ میں نے جب اپنا مکمل تعارف کروایا تو ڈاکٹر صاحب کے یہ الفاظ مجھے بہت ہی پسند آئے۔ ''آپ نوجوان ہیں اور نوجوان ہر وہ کام کر سکتے ہیں جس کا وہ مضبوط ارادہ کر لیں'' ان الفاظ سے مجھے کافی حوصلہ ملا کہ واقعی نوجوانوں کی قدر و قیمت ادبی سطح پر ہے۔ ان الفاظ کے بعد میں نے ڈاکٹر صاحب سے انٹرویو کا آغاز کیا تو ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ وہ لکھنؤ میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم بھی لکھنؤ میں حاصل کی اور اپنی زندگی کی پہلی مجلس بھی لکھنؤ میں پڑھی اور اب تک تقریباً ساڑھے پانچ سو موضوعات پر تقاریر کر چکے ہیں جو تمام نئے اور اچھوتے موضاعات ہیں۔ اب تک تقریباً ۱۱۸ کتابیں تحریر کی ہیں۔ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی سے ایک اہم سوال بھی کیا کہ ملک سے تمام تعصبات کا خاتمہ کس طرح ممکن ہے تو علامہ صاحب نے فرمایا کہ ان تمام تعصبات کا خاتمہ ادبی سطح پر ممکن ہے، اور ادب ایسا موضوع ہے جس میں مذہب، قوم، فرقہ کچھ نہیں ہوتا اور ادب بس ادب ہوتا ہے۔ علامہ نے یہ شکوہ بھی کیا کہ پاکستان میں ایسا کوئی بھی شعبہ فنون لطیفہ کا نہیں بنایا گیا جس کے بنا پر سفارت کے فرائض ادب، شعراء، دانش ور یا خطیب ادا کریں۔ اگر ان کو مضبوط کر دیا جائے تو تعصبات دم توڑتے چلے جائیں گے۔ انٹرویو

ہم نے اور بھی بہت سے سوال کیئے اور علامہ صاحب نے بڑے تحقیقی اور مدلل جوابات۔ یہ انٹرویو لاہور کے ایک اخبار ہفت روزہ ندائے شیعہ میں شائع ہوا جس کے مدیر معروف صحافی جعفر علی میر صاحب ہیں۔ لوگوں نے یہ انٹرویو بہت پسند کیا، اور پورے پاکستان سے مجھے کافی خطوط ملے جن میں علامہ صاحب کے بہترین جوابات پر علامہ کو مبارک باد دی گئی تھی۔

انٹرویو کے اختتام پر علامہ صاحب نے ہمیں بہت سی کتابیں بطور تحفہ پیش کیں، مگر ان میں ایک بہت اہم کتاب "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" بھی ہمیں بطور تحفہ دی جس کے پڑھنے کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ مولائے کائنات کے عشق میں ویسے تو شعرائے بہت کچھ کہا ہے مگر پاکستان میں وہ تمام کلام ایک جگہ مدون نظر نہیں آرہا تھا۔ مگر علامہ صاحب نے اس کتاب میں مولائے کائنات کی شان میں کی جانے والی شاعری کو خوبصورت انداز میں ایک جگہ جمع کر کے واقعتاً نہ صرف اُردو ادب کی ایک بڑی خدمت کی ہے بلکہ یہ کتاب اُردو داں طبقے کے لیئے گراں قدر سرمایہ ہے۔

پوری کتاب پر تبصرہ کرنا میرے بس کی بات نہیں ہے اور نہ میں اس قابل ہوں کہ اس کتاب پر تبصرہ کروں، مگر ایک طالب علم کی حیثیت سے جو میری سمجھ میں آیا ہے، وہ یہ کہ "قرآن میں حضرت علیؑ کے فضائل" کو جس خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے، وہ اس کتاب کا ایک اہم ترین باب ہے۔ جس میں مولائے کائنات کی ذوالفقار اور گھوڑے تک کی مدح قرآن سے ثابت کی گئی ہے۔ کتاب کا چھٹا باب "اُردو مرثیہ نگار اور مدحتِ علیؑ" بھی پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس کتاب کے لکھنے میں علامہ نے جن کتابوں سے استفادہ کیا ہے، ان کی فہرست دیکھ کر قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ علامہ موصوف نے اس کتاب کے لکھنے میں کتنے شب و روز صرف کیئے ہیں، خاص کر غدیرِ خم

کے اہم موضوع پر "سرچشمِ غدیر" سے مدح کے جو اشعار درج ہیں، وہ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔

میں ابھی اس کتاب کا بغور مطالعہ کر ہی رہا تھا کہ مجھے محترمہ نصرت بھٹو سے ملاقات کا وقت ملا تو میں نے یہ سوچا کہ کیوں نہ میں محترمہ نصرت بھٹو کو یہ کتاب بطور تحفہ پیش کروں لہٰذا میں نے ملاقات کے دوران محترمہ کو یہ کتاب بطور تحفہ پیش کی۔ میں بھی سمجھ رہا تھا کہ بیشتر سیاست دانوں کی طرح محترمہ نصرت بھٹو بھی اس کتاب کو لے کر ایک دفعہ دیکھ کر رکھ دیں گی یا اپنے پی۔اے کو پکڑا دیں گی۔ مگر مجھے سخت حیرت ہوئی کہ محترمہ نصرت بھٹو نے کتاب لینے کے بعد اور ٹائٹل پر نام پڑھنے کے بعد اس کتاب کے ہر زاویے کو دیکھنا شروع کر دیا اور وقفے وقفے سے اپنی گفتگو کے دوران اس کتاب کے بارے میں مجھ سے سوال و جواب کرتی رہیں اور ساتھ ہی اس کے مکمل مطالعے کا اشتیاق ظاہر کرتی رہیں۔

میری دعا ہے کہ ڈاکٹر علامہ ضمیر اختر نقوی اسی طرح ادب کی خدمت کرتے رہیں اور ان کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر قائم رہے۔

زیڈ اے بخاری

۴؍ نومبر ۱۹۷۶ء.....کراچی

مکرمی ضمیر اختر صاحب، سلام مسنون..... حکم نامہ ملا، میں دسمبر کی دسویں کو بشرطِ زندگی حاضر ہوں گا اور آپ کے ارشاد کے مطابق "جب قطع کی مسافتِ شب آفتاب نے" پڑھنے کی کوشش کروں گا اب دم خم کہاں، مگر کوشش ضرور کروں گا، یہ مرثیہ زور مانگتا ہے اللہ مددگار ہو۔ مجھے شروع میں پڑھوا دیجئے۔ نسیم صاحب کے بعد کیا خاک پڑھوں گا.....زیادہ دعا.....خاکسار.....ذوالفقار

سیّد حسن رضا زیدی (لاہور)

"شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ"

موضوع کے اعتبار سے پہلی کتاب

"شعرائے اُردو اور عشقِ علی" اپنے موضوع کی اہمیت وافادیت کے لحاظ سے فضائلِ علی کا وہ شعری صحیفہ ہے جس کے مطالعہ سے روح میں بالیدگی، فکر میں توانائی اور ایمان میں پختگی پیدا ہوتی ہے۔

اس کتاب کے مصنف علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی ہیں جو فضائل محمد وآل محمد علیہم السلام کا انبار لگانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے اور ہمیشہ ان موضوعات پر بآواز بلند سوچتے رہتے ہیں۔ آپ کی ذات والاصفات حلقہ اہل نظر میں محتاج تعارف نہیں آپ اکی بے شمار کتابوں کے خالق ہیں۔

شعرائے اُردو اور عشقِ علی کی تالیف اور طباعت کا مقصد بیان کرتے ہوئے علامہ فرماتے ہیں۔ "شعرائے اُردو اور عشقِ علی کی اشاعت وضابطہ تحریر میں لانے کا مقصدو مدعا صرف اور صرف یہ ہے کہ جہان بشریت کو اولیاء کرام وصوفیائے عظام، عرفاء ادباء اور شعراء کے خیالات اور ان کی نگاہ میں حضرت علی علیہ السلام کی جو وقعت ومنزلت ہے اس سے مسلمانانِ عالم کے بزرگوں، جوانوں اور بچوں کی روشناس کرایا جائے اور عشقِ علی جیسی متاع بے بہا اور گرانقدر نعمت کو پوری تابنا کی اور آن بان سے زندہ وباقی

رکھا جائے" اس سلسلے میں علامہ نے سالہا سال کی محنت و سعی پیہم کے بعد ان شعراء و عرفا کے کلام کو دنیا کے مختلف ممالک کے کتب خانوں سے حاصل کر کے ان پر جمی ہوئی وقت کی تہہ در تہہ گرد کو جھاڑ کر عشق علی سے سرشار اہل نظر مسلمان و موالیان حیدر کرار کے مطالعہ کے لئے نذر کیا ہے۔ کتاب اپنے موضوع کے اعتبار سے انتہائی معتبر و وقیع۔ مواد کے اعتبار سے قابل اعتبار اور طباعت کے لحاظ سے نہایت عمدہ ہے۔ معیاری کاغذ اور خوبصورت اور دیدہ زیب جلد نے کتاب کے ظاہری حسن کو اور نمایاں کر دیا ہے۔ اُمید ہے کہ معیاری کتابوں کا ذوق رکھنے والے علی شناسی کے آرزومند اور شعروادب سے تعلق رکھنے والے اس کتاب کی پذیرائی فرمائیں گے اور فضائل علی کے اس صحیفے کا نہ صرف خود مطالعہ فرمائیں گے بلکہ دوسروں کو بھی اس کے مطالعہ کی دعوت دیں گے۔ میں یہ بات دل کی پوری گہرائی اور پورے شعور سے کہہ سکتا ہوں کہ اس موضوع پر اس سے بہتر کوئی کتاب آج تک زیر مطالعہ یا منظر عام پر نہیں آئی۔

اس کتاب میں ڈاکٹر پروفیسر کاظم علی خان (لکھنؤ) کی تقریظ اور معروف ادیب و شاعر آل محمد رزمی کا مقدمہ ہے بلاشبہ یہ مقدمہ کتاب کے شایان شان ہے۔ جس میں رزمی نے اپنے مخصوص انداز سے علامہ ضمیر اختر نقوی اور ان کی معرکتہ الآرا کتاب پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ اور کتاب کے اوصاف کو مزید اجاگر کر کے اس کی عظمت کو دوبالا کیا ہے۔

☆ ☆ ☆

maablib.org

سید کمال حیدر رضوی

"شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ"

تحریر و تقریر کا کوثر

"حضرت امیرالمومنین علیہ السلام نے فرمایا" لَا مَذْھَبَ لِمَنْ لَا اَدَبَ لَہٗ "

"جس کے پاس ادب نہ ہو اس کے پاس مذہب نہیں"

ادب اور مذہب کے اس رشتے کی معرفت رکھنے والوں میں علامہ سید ضمیر اختر نقوی مدظلہ بھی ہیں اور اس عہد میں تو سرفہرست ہیں اور اسی ناطے علم اور ادب آپ کی شخصیت کا جمال قرار پاتا ہے کہ یہ بھی امیرالمومنین علیہ السلام نے ہی فرمایا ہے جمال درحقیقت علم وادب کا ہے۔ شخصیت کے اسی جمال کا پرتو جہاں آپ کی تقاریر میں نظر آتا ہے وہاں آپ کی تصانیف میں بھی روشن ہے "شعرائے اردو اور عشق علیؑ" جیسا پرنور صحیفہ بھی اسی روشنی کا تسلسل ہے۔

آپ کو معاشرے میں فن کی پرستش کرنے والے تو بہت مل جائیں گے لیکن فنی ذوق کی تربیت کرنے والے خال خال ہی نظر آئیں گے نہ تو ادارے اور نہ شخصیات۔

حضرت علامہ ضمیر اختر نقوی ایسی ہی ایک شخصیت اور اپنی ذات میں ایک ادارہ ہیں جنھوں نے اپنی تقریر اور تحریر دونوں کے ذریعے فنی ذوق کی تربیت کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی آپ نے ہمیشہ تقریر ہو یا تحریر ایسے موضوعات اٹھائے اور ان پر سیر حاصل

بحث کی جن سے صاحبان فکر کے لئے جستجو، تفحص اور تدبر علمی کے دروازے کھلتے رہے، گویا آپ کا ہر موضوع خواہ تقریر ہو یا تحریر ایک ایسا کوثر ہے جو کتنے ہی سلسبیل اور تسنیم کا منبع ہے۔ آپ کی کتاب ''شعرائے اُردو اور عشق علی'' ایسا ہی ایک کوثر ہے۔ اس کتاب کے ذریعے آپ نے تشنگانِ ادب اور مذہب دونوں کی سیرابی کا سامان بیک وقت بہم پہنچایا ہے۔ جہاں ایک طرف یہ کتاب صاحبان ادب کے لئے حیرت وانکشاف ثابت ہوگی وہاں دوسری طرف مذہب سے وابستگی رکھنے والوں کے لئے ایمانی توانائیاں مہیا کرے گی۔

بلاشبہ یہ کتاب آپ کی محنت شاقہ اور سعی مسلسل کا نتیجہ ہے اس امر کا اندازہ قارئین کو اس کے مطالعہ بلکہ فہرست پر ہی نگاہ ڈالنے سے ہو جائے گا۔

اس کتاب پر ''یادگار صحیفہ'' کے عنوان سے ڈاکٹر کاظم علی خاں صاحب لکھنؤ کی تقریظ ہے جو اس بات کا اظہار ہے کہ اگر شاگرد علمی صلاحیتوں کے کمال پر پہنچ جائے تو حق یہی ہے کہ استاد بھی اس کی قدر کرے۔

علاوہ ازیں ریسرچ اسکالر جناب آلِ محمد رزمی صاحب کا پیش لفظ بھی ہے جو بہت حد تک قاری کتاب اور اس کے مصنف کی معرفت میں مدد دے گا۔ لیکن بہر حال اس عظیم صحیفہ اور اس کے اعظم خالق کے بارے میں میرا یا کسی کا کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہوگا۔

☆ ☆ ☆

خاندانِ میرانیسؔ

کے

نامور شعراء

ضمیر اختر نقوی

ڈاکٹر نیر مسعود (لکھنؤ یونیورسٹی)

اُردو مرثیے کی تاریخ کا ایک ضروری باب

خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعرا

برادرم ضمیر اختر صاحب...... آداب عرض

بہت ممنون ہوں کہ آپ نے اپنی کتاب "خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا" مجھ کو اشاعت سے پہلے مطالعے کے لئے عنایت کی۔

میں نے اس کتاب کو بڑی دلچسپی اور حیرت کے ساتھ پڑھا۔ دلچسپی تو اس کے موضوع کی وجہ سے تھی، حیرت آپ کی غیر معمولی تلاش و تحقیق پر ہوئی کہ اب جب سلسلۂ انیس کے شاعروں کے تمام نام تک ذہنوں سے محو ہو چکے ہیں اور یہ معلوم کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے کہ مثلاً فرید، قدیم، غیور، کس زمانے کے لوگ تھے اور خاندانِ انیس سے ان کا کیا تعلق تھا، آپ نے ان شاعروں کے نہ صرف مستند حالات یکجا کر دیے ہیں بلکہ ان کے اس کلام کو بھی محفوظ کر لیا ہے جو عنقا کا حکم رکھتا تھا۔

آپ کی کتاب سے یہ غلط فہمی بھی دور ہوتی ہے کہ انیسؔ، انسؔ اور مونسؔ کے بعد سلسلۂ انیس کی روایت صرف نفیسؔ، عارفؔ اور عروجؔ تک محدود رہی، باقی افراد محض تبرکاً رسمی شاعری کر لیتے تھے اور اس غلط فہمی کا بھی ازالہ ہوتا ہے کہ انیسؔ و مونسؔ وغیرہ کا کلام ان افراد کے کام آیا، گویا یہ متاخرین خود مرثیہ کہنے کی صلاحیت نہیں رکھتے تھے۔ یہ

ان شاعروں کے ساتھ بڑی زیادتی تھی جس کی آپ نے تلافی کردی ہے۔ آپ نے نمونے کے طور پر اُن کے جو مرثیے درج کئے ہیں اُن میں ہر شاعر کا اپنا مزاج اور انفرادی لب ولہجہ جھلکتا ہے۔ اس کلام اور ان حالات کا فراہم کرنا جتنا دشوار کام تھا اس کا اندازہ تو آپ کے سوا دوسرا نہیں کرسکتا لیکن اتنی بات آسانی سے محسوس کی جاسکتی ہے کہ آپ نے اُردو مرثیے کی تاریخ کا ایک ضروری باب مکمل کردیا ہے اور ہمارے کئی قابلِ قدر شاعروں کے نام اور کلام کو مٹنے سے بچالیا ہے۔ آپ کی کتاب "اُردو مرثیہ پاکستان میں" کی طرح اس کتاب کی اہمیت بھی وقت گذرنے کے ساتھ بڑھتی جائے گی۔

آپ کا

نیر مسعود

ادبستان

دین دیال روڈ لکھنؤ

۲۱ر نومبر ۱۹۸۹ء

انتظار حسین

قیمتی تحقیقی کام

"روزنامہ ڈان کا تبصرہ"

ضمیر اختر نقوی ایک مختلف طرزِ نظر رکھنے والے مقرر ہیں جنھوں نے اپنی خوش کلامی ورنگین بیانی کے باوصف میر انیس کے مرثیوں میں قوت متخلیہ کی حامل خصوصیات کو اُجاگر کیا۔ انھوں نے میر انیس کے یہاں پائی جانے والی رنگوں کی ایک انوکھی تصویر کو منکشف کیا اور کہا کہ یہ مناظر اور یہ الفت الوان میر انیس کے یہاں خوش اسلوبی اور باقاعدگی سے نظر آتے ہیں۔

ضمیر اختر نقوی نے میر انیس کے مرثیوں میں نظر آنے والے جانوروں کے بارے میں بھی فرمایا۔ آپ نے کہا کہ گھوڑے کو ہٹا کر شیر ایک ایسا جانور ہے جو ہر منظر پر حاوی نظر آتا ہے اور اس کے ذیل میں ضمیر اختر نقوی نے ایک مفصل بیان پیش کیا۔

ان تحقیقی کاموں میں سے ایک کتاب بعنوان "شعرائے اُردو اور عشقِ علی" ہے۔ اس کتاب میں انھوں نے ہماری مذہبی شاعری، یعنی منقبت کی تاریخ کا سراغ لگایا ہے جو عربی، فارسی اور آخر میں اُردو مذہبی شاعری سے ملحق ہے اور یہ عربی میں حسان بن ثابت، فارسی میں فردوسی اور اُردو میں قلی قطب شاہ کے دور سے شروع ہو جاتی ہے۔

ایک اور کتاب "خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا" کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

یہ تحقیقی کتاب میر انیسؔ کے خاندان سے تعلق رکھنے والے مرثیہ گویوں کے تذکرے پر مشتمل مرثیہ نگاری خاندانِ انیسؔ میں ایک قیمتی اور مقدس وراثت کے طور پر نسلاً بعد نسلاً منتقل ہوتی رہی۔ میر انیسؔ اپنے خاندان کی چوتھی پشت سے تعلق رکھتے تھے اور اپنے بعد آنے والی نسلوں کے لیے نمونۂ عمل بن گئے۔ ضمیر اختر نقوی کا یہ کام اسی مرثیے کا نسلی و حسبی معائنہ ہے۔

ضمیر اختر نقوی نے خاندانِ انیسؔ کے مرثیائی شعور و ذوق کے تذکرے کا میر ضاحکؔ کے دور سے آغاز کیا ہے (میر ضاحکؔ، میر انیسؔ کے عظیم المرتبت پردادا تھے) اور اس سفرِ ذوق کا اختتام میر لائقؔ لکھنوی پر کیا ہے جو انیسؔ کے بعد چوتھی نسل میں ہیں اور اس طرح مجموعی طور پر آٹھ نسلیں آئی ہیں۔ خاندانِ مرثیہ نگاری کے اس سفر کی شروعات اٹھارھویں صدی کی دوسری دہائی میں ہوتی ہے اور اختتام موجودہ صدی کی ستروّیں دہائی میں ہوتا ہے جس میں خاندانِ میر انیسؔ کے آخری مرثیہ نگار میر لائقؔ نے اپنی زندگی کی آخری سانسیں گنیں۔

اردو شاعری کی تاریخ میں انیسؔ کے پردادا ہجو نگاری میں سوداؔ کے حریف کے طور پر بھی مشہور ہیں جو خود اپنے عہد کے ایک عظیم ہجو نگار تھے۔

میر ضاحکؔ کے بیٹے میر حسنؔ اپنی مثنوی، "سحر البیان" کے حوالے سے ایک منفرد مقام کے حامل ہیں۔ یہ مثنوی آج بھی اب تک لکھی جانے والی تمام مثنویوں کے مقابلے میں اپنی آب و تاب کے ساتھ ادب میں جلوہ گر ہے۔ باپ اور بیٹے، دونوں ایک بلند مرتبہ اور الگ طرزِ فکر رکھنے والے شاعر تھے۔ انھوں نے اکثر مرثیے اور سلام بھی لکھے لیکن اس شعبے میں پہچان حاصل کرنے کی پروا نہیں کی۔ میر حسنؔ کے بیٹے میر خلیقؔ نے مرثیہ گوئی میں مقام حاصل کیا، حالانکہ وہ اپنے عہد میں غزل نگار کے طور

پر زیادہ پہچانے جاتے ہیں۔ بنیادی طور پر میر خلیق ایک غزل نگار تھے۔ انھوں نے مرثیے، سلام اور رباعیات لکھیں اور جلد ہی مرثیہ نگاری میں اپنی الگ شناخت کے حامل ہو گئے۔ انھوں نے اپنی یہ میراث اپنے تین بیٹوں میں منتقل کی جن میں ایک میر انیس بھی تھے اور ان کو ایک صاحب فن خاندان کے فرد کی حیثیت سے دیکھا جا سکتا ہے۔ جنھوں نے اپنے رنگ کو بڑی تگ و دو اور جاں فشانی کے ساتھ اپنے بھائیوں اور بچوں میں منتقل کیا اور ان کو اس قابل کیا کہ وہ افقِ فن پر جگمگا سکیں۔

اس تمام کارروائی کا سہرا ضمیر اختر نقوی کے سر جاتا ہے۔ جنھوں نے تحقیق کی کٹھن منزلوں سے گزر کر تاریخ کے دھندلکوں سے ان خاندان کی شناخت کو دوبارہ اجاگر کیا ہے۔ اس خاندان کے ہر فرد کو مرثیہ نگاری میں عظیم اور معزز مقام پر دکھانے کی کوشش کی ہے اور انھوں نے کئی ایسے مرثیے جو غیر مطبوعہ تھے، اس کتاب میں شامل کیے ہیں۔ یہ ضخیم کتاب ۹۸۸ صفحات پر پھیلا ہوا ایک تفصیلی و تشریحی تذکرہ ہے ان مرثیہ نگاروں کا جن کا تعلق خاندانِ میر انیس سے ہے۔

کوثر پانی پتی

۳ دسمبر ۱۹۷۲ء......لاہور

جناب ضمیر اختر صاحب! ''آپ کا مضمون ''ماہِ نو'' میں نظر سے گذرا ہوا انشراحِ قلب ہوا۔ اللہ تعالیٰ توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ یہ تمام تر اعلیٰ درجے کی ریسرچ کی حیثیت رکھتا ہے۔ ''پیامِ عمل'' کے لئے اپنا خصوصی مضمون ضرور ارسال فرمایئے گا۔'' احقر......کوثر پانی پتی

ڈاکٹر سید جمیل احمد رضوی

ذہنی بالیدگی اور روحانی مسرت

خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعرا

زیر تبصرہ ضخیم کتاب علامہ ضمیر اختر نقوی کی عرق ریزی کے نتیجے میں منظر عام پر آئی ہے۔ علامہ نقوی ایک نامور خطیب اور معروف ادیب ہیں۔ اس دور میں ان کی حیثیت ایسے اخترِ تاباں کی ہے جس کی روشنی سے علم وادب کی دنیا منور ہو رہی ہے۔ وہ ایسے روشن ضمیر ہیں کہ ان کی خطابت سے گرد و پیش علمی روشنی سے بقعۂ نور بن جاتا ہے۔ الفاظ ان کے سامنے ہاتھ باندھے قطار در قطار کھڑے ہوتے ہیں اور وہ ان کو حسب منشا استعمال کرتے ہیں۔ ان کی تقریر تو "نور" "علیٰ نور" کا سماں پیش کرتی ہے۔ جب تقریر آگے بڑھتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے گویا علمی انوار کی بارش ہو رہی ہے جو سامعین پر اس طرح اثر انداز ہوتی ہے کہ وقت گزرنے کا پتہ نہیں چلتا اور جب مجلس اپنے اختتام کو پہنچتی ہے تو سامعین خالی دامن نہیں لوٹتے، بلکہ علم و عرفان کے جواہر آب دار سے مالا مال ہو کر جاتے ہیں۔ ان کا انداز خطابت ندرت کا حامل ہے، عصرِ حاضر کے جدید تقاضوں کو سامنے رکھتے ہوئے خطاب کرتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ ان کی مجالس میں خاص طور پر موجود ہوتا ہے اور بہت انہماک کے ساتھ بیان سے استفادہ کرتا ہے۔

زیرِ حوالہ کتاب میر انیس اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے خاندان کے معروف شعرا کا مرکز و محور ہے۔ اس میں اس خاندان کے شعرا کے حالات اور ان کے کلام پر علمی مباحث شامل ہیں۔ اگر اس مندرجات پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا ''پیش لفظ'' ڈاکٹر نیر مسعود نے لکھا ہے، مقدمہ آلِ محمد رزمی نے تحریر کیا ہے جس میں کتاب کا تجزیاتی مطالعہ شامل ہے اور انھوں نے پاکستان میں مرثیے کی صورتِ حال پر اپنے مخصوص انداز میں تنقیدی نظر ڈالی ہے۔ اس کے بعد ماجد رضا عابدی کا مبسوط مقالہ بعنوان ''کلامِ میر انیس، علامہ ضمیر اختر نقوی کی خطابت کے آئینے میں'' کتاب میں شامل کیا گیا ہے۔ پھر قائم رضا نقوی نے چار صفحات میں ایسے اقتباسات دیے ہیں جو علامہ نقوی کے بارے میں ہیں، اس کا عنوان ہے ''ضمیر اختر نقوی برِ صغیر کے ممتاز دانش وروں کی نظر میں''۔ اس کے بعد علامہ نقوی نے ''حرفِ آغاز'' کے عنوان سے کتاب کا تعارف کروایا ہے، اس میں اور بہت سی مفید معلومات بھی شامل کر دی گئی ہیں۔ انھوں نے اپنی خطابت کے بارے میں ایسی معلومات دی ہیں جو عام قاری کے لیے اچھوتی اور نئی ہیں۔ ایسی ضخیم کتابوں کا چھاپنا واقعتاً جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے ان کی خطابت ادب کے کام آئی۔ ان کے اپنے الفاظ ہیں: ''ضخیم کتابوں کا چھاپنا جوئے شیر لانا ہے۔ یوں سمجھیے میری خطابت ادب کے کام آئی'' (صفحہ ۲۲)

کتاب کا متن خاندانِ میر انیس کے تعارف سے شروع ہوتا ہے۔ اس گراں قدر دستاویز میں شبیر کی مداحی میں پہلی پشت سے لے کر آٹھویں پشت تک کے شعرا کے حالات اور کلام پر تبصرہ ملتا ہے۔ شبیر کی مداحی میں پہلی پشت میں میر ضاحک، میر انیس کے پردادا شامل ہیں، دوسری پشت میں میر انیس کے دادا میر حسن کے حالات اور کلام

کے بارے میں بحث شامل ہے۔ شبیرؑ کی مداحی میں تیسری پشت میں میر خلیق، میر انیس کے والد کے حالاتِ زندگی اور کلام پر تبصرہ تفصیل کے ساتھ کیا گیا ہے۔ چوتھی پشت میں میر انیس کے دو بھائیوں میر انس اور میر مونس کے حالاتِ زندگی اور شاعری پر مباحث شامل ہیں۔ کتاب میں میر انیس کے حالات اور شاعری پر تبصرہ شامل نہیں ہے، اس کی وجہ فاضل مولف نے یہ بتائی ہے کہ ان کے بارے میں الگ ایک مفصل کتاب لکھی گئی ہے۔ شبیرؑ کی مداحی میں پانچویں پشت میں جن شعرا کو شامل کیا گیا ہے، ان کے نام یہ ہیں: میر مونس (میر انیس کے فرزندِ اکبر) میر رئیس (میر انیس کے منجھلے بیٹے)۔ چھٹی پشت میں خاندانِ میر انیس کے جن مرثیہ گو شعرا کے حالات درج ہیں ان میں میر جلیس، میر غیور، قدیم لکھنوی، عروج لکھنوی اور فرزند حسن جلیل لکھنوی (میر انیس کے پوتے) اور میر مانوس (میر انیس کے نواسے) شامل ہیں۔ ساتویں پشت میں پانچ شعرا کے حالات درج کیے گئے ہیں اور ان کی شاعری پر تبصرہ بھی ملتا ہے، ان کے نام یہ ہیں۔

میر عارف (میر نفیس کے نواسے)، میر فائز لکھنوی (میر انیس کے پوتے)، فرید لکھنوی (میر انس کے پرپوتے)، ذکی لکھنوی (میر انیس کے پرنواسے)، اور میر ہاشم حسین حزیں (میر انیس کے پرپوتے)۔ شبیرؑ کی مداحی میں آٹھویں پشت میں میر فائق لکھنوی (میر عارف کے صاحب زادے) اور میر لائق لکھنوی (میر عارف کے چھوٹے صاحب زادے) شامل ہیں۔

زیرِ تبصرہ کتاب میں مختلف مقامات پر "نادر و نایاب تصاویر اور اور عکس تحریر" بھی شامل ہیں۔ یہ دونوں چیزیں نوادرات کے زمرے میں آتی ہیں۔ ہر شاعر کے حالات اور کلام پر تبصرہ کرنے سے پہلے اس کا مختصر سوانحی خاکہ ایک صفحے پر دے دیا گیا ہے۔ جس

سے ایک ہی نظر میں ضروری معلومات مل جاتی ہیں۔ کتاب کے آخر میں "کتابیات" کے عنوان کے تحت ان مطبوعات و مخطوطات کی فہرست شامل کر دی ہے جن سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ان مصادر و ماخذ کی فہرست حروف تہجی کی ترتیب کے مطابق ہے۔ آخر میں "اشاریہ (افراد و اشخاص)" بھی مرتب کیا گیا ہے اس کی ترتیب بھی کارآمد ہے۔

زیر حوالہ کتاب "انیسیات" کے ادب میں گراں قدر اضافہ ہے۔ تاریخ مرثیہ علامہ ضمیر اختر نقوی کا خاص میدان ہے جس میں موصوف نے تحقیق کو آگے بڑھایا ہے۔ ان کی تنقیدی نظر گہرائی اور گیرائی، دونوں صفات رکھتی ہے۔ وہ تحقیق و تدقیق سے ایسے نتائج سامنے لاتے ہیں جن تک دوسرے محققین نہیں پہنچ سکتے۔ مثال کے طور پر انھوں نے میر حسن کی مرثیہ گوئی کے بارے میں معاصرین پر گرفت کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ مرثیہ کہتے تھے، چنانچہ اس کتاب میں انھوں نے پہلی بار میر حسن کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ قلمی بیاض سے نقل کیا ہے۔ (صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۸)۔ اسی طرح میر خلیق کی معاشی حالت کے بارے میں مولانا محمد حسین آزاد کی روایت پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "میر خلیق نے ایک پُر وقار زندگی گزاری۔ میر خلیق نے جس مکان میں انتقال کیا، اس مکان کو اُردو ادب میں میر انیس کی محل سرا کہا گیا ہے" (صفحہ ۱۳۵)۔ اسی طرح علامہ نقوی نے "میر انیس کے بارے میں غلط فہمیاں" کے عنوان کے تحت شاد عظیم آبادی، حامد حسن قادری، مولانا آغا مہدی اور محمود فاروقی پر تنقید کرتے ہوئے اپنی گہری عالمانہ بصیرت سے نئی معلومات فراہم کی ہیں اور ان تاریخ اور تذکرہ نویسوں سے اختلاف کرتے ہوئے ثابت کیا ہے کہ میر انیس دبستان لکھنوی کے اہم ترین مرثیہ گو ہیں (صفحہ ۲۱۵)۔ میر انیس کے مفصل حالات اور شاعری پر مبسوط تبصرہ کتاب میں شامل ہے، اس میں میر انیس کے چوالیس مراثی کا اشاریہ بھی دیا ہے۔ اشاریے میں یہ تصریح بھی کی گئی ہے

کہ کون سا مرثیہ مطبوعہ ہے اور کون سا غیر مطبوعہ۔

تحقیق کا دروازہ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ محقق دستیاب وسائل کی بنیاد پر نتائج اخذ کرتا ہے۔ خوب سے خوب تر کی تلاش ہمیشہ جاری رہتی ہے۔ تحقیقی کام کے دوران متنوع موضوعات بھی سامنے آتے رہتے ہیں۔ تحقیقی عمل میں امانت و دیانت کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ جہاں معلومات کم ملیں یا تلاش و جستجو کے باوجود نہ مل سکیں، ان کا اعتراف کرلیا جائے اور دوسرے محققین یا بعد میں آنے والوں کو دعوت دی جائے کہ وہ ان موضوعات پر تحقیق کو جاری رکھیں۔ علامہ نقوی نے بھی اس کتاب میں کئی مقامات پر ایسے موضوعات کی نشان دہی کی ہے جن پر مزید تحقیق کرنے کی ضرورت ہے، قدیم لکھنوی کے مزید حالات لکھنے کی جانب توجہ دلائی گئی ہے۔ اسی طرح خلیل لکھنوی (فرزند انیس) کے حالات زندگی تحقیق طلب ہیں، میر انیس کے ایک پوتے جمیل لکھنوی کے حالات پر تحقیق کرنے کی ضرورت کی نشاندہی کی ہے۔ (صفحہ ۱۷۰)۔ اسی طرح میر مونس کے سلاموں کے بارے میں لکھتے ہیں کہ "ان کا تنقیدی جائزہ ابھی تک نہیں لیا گیا۔ ضرورت ہے کہ میر مونس کے سلاموں کا تنقیدی جائزہ لیا جائے اور مکمل تبصرہ لکھا جائے" (صفحہ ۲۹۲)

لاہور وطنِ عزیز پاکستان کا تہذیبی اور ثقافتی شہر ہے۔ اس پُر آشوب دور میں بھی یہاں تہذیبی زندگی کے آثار موجود ہیں، علم و ادب کی محفلیں جمتی ہیں، شعر و فن پر نشستیں ہوتی ہیں، علمی و ادبی انجمنیں سرگرم عمل رہتی ہیں۔ ان آثار میں مرثیہ خوانی کی بہت لطیف مجالس بھی شامل ہیں۔ ادھر محرم کا چاند نمودار ہوا، اُدھر مجالس سید الشہدا علیہ السلام میں کلام میر انیس اللہ مقامہٗ پڑھا جانے لگا۔ اس کو سامعین مذہبی ذوق کے ساتھ سنتے ہیں اور اس میں تازگی اور توانائی محسوس کرتے ہیں۔ مراثیِ انیس نے

لکھنؤ سے اپنا سفر شروع کیا اور یہ پنجاب کے دل "لاہور" میں آکر ٹھہرا۔ اس کتاب میں علامہ نقوی نے فاضل مشہدی کے حوالے سے ایک مجلس کا آنکھوں دیکھا حال بیان کیا ہے۔ جس میں فرزند حسن جمیل نے لال حویلی میں مرثیہ پڑھا تھا، میزبان نواب محمد علی قزلباش تھے۔ مرثیہ سننے کے لیے جن چار مہمانوں کا استقبال نواب صاحب نے کیا، ان میں علامہ اقبال، سر عبدالقادر، پنڈت شیو نرائن اور راجا نریندر ناتھ بھی شامل تھے۔ حضرت فیروز طغرائی اور حفیظ جالندھری برآمدے میں کھڑے تھے۔ فاضل مشہدی نے اس مجلس کی جس طرح تصویر کشی کی ہے، وہ پڑھنے کے لائق ہے۔ موصوف نے علامہ اقبال اور سر عبدالقادر کو داد دیتے ہوئے دکھایا ہے۔ جب مجلس ختم ہوئی تو نواب صاحب نے مہمانوں کا الوداعی مصافحے کے ساتھ شکریہ ادا کیا (صفحہ ۷۰۳ تا ۷۰۴) یہ واقعہ لاہور میں خاندانِ میرانیس کی ایک فرد کی آمد اور مرثیہ خوانی سے متعلق ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکابرینِ لاہور اور زندہ دلانِ شہر ۱۹۲۸۔۲۹ء میں اس خاندان کے ایک شاعر کے کلام کو سننے اور طرزِ خواندگی کو دیکھنے کے لیے کس طرح ٹوٹ پڑے تھے کہ لال حویلی تنگ ہوگئی تھی۔ انیس مرحوم اور اس خاندان کے نامور شعرا کے کلام نے لاہور کے دبستانِ شاعری پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ اگر قیامِ پاکستان کے بعد لاہور میں مرثیہ گوئی کی تاریخ کا جائزہ لیا جائے اور تحقیقی نظر سے ان عناصر کی نشان دہی کی جائے جو اس صنفِ شاعری پر اثر انداز ہوئے تو ان میں مراثیِ میرانیس کے گہرے اثرات کو تلاش کیا جاسکتا ہے۔ یہی کیفیت مجالس میں مرثیہ اور سلام خوانی کے بارے میں سامنے آتی ہے۔ ان تہذیبی اثرات کو ڈھونڈ نکالنا مشکل نہیں ہے، جنھوں نے لکھنؤ سے پنجاب اور بطورِ خاص لاہور کی جانب سفر کیا۔

اس کتاب کے شائع ہونے سے اردو ادب میں تذکرہ نویسی کی روایت آگے بڑھی

ہے، خاندان میر انیس کے نامور شعرا کی یاد ذہنوں میں تازہ ہوگئی ہے، اُردو میں رثائی ادب کے بارے میں بہت سے تحقیق طلب نکات کو علمی سطح پر حل کیا گیا ہے، تحقیق کے لیئے بہت سے نئے موضاعات کی جانب توجہ دلائی گئی ہے، شعرا کے کہے ہوئے مراثی کے اشارئیے بنا کر ان کو محفوظ کرنے کی کوشش کی گئی ہے، مرثیوں سے متعلق بہت سی قلمی اور غیر مطبوعہ بیاضوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ غیر مطبوعہ مراثی کو کتاب میں شامل کر کے بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا گیا ہے اُردو ادب کے چمن میں اس کتاب کی حیثیت ایسے گلِ سرسبز کی ہے جو فضا کو اپنی خوشبوں سے معطر کر دیتا ہے یا تازہ ہوا کے اس جھونکے کی سی ہے جو اپنے لطیف اثر سے فرحت کا احساس پیدا کرتی ہے۔ ایسی کتاب قارئین کے لیئے ذہنی بالیدگی اور روحانی مسرت کا باعث بنتی ہے۔

زیرِ حوالہ کتاب ظاہری خوبصورتی سے بھی آراستہ ہے۔ کتابت، طباعت اور دیدہ زیب جلد نے اس کے صوری حسن میں اضافہ کر دیا ہے۔ ہم فاضل مولف کو اس خوبصورت اور قابل قدر پیش کش پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں، اور ہمیں اُمید ہے کہ علامہ ضمیر اختر نقوی اپنے تحقیقی سفر کو اسی تیز رفتاری کے ساتھ جاری رکھیں گے تا کہ علم و ادب کی دنیا ان کی تحقیقات سے مستفید ہوتی رہے۔

امیر علی جونپوری

۱۵رمئی ۱۹۷۸ء..... لکھنؤ

جناب ضمیر اختر صاحب! کل رشید صاحب کے یہاں بہت دیر تک رہا۔ آپ ہی کا ذکر تھا ہم لوگ آپ کے احسانوں تلے دبے ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر صفدر حسین صاحب کا خط اُن کے پاس آیا ہے دکھلا رہے تھے۔ فقط نیاز مند..... امیر علی

سیّد معراج جامی

غیر معمولی تلاش و تحقیق

خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا

نظامِ قدرت کی بوالعجبیاں عہد آفرینش سے انسان کے لیے چیستاں رہی ہیں۔ خود حضرت انسان کو قدرت نے کس قدر نوازا ہے، اس کا اندازہ وہی لگا سکتے ہیں جو صاحب ایمان بھی ہیں اور اہلِ بصیرت بھی۔ انسان اگرچہ فانی ہے اور یہ دنیا بھی قائم رہنے والی نہیں ہے، مگر انسان سے کہیں زیادہ عمر اس دنیا کی ہے۔ اس دنیا میں اربوں انسان آئے اور آ کر چلے گئے، مگر کسی کو رہتی دنیا تک دوام حاصل نہ ہو سکا ماسوائے رسولوں، نبیوں، پیغمبروں کے اور ان کے جو راہِ حق میں ہمیشہ ملعون و مردود ٹھیرے۔ مزید یہ کہ قرطاس و قلم کے حوالے سے وہ چند ہستیاں، جنھوں نے علم و فضل کی ایسی شمعیں روشن کیں جو آج بھی ظلم و جہالت کی آندھیوں میں فروزاں ہیں، انھیں صاحبانِ علم و ادب میں ایک بڑا نام میر انیس کا ہے۔

میر انیس مرثیہ گوئی کے فن کے امام تسلیم کیے جاتے ہیں۔ اگرچہ مرثیہ گوئی میر انیس سے قبل اپنے ارتقا کی منزلیں طے کر چکی تھی، تاہم میر انیس کو جو قبولِ عام اور شہرتِ دوام حاصل ہوئی، اس نے میر انیس کو لافانی کردار عطا کر دیا۔ ادب کے قارئین میر انیس کے نام سے بہت اچھی طرح واقف ہیں، بلکہ دبیر کے حوالے سے تو

مولانا شبلی نعمانی کی شہرۂ آفاق تصنیف موازنۂ انیسؔ و دبیرؔ نے تو دونوں مرثیہ نگاروں کو رہتی دنیا تک قائم و دائم کردیا ہے، مگر بے شمار قارئین ادب اور خود لاتعداد اہلِ قلم آج تک خاندانِ انیسؔ کے نامور شعرا سے ناواقف ہیں، جنھوں نے مرثیہ نگاری میں بہت کام کیا ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی نے ''خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعرا'' نامی ایک ضخیم کتاب ترتیب دے کر ایک طرف تو خاندانِ میر انیسؔ کے بیشتر گم نام شعرا کو حیاتِ دوام بخشی ہے، دوسری طرف غیر معمولی تلاش و تحقیق سے سلسلۂ انیسؔ کے ان شعرا کے بارے میں اس غلط فہمی کا ازالہ بھی کردیا کہ انیسؔ، انسؔ اور مونسؔ کے بعد سلسلۂ انیسؔ کی روایت صرف نفیسؔ، عارفؔ اور عروجؔ تک محدود رہ گئی تھی، اور باقی شعرا محض تبرکاً رثائی شاعری کرتے تھے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی نے خاندانِ انیسؔ کے ۴۲ شعرا کی قلمی تصویر، عکسِ تحریر، رقعات کی نقول بھی کتاب میں شامل کی ہیں۔ ان نوادرات سے کتاب کی اہمیت اور افادیت میں بے حد اضافہ ہوا ہے۔ کتاب کا پیش لفظ ڈاکٹر نیر مسعود، لکھنؤ یونیورسٹی اور مقدمہ آلِ محمد رزمی کا تحریر کردہ ہے۔ ماجد رضا عابدی نے علامہ ضمیر اختر نقوی کی خطابت سے کلامِ انیسؔ کو بڑے دل کش پیرائے میں بیان کیا ہے۔ ضمیر اختر نقوی اور ان کے طرزِ تحریر اور کارناموں پر مشاہیر ادب کی مختصر مختصر آرا بھی شاملِ کتاب ہیں۔

کتاب کی ضخامت ۹۹۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس کی قیمت پانچ صد روپے ہے۔

کتاب کے ناشر مرکزِ علوم اسلامیہ، فلیٹ نمبر ۴، آئی نعمان ٹیرس، فیز ۳، یونیورسٹی روڈ گلشنِ اقبال، بلاک ۱۱، کراچی۔

سید محمود الحسن رضوی

مرثیہ اُردو ادب کی آبرو ہے

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب آپ جس تسلسل اور عرق ریزی سے مدحت اہل بیت اطہار اور رثائی ادب کے عظیم الشان ذخیرے کو تلاش کر کے ترتیب دے رہے ہیں۔ وہ علامہ صاحب ہی کا حصہ ہے۔ اس طرح علامہ صاحب گیسوئے اُردو سنوارنے کے ساتھ واقعہ کربلا کی تشہیر بھی کر رہے ہیں جسے آج بھی اموئیت پسند چھپانے کی سعی لاحاصل میں جٹے ہیں۔ پاکستان کے عصبیت زدہ ادیب مانیں یا نہ مانیں، مرثیہ اُردو ادب کی آبرو ہے۔ اگر اُردو ادب سے مرثیہ نکال دیا جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے؟ غزل بجز حسن و عشق، ساغر و مینا اور شراب و کباب کی خیالی عکاسی ہے، قصیدہ جو زیادہ تر مبالغہ آمیز چاپلوسی اور انعام و اکرام کے لالچ میں بے جا تعریف ہے، مثنوی بھی حسن و عشق، طویل داستانوں یا واقعات کی فرضی منظر کشی پر مشتمل ہے۔ مرثیہ ہی وہ صنف سخن ہے جس میں اخلاق و کردار کے اعلیٰ نمونے ملتے ہیں۔ محبوب کے علاوہ باپ، بہن بھائی، ماں، آقا، غلام حسب مراتب کلام کرتے نظر آتے ہیں۔ مرثیے ہی میں شجاعت و عزیمت کے بلند ترین کارنامے صبر و تحمل کے بے نظیر نمونے، خاندانی زندگی کے دل کش نقشے، علم و عمل کے لاجواب مظاہرے نیز رقیب و محتسب کی جگہ خاندان نبوت اور ان کے حامی شجاعان عرب میدان جنگ میں تیر و تبر سے کھیلتے دکھائی دیتے ہیں۔ محبوباؤں کی تخیلاتی صورتوں کے بجائے ان مخدرات عصمت و طہارت کا کردار

نظر آتا ہے۔ جن کے دامن پر نماز پڑھنا جنت کی حوریں بھی باعث فخر سمجھیں۔

مرثیے نے نہ صرف مذہبی ضرورت کو پورا کیا ہے، بلکہ پند و موعظت، عقائد دین داری، عظمت و جلالِ الٰہی، نیرنگیٔ دہر، بے ثباتیٔ عالم، زہد و اتقا، صبر و قناعت وغیرہم کے بے شمار مضامین اور اعلیٰ اخلاقی اصول جو دنیا اور عقبیٰ دونوں کے لیے مفید اور تکمیلِ انسانیت کے لیے ضروری ہیں۔ ایسے دل کش انداز اور موثر الفاظ میں بیان کیے ہیں کہ جن سے دوسرے اصنافِ سخن عاری ہیں۔

بقول مولانا حالیؔ:

> "مرثیے کو اگر اخلاق کے لحاظ سے دیکھا جائے تو بھی ہمارے نزدیک اُردو شاعری میں نظم کہلانے کا مستحق صرف انھی لوگوں کا کلام ٹھہر سکتا ہے بلکہ جس اعلیٰ درجے کے اخلاق ان لوگوں نے مرثیے میں بیان کیے ہیں، ان کی نظیر فارسی بلکہ عربی شاعری میں بھی مشکل سے ملے گی" (مقدمہ شعر و شاعری، صفحہ ۱۸۳)

مرثیے میں آرائشِ بزم کی بجائے حق و باطل کی وہ معرکہ آرائی پیش کی جاتی ہے جس کی دوسری مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ مرثیے سے پہلے اُردو شاعری نے میدانِ جنگ میں چلتی ہوئی تلوار کبھی نہ دیکھی تھی۔ نیزے کا چمکنا، تلواروں کی آب و تاب، گھوڑوں کی رست وخیز، جنگ کی حکمت عملی اور داؤں پیچ، مجاہدوں کا تین دن کی بھوک پیاس میں چیل تن پہلوانوں سے لڑنا اور انھیں زیر کرنا اُردو شاعری میں نہیں ملتے۔ بزم کے سامان کو تو اُردو شاعری نے بہت کچھ مہیا کر دیا تھا مگر رزم سے اس کا دامن خالی تھا۔ اس میں جان دے دینے کے تذکرے تھے مگر گھٹ گھٹ اور تڑپ تڑپ کر آہیں بھرتے ہوئے نہ کہ میدانِ جنگ میں مردانہ وار جنگ کرتے ہوئے۔ معشوق پر قربان ہونا

ہماری شاعری کا جز تھا مگر بھائی پر جان دینا، ماموں کے لیے لڑنا، باپ پر نثار ہونا، آقا کے صدقے ہو جانا اس سب سے یہ تہی دامن تھی۔ لہٰذا بلا خوفِ تردید کہا جاسکتا ہے کہ مرثیوں سے قبل اُردو شاعری میں رزمیہ شاعری کی عکاسی نہ تھی، یہ عناصر اُردو شاعری میں مرثیے کی وجہ سے آئے۔ مختصراً یہ کہ میر انیس اور مرزا دبیر نے مرثیہ نگاری کے ذریعے اُردو شاعری کو وقار اور متانت عطا کی۔

علامہ ضمیر اختر نقوی نے میر انیس اور ان کے خاندان کے مرثیہ نگاروں کا کلام اور ان کے حالات جمع کر کے دبستانِ میر انیس کے ساتھ فروغِ مرثیہ کے لیے بڑی وقیع خدمت انجام دی ہے، لیکن میری ناقص معلومات میں مرزا دبیر اور دبستانِ دبیر پر شاید علامہ صاحب کی کوئی کاوش منصۂ شہود پر نہیں آئی۔

یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ اختلافِ طبائع نے سخن فہموں کے دو گروہ بنا دیے اور انیسیوں اور دبیریوں کے دو حریف گروہ ایک قسم کی جنگ و جدل میں مبتلا ہو گئے۔

انیس والے مرزا دبیر کو اس لیے نہیں مانتے کہ ان کے خیال میں مرزا صاحب صفائی کلام، حسنِ بیان، روزمرہ، لطفِ محاورہ اور روانی زبان کے کوچوں سے نابلد تھے، اور دبیریوں کے دلوں میں میر انیس کی اس وجہ سے عظمت نہیں کہ ان کے گمان میں میر صاحب شوکتِ الفاظ، بلند پروازی، تازگی، جدت طرازی اور بدیع مضامین سے مجبور نظر آتے ہیں۔ لیکن علامہ ضمیر اختر نقوی جیسے سخن فہموں اور مرثیے کے تن من دھن کی بازی لگا دینے والوں سے ایسے قادر الکلام اور یگانۂ عصر بزرگوں میں تفریق کا تصور جنھوں نے مرثیہ گوئی بلکہ فصاحت و بلاغت کے پیکرِ بے جان میں جان ڈال دی، جوہر شناسی کا خون کرنا ہے۔ لہٰذا اُمید ہے کہ دبستانِ دبیر پر علامہ صاحب ایسا ہی ایک

مجموعہ شائع کرنے میں کامیاب ہوں گے۔

بلا مبالغہ فروغ مرثیہ کے لیئے علامہ ضمیر اختر نقوی کی کوششیں لائق صد ستائش ہیں لیکن حسینیوں کی کاوشوں سے معرض وجود میں آنے والی اُمت پاکستان میں جہاں نہ صرف ناصبیت و خارجیت شعبۂ تعلیم پر اس حد تک اثر انداز ہو چکی ہے کہ اُردو ادب کی درسی کتابوں میں سے مرثیہ خارج کیا جا چکا ہے، جبکہ تقسیم برصغیر سے قبل الٰہ آباد بورڈ کی انٹرمیڈیٹ کی اُردو کی کتاب میں دو مکمل مرثیے نصاب میں شامل تھے اور آج بھی ہندوستان کے اُردو نصاب میں مرثیہ شریک ہے اور پاکستان میں اُردو کے دعوے دار بھی مختلف طریقوں سے اس صنفِ سخن سے دامن بچا رہے ہیں۔ لہٰذا ضرورت اس بات کی ہے کہ فروغ مرثیہ کے لیئے وقت کے تقاضوں کے پیشِ نظر باقاعدہ مہم کا آغاز کیا جائے جس کے لیئے علامہ ضمیر اختر صاحب جیسے سخن سنج اور عاشقِ مرثیہ کی صلاحیتوں کے بھرپور استعمال کی ضرورت ہے۔ بہر حال خاندانِ انیس اعلی اللہ مقامہٗ کے مرثیہ نگاروں کے اس مجموعے کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے جس کی کتابت دیدہ زیب اور طباعت و جلد سازی بھی معیاری ہے۔ اُمید ہے کہ محبانِ اہل بیتؑ اطہارؑ میں اسے قبولِ عام نصیب ہوگا۔

مرزا جعفر رضا اکمل شہید

مکتوب......

جناب ضمیر اختر صاحب سلمہٗ.....دلی دعائیں...اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا سلمہٗ اس واسطے لکھا کہ ہم اور آپ ایک ہی محلے ایک ہی شہر کے پروردہ ہیں...اور میں سن میں کافی بڑا ہوں۔ کیونکہ آپ کو مرثیہ اور حضرت انیس اعلی اللہ مقامہٗ سے دلی لگاؤ ہے۔ اس واسطے یہ رقعات آپ کو ارسال کر رہا ہوں۔

نقاش کاظمی

علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی ادبی مہم جوئی

سید ضمیر اختر نقوی ہمارے عہد کے ایک ایسے نابغۂ روزگار خطیب و عالم ہیں جن کے سرخیلوں میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیات شامل ہیں یعنی بیک وقت مذہب اور ادب پر دسترس رکھنے کے ساتھ ایک جانب خطابت اور ذاکری کے سنگلاخ تجربات اور دوسری جانب تحریر و تحقیق کے جان لیوا مقامات۔

الحاج علامہ سید ضمیر اختر نے آنکھ کھولی تو ان کی والدۂ گرامی نے انھیں جس پہلے شاعر سے روشناس کرایا اور ان کے اشعار یاد کرائے، وہ میر ببر علی انیس تھے اور اب جبکہ ان کے والد گرامی محترم سید ظہیر حسن نقوی ان کی سرپرستی فرما رہے ہیں تو مولانا ضمیر اختر نقوی ایک ادبی و دینی محقق، مقرر، خطیب صاحب ہنر اور انجمائی اہم صاحب قلم کی حیثیت سے عوام کے سامنے موجود ہیں اور خصوصاً ماہر انیسیات کے منصب پر فائز ہیں۔

علامہ سید ضمیر اختر نے اپنے ادبی سفر کا آغاز میر انیس کی تصویر سے کیا تھا جن کو بعد میں انھوں نے اپنا ''آئیڈیل'' تسلیم کرلیا اور ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۲ء تک میر انیس کے حوالے سے متعدد مذاکرات، سیمینار، کتب اور مقالے مرتب کیے۔ ایک اندازے کے مطابق موصوف نے اب تک ۱۱۸ کتابیں تحریر کی ہیں جن کا محور ادب اور مذہبیات سے عبارت ہے۔ یہاں قابل تحسین امر یہ ہے کہ ادب کے دریائے لطافت میں غوطہ زن ہو کر شان کریمی کے موتی نکال لانا اور علامہ موصوف کا ہی خاصہ ہے، یہی طرز ''نور علی

نور" ان کی تحریروں اور تقریروں میں قوم کے لیے ایک بیش قیمت ورثہ ہے۔ قیمت، اجرت اور نذر و نیاز کے بارے میں ان کے خیالات کا اندازہ ان کی کتابوں کے مطالعے سے بخوبی آتا ہے۔

علامہ موصوف کو میں نے اوّل اوّل ماہ محرم میں کراچی کی امام بارگاہوں میں مجالس اور ذاکری کی منزلوں پر سنا تھا، لیکن ایک مرتبہ جنگ میں بھی اس اہم اور بڑے مذاکرے ومشاعرے میں شریک بزم تھا، انھیں حضرت جوشؔ ملیح آبادی کی شخصیت اور فن پر اظہار کرتے سنا۔ انھوں نے سادات امروہہ کے زیر اہتمام کئی ہزار سامعین کو اپنے طرزِ خطابت سے مبہوت کردیا۔ یہاں یہ بتانا ضروری ہے کہ اس وقت کے تمام خطیبوں میں ان کا طرزِ خطابت جداگانہ ہے۔ نہ وہ حضرت علامہ رشید ترابی کے مقلد نظر آتے ہیں، نہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے۔

حضرت ضمیر اختر صاحب کی مشہور تصانیف "جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے"، "اردو مرثیہ پاکستان میں"، "اردو غزل اور کربلا"، "تلامذۂ ناسخ"، "تاریخ مرثیہ نگاری"، (۱۰ جلدیں)، "میر انیس کی زندگی اور شاعری"، "اقبال کا فلسفۂ عشق"، "شہید علمائے حق"، "خاندانِ انیس کے نامور شعرا"، "شعرائے اردو اور عشقِ علی" ہیں۔ ہزار صفحات کی ان کتابوں کے بارے میں اظہارِ خیال کے لیے محض ایک مضمون ہی کافی نہیں، ان کے یہاں تو سو رنگ کے مضمون موجود ہیں اور ہر رنگ کے لیے علیحدہ علیحدہ کتابوں کی ضرورت ہے۔

آج کے اس مذاکرے میں، میں موصوف کو محض دو کتابوں کے آئینے میں پیش کرنا چاہتا ہوں: (۱) خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا (۲) شعرائے اردو اور عشقِ علی۔

عزیزانِ محترم! یوں تو ان دونوں کتابوں کو جن کے صفحات ایک ایک ہزار کے

قریب ہیں، ایک دوسرے سے وابستہ کہا جا سکتا ہے۔ دینی و مذہبی اثرات بھی نمایاں ہی نہیں بلکہ نمایاں تر ہیں، لیکن میں ان کے بارے میں محض ادب کے حوالے سے مختصراً گفتگو کرنے کی جسارت کروں گا، چونکہ علامہ موصوف نے مجھے اظہار خیال کی دعوت دے کر اور مطالعہ وقت انتہائی مشکل حالات میں فراہم کر کے شاید میرا امتحان لینا چاہا ہے۔

"خاندان میر انیس کے نامور شعرا" کا مطالعہ کرتے وقت میں نے محسوس کیا ہے کہ یہ ایک مخصوص ادبی تاریخ کا حصہ ہے۔ کتاب میں خاندان انیس کے اہم شعراء کی تصاویر، موضوعات اور قلمی نسخوں سے استفادہ کیا گیا ہے، تمام کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام کے ساتھ ان کے مشہور "مراثی" بھی نمونے کے طور پر پیش کیے گئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں کتابوں اور شخصیات کے REFERENCES بھی دیئے گئے ہیں جنھیں کتابیات کہا جاتا ہے۔ شاید آپ حضرات کو یاد ہو یہ مصرع:

پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں

لہٰذا باعتبار "پشت" کتاب کے CHAPTER بنائے گئے ہیں، یہاں پشت میں میر انیس کے پردادا حضرت میر ضاحک کا نام نامی اور تفصیلات ہیں...... دوسری پشت میں مثنوی سحرالبیان کے خالق، حضرت میر حسن جو میر انیس کے دادا تھے، ان کا ذکر ہے۔ تیسری پشت میں میر انیس کے والد میر خلیق کا تذکرہ ہے۔ چوتھی پشت میں میر انس اور میر مونس جو میر انیس کے برادران گرامی تھے ان کا تذکرہ ہے۔ پانچویں پشت میں میر نفیس، میر رئیس، میر سلیس جو میر انیس کے بیٹے تھے اور میر وحید جو میر انیس کے بھتیجے تھے ان کا تذکرہ ہے۔

چھٹی پشت میں میر انیس کے پوتوں: میر جلیس، میر قیصر، قدیم لکھنوی، عروج لکھنوی اور جلیل لکھنوی (میر انس کے پوتے) ، میر مانوس، میر انیس کے نواسے شامل

ہیں۔۔۔۔۔ساتویں پشت میں میر عارف، میر فائز، فرید لکھنوی، ذکی لکھنوی، میر ہاشم حزیں، میر فائق لکھنوی اور آخر میں لائق لکھنوی شامل ہیں۔

مذکورہ کتاب کی تیاری میں علامہ موصوف نے ہندوستان و پاکستان میں موجود تقریباً ۶۳ کتابوں اور تقریباً ۱۳ رسائل و جرائد کے علاوہ بے شمار احباب اور صاحب ذوق اور اہل علم حضرات سے استفادہ کیا ہے جو انتہائی کٹھن مرحلہ ہے، اور کہا جا سکتا ہے کہ مصنف نے اپنی تحریر و تحقیق کے لیے اپنی عمر عزیز کا خوبصورت دور وقف کر دیا ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کی دوسری اہم کتاب جو پیش نظر ہے اور جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں، وہ "شعرائے اردو اور عشقِ علی" ہے۔ اس کتاب کی ترتیب و اشاعت اور اسے لافانی شاہکار بنانے میں "میر انیس اکادمی" اور "مرکز علوم اسلامیہ" کی جس قدر تعریف کی جائے کم ہے۔ اس کتاب میں علامہ صاحب نے عشقِ علی کی سرگزشت کو ایک نئے انداز سے مرتب کرنے کا جوہر دکھایا ہے، تحقیق و جستجو، علمی و ادبی کمالات کی وہ شان دکھائی ہے کہ رہتی دنیا تک اہل ادب عش عش کر اٹھیں گے۔ گو اس کتاب میں کئی گوشے تشنہ رہ گئے ہیں اور اگر یہ تشنگی باقی نہ رہے گی تو ادب میں آئندہ آنے والے اس کام کو کیسے آگے بڑھائیں گے قطعاً اسی طرح جیسے کہ "شیخ ممتاز حسین جونپوری" نے جس کار ہنر اور کار خیر کا آغاز کیا تھا اور نامکمل چھوڑا تھا، اور سید ضمیر اختر نقوی صاحب نے ابتداء سے لے کر اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کا حق ادا کیا اور اب یہ کام ادب میں ایک روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔

علامہ صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے: حضرت ختمی مرتبت فرماتے ہیں کہ اپنے بچوں کی تربیت محبت علی پر کرو، گویا آنحضرت نے آئندہ نسلوں کے لیے حضرت علی کو ایک آئیڈیل قرار دیا تھا"۔ سو علامہ موصوف کو "شعرائے اردو" کے یہاں اس نوری کیفیت

کی بشارت مل گئی اور انھوں نے اپنے دجلۂ فکر و قلم کو تاریخ کے سینۂ صحرا پر رواں دواں کر دیا اور بقول میر انیسؔ:-

سبک ہو چلی تھی ترازوئے شعر
مگر ہم نے پلّہ گراں کر دیا

اس کتاب میں بھی علامۂ موصوف نے تاریخی حوالے کے طور پر سات ابواب قائم کیے ہیں اور اس مختصر مضمون کے دامن میں بھی اتنی کشادگی نہیں کہ تفصیلاً عرض کیا جا سکے لہٰذا اجمالاً پیشِ خدمت ہے۔

پہلا باب: قرآن میں حضرت علی کے فضائل اور منقبت کے محرکات۔

دوسرا باب: عربی شاعری اور مدحتِ علی (شعرائے کرام میں حسان بن ثابت اور امام شافعیؒ کے مسائل)

تیسرا باب: فارسی شاعری اور ثنائے علی، ان میں فردوسی، حکیم سنائی، عطار، مولانا روم، شمس تبریز (دم بہ دم علی علی) اور شیخ سعدی حافظ و جامی وغیرہ کے اسمائے گرامی شامل ہیں۔

چوتھا باب: اردو منقبت نگاری کا ارتقا۔ اس باب میں صوفیائے کرام کے علاوہ دکنی زبان، دہلوی منقبت نگار، غالبؔ کی فارسی منقبت نگاری، لکھنؤ کا تمدنی اور مذہبی پس منظر، دبستانِ لکھنؤ کی منقبت نگاری وغیرہ کا ذکر ہے۔

پانچواں باب: شعرائے اردو اور عشقِ علی پہچتی ہے جس میں حضرت امیر خسروؔ، میر تقی میرؔ، ولی دکنی، قلی قطب شاہ سے لے کر حسرت موہانی اور آخر دور کے لکھنوی شعرا کا تذکرہ مع کلام درج ہے۔

چھٹا باب: اردو مرثیہ نگار شعرا اور مدحتِ علی۔ اس باب میں مخصوص رنگ رکھنے والے

شعرا شامل ہیں۔

خصوصی باب: میر انیس اور حضرت علیؑ کی مدحت پر مشتمل ہے۔

ساتواں باب: ساتواں باب بڑی اہمیتوں کا حامل ہے کہ اس کا عنوان "عہدِ جدید میں عشقِ علیؑ کی مثالیں" ہے۔ ان شعرائے عظام میں سرسید، حالیؔ، میر مہدی مجروحؔ، اکبرؔ الٰہ آبادی، صفیر بلگرامی، شاد عظیم آبادی، علامہ اقبالؔ اور جوشؔ ملیح آبادی شامل ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت کے ساتھ حسبِ معمول بہت سے اعتراضات اور نزاعی مسائل بھی اُبھریں گے۔ لیکن ادب میں ایسا ہوتا آیا ہے۔ ممکن ہے آئندہ ابواب میں علامہ بذاتِ خود یا پھر دیگر محققین اس موضوع پر کام کریں اور جوشؔ ملیح آبادی کے بعد آنے والے معتبر شعرا کے کام اور کلام پر سیر حاصل تفصیلات جمع کرسکیں۔

آخر میں علامہ ضمیر اختر نقوی کی سعیِ پیہم، جاں فشانی اور مہم جوئی کی تعریف و توصیف بھی مقصود ہے کہ انھوں نے دنیا بھر کے اداروں، کتب خانوں، مخطوطات، قلمی نسخوں اور ذاتی طور پر مغربی ممالک کی لائبریریوں میں بیٹھ کر اس کتاب کی تدوین کے سلسلے میں کارہائے نمایاں انجام دیئے۔

☆ ☆ ☆

maablib.org

شفیع عقیل

ذوق وشوق بلکہ عشق ومحبت

خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعرا

یہ ضخیم تحقیقی کتاب علامہ سید ضمیر اختر نقوی کے اس ذوق وشوق بلکہ عشق ومحبت کا نتیجہ ہے جو انھیں شاعری کی صنف مرثیہ، نادر مرثیہ نگار، حضرت میر انیسؔ اور ان کے خاندان کے دیگر مرثیہ گو شعراء سے ہے۔ ان کا یہ عشق ومحبت اس دور سے ہے جب غالباً انھوں نے ادب اور ادبی دنیا میں قدم رکھا تھا۔ میں انھیں اس زمانے سے جانتا ہوں جب وہ زیرِ تعلیم تھے۔ اس وقت بھی مرثیہ نگاری اور میر انیسؔ ان کا مخصوص موضوع تھا۔ انھوں نے کراچی میں یادگارِ انیسؔ" اور میر انیسؔ اکیڈمی کی بنیاد رکھی اور اس طرح اس موضوع پر علمی وادبی بھی تحقیق وتلاش کا سلسلہ شروع کیا۔ انھوں نے خود بھی مرثیہ نگاری میں نام پیدا کیا اور جوشؔ ملیح آبادی جیسے شاعر نے ان کی شاعری کی تعریف وتوصیف کی۔

سید ضمیر اختر نقوی صاحب شاعر بھی ہیں، اور ادیب بھی ہیں، نقاد بھی ہیں، محقق بھی ہیں اور خطیب بھی ہیں۔ جن لوگوں نے انھیں مجالس میں سنا ہے، وہ ان کی خطابت کا لوہا بھی مانتے ہیں اور اس سلسلے میں وہ کئی ایک بیرونی ممالک کا دورہ کر چکے ہیں۔ مختلف مجالس میں کی گئی تقریروں پر مشتمل ان کے کئی مجموعے چھپ چکے ہیں تاہم میر انیسؔ ان کا مخصوص ومحبوب موضوع ہے، چنانچہ انھوں نے میر انیسؔ کی زندگی اور

شاعری پر اس کے علاوہ بھی بہت کچھ لکھا ہے، ایک اور علیحدہ کتاب بھی تحریر کی ہے جس میں اُردو کے اس نام ور اور منفرد شاعر کے فن، شخصیت اور فکر کا تفصیل سے جائزہ پیش کیا ہے۔ اب حال میں ان کی یہ ضخیم کتاب "خاندان میر انیسؔ کے نامور شعراء" شائع ہوئی ہے جس میں انھوں نے میر انیسؔ کی آٹھ پشتوں کے شاعروں کے بارے میں تحقیق کی ہے۔ ان کی اس تحقیق کے حسن و قبح پر صحیح رائے تو ادبی محققین ہی دے سکتے ہیں، میں تو صرف اس کا تعارف دے رہا ہوں، پہلی پشت میں میر انیسؔ کے پردادا میر ضاحکؔ، دوسری میں میر انیسؔ کے دادا میر حسنؔ، تیسری پشت میر انیسؔ کے والد میر خلیقؔ، چوتھی پشت میں میر انیسؔ کے بھائی میر انسؔ اور میر مونسؔ کے حالات زندگی اور شاعری کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ اس کے بعد پانچویں پشت میں میر انیسؔ کے بیٹوں میر نفیسؔ، میر رئیسؔ اور سلیسؔ کے علاوہ ان کے بھتیجے میر وحیدؔ کا تفصیل سے تذکرہ ہے۔ پھر چھٹی پشت میں میر انیسؔ کے پوتوں میر جلیسؔ، میر فیورؔ، قدیمؔ لکھنوی، عروجؔ لکھنوی اور فرزند حسن جلیل لکھنوی کے علاوہ ان کے نواسے میر مانوسؔ کے متعلق تحریر کیا گیا ہے۔ اس سے آگے ساتویں پشت میں میر عارفؔ، میر فائزؔ لکھنوی، فرید لکھنوی، ذکیؔ لکھنوی اور میر ہاشم حسین حزیںؔ کا ذکر ہے۔ اسی طرح آخری باب میں میر انیسؔ کی آٹھویں پشت کے دو شعرا میر فائقؔ لکھنوی اور میر لائقؔ لکھنوی کی شخصیت اور فن کا جائزہ لیا گیا ہے۔ سید ضمیر اختر نقوی صاحب نے ہر شاعر کے بارے میں تفصیلی طور پر لکھا ہے اور اُن کے حالات زندگی کے ساتھ ان کے مرثیے بھی ہیں۔ اس طرح جہاں انھوں نے تحقیق و تلاش کر کے ان شعرا کے حالات جمع کیے ہیں، وہاں ان کا بعض کلام بھی محفوظ کیا ہے۔ شروع صفحات میں میر انیسؔ کا کلام، ان کے خاندان کا تعارف، شجرۂ نسب اور ان کے آبا و اجداد کے بارے میں لکھا گیا ہے۔ یوں دیکھا

جائے تو یہ ایک ساتھ کئی مرثیہ نگار، نامور شعرا کا تذکرہ ہے۔ کتاب میں متعلقہ شاعروں کی قلمی تصویریں، اسکیچ بھی شامل ہیں اور آخر میں کتابیات کے حوالے کے ساتھ اشاریہ بھی موجود ہے۔ (روزنامہ جنگ کراچی "نقد و نظر"..... ۵ مئی ۱۹۹۵ء)

ڈاکٹر خاور رضوی نگرامی

۸ر جولائی ۱۹۸۰ء..... کراچی

برادر محترم سید ضمیر اختر نقوی صاحب، احترامات

"آپ نے اپنی مرتب کردہ کتاب "مراثی جوش ملیح آبادی" مجھے عنایت فرمائی جس کے لیے میں آپ کا سپاس گزار ہوں۔ میں نے اس کتاب کے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھا۔ جوش صاحب کی ان مہکتی ہوئی نظموں نے مجھے بہت مسرور کیا۔ اس میں فلسفہ بھی ہے، مضمون آفرینی بھی ہے، شعریت بھی ہے، جدت بھی ہے لیکن مرثیت نہیں ہے جو رثا کی جان ہے۔ پھر بھی میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اور سینکڑوں مقامات پر میری روح جھوم اٹھی "جادو نگاری" بہت مشکل فن ہے جو لاکھوں میں سے چند کے حصہ میں آتی ہے۔ انہی نظموں میں بعض بند ایسے بھی ہیں جن میں حضرت جوش کے قلم کی جادو نگاری ہے اور اس میں چند نظمیں اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ لیکن میری بصیرت یہ کہتی ہے کہ حضرت جوش باوجود انتہائی کوشش و عمل بسیار حضرت انیس اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے قدموں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ حضرت انیس کے سیدھ و مرتبہ ابھی نہیں پہنچے۔ حضرت انیس صنف مرثیہ نگاری میں اب بھی اس مقام بلند پر کھڑے ہیں جہاں وہ بالکل تنہا ہیں اور کوئی ان کا مقابل نہیں ہے۔ طرحیہ نظم لکھنا آسان ہے الیہ لکھنا دشوار تر ہے اور پھر جوش کو نفسیات نگاری، منظر نگاری (ان مرثیوں میں) ذرا سا رنج اور رزمیہ کی تو ہوا تک نہیں لگی ہے۔ ابھی وہ انیس اعظم سے بہت پیچھے ہیں۔ لیکن انیس کے علاوہ دوسرے مرثیہ نگاروں سے اونچے ہیں۔ یہی ان کا کمال ان کو ادب میں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ انیس اعظم زندہ باد۔ شبیر حسن خان جوش پائندہ باد۔"

علی حیدر ملک

خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعرا کے بارے میں تحقیق

سنجیدہ اور باشعور مصنف

اسنذی سرکل کی نشست میں اس بار دو کتابوں کو گفتگو کا موضوع بنایا گیا۔ یہ دو کتابیں تھیں ضمیر اختر نقوی کی ''خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعرا'' اور ''اردو غزل اور کربلا''۔ اول الذکر کتاب پر گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کلیم رحمانی نے کہا کہ ''خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعرا'' ایک ضخیم کتاب ہے جس میں میر انیسؔ کی آٹھ پشتوں کی ادبی وشعری خدمات کا بہت تفصیل کے ساتھ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔ ان آٹھ پشتوں میں میر انیسؔ کے پردادا میر ضاحکؔ، میر انیسؔ کے دادا میر حسنؔ، میر انیسؔ کے والد میر خلیقؔ، میر انیسؔ کے منجھلے بھائی میر انسؔ، میر انیسؔ کے فرزند اکبر میر نفیسؔ، میر انیسؔ کے پوتے میر جلیسؔ، میر نفیسؔ کے نواسے میر عارفؔ اور میر عارفؔ کے صاحب زادے میر فائقؔ لکھنوی کی پشتیں شامل ہیں۔ ہر ایک پشت میں کئی کئی حضرات کا ذکر موجود ہے۔

یادرامان نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ مرثیہ اردو شاعری کی ایک اہم اور توانا صنف ہے۔ گزشتہ چند برسوں کے دوران اس صنف کے تعلق سے جو تحقیقی وتنقیدی کام سامنے آیا ہے، وہ خاصا وقیع ہے۔ ''خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعرا'' اسی سلسلے کی ایک اہم کڑی ہے۔ اس سے مصنف کی تحقیقی وتنقیدی صلاحیتوں کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔

فرقان ادریسی نے خیال ظاہر کیا کہ اُردو مرثیہ اور میر انیسؔ لازم و ملزوم ہیں اور میر انیسؔ کے سلسلے میں ضمیر اختر نقوی کی زیرِ بحث کتاب لازمی ہے۔ اس کتاب میں جتنا مواد موجود ہے۔ اتنا کسی دوسری ایک کتاب میں ملنا دشوار ہے۔

''اُردو غزل اور کربلا'' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے شاہین بدر نے کہا کہ اس کتاب میں یوں تو چھ ابواب ہیں لیکن پہلے پانچ ابواب موضوع سے متعلق ہیں جبکہ چھٹا اور آخری باب دراصل ایک روداد ہے جس کا موضوع سے براہِ راست کوئی تعلق نہیں۔ یہ روداد اس طرح کی کسی بھی کتاب میں شامل کی جا سکتی تھی۔

احمد زین الدین نے شاہین بدر کی رائے سے اتفاق کرتے ہوئے کہا کہ کتاب کے پہلے پانچ ابواب کچھ اس طرح ہیں: اُردو غزل اور کربلا، واقعاتِ کربلا غزل کے آئینے میں، فرہنگ ذکرِ کربلا اور غزل میں مماثلت، بلاواسطہ اشعارِ غزل اور بالواسطہ اشعارِ غزل۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے کہا کہ ضمیر اختر نقوی کے خیال میں شاعری میں واقعۂ کربلا کے اثرات دو طرح کے ملتے ہیں، شعوری حیثیت سے اور غیر شعوری حیثیت سے۔ شعوری فکر کی کارفرمائی مرثیے ہیں اور غیر شعوری فکر غزل میں ابھر کر سامنے آئی ہے۔ ان کی رائے میں جس طرح غزل کربلا سے متاثر ہوئی ہے، اسی طرح اُردو مرثیہ بھی غزل سے متاثر ہوا ہے۔ یہ خیالات بہت اہمیت کے حامل ہیں، ان پر دوسرے نقادوں کو بھی غور کرنا چاہیے۔

صبا اکرام نے کہا کہ ضمیر اختر نقوی نے ایک اہم موضوع پر اچھی کتاب لکھی ہے لیکن اس میں جن شعرا کے شعار کی مثالیں دی گئیں ہیں، ان میں سے غالب اکثریت پرانے شعرا کی ہے۔ جدید شاعروں نے اس حوالے سے بہت اچھے اشعار کہے ہیں

لیکن حیرت کی بات ہے کہ مصنف نے ان کی طرف توجہ نہیں کی۔ اسی طرح بعض اشعار کو خواہ مخواہ کربلا یا واقعۂ کربلا سے منسلک کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔

پروفیسر محمد رضا کاظمی نے صدارتی کلمات میں کہا کہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب ہمارے عہد کے ایک سنجیدہ اور باشعور لکھنے والے ہیں۔ مرثیے کے حوالے سے انھوں نے جو کام کیا ہے، اسے ان کا بدترین مخالف بھی نظر انداز نہیں کر سکتا "خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا" میں جس تحقیقی دیدہ ریزی کا ثبوت انھوں نے فراہم کیا اور تمام مواد کو جس سلیقے اور قرینے سے پیش کیا ہے، وہ انھی کا حصہ ہے۔ چونکہ یہ ایک ضخیم کتاب ہے، اس لیے آج کی نشست میں اس کے چند پہلوؤں پر گفتگو ہوئی اور اور کچھ پہلو وقت کی کمی کے باعث نظر انداز ہو گئے۔ "اردو غزل اور کربلا" بھی ایک اہم کتاب ہے جس سے متاثر ہو کر کئی دوسرے مقالے اور کتابیں لکھی گئی ہیں۔ ضمیر اختر نقوی صاحب کی خوبی یہ ہے کہ وہ نہایت محنت سے ٹھوس کام کرتے ہیں، ان کی تمام کتابیں اس پر دال ہیں۔

(ہفت روزہ "اخبار جہاں" کراچی، ۷ مئی ۱۹۹۵ء)

پروفیسر کاظم علی خان

۱۷ اکتوبر ۱۹۹۳ء ..... لکھنؤ

عزیزی ضمیر اختر دعائیں! آپ کی نئی کتاب "شعرائے اردو اور عشق علیؑ" کی دو جلدیں الگ الگ لوگوں کے ذریعے دستی طور پر کچھ عرصہ قبل مل گئی ہیں اور میرے مطالعے میں ہیں۔ ایک جلد شیعہ کالج لائبریری میں جمع کرانے کا ارادہ ہے تاکہ شیعہ کالج لکھنؤ سے آپ کا دیرینہ تعلق برقرار و استوار رہے۔ کتاب کے لیے شکریہ قبول کیجیے۔

آلِ محمد رزمی

خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعرا پر تبصرہ

ہر شاعر اپنے معاشرے کی ایک زندہ اکائی ہوتا ہے۔ انفرادی اور مقامی طور پر وہ اپنے گرد و پیش اور گرد و پیش کے طبقاتی تصورات سے بندھا ہوتا ہے لیکن اجتماعی طور پر وہ اپنی قوم، اپنے ملک اور کسی خاص مسئلے اور موضوع پر دنیا کی اطاعت سے بلند ہو کر بھی سوچ سکتا ہے۔ اور اپنے ہمہ گیر افکار اور عظیم فن کی وجہ سے شخصیتِ زمانہ بھی بن سکتا ہے شیکسپیر ہو کنز، ہوگر، ہومر، ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، برٹرینڈ رسل، دانتے، شوپن ہار، سعدی، تلسی داس، جگر، ٹیگور، حیری اور میکسم گورکی وغیرہ مختلف زمانوں، مختلف زبانوں اور مختلف طبقوں کے مخصوص رشتوں کی پیداوار تھے لیکن دنیا کا کوئی ایک ملک، ایک طبقہ یا ایک عہد ان کے فکر و فن کا واحد اجارہ دار نہیں ہو سکتا، وہ ساری دنیا کے لیے عظیم فن کاروں کی حیثیت سے تسلیم کیے جاتے ہیں۔

فکری طور پر جو شاعر اپنی تخلیقات کو اپنی جماعت کے مقامی اور انفرادی رشتوں تک محدود رکھتا ہے، اس کی موت کے بعد اس کے فن کی تعلیمی اہمیت تو برقرار رہتی ہے لیکن شاید فنی حیثیت قائم نہ رہ سکے۔ اس کے برعکس جو ادیب یا شاعر انسان کو اجتماعی اور تاریخی طور پر ایک SERIAL PROCESS سمجھتا ہے اور اسے گروہوں، قبیلوں، مذہبوں، نسلوں اور علاقوں کی عصبیت سے الگ کر کے دیکھتا ہے، اس کا انداز فکر و فن آنے والے زمانوں کے لیے زندہ پائندہ رہ سکتا ہے۔ ادب و فن کا منشا یہ نہیں کہ

وہ کسی مخصوص نظریۂ حیات کی براہِ راست تبلیغ کرے، ادب اپنی علامتوں، تشبیہوں، استعاروں اور دیگر فنی محاسن کے ساتھ انسانی فکر و احساس کو SUGGESTIVE انداز میں بیان کرسکتا ہے کہ اس میں عمومی تاثر پیدا ہوسکے۔ میر تقی میر، اسد اللہ خاں غالب، نظیر اکبر آبادی، سلامت علی دبیر، میر ببر علی انیس، ڈاکٹر محمد اقبال ہمارے دور سے تعلق نہیں رکھتے، لیکن انھوں نے اپنے انفرادی فکر و احساس کو ایسے ہمہ گیر انداز میں پیش کیا ہے کہ آج کا انسان ان کے فکری اور احساسی تجربوں کو اپنے تجربے کہنے پر مصر ہے یا کم از کم ان کے فن سے متاثر ہوکر کسی نہ کسی طرح اس کی پیروی کرتا ضرور نظر آتا ہے۔ بعض خیالات وقتی اور ہنگامی اقدار کے حامل ہوتے ہیں اور وہ متعلقہ دور کی موت کے ساتھ ہی مر جاتے ہیں لیکن بعض افکار مستقل اور دیرپا ہوتے ہیں، اسی طرح بعض اسالیبِ فن کمزور و غیر موثر ہوتے ہیں اور انھیں اپنے دور میں بھی مقبولیت حاصل نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس بعض بڑے فن کار اس موثر انداز سے فن پارے تخلیق کرتے ہیں کہ صدیوں تک زبان زدِ خاص و عام رہتے ہیں۔ لیکن مرثیہ اور مرثیہ نگاری کا مسئلہ اپنے اندر ایک عجب تاثیر رکھتا ہے۔ واقعۂ کربلا ایک مخصوص قوم و مذہب خطے میں پیش آیا۔ لیکن یہ واقعہ اتنا ہمہ گیر، انسانی و آفاقی ہے کہ اس واقعے کا احساس دنیا میں روز بروز بڑھتا جا رہا ہے، اور متلاشیانِ انسانی اقدار اور انسانی شرف پر یقین رکھنے والے مظلوموں کے طرف دار اور ظلم کے خلاف آواز اٹھانے والوں نے جب واقعۂ کربلا کا مطالعہ کیا تو وہ واقعۂ کربلا کے ذمے داروں کے خلاف آواز اٹھانے اور انسانی اقدار کے تحفظ کے لیے شہید ہو جانے والوں کی حمایت کرتے نظر آتے ہیں اور رنگ و نسل و علاقائیت و مذہب سے بالاتر ہوکر حضرت امام حسین علیہ السلام سے اپنی محبت و عقیدت کا برملا اظہار کرتے ہیں۔ اس واقعے نے ہر دور میں ہر خطے، ہر قوم، ہر مذہب

اور ہر زبان سے تعلق رکھنے والے افراد کو متاثر کیا اور اس واقعے کا ہر اعتبار سے مطالعہ کیا گیا۔ انسان مشربی، انسان شناسی اور انسانی اقدار کی سب سے بڑی درس گاہ کربلا ہے۔ کربلا نے جہاں دیگر علوم کو گراں قدر دولت عطا کی، وہیں ادب کو بھی مالا مال کیا۔ آج ہر صنف سخن میں کربلا ایک استعارہ بن کر ادب کی رگ و پے میں سرایت کر چکا ہے، لیکن کربلا نے جس صنف سخن کو سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ مرثیہ ہے۔ مرثیے نے شاعری کو عروج و کمال تک پہنچایا۔ کربلا سے پہلے مرثیے کی حدود بہت محدود تھیں، لیکن مرثیے نے حضرت امام حسین علیہ السلام سے اپنا رشتہ و ربط باہمی قائم رکھ کر خود کو دیگر صنف میں ممتاز و ممیز کیا۔ جس طرح اُردو زبان کو مرثیے نے وسعت و وقعت عطا کی، اسی طرح میر انیس اور ان کے خاندان نے مرثیے کی عظمت کو چار چاند لگائے اور مرثیے کے CANVAS کو وسیع تر کر دیا۔ زیرِ نظر کتاب "خاندان میر انیس کے نامور شعرا" میں برصغیر کے نامور دانش ور، محقق و خطیب علامہ سید ضمیر اختر نقوی نے اس خاندان کے شعرا اور ان کی شاعری کا اجمالی جائزہ پیش کیا ہے۔ یہ کتاب خدائے سخن میر انیس اعلی اللہ مقامہٗ کے خاندان کے لیے خلوصِ دل کا خراج اور وہ اعتراف ہے کہ عظیم لوگ عظیم تر لوگوں کے لیے کیا کرتے ہیں۔

یہ کتاب مؤلف کی انیس شناسی کی آئینہ دار اور ذوق و رجحان کی غماز ہے۔ اس اہم و وقیع موضوع اور ادبی دستاویز کو علامہ سید ضمیر اختر نقوی نے نہایت خوش اسلوبی، ذمے داری، خلوص، دل جمعی، لگن، ادراک، شعور، ژرف بینی و جگر کاوی سے مرتب کیا ہے وہ گزشتہ تیں، پینتیس سال سے علمی و تحقیقی کاموں میں معروف ہیں اور مختلف موضوعات پر قلم اٹھایا اور اس میں شک نہیں کہ ہر میدان میں ان کی رائے متوازن اور بصیرت آمیز ہوتی ہے۔ علامہ موصوف کا تحریری و تقریری سفر اپنے دور کے انداز تحریر

میں ادبی و مذہبی تفکر، خیال کی ندرت و جدت اور ابہام سے دور رہنے کی شعوری کوشش و رجحان قابل ذکر ہے۔

علامہ سید ضمیر اختر نقوی کا نثری اسلوب:

نثر نگار کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا اسلوب، یعنی STYEL ہوتا ہے۔ اسلوب، ہیئت اور خیال کے باہمی اشتراک سے ترتیب پاتا ہے۔ یہی دو چیزیں ادب کا ظاہر اور باطن ہیں، الفاظ ان دونوں کے اشتراک باہم کا ذریعہ ہے۔ اس کا درست اور برمحل استعمال خیال میں قوت پیدا کرتا ہے اس گہرائی میں اضافہ کرتا ہے۔ معنویت بڑھاتا ہے اور بالآخر اس اسلوب کو جنم دیتا ہے جو ہر تخلیق کار کا اپنا اور یکسر جداگانہ ہوتا ہے اور جس سے اس کی شخصیت کے بہت سے گوشے آشکار ہوتے ہیں۔ الفاظ دراصل وہ جسم ہے جسے خیال کی روح تحرک و تازگی بخشتی ہے۔ فن کار کا کمال یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی غواصی کے عمل سے الفاظ کے پیکر کو جیتا جاگتا بنا دے اور زندگی کی لہر اس میں دوڑا دے کہ ان لفظوں کو اعجاز گویائی حاصل ہو جائے اور وہ قاری سے اس طرح باتیں کرنے لگیں جس طرح فن کار تخلیقی لمحے میں خود اپنے آپ سے ہم کلام ہوتا ہے۔ علامہ سید ضمیر اختر نقوی کا اسلوب تحریر داخلی طور پر بے حد توانا ہے کہ ان کے یہاں اظہار کی گوناگوں ندرت کاریوں کے باوصف تخیل کا ایک مخصوص مرکز سے کبھی فاصلہ نہیں ہونے پاتا۔ ان کے یہاں مطالعے کی وسعت اور خیال کی فوقیت مسلّم ہے کہ یہ دراصل خارجی تجربات کی باطنی بازدیدی کا ہی عنوان ہے۔ وہ کچھ سوچتے ہیں، اس کے اظہار بیان کی قدرت رکھتے ہیں۔ وہ اپنے مشاہدات و مطالعے کو بڑی خوبصورتی سے قارئین تک پہنچا دیتے ہیں۔ ان کی تحریر میں روانی، سادگی، شائستگی اور شستگی پائی جاتی ہے۔ وہ غیر ضروری ابہام، مشکل پسندی، غیر معروف و غیر مانوس الفاظ کے

استعمال سے اجتناب کرتے ہیں اور لفظوں کے اُلٹ پھیر میں الجھنے یا الجھانے کے بجائے سادہ و صاف الفاظ میں اپنے مافی الضمیر کو بڑی آسانی سے دوسروں تک منتقل کردیتے ہیں اور یہی اسلوب انھیں دوسروں سے ممتاز کرتا ہے۔ کسی بھی شاعر کی شاعرانہ عظمت کا ادراک و اندازہ لگانے کے لیے یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ اس شاعر کی شاعری فنی و تکنیکی حوالے سے کیسی ہے۔ اس دور کے اہلِ علم و فن اسے کیا مقام دیتے ہیں، اس نے جس صنف کو اپنا موضوعِ سخن بنایا ہے، اس صنف میں اس کا اپنے ہم عصروں میں کیا مقام ہے، اس نے دوسروں کے مقابلے میں کوئی اجتہاد کیا، اپنے لیے کوئی علیحدہ راستہ منتخب کیا، اس کا اسلوب دوسروں سے جدا ہے یا نہیں، خیال کی بلندی اور مطالعہ و مشاہدہ کیسا ہے، اگر اس کے سوچنے کا انداز اور شعر گوئی کا ڈھب دوسروں سے جدا و مختلف ہوگا تو وہ دیگر شعرا کے مقابلے میں ممتاز و منفرد ہوگا۔

جب ہم حضرت میر ببر علی انیسؔ اعلی اللہ مقامہٗ کی شاعری پر نظر ڈالتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کی شاعری میں تنہا وہ تمام موضوعات موجود ہیں جو بہت سے شعرا میں مل کر بھی یک جا نہیں ہوتے۔ میر انیسؔ و میر انیسؔ کے خاندان کے نامور شعرا نے مرثیے کو نئے افق عطا کیے۔ ان کی شاعری کچھ کم دو سو سال پر محیط ہے۔ مرثیے کے حوالے سے ان کا خاندان مستند و معتبر مانا جاتا ہے۔ میر انیسؔ کے خاندان کے ہر فرد کا انداز جدا ہے۔ کسی نے رزم میں کمال حاصل کیا، کسی نے منظر نگاری میں، کسی نے مصائب کا التزام و انصرام اس اہتمام سے کیا کہ سننے والا ان اشعار کو سن کر اپنے اُوپر قابو نہ رکھ سکے۔ جہاں تک منظر نگاری و ڈرامائی تشکیل کا تعلق ہے، مغرب میں ٹی۔ ایس۔ ایلیٹ، ہومر اور شیکسپیئر نے منظر نگاری و ڈرامائی تشکیل میں مغربی شاعری کا پلڑا اونچا کردیا تھا اور اس کے مقابلے میں اُردو شاعری کا دامن اس سے خالی تھا، لیکن میر انیسؔ اور ان

کے خاندان کے شعرا نے اپنے مرثیے میں فطرت، ماحول، موسم اور قدرتی مناظر اس انداز سے قلم بند کیے ہیں کہ پڑھنے اور سننے والا خود اپنے آپ کو اس ماحول کے درمیان پاتا ہے۔ میر انیسؔ کے خاندان سے پہلے مرثیے میں وہ عمومیت، سلاست اور روانی نہ تھی اور نہ تشبیہات واستعارات نظم کیے جاتے تھے۔ قلی قطب شاہ سے دہلی تک کے شعرا میں وہ رچاؤ اور شیرینی اور عام فہم زبان نہ تھی اور نہ شاعری میں اخلاقیات کا گزر تھا مرثیے نے اُردو شاعری میں وہ تمام اوصاف پیدا کر دیے جو کسی بھی مستند و معتبر زبان میں ہونا چاہئیں، یہی وجہ ہے کہ میر انیسؔ کے خاندان کے شعرا کو اپنے اپنے دور میں بے حد سراہا گیا بلکہ ہر دور میں سراہا گیا اور آنے والے دور میں بھی ناقدین اور علم وادب کا ذوق رکھنے والے اس خاندان کے معترف ومداح رہیں گے۔ علامہ سیّد ضمیر اختر نقوی نے خاندانِ میر انیسؔ کے شعرا پر قلم اٹھا کر تحقیق کا پورا حق ادا کیا ہے۔
میر انیسؔ اعلی اللہ مقامہٗ حضرت امام حسین علیہ السلام سے بے پناہ محبت ومودّت اور عقیدت وارادت رکھتے ہیں اور علامہ ضمیر اختر نقوی میر انیسؔ سے، اور یہی محبت اس کتاب کی تالیف وتدوین کی بنیادی محرک ہے۔ زندہ قومیں بھی اپنے اکابرین (HEROES) اور اربابِ دانش واہلِ کمال کو اپنے نثری شہ پاروں اور اپنے شعروں میں ہمیشہ یاد رکھتے ہیں اور ان کی شخصیت اور کارناموں کو کبھی فراموش نہیں کرتے بلکہ اپنے عہد اور آنے والی نسلوں کو باخبر رکھنے کی شعوری کوشش کرتے ہیں۔
میر انیسؔ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا مگر ہر دور میں اہلِ فکر ونظر اپنے اپنے زاویۂ فکر وزاویۂ نگاہ کے مطابق تفکر وتفحص کرتے رہیں گے اور ان شخصیتوں کے متعدد مخفی پہلوؤں کو اجاگر کرتے رہیں گے اور ان شخصیتوں کے کارناموں پر پڑی ہوئی وقت کی تہ در تہ گرد کو صاف کر کے تحقیقی کام کو آگے بڑھاتے رہیں گے۔ زیرِ نظر

کتاب ''خاندان میر انیس کے نامور شعرا'' بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے سالہا سال کی تحقیق اور چھان پھٹک کے بعد ایک ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے شعر وادب کے قارئین اور خصوصاً رثائی ادب میں گہری دلچسپی رکھنے والے کئی جہات سے آشنا کیا ہے اور خاندانِ انیس کے شعری ورثے کو از سرِ نو ترتیب کر کے نذرِ قارئین کیا ہے اور خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا کے حالاتِ زندگی کے متعلق ضروری معلومات پیش کرتے ہوئے اور اختصار و جامعیت دونوں کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے ایک اعلیٰ اور جامع کتاب تصنیف کی ہے۔ یہ اپنے موضوع پر پہلی مفصل و مدلل کتاب ہے۔ علامہ سید ضمیر اختر نقوی سے پہلے کسی نے اس موضوع پر کوئی مفصل و مستقل تصنیف نہیں لکھی اور سیکڑوں مخطوطات اور مطبوعات کے عمیق مطالعے اور عرق ریزی کے بعد اس بکھرے مواد کو یکجا کیا ہے۔ ان تمام مطبوعہ و قلمی کتابوں تک رسائی حاصل کرنا بجائے خود ایک بہت بڑا کام ہے اور اس سے بھی بڑا کام ان کتابوں کا بنظر غائر مطالعہ اور اجمالی جائزہ ہے۔ یہ دلچسپی اور لگاؤ خانوادۂ میر انیس سے عقیدت وانسیت اور دلچسپی کا اظہار ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی ایک صاحبِ احتیاط اور مستقل مزاج محقق ادب ہیں۔ اپنی اس کتاب میں انھوں نے باریک بینی، محنت اور جاں فشانی کا ثبوت دیا ہے۔ عصرِ حاضر میں ذرائع ابلاغ کے سحر نے نئی نسل کو اپنے مذہبی، ثقافتی، ادبی اور تہذیبی ورثے، روایات و اقدار سے اس قدر دور کر دیا ہے کہ وہ شعر وادب کو تضیعِ اوقات سمجھتے ہوئے صرف اور صرف دولت کمانے کے علم کی طرف متوجہ ہیں اسی طرح ان کی مرثیے سے دلچسپی بھی کم ہوتی جا رہی ہے۔ کچھ شعرا کی ذاتی چپقلش، انا، گروہ بندی، دھڑے بازی اور کچھ ادبی ذوق کے فقدان نے ادب کو نقصان پہنچایا ہے اور کچھ مغربی تہذیب کے

بطن سے پیدا ہونے والے مہلک عوارض میڈیا نے اور کچھ حکومت وامرا و روسا کی عاقبت نااندیشی اور بخل نے نئی نسل کو تہذیبی سانچوں کی بازیافت سے دور رکھا، یہی وجہ ہے کہ ہماری نوجوان نسل بلکہ اب بزرگ بھی مرثیے کے متعلق واجبی سی معلومات رکھتے ہیں۔ جب اُردو زبان کے ساتھ وطن عزیز پاکستان کے ارباب حل وعقد کا رویہ ہی ناقابل فہم ہو تو مرثیے کے ساتھ ان کا سوتیلی ماں جیسا سلوک کرنا بعید از عقل نہیں۔

میرانیس اعلی اللہ مقامہٗ پر جتنا کام حکومت ہندوستان نے کیا ہے، اس کا عشر عشیر بھی حکومت پاکستان نے نہیں کیا بلکہ سرے سے کوئی کام ہی نہیں کیا۔ اس کی ایک وجہ حکومت کی اُردو سے عدم دلچسپی اور دوسری وجہ حکام میں ادبی ذوق کا فقدان ہے یہی وجہ ہے کہ آج تک پاکستان میں حکومتی سطح پر نہ کوئی سیمینار ہوا، نہ مذاکرہ، نہ میرانیس یادگاری ٹکٹ کا اجرا ہوا۔ نئی نسل کو اُردو مرثیے بلکہ ادب سے دور رکھنے کے دوسرے بڑے مجرم پاکستان کے سرمایہ دار روسا ہیں جو تقسیم وہ استحصالی طبقہ بن گئے جو اگر کسی ادارے یا شخص کی معاونت کرتے بھی ہیں تو صرف اپنا ٹیکس بچانے کے لیے یا اپنے کالے دھن کو سفید کرنے کے لیے۔ چونکہ یہ امرا بھی وقت کی پیداوار ہیں، لہٰذا ان میں ادبی ذوق وقومی حمیت سرے سے مفقود ہے۔ اُردو ادب اور اُردو مرثیے کے تیسرے بڑے مجرم وہ علما وخطبا ہیں جو ہمارے تہذیبی سانچوں سے ناواقف ہیں اور انھوں نے اپنے تہذیبی سانچوں کی بازیافت کی کبھی کوشش نہیں کی۔ ان لوگوں نے بھی ہمیشہ اپنے مفادات کو پیش نظر رکھا۔ اس کی بھی دو وجوہات ہیں ایک تو زاہد خشک کا شعر وسخن سے کیا تعلق اور اگر کچھ واجبی سا تعلق ہے بھی تو خطرہ وخدشہ ہے کہ عوام ان کی خطابت کے بجائے مرثیے کی طرف متوجہ ومائل نہ ہو جائیں۔ اس طرح ان کی مذہبی تجارت پر اثر پڑتا ہے۔ پھر ان لوگوں نے جس تنگ دستی وکسمپرسی میں دینی تعلیم حاصل کی ہے،

انھیں ادب سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے اِمعاشرے نے اگر انھیں منبر پر پہنچنے سے پہلے یا دربار سے منسلک ہونے سے قبل عزت بخشی ہوتی یا جائز مقام دیا ہوتا تو شاید ان کے دل میں بھی رحم دلی کا انکوا پھوٹتا۔ جب وہ کسی منصب و مقام پر پہنچ جاتے ہیں تو لوگ ان کے حاشیہ بردار بن جاتے ہیں۔ اُردو ادب اور اُردو مرثیے کے پانچویں مجرم وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے مخصوص نظریات یا تعصب کے پیشِ نظر مرثیے سے چشم پوشی کی۔ اُردو ادب کے چھٹے مجرم وہ شعرا ہیں جو ادبی دھڑے بندی اور پارٹی بندی میں مصروف ہیں اور اپنی استادی کا سکہ جمانے اور بٹھانے کے لیے گروپ بندی کر کے تخلیقی نوعیت کا کوئی اجتماعی کام انجام نہیں دے سکے۔ اُردو ادب کے ساتویں مجرم ہم سب خود ہیں جو خود اپنی زبان، اپنے ادب، اپنی ثقافت اپنی تہذیب سے ناآشنا ہیں اور اس کی ترقی و ترویج کے لیے کوئی کوشش نہیں کرتے بلکہ اپنی زبان پر انگریزی زبان کو فوقیت دیتے ہیں۔ ہمارا ایسا احساسِ کمتری انگریزوں کی دو سو سالہ غلامی کا منطقی نتیجہ ہے۔

علامہ سید ضمیر اختر نقوی نے ہمیشہ اپنے وسائل و بصیرت کے مطابق اُردو مرثیے کی ترقی و ترویج کی کوشش کی ہے۔ ان کی اُردو مرثیے کے مذاق کو زندہ کرنے کی ہر کوشش مستحسن ہے۔ انھوں نے زیرِ نظر کتاب میں اُردو قارئین کو خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا اور ان کے فکر و فن سے روشناس کرایا ہے۔ ان میں جو تہذیبی و تخلیقی ذہن کار فرما نظر آتا ہے۔ اس کے مظاہرے اس کتاب میں جگہ جگہ نظر آتے ہیں۔ خاندانِ میر انیس کے تمام شعرا آج بھی تازہ دم و توانا ہیں۔ ان کی یہ تازگی عطیۂ خداوندی اور ان کے مسلسل مشقِ سخن، غور و فکر اور تجربات و مشاہدات کا نتیجہ ہے۔ لہٰذا علامہ نقوی نے نہ صرف ان شعرا کی زندگی کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے بلکہ ان کے عظیم الشان مرثیے کے اقتباسات بھی پیش کیے ہیں تاکہ تشنگانِ علم و ادب اس سے کما حقہٗ استفادہ

کرسکیں۔ یہ کتاب اپنی تزئین، حسن کاری، سلیقے اور خوش ذوقی کا بہت اچھا نمونہ ہے۔
خالص علمی، ادبی اور معلوماتی نقطۂ نظر سے بھی دلچسپ مواد پر مشتمل اس کتاب میں علامہ نقوی کی یادداشت اور جزئیات نگاری قابلِ رشک ہے۔ انھوں نے ہمارے علمی وشائستہ تہذیبی ورثے کو آئندہ نسلوں کے لیے محفوظ کردیا ہے میں ان کی اس لگن، محنت، سعیِ پیہم اور ہمت وجذبے کی داد دیتا ہوں۔

خدائے سخن میر ببر علی انیسؔ کی شاعرانہ عظمت اور بلندیِ دائرۂ خیال کی وسعت اور گہرائی، موضوع کی تخلیقی ترجمانی، فکر کو جذبے کی آنچ عطا کرنے کی صلاحیت، لفظ کو گنجینۂ معنی بنانے کی اہلیت، زبان پر فتح اور زبان کے ساز کو سوز بنانے کی قدرت، اجنبی مناظر میں مانوس پہلو دکھانے کی سکت، زبان کی آرائش وزیبائش، رعایتِ لفظی، معجز بیانی، سلاست وروانی، کردار نگاری ومنظر نگاری، تشبیہات واستعارات، محاکات، مناظر وکیفیات فصاحت، اسلوب، سیرت نگاری، شاعرانہ شعور، تنوع، موضوعات، بلاغت اور شیرینی، اثر آفرینی کے علاوہ ان کے کلام میں جو اخلاقی قدریں اور حفظ مراتب پایا جاتا ہے، وہ اُردو کے کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوا۔ اُردو شاعری کا دامن بہت سے موضوعات سے خالی تھا۔ انیسؔ نے اپنی شاعری سے دامنِ اُردو کو بھر دیا۔
یہاں میر انیسؔ کی شاعری کے ان موضوعات پر خامہ فرسائی مقصود نہیں بلکہ ان کے خاندان کے نامور شعرا پر نقد ونگاہ پیشِ نظر ہے۔

علامہ سید ضمیر اختر نقوی نے خاندانِ میر انیسؔ کا تعارف، شجرۂ نسب اور ان کے اجداد کے تذکرے بڑی تفصیل اور خوش اسلوبی سے پیش کیے ہیں۔
میر انیسؔ اعلیٰ اللہ مقامہٗ نے فرمایا تھا: "پانچویں پشت ہے شبیر کی مداحی میں"۔
جب اس مصرع کے تناظر میں ان کے خاندان کا جائزہ لیتے ہیں تو پہلی پشت میں ہمیں

میر انیس کے پردادا میر ضاحک نظر آتے ہیں۔ شبیز کی مداحی میں دوسری پشت میں میر انیس کے دادا میر حسن پر نگاہ پڑتی ہے۔ شبیز کی مداحی میں تیسری پشت میں افقِ مرثیہ نگاری پر میر خلیق طلوع ہوتے نظر آتے ہیں جن کا شمار ان شعرا میں ہوتا ہے جن کے ہاتھوں اُردو مرثیے کی صورت گری ہوئی اور مرثیے کو اُردو کی ایک باقاعدہ صنف و صنعت قرار دیا گیا۔ میر خلیق، میر انیس کے والد گرامی تھے۔ علامہ نقوی نے میر خلیق کے حالات زندگی اور ان کی شاعری پر سیر حاصل مواد پیش کیا ہے۔

شبیز کی مداحی میں چوتھی پشت میں میر مہر علی انس ہیں جو میر انیس کے مجھلے بھائی ہیں زیرِ نظر کتاب میں میر انس کے حالات زندگی اشاریہ مراثی میر انس اور مرثیے کے نمونے پیش کیے ہیں اور انتخاب میں بڑی ژرف بینی سے کام لیا ہے۔ علامہ نقوی نے میر انس کی تعلیم و تربیت اساتذہ، ابتدائی مجالس، لکھنؤ میں مستقل سکونت، سفر حیدر آباد دکن، عظیم آباد کا سفر، بنارس و امروہہ کی مجالس، ان کی وفات اور ان پر کہے جانے والے قطعۂ تاریخ کا تذکرہ فرمایا ہے۔ میر مونس کے تذکرے میں ولادت و تعلیم و تربیت، تلمذ، لکھنؤ میں مستقل سکونت، ریاست محمود آباد سے تعلقات، مقبولیت، طرزِ خوانندگی، وضع قطع، عظیم آباد اور کلکتے کا سفر، زیارات عتبات عالیہ کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ میر مونس کے حالات زندگی، اشاریۂ مراثی مونس، اخلاق و عادات، راجا صاحب محمود آباد سے مراسم اور انتخاب کلام میر مونس کو علامہ نقوی نے بڑی جگر کاوی سے پیش کیا ہے۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے میر نفیس، میر رئیس، میر وحید، میر جلیس، قدیم، عروج، جلیل، میر عارف، بابو صاحب فائق، فائز، فرید، منے صاحب ذکی، میر ہاشم حسین حزیں، میر محمد ہادی لائق کے حالات زندگی، ان کے مراثی کے اشاریوں اور انتخاب کلام کو بڑی محنت، لگن، ذہانت، تحقیق، دل جمعی اور ژرف بینی سے مرتب کیا

ہے اور موضوعی (SUBJECTIVE) انداز میں لکھا ہے جس سے تشنگانِ علوم اور مرثیے کا ذوق رکھنے والوں کے لیے نت نئے امکانات کے دروازے کھلے ہیں۔ اس کتاب میں خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعرا کی فنی دنیا اور زندگی کے مکمل حالات پیش کیے جانے کا سفر تو ممکن نہیں، لیکن علامہ ضمیر اختر نقوی کی اس کتاب کے مطالعے سے ایک بات پوری دیانت کے ساتھ کہی جا سکتی ہے اور وہ یہ کہ اس کتاب سے آنے والے محققین اپنی تحقیقات کو آگے بڑھانے میں آسانی محسوس کریں گے۔ علامہ نقوی کا طرزِ تحریر اور نقطۂ نگاہ تر و تازہ اور واضح ہے۔ انھوں نے میر انیسؔ کے خاندان کے نامور شعرا کے تذکرے سے مرثیے کی تہذیبی فضاؤں کا مطالعہ کرنے کی دعوت دی ہے۔ اس کتاب کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کچھ مسائل و موضوعات و واقعات بھی نئے ہیں اور کہنے کا انداز بھی اور خاندانِ میر انیسؔ کے نام ور شعرا کے بارے میں دلچسپ انکشافات بھی۔

مجھے اُمید ہے کہ حلقۂ اہلِ نظر میں یہ کتاب مقبولیت حاصل کرے گی اور طلبا و باذوق قارئین اس کتاب کی وساطت سے خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعرا کی عظمتِ شعری اور مقامِ شاعری کے تعین میں آسانی محسوس کریں گے۔

علامہ سید ضمیر اختر نقوی اُردو مرثیے کے جوہری ہیں۔ انھوں نے خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعرا کی شاعری کے جوہر کو بھی تحقیق و ذمے داری کے ساتھ یک جا کر دیا ہے اور خاندانِ میر انیسؔ کے شعرا کی زندگی کے چیدہ چیدہ حالات کو بھی ژرف بینی سے مرتب کیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ادب کے اس جوہری کی قدر نہ ہو سکے اور وہ ادبی ذوق کے فقدان اور حسد کا شکار ہو جائیں، مگر انھیں ادب کے ان قدامت پسند بھیڑیوں اور مذہبی تاجروں کی پروا نہ کرتے ہوئے عزم و استقلال کے ساتھ اپنے بامقصد سفر کو جاری رکھنا چاہیے۔

سید قیصر حسین قیصر مشہدی (ایم۔اے)

ہمہ جہت شخصیت

انسانی شخصیت کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ بقائے دوام کے حصول کی آرزو اسے ہر دم بے قرار رکھتی ہے۔ انسان کے لیے بے ثباتی کا تلخ احساس سوہانِ روح سے کم نہیں۔ ہر شخص گم نام زندگی پر قابو پانے کی حتی المقدور کوشش کرتا ہے، لیکن یہ کوشش جبھی بارآور ثابت ہو سکتی ہے جب وہ اپنے مطالعے اور اس سے حاصل شدہ تخلیقات یا پھر بہت ہی نمایاں کام کرنے پر بقائے دوام کی مہر ثبت کرنے کی صلاحیت رکھتا ہو۔

عربی کے مشہور شاعر امرا القیس کا ایک قول ہے:

"اگر مجھے صرف وجہِ معاش کی فکر ہوتی تو میں معمولی نانِ شبینہ پر ہی قناعت کر سکتا تھا اور اس سے زیادہ کی جستجو میں حیران نہ ہوتا، لیکن مجھے تو بقائے دوام کی آرزو ہے اور میرے جیسے لوگ ہی بقائے دوام حاصل کرتے ہیں"۔

نطشے نے ایک جگہ لکھا ہے:

"بقائے دوام حاصل کرنے والے کسی بھی ادیب و شاعر کی سب سے بڑی تعریف یہی ہے کہ اس کی تحریر میں بڑے لوگوں جیسی وسعتِ خیال اور قاتل جوہریوں کی سی مینا کاری کی جھلک نظر آئے"۔

یہ وہ صلاحیت ہے کہ جب تک فیاضِ حقیقی کسی کو دولت نہ بخشے، ہر کوئی سب کو نیض

یاب نہیں کر سکتا۔ آدمی کا نصب العین جس قدر بلند ہوگا، اس کی شخصیت بھی اسی نسبت سے بلند ہوگی اور جتنی بلند ہوگی، اس کا فن بھی اتنا ہی عظیم ہوگا، اس لیے کہ دوسرے درجے کی شخصیتیں صرف دوسرے درجے کے فن کی تخلیق کر سکتی ہیں۔

جب ہم محترم ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی دام ظلہ کی شخصیت پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں مختلف پرتو نظر آتے ہیں یعنی ذاکر، ادیب، شاعر، مؤلف، محقق اور ایک اچھا انسان۔ آپ کی شخصیت ایک ہمہ جہت اور قابلِ رشک شخصیت ہے، یعنی جب منبر پر جلوہ افروز ہوئے تو بے جان لفظوں کو نطق کا پیرہن عطا کر دیا، جب کتابوں کے درمیان ہوئے تو صفحۂ قرطاس پر ایسے ایسے تراشیدہ نگینے ثبت کر دیے کہ جس سے صاحبانِ بصیرت و بصارت کی نظریں خیرہ ہیں۔ جب شعرا و ادبا و صاحبانِ علم کے درمیان جانِ محفل بن کر بیٹھے تو محبتوں کے چمن کھلا دیے۔ جو شخص بھی جتنی دیر آپ سے ہم نشینی کا شرف لے کر اٹھا، وہ دولتِ علم لے کر اور وسیع معلومات سے بہرہ ور ہو کر اٹھا۔

تقریباً ۳۲ سال تصنیف و تالیف میں مستغرق زندگی کے بہترین ایام صرف کرنے اور اتنے وقیع کام کے بعد ضمیر اختر ایک شخصیت کا نام نہیں بلکہ ایک ادارے کا نام ہے کہ انھوں نے نام کا نہیں بلکہ کام کا اہلِ علم سے اعتراف کرایا ہے کہ شخصیت کو بقائے دوام کس طرح حاصل ہوتی ہے۔ مجھے اس بات کا احساس بھی ہے اور اچھی طرح معلوم بھی ہے کہ تصنیف و تالیف کی اس خارزار وادی کو عبور کرنے کے لیے کتنے کٹھن اور صبر آزما مراحل سے گزرنا پڑتا ہے۔ لیکن کچھ کرنے کی لگن تمام رکاوٹوں کو دور کر کے ایسی ایسی منفرد اور فقید المثال تخلیقات کا سبب بنی ہے کہ جن کا اعتراف برِ صغیر ہند و پاک کے مستند اور مشاہیر اہلِ علم نے کیا ہے۔ آپ کی ذاتی لائبریری میں خوش نما انداز میں ایک حُسنِ ترتیب کے ساتھ سجی ہوئی کتابیں دل کو بہت متاثر کرتی ہیں۔ ادب، شاعری،

منطق، فلسفہ، تفسیر، احادیث سے متعلق بہت سی نادر کتب موجود ہیں کہ جن سے اکتساب واستدراک محترم ضمیر اختر نقوی کی شخصیت کو نکھارنے اور ان کو ادبی مذہبی دنیا میں زندہ رکھنے کا سبب ہیں۔ میں یہ بات پورے وثوق اور ذمے داری سے کہہ رہا ہوں کہ خاندانِ انیس اور دیگر قدیم مشاہیر شعرا کے نایاب وکم یاب مراثی کا ذخیرہ کہ جن کی ایک محتاط اندازے کے مطابق گیارہ ہزار تعداد ہے، سوائے ضمیر بھائی کی لائبریری کے اور کہیں نہیں ہے۔ بیشتر مراثی کی جلدوں میں ہر صفحے کو (جو خود شاعر کے ہاتھ سے رقم ہے) بٹر پیپر اور پوڈر چھڑک کر ہوپر (کاغذ کھانے والا کیڑا) سے محفوظ کیا گیا ہے۔ جتنی عزت اور دیکھ بھال ضمیر بھائی کتابوں کی کرتے ہیں، اتنی ہی کتابوں نے بھی ان کو اپنے اندر چھپے ہوئے علوم سے بخوبی بہرہ مند کیا ہے۔ میری ۲۲ کتابوں کی تالیفات میں ضمیر بھائی کے زرّیں مشوروں اور پھر ذاتی لائبریری سے بھرپور استفادہ کو بڑا دخل ہے خصوصاً ۵ عدد مراثی کی مرتبہ جلدیں تو ان کے پاس نادر وکم یاب مراثی کی مرہونِ منت ہیں۔

خداوندِ تعالیٰ پنجتنِ پاک و شہدائے کربلا کے صدقے میں محترم ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی کو طولِ عمر، صحت وتن درستی اور قلم سے مزید فیض پہنچانے کی استعداد عطا فرمائے تاکہ ہم مسلسل گراں قدر تالیفات وتصنیفات سے مستفیض ہوتے رہیں۔

”خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا“

اور اب ایک ایسی کتاب کی جانب قارئین کی توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں جس نے ورق گردانی سے پہلے ہی اپنی خوبصورتی کی وجہ سے نظروں کو خیرہ کر دیا ہے۔ رنگین دیدہ زیب نقش ونگار کی بدولت کتابوں کے ہجوم میں اس کتاب نے منفرد مقام حاصل کر لیا ہے۔ خاندانِ انیس کے ۳۲ نامور شعرا کے حالاتِ زندگی اور نمونۂ کلام پر مشتمل ۹۸۶

صفحات کی اس ضخیم کتاب کو ترتیب و تشکیل دینے میں صرف ۲۷ کتب و رسائل کا تذکرہ کیا گیا ہے، لیکن ذاتی طور پر مجھے اس بات کا علم ہے کہ ہر شاعر کے حالات زندگی اور نمونۂ کلام کے حصول کے لیے کتنی محنت کرنی پڑی ہے۔ وقت پیسہ، جسمانی مشقت، کام کی لگن اور کچھ کرنے کا عزم، ان سب نے مل کر اس کاوش کو منصۂ شہود تک پہنچایا ہے۔ اس وقیع کوشش کو ہر اہلِ علم اور اہلِ بصیرت و بصارت نظرِ استحسان دیکھے گا یا ہر وہ شخص جس کو واقعی ادب سے لگاؤ ہے۔ "یہ ایک کتاب ہی نہیں ہے بلکہ یہ تو انیس کے گلستاں سے چنے ہوئے پھولوں کا گلدستہ ہے جسے سجا کر محترمی ضمیر اختر نقوی نے روحِ انیس کی خدمت میں پیش کر دیا ہے"۔

اس کتاب کو ان شعرا کے تذکرہ و نمونۂ کلام سے سجایا گیا ہے جنھوں نے لفظوں کو اعتبار، لہجے کو درد و غم، بیان کو سلاست اور کلام کو تازگی بخشی، خاندانِ انیس کی خدمات کو اگر ادب و شاعری سے نکال دیا جائے تو زبانِ اُردو اتنی تہی دامن ہو جائے گی کہ پھر ہومر کی الیاڈ، ورجل کی اینیڈ، ویاس کی مہابھارت، والمیک کی رامائن اور فردوسی کے شاہنامہ کا مقابلہ کس سے کریں گے۔

اُردو ادب میں یہ واحد خاندان ہے کہ جہاں اس نے بھرپور انداز میں چمنِ اُردو کی آبیاری کی وہاں مشغلِ شاعری ایک تسلسل کے ساتھ آگے بڑھتی گئی۔ جس طرح میر انیس کو اپنے اسلاف کی عظمت، ان کے کارنامے اور روایت کی پاس داری کا خیال تھا، اسی طرح اس خاندان کے ہر شاعر نے اپنے زمانے میں خودداری اور خاندانی نجابت کو سب باتوں پر مقدم جانا۔ شخصی اوصاف، قناعت، استغنا، ذاتی محاسن کا تقاضا تھا کہ کسی فرد نے ایک لفظ بھی کسی نواب یا رئیس کی شان میں نہیں کہے۔ ہاں! امرا و سلاطین کی خواہش و اصرار پر عظیم آباد، اصغر آباد، پٹنہ، بنارس، سلیم پور، جون پور،

الہ آباد، حیدرآباد دکن، جا کر مراثی ضرور پیش کیے۔ لکھنؤ تو آبائی شہر تھا، اس شہر نے ان تمام شعرا کی ایسی پذیرائی کی کہ لکھنؤ اور اُردو مرثیہ نگار لازم وملزوم ہو گئے۔

اس خاندان کے ہر فرد کو نسلوں کے ادبی وقار کا بڑا احساس تھا۔ وہ سب ان تمام روایات کا احترام کرتے تھے جو اس خاندان کا طرۂ امتیاز تھا، اس لیئے زبان وہیئت میں تبدیلی کیے بغیر شعریت، ورد وغم، وسعت خیال اور عظمت کردار پر اپنے قلم کی جولانیاں ختم کردیں یعنی بلا خوف تردید یہ کہہ سکتے ہیں کہ ''اس خاندان کے افراد نے تمام روایات کی پاس داری کرتے ہوئے ترقی کے تمام امکانات اپنے کلام میں سمو دیئے کہ ان کی تخلیقات کا جواب اس وقت تک تو کوئی دے نہیں سکا''۔

اس خاندان کی عظمت سے کوئی بھی ذی شعور انحراف نہیں کرسکتا۔ یہی نہیں کہ صنف شاعری کو ترقی کے آسمان تک پہنچایا بلکہ ہر فرد نے مرثیے کے اندر استقلال کی قوت بخشی، رزم وبزم کو باہم سمو دیا، مشاہدات وجذبات کے نازک نقوش سپرد قلم کیے، تلوار کی توصیف، ترتیب صفوف، جنگ کی کیفیت کی ترجمانی کی تو نفسیاتی کیفیات کے مرقعے کھینچے، شکوہ الفاظ اور تبحر علمی کے دریا بہا دیئے تو نکتہ سنجیوں کے موتی بکھیر دیئے۔ اس خاندان کے نامور شعرا نے فضائے شاعری میں مرثیے کی نمود، اس کی سلاست وفصاحت اور ادب آموزی میں وہی کام کیا ہے جو ریگستان میں ایک خوش نما سبزہ زار کرتا ہے۔

آج اس مادیت کے پُر آشوب دور میں۔ ٹی۔ وی۔ وی۔ سی۔ آر اور ڈش انٹینا کی سم آلود فضا میں کتنے لوگ ایسے ہیں جو خاندانِ انیسؔ کے حالات تو در کنار، صرف مکمل نام گنوا سکیں؟ میں شعرائے کرام، ادبائے عظام، صاحبان علم اور ادب دوست حضرات کی جانب سے محترمی ضمیر اختر نقوی دام ظلہٗ کی خدمت میں اس وقیع کاوش پر حروف

تحسین اور ہدیہ سپاس پیش کرتا ہوں۔ خداوند تعالیٰ چہاردہ معصومین و شہدائے کرام کے صدقے میں محترم سید ضمیر اختر نقوی کو طول عمر بصحت وتن ودرستی اور قلم سے فیض پہنچانے کی مزید استعداد عطا فرمائے تاکہ ہم اُن کی مسلسل گراں قدر تالیفات سے مستفیض ہوتے رہیں۔

رجب علی

۲۷ مئی ۱۹۷۸ء.....کراچی

الاخی الایمانی وروحانی محترمی ومکرمی، فخر قوم وملت جعفریہ شیعہ اثنا عشری، ذاکر حسینؑ مظلوم سید الشہدا (روحی جسمی لک الفدا) عالی جناب سید ضمیر اختر نقوی صاحب دام اللہ وجود سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مختلف مقام پر اکثر و بیشتر آپ کی دل پذیر تقریر سننے کا موقع حاصل ہوا ہے۔ ماشاء اللہ انداز گفتگو اور طرز بیان خوب سے خوب تر ہے) اے کاش آپ کی تقاریر کا مجموعہ زیور طباعت سے آراستہ و پیراستہ ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو کر متلاشیان علم و حق کی تشنگی کو بجھا کر ان کے علم میں اضافے کا سبب بنے۔

رسالہ "ذوالفقار" کورنگی والے کی رد میں آپ نے اس قدر مدلل اور تاریخی حوالوں کے ساتھ دندان شکن جواب دیا جو آپ اپنی مثال ہے۔ آپ کا بیان بالکل اچھوتے طرز کا حامل ہے۔ اس میں کئی گوشے اور نکات ہیں اور بہت خوب ہیں بڑی جستجو اور کاوش کے بعد یہ باریکیاں نظر آتی ہیں اور پھر انہیں موقع اور محل پر سجا کر ادا کرنے کی صلاحیت اور حوصلہ بھی بڑی بات ہوتی ہے، حقیقت ہے کہ:۔

این سعادت بزور بازو نیست   تانہ بخشد خدائے بخشندہ

DAWN کراچی مورخہ 21 مئی 1995

”میرانیس“ پر ضمیر اختر نقوی کی کتاب کی رونمائی

تحریر: حسن عابدی | ترجمہ: ماجد رضا عابدی

سید ضمیر اختر نقوی کی کتاب ”خاندان میر انیس کے نامور شعراء“ کی تقریب اجراء میر انیس اکاڈمی اور آرٹس کونسل کے اشتراک سے آرٹس کونسل آف پاکستان میں سید ہاشم رضا کی صدارت میں منعقد ہوئی۔

سید ضمیر اختر نقوی ایک سو سے زائد کتابوں کے مصنف اور مؤلف ہیں بشمول اس کتاب کے یعنی ”خاندان انیس کے نامور شعراء“ جس میں مشہور ومعروف شاعر و مفکر اور ان کے خاندان کے لوگوں کی تفصیلات دی گئی ہیں جو خود بھی فن تحریر کے مشاق تھے۔

مقررین جنھوں نے ضمیر اختر نقوی کی ادبی خدمات کو سراہا ان میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر عالیہ امام، پروفیسر سحر انصاری، محمد رضا کاظمی اور دوسرے شامل تھے۔

ہر مقالہ نگار نے ضمیر اختر نقوی کی عمیق فلسفیانہ معلومات، ان کا مطالعہ ثقافت اور برصغیر کی مذہبی روایات سے ان کی دلچسپی کو سراہا۔ ”خاندان میر انیس“ ایک قیمتی اور گرانقدر صحیفہ ہے، اس کے ابواب ایک صدی پر محیط ہیں جو میر انیس کے فن اور زندگی پر روشنی

ڈالتے ہیں اور ان سب پر بھی جو ان کے بعد آئے جن میں میر نفیسؔ، اور میر مونسؔ، اور دیگر شامل ہیں ہر مقرر نے مصنف کی محنتوں کی تعریف کی جو انھوں نے کتاب کے تحریر کرنے کے لیے کی ہیں۔

سید ہاشم رضا نے کہا بلا اختلاف میر انیسؔ اُردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں اور ان پر کام کرنے والے اور ان کی حیات مرتب کرنے والے سید ضمیر اختر نقوی لوگوں کے حافظوں میں اپنی اس تصنیف کی وجہ سے محفوظ رہیں گے۔

فضل قدیر

۱۹۷۵ء.....راولپنڈی

برادر عزیز ضمیر اختر.....دعا و فلاح دارین

ابھی آپ کا خط مجھے ملا تعجب ہے آپ کو میرے خط نہیں ملے۔ میں دو خط آپ کو روانہ کر چکا ہوں۔ مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ پنڈی آئے تھے مگر مجھے آپ کے آنے اور جانے کی خبر نہ ہوئی۔ ماہِ نو دبیر نمبر یقیناً نکل رہا ہے۔ آپ کو اس سلسلے میں دو خط لکھے۔ اب آپ یہ بات کان کھول کر سن لیجئے کہ آپ پر سب سے پہلا حق "ماہِ نو" کا ہے مہربانی فرما کر دبیر پر اپنی کتاب کے خاکے سے مطلع فرمایئے۔ اس سلسلے میں آپ میری عادت سے پوری طرح واقف ہیں اس لئے بغیر کسی تردد کے جیب کا مال مجھے دکھایئے یعنی یہ کہ آپ نے کیا کیا کچھ اس کتاب کے لئے کر لیا ہے کن کن پہلوؤں کو بھرپور انداز میں اُجاگر کیا ہے؟ سوانح کے سلسلے میں آپ کے پاس کیا مواد ہے؟ تصویریں کیسی ہیں کن کن لوگوں کی ہیں؟ دبیرؔ کے افراد خاندان کہاں ہیں؟ ان تک رسائی ہوگئی ہے یا نہیں.....؟ باقی باتیں پھر ہوں گی۔

حسن زبیر حسن

تقریر نے ضمیر کی پہنچا دیا کہاں...

عشقِ علی میں کیا کیا نہ انسان بن گیا
میثم بنا کوئی ، کوئی سلمان بن گیا

دیکھو تو شان بوذر و قنبر کمیل کی
روشن ضمیر ان کا قدردان بن گیا

چند ایک لوگ صاحب عرفان تھے فقط
ویسے تو ہر کوئی تھا مسلمان بن گیا

تقریر نے ضمیر کی پہنچا دیا کہاں
فرشِ عزا بھی تختِ سلیمان بن گیا

کوئی بشیر کوئی ترابی کوئی ضمیر
ہر شخص اپنے دور کی پہچان بن گیا

محشر میں تھک کے رُک گئے سجدے بھی جس جگہ
اشکِ عزا وہاں میری پہچان بن گیا

ہے منبرِ حسینؑ کا صدقہ حسنؔ یہی
بیٹھا یہاں جو صاحب عرفان بن گیا

اُردو غزل اور کربلا

سیّد ضمیر اختر نقوی

رئیس امروہوی

موضوع انوکھا اور انداز بیاں دلچسپ ہے

اُردو غزل اور کربلا

کربلا کی شہادت عظمیٰ کے اثرات تاریخ کے ہر دور میں صاف صاف نظر آتے ہیں۔ پچھلے چودہ سو برس میں عالم اسلام کی نہ جانے کتنی انقلابی تحریکوں کے عقب میں سانحۂ کربلا کا پیدا کردہ جذبہ اور جوشِ عمل کارفرما رہا ہے۔ یہی نہیں بلکہ فنونِ لطیفہ کے ہر شعبے پر کربلا کے اثرات واضح طور پر نظر آتے ہیں۔ شعر و ادب ہی کو لیجئے، عربی، فارسی، ترکی، اردو، سندھی، پنجابی، کشمیری، بروہی، بلوچی، پشتو، غرض ہر زبان میں کربلائی ادبیات اور عزائی تخلیقات کی نثر و نظم میں کثیر تعداد موجود ہے اور ان میں برابر اضافہ ہی ہوتا چلا جا رہا ہے۔ حال میں اس موضوع پر دلچسپ اور عقیدت و قابلیت سے مرتب کی ہوئی چند کتابیں نظر سے گزریں۔ برادر عزیز جناب سید ضمیر اختر نقوی نے کہ ماشاء اللہ! محقق بھی ہیں، مصنف بھی اور مقرر بھی (اور شخصیت کی یہ تینوں جہات قابلِ قدر ہیں) کربلا کے سلسلے میں ایک نئے موضوع کو تلاش و تحقیق کا نقطۂ توجہ بنایا ہے۔ یعنی ''اردو غزل اور کربلا'' یہ گراں مایہ کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے: ''اردو غزل اور کربلا'' واقعاتِ کربلا کے استعارات میں فرہنگ ذکرِ کربلا اور غزل میں مماثلت، بلاواسطہ اشعار غزل۔ جواں فکر مصنف نے صدہا شعراء کے اشعار بطورِ حوالہ پیش کیے ہیں، موضوع بھی انوکھا اور اندازِ بیاں بھی دلچسپ ہے۔

پدم شری پروفیسر علی جواد زیدی

"تحقیق کی نئی راہوں کی نشان دہی"

اُردو غزل اور کربلا

سید ضمیر اختر نقوی صاحب نے رثائی ادب کی تنقید و تحقیق میں اپنے لئے ایک خاص جگہ بنالی ہے اور پاکستان میں کئی کتابیں ژرف نگاہی اور تلاش و جستجو سے شائع کی ہیں۔ "اردو غزل اور کربلا" ان کا تازہ ترین کارنامہ ہے۔

واقعۂ کربلا تاریخِ انسانیت کا وہ درد انگیز حادثہ ہے جس کی کسک صدیوں سے محسوس کی جاتی رہی ہے۔ یزیدیت نے اپنے دامن سے اس داغ کو دھونے کی بہت کوشش کی، لیکن جیسے جیسے زمانہ گزرتا گیا، نقوشِ شہادت اور اُبھرتے گئے۔ یہ واقعہ صرف غم والم کا پیغام نہیں تھا بلکہ خیر وشر کا معرکہ تھا، مردانگی، شجاعت، قربانی، ہمت، محبت، عقیدت، اور اعلیٰ اصول سے وابستگی کا ایک پیغام بھی تھا۔ واقعات کے یہ دونوں پہلو اردو میں بڑی شان اور آب داری کے ساتھ اُبھرے ہیں اور ہر دور میں، ہر صنفِ سخن میں ان کے اثرات دیکھے جاسکتے ہیں، لیکن سب سے زیادہ غزل نے واقعاتِ کربلا سے متعلق استعارات تلمیحات اور علائم کو اپنایا اور اسے عہد بعہد نئے اندازِ نگاہ اور نئی طرز ادا سے چمکایا ہے۔ یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے۔ اس موضوع کو سب سے پہلے شیخ ممتاز حسین جون پوری نے اپنی کتاب "خونِ شہیداں" کے لئے چنا۔ "اردو غزل اور کربلا" اس کی توسیع ہے اور اگلا قدم ہے۔ اس عرصے میں گوپی چند نارنگ نے

واقعات کربلا کے علائم پر ایک مختصر کتاب پیش کی ہے، یہ تمام کوششیں صحیح سمت میں پیش رفت کی حیثیت رکھتی ہیں، لیکن موضوع بہت وسیع ہے اور مختلف کتابوں میں اس کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ اسے باقاعدہ تحقیق کا موضوع بنا کر اور جم کر کام کیا جائے۔ ایک طرف یہ دیکھنا ہوگا کہ غزل کے علائم کو رثائی ادب، مرثیہ وسلام و رباعی میں کس طرح لیا گیا ہے اور دوسری طرف یہ کہ کربلا کے مسلمہ علائم کو کس طرح غزل گویوں نے اپنایا ہے اور اس صنف میں کس طرح صرف کر کے عصری حسیات کا جزو بنایا ہے۔

ضمیر اختر نقوی صاحب نے شروع میں اس موضوع پر ایک تفصیلی مقالہ تحریر کیا تھا اور پھر بعد میں ضروری اضافے کر کے اسے موجودہ کتاب کی شکل میں پیش کیا ہے، میرؔ سے لے کر موجودہ دور کے شعراء تک کے کلام سے مثالیں دی ہیں۔ لیکن میرؔ ہی کیوں، اس داستان کو شعرائے دکن سے کیوں نہ شروع کیا جائے، یقیناً بہت سی اور مثالیں ملیں گی۔ پھر جدید شعراء نے جن نئی علامتوں سے کام لیا ہے، ان میں تنہائی، صحرا، پیاس وغیرہ نمایاں ہیں، ضمیر اختر نقوی کی نظر ان پر بھی ہے، غرض انہوں نے میرؔ سے لے کر احمد فراز تک کے یہاں مثالیں ڈھونڈی ہیں۔ اس میں افتخار عارف کا ذکر نہ ہونا تعجب خیز ہے، کیونکہ انہوں نے بطورِ خاص ان علائم سے کام لیا ہے۔ ایسی تصنیف سے جامعیت کا تقاضا غلط ہوگا، ضمیر اختر نقوی کی یہ پیش کش ان معنوں میں شگفتہ آور ہے کہ انہوں نے اس موضوع پر تحقیق کی نئی راہوں کی نشان دہی کی ہے۔ کتابت و طباعت بھی اچھی ہے۔ (سہ ماہی "العلم"، بمبئی، اپریل ۱۹۹۳ء)

پروفیسر حسن عسکری کاظمی

''روایتی موضوع میں تازگی کا احساس''

اُردو غزل اور کربلا

''اُردو غزل اور کربلا'' ایک مختصر اور دقیع تنقیدی مطالعہ ہونے کے علاوہ نئی گفتگو کا در کھولنے کی ایسی تخلیقی کاوش ہے جس کے بارے میں وثوق سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ضمیر اختر نقوی اس کتاب کے حوالے سے اُردو غزل کے تنقیدی سرمائے میں جہاں کچھ نہ کچھ اضافہ کرنے میں ایک حد تک کامیاب ہوئے ہیں، وہاں اُردو غزل اور کربلا جیسے موضوع کو متعارف کرانے میں مستقبل کے امکانی تحقیق و تخلیق کا نقطۂ آغاز بھی ثابت ہوئے ہیں۔ ان کا یہ کہنا بجا ہے کہ شاعری میں واقعہ کربلا کے اثرات دو طرح کے ملتے ہیں: شعوری حیثیت سے اور غیر شعوری حیثیت سے۔ شعوری فکر کی کارفرمائی مرثیے میں اور غیر شعوری فکر غزل میں ابھر کر سامنے آئی ہے۔ اُردو غزل کے معیار اور اس صنفِ شاعری کی ارتقائی صورت سے متعلق کچھ کہنا مناسب نہیں کہ اس پر بہت کچھ کہا اور لکھا جا چکا ہے۔ غزل کو وحشی صنفِ سخن کہنا، غزل کے مزاج سے عدم آگہی اور انگریزی ادب و شاعری سے مرعوبیت کا ثبوت فراہم کرتا ہے، البتہ غزل میں سطحی اور مبتذل مضامین شامل کرنے اور مختلف صنعتوں کے اظہار میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کا زمانہ غزل کی ارتقائی تاریخ کا ایک بڑا حصہ ہے۔ اسی طرح جدید غزل

میں تجریدی انداز اظہار کا جنون بھی نا قابل رشک کاوشوں سے عبارت ہے، مگر مجموعی طور پر اردو غزل میرؔ اور سوداؔ سے غالبؔ و اقبالؔ اور عہد موجود میں ناصر کاظمی سے منیر نیازی تک ایک ایسی خوب صورت و جان دار اور قابلِ فخر تعریف رکھتی ہے کہ دوسری کسی زبان میں بہت کچھ ہونے کے باوجود ایسا نگار خانہ دکھائی نہیں دیتا۔ غزل میں ایک طرف دجلہ اور فرات کی سی آب و تاب ہے اور دوسری طرف پیاس کے صحرا میں خیمۂ دل کی طنابیں شکستگی دکھائی دیتی ہیں۔

ضمیر اختر نقوی نے ''اردو غزل اور کربلا'' میں ایسے تلازموں اور استعاروں کا کھوج لگایا ہے جنہیں غزل میں برتنے کی شعوری یا غیر شعوری کوشش کی گئی ہے۔ کلاسیکل شعراء سے لے کر زندہ غزل گو شعرا تک مختلف دواوین کا مطالعہ کرتے ہوئے جو کچھ ہاتھ لگا، اسے ایک خاص ترتیب سے اپنے دعوے کے ثبوت میں یکجا کرنے کا عمل محنت طلب ضرور ہے، مگر ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔ ان کی یہ مختصر کتاب قاری کی نظر سے اس طرح گزر جاتی ہے جیسے کسی چیز کی کمی سی رہ گئی ہے۔ دوسرے بعض اشعار بھی شامل کتاب کر لیے گئے جو موضوع کی مناسبت کے اعتبار سے کسی مخصوص لفظ کے باعث انھیں پسند آ گئے ہیں۔ اس کتاب کی ترتیب میں یہ التزام بھی ہماری توجہ کا باعث بنتا ہے کہ واقعہ کربلا کے ظہور پذیر ہونے سے قبل سفیر امام عالی مقام، حضرت مسلم بن عقیل کی غریب الوطنی، ان کی شہادت، لاش کی تشہیر جیسے دل خراش پس منظر کی جستجو غزل میں اس طرح کی گئی ہے کہ روایتی موضوع میں تازگی کا احساس ابھرتا ہے۔ اور وہی شعر جسے ہم سرسری طور پر دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں اسے دوبارہ پڑھتے ہوئے ہماری ذہنی کیفیت میں وہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے کہ ہم نئے معانی پر سر دھننے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور قاصد یا نامہ بر ایک نئی شکل و صورت میں ہماری تمام تر ہمدردیاں

حاصل کر لیتا ہے۔

نامے کو چاک کر کے کرے نامہ بر کو قتل
کیا یہ لکھا تھا ، تیر مری سرنوشت میں

ضمیر اختر نقوی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے غزل کے اشعار کو عنوان کے تحت رکھ کر اپنا مقصود حاصل کرنے کی مقدور بھر کوشش کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ہم ان کے نقطۂ نظر سے مکمل طور پر اتفاق نہ کر سکیں اور اس کوشش کو ان کی ذہنی اپج قرار دے کر پہلے سے طے شدہ معانی پر اکتفا کریں، لیکن اتنا ضرور ہے کہ وہ غزل میں کربلا سے استفادہ کرنے والے شعرا کی شعوری یا غیر شعوری کاوش کا برملا اظہار نہ کرنے والوں کو ہم نوا بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ایسی کتاب کی پذیرائی کم ہوتی ہے، جس میں مخصوص عقیدے کی چھاپ گہری ہو، مگر یہ کتاب ایک ادبی حوالہ بھی ہے اور زبان و بیان کے اعتبار سے موجودہ اسلوب کے تقاضوں پر پوری اُترتی ہے۔ یوں بھی غزل دردمندی، سوز و گداز اور کربِ مسلسل کے علاوہ جان کاہی کے تجربوں کا ایسا بلیغ اور مکمل اظہار ہے کہ ہم جو کچھ محسوس کرتے ہیں، اسے زبان مل جاتی ہے۔ غزل سے بہتر انسانی جذبوں کے اظہار کے لئے کوئی اور وسیلہ دکھائی نہیں دیتا، یہی وجہ ہے کہ تحریر اور تقریر میں جب غزل کا شعر بے ساختہ آجائے تو سب کچھ بھول جانے کے باوصف شعر یاد رہ جاتا ہے۔

ضمیر اختر نقوی نے کربلا سے وابستہ غزل کے مزاج کا اجمالی خاکہ پیش کرتے ہوئے بالواسطہ اور بلا واسطہ اشعار کی امثال جمع کی ہیں۔ علامہ اقبال کے ہاں قومی حمیت کو زندہ کرنے کی خاطر بے شمار ایسی امثال کا ذخیرہ دکھائی دیتا ہے، جس سے اس کتاب میں خاطر خواہ حوالے دیے گئے ہیں۔ مثلاً

قافلۂ حجاز میں ایک حسینؑ بھی نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات

اسی طرح عہد موجود میں احمد فراز کی غزل سے یہ مثال کتنی خوبصورت اور حقیقت پر مبنی ہے:

خطیبِ شہر کا مذہب ہے بیعتِ سلطاں
ترے لہو کو کریں گے سلام ہم جیسے

مختصر یہ کہ "اُردو غزل اور کربلا" ایسی کتاب ہے کہ اب ایسی بہت سی کتابیں لکھی جائیں تاکہ اس کتاب کے منظرِ عام پر آنے کا مقصد پورا ہو سکے۔

(ماہنامہ "شام و سحر" لاہور، ۱۹۹۰ء)

فضل قدیر

۲۵ رجولائی ۱۹۷۵ء... راولپنڈی

برادر ضمیر اختر صاحب! دبا سخنہ دبا سخنہ کام جاری رکھیے۔ ابواللیث صدیقی صاحب وعدے کر رہے ہیں مگر مضمون ابھی تک نہیں بھیجا۔ کاش مجنوں ہی کچھ لکھ دیں۔ دبیر کے مکان اور مقبرے کی تصاویر جلد بھیجیں۔ موسوی سے کہیں کہ جلدی کریں۔ کاش فرہنگ دبیر بھی بن جائے تو جان پڑ جائے، اچھا دعا، الٰہی زورِ قلم اور زیادہ "افق پہ چھایا ہوا ہے ضمیر" نامعلوم یہ مصرعہ ہوا یا نہیں لیکن بہر حال آپ چھائے ہوئے ہیں، اس صنف ادب پر ہاں ایک بات اور اپنا فون نمبر ضرور لکھیے یاد سے اگر آ گیا ہے۔ بے شک بے شک پانچ مرثیے ضرور ہونے چاہئیں۔ میرا خیال آپ سے ہم آہنگ ہے۔

کلیم رحمانی

"ضمیر اختر کو اشعار کی پرکھ میں قدرت حاصل ہے"

اُردو غزل اور کربلا

ضمیر اختر نقوی کی اس کتاب پر گفتگو کرنے سے پہلے تھوڑی سی بات اُردو غزل کے آغاز اور اس سے موجودہ رویے پر ہو جانی چاہیے تاکہ کتاب کی تفہیم میں آسانی رہے اور اس کی اہمیت کو صحیح تناظر میں متعین کیا جاسکے۔

غزل اپنی ہیئت کے اعتبار سے اُردو ادب کی تمام اصنافِ سخن میں ایک منفرد اور ممتاز حیثیت رکھتی ہے، بلکہ یوں کہنا غلط نہ ہوگا کہ غزل شاعری کے وجود کا ایک حصہ ہونے کے باوجود شاعری کی دیگر اصناف سے کوئی تعلق نہیں رکھتی۔ یعنی غزل کی بناوٹ اور شناخت میں وہ اکائی نہیں ملتی جو نظم، گیت، مثنوی، قطعے، مرثیے، نوحے، حمد، نعت، منقبت، سلام اور دیگر اصنافِ سخن میں ہوتی ہے۔ غزل کا ہر شعر اپنی معنویت اور اظہار میں ایک الگ حیثیت رکھتا ہے، جبکہ دوسری اصنافِ سخن کے اشعار کو ان کی بناوٹ اور معنویت اور اظہار سے الگ نہیں کیا جاسکتا اور سب سے حیرت ناک خوبی غزل کی یہ ہے کہ اس کا ہر شعر غزل کا حصہ ہونے کے باوجود اس سے جدا بھی رہتا ہے اور اس سے وابستہ بھی۔ اس بات کو اس طرح بھی آگے بڑھایا جاسکتا ہے کہ غزل ہر

شعر کے اظہار میں اشارے کنائے سے کام لیتی ہے، جبکہ دوسری اصناف سخن میں بلا واسطہ تخیل، تجربے اور مشاہدے کی پوری عکاسی اور فضا موجود رہتی ہے۔ اس سے یہ بات ثابت ہوئی کہ غزل اپنے اظہار میں شرمائی شرمائی رہتی ہے، اور یہ اپنے مدعا کو رمزیت و ایمائیت کے پہلو میں تشبیہات اور علامات کے ذریعے اجاگر کرتی ہے۔ ان تشبیہات و علامات میں وہ معاشرے کی جامعیت اور ان کی تحریکات کی تفہیم میں معاون و مددگار ہوتی ہے اور اپنے ابلاغ کو الفاظ کے لغوی معنی سے جدا رکھ کر اجتماعی احساسات و جذبات کو نمایاں کرتی ہے۔

حُسن پرستی کے ضمن میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ غزل کا تعلق ایرانی ادب سے رہا ہے، اس لیے اس نے اپنی فطرت میں ایرانی تہذیب کو اپنا لیا تھا۔ ایرانی تہذیب اس بات کی غماز ہے کہ اس کے یہاں حُسن و دلبری کو اولیت دی جاتی تھی اس لیے غزل میں حُسن پرستی اور سراپا نگاری کو فوقیت ملی۔ یہ بات اپنی جگہ صحیح لیکن پھر بھی حُسن پرستی اور سراپا نگاری کی دوسری وجہ ہندوستان میں بت پرستی کا مذہبی رجحان بھی رہا ہے۔ ہندوستان کی آبادی کی اکثریت مذہبی طور پر ہندوانہ رسم و رواج کی پابند تھی اور رہی ہے اور وہ اپنی عبادت کے لئے دیوی کی خوب صورت مورتی کو بناتے تھے اور اس کے انگ انگ کو دھنک کے رنگوں سے سنوارتے تھے۔ یہ رجحان کم و بیش آبادی کے تمام طبقوں میں در آیا، اس لیئے وہ اپنی تخلیقات کو بھی سراپا نگاری کے نرم و نازک اور دل نشین حوالوں سے مرتب کرنے لگے، لیکن یہ سلسلہ تھوڑے عرصے تک اردو غزل میں محیط رہا، اس کے بعد غزل کرب کی نمائندہ ہوگئی۔ اب سوال یہ ابھرتا ہے کہ اردو غزل میں کرب والیہ کا عنوان کیوں نمایاں ہوا۔ اس کا جواب اور ماحول کا جائزہ یہ بتاتا ہے کہ جب ہندوستان پر بیرونی حملے ہوئے اور ان حملوں نے اقدار کو توڑنا شروع کیا تو

شکست و ریخت کی پوری فضا ہندوستان پر طاری ہو گئی، خستہ حالی لوگوں کا مقدر بن گئی۔ اقتصادی بدحالی ہر ایک کا گھر دیکھنے لگی اور بقول ڈاکٹر وزیر آغا "اٹھارویں صدی کے ہندوستان پر ہیراگ کی ایک مستقل کیفیت مسلط دکھائی دیتی ہے۔ سلطنت مغلیہ کی کمزوری، مرہٹوں، سکھوں، انگریزوں اور روہیلوں کی یلغار، نادر بادشاہ کے حملے، دہلی کا قتل عام، جنگ پلاسی کی شکست، روہیلہ سرداروں کے ہاتھوں شاہ عالم ثانی کی ہتک اور اس قسم کے بیسیوں دوسرے واقعات نے ملک میں انتشار اور طوائف الملوکی کی فضا قائم کر دی تھی۔" (اردو شاعری کا مزاج) اس فضا نے غزل کو بھی متاثر کیا۔ اب اس میں غم، دکھ، درد اور خوف کے عناصر الم نگاری کے موضوعات بنے اور ان موضوعات کا مقابلہ اور موازنہ اسلامی دور کے تصادم اور سانحات و واقعات سے کیا جانے لگا۔ اس طرح ہندوستان کی سیاسی تبدیلیوں اور قومی نظریوں کو مذہبی رنگ دینے کے لئے شاعروں نے واقعہ کربلا کو خوب خوب اہمیت دی اور کربلا کے کرداروں (یزیدی اہل کار اور امام حسینؑ کے رفقا) کے منفی اور مثبت رویوں کو تشبیہات، علامات اور استعارے میں نمایاں کیا ہے۔

"اردو غزل اور کربلا" میں ضمیر اختر نقوی نے غزل کا جائزہ کربلا کے حوالے سے قدیم اور جدید شعرا کی تخلیقات میں لیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ غزل میں کربلا کے واقعات و سانحات کسی نہ کسی طور نمایاں ہوئے ہیں۔ اس طرح غزل کی تعریف ایک نئی معنویت کے ساتھ سامنے آئی ہے، اس کی قدیم تعریف "عورت کے ساتھ گفتگو" کو رد کر دیا گیا ہے۔ ضمیر اختر نقوی غزل کی تعریف میں دلائل دیتے ہیں کہ "اس کی بنیاد انسانی زندگی کے ایسے بنیادی حقائق ہیں، جو غزل کے مزاج کی جان ہیں۔ اس کی بنیادی حقیقت تو یہ ہے کہ انسانی زندگی غم کا نام ہے، اس میں درد ہی درد

ہے، شروع سے آخر تک حسرت ہی حسرت ہے۔ ان جملوں پر غور کیا جائے تو غزل کی تعریف حسرت ناکام خفی ہے اور یہ تام و تعریف بلاغت پر دال ہے۔ اس کی بلاغت میں داخلیت، خارجیت، اور انسانی جذبات کے تمام پہلو اور اشارے کنائے موجود ہیں۔ جو اس کی بنیادی حیثیت ہے۔ اب رہی یہ بات کہ غزل عشق کی چاشنیوں کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اور نہیں ہو سکتی ہے تو اس پر بھی غور کیا جانا چاہیے کہ عشق کا تعلق بھی غم سے ہی ہوتا ہے۔ عشق میں محبوب کے لئے تڑپنا، اس کے وصال کے لئے انتظار کرنا اور کروٹیں بدلنا، اس کی دید میں آنکھیں وا رکھنا، اور بے وفائی میں آنکھوں کا نم ہو جانا، یہ کیفیات غم کی ہی تو ہیں۔ بس بات یہاں آ کر ٹھہری کہ غزل غم کے اظہار کے بغیر مکمل نہیں ہوتی اور غم کا مکمل استعارہ واقعہ کربلا ہے، اس لیے غزل کے اکثر و بیشتر اشعار کربلا کے استعارے اور تمثیلات سے مزین ہیں کیونکہ کربلا کا واقعہ ذہن شاعر میں کسی نہ کسی عنوان سے در آتا ہے۔

''اردو غزل اور کربلا'' میں دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس میں تصنع، لفظوں کی بھرمار اور بے محل باتوں سے گریز کیا گیا ہے۔ اس میں سادگی اور سچائی کو وتیرہ بنایا گیا ہے اور غزل کے اشعار کو کربلا کے حوالے سے عنوانات دیئے گئے ہیں۔ جیسے دشت وفا، پیاس، فرات، پیاس اور دھوپ، فرات عصر، سر مقتل، سجدۂ آخرت، منزل تسلیم و رضا، شب بیداری، سینہ زنی، نوشتۂ دیوار، اسوۂ اصحاب حسینؑ، حسینؑ، ماتم سرا، ہنگام آخر، خیموں کا جلنا، تبرک، حسینؑ کا صبر، شام غریباں، دو اصغر، پانی، پاؤں کی زنجیر اور لہو کی پکار وغیرہ ہیں۔

''اردو غزل اور کربلا'' میں غزل کے حسن اشعار کا انتخاب کیا گیا ہے، ان میں شعرا کی جدت نگاری، جدت طرازی، نازک خیالی اور معنی آفرینی کا خیال رکھا گیا ہے۔

اس انتخاب نے یہ بھی ثابت کیا ہے کہ ضمیر اختر نقوی کو اشعار کی پرکھ، ان کی رفعت شناسی اور معنویت کے امتیازی رکھ رکھاؤ میں قدرت حاصل ہے، اس لیئے یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ ''اُردو غزل اور کربلا'' ان لوگوں کے لئے مددگار ثابت ہوگی جو کربلا اور واقعہ کربلا کے حوالے سے غزل پر تحقیق کرنا چاہتے ہوں۔

جناب ضمیر اختر نقوی صاحب!

السلام علیکم!

مجھے اُمید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے ''اُردو غزل اور کربلا'' پر ایک مضمون آپ کو ارسال کر رہا ہوں، مجھے یقین ہے کہ یہ آپ کو پسند آئے گا۔ اسے آپ اپنی پسند کے رسالے میں اشاعت کے لئے بھیج دیں۔ اس مضمون کی کاپی کے ساتھ ''اُردو غزل اور کربلا'' کی ایک جلد بھی ضرور بھیجیں تا کہ اشاعت یقینی ہو جائے۔

میں آپ کی دیگر تصنیفات کا مطالعہ کرنا چاہتا ہوں اور ان پر مضامین بھی لکھنا چاہتا ہوں، مہربانی فرما کر ذیل کی کتابیں ارسال کر دیں یا مجھے فون پر اطلاع دیں میں خود آکر لے لوں گا۔

(۱) جوش ملیح آبادی کے مرثیے۔ (۲) اُردو مرثیہ پاکستان میں۔

(۳) تلامذۂ ناسخ۔ (۴) خاندانِ انیس کے عظیم مرثیہ نگار

(۵) تاریخ مرثیہ نگاری۔ (۶) میر انیس...... زندگی اور شاعری۔

(۷) اقبال کا فلسفۂ عشق۔ (۸) شعرائے اُردو اور عشقِ علی۔

آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔ شکریہ!

نیلما سرور (ڈی ایس پی لاہور)

"غزل میں واقعاتِ کربلا کی علامتیں"

اُردو غزل اور کربلا

سید ضمیر اختر نقوی نے "اردو غزل اور کربلا" کے نام سے ایک کتاب مرتب کی ہے، جسے مرکز علوم اسلامیہ فیڈرل بی ایریا کراچی نے شائع کیا ہے۔ کتاب کے موضوعات اس ترتیب سے ہیں۔

باب اوّل: "اردو غزل اور کربلا" باب دوم "واقعاتِ کربلا غزل کے آئینے میں" باب سوم "فرہنگ ذکر کربلا اور غزل میں مماثلت، باب چہارم "بلاواسطہ اشعار غزل" باب پنجم "بالواسطہ اشعار غزل"، باب ششم بیادِ چہاردہ صد سالہ ولادت حضرت امام حسین علیہ السلام۔

موضوع کے بارے میں سید ضمیر اختر نقوی لکھتے ہیں کہ شاعری میں واقعۂ کربلا کے اثرات دو طرح کے ملتے ہیں، شعوری حیثیت سے اور غیر شعوری حیثیت سے، شعوری فکر کی کارفرمائی مرثیے اور غیر شعوری فکر غزل میں ابھر کر سامنے آئی ہے۔ شعور فکر کی مثال مرثیے میں دیکھیے:

میر انیس کہتے ہیں:

بیٹھے تھے جا نماز پہ شاہِ فلک سریر
ناگہ قریب آ کے گرے تین چار تیر

دیکھا ہر اک نے مڑ کے سوئے لشکرِ شریر
عباسؑ اٹھے تول کے شمشیرِ بے نظیر

پروانہ تھے سراجِ امامت کے نور پر
روکی سپر حضور کرامت ظہور پر

جدید غزل میں واقعاتِ کربلا کی علامتیں جس شدت سے استعمال کی جارہی ہیں، اس کی مثال کسی عہد میں نہیں ملتی۔ پاکستان اور ہندوستان کے کسی گوشے میں اب نہ اودھ جیسا ماحول ہے اور نہ کوئی شیعہ حکمران بلکہ یہ عقل و شعور کا ارتقا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جدید غزل گو شاعر نے ادب میں ہمیشہ زندہ رہنے کا راز جان لیا ہے۔ عہدِ حاضر کے انسان کی دلی جذبوں، دکھوں اور آرزوؤں کی عکاسی کے لئے جدید شعرا کربلا کے واقعات کا سہارا لے کر غزل کی فصاحت اور فکر کے ارتقائی عمل کو بڑھا رہے ہیں۔ اس طرح وہ اپنے خلوص اور صداقت کا اظہار کر کے اپنی شاعری کو زندہ رہنے والے ادب میں شامل کرتے جارہے ہیں۔

باب اوّل میں "اردو غزل اور کربلا" کے تحت شعر کی تعریف میں لکھا ہے کہ عربی لغت میں شعر کے معنی ہیں باریک بینی، و دقتِ نظر سے جاننا۔ عرفاً شعر اس موزوں یا قافیہ کلام کو کہتے ہیں جس کو قصداً موزوں کیا گیا ہو۔ چونکہ ہر شعر کے لیے تخیل ضروری ہے اور بال کی کھال ہر شاعر کو اپنے شعر میں نکالنی پڑتی ہے، اس لیے ایسے موزوں معنی کلام کو "شعر" کہا جاتا ہے۔ شعر، شعر، شعور، شعرۃ، شعریٰ، سب مصادر ہیں۔ سب کے معنی ہیں جاننا، جو اس سے معلوم کرنا "تشعرون" یعنی تم سمجھتے ہو تم جانتے ہو، تم خبر رکھتے ہو۔ یہ لفظ "شعور" سے ہے جس کے معنی بذریعہ حس جاننے کے ہیں۔ قرآن مجید میں یہ لفظ چار مرتبہ استعمال ہوا ہے۔ صرف ایک مثال کافی ہے کہ یہ آیت "شہید"

کی تعریف میں ہے: "اور جو لوگ راہِ خدا میں قتل کیے جائیں، انھیں مردہ مت کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، مگر تمھیں ان کی اس زندگی کا شعور نہیں۔" شعر شعور سے ہے اور جہاں شعور ہے، وہاں شہید کی زندگی کا احترام ہے۔ واقعۂ کربلا شعورِ انسانی سے براہِ راست تعلق رکھتا ہے، اس لیے شعر شعور کی تلاش میں ہے، اس لیے واقعۂ شہادت تک پہنچ جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اگر ہم یہ کہیں کہ شاعری نام ہے سچائی کی تلاش کا اور دنیا کی سب سے بڑی سچائی شہادت ہے اور دنیا میں سب سے بڑی شہادت حضرت امام حسین علیہ السلام کی ہے، یہی وجہ ہے کہ جب شاعر سچائی کی تلاش میں نکلتا ہے تو وہ دشتِ بلا میں پہنچ جاتا ہے، جہاں کبھی سچائی اور صداقت کی فتح ہوئی تھی۔

غزل، کربلا اور عشق کے موضوع پر سید ضمیر اختر نقوی لکھتے ہیں کہ غزل کی بنا عشق و محبت پر ہے اور عشق میں غم زیادہ خوشی کم ہوتی ہے۔ عشق و محبت کا کمال اور خاتمہ غم ہے۔ تو پھر مسرت سے زیادہ غم کے مضامین میں مزہ ملتا ہے۔ واقعۂ کربلا داستانِ عشق بھی ہے اور داستانِ غم بھی ہے۔ امام حسین عشقِ الٰہی کے میدان میں قربانی پیش کر رہے تھے۔ عشقِ الٰہی کی مکمل داستان سے غزل کیسے نہ متاثر ہوتی، جبکہ غزل کا بنیادی موضوع عشق ہی رہا ہے۔

میر تقی میر سے اقبال تک آپ کو غزل میں ایسے اشعار بے شمار ملیں گے۔ عشقِ الٰہی میں ڈوب کر امام حسین نے ہر تکلیف کو آرام سمجھا:

صدقِ خلیل بھی ہے عشق صبرِ حسین بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

مہاراجہ جسونت سنگھ پروانہ کا ایک شعر:

تڑپتے جو دیکھی ہیں لاشیں تو اب دل
ترے کوچے کو کربلا جانتا ہے

مصحفی کا شعر:

ہندوستاں نہ ہوتے دشتِ بلا ہے کیا
جو اس زمیں پہ تیغ ہی چلتی ہے اب تلک

اقبال کے چند اشعار:

حقیقتِ ابدی ہے مقامِ شبیری
بدلتے رہتے ہیں اندازِ کوفی و شامی

اک فقر ہے شبیری، اس فقر میں ہے میری
میراثِ مسلمانی ، سرمایۂ شبیری

نکل کر خانقاہوں سے ادا کر رسمِ شبیری
کہ فقرِ خانقاہی ہے فقط اندوہ و دل گیری

نمازِ عشقِ حسینِ حجاز ہے گویا
یہی نماز خدا کی نماز ہے گویا

آتش کے دو شعر:

دعائے آتشِ خستہ یہی ہے، روزِ محشر کو
یہ مشتِ خاک ہوئے کربلا کی خاک سے پیدا

دشمن جو ہو حسین علیہ السلام کا
آتش! نہ کم سمجھ اسے ابنِ زیاد سے

داغؔ دہلوی کا شعر:

غمِ حسینؑ میں اُٹھے گا سرخ رو، اے داغؔ!
یہ بوجھ تو نے اُٹھایا علی علی کر کے

ناسخؔ کا شعر:

گر نہ ہوتا سرخ رو اشکِ غمِ شبیر سے
حشر میں کس منہ سے، ناسخؔ! میں شفاعت مانگتا

امیرؔ مینائی کا شعر:

امیرؔ اپنا دلِ پُر داغ سوئے کربلا لے چل
یہ گلدستہ ہے نذرِ روضۂ شبیر کے قابل

(روزنامہ "اخبار" کالم آتش خاموش، لاہور، ۲۷ مئی ۱۹۹۶ء)

جناب علی جواد زیدی کے مضمون سے اقتباس

ہفت روزہ اخبار "شیعہ لکھنؤ ۱۹۸۵ء"

آج کی گفتگو میں جس خوش گوار دریافت کا ذکر کرنا ناگزیر ہے وہ پاکستان میں جدید مرثیے کی قابلِ ذکر پیش قدمی ہے۔ عزیزی ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی اس موضوع پر ایک کتاب مکمل کر رہے تھے۔ اُن کے والد محترم کی ذات سے میرے لکھنؤ کے زمانۂ طالب علمی کی بہت سی ناقابلِ فراموش یادیں وابستہ ہیں اور ضمیر اختر نے اس تعلق کا قدم قدم پر خیال رکھا اور مختلف نشستوں میں پاکستانی مرثیہ گوئی کے بارے میں خاصی معلومات فراہم کیں اور بعد میں "اردو مرثیہ پاکستان میں" کی اشاعت کے بعد اس کی ایک جلد بھی عنایت کی۔ جو سنا تھا اُسے تحریری شکل میں دیکھا اور اس میں شک نہیں کہ میں بے حد متاثر ہوا۔

ثناء الحق صدیقی۔ایم۔اے (علیگ)

یہ ایک اچھی کاوش ہے

اُردو غزل اور کربلا

واقعات کربلا جس طرح بیان کئے جاتے ہیں اس کے مطابق یہ واقعہ عالمِ دنیا کا ایک انتہائی غم انگیز سانحہ بن گیا ہے۔ اُردو میں شروع سے واقعاتِ کربلا اور غمِ حسین پر مسلسل نظمیں اور متفرق اشعار لکھے جاتے رہے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس موضوع پر اُردو شاعری میں بہت بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا ہے بعض اصناف ایسی ہیں جو اس موضوع کے لیے مخصوص تو نہیں ہیں لیکن بعض شعرا نے وقتاً فوقتاً اس موضوع سے متعلق بھی اظہارِ خیال کیا ہے۔ اُردو کی ان اصنافِ شاعری میں غزل کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اُردو زبان میں غزل ایک ایسی صنف ہے جس میں بڑی وسعت و جامعیت ہے اور جو ہر قسم کے مضمون اور ہر طرح کے خیالات کو اپنے دامن میں جگہ دے سکتی ہے۔ اس لئے غزل گو شعرا نے واقعاتِ کربلا اور غمِ حسینؑ کو بھی اپنی غزلوں کے بعض اشعار کا موضوع بنایا، کہیں بلاواسطہ طور پر کہیں بالواسطہ۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اُردو غزل کے سرمایہ کا بہت بڑا حصہ اسی موضوع سے متعلق ہے۔ کتاب زیرِ تبصرہ کے مولف و مرتب سید ضمیر اختر نقوی نے اس موضوع کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے اس طرف خصوصی توجہ دی اور نہایت اہتمام سے وہ تمام مواد جو انھیں اُردو غزلوں میں ملا جمع کر کے یہ کتاب مرتب کردی ہے۔

پوری کتاب چھ ابواب میں بٹی ہوئی ہے۔ باب اوّل میں اُردو غزل اور کربلا، باب دوم میں واقعات کربلا غزل کے آئینہ میں، باب سوم میں فرہنگ ذکر کربلا اور غزل میں مماثلت، باب چہارم میں بلاواسطہ اشعار غزل، باب پنجم میں بالواسطہ اشعار غزل اور باب ششم میں بیادِ چہاردہ صد سالہ ولادت حضرت امام حسینؑ کو عنوان بنا کر اس موضوع پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ لیکن غالباً سہواً "بلاواسطہ اشعار غزل" کے تحت تو وہ اشعار دیے ہیں جن میں براہ راست واقعہ کربلا کا کوئی ذکر نہیں بلکہ مضمون کی مناسبت کے اعتبار سے غزل کے اشعار کو کربلا کے واقعات پر منطبق کر دیا گیا ہے۔ مثلاً "قاصد کا قتل" عنوان دے کر میرؔ کا یہ شعر اس پر چسپاں کیا گیا ہے۔

نامے کو چاک کر کے کرے نامہ بر کو قتل

کیا یہ لکھا تھا میرؔ مری سرنوشت میں

اس کے برخلاف "بالواسطہ اشعار غزل" کے عنوان کے تحت ایسے اشعار دیے ہیں جن میں واضح طور پر کربلا یا حسینؑ کا ذکر ہے مثلاً۔

کربلا کی خاک:۔

دعائے آتشِ خستہ یہی ہے روزِ محشر کو

یہ مشتِ خاک ہوئے کربلا کی خاک سے پیدا

غم حسین:

آتش غم حسینؑ پہ رو، ہنس رہا ہے کیا

سطریں کی سطریں نامۂ عصیاں سے دور ہوں

ممکن ہے ناچیز تبصرہ نگار غلطی پر ہو تاہم اس کا خیال ہے کہ معاملہ برعکس ہونا چاہیے تھا۔ مجموعی طور پر یہ ایک اچھی کاوش ہے اور مولف موصوف اپنی اس سعیٔ بلیغ کے لیے لائقِ ستائش ہیں۔

آل محمد رزمی:

ضمیر کا تخلیقی سفر

اُردو غزل اور کربلا

وقت روزِ تخلیق سے بن ٹھنکے گذر رہا ہے کل آج اور آج کل میں تبدیل ہو جائے گا، کل کی قد آور علمی و ادبی شخصیتیں آج کے دھندلکوں میں گم ہو گئیں اور آج کے صاحب فن شاید کل گرد میں کھو جائیں۔ روز و شب کے اس سفر اور بے مہری عالم کے پیش نظر ہمیں اپنے تاریخی ورثے اور ادبی سرمائے کا تحفظ کرنا ضروری ہے۔ طمع و حسد، مسابقت و پروپیگنڈہ اور تنگ نظری و تعصب کے دور میں جب شاعر یا ادیب کو اس کے فن کی بلندی اور مقام و معیار کے بجائے نظریات کی ترازو میں تولا جا رہا ہو اور لوگ ادبی بددیانتی کے مرتکب ہو رہے ہوں تو قلم قبیلے پر یہ فرض اور قرض ہو جاتا ہے کہ وہ حرف حق کہیں اور حقائق کو بلا کم و کاست بیان کریں۔ سید ضمیر اختر نقوی اس لئے قابلِ ستائش و سراہے جانے کے قابل ہیں کہ انہوں نے پاکستان کی علمی فضا کی موجودہ کساد بازاری کے باوجود اپنے ادبی، علمی مذہبی معدن لازوال اور حقدمین کے تبرکات کو اپنے سینے سے لگا کر رکھا اور اپنے مذہبی و تہذیبی سانچوں کی بازیافت میں مصروف ہیں۔

ضمیر اختر نقوی ایک ایسے کڑے وقت میں جب لوگ ناقدری کا شکار ہو کر قلم سے رشتہ توڑ کر دیگر شعبوں سے جوڑنے میں مصروف ہیں، کوچہ علم و ادب میں قیام کئے ہوئے پرورشِ لوح و قلم کر رہے ہیں۔

اس پیش پا افتادہ حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ عصر حاضر میں مطالعہ کا ذوق اور کتاب خریدنے کا شوق نہ ہونے کے برابر ہے۔ کتابوں کی خریداری ڈائجسٹوں، کہانیوں، باتصویر رسائل، دعاؤں، معجزات وعملیات کی کتابوں تک محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ فکری، تخلیقی اور معیاری ادب نہ ہونے کے برابر ہے، شعر وادب کو محض وقت کا ضیاع قرار دیا جا رہا ہے، ہر جگہ مادیت کی کارفرمائی ہے، ہر شے تجارت بن گئی ہے۔ اب لکھنے والے کو تخلیق کی جگر کاوی کے ساتھ ساتھ طباعت واشاعت وفروخت کے جاں گسل مرحلے سے بھی گذرنا پڑتا ہے۔ ہمارے پاس کوئی ایسا قومی ادارہ یا ادبی اکیڈمی نہیں جو لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کر سکے۔ کسی کے پاس اگر تخلیقی ذہن ہے اور زر نہیں ہے تو وہ اپنا شہ پارۂ فن وجود میں نہیں لا سکتا۔ یہ طرزِ عمل زندگی اور طبقات کے حقیقت پسندانہ شعور سے فرار کی ایک کوشش ہے۔ زیر نظر کتاب "اردو غزل اور کربلا" عزائیہ ادب میں ایک اچھا اضافہ اور ضمیر اختر کا کارنامہ ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر مختلف لوگوں نے بہت کچھ کہا اور بہت کچھ لکھا ہے۔ اس موضوع پر یہ پہلی کتاب نہیں لیکن پاکستان میں اس موضوع کو پیش کرنے کا سہرا ضمیر اختر نقوی کے سر ہے۔ اس وسیع و وقیع موضوع پر اتنا معتبر و مستند مواد صرف ایک شعری دریافت ہی نہیں بلکہ مثبت کام اور علمی، مذہبی اور ادبی خدمت بھی ہے۔ انتخاب ومواد کے اعتبار سے بھی خاصہ تنوع اس کتاب میں موجود ہے۔

اردو غزل اور کربلا کے مطالعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کربلا نے انسانی جذبات واحساسات پر کتنے گہرے اثرات مرتب کئے ہیں، کربلا ایک ایسے ہمہ گیر انقلاب کا نام ہے اور ایک ایسا ابدی پیغام ہے جو حیاتِ انسانی کو اوّل تا آخر انسان مشربی کی بنا پر استوار کرتا ہے۔ کربلا کے Hero's حضرت امام حسین علیہ السلام اور

ان کے رفقاء تاریخ انسانی کی وہ باکمال و باعظمت شخصیتیں ہیں جس نے اپنے مجاہدہ و جستجو اور اپنے مقدس خون سے جہان بشریت کو آبرو بخشی اور اپنے کمال و اوصاف و جوہر ذات سے جامعہ بشریت کی رہنمائی کی اور معاشرہ کو آزادی و جوانمردی کا درس دیا۔

آپ کی قربانی کسی مخصوص مذہب، علاقے، رنگ و نسل طبقہ اور فرقہ کے لیے نہ تھی بلکہ پوری انسانیت کے لیے تھی یہی وجہ ہے کہ آپ پوری انسانیت کے لیے متاع عزیز ہیں، اگر ہم تلوار پر گلے کی فتح اور وقائع اور حوادث بشریت کے عظیم شہود کربلا کو نظر انداز کریں گے اور اس تذکرہ سے چشم پوشی کریں گے یا دستبردار ہوں گے تو ہم ستائش انسانیت و مذمت حیوانیت کے مقدس فریضہ سے انحراف کریں گے۔ کربلا والوں کے تذکرے انسان میں مدد شرف اور عزت و حیات کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔

اقوام عالم کے قطعی غیر جانبدار مورخین اور اہل نظر، مذاہب عالم اور تاریخ اقوام عالم کے تقابلی مطالعہ اور تعمق و تحقیق اور تفکر و تفحص کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ اگر انسانیت کے قیام کے لیے پورے خلوص پورے شعور اور پورے ذرائع کے ساتھ کسی نے کوئی کوشش کی ہے تو وہ صرف کربلا والے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ کربلا والوں کا کردار پوری نوع انسانی کے لیے یکساں طور پر مشعل راہ ہے۔

مذہب ہو یا تاریخ، ادب ہو یا اخلاقیات، نظم ہو یا نثر سب پر کربلا والوں کی بلند و بالا شخصیتوں کے نقوش بڑے گہرے نظر آتے ہیں۔ خصوصا شعراء پر جو دوسرے کے مقابلہ میں زیادہ حساس ہوتا ہے۔

اور عصر حاضر کے تخلیقی اور فکری تقاضوں سے آگاہ ہوتا ہے۔ وہ مظلومیت کو مفروضاتی اور میکانکی طریقے سے دیکھنے کے بجائے چشم ادراک میں احساس کی بینائی کے ساتھ کربلا کے اساطیری تناظر میں دیکھتا ہے اور کربلا کا جدلیاتی مطالعہ کرتا ہے جو

مکمل انسانی آزادی کا شارح ہے اور استحصالی نظام ظلم وتشدد اور اقتدار جبر کی قوتوں کا دشمن ہے۔

اس بات کا پتہ لگانے کے لیے کہ شاعر کا انسانیت، علوم انسانی، یونیورس اور باقی موجودات سے کتنا گہرا رشتہ ہے۔ یہ دیکھیں گے کہ وہ انسانیت کے سب سے بڑے محسن ونجات دہندہ حضرت امام حسینؑ اور ان کے رفقاء کربلا والے شہیدوں کے بارے میں کتنی آگہی رکھتا ہے۔ اعلیٰ شاعری کے لیے انسان مشربی ضروری ہے اور انسان مشربی پر یقین رکھنے والا حسینؑ اور کربلا والوں سے لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ پوری دنیا کے انصاف پسند طبائع، قطعی غیر جانبدار، مفکرین، دانشوروں، سیاستدانوں، قانون دانوں اور ادیبوں اور شاعروں نے کربلا والوں کے حضور تا حد بصیرت خلوص دل کا خراج ادا کیا ہے۔

ضمیر اختر نقوی نے "اردو غزل اور کربلا" میں کربلا کے مختلف پہلوؤں پر متقدمین، متوسطین، متاخرین اور نئے کہنے والوں کے اشعار کو بڑی ژرف بینی کے ساتھ جمع کیا ہے۔ ان اشعار میں عظمت انسانی کے مختلف گوشے، فلسفۂ غم، رنج والم کرب وکشمکش، ظلم واستبداد، حریت وبیداری، مظلومیت، صداقت شعاری، جذبے کی شدت، حساسیت، فکری وجذباتی ضابطے اور شاعر کی تخلیقی وانسانی سوچ کا پتہ چلتا ہے۔

سیّد مسعود حسین زیدی (صدر شیعہ کانفرنس لکھنؤ)

"ہندوستان و پاکستان کی خطابت اب تہی دست ہو چکی ہے ضمیر اختر نقوی واحد خطیب اعظم ہیں جنھوں نے فن خطابت کی لاج رکھ لی ہے۔ جسے سنتا ہے سن لے اب اس میدان میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ صرف اور صرف ضمیر اختر نقوی برصغیر میں تاریخ خطابت کے سب سے عظیم خطیب ہیں۔"

۵۵۵
میر انیس
کی شاعری میں
رنگوں کا استعمال
ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی

مطبوعہ ڈان میگزین۔ مورخہ ۲۸ مئی ۲۰۰۰ء (اتوار)

انتظار حسین

رنگوں کی زبان

میر انیس کو رنگوں کی فقیدالمثال آگاہی حاصل تھی جو کسی اور اردو شاعر کو نصیب نہیں ہوئی۔ اس بات کا اعادہ و اظہار ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی نے اپنی نئی کتاب "میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال" میں کیا ہے۔

زیرِ نظر کتاب انیس کی شاعری پر نقد و نظر کا نیا باب کھولتی ہے۔ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی نے میر انیس پر نقد و نظر کا نیا باب کھولا ہے جو اردو تنقید میں عام نہیں۔

خاص طور سے میر انیس پر ناقدینِ فن عام طور سے ان حدود تنقید سے آگے نہیں بڑھے جیسا کہ مولانا شبلی میر انیس کی مرثیہ گوئی پر تنقید کے ذیل میں اپنے مشہور مقالے "موازنۂ انیس و دبیر" میں پیش کر چکے ہیں۔

ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی کی زیرِ نظر کتاب شبلی کے اندازِ نقد و نظر سے علیحدگی پر دلالت کرتی ہے۔ میر انیس کی مرثیہ گوئی کے ذیل میں ایک نئے اندازِ نظر کی دریافت ہے۔ اس پس منظر میں میر انیس ایک عام روایتی مرثیہ گو شاعر سے ہٹ کر بالکل مختلف شاعر نظر آتے ہیں۔

اس مطالعہ کی تمہید کے طور پر ضمیر اختر رنگوں کے سلسلے میں اس کے سائنسی تعلق و تعمق پر بحث کرتے ہوئے رنگوں کا انسانی زندگی کے اثر پر تجزیہ پیش کرتے ہیں۔ کچھ

مغربی مفکرین اور حکما کی آرا سے استفادہ کرتے ہوئے کچھ دلچسپ مشاہدات بھی پیش کرتے ہیں۔

رنگ ضمیر اختر کے بموجب آسانی سے ناپے جاسکتے ہیں اور انھیں آسانی سے دکھلایا جاسکتا ہے اعداد و شمار کے ذریعے۔ ابتدائی رنگ، ضمیر اختر کے بقول چند ہیں۔ تین یا چار اور ثانوی رنگوں کی تعداد زیادہ ہے۔ جہاں تک ابتدائی رنگوں کا تعلق ہے نیوٹن (Newton) نے ان رنگوں کی تعداد سات بتائی ہے۔

لیکن بعد کے محققین اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ ابتدائی رنگ صرف تین ہیں تمام دوسرے رنگ ان تینوں رنگوں کے امتزاج سے عمل میں آئے ہیں اور یہ رنگ تین سرخ، سبز اور نیلے ہیں۔

کچھ حکما پیلے یعنی زرد رنگ کو بھی شامل کرتے ہیں۔ ضمیر اختر نے حضرت علیؑ کا ارشاد بھی پیش کیا ہے جس کے رو سے سرخ، سبز، پیلا اور سفید ابتدائی رنگ ہیں۔

ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی نے رنگوں کو پیش کیا ہے جیسا کہ اردو زبان نے اخذ کیا ہے۔ اردو میں رنگوں کی ایک لمبی فہرست ہے جن کے نام اور صفات جانوروں، پھلوں، پھولوں، درختوں، پرندوں اور فطرت کے دیگر اجزا کے ناموں سے اخذ کیے گئے ہیں۔

اردو میں کلر (Colour) کا متبادل لفظ "رنگ" ہے۔ یہ لفظ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی کے بموجب سینتیس معانی رکھتا ہے اور انیسؔ نے ضمیر اختر کے بموجب سینتیس انداز میں استعمال کیا ہے۔

ڈاکٹر سید ضمیر اختر نے نظیر اکبر آبادی اور جوش ملیح آبادی کو خاص طور سے منتخب کیا ہے جو رنگوں کے تذکرے مزے لے کر بیان کرتے تھے لیکن بقول ڈاکٹر سید ضمیر اختر کے ایسا لگتا ہے وہ رنگوں کو گنوانے میں ہی مطمئن تھے۔ لہٰذا وہ رنگوں کی ایک طویل

فہرست بنوانے میں مددگار ثابت ہو سکتے ہیں لیکن برخلاف ان کے انیس رنگوں کا استعمال نہایت مصورانہ اور تخلیقانہ انداز سے کرتے ہیں۔

ہم رنگوں کا تجزیاتی مطالعہ انیس کے مرثیوں میں کر سکتے ہیں۔ مقتدر ناقد نے ہمیں بتلایا ہے ان رنگوں کے متعلق جو انیس کو مرغوب تھے جن کی واقعۂ کربلا کے حوالے سے ایک خاص حیثیت و اہمیت تھی اور اسی توسط سے ان رنگوں کا واقعۂ کربلا کے اظہار میں بیان ہوا ہے۔

سرخ اور سبز وہ دو رنگ ہیں جن کا واقعۂ کربلا سے ایک خاص تعلق ہے۔ جیسا کہ توقع تھی میر انیس نے متعدد بار ان رنگوں کا استعمال کیا ہے اور ہر مرتبہ ایک نئے مصورانہ حسن اور زیبائش کے ساتھ یہ رنگ پیش کرتے ہیں۔

لیکن کچھ رنگ ایسے ہیں جو کربلا کے واقعہ سے متعلق نہیں نظر آتے۔ ان میں سے ایک رنگ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی نے منتخب کیا ہے، وہ رنگ ہے اودا یا ارغوانی۔ اس رنگ کو میر انیس کن حالات میں اور کس چابکدستی سے استعمال کرتے ہیں۔ انیس کے پسندیدہ پانچ انداز اور رنگوں کے استعمال کے اس نکتے پر مزید روشنی ڈالتے ہوئے وہ ایسے مواقع پیش کرتے ہیں جہاں ان رنگوں کا استعمال ہوا ہے۔

اس طور کے رنگوں کا استعمال کرتے ہوئے پورا ایک واقعہ بیان کیا گیا ہے اور رنگ کا ایک نئے معنی اور ایک نئے ڈھب میں استعمال پیش کیا گیا ہے۔ ایسے نمایاں اور اچھوتے حُسن کی وجہ سے اس کا کسی دوسری بولی اور محاوروں میں ترجمہ نہیں ہو سکتا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی نے یہ پیش کیا ہے کہ انیس ترجمے سے بالا ہیں۔

تو رنگوں کے تناظر میں انیس پر یہ تحقیقی مطالعہ ہے جسے ضمیر اختر نے پیش کیا ہے۔ انیسیات میں یہ مطالعہ ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر شارب ردولوی (لکھنؤ، انڈیا)

انیسیات میں منفرد کتاب

عزیز گرامی ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب

تسلیم و نیاز آپ کی کتاب "میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال" مجھے چند روز پہلے ملی میں آپ کی بھتیجی عذرا کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے بڑی ذمہ داری کے ساتھ کتاب مجھ تک بھجوانے کا بندوبست کیا وہ اپنے موضوع اور پی ایچ ڈی کے کام کے سلسلے میں اب تک نہیں مل سکیں لیکن آپ مطمئن رہیں ان کی جو مدد میں کرسکتا ہوں ضرور کروں گا۔

آپ کی کتاب ان چند دنوں میں پڑھ ڈالی سب سے پہلے اس خوبصورت تصنیف اور دلکش موضوع کے انتخاب پر میری دلی مبارکباد قبول فرمائیں۔ آپ نے انیس کے مطالعہ کیلئے بہت اچھا موضوع منتخب کیا ہے اور بڑی محنت سے اشعار کا انتخاب کیا ہے۔ مجھے تعجب ہوتا ہے کہ کس طرح آپ اتنا کام کرلیتے ہیں۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے "القلم" کا چھٹا شمارہ پڑھ رہا تھا اداریہ سے لے کر خطوط کے جوابات تک معلومات کا ایک خزانہ ہے۔ میں اس شمارہ کے بارے میں تفصیلی خط لکھ چکا ہوں جو ملا ہوگا۔

میر انیس کے مرثیوں کے مطالعہ کے سلسلہ میں یہ کتاب بالکل منفرد نوعیت کی ہے جس کی طرف آج تک کسی کی نظر نہیں گئی۔ رنگوں کا تعلق انسانی نفسیات سے ہے۔ علم نجوم اور علم الاعداد کے ماہرین انسان کی زندگی سے اس کے رشتہ کو جوڑتے ہیں۔

ہندوستان ہی میں نہیں ایران میں بھی اسے اہمیت حاصل ہے اور نوروز کے ایک رنگ کا حوالہ آتا ہے۔ یہ بہت ہی وسیع موضوع ہے جس کی حد بندیاں آسان نہیں تھیں پھر بھی آپ نے انیس کی شاعری میں رنگوں کے استعمال میں انہیں ایک دائرے میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اس لئے یہ مطالعہ زیادہ بامعنی ہو گیا ہے۔ مرثیے کو پڑھنے اور پڑھانے کا موقع ہزاروں بار آیا لیکن اس کی طرف میری بھی توجہ نہیں گئی۔ رنگ الفاظ ہی کی طرح معنوی تہہ داری رکھتے ہیں۔ سیاہ، سرخ، سبز، سفید صرف رنگ ہی نہیں اپنے اندر ایک جہان معنی رکھتے ہیں۔ میر انیس نے بھی بیشتر جگہوں پر صرف رنگ کے حوالے سے نہیں بلکہ معنوی وسعت کے سلسلے میں ان کا استعمال کیا ہے۔ آپ نے بڑی تفصیل سے ہر رنگ اور اس کے ہر پہلو کا جائزہ لیا ہے آپ نے رنگوں کی نوعیت اور معنویت سے جس طرح بحث کی ہے وہ آپ کا حصہ ہے۔ میں ایک بار پھر اس بیش قیمت تصنیف پر دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ آپ لکھنؤ کب آ رہے ہیں مطلع کیجئے گا۔ خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔

مولانا آغا روحی

۱۳ر نومبر ۷۷ء..... لکھنؤ۔ محترم بھائی (ضیاء الحسن موسوی) سلام برادرانہ

"ضمیر اختر صاحب آئے تو انھیں بھی آپ کا پتہ زبانی یاد نہ تھا۔ بہر حال، اب از سر نو تجدید کر رہا ہوں۔ یہاں ضمیر صاحب نے عشرۂ محرم میں اور بعد عشرہ کئی مجلسیں پڑھیں اور بھرپور داد پائی، نوجوان طبقہ تو ان پر عاشق ہو گیا ہے۔ ہر مجلس میں بہت بڑے بڑے مجمع ہو رہے ہیں۔ لوگ انتہائی اشتیاق سے سن رہے ہیں اور سر دھن رہے ہیں۔ اتنی جلدی لکھنؤ میں اتنی زیادہ مقبولیت حاصل کر کے انھوں نے ریکارڈ قائم کیا ہے۔ خدا انھیں اور ترقی دے"۔

پروفیسر سحر انصاری

ایک منفرد اور عالمانہ کاوش

دنیا کے عظیم شعرا زمان و مکان کی حدود سے نکل کر ہر عہد کے ترجمان بن جاتے ہیں اور یہ امر بھی مسلمہ ہے کہ ہر عہد اپنے کسی عظیم شاعر کو از سر نو دریافت کرتا ہے۔ یہ کلیہ عظیم شاعر میر انیسؔ کے باب میں بھی صادق آتا ہے۔ انیس شناسی کے نئے نئے گوشے برابر سامنے آ رہے ہیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کو انیسؔ شناسی سے شغف نہیں، عشق ہے۔ اُن کے زرخیز اور خلاق ذہن میں میر انیسؔ کے حوالے سے نادر و بے مثل افکار و خیالات جنم لیتے رہتے ہیں۔ زیر نظر کتاب میں اُنھوں نے رنگوں اور الوان کے حوالے سے میر انیسؔ کے مراثی کا جائزہ لیا ہے۔ اور حق یہ ہے کہ موضوع کا حق ادا کر دیا ہے۔ رنگ اور اس کی ماہیت اور انسانی معاشرے اور ذوقِ جمال پر اثرات کو تہذیب، جمالیات، نفسیات کے علاوہ سائنسی نقطۂ نظر سے بھی دیکھا گیا ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی ایک منفرد اور عالمانہ کاوش کی داد کس طرح دی جائے۔ اس موضوع پر تو ایک مقالہ لکھنا بھی شائد دشوار ہوتا۔ چہ جائے کہ ضمیر اختر صاحب نے ایک عظیم کتاب تحریر کر دی جو بلا شبہ انیسؔ شناسی کے تازہ ترین گوشوں میں ایک عہد آفرین اضافہ ہے۔

شفیع عقیل:

اپنے موضوع پر بالکل نئی کتاب
میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال

علامہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب کا نام کسی تعارف کا محتاج نہیں ہے، وہ ادیب، محقق اور نامور خطیب ہیں اور اب تک متعدد کتابیں لکھ چکے ہیں۔ مرثیہ نگاری اور مرثیہ نگاران کا خصوصی موضوع ہے اور اس سلسلے میں انھوں نے بڑا کام کیا ہے خاص طور پر میر انیس کی زندگی اور فن پر ان کا کام مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ پیش نظر کتاب بھی میر انیس ہی کے بارے میں ہے لیکن اس دفعہ انھوں نے ایک مختلف پہلو پر لکھا ہے، یہ منفرد موضوع یہ ہے کہ انھوں نے میر انیس کے ہاں جن جن رنگوں کا استعمال ہوا ہے، جس جس موقع پر ہوا ہے اور جس جس انداز میں ہوا ہے، انھوں نے اس پر تحقیق و تلاش کی ہے، اس طرح انیس شناسی کا انھوں نے ایک نیا گوشہ متعارف کرایا ہے۔ انیس کے مرثیوں میں جو رنگ استعمال ہوئے ہیں، جناب ضمیر اختر نقوی نے ان کے الگ الگ ابواب قائم کر کے اپنا مطالعہ پیش کیا ہے اور انیس کی شاعری اور فکر کے حوالے سے ان پر روشنی ڈالی ہے، شروع میں انھوں نے رنگوں کے متعلق نفسیاتی، سائنسی، تاریخی، فنی اور فلسفیانہ حیثیت و اہمیت کے بارے میں لکھا ہے اور پھر آخر میں رنگوں کی فرہنگ بھی دی ہے کہ ایک عام قاری رنگوں کی تفریق سے متعلق جان سکے اور رنگوں میں امتیاز اور ان کی نوعیت سے آگاہ ہو جائے۔ علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی یہ کتاب اردو میں غالباً اپنے موضوع پر بالکل نئی اور الگ نوعیت کی ہے۔ (روزنامہ جنگ کراچی۔ "نقد و نظر"... ۱۸ رمئی ۲۰۰۰ء)

پروفیسر ڈاکٹر شیخ انصار حسین
(سابق صدر شعبہ طبیعات کراچی یونیورسٹی)

نئے رنگوں کی تلاش

پیارے ضمیر اختر۔ بہت سی دعائیں..... تمہارے خانوادے سے ہر چند کہ میری شناسائی مدتوں پرانی ہے، جو سفر ہجرت سے منسلک ہو کر کراچی اور اب تمہارے برادر بزرگ محسن نقوی سلمۂ سے متصل ہو کر نیو جرسی (نارتھ امریکہ) پہنچ چکی ہے۔ شاید تمہیں یاد ہوگا کہ اپنے شباب کے اُٹھان سے ہی تمہیں خدائے سخن میر انیس سے والہانہ محبت و عقیدت کے جذبے کی ابتدا یہ تھی کہ تمہیں جہاں کہیں بھی کسی اخبار و رسالے یا تصنیف میں میر انیس پر چھوٹا یا بڑا سوادمل جاتا تھا تو تم اُسے اپنی فائل میں تبرک کی طرح محفوظ کر لیا کرتے تھے۔ بڑھتے بڑھتے تمہارا یہ ذوق و شوق انیس شناسی کے شغف سے عشق کی حدود میں داخل ہو گیا اور اب ماشاءاللہ تمہارا شمار پاکستان میں میر انیس پر ایک اتھارٹی (authority) کی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔ تمہاری عالمانہ کاوشیں لائق صد ستائش ہیں۔ "اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ"

تمہیں یہ جان کر خوشی ہوگی کہ اردو سائنس کالج میں عزیزم سید قائم رضا نقوی کے توسط سے تمہاری بیشتر تصانیف اور القلم کے شمارے مجھ تک پہنچ رہے ہیں اور وہ اکثر یاد بھی دلاتے رہتے ہیں کہ میں کچھ اپنے تاثرات سپردِ قلم کروں۔ نہ معلوم کیوں ان کا یہ تقاضہ التوا میں رہا اور بات ٹلتی رہی لیکن تمہاری تازہ ترین تصنیف "میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال" ہاتھوں میں آئی تو میں چونک پڑا

یہ کون حضرت نیوٹن کا ہم زباں نکلا

بطور طبیعات کے طالب علم کے میں جانتا ہوں کہ سر آئیزک نیوٹن نے اپنی نور شناسی کے عشق میں طیف پیمائی کی مہم کے ذریعہ انتشار نور میں رنگ بھر دیئے تھے اور اب اپنی صدی کے جاتے جاتے میرے ضمیر اختر نے انیس کے مراثی میں رنگوں کا استعمال کی آمیزش کے تہذیبی، جمالیاتی اور سائنسی پرتو کے رنگ بکھیر دیئے ہیں۔ ضمیر اختر تمہاری یہ تصنیف دراصل ادب میں ایک ایسا اضافہ ہے جس نے رنگوں کو ایک نیا پیراہن عطا کر دیا ہے۔ اور اب یہ محسوس ہوتا ہے کہ رنگوں کی تعریف بقول یگانہ یہ ہے کہ

حُسن وہ حُسن بھی جس کی حقیقت نہ کھلے
رنگ وہ رنگ جو ہر رنگ میں شامل ہو جائے

واقعی تمہاری تحقیق نے یہ بات ثابت کر دکھائی ہے کہ میر انیس کی شاعری کا رنگ ہر رنگ میں شامل نظر آتا ہے۔

یہی وہ کمال فن ہے جس نے میر انیس کی شاعری کو رثائی ادب میں حرف آخر کا درجہ عطا کیا ہے۔ جب ہی تو میر انیس نے خود بھی دعویٰ کیا ہے کہ۔

اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں
گلدستۂ معنی کو نئے ڈھنگ سے باندھوں

میں نے تو خوش ہو کر جذبات محبت اور تمہاری علمی و ادبی کاوشوں کے اعتراف کی خاطر یہ خط لکھا ہے اب اگر جی چاہے تو میرے اس خط کو اظہر کے کسی شمارے میں خطوط کے باب میں چھاپ دینا۔

اُمید ہے کہ بہ صحت و عافیت اپنی علمی لگن میں مست و شاداب ہو گے اور مزید نئے رنگوں کی تلاش میں سرگرداں ہو گے۔

ادیب سہیل:

میر انیسؔ کی شاعری میں رنگوں کا استعمال

''نئے نئے رُخ''

میر انیسؔ کے شاعرانہ کمال کے تعین میں یہی کہا جاسکتا ہے کہ میرؔ، غالبؔ، اقبالؔ جن معنوں میں صاحبِ کمال اور بڑے تصور کیے جاتے ہیں۔ میر انیسؔ کا شمار بھی اسی صف میں ہوتا ہے۔ جہاں تک رثائی ادب کا تعلق ہے۔ اس میں سوڈیڑھ سو برس گزر جانے کے باوجود اُن کا کوئی حریف نظر نہیں آتا۔ آنے والی اکیسویں صدی بھی اسی لحاظ سے انیسؔ ہی کی صدی ہوگی۔

میر انیسؔ پر اس طویل مدت میں بے شمار مضامین لکھے گئے اور ان کے فن و شخصیت پر پی ایچ ڈی کے مقالے تحریر ہوئے ہیں۔ انیس شناسی کا یہ سلسلہ تا حال جاری ہے اور آگے بھی جاری رہے گا۔

میر انیسؔ پر لکھے گئے اتنے بہت سارے مضامین میں سے ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی کا یہ موضوع ''میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال'' اس لحاظ سے منفرد ہے کہ یہ انیس کی شاعری پر ایک نئی جہت اور ایک نئے رنگ سے روشنی ڈالتا ہے۔ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی نے بڑی جانفشانی اور محنت سے میر انیسؔ کی شاعری میں مختلف رنگوں بلکہ تقریباً تمام رنگوں کا سراغ لگایا ہے۔ سند کے لیے میر انیسؔ کے اشعار کے حوالے دیے ہیں،

اور دنیا بھر کے تاریخی حوالے یکجا کر دیے ہیں۔

ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی، میر انیس کے کلام کے فدائی ہیں اور ان پر نئے نئے زخ سے کام کرتے رہتے ہیں۔ کسی شخص کا کسی کے فن پر اس طرح فدا ہونا اس بات کی بین دلیل ہے کہ وہ ممدوح کے لئے کس درجہ کی محبت اور احترام رکھتا ہے۔ ظاہر ہے، جس کام میں محبت دست راست بن جاتی ہے وہ کام اسی عنوان سے معرض وجود میں آتا ہے، جس عنوان سے "میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال" بہ تمام و کمال آیا ہے۔ غرض یہ کہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کا یہ کام طول و عرض اور اپنے متون میں ممکنہ معلومات کے اس قدر بہ ہونے کی وجہ سے کسی اعلیٰ مقالے سے کم نہیں ہے۔

بات رنگوں کی تلاش و جستجو کی ہو رہی ہے تو یہ کہتا چلوں کہ زمانہ قدیم سے آج تک رنگوں کا طرح طرح سے استعمال ہوتا چلا آ رہا ہے۔ مصوری تو اس کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ موسیقی کے سات سُروں (سا رے گا ما پا دھا نی) میں سے ہر ایک کا اپنا رنگ ہے۔ آج سے چند برس پہلے مجھے اپنے ایک بزرگ شاعر اور ناول نگار جناب شاغل فریدی سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ اس وقت وہ کمر خمیدہ ہو گئے تھے اور مشاعرے میں پکڑ کے لائے جاتے تھے، باتوں باتوں میں انھوں نے یہ بتایا کہ وہ رنگوں سے مختلف امراض کا علاج کرتے ہیں۔ تو گویا رنگ دافع مرض بھی ہے۔

کتاب مذکور بہت ہی سلیقے سے چھاپی گئی ہے، میر انیس کے باب میں ایک اضافہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ غرض یہ کہ ضمیر اختر نقوی صاحب کا یہ مقالہ میر انیس کے حوالے سے رثائی ادب میں ایک نئی جہت کی تلاش ہے۔ آگے آگے دیکھیے ان کا قلم اور کون سا رخ اختیار کرتا ہے۔ ("قومی زبان" اپریل ۲۰۰۰ء)

سیّد افضال حسین نقوی (افضل فتح پوری)

فکرِ انیسؔ کی ترجمانی رنگوں کی زبانی

عزیزی ضمیر اختر نقوی کی نادر تخلیق "میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال" دراصل میر انیسؔ کے کرشموں کے حوالے سے "فکرِ انیس کی ترجمانی رنگوں کی زبانی" کی صحیح تفصیل کے مصداق ہے۔ عزیزی ضمیر اختر نقوی ایک ذہین، طباع، ایک پر اعتماد اسکالر، ایک نفیس ناقد، ایک فقید المثال خطیب اور ایک بے بدل شاعر ہیں۔ بلاشبہ موصوف کا ذہن نادر تصورات وخیالات کی آماجگاہ ہے۔

ضمیر اختر نقوی میرے ننھیالی عزیز ہیں اور مجھ سے عمر میں بہت چھوٹے ہیں، میں نے برخوردار کو ترقیوں کے زینوں پر چڑھتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ ابھی تک اردو زبان میں رنگوں کی ماہیت اور حقیقت کے حوالے سے کوئی تحقیقی کام نہیں ہوا تھا۔ اس کا سہرا عزیزی ضمیر اختر نقوی کے سر جاتا ہے کہ انھوں نے نہ صرف اس عظیم کام کو شروع کیا بلکہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچا دیا۔ رنگ کی ماہیت اور حقیقت کیا ہے، اسے سائنسی، نفسیاتی، فنی، تحقیقی، مذہبی، تاریخی، ادبی اور ذہنِ انسانی کے تمام تر امکانی پیمانوں پر ناپ کر اس کا حقیقی جوہر پیش کیا گیا ہے۔ اس کاوش وکاہش میں الہامی کتب، علم کلام، احادیث اور نہج البلاغہ کے اہم نکات کو بھی زیرِ غور لایا گیا ہے۔

میر انیسؔ کے حوالے سے رنگوں کا وہ کون سا رُخ ہے جسے قابلِ قدر مصنف ضمیر اختر نقوی نے نہیں پیش کیا۔ ذرا اس معتقدر کتاب کے ان ابواب پر ایک طائرانہ نظر ڈالیے

اور ان کی ندرت، ماہیت، حیثیت اور حسنِ انتخاب کی داد دیجئے۔ ابواب کی فہرست درج ذیل ہے:

میر انیس کی شاعری میں رنگوں کے محاورے، میر انیس کی رنگین بیانی، میر انیس کی شاعری میں (سرخ) گلاب، غیض اور جلال میں چہرہ سرخ ہونا، میر انیس کے جواہرات، یاقوت، لعل، تلوار اور سرخ رنگ، شہیدوں کا لباس سرخ ہوتا ہے، میر انیس کے ایک مرثیے میں سرخ رنگ کا استعارہ "پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح" میر انیس کی شاعری میں سبز رنگ، سبز رنگ کی اہمیت، خط سبز رنگ، خیمہ زنگاری، میر انیس کی شاعری میں سبز علم، میر انیس کے سبز نگینے (زمرد و زبرجد) تلوار کا سبز رنگ، میر انیس کی شاعری میں زرد سورج، زرد آسمان، زرد پھول، زرد زعفران، ظلم کا زرد رنگ، میر انیس کی شاعری میں گولڈن اور سلور رنگ، (الف) مادی سنہرے و روپہلے رنگ اور ان کی تفصیل، جس کی طویل فہرست ہے، (ب) فلکیاتی سنہرے، روپہلے رنگ اور ان کی تفصیل، ستاروں کا علم (Astronomy) پھر ان کی طویل فہرست، (ج) روحانی سنہرے روپہلے رنگ، ہنری کاربن (Henry Corbin) کا نظریہ الوان وغیرہ، میر انیس کی شاعری میں امتیازی رنگ، لغت الوان، رنگ کی فرہنگ (اردو) پھر رنگ کی طویل فہرست۔

ابواب کی یہ طویل فہرست پھر ان سب پر حتی الوسع علمی، ادبی، مذہبی، تاریخی، تمام جہتوں سے بحث اور ان سب کا میر انیس کی شاعری اور ان کے نہایت پُرزور اور پرستائش اشعار کے حوالے سے ارتباط، یہ تمام کاوش و کاہش اتنی آسان نہیں جن کا فقط معمولی اظہار کر کے چھوڑ دیا جائے۔ یہ اتنا بڑا کام ہے اور اتنا منفرد کام ہے کہ جس کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ عزیزی ضمیر اختر نقوی بے پایاں تعریف و تحسین کے

مستحق ہیں۔ انہوں نے رنگ کے ذیل میں اتنے بڑے موضوع کی کمی کو اردو زبان میں پورا کر دیا۔ وہ اس بات کے مستحق ہیں کہ انہیں انیس شناسی اور رنگ کی ماہیت اور حقیقت کی آگاہی کے حوالے سے اس صدی کا انیس شناسی کا سب سے بڑا ایوارڈ دیا جائے۔

آیئے اس معتدد کتاب سے چند حوالے پیشِ خدمت کرتے ہیں:

''آج کل رنگ کی بھی سائنس ہے، رنگ ایسی چیز ہے جس کو ناپا جا سکتا ہے اور اعداد میں ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ رنگ ناپنے کی سائنس رنگ پیمائی کہلاتی ہے۔''
(''نوریات'' انگریزی: الیف، ڈبلیو، سیرس، پروفیسر علم طبیعات ڈارٹ ناتھ کالج، ص ۵۲۷)

''موجودہ صدی اور آنے والی صدی کو رنگ کی صدی کہا جا سکتا ہے۔ اپنی نسبتی وجہ سے کچھ رنگ خطرے، کچھ سکون، کچھ حزن و یاس اور مسرت کی علامت بنتے ہیں۔
(صفحہ نمبر ۳)

''قرآن مجید میں صاحب بصیرت کو رنگوں (Colours) کے ادراک و فہم کی دعوت دی گئی ہے۔''

''رنگوں کی دنیا اتنی حیرت انگیز اور دلچسپ ہے کہ اس سے اکتاہٹ اور بے زاری پیدا نہیں ہوتی۔ رنگ کی دنیا کا ذرہ ذرہ کائنات کے حیرت انگیز کرشموں کی شہادت دے رہا ہے اور معاشرت کی دنیا میں رنگ سے زیادہ کوئی حربہ کارگر نہیں ہو سکتا۔ قدرت کی عظیم انسانی اسکیم میں رنگ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ غور کیجئے تو ہر رنگ میں بے شمار قوتیں پنہاں ہیں اور ہر رنگ اپنی زبانِ حال سے دعوتِ فکر و عمل دے رہا ہے۔ ہر رنگ میں اثر ہے، زندگی ہے، جان ہے، جہان ہے، رنگ مجموعہ ہے جذبات کا، مذہب اور روحانیت کا، رنگ میں جلال بھی ہے، جمال بھی، رنگ دنیا کی ہر زبان و

ادب کا مرکزی نقطہ ہے۔" (صفحہ نمبر ۹۶، ۹۷)

"سات ہزار سال پہلے عراق (میسوپوٹیمیا) کے اطبا سات رنگوں کی رنگین شعاعوں سے مریضوں کا علاج کرتے تھے۔ آج بھی ماورائے بنفشی شعاعوں (Ultra vilet rays) سے علاج کرنے والے شفا خانے امریکہ، جرمنی، برطانیہ اور سوئزر لینڈ میں موجود ہیں"۔

"ہر رنگ کا ایک مضبوط نفسیاتی تاثر ہوتا ہے جو پوری دنیا تسلیم کرتی ہے۔"

"اردو ادب میں لفظ "رنگ" کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس لفظ "رنگ" کو بہت سے معنوں میں استعمال کیا جاتا ہے، "مہذب اللغات" میں رنگ کے ۲۷ معنی لکھے ہیں، میر انیس نے ۲۷ سے زیادہ معنوں میں رنگ کے لفظ کو استعمال کیا ہے۔

چند ایک رنگ کے استعمال کے انداز آپ بھی ملاحظہ فرمایئے:

"میر انیس نے ایک بند میں لفظ رنگ کو چار مختلف معنوں میں استعمال کیا ہے۔ ضمیر اختر نقوی نے اس بند کو جس میں دہشت، خوف، تشویش، طور طریقے کا استعمال ہے، زیرِ تبصرہ کتاب کے صفحہ نمبر گیارہ پر پیش کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے اور مصنف کی رنگ آگاہی اور انیس شناسی کی داد دیجئے۔"

آتا تھا کہ کچھ اور ہی لشکر کا ہوا رنگ
سینوں میں جگر ہل گئے، چہروں سے اُڑا رنگ
سب سوچ میں تھے، دیکھیے، اب ہوتا ہے کیا رنگ
بولا کوئی، ہے آج لڑائی کا نیا رنگ

لاکھوں ہیں مگر فتح سے دل سرد ہیں سب کے
بے جنگ کے خوف سے منہ زرد ہیں سب کے

بلاشبہ درج بالا بند قابل صد ستائش ہے۔

رنگ اُڑنا (حال غیر ہونا، مضطر ہونا)

اس محاورے کے ذیل میں ضمیر اختر نقوی میر انیس کا درج ذیل شعر پیش کرتے ہیں، ملاحظہ فرمایئے اور حسن کلام کی داد دیجیے:

چمکی تھی روشنیٔ قمر ان کے سامنے
اُڑتا تھا رنگِ روئے سحر ان کے سامنے

رنگ اُڑنے پر ضمیر اختر نقوی نے میر انیس کے بیسیوں اشعار بطور حوالہ پیش کیے ہیں، چند ایک کے تیور آپ بھی ملاحظہ فرمایئے:

رنگ اُڑنا (دہشت):

دہشت سے اُڑا رنگ رخِ جن و ملک کا
تھرا گیا دہشت سے بدن شیر فلک کا

رنگ اُڑنا (خوف)

رنگ اُڑتا ہے آدمی سے جو اخّس ہے بھی گرد

رنگ اُڑنا (حال غیر ہونا، مضطر ہونا):

یہ سن کے اُڑا رنگِ رخ آل پیمبرؐ
بانو علی اکبرؑ کے لیے ہو گئی مضطر

رنگ اُڑنے کے علاوہ اور بھی اس ذیل کے محاورے ہیں، مثلاً رنگ بدلنا (عادت تبدیل ہونا) اس محاورے کا عکاس شعر ملاحظہ فرمایئے:

غل تھا فلک کا رنگ بدلا ہے، دیکھ لو
ذرّوں سے آفتاب بھی جلتا ہے، دیکھ لو

رنگ باندھنا (مضمون سو طرح سے بیان کرنا):

گلدستۂ معنی کو نئے رنگ سے باندھوں
اک پھول کا مضموں ہو تو سو رنگ سے باندھوں

رنگ دکھانا (جوہر کا مظاہرہ کرنا):

تیغ علی اکبرؑ نے عجب رنگ دکھائے

رنگ دکھانا (معجزہ دکھانا):

اعجاز کے انداز دم جنگ دکھائے
اب آپ دم تیغ نے سو رنگ دکھائے

رنگ دکھانا (حیرت انگیز اسلوب دکھانا):

تھا تیغ بھی، انیس! آج کے پڑھنے کا نیا ڈھنگ
ہر مصرع رنگیں نے دکھایا ہے عجب رنگ

رنگ دکھانا (نتیجہ دکھانا):

کیا رنگ آگے، دیکھئے! قسمت دکھاتی ہے
یاں کی زمیں سے خون کی بو آتی ہے

رنگ دیکھنا (صورت حال دیکھنا، تیور دیکھنا):

بولے یہ رنگ دیکھ کے شبیرؑ خوش نہاد
ہاں، اے مجاہدو! راہ حق میں کرو جہاد

عزیزی ضمیر اختر نقوی کا درج ذیل مشورہ صائب اور حقیقت پسندانہ ہے، ہمارے لغت نویسوں کو اس طرف توجہ دینی چاہیے:

"اگر اردو زبان کے لغت نویس بنظر غائر کلام انیس کا مطالعہ کرتے

تو لاکھوں محاورے لغات میں آ جاتے، میر انیس کی رنگ آمیزی
سے زبان ادب میں رنگ آ جاتا۔'' (زیر تبصرہ کتاب)

اس ذیل میں مقتدر مصنف نے درج ذیل ابواب رقم کیے ہیں:

میر انیسؔ اور سرخ گلاب، غیض اور جلال میں چہرہ سرخ ہونا، میر انیس کے جواہرات، عقیق، یاقوت، لعل، تلوار اور سرخ رنگ، شہیدوں کا لباس سرخ ہوتا ہے، میر انیس کے ایک مرثیے میں سرخ رنگ کا استعارہ۔

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح

قبل اس کے کہ درج بالا مرثیے پر مقتدر مصنف کا سرخ رنگ کے حوالے سے تحسین نظر پیش کیا جائے، مناسب معلوم ہوتا ہے کہ زیر تبصرہ کتاب کا ایک اور اقتباس سرخ رنگ کے حوالے سے پیش کر دیا جائے۔

''سرخ رنگ کے موضوع پر عالمی دانشور محمد کریم خان کرمانی نے ۱۸۵۱ء میں عربی زبان میں ''یاقوت الحمرا'' کے نام سے ایک رسالہ بہت ہی جلدی میں صرف دو دن کے اندر تحریر کیا۔ ساٹھ اوراق کے اس رسالے میں دو حصے ہیں، پہلے حصے میں آٹھ ابواب ہیں اور دوسرے میں نو ابواب ہیں، اس کتاب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ رنگوں کے موضوع پر مصنف کی ماہرانہ گرفت کو ظاہر کرتی ہے، اس کے علاوہ مختصر اور نہایت ہی جامع و مانع ہے، پہلے حصے میں الوان (رنگوں) کے تصورات اور ان کی حقیقت سے بحث کی گئی ہے اور دوسرے حصے میں خصوصیت سے سرخ رنگ کے موضوع پر گفتگو کی گئی ہے، سرخ رنگ کا انتخاب اس کی قدامت کے باعث کیا گیا

ہے، سرخ رنگ میں چونکہ مناسبت پائی جاتی ہے ترکِ دنیا اور ترکِ لذات سے جس کی قرآن بھی تعلیم دیتا ہے، ہنری کاربن (Henry corbin) یورپی دانشور کا کہنا ہے کہ شیخ محمد کریم خان کرمانی کے نظریہ الوان نے ان کو ہماری نظر میں ایرانی گوئٹے کا مقام دے دیا ہے۔" (زیرِ تبصرہ کتاب)

متعلقہ مرثیے" پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح" پر مقتدر مصنف کا محاکمہ پیشِ خدمت ہے۔

میر انیس نے سیکڑوں لفظ" سرخ رنگ" کو واضح کرنے کے لئے استعمال کئے ہیں۔ جن میں تراکیب اور محاورے بھی شامل ہیں: "لعل، لہو، خون، لال، سرخ رو، برق، پان کی لالی، زبانِ سرخ، دہن سرخ، بیڑا، بھبوکا، لالہ رنگ، یاقوت سرخ، یاقوتِ احمری، شفق، شفقی رنگ، وقتِ سحر، مرجان،، گلِ سرخ، گل رنگ، قصرِ یاقوت، گلِ خورشید، لختِ جگر، خون کی مہندی، خون کی شفق، گل گوں قبا، لالہ زار، گلنار، گلِ صد برگ کی لالی، لبِ لعل، گلِ زخم، خون کا دریا، سرخیِ شفق، لالہ زار صبح، گلِ ارغواں، گلاب، ورد، سرخی کے مد، سرخ ڈورے، آتش رنگ، نیر نگ، کسم، احمر، شاہانہ رنگ، شمع رنگ، شعلہ رنگ، شنگرفی، عنابی، شہابی، شرر، محاوروں کی فہرست آخر میں دی گئی ہے۔" (صفحہ نمبر ۱۳۷)

مرثیہ" پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زار صبح" حضرت قاسمؑ کی شہادت کے حال کا مرثیہ ہے۔ اس مرثیے میں میر انیس نے سرخ اور سبز رنگ بھرے ہیں، کہیں کہیں

سیاہ اور زرد اور پیلا رنگ بھی حسبِ ضرورت تصاویر میں بھر دیتے ہیں، تاکہ سرخی نمایاں ہو جائے۔ اس مرثیے میں سرخ رنگ کے استعارے کے لئے انھوں نے سرخ رنگ کے تلازمے مندرجہ ذیل قائم کئے ہیں:

"شفق، لالہ زار، گلاب، نورِ صبح، سرخ پھول، خون، لہو، عقیق، برگِ گل، روشنیِ آفتاب، گل بدنی، یمن، جلال، آفتاب، دستِ حنائی، اشکِ خوں، عروسِ اجل، شمعِ اجل، شمع، گل عذار، دلھن، رو، لعل لب، آبِ عقیق، لعلِ بدخشاں، تیرِ شہاب، گل گوں، قبا وغیرہ۔

(صفحہ نمبر ۱۴۴)

اب مقتدر مصنف کا اس مرثیے کے سلسلے میں قابلِ قدر رجحان ملاحظہ فرمایئے:

مطلع کے بند کے مصرعِ اولیٰ میں سرخ رنگ کے لئے دو لفظ موجود ہیں "شفق" اور "لالہ زار" ملاحظہ فرمایئے:

پھولا شفق سے چرخ پہ جب لالہ زارِ صبح

"بند نمبر ۱ کی بیت میں "سبز اور سرخ" کا امتزاج قابلِ قدر مصنف پیش کرتے ہیں: "چرخِ اخضری" یعنی سبز اور "گلاب" یعنی سرخ کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے:

تھا چرخِ اخضری پہ یہ رنگ آفتاب کا
کھلتا ہے جیسے پھول چمن میں گلاب کا

بند نمبر ۲ کی بیت میں "سبز" "سفید موتیوں" کا امتزاج ملاحظہ فرمایئے اور حسنِ بیان کی داد دیجئے۔

کھا کھا کے اوس اور بھی سبزہ ہرا ہوا
تھا موتیوں سے دامنِ صحرا بھرا ہوا

بند نمبر ۳ میں "نور صبح" سے "سرخ اور سبزہ زار" سے سبز رنگ ابھارا گیا ہے۔

ملاحظہ فرمایئے:

وہ نورِ صبح اور وہ صحرا، وہ سبزہ زار

قمری اور طاؤس کے رنگ:

کو کو وہ قمریوں کی، وہ طاؤس کی پکار

بند نمبر ۴ میں "آفتاب" سے سرخ اور "طاؤس" سے سبز رنگ کا استعارہ موجود ہے:

آمد وہ آفتاب کی، وہ صبح کا سماں

تھا جس کی ضو سے وجد میں طاؤس آسماں

زمین سرخ تھی:

ذروں کی روشنی پہ تاروں کا تھا گماں

آسمان سبز تھا:

روئے زمیں سے پست تھا چرخِ زبرجدی

سرخ زمین پر "زمردی" رنگ کا سبزہ کہہ کر رنگوں کا contrast کیا ہے:

کوسوں تھا سبزہ زار سے صحرا زمردی

میر انیس کو سبزے پر اصرار اس لیے ہے کہ وہ بتا سکیں کہ:

سبزہ ہرا تھا، خشک تھی کھیتی بتول کی

میر انیس تصاویر میں چند رنگوں کا اضافہ کرتے ہیں: سرخ، نیلا، (لاجوردی) سبز

اور زرد:

وہ پھولنا شفق کا، وہ مینائے لاجورد

قتل کی وہ گیاہ، وہ گل ہائے سرخ و زرد

سرخ اور زرد کا Contrast بیت میں موجود ہے۔

دھوتا تھا دل کے داغ چمن لالہ زار کا
سردی جگر کو دیتا تھا سبزہ کچھار کا

اور یہ سرخی روز قتل حسینؑ کی سرخی تھی:

تھا بس کہ روز قتل شہ آسماں جناب
نکلا تھا خوں ملے ہوئے چہرے پہ آفتاب

اس انداز نگارش کا کیا جواب ہے؟ سبحان اللہ! میر انیس لشکر یزیدی کی طرف نظر اُٹھا کر دیکھتے ہیں، یہاں تصویر میں سیاہ رنگ کی ضرورت ہے:

ہر سو جما رہا تھا صفیں شمر رو سیاہ

سفید رنگ کی ضرورت پڑ گئی، اب تلواروں کی چمک سے فائدہ اُٹھایا:

طوفان آب تیغ اُٹھا تھا فرات سے

اور لشکر یزید نواسۂ رسولؐ کا خون بہانے پر آمادہ ہے۔ "سرخ رنگ" کا استعارہ موجود ہے:

سینہ کبود، چاک گریباں، شکستہ حال

(سرخ رنگ) چونکہ امام حسینؑ یہ فرما رہے ہیں:

کھائیں گے تیر ظلم لہو میں بھریں گے ہم

جناب سکینہؑ کو اپنے بابا سے فرقت کا صدمہ ہے، امام حسینؑ بیٹی کو سمجھا دیتے ہیں (سرخ رنگ، عقیق، برگ گل):

صدقے عقیق لب پہ تیرے، فاطمہؑ کے لال!

ان برگِ گل سے ہونٹوں کے صدقے امام ہو

امام حسینؑ رخصت ہو کر خیمے سے باہر تشریف لاتے ہیں:

پھیلی زمیں پہ روشنیِ آفتابِ نور

اصحاب و انصار شہادت کو عید سمجھتے ہیں "شہادت اور عید" دونوں کا رنگ سرخ ہے:

کہتے تھے روزِ قتل ہمیں عید کا ہے دن

بند نمبر ۲۲ کا چوتھا مصرع میر انیسؔ کے اس رنگ سے جلدی ہی متعارف کروا دیتا ہے:

جرأت کا تھا یہ جوش کہ چہرے تھے لالہ رنگ

میر انیسؔ امام حسینؑ کے رشتے داروں کی مدح میں کہتے ہیں۔ دیکھئے! تصاویر میں سرخ رنگ موجود ہے:

ایک ایک رونقِ چمنستانِ روزگار

اب تو اس روش کا کوئی گل کھلا نہیں

سبز رنگ:

خلق و مروت حسنی ان پہ ختم تھی

سرخ رنگ:

سرخی تھی لب پہ گو کہ نہ پانی نصیب تھا
دیکھا جو غور سے تو یمن[1] بھی قریب تھا

پورا مرثیہ میر انیس کی ترئین رنگ کا عکاس ہے۔ چونکہ یہ مرثیہ حضرت قاسم کی شہادت کے بیان پر مشتمل ہے، اس لئے اس مرثیے میں حضرت قاسم کی روانگی،

نوٹ: یمن عقیق سرخ سے مشہور ہے اور سلیمان ندوی نے لکھا ہے یمن سرخ رنگ کو کہتے ہیں

میدان میں مبارز طلبی، ازرق کے لڑکوں اور ازرق سے جنگ، اور آخر میں حضرت قاسم کی شہادت، ہر شے کی کم و کاست عکاسی ہے اور سرخ اور سبز رنگ کی آمیزش اور ہر بیان سے متعلق ان کے ساتھ دیگر اور رنگوں کا بھی نہایت برمحل حسین اور برمحل استعمال بلاشبہ اس مرثیے میں سرخ رنگ کا استعارہ اپنی تمام و کمال تابانی کے ساتھ جلوہ فگن ہے۔

مقتدر مصنف کا اس مرثیے پر محاکمہ نہایت بسیط ہے، البتہ اس مرثیے کے ذیل میں اختتامی کلمات کے طور پر چند اقتباسات ملاحظہ فرمایئے اور حُسنِ بیان اور حُسنِ کلام کی داد دیجئے۔

"لشکرِ یزید نے حضرت قاسم پر حملہ کر دیا، حضرت قاسم کا جسم نازنین زخموں سے چور ہے۔ میر انیس اشک خوں بہاتے جاتے ہیں اور اس تصور میں سرخ رنگ کے مختلف شیڈ (Shade) ابھرتے جاتے ہیں:

منھ سرخ تھا، کھلے ہوئے تھے زخم سینے کے
بن کر لہو ٹپکتے تھے قطرے پسینے کے
تیورائے، سنبھلے، منھ سے لہو ڈالا، دم لیا

میر انیس کے یہاں رنگوں کا تناسب معجزہ ہے۔ مرثیے کا اختتام دیکھئے اور اس منظر کی سرخی دیکھئے:

بھاگڑ میں خوں سے رن کی زمیں لال ہو گئی
دولھا کی لاش گھوڑوں سے پامال ہو گئی

(سرخ)

سب چاند سے بدن پہ سموں کے نشان تھے

(سرخ)

ناگاہ لاش صحن تک آئی لہو میں تر

(سرخ)

حضرت قاسم کی دلہن لاش پر آئی ہے:

دولہا کہوں کہ قاسم گل گوں قبا کہوں

(سرخ)

مرثیہ اپنے تمام رنگوں کے امتزاج، تناسب اور تلازموں کے ساتھ ختم ہوا، لیکن

لکھے، انیس! خوب بہ سرعت یہ چند بند

اک جا ہے شیر و شکر و شہد و نبات و قند

یہاں بھی رنگ موجود ہیں:

"نبات (سبز رنگ) قند (سرخ رنگ)، شہد (زعفرانی رنگ)، شیر و شکر (سفید رنگ) میرانیس کے یہ رنگین دھارے اُردو کے چمن کو سیراب کرتے رہیں گے۔ اس کے کرم سے ہوگا یہ دریا کبھی نہ بند، کیوں؟

نہریں رواں ہیں فیض شہ مشرقین کی

پیاسو! پیو، سبیل ہے نذر حسینؑ کی

یہ رنگ آمیزی، رنگ آگاہی اور رنگوں کے امتزاج کی رنگین کہکشاں ہے جو پوری کتاب میں جاری وساری ہے۔ درج بالا پیش کش اس نادر بوقلمونی کی ایک معمولی سی جھلک تھی جو پیش کی گئی، الفاظ اس کی حسن آفرینی کے اظہار سے قاصر ہیں۔ رب

ذوالجلال عزیزی ضمیر اختر نقوی کے قلم کو مزید حُسن روانی اور اعجاز بخشے اور وہ اس طرح علم و ادب کی خدمت کرتے رہیں۔ راقم الحروف کی تو موصوف کے لئے یہی دعا ہے:

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

شمس الدین "شمس"

۲۹ر مارچ ۱۹۸۳ء.....(دادو۔سندھ)

آداب! آپ نے "جوش ملیح آبادی کے مرثیے" کے نام سے جو کتاب چھپوائی تھی وہ مجھ بدنصیب کو اب حاصل ہوئی ہے۔

میں خود شاعری کرتا ہوں اور وہ بھی نامکمل۔ کتنے تعجب کی بات ہے کہ ایک لڑکے کو شاعری کا بے حد شوق ہو اور وہ "جوش" جیسے عظیم شاعر کی کتاب کا مطالعہ کرنے سے بھی محروم رہا ہو۔

جوش کی شاعری میں وہ خودی پائی جاتی ہے جو کسی اور شاعر کے بس سے باہر ہے۔ خدارا آپ کے پاس جوش کی کوئی بھی کتاب ہو اور کتنی بھی ہوں مجھے وی۔پی پارسل روانہ کردیں۔ میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔

مجھے شاعری کا شوق کب سے ہے یہ تو مجھے بھی یاد نہیں بہر حال ردی فائلوں سے کچھ نہ کچھ مل جاتا ہے اور اُن کو مدِنظر رکھتے ہوئے میرا اندازہ ہے کہ میں آج سے تقریباً ۶ برس پہلے شاعری کا شوقین تھا اور آج بھی۔ میری عمر تقریباً ۱۹ برس ہے۔

مجھے امید ہے کہ آپ میری خواہش کو پورا کریں گے۔ میں بہت بہت شکر گزار رہوں گا آپ کا۔ فقط آپ کا دعا گو منتظر۔ شمس الدین "شمس"

کوثر الہ آبادی

اردو ادب میں رنگوں کے حوالے سے پہلی کتاب

آپ کی کتاب کا صوری حُسن تو لاجواب ہے ہی اس کے معنوی حسن کا کیا کہنا۔ میر انیس کے مرثیوں کی طرح پوری کتاب میں قوسِ قزح رنگ بکھیر رہی ہے۔ اور چاند ستارے ضوفشاں ہیں۔ کتاب کی جتنی تعریف کی جائے کم ہے۔ پوری کتاب میں میر انیس کی شاعری کے بیل کے ساتھ ساتھ آپ کا علم اور مختلف علوم میں آپ کا تفحص بھی جاری وساری ہے۔ آپ کا یہ فرمانا کہ یہ اردو زبان میں پہلی کتاب ہے، بالکل بجا ہے۔ آپ کو قدرت نے بلا کا حافظہ عطا فرمایا ہے اور آپ اس حافظے سے بہت ہی صحیح کام لے رہے ہیں۔ اگر آپ جیسے چند حضرات مجتمع ہو جائیں تو اردو میں صحیح معنوں میں انسائیکلوپیڈیا مرتب ہو جائے۔ موجودہ انسائیکلوپیڈیا تو اس لفظ کا مذاق ہے بہر حال فردِ واحد کر بھی کیا سکتا ہے۔

آپ نے لغت الوان جو تحریر فرمائی ہے وہ یقیناً اردو ادب میں قطعی نئی چیز ہے۔ اور شاعر حضرات اس سے بہت کچھ فیض حاصل کر سکتے ہیں۔ لیکن آج کے شاعر عموماً (اور مرثیہ گو خصوصاً) ناظم ہیں شاعر نہیں۔ وہ عقیدے کے گوشے نظم کرتے ہیں اور داد وصول کرتے ہیں۔ شاعری نہیں کرتے۔ البتہ چند مستثنیات ضرور ہیں۔

کلیم الدین احمد کے متعلق تو کسی نے بالکل صحیح کہا تھا کہ سوائے اپنے والد کے انھیں کسی اور کا کلام اچھا نہیں لگتا تھا۔ ایک بات بڑی عجیب ہے کہ آپ کے چہرے میں اور کتاب کے سرورق میں بڑی مماثلت ہے۔ ممکن ہے یہ صرف میرا خیال ہو۔ مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ خدا نے آپ کو مرثیے اور میر انیس کے لئے دنیا میں بھیجا ہے جس طرح مرزا غالب کے کلام کے ساتھ چند نام وابستہ ہیں اسی طرح میر انیس کے نام کے ساتھ بھی چند نام وابستہ ہیں ان میں آپ کا نام اضافے کی حیثیت رکھتا ہے۔ خدا آپ کو صحت مند اور تندرست رکھے۔

آپ کی کتاب میں بعض مقامات پر اشعار معروف الفاظ سے ہٹ کر لکھے گئے ہیں۔ مثلاً "قلم فکر سے کھینچوں جو کسی بزم کا رنگ" میں قلم کی جگہ قلزم لکھا ہے۔ اور چوں کہ اعادہ بھی ہے (صفحہ ۱۹۱ اور صفحہ ۱۰۸) اس لئے یہ محسوس ہوتا ہے آپ یہی صحیح سمجھتے ہیں۔ آپ کی حیثیت محقق کی ہے اور آئندہ اس کتاب کی حیثیت حوالہ ہوگی اس لئے برائے کرم یہ وضاحت فرما دیجئے کہ کتاب میں اشعار کی کتابت میں غلطی کا امکان کہاں تک سمجھا جائے۔ آپ میری اس جسارت کو معاف فرمایئے گا۔

آیت اللہ العظمیٰ حضرت الخوئی

(نجفِ اشرف)

"میں نے ضمیر اختر نقوی کی تمام تقریروں کے اقتباس سنے ہیں ذاکر پاکستان نے حروف مقطعات اور قرآن کی قسموں کے موضوع پر جو بیان کیا وہ معصومین کی تفاسیر کے عین مطابق ہے۔"

آلِ محمد رزمی

میر انیسؔ کی شاعری میں رنگوں کا استعمال

علّامہ ضمیر اختر نقوی اور انیسؔ شناسی

ایک مبتدی سخن کا خدائے سخن میر ببر علی انیسؔ کے بارے میں لب کشائی چھوٹا منہ اور بڑی بات ہے۔ جب شاعرِ آخر الزماں حضرت جوش ملیح آبادی رضوان اللہ تعالیٰ جیسے شاعرِ اعظم بارگاہِ انیس میں رطب اللساں ہوں اور اس طرح خلوصِ دل کا خراج ادا کر رہے ہوں کہ اے انیس! اے کشتیٔ فصاحت کے ناخدا! اے قلزمِ بلاغت کے عظیم شناور! اے نطقِ انسانی کے ناز! اے خوش لہجگی کے افتخار! اے ابلاغ کی آبرو اور اے زمزمۂ سخن کی صدائے بازگشت! اے جذبات کے مصور، خیالات کے مجسمہ ساز اور آواز کو آنکھوں سے دکھا دینے والے فنکار! اے انیس! اے بزم گاہ و آبِ شبنم و گل والا! اے جنگاہ میں تاب شعلۂ جوالہ! اے آسمانِ طرزِ بیاں کے مہرِ نیم روز! اے حق و باطل کے نقاد! اے سیف و قلم کے نباض"...... اردو شاعری کے آخری تاجدار کے نذرانۂ عقیدت سے صرف چند لفظ میں نے آپ کی نذر کیئے ہیں۔ میرا موضوع سخن خدائے سخن نہیں بلکہ علامہ سید ضمیر اختر نقوی اور ان کی انیس شناسی ہے۔

علامہ سید ضمیر اختر نقوی، میر انیس کی فکری تخلیقات کی روح میں اتر کر ان پیام کو سمجھنے اور سمجھانے اور ان کی عظمت کو منوانے کی کوشش میں ہمیشہ ہمہ تن مصروف رہے

ہیں۔ ان کی حالیہ کتاب "میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال" اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کتاب کو لندن کے حلقۂ اہلِ نظر نے اتنا سراہا کہ علامہ ضمیر اختر نقوی کی مجموعی ادبی، مذہبی اور قومی خدمات پر انجمن فروغ عزا لندن نے آپ کو انعام برائے نمایاں خدمات ۱۹۹۹ء اتوار ۲۸ نومبر ۱۹۹۹ء کو کامن ویلتھ انسٹیٹیوٹ لندن میں دیا۔ علامہ ضمیر اختر نقوی کو اندرون و بیرون ملک پڑھنے والوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہو رہا ہے۔ خصوصاً میر انیس کے حوالے سے ان کی رشحات خاصی مقبول ہوئیں اور جس طرح میر انیس نے اُردو ادب و زبان کی کمیت و کیفیت میں اپنی شاعری سے قابلِ قدر اضافہ کیا ہے، اسی طرح علامہ سید ضمیر اختر نقوی نے اپنی تحریر و تقریر، اپنی فکر اور تحقیق کے ذریعے انیس شناسی میں نئے رجحانات کا اضافہ کیا۔

علامہ کی خطیبانہ صلاحیت و استعداد، مہارت و انفرادیت، سلاست و روانی، زبان و بیان، ادبی چاشنی و تاریخی رجحانات، اقتباسات، موضوعات و مقصدیت کے ضمن میں ان کے مجموعۂ مجالس "معجزہ اور قرآن" میں اپنی ناچیز رائے کا اظہار کر چکا ہوں۔ یہاں ان کی کتاب "میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال" کے حوالے سے گفتگو مقصود ہے۔ مرثیے میں رنگوں کے استعمال میں میر انیس کو بدرجہ کمال قدرت حاصل ہے۔ تشبیہ اور استعاروں کے ذریعے میر انیس نے اپنی شاعری میں رنگوں کا استعمال اس طرح کیا ہے کہ کہیں بھی ان کا شعر صنعتِ مبالغہ کی حدود سے باہر نہیں ہے۔ سید ضمیر اختر نقوی نے میر انیس کی شاعری میں رنگوں کے استعمال کو جس تاثریت کے ساتھ ہمارے سامنے پیش کیا ہے، اس سے میر انیس کی عظمت و وقار اور (Un-limited) ہو گئی ہے۔ میر انیس کی شاعری میں جذبات نگاری، جزئیات نگاری، رزم نگاری، منظر نگاری، کردار نگاری، روایت نگاری اور واقعہ نگاری کی طرح

رنگ نگاری بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے، بات صرف تلاش و تحقیق کی تھی۔ اب اس خوش قسمتی کا کیا جائے کہ ازل سے تخلیق کے قلم نے یہ کارنامہ علامہ ضمیر اختر نقوی کے نام لکھ دیا تھا، میر انیس کی شاعری ہر دور میں حلقۂ اہلِ نظر سے ازسرِ نو مطالعے کا مطالبہ کرتی رہی ہے۔ انیس کے شعوری مطالعے اور تفکر و تفحص اور ژرف بینی سے تحقیق کے نتیجے میں محققین کی بصیرت و صلاحیت کے مطابق ان کی شاعرانہ خصوصیات کے کسی نہ کسی گوشے سے پردہ ضرور اُٹھے گا، بشرطیکہ قاری کھوجتی ہوئی نگاہ اور سوچتے ہوئے ذہن کا مالک ہو۔ انیس کی شاعری کے بہت سے پہلو ہمارے سامنے آچکے ہیں، لیکن ابھی بے شمار پہلو اہلِ نظر کی نگاہوں سے اوجھل ہیں۔ شاید زمانے کے پیچ و خم نے انیس شناسوں کو ابھی موقع نہیں دیا کہ وہ انیس کے شاعرانہ محاسن تک کما حقہ Approch کرسکیں۔

علامہ سید ضمیر اختر نقوی گزشتہ ربع صدی بلکہ اس سے بھی زائد عرصے سے مذہبی، علمی، ادبی اور تحقیقی کاموں میں مصروف ہیں اور انہوں نے مختلف موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے اور اس میں شک نہیں کہ ہر میدان میں ان کی رائے متوازن اور بصیرت آمیز ہے۔ ہوسکتا ہے کہ کچھ لوگوں کو میری اس رائے سے اتفاق نہ ہو، لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک مصروف انسان ہیں اور کچھ نہ کچھ لکھتے اور دوسروں سے لکھواتے رہتے ہیں۔ اب تک ان کی متعدد کتابیں تصنیف، تالیف اور ترتیب کے مرحلے سے گزر چکی ہیں اور نامکمل کاموں کا اچھا خاصا ذخیرہ موجود ہے۔ ان کا قلم برابر لکھنے میں مصروف ہے۔ ان کی تحریر میں جذبہ بھی ہے، فکر بھی، خود اعتمادی بھی ہے، فن کی تہذیب و ترتیب بھی، اس کے علاوہ لکھنؤ کا ستھرا ادبی ذوق بھی پوری توانائیوں اور رعنائیوں کے ساتھ موجود ہے۔ جس طرح میر انیس نے اپنی شاعری کے اس رُخ کو بڑی ندرت اور سلیقے

سے پیش کیا ہے، اسی طرح ضمیر اختر نے میر انیس کی شاعری کے اس رُخ کو بڑی خوش اسلوبی و متانت سے پیش کیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ انیس اپنے ساتھ رنگوں کا ایک سیل و نور لیے ہوئے ہیں اور ضمیر اختر نقوی اس سیل و نور سے اپنے مشام فکر کو منور کر کے فکرِ انیس کا تبرک پڑھنے اور سننے والوں میں تقسیم کر رہے ہوں۔ جو ان کے ذاتی ذوق، فکری رجحانات و انیس شناسی کا عکاس ہے۔

جذبات نگاری، منظر نگاری کے علاوہ رنگوں کے استعمال کے شعور کو بھی اُردو ادب میں میر انیس ہی نے زندہ کیا ہے۔ اُردو کے دوسرے شعرا کے یہاں بھی یہ رجحان و شعور ملتا ہے، مگر اتنی آب و تاب و توانائی کے ساتھ نہیں ملتا۔ انیس سے پہلے فطرت کی منظر نگاری اُردو میں نہ اتنی وسیع و کشادہ تھی نہ کربلا والوں کے کرداروں کی تصویریں اور نہ سرزمین کربلا کے مناظر میں اتنے رنگ کسی نے پیش کیے۔ رنگ نگاری انیس کی شاعری کا وہ غیر محسوس عمل تھا جس پر ماہرین انیسیات نے کبھی اس رُخ سے نہیں سوچا، جس طرح ضمیر اختر نقوی نے سوچا۔ ان کے رسا ذہن نے نہ صرف سوچا بلکہ اپنی فکر کو ضابطۂ تحریر میں لا کر ایک ضخیم کتاب کی شکل دے دی۔ یہ ان کی تلاش، ان کی جستجو اور ان کی تحقیق ہے اور سراہے جانے کے قابل ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی نے پوری دیانت داری اور خلوص سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ جب اُردو شاعری اپنی فنی بلندی اور پیغمبرانہ دل سوزی سے محروم ہو گئی تھی تو میر انیس نے غیر معمولی بلند نگاہی اور خلوص اور لگن سے اس کو پھر اس کے اصل منصب کا اہل بنا دیا تھا۔ دنیائے ادب کے سکہ بند تنقید نگار نہ انہیں شاعری کو مذہبی شاعری کہہ کر نظر انداز کرنے میں کامیاب ہو سکتے ہیں، نہ انہیں عقیدے کے دائرے میں محدود کر کے انہیں کسی خاص فرقے یا Ideology کا شاعر کہہ کر اپنا دامن بچا

سکتے ہیں اور نہ ان کی شاعری پر کسی مخصوص موضوع کا لیبل لگایا جا سکتا ہے۔ انیس ایک آفاقی شاعر ہیں، ان کی شاعری کائنات پر محیط ہے۔ ان کی شاعری کی مختلف جہتیں ہیں، ان جہتوں میں نئے موضوعات ہیں، ان موضوعات کی علیحدہ علیحدہ قدر و قیمت ہے۔ اس کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے یا فیصلہ کرنے کے لئے صدیاں درکار ہیں۔ انیس کی شاعری ڈیڑھ صدی سے زائد عرصے پر محیط ہے جو دنیائے ادب کے لئے مسلسل پیغام ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میر انیس کی شاعری واقعات کربلا کے گرد طواف کرتی ہے، لیکن جس طرح لوگ کربلا کو ایک درگاہ کے بجائے قتل گاہ سمجھتے رہے اور کربلا کے آفاقی پیغام و انقلاب عاشورہ کی روح کو سمجھنے سے قاصر رہے، اسی طرح کربلا کے پیغامبر میر انیسؔ کی آفاقی شاعری کو بھی سمجھنا دشوار اور تنگ نظری کا شکار ہے۔

سید ضمیر اختر نقوی انیس کی شاعری کے مختلف گوشوں کو گاہ و بیگاہ اُجاگر کرتے رہتے ہیں، ورنہ اُردو ادب میں تنہا ان کا Contribution ایک ادارے کے برابر ہے۔ ذات واجب ان کی توفیقات میں اضافہ فرمائے!

تقی سجاد عابدی

محترم و معظم و مکرم سید ضمیر اختر صاحب۔ سلام علیکم!

"مزاج گرامی امید کہ بفیض پروردگار، بوسیلۂ آل اطہار انشاءاللہ بخیر ہوگا۔

آپ سے بالمشافہ کوئی تعارف نہیں ہے البتہ بلاواسطہ آپ کی تحریروں سے یقیناً رہا ہے اور وہ بھی بواسطہ محمدؐ و آل محمدؐ۔ اور ملتمس ہوں "آل یٰسین" سے کہ جبین تحقیق سے تدبر کا سورج اسی طرح طلوع کرتا رہے اور عالم قرطاس و قلم کو منور کرتا رہے۔ آپ کی تحقیق و تخلیق "اردو غزل اور کربلا" زیب نظر ہوئی۔ یقیناً یہ صحیفۂ تحقیق ہے جو سینۂ عصر پر نازل ہوا ہے۔ اور اردو ادب کی جدید جہتوں کی جانب رہبری کرتا ہے"۔

محمد عباس نقوی:

رنگوں کے حوالے سے ایک گراں قدر تحقیق

علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب اور میر انیس اب لازم و ملزوم قرار پا چکے ہیں، یعنی اگر میر انیس کا ذکر کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ نہ صرف کراچی بلکہ پاکستان اور برصغیر میں ڈاکٹر صاحب کا نام نہ لیا جائے، اور اسی طرح اگر ڈاکٹر صاحب کہیں، کسی بھی موضوع پر تقریر فرما رہے ہوں تو میر انیس کا ذکر کے بغیر انہیں خود اپنی تقریر پھیکی محسوس ہوتی ہے۔ فی الوقت ہم "میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال" کا تعارف پیش کر رہے ہیں۔ اس کتاب کا آغاز "نذرِ انیس" کے زیرِ عنوان علامہ صاحب کے ایک گرانقدر مقالے سے ہوتا ہے، جس میں تادمِ اشاعت (۱۹۹۹) میر انیس کا ذکر کرنے والے تمام لکھاریوں بالترتیب نقاد و ادیب، شعراء، علماء و مجتہدین، ماہرینِ تعلیم، محققین، ہندو ادباء، ناول نگار حضرات کے علاوہ رسائل و جرائد، خصوصی نمبر، اخباروں کے خصوصی شمارے اور ان کے مدیران کے اسمائے گرامی تحقیق کئے گئے ہیں۔

اس کے بعد فرانسیسی دانشور "گارساں دتاسی"، یورپی ادیب "گراہم بیلی"، امریکی دانشور "رچرڈ کیوڈین" اور انگلستان کے ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کی خدمات کو سراہا گیا ہے۔ اسی مقالے کے اختتام پر فاضل محقق نے میر انیس کے یہاں لفظی مصوری کی مثال میں "حضرت عباس" کا سراپا نظم کرنے کی ایک مثال کے لئے دو مصرعے پیش کئے ہیں کہ۔

ڈورے جو سرخ سرخ ہیں چشمِ سیاہ میں
پھرتی ہیں خوں بھری ہوئی تیغیں نگاہ میں

زیر نظر کتاب میں جہاں میر انیسؔ کے کلام میں جا بجا بکھرے رنگوں کو باقاعدہ ترتیب دی گئی ہے، وہیں "لغت الالوان" کے عنوان سے رنگوں کی ایک لغت بھی مرتب کی گئی ہے جو اردو ادب میں رنگوں کے حوالے سے کی گئی ایک گراں قدر تحقیق کہلانے کی مستحق ہے۔ اس کے علاوہ بین السطور جگہ جگہ نہ صرف میر انیسؔ پر کم نظروں کے ادبی اعتراضات کا ازالہ کیا گیا ہے بلکہ اسلام اور مسلمانوں کے رسم و رواج سے متعلق لاتعداد شکوک و شبہات رفع کئے گئے ہیں اور اکثر جگہ ناقدین کو منہ توڑ جواب فراہم کیا گیا ہے۔

علامہ صاحب چونکہ قرآن، تاریخ، مذہب ادب تمام شعبوں پر قادر ہیں لہٰذہ کتاب میں جہاں جہاں ضرورت محسوس ہوئی وہاں استدلال کے طور پر قرآنی آیات کے ساتھ ساتھ سائنسی علوم بشمول طبیعات، فلکیات، علم الالوان پر دنیا بھر کے محققین و دانشور حضرات کی آراء بھی حوالے کے طور پر پیش کی گئی ہیں اور ساتھ عہد حاضر کے محققین و دانشور حضرات کی تحقیق کو میر انیسؔ کے کلام پر پرکھتے ہوئے تعریف یا تصحیح بھی فرمائی گئی ہے، مثلاً میر انیسؔ کے کلام میں "سانولے" رنگ کی نشاندہی کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ ڈاکٹر ڈیوڈ میتھیوز کے یہاں تمام جگہوں پر "سانولے" کے لئے Black استعمال کیا گیا ہے جبکہ جہاں انہوں نے "کالے" کا ترجمہ کیا ہے وہاں بھی لفظ Black ہی استعمال کیا گیا ہے، گویا کالا اور سانولا دونوں ایک معنوں میں استعمال ہو رہے ہیں، اس مقام پر میر انیسؔ کے ہی دو مصرعوں سے سند فراہم کی گئی ہے کہ "سانولے" رنگ کے لئے Black نہیں استعمال کیا جا سکتا کیوں کہ میر انیسؔ کہتے ہیں کہ

اللہ رے لڑائی میں شوکت جناب کی
سوکھلائے رنگ میں تھی ضیاء آفتاب کی

یہ اور اسی قسم کے کئی مندرجات جگہ جگہ بکھرے نظر آتے ہیں۔ زیر نظر کتاب ایک محقق کے لئے حوالہ، ادیب کے لئے موضوع، شاعر کے لئے رہنمائی اور عام قاری کو انیس سے رغبت فراہم کرنے کے علاوہ بھی دیگر فنون بشمول مصوری و خطاطی اور الیکٹرانک میڈیا وغیرہ کے لئے انیس پسندی کا موجب ثابت ہو سکے گی، کیوں کہ الیکٹرانک میڈیا کا بنیادی عنصر بھی رنگ ہی ہے اور میر انیس کا کمال یہ ہے کہ ان کے کلام میں بنیادی رنگوں کے مختلف شیڈز کو نہایت مہارت کے ساتھ منعکس کیا گیا ہے، میر انیس کا تو یہ عالم ہے کہ

جسے دیکھ کر ہووے مانی کو حیرت
وہ تصویر رنگیں یہاں کھینچتے ہیں

(ندائے حق کراچی — یکم فروری ۲۰۰۳ء)

سید کاشف رضا زیدی

۳۱ اکتوبر ۲۰۰۰ء

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب... آداب عرض!

میں آپ کی ہر تقریر سنتا ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ آپ جیسا خطیب پورے برصغیر میں نہیں ہے۔ میں ایک طالب علم ہوں میرے وسائل محدود ہیں۔ کل آپ نے منبر پر اپنے عنوانات کا تذکرہ کیا جسے سن کر میرے دل میں خواہش پیدا ہوئی کہ میں ان عنوانوں کی کیسٹس لے سکوں۔ لیکن جب میں نے ان کی قیمت معلوم کی تو میرے پیروں سے زمین نکل گئی۔ علامہ صاحب میرے جیسے نوجوان کس طرح آپ کے علم سے استفادہ حاصل کریں۔ نہ تو ہم آپ کی کتابیں خرید سکتے۔ کیونکہ ان کی قیمتیں حضرت عیسیٰ سے باتیں کر رہی ہیں۔ برائے مہربانی ہم غریب لوگوں کا خیال کریں۔ علم کی طلب رکھنا اور حاصل کرنا کوئی گناہ تو نہیں ہے۔ امید کرتا ہوں کہ کسی کو میری اس بات سے اختلاف نہیں ہوگا کیونکہ میں حق پر ہوں۔ برائے مہربانی میری تحریر پر ذرا سا غور کریں۔ میں مرد مومن نہیں ہوں۔ فقط آپ کا چاہنے والا اور اہل بیت کا غلام... سید کاشف رضا زیدی

حافظ قرآن سید دلدار علی نقوی (عمر ۱۳ سال)

نبیرۂ غفرانمآب شاگرد علامہ صاحب

چراغِ راہ

ضمیر ہم کو تو انساں دکھائی دیتا ہے — زمیں پہ نیر تاباں دکھائی دیتا ہے

انیس جیسی ہی ان کی یہ شکل و صورت ہے — وہی ادا ہے وہی خو وہی بصیرت ہے

ذر قرأت وحدت کا نغمہ خواں کیسے — عصائے پیر ہے پر تیغ نوجواں کیسے

خدا کا قہر ہے مولا کے دشمنوں کے لیے — چراغِ راہ ہے لاریب مومنوں کے لیے

غمِ سلوکِ یزیدی بہت جو سہتا ہے — حدیثِ گلِ اقبال میں یہ رہتا ہے

تلاشِ حق میں گزرتا ہے سارا وقت یہاں — کہاں کہاں نہیں ڈھونڈے نعیم بدبختاں

کتابیں چھپائی ہیں برسوں میں جستجو کر کے — لیا ہے نام اماماں تو وضو کر کے

دہن سے پھول جھڑے ہیں یا خوش گوار چلی — کبھی یہ کہتے ہیں منبر پہ ذوالفقار چلی

دلِ یزید کو جھلسا دیا شرارے سے — پلٹ دیا دلِ کافر کو اک اشارے سے

ضمیر اختر عالم ذاکرو کا پسر — ہمارے واسطے منبر پہ گوندھتا ہے گہر

۱؎ علی کا دل ہے جو شاگرد ضمیر اختر کا

یہ ایک فرد ہے غفرانمآب کے گھر کا

۱؎ دلدار علی.... خاندانِ غفرانمآب

٥٩٣
تالیف و تدوین

سید حسن کاظمی

تحقیق کے جھرنے

وقت کی آنچ سے نکھرا ہوا نگینہ ہیں اختر
تحقیق کے جھرنوں سے ابھرتا ہوا آبگینہ ہیں اختر
معرفتِ آلِ محمدؐ سے ہے شاداب غنچۂ دل ان کا
پہنچادے جو بامِ آلِ عبا تک وہ زینہ ہیں اختر

نیرؔ مجیدی لکھنوی

علم کی اِک انجمن

صدقے میں پنجتنؑ کے زمانے میں، اے ضمیرؔ!
ہے تیرا نام علم کی اک انجمن کا نام
شاہِ زمن کا نام مٹائے گا کیا کوئی
مٹتا نہیں ہے ذاکرِ شاہِ زمن کا نام

❀❀❀

جوش ملیح آبادی کے مرثیے

ضمیر اختر نقوی

maablib.org

سیّد ہاشم رضا (سابق گورنر مشرقی پاکستان)

اُردو ادب کی گراں بہا خدمت

آپ نے ہمارے دور کے سب سے بڑے شاعر جناب جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے ترتیب دے کر اردو ادب کی گراں بہا خدمت کی ہے، آپ کی تحقیق اور محنت دونوں قابلِ داد ہیں، جو بھی جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے پڑھے گا وہ ان کو اور آپ کو دعائیں دے گا۔ آپ نے صفحہ ۸ پر جوشؔ کی وہ نظم شائع کر کے جس میں مجھ حقیر پر تقصیر کا ذکر ہے میری بڑی عزت افزائی کی ہے، جس کے لئے میں تہہ دل سے آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں۔ جوشؔ کی وہ رباعی جس کے دو مصرعے آپ نے تیسرے صفحے پر لکھے ہیں:

کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسینؑ چرخِ نوعِ بشر کے تارے ہیں حسینؑ
انسان کو بیدار تو ہو لینے دو ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسینؑ

اسی طرح زباں زدِ عوام اور شہرتِ دوام کی حامل ہے جس طرح خواجہ اجمیری حضرت معین الدین چشتی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کی یہ رباعی:

شاہ ہست حسینؑ بادشاہ ہست حسینؑ دیں ہست حسینؑ دیں پناہ ہست حسینؑ
سرداد نہ داد دست در دستِ یزید حقا کہ بنائے لا الٰہ ہست حسینؑ

اگر جوشؔ امام عالی مقام کی مدح میں صرف ایک یہی رباعی کہتے تو یہ ان کی شاعرانہ عظمت کے لئے کافی تھی۔

ہمارے دور کے مرثیہ گویوں میں جنہوں نے دورِ حال کے تقاضوں کو پورا کیا ان

میں جوش کے مرثیے سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمارے دور میں ایسے باکمال مرثیہ گو منظرِ عام پر آئے جیسے جناب نجم آفندی، جناب سیّد آلِ رضا، جناب نسیم امروہوی اور جناب جمیل مظہری، ان حضرات کے علاوہ ہمارے اسی دور میں ایسے متعدد مرثیہ گو ہیں جو ہر سال جدید طرز کے مرثیے کہہ کر مرثیے کی مقبولیت اور افادیت میں اضافہ کر رہے ہیں۔ جوشؔ کی رباعی کے بعد بہت سے ہندو شعرا نے امام عالی مقام کو خراج عقیدت پیش کیا۔ نرائن داس طالب پانی پتی نے کیا خوب کہا:

یہ تو بجا ہے مسلمانو! تمہارے ہیں حسینؑ ہم کو بھی لیکن یہ کہنے دو ہمارے ہیں حسینؑ

روشنی قائم ہے جس کی وہ ستارے ہیں حسینؑ عالمِ انسانیت میں سب کے پیارے ہیں حسینؑ

یہ نہ سمجھو قلزم ابنِ علیؑ پایاب ہے

یہ وہ دریا ہے جس سے کل جہاں سیراب ہے

گوپی ناتھ امن لکھنوی کا شعر ہے۔

ایک ہندو کے تصور کا یہ جوہر دیکھنا

دل کے آئینے میں ہے تصویرِ سرورؑ دیکھنا

کنور مہندر سنگھ سحر نے جو کہا اُسے سہلِ ممتنع کہنا چاہیے۔

زندہ اسلام کو کیا تو نے حق و باطل دکھا دیا تو نے

جی کے مرنا تو سب کو آتا ہے مر کے جینا سکھا دیا تو نے

منشی بشیشور پرشاد لکھنوی:

توحید کے آئین جہانگیر نہ ہوتے

ممتاز شہادت سے جو شبیرؑ نہ ہوتے

رام پرکاش ساحر:

ہے حق و صداقت میرا مسلک ساحر
ہندو بھی ہوں، شبیر کا شیدائی بھی

باوا کرشن گوپال مغموم:

تازہ کر دیتا ہے ہر ماہِ محرم ان کی یاد
کرتے ہیں اہل عقیدت ان کا ماتم ان کی یاد
غیر مسلم ہیں شریک غم مسلمانوں کے ساتھ
آج ہمدردی ہے انسانوں کو انسانوں کے ساتھ

آنند نرائن ڈانگر امروہوی:

اب اس عقیدت حسن آفریں کو کیا کہیے
حسین لکھتا ہوں لیکن حسینؑ پڑھتا ہوں

بلونت کمار ساغر:

سر کو جھکا رہا ہوں مزار حسینؑ پر
ساغر میں صدق دل سے ہوں بندہ حسینؑ کا

رام بہاری لال صبا جے پوری کا قطعہ ہے:

اے حسینؑ ابن علیؑ اے جان جان مصطفیٰ
کرتے ہیں تعظیم تیری رتبہ دان مصطفیٰ
کربلا میں اک بہانہ تھے حسینؑ ابن علیؑ
لینے والے نے لیا تھا امتحان مصطفیٰ

صبا جے پوری نے مرزا اسد اللہ خاں غالب اعلی اللہ مقامہ کے اس شعر سے استفادہ کیا جس میں مرزا غالب خداوند عالم سے سوال کرتے ہیں:۔

یا تو دادی مصطفےٰ را فارغ از رنج حسینؑ
یا تو خواہی زیں مصیبت امتحان مصطفےٰ

جوش ملیح آبادی کے سارے مرثیے آبشار کی مانند ہیں، جس کی گڑگڑاہٹ دلوں میں حرارت پیدا کرتی ہے۔

اس خوانِ نعمیٰ کی طرح ہیں جس کی خوشبو مشامِ جاں کو معطر کرتی ہے، اس تابندہ تاج کے ہم پلہ ہیں جس کی جگمگاہٹ نگاہوں کو خیرہ کرتی ہے اور جس کی زیبائش پر یہ مصرعہ صادق آتا ہے:

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

اللہ نے جوش کو طالعِ سکندری تو عطا کیا ہے میری دعا ہے کہ انہیں عمرِ خضری بھی عطا ہو۔

سید محمد عباس صادق جعفری:

قطعہ تاریخ ولادت

(جناب علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب)

گوندھا گیا مودتِ شبیر سے جو، یہ خمیر
رب نے بھیجا مرثیے کا اس کو، بنا کر سفیر
خونِ دل سے اس نے سینچا مرثیے کو اس طرح
"رہی آلِ عبا سے منسلک، اس کی روحِ باضمیر"

۱۹۴۷ء

پروفیسر سردار نقوی

ادبی جہاد

"جوش ملیح آبادی کے مرثیے"

"جوش ملیح آبادی کے مرثیے" جنہیں ضمیر اختر نقوی نے مرتب کیا ہے، ادارہ فیض ادب ناظم آباد کراچی نے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ کتاب جوش ملیح آبادی کے آٹھ مکمل مرثیوں اور ایک مرثیے کے تیرہ بندوں پر مشتمل ہے۔ مکمل مرثیوں کے عنوان یہ ہیں، آوازۂ حق، حسین اور انقلاب، موجد و مفکر، وحدت انسانی، طلوع فکر، عظمت انسان (قلم) موت محمدؐ و آل محمدؐ کی نظر میں اور پانی۔ نویں مرثیے کا عنوان آگ ہے اور اس کے ابتدائی ۱۳ بند شامل کتاب ہیں۔ مرثیوں کے علاوہ جوش صاحب کی رباعیات اور سلام بھی متن کتاب میں شامل ہیں۔ کتاب کا اصل متن ۲۶۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ شروع میں جناب ضمیر اختر نقوی کا لکھا ہوا پیش لفظ اور جوش کی مرثیہ نگاری پر مقدمہ اور آخر میں فرہنگ مراثی جوش کی شمولیت کتاب کی افادیت اور قدر و قیمت میں اضافے کا سبب ہے۔ کل کتاب ۳۲۰ صفحات پر مشتمل ہے، جسے عمدہ سفید کاغذ پر چھاپا گیا ہے، طباعت روشن اور کتابت واضح ہے۔ کتابت کی غلطیاں جن کی شکایت اردو کی بیشتر کتابوں میں پائی جاتی ہے، اگرچہ بہت زیادہ نہیں ہیں مگر ہمیں امید ہے کہ آئندہ ایڈیشن میں ان غلطیوں کی اصلاح کی طرف توجہ دی جائے گی۔ کتاب کی

قیمت ۲۵ روپے ہے۔

یہ بات کسی سے پوشیدہ نہیں کہ مرثیہ خاص اردو ادب کی چیز ہے۔ دنیا کی دیگر زبانوں کا رثائی ادب اردو مرثیے کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اردو کا مرثیہ برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ و ثقافت کا آئینہ دار ہے۔ مسلم تہذیب و ثقافت کی جیسی بھرپور عکاسی مرثیے میں ملتی ہے، اس کا دوسری اصناف ادب مقابلہ نہیں کرسکتیں۔ اسلام میں زندگی کا مقصد عبادت ہے اور عبادت کا کمال شہادت قرب الٰہی کے حصول کا قرینہ، اسی لئے شمشیر کا عریاں ہونا اہل تمنا کے لئے عید نظارہ ہے۔ زندہ کی حقیقت اور اس کی معرفت کا تقاضا یا اعلان ہے کہ:

جان دی ، دی ہوئی اسی کی تھی
حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کربلا شہادت کا وہ مکمل اور مفصل نمونہ ہے جو وقت کے ہر موڑ پر لوگوں کو یہ بھولا ہوا سبق یاد دلاتا رہتا ہے کہ حق کی راہ میں جان دینا عزت کی موت ہے اور باطل کے ساتھ زندہ رہنا ذلت کی زندگی ہے، اور انسان کا شرف یہ ہے کہ وہ عزت کی موت کو ذلت کی زندگی پر ترجیح دے۔ اسلام میں شہادت زندگی کا وہ کمال ہے جہاں حیات و موت کی دوئی مٹ جاتی ہے اور وہ منزل ہے جہاں انسان کے دل سے موت کا ڈر نکل جاتا ہے اور جب انسان موت کے خوف سے بے نیاز ہو جاتا ہے تو پھر وہ کسی فرعون یا یزید کی حکومت یا طاقت سے ہرگز مرعوب نہیں ہوسکتا۔

پھر وہ حق کی راہ میں جیتا ہے، حق کے لئے جیتا ہے بلکہ خود حق بن کر زندہ رہتا ہے اور حق کی راہ میں جان دینے کو اپنی زندگی کی معراج سمجھتا ہے۔ حق سے یہی محبت اس کے اندر ذوق عمل اور جوش کردار کو اجاگر کرتی ہے۔ ایسے انسان کا ہر عمل باطل کا انکار

بن جاتا ہے۔ امام حسین علیہ السلام نے صرف زبانی طور پر بیعت یزید سے انکار نہیں کیا، بلکہ ان کا ہر عمل، ان کی ہر حرکت، ان کا ہر سکون، ان کی گویائی، ان کی خاموشی، باطل کا انکار اور حق کا اثبات تھی، انہیں نے اپنے ذمے یہ عظیم فرض لیا تھا کہ وہ نا مساعد حالات میں مسلمانوں کے لئے زندگی کا نمونہ بن جائیں، وہ اثم و عدوان سے عدم تعاون کا مثالی معیار قائم کردیں وہ باطل کے مقابلے میں حق کی حمایت و حفاظت کرنے کا طریقہ اجاگر کردیں، وہ زندگی کے اس نئے افق کو اجاگر کردیں، جس کی سرخی خون شہید کے خون سے جلا پاتی ہے، اردو مرثیہ حیات و موت کے اسی تصور کی فن کارانہ پیش کش سے عبارت ہے۔ اس لحاظ سے اردو مرثیہ لوگوں کو زندگی سے دور نہیں لے جاتا، بلکہ وہ حقیقی زندگی کے مفہوم سے متعارف کراتا ہے۔ اردو مرثیہ زندگی اور کشمکش زندگی سے گریز کی تعلیم نہیں دیتا بلکہ وہ کشمکش حیات میں باطل سے انکار اور حق کے اثبات کی جرأت کو ابھارنے کا ذریعہ ہے۔

جوش ملیح آبادی جن کی فن کارانہ عظمت سے انکار خود اپنی ادبی جہالت کا اقرار ہے، وہ حسینیت کی اسی زندگی آمیز اور زندگی آموز فکر کے بہت بڑے مبلغ ہیں۔ وہ مرثیہ معروف معنی میں اپنے آپ کو مرثیہ گو کہلوانا پسند نہیں کرتے اور اپنی تخلیقات کو مرثیے کہے جانے سے [illegible] زیادہ سہولت محسوس کرتے ہیں، لیکن "ارشاد" کے محرم نمبر میں [illegible] کے مضمون کے جواب میں جو خط انہوں نے لکھا ہے اور جس کو [illegible] ہے اس میں انہوں نے اپنی مرثیہ گوئی اور اپنے مرثیوں کے خود [illegible] کئے ہیں۔ جوش کی مرثیہ نگاری پر [illegible] مضمون [illegible] ہے [illegible] جوش صاحب کے خیالات اس طرح نقل کئے گئے ہیں:

[illegible]

اور آہوں کا کام لیا گیا ہے اور کسی ایک مرثیہ گو نے بھی اس جانب
توجہ مبذول نہیں کی ہے کہ حسینؑ کے کردار کو پیش کر کے مومنین کو یہ
سبق دے کہ دیکھو، اگر تم حسینیؑ ہو تو خبردار! باطل کی طاقت کے
سامنے کبھی سر نہ جھکانا اور فرماں روایانِ دہر کو خاطر میں نہ لانا۔"

جناب جوش نے اپنے اس بیان میں بلا تخصیص ہر مرثیہ گو کو جس اعتراض کا مورد ٹھہرایا ہے، وہ محلِ نظر ہے۔ جناب ضمیر اختر نقوی نے اپنے مضمون میں دو، تین وضاحتی جملوں میں اس اعتراض کو رد کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میر انیس اور دیگر مرثیہ گو فن کو تبلیغ سے زیادہ ابلاغ سمجھتے تھے اور جوش اپنے مرثیوں میں ابلاغ کے بدلے تبلیغ کے قائل نظر آتے ہیں، ورنہ اس قسم کے بند میر انیس کے مرثیوں میں بھی ملتے ہیں:

تو کیا ہے اور کیا ہے وہ تیرا امیر شام	کرتے ہیں بادشاہ کہیں بیعتِ غلام
تو بھی نمک حرام ہے، وہ بھی نمک حرام	او بے ادب! یزید کیا اور کیا امام

دوزخ سے دور رہتے ہیں ساکن بہشت کے
کعبہ کبھی جھکا نہیں آگے کنشت کے

اس بند میں سلطانِ جابر کی تحقیر، ظالم کی تذلیل اور امام حسینؑ کی عظمت کا اظہار جس قرینے سے کیا گیا ہے، اس میں جو بات قابلِ غور ہے وہ پانچویں مصرع میں نظر آتی ہے، یعنی شاعر کے نزدیک اخروی زندگی کا تصور دنیاوی زندگی پر حاوی ہے، جسے وہ دوزخ اور بہشت کے الفاظ سے اُجاگر کرتا ہے۔ امام حسینؑ اور ان کے ساتھی اپنے آپ کو بہشت کا ساکن بنانے کے خواہش مند تھے، ان کے نزدیک سلطانِ جابر کی بیعت اپنے لئے دوزخ خریدنے کے مترادف تھی۔ ان کی نظر کی بلندی اس دنیا کی مادّی سطح سے ماورا آخرت کی زندگی کو دیکھ رہی تھی۔ ایک مرثیے کے مطلع کے چوتھے

مصرعے میں یہ بات زیادہ واضح نظر آتی ہے۔

جاتی ہے کس شکوہ سے رن میں خدا کی فوج   گھریں وفا پاندھے ہے مشکل کشا کی فوج

صف بستہ آگے پیچھے ہے سب پیشوا کی فوج   جنت کا رُخ کئے ہے شہِ کربلا کی فوج

ڈیوڑھی پہ جن و انس و ملک کا ہجوم ہے

خیمے سے اب علم کے نکلنے کی دھوم ہے

زندگی کے مقصد اور اس کی جہت کی اس بلندی کے ساتھ ساتھ جن کا اظہار "جنت کا رُخ کئے ہے شہِ کربلا کی فوج والے مصرع سے ہوتا ہے۔ یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ پرانے مرثیہ گویوں کے یہاں زندگی کا ایک مکمل تصور ہے۔ واقعہ کربلا میں زندگی اپنی تمام جہتوں اور سطحوں کے ساتھ جلوہ گر ہے۔ آپس کے تعلقات بھی ہیں، محبت بھی ہے، حفظ مراتب بھی ہے، بچوں کی ضدیں بھی ہیں، عورتوں کے بین بھی ہیں، رفیقوں کی جاں گساری بھی ہے، جوانوں کا جوش بھی ہے، بچوں کا ولولہ بھی ہے، بوڑھوں کا حوصلہ بھی ہے۔ شجاعت کے مظاہرے بھی ہیں، ایثار و وفا کے نمونے بھی ہیں اور پھر گریہ و بکا جو مرثیے کا ماحصل ہے، اس کے مواقع بھی ہیں۔ غرض زندگی اپنے پورے پھیلاؤ کے ساتھ موجود ہے، لیکن ان سب پر حاوی زندگی کا وہ تصور ہے جو شہادت سے عبارت ہے۔ یہ شہادت ابتلا ہے تو اس کا ردِ عمل کرب کی صورت میں بھی ظاہر ہوتا ہے اور کرب و بلا اسی غم انگیز کرب اور صبر و ابتلا کا مجموعہ ہے۔

موجودہ دور میں زندگی بکھر گئی ہے۔ ہمارے اور زندگی کے درمیان ایک خلا واقع ہو گیا ہے، جسے ہم تفکر و تدبر یا وعظ و نصیحت سے پر کرنا چاہتے ہیں۔ جوش ہمارے دور کے شاعر ہیں، اس لئے ان کے مرثیوں میں واعظانہ اور خطیبانہ رنگ و آہنگ کا نظر آنا اس دور کا تقاضا ہے۔ ان کے ہاں زندگی کی وہ گیرائی اور گہرائی نظر نہیں آتی جو میر انیس

کے مرثیوں کا امتیاز ہے۔ ان کے ہاں سوز و گداز کا عنصر بھی کم بلکہ بہت ہی کم ہے، اس کے برعکس وہ اپنے مرثیوں سے انقلابی روح بیدار کرنے کا کام لیتے ہیں، مگر ان کے کلام میں بھی اس قسم کے بند مل جاتے ہیں۔

اے بندۂ زر چونک مناسب نہیں غفلت　　معلوم نہیں؟ کیا تجھے دنیا کی حقیقت
کس نیند میں ہے؟ چھوڑ بھی باطل کی محبت　　آ حق کی طرف دیکھ یہ حوریں ہیں یہ جنت

حوریں ہوں کہ فردوس، یہ ادنیٰ سا صلا ہے
خود حق میں وہ لذت ہے جو ان سب سے سوا ہے

چوتھے مصرع کے بعد بیت نے مفہوم کو وہ بلندی اور حسن عطا کیا ہے جو اہل نگاہ سے داد وصول کیے بغیر نہیں رہ سکتا، لیکن یہ جوش کے پہلے مرثیے کا بند جو ضمیر اختر نقوی کی تحریر کے مطابق ۱۹۱۹ء میں کہا گیا۔ بعد میں جوش کے ہاں خطیبانہ رنگ بہت غالب آ گیا۔ ۱۹۶۵ء میں زندگی اور موت کے عنوان سے جو مرثیہ جوش نے کہا جس کے مطلع کا مصرع یہ ہے "ہاں انا ہے وہ دبیر نفس و دارائے حیات" اس میں ان کی مرثیہ گوئی اس لحاظ سے اپنے کمال پر نظر آتی ہے کہ اس میں موت کا وہ تصور جو شہادت سے عبارت ہے، اس کو اجاگر کر کے کربلا کو پیش کیا گیا ہے۔ یہاں امام حسینؑ صرف تاریخ انسانی کے انقلابی ہیرو کے طور پر نہیں بلکہ فکر محمدؐ کے نمائندہ بن کر ابھرتے ہیں:

اے محمدؐ! موت وہ تیرے نواسے کو ملی　　آج تک جس سے درخشاں ہے ضمیر آدمی
اللہ اللہ! روشنی تیرے چراغ ذہن کی　　کربلا کی دھوپ پر چھٹکی ہے جاب تک چاندنی

یہ انی پر سر نہیں، تیری انا کا تاج ہے
کربلا تیرے نظام فکر کی معراج ہے

جوش نے ایک ایسا زمانہ پایا جب دنیا فکری، معاشی اور سائنسی انقلابات سے

دوچار ہے۔ ظالم اور مظلوم کی جنگ ایک ابدی حقیقت ہے اور حق و باطل کا ٹکراؤ ہر دور میں جاری رہا۔ جوش اپنے دور کے انقلابی رویے سے متاثر ہیں، انہوں نے امام حسینؑ کو اس خاص فکری تناظر میں دیکھا ہے۔ وہ اقتدار اور اغراض کے اس تصادم میں کربلا کو سلطانوں سے ایک ابدی جنگ قرار دیتے ہیں:

جب تک اس خاک پہ باقی ہے جو دو اشرار
دوشِ انساں پہ ہے جب تک حشم تخت کا بار
جب تک اقدار سے اغراض ہیں گرم پیکار
کربلا ہاتھ سے پھینکے گی نہ ہرگز تلوار

کوئی کہہ دے یہ حکومت کے نگہبانوں سے
کربلا اک ابدی جنگ ہے سلطانوں سے

اب تک جوش کی مرثیہ گوئی میں خطیبانہ رنگ و آہنگ غالب ہے۔ لفظ و بیان پر انہیں جو قدرت حاصل ہے اور اپنے مفاہیم کے اظہار کا جو سلیقہ ان کے ساتھ مخصوص ہے اس سے کوئی ادب کا قاری بے خبر نہیں۔ ان کے مرثیے ان کی فنکارانہ صناعی، ان کے عمیق مطالعے اور ان کی فکری بصیرت کے آئینہ دار ہیں۔ موجد و مفکر کے عنوان سے جو مرثیہ ہے اس میں انسانی ارتقا کی تاریخ جس فنکارانہ مہارت سے نظم کی گئی ہے وہ جوش ہی کا حصہ ہے۔ بہر حال ابھی ان کی مرثیہ گوئی کا دور ختم نہیں ہوا اور امید کی جا سکتی ہے کہ شاید وہ کوئی ایسا مرثیہ یا مراثی تخلیق کر سکیں جو رثائی ادب کا شاہکار قرار پا سکے۔

اردو کا رثائی ادب وہ توجہ اور ستائش حاصل نہ کر سکا جس کا وہ مستحق ہے۔ دراصل انیس جیسے باکمال شاعر کے کمالِ فن کا اعتراف کرنے کے لئے حالی اور شبلی جیسی بصیرت اور خود اعتمادی درکار ہے، جنہیں اپنی ذات پر اعتماد نہیں ہوتا۔ وہ دوسرے کی عظمت کے اعتراف سے ہچکچاتے ہیں۔ کسی بلند و بالا شخصیت کے قد و قامت کا اندازہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ خود ہمارا قد و قامت بھی متوازن ہو۔ جیسے موجودہ دور

میں مرثیے سے جو بے اعتنائی پائی جاتی ہے، اس کی وجہ شاید یہ ہو کہ خود ہماری زندگی اغراض کا شکار ہو کر ان اقدار سے بہت دور ہو گئی ہے جو مرثیے کا طرۂ امتیاز ہیں۔ وجہ خواہ کچھ بھی ہو، بہر حال حقیقت یہ ہے کہ مرثیہ عدم اعتنائی کا شکار ہے۔ ضمیر اختر نقوی نے اپنے پیش لفظ میں اس سخن گسترانہ بات کو نسبتاً تلخ لہجے میں کہا ہے۔ انہوں نے اس حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ حال میں ہندوستان سے جوش کے ہم عصر شاعر ماہی جائسی اور جعفر علی خاں اثر کے متعلق جو کتابیں شائع ہوئی ہیں ان میں ان شعراء کے مرثیوں کا تذکرہ نہیں ملتا۔ خود جوش ملیح آبادی کے مرثیوں کے بارے میں یہ انکشاف کس قدر افسوس ناک ہے کہ ان کا مسودہ نہ خود جوش صاحب کے پاس محفوظ ہے اور نہ کسی اور نے اب تک اس کو محفوظ کرنے کی کوشش کی۔

ایسے حالات میں ضمیر اختر نقوی نے ان مرثیوں کو مرتب کر کے واقعی ادبی جہاد کیا ہے۔ جوش کی مرثیہ نگاری پر مقدمہ لکھ کر اور آخر میں فرہنگ مراثی جوش ترتیب دے کر ضمیر اختر صاحب نے ایک قابلِ قدر خدمت انجام دی ہے۔ مجموعی طور پر ضمیر اختر نقوی کی یہ کوشش ہر طرح تحسین اور تعاون کی سزاوار ہے۔

maablib.org

ڈاکٹر نظیر حسنین زیدی

جوش کی انفرادیت
اور ضمیر اختر نقوی کی دیدہ ریزی

یوں تو ہر شاعر کا کوئی نہ کوئی رنگ ہوتا ہے اور وہ اسی خاص رنگ کے سبب پہچانا جاتا ہے، لیکن اپنی زندگی کی ترجمانی کے لئے اپنی شاعری کو آئینہ بنانا اور زندگی کے ہر گوشے میں حقیقت اور سچائی کو مدِ نظر رکھنا بلکہ اس سچائی کو ہی مقصدِ زندگی سمجھنا اور اس حقیقت پر ایمان رکھنا، ایمان کی بات کہنا اور بے باکی سے کہنا، سب کے سامنے کہنا، دوسروں پر اس کا اظہار کرنا، اس کے ابلاغ میں اپنی پوری توانائیوں کا صرف کر دینا، سود و زیاں کے خوف سے بے فکر رہنا، یہ خصوصیت تامہ تھی جو جوش کی زندگی کا محور رہی، اسی خصوصیت نے جوش کا سکہ لوگوں سے منوایا اور آج بھی اس کا سکہ چل رہا ہے:

جوش! ہم ادنیٰ غلامانِ علی مرتضیٰ
حکمت سے پیش آتے ہیں جہاں بانی کے ساتھ

سچائی کا اظہار، منافقت سے فرار ہے جوش کی وہ معرکۃ آرائی ہے کہ جہاں ان کے بزرگوں نے جوہرِ سیف کو اپنی آبرومندی کا ذریعہ بنایا، وہاں جوش نے اپنے قلم کی آبرو اپنی سچائی سے رکھی، کوئی پسند کرے یا نہ کرے، سچائی ان کی زندگی کا جوہر تھا۔ وہ اپنے قلم کی گردش سے حقیقت کے بے سوتی اپنے نہاں خانۂ دماغ سے اہلِ فکر و نظر کے

دامن میں ڈالتے رہے۔ گویا وہ حالی کی آواز بازگشت ہیں، جنہوں نے غزل کو ہاتھ نہیں لگایا۔ وہ غزل سرا اور غزل گو شعرا کے گروہ سے اپنی نظم گوئی کی داد لیتے رہے۔ ان کی شاعری کا ایک دور وہ تھا جب انہوں نے اظہار بیان کے لئے تشبیہات و استعارات کے تنوع سے کام لیا، گویا ایک رچ دھج کے ساتھ اظہار قدرت زبان و بیان کیا۔ لوگ اُن کی بعض نظموں کی تشبیہات و استعارات کی بہتات سے ایسے گھبرائے (جو ان کے بس کی بات نہ تھی) کہ ان کی شاعری کو الفاظ کی گھن گھرج سے تشبیہ دے دی، حالانکہ شاعری نام ہی تنوع بیان کا ہے، یہ اس کے اظہار مال کی دلیل ہے کہ وہ پوری لفظی مناسبتوں کو تشبیہات و استعارات کے تانے بانے سے اس طرح پیش کرتا ہے کہ بیان سے نکھرتا چلا جاتا ہے، ہر ہر لفظ کو اس کے صوتی انداز سے پیش کرنا، تحریر میں اس کے صحیح اعراب لگانا اور بیانی کیفیات کی تمام مناسبتوں کو مد نظر رکھ کر صرف لفظ کے دروبست پر زور نہیں، بلکہ معانی کی وسعتوں کو لفظ کے دامن میں سمیٹ لینا، یہ شاعر کا وہ کمال ہے اور اس کے کلام کی وہ عظمت ہے جو سامع کو کبھی ادبی دھوکا نہیں دیتی، اس لئے یہ بات بجا طور پر کہی جا سکتی ہے کہ جوش ملیح آبادی کی قادر الکلامی نے اپنے موضوع نظم کو مقصد کے دائرے سے باہر نکلنے نہیں دیا۔

بلاشبہ یہ ان کی اور انہوں نے اپنے خاندان کی عالی ظرفی تھی کہ انہوں نے اپنے کھرے پن سے صاف گوئی کو اپنا شعار بنائے رکھا۔ شاعر انسان کو اس کے اعلیٰ مرتبے کی عظمت دکھاتا ہے، اسی لئے وہ بنی نوع انسان میں انقلاب کا نعرہ بلند کرتا ہے، خواہ وہ ذاکر حسینؑ سے خطاب کی صورت میں ہو یا حسینؑ اور انقلاب کی شکل میں۔ ان کی شاعری کی توانائی کا راز اس نکتے میں مضمر ہے کہ وہ صرف الفاظ کی رعنائی کو مد نظر نہیں رکھتے بلکہ رعنائی فکر کو اپنی شاعری کی معراج سمجھتے ہیں۔ یہ فکر کی بلندی انسان کو بصارت

کے ساتھ بصیرت کی ضرورت کا زیادہ احساس دلاتی ہے۔ یہ میرا اپنا خیال ہے کہ جوش
کی فکر تک رسائی کے سلسلے میں تشبیہات و استعارات دراصل زینے کا کام دیتے ہیں،
جہاں امعان نظر کی زیادہ ضرورت ہے، اور اس امعان نظر سے ان کی عظمتوں کو تلاش
کرنے بھی ایک ایسی پرواز کی ہمت کرتا ہے جہاں الفاظ کا ہجوم محض لفظی خول نہیں ہے۔
ذرا ان کے اس مسدس "طلوع فکر" کے چند اشعار ملاحظہ فرمایئے جہاں الفاظ کے در و
بست کے ساتھ معانی کی بلندیاں ہر بلند قامت کو پست کر دیتی ہیں:

اے خاتم پیمبر آفاق کے نگیں!   اے کار ساز نور و کلاہ سر یقیں!
اس بات کو زمیں پہ کوئی جانتا نہیں   یعنی خدا سی چیز بھی موجود ہے کہیں
کوئی زمیں پہ لو ہے نہ ضو آسمان پہ
بنیاد اعتقاد رکھی اپنی زبان پہ

ہاں! شمع ذات غیرۂ الفاظ میں جلا   لیلائے حق کو محمل تقریر میں بٹھا
گوش بشر کو چشم حقیقت نگر بنا   کانوں سے لوگ دیکھ سکیں جلوۂ خدا
تیرے بیان پہ غلغلہ اٹھے درود کا
یوں پیش کر ثبوت خدا کے وجود کا

توحید کی ان دشوار گزار منازل کو طے کرنے کے لئے شاعر اپنے ممدوح کے جس
وصف جلی کو عالم کے سامنے پیش کرتا ہے، اس سے شاعر کی نزاکت فکر اور علوئے فکر کا
صحیح اندازہ ہوتا ہے اور یہ توحید کا وہ نقش بدیع ہے کہ جو ممدوح کی ذات نے لوگوں کے
دلوں میں پیوست کر دیا اور رہتی دنیا تک ان کا یہ احسان ہے کہ ممدوح نے وحدت کے
بارے میں فکر بشر کو اوج بخشا اور وہم و قیاس کے التباس سے علیحدہ کر دیا۔ اب شاعر
کے اوج فکر اور رفعت معانی کی طرف توجہ فرمایئے تو اندازہ ہوگا کہ شاعر کی راہ فرضی

انسانوں کی فکر سے الگ ہے:

چمکے گا تیرے فکر سے ہر گوشۂ جمال | لائے گا تو خیال کے موسم میں اعتدال
انساں کے ذہن میں ہیں جو اشکالِ ذوالجلال | اک تو ہی لا سکے گا ان اشکال پر زوال

یہ تو کہے گا، جلوہ بجز واہمہ نہیں
جو دیکھنے میں آئے، وہ بت ہے، خدا نہیں

سچ بات یہ ہے کہ اگر ضمیر اختر اپنی دیدہ وریزی اور عرق ریزی سے جوش کے مسدس اور مراثی کے جمع کرنے میں سعی پیہم نہ کرتے تو یہ ادبی ذخیرہ نہیں بلکہ علمی سرمایہ ضائع ہو جاتا، انہوں نے جوش کے مرثیے جمع کر کے مقدمہ و فرہنگ لکھ کر ہمیں اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ آؤ اور جوش کے کلام کی عظمت کو اپنے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر تسلیم کرو کہ کس طرح جوش مرحوم نے فلسفۂ حیات کو فکر و تخیل میں بدلا اور الفاظ کے قالب میں ڈھالا اور بصارتِ انسانی کو بصیرت کی طرف متوجہ کیا جہاں ان کے مسدس اور مرثیوں کا ہر ہر مصرع اختصارِ کلام کا متقاضی اور جامعیت و بلاغت کا متلاشی ہے۔ یہ وہ مقام ہے جہاں نظم نگار یا سادہ کار، بحرِ حرف میں غوطے کھانے لگتا ہے اور اپنی کم مائیگی کے اظہار کو چھپانے کے لئے جوش کو صرف لفظوں کا بادشاہ سمجھ کر اس کے معانی کی بلندیوں کے اعتراف سے پہلو تہی کرتا ہے، حالانکہ مرثیہ اسی بلاغتِ کلام کا نام ہے، جہاں رثائیت انسانی فکر کو معراج کا درجہ عطا کرتی ہے۔ ایک مسدس کا بند ملاحظہ کیجئے:

قطرۂ دل میں لیے ایک سمندر تھے حسینؑ | ذاتِ واحد میں سمیٹے ہوئے لشکر تھے حسینؑ
دینِ آدابِ رفاقت کے پیمبر تھے حسینؑ | جان دینے کو جب آئے تو بہتر تھے حسینؑ

سر فرشتوں کے یہاں آج بھی خم ہوتے ہیں
ایسے انسان رسولوں میں بھی کم ہوتے ہیں

جوش کے یہ مسدس اور مرثیے عظمتِ انسانیت کے لئے راہ نمائی کا کام کرتے ہیں۔ آیئے اور ان مسدسوں کے ذریعے اس مردِ فقیر کی عظمت کا اندازہ لگایئے جس کی ایک ضرب پہ فقر نے شاہی کی کمر توڑ دی:

جو سے خوں میں جو دلیروں کے سفینے آئے — چند پیاسے جو لہو موت کا پینے آئے
مرد جب سر سے کفن باندھ کے جینے آئے — شمر یاری کو پسینے پہ پسینے آئے

نبض آقائی ابلیس ہوس چھوٹ گئی
فقر کی ضرب سے شاہی کی کمر ٹوٹ گئی

❁ ❁ ❁

ڈاکٹر سید محمد عباس

۲۶ / مارچ ۱۹۹۵ء ... کراچی

محترم جناب ضمیر اختر نقوی صاحب سلام مسنون!

آپ کی عطا کردہ کتاب "خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا" گزشتہ جمعہ کو مجھے ملی۔ میں آپ کا ایک ادنیٰ مداح اور عقیدت مند ہوں۔ میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں اور ممنون ہوں کہ آپ نے اپنے دستخطوں سے یہ کتاب مجھے بھیجی ہے۔

اللہ تعالیٰ آپ کو بتصدقِ چہاردہ معصومین صحت مند اور تندرست رکھے تاکہ آپ کی دینی، مذہبی اور ادبی خدمات جاری رہیں۔ فقط والسلام ... سید محمد عباس

السید سمیع الحسن (سلطان المدارس، خیرپور میرس، سندھ)

"جوش ملیح آبادی کے مرثیے" کا انگریزی ترجمہ

جناب ضمیر اختر نقوی کی تصنیف "جوش ملیح آبادی کے مرثیے" ایک ایسی کتاب ہے جو پاکستان میں پہلی بار دیکھنے میں آئی۔ علم و ادب کے حقیقت پرواز پروانے جو ابھی تک اس شمع کی روشنی سے محروم تھے کہ وہ ادب کی انقلابی شمع سے اپنے ذہنوں کو منور کریں، اب نہیں رہے۔

جناب ضمیر اختر نقوی نے جوش صاحب کے ان مراثی کو کہ جنھیں زیرِ مطالعہ لانے کے لئے اہلِ علم ترستے رہتے تھے، بڑی خوبی کے ساتھ جمع کر کے ایک کتابی شکل دے دی اور بڑے ہی نئے اور مفکرانہ انداز سے ان پر تنقید لکھی ہے جو مرثیے کی تاریخ میں ایک شاہکار ہے۔ میں نے ان تمام خوبیوں کو مدِ نظر رکھ کر یہ ارادہ کیا کہ میں اس کتاب کا انگریزی ترجمہ قوانینِ نظم و نثر کے اعتبار سے کروں تاکہ جوش صاحب کے انقلابی اور حقیقت آفریں کلام اور جناب ضمیر اختر کی پرجوش تنقید سے دوسرے اہلِ علم فیض یاب ہو سکیں۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری
ایم۔اے، پی ایچ ڈی (ڈی۔لٹ)
سینئر ریڈر، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر (بھارت)

ضمیر اختر نقوی کی کتاب
”جوش ملیح آبادی کے مرثیے“
ایم۔اے (اُردو) کے نصاب میں

میرے کرم فرما جناب ضمیر اختر صاحب اچھے رہیے!

آپ کو یہ سن کر بے حد مسرت ہوگی کہ ۲۳ سال کے خاموش جہاد کے بعد میرا تقرر یونیورسٹی میں بطور سینئر ریڈر ہوا ہے۔ میں کسی عہدے کا متمنی نہیں ہوں، صرف خاموش اور پر امن ماحول میں اُردو کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میں نے کشمیر یونیورسٹی، سری نگر (بھارت) کے شعبہ اُردو میں ایم۔اے کے لئے مرثیے کا مکمل پرچہ رکھا ہے۔ نصاب میں میر انیس اور مرزا دبیر کے علاوہ جوش کے مرثیوں کو بھی شامل کیا ہے۔ آپ کی کتاب ”جوش ملیح آبادی کے مرثیے“ ایم اے اردو کے نصاب میں شامل کی گئی ہے۔ ۱۲ اگست ۱۹۸۲ء کو میں نے ایم اے کے طلباء کو آپ کے بارے میں ایک نوٹ لکھوایا۔ ایم اے پریوئس میں ۵۳ اور فائنل میں ۳۴ طلباء ہیں اور ریسرچ اسکالر کی تعداد ۲۳ ہے۔

انشاء اللہ ایم۔اے اُردو مرثیہ کے پرچے میں آپ کی شخصیت اور ادبی کارناموں کے بارے میں سوالات ہوں گے۔ ایم۔اے کے نصاب کے لئے اپنے حالاتِ زندگی بھی فوراً روانہ کریں تاکہ طلباء کو مزید نوٹس (Notes) لکھوا سکوں۔

ضمیر حسین جعفری

۲۰ر جولائی ۱۹۹۱ء.....لاہور

محترم ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب...السلام علیکم!

آج سے تقریباً ایک یا دو سال پہلے ایک جشن مقاصدہ میں ایبٹ روڈ پر آپ کو دیکھنے اور سننے کا اتفاق ہوا۔ آپ کی دوستی کی جعفری گفتگو نے ہمیں آپ کا گرویدہ بنا لیا۔ خیر وقت گزر گیا ہم مگر آپ کو نہیں بھولے۔ شاید یہ ہماری محبت تھی کہ پچھلے برس آپ لاہور میں بحیثیت مقرر تشریف لائے اور ہم نے آپ کی چند تقاریر خواجگان میں سنیں بھی مگر ایک تشنگی کا احساس مستقل رہا۔ مگر میں اسے اہل لاہور کی بلکہ اہل موچی دروازہ کی خوش قسمتی کہوں گا اس سال آپ پھر ہمیں سننے کو میسر آئے۔ اس بار تو آل عمران میں ہم بلاناغہ آپ کی تقاریر سن رہے ہیں۔ بلکہ ایک دو مرتبہ تو آپ ذرا دیر سے آئے بلکہ کافی دیر سے آئے تو اس دن سوچا کہ چلو یار چلتے ہیں ڈاکٹر صاحب تو آئے ہی نہیں ہیں مگر پھر بھی کچھ سوچ کر بیٹھ رہے۔

میں آپ کی تقریریں سن کر اور آپ کو یہ سب کچھ بتا کر کوئی اہمیت نہیں دلا رہا بلکہ یہ بتانا چاہ رہا ہوں کہ باوجود اس کے کہ میں ایک میڈیکل اسٹوڈنٹ ہوں اور آئی ایس او سے بھی تعلق رکھتا ہوں اور اس کی کچھ ذمہ داریاں بھی ہیں مثلاً یہ کہ رات کے وقت ایک اور مقام پر مجلس ہوتی ہے جہاں سے عاشور کا مرکزی جلوس بھی برآمد ہوتا ہے وہاں آئی ایس او کا ایک اسٹال لگتا ہے تو یقین کیجئے گا کہ میں جب سے آپ کو سن رہا ہوں ایک بار بھی ڈیوٹی ہونے کے باوجود نہیں گیا۔ مطلب یہ ہے کہ اس بات کی موجب آپ کی محبت، چاہت اور آپ کا انداز بیان ہے۔" کہتے ہیں کہ غالب کا ہے انداز بیاں اور" مگر یہ بات صرف غالب کے لئے ہی نہیں بلکہ مقررین کے حق میں آپ پر بھی لاگو ہوتی ہے۔

ڈاکٹر تقی مسعود

حسنِ ترتیب

جدید مرثیے کا ذکر آتے ہی جوشؔ ملیح آبادی کا نام ذہن میں آتا ہے۔ اردو میں مرثیے کی نہایت مستحکم کلاسیکی روایت کے موجود ہوتے ہوئے اس صنفِ سخن کو کسی جدید راہ پر ڈالنا آسان کام نہیں تھا اور اس راہ پر اسے آگے بڑھانا تقریباً محال تھا۔ اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اگرچہ انیسؔ و دبیرؔ کی آنکھ بند ہونے کے کچھ ہی عرصے بعد سے مرثیے کو نیا رنگ روپ دینے کی کوششیں شروع ہو گئی تھیں لیکن ساقی نامہ، بہار اور چہرے میں کچھ نئے مضامین کے اضافے کے سوا مرثیہ اس شاہراہ سے انحراف نہیں کر سکا جو انیسؔ و دبیرؔ قائم کر گئے تھے۔ اس کے علاوہ مرثیے کی زائل ہوتی ہوئی ادبی حیثیت بھی اس کے حق میں فالِ بد تھی۔ جس کی وجہ سے مرثیے کی مجموعی صورتِ حال مایوس کن ہو گئی تھی۔

اس صورتِ حال کا تدارک اسی صورت میں ممکن تھا کہ مرثیے کو ایک جدید صنفِ سخن کی طرح برتا جائے اور اس جدید صنفِ سخن کو وقار کسی ایسے ہی سخن ور کے ہاتھوں حاصل ہو سکتا تھا جو ذہن اور نطق دونوں کے اعتبار سے انقلابی ہو اور جس کا سکہ شاعری کی دنیا میں پہلے ہی سے رواں ہو۔ خوش قسمتی سے مرثیے کو وہ مردے از غیب جوشؔ ملیح آبادی کی صورت میں مل گیا۔

آج جدید مرثیے کو جو کچھ بھی اہمیت اور اعتبار حاصل ہے وہ جوشؔ اور ان کے ہم

نوازوں کی بدولت ہے۔ جوشؔ کے مرثیوں کو منتشر حالت میں رہنا جوشؔ اور مرثیے دونوں کے ساتھ ناانصافی تھی۔ ضمیر اختر نقوی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے بڑی محنت اور تلاش سے جوشؔ کے مرثیوں اور دوسرے متعلقہ کلام کو یکجا کیا اور بہت سلیقے اور حُسن ترتیب کے ساتھ اسے ایک دیدہ زیب مجموعے کی شکل دے دی۔

یہ مجموعہ عمدہ مرثیوں ہی کا نہیں، اعلیٰ معیار کی شاعری کا بھی نمونہ ہے۔ امید ہے کہ جدید مرثیہ جو افسوس ناک طور پر ادب کے میدان سے ہٹتا جا رہا تھا اس مجموعے کی بدولت اپنے معاصر اصناف سخن سے آنکھیں چار کر سکے گا۔

آلِ میر انیسؔ سید علی احمد دانشؔ (لکھنؤ، انڈیا)

جناب سید ضمیر اختر نقوی صاحب ...... السلام علیکم!

امید ہے بفضل خداوندی آپ بعافیت ہوں گے۔ ''القلم'' کا چھٹا شمارہ ہمیں سید نصیر رضا صاحب سے مل گیا تھا۔ ہر شمارہ اپنی اپنی جگہ انفرادیت رکھتا ہے۔ زیر نظر شمارہ نمبر ۶ میں سید نصیر رضا صاحب کا مضمون ''حکیم آغا حسن ازلؔ'' بے حد تحقیقی ہے اور ابھی تک اس نوعیت کا کام ان پر نہ ہو سکا تھا اور آپ کے مضامین بھی خاصے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی تصنیف ''کلام انیسؔ میں رنگوں کا استعمال'' پڑھی۔ بھئی آپ کیا کیا نکات ضبط تحریر میں لائے ورنہ آج تک عام قاری کا رجحان میر انیسؔ کے کلام کے اس گوشے کی طرف نہیں گیا تھا۔ خدا آپ کو وسعت دے اور جس تیزی کے ساتھ آپ اردو مرثیہ کو آگے بڑھا رہے ہیں اس کا اجر آئمہ معصومینؑ ہی دیں گے۔ انسان کے بس کی بات نہیں کیونکہ مرثیہ ہی ان کا پسندیدہ موضوع تھا اور ان معصومینؑ نے اگر اس عہد کے شعراء سے کسی چیز کی فرمائش کی تو یہی کہ ''تم میرے جد کا مرثیہ کہو میں سنوں گا'' آپ سنا بھی رہے ہیں اور نشر و اشاعت میں بھی مصروف ہیں۔ یہاں ڈاکٹر نیر مسعود رضوی صاحب کی صحت تاج کرنے کے بعد ویسی ہی ہے ہماری دلی دعا ہے کہ پنجتن پاکؑ کے صدقے میں انہیں شفا حاصل ہو جائے (آمین) باقی حالات بدستور ہیں۔ اپنی خیریت سے مطلع فرمائیے۔ وہاں علیٰ حسب مراتب سب کو سلام و دعا کہیں۔

پروفیسر ڈاکٹر منظر حسین کاظمی

جوشؔ ملیح آبادی کو مرثیہ نگار ثابت کرنے میں ضمیر اختر صاحب کا بڑا ہاتھ ہے

معاملات زندگی میں میں حد درجہ بے نیاز ہو چکا ہوں۔ وقت کے منچلے دھاروں نے بے نیازی کو عادت کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ چنانچہ بے نیازی اور عادت کے ہاتھوں اکثر کام ادھورے رہ جاتے ہیں یا پھر التوا میں پڑے رہتے ہیں۔ میرے اعزا و احباب جانتے ہیں کہ یہ بات پہلے نہ تھی۔ یہ تو جس عہد کے حقوق پر غاصبانہ ڈاکہ ڈالا گیا اور نااہلوں کو مناصب عطا ہوئے اس وقت سے بے نیازی کی کرم فرمائیاں شروع ہوئیں۔ اسے جوشؔ صاحب نے بہت پہلے محسوس کر لیا تھا انھیں کی زبان سے سنئے۔

محلوں میں جلوہ ریز ہوں ارذال خیرہ سر — چالاک رہزنوں کو ملے منصب خضر
سفلوں کو ہو نشست سر تخت سیم و زر — اقطاب روزگار کے بستر ہوں خاک پر
آئے اجل عوام کی جانوں کے واسطے
دنیا ہو صرف چند گھرانوں کے واسطے

جہال کی زبان پہ ہوں لن ترانیاں — اشرار خود غرض کو ملیں حکمرانیاں
برسیں حقیقتوں کی زمیں پہ کہانیاں — کھانے لگیں عوام کا گودا گرانیاں
سفلوں سے بھیک اہل سخا مانگنے لگیں
مرنے کی اہل علم دعا مانگنے لگیں

پھر بھی جناب ضمیر اختر نقوی صاحب جو مجھے بیحد عزیز ہیں اس لئے ان کی کتاب جناب جوش ملیح آبادی کے مرثیوں کی ترتیب اور مقدمہ و فرہنگ پر لکھنے بیٹھ گیا۔

ضمیر اختر صاحب کی علم دوستی اور جوہر شناسی کا اندازہ تو ان کی ابتدائی تحریر ہی سے ہو جاتا ہے۔ جہاں انھوں نے ذکر کیا ہے کہ علامہ طالب جوہری جیسے عالم ان کے دوست ہیں اور انھوں نے اس کتاب کی اشاعت میں ان سے تعاون کیا۔ سب سے پہلے جو بات کھل کر سامنے آئی ہے وہ جوش صاحب سے ضمیر اختر صاحب کا خلوص و محبت اور عقیدت ہے۔ جس کا متعدد جگہ اظہار بھی ہوا ہے۔ یہ کتاب حیات جوش کا جامع و مانع تذکرہ تو نہیں کہا جا سکتا جس میں جوش کی بھرپور شخصیت ابھر کر سامنے آئی ہو۔ یہ ان کی شاعرانہ صلاحیتوں کا تجزیہ بھی نہیں بلکہ یہ ان کی شاعری کے انداز کا ایک رُخ ہے جسے ضمیر اختر صاحب نے ان کی مرثیہ نگاری میں دیکھا۔ اس کتاب کی ترتیب و تصنیف میں جو اصل مقصد کارفرما ہے وہ مرثیہ نگاری پر عظیم و مقدس کام ہے۔ جس کے لئے ضمیر اختر صاحب نے اپنے آپ کو وقف کر رکھا ہے۔ ترتیب، مقدمہ اور فرہنگ دیکھنے کے بعد ضمیر اختر صاحب کی خود اعتمادی پر نظر جاتی ہے جو انھیں صنف مرثیہ کے بارے میں حاصل ہے۔ مرثیہ نگاری کسی رنگ میں ہو اور کہیں بھی ہو ضمیر صاحب کی نگاہ عمیق سے نہیں بچ سکتی۔ میر انیس کی مرثیہ نگاری پر کام شروع کرتے ہوئے ضمیر صاحب شعر و ادب کی تاریخ تک آپہنچے ہیں اور وہ دن دور نہیں جب ان کا نام تاریخ میں مورخ مرثیہ نگاری کی حیثیت سے نمایاں مقام حاصل کرے گا۔

ضمیر صاحب نے جوش صاحب کو مکمل مرثیہ گو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے لیکن میرے خیال میں جوش صاحب خود بھی اس اعزاز کو قبول کرنے سے گریز کریں گے کیونکہ مرثیہ کے ساتھ جو لوازمات و خصوصیات وابستہ کر دیئے گئے ہیں انھیں جدا کر

دینے کے لئے ذہن ابھی تیار نہیں ہیں۔ ہاں مرثیہ کو نظم کی شکل میں ایک نیا رخ عطا کرنا واقعی جوشؔ کا کارنامہ ہے۔ وہ مرثیہ کا مقصد صرف آنسوؤں اور آہوں میں نہیں دیکھتے بلکہ اس کے ذریعہ عمل کی ترغیب دیتے ہیں۔

صرف رو لینے سے قوموں کے نہیں پھرتے ہیں دن
خوں فشانی بھی ہے لازم اشک افشانی کے ساتھ

حسینؑ کی شہادت کے پیچھے وہ ایک عظیم مقصد دیکھتے ہیں جو انقلاب سے وابستہ ہے۔

اک دین تازہ کا جو پیمبر تھا وہ حسینؑ　　جو کربلا کا داور محشر تھا وہ حسینؑ
جس کی نظر پہ شیوۂ حق کا مدار تھا
جو روحِ انقلاب کا پروردگار تھا

جوشؔ صاحب کا ذکر آتے ہی تخیل ماضی کی طرف پرواز کرنے لگا۔ ۱۹۴۱ء کی بات ہے جب میں کرسچن کالج الہ آباد میں فرسٹ ایئر کا طالب علم تھا اور جوشؔ صاحب کا غائبانہ پرستار تھا ذہن میں ان کا وہ گول وزنی محسوس ہوتا تھا جو انھوں نے دوسری جنگ عظیم میں جرمنی سے انگلینڈ پر گولہ پھینکنے کی سفارش کی تھی۔

"خبر لینے جہنم کی جواب کی بار پھر جاتا
ہمارے نام سے بھی ایک گولہ پھینکتے آنا"

بس بچپنا ہی تو ٹھہرا ایسی بات دل کو لگ گئی اور جب سنا کہ جوشؔ صاحب الہ آباد یونیورسٹی کے مشاعرے میں شرکت کے لئے آ رہے ہیں تو آٹوگراف کیلئے وہاں پہنچ گیا۔

مشاعرے میں روشؔ صدیقی صاحب خدا معلوم کس بات پر ناراض ہوئے اور صرف ایک قطعہ پڑھ کر مشاعرے سے اٹھ گئے۔ مفہوم تھا کہ جوشؔ صاحب نے مولویوں کو گالی دی ہے۔ خدا کی پناہ یہ کہنے کی جسارت۔

خدا کو اور نہ پہچانیں یہ حضرت (مولوی)

خدا کے ساتھ کے کھیلے ہوئے ہیں

یہ بات انہوں نے شراب کے نشے میں کہی ہے اور میں شرابی پر لعنت بھیجتا ہوں۔ روشؔ صاحب تو یہ کہہ کر چل دیئے۔ جوشؔ صاحب قریب ہی مائیک پر کھسک آئے اور فی البدیہہ چار مصرع سنا دیئے کہ یہ جھوٹ ہے اس میں گالی کا شائبہ تک نہیں قرآن میں شراب پینے والوں پر لعنت کا ذکر نہیں البتہ کاذبین پر لعنت بھیجی گئی ہے۔ روشؔ صاحب کاذب ہیں اس لئے قرآن کی رو سے ان پر لعنت ہوئی۔ مشاعرہ چمک اٹھا اور ہم سب جوشؔ کی برجستگی پر حیران رہ گئے۔ لیکن ان سے قریب ہونے کا شرف پھر بھی حاصل نہ ہو سکا۔ یہ احساس باقی ہی تھا کہ ۱۹۳۵ء کا زمانہ آ گیا جب میں لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم۔ اے کا طالبعلم تھا اور مجھے جوشؔ صاحب کی حقیقی معرفت اسی زمانہ میں اپنے عزیز ترین استاد احتشام حسین مرحوم کے ذریعہ ہوئی۔ احتشام صاحب نے اپنا شاگرد رشید کہہ کر ملایا لیکن جوشؔ صاحب نے پتہ نہیں سنا بھی یا نہیں۔ ایک اسٹول اٹھا کر اس پر ہال میں کھڑے ہو گئے اور ایک عورت کی تصویر لگی تھی اسے الٹ دیا احتشام صاحب کے استفسار پر کہنے لگے بھئی میں عورت کے ہاتھ میں تلوار نہیں دیکھ سکتا۔

اک سنہری تان کی زنجیر بل کھائی ہوئی

ایک انگڑائی، دھنک کے بل پہ لہرائی ہوئی

"بھلا تلوار کی کیا ضرورت ہے"

یونیورسٹی میں مشاعرے کے بعد نجی محفل میں تو وہ نظمیں پڑھیں کہ سامعین جھوم جھوم اٹھے اور میں چونکہ شعور کی منزلیں طے کر رہا تھا اس لئے بیسویں صدی کے اس عظیم شاعر کو اس کے پس منظر میں دیکھنے لگا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ قومی ذہن جب

بیسویں صدی کے اضطراب و کرب کے شکنجے میں جکڑ کر امید کی نئی فضاؤں سے روشناس ہوا اور قومی ضروریات و بین الاقوامی اثرات نے فکر و مادی زندگی کو تبدیلیوں پر مجبور کیا تو جوشؔ آگے بڑھے جنہوں نے نظم نگاری کو نئی پرواز عطا کی اور ان کی بدولت ان اقدار کی تلاش ابھر کر سامنے آئی جس نے انفرادی اور اجتماعی توازن و آسودگی کی ضمانت بن کر زندگی کو حقائق سے روشناس کرادیا انھوں نے ناقابلِ برداشت صعوبتوں کو جھیل کر گلزار نظم کی آبیاری کی۔ جوشؔ نے جہاں نظیرؔ اکبرآبادی، اقبالؔ، ٹیگور اور انیسؔ سے استفادہ کیا وہاں اپنا خود ایک انوکھا اسلوب پیدا کیا۔

جوشؔ نے انیسؔ کے اثر سے جو نئے قلعے سر کئے وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ ایک طرف روحانیت کے افسوں کا شکار ہیں تو دوسری طرف اسلام کے دامن سے لپٹے نظر آتے ہیں جہاں وہ صرف حسینؑ ہی کو اسلام کا محافظ کہتے ہیں اور اس تضاد کے بیان میں اس رنگ اور روپ کا میل جہانِ شعری میں ایک نئی تخلیق ہے بات چونکہ مرثیے سے متعلق نکلی ہے اس لئے مراثی ہی سے مثال دینا مناسب ہوگا۔ چنانچہ بعنوان ''پانی'' ایک مرثیہ یا مسدس ہے جس میں پانی کے لئے الفاظ کی بہتات میں رنگ آمیزی دیکھئے

ٹپ ٹپ، شرر، شرار تڑاتڑ، جھنن جھنن	دھمال، دھوم، دھام، دمادم، دھنن دھنن
چھن چھن، چھنن، چھما، چھم، چھنن چھنن	گھن گھن، گرج، گھماؤ، گھما گھم، گھنن گھنن

ہول و ہراس و ہیبت و ہیجاں لئے ہوئے
بجلی کی تیغ نوحؑ کا طوفاں لئے ہوئے

لیکن جب اسلامی نظریہ کا اظہار کرتے ہیں تو حسینؑ کو کس انداز کا سلام کرتے ہیں۔

اے وجہ افتخار اب وجد سلام لے	اے کارساز ابیض و اسود سلام لے
اے ذی حیات منبر و معبد سلام لے	اے عارف ضمیر محمدؐ سلام لے

ناموسِ انبیاء کے نگہبان السلام
اے رحلِ کائنات کے قرآن السلام

اردو شاعری کو سب سے زیادہ الفاظ انیس نے عطا کئے اور اگر نمبر دو (۲) پر کسی شاعر کو تلاش کیا جائے تو جوشؔ ہی کا نام آئے گا۔

ہر دور میں ہر ابھرتے ہوئے فنکار کی مخالفت کرنے میں بعض حضرات فخر محسوس کرتے ہیں۔ دراصل وہ اونچا مقام حاصل کرنے کے لئے مخالفت ہی کا سہارا لینا چاہتے ہیں۔ ایسے ہی ایک انتہائی معروف شاعر (نام لینا مناسب نہیں) جوشؔ کو ہمیشہ نیچا دکھانے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ میں جب گورنمنٹ کالج جو ہر آباد کا پرنسپل تھا تو ۱۹۶۲ء میں اتنے بڑے مشاعرے کا اہتمام کیا تھا کہ ہندوستان اور پاکستان کے کسی بڑے شاعر کو نہ چھوڑا سب ہی نے شرکت کی چنانچہ جوشؔ صاحب کی خدمت میں بھی خط لکھا اور لکھنؤ کی ملاقات میں احتشام حسین صاحب مرحوم کا ذکر بھی لے آیا۔ جوشؔ صاحب نے فوراً جواب دیا کہ انھیں اچھی طرح یاد ہے اور وہ رعایت کرتے ہوئے صرف ایک ہزار روپیہ لیں گے اور قیام، طعام اور جام کا انتظام میرے ذمہ ہوگا'' میں بڑا خوش تھا کہ سارے ہندوستان و پاکستان کے شعراء کے مجمع میں جوشؔ صاحب کا کلام اور بھی لطف دے گا۔ لیکن مشاعرے سے تین یوم قبل حکومت وقت کا پروانہ پہنچ گیا کہ جوشؔ اور قمر جلالوی نہیں آسکتے ان کا نام شاعروں کی فہرست سے خارج کر دیا جائے میں بہت پریشان ہوا اور عالیہ امام صاحبہ کو تار دیا کہ کسی عنوان جوشؔ صاحب کو روک دیں۔ عالیہ امام کو چونکہ جوشؔ صاحب کی بڑی قربت حاصل ہے اس لئے انھوں نے یہ کام انتہائی حسن وخوبی کے ساتھ انجام دیا لیکن میں بیحد شرمندہ تھا۔ معلوم ہوا کہ انھی بزرگ شاعر نے یہ حرکت کی تھی کہ جوشؔ کے سامنے بھلا ان کا چراغ کیسے جلتا۔ اس کا

مجھ پر اتنا اثر رہا کہ پھر جوش صاحب کا سامنا کرنے سے گھبراتا تھا حالانکہ یہ جوش صاحب کی فراخدلی تھی کہ کافی عرصہ بعد جب سامنا ہوا تو انھوں نے اس واقعے کا ذکر بھی نہ کیا۔ اور ہوسکتا ہے کہ بھول گئے ہوں کیونکہ مجھ سے تو کیا میں ایک معمولی انسان ہوں میں نے جوش صاحب کو اپنے مخالف معاصرین سے بھی کبھی الجھتے نہیں دیکھا۔ اور نہ انھوں نے کبھی انتقام لینے کی کوشش کی۔ جس کسی نے آزار دیا اسے صبر و سکون سے برداشت کرلیا۔

اسی طرح ایک بار جب میں راولپنڈی میں ڈائریکٹر تعلیمات تھا اور ڈاکٹر صفدر جو اب مرحوم ہو گئے اُن کو ان کی درخواست پر تبادلہ کرکے بحیثیت پرنسپل گورنمنٹ کالج راولپنڈی لے آیا تو ایک محفل میں انھوں نے جوش صاحب پر چوٹ کی انداز یہ تھا کہ ایسی تضمینیں تو سب لکھ لیتے ہیں اور اس کے بعد اپنا بے ڈھنگا کلام سنا بیٹھے۔ گویا دکھانا چاہتے تھے کہ وہ بھی جوش سے کم نہیں۔ مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے کہہ دیا کہ آپ کی تو عادت ہے کراچی میں آل رضا سے مقابلہ کر بیٹھے اور یہاں جوش جیسے عظیم شاعر پر تنقید کرڈالی حالانکہ کہاں یہ حضرات اور کہاں آپ کی بچوں والی شاعری بس کیا تھا جب تک ماتحتی میں رہے ایک لفظ نہ بولے اور میرے تبادلے کے بعد جو انھوں نے میرے خلاف گند اچھالی تو اس کا جواب میرے ایک دوست طاہر صاحب نے جو اس وقت نیشنل اسمبلی میں آفیسر لگے تھے مکمل کردیا۔ میں نے بھی سنا لیکن نہ خود کچھ کہا اور نہ اس کا تذکرہ بھی جوش سے کیا۔ مجھ سے تو خیر ان کی خفگی کی اور وجوہات بھی تھیں کہ میں نے ان کی سفارش پر آپ کے غیر مستحق عزیز کو حسب منشا عہدہ نہ دیا اور اس وقت کے مارشل لاء میں بریگیڈیر کے کہنے پر ان کی نااہلی کے طور پر ان کا تبادلہ جہلم کالج کردیا تھا جس کا الزام وہ مجھ پر رکھتے رہے لیکن جوش صاحب نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔ خیر ان جیسے

حضرات کی مخالفت تو کوئی معنی نہیں رکھتی لیکن حیرت تو یہ ہے کہ جناب شاہد احمد دہلوی نے بھی مخالفت میں "ساقی" کا ایک جوش نمبر نکال ڈالا اور پھر حال میں ڈاکٹر منظور احمد کے متعدد مراسلے بھی مخالفت میں شائع ہوئے جس کی جوش صاحب نے کوئی پروا نہ کی نتیجہ یہ ہوا کہ جوش پر اعتراض کرنے والے دب گئے اور جوش مزید ابھر گئے۔

جوش صاحب پر بڑا الزام یہ لگایا گیا کہ وہ ملحد ہیں صرف حسین کا نام لینا کافی نہیں جب وہ خدا اور رسول کو نہیں پہچانتے۔ لیکن ایسے حضرات خود ان کا کلام دیکھیں۔

خدا:-

اللہ کو قہار بتانے والو
اللہ تو رحمت کے سوا کچھ بھی نہیں

رسولؐ:-

نوع انساں کو دیا کس فلسفی نے یہ پیام
مرد غازی کا کفن ہے، خلعت عمر دوام

نصب کس نے کر دیے عقل میں حدوں کے خیام
جانتے ہو اس دبیر ذہن انسانی کا نام

جو انوکھی فکر تھا، جو اک نیا پیغام تھا
اس حکیم نکتہ پرور کا محمدؐ نام تھا

اے محمدؐ اے سوار توسنِ، وقت رواں
اے محمدؐ اے طبیب فطرت نباض جاں

آگے چل کر کہتے ہیں۔

خاک کے ذرات کو تو نے ثریا کر دیا
آگ کو پانی کیا پانی کو صہبا کر دیا

جوش نے ببانگ دہل کہا ہے کہ انھوں نے اللہ اور رسولؐ کو پہچانا لیکن اس کا ذریعہ حسین ہیں۔ ان کی تیغ گوئی، آزاد خیالی اور بے باک شاعری صرف پہچاننے ہی تک ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اسی جواز سے وہ بیسویں صدی میں سینکڑوں یزید کی طرف اشارہ کر بیٹھے ہیں اور حق گوئی میں ذرا نہیں جھجکتے

ہاں جوش اب پکار کے اے میر کربلا — اس بیسویں صدی کی طرف بھی نظر اٹھا
ہاں دیکھ یہ خروش یہ ہلچل یہ زلزلہ — اب سینکڑوں یزید ہیں کل اک یزید تھا

طاقت ہی حق ہے شور ہے یہ گاؤں گاؤں میں
زنجیر پڑ رہی ہے پھر انساں کے پاؤں میں

دراصل دنیا کی ریت ہی یہ خوب ہے کہ مشاہیر اور اہل کمال کی قدر افزائی اس کے دنیا سے اٹھ جانے کے بعد کی جاتی ہے جو انتہائی لغو روایت ہے اور اظہار عقیدت کا قابل ملامت انداز ہے۔ صرف جوش صاحب ہی ایسے خوش قسمت فنکار، شاعر اور دانشور نہیں کہ دنیا نے ان کی زندگی ہی میں ان کی قابلیت، ذہانت اور تخلیقی صلاحیتوں کی قدر کی۔ چند لوگوں کی مخالفت کوئی معنی نہیں رکھتی۔ یہ بڑی بات ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کے نام پر دو نمبر شائع ہو گئے اور صہبا لکھنوی نے تو "افکار" کا جوش نمبر نکال کر کافی معلومات فراہم کر دیں۔

جوش صاحب کے شاعر اعظم ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ ان کی زندگی ہی میں ان کے کلام پر ریسرچ شروع ہو گئی۔ اور پروین عالم پٹنہ یونیورسٹی میں، محمد عصمت خان لکھنؤ یونیورسٹی میں اور محمد اسمٰعیل حسن خان علی گڑھ یونیورسٹی میں تھیسس لکھ رہے ہیں۔ موقع ملا اور جوش صاحب نے اجازت دی تو پاکستان میں خاکسار بھی اس کام کے کرنے میں فخر محسوس کرے گا۔ اگر مجھ سے تمام شعرا متقدمین و متاخرین کو سامنے رکھ کر کہا جائے کہ ایک شاعر کا انتخاب کرو تو بغیر کسی تامل کے میں کہہ دوں گا کہ میر، مومن، غالب، انیس اور اقبال کو چھوڑ کر میری دماغی اور روحانی صلاحیتوں کو بیدار کرنے کے لئے صرف جوش کا کلام کافی ہے جوش صاحب فطرت کے اصول پر سختی سے عمل پیرا ہیں۔ ماحول کتنا بھی بھیانک ہو وہ متاثر نہیں ہوتے اور حق کا اعلان

کر دیتے ہیں اس لئے ان کا کلام خوئے گدایانہ سے پاک ہے۔ٹیلیویژن نے ان کا ایک انٹرویو محفوظ کر رکھا ہے جو ان کے بعد عوام کے سامنے پیش کیا جائے گا اس میں بھی لوگ دیکھ لیں گے کہ وہ عظیم ہیں اور اگر باہر کسی ملک میں ہوتے تو دوسرے شیکسپیئر کہلاتے۔

جوشؔ ہم ادنیٰ غلامانِ علی مرتضیٰ
تمکنت سے پیش آتے ہیں جہانبانی کے ساتھ

رہا مرثیہ نگاری کا سوال تو پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ بحیثیت مرثیہ نگار جوشؔ صاحب کو شائد ابھی وقت کی ضرورت ہے لیکن مرثیہ کے انداز میں ان کا کلام اپنا جواب نہیں رکھتا۔

جوشؔ صاحب کی مرثیہ نگاری کے بارے میں ضمیر اختر صاحب کا تاثر جہاں ان کے خلوص، محبت اور عقیدت کا آئینہ دار ہے وہاں ان کا مضمون ان کی دیدہ وری و جوہر شناسی کی بھی عکاسی کرتا ہے۔

مختصر یہ کہ جوشؔ صاحب کو مرثیہ نگار ثابت کرنے میں ضمیر اختر صاحب کا بڑا ہاتھ ہے اور انھوں نے جوشؔ صاحب کو نیا مقام دیتے ہوئے جدید مرثیہ گوئی کا تاج پہنا دیا ہے۔دعا ہے کہ صنفِ مرثیہ سے والہانہ عشق رکھنے والے اس نوجوان ضمیر کو اللہ اور زورِ قلم عطا کرے۔ امید ہے کہ علمی حلقے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گے اور جوشؔ صاحب پر کام کرنے والوں کو ایک نیا راستہ نظر آئے گا جس میں جوشؔ کے ان افکار پر زیادہ توجہ دی جائے گی جہاں وہ کسی کرسی کو معبود نہیں سمجھتے۔

کوئی پکار کے جوشؔ آسمان سے کہہ دے
کہ اب زمیں کو تری بندگی نہیں منظور

جوش ملیح آبادی کے مرثیے

ڈاکٹر سبط حسن رضوی:

رثائی ادب کی تاریخ و تحقیق میں پاکستان کے جواں سال ادیب اور خطیب ضمیر اختر نے ادھر جو کام کیا ہے وہ قابل توجہ اور لائق تحسین ہے انھوں نے قدیم و جدید مرثیہ نگاروں پر یکساں محنت کی ہے اور خدائے سخن میر انیس سے لے کر شاعرِ انقلاب جوش تک اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں۔ ضمیر اختر کی یہ کتاب جوش پر کئے ہوئے بہت سے اعتراضات کا جواب لاجواب ہے اور اس امر کا ثبوت ہے کہ دنیا میں پھنسے ہوئے شاعر کو بھی اسلامی روایات سے تصوراتی وابستگی دلدلوں سے نکال کر روحانی اقدار کے ادراک کی منزلوں تک پہنچا دیتی ہے۔

مولانا مرتضیٰ حسین فاضل:

جوش کے مرثیے اردو ادب میں نئی شاہراہ کی سمت معین کرتے ہیں، ان مرثیوں نے اپنے اپنے زمان و مکان میں شعراء کے شعور و لاشعور کو تکان دی ہے جوش کے جنگ دار لہجوں کی صدائے بازگشت دوسرے مرثیوں میں کبھی گونج اور کبھی دھیمے انداز میں سنی گئی ہے۔ ضمیر اختر نقوی نے مرثیوں کے ساتھ رباعیات و سلام کو یکجا کر کے ایک روایت کا پورا بستہ تیار کر دیا ہے۔ ضمیر اختر نقوی کلاسیکی مرثیے کے دلدادہ اور محقق ہیں۔ انیس و دبیر پر ان کی عرق ریزی کے جوہر محققین ادب سے داد و ستائش حاصل کر

چکے ہیں اور اب جدید مرثیے کے عظیم شاعر جوشؔ کے مرثیوں پر تحقیقی کتاب مرتب کر کے ضمیر اختر نقوی نے جدید مرثیے پر پی ایچ ڈی کرنے والے اسکالرس کے لیے نئی راہیں معیّن کر دی ہیں۔

پروفیسر محمد رضا کاظمی:

معاصر شعرا بالعموم تحقیق کے دائرے میں نہیں آتے گرچہ بعض تحقیقی امور ایسے ہوتے ہیں جو شاعر کی حیات میں ہی طے ہو سکتے ہیں مگر خود شعرا کی تحقیقی حس انکی تخلیقی حس کے برابر نہیں ہوتی اور بہت قیمتی معلومات اور سرمائے پردۂ خفا میں چلے جاتے ہیں۔ جناب ضمیر اختر نقوی اردو ادب کے محققین میں بہت نمایاں ہیں۔ انھوں نے جس جانفشانی کے ساتھ حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے یکجا کیے ہیں اور جس انداز سے مسودات کی صحت پر توجہ دی ہے وہ فی زمانہ خود شاعر موصوف کے دائرۂ اثر سے باہر تھا۔ حضرت جوشؔ ملیح آبادی کے بارے میں یہ فقرہ زبان زد خاص و عام ہے کہ وہ الفاظ کے بادشاہ ہیں مگر آج تک انکے کسی مجموعے میں نہ اُن پر شائع ہونے والے رسالوں کے خاص شماروں میں انکے استعمال کردہ الفاظ کی کوئی فرہنگ شامل نہیں ہوئی تھی معیاری مقدمے اور ترتیب کے ساتھ ساتھ جناب ضمیر اختر نقوی نے فرہنگ مراثی جوشؔ ترتیب دیکر ایک انتہائی اہم تحقیقی اور تاریخی کارنامہ پیش کیا ہے

ڈاکٹر شکیل رضا کاظمی

جوش ملیح آبادی اور ضمیر اختر نقوی

(۱) ضمیر اختر نقوی کی کتاب "جوش ملیح آبادی کے مرثیے" جوش پر پہلی کتاب ہے جو ۱۹۸۰ء میں کراچی پاکستان سے چھپی۔

(۲) یہ کتاب اس قدر مقبول ہوئی کہ ۱۹۸۱ء میں اس کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تھا۔ اب مزید اضافوں کے ساتھ تیسرا ایڈیشن شائع ہو رہا ہے۔

(۳) یہ کتاب اُردو پبلشرز، لکھنؤ (بھارت) سے بھی شائع ہوئی۔ ۲۶ اپریل ۱۹۸۱ء میں اُردو اکادمی، اتر پردیش، لکھنؤ میں اس کتاب کی رسم اجرا منعقد ہوئی۔ صدارت ممتاز تنقید نگار اور محقق علی جواد زیدی (صدر اُردو اکادمی، اتر پردیش، لکھنؤ) نے کی اور مہمان خصوصی مہاراج کمار آف محمود آباد تھے۔ اس تقریب میں ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی، ڈاکٹر محمود الہٰی، ڈاکٹر نیر مسعود اور ضمیر اختر نقوی نے تقریریں کیں۔

(۴) اس کتاب میں شامل ضمیر اختر نقوی کا مقالہ "جوش کی مرثیہ نگاری" ٹورنٹو (کینیڈا) کے "یوم جوش" میں ۲۸ مارچ ۱۹۸۲ء کو پڑھا گیا۔

(۵) ضمیر اختر نقوی کی یہ کتاب "ہما" اُردو ڈائجسٹ، دہلی کے "شاعر انقلاب نمبر" میں شائع کی گئی۔ جوش کی وفات پر یہ پہلا جوش نمبر ہے اور برصغیر میں اس سے بہتر "جوش نمبر" اب تک شائع نہیں ہوا۔

(۶) جوش ملیح آبادی نے ضمیر اختر نقوی کے مضمون "جوش کی مرثیہ نگاری" کو پڑھنے کے بعد اپنے ایک خط میں لکھا: "اگر میرا اللہ کا سا مزاج ہوتا تو میں آپ کے دامن کو موتیوں سے بھر دیتا۔"

(۷) اب یہ کتاب ایم۔اے اُردو (کشمیر یونیورسٹی) کے نصاب میں داخل کی گئی ہے۔

(۸) کل پاک و ہند مشاعرہ بیادِ جوش کا آغاز ضمیر اختر کی افتتاحی تقریر سے ہوا۔

سید محمد عباس صادق جعفری:

قطعۂ تاریخ اجرا شمارہ "القلم"

خوابیدہ ذہنیت کو جگاتا ہے، سو یہ نو
علم و ادب کے غنچے کھلاتا ہے گو یہ گو
پوشیدہ ہر شمارے میں "اک کائناتِ علم"
"نہج القلم بھی نہج بلاغہ، بھی ہو یہ ہو"

۱۴۱۸ھ

پروفیسر ڈاکٹر ظفر ہاشمی:

قطعات

بخدمتِ اقدس علامہ سید ضمیر اختر نقوی مدظلہٗ العالی

ہدیۂ عقیدت

بہ شانِ حکمت خیرِ کثیر زندہ ہے
جہاں میں مثلِ سراجِ منیر زندہ ہے
اجل کو بھی ظفرؔ اندیشۂ اجل ہے مگر
ضمیر زندہ ہے جب تک ضمیر زندہ ہے

بہ فیضِ بارشِ انوارِ نطقِ بابُ العلم
مقامِ اہلِ قلم بے نظیر ہے لاریب
یزیدِ نفس کی قسمت میں ظلمتِ شب ہے
نویدِ صبحِ حسین ضمیر ہے لاریب

تقریبِ اعتراف و تحسین

بین الاقوامی دولت مشترکہ

(Common wealth) ایوارڈ لندن

جناب سید مولانا سید محمد رضا شبر کی تقریر سے اقتباس

یہ انعام اس شخص کو دیا جاتا ہے۔ جس نے اپنی زندگی کے روز و شب قوم کی ذہنی، سماجی اور اقتصادی بہتری کے لئے وقف کئے ہوں۔ اس قسم کے انعام پانے والے کا قومی وفلاحی کاموں میں عملی طور پر حصہ لینے کا اور ان میں نمایاں کامیابیوں کے حصول کا ایک معتدبہ رکارڈ (Record) ہو۔

انجمن فروغ عزا نے ۱۹۹۹ء کے ایوارڈ (انعام) کے لئے مرکز علوم اسلامیہ سے وابستہ علامہ سید ضمیر اختر نقوی کو منتخب کیا ہے۔

انجمن فروغ عزا نے علامہ ضمیر اختر نقوی کے علمی خدمات اور مساعی کو بحیثیت معروف دانشور کے نہایت اہم مقام دیا ہے بالخصوص وہ عمل جو موصوف قوم کی شعوری بہتری کے لئے سرانجام دے رہے ہیں۔ اس سال کے ایوارڈ (انعام) کے ذریعہ انجمن کی یہ تمنا ہے کہ اپنی توجہ علامہ ضمیر اختر نقوی کے بنیادی مساعی کی طرف منعطف کی جائے جو ایک ایسی جدوجہد ہے جس کے ذریعہ بے ہدف، غیر محفوظ، منتشر اردو بولنے والی قوم میں اتحاد پیدا کیا جاسکے اور اسے اقتصادی بدحالی سے باہر نکالا جاسکے مزید برآں اس ایوارڈ کے ذریعہ اس بات کو بھی تسلیم کیا گیا ہے کہ اپنی توجہ پوری دنیا میں

ان لوگوں کی طرف منعطف کرائی جائے جو اس مہم کے ہراول دستے کی حیثیت رکھتے ہیں کہ وہ اپنے راستے اختیار کریں بالخصوص تعلیم کے فروغ کے ذریعہ تاکہ اقتصادی اور سماجی خوشحالی لاسکیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی موصوف وہ واحد شخصیت ہیں جو بین الاقوامی سطح پر بحیثیت معروف خطیب، ادیب، محقق اور ایک فلسفی، ایک اعلیٰ علمی، ادبی اور تدریسی شخصیت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ بلاشبہ موصوف کی وافر تصانیف جو کہ سو (۱۰۰) سے زیادہ کتابوں پر مشتمل ہیں جو موصوف نے تحریر فرمائی ہیں۔ متذکرہ بالا حقیقت کی تصدیق کرتی ہیں۔

علامہ موصوف میر انیسؔ پر جو کہ ایک مشہور زمانہ مرثیہ گو ہیں ایک حکم کی حیثیت رکھتے ہیں۔ علامہ موصوف کو متعدد بین الاقوامی علمی، ادبی اور تدریسی اداروں کی طرف سے مدعو کیا جاتا رہا ہے بشمول ان کے جو ہندوستان، امریکہ اور برطانیہ میں وقوع پذیر ہیں۔

گو ہم نے کوشش کی ہے کہ قوم کے شعوری خزانے سے کچھ بیانیہ بصیرت کا حصہ اپنی گرفت میں لاسکیں بالخصوص جو علامہ ضمیر اختر نقوی نے تخلیق فرمایا ہے۔ البتہ ہم مناسب طور پر انھیں وہ نذرانۂ عقیدت پیش کرنے میں ناکام ہوئے ہیں جس کے موصوف حقدار ہیں اور ہم اپنی اس تقصیر پر موصوف سے معافی کے خواستگار ہیں۔

رئیسؔ امروہوی

"برادرِ عزیز جناب سیّد ضمیر اختر نقوی ماشاء اللہ محقق بھی ہیں مصنف بھی اور مقرر بھی اور ان کی شخصیت کی تینوں جہات قابلِ قدر ہیں"۔

ڈاکٹر شوذب کاظمی

تقریبِ ''اعتراف و تحسین''

آرٹس کونسل آف پاکستان

علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی دینی، علمی، ادبی و تحقیقی خدمات کے سلسلے میں مجلسِ مذاکرہ میر انیس اکیڈمی اور آرٹس کونسل آف پاکستان کے اشتراک سے آرٹس کونسل میں زیرِ صدارت سید ہاشم رضا منعقد ہوئی۔ صدرِ تقریب سید ہاشم رضا نے کہا:

''علامہ سید ضمیر اختر نقوی اپنی ادبی خدمات اور خطابت کے حوالے سے ایک منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے ایک سو اٹھارہ (۱۱۸) کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں اور ابھی سلسلہ جاری ہے۔ ان کے لئے میں ذوق کا ایک شعر پڑھ رہا ہوں:

رہتا سخن سے نام قیامت تلک ہے، ذوق!
اولاد سے یہی نا کہ دو پشت، چار پشت

علامہ ضمیر اختر نقوی اپنے علمی کارناموں سے قیامت تک زندہ رہیں گے۔ ان کا نام ادب میں ہمیشہ باقی رہے گا۔ حکومت کا عہدہ اس کی زندگی تک باقی رہتا ہے، لیکن ادیب، شاعر، دانشور اور مصنف کا نام رہتی دنیا تک قائم رہتا ہے۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے ادب کا عظیم

موضوع منتخب کیا ہے، میر انیس ان کے ممدوح ہیں۔ شبلی نعمانی، مولانا حالی، مسعود حسن، ادیب اور محمود شیرانی کی نظر میں میر انیس اردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔

''علامہ ضمیر اختر نقوی نے بڑے موضوع کا انتخاب کر کے بہت بڑی کتاب خاندانِ میر انیس کے نامور شعراء اور میر انیس کی حیات اور شاعری تخلیق کی ہیں۔''

مہمانِ خصوصی ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے کہا:

''علامہ ضمیر اختر نقوی کی ادبی خدمات کے سلسلے میں آج کی اس محفل میں علامہ ضمیر اختر نقوی کی کتابوں کے حوالے سے علم و ادب کے جتنے مسائل زیرِ بحث آ گئے ہیں، میں اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں یہ کہتا ہوں کہ اتنے مسائل کسی کتاب کی تعارفی تقریب میں کبھی زیرِ بحث نہیں آئے۔ یہ اس محفل کا واقعی ایسا حاصل ہے کہ فلسفے کے حوالے سے، عشق کے حوالے سے، سماجیات کے حوالے سے، سماجیات اور سیاسیات کے حوالے سے اور عقائد اور دین کے حوالے سے میں نے جتنی کارآمد باتیں اس محفل میں سنیں، کم سے کم کسی کتاب کی تعارفی تقریب میں اس طرح کی باتیں سننے میں نہیں آئیں۔ یہ باتیں کیوں ہوئیں؟ ایسی عالمانہ باتیں، ایسی حق اور صداقت اور علم و ادب سے بھری باتیں کیوں ہوئیں؟ وجہ یہ ہے کہ موضوعِ گفتگو عظیم سے عظیم تر ہوگا تو گفتگو بھی بڑی ہوگی، وسیع اور روشن ہوگی، اس محفل میں ایک جوش و خروش پایا جا رہا ہے، جبکہ

چار گھنٹے مسلسل گزر چکے ہیں اور محفل پر کوئی جمود طاری نہیں ہوا، آپ کو کسی قسم کی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ علامہ ضمیر اختر نقوی کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کے تنوع، ان کی ادبی رنگا رنگی اور ذوقِ علم و ادب سے اتنی شاخیں پھوٹ رہی ہیں کہ آپ تقریروں کا لطف لیتے رہے، میں علامہ ضمیر اختر نقوی کو اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھتا ہوں۔"

ڈاکٹر عالیہ امام نے منفی و مسجع تقریر میں کہا:

"جہل و تاریکی و نفرت و زرگری کے اس ماحول میں علم و ادب کی محفل، کتابوں کے اجرا کی تقریب کا انعقاد کیا معنی رکھتا ہے؟ لیکن میں نے تاریخ پر نگاہ ڈالی تو مجھے جواب ملا کہ جہل کے ریگ زاری میں علم کی جوت جگائی جاتی ہے۔ مجھے تاریخ سے جواب ملا کہ دہکتے ہوئے انگاروں ہی میں حق اور صداقت کے پھول کھلائے جاتے ہیں، علم کی محبت سے روشنی کا دیا جلایا جاتا ہے، ایک تنہا انسان علم کی لو کو تیز تر کرتا ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی ادراک و آگہی کی باڑھ پر آیا ہوا دھارا ہیں۔ میں ان کو دل کی گہرائیوں سے محبت کا خراج پیش کرتی ہوں۔ علامہ ضمیر اختر نقوی اپنی زندگی کے سرد و گرم سے گزرے اور ایسے مراحل بھی آئے کہ جب وہ آگ اور خون کے دریا سے گزرے ہیں لیکن وہ پگھلے نہیں ہیں بلکہ فولاد بن گئے ہیں، صرف فولاد نہیں بنے بلکہ سونا بن گئے ہیں، صرف سونا نہیں بنے بلکہ کندن بن گئے ہیں،

صرف کندن نہیں ہے بلکہ اس کندن کو ریزہ ریزہ کر کے آپ کے لئے علم و ادب کے سونے کی دکان سجادی ہے۔ سچے موتیوں کی دکان سجادی ہے۔ اب آپ کا کام ہے کہ آپ ایک جوہری کی طرح ان موتیوں کو اپنے سینے میں بسالیں۔ علامہ ضمیر اختر نقوی اس عہد کے نئے کوہ کن ہیں جو نئے تیشے لے کر نئی پیکر شیریں تراشنے کے لئے اس میدان میں اتر آئے ہیں:

"بساط رقص بسیط ہو اور کوہ کن کی جیت ہو"

صدر شعبہ اردو کراچی یونیورسٹی پروفیسر سحر انصاری نے علامہ ضمیر اختر نقوی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

"اعتراف و تحسین کی یہ محفل جس خلوص و جذبے سے سجائی گئی ہے اور علامہ ضمیر اختر نقوی کے لئے جو عقیدت کے پھول لٹائے گئے، یقیناً ان نامساعد حالات میں بھی علامہ ضمیر اختر جیسے عالم کی شمع روشن کرنے والے ابھی موجود ہیں۔ جہل کے اندھیرے پنجے گاڑنا چاہتے ہیں، لیکن جب تک علامہ ضمیر اختر نقوی جیسے محقق اور عالم موجود ہوں گے، وہ شمع کبھی گل نہیں ہو سکتی۔"

پاکستان کے ممتاز شاعر نقاش کاظمی نے علامہ ضمیر اختر نقوی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

"علامہ ضمیر اختر نقوی ہمارے عہد کے ایک ایسے نابغۂ روزگار خطیب و ادیب ہیں جن کے سرخیلوں میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسی شخصیات شامل ہیں، یعنی علامہ صاحب بیک وقت مذہب اور ادب

پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک جانب خطابت کے سنگلاخ
تجربات اور دوسری جانب تحریر و تحقیق کے جان لیوا مقامات ہیں۔
علامہ ضمیر اختر ایک صاحب طرز خطیب ہیں نہ تو وہ علامہ رشید ترابی
کے مقلد نظر آتے ہیں، نہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے۔"

تقریب سے پروفیسر سردار نقوی، رشید رضوی، علامہ ذوالفقار حیدر، آل محمد رزمی، ماجد رضا عابدی، پروفیسر محمد رضا کاظمی اور معین الرضا نے بھی گراں قدر مقالے پیش کیے۔

آل محمد رزمی نے اپنے مقالے میں کہا:

"علامہ ضمیر اختر نقوی کی تحریر میں دو چیزیں شدت سے متاثر
کرتی ہیں، اولاً روایت سے محبت اور ثانیاً اس روایت کے احترام کو
برقرار رکھتے ہوئے صحت مند جدیدیت کی طرف مثبت رغبت۔ اسی
طرح ان کی شخصیت میں بھی دو خوبیاں ہیں، دوسروں کو سراہنے کا
جذبہ اور کام کی لگن۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ادبی کارناموں کا اعتراف
دنیا کے بڑے دانشوروں نے کیا ہے۔ علامہ صاحب ہماری قوم کے
خوش قسمت ترین مفکر و دانشور ہیں جنھیں اپنے فکری خواب کو تعبیر
کی حدوں تک پہنچانے کا موقع خود ان کی زندگی میں مل گیا اور دنیا
بھر کے ارباب دانش کو ان کے فکر و فن کے مختلف گوشوں کو نئے
زاویوں سے پرکھنے کا موقع ملا۔"

تقریبِ ''اعتراف و تحسین''

برمکان ناصر رضا رضوی

علامہ ضمیر اختر نقوی کی دینی، علمی، ادبی و تحقیقی خدمات کے اعتراف میں ایک تقریب ''اعتراف و تحسین'' میر انیس اکیڈمی کی طرف سے جمعہ ۲۸؍ اپریل جناب ناصر رضا رضوی کے مکان گلشنِ اقبال، ۱۳ ڈی میں منعقد ہوئی۔ تقریب ۱۰ بجے صبح شروع ہوئی۔ مہمانوں کی آمد ساڑھے ۹ بجے صبح سے شروع ہو چکی تھی۔ کراچی کے پُرآشوب حالات میں گزرے ہوئے سال بھر کے بعد یہ تقریب جس کے ماحول میں ایک تازہ ہوا کا جھونکا تھی۔ جس سے اہلیانِ کراچی مکمل طور پر مستفیض و لطف اندوز ہوئے۔

ساڑھے نو بجے صبح سے ہی ناصر رضا رضوی صاحب کے مکان میں چہل پہل کا سماں نظر آرہا تھا۔ مہمان آرہے تھے اور میزبان ان کا استقبال دروازے پر کررہے تھے۔

۱۰ بجے تلاوت حدیث کساء سے تقریب کے ناظم ماجد رضا عابدی نے مہمانوں کا باقاعدہ استقبال کیا۔ ماجد رضا عابدی نے کہا کہ علامہ سیّد ضمیر اختر نقوی کی ان تمام علمی تصانیف اور آپ کی علمی تقریروں اور قومی خدمات سے ہر صاحبِ نظر بخوبی واقف ہے۔

حدیثِ کساء کے بعد علامہ ضمیر اختر نقوی کی تصانیف کا ایک سیٹ مع مجلّہ ''شعرائے اُردو اور عشقِ علی'' یونیورسٹی لائبریری کے لئے بطور تحفہ پروفیسر سحر انصاری کو پیش کیا گیا، یہ سیٹ علامہ ضمیر اختر نقوی کے والد جناب ظہیر حسن نقوی نے پروفیسر سحر

انصاری کو پیش کیا۔ اس کے بعد مہمانانِ خصوصی کی گل پاشی کی گئی۔ جناب ناصر رضوی نے بطور میزبان اور تقریب کے منتظم اعلیٰ ہونے کی نسبت سے مہمانانِ خصوصی کی گل پوشی کی۔ ان مہمانوں میں سید ہاشم رضا، پروفیسر سحر انصاری، پروفیسر شیخ انصار حسین، جناب صائم رضا امروہوی (برادر نسیم امروہوی)، جناب ماجد حسین رضوی، ڈاکٹر بلال نقوی، مولانا سلمان حیدر زیدی، جناب آباد محمد نقوی زائر، محشر لکھنوی، ساحر فیض آبادی، میر رضی میر، صبا اختر، علامہ عباس کمیلی، علامہ فرقان حیدر عابدی اقبال کاظمی، نیر اسعدی، سید احسن انجم اور دوسرے زعما شامل تھے۔

اس کے بعد کراچی یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو کے چیئرمین جناب پروفیسر سحر انصاری کو اپنے خیالات کا اظہار کرنے کی دعوت دی گئی۔ پروفیسر سحر انصاری نے فرمایا کہ علامہ ضمیر اختر نقوی کی ان خدمات کے وہ چشم خود گواہ ہیں اور انھیں ایک طویل عرصے سے ان کاموں میں مصروف دیکھ رہے ہیں۔

پروفیسر سحر انصاری کی تقریر کے بعد منظوم مقالوں کے سلسلے کا آغاز کیا گیا۔ سب سے پہلے علامہ ضمیر اختر نقوی کے ایک دیرینہ معتقد اور برصغیر کے بہترین سوز خواں جناب محسن نقوی امروہوی نے اپنے قطعات کی شکل میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ ان کا ایک قطعہ درج ذیل ہے:

ذاکرِ آلِ عبا ، تاریخ کا دفتر ضمیر   مخزنِ علم و ادب کے بے بہا جوہر ضمیر
ذکرِ اہلِ بیتؑ اُن کا ہے شعارِ زندگی   زیرِ سایہ ہیں علم کے بر سرِ منبر ضمیر

جناب محسن نقوی کے بعد ناظم تقریب ماجد رضا عابدی صاحب نے، جو خود ایک اُبھرتے ہوئے نوجوان شاعر، بہترین سوز خواں اور مقالہ نگار ہیں، علامہ ضمیر اختر نقوی کو اپنے ایک مسدس کے ذریعے خراجِ تحسین پیش کیا۔ ماجد رضا عابدی کے مسدس کے

چند بند درج ذیل ہیں:

قلزمِ اوجِ معانی کا کنارا ہیں ضمیر ادب و علم کا بہتا ہوا دھارا ہیں ضمیر
دورِ رفتہ کی خطابت کا نظارا ہیں ضمیر بیتِ حیدرؑ پہ جو اترا وہ تارا ہیں ضمیر

بیتِ حیدرؑ جو چوما تو سند پائی ہے
اس لئے ان کی خطابت میں توانائی ہے

یہ سلاست یہ فصاحت یہ خطابت یہ بیاں حُسن کا ندرتِ الفاظ میں دریا سا رواں
ہے مبہوت ایک سا دونوں پہ یقیں ہو کہ گماں سادگی دیکھ کے عاشق ہوئے خاصانِ جہاں

گفتگو ایسی کہ ہر بات سے موتی برسیں
سن کے تقریر چہکنے کو عنادل ترسیں

شوکتِ فکر کے مظہر بھی ضمیر اختر ہیں لفظ و معنی کے سمندر بھی ضمیر اختر ہیں
مدحتِ آلؑ کے محور بھی ضمیر اختر ہیں یعنی منبر کے دلاور بھی ضمیر اختر ہیں

خنجرِ فکر و تخیل نے جگر کاٹ دیئے
جنگِ حیدرؑ جو پڑھی، تارِ نظر کاٹ دیئے

فن کا وہ اوج کہ حیرت سے ترائی دیکھیں گیسوئے فکر میں لفظوں کی اسیری دیکھیں
جرأتِ ذوقِ تخیل کی بلندی دیکھیں اس گدائے درِ زہراؑ کی امیری دیکھیں

جب بھی تحریر کے میداں میں نظر آتے ہیں
بڑھ کے قرطاس و قلم ان کی قسم کھاتے ہیں

سیرتِ زہراؑ، فدک، شاعری، آنسو، پانی ذوالفقار، آگ، ہوا، شہد، جوانی، پیری
ذوالجناح و علم و رنگ اور آبائے نبیؐ اور اسلام کی تاریخ میں کردارِ علیؑ

منتخب کرنے میں موضوع کو یکتا ہیں ضمیر

فنِ تقریر میں مضمون کا دریا ہیں ضمیر

بدر و بیر العلم و ذات سلاسل سو تہ　　قینقاع و اُحد و خیبر و فتحِ مکہ
نہروان لیل حریر و جمل و کرب و بلا　　رمل و خندق و عمار کی جنگِ کوفہ
پڑھ کے غزوات یہ ہلچل سی مچا دیتے ہیں
رزم شبیر کی تصویر دکھا دیتے ہیں

بارے کچھ ذکر ہوان کا جو ہیں اختر کے قریب　　ہیں حسین نقوی، ماجد رضوی و ادیب
اور جاوید و منور بھی ہیں بیدار نصیب　　ذوالفقار اور کمال و ابو ذر اور حبیب
ایک سجاد و وزیر خرد آثار بھی ہیں
ساجد و قائم و حامد بھی ہیں زوار بھی ہیں

اک ناصر رضا مصروف عزائے شبیر　　جن کی خدمات سے واقف ہیں صغیر و کبیر
اک حسین رضا پروردۂ آغوش ضمیر　　اور عباس رضا با ادب و با توقیر
فکرِ اختر سے مسلسل یہ تعبیریں ہیں
شمعِ مستقبلِ روشن کی یہ تنویریں ہیں

دور حاضر کی خطابت پہ ہے فیضان ضمیر　　یعنی اک زندہ حقیقت دبستان ضمیر
فلکِ علم کے تارے ہیں محبانِ ضمیر　　ماجد عابدی! میں بھی ہوں ثنا خوانِ ضمیر
میرا اسلوب اسی سیفِ زبانی کا اسیر
میرا ادراک اسی زمزمہ دانی کا اسیر

جناب قسیم امروہوی جن کے منظوم مقالے کے لئے یہ تقریب منعقد کی گئی تھی، ان کو بلانے سے پہلے ماجد رضا عابدی نے قسیم امروہوی اور ان کے منظوم مقالے کے لئے مسدسِ نظامت سے ایک بند پڑھا۔ بند درج ذیل ہے:

قاسم معرفتِ حق کے ثنا خوان قسیم! تیری میراث دبستانِ شمیم اور نسیم
یہ مسدس تو ادب میں ہے ترا کارِ عظیم اور کوئی جرم نہیں، یہ تو ہے فن کی تعظیم

بدلہ احسان کا ادا کرتی ہیں زندہ قومیں
اپنے محسن کی ثنا کرتی ہیں زندہ قومیں

اور پھر قسیم امروہوی نے اپنے مسدس کا آغاز کیا۔ یہ مسدس ایک سو دس بند پر مشتمل تھا جس پر قسیم امروہوی نے مسلسل دو گھنٹے تک سامعین سے داد و تحسین وصول کی۔

آخر میں جناب سید ہاشم رضا نے مسدس اعتراف و تحسین کی خوش خط نقل علامہ ضمیر اختر نقوی کو پیش کی اور فرمایا یہ "جنت کا پروانہ" ہے اور پھر آپ نے اپنی صدارتی تقریر کا آغاز کیا۔ ہاشم رضا صاحب نے فرمایا کہ میر انیسؔ نے ایک شعر کہا تھا، لیکن وہ شعر میر انیسؔ نے اپنے لئے نہیں کہا تھا، کیونکہ میر انیس کو ان کی زندگی میں بہت بڑا رتبہ ملا اور ان کو بے حد سراہا گیا۔ ضمیر اختر نقوی صاحب بھی یہ شعر اپنے لیے نہیں پڑھ سکتے اس لئے کہ ان کو بھی ان کی زندگی میں خراج تحسین پیش کیا جا رہا ہے اور ان کی پذیرائی کی گئی ہے۔ وہ شعر تھا:

زندگی میں تو نہ اک دم خوش کیا ہنس بول کر
آج کیوں روتے ہیں میرے آشنا میرے لئے

ہاشم رضا صاحب نے فرمایا کہ قسیم امروہوی صاحب نے اپنے مسدس میں جو کچھ بھی ضمیر اختر نقوی صاحب کے لئے کہا ہے، وہ حرف بحرف حقیقت پر مبنی ہے۔ انہوں نے علامہ ضمیر اختر نقوی کو خراج تحسین پیش کیا اور ساتھ ہی ساتھ میر انیسؔ کی ایک مجلس جو الٰہ آباد میں منعقد ہوئی، اس کا حال ذکاء اللہ ذکا کی زبانی سامعین کو سنایا، سامعین جس کو سن کر بے حد لطف اندوز ہوئے، آخر میں ہاشم رضا صاحب نے انیسؔ کی زمین میں

اپنی ایک نظم میر انیس کی تعریف میں پیش کی، جس کے بعد تقریب کے اختتام کا اعلان کیا گیا اور مہمانوں کی پر تکلف ماحضر سے ضیافت کی گئی۔ ہاشم رضا صاحب نے علامہ ضمیر اختر نقوی کے والد ظہیر حسن نقوی سے گلے مل کر ان کو مبارک باد پیش کی اور کہا کہ نہ تو ضمیر اختر نقوی کے پاس کوئی دنیاوی منصب ہے، نہ وہ سرمایہ دار ہیں، لیکن پھر بھی جس کثیر تعداد میں لوگ آج کی تقریب میں آئے ہیں اور جس طرح لوگوں نے اپنے اپنے انداز میں ضمیر اختر نقوی صاحب کو خراج تحسین پیش کیا ہے، یہ صحیح معنوں میں ضمیر اختر نقوی صاحب کی عظمت اور لوگوں کی ان سے والہانہ محبت کا ثبوت ہے۔ شرکائے تقریب نے علامہ ضمیر اختر نقوی اور میر انیس اکیڈمی کے عہدے داروں سے معانقہ کیا اور ان کو زبردست مبارک باد پیش کی۔ مولائے کائنات کے غلام کی خدمات کے اعتراف میں منعقدہ تقریب میں ہر مہمان کا چہرہ اسی طرح کھلا ہوا اور روشن تھا جس طرح مولا کی محفل میں ہر شخص خوش و مسرور نظر آتا ہے۔

سید اشتیاق حسین ساغر لکھنوی

قطعہ در صنعتِ مقلوب

(جس میں دو مصرعے صنعتِ مقلوب میں ہیں)

شیرِ پاکستان بھی ہے کب ضمیر اختر فقط
ہے یہ خورشید ادب علم و سخن کے روح و جاں
بارش ماج و قریب بیرق و جامِ شراب
نائب روحِ کلام و مالکِ حورِ بیاں

پروفیسر سحر انصاری (صدر شعبہ اردو کراچی یونیورسٹی)

چند تاثرات

ڈاکٹر جانسن نے ایک جگہ لکھا ہے کہ جو ادیب و شاعر بقیدِ حیات ہیں، ان پر تنقید کی جائے تا کہ وہ اپنے فن کو نکھار سکیں اور تعریف صرف ان فنکاروں کی ہونی چاہئے جو دنیا سے گزر چکے ہیں۔ کیونکہ اس کے بعد فن میں ترمیم و اصلاح کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ معلوم نہیں ہمارے معاشرے میں ڈاکٹر جانسن کی یہ بات کس حد تک پہنچی کہ زندہ اربابِ کمال کی پذیرائی کا سلسلہ عرصے تک مفقود رہا۔ اس طرح کی روش پر شعرا نے بہت کچھ کہا بھی ہے۔ احمد ندیم قاسمی صاحب نے جوش صاحب کی موجودگی میں ایک مشاعرے میں یہ شعر پڑھا:

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن
یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

جوش صاحب نے فوراً کہا "جناب! یہ بھی خوش فہمی ہے" تاہم کچھ تغیرات زمانہ کا اثر، کچھ اکابر شناسی کی عالمی روایات کہ اس روشِ قدیم میں تبدیلی آ رہی ہے اور زندہ دوستی کا ایک میلان علم و ادب کی دنیا میں بھی مستحکم ہوتا جا رہا ہے۔

مجھے بڑی مسرت ہوئی کہ جب ہمارے عہد کے ایک صاحبِ طرز محقق اور خطیب علامہ ضمیر اختر نقوی کی علمی و ادبی خدمات کی پذیرائی اور اعترافِ کمال کے طور پر ایک اعلیٰ پائے کی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ اعترافِ کمال زندہ قوموں کا خاصہ رہا ہے۔ ضمیر

اختر نقوی صاحب کے باب میں جن اداروں اور افراد نے تقریب پذیرائی کی بنا رکھی، وہ بلاشبہ اہلِ علم و ادب کے شکریے کے مستحق ہیں۔

میں ذاتی طور پر ضمیر اختر نقوی صاحب کو بہت قریب سے جانتا ہوں اور ان کی غیر معمولی صلاحیتوں کا دل سے معترف ہوں، میں اس امر کا عینی شاہد ہوں کہ میر انیس اعلی اللہ مقامہٗ کی صد سالہ تقریبات سے کافی مدت قبل حضرت ضمیر اختر نے پاکستان کے بالعموم اور کراچی کے بالخصوص ادبی حلقوں اور ادبی رسالوں کے مدیروں کو اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ میر انیس کے شایانِ شان خصوصی نمبر شائع کریں۔ اس ضمن میں انھوں نے ہر مدیر سے عملی تعاون کیا اور تحریروں اور تصویروں کا خاصا اہم ذخیرہ ان میں تقسیم کیا۔ وہ خود ایک صاحبِ طرز اور بیدار مغز نقاد و محقق ہیں۔ "پاکستان میں اُردو مرثیہ" اپنی نوعیت کی منفرد تصنیف ہے، جس سے بعد کے محققین کو تحقیق کی نئی راہیں ملیں۔ اسی طرح "اُردو غزل اور کربلا" اور "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" ان کی تحقیق و تدقیق کی زندہ مثالیں ہیں لیکن "خاندانِ میر انیس کے نامور شعراء" اور دبستانِ ناسخ ان کے بے مثال کارناموں میں شمار ہونے کے لائق ہیں۔

ضمیر اختر نقوی صاحب کو میر انیس اور لکھنوی روایات ادب و تہذیب سے بے پایاں لگاؤ ہے۔ خود ان کی شخصیت میں لکھنوی تہذیب کے خوش رنگ اجزاء کی جھلک نظر آتی ہے۔ وہ ایک خوش اخلاق، متواضع، ذہین طباع اور خوش جمال انسان ہیں اقدارِ حیات کا پاس کرتے ہیں، طبعاً فیاض، علم دوست اور منکسر المزاج ہیں۔ ضمیر اختر نقوی صاحب کی انفرادیت کا ایک اور رُخ میرے پیشِ نظر ہمیشہ سے یہ رہا ہے کہ انھوں نے ابتداء سے اب تک اپنی تقاریر اور خطابت کی بنیاد ادب پر رکھی ہے۔ ادب و شعر سے وہ اپنی منطق اور استدلال کو سجاتے ہیں اور یہی وصف انھیں آج کے متعدد

علماء، خطبا اور ذاکرین سے ممیز و ممتاز کرتا ہے۔

میں نے ضمیر اختر صاحب کو علمی، ادبی، مذہبی تحقیق کے ہفت خواں طے کرتے دیکھا ہے، لیکن ان کی شخصیت کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ وہ کبھی خشک مزاج، تنگ طبع اور مغرور نظر نہیں آئے۔ اپنے بڑے سے بڑے کارنامے کو ہنستے مسکراتے، روا روی میں بیان کر جاتے ہیں۔ ان۔ کے کام پر نگاہ ڈالیے تو اندازہ ہوگا کہ فی زمانہ ادارے بھی اتنا کام نہیں کر رہے ہیں جتنا کہ تن تنہا ضمیر اختر نقوی صاحب کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں صحت دے اور تحقیق و تدقیق کی جولاں گاہ میں اسی طرح سرگرم سفر رکھے۔ ایں دعا از من واز جملہ جہاں آمین باد۔

ان کارناموں پر نظر ڈالیے اور پھر ضمیر اختر صاحب کے سراپے پر بھی نظر ڈالیے۔ ابھی ان کی عمر ہی کیا ہے۔ نوجوانی اور جوانی کے شب و روز تحقیق کی جاں کاہ وادیوں میں بسر کر دیے۔ بقول عزیز حامد مدنی:

تیری ہی طلب میں نذر کرنے
ہر شامِ وصالِ دوست ہاری

حقیقت یہ ہے کہ "کچھ بات نہیں آتا ہے آ وہ کراہی"۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کے یہ اوصاف و کمالات اظہر من الشمس ہیں۔ محبانِ اہلِ بیتؑ اور مشتاقانِ تحقیق و تصنیف میں سے کون ہوگا، جو ان کے نام نامی اور علمی کارناموں سے آگاہ نہ ہوگا، اور پھر بقدر ذوق و انسیت اپنے انداز میں ضمیر اختر صاحب کے کمالات کا اعتراف بھی ہو رہا ہے، چنانچہ یہ امر بھی میرے لئے باعثِ مسرت ٹھہرا کہ ہمارے عہد کے ایک خوش فکر مرثیہ گو جناب نسیم ابن نسیم امروہوی نے از راہِ محبت و انفرادیت ایک طویل مسدس علامہ ضمیر اختر نقوی کی مدح میں تصنیف کر کے اس

تقریب میں بزبانِ خود پیش کیا۔

نسیم، شاعرِ آلِ محمد حضرت نسیم امروہوی کے فرزند ارجمند ہیں۔ ان کے خاندان میں شاعری اور مرثیہ گوئی کی قدیم سے ایک روایت چلی آ رہی ہے۔ جدید مرثیے میں جن اکابر کے اسمائے گرامی تاریخ کا حصہ ہیں، ان میں حضرت نسیم امروہوی سرِفہرست ہیں۔ مجھے ان سے نیاز مندی کا شرف حاصل رہا ہے۔ خلوت و جلوت، مجلس و منبر، خانہ و دفتر، ہر جگہ انہیں دیکھا اور سنا۔ قسیم انہی کے فن اور نام کو روشن کیے ہوئے ہیں اور اسلوبِ نسیم کو بڑی ہمت و حوصلے سے نباہ رہے ہیں۔ اُردو کے جدید مرثیہ گو شعراء میں قسیم اپنے انداز کی وجہ سے نمایاں شناخت رکھتے ہیں۔ قسیم ابن نسیم، ضمیر اختر نقوی کے لڑکپن کے دوست اور ساتھی ہیں۔ انہوں نے نہایت خلوص، محبت اور یگانگت سے یہ مسدس لکھا ہے۔ ۱۰۹ بند کے اس مسدس کا عنوان اُنہوں نے "اعتراف و تحسین" رکھا ہے۔ اس کا ذیلی عنوان یوں ہے:

"علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی دینی، علمی، ادبی و تحقیقی خدمات، نظم کے آئینے میں"

اس میں شک نہیں کہ ضمیر اور عہدِ ضمیر کی ذاتی، سماجی، انفرادیت اور اجتماعی زندگی کو قسیم ابن نسیم نے بڑی محنت و محبت کے ساتھ قلم بند کیا ہے۔ ابتداء بجا طور پر قسیم نے امروہہ کی چار سو سال روایاتِ ادب کے ذکر سے کی ہے:

یوں تو ہر شہر میں اُردو کا ہے دروازہ کھلا ۔۔۔ دکن و دہلی کا ہے خاص ادب میں چرچا
یہ بھی دیکھیں کہ رواں ہے قلمِ امروہا! ۔۔۔ چار سو سال سے جاری یہ سفر ہے، بخدا!

فن سے مہکا ہوا گلزارِ شمیم آج بھی ہے
جس کی تصدیق کو تحقیقِ عظیم آج بھی ہے

پھر لکھنؤ اور ضمیر اختر نقوی صاحب کے خاندانی ماحول کا ذکر ہے۔ ضمیر اختر نقوی

صاحب بچپن ہی سے ذکر و خطابت کا میلان رکھتے تھے۔ گیارہ برس کی عمر میں انہوں نے ذکرِ عباسؑ سے خطابت کا آغاز کیا تھا۔ قسیم ابنِ قسیم نے گویا ایک بند میں ضمیر اختر نقوی کا بھرپور تعارف کرا دیا۔

لوگ یہ پوچھتے ہیں، کیسے ضمیر اختر ہیں　　جیسے ان کے ہیں سلف ویسے ضمیر اختر ہیں
کاش ایسے ہوں سبھی جیسے ضمیر اختر ہیں　　دیکھیں! زندہ ہے ضمیر ایسے ضمیر اختر ہیں

زندگی محوِ سفر رفِ احساس پہ ہے
ہر نفس خامۂ فن مسندِ قرطاس پہ ہے

اسی میں قسیم نے انکشاف کیا ہے کہ:

ایک سو تیس کتب ان کے قلم کی ہیں عطا

علامہ ضمیر اختر نقوی کی عمر اس وقت ۲۹ تیس برس کی تھی جب ان کی اہم کتابیں منصۂ شہود پر آنے لگیں۔ اس وقت حضرت جوش ملیح آبادی اور حضرت نسیم امروہوی نے انہیں بھرپور داد دی اور ان کی منہاجِ تحقیق و تدوین کو سراہا۔ اس اعتراف کے بعد ضمیر اختر نقوی صاحب کے بزرگوں، معاصروں، دوستوں اور شاگردوں کا تذکرہ ہے اور اعلیٰ قدر و مراتب ہر ایک کے احساسات و جذبات کو خوبی و سلیقے سے قلم بند کیا ہے۔ آگے چل کر لکھتے ہیں:

صرف ذاکر ہی نہیں، یہ ہے سخنور بھی نفیس　　نوحے گیارہ کہے اور منقبتیں لکھی ہیں تیس
بارہ قصائد و سلام اور ہیں غزلیں اکیس　　اک مسدس بھی کہا جس میں ہے توصیفِ انیس

ذوقِ شعری نہ ہو کیوں، واقفِ ہر رستہ ہے
بستۂ فکرِ انیس سے یہ وابستہ ہے

اس بند کی بیت قسیم ابنِ قسیم کے اسلوب کی مکمل عکاسی کرتی ہے۔ "واقفِ ہر رستہ"

اور ''بستۂ فکر سے وابستہ'' کا کیا کہنا!

قسیم ابنِ نسیم کے اس مسدس کا کمال یہ ہے کہ یہ علامہ سید ضمیر اختر نقوی کے باب میں تاریخ بھی ہے، تذکرہ بھی، سوانح حیات بھی، نقد و تبصرہ بھی۔ انہوں نے ان کی تمام اہم تصانیف کا نہ صرف ذکر کیا ہے، بلکہ وہ منظوم تنقید و تبصرہ بھی کرتے چلے گئے ہیں، جس سے قارئین کو ضمیر اختر نقوی صاحب کی تصانیف اور ان کے انفرادی مضامین و اسالیب کا بھی علم ہو جاتا ہے۔

''اعتراف و تحسین'' اپنی نوعیت کا ایک منفرد مسدس ہے۔ اس کی ادبی، تاریخی اور شاعرانہ حیثیت اپنی جگہ، لیکن یہ ایک خوب صورت گل دستۂ محبت و اخلاص بھی ہے، جس نے آج کی بے حس دنیا کے سوئے ہوئے ایوانوں کو اپنی خوشبو سے جگانے کی کوشش کی ہے۔ علامہ سید ضمیر اختر نقوی لائق صد مبارک باد ہیں کہ انھیں شاعر دوست کی شکل میں قسیم ابنِ نسیم جیسا مداح ملا اور قسیم ابنِ نسیم قابلِ تحسین ہیں کہ کہ انھیں سید ضمیر اختر نقوی جیسا باکمال ممدوح میسر آیا۔ اللہ تعالیٰ دونوں کو سلامت رکھے۔ آمین۔

پروفیسر سحر انصاری

جمعہ ۶ رجولائی ۱۹۸۳ء ساڑھے گیارہ بجے صبح

مکرمی ضمیر اختر صاحب! میں حاضر ہوا تھا۔ لیاقت حسین صاحب بھی ملاقات کے خواہاں تھے۔ ''کلبِ حسین نادر'' بھی موجود تھے۔ اب یہ سب اشتیاقِ دید کا سامان لئے واپس جارہے ہیں۔

امید ہے جلد بازدید ہوگی.........سحر انصاری

علامہ ضمیر اختر نقوی کی علمی و ادبی، دینی و ثقافتی
خدمات کے صلے میں
اعتراف و تحسین

(مسدس)

تصنیف:- قسیم ابنِ نسیم امروہوی

قسیم ابنِ نسیم امروہوی

اعتراف و تحسین

نذرِ علامہ ضمیر اختر نقوی

عالمِ فن میں ترقی کی سحر آج بھی ہے ۱ صدفِ فکر میں نایاب گہر آج بھی ہے
ادبِ عہد قدیمی کا اثر آج بھی ہے شہر میں اردو کے تہذیب کا در آج بھی ہے

کب سلاطیں کی نگاہوں میں ادب کھلتا ہے
اک قلم کار کے ہاتھوں سے یہ در کھلتا ہے

یوں تو ہر شہر میں اردو کا ہے دروازہ کھلا ۲ دکن و دہلی کا ہے خاص ادب میں چرچا
یہ بھی دیکھیں کہ رواں ہے قلمِ امروہا چار سو سال سے جاری یہ سفر ہے یکتا

فن سے مہکا ہوا گلزارِ قسیمؔ آج بھی ہے
جس کی تصدیق کو تحقیقِ عظیم آج بھی ہے

فن کی امروہوی تنظیم تو گھر میں ہے مرے ۳ دکن و دہلی ادب میرے تخیل میں ہے
لیکن اس نظم کا عنوان یہ مقصد ہے لیے رخشِ اردو جو چلے، لکھنؤ جا کر ٹھہرے

قلب ہر شہر پہ اردو نے اثر چھوڑا ہے
لکھنؤ پہنچی تو رخ چاروں طرف موڑا ہے

لکھنؤ قلزم تہذیب کا اک دھارا ہے ۴ نفس کے جہل کو با تیغِ ادب مارا ہے
لکھنؤ اردو کی ترسیل کا سیّارا ہے ذہنِ تخلیق کی تطہیر کا گہوارا ہے

یہ ترا ، کاتبِ تقدیر! کرم ہے گویا
لکھنؤ کعبۂ قرطاس و قلم ہے گویا

اسی کعبے نے کئی بابِ منوّر کھولے ۵ خلفائے اردو کی ترقی کے سرِ اسرار کھولے
صفحۂ فن پہ قلم کار کے جوہر کھولے شاعری اور خطابت کے نئے در کھولے

اب بھی وا لکھنوی افکار کا در ہے ، دیکھیں
علم کے در سے تمسّک کا اثر ہے ، دیکھیں

درِ علمی سے تمسّک کے صلے کا ہے یہ حال ۶ دو ہزار عیسوی میں کم تھے ترپن جب سال
لکھنؤ میں ہوا پیدا جو ضمیرِ اہلِ کمال قلعۂ نسلِ دیانتؔ کا بنا بابِ جمال

یہ ضمیر اک درِ تحقیق نیا کھولے گا
جس کی تصدیق کو حرفِ ادبی بولے گا

گزرے جب لکھنؤ میں شکرِ خدا گیارہ سال ۷ خونِ گردیزیؔ بنا راہِ تطہیرِ اعمال
آیا جب فن کی امانت سے دیانت کا خیال ذکرِ عباسؑ سے آغازِ خطابت تھا کمال

ہر نفس بوئے وفاداری سے سیراب ہوا
جو نواسہ تھا ظفرؔ کا ، وہ ظفریاب ہوا

عمر تھی گیارہ برس ، پھر بھی یہ رفعت پائی ۸ راس گیارہ کا عدد آ گیا ، عظمت پائی
گیارھویں نائبِ احمدؐ کی عنایت پائی ان کی تفسیر پڑھی ، فکر نے قوت پائی

ان کی تفسیر نے تقدیر کو چمکایا ہے
ان کے صدقے میں مفسّر کا لقب پایا ہے

بچپنے سے رہی تہذیبِ سلف ہمجولی ۹ بن گیا ذہنِ رسا کسبِ ادب کی جھولی

اردو یوں ساتھ رہی جیسے کہ دامن چولی آنکھ بھی تو سرِ آغوشِ خطیبہ کھولی

گود میں محسنہ کے طفل جو یہ آیا تھا

ذکرِ اصغر کا زمانے میں صلا پایا تھا

ہند سے پاک زمیں آئے جوش کے ارباب ۱۰ بن گیا قومی زباں ملک میں اردو کا نصاب

لیلیٰ اردو پہ آنے لگا پھر عہدِ شباب اس سفر میں ملا اردو کو بھی ہجرت کا ثواب

آئے شیدائی بھی اردو کے یہاں ہنرور بھی

لکھنوی فکر کے ساتھ آئے ضمیر اختر بھی

سن ولادت کا جو اس بحر میں آتا ہی نہیں ۱۱ سن وہی سمجھیں جو آزاد ہوئی پاک زمیں

غالباً کھینچ کے لے آیا یہی ربطِ حسیں جس سے روشن ہوئی ماحول کراچی کی جبیں

لے کے اوصافِ سلف کی یہ گواہی آیا

لشکری فکر کا بے باک سپاہی آیا

اے خوشا بخت یہ جب شہر کراچی آئے ۱۲ پہلی ہی بار ملاقات میں ہم کو بھائے

کیوں نہ دل ووق کا ان کی بھلا گن گائے ان کی خدماتِ ادب نظم کرے، جتلائے

بھی آتی ہے صبا قلب کے کاشانے سے

قامتِ وصف ہے عمل کے پیمانے سے

لوگ یہ پوچھتے ہیں، کیسے ضمیر اختر ہیں ۱۳ جیسے ان کے ہیں سلف، ویسے ضمیر اختر ہیں

کاش ایسے ہوں سبھی جیسے ضمیر اختر ہیں! دیکھیں! زندہ ہے ضمیر ایسے ضمیر اختر ہیں

زندگی محوِ سفر رفرفِ احساس پہ ہے

ہر نفس خامۂ فن مسندِ قرطاس پہ ہے

اہلِ دل، اہلِ نظر، شکل سے بھولا بھالا ۱۴ بہرِ دیں، دولتِ دنیا کو ہمیشہ ٹالا
فن کے ماحول کا وہ تجزیہ کرنے والا　　دفترِ جہل میں بے خوف لگا دے تالا

آلؑ و قرآن کا دامن جو بہم تھاما ہے
عمل و علم مساوی ہیں یہ علامہ ہے

وہ قلم کار جو تحریر کرے ذکرِ حمید ۱۵ قلم اس شخص کا ہر صنفِ سخن کی ہے نوید
شاخِ گل سے جو کرے قطعِ جہالت کا حدید　　قفلِ گنجینۂ تہذیب ادب کی ہے کلید

قلم ایسا کبھی پابند نہیں ہو سکتا
کارِ تحقیق کبھی بند نہیں ہو سکتا

ہے دماغ ان کا جو اک فکر و تجسس کا جہاں ۱۶ ادبی، دینی کتابوں کا ہے گویا یہ مکاں
جس میں محفوظ ہیں ہر بحثیں حدیثیں قرآں　　"عالمی لائبریری" ہے کہ ذہنِ انساں!

یہاں تحقیق کے گوشے میں بھی بیداری ہے
ایک سو تیس کتابوں کی یہ الماری ہے

ان کا گھر خود ہے کتب خانہ، یہ منظر دیکھیں ۱۷ صرف فہرستِ کتب ہی جو اٹھا کر دیکھیں
ان گنت مرثیوں کے مطلعِ انور دیکھیں　　یہی سب دفترِ الہام کے ہیں در، دیکھیں

حدِ ترویج میں ان سے متعلق ہیں ضمیر
گویا اک صاحبِ ادراک محقق ہیں ضمیر

ایک سو تیس کتب ان کے قلم کی ہیں عطا ۱۸ ان میں کچھ زیرِ اشاعت ہیں تو کچھ طبع شدہ
قطرے قطرے سے بنایا گیا گویا دریا　　منکشف ذہن ان کا وہ ہے جس میں سمندر ہے بھرا

عمقِ فکر نے ان کا یہ نظارا دیکھا
ڈوب کر فن کے سمندر میں ابھرتا دیکھا

لکھی "آئمۂ اثنا عشر" اک دینی کتاب ۱۹ شرف "تقدیس" کا شرف لکھ کے بڑھی کلک کی تاب
"کربلا اردو غزل" سے ملا خامے کو شباب   حرف آخر ہے "تعارف" ترابی کا نصاب

اک کتاب ایسی لکھی جس سے کہ بیداری ہے
سارے عالم کا جو منشور "عزاداری" ہے

دل میں تھے مرثیہ گو پاک وطن کے جو نہاں ۲۰ اک کتاب "ان پہ" لکھی جو ہوئی مشہور جہاں
ہیں نسیم، آل رضا، جوش، ہر اک روح رواں   ذکر سے جن کے ہوا مرثیے کا وزن عیاں

بات تقسیم سے یہ تیس برس تک کی ہے
چند برسوں کو حیات ابدی بخشی ہے

دکنی مرثیہ تا مرثیۂ نو عنواں ۲۱ گویا کہیے جسے "قاموس" "دبستان زباں"
صدی کرنوں کا بھی پھیلاؤ بھی ایسا ہے کہاں   چار سو تبصرہ یہ چار صدی کا ہے عیاں

گویا کوزے میں سمندر کا حشم بند کیا
وصف جو کھل نہیں سکتا تھا، قلم بند کیا

شعرا سارے نظر میں تھے جدید اور قدیم ۲۲ مرثیہ گوئی میں ہے طاق دبیر ایسا کلیم
وقف تھی جس انیس اس کے لیے فکر سلیم   جھکی خامے کی جبیں بارہا بہر تسلیم

افق فن پہ دبیر سخن آرا چمکا
اے محقق! تری قسمت کا ستارہ چمکا

مرثیائی ادب آثار حوالے لکھے ۲۳ جو ہیں تحریر کی دنیا کے اجالے، لکھے
سخت سے سخت بھی مضمون نرالے، لکھے   تبصرے ساتھ تو اکیاسی مقالے لکھے

تبصروں اور مقالوں سے یہی ظاہر ہے
خود بھی ہے مرثیہ گو، مرثیوں کا ماہر ہے

حرف آخر نہیں، گویا ہے یہ منزل کی سبیل ۲۴ کلیات ایک طرف دیکھیے تحریرِ قلیل
قطرۂ حرف کا پھیلاؤ ہے یا موجِ نیل "جزئیات" ان کے کلبِ خاص کی ہیں بحثِ طویل

خاک چھانی ہے سرِ عرصۂ تعلیم ضمیر
خضرِ راہِ ادب ، لائقِ تعظیم ضمیر

کبھی دیکھا نہیں سوتے ہوئے غفلت کا شکار ۲۵ وقت کی تیز روی سے ہیں ہمیشہ ہشیار
خواب کے وقت بھی ہیں بسترِ فن پر بیدار تکیۂ ذکرِ شہادت بنا نیندوں کا قرار

خدمتِ آلؑ سے بالکل نہیں فرصت، دیکھیں!
جسمِ لاغر کا یہ ہے وزنِ عبادت ، دیکھیں!

ایک ناظر ہے، مناظر ہے، نظارا ہے ضمیر ۲۶ ایک تنظیم ہے، منظر ہے، ادارا ہے ضمیر
گرہوں کے لئے شعلہ ہے شرارا ہے ضمیر ہر ادب دوست کا ساتھی ہے سہارا ہے ضمیر

دُرِ تحقیق لٹانے پہ جو آمادہ ہے
یہ بھی اقلیمِ ادبیات کا شہزادہ ہے

گر ضمیر ایسا ہے سرمایۂ نایابِ ادب ۲۷ اس کو محفوظ رکھے قوم ضروری ہے یہ اب
قدرداں مرثیے کا ہے، کریں قدر اس کی سب مرثیہ وہ ہے صحیفہ جو ہے زہراؑ کی طلب

کربلا جیسا کوئی ذکر دکھائے اردو
مرثیہ ، صنفِ سخن کا ہے خدائے اردو

اے ضمیر! ارضِ وطن پر ترا چمکا یہ نصیب ۲۸ تیرے قائل ہوئے دانشور و نقاد و ادیب
شعرا، فلسفہ داں، حافظِ قرآن و خطیب دیوں تعداد میں ہیں گنیے جو اردو کے نجیب

کیا سند ان کی ، سند تو یہ دوامی پائی
صاحبِ علم سلونی کی غلامی پائی

جوشؔ کے مرثیے کہتے ہیں یہ ہو کر فرحاں ۲۹ اے ضمیرؔ! آپ کا ہم پر ہے ابد تک احساں
مل گئی پہلے پہل ہم کو اشاعت کی جہاں   اب ہمارے ہی تجسس میں ہے جاگا یہ جہاں

یہ نہ ہوتا تو سمجھئے یہ فنا ہو جاتے
انقلابات کے پیغام ہوا ہو جاتے

اے ضمیرؔ! آپ کے یہ کار نمایاں بھائے ۳۰ معترف کیوں نہ ہر اک اہلِ نظر ہو جائے
جوشؔ کے ناسے یہ کہتے ہوئے آخر آئے   بھر دوں موتی ترے دامن میں یہ دل کی رائے

کیا کروں، حق سا نہیں پایا عنایت کا مزاج
وارثِ آلِ پیمبرؐ ہے سخاوت کا مزاج

تھے جو انداز انیسؔ کے تبسم اک ماہر ۳۱ جوشؔ کے مرثیوں پر ڈال نگاہِ غائر
پھر ضمیرؔ! آپ پاک خط سے کیا یہ ظاہر   مصحفِ جہد و عمل ہے یہ کتابِ شاعر

ڈھلی اشعار میں جو، وہ روانی کہئے
فن کی تلوار کا ٹھہرا ہوا پانی کہئے

یادِ صد سالہ انیسؔ کا تھا جس دم چرچا ۳۲ شاعرِ آلِ محمدؐ نے پھر اک خط لکھا
اے ضمیرؔ! آپ ہیں حق دارِ ستائش، بخدا!   آپ کی کاوشِ پیہم نے بڑا کام کیا

پہلی بار ارضِ وطن میں یہ سماں چھایا ہے
پرچمِ یادِ انیسؔ آپ نے لہرایا ہے

فکر کا مرکز و محور بھی استاد رہے ۳۳ مرثیہ گوئی کے معمار سدا یاد رہے
قلب میں حبِّ رضا نجم بھی آباد رہے   آخرش ان کے بچھڑ جانے سے ناشاد رہے

ان کی فرقت کے غم و درد خیالوں میں بھرے
اشکِ احساس مجلسوں کے پیالوں میں بھرے

پاک ہر خامی سے موصوف کا جو خامہ ہے ۳۳ فلکِ خدمتِ اردو کا یہ را تھاما ہے
فرقِ تحریر پہ تحقیق کا عمامہ ہے اس حوالے سے بھی یہ کام کا علامہ ہے
راہِ علمی میں زیادہ نہ کسی سے کم ہے
گویا تحقیق و خطابت کا یہ اک سنگم ہے

ہنر فکر میں تم صنفِ ہر اک لے کے بڑھے ۳۵ روش نظم و رباعی نہ سلاموں سے ہٹے
مثنوی، ہجو، غزل، مرثیہ، واسوخت پڑھے جب تو گلہائے عقیدت مرے لفظوں سے کھلے
مرثیہ ہی نہیں، گلِ فن کے پیارے چمکے
جس طرح چاند کے ہمراہ ستارے چمکے

تبصرہ اور بھی کچھ اہلِ قلم کا ہے شعار ۳۶ بحثِ علمی سے ہے ماجد کے تخیل پہ نکھار
شوقِ تحقیقِ عزاداری کے دیکھیں آثار غیر ہے پھر بھی بلندی پہ ہے شوبل کا وقار
کہا شوبل[۳] نے، عزاداری کا داعی ہے ضمیر
اک فروغِ غمِ شبیرؑ کا ساعی ہے ضمیر

ذکر مقصود ہے اب بہرِ تسلسل ان کا ۳۷ وہ بھی تعریف کے قابل ہیں جنہوں نے، یعنی
اے ضمیر! آپ کو تحسین کے قابل سمجھا ان کے بارے میں بھی اس نظم میں ہے لکھا گیا
ان میں سے چل بسے جو مر کے بھی پائندہ ہیں
انہیں اللہ سلامت رکھے جو زندہ ہیں!

آج بھی کل کی طرح فیضِ قلم جاری ہے ۳۸ عرصۂ اردو میں گزار کی گزاری ہے
ایسی، گزارِ حسینیؑ! آپ سے بیداری ہے تا حدِ خلدِ ادب آپ کی سرداری ہے
صدرِ تنظیمِ ادب، مصدرِ اردو گزار
گویا ہے دلی کا پیغمبرِ اردو گزار

اک بزرگ اور بھی ہیں حامل قرطاس و قلم ۲۹ نام ہے سید ہاشمؔ رضا اردو کا بھرم
بزم فن کے لئے ہے روح رواں آپ کا دم   ماہر شعبۂ تحریر ، ادب کا محرم
یہ چشم مرثیہ گویوں کے ہے حامی کے لئے
حسرتیں جگتی ہیں ہاشم کی سلامی کے لئے

راہ فن میں ہیں وحید الحسنؔ ان کے ساتھی ۳۰ کیوں نہ بتلاتے جمیلؔ ان کا جمال ادبی
کہا فاضلؔ نے ضمیرؔ! آپ پہ ہے فضل علیؑ   عسکریؔ بولے، سپاہی ہے یہ اردو کا جری
اے ضمیرؔ! آپ کے افکار کو تو ناز یہ ہے
صاد صفدرؔ سے محقق کا ہے، اعزاز یہ ہے

لکھنوی فکر منور ہے جو نیرؔ کے سبب ۳۱ حیدریؔ اردو کے میداں میں ہیں اک بربِ ادب
آج بھی کاظمؔ و جوادؔ کی فن کو ہے طلب   شمسؔ آزادؔ کھلاں ان میں سے ہر ایک کے لب
جن پہ ہے منقلب ادب آپ کے ہی کاندھے ہیں
یوں، ضمیرؔ! آپ کی تعریف کے پُل باندھے ہیں

ہے ضمیر دوسروں کی نظروں میں جو انسان شریف ۳۲ ناقدؔ فکر پہ ہے گویا بزرگوں کا ردیف
لکھنوی طرز مزاحی بھی ملا مثل ظریفؔ   ہے تبرا و تولا میں ابوذرؔ کا حلیف
دم تقریر سیاست ہے نہ چالاکی ہے
مصلحت ساز نہیں، بات میں بے باکی ہے

وہ مقرر جو لٹاتا ہے مضامیں کے گہر ۳۳ وہ مدبر کہ تدبر ہوا نازاں جس پر
وہ "ادب" آج بھی جس کی ہے سخن سنج نظر   ایسے "فاضل" پہ ہوا فضل خدائے برتر
وہ محقق جسے تحقیق کی دنیا کہیے
ایک لشکر ہے ادب کا، نہ اکیلا کہیے

ایک دیوانہ فن ، عاشق تحقیق ضمیر ۲۴ ایک تاریخ بکف ، لائق تحقیق ضمیر
عالم اردو کا اک شائق تحقیق ضمیر گویا اک مرثیوں کا خالق تحقیق ضمیر

ہاتھ سے دامن فن تو نہ کبھی چھوٹے گا
تیغ تحقیق کا لوہا ہے ، نہیں ٹوٹے گا

اتنی مضبوط ہے یہ منزل تحقیق علوم ۲۵ جو کبھی ہو نہیں سکتی کسی صورت معدوم
"شاعری اور حیات" ان کا ہے حرف مرقوم جس نے تحریر کی دنیا میں مچا رکھی ہے دھوم

آرزو پوری ہوئی ، شکر کے دن آئے ہیں
نسخے نادر قلمی "آرزو" کے پائے ہیں

ہیں رسالوں میں علم دار مضامیں یہ جناب ۲۶ "اردو نامہ" کا دعویٰ کہ کنول ہیں سر آب
ہے یہ "ارشاد" کا ارشاد ، ہیں تالیف مآب "جام نو" کہتا ہے پیتے ہیں ادب کی یہ شراب

جو بھی "فاضل" ہے ، اشارہ یہ فن لکھ کر ہے
"ماہ نو" سے ہوا روشن کہ ضمیر ، اختر ہے

یہ بھی اک کام ، ضمیر! آپ کا ہے بیش بہا ۲۷ علم انساب کا ذہنوں میں علم نصب کیا
گویا کشت شجرہ کو بھی لہو سے سینچا خون کا تھا جو سفر نامہ ، رگ دل سے لکھا

اپنی پہچان ہو انساں کو یہ تیاری ہے
چمن نسل میں کیا خوب شجرکاری ہے!

اے ضمیر! ایسا کسی نے بھی نہ میداں ڈھونڈھا ۲۸ تم نے تو حضرت تاریخ کا دبستاں ڈھونڈھا
نسل نو کی طلب فکر کا عنواں ڈھونڈھا مرثیہ گوئی کی تاریخ کا دیواں ڈھونڈھا

نسل نو ، فکر ترقی میں اگر رہتے گے
کیا عجب "محسن اردو" تمہیں یہ کہنے لگے

مجلسوں، تبصروں، تحریروں، مقالوں کی قطار ۴۹ ان کی فہرست مرتب کرے گر نظم نگار
کتنی کاوش وہ کرے پھر بھی نہ دریا ہو یہ پار عملی درس دیا کر کے یہ رستہ ہموار
جب کلی کھلتی ہے اس وقت ہی گل بنتا ہے
فکر کی راہ سے ہی ذکر کا پل بنتا ہے

ہے یہی منظر و پس منظر افکار ضمیر ۵۰ کھلیں گل ہائے مضامیں جو ہو شائع تحریر
آل و قرآں کی بہم پھیلے ہر اک سو تنویر ہے بھرم صدیوں کا سینتیس برس کی تقدیر
ملیں سینتیس برس میں جو یہ راہیں ان کو
کیوں بزرگوں کے زمانے نہ سراہیں ان کو

طے کریں اجرت مجلس، یہ نہیں ان کا شعار ۵۱ کوئی خود نذر کرے کچھ، نہ کریں پھر انکار
ایسے مداح کو کہتے ہیں "فرزدق کردار" کبھی گھٹتا نہیں، بڑھتا ہے تبرک سے وقار
دیکھ کر ان کو حواس اوروں کے یوں باختہ ہیں
یہ سند یافتہ عالم ہیں، وہ خودساختہ ہیں

اے ضمیر! آپ بھی ہیں معدنِ ذکرِ عترت ۵۲ مجلسیں پڑھنے کی ہے آپ میں اتنی قدرت
پانچ ہزار ایسی، ملی جن کو وطن میں شہرت" نہیں محدود یہیں تک یہ بیاں کی وسعت
غیر ملکوں میں مصلائے ولا بچھوایا
تین سو تیس جگہ فرشِ عزا بچھوایا

منتخب ہو دمِ تحریر کوئی بھی عنواں ۵۳ کھول دیں صفحۂ تاریخ و حدیث و قرآں
مرثیہ بہرِ حوالہ جو بنے زورِ بیاں ایک جا گوہرِ ہر صنف ہوں پھر زیبِ زباں
فن کے ہر دانۂ حوالے کا جو لاتے ہیں ضمیر
گویا مضمون کی تسبیح بناتے ہیں ضمیر

روشن افکار کی منبر پہ جو مشعل کی ہے ۵۳ بات تم نے نہ ضمیر! ایک بھی مجمل کی ہے
گفتگو باغِ فدکؑ پر بھی مفصل کی ہے   بحث بے مغز نہیں بلکہ مدلل کی ہے

نیتو ذکر تمہاری بھی جلاتی ہے
حق زہراؑ کی نماز ایسے پڑھی جاتی ہے

ایک تقریر بعنوان "خواتینؑ" ہے جلی ۵۵ بات خوش سے چلی نور جہاں تک پہنچی
اوجِ عصمت کے لئے گفتگو جب آگے بڑھی   حورِ گفتار کی آکر درِ زہراؑ پہ رکی

کل خواتین کو اس در کی خبر دی جائے
عملِ فضہؑ و زہراؑ پہ نظر کی جائے

ذوالفقارؑ آپ کی جب زینتِ گفتار بنی ۵۶ رزم کی بات تھی پر بزم کا معیار بنی
علم کی ڈھال بنی، جہل کو تلوار بنی   برشِ تیغِ علی، لفظوں کی جھنکار بنی

ان گنت وصف جو سنا کے یہ جتانے لگے
لب پہ امداد کو اشعار انیسؔ آنے لگے

پائے گفتار کو ہر زینۂ عنواں پہ دھرا ۵۷ مثلاً گھوڑوںؑ کے موضوع کا باندھا جو پرا
اسپ تخیل ضمیر اس گھڑی ٹھہرا نہ ذرا   فکر نے ذکر کے اصطبل میں گھوڑوں کو بھرا

گفتگو حد پہ تھی ہر نسل کی، ہر جوڑے کی
دستِ مضمون میں تھی باگ ہر اک گھوڑے کی

ہر رجب جن دنوں بطحا میں تھے علامہ ضمیر ۵۸ کسی مومن کے یہاں پہنچے بسر "بزم غدیر"
وہاں وہ آیۂ تبلیغ پہ کی جامع تقریر   بول اٹھے حرف، کھنچی خم کی سراسر تصویر

آپ کے ذکر کا تھاما ہے جو دامن، مولا!
اسی نسبت سے ضمیر آج ہیں ہر فن مولا

کربلا پہنچے تو دنیا ہی میں جنت دیکھی ۵۹ روضۂ شہ پہ گئے، دین کی جلوت دیکھی
منزلِ سجدہ گہِ عشق و مودت دیکھی وہاں عازی کا پڑھا مرثیہ، جشت دیکھی

ذکرِ عباسؑ تھا خوشنودیٔ زہراؑ کے لئے
فخر ہے فکرِ انیسِ سخن آرا کے لئے

پہنچے جب روضۂ مولائے رضاؑ پر بھی ضمیر ۶۰ داستاں روضے کی روضے پہ پڑھی باتفسیر
میرے لفظوں میں تھا گویا یہی متنِ تقریر شہ کے ہاتھوں نے ملی آیتِ حق کی یہ لکیر

لفظ کی کڑیوں نے سچائی کو زنجیر کیا
شہرِ تاریخ کو تقریر نے تسخیر کیا

مغربی ملکوں میں جب پڑھنے مجالس پہنچے ۶۱ کیں وہ تقریریں ملی داد انہیں غیروں سے
ہی محفل میں جو عیسائی ادیب آنے لگے شمعِ افکارِ انیس یہ جلا کر بیٹھے

اللہ اللہ، ضمیرا! آپ کا یہ پایا ہے
مرثیہ، قاریٔ انجیل سے پڑھوایا ہے

ہو مبارک تجھے، اے فکرِ انیس کے وکیل! ۶۲ پیش کی سامنے غیروں کے بھی مضبوط دلیل
بن گیا اہلِ کلیسا میں بھی ایماں کی سبیل ہوئی معروف زمانے میں انیسی تمثیل

سچ ہے قول اس کا، یہ اک اہلِ نظر بندہ ہے
بے انیس آج بھی بازارِ ادب مندہ ہے

آیا اک اور خطِ شفقتِ مولانا نسیم ۶۳ اس میں لکھا تھا، ضمیرا! آپ مقرر ہیں عظیم
گئے بیرونِ وطن آلؑ کے جب بن کے کلیم ذکرِ شبیرؑ سے پھیلائی وہاں غم کی شمیم

منصبِ نشرِ عزاداری سنبھالا، شاباش!
کیا مغرب میں بھی مشرق کا اجالا، شاباش!

ان کی قسمت میں تھی سیاحیِ دنیائے ادب ۶۴ پھول کیوں اہلِ ادب کے منہ پہ برسائے ادب
مرحبا کہہ کے نہ کیوں سینے سے لگ جائے ادب خاک چھانی تو ملے ہیں دُرِ زیبائے ادب

وجہِ تفریح بھی شیز کی مداحی تھی
دین کے واسطے دنیا کی یہ سیاحی تھی

کبھی ایسا بھی ہوا پہنچے جو مجلس میں ضمیر ۶۵ کسی نے دے دیا موضوع برائے تقریر
اس کی فی الفور بیاں کر دی مناسب تفسیر مجلسیں ایسی ہیں تینتیس، نہیں جن کی نظیر

یہ سلیقہ کسی آقا سے نہ آغا سے ملا
ذکرِ برجستہ کا فن نہجِ بلاغہ سے ملا

کامیابی سے ہے مربوط، خطابت ایسی ۶۶ حدِ تکمیل پہ عنوان ہے، حکمت ایسی
رزمیہ ذکر میں بھی زور ہے، قوت ایسی نثر پر نظم کا دھوکا ہو، سلاست ایسی

نثر کو نظم سے جو تم نے نکھارا ہے، ضمیر
نقشِ اسلوبِ انیس کو ابھارا ہے، ضمیر!

شمعِ افکار جلائی سرِ اوجِ منبر ۶۷ دیکھ کر کہتے تھے مجلس میں یہی اہلِ نظر
شخصیت ہے کہ مصور کا ہے شہکارِ ہنر اے نسیم! اپنے تخیل سے یہ کھینچ ایک نظر

جو بھی افکار کے پیمانے سے ناپا، لکھ دے
وارثِ طرزِ نسیم! اب یہ سراپا لکھ دے

وہ سراپا کہ جسے پست نہ بالا کہیے ۶۸ قد و قامت میں ادب کا ہے جیالا کہیے
زلفیں کہتی ہیں، گھنے گیسوؤں والا کہیے اور آنکھوں کو مئے فن کا پیالا کہیے

بھویں آنکھوں پہ جبیں کیسی ہلالی، دیکھیں
حسنِ مصحف کی لکیریں ہیں جمالی، دیکھیں

وہ شباہت کہ نظر کھاتی ہے اکثر دھوکا ۶۹ غور سے دیکھیں تو بس ایک ہی ابھرے چہرا
آیئے اس سوچیں ذرا کس سے ہے ملتا جلتا   جس نے منبر کو جلا بخشی ہے ایسا بندہ

عہدِ حاضر نے دوبارہ یہ حشم پایا ہے
بجز تقریر یہ ہم شکلِ انیس آیا ہے

صرف ذاکر ہی نہیں یہ ہے سخن ور بھی نفیس ۷۰ نوحے گیارہ کہے اور منقبتیں لکھی ہیں
بارہ تعداد سلام اور ہیں غزلیں اکیس   اک مسدس بھی کہا جس میں ہے تتبعِ انیس

ذوقِ شعری نہ ہوں کیوں، وہ واقفِ ہر رستہ ہے
بستۂ فکر انیس سے یہ وابستہ ہے

ہر اک عنوان کو منبر سے جلا دیتا ہے ۷۱ شعر پڑھتا ہے تو منظر یہ دکھا دیتا ہے
رنگِ الفاظ سے تصویر بنا دیتا ہے   پھر اسے طاقِ سماعت میں سجا دیتا ہے

سُن کے احباب یہ کہتے ہیں کہ جوشیلا ہے
جو حسد کرتے ہیں، ان کے لئے زہریلا ہے

وہ وہی دھیان جو شہرت پہ نہیں دھرتا ہے ۷۲ ایسا دیوانہ کتابوں پہ فقط مرتا ہے
جو مخالف ہے بھی ذکر مگر کرتا ہے   کچھ بھی ہو، علم کا یہ شخص تو دم بھرتا ہے

سچ تو یہ ہے کہ ذہانت بھی بہت پائی ہے
بات میں وزن ہے، تحریر میں گہرائی ہے

وقف ہے جو کہ برائے سخن ایسا بندہ ۷۳ برعکس جو ہے صدائے سخن ایسا بندہ
جو سرِ بزم سجائے سخن ایسا بندہ   بندۂ خاص خدائے سخن ایسا بندہ

طالبِ علم کا اک ماحصل جہد کہو
مستند اگلے خطیبوں کا ولی عہد کہو

یاد ہے تیرہ سو اکیانوے ہجری اب تک ۷۴ یاد صد سالہ انیسؔ سخن آرا کی دمک
اور ضمیرؔ آپ کے احساس دبنگ و دو کی چمک بھی کہتی ہے نمایاں ہے یہ خدمت بے شک
لیلیٔ فن کو یہ ڈھونڈھے سے بھی مجنوں نہ ملے
عاشقِ مرثیہ کا ان کو لقب کیوں نہ ملے

رخِ اشعار انیسؔ سے ہٹایا پردا ۷۵ منقولِ سخن سخن کے پیا خلدوں کو اس سے جدا
موسیٔ فن کا عصا، عیسیٔ فن کی ہے جلا کتب درسِ انیسؔ کا محافظ ٹھہرا
کام سے اس کے بھی مشہور ہوا نام انیسؔ
ہے یہ پیغامبرِ مصحفِ پیغام انیسؔ

ایسا ہے وصفِ مراثی کا یہ مضمون نویس ۷۶ سارے مضمون ہیں اس ایک نفیس بے انیس
کم ہیں تحقیق کی دنیا میں ضمیرؔ ایسے رئیس کیسہ فکر میں ہے دولتِ اشعارِ انیسؔ
اوج مست قلندر ہے، فقیر ایسا ہے
پاس زہراؑ کی دعا ہے، یہ امیر ایسا ہے

جو بھی تحریر ہے وہ حرفِ دعا سے نکھری ۷۷ اک کتاب ایسی لکھی جس سے کھلی دل کی کلی
الفتِ جلد پہ ہے عشقِ علیؑ کی سرخی پہلے ہی باب میں قرآں سے لئے وصفِ علیؑ
باب کہتا ہے کہ بانگِ ازلی ہے یہ کتاب
بائے بسم اللہ توصیفِ علیؑ ہے یہ کتاب

نقطۂ "با" سے یہ نکتہ بھی عیاں ہم پہ ہوا ۷۸ سات ابواب ہیں جس میں یہ ہے نسخہ ایسا
اس کو حق گوئی کے میزاں میں جو تولا تو کھلا شعرا اردو کے ہیں عشقِ علیؑ سے زندہ
یہ کتاب آئینہ ایماں کا دکھانے آئی
بغضِ حیدرؑ کے اندھیروں کو مٹانے آئی

جس کے مضموں سے عیاں ہے صلائے اردو ۷۹ محسنِ فن ہیں بھی مدح سرائے اردو
دینی خدمات ہیں ان سب کی برائے اردو محو ہیں عشقِ علی میں شعرائے اردو
ابھری افکار قدیمی کی شبابی صورت
دے دی گل ہائے عقیدت کو کتابی صورت

غازۂ جلد پہ ہے خوں کی جو رنگت کا گماں ۸۰ ابھری ہے سرخیٔ تحریر لئے یہ عنواں
سرخرو "عشقِ علی" سے ہوئے اہلِ ایماں کربلا والوں کا بھی رنگِ شہادت ہے عیاں
نہ کبھی وقت کے دھارے میں بہے گی یہ کتاب
رنگ پائندہ ہے، پائندہ رہے گی یہ کتاب

دو سو چھہتر ہوئے گل ہیں شعرا زیبِ کتاب ۸۱ جن کا دنیائے ادب میں نہیں ملتا ہے جواب
اک سو چھپن کے ہیں افکار سے اردو پہ شباب جن میں ہر اک ہے یمِ عشقِ علی سے سیراب
خارج اردو سے سخن ان کا جو ہو جائے گا
دجلۂ اردو ادب خشک نظر آئے گا

اک قصیدہ بھی چھپا اس میں وہ الہام صفات ۸۲ ایک شہکار ہے جو عالمِ دیں کی سوغات
باسم المنتظر اسلامیہ آلِ صفات مرثیہ کہہ کے نسیم ان کا یہ بتلا گئے بات
خود اسوۂ شبیر حیات ایسی تھی
شاعرِ آل ہے مداح، یہ ذات ایسی تھی

ایسے مداح جو اردو کا سہارا ہو جائیں ۸۳ اک سو چھپن جو بہم یہ سخن آرا ہو جائیں
جمع ہو کر یہ عقیدت کا اشارہ ہو جائیں ایک چھ پانچ کریں، جمع تو بارہ ہو جائیں
جشنِ مدح کی اک بارہ دری ہے اردو
ذکرِ آئمہ سے اثنا عشری ہے اردو

ماح ذہنوں پہ تو ایسے شعرا کرتے ہیں ۸۴ مدح معظوم کے میداں میں قدم دھرتے ہیں
دجلۂ عشق سے مشکیزۂ دل بھرتے ہیں جو علی والے ہیں مر کر بھی نہیں مرتے ہیں

بادۂ عشقِ علی جم کے جو پینا سیکھا
جی کے مرنا ہی نہیں، مر کے بھی جینا سیکھا

حمیریؒ ہوں کہ ہوں دعبلؒ کہ کمیتؒ و حسانؒ ۸۵ شیخ سعدیؒ ہوں کہ فردوسی کہ ہوں وہ سلطانؒ
شمسؒ تبریز و سنائیؒ ہیں ولا کی پہچان جتنے مداح علی ہیں، یہ ہے سب کا ایمان

عشق جب ''عشقِ علی'' میں ڈھلے ایمان بنے
وسعتِ مدح میں پھیلے تو یہ قرآن بنے

وزنِ ایمان کی میزان بنا عشقِ علی ۸۶ مرض اک ہے جو نفاق، اس کی دوا عشقِ علی
عملی شکل میں حق کا کلمہ عشقِ علی کل عبادات کا حاصل، بخدا! عشقِ علی

وادیٔ عشقِ علی میں اگر انساں کھو جائے
لونے کانٹوں پہ تو شہباز قلندر ہو جائے

سات دلیلوں کا کلام اس میں ہے پاک وطاہر ۸۷ شامل ذکر ہوئے سات عرب کے شاعر
فارسی کے بھی ہیں دس شعر و سخن کے ماہر یہ کتاب ایسی ہے چومے اسے چشمِ ناظر

جذبۂ عشقِ علی یوں بھی مکمل ہوگا
سجدۂ لب پہ جلد اب تو مسلسل ہوگا

اولیا کے ہے عقائد کی کتاب، آئینہ ۸۸ انتساب اس کا علی والوں کے ناموں سے ہوا
بوذرؒ و میثمؒ و حجرؒ ابنِ عدی اہلِ ولا قنبرؒ و ابنِ سکیتؒ آیتِ عشقِ مولا

خوں سے ان پانچوں نے سینچا چمنِ عشقِ علی
یہ بھی ہیں پنجتنی پنجتنِ عشقِ علی

کتنی مکمل ہے کتاب اس کو جو دیکھیں پڑھ کر ۸۹ پائیں چھتیس مضامین صفاتِ حیدرؑ
کھلے ایمان و عقیدت کا سراسر دفتر   رک گیا کلکِ ضمیر اتنا بالآخر لکھ کر

کس نے ، کب پایۂ مولودِ حرم کو چوما
ہاں! فقط مہرِ نبوت نے قدم کو چوما

اک کتاب اور لکھی جو ہے کتابوں میں رئیس ۹۰ جس کا عنوان بنا "کتبہ و اولادِ انیس"
نو سو بارہ بہ عدد جس کے ہیں صفحات نفیس   باب تفصیل کے ہیں جس میں کل "چیدہ" بائیس

علمِ ابجد سے ملی ان کو سند ، کیا کہنا!
لفظ چیدہ کے ہیں بائیس عدد ، کیا کہنا

ہے یہ اک ایسی کتاب آئینۂ فکر جمال ۹۱ مرثیہ گویوں کے ہے ذکر سے ہر صفحہ نہال
اے قسیم اس کو پڑھیں ہم تو یہ پہنچے ہو خیال   سفرِ نسلِ انیس کو ملی حدِ کمال

ہم بھی نازاں ہیں ، بہ فطرت جو یہ ہم تک پہنچی
شاعری خون میں رچ بس کے قلم تک پہنچی

اے قسیم! اب سفرِ خامہ کرو ختم یہیں ۹۲ حرفِ آخر ہو وہ مقطع نظر آئے جو حسیں
بیت کا دوسرا مصرع ہو نشانِ تحسیں   جس سے تاریخ برآمد ہو برائے تحسیں

ایک آئینۂ اوصاف نسب ہیں یہ ضمیر
اک خطیب ، اہلِ قلم ، اوجِ ادب ہیں یہ ضمیر

۱۹۹۵ء

حواشی:

۱ شمیم امروہوی۔

۲ سید دیانت حسین نقوی ، رئیس مصطفیٰ آباد (ضمیر اختر نقوی کے دادا)

۳ علامہ سید ضمیر اختر نقوی، سید شہاب الدین گردیزی کی نسل میں ہیں۔

۴ سید ظہیر حسن نقوی، علامہ سید ضمیر اختر نقوی کے والد۔

۵ سید ظفر عباس نقوی بی۔اے علیگ، علامہ ضمیر اختر کے نانا۔

۶ حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام۔

۷ علامہ ضمیر اختر کی والدہ ماجدہ سیدہ رحمت بیگم مرحومہ۔

۸ علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی مطبوعہ وغیر مطبوعہ تصانیف۔

۹ علامہ ضمیر اختر نقوی کے دولت کدے میں بہت بڑی لائبریری ہے جس میں ہزاروں کتابیں موجود ہیں اور لاتعداد غیر مطبوعہ مرثیے بھی ہیں۔

۱۰ "آئمہ اثنا عشر" انگریزی سے ترجمہ۔

۱۱ "شرف الدین شاہ ولایت"۔

۱۲ "اردو غزل اور کربلا"۔

۱۳ مجالس ترابی ۵ جلدیں۔

۱۴ "تاریخ عزاداری"۔

۱۵ "اردو مرثیہ پاکستان میں"۔

۱۶ تاریخ مرثیہ نگاری دس جلدیں۔

۱۷ جناب ضیاء الحسن موسوی نے فرمایا۔

۱۸ "جوش ملیح آبادی کے مرثیے"۔

۱۹ حضرت جوش ملیح آبادی کے خط سے اقتباس۔

۲۰ حضرت نسیم امروہوی کے ایک خط سے اقتباس۔

۲۱ سید آل رضا اور نجم آفندی کی یاد میں دو مجلّے شائع کیے۔

۲۲ ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

۲۳ امریکن اسکالر مسٹر ورنن جیمز شومل ورجینیا یونیورسٹی، امریکا۔

۲۴ پروفیسر کرار حسین، سابق وائس چانسلر، بلوچستان یونیورسٹی۔

۲۵ سید ہاشم رضا کراچی۔ (سابق گورنر مشرقی پاکستان)

۲۶ جناب وحید الحسن ہاشمی۔

۲۷ ڈاکٹر جمیل جالبی۔

۲۸ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل۔

۲۹ پروفیسر حسن عسکری۔

۳۰ ڈاکٹر صفدر حسین زیدی۔

۳۱ ڈاکٹر نیر مسعود

۳۲ ڈاکٹر اکبر حیدری (صدر شعبۂ اردو، کشمیر یونیورسٹی، سری نگر) لکھتے ہیں:-

"ضمیر اختر نقوی ایک اچھے محقق اور بہترین خطیب بھی ہیں۔ ۱۹۷۶ء میں جب لکھنؤ آئے تھے تو یہاں کے سخن فہم حضرات اور عقیدین کے علاوہ پڑھے لکھے لوگوں کا خاصا مجمع ان کی مجلسیں ہمہ تن گوش ہو کر سنتا تھا۔ مجلسیں کیا پڑھتے ہیں گویا منبر پر جادو جگا رہے ہیں۔ خدا تعالیٰ نے انہیں اچھی اور روشن دماغ سے سرفراز کیا ہے۔ ان میں وہ تمام صلاحیتیں موجود ہیں جو کسی ذہین، مطاق اور جینئس انسان میں ہونا چاہئیں۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کے دماغ میں وہ نادر اور نایاب چیزیں محفوظ ہیں جس سے وقتاً فوقتاً ہم دور افتادگان بھی فیض یاب ہوتے ہیں۔ وہ ایک ادارہ اور ایک انسٹی ٹیوٹ سے کم نہیں ہیں"۔

۳۳ ڈاکٹر کاظم علی خاں (لکھنؤ)

۳۴ علی جواد زیدی (صدر اردو اکیڈمی، لکھنؤ) لکھتے ہیں:-

"ضمیر اختر نقوی کی سعی پیہم ایک خوش آئند مستقبل کی پیامی ہے۔ وہ ایک اچھے محقق ہیں، تحقیقی مواد کو سلیقے سے یکجا کرنے اور پیش کرنے کی صلاحیت قابلِ قدر ہے"۔

۳۵ جگن ناتھ آزاد (صدر شعبۂ اردو، جموں یونیورسٹی، کشمیر) لکھتے ہیں:۔
"ضمیر اختر نقوی کے علمی اور ادبی کارناموں سے پاکستان اور ہندوستان کی تمام یونیورسٹیاں اور تمام اہلِ نظر مستفید ہو رہے ہیں"۔

۳۶ ظریف لکھنوی۔

۳۷ "میر انیس کی حیات اور شاعری"، تالیف: ضمیر اختر نقوی۔

۳۸ آرزو لکھنوی۔

۳۹ اردو سہ ماہی۔

۴۰ "ارشاد"، کراچی۔

۴۱ جامِ نو۔

۴۲ ماہِ نو۔

۴۳ جناب ضمیر اختر نقوی ماہرِ علمِ انساب بھی ہیں۔

۴۴ "دبستانِ تاریخ"، تالیف: ضمیر اختر نقوی۔

۴۵ آغازِ خطابت ۱۹۵۸ء، جائزہ تا ۱۹۹۵ء، کل ۳۷ برس۔

۴۶ علامہ ضمیر اختر نقوی کے پانچ ہزار کیسٹ مختلف موضوعات پر محفوظ ہیں۔

۴۷ متعدد مقامات پر عزاداری کی بنیاد رکھی۔

۴۸ "فدک" کے موضوع پر ۲۵ تقاریر محفوظ ہیں۔

۴۹ دس تقاریر "عورت اور اسلام"۔

۵۰ دس تقاریر "عظمتِ ذوالفقار"۔

۵۱ تیس تقاریر "عظمتِ ذوالجناح"۔

۵۲ یہاں ہر فن مولا کے معنی ماہرِ فن کے ہیں۔

۵۳ زیارت کربلائے معلّٰی (عراق)۔

۵۴ زیارت مشہد مقدس (ایران)۔

۵۵ یورپ اور امریکا میں آپ نے عشرے پڑھے۔

۵۶ بے شمار تقاریر ایسی ہیں کہ منبر پر پہنچنے کے بعد مجمع سے موضوع آیا اور فی الفور تقاریر ہوئیں۔

۵۷ "شعرائے اردو اور عشقِ علی" جلد کا رنگ سرخ ہے۔

۵۸ "خاندانِ میر انیس کے نامور شعراء"۔

کلیمِ آلِ عبا شاہد نقوی

اے اہلِ نظر.....!

کیا بات کریں ان سے، جو بغضِ ازلی میں
کرتے ہیں نقائص کی تلاش ایک ولی میں
اے اہلِ نظر! دیدۂ بینا سے یہ دیکھو
.........۱۳۱۳ھ
....
کیا کہتے ہیں اردو شعرا عشقِ علی میں
.........۱۹۹۳ء
....

شفیع عقیل:

روزنامہ جنگ کا تبصرہ

اعتراف و تحسین پر تبصرہ

علامہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب ایک علمی و ادبی شخصیت ہیں۔ وہ خطیب بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، نقاد بھی ہیں اور ذاکر بھی ہیں انھوں نے اردو مرثیہ یا رثائی ادب اور میر انیس کے سلسلے میں جو کام کیا ہے اسے علمی حلقوں میں بہت سراہا گیا ہے۔ یہ مختصری غیر مجلد منظوم کتاب قسیم ابن قسیم امروہوی کی تصنیف ہے جس میں علامہ ضمیر اختر نقوی کی علمی و ادبی اور مذہبی خدمات کو خراج تحسین پیش کیا گیا ہے۔ یہ نظم مسدس کی صورت میں لکھی گئی ہے جس کے ایک سو دس بند ہیں، دوسرے لفظوں میں اسے ایک منظوم مقالہ بھی کہا جاسکتا ہے جس میں ممدوح کی علمی خدمات کا اعتراف ان کی کتابوں اور تحریروں کے حوالے سے کیا گیا ہے۔

علی حیدر ملک

کراچی کا ادبی منظر نامہ

میر انیس اکادمی نے ادیب و خطیب علامہ سید ضمیر اختر نقوی کے اعزاز میں ایک تقریب اعتراف و تحسین منعقد کی جس کی صدارت سید ہاشم رضا اور نظامت ماجد رضا عابدی نے انجام دی۔

پروفیسر سحر انصاری نے اس تقریب سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی ادبی و دینی خدمات کا اظہار تسلسل کے ساتھ ہوا ہے۔ مرثیے کے سلسلے میں ضمیر اختر نقوی صاحب نے جو کام کیا ہے، اس نوعیت کا کام کسی اور نے نہیں کیا۔ میر انیس کے تعلق سے ان کا کام ایک بڑا کارنامہ ہے جسے صحیح معنوں میں مشن کہنا چاہیے۔ بنیادی طور پر وہ ادیب ہیں، اسی لیے جب وہ خطابت کے منبر پر آئے تو ان کی خطابت میں بھی ادبیت نمایاں رہی۔ "شعرائے اُردو اور عشق علی" ان کا ایک منفرد کارنامہ ہے۔ اس سے پہلے "خاندان میر انیس کے نامور شعرا" اور "اُردو غزل اور کربلا" میں وہ داد تحقیق دے چکے تھے۔ انھوں نے مزید کہا کہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی نے اپنا یہ منشور بنا لیا ہے کہ وہ اپنی علمی و ادبی تصانیف کے ذریعے قوم و ملت کی خدمت کرتے رہیں گے۔ لہٰذا ہمیں بھی اپنا یہ منشور بنا لینا چاہیے کہ ہم ضمیر اختر نقوی کو اسی طرح خراج تحسین پیش کرتے رہیں گے۔

محسن نقوی امروہوی اور ماجد رضا عابدی کے منظوم خراج تحسین کے بعد تقسیم

امروہوی نے مسدس کی ہیئت میں ایک سو دس بندوں کا ایک قصیدہ پیش کیا جسے منظوم مقالے کا نام دیا گیا تھا۔ اس منظوم مقالے کو پڑھنے میں شاعر نے کم و بیش ڈھائی گھنٹے صرف کیے۔

صدر تقریب سیّد ہاشم رضا نے قسیم امروہوی کے منظوم مقالے کا ایک نسخہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے کہا کہ قسیم امروہوی نے ضمیر اختر نقوی کے متعلق جو باتیں کہی ہیں، وہ سب حقائق پر مبنی ہیں، ان میں غلو سے کام نہیں لیا گیا۔ صاحب صدر نے میر انیس کے کچھ اشعار کے بعد آخر میں اپنا ایک سلام سامعین کی نذر کیا۔ (ہفت روزہ "اخبار جہاں" کراچی، ۱۵ مئی ۱۹۹۵ء)

قبلہ و کعبہ۔ آداب

مولا آپ کو صحت و سلامتی عطا کرے سب سے پہلے آپ کو عید زہرا مبارک ہو، رات آپ کا پروگرام "ٹی وی ون" پر دیکھا بہت خوبصورت انداز میں آپ نے گفتگو کی بہت سے دلائل سے جواب دے کر آپ نے پوری قوم کا سر فخر سے بلند کر دیا ہے۔ آپ اس ملت کا سرمایہ ہیں آپ اللہ کی ایک روشن آیت اور ہمارے لئے آج کے دور میں ہدایت کا سرچشمہ ہیں۔

خدا آپ کا سایہ ہمارے سروں پہ قائم رکھے۔

ہمیشہ آپ کی دعاؤں کا طالب

زاہد علی
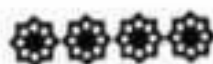
نخنؔ فتح پوری:

شیریں بیاں

ہے ضمیرِ اخترؔ شیریں بیاں
وقت کا سب سے بڑا تاریخ داں
ہے نحیف الجثہ لیکن الاماں
علمِ تاریخی کا ہے کوہ گراں
اس نے فرسودہ روش کو چھوڑ کر
رکھ دیا ہے ذہنِ انساں موڑ کر

خطابت

مولانا مرزا محمد اشفاق شوق لکھنوی:

خلوص پیکر

عزیزم علامہ ضمیر اختر صاحب کے لیے

خطیب باکمال، ادیب بے مثال، آشنائے رموز مودت، واقف اسرار محبت، انجمن لیلائے فصاحت، جلیس و عروس بلاغت، عندلیب چمنستان ولایت، بلبل بوستان عصمت، سرو چمن اردو، سفیر گلشن لکھنو، نازِ تحقیق، فخر تدقیق، ناشر آیات جلی، کاشف فضائل علی، شیدائے صداق اثنا، عاشق مراد لافتیٰ، گدائے مقصود ہل اتیٰ، فقیر باب قل کفی، مست صہبائے غدیر، دیوانۂ جناب امیر، ہارون[1] زماں، بہلول دوراں، موذن نماز عشق علی، نقیب عظمت ولایت، ولی کلیم منبر، مداح حیدر، سلیمان بلقیس زباں، شہنشاہ اورنگ بیاں، غواص لولوُ و مرجاں، ثنا خوان عترت و قرآں، رفیق صاحبان ولا، ندیم ارباب عزا، مبین سانحۂ کربلا، ذاکر حضرت سید الشہداء، رہرو طریق قنبری، سالک مسلک بوذری، عمار فطرت، سلمان طینت، وفا جوہر، خلوص پیکر عزیزم (علامہ) ضمیر اختر نقوی۔

---

[1] نوٹ: ہارون مکی (صحابی حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام)

صادق امام (فرزند خان بہادر امداد امام اثرؔ)

خطیب الکوثر علاّمہ ضمیر اختر

"خطیب الکوثر علامہ ضمیر اختر" یہ کتاب ندیم شبلی ایڈووکیٹ نے ترتیب دی ہے۔

زیر تبصرہ کتاب خطیب الکوثر علامہ ضمیر اختر نقوی کی شخصیت کے تمام پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہے۔ لمحہ موجود میں فن خطابت ان کے دم سے روشن ہے۔ جنوبی ایشیا کے علاوہ مغربی ممالک میں بھی علامہ اپنی خطابت کا لوہا منوا چکے ہیں۔ لندن، بریڈ فورڈ، برمنگھم میں ان کے سامعین ان کی استعداد علمیت وفن وہنر اور افکار کا بالمشافہ مشاہدہ کر چکے ہیں۔ رثائی ادب پر اتھارٹی رکھتے ہیں اور اس موضوع پر ان کی تصانیف حلقہ دانشوراں سے گرانقدر پذیرائی حاصل کر چکی ہیں۔

علامہ ضمیر اختر کثیر المطالعہ خطیب ہیں۔ ان کی ذاتی لائبریری علم وادب کا بیش بہا خزینہ ہے، جس میں بے شمار موضوعات پر کتابیں موجود ہیں۔ لمحہ موجود میں جب کہ ہمارا معاشرہ علمی لحاظ سے زوال پر آمادہ ہے۔ ایسی ہمہ صفت شخصیت کا دم بڑا غنیمت ہے۔

علامہ کی خطابت کسی زاہد خشک کی تقریر کی طرح بے کیف نہیں ہوتی، بلکہ دل کشی کی حامل ہوتی ہے۔ انداز بیاں ایسا عام فہم ہے کہ ہر عمر کے سامعین مستفید ہو سکتے ہیں۔ ان کی علامانہ خطابت قدیم وجدید فکر کا سنگم ہے۔ "خطیب الکوثر" کو جوش ملیح آبادی نے اس طرح نذرانہ عقیدت پیش کیا ہے۔

تیرا وجود فخر ضمیر حیات ہے
تو محض ایک فرد نہیں کائنات ہے

قومی زبان (بابائے اردو نمبر اگست ۲۰۰۲ء)

ڈاکٹر گوہر نوشاہی

علامہ ضمیر اختر کی شخصیت کا احاطہ

علامہ ضمیر اختر نقوی اپنے علم وفضل اور جادو بیان خطابت کے حوالے سے ایک جانی مانی شخصیت ہیں۔ وہ خطابت کی جان اور مجالس کا نقطۂ پرکار ہیں۔ ان کے ارادت مند پوری دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں اور ہر مکتبِ فکر ان کے جوہرِ دانش کا لوہا مانتا ہے۔ انہوں نے فروغِ ادب بالخصوص مرثیہ فہمی میں بھی بے حد محنت کی ہے اور اپنا ایک الگ مقام بنایا ہے۔ زیرِ نظر کتاب علامہ صاحب کی شخصیت اور کارہائے نمایاں کے اعتراف کے طور پر مرتب کی گئی ہے جس میں ضمیر صاحب کے بارے میں پچاس مقالے اور ان کو نذرانۂ عقیدت پیش کرنے والوں کی متعدد منظوم تخلیقات شامل ہیں۔

کتاب کے مطالعے سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ ضمیر اختر کی شخصیت کا پورے طور پر احاطہ نہیں کیا جاسکتا۔ مضامین میں عقیدت مندی کی فضا علمی تجزیوں پر حاوی ہے۔ اس تشنگی کے باوجود اس خطیبِ بے مثال سے ذہنی اور فکری وابستگی رکھنے والوں کو اس کتاب کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے تاکہ وہ ان کی شخصیت کو مثال بنا کر اپنی خوابیدہ صلاحیتوں کو اجاگر کرسکیں۔

سیّد مسعود حسین زیدی عرف ننّن صاحب
(مختار خاص شیعہ وقف بورڈ لکھنؤ)

لکھنؤ میں علاّمہ ضمیر اختر نقوی کی بے مثال خطابت (۱۹۷۶ء میں)

اس سال لکھنؤ کے محرم کی خصوصیات میں ایک اضافہ یہ تھا کہ علامہ ضمیر اختر صاحب تقریباً دس برس کے بعد پاکستان سے لکھنؤ تشریف لائے اور اپنی بے مثال خطابت سے لکھنؤ کے محرم کو اور زیادہ پُر رونق بنا دیا۔ کراچی سے آنے والی اطلاعات میں علامہ ضمیر اختر کی خطابت کے چرچے بہت سنے تھے، لیکن ان کو سننے کا اتفاق پہلی بار ہوا۔ جب وہ کراچی سے لکھنؤ آئے تو میری ان سے پہلی ملاقات سرکار ناصر الملت اعلیٰ اللہ مقامہ کے شریعت کدے پر ہوئی جہاں وہ سرکار روح الملت مولانا علی ناصر سعید عبقاتی قبلہ سے محو گفتگو تھے۔ میں ان کی تقریر سننے کے لئے بے چین تھا، لیکن وہ لکھنؤ میں چند دن مجالس پڑھ کر اپنے آبائی وطن مصطفیٰ آباد ضلع رائے بریلی تشریف لے گئے۔ واپسی پر محرم انہوں نے لکھنؤ میں کیا اور پہلی مجلس ان کے پڑھنے کی اولڈ بوائز شیعہ کالج میں منعقد ہوئی۔ پہلی تقریر کے بعد مومنین کا یہ عالم تھا کہ پروانوں کی طرح آگے پیچھے چل رہے تھے اور ہر عزادار چاہتا تھا کہ اس کے عزاخانے میں علامہ ضمیر اختر مجلس پڑھیں، فرمائشات کا انبار ضمیر میاں نے میرے حوالے کر دیا، یعنی ان کی ڈائری میرے پاس

تھی، اور ان کے پروگرام میں نے نوٹ کئے، لیکن ان کے قیام کا صرف ایک ہفتہ باقی تھا۔ ضمیر میاں کی روانگی چھ جنوری کو تھی، لیکن میرے اصرار پر انہوں نے اپنی روانگی تیرہ جنوری تک بڑھادی، ضمیر میاں نے لکھنؤ میں تقریباً بارہ یا تیرہ مجلسیں پڑھیں اور یہ تمام مجلسیں یادگار رہیں گی۔ تقریریں برابر ریکارڈ ہوتی جارہی تھیں اور جو لوگ ریکارڈ نہیں کر سکے، انہوں نے بعد میں دوسرے حضرات سے ٹیپ مانگ کر تقاریر ریکارڈ کی ہیں۔ لکھنؤ میں جگہ جگہ ان کی مجالس کے ٹیپ چل رہے تھے۔

اسی لکھنؤ میں مولانا سید محمد دہلوی اعلیٰ اللہ مقامہٗ، حافظ کفایت حسین صاحب اعلیٰ اللہ مقامہٗ، ذوالفقار علی شاہ صاحب مدظلہٗ، علامہ رشید ترابی اعلیٰ اللہ مقامہٗ، بھی حضرات آئے، لیکن یہ مقبولیت کسی ذاکر کو نہیں ملی۔ اس کے ثبوت میں علامہ ضمیر اختر نقوی کی خطابت کا ایک مختصر جائزہ پیش کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے جہاں تک مشاہدہ کیا ہے، اس سے اندازہ ہو جائے گا کہ علامہ ضمیر اختر نقوی نے لکھنؤ کے نکتہ رس مجمع سے خراج تحسین کیسے وصول کیا اور یہ مقبولیت انہیں آئمہ معصومین کے در سے کیسے ملی۔

انداز خطابت:

ضمیر میاں کا انداز خطابت بالکل منفرد تھا۔ اس دور میں جبکہ پاکستانی ذاکرین حضرت علامہ رشید ترابی کے انداز خطابت سے متاثر ہیں اور ہندوستان کے ذاکرین مولانا مظفر طاہر جرولی کے انداز خطابت کو اپنا رہے ہیں، ضمیر میاں نے بالکل نیا انداز تاریخ خطابت کو عطا کیا ہے۔ وہ زیادہ چیختے چلاتے نہیں ہیں، جبکہ زیادہ تر ذاکرین مجمع پر رعب ڈالنے کے لئے آواز کی آخری حدوں سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں۔ ضمیر میاں کی آواز میں گھن گرج ہے، لیکن سماعت پر بار نہیں ہوتی۔ روانی ماشاءاللہ ایسی ہے کہ

ایک کے بعد ایک الفاظ ڈھلتے چلے جاتے ہیں کسی مقام پر سبقت لسانی یا لکنت کا نام و نشان نہیں۔

حافظہ:

میں نے مولانا پاروی صاحب اعلی اللہ مقامہٗ، مولانا محسن نواب صاحب اعلی اللہ مقامہٗ کو بھی سنا ہے اور موجودہ ذاکرین میں سب کو برابر سنتا رہتا ہوں، لیکن یہ حافظہ جس کے مالک ضمیر میاں ہیں، ان کی مثال میں نہیں دے سکتا۔ ان کے حافظہ میں علم و ادب کی ہر بات محفوظ ہے۔ آپ جس موضوع پر چاہیں، وہ بے دھڑک بولتے چلے جائیں گے۔ کلام پاک اور نہج البلاغہ پر ان کی عمیق نظر ہے۔ میر تقی میر، غالب، میر انیس، مرزا دبیر، میرزا عشق، تعشق، وحید، واجد علی شاہ کے اشعار ہزاروں کی تعداد میں انہیں زبانی یاد ہیں۔

انتخاب موضوع:

ضمیر میاں کی خطابت میں خاص فن یہی ہے کہ وہ مجلس کی پچویشن دیکھ کر موضوع کا انتخاب کرتے ہیں۔ انہوں نے اولڈ بوائز شیعہ کالج کی آٹھ محرم کی مجلس میں معرکۃ الآرا تقریر کی جس کے نقش ہم لکھنؤ والوں کے ذہن سے نہیں مٹ سکتے۔ اولڈ بوائز کی مجلسیں مرثیہ خوانی کی مجلس ہوتی ہیں، یہاں صرف قدیم اور جدید مرثیے پڑھے جاتے ہیں۔ یہ پہلا اتفاق ہے کہ یہاں حافظ علی صابر صاحب نے کسی خطیب کو منبر پر رونق افروز ہونے کی دعوت دی، یہ فخر بھی ضمیر میاں کے لئے تھا۔ صابر صاحب یہ مجلسیں بہت برسوں سے کرتے ہیں اور پوسٹر کا عنوان "آل محمدؐ کی پسندیدہ ذاکری" ہوتا ہے۔ ضمیر میاں نے منبر پر بیٹھتے ہی کہا "آج میں "آل محمدؐ کی پسندیدہ ذاکری" کے عنوان پر تقریر کرنا چاہتا ہوں اس لئے کہ یہاں کا یہی موضوع ہوتا ہے۔" چالیس منٹ

کی تقریر میں ضمیر میاں نے ہزاروں مومنین لکھنؤ کے دل جیت لیے۔ موقع و محل کو دیکھ کر انتخاب موضوع کا یہ ادنیٰ سا کرشمہ تھا۔ دوسری مثال بھی عجیب و غریب ہے۔ علم یادگار حسینی کی مجلس میں ضمیر میاں نے "علم" کے عنوان پر تقریر کی۔ جناب کاظم علی خاں صاحب کی منعقدہ مجلس میں ملت جعفریہ کے نونہال منبر کے گرد اشتیاق میں بیٹھے تھے اس لیے ضمیر میاں نے "بچپن اور اسلام" کے عنوان پر تقریر کی۔ ضمیر میاں آخری تقریر کشمیری محلے میں کر رہے تھے، اس لیے ضمیر میاں نے خواجہ معین الدین چشتی کی رباعی "شاہ ہست حسین" کو عنوان مجلس بنایا۔ نو محرم کو ہاشم صاحب کے امام باڑے میں جو تقریر انہوں نے کی، اس کا انتخاب موضوع مولانا سید علی ناصر سعید عبقاتی نے کیا تھا۔ یہ بھی بے مثال تقریر تھی "شعرائے اُردو اور حسینؑ" بہر حال فن خطابت میں انتخاب موضوع کو اوّلیت حاصل ہے اور ضمیر میاں اس فن پر مکمل دسترس رکھتے ہیں اور یہ ان کی مقبولیت کا ایک پہلو ہے۔

معیارِ علم:

ضمیر میاں کی خطابت میں علمی معیار بہت بلند ہے۔ وہ لطیفے سنا کر مجمعے کو بے وقوف نہیں بناتے۔ آج کل ذاکری کی علمی سطح یہی ہے کہ مزاحیہ لطیفے سنا کر ان سے استدلال قائم کیا جاتا ہے، لیکن ضمیر میاں کا استدلال علم سے بھرپور ہوتا ہے۔ درمیان تقریر کوئی لفظ علم سے بھرپور آتا ہے تو اس کی تشریح میں وہ علم کے دفتر کھول دیتے ہیں۔ ایک تقریر میں انہوں نے لفظ "سکندری" کی تشریح و معنی بتائے۔ اس مقام پر ایک عالم فاضل بزرگ نے فرمایا کہ میں نے ادب سید احمد صاحب قبلہ اعلی اللہ مقامہٗ سے پڑھا ہے لیکن آج اس لفظ کی تشریح پہلی بار سنی ہے۔ ایک تقریر میں ضمیر میاں نے لفظ "علم" کے معنی بتائے، ایک تقریر میں عربی لفظ "تنعبد" کے معنی بتائے، ایک تقریر میں لفظ

"قریب" کے معنی و مطالب بیان کئے اور سچ پوچھیے تو میں نے لکھنؤ میں اپنی پوری عمر گزاری ہے، یہ چیزیں میں نے پہلی مرتبہ سنیں۔ اس دور میں جبکہ معیار علم منبر پر ختم ہو رہا ہے، ذاکرین کو اس نوجوان خطیب سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ علامہ ضمیر اختر کی ایک تقریر "نہج البلاغہ" سے متعلق تھی۔ مولائے کائنات علی ابن ابی طالبؑ نے خطبوں میں اپنے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا ہے، اس کو تاریخ کی روشنی میں کچھ اس طرح سجا کر ضمیر میاں نے پیش کیا کہ دل چاہتا تھا وہ بولتے رہیں اور اس تقریر کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔

تقریر میں حوالۂ کتب کو خاصی اہمیت حاصل ہے۔ ضمیر میاں نے تمام اسلامی کتب کے حوالوں کے ساتھ گفتگو کی، ناسخ التواریخ، بخاری، مسلم، تاریخ بغداد، آغانی کی تاریخ شعرائے عرب، بحار الانوار، اصول کافی، تہذیب وغیرہ کے حوالے دیے، اردو ادب میں کلیات میر، دیوانِ غالب، مراثی انیس کا تذکرہ کیا۔ میرا خیال ہے کہ حوالۂ کتب سے سامعین کا ذوقِ کتب بینی بڑھ جاتا ہے اور خطیب کی سیرِ کتب اور وسعتِ مطالعہ کا اندازہ ہوتا ہے۔ ضمیر میاں کو تاریخ پر عبور حاصل ہے، اس لیے کہ انہوں نے بعض تقریریں خالص تاریخ سے متعلق بھی ہیں، جن میں اسلامی تاریخ کے علاوہ ہندوستانی تاریخ، ایرانی اور عربی تاریخ کے تذکرے بھی شامل تھے، خاص کر تاریخ اودھ اور لکھنؤ کی ایک ایک بات "عزائے حسینؑ" کی روشنی میں پہلی مرتبہ سنی اور معلومات میں اضافہ ہوا۔

ذکرِ مصائب:

ذاکر کی مقبولیت کا اندازہ تقریر کے اس حصے پر ہوتا ہے۔ کربلا کے مصائب وہی ہیں جو سب بیان کرتے ہیں، لیکن کسی کے بیان میں اثر ہوتا ہے اور کہیں بہت زور لگانے کے باوجود گریہ نہیں ہوتا۔ مصائب پڑھنا بہت مشکل مسئلہ ہے۔ لکھنؤ کا مجمع اور

یک زبان ہو کر کہے کہ علامہ ضمیر اختر صاحب کا مصائب پڑھنے میں جواب نہیں ہے!
یہ مضمون تفصیلی نہیں، ورنہ میں تفصیل سے ان کی تقریر کے مصائب کے ٹکڑے تحریر کرتا اور اس پر تبصرہ کرتا۔ اس مقام پر بھی ضمیر میاں نے سب سے ہٹ کر اپنا ایک منفرد راستہ نکالا ہے۔

محرم کی ۸ تاریخ کو حضرت عباس علیہ السلام کی شہادت کا تذکرہ ہوتا ہے۔ صبح سے ذاکرین حضرت عباسؑ کی رخصت اور شہادت بیان کر رہے تھے۔ ایک بجے ضمیر اختر صاحب کی مجلس تھی۔ اگر انہیں بیانات کو وہ دہراتے تو وہ بات نہ ہوتی، جو انہوں نے "عظمت عباسؑ" دوسرے رُخ سے بیان کی۔ معصومین علیہ السلام کی نظر میں جناب عباسؑ کی منزلت اور پھر کلام انیس سے عہدہ علم داری کا بیان، اس کے بعد جناب عباسؑ کے فرزند کا میدان جنگ میں شہید ہونا اور لاش پر امام حسینؑ کا آنا کچھ اس انداز سے بیان کیا کہ منظر نگاہوں کے سامنے دکھائی دینے لگا۔ ۹ محرم کو امام حسینؑ کی رخصت اور شہادت کا بیان بالکل جداگانہ انداز لئے ہوئے تھا۔ ایک مجلس میں جناب سکینہؑ کی شہادت کا تذکرہ اس انداز سے کیا کہ قید خانے کی مکمل تصویر نگاہوں میں پھر گئی۔ اس وقت کی بے کسی اور اہل حرم کی تنہائی، شام کا انقلابی خاکہ سامعین کی نظروں کے سامنے ایک منظر کی شکل میں اُبھرنے لگا۔

معیارِ زبان:

خطیب کی کامیابی کا راز خطابت کے اسی پہلو میں پوشیدہ ہے، یعنی اس کی زبان درست ہو۔ ضمیر میاں کی زبان کوثر و تسنیم سے ڈھلی ہوئی، خالص منبر کی زبان ہے۔ ان کی زبان میں بازاری الفاظ کہیں دور دور نہیں نظر آتے۔ ذم کے پہلو تلاش کرنے کے باوجود نہیں ملتے۔ بعض مشہور خطیبوں کی تقریروں میں سیکڑوں الفاظ ذم کے ہوتے

ہیں۔ ڈرامے کے پہلو ہر جملے میں موجود۔ ضمیر میاں کا ماحول کراچی کا ماحول ہے لیکن اس قدر شفاف زبان استعمال کرنے پر وہ قابلِ مبارک باد ہیں۔ ہمارے لکھنؤ کے ایک خطیب بہت عمدہ زبان بولتے ہیں لیکن الفاظ کی ترکیبیں با معنی نہیں ہوتی ہیں۔ ضمیر میاں کے الفاظ اور ترکیبیں وزن رکھتی ہیں اور وہ الفاظ دل پر اثر کرتے ہیں۔ اس قدر سنبھل کر اور احتیاط کے ساتھ ایک نوجوان کا منبر پر بولنا اس دور کی خطابت کی تاریخ میں ایک بے مثل کارنامہ ہے۔ زبان میں اگر زی اور شیرینی نہیں ہے تو مصائب بے اثر ہو جاتے ہیں۔ ضمیر میاں نے منبر پر اس روایت کی اہمیت کو برقرار رکھا اور لکھنؤ کے منبر سے ''حسینیت کی زبان'' کی سند حاصل کی ہے۔

آپ کو منبر پر ایسے الفاظ بھی سننے کو ملتے ہوں گے۔ قتل، وقت، فکر، نکات، شکست، نشست، ختم، لیکن علامہ ضمیر اختر درست اضافتیں استعمال کرتے ہیں، زیر و زبر کا خیال رکھتے ہیں۔ وہ فکر کو فِکر، قتل کو قتل، وقت کو وقت، نکات کو نِکات، شکست کو شکست، نشست کو نشست اور ختم کو ختم بولتے ہیں۔ صحیح الفاظ پر وہ بعد میں تبصرہ بھی کرتے ہیں۔ ایک دن میں نے لفظ ''تنگ'' کے سلسلے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا ''لفظ ''تنگ'' ہی صحیح ہے اس لئے کہ ''تنگی'' ہے، ''تنگی'' نہیں بولتے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی بحیثیت محقق:

ضمیر میاں ادب کے محقق ہیں لیکن منبر پر بھی وہ ایک ذمے دار محقق کی حیثیت سے قدم رکھتے ہیں۔ لکھنؤ کا مشہور اخبار ''قومی آواز'' ۹ جنوری ۱۹۷۷ء کی اشاعت میں ان کو ''محقق اعظم'' تحریر کرتا ہے اور میرا خیال ہے کہ یہ خطاب ان کے لئے بہت موزوں ہے، اس لئے کہ وہ منبر پر ضعیف روایتوں سے پرہیز کرتے ہیں اور تحقیق کے ساتھ ہر روایت پر استدلال قائم کرنے کے بعد اس روایت کو بیان کرتے ہیں، غلط روایتوں پر

منطقی اور تاریخی دلائل دے کر اسے غلط ثابت کرتے ہیں۔

ائمہ معصومینؑ کی عصمت و عظمت پر اگر کسی روایت سے غلط فہمی پیدا ہوتی ہے تو اس روایت کو پڑھنا انتہائی کم عقلی کی دلیل ہے۔ ہمارے دین میں جب "علم رجال" موجود ہے، علماء کے اقوال موجود ہیں تو ہمارے خطیبوں کو ایسی غلطیاں نہیں کرنی چاہئیں۔ ضمیر میاں نے اپنی تقریروں میں کہا کہ اہل بیتؑ کے "معجزات" لوگ اس لئے مجلسوں میں نہیں پڑھتے کہ جدید دور کے لوگ تسلیم نہیں کرتے، لیکن سائنسی دور میں ہی معجزات پڑھنا زیادہ ضروری ہے، اس لئے کہ اب زیادہ آسانی سے معجزے کی عظمت کو اُجاگر کیا جا سکتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ آپ فضائل میں زیادہ معجزے چاہے نہ بیان کریں، لیکن ذکر مصائب میں نہایت ضروری ہے معجزے کی عظمت کو اُجاگر کیا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ دنیا کے ہر مذہب میں اب "شہید" کا مرتبہ بلند ہو گیا ہے اور پوری دنیا مانتی ہے کہ "شہید" مرنے کے بعد زندہ ہو جاتا ہے اور اس کی روح سے معجزے صادر ہوتے ہیں۔ امام حسینؑ دنیا کے سب سے عظیم شہید ہیں اور ان کے فرق مبارک سے جو معجزات رونما ہوئے، انہیں عقل تسلیم کرتی ہے اس لیے تحریر و تقریر دونوں میں ان کا تذکرہ لازمی ہے۔

۱۰ محرم کو "عاشورا ایڈیشن" میں حکومت ہند کا مشہور اُردو اخبار "قومی آواز" اپنے پہلے صفحے پر یہ خبر شائع کرتا ہے:

"آج نویں محرم کے دن مجلس میں ماتم تمام ہوا۔ غفراں مآب کے امام باڑے، حسینیہ ہاشم صاحب اور ناظمیہ اسکول میں حسب دستور بڑے اجتماعات ہوئے۔ ان مقامات پر روز کی طرح علی الترتیب مولانا سید کلب عابد مجتہد، مولانا سید علی ناصر سعید اور مولانا سید حمید الحسن نے مجالس پڑھیں۔ مجمع تینوں جگہ بہت کثیر تھا اور اس طرح

جانے والی تمام سڑکیں عزاداروں سے پر تھیں۔ پاکستانی عالم سیّد ضمیر اختر نقوی جو لکھنؤ شیعہ کالج کے سابق طالب علم ہیں، اس سال محرم کرنے لکھنؤ آئے ہوئے ہیں۔ انہوں نے شیعہ اولڈ بوائز شیعہ کالج اور امام باڑے ناظم صاحب میں متعدد مجالس اپنے مخصوص انداز میں پڑھیں۔ جن کو سننے کے لئے زبردست مجمع ہوا۔"

"Pakistani scholar S.Z. Naqvi, who initially belongs to Lucknow,is a Product of the Shia College and who has come to Lucknow to join the Moharrum Programmes also addressed a number of "Majlises" in his prose Com-Poetry style and drew large crowds at the Shia Old Boys School and Imambara Nazim Saheb. He was much apprecitated for his literary and learned discourse and the style of presentation of his subject."

ہمارے قومی اخبار "سرفراز" نے بھی تفصیل سے لکھا ہے۔ اس کے علاوہ ہندی اخبار "نوجیون" بھی انہیں خیالات کا اظہار کرتا ہے۔ ضمیر میاں کی بے مثال خطابت کی مقبولیت کا اندازہ مجھے اس وقت شدت سے ہوا جب پورا لکھنؤ درگاہ حضرت عباسؑ کی مجلس کے بعد ان کو چند ہفتوں کے لئے ٹھہرنے کو کہہ رہا تھا اور آخری مجلس میں ان کو رخصت کرنے کے لئے اژدحام تھا۔

۲۲ محرم کو ضمیر اختر صاحب کو اسٹیشن پر رخصت کرنے کے لئے لکھنؤ کے مشہور عالم دانشور، ادیب، اور شاعر جوانانِ لکھنؤ، بھی موجود تھے جن میں قابلِ ذکر ہستیاں مولانا روح الملت آغا علی ناصر سعید عبقاتی، قبلہ ڈاکٹر اکبر حیدری، (صدر شعبہ اردو، کشمیر یونیورسٹی) پروفیسر کاظم علی خاں، پروفیسر شید صفی پوری (شیعہ کالج) جناب دلاور حسین (چیف ایڈیٹر، نیشنل ہیرالڈ) جناب امیر علی جون پوری، منظور نقوی

(خانوادۂ میر انیس)، سید محمد احمد (خانوادۂ میر انیس)، جناب زوار حسین صاحب، شفیق رضوی صاحب، عاقل رضوی صاحب، نفیس عابدی صاحب، شکیل عابد صاحب، صفدر رضا صاحب، جاوید مہدی صاحب، شاہد حسین صاحب، یعنی لکھنؤ کے تمام معزز حضرات چار باغ اسٹیشن پر اس بے مثال خطیب کو الوداع کہنے کے لیے آئے تھے۔

لکھنؤ کے ماتم داران حسین ضمیر میاں کے لیے ہمیشہ دعا گو رہیں گے، اس لیے کہ انہوں نے اس سال ہمارے یہاں کے محرم کو چار چاند لگا دیے۔ بقول چند حضرات کے اس سال لکھنؤ کے ایک ذاکر کا انتقال ہوا تو امام حسین علیہ السلام نے علامہ سید ضمیر اختر نقوی کو لکھنؤ بھیج دیا۔

مولانا ڈاکٹر کلبِ صادق

"میرے قابلِ فخر اور عزیز دوست ضمیر اختر نقوی کو اللہ تعالیٰ نے بیک وقت ذہانت اور حافظہ دونوں چیزوں سے نوازا ہے میں نے اُن کی تقریر لندن میں سنی، لکھنؤ اور کراچی میں بھی سننے کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے دنیائے خطابت میں اپنی انفرادیت کا لوہا منوالیا ہے۔ میں ضمیر اختر نقوی سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔"

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

کلامِ میر انیسؔ

علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی خطابت کے آئینے میں

خاندانِ میر انیسؔ کی آٹھ پشتوں نے زبان کو سنوارنے اور سجانے میں اپنی زندگیاں وقف کر دیں۔ دنیا کی کوئی بھی زبان اپنے محسنین کی آٹھ پشتیں پیش کرنے سے قاصر ہے اور اُردو زبان میں بھی یہ واحد مثال ہے کہ جہاں آٹھ پشتوں تک مستقل مزاجی کے ساتھ ایک ہی فن یعنی مرثیہ گوئی کی ترویج و ترقی میں حصے کرائے معراج کمال پر پہنچا دیا جائے۔

"مداحیٔ شبیرؑ" پر یہ خاندان ہمیشہ فخر و مباہات کرتا رہا اور یہ ناز انھیں زیب بھی دیتا تھا۔ کسی عظیم مقصد کے لئے عظیم موضوع کی ضرورت ہوتی ہے، خاندانِ میر انیسؔ نے شاعری کا مرکزی موضوع واقعۂ کربلا کو قرار دیا۔ واقعۂ کربلا جس میں کائنات کی تمام وسعتیں سمائی ہوئی ہیں، یہ واقعہ محدود نہیں بلکہ آفاقی ہے، یہی وجہ ہے کہ دنیا کی ہر زبان نے واقعۂ کربلا کے اثرات کو قبول کیا ہے۔ لیکن واقعۂ کربلا کی ترویج و تفہیم اور اس واقعے کے ہیرو حضرت امام حسین علیہ السلام کے کردار کی عظمتوں کا بیان اور مدح کی سعادت اُردو زبان کے حصے میں آئی اور اُردو زبان نے اس سعادت کو خاندانِ میر انیسؔ کے لئے مختص کر دیا، یہی وجہ ہے کہ آج اس خاندان کو بھی آفاقیت حاصل ہے۔

میر انیس اور ان کے خاندان کے شعرا کے کلام میں واقعات کی تصویر کھینچ دینے کی خصوصیت اور واقعات بھی حقیقت حال سے قریب تر اور کتب تاریخ سے سند یافتہ، واقعے کے ایک ایک جزو کو اجاگر کرنے کا فن اس طرح کہ پڑھنے والے کو گراں نہ گزرے اور اس کی دلچسپی بھی برقرار رہے، مصوری و مرقع نگاری، ترتیب الفاظ، تشبیہ و استعارے کی رفعت، الفاظ کی ندرت، فکر کی جودت، حسن زبان کی جاذبیت جیسی خصوصیات بدرجہ کمال موجود ہیں۔ یہ وہ احسانات ہیں جنھیں اُردو زبان کبھی نہ اُتار سکے گی۔

میر انیس کے مرثیے سلاست، فصاحت اور روانی کی وجہ سے آج بھی سب سے زیادہ مقبول ہیں اور یہی میر انیس کا سب سے اہم کارنامہ ہے جس نے اُردو زبان کو دنیا کی دوسری بڑی زبانوں کی صف میں جگہ عطا کی ہے۔ میر انیس کا دوسرا اہم ترین کارنامہ اُردو شاعری میں رزمیہ شاعری کو شامل کر کے درجہ کمال تک پہنچانا ہے۔ اُردو شاعری میں EPIC یعنی طویل رزمیہ نظم کی کمی کو میر انیس کے مرثیوں نے پورا کیا ہے۔ خاندان میر انیس کے شاعروں نے میر انیس کی اس عظیم روایت کو آٹھ پشتوں تک برقرار رکھا۔ واقعات کی تصویر کشی میں بھی خاندان میر انیس کے شعرا ایک منفرد مقام کے مالک ہیں، اور تصویر کشی اسی وقت پُرلطف ہوتی ہے جب اس کی ادائیگی بھی اسی طرح کی جائے جو مرثیے کی DEMAND ہے، چنانچہ عبدالحلیم شرر "گزشتہ لکھنؤ" میں لکھتے ہیں:

"الفاظ کی مناسب آواز کے تغیرات اور مضامین کے موافق چہرہ بنا لینے، کلام کو اعضا و جوارح کے مناسب حرکات اور خط و خال کے اشارات سے قوت دینے کا فن میر انیس کے گھرانے کی ایجاد ہے۔"

آج فن خطابت میں جو طریقے رائج ہیں، ان پر بھی میر انیس کی تحت اللفظ خوانگی

کے گہرے اثرات ہیں، یہی وجہ ہے کہ مولانا سبط حسن صاحب قبلہ مرحوم اور مولانا سید ابن حسن نونہروی مرحوم اور مولانا سید کلب حسین صاحب مرحوم کی تقریروں پر میر انیس کے کلام کی گہری چھاپ ہے۔ علامہ رشید ترابی مرحوم نے بارہ (۱۲) برس کی عمر میں میر انیس کے سات (۷) مرثیے حفظ کر لیے تھے اور ان کی تقریروں میں میر انیسؔ کے مرثیوں کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔

ہماری خطابت کا گہرا رشتہ زبانِ اُردو سے ہے اور بہترین اُردو بولنے کے لئے میر انیسؔ کے مرثیوں کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ میر انیسؔ کے گھرانے کی زبان بلاشبہ آبِ کوثر سے دھلی ہوئی زبان ہے۔ اُردو زبان ہو یا اُردو خطابت، خاندانِ میر انیسؔ کے اثرات تمام فنونِ لطیفہ پر تاحشر قائم رہیں گے۔ میر انیسؔ نے کہا تھا:

ہاں! بعد فنا سخن نشاں ہے میرا   دنیا میں یہ باغ بے خزاں ہے میرا
تاحشر رہے گا نام اس سے روشن   ہر شعر چراغ دودماں ہے میرا

خاندانِ میر انیسؔ کے یہی محاسنِ کلام اور بلندیٔ فکر ہے جو کسی بھی خطیب یا شاعر کو میر انیسؔ سے محبت کرنے پر مجبور کرتی ہے، اور میں بلا تکلف یہ لکھنے میں کوئی مشکل محسوس نہیں کر رہا ہوں کہ اس عہد کے "ماہر انیسیات" علامہ ضمیر اختر نقوی ہیں جنہوں نے کلامِ میر انیسؔ سے محبت کرنے کا شعور عطا کیا ہے۔ برصغیر کے عظیم خطیب، محقق ادب، عالمی شہرت یافتہ ادیب، دانشور علامہ ضمیر اختر نقوی نے فنِ خطابت کو وہاں پہنچا دیا ہے کہ جہاں سے ترقی کے امکانات اس صدی میں ختم ہو چکے ہیں۔ علامہ ضمیر اختر نقوی کی خطابت ایک زندہ علامت ہے۔ وہ اپنی تقریروں کو دوسروں کے مشاہدات سے نہیں سجاتے بلکہ اپنے علمی تجربات وادبی ومذہبی تحقیق کے بھروسے پر نئے نئے موضوعات سے متعارف کراتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ان کی تقریروں کو

سماعت فرمانے والے سامعین کو روحانی آسودگی حاصل ہوتی ہے۔ علامہ ضمیر اختر نقوی ۳۷ برس سے علم و ادب کی خدمت اور تحقیق و جستجو میں مصروف ہیں۔ وہ تاریخ ادب کا گہرا مطالعہ اور گہرا شعور رکھتے ہیں۔ وہ اپنے علمی تجربات و مشاہدات کو اپنی تقریر و تحریر میں اس قدر پُر تاثیر انداز میں سموتے ہیں کہ سامع و قاری بے ساختہ داد دینے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ علامہ ضمیر اختر نقوی فنِ خطابت میں اپنے طرز کے موجود ہیں۔ وہ اس فن میں کسی کی پیروی نہیں کرتے۔ ان کے یہاں مذہب کا Basic Concept عام ڈگر سے ہٹ کر ہے اور انہوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ راہ اختیار کی ہے اور خطابت کو نزاعی اور اختلافی موضوعات سے ہٹا کر تاریخی و علمی موضوعات کی طرف لانے میں کوشاں بلکہ جہاد میں مصروف ہیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی خطابت کی سب سے اہم خوبی ان کی تقریر کے موضوعات ہیں وہ موضوع کا انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کرتے ہیں۔ ان کی کوشش ہوتی ہے کہ ایسے موضوعات ہوں جو ماضی کے خطیبوں نے نہ اپنائے ہوں، یہی وجہ ہے کہ ان کے موضوعات میں ایک جدت اور ندرت و رفعت پائی جاتی ہے۔ علامہ ضمیر اختر نقوی اپنے موضوع کو اوّل تا آخر نبھاتے ہیں، موضوع کی انفرادیت بھی انہیں اپنے معاصرین میں ممتاز و ممیز کرتی ہے۔ علامہ صاحب اب تک پانچ ہزار موضوعات پر تقریر کر چکے ہیں۔ اور یہ تمام ریکارڈز ان کی لائبریری میں آڈیو ویڈیو کیسٹ کی صورت میں محفوظ ہے۔ تاریخ خطابت کا کوئی خطیب اس کارنامے میں ان کے مقابل نظر نہیں آتا۔ آپ کے عشروں اور مجالس کے موضوعات درج ذیل ہیں۔ (یہ وہ مرکزی عشرے ہیں جو کراچی اور دیگر ملکوں میں پڑھے گئے۔)

عدالت اور امامت (۱۹۶۷ء)، عزاداری اور عصری تقاضے (۱۹۶۸ء)، عزاداری

اور تہذیب (۱۹۶۹ء)، خطابت کا ارتقا (۱۹۷۰ء)، سورۂ یوسف اور کلام میر انیس (۱۹۷۱ء) علم اعداد اور اہل بیتؑ (۱۹۷۲ء) زندگی اور بندگی (۱۹۷۳ء) شاعری اور سورت (۱۹۷۴ء) اخلاقیات اور مذہب (۱۹۷۵ء)، عجائبات قرآن (۱۹۷۶ء) فلسفۂ نفس و روح (۱۹۷۷ء) حروف مقطعات کی اہمیت (۱۹۷۸ء) ذکر اور فکر (۱۹۷۹ء)

۱۹۸۰ء میں علامہ سید ضمیر اختر نقوی نے یورپ کا سفر کیا اور ہالینڈ، بلجیم اور انگلینڈ میں آپ نے ایک سو پینتالیس تقاریر سے سامعین کو مستفیض فرمایا، وہاں کے چند موضوعات یہ ہیں:۔

(۱) سورۂ رحمٰن اور اہل بیتؑ (۲) اطاعت رسولؐ اور قرآن (۳) اسلام میں مزاح (۴) کوفہ اور علیؑ (۵) نہج البلاغہ اور سائنس (۶) قرآن اور معجزہ (۷) اسلام میں شعر و ادب کی اہمیت (۸) ماتم کیوں ہوتا ہے؟ (۹) ایفائے عہد (۱۰) وراثت اور رسالت (۱۱) میر انیس کی ترقی پسندی وغیرہ۔

کراچی کے عشروں کے دیگر عنوانات:۔

نور کا سفر (۱۹۸۱ء) قرآن اور سیرت آئمہ (۱۹۸۲) عظمت قرآن (۱۹۸۴ء) قاتلان حسینؑ کا انجام (۱۹۸۵) محسن اسلام (۱۹۸۶ء) حضرت علیؑ اور تاریخ اسلام (۱۹۸۷ء) امام اور اُمت (۱۹۸۸ء) اسلام اور طرز معاشرت (۱۹۸۹ء) عورت اور اسلام (۱۹۹۰ء) تاثرات زیارات کربلا و نجف (۱۹۹۱ء) اسلام اور طرز معاشرت (۱۹۹۲ء) تاریخ شیعیت (۱۹۹۳ء) ظہور امام مہدیؑ (۱۹۹۴ء)۔

۱۹۸۶ء میں علامہ ضمیر اختر نقوی حج کے لیے مکہ معظمہ تشریف لے گئے، وہاں آپ نے مکے، مدینے اور جدہ میں مجالس سے خطاب کیا۔ وہاں کے عشرے کا عنوان تھا، "قرآن میں قسمیں کھانے کی حکمت" (۱۹۸۶ء) اسی سال آپ ایران بھی گئے،

وہاں بھی تقاریر کی ہیں جن کے عنوانات الگ ہیں۔ ۱۹۸۹ء میں آپ امریکہ تشریف لے گئے۔ مختلف شہروں میں آپ نے عشرے اور مجالس سے خطاب کیا، وہاں کے عنوانات اور موضوعات الگ ہیں۔ ۱۹۹۰ء سے اب تک آپ لاہور کی اجتماعی مجالس سے خطاب فرماتے ہیں۔ آپ تقریباً دس روز میں سو (۱۰۰) مجالس سے خطاب فرماتے ہیں، بعض روز دس تقاریر صبح سے شام تک ہوتی ہیں۔

لاہور کی بعض مجالس کے عنوانات یہ ہیں:۔

آنسو اور قرآن، الوان اور قرآن، حواسِ خمسہ اور قرآن، شجرۂ طیبہ، شریعت اور قرآن، حیوان اور انسان، آواز، چراغ، روشنی، آگ، ہوا، مٹی اور پانی، ذوالجناح، ذوالفقار، علم، قرآن اور عزاداری، مستند تاریخ کربلا، سخاوت اور بنی ہاشم، توحید اور ابوطالبؑ، تاریخ نجف، نماز اور اہلِ بیت وغیرہ۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کے علمی و ادبی کارناموں میں ایک اہم ترین کارنامہ "میر انیس کی صد سالہ یادگار" بھی ہے۔ یہ کارنامہ ان کی میر انیس سے والہانہ عقیدت و محبت کا ثبوت ہے۔ ۱۹۷۱ء میں، جب علامہ ضمیر اختر نقوی کی کم عمری کا زمانہ تھا، انہوں نے میر انیس کی صد سالہ برسی منانے کا اہتمام کیا اور نہایت شایانِ شان طریقے سے یہ کام کیا گیا۔ اس بات کا ثبوت اس وقت کے اخبارات و رسائل ہیں جو میر انیس کی صد سالہ برسی کے پروگرام کی خبروں اور میر انیس پر تصنیف کردہ مقالوں سے بھرے پڑے ہیں۔ اس دور میں حضرت جوش ملیح آبادی، سید آلِ رضا صاحب مرحوم، حضرت نجم آفندی، جناب فیض احمد فیض، جناب رئیس امروہوی، سید ضیاء الحسن موسوی مرحوم، جیسی علمی و ادبی شخصیات موجود تھیں، جو اردو ادب میں ممتاز درجے پر فائز تھیں، یہ علامہ ضمیر اختر نقوی کی علمی و ادبی شخصیت کا اثر تھا کہ اس زمانے میں ان کی ایک

درخواست پر نامور دانشوروں نے ان کا ساتھ دیا۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے اسی زمانے میں "انجمن یادگار انیس" اور "میر انیس اکیڈمی" کی بنیاد رکھی اور ملک کے مشہور شاعروں، ادیبوں، اور دانشوروں نے علامہ ضمیر اختر نقوی کے ساتھ تعاون کیا۔ پاکستان کے تمام شہروں میں مذاکرات، مجالس ومحافل کا انعقاد ہوا، بے شمار اخبارات و رسائل نے میر انیس پر خصوصی شمارے شائع کیے۔

میر انیسؔ کی صد سالہ برسی سے اُردو ادب کو سب سے اہم فائدہ یہ ہوا کہ میر انیس پر تحقیقی وتنقیدی کام کرنے کے لئے نئے دروازے کھلے اور اس کے بعد میر انیسؔ پر جتنا بھی تحقیقی وتنقیدی کام ہوا وہ سب کی نظروں کے سامنے ہے۔ پہلا محرک وہ رسالہ تھا جو علامہ ضمیر اختر نقوی نے "یادگار انیس" کے نام سے شائع کیا تھا، دوسرا وہ تحقیقی مقالہ اور اشاریہ تھا جو حیات انیس اور انیس کے فنِ شاعری سے متعلق "ماہِ نو" کے انیسؔ نمبر میں ۱۹۷۱ء میں شائع ہوا تھا۔ یہ کام علامہ ضمیر اختر نقوی نے وزارتِ اطلاعات و نشریات حکومتِ پاکستان کی فرمائش پر کیا تھا۔ میر انیسؔ کے علاوہ مرزا دبیرؔ پر بھی تحقیقی کام کا آغاز ہوا اور دیگر شعراء پر بھی کام شروع ہوا اور اس طرح اُردو ادب کی تصنیفات وتالیفات میں اضافہ ہوا۔

صد سالہ یادگار میر انیسؔ کے پروگراموں کی کامیابی سے جدید مرثیے کو سب سے بڑا فائدہ پہنچا، پورے پاکستان بالخصوص کراچی میں جدید مرثیوں کی مجالس انتہائی کامیاب ہوئیں اور جدید مرثیوں کی مجالس کے اجتماع میں بے انتہا اضافہ ہوا، اسی زمانے میں حضرت جوش ملیح آبادی نے علامہ ضمیر اختر نقوی کی فرمائش پر اپنا معرکۃ الآرا مرثیہ بعنوان "پانی" تصنیف کیا تھا اور ایرانیان ہال کے عظیم الشان مجمع میں پیش کیا تھا۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی عالمانہ بصیرت کی وجہ سے بزرگوں کے علاوہ نوجوان نسل کو بھی میر انیس اور ان کے کمالِ فن سے آگاہی حاصل ہوئی۔ اہلِ علم و ادب جانتے ہیں کہ علامہ ضمیر اختر نقوی، محقق ادب ہونے کے ساتھ ایک بلند پایہ خطیب بھی ہیں اور دنیا کے ہر براعظم میں اپنی خطابت کا لوہا منوا چکے ہیں۔ انہوں نے تحریر کے علاوہ تقریروں میں بھی میر انیس اور ان کے کمالِ شاعری کا ذکر جابجا کیا ہے۔ اپنے عنوانات کے ذیل میں موقع کی مناسبت سے وہ میر انیسؔ کے کلام کی باریکیوں کی تشریح کرتے ہیں۔ انھوں نے اکثر اپنی تقریروں کے لئے میر انیسؔ کے مرثیوں سے متعلق اچھوتے موضوعات کا انتخاب کیا اور میر انیسؔ کے کلام کی مختلف جہتوں کو پیش کیا اور یہ بلاشبہ علامہ صاحب ہی کا انفرادی رنگ ہے ورنہ ہر خطیب اس موضوع پر گفتگو نہیں کرسکتا۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے میر انیس پر پورے پورے عشرۂ مجالس پڑھے ہیں جن میں دو عشرے اپنے موضوع کے اعتبار سے منفرد اور انوکھے ہیں اور بہت ہی مشہور عشرے ہیں۔ ان مجلسوں میں سامعین کا ٹھاٹھیں مارتا ہوا سمندر موجود تھا۔ ایک عشرے کا عنوان تھا "سورۂ یوسف اور کلام انیس" (۱۹۷۱ء) اور دوسرے عشرے کا عنوان تھا "قرآن اور میر انیسؔ" (۱۹۸۸ء)۔

عشروں کے علاوہ بے شمار تقاریر پر کلام انیسؔ سے متعلق علامہ صاحب کی موجود ہیں، کئی برس تک ہر مہینے ایک تقریر ایسی کرتے رہے ہیں جس میں میر انیسؔ کے ایک مرثیے کی تشریح ہوتی تھی۔ اس طرح کی تقاریر کے عنوانات مندرجہ ذیل ہیں:۔

(۱) گلزار ارم (۲) عظمت حضرت عباسؑ کلام میر انیس کے آئینے میں (۳) عظمت فاطمہ زہراؑ اور کلام میر انیسؔ (۴) نماز اور کلام میر انیسؔ (۵) اصحاب با وفا اور کلام میر انیسؔ (۶) معراج شاعری (۷) ذوالفقار کلام میر انیس میں

(۸) ذوالجناح کلام انیسؔ میں (۹) کردار حُر اور کلام انیسؔ (۱۰) شعرائے عرب اور انیس (۱۱) پنجتن کی مدح اور فکر انیس (۱۲) شاعری اور عبادت (۱۳) شاعری اور موت (۱۴) سورۂ شعراء اور انیس (۱۵) آواز اور میر انیس (۱۶) خوشبو اور میر انیس (۱۷) رنگ اور میر انیسؔ۔ وغیرہ وغیرہ۔

یہ علامہ ضمیر اختر نقوی کی ہی ذات ہے جن کی وجہ سے آج دنیا کے گوشے گوشے میں اور خصوصاً ان ملکوں میں جہاں اُردوں داں طبقے شیکسپیر، ملٹن، ہومر اور اسپنسر سے متاثر ہیں، وہاں بھی آج میر انیسؔ کا کلام مقبول ہے۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے بی بی سی لندن اور وائس آف امریکہ سے بھی میر انیسؔ کی شاعری پر تقاریر کی ہیں۔

۱۹۸۳ء میں "مجالس درسِ انیسؔ" کا سلسلہ جناب ظفر کاظمی کی قیام گاہ پر شروع ہوا ان مجالس میں ہر مہینے علامہ ضمیر اختر نقوی کلام میر انیس کی شرح بیان فرماتے ہیں۔ ان مجالس میں ایک ایک سامع ہمہ تن گوش ہو کر آپ کے خطاب کو سنتا اور سب یہی کہتے تھے کہ بلاشبہ کلامِ انیسؔ معجزہ ہے۔ اگر ان تمام تقاریر کے صرف اہم نکات ہی جمع کر کے شائع کیے جائیں تو ایک ضخیم کتاب ادب میں ہوگی۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی ان تقاریر سے یہاں چند علمی نکات کیسٹ سے پیشِ خدمت ہیں۔ علامہ ضمیر اختر نقوی کی ایک تقریر کا موضوع ہے "کلام میر انیسؔ میں نور کا مفہوم" اس تقریر میں آپ نے کلام میر انیسؔ پر قرآنی آیات سے استدلال کیا ہے۔

(اقتباس)

یٰٓاَیُّھَا النَّاسُ قَدْ جَآءَکُمْ بُرْھَانٌ مِّنْ رَّبِّکُمْ وَاَنْزَلْنَآ اِلَیْکُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا (النساء، ۱۷۴)

"اے بنی نوع انسان! تمہارے پروردگار کی طرف سے تمہارے پاس دلیل روشن

آ چکی ہے۔ ہم نے کفر اور ضلالت کا اندھیرا دور کرنے کے لئے تمہاری طرف چمکتا ہوا نور بھیج دیا ہے۔"

برہان، یعنی دلیل سے مراد حضرت رسولؐ خدا ہیں اور نور مبین یعنی چمکتا ہوا نور سے حضرت علیؑ مراد ہیں۔ خلقت نور کی حدیث میں حضرت رسالت مآبؐ نے ارشاد فرمایا:

"جب اللہ نے ہماری تخلیق کا ارادہ فرمایا تو پہلے نور کو پیدا کیا اور پھر روح کو خلق فرمایا اور ان دونوں کو ملا کر مجھے اور علیؑ و فاطمہؑ و حسنؑ و حسینؑ کو پیدا کیا، پھر میرے نور سے عرش کے نور کو علیؑ کے نور سے ملائکہ کے نور کو، فاطمہؑ کے نور سے زمین و آسمان کو، حسنؑ کے نور سے شمس و قمر کو، اور حسینؑ کے نور سے جنت و حورالعین کو پیدا کیا۔

حدیث میں اوّل مخلوق نور، روح اور عقل سب سے مراد نور رسالت مآبؐ ہے۔

میر انیس نے "حدیث نور" کا تفصیل سے ذکر کیا ہے بصرف تین بند دیکھئے:

پہلے کیا جس چیز کو اللہ نے پیدا لکھا ہے کہ وہ نور جناب نبویؐ تھا
دس سو برس اس دن سے وہ نور شہ والا استادہ رہا رو بروئے خالق یکتا
کچھ حمد و ثنا، و کچھ صفتِ قدرتِ حق تھی
اس نور پہ ہر دم نظر رحمتِ حق تھی

اس نور کو دو حصے کیا حق نے برابر اور پھر کیے ہر حصے کے دو حصے کر کر
دو ٹکڑوں سے مخلوق ہوئے احمدؐ و حیدرؑ پیدا ہوئے دو حصوں میں سبطینِ پیمبرؐ
زہراؑ کو پھر اس نور سے تنہا کیا پیدا
یوں پنجتنِ پاک کا نقشا کیا پیدا

تب کرسی و لوح و قلم و عرشِ معلی نجم و مہ و مہر و ملک و گنبدِ خضریٰ
شام و سحر و ظلمت و ضو، جنت و دنیا اللہ نے سب نورِ نبیؐ سے کیے پیدا

حق یہ ہے کہ باعث ہے وہ عالم کی بنا کا
کیا رتبہ ہے، کیا فیض ہے محبوب خدا کا

حضرت رسالت مآبؐ کے نور سے حضرت علیؑ، حضرت فاطمہ زہراؑ، امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی خلقت ہوئی۔ اس نور کے سلسلے کو اللہ نے قیامت تک قائم کر دیا۔ ہر زمانے میں اس نور کا ایک فرد موجود ہوا کرتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ اپنے عہد میں نور تھے۔ امام حسینؑ کی نسل میں نو (۹) امام آئے۔ میر انیس کہتے ہیں:

حضرت رسالت مآبؐ کے نور سے حضرت علیؑ، حضرت فاطمہ زہراؑ امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی خلقت ہوئی۔ اس نور کے سلسلے کو اللہ نے قیامت تک قائم کر دیا ہے ہر زمانے میں اس نور کا ایک فرد موجود ہوا کرتا ہے۔ حضرت امام حسینؑ اپنے عہد میں نور تھے۔ امام حسینؑ کی نسل میں نو (۹) امام اور آئے۔ میر انیس کہتے ہیں:

ہر جسم میں جاں آتی ہے مذکور سے جس کے
نو نور خدا ہوں گے عیاں نور سے جس کے

سورۂ رحمٰن کی آیت ہے:

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيَانِ (الرحمٰن:۱۹)

"اس نے دو دریا بہائے جو کسی مقام پر باہم ملتے ہیں۔"

ان دونوں دریاؤں سے موتی اور مرجان نکلتے ہیں۔

حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام کا ارشاد ہے: "یہ دو نور کے دریا ہیں۔ حضرت علیؑ اور حضرت فاطمہ زہراؑ، ان دونوں سے لولو و مرجان، یعنی امام حسنؑ اور امام حسینؑ کی ولادت ہوئی۔"

میر انیس کہتے ہیں:

دو نور کے دریاؤں کو ہم نے کیا اک جا
تب اس سے ہوا گوہر نایاب یہ پیدا

امام حسینؑ کا نور فرشتے عرش پر دیکھ چکے تھے۔

آپ کی ولادت کے موقع پر جب جبرئیلِ امیں مبارک باد دینے کے لئے آئے تو اس منظر کو میر انیس اس طرح پیش کرتے ہیں:

جب کر چکے ذکرِ کرم مالکِ تقدیر ۔۔۔ جبرئیلؑ نے پاس آن کے دیکھا رخِ شبیرؑ
کی صلِ علیٰ کہہ کے محمدؐ سے یہ تقریر ۔۔۔ یا شاہا یہ مہ رو تو ہے صاف آپ کی تصویر
جب کی ہے زیارت، بپئے تسلیم جھکے ہیں
اس نور کو ہم عرش پہ بھی دیکھ چکے ہیں

حضرت امام حسینؑ شبیہ رسولؐ تھے۔ دونوں نور ہیں، امام حسینؑ کے نور سے دنیا روشن ہے۔ میر انیس کے مختلف مرثیوں سے تین بند اس موضوع پر لاجواب ہیں۔

مصباحِ بزمِ حیدرِ صفدر حسینؑ ہے ۔۔۔ گل گوں قبائے عرصۂ محشر حسینؑ ہے
بے سر ہے پر زمانے کا سرور حسینؑ ہے ۔۔۔ روشن ہے جس سے عرش وہ گوہر حسینؑ ہے
عالم میں کیوں ضیا نہ ہو اس کے ظہور سے
اللہ خود بنائے جسے اپنے نور سے

پہلے تو رنگِ کفر کیا شیرِ حق نے دور ۔۔۔ بے کس جو تھے، قتل ہوئے سب وہ بے غرور
ظاہر ہوئے حسینؑ تو حق نے کیا ظہور ۔۔۔ وہ بھی خدا کے نور تھے، یہ بھی خدا کے نور
حُبِ علیؑ کے ساتھ جب ان کی ولا ہوئی
ایماں کے آئینے کو دوبارہ جلا ہوئی

غل تھا کہ ہے حسینؑ کی شوکت، وہ بے وقار ۔۔۔ گویا کھڑے ہیں جنگ کو محبوبِ کردگار

رُخ سے عیاں ہے دبدبۂ شاہِ ذوالفقار — ہے نور حق جبین منور سے آشکار

کیونکر چھپے نہ ماہ وہ ہفتہ نقاب سے

چودہ طبق میں نور ہے اس آفتاب سے

نور ایک صفت ہے لیکن جب کسی موصوف میں بدرجۂ کمال موجود ہو تو مجازاً ذات موصوف پر بھی اس کا اطلاق درست ثابت ہوتا ہے۔ خدا کے بندے جو صاحب عصمت ہیں اور صفات خیر سے آراستہ ہیں، وہ سب کے سب نور ہیں۔ تمام انبیاء اور ان کے اوصیائے طاہرین سب نور ہیں۔ حضرت رسولؐ خدا پر نور کا اطلاق قرآن مجید کی متعدد آیات میں موجود ہے:

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ (المائدہ:۱۵)

"تمہارے پاس اللہ کی طرف سے نور اور کتاب، دونوں آچکے۔"

اس آیت میں نور سے مراد حضرت رسولؐ خدا ہیں۔

حضرت اکبرؑ شبیہ رسولؐ تھے اور ولیِ خدا بھی تھے۔ علمائے کرام نے اس سلسلے میں کلام کے مباحث میں حضرت علی اکبرؑ کو نور تسلیم کیا ہے۔ میر انیس کی نظر میں مقاتل اور علم کلام کی یہ کتابیں تھیں۔ وہ کہتے ہیں:

کیا اکبرِ جری کے کہوں رُخ کی آب و تاب — ذرہ تھا جس کے حُسن کے پرتو سے آفتاب

وہ دل میں شوقِ جنگ کا، وہ عالمِ شباب — گویا کھڑے تھے رن میں رسولِ فلک جناب

ہر ایک کو گماں تھا تجلی طور کا

جلوہ مگر فقط تھا محمدؐ کے نور کا

جب ہم حضرت امام حسینؑ کی زیارت پڑھتے ہیں، اس میں یہ الفاظ بھی آتے ہیں:

انك كنت نوراً في الاصلاب الشامخة والارحام المطهرة

معصوم کو مخاطب کرکے کہا جاتا ہے: "آپ تو بلند رتبہ صلبوں اور پاکیزہ رحموں میں نور کی حیثیت سے موجود تھے۔"

تمام مخلوق خدا میں محمدؐ و آل محمدؐ نور کے اکمل واشرف افراد ہیں کیونکہ انہی کی بدولت تمام عالم بقعۂ نور بنا۔ قرآن پاک سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہے کہ نور ایک مثبت حقیقت ہے جو خیر و رشد کے معانی کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے اور اس سے منفی پہلو کا نام ظلمت ہے۔ کربلا میں امام حسینؑ کا لشکر نور تھا۔ میر انیس کہتے ہیں:

ایک ایک رُخ پہ قدرتِ حق کا ظہور تھا
لشکر نہ تھا حسینؑ کا، دریائے نور تھا

یزید اور یزید کا لشکر ظلمت تھا، کربلا نور اور ظلمت کی جنگ تھی۔

میر انیسؔ نے ایک آیت: اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ (النور: ۳۵) کا مصرف رجز میں اس طرح کیا ہے:

قرآں میں کون نور سماوات و ارض ہے
طاعت وہ کس کی ہے جو زمانے پہ فرض ہے

میر انیس نے قرآن اور حدیث کی روشنی میں معرکۂ کربلا کو نور و ظلمت کی لڑائی قرار دیا ہے۔ یہ لاجواب بند قابل داد ہے:

کعبہ اِدھر تھا جلوہ نما اور اُدھر کنشت | دوزخ کی آگ اُدھر تھی، اِدھر گلشنِ بہشت
کھیتی اِدھر کرم کی، اُدھر تھی ستم کی کِشت | یاں کار نیک ہوتے تھے واں فعل ہائے زشت

شیطاں تھا اُس طرف تو اِدھر کردگار تھا
میدان میں مقابلۂ نور و نار تھا

کربلا میں یہ ابدی فیصلہ ہو گیا کہ نور سے کوئی ظلمت کی طرف نہیں جائے گا۔ حُر

ظلمت سے نور کی طرف آئے، یہ نور کی فتح تھی۔

اَللّٰہُ وَلِیُّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا یُخْرِجُھُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَی النُّوْرِ (البقرہ:۲۵۷)

''اللہ ولی ہے صاحبانِ ایمان کا، وہ انہیں اندھیروں سے نکال کر نور کی طرف لاتا ہے۔''

میر انیس کہتے ہیں:

نار سے نور کی جانب اسے لائی تقدیر
ابھی ذرہ تھا، ابھی ہو گیا خورشید منیر

علامہ ضمیر اختر نقوی کی تقریروں میں ایک اہم ترین موضوع ''ذوالفقار'' بھی ہے برصغیر کے کسی عالم، فاضل، خطیب سے آپ ''ذوالفقار'' کے موضوع پر تقریر کرنے کو کہیں تو چند جملوں سے زیادہ نہیں بول سکتا۔ یہ علامہ ضمیر اختر نقوی کی خطابت کا کمال ہے کہ انہوں نے ''ذوالفقار'' کے موضوع پر اب تک پانچ تقاریر کی ہیں اور ہر کیسٹ ڈیڑھ گھنٹے سے کم نہیں، گویا سات گھنٹے کا وقت ''ذوالفقار'' کے لئے وقف کیا گیا۔ اگر ان تقاریر کو تحریر کیا جائے تو ایک ضخیم کتاب ''ذوالفقار'' پر تیار ہو سکتی ہے۔ ان تقریروں میں ایک لاجواب تقریر کا موضوع ہے ''میر انیس کے مرثیوں میں ذوالفقار کی مدح'' اس موضوع پر ایک تقریر ۱۹۷۱ء میں کراچی میں ہوئی تھی اور دوسری تقریر ۱۹۸۹ء میں روضۂ کاظمین لکھنؤ کی ہے۔

یہ تقریر ہزاروں کے مجمع میں تقریباً تین گھنٹے مسلسل جاری رہی ہے۔ اس تقریر کا کیسٹ سن کر ایک طرح کا جوش وولولہ پیدا ہو جاتا ہے، داد و تحسین کے نعرے اور اہلِ لکھنؤ کا مجلسی شعور کیا ٹھکانہ ہے کہ لفظوں میں بیان کیا جا سکے۔ سچ پوچھیے تو لکھنؤ کے علاوہ دنیا کے کسی شہر کے شیعوں میں مجلس سننے کا شعور پیدا نہیں ہو سکا۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی شاہکار تقریر "کلام میر انیس میں ذوالفقار کی مدح" سے ایک اقتباس:

وَأَنزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ وَمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللَّهُ مَن يَنصُرُهُ وَرُسُلَهُ بِالْغَيْبِ ۚ إِنَّ اللَّهَ قَوِيٌّ عَزِيزٌ (الحدید:۲۵)

"اور ہم نے فولاد (لوہے) کو نازل کیا جس کے ذریعے سے سخت لڑائی اور لوگوں کے لئے بہت سی نفع کی باتیں ہیں تاکہ خدا دیکھ لے کہ بن دیکھے خدا اور اس کے رسولوں کی کون مدد کرتا ہے۔ بے شک خدا بہت زبردست، غالب (قوت والا) ہے۔"

"پروردگار ہر چیز پر قدرت کاملہ رکھتا ہے۔ وہ لوہے کو آسمان سے نازل کر سکتا ہے۔ آیت میں یہ اعلان موجود ہے کہ ہم نے لوہے کو آسمان سے نازل کیا۔ مفسرین کا کہنا ہے کہ "الحدید" سے مراد تلوار ہے جو عرش سے نازل ہوئی۔ آئمہ معصوم نے وضاحت سے بیان کیا ہے کہ "الحدید" سے مراد "ذوالفقار" اور جنگ سے مراد "جنگ اُحد ہے" جس لڑائی میں ذوالفقار نازل ہوئی۔

ذوالفقار کے نزول کا یہ واقعہ تاریخوں میں موجود ہے کہ جنگ احد میں جب حضرت حمزہؑ شہید ہو گئے تو میدانِ اُحد میں صرف رسولؐ خدا اور حضرت علی مرتضیٰ تنہا رہ گئے۔ فاتح بدر وحنین نے کافروں کا مقابلہ کیا اور کافروں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اس حملے میں حضرت علی کی تلوار ٹوٹ گئی۔ وہ ٹوٹی ہوئی تلوار لے کر رسولؐ خدا کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور عرض کیا "یا رسولؐ اللہ! مالک کائنات نے بعد تحفۂ درود و سلام یہ قدرت سے بنی ہوئی یہ تلوار بھیجی ہے۔ یہ سیفِ خدا اسد اللہ کو عنایت کیجئے۔" حضرت علی کی جاں نثاری کا یہ خصوصی انعام تھا جو منجانب اللہ عرش سے نازل ہوا تھا۔ اِدھر حضرت علی کے ہاتھ میں تلوار آئی، اُدھر جبرئیل امین نے فضا میں بلند ہو کر اپنے ساتھ

کے چار ہزار فرشتوں کے ساتھ نعرہ بلند کیا:

لا فتیٰ اِلّا علیؑ لا سیف اِلّا ذوالفقار

"نہیں ہے کوئی جوان مگر علیؑ اور نہیں ہے کوئی تلوار مگر ذوالفقار"

گویا جبریل امین کا یہ اعلان ایک قصیدہ تھا جو حضرت علیؑ کی شان میں وہ پڑھ رہے تھے۔ حضرت علیؑ کے ہاتھ میں ذوالفقار آئی، پنجۂ شیر خدا اور قبضۂ ذوالفقار نے ایک دوسرے سے مناسبت پائی۔ میر انیسؔ کہتے ہیں:

جیسی وہ ذوالفقار تھی، ویسا ہی ہاتھ تھا

میدان اُحد سے حضرت علیؑ نے لشکرِ کفار کو مار بھگایا، اکثر کو تنہا قتل کیا۔ اب میدان اُحد صاف تھا۔ ذوالفقار کی آب نے خون کے دریا بہا کر اسلام کے دامن سے گرد شکست کو دھو کر ظاہری شکست کو فتح میں بدل دیا۔ یہی تلوار ہے جس سے مسلمانوں کو فتح حاصل ہوا، اس فتح کا اعلان سورۂ حدید کی آیت میں کیا گیا ہے۔

"ذوالفقار" عربی کا لفظ ہے، لیکن "فقار" کے دو معنی ہیں۔ یہ "فقرۃ" کی جمع ہے۔ "فقرۃ" عربی میں کلام یا جملے کے لطیف نکتے کو کہتے ہیں، اس کی جمع "فقار" یعنی زبان سے متعلق ہے اور دوسرے معنی ہیں "الفقرۃ" یا "الفقارۃ" یعنی ریڑھ کی ہڈی "ذوالفقار" کی پشت مہرہ ہائے پشت کی طرح سیدھی نہ تھی۔ جس طرح ریڑھ کی ہڈی خم دار ہوتی ہے، "ذوالفقار" بالکل اسی طرح کی تھی، تلوار میں بھی مہرے تھے جس طرح ریڑھ کی ہڈی میں، اِدھر اُدھر ہوتے ہیں۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ تلوار پر چونکہ یہ فقرے تحریر تھے:

لا فتیٰ اِلّا علیؑ لا سیف اِلّا ذوالفقار

اس لیے اس تلوار کا لقب "ذوالفقار" قرار پایا۔ اب جو بھی معنی ہوں، یہ نام لسان

قدرت کا عطا کیا ہوا ہے۔ لیکن ذوالفقار کی تیزی، چم خم کاٹ، گھاٹ، باڑھ، دھار کو میر انیس کے علاوہ کوئی دوسرا بیان نہیں کر سکا۔ میر انیس نے "ذوالفقار" کا خم، جھنکار، چمک، روانی و پانی، شعلہ فشانی و تیز زبانی، اس کی ادائیں، اس کے جوہر، اس کے پھل، اس کے اوج اور اس کے معجزات کو جس طرح بیان کیا ہے، اسے سن کر ہر ادب پسند ورطۂ حیرت میں آ جاتا ہے۔

میر انیس نے "ذوالفقار" کو کہیں پری وش بنایا ہے اور دلہن کے روپ میں دیکھا ہے، کہیں مچھلی کی طرح مشاق پیراک بنایا اور کہیں حسینوں کا اشارہ قرار دیا، کہیں "ذوالفقار" کی روشنی کو ستارے کی طرح ٹوٹتے اور گرتے ہوئے دکھایا۔ "ذوالفقار" کی تعریف میں انہوں نے بند کے بند تصنیف کئے ہیں۔

کلام میر انیس میں "ذوالفقار" کبھی برق نظر آتی ہے اور کبھی ناگن کی طرح لہراتی ہوئی، کبھی ہما بن جاتی ہے اور کبھی شہباز کی طرح پرواز کرتی ہے، کہیں اژدر کی طرح آگ اگلتی نظر آتی ہے اور کبھی قہر خدا بن کر دشمنوں کے سروں پر نازل ہوتی ہے۔

میر انیس نے "ذوالفقار" کے مختلف القابات و خطابات بتائے ہیں۔ وہ برچھی بھی ہے، کٹاری بھی ہے، سروہی بھی ہے، چھری بھی ہے، موت کی تصویر بھی ہے، عنقائے ظفر بھی ہے، شہباز اجل بھی ہے، مہ نو بھی ہے، شمع کی لو بھی ہے، امرت بھی ہے، زہر ہلاہل بھی ہے، مسیحا بھی ہے، قضا بھی ہے، معشوق خوش ادا بھی ہے، عروس ظفر بھی ہے، جوہر بھی ہے، صاعقہ کردار بھی ہے، شمشیر شعلہ بار بھی ہے۔

میر انیس نے "ذوالفقار" کو قرآن، علم تفسیر، حدیث، تاریخ، سیر، فلسفہ، منطق، علم کلام، ادب اور علم الوان، تمام علوم میں تلاش کیا ہے۔ انہیں قرآن میں "ذوالفقار" نظر آئی تو یہ کہا کہ:

نازل اسی کی شان میں ہے سورۂ حدید

تفسیر میں دیکھا کہ وہ آسمان سے نازل ہوئی ہے تو میر انیس نے کہا:

جو عرشِ ذوالجلال سے اتری، وہ تیغ تھی

ایک پورا بند دیکھیے:

کیا تیغ کی تعریف کرے کوئی زباں سے ۔۔۔ جن ناگئیں اماں جان کی جس آفتِ جاں سے
واں قطعِ سخن خوب جو باہر ہو بیاں سے ۔۔۔ دھوئی ہوئی کوثر میں زباں لائے کہاں سے
یوں تیغ بھلا عرش سے اتری ہے کسی کو
ہدیہ وہ خدا نے جسے بھیجا تھا علی کو

میر انیس نے "ذوالفقار" کے معنی بتاتے ہوئے گویا لغات کی سیر کرائی ہے:

فقروں کا ذوالفقار کے مطلب ادا نہ ہو ۔۔۔ کٹ جائے ساری عمر تو اس کی ثنا نہ ہو

اعضائے بدن قطع ہوئے جاتے تھے سب کے ۔۔۔ قینچی کی زباں چلتی تھی فقرے تھے غضب کے

لب صورتِ شگافِ قلم بند کر دیے ۔۔۔ فقروں کے ذوالفقار نے دم بند کر دیے

کیونکر جواب دے کوئی دم بند سب کے ہیں ۔۔۔ غل تھا کہ ذوالفقار کے فقرے غضب کے ہیں

میر انیس نے علم الوان کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ رنگوں کے استعمال میں ان کے یہاں ایک علمی شعور پایا جاتا ہے۔ انہوں نے "ذوالفقار" کا رنگ سبز بتایا ہے:

ہیرا تھا بدن رنگ زمرد سے ہرا تھا ۔۔۔ جوہر نہ کہو، پیٹ جواہر سے بھرا تھا
گلے کاٹ کر جب لہو سے رنگیں ہو جاتی تھی تو

تھی تیغ وہ پیکر کی زباں سرخ، دہن سرخ

چوتھے مصرع کی یہ بیت دیکھیے:

بے وجہ نہ منھ لال تھا اس عربدہ جو کا　　　　پیڑا وہ اٹھائے ہوئے تھی خونِ عدو کا

میر انیس "ذوالفقار" کے معجزات تفصیل سے بیان کیے ہیں، بہت سے معجزات کتابوں میں ذوالفقار کے سلسلے میں راویوں نے تحریر کیے ہیں۔ ایسی تمام کتابوں پر میر انیس کی گہری نظر تھی۔ "ذوالفقار" کے معجزات وصفات عجائبات ہیں "ذوالفقار" دو زبانوں والی تھی، تیز دھار والی تھی۔ وہ چلتی تھی تو میدان جنگ میں بڑھتی بھی تھی اور گھٹتی بھی تھی، جہاں تک چاہے میدان جنگ میں چلی جائے اور پھر واپس آ جائے:

وہ تیغ دو سر کا کبھی بڑھنا کبھی گھٹنا

میر انیس کہتے ہیں کہ "ذوالفقار" میدان جنگ میں اکثر ہفتاد گز کی ہو جاتی تھی۔

اٹھتی تھی پئے ضرب جو شمشیر دو پیکر
بڑھ جاتی تھی ہفتاد گز اس دم وہ سراسر

حضرت رسولؐ خدا فرماتے تھے کہ جس طرح موسیٰ کو عصا کا معجزہ دیا گیا، مجھے "ذوالفقار" کا معجزہ عطا کیا گیا۔ عصائے موسیٰ میں اژدھا بننے کی قوت موجود تھی "ذوالفقار" بھی اژدھا بن جاتی تھی:

وقتِ وغا عصا تھی کبھی، اژدہا کبھی　　　　تلوار بن گئی وہ کبھی اور قضا کبھی
بجلی بھی تھی، ابر بھی اور ہوا کبھی　　　　بنتی تھی کفر کی خاطر بلا کبھی

پھرتے تھے جب حسینؑ پیادوں کو رول کے
کھا لیتی تھی سروں کو دہن کھول کھول کے

"ذوالفقار" کو یہ معجزہ عطا کیا گیا تھا کہ وہ صلبوں میں مومن اور کافر کی نسلوں کو دیکھ کر چلتی تھی۔ "ذوالفقار" کو یہ بھی معجزہ ملا تھا کہ وہ تنہائی میں شیر خدا سے باتیں کرتی تھی اور کربلا میں امام حسینؑ سے محوِ گفتگو تھی۔ "ذوالفقار" کا ایک وصف یہ تھا کہ وہ دشمن کے

جسم کو دو برابر حصوں میں تقسیم کر دیتی تھی۔ طول کے وار میں سر سے چلتی تھی، وزین تک
در آتی، جب عرض کے وار سے چلتی تو کمر سے کاٹ کر دو ٹکڑے برابر کے کر دیتی:

فولاد ہو کہ سنگ، یہ منھ موڑتی نہیں
بے دو کیے، کسی کو کبھی چھوڑتی نہیں

میر انیسؔ نے "ذوالفقار" کو دلھن کی طرح سجی ہوئی بھی دیکھا ہے:

جوہر نہ کہو، موتیوں سے مانگ بھری تھی

گھونگھٹ ہٹا تو برق سی چمکی لڑائی میں
نقدِ حیات لینے لگی رونمائی میں

میدانِ جنگ میں جب "ذوالفقار" دشمنوں کے خون سے سرخ ہو جاتی ہے۔ تو اس
کا رنگ سبز سے سرخ ہو جاتا ہے۔ اس وقت میر انیسؔ "ذوالفقار" کو "عروسِ ظفر" اور
"عروسِ فتح" کے خطابات سے یاد کرتے ہیں اور کبھی "پری وش" کہتے ہیں، میر انیسؔ
کا یہ لاجواب بند جسے میں نے اپنی تقریروں میں بارہا پڑھا ہے، آج خصوصی
فرمائش ہے کہ یہ بند پھر سنا دیا جائے۔

زیبا تھا دمِ جنگ پری وش اسے کہنا ۔۔۔ معشوق بنی، سرخ لباس اس نے جو پہنا
جوہر تھے کہ پہنے تھی دلھن پھولوں کا گہنا ۔۔۔ اس اوج میں دو سر کو جھکائے ہوئے رہنا

سیب چمن خلد کی بو باس تھی پھل میں
رہتی تھی وہ شمشیر سے دولہا کی بغل میں

"ارجح المطالب" میں عبداللہ ابن عباس سے ایک روایت ہے کہ شب معراج
حضرت رسول خدا نے جنت میں سیب کے درخت سے ایک سیب تناول فرمایا تھا اور
واقعہ شب معراج کے بعد اسی سیب سے حضرت فاطمہ زہراؑ کی خلقت ہوئی تھی۔ اسی

سیب کے درخت کی جڑ سے "ذوالفقار" کی خلقت ہوئی تھی، "ذوالفقار" میں اسی جنت کے سیب کی خوشبو تھی۔ میر انیس نے پانچواں مصرع کیا خوب کہا ہے!

سیب چمن خلد کی بو باس تھی پھل میں

میر انیس نے "ذوالفقار" کو دلھن کی طرح سجایا ہے۔ لوہے پر جو قدرتی نقوش ہوتے ہیں، انہیں جوہر کہتے ہیں، جو لوہے کی عمدگی کو ظاہر کرتے ہیں۔ "ذوالفقار" کے جوہر پھولوں کے گہنے کے تھے۔ لکھنؤ میں پھولوں کا گہنا عام طور سے موتیے کے پھولوں سے تیار کیا جاتا ہے۔ موتیے میں ہلکا ہلکا سبز رنگ سفیدی میں جھلکتا ہے۔ جوہر کی سبزی کو پھولوں کے گہنے کی سبزی سے تشبیہ دے کر میر انیس نے ماہر علم الوان ہونے کا ثبوت دیا ہے۔ دلھن سر کو جھکا کر چلتی ہے۔ تلوار کے خم کو دلھن کا سر جھکانا کہہ کر حسن بیان میں چار چاند لگا دیے ہیں۔ لیکن دلھن کے لئے دولھا کا وجود بھی لازمی ہے۔ چھٹے مصرع میں فن شاعری کا عروج دیکھیے۔

رہتی تھی وہ شیر سے دولھا کی بغل میں

اس کے علاوہ علامہ ضمیر اختر نقوی نے میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام کو مجلسوں میں نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ علامہ ضمیر اختر نقوی ہر سال جناب فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کی شہادت کی مجالس سے خطاب فرماتے ہیں۔ ان مجالس میں اس سال آپ نے یہ جدت فرمائی کہ میر انیس اور مرزا دبیر نے جناب سیدہ کے جو فضائل نظم کیے ہیں، ان کی تفصیل علامہ صاحب منبر سے بیان فرماتے اور راقم الحروف (ماجد رضا) ان اشعار کو تحت پر بیٹھ کر لحن سے پڑھتا، جب علامہ صاحب نثر میں تشریح فرماتے تو میں خاموش ہو جاتا اور ان کی تفصیل کے بعد میں دوبارہ بند پیش کرتا۔ یہ ایک بالکل نیا اور اچھوتا تجربہ تھا جو نہایت کامیاب رہا اور سامعین نے بہت پسند کیا۔

میں نے علامہ ضمیر اختر نقوی کی تقریروں سے چند نکات "کلامِ انیس" کے موضوع کے متعلق پیش کیے ہیں، اگر تمام تقاریر کو جمع کیا جائے تو یقیناً ضخیم جلدیں مرتب ہو جائیں گی اور انشاء اللہ یہ کام بھی عنقریب قدردانوں کے سامنے آ جائے گا۔

زیرِ نظر کتاب بھی علامہ ضمیر اختر نقوی کی میر انیس اور ان کے خاندان کے شاعروں کے کلام سے محبت و عقیدت کا ایک بین ثبوت ہے۔ یہ کتاب میر انیس اور ان کے خاندان کے متعلق ایک انسائیکلوپیڈیا کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ میری خوش بختی ہے کہ مجھ جیسے ہیچ مداں اور نو آموز ذہن کی تحریر بھی اس یادگار کتاب میں شامل ہے۔

آخر میں علامہ ضمیر اختر نقوی کو ان کی یادگار کتابوں کی اشاعت پر مبارک باد دیتے ہوئے اتنا ضرور عرض کروں گا کہ علامہ ضمیر اختر نقوی نے انیس اور انیسیات کے تنقیدی و تحقیقی دائرے کو وسیع تر کر دیا ہے۔ انہوں نے نوجوان نسل کو میر انیس سے محبت کرنا سکھایا ہے اور وہ ادب اور مذہب کی دنیا میں ایک ایسا ادارہ بن گئے ہیں کہ اس ادارے کی رکنیت حاصل کیے بغیر کم از کم پاکستان کا کوئی بھی علمی و ادبی شخص اپنے کام کو مکمل نہیں کر سکتا۔ علم و ادب کی اس عظیم شاہراہ کا نام ہے "ضمیر اختر نقوی" جن کے لئے جوش ملیح آبادی کا یہ شعر صادق آتا ہے:

تیرا وجود فخرِ ضمیرِ حیات ہے
تو محض ایک فرد نہیں کائنات ہے

پروفیسر ممتاز حسین

"ضمیر اختر نقوی کا اسلوبِ بیان شائستہ اور جچا تلا ہوا ہے"۔

محبت شجاع رانا

عزاداریٔ امام حسینؑ اور اقوامِ عالم

"علامہ ضمیر اختر نقوی کی تقریروں سے اقتباس"

مطبوعہ دی نیشن۔ لاہور۔ مورخہ ۱۷ مئی، ۱۹۹۷ء (سنیچر)

عزائے شہادت امام حسینؑ کی ابتدا تاریخی اعتبار سے واقعۂ کربلا کے بعد سے نہیں ہوئی بلکہ اس کی ابتدا اللہ کے پہلے نبی حضرت آدم علیہ السلام کی آمد کربلا کے واقعہ کے بعد سے ہوئی۔ اپنے بیٹے ہابیل کے اپنے دوسرے بیٹے قابیل کے ہاتھوں قتل ہونے کے بعد حضرت آدمؑ نے اس سنگلاخ علاقہ کا (جہاں واقعۂ کربلا رونما ہونا تھا) سفر کیا اور اس سفر کے دوران آپ کے پاؤں زخمی ہو گئے اور ان سے خون بہنے لگا۔ جب حضرت آدمؑ نے اللہ پاک سے اس علاقہ کے متعلق معلومات حاصل کرنے کی درخواست کی تو خداوند عالم نے ان پر منکشف کیا کہ اس جگہ کا نام کربلا ہے۔ پھر حضرت آدمؑ کو حضرت محمد مصطفےٰؐ کے نواسے حضرت امام حسینؑ کی شہادت کے متعلق بتلایا گیا کہ انھیں اللہ کی راہ میں نہایت بے دردی سے ان کے تمام خاندان کے افراد کے ساتھ قتل کر دیا جائے گا۔ حضرت آدمؑ یہ سن کر بہت رنجیدہ ہوئے اور بہت روئے۔ اس واقعہ کو حضرت امام حسینؑ کی پہلی عزاداری کا نام دیا جا سکتا ہے۔

درج بالا واقعہ ڈاکٹر پروفیسر ضمیر اختر نقوی نے اپنی ایک بہت بڑی مجلس عزا کے خطاب کے دوران بیان فرمایا جو "خیمۂ سادات" ایڈورڈ روڈ لاہور میں منعقد ہوئی۔ محرم

کے دوران ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب "عزائے حسینؑ اور اقوام عالم" کے موضوع پر تقریباً بیس (۲۰) نہایت مدلل مجالس پڑھیں گے۔ ڈاکٹر ضمیر اختر ایک نہایت مقتدر خطیب اور مصنف ہیں۔ آپ نے تقریباً ایک سو تیس (۱۳۰) کتابیں مذہب اور ادب پر تحریر فرمائی ہیں اور پچھلے ۳۷ سال سے تمام عالم میں (دنیا کے مختلف ممالک میں) عزائے حسینؑ مظلوم پر مجالس سے خطاب کرتے آرہے ہیں۔ آپ ایک نامور محقق، ریسرچ اسکالر اور مذہبی فلسفی ہیں جن کی تاریخ پر مضبوط گرفت ہے۔ خداوند عالم کا قرآن پاک میں ارشاد ہے "تم ہنستے ہو لیکن روتے نہیں تم سب بڑی لاعلمی میں ہو" (سورہ نجم آیت ۵۹۔۶۰) "تم اپنے خدا کے پاس واپس جاؤ گے اور وہی تمہیں ہنساتا اور رلاتا ہے" (سورہ نجم آیت ۴۲۔۴۳)

پھر ڈاکٹر ضمیر اختر نے حضرت نوح علیہ السلام کا تذکرہ کیا جو نو سو (۹۰۰) سال زندہ رہے اور اپنی پوری زندگی روتے رہے۔ "نوح" کے معنی ہیں وہ شخص جو روتا اور بکا کرتا ہے۔ حضرت نوحؑ کا نام انجیل (Bible) میں نوحا (Nooha) ہے جو کہ اردو لفظ "نوحہ" کی مانند ہے جس کے معنی ایک قسم کی رثائی نظم یا رثائی اشعار کے ہیں۔

اللہ پاک نے حضرت نوحؑ کو حکم دیا کہ وہ اپنی نجات کے لئے ایک کشتی بنائیں۔ حضرت نوحؑ کو لکڑی کے تختے ایک جگہ جمع کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ چنانچہ اللہ پاک نے حضرت جبرئیلؑ کو حکم دیا کہ وہ کشتی بنانے میں حضرت نوحؑ کی مدد کریں اور پانچ میخوں (کیلوں) کی کشتی بنائیں۔ جب حضرت نوحؑ نے پانچویں میخ (کیل) ٹھونکی تو اس میں سے خون بہنے لگا یہ دیکھ کر حضرت نوحؑ بہت متعجب ہوئے اور حضرت جبرئیلؑ سے اس کا سبب پوچھا تو حضرت جبرئیلؑ نے فرمایا پانچ میخیں (کیلیں) یہ سب بالترتیب ظاہر کرتی ہیں اللہ، محمدؐ، علیؑ، فاطمہؑ، حسنؑ اور حسینؑ کے اسما کو۔

آخری میخ (کیل) سے جو خون نکلا اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ کیل (میخ) حضرت امام حسینؑ کے نام سے منسوب ہے جنھیں کربلا میں شہید کر دیا جائے گا۔ جب کشتی چلی تو پورا کرۂ ارض پانی سے لبریز تھا۔ جب کشتی کربلا کے مقام پر رکی تو وہاں حضرت نوحؑ نے ایک نظم فرات کے ساحل پر پڑھی جو کہ نبی آخرالزماں حضرت محمدؐ کے نواسے کی شہادت اور ان کے سوگ کے ذیل میں تھی۔

ڈاکٹر ضمیر اختر نے فرمایا کہ تمام واقعات تورات اور زبور (حضرت داؤد علیہ السلام کے دعاؤں کے مجموعہ) میں ہیں اور وہ واقعات انجیل (Bible) میں بھی درج ہیں انجیل نے حضرت امام حسینؑ کے شہادت کے ہونے والے واقعہ کا اظہار کیا ہے۔

سقراط یونان کا مشہور عالم، محقق اور فلسفی تھا، اس نے اپنے والد سے کہا کہ اس نے خواب میں تین ستارے دیکھے ہیں جن پر اللہ، محمدؐ اور علیؑ کے اسما لکھے ہوئے ہیں۔ ڈھائی ہزار سال پہلے سقراط بیمار پڑا لیکن اُس نے ساتھیوں کے دیوتا سے علاج کرانے سے انکار کر دیا۔ کیونکہ اس کا دل زیر سایہ (Shadowed) تھا لیکن اس نے دعویٰ کیا کہ اس نے ایک شخص کو دیکھا ہے جو کہ سانپ کے ٹکڑے ٹکڑے کر سکتا ہے اور جب ہی سے سقراط خدا کی وحدانیت پر یقین رکھتا تھا۔ یونان کے بادشاہ نے اسے قید خانہ میں ڈال دیا اور اسے بھاری زنجیریں پہنا دیں۔

سقراط زنجیریں پہنے ہوئے جب چلتا تھا تو بہت تاسف کرتا تھا اپنی ذات کے اوپر نہیں بلکہ عابد جوان کے لئے جو بیمار ہوگا پھر بھی شام کی سڑکوں پر پابند سلاسل کر دیا جائے گا۔

ڈاکٹر ضمیر اختر نے دنیا کا سفر کیا ہے، اس بسیط تحقیق کے سلسلے میں کہ کس طرح عزاداری حسینؑ یورپ، امریکہ، ایران، عراق، آذربائیجان، تاشقند، افریقہ، ہندوستان،

پاکستان اور دنیا کے دیگر ملکوں میں ہوتی ہے۔

صحیح روح عزاداری شہادت امام حسینؑ کی یہ ہے کہ اللہ کے سچے مذہب کو مکمل طور پر زندہ رکھا جائے جو ہمیں ہدایت دے سکے کہ انسانیت کے لئے صحیح راستہ کیا ہے۔ ہم حضرت ام سلمیٰ سلام اللہ علیہا زوجہ حضرت محمد مصطفےٰؐ کی بتلائی ہوئی ایک روایت کا اظہار کرتے ہیں۔ ایک دن رسول اکرمؐ کی طبیعت ناساز تھی اور آپ نے اپنی زوجہ حضرت ام سلمیٰؓ سے کہا کہ وہ کسی سے نہیں ملیں گے اور اپنے بستر پر دراز ہو گئے اسی وقت حضرت امام حسینؑ جن کی اس وقت پانچ سال سے زیادہ عمر نہیں تھی اپنے نانا کے مکان میں داخل ہوئے اور حضرت رسول اکرمؐ کے حجرے کی طرف بڑھنے لگے، حضرت ام سلمیٰ نے ننھے حسینؑ کو روکا اور کہا کہ اس وقت رسول اکرمؐ کسی سے نہیں ملیں گے۔ اس گفتگو کے دوران رسول اکرمؐ نے امام حسینؑ کی آواز سن لی اور فوراً ہی بستر سے اٹھ کر باہر آ گئے۔ رسول اکرمؐ اپنے نواسے ننھے حسینؑ کو اپنے حجرے میں لے گئے اور اپنے نواسے سے باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر کے بعد حضرت امّ سلمیٰ حجرے میں داخل ہوئیں انھوں نے حضرت امام حسینؑ کو رسول اکرمؐ کے سینے پر سوتے ہوئے دیکھا اس وقت رسول اکرمؐ کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ رسول اکرمؐ نے اپنے ہاتھ میں ایک مٹھی خاک لی اور اُسے سانس کھینچ کر سونگھا۔ اس کے بعد آنحضرتؐ نے امّ سلمیٰ سے فرمایا کہ حضرت جبرئیلؑ نے مجھے پوری کہانی سنادی ہے میرے نواسے کی کربلا میں شہادت کی اور انہوں نے کربلا کی وہ خاک بھی مجھے دے دی ہے۔ رسول اکرمؐ نے فرمایا کہ امام حسینؑ اور اس خاک دونوں کی خوشبوئیں ایک جیسی ہیں۔ حضرت ام سلمیٰ نے فرمایا کہ رسول اکرمؐ نے وہ خاک مجھے دے دی اور مجھے ہدایت کی کہ اسے احتیاط سے رکھوں اور جب یہ خاک خون میں تبدیل ہو جائے تو پھر مجھے یقین کرنا

چاہیے کہ نواسہ قتل ہو گیا۔

حضرت ام سلمیٰ نے وہ خاک احتیاط سے ایک شیشے کے مرتبان میں رکھی اور اس مرتبان کو طاق پر رکھ دیا۔ ہر نماز کے بعد وہ اس مرتبان میں خاک کو دیکھتی تھیں حقیقت میں یہ امام حسینؑ کا پہلا تعزیہ تھا جسے حضرت ام سلمیٰ نے شیشے کے مرتبان کے روپ میں سجا کر رکھا تھا۔

دسویں محرم کو ظہر کی نماز کے بعد ام سلمیٰ کچھ دیر کے لیے سو گئیں انھوں نے رسول اکرمؐ کو خواب میں دیکھا جو خون سے بھرے ہوئے کئی شیشے اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے ہیں اور کہہ رہے ہیں کہ میرا نواسہ قتل کر دیا گیا لیکن میں نے اس کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہیں گرنے دیا۔ جب حضرت ام سلمیٰ خواب سے بیدار ہوئیں تو وہ تیزی سے اس خاک کو دیکھنے کے لیے شیشے کے مرتبان کے پاس پہنچیں انھوں نے دیکھا کہ مرتبان کی خاک خون میں تبدیل ہو چکی ہے ام سلمیٰ نے وہ مرتبان اٹھایا اور اسے صحن میں لے گئیں اور شہادت امام حسینؑ پر عزاداری اور تعزیت کے لیے اور خواتین کو بلایا۔ حضرت ام سلمیٰ نے حضرت صغریٰ دختر امام حسینؑ کو بتلایا کہ ان کے والد کو قتل کر دیا گیا ہے۔ رسول اکرمؐ کی ازواج میں سے صرف حضرت ام سلمیٰ شہادت امام حسینؑ کے بعد تک زندہ رہیں۔

تمام دنیا میں عزائے حسینؑ منائی جاتی ہے کچھ قومیں اور کچھ مقامات عزاداری اور تعزیہ داری کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے۔ تیمور لنگ تاریخی اعتبار سے امام حسینؑ کا تعزیہ پہلی مرتبہ ہندوستان میں لایا۔

راجہ صاحب محمود آباد، آصف الدولہ، حیدر علی اور ٹیپو سلطان شہادت امام حسینؑ کا غم تازہ کرتے تھے۔

سونے، موتیوں اور قیمتی پتھروں سے تعزیے بنا کر۔ راجہ رنجیت سنگھ کو بڑی شہرت حاصل ہوئی اس کے اپنے، حضرت امام حسینؑ کے تعزیے کی وجہ سے۔ حضرت امام حسینؑ کے روضے کا نہایت قیمتی تعزیہ اب بھی انگلینڈ کی ملکہ کے محل میں ہے جو کوئی برطانوی باشندہ چرا کرلے گیا تھا۔

لیاقت علی خان ہر محرم میں اپنے ہاتھ سے تعزیہ بناتے تھے۔ علامہ اقبال نے زبردست محنت اور تگ و دو کی "امامت" کے معنی اور اس کی صحیح روح سمجھنے میں۔ قائد اعظم محمد علی جناح ہر سال بڑے جوش و جذبے سے شہادت امام حسینؑ مناتے تھے۔ قائداعظم کی والدہ نے پہلے ان کا نام ذوالجناح رکھا تھا جو بعد میں صرف جناح رہ گیا۔

ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کی علمی تحقیق قابلِ صد ستائش ہے جو مذہبی جذبے کو تقویت پہنچاتی ہے۔ اسلام کی صحیح روح زندہ ہے دراصل حضرت امام حسینؑ کی بے مثال قربانی کی وجہ سے جس کی عزاداری پورے جوش و جذبے اور لگن کے ساتھ منائی جاتی ہے۔

محبت شجاع رانا (آفیسر تعلقات عامہ پنجاب اسمبلی لاہور)

۶ دسمبر ۱۹۹۷ء

جناب ڈاکٹر علامہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب...... سلام ورحمت!

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ کا محبت نامہ ملا۔ پڑھ کر دلی و روحانی خوشی ملی۔ خط کا جواب دیر سے لکھنے پر معذرت خواہ ہوں۔ آپ نے جس انداز میں میرے مضمون کی تعریف کی ہے۔ میں اس کے لئے آپ کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

میرے نزدیک اس مضمون کی اشاعت مولا حسینؑ کی بارگاہ عظمت میں قبولیت کے باعث ہی ممکن ہو سکی۔ میں آپ کی علمی، ادبی اور لسانی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو ہمیشہ سلامت رکھے۔

آپ نے جس کام کے لیے میرا انتخاب کیا ہے۔ میری خوش قسمتی اس میں پنہاں ہے۔ یہ کام اتنا آسان نہیں ہے۔ لیکن انشاء اللہ میں اس کی تکمیل میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کروں گا۔ یہ نہ صرف مذہب اور ادب کی خدمت ہوگی بلکہ میری قلبی و روحانی تسکین کا باعث بنے گا۔

آپ سے درخواست ہے کہ جتنی جلدی ممکن ہوسکے مجھے ''عزاداریِ حسینؑ اور اقوامِ عالم'' پر آپ کی مجالس کا پورا عشرہ ارسال کر دیں تاکہ میں اس پر کام شروع کرسکوں، آپ نے جس مضمون کے اردو ترجمے کے لیے لکھا ہے وہ بھی ساتھ ہی بھیج دیں۔

آپ سے استدعا ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ سے میرے لیے اس مقدس اور بامقصد کام کی تکمیل میں مدد کے لیے دعا کریں۔ تاکہ میں آپ کی توقعات پر پورا اتر سکوں۔ اور اس عظیم مقصد میں کامیاب ہوسکوں۔ شکریہ۔

آپ کا خیر اندیش... محبت شجاع رانا

آفیسر تعلقاتِ عامہ پنجاب اسمبلی لاہور

محبت شجاع رانا، آفیسر تعلقاتِ عامہ پنجاب اسمبلی لاہور، ایک انگریزی اخبار ''نیشن'' کے مشہور صحافی و کالم نویس بھی ہیں۔ ۱۹۹۷ء میں جب علامہ ضمیر اختر نقوی نے عشرۂ محرم میں ''عزاداریِ امام حسینؑ اور اقوامِ عالم'' کے عنوان سے خیرسادات لاہور میں مرکزی عشرے سے خطاب فرمایا تو محبت شجاع رانا نے خصوصی طور پر اس عشرے کی تلخیص انگریزی میں کر کے چھاپی یہ مضمون انگریزی سے ترجمہ کیا گیا ہے۔ یہ خیال رہے کہ یہ عنوان اس وقت رکھا گیا جب شدت سے سندھ اور پنجاب میں عزاداری کی مخالفت ہورہی تھی اور شیعہ کافر کے نعرے پنجاب اسمبلی تک پہنچ گئے تھے۔

سیّد ممتاز حسین زیدی (موتیؔ)

"آسمانِ خطابت کے عظیم اختر"

ضمیر اختر، ضمیر اختر

تیس برس اُدھر کی بات ہے کہ جب علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی صاحب کو ضمیر اختر نہ جانتے ہوئے بھی صرف ضمیر اختر ہی جانتا تھا مگر آپ جناب کی محبت اور معرفت دل میں نہ رکھتا تھا۔ انچولی سوسائٹی کی امام بارگاہ چہاردہ معصومین میں صبح ۱۱ بجے مرثیہ تحت اللفظ کی مجلس کا انعقاد تھا اور علامہ صاحب کو اس مجلس میں حضرت جوشؔ ملیح آبادی کا تصنیف کردہ مرثیہ بعنوان "پانی" پڑھنا تھا۔ میں بھی اپنے شوق اور ذوق سے مجبور ہو کر مرثیہ سننے پہنچا۔ اُس وقت میرا تاثر صرف یہ تھا کہ مجھے کلامِ جوشؔ سننا ہے۔ جو میرے لیے انتہائی دقیق اور مشکل تھا مجھے موقع فراہم ہوا اور میں علم و ادب کی بارگاہ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے پہنچا۔

مشاہیرِ شعراء اس مجلس میں شریک تھے۔ اگر میرا حافظہ مجھے تنہا نہ چھوڑے تو مجھے یاد پڑتا ہے کہ حضرت رئیسؔ امروہوی مرحوم اور سید حسن انجمؔ مرحوم کے علاوہ اور دیگر ادب کی قد آور شخصیات اس مجلس میں رونق افروز تھیں۔ وقتِ مقررہ پر علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی صاحب زیبِ منبر ہوئے اور حسبِ دستور حمد و ثنا کے بعد مرثیے سے متعلق کچھ تمہیدی گفتگو کی اور پھر مرثیہ پڑھنا شروع کیا۔ دورانِ مرثیہ علامہ صاحب نے رقت

رفتہ ہر مصرعے کی شرح اور تفسیر بیان کی اور کلام جوشؔ کا نشہ جو مجھ پر سوار تھا وہ ہوا ہو چکا تھا اور میں ایک وجدانی کیفیت میں کھو چکا تھا۔ اور علامہ ضمیر اختر کی خطابت اور دلنشیں آواز کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ اُس دن مجھے شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ تفسیر صرف قرآن ہی کے لیے ضروری نہیں ہے بلکہ شہر میں اسی طرز پر "مجالس تفسیر مرثیہ" بھی ہونا چاہئیں۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں گھر سے اپنے دل کو اپنے ساتھ لے کر چلا تھا مگر اختتام مجلس پر نہ معلوم میرا دل کس نے چرا لیا تھا...... ابعد مدت کے بہ توفیقِ الٰہی اور بہ تائید مولا علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب تک ایک مرتبہ پھر رسائی ہوئی اور پھر کچھ ہی دنوں میں مجھے اس بات کا علم ہو چکا تھا کہ بیسؔ برس پہلے جو میرا دل چوری ہوا تھا وہ ضمیر اختر صاحب ہی کے پاس بڑی احتیاط کے ساتھ رکھا ہے۔

اب میں ان سطور کی شرح و تفصیل بیان کرتا ہوں کہ یہ سارا ماجرا کیا ہے؟ جب علامہ صاحب مرثیہ پڑھ رہے تھے تو میں اپنے ذوق سے مجبور ہو کر اور ضمیر اختر صاحب کی "شرحِ مرثیہ" سے متاثر ہو کر برمحل اور برحق داد دے رہا تھا نہ تو علامہ صاحب مجھے ذاتی طور پر جانتے تھے اور نہ مجھے اُن سے اُس وقت تک کوئی قلبی یا ادبی راہ و رسم تھی۔ علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کو قدرت نے جہاں اور بہت سے ہنر اور فن سے نوازا ہے وہاں یہ فن بھی بدرجہ اتم موجود ہے کہ دورانِ مجلس وہ ہر سامع پر بھرپور نظر رکھتے ہیں اور پہچان لیتے ہیں کہ کون سا سامع کس کیفیت اور وجدان میں تقریر یا مرثیہ سن رہا تھا۔ بعد از مجلس میں اپنی کم علمی اور تنہائی کو دیکھتے ہوئے امام بارگاہ کی دیوار سے ایک طرف ٹیک لگائے یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ جناب حضرت رئیس امروہوی اور سید حسن انجم صاحب علامہ صاحب کو ڈھیر ساری دعاؤں کے ساتھ ساتھ "حق مرثیہ اور حق بیانی تحت اللفظ" پر بھرپور خراجِ تحسین پیش کر رہے تھے۔ اب جب علامہ صاحب اس مرحلے سے فارغ

ہوئے تو اچانک اُن کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ خود ہی بڑی محبت اور مشفقانہ انداز میں میرے نزدیک آئے مجھ سے مصافحہ کیا اور بڑے ہی پیارے اور خوبصورت انداز میں میرا نام اور حال احوال دریافت کیا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میں نے اچانک "کچھ کھو دیا" اور اگلے ہی لمحے "بہت کچھ" پالیا۔ جو میں نے کھویا وہ "دل" تھا اور جو میں نے پایا وہ "علم" تھا۔ علامہ صاحب کا خلوص، محبت اور اخلاص اس بات کا متقاضی تھا کہ نہ جانتے ہوئے بھی انھوں نے اس بات کو جان لیا کہ اس شخص نے پوری توجہ اور دل جمعی کے ساتھ مرثیہ سنا ہے اور یہ علامہ صاحب کا کمال محبت ہے کہ وہ اپنے اوپر کسی کا قرض نہیں رکھتے اور جلد ہی اس قرض کو ادا کر دیتے ہیں۔ اب مجھے فخریہ طور پر یہ شرف حاصل ہے کہ میں اس موقع پر میر انیس کا یہ شعر اس تحریر میں جوڑ سکتا ہوں۔

تمہارے حلقہ بگوشوں میں ایک ہم بھی ہیں
پڑا رہے یہ سخن کان میں گہر کی طرح

اب جبکہ علامہ صاحب کی خطابت کا سورج پوری آب و تاب کے ساتھ اس کرہ ارض پر روشن ہے ہر صاحب فکر و نظر سے لے کر "ملک و جن و انس" علامہ صاحب کی تقاریر اور مجالس سید الشہداؑ کا بیان بڑے ہی غور سے سنتے ہیں۔ بلکہ میں خود اس بات کا گواہ ہوں کہ کئی مرتبہ میں نے مجلس میں جہاں اور بہت سے معجزے ہوتے دیکھے ہیں وہیں یہ معجزہ بھی بہ چشم نم دیکھا کہ "وقت خود ٹھہر کے ضمیر اختر نقوی صاحب کو سن رہا ہے"۔ اور میرا یہ عقیدہ ہے کہ مجلس میں جہاں ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو وہ قبولیت دعا کا وقت ہوتا ہے لہٰذا میری دعا یہی ہے کہ خطابت کا یہ سورج یونہی تا دیر پوری آب و تاب کے ساتھ اس کرۂ ارض پر منور و روشن رہے۔

میں اس مضمون کو یہیں ختم کر دیتا اگر میرا ضمیر میری توجہ اس جانب مبذول نہ کراتا

کہ حسن روایت یہ ہے کہ واقعات کو کامل بیان کیا جائے۔ اور حق محبت بھی یہی ہے کہ حق کو ظاہر کیا جائے۔

گلشن اقبال بلاک ۳ میں ریٹائرڈ کیپٹن خورشید الحسن صاحب کے مکان پر مجلس برپا تھی۔ میں نے اپنی کج بحثی میں سلام پیش کیا۔ بعدۂ علامہ صاحب نے مجلس سے خطاب کیا۔ آپ زیب منبر ہوئے اور تمہید کے بعد سامعین سے ارشاد فرمایا کہ چونکہ اس بارگاہ اور علاقے میں یہ میری پہلی مجلس ہے اور یہ سامعین بھی میرے لیے نئے ہیں اور مجلس کے لیے ضروری ہے کہ کسی ایک موضوع کو عنوان بنا کر مجلس پڑھی جائے تو پھر بعد میں وہ مجلس ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت اختیار کر جاتی ہے اور اس متعین کردہ موضوع پر بہت کچھ "Matter" ایک جگہ جمع ہو جاتا ہے جو بعد میں ریسرچ کرنے اور پڑھنے پڑھانے والے لوگوں کے لیے مددگار و معاون ثابت ہوتا ہے۔ علامہ صاحب نے کہا اس لیے میں آپ تمام سامعین سے کہتا ہوں کہ آپ میں سے کوئی صاحب مجھے "اس وقت" کسی ایک موضوع کی طرف اشارہ کریں تو میں اس موضوع کو عنوان بنا کر تقریر کروں۔ یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ عموماً ذاکرین از خود مجلس کے لیے عنوان تلاش کرتے ہیں اور پھر اس عنوان پر خوب اچھی طرح مواد جمع کر کے مجلس پڑھتے ہیں۔ یقیناً یہ ایک اچھی اور مستحسن بات ہے کہ "پڑھ کر پڑھا جائے" مگر اس سے بھی بڑھ کر قابل فخر یہ بات ہے کہ علامہ صاحب مجلس کا عنوان اکثر و بیشتر سامعین کی مرضی اور منشا پر چھوڑ دیتے ہیں۔ اور پھر جو بھی فرمائش ہوتی ہے اس پر فی البدیہہ بولنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور اختتام مجلس تک بیان مجلس کو وہ معراج عطا کرتے ہیں کہ گویا ایسا لگتا ہے کہ حشر کا میدان ہے کہ جہاں کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی۔ بالکل اسی طرح علامہ ضمیر اختر کی مجالس میں داد دینے والوں کی آوازوں سے حشر کا سا منظر آنے لگتا

ہے۔ متذکرہ بالا مجلس میں بھی جب آپ نے یہ دیکھا کہ سامعین عنوان بتانے میں کچھ ہچکچا رہے ہیں تو پھر آپ نے سامعین کی اس مشکل کو بھی آسان بنادیا اور بہت سے عنوانات سامعین کے سامنے رکھ دیے مثلاً فرشِ عزا، ذوالجناح، علم، "تابوت"، آنسو، منبر، تخت، رومال، بانیِ مجلس، حاضرینِ مجلس، تبرک، چاندنی، خاکِ شفا، تسبیح، آہ اور واہ، سوز خوانی، نوحہ، سلام، محبت، مودّت، معرفت، اتنے خوبصورت، اچھوتے اور جدید عنوانات کو سن کر ہی سامعین نے علامہ صاحب کو بھرپور داد دینی شروع کردی۔ تو درمیان میں سے پھر ایک صاحب نے کراہت باندھی اور کہا کہ آپ آج "تابوت" پہ مجلس پڑھیں۔ مگر میرا ذاتی تجزیہ ان عنوانات کو سن کر یہ تھا کہ عنوانات کی فہرست ہی خود نصف مجلس ہے اور فضائلِ مجلس کا نصف بیان ہو چکا ہے اب صرف مصائب پڑھنے باقی رہ گئے ہیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کا حافظہ یقیناً کسی "معجزہ" سے کم نہیں۔ آپ نے فوراً اپنے حافظے سے کام لیتے ہوئے "تابوت" کے موضوع پر تقریر کرنا شروع کی۔ اور پوری چابکدستی کے ساتھ ایجادِ تاریخ تابوت سے لے کر اس عہد تک یعنی منت کے تابوت اُٹھانے تک کی تاریخ کو بیان کرنا شروع کیا، اور یوں یہ مجلس بھی ایک پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کے مقالے کی حیثیت اختیار کرگئی۔ ہر شخص اپنی جگہ آپ کی معلومات، قدرتِ بیان اور پھر سب سے اہم نکتہ "ربطِ مضمون" پر اپنی عقیدت اور داد و تحسین کے پھول نچھاور کر رہا تھا اور میں حیرت کے سمندر میں غوطہ زن تھا کہ کیا ہمارے شہر اور ملک میں بھی ایسے خطیب اور ذاکر موجود ہیں کہ جو روایت سے ہٹ کر بھی مجلس کو جدید عنوان دے کر بڑی ہی خوبصورتی اور کمالِ بیان کے ساتھ اسی مجلسی روایت سے منسلک ہو جاتے ہیں کہ جسے بزرگوں نے قائم کیا اور "گریہ مجلس کو مالِ مجلس" قرار دیا واہ، واہ

کیا مجلس تھی آج بھی اُس مجلس کا سماں آنکھوں میں اور نشہ سر پر سوار ہے۔ بعد میں میں علامہ صاحب کے ساتھ چائے پر شریک تھا۔ علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب نے ہمارے ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے ہمیں میر انیس اعلیٰ اللہ مقامہٗ کے مرثیے کے چند بند سنائے جس میں حضرت امام حسینؑ کی آنکھوں کی تعریف کی گئی تھی اور میر انیسؔ نے چند مصرعوں میں ۵۲ خوبیاں امام حسینؑ کی آنکھوں کی بیان کی تھیں۔ مگر علامہ صاحب نے وہ بند اس روانی اور خوبصورتی کے ساتھ بیان کئے کہ گویا یوں محسوس ہو رہا تھا کہ آنکھوں کے سامنے دفترِ انیس کھلا ہوا ہے اور آپ اُسے دیکھ کر پڑھ رہے ہیں۔ اُن مصرعوں میں خاص بات اور تکنیک یہ ہے کہ اُن مصرعوں کو صرف وہی شخص روانی اور جادو بیانی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے کہ جسے زبان و بیان پر بھرپور قدرت حاصل ہو اور یہ ہنر علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب سے کچھ دور نہیں ہے۔

"اللہ کرے زورِ خطاب اور زیادہ"

ادب کا ادنیٰ طالب علم

سید ممتاز حسین زیدی سوتی

۲۱ ذی الحج ۱۴۲۳ھ بمطابق ۲۳ فروری ۲۰۰۳ء

مسٹر ورنن جیمز شوبل

(اسکالر ورجینا یونیورسٹی امریکا)

"میں نے امام حسینؑ کی عزاداری کے موضوع پر امریکا میں پی ایچ ڈی کیا ہے۔ میرا یہ کام بھی آسان نہ ہوتا اگر ضمیر اختر صاحب کی تقاریر اور کتابوں سے استفادہ نہ کرتا۔ وہ ایک قابلِ قدر ذریعہ معلومات ہیں"۔

ریحان احمد:

فلک پہ پھیلے اندھیروں میں روشنی کا سفیر

قلم میں اتنی طاقت ہے نہ صفحات میں اتنی وسعت کے علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی کی حیات وفن کے بارے میں کچھ لکھا جاسکے۔

شخصیت کے کس کس پہلو کا ذکر کیا جائے اور حیات کے کن کن گوشوں پر روشنی ڈالی جائے۔ فنِ خطابت کا ذکر کیا جائے یا تصانیف کا ذکر کیا جائے۔ فنِ شاعری کے متعلق کچھ لکھنے کی جسارت کی جائے یا ایک ادیب کی حیثیت سے علامہ صاحب کے متعلق کچھ لکھا جائے۔ ماہر انیس کے طور پر پیش کیا جائے یا ماہر دبیر کی حیثیت سے کچھ لکھا جائے۔ یا علامہ صاحب کی نجی زندگی میں اُن کی انسانیت پروری کو ضبط تحریر میں لایا جائے غرض زندگی وفن کے کسی بھی گوشے پر لکھنے کی جسارت کی جائے تو صفحات بھرتے چلے جائیں گے لیکن علامہ صاحب کی شخصیت وفن کا احاطہ کرنا ناممکن ہے۔

علامہ صاحب کی ذات علم کا بہتا ہوا سمندر ہے۔ جس کے متعلق کچھ لکھنا میرے جیسے طالب علم کے لئے اتنا آسان نہیں۔

میں علامہ صاحب کے ساتھ پچھلے آٹھ سال سے کمپوزر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ جب بھی دیکھا علامہ صاحب کو علم ہی کی بات کرتے دیکھا۔ جب بھی دیکھا کچھ لکھتے یا پڑھتے ہوئے ہی دیکھا۔ دن ہو یا رات زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں جو علم کے فروغ کے علاوہ کسی دوسرے کام میں صَرف ہوتا ہو۔ کوئی بھی شخص ملنے آیا خواہ وہ کسی بھی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہو اُسے کوئی نہ کوئی علمی بات بتاتے نظر آئیں گے خواہ وہ دنیا کے کسی شعبے سے منسلک ہو اور اپنے شعبے میں کتنی ہی مہارت کیوں نہ رکھتا ہو لیکن علامہ صاحب کے دلائل سے کلّی طور پر متفق نظر آتا ہے۔

برصغیر پاک وہند میں شاید ہی کوئی شخص ایسا ہو، جو بیک وقت اتنے سارے شعبوں میں یکساں مہارت رکھتا ہو۔ میری نظر میں تو دورِ حاضر کا کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو ایک ماہر ادیب بھی ہو، مانا ہوا خطیب بھی ہو، تاریخ داں بھی ہو اور ایک اچھا شاعر بھی ہو۔

جہاں خطابت کے میدان میں اچھوتے موضوعات کا انتخاب علامہ صاحب کی خطابت کا خاصہ ہے وہیں ادب کے میدان میں بھی ایسے موضوعات پر لکھنا علامہ صاحب کا محبوب مشغلہ ہے کہ جن پر ابھی تک کسی مصنف نے قلم نہ اُٹھایا ہو۔ "شعرائے اُردو اور عشق علی"، "میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال"، "خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا"، "اردو مرثیہ پاکستان میں"، "اردو غزل اور کربلا" اور "شہید علمائے حق" علامہ صاحب کی ایسی تصانیف ہیں جو اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔

کیونکہ ایسے موضوعات کا انتخاب کرنا صرف اُسی شخص کو زیب دیتا ہے جو اُن مشکل

موضوعات کا حق ادا کرسکتا ہو اور اس موضوع کے کسی پہلو کو بھی تشنہ نہ رہنے دے۔ اکثر مصنف مشکل موضوعات کا انتخاب کرتے ہوئے اسی لئے کتراتے ہیں کہ انہیں یہ ڈر ہوتا ہے کہ وہ اس موضوع کا حق ادا نہیں کر پائیں گے۔ لیکن علامہ صاحب کو اس قسم کا کوئی خوف نہیں ہوتا بلکہ یہاں تو معاملہ کچھ یوں ہے کہ علامہ صاحب کسی موضوع پر کتاب لکھنے کا ارادہ کرتے ہیں تو پروگرام تو یہ ہوتا ہے کہ اس موضوع پر دو ڈھائی سو صفحات کی کتاب لکھیں گے لیکن وہ موضوع وسعت اختیار کرتے کرتے اس حد تک پہنچ جاتا ہے اور کتاب اتنی ضخیم ہو جاتی ہے کہ اُسے دو جلدوں میں چھاپنا پڑتا ہے۔ کئی کتابوں کے ساتھ یہی صورت حال پیش آچکی ہے۔ مثال کے طور پر "سوانح حیات شہزادہ قاسم ابن حسنؑ" کی ایک جلد چھپ چکی ہے جبکہ اس کی دوسری جلد تیار ہے۔ اسی طرح "جناب سیدہؑ کی سوانح حیات" بھی ایک انتہائی ضخیم کتاب ہے اور "ذوالجناح کی سوانح حیات" یہ تمام کتابیں اور اسی طرح کی کئی کتابیں جو ماشاء اللہ بہت ضخیم اور مستند ہیں۔

علامہ صاحب تن تنہا ایک پورے ادارے کا کام کر رہے ہیں کیونکہ بیک وقت اتنی ساری اصناف پر کام کرنا کسی ایک شخص کے بس کی بات نہیں بلکہ یہ کہنا بھی بجا ہوگا کہ کسی ادارے کے بس کا بھی کام نہیں ہے جسے علامہ صاحب تن تنہا انجام دے رہے ہیں۔ لوگ ان کاموں کو سراہتے اور یہی کہتے نظر آتے ہیں کہ علامہ صاحب اتنا کام کر کس وقت لیتے ہیں۔

اسی طرح خطابت کے میدان میں بھی علامہ صاحب کا کوئی ثانی نہیں ہے۔ اکثر خطیب عربی میں آیتیں پڑھتے اور اس کا ترجمہ کر کے سناتے نظر آتے ہیں لیکن تاریخ پڑھنا اور مستند حوالوں سے اپنی بات لوگوں تک پہنچانا کوئی بھی نظر نہیں آتا۔

آرٹس کونسل میں کوئی لیکچر ہو یا بار کونسل میں وکلا کے درمیان کوئی لیکچر ہو، علامہ صاحب پُر وقار انداز میں اُنہی کے شعبے سے متعلق دلائل دے کر انہیں قائل کرتے نظر آتے ہیں۔ حالانکہ وکلا حضرات جن کا کام ہی اپنے دلائل سے دوسروں کو قائل کرنا ہے بمشکل ہی کسی دوسرے شخص کے قائل ہوتے ہیں لیکن علامہ صاحب کے ٹھوس دلائل کو ستائشی نظروں سے تسلیم کرتے نظر آتے ہیں۔ کیونکہ راقم کو متعدد دفعہ بار کونسل کراچی میں "یوم حسینؑ" کے موقع پر علامہ صاحب کے ساتھ بار کونسل جانے کا اتفاق ہوا اور راقم ان تمام باتوں کا چشم دید گواہ ہے۔ بالکل اسی طرح کی صورت حال جنگ فورم کے کسی مذاکرے یا آرٹس کونسل میں بھی پیش آتی ہے اور تمام مندوبین علامہ صاحب کی بات کو حرف آخر کی حیثیت دیتے ہیں۔

علامہ صاحب کسی بھی کام کو مکمل پلاننگ سے شروع کرنے اور سلیقہ مندی سے اُسے پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے عادی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی ٹیلی ویژن پر کوئی ادبی، مذہبی یا کرنٹ افیئر سے متعلق کوئی پروگرام نشر کرنے کی منصوبہ بندی کی جاتی ہے تو بڑے بڑے TV channels کے ہوسٹ علامہ صاحب سے سوالنامے اور اُس پروگرام کا Layout ترتیب دلواتے اور شہرت کماتے نظر آتے ہیں جبکہ اس میں پس پردہ علامہ صاحب کی محنت کا عمل دخل ہوتا ہے۔

پاک و ہند کے متعدد لوگوں کی Phd مقالے میں معاونت فراہم کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری دلوا چکے ہیں۔ حال ہی میں اُمّ المومنین "جناب خدیجہؑ" کی حیات کے موضوع پر کراچی یونیورسٹی سے ایک صاحب نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے اس میں بھی ہر مرحلے پر علامہ صاحب کی مدد شامل حال رہی۔ یعنی علامہ صاحب تن تنہا ایک یونیورسٹی کا کام بھی انجام دے رہے ہیں۔

غرض زندگی کا کوئی بھی شعبہ ہو کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی علامہ صاحب کی ذات سے فیض حاصل کر رہا ہے۔

ان آٹھ برسوں میں مجھے علامہ صاحب کو بہت نزدیک سے دیکھنے کا موقع ملا ہے۔ علامہ صاحب اپنی نجی زندگی میں بھی انتہائی مشفق، ملنسار اور غریب پرور انسان ہیں غریبوں کی مدد کرنے میں کبھی کنجوسی نہیں کرتے۔ علامہ صاحب کے ادارے مرکز علوم اسلامیہ کے بعض شعبے ایسے ہیں جو محض غریبوں کی مدد کے لئے ہی قائم کئے گئے ہیں تاکہ انہیں روزگار میسر آسکے۔ مثلاً کیسٹوں سے علامہ صاحب کے پڑھے ہوئے عشرے کاغذ پر لکھوانا اور اس کے بعد کمپوز کروا کر اسے کتابی شکل دینا جبکہ یہ عشرے ڈائریکٹ کیسٹ سے سن کر بھی کمپوز کئے جاسکتے ہیں اور انہیں کتابی شکل دی جاسکتی ہے۔ اسی طرح کتابوں کے ترجمے اور اسی طرح کے دیگر شعبے۔

دوران خطابت علامہ صاحب منبر پر انتہائی چاق و چوبند ہوتے ہیں اور اپنے ہر سامع پر انفرادی نظر رکھتے ہیں، کہاں سے کون آیا اور کون کہاں بیٹھا ہے یہ سب علامہ صاحب کو معلوم ہوتا ہے۔ گفتگو کے دوران کس کو مخاطب کیا گیا یہ سامع بھی اچھی طرح سمجھ جاتا ہے۔ یہ بات دوسرے کسی خطیب میں نہیں دیکھی گئی، دیگر خطیب اگر اپنے کسی سامع کو پہچان بھی جائیں تو اپنی خطابت کے زعم میں اس پر ظاہر نہیں کرتے جبکہ علامہ صاحب ہرگز ایسا نہیں کرتے، دوران مجلس جب کوئی اہم بات سمجھانی ہوتی ہے تو یہ کہہ کر سمجھاتے ہیں کہ "بچوں نے یہ یہ مثال دے رہا ہوں وہ سمجھ لیں" جبکہ بیشتر بڑی عمر کے لوگ بھی وہ بات پہلی بار سن رہے ہوتے ہیں ایسا صرف اس لئے کرتے ہیں کہ بڑی عمر کے لوگ احساس کمتری میں مبتلا نہ ہوں کہ انہیں یہ بات پتہ ہی نہیں تھی۔

غرض علامہ صاحب علم کا ایک بہتا ہوا سمندر ہیں جس سے جن جن لوگوں نے فیض

اُٹھالیا وہ فائدے میں رہے اور جس نے نہیں اُٹھایا وہ نقصان میں۔

فلک پہ پھیلے اندھیروں میں روشنی کا سفیر
جہاں میں کوئی بھی اختر نہیں سوائے ضمیر

پتہ نہیں شعر موزوں ہوا بھی یا نہیں۔ بہر حال ڈاکٹر شوذب کاظمی صاحب نے علامہ صاحب کی حیات وفن پر "ضمیر حیات" کے نام سے یہ جو کتاب شائع کرنے کا ارادہ کیا ہے یہ انتہائی قابل تعریف ہے۔ یہ ایک ایسا کام ڈاکٹر شوذب کاظمی صاحب نے کر دیا ہے کہ اگر اب کوئی علامہ صاحب پر Phd کرنا چاہے تو اُسے مقالہ لکھنے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کتاب کو Submit کروا دے اُسے ڈاکٹریٹ کی ڈگری مل جائے گی۔

اللہ تعالیٰ علامہ صاحب کا سایہ ہمارے سروں پر ہمیشہ قائم و دائم رکھے اور ملک و ملت کے ہر شخص کو ضمیری فکر عطا فرمائے (آمین)

آلِ محمد رزمی

ضمیر اختر نقوی ایک آزاد خیال اور ہفت رنگ شخصیت ہیں ان کے یہاں مذہب کا Basic Concept عام ڈگر سے ہٹ کر ہے۔ نہ جانے کیوں وہ علمی و تحقیقی کام کو موخر کر کے خطابت کے میدان میں کود پڑے ہیں لیکن اس میدان میں بھی انھوں نے اپنے لئے ایک علیحدہ راہ اختیار کی ہے اور عام ڈگر سے ہٹ کر خطابت کو نزاعی اور اختلافی موضوعات سے ہٹا کر تاریخی و علمی موضوعات کی طرف لانے کی کوشش میں ایک عرصے سے مصروف ہیں دیکھئے وہ اس جہاد میں کہاں تک کامیاب ہوتے ہیں۔

رائے کاظم حسین کھرل:

خطابت کا روشن آفتاب

سیّد ضمیر اختر نقوی

جناب ندیم شبلی صاحب آداب عرض!

آپ کی آلِ رسولؐ سے محبت اور کاوشوں کو اہل علم و قلم سراہتے ہیں، آپ نے پاکستان کے عظیم خطیب وذاکر حسین کی عزت، مقبولیت، عوام اُسے کس نگاہ سے دیکھتے ہیں؟ وہ عوام کو کیا علم دے رہے ہیں اس بارے میں آپ نے تحریری نوٹ طلب کئے ہیں اور انہیں کتابی شکل دینے کا پروگرام ہے اس محنت و کوشش کی میں آپ کو مبارک باد دیتا ہوں آپ یہ ایسا کام سرانجام دے رہے ہیں کہ جس سے آنے والی نسلوں کو معلوم ہو سکے گا کہ خطیب عوام کے دلوں میں کیا مقام رکھتا تھا، اب خطابت کا جداگانہ انداز:۔

خطابت کا جداگانہ انداز:

قوم کے وقت کا اس قدر احساس ہے کہ کوئی لمبا خطبہ نہیں، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، تمام تعریفیں اللہ کے لئے اور درود وسلام محمد وآلِ محمدؐ کے لئے چھ سات سیکنڈ کا خطبہ پھر باقاعدہ تقریر کا آغاز، شروع میں آواز دھیمی پھر آہستہ آہستہ بلند ہوتی جاتی ہے آپ کا لفظ ادا کرنے کا لہجہ اس قدر واضح اور صاف ہے کہ ان پڑھ سامعین بھی آپ کی تقریر

کے ہر لفظ سے لطف اندوز ہوتے ہیں، دوران خطابت کسی واقعہ کی تشریح کے لئے آپ موضوع سے بالکل جدا نہیں ہوتے، دوران تشریح آپ چاہے کتنی ہی دور نکل جائیں واپس اسی جگہ پر آئیں گے اور موضوع آگے بڑھائیں گے۔ حتیٰ کے بعض اوقات تو سامعین بھی رُکے ہوئے سلسلہ گفتگو کو بھول چکے ہوتے ہیں گفتگو کو مسلسل رکھنا آپ ہی کی تقاریر کا خاصہ ہے۔

آداب منبر:

آپ نے قوم کے بچوں اور جوانوں کو منبر کے آداب سے روشناس کیا ہے، دنیا آج جہاں منبر حسینؑ کو اسٹیج کہہ رہی ہے وہاں آپ نے منبر حسینؑ کا لفظ قوم کے معماروں کے اذہان میں پختہ کیا ہے اور اس منبر کی عظمتوں سے آگاہ کیا ہے آپ کی پوری تقریر کے دوران چاہے سخت گرمی ہو، آپ منبر سے ۲ گھنٹے بولتے رہیں لیکن آداب منبر کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے دوران تقریر کبھی آب نوش نہیں کیا، ایک مرتبہ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ آپ کی طبیعت بہت ناساز تھی یعنی بخار و کھانسی تھی، کھانسی ایسی کیفیت ہے کہ اسے روکنا بہت مشکل کام ہوتا ہے مگر آپ نے ناسازی صحت کے باوجود مجلس عزا پڑھی اور آداب منبر کے تحت کھانسی کو روکے رکھا، مومنین کو معلوم بھی نہ ہونے دیا کہ ناسازی صحت کا کیا عالم ہے پوری مجلس پڑھنے کے بعد ناسازی صحت کا ذکر کیا، یہ مجلس میرے ریکارڈ میں محفوظ ہے۔

ضعیف روایتوں سے گریز:

آپ کی روشن خطابت کا ایک اہم پہلو یہ بھی ہے کہ آل رسولؐ کی شان میں کسی واقعہ پر چار یا پانچ روایات ہیں تو برسر منبر آپ کو اسی روایت کا ذکر کرتا ہے کہ جس پہ

آپ کی مکمل تحقیق ہو اور اہل بیت کی عظمت کی جھلک باقی روایتوں سے زیادہ ہو (ایک خطیب نے بیان کیا کہ شام غریباں کو کھانا و پانی لشکر یزید سے آیا) آپ نے اس جھوٹی روایت کے بارے میں وضاحت کی، مجھے یاد ہے کہ آپ نے اس جھوٹی روایت کے بارے میں چار اعلیٰ اور اہم عقلی دلیلیں دیں اور بتایا کہ کھانا و پانی لشکر یزید سے نہیں بلکہ جناب فضہ نے بارگاہ خدائے کائنات میں دعا کر کے جنت سے منگوایا تھا، اس کے علاوہ بھی آپ نے ضعیف روایات سے گریز کیا ہے۔

معلوماتی و مشہور تقریریں:

آپ کی بہت سی تقاریر ایسی ہیں کہ جو ملت کے جوانوں، علم کے متلاشیوں کے لئے مشعل راہ بنی ہیں اور آئندہ نسلوں کے لئے مشعل راہ رہیں گی، ان میں قرآن کی دلہن، موت، "عزاداری آدم تا قائم اعظم" علی اصغر، محبت امام حسین، جناب شہربانو، رنگ، شعر اور شاعری وغیرہ شامل ہیں اور ریکارڈ میں محفوظ ہیں، ہر تقریر پرانے واقعات اور جدید علوم کی معلومات کا خزانہ ہوتی ہے۔

ہر موضوع پہ ہمہ وقت بولنے کی صلاحیت:

آپ کی شخصیت میں منفرد پہلو یہ بھی ہے کہ عین تقریر سے قبل موضوع ملنے کے بعد بھی برسر منبر در علم سے حاصل کیے ہوئے علم سے مومنین کو عظیم ذکر کے موتیوں سے فیض یاب کرتے ہیں، ویسے تو اور بھی بہت سے واقعات ہیں لیکن ایک واقعہ درج کرتا ہوں ایک شاعر کے ایصال ثواب کی مجلس سے خطاب میں آپ نے غالب کے شعر سے گفتگو کا آغاز کیا:

مشکیں لباس کعبہ علی کے قدم سے جان
ناف زمیں ہے نہ کہ ناف غزال ہے

یہ اعلیٰ گفتگو آج بھی روشن ذہنوں کو وسعت عطا کر رہی ہے۔

میر انیسؔ کی شاعری کا قوم میں شغف پیدا کرنا:

ملت شیعہ مرثیہ کے عظیم شاعر کو بھول چکی تھی، اس عظیم شاعر کو ملت کے جوانوں میں بیدار کرنا اور ان کی شاعری سے شغف پیدا کرنے کا سہرا بھی آپ کی شخصیت کے سر ہے، آپ کو دورِ جدید کا بجا طور پر انیسؔ ثانی کہا جا سکتا ہے، آپ کو ہزاروں اشعار انیسؔ کے یاد ہیں جن کا ذکر اکثر آپ کی تحریروں اور خطابت میں ملتا ہے، ایک شعر جو کہ ہے پہیلی لیکن میر انیسؔ نے خاندانِ نبوت سے دور جانا پہیلی میں بھی گوارا نہیں کیا، یہ شعر بھی آپ کی زبانِ علم سے ہی مجھ ناچیز نے سنا ہے:-

دنیا میں اک شجر ہے کہ جس کو نہیں ہے چین
ظاہر غمِ حسنؑ ہے تو باطن غمِ حسینؑ

اس پہیلی کا جواب یا بوجھ "مہندی" ہے جو سبز اور پسنے کے بعد سرخ ہو جاتی ہے۔

خطابت وراثتاً پانا:

ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی صاحب کی شخصیت کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ کو خطابت وراثتاً حاصل ہوئی ہے آپ کی عظیم والدہ کہ جن کی آغوش میں آپ نے آنکھیں کھولیں اور پرورش کے مراحل اُن کی نگرانی میں طے کیے، امام حسینؑ کی عظیم ذاکرہ تھیں، اُن کی شہادت دورانِ مجلس ہی ہوئی، آپ نے خطابت سے اُنسیت ورثہ والدہ کی گود سے حاصل کیا اور آج انسانیت کو علومِ دینیؑ سے فیض یاب کر رہے ہیں۔

عزاداری کے ہر موضوع کو واضح کرنا:

ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی کی خطابت کا ایک خاص گوشہ یہ ہے کہ اپنی خطابت میں

عزاداریِ حسینؑ کے تمام پہلوؤں پر وقتاً فوقتاً دلیلوں کے ساتھ گفتگو کرتے ہیں، جس سے اپنوں اور غیروں کے اذہان میں اُٹھنے والے سوالات خود بخود چھٹتے رہتے ہیں، ان موضوعات میں، علم، مشک، تابوت، ذوالجناح، پنجہ، علم، پٹکا، پھریرا اور مہندی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔

عزاداروں کے ساتھ مل کر ماتمِ حسینؑ کرنا:

آپ ایک ایسے خطیب ہیں کہ جو کہنے کے ساتھ ساتھ خود بھی عمل کرتے ہیں، سوالی کے ماتم داروں کے ساتھ مل کر ماتم کرتے ہیں اور اس ماتم کی عظمتوں سے مومنین کو آگاہ کرتے ہیں،

ذوالجناح کا ادب واحترام، روزِ عاشور گریبان چاک، ننگے پاؤں و ننگے سر چلنا، یہ وہ عمل ہیں کہ جب آپ کی شخصیت کرتی ہے تو مومنین، چاہنے والے یا دیکھنے والے بھی اس عمل کو بغیر کہے دہراتے ہیں۔

آدابِ مجلس سے آگاہ کرنا:

آپ نے شعوری طور پر عوام کو آدابِ مجلس کے لئے بیدار کیا ہے کہ فرشِ عزا پر جوتے نہ لائے جائیں اور مجلس خاموش رہ کر سنی جائے، مجلس کے پہلے حصے میں واہ واہ نعرے اور درود اور دوسرے حصہ میں آہ گریہ و ماتم ضروری ہے۔ آپ نے دورانِ مصائب گریہ نہ کرنے والوں کو اس عظیم گریہ کے اجر سے آگاہ کیا ہے آپ نے اُن اہم پہلوؤں پر کہ جو مجلس کی زینت تصور کیے جاتے ہیں مومنین کو اہم دلائل کے ساتھ آگاہ کیا ہے آخر میں ڈاکٹر صاحب کی شخصیت کے بے شمار علمی و ادبی پہلو ایسے ہیں کہ جو مجھ ناچیز پر آشکار نہیں ہوئے آپ کو ادب کی دنیا میں مرثیہ کی افتخاری تسلیم کیا جاتا ہے۔

آپ کی شخصیت میں خطیب، شاعر، مرثیہ گو، ادیب، دانشور، محقق، مفکر جیسے خطاب پنہا ہیں، یوں تو دنیا میں ہزاروں لوگ روزانہ پیدا ہوتے اور مرتے رہتے ہیں لیکن کچھ رجال کار ہوتے ہیں جو صدیوں بعد پیدا ہوتے اور قیامت تک امر بن جاتے ہیں، نرگس کو ہزاروں سال اپنی بے نوری پر رونے کے سلسلے میں چمن کے اندر ایسا دیدہ ور ملتا ہے آسمان برسوں خاک چھانتا ہے پھر کہیں ایسا گوہر یکتا اس کے ہاتھ آتا ہے، فلک کی ہزاروں گردشوں کے بعد خاک کے پردے سے ایسا انسان برآمد ہوتا ہے، ایسی عظیم شخصیت کو پڑھنے، سننے اور سمجھنے کا موقع عوام الناس کے پاس ہے، ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی خود فرماتے ہیں:-

''ہم کیا ہیں؟ ہم کیا کر چکے؟ ہم کیا کر رہے ہیں؟ ابھی بہت سے لوگوں کو کچھ خبر ہی نہیں، بے خبر لوگوں سے کیا گفتگو کی جائے''۔ بے خبر لوگ فانی بدایونی کا یہ شعر یاد کریں۔

بے حسنِ نظر بزمِ تماشہ نہ رہے گی
منہ پھیر لیا ہم نے تو دنیا نہ رہے گی

پدم شری علی جواد زیدی

(صدر اردو اکیڈمی لکھنؤ)

''ضمیر اختر نقوی کی سعی پیہم ایک خوش آئند مستقبل کی پیامی ہے وہ ایک اچھے محقق ہیں تحقیقی مواد کو سلیقے سے یکجا کرنے اور پیش کرنے کی صلاحیت قابل قدر ہے۔''

عمران رضا نقوی:

علامہ ضمیر اختر نقوی کی تحریر و تقریر

پروردگار کا شکر ہے کہ اس کی ذات نے مجھے آج اتنی عزت دی کہ مجھ جیسا ادنیٰ انسان ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کے لئے کچھ لکھ رہا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو میں پچھلے آٹھ برسوں سے سن رہا ہوں اور اس بات کا ہمیشہ افسوس رہے گا کہ میں ان کی چالیس سالہ خطابت کیوں نہ سن سکا لیکن مولا کا یہ بھی کرم ہے کہ میں آٹھ سال پہلے ان کا سامع بن گیا۔ اگر ہم علامہ صاحب کی خطابت پر نظر ڈالیں تو کہیں بھی ایسا نہیں ملے گا کہ کچھ رہ گیا ہو یا بچ گیا ہو۔ علامہ صاحب ہر موضوع پر گفتگو فرما چکے ہیں اور ایسے ایسے موضوعات پر قبلہ نے تقریریں کی ہیں کہ میرے خیال سے شاید ہی کوئی ایسا خطیب ملے جس نے اتنی تقریریں کی ہوں علامہ صاحب کی آپ کسی بھی تقریر کو اٹھا کر دیکھیں تو وہ بالکل ہی الگ موضوع پر ہوگی جو اس سے پہلے نہ سنی ہوگی نہ کبھی اس موضوع پر غور کیا ہوگا ایسا کرم در زہراؑ سے شاید ہی کسی خطیب پر ہوا ہو۔ منظر کشی اس طرح سے فرماتے ہیں کہ پورا منظر آنکھوں کے سامنے لے آتے ہیں فضائل ہوں یا مصائب علامہ صاحب کا سامع ہر منظر آنکھوں کے سامنے دیکھ رہا ہوتا ہے۔ ہم مجالس بچپن سے سنتے ہوئے آرہے ہیں لیکن اگر آپ علامہ صاحب کے سامع ہیں تو خود محسوس کریں گے جب سے آپ نے علامہ کی تقریریں سننا شروع کیں تو آپ معرفت کی کس منزل تک پہنچ چکے ہیں اور یہی وہ عطا ہے علامہ صاحب پر در زہراؑ سے جو عطا ہوئی ہے۔

میں نے آج تک علامہ صاحب کو مجلس کی تیاری کرتے نہیں دیکھا کہ کچھ یاد کر رہے ہوں۔ بس جیسے ہی زیبِ منبر ہوئے اک علم کا سمندر ہے جو اُترتا چلا جاتا ہے کاش ہماری قوم اس عظیم خطیب کے مقصد کو سمجھ جائے۔ غمِ حسینؑ میں اپنی تمام زندگی جو انسان گزار رہا ہے وہ کتنا عظیم ہوگا۔ آپ بھی غور کریں اور مجلس کے ابتدا سے علامہ صاحب کے چہرہ پر نظر رکھیں جیسے جیسے آپ تقریر سماعت کرتے جائیں گے آپ دیکھیں گے کہ علامہ صاحب کے چہرہ پر ایک عجیب سفید رنگ آتا جائے گا اور جب آپ مصائب پر آئیں گے تو آپ کا چہرہ چودھویں کے چاند کی طرح چمک رہا ہوگا۔ میں یہ بات بہت عرصے سے محسوس کر رہا ہوں اور آج اپنے دل کی بات آپ سے شیئر (Share) کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں اور آپ نے اب تک جو کتابیں بھی تحریر کی ہیں اگر صرف ان کتابوں کو ہی پڑھ لیا جائے تو آدمی خود بہترین خطیب بن سکتا ہے ویسے تو علامہ صاحب کی تقریریں ہمارے بہت سے ذاکرین پڑھ رہے ہیں۔ ان میں کچھ ایسے بھی ہیں جن کے پاس سارا علم علامہ صاحب ہی کا عطا کردہ ہے اور آج پوری دنیا میں وہ تقریریں کر رہے ہیں۔ اگر پاکستان خاص کر کراچی میں دیکھا جائے تو علامہ صاحب ہی واحد خطیب نظر آتے ہیں جو غمِ حسینؑ میں پورا سال مشغول رہتے ہیں۔ یہ واحد خطیب ہیں جو خود سے مجالس کا اہتمام کرتے ہیں۔ شہادت ہو یا ولادت، ہر مخصوص تاریخ پر محافل، مجالس کا انعقاد کرتے ہیں اور تقریباً قبلہ کے ہر پروگرام میں نذر کا اہتمام بھی باقاعدگی سے ہوتا ہے۔

محمد علی صدیقی

"ضمیر اختر نقوی، وسیع مطالعہ اور تحقیق لگن کی قابلِ رشک مثال ہیں۔"

طارق وحید (کمپوزر مرکز علوم اسلامیہ)

علامہ ڈاکٹر سیّد ضمیر اختر نقوی کی ذات بابرکت وانسانیت پروری

''چھوٹا منہ بڑی بات'' مجھ ناچیز کی یہ جسارت کہاں کہ علامہ ڈاکٹر سیّد ضمیر اختر نقوی صاحب کی ادبی، سماجی، مذہبی خدمات کے بارے میں کچھ لکھوں، بس یہی کہوں گا کہ علامہ صاحب اس تاریکی کے دور میں اُس آفتاب کی حیثیت رکھتے ہیں، جو زمانے کی بے اعتنائیوں اور سرد مہریوں کے باوجود ہر روز اپنے وقت پر نمودار ہو کر اپنا کام مسلسل کئے جارہا ہے۔

اس دور میں جہاں ایک نماز پڑھانے والا مولوی بھی سمجھتا ہے کہ میں قوم پر احسان کررہا ہوں حالانکہ ہر ماہ اُسے تنخواہ ملتی ہے وہاں علامہ صاحب کی ذات بغیر کسی لالچ و طمع کے مسلسل اسلام کی اشاعت میں دن رات مصروف ہیں۔ محبت کرنے والوں کے مسلسل اصرار کے باوجود بنگلے اور مہنگی ترین گاڑیوں کو از راہِ فیشن اپنانے کی بجائے علامہ صاحب بالکل سادہ زندگی گزار رہے ہیں۔

اب تک کئے گئے اشاعتی کام کو اگر علامہ صاحب کی ساٹھ سالہ زندگی پر تقسیم کیا

جائے تو علامہ صاحب نے تقریباً یومیہ پچاس صفحات لکھے، اب تک تقریباً ساڑھے پانچ ہزار موضوعات پر تقاریر کر چکے ہیں۔ علامہ صاحب کی ایک ایک کتاب، چاہے وہ شاعری ہو یا نثر قوم کے لئے انمول خزانہ ہے۔

اس گئے گزرے دور میں جہاں انسان حریصانہ ذہنیت کی وجہ سے کسی کے کام آنا تو درکنار بلکہ ہر وقت دوسرے کے پاؤں کھینچنے کے چکر میں رہتا ہے، وہاں علامہ صاحب کی انسانیت پرور، مشفق اور مہربان ذات ہمیشہ ہر طبقے کے لوگوں کو اپنے دامنِ دلگیر میں جگہ دیے ہوئے ہے۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ادیب، شعراء، علامہ اور مولانا حضرات نوجوان طبقے کے ساتھ دوستانہ رویہ نہیں رکھ پاتے، جس کی وجہ سے نوجوان ان سے کسی طرح کا علمی استفادہ نہیں کر پاتے اور ان سے دور بھاگتے ہیں، لیکن اس کے برعکس علامہ صاحب نوجوانوں کے ساتھ گھل مل کر محبت اور شفقت سے رہتے ہیں، جس کی وجہ سے علامہ صاحب مجالس و محافل میں زیادہ تر نوجوان طبقے میں گھرے رہتے ہیں۔

علامہ صاحب میر انیس سے والہانہ عقیدت رکھتے ہیں، یہ محبت علامہ صاحب کی انیس ذات سے ہر وقت جھلکتی رہتی ہے اور یہی انسیت ہر ملنے والے پر پھولوں کی طرح نچھاور کرتے رہتے ہیں۔

میری زندگی کا بیشتر حصہ ادبی اداروں سے وابستگی میں گزرا، میں علامہ صاحب کے ہاں تقریباً دو سال سے کمپوزر آپریٹر کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں، میں چونکہ شروع سے ہی اسی فیلڈ میں ہوں اس لیے میں نے تقریباً ہر طبقہ فکر لوگوں کے ساتھ کام کیا ”میں نے علامہ صاحب کو بحیثیت انسان سب سے بہتر پایا۔“

روزانہ چونکہ بارہ گھنٹے علامہ صاحب کی صحبت میں گزرتے ہیں تو یہاں آ کر

انسانیت کو قریب سے دیکھا اور بہت کچھ سیکھنے کا موقعہ ملا، علامہ صاحب کی مشفقانہ طبیعت کی وجہ سے اس ادارے میں کام کرتے ہوئے کبھی یہ محسوس نہیں ہوا کہ ہم جاب کر رہے ہیں، گھر کا ماحول ہے، ادارے کے ہر فرد کی ضرورت، پریشانی، دکھ تکلیف میں فیملی ممبر کی طرح شامل رہتے ہیں۔

یہ چند الفاظ جو میں نے لکھے علامہ صاحب کی زندگی کی مکمل عکاسی نہیں کر سکتے، مجھ ناچیز کے قلم میں اتنی طاقت کہاں کہ علم کے اس سمندر کی گہرائی ماپ سکے، یہ تو محض چند قطرے تھے، علامہ صاحب کی شخصیت پہ لاکھوں صفحات لکھے جانے چاہئیں کیوں کہ اگر ان کی ذات و صفات کو پڑھ کر آئندہ نسل میں سے کوئی ایک انسان بھی علامہ صاحب کے نقش قدم پر چل پڑا تو ملک و ملت کے لئے اس سے بڑا سرمایہ اور کیا ہو سکتا ہے!

اللہ آپ کو عمر نوح عطا فرمائے!

ماجد حسین رضوی (رضویہ سوسائٹی)

"جناب ضیاء الحسن صاحب موسوی نے ایک جلسے میں حاضرین کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔ "ضمیر اختر نقوی، قوم کا ایک بہت بڑا سرمایا ہیں ان کی قدر کیجیے۔" آج بھی میرے کانوں میں اس باعظمت شخصیت کے جملے گونج رہے ہیں۔"

علامہ ضمیر اختر نقوی کی قیمتی تقاریر

علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی مدظلہ العالی اس وقت آسمانِ خطابت کے آفتاب ہیں۔ عرصہ چالیس برس سے ڈاکٹر صاحب ذکر حسینؑ کے ذریعے خدمت اہل بیتؑ میں مصروف ہیں۔ علامہ ضمیر اختر نقوی کی خطابت کا اگر جائزہ لیں تو ان چالیس برسوں میں مسلسل تنوع، ارتقاء، دوربینی، مستقبل شناسی، عہد شناسی، حالات حاضرہ سے مکمل و مستحکم واقفیت، منبر پر حق بات کہنے کا حوصلہ اور ہمت، دفاعِ حقوق محمدؐ وآل محمدؐ، اور مسلسل منبر پر معجزاتی والہامی خطابت دیکھنے میں آتی ہے۔ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی اپنے عہد میں رہتے ہوئے سو سال آگے کی بات کرتے ہیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی بیک وقت ایک کامیاب خطیب بھی ہیں اور ایک معروف و نامور ادیب بھی ہیں۔ یہ دونوں باتیں کسی ایک شخصیت میں یکجا نہیں ہوتیں اور یہ وصف خداداد ہے۔ اُن کی خطابت جدید موضوعات یعنی سائنس، طب، فلسفہ، تاریخ اور کمپیوٹر سے متصل ہو کر سفر کرتی ہے۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی مجلس ریکارڈ کر کے جب حروف گنے گئے تو تقریباً ستائس ہزار (۲۷۰۰۰) الفاظ علامہ صاحب ایک گھنٹے میں بولتے ہیں جو حیرت انگیز ریکارڈ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ علامہ ضمیر اختر نقوی کی ایک تقریر ایک مکمل ضخیم مقالے کے برابر ہوتی ہے اور اوسطاً ایک تقریر ڈیڑھ سے دو گھنٹے کی ہوتی ہے اب تک علامہ صاحب کی پانچ ہزار موضوعات پر دس ہزار تقاریر کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ موجود ہیں اور یہ ایک

ایسا ریکارڈ ہے جو تاریخ خطابت میں کسی خطیب کے حصے میں نہیں آیا ہے۔ یہ کیسٹ مرکز علوم اسلامیہ کی آڈیو کیسٹ لائبریری میں موجود ہیں۔ یہ کیسٹ (Commercial Market) میں نہیں دیے جاتے۔ اس لئے کہ علامہ ضمیر اختر نقوی کی مجالس میں عشرہ مجالس کے دس کیسٹس کی قیمت مبلغ دو ہزار روپے ہے اور ویڈیو کیسٹس میں عشرہ مجالس کی قیمت پانچ ہزار روپے ہے۔ لہذا جو حقیقتاً موضوع اور مضمون کا متلاشی ہوتا ہے وہ یہ کیسٹس خریدتا ہے اور استفادہ حاصل کرتا ہے۔ جو حضرات یہ کیسٹس طلب کرنا چاہیں وہ مرکز علوم اسلامیہ، 4-1 نعمان ٹیرس فیز 3 گلشن اقبال بلاک 11، کراچی سے طلب کرسکتے ہیں۔ فون نمبر 4612868

علامہ ضمیر اختر نقوی کے آڈیو اور وڈیو کیسٹ

۱.	تفسیر سورۂ آل عمران	۱۹۸۶ء	امام بارگاہ چہاردہ معصومین
۲.	فدک	//	//
۳.	تفسیر سورۂ نساء	//	//
۴.	تفسیر سورۂ انعام	//	//
۵.	جناب خدیجہؑ (خدیجہؑ کی دولت)	//	//
۶.	قرآن میں جانوروں کا تذکرہ	//	//
۷.	تفسیر سورۂ اعراف	//	//
۸.	تفسیر سورۂ انفال	//	//
۹.	تفسیر سورۂ برأت (توبہ)	//	//
۱۰.	تفسیر سورۂ یونسؑ	//	//

۱۱. تفسیر سورۂ ہودؑ // //

۱۲. تفسیر سورۂ نحل // //

۱۳. قرآن میں پھلوں کا تذکرہ۔ شہد،
کھجور، انار، انجیر، سیب وغیرہ // //

۱۴. تفسیر سورۂ بنی اسرائیل ۱۹۸۶ء امام بارہ چہاردہ معصومینؑ

۱۵. امام حسنؑ کی ولادت // //

قرآن، احاطۂ علوم اور قرآنی لفظیات (۲۸ تقاریر) // //

۱۶. سورۂ کہف // //

۱۷. فضیلتوں کا اول و آخر (شبِ ہجرت) // //

۱۸. علیؑ کی کامیاب زندگی // //

۱۹. علیؑ کے فیصلے // //

۲۰. کوفہ دارالحکومت کیوں بنا؟ // //

۲۱. معرفتِ علیؑ // //

۲۲. شبِ قدر (شانِ نزولِ قرآن) // //

۲۳. تفسیر سورۂ شعراء (۳ تقریریں) // //

۲۴. رموزِ آلِ محمدؐ // //

۲۵. تفسیر سورۂ فرقان // //

۲۶. حضرت ابو طالبؑ // //

نمبر	عنوان	سال	مقام
۲۷.	شجرۂ طیبہ (حضرت عبدالمطلب)	۱۹۸۹ء	امام بارہ چہاردہ معصومینؑ
۲۸.	تفسیر سورۂ ابراہیم اور فاطمہ بنت اسدؑ	″	″
۲۹.	حروف مقطعات	″	″
۳۰.	خدیجۃ الکبریٰؑ	″	″
۳۱.	تفسیر سورۂ یوسفؑ	۱۹۸۹ء	امام بارہ چہاردہ معصومینؑ
۳۲.	سورۂ یوسفؑ اور اہل بیتؑ	″	″
۳۳.	ولادت امام حسنؑ	″	″
۳۴.	سورۂ احزاب اور ازواج رسولؐ	″	″
۳۵.	حضرت اُم سلمیٰؓ (احترام اُمّ المومنین)	″	″
۳۶.	حضرت علیؑ کے چودہ امتحان	″	″
۳۷.	سورۂ احزاب اور جنگ احزاب	″	″
۳۸.	غزوۂ ذات السلاسل (تفسیر والعادیات)	″	″
۳۹.	تاریخ نجف	″	″
۴۰.	علیؑ کی پرورش	″	″
۴۱.	گل ز جنّ	″	″
۴۲.	جزیرہ خضرہ	″	″
۴۳.	حضرت ابوطالبؑ	″	″
۴۴.	معرفت امام زمانہؑ	″	″

۴۵.	معراج نبیؐ		۱۹۸۹ء امام بارہ چہاردہ معصومینؑ
۴۶.	سخاوت بنی ہاشم		// //
۴۷.	شجرہ ملعونہ		// //
۴۸.	عظمت امام		// //
۴۹.	فاطمہ بنت اسدؑ		۱۹۸۹ء امام بارہ چہاردہ معصومینؑ
۵۰.	ازواج نبیؐ		// //
۵۱.	آسیہؑ اور مریمؑ		// //
۵۲.	عظمت خدیجہؑ		// //
۵۳.	جیش اسامہ		// //
۵۴.	تفسیر سورۂ بنی اسرائیل	(۵ تقاریر)	// //
۵۵.	تفسیر سورۂ تحریم	(۳ تقاریر)	// //
۵۶.	تفسیر سورۂ یٰسین	(۷ تقاریر)	// //
۵۷.	تفسیر سورۂ حدید		// //
۵۸.	تفسیر سورۂ کوثر		// //
۵۹.	صراط مستقیم		// //
۶۰.	ذوالفقار		// //
۶۱.	سیرت امام حسنؑ		// //
۶۲.	شب ہجرت اور اصحاب		// //
۶۳.	جنگ بدر		// //

۶۴. امام مبین (۲ تقریریں) // //

۶۵. معرفت امام مبین // //

۶۶. جناب قنبرؓ // //

۶۷. شب قدر // //

۶۸. حضرت آمنہؑ ۱۹۸۹ء امام باڑہ چہاردہ معصومینؑ

۶۹. تفسیر سورۂ فتح // //

۷۰. معصوم کی فتح // //

۷۱. سورۂ منافقون // //

۷۲. منافق // //

۷۳. تفسیر سورۃ العصر // //

۷۴. حسنینؑ کی عید // //

۷۵. عظمت ابوطالبؑ // //

۷۶. خلقت نور // //

---

۷۷. تفسیر سورۃ الحمد ۱۹۹۰ء امام باڑہ چہاردہ معصومینؑ

۷۸. تفسیر سورۂ قصص (۶ تقریریں) // //

۷۹. تفسیر سورۂ والضحیٰ // //

۸۰. تفسیر سورۂ کافرون // //

۸۱. تفسیر سورۂ والشمس (۳ تقریریں) // //

۸۲. موسیٰؑ اور فرعون (۳ تقریریں) // //

۸۳.	حضرت علی اصغرؑ	(۳ تقریریں)	//	//
۸۴.	فاطمہ بنت اسدؑ		//	//
۸۵.	خدیجہؑ اور فاطمہؑ (ماں اور بیٹی)		//	//
۸۶.	سورج چاند ستارے		۱۹۹۰ء	امام بارہ چہاردہ معصومینؑ
۸۷.	حضرت امام حسنؑ		//	//
۸۸.	نماز اور اہل بیتؑ		//	//
۸۹.	جنگ بدر اور کربلا		//	//
۹۰.	ربِ کعبہ کی قسم		//	//
۹۱.	عصمت ابو طالبؑ		//	//
۹۲.	عظمت ابو طالبؑ		//	//
۹۳.	دفن مولائے کائنات		//	//
۹۴.	حدیث کساء		//	//
۹۵.	لباس		//	//
۹۶.	تفسیر سورۂ قدر		//	//
۹۷.	تفسیر سورۂ مدثر		//	//
۹۸.	رنگ		//	//
۹۹.	ذوالفقار	(۳ تقریریں)	//	//
۱۰۰.	سورۂ فرقان	(۲ تقریریں)	//	//
۱۰۱.	حضرت ابو طالبؑ		//	//

۱۰۲.	تفسیر سورۂ کوثر	۱۹۹۱ء	امام بارگاہ آلِ عبا	
۱۰۳.	تفسیر سورۂ عصر	//	//	
۱۰۴.	تفسیر سورۂ علق	۱۹۹۱ء	امام بارگاہ آلِ عبا	
۱۰۵.	نوروز	//	//	
۱۰۶.	اقراء	//	//	
۱۰۷.	سورۂ فیل اور ہاتھی	//	//	
۱۰۸.	فاطمہ بنت اسدؑ	//	//	
۱۰۹.	شیر (قسورہ)	//	//	
۱۱۰.	تفسیر سورۂ والضحیٰ	//	//	
۱۱۱.	جنابِ خدیجہ	//	//	(۳ تقریریں)
۱۱۲.	تفسیر سورۂ الم نشرح	//	//	
۱۱۳.	نصبِ خلافت	//	//	
۱۱۴.	تفسیر سورۂ التین	//	//	
۱۱۵.	پیغامِ امن	//	//	
۱۱۶.	تفسیر سورۂ لہب	//	//	(۲ تقریریں)
۱۱۷.	ولادتِ امام حسنؑ	//	//	
۱۱۸.	صلح حسنؑ	//	//	
۱۱۹.	سورۂ عصر	//	//	
۱۲۰.	تفسیر سورۂ توبہ	//	//	(۳ تقریریں)

۱۲۱. حلم حسنؑ 〃 〃

۱۲۲. فتح بدر 〃 〃

۱۲۳. دنیا کی کہانی علیؑ کی زبانی ۱۹۹۱ء امام باڑہ آل عبا

۱۲۴. علم اور جہل (۲ تقریریں) 〃 〃

۱۲۵. زمین نجف 〃 〃

۱۲۶. تفسیر سورۂ قدر 〃 〃

۱۲۷. اقتدار آل محمدؐ 〃 〃

۱۲۸. تفسیر سورۂ شعرا (۲ تقریریں) 〃 〃

۱۲۹. عزاداری اور شاعری 〃 〃

۱۳۰. علم کی تعریف علیؑ کی زبانی 〃 〃

۱۳۱. ابلاغ اور تبلیغ 〃 〃

۱۳۲. ظالم کا انجام 〃 〃

۱۳۳. 〃 〃 〃 〃

۱۳۴. سوال اور جواب 〃 〃

---

۱۳۵. تفسیر سورۂ ن و القلم (۳ تقریریں) ۱۹۹۲ء امام باڑہ چہاردہ معصومینؑ

۱۳۶. عظمت قلم 〃 〃

۱۳۷. خلق نبیؐ 〃 〃

۱۳۸. مفہوم تبرا 〃 〃

۱۳۹. تفسیر سورۂ مزمل		″	″
۱۴۰. چادر		″	″
۱۴۱. ہاتھ		″	″
۱۴۲. تفسیر سورۂ تکویر	۱۹۹۳ء	امام باڑہ چہاردہ معصومینؑ	
۱۴۳. شہادت محسنؑ		″	″
۱۴۴. فاطمہ بنت اسدؑ		″	″
۱۴۵. تفسیر سورۂ قریش		″	″
۱۴۶. تفسیر سورۂ بروج		″	″
۱۴۷. شاہد و مشہود		″	″
۱۴۸. تفسیر سورۂ والضحیٰ		″	″
۱۴۹. تفسیر سورۂ واللیل		″	″
۱۵۰. عظمت خدیجہؑ		″	″
۱۵۱. قرآن اور وزیر		″	″
۱۵۲. تفسیر سورۂ یوسفؑ	(۳ تقریریں)	″	″
۱۵۳. امام حسنؑ		″	″
۱۵۴. تفسیر سورۂ تحریم	(۲ تقریریں)	″	″
۱۵۵. ذکر علیؑ	(۳ تقریریں)	″	″
۱۵۶. تفسیر سورۂ قدر	(۲ تقریریں)	″	″
۱۵۷. حدیث کسا	(۲ تقریریں)	″	″

نمبر	عنوان	تقریریں	سال	مقام
۱۵۸.	تفسیر سورۂ شعرا	(۲ تقریریں)	//	//
۱۵۹.	تفسیر سورۂ فرقان	(۲ تقریریں)	//	//
۱۶۰.	حضرت ابوطالبؑ		۱۹۹۳ء	امام باڑہ چہاردہ معصومینؑ
۱۶۱.	ہماری تہذیب		//	//
۱۶۲.	علیؑ کی مدح ابن ابی الحدید معتزلی کی زبانی		//	//

نمبر	عنوان	تقریریں	سال	مقام
۱۶۳.	نذر و نیاز		۱۹۹۶ء	بر مکان شمشیر حیدر جعفری
۱۶۴.	قمع و زنجیر کا ماتم		//	//
۱۶۵.	پانی		//	//
۱۶۶.	معصوم کا علم غیب		//	//
۱۶۷.	فاطمہ بنت اسدؑ		//	//
۱۶۸.	حقیقت خواب	(۵ تقریریں)	//	//
۱۶۹.	خدیجۃ الکبریٰ		//	//
۱۷۰.	معصوم کا خون پاک ہے		//	//
۱۷۱.	امام حسنؑ		//	//
۱۷۲.	رشتے داریاں		//	//
۱۷۳.	سورۂ یوسفؑ اور میر انیس		//	//
۱۷۴.	سورۂ یوسفؑ کی شان نزول		//	//
۱۷۵.	شجرۂ طیبہ		//	//

عنوان			
۱۷۶. جنگِ خندق		//	//
۱۷۷. تاریخ نجف		//	//
۱۷۸. شبِ قدر		۱۹۹۶ء برمکان	شمشیر حیدر جعفری
۱۷۹. نبیؐ کا وارث کون؟		//	//
۱۸۰. علما کی شان		//	//
۱۸۱. ذاکرِ حسینؑ کی عظمت		//	//
۱۸۲. گدھے کی سرگزشت		//	//
۱۸۳. شاعروں کا مرتبہ		//	//
۱۸۴. حضرت ابوطالبؑ		//	//
۱۸۵. حضرت امام جعفر صادقؑ	(۲ تقریریں)	//	//
۱۸۶. تفسیر سورۂ دہر		//	//

عنوان		
۱۸۷. سورۂ اخلاص	۱۹۹۷ء	امام بارہ چہاردہ معصومینؑ
۱۸۸. توحید	//	//
۱۸۹. کربلا اور توحید	//	//
۱۹۰. آنسو اور توحید	//	//
۱۹۱. حُسن و عشق	//	//
۱۹۲. اللہ کی پسندیدہ قوم	//	//
۱۹۳. سورۂ دہر کا پس منظر	//	//

۱۹۴۔	تفسیر سورۂ دہر	(۳ تقریریں)	// //
۱۹۵۔	منصب آبائے نبیؐ		// //
۱۹۶۔	جنابِ فاطمہ بنتِ اسدؑ	۱۹۹۷ء	امام باڑہ چہاردہ معصومینؑ
۱۹۷۔	جنابِ خدیجۃ الکبریٰؑ		// //
۱۹۸۔	تفسیر سورۂ رحمان	(۳ تقریریں)	// //
۱۹۹۔	امام حسنؑ		// //
۲۰۰۔	حضرت قاسمؑ کی جنگ		// //
۲۰۱۔	جنگِ بدر		// //
۲۰۲۔	سیرتِ حضرت علیؑ		// //
۲۰۳۔	// //		// //
۲۰۴۔	// //		// //
۲۰۵۔	// //		// //
۲۰۶۔	امام حسینؑ کی جنگ		// //
۲۰۷۔	شبِ قدر	(۳ تقریریں)	// //
۲۰۸۔	مرثیہ انیس میں امام حسینؑ کی جنگ		// //
۲۰۹۔	تفسیر سورۂ والعادیات	(۳ تقریریں)	// //
۲۱۰۔	حضرت ابوطالبؑ		// //
۲۱۱۔	قدرتِ خدا		// //

۲۱۲.	قرآن اور اہلِ بیتؑ	۱۹۹۸ء امام باڑہ چہاردہ معصومینؑ
۲۱۳.	نزولِ وحی سے پہلے	// //
۲۱۴.	نزولِ وحی	۱۹۹۸ء امام باڑہ چہاردہ معصومینؑ
۲۱۵.	قلم	// //
۲۱۶.	نزولِ وحی اور ابو طالبؑ (۳ تقریریں)	// //
۲۱۷.	نزولِ وحی اور بنتِ اسدؑ	// //
۲۱۸.	شبِ ہجرت اور اتمامِ نعمت (۲ تقریریں)	// //
۲۱۹.	مجلسِ ایصالِ ثواب معجز جونپوری (عجز اور معجزے کی تعریف)	// //
۲۲۰.	حضرت خدیجہؑ	// //
۲۲۱.	سورہ برات اور حیاتِ علیؑ	// //
۲۲۲.	مجلس شہدائے مومن پورہ لاہور	// //
۲۲۳.	علم و جہل	// //
۲۲۴.	شہید کی تعریف (ولادتِ امام حسنؑ)	// //
۲۲۵.	امام حسنؑ کا بچپن	// //
۲۲۶.	آدابِ غلامیٔ علیؑ	// //
۲۲۷.	جنگِ بدر	// //
۲۲۸.	ذکرِ علیؑ	// //
۲۲۹.	اُحد میں نزولِ ذوالفقار	// //
۲۳۰.	شہادتِ علیؑ	// //

۲۳۱. ″ ″ ″ ″

۲۳۲. شبِ قدر ″ ″

۲۳۳. قرآنی سوانحِ حیات ۱۹۹۸ء امام باڑہ چہاردہ معصومینؑ

۲۳۴. مجلس ایصالِ ثواب عرفان حیدر عابدی (ذاکر کا مرتبہ) ″ ″

۲۳۵. تفسیر سورۂ التین ″ ″

---

۲۳۶. تفسیر سورۂ حمد ۱۹۹۹ء امام باڑہ چہاردہ معصومینؑ

۲۳۷. قرآن کا فلسفۂ قسم (تین تقاریر) ″ ″

۲۳۸. قرآن میں حیاتِ رسولؐ کی قسم (دو تقاریر) ″ ″

۲۳۹. مودّت ″ ″

۲۴۰. فاطمہ بنتِ اسدؑ ″ ″

۲۴۱. خدیجۃ الکبریٰ (دو تقاریر) ″ ″

۲۴۲. قرآن اور حیوان ″ ″

۲۴۳. قرآن میں کتّے کا ذکر ″ ″

۲۴۴. تفسیر سورۂ یوسفؑ (مجلس ایصالِ ثواب فرزند شاہد تقوی) ″ ″

۲۴۵. ذکر امام حسنؑ (قرآن وسنت کی تفہیم) (دو تقاریر) ″ ″

۲۴۶. قرآن میں اونٹ کا ذکر (مجلس ایصالِ ثواب شہدائے مظفر گڑھ) ″ ″

۲۴۷. جنگِ جمل ″ ″

۲۴۸. سیرت حضرت علیؑ (مجالس شہادت علیؑ) ″ ″

۳۴۹. // // // //

۳۵۰. // // // //

۳۵۱. حضرت علیؑ کا طرزِ معاشرت ۱۹۹۹ء امام بارگاہ چہاردہ معصومینؑ

۳۵۲. سیرت حضرت علیؑ // //

۳۵۳. شبِ قدر // //

۳۵۴. جنگِ خیبر // //

۳۵۵. امام حسینؑ کی جنگ // //

۳۵۶. حضرت ابوطالبؑ // //

۳۵۷. ماں ۱۹۹۹ء امام بارگاہ خیمہ سادات، لاہور

۳۵۸. خوشبو // //

۳۵۹. حضرت علی اصغرؑ // //

۳۶۰. محبت // //

۳۶۱. ولی عصرؑ // //

۳۶۲. سورۂ کوثر // //

۳۶۳. نجات // //

---

۳۶۴. جناب فضہ ۱۹۸۹ء

۳۶۵. جناب آسیہ // //

۳۶۶. جناب ہاجرہ // //

۲۶۷. جناب سارہ	〃	〃
۲۶۸. جناب مریمؑ	〃	〃
۲۶۹. حضرت اُمِ سلمیٰ	۱۹۸۹ء	
۲۷۰. حضرت آمنہؑ	〃	〃
۲۷۱. حضرت اُمِ ہانیؒ	〃	〃
۲۷۲. جناب سکینہؑ	〃	〃
۲۷۳. جناب اُمِ ربابؑ	〃	〃
۲۷۴. جناب اُمِ لیلیٰؑ	〃	〃
۲۷۵. جناب اُمِ البنینؑ	〃	〃
۲۷۶. حضرت امام زین العابدین علیہ السلام	۱۹۸۳ء	
۲۷۷. حضرت امام محمد باقر علیہ السلام	〃	〃
۲۷۸. حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام	〃	〃
۲۷۹. حضرت امام موسیٰ کاظم علیہ السلام	〃	〃
۲۸۰. حضرت امام علی رضا علیہ السلام	〃	〃
۲۸۱. حضرت امام محمد تقی علیہ السلام	〃	〃
۲۸۲. حضرت امام علی نقی علیہ السلام	〃	〃
۲۸۳. حضرت امام حسن عسکری علیہ السلام	〃	〃
۲۸۴. ولی العصرؑ	〃	〃
۲۸۵. حضرت سلمان فارسی	〃	〃

عنوان			
۲۸۶. حضرت ابوذر غفاری		//	//
۲۸۷. حضرت عمار یاسر		//	//
۲۸۸. حضرت مقداد		۱۹۹۱ء	
۲۸۹. حضرت قنبر		//	//
۲۹۰. حضرت حذیفہ یمانی		//	//
۲۹۱. حضرت مالک بن نویرہ		//	//
۲۹۲. حضرت بلال		//	//
۲۹۳. حضرت مالک اشتر		//	//
۲۹۳. حضرت محمد حنفیہ		//	//
۲۹۵. عید کے معنی		//	//
۲۹۶. ذوالفقار	(دس تقاریر)	//	//
۲۹۷. ذوالجناح	(دس تقاریر)	//	//
۲۹۸. حضرت قاسمؑ کی جنگ	(پانچ تقاریر)	//	//
۲۹۹. حضرت عباسؑ کی جنگ			
۳۰۰. حضرت علی اکبرؑ کی جنگ			
۳۰۱. حضرت عونؑ و محمدؑ کی جنگ			
۳۰۲. عظمت حضرت عباسؑ			
۳۰۳. سیرت حضرت علی اکبرؑ			
۳۰۴. تاریخ فدک	(دس تقاریر)		

۳۰۵. امام حسینؑ کی جنگ (پانچ تقاریر)
۳۰۶. مجلس چہلم فیض بھرت پوری مرحوم
۳۰۷. مجلس ایصال ثواب مولانا محمد مصطفےٰ جوہر مرحوم
۳۰۸. مجلس ایصال ثواب نسیم امروہوی مرحوم
۳۰۹. مجلس ایصال ثواب عزت لکھنوی مرحوم
۳۱۰. حضرت حمزہ
۳۱۱. قاضی نور اللہ شوستری
۳۱۲. شاہانِ مغلیہ اور عزاداری
۳۱۳. شاہانِ اودھ اور شیعیت
۳۱۴. شعرائے عرب اور مرثیہ
۳۱۵. عظمت اہلِ بیتؑ سقراط کی نظر میں
۳۱۶. ہندو قوم میں تعزیہ داری
۳۱۷. جوشؔ ملیح آبادی اور مولانا نقن صاحب مرحوم
۳۱۸. جوشؔ کا مرثیہ "پانی"
۳۱۹. جوشؔ اور طلوع فکر
۳۲۰. اسلامی عمل حیات (انگلینڈ کے عشرے کی دس تقاریر)
۳۲۱. سفر حج (جدہ کے عشرے کی دس تقاریر)
۳۲۲. عشرۂ امریکہ (نیو یارک کی دس تقاریر)
۳۲۳. عشرۂ ہالینڈ (ڈین ہاگ کی دس تقاریر)

۳۲۴۔ اسلام آباد کے عشرے کی دس تقاریر

۳۲۵۔ عظمت امام حسنؑ (ملتان کی دو تقاریر)

عشرہ چہلم

۱۹۸۲ء میں رضویہ سوسائٹی میں عشرہ چہلم کا آغاز ہوا۔

سال		عنوان
آغاز عشرہ چہلم	۱۹۸۲ء	قرآن اور سیرت آئمہؑ
دوسرا سال عشرہ چہلم	۱۹۸۳ء	عظمت قرآن
تیسرا سال عشرہ چہلم	۱۹۸۴ء	قاتلان حسینؑ کا انجام
چوتھا سال عشرہ چہلم	۱۹۸۵ء	محسنین اسلام
پانچواں سال عشرہ چہلم	۱۹۸۶ء	حضرت علیؑ اور تاریخ اسلام
چھٹا سال عشرہ چہلم	۱۹۸۷ء	امام اور اُمت
ساتواں سال عشرہ چہلم	۱۹۸۸ء	اسلامی طرز معاشرت
آٹھواں سال عشرہ چہلم	۱۹۸۹ء	عورت اور اسلام
نواں سال عشرہ چہلم	۱۹۹۰ء	تاثرات زیارت کربلا و نجف
دسواں سال عشرہ چہلم	۱۹۹۱ء	عظمت صحابہؓ
گیارھواں سال عشرہ چہلم	۱۹۹۲ء	تاریخ شیعیت اور امیر مختارؒ
بارھواں سال عشرہ چہلم	۱۹۹۳ء	ظہور امام مہدیؑ
تیرھواں سال عشرہ چہلم	۱۹۹۴ء	علم زندگی ہے (جامعہ سبطین گلشن اقبال)

چودھواں سال عشرۂ جہلم	۱۹۹۵ء	معصومین کا علم لسانیات	//	//
پندرھواں سال عشرۂ جہلم	۱۹۹۶ء	تاریخ انبیا اور ارتقائے معاشرہ	//	//
سولہواں سال عشرۂ جہلم	۱۹۹۷ء	احسان اور ایمان	//	//
سترھواں سال عشرۂ جہلم	۱۹۹۸ء	حضرت علیؑ میدان جنگ میں	//	//
اٹھارھواں سال عشرۂ جہلم	۱۹۹۹ء	اسلام پر حضرت علیؑ کے احسانات	//	//
انیسواں سال عشرۂ جہلم	۲۰۰۰ء	انسان اور حیوان	//	//
بیسواں سال عشرۂ جہلم	۲۰۰۱ء	حضرت علیؑ وارث انبیاء	//	//
اکیسواں سال عشرۂ جہلم	۲۰۰۲ء	معرفت الٰہی	//	//
بائیسواں سال عشرۂ جہلم	۲۰۰۳ء	ناصران اہل بیتؑ	//	//
تئیسواں سال عشرۂ جہلم	۲۰۰۴ء	ولایت علیؑ	//	//
چوبیسواں سال عشرۂ جہلم	۲۰۰۵ء	تجزیہ نہج البلاغہ	//	//
پچیسواں سال عشرۂ جہلم	۲۰۰۶ء	حیات حضرت عباسؑ	//	//
چھبیسواں سال عشرۂ جہلم	۲۰۰۷ء	حقوق نسواں اور اسلام	//	//
ستائیسواں سال عشرۂ جہلم	۲۰۰۸ء	بت شکن اور بت تراش	//	//

عشرہ ہائے مجالس

سیرت معصومینؑ	(عشرہ ثانی)	۱۹۸۳ء امام بارگاہ خیر العمل
تاریخ عزاداری	(عشرہ اولیٰ)	۱۹۸۳ء رضویہ سوسائٹی
رحمان اور شیطان	(عشرہ ثانی)	۱۹۸۳ء النور سوسائٹی

قرآن اور عزاداری (عشرۂ ثانی) ۱۹۸۵ء انور سوسائٹی

تاریخ شیعیت (اوائی عشرہ) ۱۹۸۶ء امام بارگاہ چہاردہ معصومین

تاریخ حضرت ابراہیم تا ذبح عظیم (عشرۂ اولیٰ) ۱۹۸۶ء امام بارگاہ علی رضا

قرآن اور میراثیں (اوائی عشرہ) ۱۹۸۶ء امام بارگاہ چہاردہ معصومین

مستند تفسیر کربلا (عشرۂ اولیٰ) ۱۹۸۹ء امام بارگاہ علی رضا

معجزہ اور قرآن (اوائی عشرہ) ۱۹۸۹ء امام بارگاہ چہاردہ معصومین

تاریخ شیعیت اور امیر مختارؓ ۱۹۸۹ء امام بارگاہ آل عبا

عظمت امام حسنؑ (اوائی عشرہ) ۱۹۹۰ء امام بارگاہ چہاردہ معصومین

شجرۂ طیبہ (عشرۂ اولیٰ) ۱۹۹۳ء امام بارگاہ نخشبی انجمن روڈ

قرآن میں ذکر خواتین (عشرۂ اولیٰ) ۱۹۹۳ء امام بارگاہ خیمہ سادات، لاہور

اقوام عالم اور عزاداری حسینؑ (عشرۂ اولیٰ) ۱۹۹۶ء امام بارگاہ خیمہ سادات، لاہور

علم زندگی ہے (عشرۂ اولیٰ) ۱۹۹۸ء امام بارگاہ شاہ نجف، مارٹن روڈ

محسنین اسلام (عشرۂ اولیٰ) ۱۹۹۸ء امام بارگاہ آل عبا، کراچی

شجاعت بنی ہاشم (عشرۂ اولیٰ) ۱۹۹۹ء امام بارگاہ آل عبا، کراچی

دم بہ دم علی علی (عشرۂ اولیٰ) ۱۹۹۹ء امام بارگاہ شاہ نجف، مارٹن روڈ

عظمت ابوطالبؑ (عشرۂ اولیٰ) ۱۹۹۹ء حسین آباد طیبہ، کراچی

قرآن کا جلال و جمال (عشرۂ اولیٰ) ۱۹۹۹ء امام بارگاہ چہاردہ معصومین

سیرت حضرت فاطمۃ الزہراؑ (جمادی الثانی) ۱۹۸۰ء سے ۱۹۹۹ء تک ۶۰ تقریریں

جہاد اور حضرت علیؑ (عشرۂ اولیٰ) ۲۰۰۲ء مرکزی امام بارگاہ جعفر طیار، کراچی

علیؑ ذریعۂ نجات	(عشرۂ اولیٰ)	۲۰۰۱ء حسین آباد ملیر۔ کراچی
قرآن اور اہلِ بیتؑ	(عشرۂ اولیٰ)	۲۰۰۰ء شاہ نجف مارٹن روڈ
تاریخ امامت	(عشرۂ اولیٰ)	۲۰۰۲ء شاہ نجف مارٹن روڈ
علومِ آلِ عباؑ	(عشرۂ اولیٰ)	۲۰۰۱ء آلِ عبا۔ گلبرگ کراچی
احسان اور اسلام	(عشرۂ اولیٰ)	۲۰۰۱ء شاہ نجف مارٹن روڈ کراچی
ابوطالبؑ وصی انبیاء	(عشرۂ اولیٰ)	۲۰۰۱ء انجمن محبین العزا۔ کراچی
عزاداری آدم تا قیامت	(عشرۂ اولیٰ)	۲۰۰۱ء ؍؍ ؍؍ ؍؍
معاشرتی علوم اور فکرِ اہلِ بیتؑ	(عشرۂ اولیٰ)	۲۰۰۲ء امامبارگاہ یثرب۔ ڈیفنس۔ کراچی
عصرِ حاضر اور عزاداری	(عشرۂ اولیٰ)	۲۰۰۳ء آلِ عبا۔ گلبرگ۔ کراچی
احسان اور اسلام	(عشرۂ ثانی محرم)	۲۰۰۱ء شاہ نجف مارٹن روڈ۔ کراچی
علومِ آلِ محمدؐ	(عشرۂ ثانی محرم)	۲۰۰۱ء امامبارگاہ آلِ عبا، کراچی
تاریخ عزاداری	(عشرۂ ثانی محرم)	۲۰۰۲ء امامبارگاہ آلِ عبا، کراچی
امامت	(عشرۂ ثانی محرم)	۲۰۰۲ء شاہ نجف مارٹن روڈ، کراچی
واقعۂ کربلا اور حضرت امیر مختار	(اوائل عشرہ)	۲۰۰۲ء امامبارگاہ آلِ عبا، کراچی
ظہورِ امام مہدیؑ	(عشرۂ ثانی محرم)	۲۰۰۳ء شاہ نجف مارٹن روڈ، کراچی
حضرت علیؑ اور اقوامِ عالم	(عشرۂ ثانی محرم)	۲۰۰۳ء امامبارگاہ آلِ عبا گلبرگ، کراچی
عزاداری اور شفاعت	(عشرۂ ثانی محرم)	۲۰۰۳ء شہدائے کربلا انچولی، کراچی
عظمتِ ابوطالبؑ	(اوائل عشرہ)	۲۰۰۳ء قصر سکینہ۔ رضویہ کراچی
ناصرانِ اہلِ بیتؑ اور امیر مختار	(عشرہ مجالس)	۲۰۰۳ء امامبارگاہ آلِ عبا، کراچی
شجرۂ طیبہ	(عشرۂ ثانی محرم)	۲۰۰۳ء امامبارگاہ آلِ عبا گلبرگ، کراچی

علومِ آلِ محمدؐ (عشرۂ اول محرم) ۲۰۰۳ء کاظمین ڈرگ روڈ، کراچی

بعدِ رسولؐ (الوداعی عشرہ) ۲۰۰۳ء قصرِ سیتب، رضویہ سوسائٹی

واقعۂ کربلا اور میر انیسؔ (عشرۂ ثالث) ۲۰۰۵ء امام بارگاہ آلِ عبا گلبرگ

کیا قرآن کافی ہے؟ (الوداعی عشرہ) ۲۰۰۵ء قصرِ سیتب، رضویہ سوسائٹی

پوری دنیا کی عزاداری (الوداعی عشرہ) ۲۰۰۶ء قصرِ سیتب، رضویہ سوسائٹی

فدک قانون کی روشنی میں (الوداعی عشرہ) ۲۰۰۷ء قصرِ سیتب، رضویہ سوسائٹی، کراچی

حق و باطل کی پہچان (عشرۂ اول محرم) ۲۰۰۸ء امام بارگاہ جامعہ سبطین، کراچی

رسولؐ خدا کے آخری لمحات (الوداعی عشرہ) ۲۰۰۹ء قصرِ سیتب، رضویہ سوسائٹی

ویڈیو کیسٹ

محسنینِ اسلام ۱۹۸۵ء امام بارگاہ رضویہ سوسائٹی

حضرت علیؑ اور تاریخِ اسلام ۱۹۸۶ء // //

امام اور اُمت ۱۹۸۷ء // //

کارنامۂ امیر مختارؒ ۱۹۸۹ء // //

عظمتِ صحابہ ۱۹۹۱ء // //

ظہورِ امام مہدیؑ ۱۹۹۳ء // //

معصومینؑ کا علمِ لسانیات ۱۹۹۵ء جامعہ سبطین، گلشنِ اقبال

تاریخِ انبیاء اور ارتقائے معاشرہ ۱۹۹۶ء // //

عالمی ادب اور اہلِ بیتؑ امام بارگاہ چہاردہ معصومینؑ

امن اور جنگ — ۲۰۰۹ء (عشرۂ اولیٰ) — امام بارگاہ جامعۂ سبطین گلشن اقبال

خیر اور شر — ۲۰۰۹ء (عشرۂ اولیٰ) — چہاردہ معصومین انچولی

اصحابِ علیؑ — ۲۰۰۹ء (عشرۂ ثانی) — دربارِ حسینی بحرف خانہ ملیر

گناہگار شیعوں کی بخشش — ۲۰۰۹ء (عشرۂ ثانی) — جٹ لائن امام بارگاہ حسینی

ابنِ زیاد کا شجرہ — ۲۰۰۹ء (صفر کا عشرۂ اول) — مرکزی امام بارگاہ جعفر طیار

فضائلِ امام حسنؑ — ۲۰۰۹ء (انجمن ظفر الایمان) — چہاردہ معصومین انچولی

امامت اور عزاداری — ۲۰۰۹ء (الوداعی عشرہ) — قصرِ سبطینِ رضویہ سوسائٹی

سانحۂ جامعۂ سبطین — ۲۰۰۹ء (واقعہ پر ایک تقریر)

ذوالفقار (شب بیداری انجمن ذوالفقار) ۲۰۰۹ء — امام بارگاہ شہدائے کربلا انچولی

عزاداری آدمؑ تا قائدِ اعظم — ۲۰۰۹ء (شب بیداری انجمن العزا) — شہدائے کربلا انچولی

نوروز کی اہمیت

مجالسِ تفسیرِ قرآن — ۲۰۰۹ء (رمضان المبارک) — چہاردہ معصومین انچولی

کیا قرآن کافی ہے — ۲۰۰۹ء (الوداعی عشرہ) — قصرِ سبطین رضویہ کراچی

بت شکن اور بت تراش — ۲۰۰۹ء (عشرۂ چہلم) — امام بارگاہ جامعۂ سبطین

Visit: www.allamazameerakhtar.com

maablib.org

صحافت

سیفؔ حسن پوری

تاریخِ مرثیہ

کِس دور میں حوالے سے اس ارضِ پاک کے
لکھا گیا نہ مرثیہ گویوں کا تذکرہ
لیکن ضمیر اختر نقوی کا کیا جواب
ہے لاجواب اُن کی "یہ تاریخِ مرثیہ"

۱۹۸۱ء

پروفیسر ظلِ صادق

عزائے زہراؑ

حق نے کیا ممتاز ضمیر اختر کو
ہونا تھا سرافراز ضمیر اختر کو
ہر سال مناتے ہیں عزائے زہراؑ
حاصل ہے یہ اعزاز ضمیر اختر کو

۷۷۵
سہ ماہی القلم
پر تبصرے

سید سجاد شبیر رضوی

القلم...... ایک ادبی جریدہ

ضمیر اختر نقوی کراچی کی ایک ادبی شخصیت میں شمار کئے جاتے ہیں، نہایت پُرسکون اور محبت کرنے والے انسان ہیں۔ میری ان کی دوستی کافی پرانی نہیں، مگر پھر بھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان سے دوستی کو کافی زمانہ ہو گیا۔ بہت ہی دھیمی دھیمی آواز میں گفتگو کرتے ہیں۔ ان کی شخصیت ہی سے عیاں ہوتا ہے کہ وہ ایک واقعی ادبی شخصیت ہیں۔ میرے قریبی دوست علامہ شفیق رضوی ابھی کچھ دنوں پہلے اپنی ایک کتاب کے بارے میں مجھے بتا رہے تھے کہ وہ ایک کتاب لکھ رہے ہیں تو میں ان مشکلات کا تذکرہ ان سے کر رہا تھا، جو کتاب لکھتے وقت پیش آتی ہیں۔ تو علامہ شفیق صاحب نے میری بات سے اتفاق کیا کہ واقعی آج کے دور میں کتاب لکھنا بڑا مشکل کام ہے۔ باتیں کرتے کرتے ہم دونوں کے درمیان علامہ ضمیر اختر کا تذکرہ آیا اور علامہ نے کہا کہ واقعی آج کے اس مشکل دور میں علامہ ضمیر اختر نے قلم سے رشتہ جوڑا ہوا ہے جو مشکل کام ہے۔ ظاہر ہے کہ قلم استعمال کرنے کے بھی انداز ہیں۔ میں صحافی ہوں، روزانہ ایک یا دو مضامین لکھ دیتا ہوں، مگر چھپوانے اور چھاپنے کی ذمہ داری میری نہیں ہے کہ میں مضمون کے چھپنے کے آخری مراحل تک اس کے ساتھ رہوں، مگر ایک کتاب لکھنا اور ایک خالصتاً ادبی رسالہ نکالنا آج کے اس دور میں بڑا مشکل کام ہے، جہاں علامہ ضمیر اختر نے ۱۲۰ یا اس سے زائد کتابیں لکھی ہیں، وہاں انہوں نے مرثیے پر بھی

خصوصی کام کیا ہے۔ ان کا ادارہ "مرکزِ علوم اسلامیہ" پورا سال کتابیں اور خصوصی مجلّے وغیرہ کا اجرا کرتا رہتا ہے۔

ابھی کچھ دن ہوئے علامہ ضمیر اختر صاحب نے ہمیں اپنے علمی اور ادبی جریدے "القلم" کی ایک کاپی دی اور مجھے اس پر تبصرہ کرنے کو کہا، میں اس پر کچھ لکھنے کی سوچ ہی رہا تھا کہ علامہ شفیق نے کہا کہ آپ لکھیں، میں بھی اس پر تبصرہ کروں گا۔ "القلم" مرکز علوم اسلامیہ کی جانب سے نکالا گیا ہے، جس کے مدیر ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی ہیں۔

"القلم" کی اشاعت پر قطعۂ تاریخ نسیم ابن نسیم صاحب نے لکھا ہے:

القلم فکر کا مصحف، یعنی بیداری
القلم ذکر کا مکتب، قلمی ضوباری
اے نسیم! آپ یہ تاریخ اشاعت لکھ دیں
القلم اہلِ ادب کے لئے فیضِ جاری

"علامہ ضمیر اختر نقوی نے اداریے میں دورۂ ہندوستان کے دوران ادیبوں سے ملاقات کا مختصر تذکرہ کیا ہے۔ شروع میں پروفیسر مسعود حسن کا ایک غیر مطبوعہ مضمون شائع کیا ہے۔ "مراثی انیس میں نورس"، اس کے علاوہ ڈاکٹر پروفیسر کاظم علی خان (لکھنؤ) کا مضمون "آصف الدولہ کا امام باڑہ" بھی شاملِ اشاعت ہے جنھوں نے آصف الدولہ کا تعمیر کردہ "حسینیہ آصفی دربار" پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور اس عمارت میں کیا اور کون سی جگہ ہیں، ان پر تفصیلی جرح کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر شارب ردولوی (دہلی) کا مضمون "عروض کا ایک اہم غیر مطبوعہ مرثیہ" شاملِ اشاعت ہے جس میں سید حسن کاظم صاحب پر لکھا گیا ہے۔ سید حسن کاظم عروض کا غیر مطبوعہ مرثیہ بھی ہے جس میں امام حسینؑ کی شہادت کا حال ہے۔ لکھتے ہیں:

محدود کب ہے وسعتِ دامانِ شاعری
ہر دور میں بدل گیا سامانِ شاعری

آگے انہوں نے مفصل امام حسینؑ کی شہادت پر لکھا ہے۔ اس کے علاوہ علامہ ضمیر اختر نقوی نے "سادات کی ایک مشہور بستی کلاں پور" پر لکھا ہے، ماجد رضا نے جوش ملیح آبادی کی پسندیدہ بحر پر لکھا ہے۔ اس کے علاوہ مندرجہ ذیل مضامین ہیں:

۱۔ ضمیر دہلوی کے غیر مطبوعہ مرثیے (ضمیر اختر نقوی)

۲۔ جدید اور قدیم خطابت (محسن نقوی)

انشاءاللہ دوسری قسط میں ہم مضامین پر بحث کریں گے۔

جریدے کے آخر میں تعزیت کی گئی ہے جس میں شاعر مجز جون پوری، علامہ عرفان حیدر عابدی اور ان کی اہلیہ، سبط حسن رضوی، سبط حسن انجم اور مولانا سلمان حیدر کے انتقال پر تعزیت ہے۔ وفات علامہ عابدی پر ظل صادق صاحب نے قطعہ کہا ہے:

پوچھتے ہو حال کیا عرفان کا
چاند تھا انیسویں کا، کھو گیا
موت کیسی عاشقِ شبیرؑ کو
ذاکرِ شامِ غریباں سو گیا

مولانا سلمان حیدر مرحوم کے لئے کہا ہے:

اہلِ دیں، اہلِ بصیرت، محترم، عالی جناب
خوب پائی زندگی نے بندگی کی آب و تاب
لکھ دو، ماجدؔ! قبر پہ یہ مصرعۂ وصفِ جلی
باعمل سلمان حیدر خلد میں ہیں کامیاب

ہماری دعا ہے کہ خدا ضمیر اختر صاحب کے قلم میں اور بصیرت دے تاکہ وہ ملت کی مزید قلم سے خدمت کرسکیں۔

علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کے ادبی جریدے "القلم" اور ڈاکٹر صاحب کی زندگی کے تقریباً ہر پہلو پر ہم نے پچھلی قسطوں میں روشنی ڈالی اور اب یہ مضمون اپنے آخری مراحل میں داخل ہو رہا ہے۔ دراصل ہم پر دوہری ذمے داری تھی، کیونکہ جب سے علامہ شفیق رضوی سے ہماری دوستی ہوئی ہے، ہم نے اور علامہ شفیق رضوی نے کبھی کسی کام کو الگ الگ نہیں سمجھا۔ کوئی مضمون لکھنا ہوتا ہے تو علامہ رضوی نے ہم پر "القلم" پر تبصرہ کرنے کی ذمے داری عائد کی تھی جس کو ہم نے احسن طریقے سے ادا کر دیا۔ ہمیں اس بات کی خوشی ہے کہ علامہ ضمیر اختر نقوی باقاعدگی سے "القلم" کے اجرا کا ارادہ رکھتے ہیں اور انہوں نے اپنے دوسرے شمارے میں یہ لکھا ہے کہ سال میں چار شمارے شائع کیے جائیں گے۔ اور لکھنے والوں کو باقاعدہ معاوضہ دیا جائے گا۔ ہمیں دراصل خوشی اس بات کی ہے کہ علامہ نقوی نے حقیقی معنوں میں ادب کی خدمت کی ہے اور وہ باقاعدہ ایک مشن پر کام کر رہے ہیں، کیونکہ آج کے اس زمانے میں ۱۳۰ کتب لکھنا اور باقاعدہ ایک ادارہ چلانا آسان بات نہیں ہے۔

"القلم" کے دوسرے شمارے کے مضامین مندرجہ ذیل ہیں:

(۱) مراثی انیس میں نورس: پروفیسر مسعود حسن رضوی

(۲) آصف الدولہ کا امام باڑہ: ڈاکٹر پروفیسر کاظم علی خان

(۳) عروج کا ایک اہم غیر مطبوعہ مرثیہ: ڈاکٹر شارب ردولوی

(۴) مرثیہ (غیر مطبوعہ): سید حسن کاظم عروج

(۵) ظہیر دہلوی کے غیر مطبوعہ مرثیے: سید ضمیر اختر نقوی

(۶) جدید اور قدیم خطابت: محسن اختر نقوی

(۷) سلام بر حسین: ڈاکٹر سید تقی عابدی

(۸) سادات کی ایک مشہور بستی کلاں پور: سید ضمیر اختر نقوی

(۹) جوش ملیح آبادی کی پسندیدہ بحر: ماجد رضا عابدی

(۱۰) شوق لکھنوی اپنی شاعری کے آئینے میں: آل محمد رزمی

(۱۱) بڑی کٹھن ہے ڈگر پنگھٹ کی: پروفیسر محمد نصیر

اس کے علاوہ دانشوروں کے خطوط اور علامہ نقوی کے جوابات ہیں۔ اور آخر میں تعزیت ہے۔ شمارہ نمبر (۳) کے موضوعات بھی درج ہیں جو ایک اچھی بات ہے اور اس سے اہل علم حضرات میں شمارہ پڑھنے کی جستجو میں یقیناً اضافہ ہوگا۔

شمارہ نمبر ۳ کے موضوعات:

(۱) ڈاکٹر صبیح زکا ترجمہ کلام انیس پر تبصرہ: سید محسن اختر نقوی

(۲) بھائی چھن کی دلچسپ باتیں: نسیم حسن امروہوی

(۳) غیر منقوطہ مرثیے..... سید ضمیر اختر نقوی

(۴) زائر زیدی کی منقبت نگاری: شہاب کاظمی

(۵) اک ذاکر حسین تھے عرفان عابدی: علامہ ضمیر اختر نقوی

(۶) جوش ملیح آبادی کا غیر مطبوعہ سلام

(۷) جدید مرثیہ (حضرت حُر): اصغر نقوی

(۸) میر انیس بحیثیت ماہر حیاتیات: علامہ ضمیر اختر نقوی

''القلم'' کے شمارہ نمبر ۲ کے تمام مضامین جہاں علمی ہیں وہاں تحقیقی بھی ہیں۔ جن کا مطالعہ تو ہر شخص کرسکتا ہے، مگر اس کو سمجھنا اور لکھنا ہر آدمی کے بس سے باہر ہے، خاص

طور پر آلِ محمد رزمی صاحب نے بھی ایک بہترین مضمون لکھ کر تحقیق قلم کا حق ادا کیا ہے:
"شوق لکھنوی اپنی شاعری کے آئینے میں"
ہماری دعا ہے کہ علامہ ضمیر اختر نقوی کا قلم یوں ہی چلتا رہے اور وہ ادب کی خدمت کرتے رہیں۔ (روزنامہ "حریت" کراچی، ۲۵ ستمبر ۱۹۹۸ء)

آلِ محمد رزمی

سید ضمیر اختر نقوی کا تعلق لکھنؤ کی گنگا جمنی تہذیب سے ہے ادبی و مذہبی حلقوں میں ان کا نام تعارف سے بے نیاز ہے قلم سے ان کا رشتہ بہت پرانا ہے وہ گزشتہ ربع صدی سے لکھنے لکھانے میں مصروف ہیں اور مرثیہ نگاری پر تحقیقی کام کر رہے ہیں اور ستائش تمنا اور تنقید سے بے نیاز خود اعتمادی سے ادب کی خدمت میں نیک جذبوں کے ساتھ مصروف ہیں وہ ایک روشن فکر انسان ہیں اور اسی روشن فکری کی وجہ سے وہ سالہا سال سے جرم خود آگہی کی سزا پا رہے ہیں اگرچہ روشن فکری ایک ایسی ذہنی کیفیت کا نام ہے جو انسان کو آفاقی معیار کی تلاش، قاعدہ کلی کی جستجو اور عمومی نتائج کے حصول میں سرگرم رکھتی ہے یہ کیفیت اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ تاریخی حقائق سے چشم پوشی یا جانبداری سے کام لیا جائے۔

سیّد سجاد شبیر رضوی

"القلم" کے جریدے پر تبصرہ

ضمیر اختر نقوی کو اگر ادب کے آئینے میں دیکھا جائے تو واقعی ہم کو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ضمیر اختر نے دنیائے ادب کے لئے بیش بہا خزانہ دیا ہے، مگر ہمیں افسوس ہے کہ اس سلسلے میں ہماری قوم کی بے حسی بھی قابلِ دید ہے۔ ہمارے یہاں مطالعے کا رجحان بیس فیصد ہے جبکہ تحقیقی کام کرنے والوں کی تعداد بھی انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے، ان لوگوں میں علامہ ضمیر اختر کا نام سرِفہرست آسکتا ہے۔ علامہ نقوی کی کتاب "شعرائے اُردو اور عشقِ علیؑ" میں اس قدر مواد ہے کہ کیا لکھا جائے۔ علامہ نقوی نے ہر چیز کو قرآن سے ثابت کیا ہے اور حضرت علیؑ کے لئے شعرا نے کیا کہا ہے، اس کو ایک جگہ جمع کر کے بڑا علمی کام کیا ہے۔ اس کے علاوہ علامہ کی ایک اور کتاب "خاندانِ میر انیسؔ کے نامور شعرا" کے نام سے ہے جس نے دنیائے ادب میں بڑی شہرت حاصل کی ہے۔

ہم نے اپنی پہلی قسط میں "القلم" کے شمارے پر گفتگو کی تو ہم نے علامہ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں کا جائزہ لیا۔ علامہ نقوی صرف اسکالر نہیں ہیں، کامیاب خطیب اور ذاکر بھی ہیں، دراصل اگر غور کیا جائے تو انسان ایک وقت میں صرف ایک شعبے میں کام کرسکتا ہے اور اس کی کوشش بھی ہوتی ہے کہ وہ صرف اسی شعبے میں ترقی کرے یا اگر لکھنے والا ہوتا ہے تو اس کو خطابت میں مشکل ہوتی ہے مگر ڈاکٹر ضمیر اختر محقق اور اسکالر

ہونے کے ساتھ ایک کامیاب خطیب بھی ہیں۔ ہمارے قریبی دوست اور ساتھی علامہ شفیق رضوی جو "حریت" کے ایڈیٹر ہونے کے ساتھ ایک کامیاب ذاکر بھی ہیں، علامہ ضمیر اختر کے بارے میں مجھ سے فرمارہے تھے کہ دراصل ضمیر اختر نقوی کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ وہ جس موضوع پر گفتگو کرتے ہیں، آخر تک اسی موضوع پر گفتگو کرتے رہتے ہیں، حالانکہ ایسا بہت کم ہوتا ہے۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ علامہ ضمیر اختر نے جب سے خطابت شروع کی، یعنی جب آپ گیارہ سال کے تھے، جب سے ان کی ہر تقریر ریکارڈ کر کے رکھی جا چکی ہے۔ ہم نے ایک بات پر غور کیا ہے، وہ یہ کہ جب کوئی آدمی ریسرچ ورک کرتا ہے تو الجھا الجھا رہتا ہے۔ علامہ ضمیر اختر صاحب کو اس کے برعکس پایا۔ آپ کی یہ خوبی بھی ہے کہ آپ کا اخلاق بڑا وسیع ہے۔ ہم نے دیکھا اور خود اس کا شکار بھی ہوئے کہ لکھنے والا چاہے چھوٹا ہو یا بڑا، اگر کوئی دوسرا اس کے پاس اپنا مضمون اصلاح کے لئے لے جائے تو وہ ایسا محسوس کرتا ہے کہ بس اس سے بڑا اور کوئی اسکالر نہیں ہے۔ ہم نے "حریت" کے لئے طویل مضمون لکھا تھا، اور چاہا تھا کہ علامہ شفیق رضوی جیسے باعمل عالم سے اس کی اصلاح لیں گے۔ مگر علامہ شفیق کی مصروفیات کی وجہ سے ہماری ملاقات ان سے نہ ہو پائی، تو ہم ایک اور اسکالر کے پاس چلے گئے تو جواب ملا کہ آپ مضمون رکھ دیں، ایک ہفتے بعد آیئے گا۔ اس کو اپنے اوپر ناز کرنا کہتے ہیں، مگر علامہ ضمیر اختر اس معاملے میں بہترین نظریہ رکھتے ہیں۔ آپ سے پوچھنے والا چھوٹا ہو یا بڑا، آپ اس کی اصلاح کرنے میں کبھی عار محسوس نہیں کرتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آج آپ کا شمار برصغیر کے ممتاز اسکالرز میں ہوتا ہے۔ علامہ کے اخلاق پر اگر میں یہ شعر کہوں کہ:

جو اعلیٰ ظرف ہوتے ہیں ہمیشہ جھک کے ملتے ہیں
صراحی سرنگوں ہو کر بھرا کرتی ہے پیمانہ

علامہ ضمیر اختر نقوی کے لیے ممتاز سماجی رہنما مولانا عبدالستار ایدھی نے فرمایا:

"مجھے خوشی ہے کہ علامہ نقوی نے اتنی کم عمری میں اتنی کتابیں تحریر کیں، یہ ان کی کامیابی ہے۔ یہاں میں کہنا چاہتا ہوں کہ ہمارے یہاں ادبی کاموں کا فقدان ہے۔ ایسے میں ضمیر اختر نقوی کا کمال ہے کہ وہ اس مشن کو لے کر چل رہے ہیں۔"

محترمہ نصرت بھٹو نے کہا:

"ضمیر اختر نقوی اپنی ذات میں یونیورسٹی ہیں اور اگر میں کہوں کہ وہ قوم کے سرسید ہیں تو اس میں مبالغہ نہیں ہوگا۔ علامہ نقوی ڈوب کر قلم چلاتے ہیں اور یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔"

ممتاز اسکالر علامہ شفیق رضوی فرماتے ہیں:

"دراصل علامہ ضمیر اختر نقوی میں وہ تمام تر خوبیاں موجود ہیں اور یکجا ہو گئی ہیں جو ایک کامیاب محقق اور اسکالر میں ہونی چاہئیں۔"

ممتاز عالم دین مولانا مجتہد حسن عباس رضوی فرماتے ہیں:

"ضمیر اختر میری قوم کا بہت بڑا سرمایہ ہے۔ یہ بچہ ہمارے سامنے دیکھتے ہی دیکھتے شہرت کی بلندیوں پر پہنچ گیا، یہی ایک کامیاب محقق اور اسکالر ہونے کا ثبوت ہے۔"

علامہ ضمیر اختر نقوی اور ان کی خدمات پر قسیم ابن نسیم نے ایک طویل نظم "اعتراف و تحسین" کے نام سے تحریر کیا ہے جس پر ہم انشاءاللہ بعد میں لکھیں گے۔ قسیم ابن نسیم لکھتے ہیں

تیرا خطاب بھی زندہ ہے، تو بھی زندہ ہے
نہ ہوگا دوسرا کوئی ضمیرؔ! تیری طرح

نسیم ابن نسیم، برصغیر کے ممتاز شاعر نسیم امروہوی صاحب کے صاحبزادے ہیں اور خود بھی ایک ممتاز اسکالر اور شاعر ہیں۔ نسیم صاحب نے اس طویل نظم میں علامہ کی زندگی کے ہر پہلو پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے۔ جس پر آئندہ بحث ہوگی۔

محسن نقوی امروہوی نے علامہ کو یوں خراج عقیدت پیش کیا ہے:

ذاکرِ آلِ عبا، تاریخ کا دفتر ضمیر
مخزنِ علم و ادب کا بے بہا جوہر ضمیر
ذکرِ اہلِ بیتؑ ان کا ہے شعارِ زندگی
زیرِ سایہ ہیں علم کے برسرِ منبر ضمیر

ملک کے ممتاز دانشور سحر انصاری فرماتے ہیں:

علامہ ضمیر اختر نقوی کی ان خدمات کے وہ چشم خود گواہ ہیں اور انھیں ایک طویل عرصے سے ان کاموں میں مصروف دیکھ رہے ہیں۔"

واقعی ضمیر اختر نقوی صاحب کی بات کافی وزن رکھتی ہے کہ "ادب کو مضبوط کر دیا جائے تو تمام تعصبات خود بخود دم توڑتے چلے جائیں گے۔" ہماری دعائیں ضمیر اختر نقوی صاحب کے ساتھ ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ ضمیر اختر نقوی اسی نہج پر قلم اٹھاتے رہے تو پھر ہر جگہ علامہ نقوی کا نام دنیائے ادب کے ہر کونے میں گونجے گا۔ انشاء اللہ!

(روزنامہ "حریت" کراچی، یکم اکتوبر ۱۹۹۸ء)

مکرم لکھنوی

القلم سہ ماہی اور اعتراف و تحسین

"القلم" سہ ماہی گلشن اقبال، بلاک گیارہ سے مرکز علوم اسلامیہ (پاکستان) کراچی کے زیر اہتمام شائع ہوتا ہے۔ "القلم" کی قیمت فی شمارہ پچاس روپے مقرر کی گئی ہے۔

ہم نے دسمبر ۱۹۶۳ء میں جب ۶۳ صفحے کا ماہنامہ "نقش لطیف" جاری کیا تھا تو اس کی قیمت پچاس (۵۰) پیسے تھی۔ جس کی ادارت کے فرائض ہمارے دوست جناب شور صہبائی انجام دے رہے تھے۔ امن و سلامتی کا دور تھا۔ سڑکوں پر آج کی طرح قدم قدم پر گندگیوں کے ڈھیر نظر نہیں آتے تھے۔ آج کل تو ادب میں بھی ایسے ڈھیر نظر آنے لگے ہیں۔ دہشت گردی کا نام و نشان نہیں تھا۔ بوریوں میں بند لاشیں ملنے کا تصور بھی نہیں تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ان سیاسی پارٹیوں کا گندا وجود اس وقت کراچی میں نہیں تھا جن سے آج مفر حاصل کرنے کی کوئی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔

۱۹۶۳۔۶۵ء سنجیدہ صاحبان علم و ادب کے لیے اطمینان کا سنہری دور تھا جس میں ان چند معزز اہل قلم ہستیوں کے نام لیے جا سکتے ہیں جن سے ہمیں قلمی قربت حاصل تھی مثلاً جناب ضیاء الحسن موسوی، پروفیسر مجتبیٰ حسین، نادم سیتاپوری، سید ناصر جہاں، پروفیسر کرار حسین، پروفیسر شیخ وقار حسین، جون ایلیا، ڈاکٹر آغا سہیل، پروفیسر آغا سروش، عبدالعزیز خالد، پروفیسر حسن عابد، جناب حسین انجم، وفا کانپوری، بنیاد تیموری، جناب ابرار عابد، ڈاکٹر یاور عباس، راغب مرادآبادی، ڈاکٹر شیخ انصار حسین،

ڈاکٹر محمد احسن فاروقیؔ، مولانا محمد باقر شمس، وحشی محمود آبادی اور ڈاکٹر فرمان فتح پوری،

اسی سکون و اطمینان کے دور میں ریڈیو پاکستان کراچی میں ارم لکھنوی کا دور دورہ تھا، شعرا میں ان سے زیادہ کسی کو استادانہ مرتبہ حاصل نہیں تھا۔ ہمیں یاد ہے کہ ہمارے دوست حیدر امام رضوی جو کہ سر دست اپنا ایک پرچہ کرامم گزٹ نکالتے ہیں، اس وقت انھوں نے میرے کلام کو ریڈیو میں متعارف کرایا تھا اور مرحوم ارم لکھنوی کی منظوری کے بعد میری غزلیں ریڈیو پر آنے لگی تھیں۔

اُبھرتے ہوئے صاحبانِ قلم میں اس وقت بھی جناب ضمیر اختر نقوی کا نام روشن تھا، ان کی سکونت رضویہ سوسائٹی میں تھی اور ان کا گھر کتابوں سے بھرا تھا اور انیس پر اس وقت ضمیر اختر سے زیادہ کسی کے پاس کتابیں اور مرثیے نہیں تھے۔ ایک طرح سے وہ انیس پر اتھارٹی بن کر اُبھر رہے تھے۔ مشہور مرثیہ گویوں کے مطبوعہ و غیر مطبوعہ مرثیوں کا امین کراچی میں ان سے زیادہ کوئی نہیں تھا۔

سہ ماہی القلم کے مدیرِ اعلیٰ سید ضمیر اختر نقوی ادب پر عمیق نظر رکھتے ہیں، بالخصوص آپ کو اسلامی ادب پر کامل دسترس ہے۔

القلم سہ ماہی کے اجرا کی غرض و غایت اور تفصیل نقوی صاحب کے لکھے ہوئے اداریے میں ان کے اس ارشاد سے معلوم ہو جاتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس رسالے میں شامل مضامین کا تعلق خالصتاً ادبِ اہلِ بیتِ رسولؐ سے ہوگا اور یہ رسالہ رسولؐ و آلِ رسولؐ کے لئے اُردو زبان کی خدمات کو اُجاگر کرے گا۔''

''القلم'' میں حافظ تائب جو خود نعت گو شاعر بھی ہیں، ان کا مختصر مضمون ''اُردو نعت ــــ اجمالی جائزہ'' اچھا مضمون ہے جس کے ساتھ بیس سال کے اندر شائع ہونے والے نعتیہ مجموعوں کی تاریخ اور فہرست ایک مفید چیز ہے۔

موصوف کے مضمون میں یہ ایک فقرہ "حسن کی صناعی لکھنوی رنگ لیے ہوئے ہے مگر اس کا استعمال لطافت اور کیف سے خالی نہیں ہے۔" اس نکتے کو ظاہر کرتا ہے کہ لکھنوی رنگ لیے ہوئے صناعی، لطافت، و کیف سے خالی ہوتی ہے۔ اپنے انداز اور مفہوم میں ان کا یہ ارشاد لکھنؤ شناس ارباب بینش و دانش کے لئے دعوت فکر مہیا کرتا ہے۔

"القلم" کے صفحات ۱۳ تا ۳۱ علامہ ضمیر اختر نقوی کا مضمون "میر مونس کے حالات زندگی" ملاحظے کے قابل چیز ہے۔ طرز تحریر سادہ و دل نشین ہے۔ تلاش تجسس کے ساتھ لکھا جانے والا یہ مضمون اتنا جاذب توجہ ہے کہ مضمون کا مکمل مطالعہ کیے بغیر رسالہ ہاتھ سے رکھنے کو جی نہیں چاہتا۔ حالات زندگی کے ذیلی عنوانات یہ ہیں:

(۱) ولادت (۲) تعلیم و تربیت (۳) تلمذ (۴) استعداد علمی (۵) لکھنؤ میں مستقل سکونت (۶) میر مونس کا مکان (۷) ریاست محمود آباد سے تعلقات (۹) مقبولیت (۱۰) طرز خواندگی (۱۱) وضع قطع (۱۲) عظیم آباد کا سفر (۱۳) کلکتے سے طلبی (۱۴) عراق کا سفر (۱۵) بھائیوں سے محبت (۱۶) میر انیس کی وفات کا صدمہ (۱۷) آخری مرثیہ (۱۸) وفات (۱۹) اقتباس طبع (۲۰) شادی (۲۱) شاگرد۔

ضروری حوالے پیش کیے جانے سے مضمون تحقیقی مرتبے کو پہنچ گیا ہے جو ضمیر اختر صاحب کی تصنیف و تالیف کا ہمیشہ طرۂ امتیاز رہا ہے۔

جناب ماجد رضا عابدی کا مضمون "انیس کے ایک مرثیے کا مطالعہ" ایک اچھا مضمون ہے۔ اسے سرسری نظر سے بھی دیکھنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے کہ آپ ایک ہونہار اہل قلم ہیں۔ آپ میں لکھنے کی اچھی صلاحیت ہے۔ ایسے ادیب و شاعر سے ہمیں مستقبل کے لئے اچھی امیدیں وابستہ رکھنا چاہئیں۔

جناب منظر حسین کاظمی کا مضمون "مصطفیٰ آباد" ان کی ننھیال کے نیک دل و سادہ

مزاج پرانے حضرات کے کوائف کے ساتھ عجیب قسم کا کہیں مزاحیہ اور کہیں سنجیدہ مندرجات کا حامل مضمون ہے۔ بہر حال اس کے مطالعے سے محظوظ ہوا جا سکتا ہے۔

پروفیسر منظر حسین کاظمی کی تحریر سے یہ بات معلوم ہوئی کہ جناب ضمیر اختر نقوی ''مصطفیٰ آباد ضلع رائے بریلی، یوپی کی تاریخ کے ساتھ وہاں آباد خواتین و حضرات کا شجرہ بھی لکھ رہے ہیں۔ منظر کاظمی کے بقول مصطفیٰ آباد ضمیر اختر کی ددھیال ہے۔ اس حوالے سے اشتیاق پیدا ہوتا ہے کہ دیکھیں ضمیر اختر صاحب کتنی محنت و مہارت کے ساتھ اپنے اس کام میں ادبی افادیت کے عناصر شامل کرتے ہیں۔

''القلم'' کے صفحہ ۵۷ پر جناب آلِ محمد رزمی کے سو سے زیادہ اشعار ہیں۔ اس نظم کا عنوان ہے ''بے مالا مال علم سے دامانِ لکھنؤ'' رزمی صاحب بے تکان شعر کہتے چلے گئے ہیں۔ ان اشعار میں عیب و ہنر کا امتیاز برتنے کی ضرورت کو محسوس نہیں کیا گیا ہے اور افراطِ جذبات میں موزوں ناموزوں، ہر طرح کا شعر پیش کر دیا گیا ہے۔ ''فاعتبروا یا اولی الابصار'' صفحہ ۶۲ پر جناب حامد جون پوری کا تصنیف کردہ مرثیہ شروع ہو جاتا ہے جو حضرت شہیدِ ثالث قاضی نور اللہ شوستری کے حال میں ہے اور اسی پر رسالے کے مضامین کا اختتام ہوتا ہے۔ مرثیہ اپنی فکر میں بہت اچھا ہے، بہتر ہوتا کہ اسے اور سنوار کے پیش کیا جاتا۔

اور اب ایک کتاب ''اعتراف و تحسین'' جو مجھے علامہ ضمیر اختر صاحب کی علمی و ادبی خدمات کے سلسلے میں پیش کی گئی ہے، اس کا حاصل مطالعہ ''القلم'' کے قارئین کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے۔

آغازِ کلام میں یہ بات عرض کر دینا چاہتا ہوں کہ میری نظر میں اس وقت کی بڑی شخصیت، یعنی صاحبِ علم و بصیرت اور صاحبِ نظر شخصیت ہے حضرت ضمیر اختر نقوی

کی۔ میں انھیں ان کے بڑے بڑے علمی اور ادبی کارناموں کی وجہ سے بڑی شخصیت گردانتا ہوں، اس لیے بھی کہ اپنے سن وسال کے اعتبار سے انہوں نے اب تک جو علمی اور تحقیقی خدمات پیش کی ہیں، وہ کسی کے تصور سے بھی کہیں زیادہ ہیں اور ابھی ان کی خدمات دینی وادبی کا دائرہ تنگ ہوتا نظر نہیں آرہا ہے۔ قیاس و یقین کہتا ہے کہ وہ اپنی آئندہ عمر کے حصے میں ایسے علمی، ادبی اور تحقیقی کام کر سکیں گے جو عالم علم وادب اور تحقیق وخطابت کے میدان میں دنیا والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دینے کے لیے کافی ہوں گے۔ یہاں مسٹر جگن ناتھ آزاد کا یہ ارشاد و انکشاف کہ "ضمیر اختر نقوی کے علمی اور ادبی کارناموں سے پاکستان اور ہندوستان کی تمام یونیورسٹیاں اور تمام اہل نظر مستفید ہو رہے ہیں۔" اس پیشین گوئی کا غماز ہے کہ مستقبل قریب میں پاک و ہند کے کسی بھی محقق کا کارنامہ ضمیر اختر کی کاوشوں سے استفادے کے بغیر نامکمل تصور کیا جائے گا۔

حکایت یہ ہے کہ جناب قسیم ابن نسیم پاکستان کے ایک فاضل مرثیہ نگار ہیں۔ جنہیں اپنے خاندانی ورثے میں قدرت کی طرف سے عزت و مرتبہ حاصل ہے۔ ایک قول کے مطابق جناب قسیم جناب ضمیر اختر نقوی کے لڑکپن کے ساتھی ہیں۔ موصوف نے علامہ ضمیر اختر کے طرز خطابت اور تحقیقی کارناموں کا بھی ذکر کیا ہے۔ قسیم صاحب کے اس مسدس کو "علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی دینی، علمی، ادبی اور تحقیقی خدمات نظم کے آئینے میں اعتراف و تحسین کے نام سے مرکز علوم اسلامیہ (پاکستان) کراچی نے کتابی شکل میں شائع کیا ہے۔ اس مسدس کی پذیرائی کے لئے "تقریب اعتراف و تحسین" کے عنوان سے جناب ناصر رضا رضوی کے مکان پر ایک تقریب منعقد کی گئی اور اس تقریب میں پڑھے جانے والے مقالات و مضامین کو بھی شامل کر لیا گیا۔ اس

کے علاوہ روز نامہ "ڈان" میں جناب انتظار حسین کے تبصرے کا اُردو ترجمہ بھی پیش کیا گیا ہے۔

انتظار حسین کی ہمہ جہت شخصیت دنیائے علم وادب وصحافت کے کسی گوشے میں محتاج تعارف نہیں ہے۔ انہوں نے اپنے تبصرے میں ضمیر اختر نقوی کے بارے میں لکھا ہے:

"حقیقت میں ضمیر اختر نقوی صرف ایک ساحر البیان خطیب ہی نہیں ہیں، ضمیر اختر نقوی نے ہماری مذہبی شاعری کے شعبے میں بھی بہت سے قیمتی تحقیقی کام کئے ہیں۔"

آگے چل کے انتظار حسین صاحب لکھتے ہیں:

"ان کے تحقیقی کاموں میں سے ایک بعنوان "شعرائے اُردو اور عشق علی ہے" اس کتاب میں انہوں نے ہماری مذہبی شاعری یعنی منقبت کی تاریخ کا سراغ لگایا ہے۔ جو عربی، فارسی، اور آخر میں اُردو مذہبی شاعری سے متعلق ہے اور یہ عربی میں حسان بن ثابت، فارسی میں فردوسی اور اُردو میں قلی قطب شاہ کے دور سے شروع ہوتی ہے۔"

انتظار حسین صاحب، ضمیر اختر نقوی کی ایک اور کتاب "خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا" کے لیے لکھتے ہیں:

"یہ تحقیقی کتاب میر انیس کے خاندان سے تعلق رکھنے والے مرثیہ گویوں کے تذکرے پر مشتمل ہے۔"

وہ اپنے تبصرے میں مذکورہ کتاب پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالنے کے بعد لکھتے ہیں:

"اس تمام کارروائی کا سہرا ضمیر اختر نقوی کے سر جاتا ہے جنہوں

نے تحقیق کی کٹھن منزلوں سے گزر کر تاریخ کے دھندلکوں سے اس
خاندان کی شناخت کو دوبارہ اجاگر کیا ہے۔ اس خاندان کے ہر فرد کو
مرثیہ نگاری میں عظیم اور معزز مقام پر دکھانے کی کوشش کی ہے اور
انھوں نے کئی ایسے مرثیے جو غیر مطبوعہ تھے، اس کتاب میں شامل کیے
ہیں۔ یہ ضخیم کتاب ۹۸۸ صفحات پر پھیلا ہوا ایک تفصیلی اور تشریحی تذکرہ
ہے ان مرثیہ نگاروں کا جن کا تعلق خاندانِ میر انیس سے ہے۔"

علامہ ضمیر اختر نقوی فقط تحریر و تقریر کے میدان میں نہ صرف یہ کہ اپنا جواب نہیں
رکھتے، وہ حبِ اہل بیت و محبتِ آلِ محمدؐ میں بھی ازل سے ایک سرشار دل لے کے آئے
ہیں۔ اسی لیے ان کا کوئی ادبی اور تحقیقی کام سلسلۂ حسینی سے الگ نہیں ہوتا۔"

ماجد رضا عابدی علامہ ضمیر اختر کے معتقدین میں ایک جواں سال ادیب و شاعر
ہیں، انھیں ان کی ہم نشینی، دوستی اور اکتسابِ فیض پر اسی لیے فخر ہے اور اس فخر کے
اظہار میں بڑی مسرت کے ساتھ وہ کہتے ہوئے نظر آتے ہیں کہ

دورِ حاضر کی خطابت پہ ہے فیضانِ ضمیر | یعنی اک زندہ حقیقت دبستانِ ضمیر
فلکِ علم کے تارے ہیں محبانِ ضمیر | ماجد عابدیؔ میں بھی ہوں ثناخوانِ ضمیر

میرا اسلوب ہی سیفِ زبانی کا اسیر
میرا ادراک ہی زمزمہ دانی کا اسیر

جناب صائم رضا امروہوی، جناب سید ہاشم رضا، جناب پروفیسر سحر انصاری،
جناب پروفیسر شیخ انصار حسین (برادر نسیم امروہوی)، جناب ماجد حسین رضوی، ڈاکٹر
ہلال نقوی، مولانا سلیمان حیدر زیدی، جناب آباد محمد نقوی، زائر، محشر لکھنوی، ساحر
فیض آبادی، میر رضی میر اور دوسرے زعما شامل تھے۔

شیدائیان علامہ ضمیر اختر نے دوسری تقریب ''تقریب اعتراف و تحسین'' آرٹس کونسل آف پاکستان میں منعقد کی جس میں صدر تقریب سید ہاشم رضا نے فرمایا:

''علامہ ضمیر اختر نقوی اپنی ادبی خدمات اور خطابت کے حوالے سے ایک منفرد شخصیت کے مالک ہیں۔ انہوں نے ایک سو اٹھارہ (۱۱۸) کتابیں تصنیف و تالیف کی ہیں اور ابھی سلسلہ جاری ہے۔''

انہوں نے فرمایا:

''علامہ ضمیر اختر نقوی اپنے علمی کارناموں سے قیامت تک زندہ رہیں گے، ان کا نام ادب میں ہمیشہ باقی رہے گا، علامہ ضمیر اختر نقوی نے ادب کا عظیم موضوع منتخب کیا ہے میر انیس ان کے ممدوح ہیں۔ شبلی نعمانی، مولانا حالی، مسعود حسن ادیب اور محمود شیرانی کی نظر میں میر انیس اُردو کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔''

علامہ ضمیر اختر نقوی نے بڑے موضوع کا انتخاب کر کے بہت بڑی کتاب ''خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا'' اور میر انیس کی حیات اور شاعری تخلیق کی۔''

اس تقریب کے مہمان خصوصی ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے فرمایا:

''علامہ ضمیر اختر نقوی کی ادبی خدمات کے سلسلے میں آج کی اس محفل میں علامہ ضمیر اختر نقوی کی کتابوں کے حوالے سے علم و ادب کے جتنے مسائل زیر بحث آ گئے ہیں، میں اپنے مشاہدے اور تجربے کی روشنی میں یہ کہتا ہوں کہ اتنے مسائل کسی کتاب کی تعارفی تقریب میں کبھی زیر بحث نہیں آئے۔ یہ اس محفل کا واقعی ایسا حاصل

ہے کہ فلسفے کے حوالے سے، عشق کے حوالے سے، سماجیات کے حوالے سے، سماجیات اور سیاسیات کے حوالے سے اور عقائد اور دین کے حوالے سے، میں نے جتنی کارآمد باتیں اس محفل میں سنیں، کم سے کم کسی کتاب کی تعارفی تقریب میں اس طرح کی باتیں سننے میں نہیں آئیں۔ یہ باتیں کیوں ہوئیں؟ ایسی عالمانہ باتیں، ایسی حق اور صداقت اور علم و ادب سے بھری باتیں کیوں ہوئیں؟ وجہ یہ ہے کہ موضوعِ گفتگو عظیم سے عظیم تر ہوگا تو گفتگو بھی بڑی ہوگی، وسیع اور روشن ہوگی، اس محفل میں ایک جوش و خروش پایا جا رہا ہے، جبکہ چار گھنٹے مسلسل گزر چکے ہیں اور محفل پر کوئی جمود طاری نہیں ہوا، آپ کو کسی قسم کی اکتاہٹ محسوس نہیں ہوئی۔ علامہ ضمیر اختر نقوی کی شخصیت اور ان کے علمی کارناموں کے تنوع، ان کی ادبی رنگا رنگی اور ذوقِ علم و ادب سے اتنی شاخیں پھوٹ رہی ہیں کہ آپ تقریروں کا لطف لیتے رہے، میں علامہ ضمیر اختر نقوی کو اپنے خوابوں کی تعبیر سمجھتا ہوں۔"

مہمانِ خصوصی ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی تقریر کے بعد ڈاکٹر عالیہ امام صاحبہ نے اپنی منطقی اور مسکتی تقریر میں فرمایا:

علامہ ضمیر اختر نقوی ادراک و آگہی کی بازگشت پر آیا ہوا دھارا ہیں۔ میں ان کو دل کی گہرائیوں سے محبت کا خراج پیش کرتی ہوں۔ علامہ ضمیر اختر نقوی اپنی زندگی کے سرد و گرم سے گزرے اور ایسے مراحل بھی آئے کہ جب وہ آگ اور خون کے دریا سے گزرے ہیں

لیکن وہ پگھلے نہیں ہیں بلکہ فولاد بن گئے ہیں، صرف فولاد نہیں بنے بلکہ سونا بن گئے ہیں، صرف سونا نہیں بنے بلکہ کندن بن گئے ہیں، صرف کندن نہیں بنے بلکہ اس کندن کو ریزہ ریزہ کر کے آپ کے لئے علم وادب کے سونے کی دکان سجا دی ہے۔ یہ موتیوں کی دکان سجا دی ہے۔ اب آپ کا کام ہے کہ آپ ایک جوہری کی طرح ان موتیوں کو اپنے سینے میں بسا لیں۔ علامہ ضمیر اختر نقوی اس عہد کے نئے کوہ کن ہیں جو نئے تیشے لے کر نئی پیکر شیریں تراشنے کے لئے اس میدان میں اُتر آتے ہیں۔

صدر شعبہ اُردو کراچی یونیورسٹی پروفیسر سحر انصاری نے علامہ ضمیر اختر نقوی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

''اعتراف و تحسین کی یہ محفل جس خلوص و جذبہ سے سجائی گئی ہے اور علامہ ضمیر اختر نقوی کے لئے جو عقیدت کے پھول لٹائے گئے، یقیناً ان نامساعد حالات میں بھی علامہ ضمیر اختر جیسے علم کی شمع روشن کرنے والے ابھی موجود ہیں۔ جہل کے اندھیرے پنجے گاڑنا چاہتے ہیں، لیکن جب تک علامہ ضمیر اختر نقوی جیسے محقق اور عالم موجود ہوں گے، وہ شمع کبھی گل نہیں ہو سکتی۔''

پاکستان کے ممتاز شاعر نقاش کاظمی نے علامہ ضمیر اختر نقوی کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے کہا:

''علامہ ضمیر اختر نقوی ہمارے عہد کے ایک ایسے نابغۂ روزگار خطیب وادیب ہیں جن کے سرخیلوں میں مولانا ابوالکلام آزاد جیسی

شخصیات شامل ہیں، یعنی علامہ صاحب بیک وقت مذہب اور ادب
پر دسترس رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک جانب خطابت کے سنگلاخ
تجربات اور دوسری جانب تحریر و تحقیق کے جان لیوا مقامات ہیں۔
علامہ ضمیر اختر ایک صاحب طرز خطیب ہیں نہ تو وہ علامہ رشید ترابی
کے مقلد نظر آتے ہیں، نہ سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے۔"

تقریب سے پروفیسر سردار نقوی، رشید رضوی، علامہ ذوالفقار حیدر، آل محمد رزمی، ماجد رضا عابدی، پروفیسر محمد رضا کاظمی اور عین الرضا نے بھی گراں قدر مقالے پیش کیے۔

آل محمد رزمی نے اپنے مقالے میں کہا:

"علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب ہماری قوم کے خوش قسمت ترین
مفکر و دانشور ہیں جنہیں اپنے فکری خواب و تعبیر کی حدوں تک
پہنچانے کا موقع خود ان کی زندگی میں مل گیا اور دنیا بھر کے ارباب
دانش کو ان کے فکر وفن کے مختلف گوشوں کو نئے زاویوں سے پرکھنے کا
موقع ملا۔"

اس محل پر راقم الحروف کو یہ عرض کرنے میں دلی مسرت محسوس ہو رہی ہے کہ جناب ضمیر اختر نقوی کو تمام صاحبان علم و کمال "علامہ" کے لفظ سے یاد کر کے ان کی مرتبہ شناسی اور اپنی حقیقت پسندی کا ثبوت فراہم کرتے رہنے میں ایک ذرا سے کو بھی اس لیے تکلف سے کام نہیں لیتے کہ علامہ موصوف نے اپنے دینی و علمی، ادبی و تحقیقی ہزاروں صفحات پر محیط کارناموں سے اور بہت مختصر سے عرصے میں پاک و ہند کی مذہبی، ثقافتی، اور ادبی دنیا کو ساحرانہ انداز میں اپنی طرف متوجہ کر لیا ہے۔ اس لیے انصاف کی بات یہ ہے کہ وہ "علامہ" کہے جانے کے بالکل اسی طرح مستحق ہیں جس طرح دنیا کے اہل

کمال اور صاحبانِ علم نے علامہ حلّی، علامہ جارچوی، علامہ آرزو، علامہ طالب جوہری اور علامہ رضی جعفر صاحب کو "علامہ" مانا ہے۔

اور آخر میں یہ بھی عرض کیا جاسکتا ہے کہ جناب قسیم ابنِ نسیم امروہوی کا مسدس اپنے مقصد میں ایک کامیاب منظومہ ہے۔ جس میں علامہ ضمیر اختر نقوی کے تمام ادبی کارنامے ریکارڈ ہو گئے ہیں۔ جناب قسیم ابنِ نسیم امروہوی کے مسدس کو دیکھنے سے یہ اندازہ کر لینا آسان ہے کہ وہ اپنے رنگ کے آپ مالک ہیں اور نسیم امروہوی کا انداز گویائی قسیم ابنِ نسیم کے طرزِ فکر و اندازِ گویائی سے بالکل مختلف چیز ہے:

اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ

جنابِ ابنِ نسیم نے "اعتراف و تحسین" (مسدس) کے آخری بند میں مسدس کی تاریخ تصنیف بھی کہی ہے اور وہ بند یہ ہے:

اے قسیم! اب سفرِ خامہ کرو ختم یہیں حرفِ آخر ہو وہ مقطع نظر آئے جو حسیں
بیت کا دوسرا مصرع ہو نشانِ تمکیں جس سے تاریخ برآمد ہو برائے تحسیں
ایک آئینۂ اوصافِ نسب ہیں یہ ضمیر
اک خطیب، اہلِ قلم، اوجِ ادب ہیں یہ ضمیر

شیرِ ہندوستان مولانا طاہر جرولی

"مجھے کلکتے کے مومنین نے "شیرِ ہندوستان" کے خطاب سے نوازا ہے لیکن مومنین نے ضمیر اختر نقوی کو ضیغمِ پاکستان کا خطاب عطا کیا۔ یہ شیر مجھ سے زیادہ بہادر اور شجاع نکلا۔"

شفیع عقیل:

نقد و نظر

روزنامہ "جنگ" کراچی
کے تبصرے سہ ماہی "القلم" پر

روزنامہ جنگ، کراچی
اتوار ۱۹/ جولائی ۱۹۹۸ء

"القلم"

مدیر...... سید ضمیر اختر نقوی

صفحات...... ۲۵۰، قیمت...... دو سو پچاس روپے

علامہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب کا نام اردو کے رثائی ادب کی تحقیق میں معتبر ہے۔ انھوں نے اس موضوع پر بڑا کام کیا ہے۔ خاص طور پر میر انیس اور ان کے خاندان کے شعرا کے سلسلے میں انھوں نے جو تحقیق کی ہے اسے علمی و ادبی دنیا میں بہت سراہا گیا ہے۔ حالیہ دنوں میں انھوں نے "القلم" کے نام سے ایک سہ ماہی رسالہ جاری کیا ہے جس میں رثائی ادب پر مشتمل منثور و منظوم تحریریں شامل ہیں۔ لکھنے والوں میں بعض معروف نام ہیں اور پیش نظر "القلم" کا دوسرا شمارہ ہے جو کتابی سائز میں چھپا ہے۔

روزنامہ جنگ، کراچی

جمعرات ۲۷/ جنوری ۲۰۰۰ء

"القلم"

مدیر اعلیٰ...... سید ضمیر اختر نقوی

قیمت...... دو سو پچاس روپے

"القلم" سہ ماہی جریدہ ہے جو رثائی ادب کے لئے مخصوص ہے اور اگرچہ ابھی تک اس کے چار شمارے شائع ہوئے ہیں لیکن اس کم عرصہ میں بھی اس نے مرثیہ نگاروں اور مرثیہ نگاری کے علاوہ رثائی ادب پر قابل مطالعہ مواد شائع کیا ہے۔ حال ہی میں "القلم" کا چوتھا شمارہ شائع ہوا ہے جس کا زیادہ حصہ ایک ممتاز علمی شخصیت سید ظہیر حسن نقوی مرحوم کے لئے وقف ہے جو پرچے کے مدیر جناب علامہ سید ضمیر اختر نقوی کے والد محترم تھے اور عمو جان کے نام سے مشہور تھے۔ مختلف مضامین میں مرحوم کی علمی شخصیت کے بارے میں لکھا گیا ہے اور منظومات میں انھیں خراج محبت وعقیدت پیش کیا گیا ہے۔ دوسرے حصے میں دیگر مضامین بھی ہیں جن میں "اردو مرثیہ اور میر انیس" کے عنوان سے ایک مذاکرہ کی روداد بھی شامل ہے جو پروفیسر ڈاکٹر شارب ردولوی کی کراچی آمد کے موقع پر منعقد کیا گیا تھا۔

پروفیسر ڈاکٹر سید جعفر رضا

(سابق صدر شعبہ اردو الٰہ آباد یونیورسٹی)

تہذیبی ورثہ کی حفاظت و فروغ

بشرف ملاحظہ علامہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب

محترمی، تسلیم!

''القلم'' کی بزم میں شمولیت کے خیال سے ایک مقالہ ارسال خدمت کر رہا ہوں۔ پسند آئے تو شامل اشاعت کرلیں۔ شکریہ

آپ تک رسائی کے لئے میرے پاس تین ذرائع رہے ہیں۔ آپ کے استاد ڈاکٹر کاظم علی خاں، جو محض اس خطا پر کہ میں ان کی پی ایچ۔ ڈی۔ کا نگراں تھا، مجھے استاد کہتے اور لکھتے ہیں۔ میں حالانکہ انھیں ان کے وقیع تحقیقی کارناموں کی بنا پر استاد الاساتذہ مانتا ہوں ان سے آپ کی تعریف و توصیف سنتا رہتا ہوں۔ دوسرے برادرم پروفیسر شارب ردولوی جو آپ کے زبردست مداح ہیں۔ ان سے آپ کی گراں قدر تصانیف مطالعہ کے لئے ملتی رہیں، چونکہ میں نہایت سعادت مندی سے کتابیں واپس کرتا رہا ہوں، اس لئے ان سے آپ کی بیشتر کتابیں پڑھنے کو ملیں۔ یہ کتابیں رسائی کا تیسرا ذریعہ تھیں۔ اب ''القلم'' چوتھا ذریعہ ہوگا۔ ''القلم'' کا دوسرا شمارہ ملا تھا، ایک دوست مانگ کر لے گئے، بہت کہنے پر بھی واپس نہیں ملا۔ اب چوتھا شمارہ ملا۔ اگر باقی شمارے مل جاتے تو خصوصی عنایت ہوتی۔ آپ کی کتابوں میں محض ایک کتاب ''اردو

مرثیہ پاکستان میں" میرے پاس ہے۔ باقی کتابیں بھی حوالہ کے لئے اپنے پاس رکھنا چاہتا ہوں، خاص طور پر "خاندان میر انیسؔ کے نامور شعرا" مرثیہ کی تاریخ پر ایک کتاب لکھ رہا ہوں، اس میں کام آئے گی۔ اگر آپ کی مرثیہ سے متعلق تمام تصانیف قیمتاً بھی حاصل ہو سکیں تو مضائقہ نہیں۔ کیا اس کی کوئی صورت پیدا ہو سکتی ہے۔

ایوان غالبؔ دہلی میں نادرات کے ذخیرہ میں آپ کا عطا کردہ تحفہ امام ضامن آپ کے نام سے محفوظ کیا گیا ہے۔ دیکھا تو آپ سے عقیدت مندی پیدا ہوگئی۔ یہ تحفہ ہمارے تہذیبی ورثہ سے وابستگی کی خوبصورت علامت ہے۔ اردو مرثیہ شعری و تخلیقی جواہر پارہ ہونے اور اعلیٰ اخلاقی اقدار کا ترجمان ہونے کے علاوہ ہمارے تہذیبی ورثہ کا امانت دار بھی ہے، جو برِّ صغیر ہندو پاک کو انسانیت، اخوت اور خودداری کا پیغام دیتا ہے۔ اس تہذیبی ورثہ کی حفاظت و فروغ کے لئے پاکستان میں آپ حضرات قابل قدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔ آپ کے کارنامے مختلف الابعاد ہیں، ان کی خصوصی اہمیت و معنویت ہے۔ یقین ہے کہ "القلم" ان میں مزید وسعت کرے گا۔

ڈاکٹر پروفیسر منظر کاظمی

"ضمیر اختر نقوی مجھے صرف اس لئے پسند ہیں کہ میں نے ان کی شخصیت میں جو بالغ النظری، دانش مندی، قوتِ ایمانی، جرأت اور حقیقت پسندی کا امتزاج دیکھا ہے وہ اس دورِ جدید میں عنقا ہے۔"

ڈاکٹر سیادت نقوی

(صدر شعبۂ اردو ہندو کالج (امروہہ، بھارت)

ہمہ جہت رسالہ

مکرمی و محترمی ضمیر اختر صاحب دام فضلہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوگا۔ کافی عرصہ ہوا کہ ایک مرتبہ جناب سے امروہہ میں نیاز حاصل ہوا تھا۔ اس کے بعد وقتاً فوقتاً جناب والا کی ادبی و مذہبی سرگرمیاں بھی معلومات میں آتی رہی ہیں۔ جن میں بطور خاص "العلم" جریدے کا اجرا لائق مبارکباد ہے۔

کافی عرصے پہلے یہ معلوم ہوا تھا کہ آپ نے "العلم" کے عنوان سے ایک وقیع جریدہ نکالنا شروع کیا ہے۔ جس کی زیارت کا اشتیاق اسی وقت سے دل میں تھا بحمد اللہ اب بھائی محسن کے ذریعے وہ جریدہ نظر نواز ہوا۔ خدا ان کا بھلا کرے۔ "العلم" کے متعلق جیسا سنا گیا تھا واقعتاً اسے ویسا ہی پایا۔ بہترین گٹ اپ، دیدہ زیب سرورق ہونے کے ساتھ جیسا کہ سرورق پر "علمی، ادبی، ثقافتی اور تحقیقی جریدہ" جلی حروف میں تحریر کیا گیا ہے اندر بھی آپ نے اپنے اس اعلان کو پوری طرح نباہنے کی کوشش کی ہے اور اپنے سلیقے سے زندگی سے متعلق ان اہم موضوعات کو کافی حد تک وقیع بنانے کی سعی فرمائی ہے۔ ہر موضوع پر وقیع اور معلومات افزا مضامین کا ذخیرہ جمع کرکے اپنے رسالے کو پوری طرح ہمہ جہتی سے آراستہ کردیا ہے۔ جس کے لئے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا

کہ آپ کی یہ کوشش یقیناً سعی مشکور کہلانے کی مستحق ہے۔ جریدے کی موجودہ صورت حال کے پیش نظر مستقبل میں اس سے بہتر صورت کی توقع کرنا کس طرح بے جا نہیں۔

اسی سے میری معلومات میں یہ اہم اور قابل قدر اضافہ بھی ہوا کہ ہمارے بھائی چمن جو کل تک صرف زبانی جمع صرف کرنے کے عادی تھے اور اپنے حسین وخوبصورت فقروں سے احباب کی محفلوں کو وقتی طور پر زعفران زار بناتے رہے تھے "القلم" کے ذریعے صاحب قلم بھی ہو چکے ہیں اور تقریری کیفیتوں کے وقتی وجمعی تاثر کو جو کل تک حلقۂ احباب تک محدود تھا ضبط تحریر میں لاکر عام ادبی حلقوں کو مستفید ہونے کے مواقع فراہم کررہے ہیں جس میں آپ کی سرپرستی کو بڑا دخل ہے۔ "اللہ کرے زور قلم اور زیادہ"۔ ان کے مضامین میں زبان کے چٹخاروں کے ساتھ سماج کی اس عام زندگی سے متعلق بھی کچھ نہ کچھ ایسی باتیں ضرور سامنے آتی ہیں جس پر اعلیٰ اور درمیانی طبقے کی نگاہ عموماً نہیں پہنچ پاتی ہے۔ اگرچہ ترسیل میں کہیں کہیں ابہام پیدا ہو جاتا ہے جس کا ہونا لازمی امر ہے۔ بہر طور یہ کوشش بحیثیت مجموعی ایک مستحسن اور قابل فخر کوشش ہے اس لئے کہ وہ لوگ جو مختلف موضوعات ذہن میں رکھتے ہیں لیکن قلم ہاتھ میں لیتے ہوئے ڈرتے ہیں ان لوگوں میں قلم چلانے کی ہمت پیدا کرنے کے لئے یہ زبردست تحریک بن سکتی ہے جس کے لئے بھائی چمن کم اور آپ زیادہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

علاوہ ازیں موصولہ کتب کے سلسلے میں عشرۂ محرم کی مصروفیات کے سبب ابھی اظہار خیال نہیں کرسکتا ان کتب پر سرسری طور پر کچھ کہنا اپنی دیانت داری کے منافی سمجھتا ہوں۔ انشاء اللہ بہت جلد مستقبل قریب میں "میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال" جو آپ کی ایک نادر تحقیق ہے اس کا بالاستیعاب مطالعہ کرنے کے بعد اپنی تفصیلی رائے پیش کروں گا۔

میری کتاب ''گفتہ غالب'' جو غالب پر چند مضامین کا مجموعہ ہے جسے غالب انسٹیٹیوٹ نئی دہلی نے شائع کیا ہے اس کا ایک مسودہ ہمرشتہ ارسال کر رہا ہوں جسے آپ اگر مناسب خیال فرمائیں بحیثیت مجموعی کتابی صورت میں شائع فرمادیں ورنہ ''اقلم'' میں اس کے مضامین شائع کر سکتے ہیں۔

آئندہ بھی میرا تعاون ''اقلم'' کے سلسلے میں برقرار رہے گا۔

شاہین اکرام (لاہور)

قبلہ محترم ڈاکٹر ضمیر اختر صاحب.....السلام علیکم!

کاش اب کے برس میری بدقسمتی خوش بختی میں بدل جائے اور میرے بے حد محترم ڈاکٹر صاحب سے شرف ملاقات نصیب ہو جائے کیونکہ اب حسن بھائی نہیں ہیں جو یہ بات جانتے تھے کہ شاہین ڈاکٹر صاحب سے کتنی الفت رکھتی ہے اور ہر دم ان کی تعریف کرتے کن گاتے تھکتی نہیں ہے اور میں ہمیشہ ان سے کہتی تھی کہ میری ملاقات ان سے کروائیں ایک دفعہ کچھ برس پہلے حسن بھائی نے مجھ سے کہا کہ صبح اس بجے آ جاؤ میں اپنے شوہر کے ساتھ آئی پاس میں ماجد رضا بیٹھے تھے اور آپ سو رہے تھے کچھ دیر آپ کے جاگنے کا انتظار کرتے رہے پھر میں نے مناسب نہ سمجھا کہ سوتے ہوئے انسان کی نیند خراب کی جائے۔ حسن بھائی بھی مایوس ہوئے پھر مجھ سے نہ آیا گیا۔ خیر... میرا دل بہت خوش ہوتا ہے جب آپ منبر پر تشریف لاتے ہیں اور خاص طور پر حسن بھائی کے لیے فاتحہ کے لیے فرماتے ہیں۔ خدا انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین۔ ہمیشہ کی طرح اب کے برس بھی آپ کی ہر تقریر بہت پُر اثر ہے اور آپ کی تقریر کا انداز بہت اچھا ہے آپ کو سننے کے بعد میرے دل میں کسی اور کو سننے کی خواہش پیدا نہیں ہوتی۔ ہر کسی سے کہتی ہوں کہ آپ کی تقریر سنا کرے بہت ٹھوس دلائل ہوتے ہیں اور آپ کی تقریر میں ہر لفظ میں موتی پروئے ہوئے ہوتے ہیں بہت اچھی باتیں بتاتے ہیں آپ۔ مختصر میں یہ کہنا چاہتی ہوں کہ آپ کی بہت قدردان ہوں اور آپ بہت great اسکالر ہیں۔ آپ نے ایک دفعہ میرا خط قصر بتول شاداماں میں پڑھا تھا اس میں میں نے آپ کو بتایا تھا کہ میں اپنا سب کچھ چھوڑ کے آپ کی مجلس سننے کے لیے آ جاتی ہوں۔ خدا سے آپ کی صحت اور درازی عمر کی دعا گو ہوں۔ آپ ''جن'' کے Topic پر بہت اچھی تقریر فرماتے ہیں۔ آپ جتنی دفعہ بھی اس پہ تقریر فرماتے ہیں ہم بور نہیں ہوتے۔ اک سماں بندھ جاتا ہے

سیّد ظہور مہدی

جریدہ القلم پر تاثرات

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی قوم کے ادیب، شاعر، دانشور اور عالم اس قوم کی شناخت کا مظہر ہوا کرتے ہیں۔ ان کی تخلیقات ان کے فکر و عمل کی آئینہ دار ہوتی ہے جس سے قومیں استفادہ کرتے ہوئے اپنے مستقبل کی راہیں متعین کرتی ہیں۔ دراصل ایسی شخصیتیں قوموں کی رہنمائی اور رہبری کا فریضہ انجام دیتی ہیں اور ان کا شمار قوم کے محسنوں میں ہوا کرتا ہے اور انھیں ہمیشہ یاد کیا جاتا ہے۔

ہماری تاریخ میں ایسے محسنوں کو ہمیشہ عزت و وقار کی نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور ان کے کارناموں کو شہرت دوام حاصل رہتی ہے۔ جنھوں نے اپنے تبحر علمی اور بصیرت سے قوموں کی تعمیر و تشکیل میں اہم کارنامے انجام دیئے اور یہ سلسلہ آج بھی جاری و ساری ہے۔

اسی طبقہ علم و دانش کی ایک ممتاز شخصیت ہمارے ممدوح جناب علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی صاحب ہیں جن کی علمی و ادبی اور قومی خدمات پر بجا طور پر فخر کیا جاسکتا ہے۔ علامہ صاحب کی خدمات برسوں پر محیط ہیں۔ آپ نے اپنی علمی و ادبی تخلیقات سے فکر و شعور کو بیدار کرنے اور معاشرتی قدروں کا احیا کرنے کے لئے ایسے موضوعات کا انتخاب کیا ہے جو اسلامی طرز حیات کے فروغ کا ذریعہ ہیں۔ ایسے دور میں جبکہ پاکیزہ علم و ادب کا فقدان ہو رہا ہو اور قلم کے تقدس کو پامال کیا جا رہا ہو، ایسا ادب تخلیق

کرنا جس سے قوم و نسل کی تفریق کو ختم کیا جا سکے اور نوجوانوں میں ادب عالیہ کا شعور بیدار کیا جائے، بڑی ہمت، قربانی اور حوصلے کی بات ہے اور یہی آپ کا ایسا کارنامہ ہے جو جہاد فی القلم کے مترادف ہے۔ آپ نے قومی شاعروں، ادیبوں اور عالموں کے کارناموں کے ان گوشوں کی نقاب کشائی کی ہے جو ماضی کی یادگار بن کر رہ جاتے اور ممکن تھا کہ کم علمی کی بنا پر تعصب اور تنگ نظری کا شکار ہو جاتے۔ آپ کی تخلیقات نے شعور اور فکر کی اعلیٰ قدروں کو قومی مزاج میں ڈھالنے کی ہر ممکن جدوجہد کی ہے جو بلاشبہ ایک ایسا کارنامہ ہے جس کے لئے ایک ادارے کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ بحمد اللہ! علامہ صاحب کو اللہ تعالیٰ نے وہ صلاحیت عطا کی ہے جس کی بدولت وہ اپنی ذات میں خود ایک ادارہ بن گئے ہیں جس کے اثرات ہر صاحب فکر و عمل کو محسوس ہو رہے ہیں۔ یہ ایسی قابل قدر قومی خدمت ہے جس پر علامہ صاحب کو خراج تحسین پیش کرنا چاہیے۔ وہ یقیناً ہمارے ہادیٔ برحق نبی آخر الزماں محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قول پر عمل پیرا نظر آتے ہیں کہ ''علم مومن کی گم شدہ میراث ہے، جہاں سے ملے اسے حاصل کرو''۔ علامہ ضمیر اختر نقوی اپنی تخلیقات سے یہی متبرک فریضہ انجام دے رہے ہیں اور ''القلم'' کی اشاعت بھی انھیں خصوصیات کی آئینہ دار ہے۔ ہماری دعا ہے کہ علامہ صاحب اور ان کے رفقائے کار اپنے مشن میں کامیاب ہوں اور آپ کی صلاحیتوں میں روز افزوں اضافہ ہو۔ مجھے امید ہے کہ علمی و ادبی حلقوں میں ''القلم'' کی پذیرائی ہوگی اور آپ کی تخلیقات سے قوم استفادہ کرے گی۔

گزشتہ شمارے ''القلم'' میں اردو نعت گو شعرائے قدیم و جدید پر مختصر روشنی ڈالی گئی ہے اور اسے سب سے بڑی صنف سخن قرار دیا گیا ہے، کیونکہ اس کا مرکز و منبع حضور ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ذات گرامی ہے جو محبوب خدا اور دونوں جہاں میں اول و

آخر اللہ تعالیٰ کی صفات کا حقیقی مظہر ہیں۔

شاعر اہل بیتؑ میر مونسؔ کے حالات زندگی اور شاعری پر علامہ صاحب کا بصیرت افروز مقالہ یقیناً قارئین کی معلومات میں اضافے کا سبب بنے گا۔ ہمارے نوجوان ادیب و شاعر اہل بیتؑ جناب ماجد رضا عابدی نے مرثیے میں اشعار اور علامتوں کے حوالے سے ناخدائے سخن میر انیسؔ کے ایک مرثیے کا خوب صورت مطالعہ سپردِ قلم کیا ہے جو یقیناً مرثیہ گو حضرات کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ میر انیسؔ و مرزا دبیرؔ کے خاندان نے مرثیے جیسی مقدس صنف کو اپنے حقیقی جواہر پاروں سے آسمان جیسی رفعت عطا کی ہے۔ جس نے سامعین اور قارئین کو وہ شعور بخشا ہے جس سے اہل بیت علیہم السلام کے فضائل و مصائب کا صحیح ادراک ہوتا ہے اور جو ہمیں حق شناسی اور معرفت کی منزل تک پہنچاتا ہے۔

الحاج پروفیسر ڈاکٹر مظفر حسین کاظمی نے مصطفیٰ آباد کی تہذیبی، علمی اور مذہبی افکار سے لبریز اور معلوماتی تصویر پیش کی ہے جس سے اہل سخن ماہرین علم و فن، بذلہ سنج حضرات کی طبع رسا کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اس زوال پذیر معاشرے میں سادگی اور پاکیزگیٔ نفس کے ساتھ مصطفیٰ آباد کے لوگوں کی زندگی کے شب و روز کا بڑے خوب صورت انداز میں تذکرہ کیا گیا ہے۔ جس سے وہاں کے بزرگوں کا تشخص ابھر کر سامنے آتا ہے اور اس عہد کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جو تاریخ کا ایک اہم باب ہے۔

جناب آل محمد رزمی لائق تحسین ہیں جنھوں نے لکھنؤ پر انتہائی دل آویز، معنی خیز اور تاریخی نظم پیش کی ہے۔ موصوف کی اس تخلیق پر بالخصوص اہل لکھنؤ کو ہدیۂ تبریک پیش کرنا چاہیے کہ وہ یقیناً دبستانِ لکھنؤ کی پہچان ہیں اور ماشاءاللہ! صاحب عرفان ہیں۔ خدا موصوف کی توفیقات میں اضافہ فرمائے! جناب حامد جونپوری نے حضرت شہید

ثالث کا مرثیہ اپنی خوب صورت زبان و بیان کے مقدس تاروں میں تسبیح فاطمہؑ کے دانوں کو پرو کر اہل بیتؑ اطہار کے افکار و کردار کا مثالی مظاہرہ کیا ہے۔ پروردگار عالم موصوف کو اجر عظیم عطا فرمائے!

"اللہ کرے زور قلم اور زیادہ" آمین

سید حسن امام رضوی ایڈووکیٹ

۲۰ راگست ۱۹۹۵ء......کراچی

محترم جناب ضمیر اختر صاحب......السلام علیکم!

۲۰ راگست ۱۹۹۵ء کو ایڈووکیٹس فورم کی ایک ادبی نشست زیر صدارت سید حسن امام رضوی ایڈووکیٹ منعقد ہوئی اور میر انیس کے مرثیہ کو عنوان گفتگو بنایا گیا۔

سید ضمیر اختر نقوی صاحب کی مرثیہ نگاری اور خصوصاً میر انیس کی مرثیہ نگاری پر ان کی تحقیق ادبی تاریخ کا ایک باب بن چکا ہے۔

ایڈووکیٹس فورم کے محترم ممبران کی خواہش تھی کہ "خاندان میر انیس کے نامور شعرا" کے عنوان پر قلم اٹھا کر میر انیس کے خاندان کا تعارف "شجرہ نسب اور ان کے آباؤ اجداد کی جو تاریخ لکھی ہے وہ یقیناً ادبی حلقوں میں بہت ذوق وشوق کے ساتھ پڑھی جائے گی۔ ہمارے قابل احترام اراکین آپ کے مشکور ہوں گے اگر فورم کے اراکین کے خصوصی مطالعہ کے لئے ایک اعزازی کاپی "خاندان میر انیس کے نامور شعرا" کی عنایت کیا جائے۔ نوازش ہوگی۔

القلم (شمارہ۔۱) پر تبصرے

سبط محمد نقوی (لکھنؤ)

۲۵ر مارچ ۱۹۹۷ء

میر مونس مرحوم کے حالات لکھ اور چھاپ کے آپ نے ایک اہل قلم کے سر سے ایک بڑے قرضے کا بار اتارا۔ حضرت باری جزائے خیر سے مالا مال فرمائے! آمین۔ مضمون سیر حاصل ہے۔ اگلی فرصت میں مرحوم کے کلام پر بھی ایک جامع نظر......

اے برادر! تیری توفیق زیادہ ہوئے آمین۔ خداوند علیم آپ کی سربراہی میں مرکز علوم اسلامیہ اور اس کے مطبوعات و منشورات کو مقبولیت و مرجعیت ارزانی کرے! آمین۔

سید فیضی (اسلام آباد)

برادر عزیز سید ضمیر اختر نقوی! اسلام رحمت۔

امید ہے بہمہ وجوہ خیر و عافیت ہوگی۔ سہ ماہی "القلم" کا پہلا شمارہ جو آپ کی زیر ادارت مطلع شہود پر جلوہ گر ہوا ہے، نظر نواز ہوا۔ اس فیضی نوازی کا شکریہ! مرکز علوم اسلامیہ (پاکستان) کراچی کو بھی ضرورت لاحق تھی کہ زبان اردو رسولؐ و آل رسولؐ کے تذکار جلیلہ کی اشاعت کے لئے جو خدمات انجام دے رہی ہے، ان کی اشاعت کا سلسلہ برقرار رہے۔ آپ کی یہ سعی عنداللہ ماجور ہو کر رہے گی۔ اللہ آپ کی توفیقات میں

اضافہ کرے! ''القلم'' میں شائع شدہ جملہ مضامین نظم و نثر منفرد حیثیت کے حامل ہیں اور رسولؐ و آلِ رسولؐ کے محامد و مناقب سے ''القلم'' کی تزئین اس کے روشن مستقبل کی ضمانت ہے۔

ڈاکٹر کاظم علی خاں (لکھنؤ)

عزیزی الحاج سید ضمیر اختر صاحب نقوی! دعائیں۔

آپ کے سہ ماہی علمی، دینی اور ادبی جریدے ''القلم'' کراچی کا پہلا شمارہ (جنوری تا مارچ ۱۹۹۷ء) محب مکرم جناب پروفیسر نیر مسعود (لکھنؤ) سے چند ہفتے قبل ملا۔ پہلا شمارہ دیکھ کر بے اختیار دل سے آپ کے لئے بے شمار دعائیں نکلیں۔ آپ کے علمی، دینی اور ادبی کام میرے لئے دلچسپی اور مسرت کا باعث ہوتے ہیں۔ آپ میرے عزیز ترین شاگردوں میں جس نمایاں مقام کے مالک ہیں اس میں میرا کوئی شاگرد آپ کی ہمسری نہیں کرتا۔

''القلم'' کے پہلے شمارے میں میر مونس پر آپ کا مقالہ پسند آیا۔ کالج کے ایم۔ اے فائنل کے طلبہ و طالبات کو میر انیس کے خصوصی مطالعے کے سلسلے میں ایک PAPER تیار کرنا ہوتا ہے جس میں انیس اور ان کے معاصرین وغیرہ کے احوال و آثار کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے۔ مونس پر آپ کے مقالے کی زیراکس کاپیاں طلبا و طالبات کے لئے تیار کراؤں گا اور تقسیم کراؤں گا۔

سید علی احمد دانش آلِ میر انیس (لکھنؤ)

مکرمی!

جناب سید ضمیر اختر نقوی کی خدمت میں حقیر دانش سلام عرض کرتا ہے عرصہ ہوا

آپ کی خیریت سے محروم ہوں۔ آپ کی روانہ کردہ کتاب "خاندانِ انیس کے نامور شعرا" نیر مسعود صاحب سے مل گئی تھی۔ آپ نے بڑی محنت کر ڈالی اور ایک اچھا کام بھی ہو گیا۔ خدا آپ کو توفیقاتِ عالی عطا فرمائے! تبصرہ اس لئے ابھی نہیں لکھا کہ لوگ یہ نہ کہیں کہ اپنے خاندان والوں کی مدح سرائی کر رہے ہیں۔ آپ کی رائے کا منتظر رہوں گا۔

آپ کا بھیجا ہوا شمارہ نمبر۔۱ "القلم" مل گیا ہے۔ بڑا اچھا رسالہ نکالا ہے۔ اس کے تمام مضامین رثائی ادب کے شائقین کے لئے نعمتِ غیر مترقبہ ثابت ہوں گے۔ آپ کے مضمون سے مونس کے بارے میں کچھ نئی معلومات کا اضافہ ہوا۔

پروفیسر ظلِ صادق (کراچی)

برادر محترم قبلہ ضمیر اختر نقوی! آداب۔

آنجناب نے ازراہِ محبت "القلم" کا پہلا شمارہ اور عزیزی ماجد رضا عابدی کا مرثیہ بعنوان "نسلِ اشرف" ارسال فرمایا، وہ ہمیں مل گیا۔ دو خوشیاں گردن میں باہیں ڈالے ایک ساتھ نظر آئیں تو آنکھوں کو تابِ نظارہ نہ رہی۔

"القلم" کے بارے میں کیا عرض کروں۔ ہفت روزہ، ماہانہ، سہ ماہی اور ششماہی چھپنے والے زیادہ تر جریدے ایسے ہوتے ہیں کہ جن میں سب کچھ تو ہوتا ہے لیکن وہ ادب، علم، ثقافت اور تحقیق سے یکسر عاری ہوتے ہیں۔ "القلم" کا پہلا شمارہ دیکھ کر جی دل باغ باغ ہو گیا کہ اس "تہذیب گشتہ" دور میں ابھی آپ ایسی شخصیت موجود ہے۔ "جریدہ" کیا ہے گویا ایک ہمہ جہت مقالہ ہے جس میں "اردو نعت، ایک اجمالی جائزہ" "میر مونس کے حالات"۔ "انیس کے ایک مرثیے کا مطالعہ"، "مصطفیٰ آباد اور مرثیہ شہید ثالث" جیسے نوادرات موجود ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ آپ کی ادارت، سبحان

اللہ! ہاں یاد آیا۔ آپ نے "ماجد رضا عابدی" کے مرثیے "نسل اشرف" پر جو مقدمۂ زریں فکر تحریر فرمایا ہے اس میں الفاظ کا بہاؤ ایسا ہے جیسے بلندی سے چشمہ مسکراتا، گنگناتا، رسماتا اور اٹھکیلیاں کرتا ہوا مناظرِ فطرت کو اور بھی جاذبِ نظر و دل نشین و دل فریب بنا دیتا ہے۔ ہم نے چاہا کہ چند جملے آپ کے ہی انداز تحریر میں سپردِ قلم کریں۔

ملاحظہ کیجیے:

قبلہ ضمیر اختر نقوی صاحب! آپ کی مقفّیٰ و مسجّع عبارت عروس پیرہن پڑھ کر "رجب علی بیگ سرور" کو اتنا سرور ہوا کہ انھیں اپنی طرزِ نگارش صد حسن بے کیف نظر آنے لگی۔

رہے "محمد حسین آزاد"، سو وہ "ضمیر" کے ہاتھوں مجبور ہو کر "ضمیری اسلوب" کے اسیر ہو گئے:

جلوہ کو طور بھول گئے
جو تھا نزدیک و دور، بھول گئے
نثر پڑھ کر ضمیر کی صادق!
رنگ اپنا سرورؔ بھول گئے

یوسف کاظمی (ایڈووکیٹ، لاہور)

محترم علامہ ضمیر اختر صاحب! السلام علیکم۔

کچھ دن پہلے ایک سہ ماہی رسالہ "العلم" ملا۔ بہت شکریہ! مبارک باد قبول فرمائیں۔ اتنا اچھا رسالہ نکال کر آپ نے بڑا کام کیا ہے۔ خدا کرے کہ یہ جاری و ساری رہے! آپ کے ارشادات اور قلم سے مومنین تا دیر مستفید ہوتے رہیں۔

اقبال ظفر نقوی۔ فرزند مانی جائسی مرحوم (حیدرآباد، سندھ)

محترم جناب ضمیر اختر صاحب زاد لطفکم! اسلام مسنون۔

مزاج اقدس! پہلے تو رسالہ "القلم" کے اجرا کی مبارک باد قبول فرمایئے، پھر اس امر کا شکریہ کہ اس موقع پر آپ نے مجھ ایسے حقیر کو یاد رکھا۔ رسالے کا سرورق گو کہ بڑا سادہ ہے مگر پرکار ہے، آنکھوں کو بھلا لگا۔

جہاں تک معیار کا تعلق ہے تو جہاں آپ کا دخل ہو، وہاں کوئی غیر معیاری مضمون، نظم وغیرہ کا گزر ہو ہی نہیں سکتا۔

ڈاکٹر مرزا امام علی بیگ افسر (حیدرآباد، سندھ)

محترم سید ضمیر اختر نقوی صاحب! السلام علیکم و یا علی مدد۔

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ آپ کی طرف سے "القلم" سہ ماہی کی اعزازی کاپی ملی۔ پہلے شمارے میں جو آپ نے مضامین دیے ہیں، وہ قابل ستائش اور لائق دید و مطالعہ ہیں۔ پروردگار عالم بحق محمدؐ و آل محمدؐ آپ کو اس نیک مقصد میں کامیاب فرمائے!

شمشاد حسین رضوی (گلبرگ، کراچی)

مکرمی جناب ضمیر اختر نقوی صاحب اسلام مسنون۔

سہ ماہی "القلم" کا پہلا شمارہ مکرمی ظہور مہدی صاحب کے توسط سے مجھ تک پہنچا۔ شکریہ اس دور میں جبکہ علم و ادب کا قاری مفقود ہے، کسی ادبی پرچے کا اجرا خاصا تعجب انگیز ہے۔ آپ جس کو وکی پر کمربستہ ہوئے ہیں، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ کے جسم ناتواں میں یقیناً چیتے کا جگر ہے۔

ڈاکٹر نیر مسعود (لکھنؤ)

برادرم ضمیر اختر صاحب! آداب

آپ نے رسالہ بہت سلیقے سے نکالا ہے۔ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ پاکستان میں رثائیات پر سنجیدگی سے کام ہو رہا ہے۔

میر انیس پر آپ کی کتاب کا شدید انتظار ہے۔ اگر یہ شائع نہیں ہوئی تو کب تک اشاعت کی امید ہے؟

حاجی ممنون حیدر جعفری علیگ (گونڈہ، انڈیا)

جناب ضمیر بھائی! السلام علیکم۔

مزاج گرامی!

ضمیر بھائی احسن صاحب قبلہ کا میں علی گڑھ میں شاگرد رہ چکا ہوں جبکہ ڈاکٹر کلب صادق صاحب میرے ہم عصر رہے ہیں، لیکن اگر آج بھی مجھ سے کوئی سوال کرے کہ ممنون! تم سب سے زیادہ ذاکرین میں کس سے متاثر ہوئے تو میں صرف اور صرف ضمیر اختر صاحب کا نام لوں گا جو جسمانی حالت میں سب سے کمزور لیکن آواز اور صلاحیت کی دنیا کا سب سے بڑا شیر۔ خدا آپ کو سلامت رکھے!

اقبال کاظمی (کراچی)

محترم جناب سید ضمیر اختر نقوی صاحب

مدیر اعلیٰ "القلم"، کراچی۔

جناب والا! اسلام مسنون۔

مرکز علوم اسلامیہ کے زیر اہتمام علمی، ادبی، ثقافتی اور تحقیقی سہ ماہی جریدے

"القلم" کے اجرا پر مبارک باد قبول فرمایئے۔ یوں تو آپ اپنی ذاتی حیثیت میں بھی اور تنظیمی طور پر فروغ و ترویج مرثیہ کی کوششوں میں ابتدا سے ہی متحرک ہیں اور اس سلسلے میں آپ کی تصنیفات و تالیفات اور مختلف مواقع پر اہم تقریبات کا انعقاد اور دیگر اقدامات کو بڑی قدر کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے، مگر اب "القلم" کا اجرا فرما کر ایک اور تعمیری کام کا آغاز کیا ہے۔ مجھے قوی امید ہے کہ ادبی دنیا میں اس جریدے کو کھلے دل سے خوش آمدید کہا جائے گا۔ چونکہ عام ادبی رسالوں اور دیگر جریدوں میں مرثیے پر گفتگو نہ ہونے کے برابر ہے، اس لئے ایسے جرائد اور ادبی رسالوں کی واقعی بڑی اشد ضرورت ہے جو مرثیے کے لئے مخصوص ہوں تاکہ اس صنفِ سخن سے روایتی بے اعتنائی اور غفلت کا سدِ باب کیا جا سکے اور دل دادگانِ مرثیہ کے تسکینِ ذوق کا سامان میسر آئے۔ "القلم" کا جاری ہونا ایک فالِ نیک ہے۔ میں اپنی اور مرثیہ فاؤنڈیشن کی جانب سے "القلم" کو خوش آمدید کہتا ہوں اور پورے تعاون کا یقین دلاتا ہوں۔

رشید وارثی (کراچی)

گرامی قدر محترم سید ضمیر اختر نقوی صاحب!

السلام علیکم۔

سہ ماہی "القلم" کا پہلا شمارہ (جنوری، فروری، مارچ، ۱۹۹۷) موصول ہوا۔ یاد آوری اور اس کرم فرمائی کا شکریہ! جریدے کے اجرا میں غیر معمولی تاخیر کا سبب آپ کے بلیغ اداریے میں صراحت کے ساتھ بیان ہوا ہے۔ بہر حال "دیر آید درست آید" کے مصداق آپ کا یہ اقدام بہت خوش آئند اور لائقِ تحسین ہے۔ جریدے کے اجرا کے مقاصد کے بارے میں یہ جان کر خوشی ہوئی کہ "اس رسالے میں شامل مضامین کا تعلق خالصتاً ادبِ اہلِ بیتِ رسولؐ سے ہوگا اور یہ رسالہ رسولؐ (اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم)

وآلِ رسول (علیہم السلام) کے لئے اردو زبان کی خدمت کو اجاگر کرے گا"۔

افتخار عارف (اسلام آباد)

محترم و مکرم!

سلام و رحمت۔

سہ ماہی "القلم" موصول ہوا۔ یاد آوری کا بے حد ممنون ہوں۔ اس میں اکثر تحریریں میری دلچسپی اور پسند کی ہیں، سو آپ کے توسط سے فیض یاب ہوئے خداوند کریم ایمان و امن کے ساتھ اپنے حفظ و امان میں رکھے!

اردو نعت پر محترم و مکرم حفیظ تائب صاحب کا مضمون مختصر مگر ایک لحاظ سے بہت مفید ہے کہ اس میں نعتیہ کتب کی ایک فہرست فراہم کر دی گئی ہے۔ میر مونس پر آپ کے مضمون میں بہت سے باتیں ایسی ہیں جو پہلے میرے علم میں نہیں تھیں۔ آلِ محمد رزمی کی نظم "لکھنؤ" جناب رزمی کی لکھنؤ سے محبت کی غمازی کرتی ہے۔ غالباً اس نظم کو "القلم" میں مختصر کر کے شائع کیا گیا ہے۔ اشاریے میں مندرج بعض نام نظم میں نظر نہیں آئے، غالباً انتخاب نظم کے وقت اشاریے سے وہ نام خارج ہونے سے رہ گئے۔ کیا اچھا ہو کہ اس نظم کی ایک نقل مجھے بھجوا دیں۔

سید نصیر رضا رضوی (لکھنؤ، بھارت)

برادرِ معظم ضمیر اختر نقوی صاحب!

سلام علیکم و رحمت اللہ برکاتہ

ایک زمانے کے بعد آج توفیق نگارش میسر ہوئی ہے۔ کچھ ایسی معروفیات میں الجھا رہا کہ فوری خط نہ لکھ سکا، شرمندہ ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں۔ "اعتراف و

تحسین" (مسدس) ملاحظہ کر یا یقین کیجئے وہ آپ اور آپ کے خلوص ومحبت اور یاد آوری کو کسی حال میں بھی فراموش نہیں کرسکتا۔ مجھے "القلم" کے اجرا کا علم نہ تھا۔ اس رسالے کے معیاری پہلے شمارے کے مطالعے سے محروم ہوں جس کے دیکھنے کا ہنوز اشتیاق ہے لیکن دستیاب نہ ہوسکا۔

دوسرا شمارہ نظر نواز ہوا، انتہائی محنت سے مرتب کیا گیا، دلچسپ مضامین سے مملو ہے۔ امید ہے کہ آپ آئندہ بھی اسی طرح کے معیاری رسالے نکالتے رہیں گے۔ یہ شمارہ واقعی ایک دستاویز ہے اور آنے والی نسلوں کے لئے نشانِ منزل ثابت ہوگا آپ نے اپنی ذات گرامی سے ایسا نایاب اور نادر تحفہ شائع کیا۔ واللہ! اس کی اشاعت نے اردو کے ادبی اور تحقیقی حلقوں میں فکر کے نئے دریچے وا کیے ہیں اور یہ شمارہ پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا اور بڑے انہماک، ذوق وشوق سے پڑھا جائے گا۔ اردو کا اتنا معیاری رسالہ نکالنے پر آپ قابلِ مبارک باد ہیں۔ بہر حال رسالہ القلم کی قدر وقیمت یا اس کے معیار پر گفتگو فضول ہے۔ اس کی اہمیت تو اس بات سے قائم ہوگئی کہ رسالہ آپ کی ادارت میں نکل رہا ہے جو آپ کی دینی، علمی، ادبی وتحقیقی بصیرت کا غماز ہے اور ادارے میں برادر عزیز جناب ڈاکٹر ماجد رضا صاحب کی رفاقت بھی شامل ہے۔ خدا آپ کو کامیاب بنائے! مجھے یقین ہے کہ آپ کی شخصیت واقعۃً ملک وقوم کے لئے سرمایۂ ناز ثابت ہوگی۔

سیّد حسن عباس

مرکز تحقیقات اردو، فارسی، گوپال پور، بہار، بھارت

بخدمت شریف جناب علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب

السلام علیکم

بعد از سلام عرض خدمت یہ ہے کہ "القلم" کا ایک (پہلا شمارہ) شمارہ استاد محترم جناب پروفیسر نیر مسعود صاحب (لکھنؤ) نے عنایت فرمایا تھا اور حکم دیا تھا کہ کچھ آپ کو ضرور بھیجوں۔ چوں کہ میرا موضوع بھی مرثیہ ہی ہے اور میں نے بہار میں اردو مرثیہ نگاری پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی ہے لہٰذا مرثیہ سے متعلق تحریریں آپ کی خدمت میں روانہ کرتا رہوں گا۔ سردست "منظر عظیمی کی شاعری" ارسال خدمت ہے اگر "القلم" میں شامل فرمائیں تو ممنون رہوں گا۔

آپ سے مخاطب ہوتے ہوئے بے حد خوشی محسوس کر رہا ہوں۔ آپ کی صرف دو کتابیں میرے پاس ہیں ایک "اردو مرثیہ پاکستان میں" دوسری "خاندان انیس کے نامور شعرا" اگر ممکن ہو تو مرثیوں سے متعلق اپنی دیگر تحقیقات سے بھی سرفراز فرمایئے، استاذی نیر مسعود صاحب سے اس ماہ میں معلوم ہوا کہ اب تک "القلم" کے چار شمارے شائع ہو چکے ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ پہلے شمارے کے علاوہ دیگر شمارے مجھے بھجوا دیں تاکہ میں بھی ان سے استفادہ کرتا رہوں۔

القلم (شمارہ ۲) پر تبصرے

رئیس احمر (اسلام آباد)

مکرمی و محترمی علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب!

مزاج گرامی قدر۔

آپ کا ادبی جریدہ القلم شمارہ نمبر ۲ موصول ہوا۔ ذرہ نوازی کا شکریہ ادورنہ میں کہاں اس قابل کہ آپ کی ادبی کاوش پر کوئی رائے دے سکوں۔ پہلا شمارہ مجھے نہیں ملا۔ اس شمارے کا مطالعہ میں نے بڑے شوق سے کیا۔ میری ناقص رائے میں اب تک چھپنے

رسائل بابت رثائی ادب شائع ہوئے ہیں، ان میں آپ کا جریدہ میرے لئے خاصا سودمند ثابت ہوا۔ ویسے تو مجموعی طور پر ہر مضمون جو اس میں شامل ہے، وہ اپنی اپنی جگہ ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔

حنیف اسعدی (کراچی)

محترم سید ضمیر اختر نقوی صاحب!

القلم شمارہ نمبر ۲ موصول ہوا۔ مجھے مسرت ہے کہ آپ نے مجھے یاد رکھا، میں شکر گزار ہوں۔ اللہ آپ کو اپنے مقاصد میں کامیاب کرے!

میں نے پرچہ پڑھا۔ معیار و موضوعات کے اعتبار سے یہ ایک اہم دستاویز ہے۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ خریداری کی استطاعت نہیں، بس اسی پرچے کو حرزِ جاں بنا کر رکھوں گا، اس لئے کہ اس میں اہم علاقوں کے سرداروں (سیدوں) کے تذکرے ہیں۔

سید ممنون حیدر جعفری (علیگ) (اترولہ، گونڈہ، یو پی، بھارت)

جناب ضمیر بھائی قبلہ!

سلام علیکم۔

آج سے ٹھیک بارہ (۱۲) برس قبل دورانِ عمرہ آنجناب سے ملاقات ہوئی تھی۔ میدانِ عرفات و منیٰ میں جناب کی مجلس بھی سنی تھی اور پھر عشرہ بھی جدہ میں سنا۔ کچھ آپ کے معزز میزبان پروفیسر سید ... صاحب کی مہربانی تھی کہ اس عشرے کی مجلس کا ٹیپ مل گیا تھا جو بحمد اللہ! آج بھی ہمارا قیمتی سرمایہ بنا ہوا ہے، حالانکہ چلتے چلتے وہ تھک گیا، سننے میں ہرگز نہیں تھکا میں اکثر دوستوں کی محفل میں کہا کرتا ہوں کہ پاکستان نے کچھ دیا یا نہیں، یہ الگ بحث ہے لیکن پاکستان نے ضمیر اختر نقوی جیسا

ذاکر ضرور دیا جس کو میں نے باہر دیکھا اور سنا ہے۔ لگتا ہے نہ دل بھرے گا اور نہ سیری ہوگی۔ وہی حال آپ کی مجلسوں کا ہے۔ میرے زیادہ تر دوست سنی اور وہابی ہیں لیکن پڑھے لکھے ہیں جو آپ کی تقریر کو بہت پسند کرتے ہیں۔ میرے عزیز! خدا آپ کو سلامت رکھے۔ میں اپنی حیات کے چند سال یعنی (۵) سال آپ کو وقف کرتا ہوں، وہ مولا میری حیات میں کم کردیں اور ضمیر اختر کی حیات میں بڑھا دیں تا کہ وہ ذکر حسین کا پرچم بلند کرتا رہے (آمین ثم آمین!) کس قدر آپ کو دیکھنے اور آپ کی قربت کی خواہش ہے! میں لکھنؤ میں ایک ہفتے ہوٹل میں بلاوجہ پڑا رہا۔ آپ کی زیارت نہ ہوسکی اور نہ آپ کی مجلسوں کے کیسٹ حاصل کرسکا علاوہ دو عدد کے۔

ڈاکٹر پیکر جعفری (لکھنؤ بھارت)

محترم و معظم علامہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب قبلہ!

السلام علیکم، مزاج اقدس۔

آپ نے ہر بار کی طرح اس بار بھی لکھنؤ تشریف لاکر لکھنؤ والوں پر احسان کیا ہے آپ کی یاد کے گہرے نقوش قرطاس دل پر نور افشانی کرتے رہتے ہیں۔

آپ جس طرح تحقیق کا کام انجام دے رہے ہیں، یہ آپ کا حصہ ہے۔ تحریر و تقریر پر یکساں قوت اظہار ذرا کم لوگوں کو نصیب ہوتی ہے۔ پروردگار نے آپ کو دونوں صفتوں سے مالا مال فرمایا ہے۔

قیصر نجفی (کراچی)

مکرمی سید ضمیر اختر نقوی صاحب!

السلام علیکم۔

گزشتہ اتوار کو روزنامہ جنگ میں آپ کے سہ ماہی رسالے "القلم" پر شفیع عقیل صاحب کا مختصر سا تبصرہ نظر سے گزرا اور آپ کی ایک نئی ادبی کاوش کی نوعیت و اہمیت سے آگاہی ہوئی۔ رثائی ادب کے حوالے سے آپ کی خدمات قابلِ تحسین ہیں۔ میں آپ کے نام اور کام سے واقف ہوں۔ ماشاءاللہ!

سید شباب نقوی (قم، ایران)

بخدمت اقدس علامہ ضمیر اختر نقوی قبلہ دام ظلکم العالی

سلام علیکم!

بعد از سلام، امید قوی ہے کہ آپ ہر طرح خیر و عافیت سے ہوں گے اور ہم بھی ایام عزا و تعطیل گزار کر انڈیا سے معصومۂ قم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ کراچی میں آپ کی زیارت کا شرف حاصل ہوا، مختصر ملاقات لیکن مفید ملاقات رہی۔ انڈیا میں مختلف مقامات پر آپ کا ذکرِ خیر ہوتا رہا۔ اردو ادب میں آپ کا وجود نعمتِ عظمیٰ سے کم نہیں۔ جب بعض ناواقف آپ کے قصائد ہماری زبانی سن کر تعجب کرتے ہیں تو دل چاہتا ہے کہ ان کو ادب کے دائرے سے خارج کر دیا جائے۔

سیّد علی احمد دانش (میر انیس ہاؤس لکھنؤ)

۲۲ر رمضان المبارک ۱۴۱۹ء

محترم الحاج سید ضمیر اختر نقوی صاحب

السلام علیکم!

امید ہے بفضل تعالیٰ آپ اور گھر کے تمام افراد بخیر و عافیت ہوں گے۔ آپ کے جانے کے بعد "القلم" کا دوسرا شمارہ مولانا مصطفےٰ صاحب سے مل گیا۔ یہ شمارہ بھی بے

اعتبار مضامین بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ مولانا مرزا محمد اشفاق کی قصیدہ گوئی پر مضمون بے حد پسند آیا۔ آپ نے حق ادا کر دیا۔ نصیر ترابی کے مضمون کے جواب میں آپ کا مضمون "رثائی ادب" کے انیس نمبر میں بڑے غور سے پڑھا۔ بس کیا کہوں یہاں ہوتے تو ہاتھ چوم لیتا سوائے واہ واہ سبحان اللہ کے کیا لکھوں۔ خدا آپ کو زودہ صحت رکھے۔

کوثر الہ آبادی (کراچی)

۲۳، مارچ ۱۹۹۹ء

محترم علامہ صاحب تسلیمات

امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

آپ کے جریدے کے متعلق کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ آپ کا نام ہی رسالے کے معیار کی ضمانت ہے۔ اس میں خطوط اور ان کے جواب کا سلسلہ ہی ایسا ہے جو مجھ جیسے کم سوادوں کے علم میں اضافے کا باعث بنے گا۔

سید زوار حسین شاہ (بہاولپور)

۳۱، مارچ ۱۹۹۹

محترم قبلہ نقوی صاحب سلام مسنون!

آپ کی علمیت اور حد درجہ دل آویز شخصیت سے متاثر نہ ہونا کور علمی اور بد ذوقی کی بین دلیل ہے۔ سو میں آپ کا مداح ہوں۔ میں جناب نسیم امروہوی کی شخصیت اور فن پر تحقیقی کام کا آغاز کر چکا ہوں۔ حسب وعدہ ان کے غیر مطبوعہ مراثی اور دوسرا تخلیقی کام جو صرف آپ کے پاس ہے عنایت فرمائیں۔ آپ کے خطوط جو "القلم" میں نظر آئے اختصار و جامعیت کی عمدہ مثال ہیں۔

عباس رضا نیر (لکھنؤ)

۲؍فروری ۱۹۹۹ء

محترم ضمیر اختر نقوی صاحب سلام علیکم!

''القلم'' کا دوسرا شمارہ بدست ہوا۔ سارے مشمولات لائق پسند بھی ہیں اور معیاری بھی۔ وقت کی تحدید ختم کرنے کے اعلان سے یقین ہوا کہ آپ جریدے کا معیار اور بھی بلند کریں گے۔ انشاء اللہ خدا آپ کے حوصلے اور توفیقات میں اضافہ کرے۔ آمین

القلم (شمارہ۔۳) پر تبصرے

نیساں اکبر آبادی (راولپنڈی)

محترم سید ضمیر اختر نقوی صاحب۔

السلام علیکم امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

القلم شمارہ نمبر ۳ ملا۔ سب سے پہلے تو آپ مبارک باد قبول کیجئے کہ ایک ایسا جریدہ نکال رہے ہیں جو یقیناً علمی، ادبی، ثقافتی، اور تحقیقی ہے اور مضامین نایاب کی تلاش کی کاوش کی بھی داد نہ دینا انصاف کے منافی ہوگا۔ اس لئے کہ جو مضامین شائع کیے گئے ہیں وہ بہت نادر، معیاری اور قابل تحسین ہیں۔ اتنی جدوجہد اس دور میں کون کرتا ہے؟

افتخار عارف (اسلام آباد)

۲۸؍اپریل ۱۹۹۹ء

محترم و مکرم اسلام ورحمت

''القلم شمارہ ۳'' موصول ہوا۔ یاد آوری کا شکریہ اور کرم فرمائی کا شکر گزار ہوں۔ انشاء اللہ میں بھی استفادہ کروں گا اور مقتدرہ قومی زبان کی لائبریری کے توسط سے دیگر خواتین و حضرات بھی فیضیاب ہوں گے۔

کوثر الہ آبادی (کراچی)

۱۹؍اپریل ۱۹۹۹ء

محترم جناب علامہ صاحب آداب عرض ہے۔

امید ہے کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوں گے۔

میں اس سے قبل آپ کے موقر جریدہ ''القلم'' کے متعلق ایک مکتوب ارسال کر چکا ہوں۔ لیکن اب جب کہ میں نے پورا شمارہ پڑھ لیا ہے دوبارہ خط لکھنے کا دل چاہا۔

اس شمارہ میں آپ کا تیسرا مرثیہ ''سلیمان امامت'' شائع ہوا ہے۔ یقین فرمایئے طبیعت بے حد خوش ہوئی اور میں آپ کے ایک اور جوہر سے روشناس ہوا۔ میں ذاتی طور پر اس وقت خوش ہوتا ہوں جب کسی مرثیے میں شاعری کا رچاؤ ہوتا ہے۔ مجھے ایسا کھردرا مرثیہ جس میں صرف عقائد کا اظہار و اثبات ہو اچھا نہیں لگتا۔ چاہے مرثیہ کتنے ہی بڑے نام سے منسوب کیوں نہ ہو۔ میر انیس کے مرثیے آج تک اسی طرح زندہ ہیں۔ صرف شاعری کے آب و تاب کی بدولت۔ مجھے عقائد کا منظوم اظہار قطعی پسند نہیں ہے۔ یہ تو مرثیے کو منبر اور امام بارگاہ تک محدود کر دینے والی بات ہے۔ ایسے مرثیے جن کے اجزاء اسکول، کالج کی کتابوں کا حصہ بن سکیں، زندہ رہ سکیں گے۔ آپ کے مرثیے میں شاعری کی جدت ہے اور الفاظ کا رکھ رکھاؤ ہے۔ اس مرثیے میں چند باتیں ایسی بھی بیان کی گئی ہیں جو عام مجالس سننے والوں کے لئے بھی نئی ہیں۔

مثلاً:

کیا ان کے بھی گھوڑوں کی قسم کھائی تھی حق نے

وہ کہف نشینوں سے ملے ہوں تو بتاؤ

ابلیس کے پوتے کو بھی تیغ سے مارا

خود ملکہ سلیماں کو چلایا تھا علی نے...... وغیرہ

اور بڑی بات یہ ہے کہ کہیں کوئی حرف ساقط ہوتا تو درکنار، دبتا ہوا بھی نظر نہیں آتا۔ حیران ہوں کہ آپ کے سفر علم اور سفر شاعری کی انتہا کیا ہوگی۔ آپ کی اور ماجد رضا عابدی ستمرا کو دیکھ کر یہ معلوم ہوتا ہے کہ واقعی صنف مرثیہ کا احیاء مقدر ہو چکا ہے۔

ملک منیر اختر (ڈیرہ اسماعیل خان)

۲۸، اپریل ۱۹۹۹ء

قبلہ علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب۔ السلام علیکم!

آپ "القلم" کے ذریعے جو رثائی ادب کے حوالے سے خدمات انجام دے رہے ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔ میں آپ کی بصیرت افروز کاوشوں سے بہرہ ور ہونا چاہتا ہوں۔

قیصر نجفی (کراچی)

۳، مئی ۱۹۹۹ء

محترم و مکرم سید ضمیر اختر نقوی صاحب اسلام و رحمت!

"القلم" شمارہ "۳" گزشتہ ماہ ملا تھا۔ فوری طور پر شکریے کا خط نہ لکھ سکا، معذرت خواہ

ہوں۔ شمارہ تا حال زیرِ مطالعہ ہے۔ آپ کی کاوشوں نے "القلم" کو معیار و مقام بخشا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے۔ تاہم کسبِ فیض کا اعتراف نہ کرنا بھی ناسپاس گزاری ہے۔ مکمل مطالعہ کے بعد یہ فرض ضرور بجالاؤں گا۔ انشاءاللہ!

نثار نقوی (لکھنؤ، بھارت)

جناب ضمیر اختر صاحب، سلام علیکم۔

کچھ دنوں قبل "القلم" کے تیسرے شمارے کی جلد موصول ہوئی۔ یاد آوری اور وہ بھی ایسے محبت آمیز انداز میں، تہ دل سے شکرگزار ہوں۔

خط لکھنے کا ارادہ بہت دنوں سے کر رہا تھا لیکن کچھ تو عدیم الفرصتی کی عنایات اور کچھ میری قوت ارادی کی نافرمانیاں، جن کی بنا پر ایسا نادر تحفہ ملنے پر شکریہ ادا کرنے میں قدرے تاخیر ہوگئی۔

رثائی ادب، جو مذہبی اہمیت سے قطع نظر ادب کا ایک نہایت اہم جز مانا جاتا ہے آپ نے "القلم" میں اس کی نہایت واضح نمائندگی فرمائی ہے۔ دوسرے مضامین بھی کافی معیاری ہیں اور مجموعی اعتبار سے "القلم" دیدہ زیب بھی ہے اور بصیرت افروز بھی یعنی صوری اور معنوی دونوں طرح سے بے مثال ہے۔ آپ کا انتخاب، ترتیب، و پیش کش بھی لاجواب ہے۔ ہماری جانب سے دلی مبارکباد قبول فرمایئے۔

سبط محمد نقوی (لکھنؤ، بھارت)

۳ جون، ۱۹۹۹ء

محترمی و محبی جناب نقوی صاحب اسلام علیکم!

دعا ہے کہ ہر طرح بخیر و عافیت ہوں۔

کل ڈاک سے "القلم" شمارہ ۳ موصول ہوا۔ جی خوش ہو گیا۔ آپ بڑی قدردانی فرماتے ہیں۔ ربّ العزت آپ کی قدر و منزلت اور بڑھائے۔ شمارہ بہت مالا مال ہے۔ نظم سے بھی نثر سے بھی۔ صفدر علی حسرتی اور ان کے غیر منقوط مرثیے کی معرفت پہلے پہل ہوئی۔

رئیس احمد (اسلام آباد)

۲۷ مئی، ۱۹۹۹ء

مکرمی و محترمی علامہ (ڈاکٹر) سید ضمیر اختر نقوی

سلام مسنون۔ مزاج گرامی قدر۔

"القلم" شمارہ ۳ موصول ہوا۔ کیا بات ہے، بقول محمد حسین نقش و نگار و رنگ و بو، تازہ بہ تازہ و نو بہ نو

سید محسن نقوی صاحب کا مضمون "میر انیس انگریزی میں" ڈیوڈ میتھیوز صاحب کی اعلیٰ تخلیقی صلاحیت کا غماز ہے، کیا خوب ترجمہ ہے اور وہ بھی منظوم معرّا (بلینک ورس) نہیں پابند۔ میتھیوز صاحب نے اپنے اس منظوم ترجمے سے ثابت کر دیا ہے کہ "ترجمہ بذات خود ایک تخلیقی عمل ہے"۔

آپ کا مقالہ "غیر منقوط مرثیے" ایک تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ آپ نے اس مضمون میں اپنی محققانہ کاوشوں سے جوش صاحب کے اس خیال کی تردید کر دی ہے کہ "ہمارے ہاں محققین و نقادانِ فن" "کھیت کے پٹواری ہیں" سچ پوچھیے تو آپ کے اس مضمون نے بدعتوں کے بڑے بڑے بت گرا کر رکھ دیے ہیں ورنہ نہ جانے کب تک محمد حسین آزاد اور عبدالرؤف عروج کے خیالات ہم جیسے کم علموں کو گمراہ کرتے رہتے۔ مقالۂ متذکرہ میں سید صفدر علی حسرتی کا غیر منقوط مرثیہ یا بقول انیس "سرتاپا

مہمل" بھی پڑھا۔ آپ نے یہ مرثیہ مشتہر کر کے اہلِ علم اور اہلِ ذوق پر ایک احسان عظیم کیا ہے۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے (آمین ثم آمین) بحق محمدؐ و آلِ محمدؐ۔

شاہد ملک (ملتان)

۲۵ جون، ۱۹۹۹ء

محققِ زماں، مفکرِ دوراں، سید العلما

جناب سید ضمیر اختر نقوی صاحب قبلہ، تسلیمات! یا علی مدد۔

شاید ہی علم و ادب کی ترویج و ترقی کے لئے پوری دنیا میں "القلم" سے بڑھ کر علمی، ادبی، ثقافتی اور تحقیقی مجلہ شائع ہو رہا ہو! "القلم" کا پہلا اور تیسرا شمارہ لفظ بہ لفظ پڑھ کر بے پناہ فیض حاصل کیا۔ دوسرے شمارے کی زیارت سے تاحال محروم ہوں۔

وحید الحسن ہاشمی

القلم (شمارہ ۳) پر تبصرہ

"القلم" کا یہ علمی ادبی اور ثقافتی جریدہ مولانا ضمیر اختر نقوی کی ادارت میں اپنی پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوا ہے۔ مولانا نے تینوں شماروں میں رسالے کے جو مقاصد بیان کئے ہیں درج ذیل ہیں:

(۱) اسلامی دنیا میں جو غلط روایات راہ پا گئی ہیں ان کا سدباب کرنا۔

(۲) پاکستان کی سوسائٹی سے ناانصافی کا قلع قمع کرنا۔

(۳) دنیا میں اردو کی صنف مرثیہ نگاری کا تحفظ۔

(۴) مرثیہ نگاروں کے غیر مطبوعہ کلام کی اشاعت۔

(۵) اردو زبان کی ترویج و ترقی کی کوشش کرنا۔

(۶) مقالوں اور نظموں کا معقول معاوضہ ادا کرنا۔

(۷) نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کرنا۔

(۸) نئی مطبوعہ کتابوں کے حسن و قبح پر بے لاگ تنقید کرنا۔

مندرجہ بالا مقاصد کو دیکھتے ہوئے اگر آپ ۲۳۰ صفحات پر مشتمل شمارہ نمبر ۳ کا تجزیہ کریں تو معلوم ہوگا کہ مولانا نے اپنے مقاصد سے سرمو انحراف نہیں کیا۔ ان کے اس ادبی منظرنامے میں تحقیق کے مہکتے ہوئے باغ بھی ہیں اور تنقید کے خوش رنگ پھول بھی تحریر کی خوشنما کیاریاں بھی ہیں اور معانی و مطالب کی حسین کلیاں بھی قدیم اساتذہ کے کلاموں کے تنے بھی ہیں اور جدید لکھاریوں کی کاوشوں کی ڈالیاں بھی غرض کہ انہوں نے اس گلستان ادب کو سجانے میں کوئی کسر باقی نہیں رکھی۔

سردست سب سے اہم مسئلہ ادیبوں کی عزت و وقار کا ہے جب حکومت یہ سمجھتی اور کہتی ہے کہ ملک کے ادیب معاشرے کی روح رواں ہوتے ہیں تو وہ ان کے گمبھیر مسائل کے حل کی طرف بے اعتنائی کیوں برت رہی ہے۔ اس وقت حکومت کے حاشیہ نشیں اور مدلل مداحی کرنے والے وہ حضرات ادیب شاعر اور نقاد بنے بیٹھے ہیں جنھیں سب کچھ آتا ہے لیکن ادب سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ہے جو حقیقی اور ادب کے اصلی وارث اور محافظ ہیں انھوں نے حالات سے مجبور ہو کر گوشہ نشینی اختیار کرلی ہے نتیجہ یہ ہے کہ حکومت کی طرف سے ادیبوں کے لئے جو گرانٹ منظور ہوتی ہے وہی حاشیہ نشیں اسے آپس میں بانٹ لیتے ہیں اور اصلی حقداروں کو ان کا حق نہیں ملتا۔ کیا حکومت صرف ایسے ہی لوگوں کو ادیب سمجھتی ہے جو دن رات اس کی قصیدہ خوانی میں مشغول رہتے ہیں۔ ابھی ابھی ادبیات اکادمی اسلام آباد کی طرف سے جن شعرا کو لاکھ لاکھ کا انعام ملا ہے وہ شعر کی شین سے بھی واقف نہیں اور لطف کی بات یہ ہے کہ مصنفین

میں سے ایک نے پانچ لاکھ کی رقم کا انعام خود ہی لے لیا۔ امراؤ طارق صاحب نے ادیبوں کے مسائل پر اچھی روشنی ڈالی ہے۔

اس شمارے میں مولانا نے غیر منقوط مرثیے کے عنوان سے بڑا تحقیقی مقالہ سپرد قلم کیا ہے مختلف شعرا اور ادبا کی تحریروں کا حوالہ دے کر جدید دور کے شاعر حسرتی سے ہمارے ملاقات کرائی ہے اور ان کا ایک بے بہا غیر منقوط مرثیہ بھی پیش کیا ہے۔ اول تو ایک اچھا مرثیہ ہی کہنا دشوار ہے دوم جب اس پر کسی صنعت کی قدغن لگا دی جائے تو صرف الفاظ رہ جاتے ہیں کلام کی تاثیر رخصت ہو جاتی ہے اسی شمارے میں "سلیمانِ امامت" کے عنوان کے تحت ضمیر اختر صاحب کا ایک مرثیہ بھی شائع ہوا ہے چونکہ اس کا مزاج کلاسیکی ہے اور بڑی تفصیل چاہتا ہے اس لئے اس پر تبصرہ یہاں موزوں اور مناسب نہیں البتہ ایک نکتے کی بات تحریر کئے دیتا ہوں۔

کراچی کے میرے ایک دوست نے مجھے خط میں لکھا کہ ضمیر اختر صاحب نے اپنے مرثیے کے ۵۲ ویں بند میں رنگِ لہو کی ترکیب استعمال کی ہے کیا یہ درست ہے۔ میں نے انھیں تحریر کیا کہ لہو ہندی ہے اس لئے اسے فارسی اضافت کے ساتھ استعمال نہیں کر سکتے مگر رنگ کے نیچے جو زیر آیا ہے وہ کتابت کی غلطی ہے اصل مصرع یوں ہے:

یہ عربدہ جو کھیلتی تھی رنگ ــــــ لہو میں

اگر مولانا غلطی ہی سے رنگِ لہو استعمال کرتے تو مصرع یوں ہوتا:

یہ عربدہ جو کھیلتی تھی رنگِ لہو سے

چونکہ ردیف "میں" ہے اس لئے عربدہ جو لہو میں رنگ کھیل رہی تھی لکھنا بالکل درست ہے آپ زیر کاٹ دیں رنگ کھیلنا بڑا نایاب محاورہ ہے۔

جناب قائم رضا نقوی صاحب نے ڈاکٹر اکبر حیدری کی کتاب مراثیِ خلیق پر یہ

اعتراض کیا ہے کہ اس میں کئی دوسرے شعرا کے مرثیے شامل کر دیے گئے ہیں اکبر حیدری صاحب کے سامنے ہندوستان کے دس کتب خانے تھے انھوں نے بڑے غور و خوض اور پورے یقین کے ساتھ یہ کتاب مرتب کی ہوگی اب جبکہ ان کی تحقیق کو چیلنج کیا گیا ہے تو ان کا فرض ہے کہ وہ اعتراضات کا مسکت جواب دیں اور ان کا جواب بھی "القلم" میں شائع کیا جائے۔

القلم (شمارہ۔۴) پر تبصرے

سید جمیل احمد رضوی

چیف لائبریرین، پنجاب یونیورسٹی لائبریری، لاہور

محترم علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب السلام علیکم!

"القلم" کا شمارہ ۴ وصول ہوا۔ اس کرم فرمائی کے لئے بہت ممنون ہوں۔ زیرِ حوالہ شمارہ معنوی اور صوری اعتبار سے بہت قابل قدر پیشکش ہے۔ اس کے ابتدائی حصے کو گوشۂ سید ظہیر حسن نقوی (اعلی اللہ مقامہ) کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ مرحوم کی ذات آپ اور خاندان کے دیگر افراد کے لئے شجر سایہ دار کی حیثیت رکھتی تھی۔ واقعاً "القلم" پر ان کا حق زیادہ ہے۔ مرکز علوم اسلامیہ کراچی نے منثور و منظوم صورت میں اس حق کو ایک حد تک ادا کرنے کی مستحسن کوشش کی ہے۔ آپ کا سفرنامہ لندن بہ عنوان 'لندن جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب، گلشن سے لندن تک' اس شمارے میں شائع ہوا ہے یہ بہت دلچسپ اور معلوماتی ہے۔ اظہار زبان کا پیرایہ بہت پرکشش اور دلآویز ہے۔ کمال حیدر رضوی کا مقالہ: ایک مذاکرہ 'اردو مرثیہ اور میر انیس'۔ اردو مرثیہ کی عصری صورت حال پر روشنی ڈالتا ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر شارب ردولوی صاحب نے

ہندوستان میں ایک صنفِ سخن پر ہونے والے کام پر بحث کی ہے۔ دیگر شرکائے مذاکرہ نے پاکستان میں مرثیہ پر ہونے والے علمی کام کا ذکر کیا ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ میر انیس (اعلی اللہ مقامہ) کا دو سو سالہ جشن ولادت ۲۰۰۲ء میں منانے کا پروگرام بنایا جا رہا ہے۔ اس سے یقیناً اردو میں رثائی ادب کو بالعموم اور اردو مرثیہ نگاری کی تحریک کو بالخصوص آگے بڑھانے کا موقع ملے گا۔

زیرِ نظر شمارے کے دوسرے مقالات بھی بہت علمی اور تحقیقی نوعیت کے ہیں۔ ان کو پڑھ کر اس محنت اور عرق ریزی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ جو آپ کی ادارتی مسئولیت میں اختیار کی جاتی ہے۔ ۲۷۲ صفحات پر مشتمل اس دستاویز کا مطالعہ کرنے والا سنجیدہ قاری داد و تحسین دینے پر از خود مائل ہو جاتا ہے۔ یہ جریدہ بہت پاکیزہ اور مہذب ادب پر مشتمل ایک ایسا علمی ارمغان ہے جو دنیائے علم و ادب کے لئے گرانقدر تحفہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ والسلام

شاہد نقوی (کراچی)

محبّ محترم ضمیر اختر صاحب...... تسلیم و نیاز!

برادرِ عزیز آپ واقف ہیں کہ میں نے نثر نگاری میں اپنی نااہلیت کا بارہا اعتراف کیا ہے لیکن "القلم" کے چوتھے شمارے میں چند ایسے سخن گسترانہ پہلو داخل ہو گئے کہ بُرا بھلا جیسا بھی ممکن ہوا اظہارِ خیال پر مجبور ہوں۔

سب سے پہلے تو "القلم" کے متعلق اپنے تاثرات پیش کروں کہ یہ مجھ پر قرض ہے مگر میں شاید مقروض ہی رہتا اگر بعض دوسرے اسباب سے یہ تحریر ناگزیر نہ ہو جاتی۔ یہ عرض کروں کہ اچھا یا بُرا بہر حال محمدؐ و آلِ محمدؐ کے دربار کا شاعر ہوں غلط بیانی معاذ اللہ بھی مجھ سے ممکن نہیں ہے اس لئے میری معروضات کو توصیف یا تنقیص کے پیمانے سے

ناپنا مجھ پر ظلم ہوگا۔ سچے جذبات اور سچے الفاظ میری مجبوری ہیں۔

تو بھائی صورت حال یہ ہے کہ دور حاضر کے ارتکاز شکن اور انتشار فگن ماحول میں زندگی گزارنے والے اگر ادب سے دلچسپی رکھتے بھی ہوں تب بھی سنجیدہ موضوعات کے مطالعے سے حد ممکن تک گریز تقریباً بہ جبر فطرت مجبور ہیں یہی سبب ہے کہ ایک معمولی ڈائجسٹ کی اشاعت ادب کی عظیم ترین کتاب سے سینکڑوں گنا زیادہ ہے۔ ایسے حالات میں اول تو کوئی ادبی رسالہ نکالنا ہی غیر معمولی مہارت ہے پھر اگر وہ رسالہ کسی صنف خاص سے مختص کر دیا جائے اور موضوع بھی دنیوی کے بجائے دینی ہو تو اس قسم کے رسالے کا اجراء اقدام خودکشی ہی قرار دیا جا سکتا ہے پھر کوئی شخص یہ اقدام کر ہی ڈالے اور رسالہ نہ صرف جاری رہے بلکہ مسلسل ارتقائی سفر طے کر رہا ہو تو یہی کہنا پڑے گا کہ یہ اگر معجزہ نہیں تو منتظمین رسالہ کی محیر العقول صلاحیتوں کا زندہ ثبوت یقیناً ہے۔ "القلم" ایک ایسا ہی رسالہ ہے۔ جس کا پورا کریڈیٹ آپ کو جاتا ہے البتہ اگر آپ اجازت دیں کچھ محل نظر گوشوں کی نشان دہی کر دوں۔ ایک تو یہ کہ حلقہ مضمون نگاران بہت محدود ہے۔ کامیاب رسالے کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ اس میں ادارے کی تخلیقات کم سے کم ہوں اور دوسرے تخلیق کاروں کے رشحات قلم زیادہ سے زیادہ ہوں مگر یہ دیکھا جا رہا ہے کہ رسالے کا ایک معتدبہ حصہ لوگوں کے سوالات اور آپ کے جوابات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان سوالات و جوابات میں بیشتر بڑی کام کی باتیں ہوتی ہیں لیکن کیا یہ بہتر نہ ہوگا کہ صرف ایسے خطوط کے جواب دینے کے لئے منتخب کیا جائے جو کسی معلوماتی زاویے سے قارئین کے لئے افادیت رکھتے ہوں۔ ایک توجہ طلب گوشہ یہ بھی ہے کہ رسالے میں تنقید اور تحقیق کے حوالے سے تو قابل قدر مواد ملتا ہے مگر تخلیقی جنبہ نسبتاً کم ہوتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اگر میری

گزارش کوئی وزن رکھتی ہے تو آپ کے لئے مناسب توازن قائم کرنا دشوار نہ ہوگا۔

رفیق رضوی (کراچی)

محترم و معظم علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب قبلہ مدظلہٗ سلام مسنون!

آپ کا عطا کردہ "القلم" شمارہ ہمبر ہانے تھا یگانہ خواب نے اس کی ورق گردانی شروع کردی نیند کی وادی میں نہ سہی "القلم" کی علم پرور فضا میں وقت کٹنے لگا یہ شمارہ بھی حالانکہ تعزیت نامہ ہے اس کے باوجود صوری اور معنوی اعتبار سے خوب صورت گلدستہ ہے۔

میں آپ کے تصنیف کردہ مرثیہ "سلیمانِ امامت" پر ایک مبسوط خط لکھوں گا کیوں کہ آپ "بیوت الحماس" اور "آئینہ" میں ملاحظہ فرما سکتے ہیں کہ میں نے خود اسی رنگ کو اپنایا ہے لیکن پہلے ذرا راستے کے جھاڑ جھنکار کو صاف کرلوں۔

خدا آپ کو سلامت رکھے، آپ کے حوصلے کبھی پست نہ ہوں آپ خوب صورت خوب صورت مضامین شعرائے کرام پر لکھتے اور لکھواتے رہے یقیناً بذریعہ "القلم" یہ اردو ادب کی غیر معمولی خدمت ہوگی نیز اگر احقر کو خطوط کے باب میں صفحہ دو صفحہ ملتا رہا تو میں بچوں اور جوانوں کی کچھ نہ کچھ خدمت ضرور کروں گا۔

نیساں اکبرآبادی (راولپنڈی)

قابلِ صد احترم جناب ضمیر اختر نقوی صاحب السلام علیکم!

"القلم" شمارہ موصول ہوا۔ شکریہ قبول فرمایئے۔ آپ کا رسالہ دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اوّل تو کاغذ عمدہ، طباعت خوش نما، سرورق حسین اور دوئم اس میں جو مضامین یا منظومات شامل ہوتی ہیں وہ تحقیقی اور نایاب ہوتی ہیں۔

اس کا بھی شکریہ کہ آپ نے میرا خط شائع کیا لیکن اس کا جواب شائع نہیں کیا۔

بہر حال "العلم" دیکھ کر طبیعت خوش ہوتی ہے کہ اہل علم کے لئے بہت معیاری اور بامقصد ہے، کتابت وطباعت بھی خوب ہے۔

امیر زہرا رضوی (لندن)

محترمی ضمیر نقوی صاحب، تسلیمات!

"العلم" کا شمارہ ملا۔ رسالہ بھیجنے اور یاد رکھنے کے لئے مشکور ہوں۔ آپ اس رسالے کے ذریعے جو علمی، مذہبی اور ادبی اقدام کی پاسبانی کر رہے ہیں وہ قابل ستائش ہے۔ رسالہ میں نے پڑھا اور جس گرلز کالج میں پڑھاتی ہوں وہاں بھی پڑھا جائے گا۔

ادب خلاؤں میں پروان نہیں چڑھتا۔ انسان کی طرح ادب بھی ہمہ جہت ہے اسی لئے جب مذہب اور مذہبی ورثے کی بات ہوتی ہے تو زبان کی بات آتی ہے، جو اظہار ہے پہچان ہے، مذہب وکلچر کی محافظ ہے، سرمایہ ہے، اس حقیقت سے کوئی انکار نہیں کر سکتا اردو زبان میں ہمارا جس قدر علمی اور مذہبی سرمایہ ہے وہ برصغیر ہند و پاک کی کسی دوسری زبان میں نہیں۔ زبان کے اس افادی پہلو کی اہمیت کا ہمیں ٹھیک طرح سے اندازہ نہیں ہے۔ جگہ کی قید نہیں ہے خواہ وہ لندن ہو، پاکستان، ہندوستان یا امریکہ۔ ماں باپ کی کوششوں کے بغیر بچے نابلد رہ جائیں گے۔ جان بی کا کہنا ہے کہ کسی "قوم کو ختم کرنا ہو تو اس کی زبان چھین لو"۔

آپ کی دوسری تصنیف "میرانیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال" انیس شناسی میں بڑا اچھا اضافہ ہے۔ قابل قدر کام ہے ڈیوڈ میتھیوز کا انیس کے مرثیے کا انگریزی ترجمہ تو آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ انیس کو ہر دور اپنے طور پر تلاش کرے گا۔

سید علی احمد دانش (لکھنؤ، بھارت)

برادرم سید ضمیر اختر نقوی صاحب قبلہ، آداب!

آپ کے تمام شمارے پڑھے۔ ہر شمارہ اپنی جگہ ایک دستاویزی حیثیت رکھتا ہے۔ خصوصاً شمارہ نمبر ۳ میں آپ کا تصنیف کردہ مرثیہ پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اس لئے کہ آپ نے آلِ محمدؐ کی پسندیدہ صنف "مرثیہ" کو بھی اپنا موضوع بنالیا ورنہ خطابت کرنے والے ذاکر مرثیہ سے ایسے دور رہتے ہیں جیسے خدانخواستہ۔۔۔۔۔ کیا ہو رہا ہے۔ مرثیے کی مجلسوں سے کترا کے نکل جاتے ہیں۔ جب کہ تاریخ شاہد ہے کہ آئمہ معصومینؑ نے صرف مرثیہ ہی کہلوایا اور مرثیہ ہی سُنا۔

شارب ردولوی صاحب سے آپ نے جو انٹرویو لیا وہ اردو مرثیہ کی پیش رفت کے سلسلے میں بے حد معلوماتی ہے۔ خدا انھیں بھی صحت عطا کرے وہ بھی شمع کو روشن رکھے ہیں جیسے آپ پاکستان جیسے ملک میں آگے بڑھا رہے ہیں۔ رسالے کے تمام مندرجات کو پڑھ کر میر انیسؔ کے اس مصرعہ پر اکتفا کرتا ہوں۔

"بس اے انیسؔ بس نظرِ بد کا خوف ہے" (تصرف ذاتی)

رئیس احمر (اسلام آباد)

مکرمی و محترمی (علامہ) ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی،

سلام مسنون۔ مزاج گرامی قدر!

"القلم" شمارہ ۳ ملا۔ نقوش تازہ نظر سے گزرے، کلیم آلِ عبا، شاہد نقوی کی نظم۔ "ظہیر اپنی جگہ قوم کا ادارہ تھے" ۱۹۹۹ء کیا کہنا، اس استادانہ کاوش کا۔ "مضامین نو" میں شمس الرحمٰن فاروقی کا مضمون، میر انیسؔ پر ایک اچھوتا مضمون ہے۔ میں نے بڑے شوق سے پڑھا۔ آپ کا مضمون۔ "لندن جو ایک شہر ہے۔۔۔ " ایک اچھا سفرنامہ ہے۔

۲۔ حصہ نظم میں میر انیسؔ کا غیر مطبوعہ مرثیہ اور سعادت یار رنگین کا مرثیہ اپنے اپنے زمانے کے طرزِ سخن کے غماز ہیں۔ ماجد رضا عابدی کا غیر مطبوعہ مرثیہ خاصا مضبوط اور

موثر ہے۔ اسی طرح ان کا ترجمہ عبداللطیف بھٹائی کے کلام کا، ایک اضافہ سے کم نہیں۔ وامق جونپوری کی نظم فاتح کربلا، بار بار پڑھی، عقیدت وخلوص سے لکھی گئی ہے، خدا مرحوم کو جزائے خیر عطا کرے (آمین)

قمر حسین رضوی (بلہور، کانپور، بھارت)

عزیزم ضمیر میاں

قابل صد ستائش ہو۔ ترقی درجات مبارک ہو، تمہارا مرثیہ "القلم" شمارہ ۳ میں نظر سے گذرا، میر انیس اور میر نفیس کے بعد مرثیہ نگاری کے میدان میں اترنا بڑی ہمت کا کام ہے۔

مرثیہ "سلیمانِ امامت" جس کا مطلع ہے۔

"خورشید بلاغت میں ضیا ہے مرے دم سے"

بہت خوب ہے، زبان وبیان پر گرفت خوب ہے۔

کوثر الہ آبادی (کراچی)

محترم علامہ صاحب تسلیمات، اُمید کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوگے!

آپ کا کرم آپ کی نوازش کہ القلم کا چوتھا شمارہ محترم افضال حسین نقوی کی معرفت مرحمت فرمایا۔

آپ کے والد صاحب کے حالات زندگی اور خاندانی حالات پڑھے بدقسمت ہوں کہ مرحوم سے ان کی زندگی میں نہیں ملا۔ اور ان کی شفقتوں سے محروم رہا۔

آپ نے بڑی محنت کی ہے مرحوم کے ایصال ثواب کے رقعہ کے ہر جملہ سے تاریخ نکالی ہے۔ اور بڑا لائق تحسین کارنامہ انجام دیا ہے۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ سرکار ناصر

السلطنت کا انتقال ہوا تھا تو لکھنؤ کے کسی عالم نے ایک پورا مضمون لکھا تھا جس کے ہر جملے سے ہجری یا عیسوی تاریخ نکالی تھی۔ یہ مضمون نظامی جنتری میں شائع ہوا تھا۔ آپ یقیناً اس مضمون سے واقف ہوں گے۔

سعادت یار خاں رنگین کا مرثیہ ایک نادر چیز ہے اور محفوظ کرنے کے لائق ہے۔ آپ کا لندن کا سفرنامہ پڑھا بخدا بڑا لطف آیا سفرنامے میں انشاء پردازی ہو تو رپورتاژ بن جاتا ہے۔ اور یہ سفرنامے کی انتہائی نکھری نکھری صورت ہے۔

عقیل نجمی (کراچی)

محترم علامہ صاحب السلام علیکم!

روزنامہ جنگ میں آپ کے رسالہ "العلم" پر تبصرہ نظر سے گذرا۔ العلم کا شمارہ ۱۳ از اول تا آخر پڑھا۔ بس یہی کہا جاسکتا ہے۔ کہ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ آمین

ظہیر حسن صاحب مغفور کے حالات زندگی اور حسب نسب سے واقفیت ہوئی۔ ایسے صاحب کمال اور ذی شرف باپ کی رحلت پر خدا آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے اور مرحوم کو جنت الفردوس۔

"العلم" شمارہ ۴ کے تمام مضامین اور نظمیں قابل ستائش ہیں۔ اداریہ آل محمد رزمی صاحب کا مضمون "آہ! سید ظہیر حسن نقوی" آپ کا مضمون "لندن جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب" خطوط اور ان کے مدلل جواب۔ میر انیس کا تعارف اور غیر مطبوعہ مرثیہ۔ ماجد رضا عابدی کا مرثیہ "تسلیم امر" خاص طور پر قابل تعریف ہے۔

ڈاکٹر عظیم امروہوی (امروہہ، بھارت)

برادرم محترم و محتشم مکرم و معظم! علامہ ضمیر اختر قبلہ سلام و احترام،

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ محترم نسیم حسن صاحب (بھائی چمن) سے "القلم" کا تازہ شمارہ "میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال" اور ماجد رضا عابدی کا مرثیہ "نسل اشرف" ملا۔ یوں تو آپ کی دینی، علمی، ادبی، اور خاص طور سے رثائی ادب کے سلسلے میں خدمات کا علم مختلف ذرائع سے ہوتا رہتا ہے۔ لیکن بھائی چمن صاحب نے میری معلومات میں مزید اضافہ کیا اور ان سے زیادہ تر آپ کے بارے ہی میں گفتگو رہی۔ آپ کی مجالس کے کیسٹ بھی سنے ان تمام باتوں پر مجموعی تاثر کا اظہار کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں۔

آپ کے والد ماجد کی رحلت کی خبر یہاں سن لی تھی لیکن آپ کا پتہ نہ ہونے کے سبب تعزیت نامہ ارسال نہیں کرسکا تھا "القلم" کے مطالعے سے مرحوم کے بارے میں معلومات میں اضافہ ہوا۔ خداوند عالم مرحوم کو جوارِ معصومین میں جگہ مرحمت فرمائے۔ آیئے ان کے لئے ایک سورۂ فاتحہ پڑھ لیں۔

پروفیسر عباس رضا نیر (شعبۂ اردو، مہاراجہ ہریش چند کالج (مرادآباد، بھارت)

محترمی و مکرمی ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب

سلام مسنون

"القلم" میں استاذی ڈاکٹر مولانا سید شبیہ الحسن نونہروی پر میرا مضمون شائع کر کے آپ نے میری حوصلہ افزائی فرمائی مگر شکریے کی چند سطریں اس لئے نہیں لکھ سکا کہ یہ موقر جریدہ ابھی تک مجھے دستیاب نہیں ہوا تھا۔ البتہ جناب اعجاز مدیر الواعظ نے مختلفوں کی ملاقاتوں میں ذکر ضرور کیا تھا۔ ہاں امسال عشرۂ اربعین میں محلہ حقانی امروہہ کے عزاخانے میں پڑھا جہاں محترم عظیم امروہوی برابر میری مجلسوں میں شریک ہوتے رہے اور روز ہی کوئی نہ کوئی رسالہ یا کتاب مرحمت فرماتے رہے انھیں کی مہربانیوں

سے مجھے ''القلم'' کا شمارہ ۳ ملا اور سرمہ چشم ہوا۔ مصروفیات عزا نے پھر بھی خط لکھنے کی اجازت نہ دی اور ایام عزا کے بعد میلاد رسالت مآبؐ کے جلسوں میں شرکت کی غرض سے میں بنگلہ دیش چلا گیا پھر ممبئی میں زہنیہ ٹرسٹ کی جانب سے مولانا جوادی، مولانا ادیب الہندی اور مولانا سید کرار حسین کی شخصیات پر جلسے اور سیمینار منعقد ہوئے جن میں مجھے شریک ہونا پڑا۔ خیر اب میرا کانج کھل گیا ہے اور زندگی اپنے معمول پر ہے۔

''القلم'' کے ذریعے آپ کے والد محترم کے انتقال پر ملال کی اطلاع ملی۔ میری طرف سے تعزیت قبول کیجئے۔

کیا کہوں نیّر ضمیر اختر کے والد کیا اٹھے
میرے دامن میں بھی جیسے اک دعا کم ہوگئی

القلم (شمارہ۔۵) پر تبصرے

حسن عابد (کراچی)

برادر عزیز

ادعیہ کثیرہ

''القلم'' شمارہ نمبر ۵ بھیجنے کا شکریہ۔ آپ اسے بڑی محنت سے نکال رہے ہیں بعض چیزیں خاصے کی ہوتی ہیں مباحث عروض کے حوالے سے ہوں یا کسی دوسرے ادبی حوالے سے معلومات افزا ہوتے ہیں۔

زاہد بخاری (ریڈیو پاکستان، لاہور)

محترم ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب...... السلام وعلیکم!

اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

آپ کی جانب سے "القلم" کا شمارہ نمبر ۵ موصول ہوا۔ یہ شمارہ دیکھ کر دلی مسرت حاصل ہوئی۔ آپ علم و ادب کی جو خدمات انجام دے رہے ہیں یہ لائقِ صد تحسین ہیں۔ اللہ رب العزت آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے (آمین) شمارہ ارسال کرنے کا بہت شکریہ۔

ڈاکٹر خیالؔ امروہوی (لیہ، پنجاب)

دوحہ بوستان رشاد شعاع الشموع دودمان والا جتہاد حضرت علامہ سیّد ضمیر اختر نقوی مدظلہ العالی

سلام علیکم۔ مجلہ "القلم" شمارہ پنجم عالوتی من الستا مازل گردید۔

حیرت ہے کہ ایک صحرا نشین اسیر سلاسل قضا و جبریت کو آپ نے کس طرح ڈھونڈ نکالا۔ یوں تو درجنوں جرائد موصول ہوتے ہیں کبھی کے لئے حسب توفیق لکھتا رہتا ہوں لیکن القلم نہایت علمی جریدہ ہے۔ سفارت ایران سے بھی دانش، آشنا، ایران شناسی بھی آتے رہتے ہیں۔ لیکن پاکستان سے "القلم" جیسا فکر انگیز۔ جاذب و جذب دلچسپ جریدہ پہلی بار دیکھنے میں آیا اس کے گزشتہ چار شمارے بھی باصرہ نواز ہو جاتے تو کیا ہی بات تھی۔

قاصدؔ سرسوی (کراچی)

محترم علامہ ضمیر اختر صاحب...... السلام علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ

میں آپ کی اس کرم گستری کا حقیقتاً سپاس گزار ہوں کہ جب بھی "القلم" کے تازہ شمارے کا لوحِ افکار پر ورود ہوتا ہے تو آپ اس فقیر گوشہ نشین کو یاد رکھتے ہیں۔ خدائے

بزرگ و برتر آپ کو صحت مند اور خوش و خرم رکھے۔ آج دوپہر کی شدید گرمی میں رجسٹرڈ پیک موصول ہوا جس میں "القلم" کا تازہ شمارہ نمبر ۵ اور آپ کی مجالس کے آڈیو اور ویڈیو کیسٹ کی فہرست پر مشتمل بروشر مرکز علوم اسلامیہ، کراچی کی جانب سے موصول ہوا اس گرمی میں یہ تحفے نسیم خوشگوار کے جھونکوں سے کم نہ تھے۔ چنانچہ نصف کے قریب شمارہ بصد ذوق وشوق پڑھ ڈالا۔

میں نے مسجد آل عبا میں آپ کی چار تقاریر سنیں۔ تمام تقاریر پر مغز اور معلومات افزا تھیں بالخصوص خواجہ معین الدین چشتی کی مشہور زمانہ رباعی پر اور خطبات سید الشہدا پر آپ کی تقاریر کا جواب نہیں۔ اب یہ بروشر آپ کے ادارے نے بھیج دیا جس کا شکر گزار ہوں ورنہ مسجد آل عبا سے میں نے پانچ روپے کا ہدیہ دیکر حاصل کر لیا تھا۔

ڈاکٹر طاہر تونسوی (ملتان)

محترم سید ضمیر اختر نقوی صاحب تسلیمات

امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ "القلم" کا شاندار اور جاندار شمارہ ملا۔ اس عطا کے لئے شکر گزار ہوں اس سے پہلے والے شمارے بھی مل جائیں تو ممنون ہوں گا۔ مجھے یاد پڑتا ہے کہ جب میں ۱۹۷۹ء میں سید مسعود حسن رضوی ادیبؔ کے بارے میں پی ایچ ڈی کی سطح کا کام کرنے کے لئے لکھنؤ گیا تھا تو آپ بھی ان دنوں وہیں تشریف لے گئے تھے۔ اردو مرثیہ کے بارے میں آپ کا کام لائق تحسین ہے۔ امید ہے قلمی رابطہ رہے گا کراچی آیا تو اطلاع دوں گا۔

عرشیہ جبین (حیدر آباد دکن، بھارت)

محترم عالی جناب ضمیر اختر نقوی صاحب تسلیمات

آپ کا علمی و ادبی جریدہ "القلم" شمارہ نمبر ۵، ۱۲ جون کو موصول ہوا۔ آپ کی عنایتوں اور شفقتوں کے لئے تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔ آپ نے "القلم" میں میرا خط شامل کر کے نہ صرف میری مدد کی بلکہ میری حوصلہ افزائی بھی کی ہے آپ نے اپنے خط میں مذاکرہ اردو مرثیہ اور میر انیس کا ذکر کیا تھا مجھے اس کی ایک کاپی شارب صاحب کے توسط سے مل چکی ہے۔ بہت ہی عمدہ مذاکرہ تھا جسے آپ نے "القلم" ہی میں شائع کرادیا تھا۔ "القلم" کے ذریعہ آپ کی دینی علمی و ادبی اور خاص کر رثائی ادب کے سلسلے میں خدمات کا علم ہوا۔ بے حد مسرت ہوئی اور آپ کی علم دوستی، ادب نوازی اور مخلصانہ تعاون نے مجھے آپ کا پرستار بنادیا۔ میں اپنا مقالہ جلد سے جلد مکمل کرنے کی کوشش کروں گی اس میں آپ کا حوالہ بھی دوں گی اور مکمل ہوتے ہی ایک کاپی آپ کو روانہ کروں گی۔

آپ نے میرا مکتوب "القلم" نمبر ۵ کے ص ۲۱۴ پر شائع کیا اور جواب بھی تحریر کیا اور مجھے ایک رسالہ بھی روانہ کیا مزید شکریہ۔

مکرم لکھنوی (کراچی)

الحاج جناب ضمیر اختر نقوی السلام علیکم

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔

آپ کی خطابت وصحافت آپ کی کثرت تصنیفات وتالیفات کا شہرہ تو ہے ہی اس کے ساتھ ساتھ آپ نے علم وادب میں جو تحقیقی کارنامے انجام دیے ہیں اس پر بعض نافہم بغض وحسد کا شکار نظر آنے لگے ہیں۔

خیر یہ تو ہر صاحب علم وکمال فن کے ساتھ ہوتا چلا آیا ہے۔ آج نہ سہی تو کل یہی لوگ ایمان لانے پر مجبور ہو جائیں گے۔ دشمنوں کو کھلنے والی حقیقت پر دو تمہید کے بعد عرض

حال کی طرف آتا ہوں اور وہ یہ کہ میرے تنقیدی مضامین ایک معاصر ماہنامے میں ابھی چھپنا شروع ہی ہوئے تھے کہ مولانا محسن لکھنوی پر لکھے ہوئے دو مضامین کی ترتیب اشاعت کے سلسلے میں من مانی کرنے کی بنا پر مدیر مسئول سے رنجش کا آغاز ہو گیا اور اس طرح میرے لئے قارئین تک اپنی بات پہنچانے کی راہ مسدود ہو گئی۔ جس کا حل میں نے "ششماہی تنقید" کی صورت میں تلاش کر لیا ہے۔ میرے اس مجلّہ ششماہی تنقید میں صوری حسن تلاش کرنے کے بجائے معنوی حسن پر نگاہ ڈالنے کی ضرورت ہے۔ اس کے آگے آپ سے کچھ کہنے کے بجائے بات کو مختصر کرنا مناسب سمجھتا ہوں۔ "القلم" میں آپ کے موقر تبصرے کے لئے ادبی مجلّہ ششماہی تنقید کا شمارہ نمبر ۱، اور شمارہ ۲ حاضر خدمت کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ کرم ناچیز کے اس مجلّے سے صرف نظر نہیں فرمائیں گے اور آپ اپنے قلم جواہر رقم سے جو کچھ بطور نقد و تبصرہ لکھیں گے وہ ہمارے قارئین کے لئے مسرت و طمانیت کا باعث ہوگا۔

جناب قمبیر صاحب مرحوم اور آپ کی والدہ مرحومہ کے لئے دعائے مغفرت کرتا ہوں ایام عزا کی آخری مجلس آٹھویں ربیع الاول کو امام بارگاہ رضویہ میں ایسی سنی جو آپ کی خطابت کا معجزہ کہی جا سکتی ہے خداوند عالم آپ کو صحت و توانائی کے ساتھ طویل عمر عطا فرمائے۔ آمین۔

رئیس اختر (اسلام آباد)

مکرمی محترمی، علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب

السلام علیکم ...... مزاج گرامی قدر

"القلم" شمارہ نمبر ۳، موصول ہوا۔ حسب دستور، نقوش تازہ سے مزین۔ میر انیس یاد آ گئے۔

لگا رہا ہوں مضامینِ نو کے پھر انبار
خبر کرو مرے خرمن کے خوشہ چینوں کو

نئے اور تازہ مضامین پڑھنے کو ملے اداریہ بھی دلچسپ اور فکر انگیز کیا کہنا۔ خدا آپ کو جزائے خیر دے۔ "ضمیر نامہ" کیا بے تکی بات ہے بقول میرؔ۔

سمجھے نہ یہ تو فہم کا اپنی قصور تھا

۲۔ "کنایاتِ حسینیت" (آلِ محمد رزمی) میر انیس کی شعری حرفت (ڈاکٹر نیر مسعود) اور مرزا محمد ہادی رسوا کی مرثیہ نگاری (ضمیر اختر نقوی) خزینہ معلومات ہیں۔ حصہ نظم میں قصیدہ در مدح امام حسینؑ (عباس رضا نیر) اور مرزا رسوا کا غیر مطبوعہ مرثیہ قابلِ داد ہیں۔

خطوط کے جواب میں جناب کا خط میرے نام، میں شکر گزار ہوں آپ نے مجھے ایک فاش غلطی بلکہ میری جہالت سے مجھے آگاہ کیا۔ حقیقت یہ ہے مرثیہ کی شعری حرفت اور مراثی میں استعمال ہونے والے الفاظ اور اس کے پس منظر کو جاننا بڑا ضروری ہے ورنہ نتیجہ معلوم اور خاص طور پر مجھے اس کی زیادہ ضرورت ہے چونکہ میں اپنے آپ کو مرثیہ نگاروں میں شمار کرتا ہوں۔

خطوط کے دیگر جوابات میں ایک آپ کی تشریح میر تقی میرؔ کے شعر کی انتہائی بامعنی ہے آپ کی تشریح کو سامنے رکھ کر اگر غور کیا جائے تو جدید اردو شعری ادب وتنقید کے حوالے سے کئی جہتیں سامنے آجاتی ہیں حقیقت یہ ہے ہر خط کا جواب آپ کی علمیت کا غماز ہے۔

۳۔ "اداریہ" میں مرثیہ اور ایران۔ غالباً آپ کا اندازہ درست ہے۔ ایرانی حضرات ادب کے معاملے میں کچھ کم خیال، متعصب اور میرے خیال میں محتاط ہیں۔

دنیا کے کسی بھی بڑے ادب کی کسی بھی بڑی صنف سخن کا مقابلہ ایرانی ادب کر سکتا ہے۔

۴۔ مرثیہ پر آپ کی گہری نظر ہے اور بقول پروفیسر کرّار حسین آپ استاد ہیں اس فن کے۔

آپ کی بات میرے خط کے جواب میں۔ بڑا احسان ہے۔

۶۔ آخر میں یاد آیا۔ آپ نے میری توجہ اُنس کے مرثیے کی طرف دلائی ہے۔ میری بدقسمتی کہ میں اس پر غور کرنے کے بجائے سرسری طور پر پڑھ گیا۔

سیّد اطہر رضا بلگرامی (صدر شعبہ معاشیات جامعہ ملیہ دہلی)

محترم ضمیر بھائی...... آداب۔

''اظہم'' شمارہ نمبر ۵ موصول ہوا۔ آپ نے میرے خط کو قابلِ اشاعت سمجھا بہت بہت شکریہ۔ ''اظہم'' میں ہر بار نکھار سا محسوس کرتا ہوں۔ اس بار خطوط و ان کے جوابات کا ادبی رنگ بہت پسند آیا۔ غالب کی رُوح یقیناً خوش ہوگی۔ آپ کا اور پروفیسر تیز مسعود صاحب کا مضمون تحقیق کا نمونہ ہیں۔ اس بار مرزا رُسوا کا غیر مطبوعہ مرثیہ اور آپ کا تعارف دونوں نے چونکایا۔ مرزا رُسوا کو ایک ناول نگار کی حیثیت سے ہی جانا جاتا ہے لیکن آپ نے نہ صرف مرثیہ نگار بلکہ اُردو دنیا میں اُردو شارٹ ہینڈ اور اُردو ٹائپ بورڈ کا موجد، بتلا کر تکنیکی انقلاب کا موجد بھی ثابت کر دیا۔ امید ہے ''اظہم'' ہر بار اسی طرح کی ''کھوج و جستجو'' Discoveries سے چونکاتا رہے گا اور اُردو کا دامن مالا مال کرتا رہے گا۔

رفیق رضوی (کراچی)

حضرت علامہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب قبلہ دامت برکاتہ

سلام مسنون۔

امید ہے مع الخیر ہوں گے "القلم" شمارہ نمبر ۵ بدست صاحب قلم، شاعر بے مثال نگر منکسر المزاج برادر عزیز جناب ماجد رضا عابدی صاحب طول عمرہ نظر نواز ہوا یہ آپ کی ادب پروری نہیں غریب پروری ہے کہ ایسا موقر جریدہ اور مجھے باآسانی مل جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس پُر وقار مجلّہ سے میرا گئی جون کا چلا دن چل جاتا ہے۔ بے شمار نئے نئے حقائق منکشف ہوتے ہیں معلومات میں غیر معمولی اضافہ ہوتا ہے۔

نیساں اکبر آبادی (راولپنڈی)

مکرم و محترم ضمیر اختر نقوی صاحب

السلام علیکم

امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

اس سے قبل ایک خط روانہ کیا تھا ملا ہوگا۔ اس وقت "القلم" شمارہ نمبر ۵ سرسری طور پر دیکھا تھا۔ رسید دینا مقصود تھا خط فوراً لکھ دیا۔ اب تقریباً پورا رسالہ پڑھا۔ پہلے تو آپ کی داد دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ آپ اس دور میں (جب رسالہ نکالنا بڑا مشکل کام ہے اور وہ بھی ادبی اور معیاری) بڑی خوبی کے ساتھ اور مستقل مزاجی کے ساتھ نہایت دلچسپ ادبی اور معیاری رسالہ نکال رہے ہیں۔ اس میں خطوط کا سلسلہ بھی بہت خوب ہے۔ خطوط میں بھی ادبی چاشنی ہوتی ہے۔ اور اس سے کچھ لوگوں کی علمی قابلیت کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ اور قلمی دوست بن جاتے ہیں: بلکہ یوں کہوں تو بے جا نہ ہوگا کہ کچھ نئی باتیں بھی علم میں آتی ہیں اور یوں یہ رسالہ فیض پہنچا رہا ہے۔

سید محمد زیدی ایڈووکیٹ (ساہیوال)

حضرت برادر گرامی قدر علامہ صاحب

السلام علیکم ورحمتہ اللہ وبرکاتہ

"القلم" کا شمارہ ۵ موصول ہوا۔ سرورق سے جس قدر جاذبیت عیاں ہے اس سے کہیں بڑھ کر اس میں شائع ہونے والے مضامین کی دل پذیری ہے۔ واقعی حقیقی معنی میں یہ ایک علمی، ادبی، ثقافتی اور تحقیقی جریدہ ہے۔ امید ہے کہ آپ کے زیرِ سرپرستی اس کا Tempo اور Getup اسی طرح برقرار رہے گا۔

سفرنامہ لندن کے ذریعے جہاں ایک طرف آپ نے برطانیہ میں نشر و اشاعت علوم حضرات محمدؐ وآلِ محمد علیہم السلام کے بارے میں تازہ ترین اطلاعات بہم پہنچائی ہیں۔ وہیں دوسری طرف جواب مکاتیب کے ذریعے اردو مرثیہ کی ترقی، ہندوستان و پاکستان کے مختلف علاقوں میں فن مرثیہ گوئی کی ترویج اور لکھنؤ کے تہذیبی ورثے کے بارے میں ایسی Informations قارئین تک پہنچائی ہیں جو اس سے پہلے علم میں نہ آئی تھیں۔

میری نگاہیں مستقبل کے اس دور پر لگی ہوئی ہیں جہاں یورپ و امریکہ میں اردو ادب بالخصوص اردو زبان آپ کی بدولت ترویج پائے گی اور لندن میں رہنے والے اتنے ہی انیس شناس ہو جائیں گے جتنے لکھنؤ کے ادب شناس۔

باقر علی روش لکھنوی عرف شلّن صاحب (لکھنؤ، بھارت)

برادرم ضمیر اختر صاحب..... آداب و نیاز

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

"القلم" شمارہ نمبر ۵ کے وسیلے سے آپ کے والد ماجد سید ظہیر حسن صاحب نقوی دام اقبالہ کی خبرِ وفات پڑھ کر دلی صدمہ ہوا۔ خداوند کریم مرحوم کو جوارِ محمدؐ میں جگہ دے اور آپ کو صبرِ جمیل عطا کرے۔ آمین۔ میری اور میرے بھائی جعفر لکھنوی کی طرف

سے تعزیت قبول فرمائیں۔

''القلم'' کا شمارہ ۵، برادر عزیز جناب سید حیدر نواب جعفری صاحب سے مانگ کر پڑھا، شمارے کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ شمارہ علمی، ادبی، تحقیقی، جواہر پاروں سے مزین ہے اور ادب کے تمام شعبوں کی آبیاری کر رہا ہے۔ یقیناً علم و ادب کے متلاشی اشخاص کے لئے بہترین تحفہ ہے۔ اچھے اچھے مضامین اور خطوط نظر نواز ہوئے۔

سلطانہ ذاکر آوا (کیلی فورنیا امریکہ)

برادر عزیز ضمیر اختر نقوی دعائیں مزاج بخیر

آپ کا میل کیا ہوا ''القلم'' ہمیں اکتوبر ۲۰۰۰ء میں ملا بہت خوشی ہوئی۔ آپ کی یاد آوری کا شکریہ۔ یہ لفظ شکریہ ان لفظوں کا احاطہ نہیں کرسکتا جو ہم کہنا چاہتے ہیں اور جو آپ کر رہے ہیں یا اس کو فی زمانہ لوگ سمجھ نہیں رہے ہیں اور جب سمجھیں گے تو قدر کیا کریں گے؟ آپ نے اس مرتبہ کے خط کو بھی ''القلم'' میں شائع کردیا گو کہ وہ خط ایسا نہیں تھا۔ اس کے لئے بھی دعائیں۔ ہم نے آپ کی کتاب ''میر انیسؔ کی شاعری میں رنگوں کا استعمال'' پوری توجہ سے پڑھی اور بار بار کچھ مضامین کو پڑھا۔ بہت خوب ہے آپ میر انیسؔ کے مزاج کو جس طرح سمجھے ہیں اور سمجھاتے ہیں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بہت ہی قریب رہا ہو اور ان کی ہر سوچ پر گہری نظر ہو اور اتنی گہرائی سے، ان کا مزاج سمجھ رہا ہو وہی ایسی تشریح کرسکتا ہے۔ کتنی چاشنی ان کے کلام میں ہے۔ اتنی ہی آپ کے کلام میں ان کے اشعار سمجھانے میں محسوس ہوتی ہیں۔ گویا وہ خود بتا رہے ہوں۔ آپ کے خطوں کے جواب میر انیسؔ کے بارے میں بہت معلوماتی ہوتے ہیں کاش، اب بھی اتنا وسیع النظر بحث کرنے والا فصاحت و بلاغت سے مرثیہ پڑھنے والا ہو؟ یہاں ہماری دعا سلام فون پر ڈاکٹر تقی عابدی صاحب (کینیڈا) سے بھی ہے۔ اپنی

کتابوں کی وجہ سے ہم بھی سونگھ سونگھ کر ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ سو اس طرح آپ کا اور آپ کی کتاب کا ذکر ان سے فون پر گفتگو میں آ گیا۔

آغا عبدالحسن سرحدی (فیصل آباد)

بخدمت محترم جناب مستطاب سلالۃ الاطیاب علامہ سید ضمیر اختر نقوی دامت معالیکم السامیہ السلام علیکم۔ تحفہ یا علی مدد

بعد از طلب خیریت و دعائے صحت و عافیت واضح ہے کہ "القلم" کا شمارہ ۵ ملا سبحان اللہ کیا ہی خوب ادبی و فکری مجلہ ہے اس کے شاندار اجراء پر ہدیہ تبریک قبول فرمائیں۔

والقلم (حرمت قلم کی قسم)

اس کی ظاہری دلکشی اور معنوی زیبائی آپ کے حسن اور باطنی رعنائی کی آئینہ دار اور غماز ہے۔

ترے ضمیر کے اختر کی ہر طرف ہے چمک — یہ شمع نور فشاں تو نے ہی جلائی ہے
قلم کی نوک ستاروں کی روشنائی سے — حکایت ایسی لکھی جو سبھی کو بھائی ہے

سچ بات تو یہ ہے کہ قلم کے حوالے سے آپ ایک برق آسا اور پرضیا کہکشاں آباد کر رہے ہیں جس کی روشنی میں اردو داں اور اردو خواں حضرات کا قافلہ با آسانی اپنے اہداف اور منزل کی طرف بڑھ سکے گا۔

این کار از تو آید و مرداں چنیں کنند

آپ مدت سے رثائیہ ادب اور عزائیہ فکر کا قلم و علم اٹھا کر بحمد اللہ جہاں خود کو اس دنیا کا ڈاکٹر اور متخصص منوا چکے ہیں۔

وہاں انیسیات کی دنیا میں اپنی دھاک بٹھا کر اپنے کو فکر انیس کا صحیح وکیل انیس و

جلیس بھی ثابت کر چکے ہیں۔

اور پھر بڑی خوشی کی بات تو یہ ہے کہ آپ نے "القلم" کے زیر عنوان اپنے گلشن فکر کو گلوبل ولیج (GLOBAL VILLAGE) بنا دیا ہے۔ جس میں دنیا جہاں کے ہمہ جہت لکھاری ہی قلم بدست نظر نہیں آ رہے بلکہ قاری کے لئے آپ کی کمال جانکاری اور فنکاری بھی کارفرما اور جلوہ مست نظر آ رہی ہے۔

خطاب و کتاب کے دونوں شعبوں میں متوازی اور متواتر خدمات کو دیکھ کر اب یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا ہے کہ آپ خطیب بڑے ہیں یا شاعر و ادیب۔ بفضلہٖ تعالیٰ آپ محض نام کے ہی ضمیر اختر نہیں بلکہ معیاری کام کے سبب بھی آپ کا اختر فکر کمال عروج پر ہے۔

تیرے ضمیر کا اختر بڑے عروج پہ ہے　　　خدا کرے کہ سدا یونہی بے زوال رہے

خلش پیر اصحابی۔ پیر اصحاب (جہلم۔ پنجاب)

عزیز محترم جناب سید ضمیر اختر نقوی صاحب مدظلہ

سلام خلوص دعائیں

سنا تھا نہ دیکھا تھا۔ مگر اب نہ دیکھا تھا "نہ دیکھیں گے جو دیکھا اس رسالے میں" شمارہ نمبر ۵، القلم، باصرہ نواز ہوا، خلش نوازی کا شکریہ ہی شکریہ ہمیں تو آپ کے تبحر کا علم تھا ہی۔ شکر ہے اب ساری دنیا آپ کو مان گئی ہے۔ اللہ کرے زور قلم اور زیادہ قبلہ سید ظہیر حسن صاحب (آپ کے والد ماجد) کے انتقال کا علم ہوا اور بڑا دکھ ہوا۔ خدا وارثان کو صبر جمیل اور ان کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے۔ (آمین)

شمارہ نمبر ۵ کے تمام مضامین پڑھے اور اداریہ بھی، سبحان اللہ، تمام مضامین بہترین ہیں، خطوط معلوماتی اور فائدہ بخش ہیں، خاص کر "میر انیس کی مرثیہ میں حرفت پسند آیا۔

میر انیس کے مطالعہ میں غالباً یہ ایک نئی سوچ ہے۔

آپ کی کتاب "میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال" چھپ گئی ہے مگر مجھے محروم رکھا گیا ہے۔

بشیر ہاشم کے تجاہل عارفانہ کا بھی علم ہوا آپ نے جو منہ توڑ بلا تردید جواب لکھا قابل تحسین ہے اور لاجواب بھی۔

میں آپ کو علامہ سمجھتا ہوں آپ کے ساتھ خطوط اب تک میرے پاس موجود ہیں خوش ہوں کہ آپ اردو ادب کے ساتھ ساتھ رجالی ادب کی بھی بے مثال خدمت انجام دے رہے ہیں۔

قمر حسین رضوی (جاجمو، کانپور، بھارت)

عزیزم ضمیر صاحب

ڈھیر ساری دعائیں

"القلم" شمارہ ۵ ڈاک سے موصول ہوا بہت شکریہ۔ دیدہ زیب بھی ہے اور ادبی بھی آپ نے میرا خط بھی شائع کیا اور جواباً اپنا خط بھی۔ آں عزیز کی یادداشت کا جواب نہیں میں آپ کا بھولے بھائی تھا اور ہوں نصیر اور نرجس کی شادی کو ۳۵ برس ہو گئے۔ اتنی مدت تک آپ کے ذہن میں محفوظ رہا حیرت انگیز بات ہے عند الطلب والد مرحوم عترت حسین عاشق کا مرثیہ بھیج رہا ہوں ۵۰ سال قبل کا تحریر کردہ ہے اسی کے ساتھ "نار وصال" کی ۲ جلدیں اور "نشاط غم" کی ۲ جلدیں آں عزیز کی لائبریری کے لئے تحفتاً بھیج رہا ہوں "نار وصال" والد مرحوم کی اردو ۱۰۰ غزلوں اور فارسی کی ۳۰ غزلوں کا مجموعہ ہے اور "نشاط غم" خود میری ۱۲۱ غزلوں کا مجموعہ ہے یقین ہے کہ پسند آئے گا ۲ مضمون بھی بھیج رہا ہوں۔

علی گڑھ میں مہدی بھیا نے آپ کی ضخیم کتاب خاندان انیس کے شعرا کے بارے میں دی تھی دھیان سے پڑھی آپ کی کاوشوں کی جتنی داد دی جائے کم ہے اسی کتاب سے میر نفیس کے مرثیے کی فوٹو کاپی کروالی ہے یہ مرثیہ میرے پاس نہیں تھا اس کا مطلع ہے۔

مری زباں کو شرف مدح پنجتن سے ملا

اصغر نقوی (مصطفےٰ آباد ضلع رائے بریلی بھارت)

محترم علامہ ضمیر نقوی صاحب

آداب ودعا۔

آپ کی تصویر میں آپ کی دستار بندی اور اس کی فضیلت کے پیش نظر اب ہمت نہیں پڑ رہی کہ آپ کو (تم) کہہ کر مخاطب کروں کہ یہی ہماری آبائی تہذیب ہے۔

آپ کا رسالہ "القلم" برابر مجھے مل رہا ہے۔ اس رسالہ میں آپ نے میرے تصنیف کردہ مرثیہ کو جگہ دی اور پھر تنقید کا جواب بھی بے حد معقول دیا۔ آپ کی بڑی نوازش ہے۔ میں تہہ دل سے مشکور ہوں۔

ظفر الحسن جلالپوری (جے پور، بھارت)

ادیب عصر دانشمند محترم علامہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب قبلہ

سلام ونیاز

الحمد للہ رسالہ "القلم" میری معلومات کے لئے "علم بالقلم" ہے گلابی نگری میں رہ کے ہندوپاک کے مومنین کے آواگون سے آپ کی ادبی شخصیت نے مجھے بے حد متاثر کیا ہے آج گفتگو تحریری ہو رہی ہے انشاء اللہ کبھی ضرور بالمشافہ ہوگی ایک "منقبت"

دوسری "نظم" اشاعت کے لئے پیش خدمت ہے امید ہے کہ قابل قدر مقام عطا فرمائیں گے۔

جے پور کی مختلف ادبی سوسائٹی کو آپ کی تخلیقات کی ضرورت ہے امید ہے کہ ارسال فرمائیں گے عین کرم ہوگا۔

القلم (شمارہ۔۶) پر تبصرے

پروفیسر ڈاکٹر نثار احمد (مرادآباد، انڈیا)

قابل صد احترم ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی

خلوص و سلام

علی گڑھ میں آپ کے علم و فضل کی تعریف پروفیسر ابوالکلام قاسمی، طارق چھتاری ڈاکٹر قمر الہدیٰ فریدی اور ڈاکٹر شافع قدوائی وغیرہ سے سنتا رہا ہوں۔ یہاں مرادآباد میں آپ کے عقیدت مندوں میں عروض داں ڈاکٹر عارف حسن خان اور جواں سال ادیب تنویر عباس بھی ہیں جن کی زبان آپ کی اور آپ کے رسالے کی تعریف کرنے میں تھکتی نہیں ہے۔

براہ کرم مجھے بھی اپنے حلقۂ ارادت میں شامل کرنے کی زحمت کریں۔ مؤقر رسالہ القلم کیلئے اسرار الحق مجازؔ پر ایک تنقیدی مضمون بھیج رہا ہوں توقع ہے کہ کسی قریبی شمارے میں ضرور اسے جگہ دیں گے۔

آل میر انیسؔ سید علی احمد دانشؔ (لکھنؤ۔انڈیا)

جناب سید ضمیر اختر نقوی صاحب...... السلام علیکم!

امید ہے بفضل خداوند آپ بعافیت ہوں گے۔ ''القلم'' کا چھٹا شمارہ ہمیں سید نصیر رضا صاحب سے مل گیا تھا۔ ہر شمارہ اپنی اپنی جگہ انفرادیت رکھتا ہے۔ زیر نظر شمارہ نمبر ۶ میں سید نصیر رضا صاحب کا مضمون ''حکیم آغا حسن ازل'' بھی تحقیقی ہے اور ابھی تک اس نوعیت کا کام ان پر نہ ہو سکا تھا۔ اور آپ کے مضامین بھی خاصے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آپ کی تصنیف ''کلام انیس میں رنگوں کا استعمال'' پڑھی۔ بھئی آپ کیا کیا نکات ضبط تحریر میں لائے ورنہ آج تک عام قاری کا رجحان میر انیس کے کلام کے اس گوشے کی طرف نہیں گیا تھا۔ خدا آپ کو رو بصحت رکھے اور جس تیزی کے ساتھ آپ اردو مرثیہ کو آگے بڑھا رہے ہیں اس کا اجر آئمہ معصومینؑ ہی دیں گے۔ انسان کے بس کی بات نہیں کیونکہ مرثیہ ہی ان کا پسندیدہ موضوع تھا اور ان معصومینؑ نے اگر اس عہد کے شعراء سے کسی چیز کی فرمائش کی تو یہی کہ ''تم میرے جد کا مرثیہ کہو میں سنوں گا'' آپ سنا بھی رہے ہیں اور نشر و اشاعت میں بھی مصروف ہیں۔

ڈاکٹر سید حسن عباس (گوپال پور، بہار، بھارت)

محترم جناب علامہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب،

السلام علیکم

بعد از سلام امید کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ القلم کا چھٹا شمارہ بہت پہلے مل گیا تھا اور میں رسید بھیجنا چاہتا تھا مگر بعض وجوہ کے سبب تاخیر پر تاخیر ہوتی گئی۔ القلم کے اس شمارے میں شامل اشاعت تمام مضامین خاص کر آپ کے سفرنامے خاصے کی چیز ہیں اور لائق مطالعہ بھی۔ نیساں اکبر آبادی کا جدید مرثیہ بھی خوب ہے۔ مجھے نیساں صاحب کا پتہ مطلوب ہے امید ہے ضرور لکھیں گے۔ اور اک شمارہ ۱ میں میں نے نیساں اکبر آبادی کی تاریخ گوئی پر سرور انبالوی کا مضمون شائع کیا تھا جسے یہاں بہت

پسند کیا گیا۔ ازل لکھنوی کا مرثیہ بھی شائع کر کے آپ نے اور سید نصیر رضا نے اہل علم خاص کر اردو مراثی سے دلچسپی رکھنے والوں پر کرم فرمایا۔ اس شمارے کے خطوط بھی بہت معلوماتی ہیں۔ "بہار میں اردو مرثیہ نگاری" یہ میرے ڈاکٹریٹ کے تحقیقی مقالے کا عنوان تھا۔ آپ نے میرے خط (مطبوعہ شمارہ ۶) کے جواب میں تحریر فرمایا ہے کہ سید نظیر حسن نظیر غازی پوری، غیور اور سلطان کے غیر مطبوعہ مراثی آپ کے ذخیرے میں ہیں۔ کیا ممکن ہے کہ ان کے عکس مجھے فراہم کرادیں۔

پروفیسر ڈاکٹر ظفر ہاشمی (کراچی)

مشفق مکرم

سلام مسنون

آپ کا "القلم" شمارہ نمبر ۶ نظر نواز ہوا مگر اس فردوس نظر کو کس کی ایسی نظر لگ گئی کہ ایک عقیدت مند چند دنوں کے لئے لے گئے مگر مہینوں بعد واپس کیا ہے۔

خط نہ لکھنے کی وجہ میری کوتاہی سہی لیکن جس کرب خجالت سے میں دوچار رہا اس کی تلافی سوائے اس کے اور کیا ہو سکتی ہے کہ آپ اپنے ترحم خسروانہ نہیں عفو علویہ سے سرفراز فرمائیں۔

اداریہ، مکتوبات اور مضامین ردائے قرطاس پر ستاروں کی طرح جگمگا رہے ہیں۔ امید واثق ہے کہ "فیضان ثلاثہ" کے فضائل وجدان سے محروم نہیں رکھیں گے۔

کہاں میں اور کہاں "القلم" کی بزم ادب
کمال میرا نہیں، معجزہ "ضمیر" کا ہے

القلم (شمارہ۔۷) پر تبصرے

پروفیسر ڈاکٹر اطہر رضا بلگرامی (شعبہ معاشیات، جامعہ ملیہ، دہلی)

محترم ضمیر اختر بھائی.........آداب

آپ کا ''القلم'' شمارہ ۷ موصول ہوا۔ بے چینی سے انتظار کر رہا تھا یا تو تاخیر سے شائع ہوا یا تاخیر سے ملا۔ ابھی پڑھ کر ختم کیا۔ اس بار شمارہ میں اعتراضات و جواب اعتراضات کا ماحول زیادہ نمایاں ہے۔ ایسی فضا میں خالص تحقیقاتی کاوش گم سی ہوجاتی ہے۔ آپ نے اپنا سفر نامہ کیوں نہیں لکھا۔ آپ نے ایک دلچسپ پہلو سے محروم رکھا۔

آپ کا مضمون مرثیہ کی تاریخ میں بیگمات اودھ کا حصہ ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کی تحقیقات کا انتہائی جامعہ وتنقیدی جائزہ ہے۔ اکبر حیدری صاحب کو تحقیق کے معیار کا احساس ہوجانا چاہیے۔ امید ہے مرثیوں کی تاریخ میں مروجہ اسی طرح کی تمام کوتاہیوں کا آپ آئندہ بھی پردہ فاش کرتے رہیں گے۔

طارق حبیب (سرگودھا)

بہت محترم سید ضمیر اختر نقوی صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہٗ

ادبی رسائل کی موجودہ روایت کے برعکس ''القلم'' کا مزاج منفرد بھی ہے اور دلچسپ بھی لیکن مخصوص دائرۂ کار کے باعث کئی ایک (مجھ جیسے) چاہنے والے بھی قلمی شمولیت اختیار کرنے سے شائد محروم ہی رہیں۔ کیونکہ آپ نے نسبتاً مشکل اور دوسروں

سے الگ راہ نکالی ہے۔

ابوالامتیاز ع س مسلم (کراچی)

مکرم و محترم اختر نقوی صاحب، السلام علیکم۔

گزشتہ دنوں ڈاک سے آپ کے علمی ادبی اور تحقیقی جریدہ ''القلم'' کا شمارہ ۷ موصول ہوا۔ میں سراپا سپاس ہوں کہ آپ کے ادارے نے اس گوشہ نشین کو اس قابل سمجھا کہ اپنی اس گراں قدر تخلیق سے نوازیں۔

مضامین، ترتیب، کاغذ، معیار تحریر اور حسن طباعت سب ہی قابل تعریف ہیں۔ اللہ آپ کو اور آپ کے ادارے کو توفیق مزید سے نوازے۔

ڈاکٹر عزیز عباس (شعبۂ اردو، امرتسر یونیورسٹی، بھارت)

محترمی نقوی صاحب...... سلام علیکم

امید ہے بخیر و عافیت ہوں گے۔ ''القلم'' کراچی کا شمارہ نمبر ۷ ملا۔ بہت بہت شکریہ۔ اگر میں اس کا زر سالانہ ارسال کرنا چاہوں تو کس طرح؟ مجھے بتائیں کہ ڈرافٹ بنواؤں یا پھر اور کوئی طریقہ ہے۔ کیونکہ اس میں ہندوستان کے لئے زر سالانہ کا کوئی خانہ نہیں ہے۔

اس میں شائع بھی مضامین معیاری ہیں۔ خاص طور سے پروفیسر ظل صادق اور پروفیسر جعفر رضا کے مضامین بہت پسند آئے۔

کوشش کرونگا آئندہ شمارہ کے لئے مضمون لکھوں۔ میرا تعلق جارچہ سے ہے اور جارچہ میں کافی مرثیہ گو شعراء ہوئے ہیں۔ لیکن ان پر ابھی تک کچھ نہیں لکھا گیا۔ میری کوشش ہوگی کہ جارچہ کی عزاداری اور مرثیہ گوئی پر مضمون لکھوں اور ''القلم'' کے ذریعہ

قارئین تک پہنچاؤں۔ امید ہے آئندہ مجھے یاد رکھیں گے۔

ڈاکٹر اسد اریب (ملتان)

حسینی ادب وتہذیب کے پاسدار اجناب ضمیر اختر نقوی

القلم کے شمارہ ۷ کو دیکھ رہا ہوں۔ آپ جیسے شائستہ، لطیف الخیال، خلیق اور ادب آگاہ افراد کی نظامت میں اشاعت پذیر ادب کے بعض مقامات پر لہجے کی شدی اور بیان کی تیزی دیکھ کر جی گھبرا سا جاتا ہے۔ ہر چند کہ حقائق واقعات درست تر اور سب باتیں آپ کی بجا ہیں۔

خلش پیر اصحابی (جھنگ، پنجاب)

القلم کا شمارہ نمبر ۷ موصول ہوا، تمام کے تمام ۴۰۰ صفحات ایک مسخرہ، بیہودہ گو ذلیل شخص کے لیے وقف کر دیے گئے۔ ہاں ایک مضمون پڑھنے کو ضرور ملا ''برصغیر میں عزاداری کے ابتدائی نقوش''

حسن لکھنوی

کون ہے بہتر

دقائق کے دلائل میں جو پوچھو کون ہے بہتر
تو میں برجستہ کہہ دوں گا ضمیر اختر، ضمیر اختر

❁❁❁

ذکی عابدی

جنت کے خریدار

مومن سے کوئی مومنِ دیندار بنے
مومن ہی نہیں ذاکرِ کردار بنے
صدقے میں حسینؑ کے ضمیر اختر نقوی
سب بیچ کے جنت کے خریدار بنے

اقبال حسین اقبالؔ

معجزے کی زباں

بولے ہیں ضمیر اختر معجزے کی زباں
فرشِ عزا پہ ہم کو دکھاتے ہیں وہ سماں
جیسے کہ ہر اک دور میں موجود رہے ہوں
تاریخ، تشیع کی کرتے ہیں یوں بیاں

منظوم خراجِ تحسین

ضمیر اختر نقوی خود اپنی نظر میں

خورشید بلاغت میں ضیا ہے مرے دم سے رنگین فصاحت کی قبا ہے مرے دم سے

تہذیب و تمدن میں جلا ہے مرے دم سے روشن ادب و فن کی فضا ہے مرے دم سے

کاغذ ہی پہ کیا حرف قلم میں نے رکھا ہے

معیار خطابت کا بھرم میں نے رکھا ہے

ہر زخم دل قوم کا مرہم ہے مری ذات نثر و سخن و نظم کا سنگم ہے مری ذات

منبر کے حوالے سے مکرم ہے مری ذات صد شکر کہ فخر بنی آدم ہے مری ذات

دنیا نہ سمجھ پائی اثر زور ہنر کا

چرچا ہے مگر پھر بھی مرے فکر و نظر کا

بہتا ہے اشاروں پہ مرے علم کا دھارا ہر جھوٹی روایت کو میں کرتا ہوں دو پارا

منکر کی فنا ہے مرے ابرو کا اشارا معصوم کی عظمت میں کمی کب ہے گوارا

خطبات کو دھارے مرے لہجے سے ملے ہیں

کیا کیا سر گلزار ادب پھول کھلے ہیں

احساس کو تحریر کیا جس نے وہ میں ہوں　　تحریر کو تقریر کیا جس نے وہ میں ہوں
ہر لفظ کو زنجیر کیا جس نے وہ میں ہوں　　تاریخ کو تسخیر کیا جس نے وہ میں ہوں

ایسی کوئی بالغ نظری ہو تو دکھاؤ
ہمسر مرا دنیا میں کوئی ہو تو دکھاؤ

ہر سانس تھی وابستہ مری کسبِ ہنر سے　　ذہنوں کے دریچے کھلے مضموں کے اثر سے
تائید یہ حاصل ہوئی خود علم کے در سے　　تنویر ملی ہے افقِ نورِ سحر سے

وہ اور ہیں جو گم ہیں سرابوں کی فضا میں
میں سانس بھی لیتا ہوں کتابوں کی فضا میں

میں وہ ہوں ملا جس کو ہنر عشقِ علی سے　　کانٹوں کو بنایا گلِ تر عشقِ علی سے
اُبھرا ہے یہ اُلفت کا شجر عشقِ علی سے　　مربوط جو ہے قلب و نظر عشقِ علی سے

محشر میں بھی بخشش کا سبب عشقِ علی ہے
فردوس نہیں میری طلب عشقِ علی ہے

جب ذکرِ علی مطلعِ قرآں نظر آیا　　ہر لفظ مرا ماہِ درخشاں نظر آیا
اس ذکر سے ہر اوج کا امکاں نظر آیا　　قرطاس ولا تختِ سلیماںؑ نظر آیا

یوں دولتِ ایمان سے دل بھر دیا میں نے
زر مانگا تھا مجھ سے دلِ بُوذر دیا میں نے

اے چشمِ فلک دیکھ مرا ملکِ سخن دیکھ　　اے محفلِ انجم مرے لفظوں کا چمن دیکھ
اے چاند مرے نورِ قلم کا بھی چلن دیکھ　　سُورج مرے خورشیدِ تخیل کی کرن دیکھ

اس نور کی زد پر تو ہے وہ بھی جسے کد ہے
تا نہجِ بلاغہ مرے اس ملک کی حد ہے

منبر ہے مرا تخت مرا تاج علم ہے　　مجلس مرا دربار ہے یہ جاہ و حشم ہے
قبضے میں مرے دولت قرطاس و قلم ہے　　یہ اوج عقیدت مرے مولا کا کرم ہے

یہ ملک اور اس ملک سے جو کچھ بھی ملا ہے
سب فخر سلیمانؑ کی غلامی کا صلا ہے

ساغر لکھنوی

لکھنؤ میں ضمیر اختر کا استقبال

بسلسلۂ جلسۂ استقبالیہ بخدمت اختر ادب عالی جناب سید ضمیر اختر صاحب نقوی

(منجانب: دبستانِ مرثیہ خوانی لکھنؤ)

قطعہ

سارے جہاں میں بزم ادب میں ہو انتخاب | اہلِ زباں میں بھی نہ کوئی اس کا ہو جواب

غواصِ بحرِ علم جو ہے اخترِ ادب | روشن ہو عرشِ علم پہ اب مثلِ آفتاب

نظم در صنعتِ توشیح

ا — آپ سمجھے ؟ کون آیا ہے یہاں عالی وقار

س — ساری محفل ہو رہی ہے کس لئے باغ و بہار

ت — تازگی سی ہے دلوں میں تازہ غنچوں کی طرح

ق — قابلِ صد فخر ہے باغِ مسرت کا نکھار

ب — بابِ شہرِ علم کا آیا ہے کیا ذاکر کوئی

ا — آسماں بھی جس کی رفعت دیکھ کے ہے شرمسار

ل — لائقِ تحسین ہو پھر کیوں نہ اس کا رتبہ داں

ی — یوسفِ ایماں کی الفت کا ہو دل جس کا شکار

ہ — ہم سمجھتے ہیں وہی ہے دو جہاں میں سرفراز

استقبالیہ

ا احمدؐ مرسل کے دلبر سے جو رکھے دل میں پیار
خ خاصِ آلِ عبا کا جو بھی ہوتا ہے غلام
ت تاجداروں سے بھی بڑھ جاتا ہے پھر اس کا وقار
ر روشنی سے حق کی ہو جاتی ہے تابندہ حیات
اختر

ا آفتابِ دیں کا جو دل سے ہوا ہو جاں نثار
د دارِ دنیا میں سمجھ لو بس وہی ذی ہوش ہے
ب بانیٔ اسلام کے دل کا جو ہو خدمت گزار
ادب

ض ضوفشاں ہے آفتابِ مرثیہ خواں ہو کے جو
م مرثیہ خوانی میں ہے جو لکھنؤ کا شاہکار
ی یہ ہوا ہے اس کی کوشش سے ہی استقبالیہ
ر روز و شب جو مرثیہ خوانی پہ ہے دل سے نثار
ضمیر

ا اخترِ علم و ادب ہو کیوں ضمیر اختر نہ پھر
خ خوش بیاں، خوش فکر ہے یہ خوش سیر جب خوش شعار
ت تاجدارِ کشورِ علم و ادب ہو ایک دن
ر رہبرِ راہِ سخن ، اخترِ ادب کا ذی وقار
اختر

استقبالیہ اخترِ ادب ضمیر اختر

مرزا فرزند علی عرف ننھے آغا تاثیرؔ لکھنوی:

دُھن کے پکّے، عزم واستقلال کے کوہِ گراں

ہیں ضمیرِ اختر، خدا رکھے! غلامِ پنجتنؑ
تذکرے تو ہیں اسی باعث چمن اندر چمن

خوبیوں سے دستِ قدرت نے سنوارا آپ کو
ارتقائی منزلوں نے خود پکارا آپ کو

لکھنؤ تشریف لائے پاک سے بندہ نواز
ہم کو اپنے مشوروں سے کر دیا ہے سرفراز

یوں ابھر کر جوہرِ ذاتی فسانہ ہوگیا
علم وفن کا آپ کی قائل زمانہ ہوگیا

دُھن کے پکّے، عزم واستقلال کے کوہِ گراں
خادمِ علم و ادب، مخدومِ ہر خورد وکلاں

پیکرِ انسانیت، علم و عمل کی شاہراہ
آپ کی اس قابلیت پر ہر اک عالم گواہ

آپ کے تحقیق کرنے کا عجب انداز ہے

ہر انیس اور دبیری آج ہم آواز ہے

علم و فن کا آپ نے اپنا دیا ایسا ثبوت

دشمنوں کے دل پہ چھایا ہے ندامت کا سکوت

اس بدلتے دور میں یہ شان و حکمت آپ کی

ہے زمینِ پاک کو ہر دم ضرورت آپ کی

بہ اعزاز علامہ ضمیر اختر نقوی لکھنؤ کے عظیم الشان اجلاس میں یہ نظم پڑھی گئی۔

حضرت نخشن فتح پوری

مثالِ چشمۂ زم زم

قلم کے نامور ضیغم ضمیر اختر ضمیر اختر
ہیں گویا پیکرِ انعم ضمیر اختر ضمیر اختر
حریمِ علم کے محرم ضمیر اختر ضمیر اختر
خطیبِ نیّرِ اعظم ضمیر اختر ضمیر اختر
کتب بینی بقا اُن کی کتب بینی غذا ان کی
بقا کی فکر میں ہر دم ضمیر اختر ضمیر اختر
انوکھی فکر سے مِلّت کو یہ سیراب کرتے ہیں
مثالِ چشمۂ زمزم ضمیر اختر ضمیر اختر
جو عالمِ ظاہری ہیں اور فطرت میں وہ بزدل ہیں
ہیں ان کے واسطے ضیغم ضمیر اختر ضمیر اختر

maablib.org

کلیم آلِ عبا شاہد نقوی

قطعۂ تاریخِ تصنیف

"اردو مرثیہ پاکستان میں"

(در صنعتِ توشیح)

اردو:

ا	ایک مدت تک رہا صیدِ حقارت مرثیہ	اس کے چہرے پر غبارِ وقت کا غازہ رہا
ر	راہ کا پتھر سمجھ کر اس کو ٹھکرایا گیا	بند ایوانِ ادب کا اس پہ دروازہ رہا
د	داستانِ درد کی آفاقیت سمجھی گئی	صرف اک فرقے کا، اک مخصوص حلقے کا ادب
و	وقت کے نقادِ فن تحقیر سے کہتے رہے	اعتقادی گیت ہیں یہ مرثیے، کیسا ادب

مرثیہ:

م	مرکزِ تحسین ہر صنفِ سخن اس کے سوا	مرثیہ شامل نہ ہو پایا درِ اصنافِ سخن
ر	رد کیا اس کو ادب کے ہر ادارے نے مگر	مرثیے سے جگمگائے اردو کے سب اطرافِ سخن
ث	ثقلِ اکبر کی طرح ابھرا وہ قرآنِ سخن	سارے نغمے جس کے آگے سر جھکا کر رہ گئے
ی	یوں فضائے شعر پر لہرائے انوارِ انیس	جتنے تارے تھے فلک پر، جھلملا کر رہ گئے
ہ	ہٹ گئے پتھر، بڑھا جب مرثیے کا قافلہ	اور ادھر ابھری افق پر قوسِ پاکستان کی

پاکستان:

پ	پیشِ اربابِ نظر تھا جب تقاضا وقت کے	آ گئی رکی عقیدوں میں جھلک عرفان کی

ا   اب بڑھے تقلید سے تنقید کی جانب قدم   ذوق طے کرنے لگا فکر و نظر کے مرحلے

ک   کارواں کو یاں لے آل رضا، جوش و نسیم   منزل نو کی طرف جو مرثیے کو لے چلے

س   سر بکف اس راہ میں تنہا نہ تھے یہ رہنما   قافلے کو ہر قدم پر راہ رو ملتے رہے

ت   تھے جو نادر رنگ حوالے کر کے ان کو ایک جا   پھول کچھ جولاں گہ تاریخ میں کھلتے رہے

ا   ان میں کر کے شاعران عہد نو کا تذکرہ   شاعروں پر ملک پاکستان کے احساں کیا

ن   ناز کرتے ہیں ادب کے ناز پرور وہ ضمیر   تم نے ان سب کے بجائے فن کا ہے ساماں کیا

میں:

م   مختصر یہ ہے کہ ہر منزل پہ ارباب نظر   بھر رہے ہیں مرثیے کو نو بہ نو افکار سے

ے   یہ ادب پرور، یہ اردو ساز، یہ معمار فن   اب قدم رکتے نہیں ان کے کسی دیوار سے

ن   ناز کے قابل ہیں یہ معمار جن کی فکر نے   مرثیے کو دے دیا جو کچھ بھی تھا امکان میں

دیکھتی ہے دنگ سے اب اس کو ہر صنف سخن   کیسا اردو مرثیہ نکھرا ہے "پاکستان میں"

.........۱۹۸۳ء.........

رہبر ہاشمی

فکر کا کارواں ضمیر اختر

قوم کے نوجواں ضمیر اختر
فکر کا کارواں ضمیر اختر

آپ ہی محفلوں کی زینت ہیں آپ ہی مجلسوں کی ندرت ہیں
آپ ہی صاحبِ بصیرت ہیں علم کے قدرداں ضمیر اختر
قوم کے نوجواں ضمیر اختر
فکر کا کارواں ضمیر اختر

ہیں ادیبوں میں بے نظیر ادیب ہیں خطیبوں میں بے مثال خطیب
اہلِ دانش میں ہیں عجیب و غریب سب کے روحِ رواں ضمیر اختر
قوم کے نوجواں ضمیر اختر
فکر کا کارواں ضمیر اختر

شانِ یکتائیِ زمانا ہیں خود حقیقت ہیں، خود فسانا ہیں
ہوش مندوں میں گویا دانا ہیں نطقِ شیریں بیاں ضمیر اختر
قوم کے نوجواں ضمیر اختر
فکر کا کارواں ضمیر اختر

سطحِ اعلیٰ پہ ہے جو ان کا خیال ذہن و ادراک پر عبور کمال
گفتگو پر کبھی نہ ہوگا زوال رمز کے رازداں ضمیر اختر

قوم کے نوجواں ضمیر اختر
فکر کا کارواں ضمیر اختر

منفرد سب سے گفتگو ان کی نکتہ دانوں میں آبرو ان کی
حرفِ اعلیٰ ہے جستجو ان کی بحر ہیں بے کراں ضمیر اختر

قوم کے نوجواں ضمیر اختر
فکر کا کارواں ضمیر اختر

نام و اکرام کے نہیں خواہاں دور رہتے ہیں ان سے سود و زیاں
حق نوائی پہ گام زن ہے زباں حق کے ہیں پاسباں ضمیر اختر

قوم کے نوجواں ضمیر اختر
فکر کا کارواں ضمیر اختر

سر پہ سایہ ہے ربِّ اکبر کا ان پہ فیض و کرم ہے سرورؐ کا
ذکر کرتے ہیں کُل کے رہبر کا ذکر کے جانِ جاں ضمیر اختر

قوم کے نوجواں ضمیر اختر
فکر کا کارواں ضمیر اختر

❁❁❁

جناب اقبال ظفر (خویش حضرتِ مولانا کلب حسین اعلی اللہ مقامہٗ)
(مرحوم اقبال ظفر، ماکی جائسی کے فرزند اور مولانا حسن ظفر کے والد تھے)

جدید طرزِ خطابت

فلسفہ آلِ محمدؐ کا بیاں کرتے ہیں
کر دیا قوم کو بیدار ضمیر اختر نے
اک نئی طرزِ خطابت کی بِنا ڈالی ہے
صاحبِ سیرت و کردار ضمیر اختر نے
کیسی ہوتی ہے خطابت تو ہے کیا علمِ کلام
سب پہ روشن کیا سرکار ضمیر اختر نے
حسنِ اخلاق و مروّت میں نہیں ان کا جواب
قائم ایسا کیا معیار ضمیر اختر نے
کس طرح جیتے ہیں دنیا میں محبانِ علیؑ
ہم کو دکھلا دیا خوددار ضمیر اختر نے

کلیمِ آلِ عبا شاہد نقوی

تاجِ پیشانیٔ ادب کا نگیں

کم ہوا ہوگا خاندان ایسا — حق نے جیسا انیس کو بخشا
نسل در نسل اہلِ فن ہیں جہاں — اپنے اپنے مقام پر یکتا
مستحق داد کا ہے یہ لاریب — کارنامہ ضمیر اختر کا
کہ پرو ڈالا اک لڑی میں انھیں — منتشر تھے جو دُرِ ناسفتا
اس کو پڑھ کر مجھے ہوا محسوس — جیسے پیشِ نظر ہو اک دریا
ابتدا میں لطیف و نرم روش — اور پھر آئے اک مقام ایسا
جب یہ دریا ہو بحر میں تبدیل — جس کی ہر موج ہو فلک پیما
اور پھر اس کی خوش نما شاخیں — دور تک جھومتی چلیں گویا
الغرض ایک نسخۂ بے مثل — افقِ علم و فہم پر چمکا
تاجِ پیشانیٔ ادب کا نگیں — فکر و تحقیق و فن کا شہ پارہ
میں نے چاہا کہ قطعۂ تاریخ — کہوں اس لاجواب نسخے کا
ابھی سوچا ہی تھا کہ بے آواز — مجھ سے میرے ضمیر نے یہ کہا
شاید اس میں ہو عیسوی تاریخ — دونوں مصرعے ملا کے پڑھ تو ذرا

ہیں انیس اپنے دور کے یہ سب... ۵۶۶
خاندانِ انیس کے شعرا... ۱۴۲۸

..............۱۹۹۳ء..............

ذیشان حیدر ذیشانؔ

میں لکھ رہا ہوں یہ اپنے ضمیر کی آواز
صدا ضمیرؔ کی روشن ضمیر سنتے ہیں

وہ جس کو دولتِ عشقِ علی میسّر ہے — وہ زر پرست ہو کیسے کہ وہ ابوذر ہے

ازل سے جس کی زباں پر ثنائے حیدرؑ ہے — اسی کے واسطے زیبا فرازِ منبر ہے

ادب کا راستہ اس کے لیے منوّر ہے — وہ جس کی فکر کا محور ضمیر اخترؔ ہے

بجھی نہ پیاس کسی کی تو یہ مقدر ہے — وہ اپنی ذات میں اک بے کراں سمندر ہے

شعورِ عشقِ علی ہے وہ آگہی کا کمال — کہ جس کمال کی سرحد کا نام قنبر ہے

خزاں پرست بھی اس بات کو سمجھتے ہیں — علی کے ذکر سے قائم بہارِ منبر ہے

نہ مہکے کیسے تو زنداں میں مثلِ بوئے حنا — قبائے فکر کی خوشبو سے تو معطر ہے

گداز لہجے کی ہر سو جو ہے دھنک بکھری — حدیثِ عشق تری گفتگو کا جوہر ہے

ہے میرے شعر کی قامت میں تیری زیبائی — میں کیا کہوں کہ جو احسان تیرا مجھ پر ہے

میں تیری قامتِ فن کو سلام کرتا ہوں! — طویل چھاؤں میں تیری ہر اک سخن ور ہے

خیال خاطرِ دانش وراں کے قریوں میں — نشانِ فکر ترا ہر قدم میسّر ہے

تو بانٹتا ہے قلم کو حروف کے موتی — سخنوروں کا قلم بھی ترا گداگر ہے

کمال یہ ہے کہ حدِ کمال سے بھی سوا — ہر ایک سانس کی آمد بنامِ حیدرؑ ہے

قبائے موجِ تاثر پہ یہ لکھو، ذیشانؔ!
علی کی مدح کا دفتر ضمیر اخترؔ ہے

دُرِ حسن صاحب حسنؔ جلالوی

حرفِ معتبر

•

اک دُرِ بے بدل ضمیر اختر   عالمِ با عمل ضمیر اختر
مسئلے قوم کے جو الجھے ہیں   ان کا پائندہ حل ضمیر اختر
عشقِ شبیرؑ کے احاطے سے   کیسے جائے نکل ضمیر اختر
با ادب ، با اصول و با کردار   خوش بیاں ، خوش عمل ضمیر اختر
جو یہ کہہ دے، وہ حرف پھر نہ مٹے   بات پہ ہے اٹل ضمیر اختر
ڈھونڈنے سے بھی مل نہیں سکتا   تیرا نعم البدل ، ضمیر اختر!
درِ علمی کا جو سوالی ہے   ایسا دار العمل ضمیر اختر
ہے یہ احساں، شریکِ دردِ حسنؔ   تُو تھا ہر ایک پل ضمیر اختر

پروفیسر ظلِّ صادق:

تاجدارِ سلطنتِ خطابت
علّامہ ضمیر اختر نقوی

لوحِ مدحت پہ قلم کو جو رواں کرتا ہوں
جو حقیقت ہے نہاں، اُس کو عیاں کرتا ہوں
کب بھلا مشغلۂ سود و زیاں کرتا ہوں
میں تو حقدار کی توصیف بیاں کرتا ہوں

ساری دنیا کے کتب خانے جنہیں ازبر ہیں
وہی علّامۂ دوراں تو ضمیر اختر ہیں

آنِ واحد میں ہنساتے ہیں رُلا دیتے ہیں
اپنے مجمع کو اُٹھاتے ہیں، بٹھا دیتے ہیں
رزم میں جب، صفِ صفین دکھا دیتے ہیں
کیا خطابت ہے کہ تصویر بنا دیتے ہیں

صرف عالم نہ کہو ان کو، کہ اعلم ہیں ضمیر
آپ موجد ہیں ضمیر آپ ہی خاتم ہیں ضمیر

ناز جن پر نجباء کو ہے نجیب ایسا ہے

محسنہ والدہ ہیں ان کی، نصیب ایسا ہے

فخر کرتا ہے ادب، جس پہ ادیب ایسا ہے

آپ حیران خطابت ہے، خطیب ایسا ہے

بخدا صاحب اجلال ضمیر اختر ہے

قوم کا بیش بہا لعل ضمیر اختر ہے

وسعت علم بھی ہے خوبیٔ گفتار کے ساتھ

رقص کرتی ہے صبا شوخیٔ رفتار کے ساتھ

طاعت و زہد گلے ملتے ہیں کردار کے ساتھ

علم سے پیش سدا آتے ہیں اغیار کے ساتھ

تیغ کی دھار کو یوں کند کیا کرتے ہیں

مژہ سے ڈھال کا بھی کام لیا کرتے ہیں

فلسفہ، منطق و تاریخ ہو یا ہو انساب

آپ کی ذات میں پنہاں ہے کتابوں کی کتاب

جیسے پتھر کا جگر توڑ کے پھوٹ آئے گلاب

درحقیقت، ضمیر اختر کا نہیں کوئی جواب

شعبۂ حافظے کا نظم و نسق لیتے ہیں

جتنے حفاظ ہیں وہ ان سے سبق لیتے ہیں

علی انصر رضوی:

اب ہے ضمیر اصلِ خطابت کا پاسباں

منبر ہے شاد اُس کا نگہباں ہے ضوفگن
دانائے کشف محرمِ ایقاں ہے ضوفگن
فرمانروائے مملکتِ جاں ہے ضوفگن
عرشِ عزا کا نیرِ تاباں ہے ضوفگن
کیا پوچھتے ہو شانِ خطابت ضمیر کی
جب ہو رہی ہے حق سے ہدایت ضمیر کی
روشن ہے جس سے دل وہ اُجالا ہے ضوفگن
پیکر عمل کا حوصلے والا ہے ضوفگن
شیعیت کو جس نے بڑھ کے سنبھالا ہے ضوفگن
حیدرؑ ہے جس کا چاند وہ ہالا ہے ضوفگن
نرمی مزاج میں ہے مگر دل دلیر ہے
جو شیر کردگار ہے یہ اُس کا شیر ہے

ہے با ضمیر معرفتِ اجتہاد ہے
عشقِ علیؑ میں گویا ابوذر نژاد ہے
طبعِ نفیس قاطعِ کفر و عناد ہے
ہے حافظہ غضب کا ہر اک بات یاد ہے

فیضانِ خطبۂ اسد اللہ کے طفیل
نور آفریں ہے چرخِ خطابت کا یہ سہیل

قرآں پہ دسترس ہے احادیث پر عبور
فیضِ ولائے آل سے نکھرا ہوا شعور
رُخ کی بلائیں لیتا ہے پاکیزگی کا نور
یہ رتبۂ جلیل مگر کچھ نہیں غرور

اس مردِ حق کا جشنِ پذیرائی دیکھ کر
دشمن ہیں دنگ انجمن آرائی دیکھ کر

ابلاغِ علم کا یہ سرِ منبرِ رسولؐ
مربوط ذکرِ آل خطابت کا ہر اصول
گلزارِ انتخاب میں حُسنِ عطا کا پھول
ہے راہِ بندگی میں اسے موت بھی قبول

شاعر ہے بے مثال خطیب و کلیم ہے
ہے با ضمیر ذات بھی انکی عظیم ہے

اب ہے ضمیر اصلِ خطابت کا پاسباں
اور یا علیؑ کا ورد ہے ہر دل کا ترجماں
جوشِ ولائے آلؑ میں کرتا ہے جب بیاں
بدر و اُحد کی خیبر و خندق کی داستاں

لگتا ہے جیسے سامنے میدانِ جنگ ہے
حملہ ہے شیر کا صفِ کفار دنگ ہے

❀❀❀

پروفیسر طہیر نقوی

قطعاتِ تحسین و آفرین، ارمغانِ اخلاص

نذرِ علامہ ضمیر اختر

مولا علیؑ رسولؐ و آلِ رسولؐ کے — مشکل کشا و پُشت پناہ و ظہیر ہیں
کیا کیا ظہیر کے ہیں فضائل بیاں کیجئے — بے شک ابوالبیان جناب ضمیر ہیں

----◆----
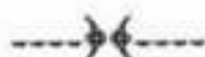
منہ میں زباں ہے یا کہ کوئی خنجر و حسام — زورِ کلام آپ پہ لاریب ہے تمام
صد مرحبا، صد آفریں علامۂ ضمیر — زیبا ہے آپ کو کہیں گر ہم ابوالکلام

----◆----
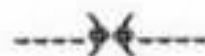
علامۂ ضمیر کے لطفِ بیان سے — اہلِ عزا کا دل کبھی ہوتا نہیں ہے سیر
زورِ بیاں سے لرزاں ہے اہلِ جفا کا دل — منبر پہ جب گرجتا ہے مولا علیؑ کا شیر

----◆----

گویا ہے کاٹ تیغ کی جُملوں کی مار میں — تاویلیں سو سو کٹتی ہیں ایک ایک وار میں
اللہ رے! خطابتِ علامۂ ضمیر — شیرِ ببر دہاڑتا ہو جیسے کچھار میں

پروفیسر ڈاکٹر ظفر ہاشمی:

قطعات

بخدمت اقدس علامہ سیّد ضمیر اختر نقوی مدظلہٗ العالی

ہدیۂ عقیدت

بہ شانِ حکمت خیرِ کثیر زندہ ہے
جہاں میں مثلِ سراجِ منیر زندہ ہے
اجل کو بھی ظفرؔ اندیشۂ اجل ہے مگر
ضمیر زندہ ہے جب تک ضمیر زندہ ہے

بہ فیضِ بارشِ انوارِ نطقِ بابُ العلم
مقامِ اہلِ قلم بے نظیر ہے لاریب
یزید نفس کی قسمت میں ظلمتِ شب ہے
نویدِ صبحِ حسین ضمیر ہے لاریب

سخن فتح پوری:

شیریں بیاں

ہے ضمیرِ اخترِ شیریں بیاں
وقت کا سب سے بڑا تاریخ داں
ہے نحیف الجثہ لیکن الاماں
علمِ تاریخی کا ہے کوہ گراں
اس نے فرسودہ روش کو چھوڑ کر
رکھ دیا ہے ذہنِ انساں موڑ کر

علی افسر رضوی:

اے پیکرِ ذہانت وایثار مرحبا

جیسے ہو ماہتاب ستاروں کے درمیاں
جیسے زمیں پہ عرش سے اُتری ہو کہکشاں
جیسے رواں ہو حرف و معانی کا کارواں
جیسے ہو علوم ذہانت کا سائباں
کہنے کو بابِ علم کا ادنیٰ فقیر ہے
لیکن اسی جہت سے یہ روشن ضمیر ہے
تقریر کو لطافتِ حُسنِ بیاں کہوں
کم ہے اگر تسلسل ابرِ رواں کہوں
نکہت کہوں بہار کہوں گلستاں کہوں
ہے بحرِ علم و فضل جسے بیکراں کہوں
ہر لفظ لاجواب ہو جب گفتگو کرے
تارے بھی توڑ لائے اگر جستجو کرے

تاریخ پر عبور ادب دسترس میں ہے
جملے لطیف حرمتِ احساس بس میں ہے
تحقیق کا شعور حصار نفس میں ہے
فکرِ جمیل ذہنِ رسا کے قفس میں ہے

گم گشتہ واقعات کے پہلو نکھار کر
موئے قلم کے رکھدیے گیسو سنوار کر

تحقیق دوسروں نے ہر اک شے پہ کی مگر
سچ کہیے دل پہ آپ کے کتنا ہوا اثر
سچائی کی تلاش ہے آتی نہیں نظر
حیراں مسافتیں ہیں ادھورا رہا سفر

تحقیق کی بنا تھے جو رشتے وہ کٹ گئے
قد تھے دراز حوصلہ والوں کے گھٹ گئے

کہتا ہے کوئی شب کی سیاہی کو روشنی
اور روشنی کو دوسرا کہتا ہے تیرگی
جائز کسی نظر میں ہے پتھر کی بندگی
ذہنوں پہ گردِ عقل پہ طاری ہے بے حسی

یہ واقعہ حدود خرد میں عجب ہوا
ہر شخص کو ہے علم کا دعویٰ غضب ہوا

لیکن حقیقتاً ہے جسے علم کا شعور
کرتا ہے تیرگی میں ہمیشہ تلاش نور
تحقیق میں مگن ہے ذرا بھی نہیں غرور
رہتا ہے جہل و کبر و عداوت سے دور دور

ان علم دوست لوگوں میں شامل ضمیر ہے
تحقیق مملکت ہے یہ اس کا سفیر ہے

بدلا ہے ہر طریق پرانے نظام کا
یہ دین ہے رسولؐ کی صدقہ امام کا
شہرہ ہے سارے ملک میں حُسنِ کلام کا
کیا زور ہے خطابتِ عالی مقام کا

سنتے ہیں اہلِ علم دو رویہ کھڑے ہوئے
الفاظ ہیں کہ نطق میں موتی جڑے ہوئے

اے پیکرِ ذہانت و ایثار مرحبا
اے جانثار سیّد ابرار مرحبا
اے کربلا کے مونس و غمخوار مرحبا
تحقیق و جستجو کے طلبگار مرحبا

تو ہم نوائے فکرِ شہ مشرقین ہے
تو ہے حسینؑ کا ترا آقا حسینؑ ہے

رکھے ترے ضمیر کا اختر صدا یونہی
رکھے تجھے اماں میں شہ لافتیٰ یونہی
کرتا رہے بیان غم کربلا یونہی
محکم رہے حسینؑ سے عہد وفا یونہی

دربار باب علم میں یوں باریاب ہو
تیری جبیں ہو اور در بوترابؑ ہو

---

maablib.org

سیّد محمد عباس صادق جعفری

"در توصیفِ جناب علّامہ سیّد ضمیر اختر نقوی"

یہ بات کہنے میں مجھ کو نہیں ہے کوئی حجاب
وہ علم کا ہیں سمندر تو میں ہوں مثلِ حباب
کروں ستائش علم و عمل میں کیسے جناب
دلوں میں بات اترنے کے ہیں کئی اسباب

کئی ہیں زاویے اسلام کے فسانے کے
طریقے سینکڑوں ہیں بات کو بتانے کے

شرافتوں کا نمونہ ہیں یہ خطیب جواں
نجابتوں کا لہو ان کے قلب میں ہے رواں
دہن میں رکھتے ہیں یہ مدحتِ علیؑ کی زباں
ہیں جیسے خود تو اسی طرح ان کی فکر جواں

نفاستوں نے وہ اعلیٰ چلن دکھایا ہے
نہ آئے جس میں فتور ایسا، ذہن پایا ہے

میں جن کا مدح سرا ہوں وہ ہیں، ضمیر اختر
یہ حلم و صبر و تحمل کا ہیں حسیں پیکر
بصد خلوص یہ ہر اک سے ملتے ہیں ہنس کر
ہیں ان کے سینے میں پوشیدہ علم کے دفتر

جو ان کا علم ہے حیدرؑ کی وہ عطا ٹھہرا
نشانہ جہل کا ان پر ہی بس خطا ٹھہرا

ہے شخصیت سے جھلکتا جو، بانکپن ان کا
سجیلا اور چھریرا ہے جو، بدن ان کا
مثال دیبا و ریشم جو ہے سخن ان کا
یہ کیوں نہ ہو کہ جو لکھنؤ ہے وطن ان کا

وہ صاحبانِ ذکا حاملِ خرد بھی تھے
کہ آلِ حق کے وفادار ان کے جد بھی تھے

خیال و فکر کے سب سے بلند طائر ہیں
ہمارے عہد کے سب سے بڑے مفکر ہیں
کسی کے ذکر سے غافل نہیں، وہ ذاکر ہیں
خطیب آل محمدؐ ہیں، اور شاعر ہیں

ہیں شعر گوئی کے فن میں بھی یہ حد فاصل
ہوا ہے شاعری میں ان کو ارتقا حاصل

سخن میں کوئی بھی ہلکی نہیں ہے بات ان کی
جو بات بھی ہے وہ ہے منضبط صفات ان کی
بس ارتقائے خطابت ہے کائنات ان کی
انیسؔ و میرؔ کا عکسِ جمیل ذات ان کی

کلام ایسا کہ الفاظ خود ہی بولتے ہیں
انھی کے لہجے میں رچ کر زبان کھولتے ہیں

ثنائے آلِ نبیؐ سے انھیں بہت ہے پیار
منیرؔ اور کسی کو نہیں یہ حق کا شعار
انھی کے خطبوں میں دینِ نبیؐ کا ہے معیار
نئی ہے فکر تو موضوع بھی نیا ہر بار

کہیں گرجتے ہیں دھیما کہیں پہ لہجہ ہے
خطابت ان کی بس اک روشنی کا دریا ہے

ثنا ضمیرؔ کی صادقؔ نے کی بہ عجز و نیاز
دعا ہے رب سے کرے ان کی وہ حیات دراز
ضمیرؔ آپ کو اللہ رکھے بس ممتاز
نہ زندگی میں نشیب آئے آپ پائیں فراز

ہر ایک سال تمھیں کربلا دکھائے خدا
ہر ایک آن زبس علم بھی بڑھائے خدا

سیّد محمد عباس صادق جعفری

احسان ضمیر بر نسل جدید

""سہ ماہی ""القلم"" کے اجرا پر""

کتنا ادب ہے آج بھی مرہونِ القلم
شغل جہول ہے کہ کریں خونِ القلم
عالم ہر ایک اب بھی ہے ممنونِ القلم
قرآں کا نون زیرِ نہاں نونِ القلم

اس ""ن"" کا ہے راز فقط ""نطق نور"" بھی
فرضِ قلم ہے کرتا رہے مشقِ نور بھی

ہے مشقِ نور اصل میں امدادِ داوری
اہلِ قلم ہی دہر میں قدرت کے ہیں دھنی
ان کے قلم سے جہل کی قوت میں ہے کمی
یہ نور سے بڑھاتے ہیں ذہنوں کی آگہی

جس کو کتابِ حق کی ہر آیت کا ہے خیال
صرف اس کو ہی قلم کی بھی حرمت کا ہے خیال

جو حمد میں خدا کی چلے ہے وہی قلم
جو مصطفےٰؐ کی مدح کرے ہے وہی قلم
جو الفتِ علیؑ میں ڈھلے ہے وہی قلم
جو راہِ پنجتنؑ پہ چلے ہے وہی قلم

اس راہِ حق پہ ہے جو اسالیب کا قلم
ایسے قلم کو کہتے ہیں تہذیب کا قلم

پھیلا ہوا جو اہلِ قلم کا ہے خاندان
ہر ایک سے ہے اونچا قلمکار کا نشان
جو بھی صداقتوں کی دکھاتا ہے آن بان
دنیا میں بس اسی کا قلم رہتا ہے جوان

راہِ خدا میں بنتا ہے جب حق نگر قلم
تحریر خوں سے لکھتا ہے قرطاس پر قلم

یہ ''القلم'' بھی حق نگری کا جریدہ ہے
مضمون جو بھی اس کا ہے چیدہ چنیدہ ہے
ہر وصف اس کا دیکھئے وصفِ حمیدہ ہے
اپنے وجود میں یہ ادب کا قصیدہ ہے

ہر اک جہت سے دیکھئے آہنگ ہے نیا
ہے کوکبِ رثائی ادب رنگ ہے نیا

پائے غلط جگہ جو کوئی لفظ کیا مجال
اوصاف کا بیان بھی ہے عقل سے محال
ماضی کے مرثیے کے وہ رخشندہ ماہ و سال
اس کے مطالعے سے ہویدا ہے سب کا حال

ہے خامۂ رثائی ادب نام القلم
نامِ حسینؑ لیتا ہے ہر گام القلم

یہ پیاس تشنہ گان خرد کی بجھاتا ہے
امیدِ طالبانِ حقیقت بندھاتا ہے
تحقیق و فحص کو نئی راہیں سُجھاتا ہے
یادِ بہارِ گلشنِ اردو دلاتا ہے

اس میں ہر آن مصحفِ ناطق کا ذکر ہے
اللہ اور رسولؐ کے عاشق کا ذکر ہے

یہ بات مجھ کو کہنے میں مانع نہیں حجاب
تعریف اس کی ہوتی ہے جو بھی ہو لاجواب
صادق نہ "القلم" کی نظیر اور نہیں جواب
تعبیر پا گیا ہے یہ اہلِ خرد کا خواب

اک قرض تھا جو ہم پہ انیسؔ و دبیرؔ کا
احسان اتار سکتے نہیں "ہم"، ضمیرؔ کا

سیّدمحمد عباس صادق جعفری:

قطعۂ تاریخ ولادت
(جناب علامہ ضمیراختر نقوی صاحب)

گوندھا گیا سودت شبیرؑ سے جو، یہ خمیر
رب نے بھیجا مرثیے کا اس کو، بنا کر سفیر
خون دل سے اس نے سینچا مرثیے کو اس طرح
"رہی آلِ عبا سے منسلک، اس کی روح باضمیر"

۱۹۴۷ء

سیّدمحمد عباس صادق جعفری:

قطعۂ تاریخ اجرا شمارہ "القلم"

خوابیدہ ذہنیت کو جگاتا ہے، سو بہ سو
علم و ادب کے غنچے کھلاتا ہے کو بہ کو
پوشیدہ ہر شمارے میں "اک کائنات علم"
"نہج القلم بھی نہج بلاغہ، بھی ہو بہ ہو"

۱۴۱۸ھ

سیّد ظہور مہدی

(ایم اے ادبیات۔ ایم اے صحافت)

علامہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب مسلسل دس برس سے امام بارگاہ آلِ عبا گلبرگ میں خطاب فرما رہے ہیں، تمام محافل ومجالس ہمیشہ ان کی زیرِ سرپرستی منعقد ہوتی ہیں، ٹرسٹ آلِ عبا کی جانب سے انھیں ذاکرِ آلِ عبا کا خطاب دیا گیا۔ مندرجہ ذیل اشعار علامہ صاحب کی مجالس میں گاہے بگاہے پیش کئے گئے تھے۔

شانِ خطابت

ذاکرِ آلِ عبا جب خطاب کرتے ہیں
پہلے موضوع کا وہ انتخاب کرتے ہیں
ضمیر اختر حق بیں میں ہے وہ بے باکی
کہ ذکرِ شاہ وہ با آب وتاب کرتے ہیں
جلا کے دل میں مودّت کے وہ چراغ علوم
قسم خدا کی وہ کارِ ثواب کرتے ہیں

جو علم و فن و ادب کے اسیر ہوتے ہیں
وہی تو اصل میں روشن ضمیر ہوتے ہیں
جو بابِ علم کے در کے فقیر ہوتے ہیں
قسم خدا کی وہ سب سے امیر ہوتے ہیں
جنھیں محبتِ آلِ نبیؐ و قرآں ہے
وہی تو آلِ عباؑ کے سفیر ہوتے ہیں

علامہ ضمیر اختر کا کرتا ہوں میں بیاں
جن کی ہیں کامیاب بہت مجلسیں یہاں
ذکرِ حسینؑ و ذکرِ علیؑ ہے قرارِ جاں
آلِ عباؑ کو رکھتے ہیں از حد عزیز جاں
مہدیؔ بھی ان کے فیض کا بے حد ہے قدرداں
عرفانِ معرفت ہے سدا جن کا ہر بیاں

دونوں جہاں میں بس وہی با آبرو رہے
جن کے دلوں میں الفتِ حیدرؑ کی بو رہے
بجھتی ہے پیاس روح کی ذکرِ حسینؑ سے
ہے شرط یہ کہ قلب میں اس کی نمود ہے
آلِ عبا کے واسطے جو وقف ہوگئے
چرچے انھیں کے شام و سحر کو بہ کو رہے

ماجد رضا عابدی

"لفظ و معنیٰ کا سمندر"

قلزمِ اوجِ معانی کا کنارا ہیں ضمیر — ادب و علم کا بہتا ہوا دھارا ہیں ضمیر
دورِ رفتہ کی خطابت کا نظارا ہیں ضمیر — بیتِ حیدرؑ پہ جو اترا تھا وہ تارا ہیں ضمیر

بیتِ حیدرؑ کو جو چوما تو سند پائی ہے
اس لئے ان کی خطابت میں توانائی ہے

یہ سلاست یہ فصاحت یہ خطابت یہ بیاں — حُسن کا ندرتِ الفاظ میں دریا سا رواں
بے مہورایک سا دونوں پہ یقیں ہو کہ گماں — سادگی دیکھ کے عاشق ہوئے خاصانِ جہاں

گفتگو ایسی کہ ہر بات سے موتی برسیں
سُن کے تقریر چہکنے کو عنادل ترسیں

شوکتِ فکر کے مظہر بھی ضمیر اختر ہیں — لفظ و معنی کا سمندر بھی ضمیر اختر ہیں
مدحتِ آلؑ کے محور بھی ضمیر اختر ہیں — یعنی منبر کے دلاور بھی ضمیر اختر ہیں

خنجرِ فکر و تخیل نے جگر کاٹ دیے
جنگِ حیدرؑ جو پڑھی تارِ نظر کاٹ دیے

فن کا وہ اوج کہ حیرت سے ترانے دیکھیں — گیسوئے فکر میں لفظوں کی اسیری دیکھیں
جو ولی ذوقِ تخیل کی بلندی دیکھیں — اس گدائے درِ زہراؑ کی امیری دیکھیں

جب بھی تحریر کے میداں میں نظر آتے ہیں
بڑھ کے قرطاس و قلم ان کی قسم کھاتے ہیں

سیرت زہراؑ، فدک، شاعری، آنسو، پانی ‏ ‏ ذوالفقار، آگ، ہوا، شہد، جوانی، پیری
ذوالجناح وعلم ورنگ اور آبائے نبیؐ ‏ ‏ اور اسلام کی تاریخ میں کردار علیؑ
منتخب کرنے میں موضوع کو یکتا ہیں ضمیر
فنِ تقریر میں مضمون کا دریا ہیں ضمیر

بدر و بیر العلم و ذات سلاسل موتہ ‏ ‏ قیقاع و اُحد و خیبر و فتح مکہ
نہرواں لیل ہریر وجمل و کرب و بلا ‏ ‏ رمل و خندق و مختار کی جنگ کوفہ
پڑھ کے غزوات یہ ہلچل سی مچا دیتے ہیں
رزمِ شمشیر کی تصویر دکھا دیتے ہیں

دورِ حاضر کی خطابت پہ ہے فیضانِ ضمیر ‏ ‏ یعنی اک زندہ حقیقت ہے دبستانِ ضمیر
فلکِ علم کے تارے ہیں محبانِ ضمیر ‏ ‏ ماجدؔ عابدی میں بھی ہوں ثناخوانِ ضمیر
میرا اسلوب اسی سیفِ زبانی کا اسیر
میرا ادراک اسی زمزمہ دانی کا اسیر

۱۔ علامہ ضمیر اختر صاحب کے چند موضوعات کے عنوانات اور جو اسلامی جنگیں انھوں نے پڑھی ہیں ان کے نام دونوں بندوں میں نظم کیے گئے ہیں۔

۲۔ نظم کے پہلے بند کا چوتھا مصرع دیکھئے، علامہ ضمیر اختر صاحب کا ستارہ "زہرہ" ہے اور یہی ستارہ درِ حیدرؑ پر اترا تھا۔

محشر لکھنوی

قرطاس وقلم

نذرِ عقیدت بخدمتِ جناب الحاج حضرت علامہ سید ضمیر اختر نقوی قبلہ، محقق، مبصر، مفکر، مقرر ومصنف بسلسلۂ تصنیف شعرائے اردو اور عشقِ علی

ہوتا نہ تیرے دل میں جو عشقِ علی، ضمیر
ملتی نہ تجھ کو علم کی یہ روشنی، ضمیر

جب صرف ربِ ذولمنی مناجات ہے تری
پھر کیوں نہ مہربان ہوں آلِ نبی، ضمیر

تصنیف تیری "نہج بلاغہ" کا آئینہ
تقریر تیری، دین کی منظر کشی، ضمیر

پایا ہے علم تو نے ائمہ کے فیض سے
تجھ پر نہ ہوگی بند یہ بارہ دری، ضمیر

رہتے ہیں زندہ مر کے بھی زندہ ضمیر لوگ
ایسی ہی تو نے پائی ہے اک زندگی، ضمیر

اختر ہے تو ضمیر کا، چمکے گا عرش پر
تیری ضیاء میں ہوگی نہ ہرگز کمی، ضمیر

قرطاس اور زبان نے کر دی ہے مستقل
منبر سے اور قلم سے تری دوستی، ضمیر

تحریر کی کسوٹی پہ الفاظ کی پرکھ
تجھ سے نہیں ہے بڑھ کے کوئی جوہری، ضمیر

تاریخ شاعروں کی ہے اس طرح تجھ کو یاد
منھ بولتی ادب کی ہے تو جنتری، ضمیر

قرطاس تیری ناؤ ہے، پتوار ہے قلم
پائی ہے روشنائی کی تو نے ندی، ضمیر

جلنے لگیں نہ اہلِ خطابت کچھ اور بھی
لکھ دوں جو تیرا نام بحرفِ جلی، ضمیر

تجھ پر ظہیر و ناصر و نسرین کو ہے ناز
واللہ! تو ہے ذاکرِ آلِ نبیؐ، ضمیر

محشرؔ کتابِ عشقِ علی پر میں کیا لکھوں
زنجیر ہر سطر ہے تو اک اک کڑی ضمیر

علامہ ڈاکٹر شبیہ الحسن رضوی (اسلام آباد)

نوائے ضمیر

سو کب نہ تھا دلِ بیدار آشنائے ضمیر
بلند بخت ہوا حاملِ لوائے ضمیر

ہوائے کوئے نگاراں کو کیا نہیں معلوم
صدائے نکہتِ صد رنگ ہے نوائے ضمیر

دھرا ہے سامنے توثیق نامۂ غالبؔ
ہے نسخہ ہائے وفا فیضِ نسخہ ہائے ضمیر

انھیں کے گھر پہ ہے یارانِ نکتہ داں کی نشست
صلائے عام میں بھی خاص ہے صلائے ضمیر

طریق جس کا نہ ہو حُبِّ اہلِ بیتؑ رسولؐ
رفیق اور وہ ڈھونڈے کوئی بجائے ضمیر

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی

نصابِ عشقِ علیؑ

ہے یہ ایسی کتابِ عشقِ علیؑ — جس نے کھولے ہیں بابِ عشقِ علیؑ

یہ صحیفہ ضمیر اختر کا — ہے مکمل نصابِ عشقِ علیؑ

رہبری کے لئے ہے لاثانی — مکتبِ لاجوابِ عشقِ علیؑ

مطلعِ آسمانِ فکر پہ ہے — ضوفشاں آفتابِ عشقِ علیؑ

گویا الہام بن کے آیا ہے — مژدۂ کامیابِ عشقِ علیؑ

قلبِ مومن پہ کھل کے برسے گا — ہے یہ ایسا سحابِ عشقِ علیؑ

سرخی ایسی سرورق کی ہے — جیسے رنگِ شبابِ عشقِ علیؑ

تذکرہ شاعرانِ اردو کا — بن گیا خود کتابِ عشقِ علیؑ

حشر تک اب ضمیر اختر کو — مل رہا ہے ثوابِ عشقِ علیؑ

میں بھی جامِ ولا سے، اے ماجد! — پی رہا ہوں شرابِ عشقِ علیؑ

سیّد آصف رضا رضوی

محترم ضمیر اختر نقوی کی خدمت میں

اے ضمیرِ آگہی! اے پیکرِ صدق و صفا!
تیرے افکارِ مسلسل سے ملی حق کو جِلا
تیرے پیغامات میں پنہاں ہیں دستورِ حیات
تیرے ہر انداز سے ظاہر ترے اعلیٰ صفات
پست ہے تخیل کے آگے ترے ارضِ بسیط
ذات تیری آنے والے دور پر ہوگی محیط
تو مزاجِ وقت کو پہچانتا ہے ہر قدم
غازۂ رخسارِ دانش تیرے رشحاتِ قلم
حق تو یہ ہے تجھ کو ہے تاریخ پر کامل عبور
جاگ اٹھا تیری تحریروں سے خوابیدہ شعور
تو نے پیراہن دیا لفظوں کا احساسات کو
اور صدیوں میں بدل ڈالا حسیں لمحات کو
تو انیسِ وقت کے "فوجِ سخن" کا ہے "نقیب"
منفرد ہے جس کا اندازِ خطابت، وہ خطیب

علم و عرفاں کا ہے گہوارہ ترا دانش کدہ
علم کے پیاسوں کو ملتا ہے یہاں جامِ ولا
بابِ شہرِ علم سے ہر دم تری وابستگی
الفتِ آلِ محمدؐ میں رواں ہے زندگی
کھینچ کر تو نے مرقع لکھنؤ کی "شان" کا
کر دیا اجداد کی عظمت کا اپنے حق ادا
ہے تری اسلام کی تاریخ پر گہری نظر
اس تناظر میں ترا فرمان، "قولِ معتبر"
ہے ترے انداز میں آہنگ بھی، آواز بھی
صاحبانِ علم کا شیدا بھی اور دم ساز بھی
نسلِ نو کے واسطے گنجِ گراں مایہ ہے تو
اور دنیائے ادب کا ایک سرمایہ ہے تو
ذکرِ اہلِ بیتؑ ہے تیرا شعارِ زندگی
ہے اسی در سے تجھے حاصل وقارِ زندگی
برسرِ منبر جو کرتا ہے ثنائے اہلِ بیتؑ
ہے تری قرآن فہمی بھی عطائے اہلِ بیتؑ
التجا ہے خالقِ کونین سے اپنی، رضاؔ!
اے خدا! رہنا محافظ ذاکرِ شبیرؑ کا

مولانا کمال حیدر رضوی

لوحِ محفوظِ مودّت

وہ جس کی باتوں میں حکمتیں ہیں، زباں میں جس کے اثر دیا ہے
اے قوم! قدرِ ضمیر کرنا، خدا نے اک چارہ گر دیا ہے
علیؑ کے در پر برائے خدمت متاعِ دنیا لٹانے والا
جواہراتِ ہنر سے حیدرؑ نے دامنِ دل کو بھر دیا ہے
خلوصِ دل یہ نوید لایا، تمہاری قسمت نے اوج پایا
ادائے فرضِ ولا نے تیرے، بتولؑ کو شاد کر دیا ہے
بساطِ تحقیق جب سنبھالی، کمند پھر کہکشاں پہ ڈالی
سکھائی پروازِ فکر سب کو، شعورِ صرفِ ہنر دیا ہے
گرائے جہل و جنوں کے کشتے اٹھایا جب رایتِ تعقّل
دکھائی بدرِ خطابت ایسی، ہر اک کو حیران کر دیا ہے
جلاؤ اپنے چراغ اس سے، رہے تسلسل یہ روشنی کا
جو اپنے جلووں میں مہرِ تاباں ہے دیکھنے میں گہر دیا ہے

علیؑ کے لشکر کا یہ مجاہد بہ فیضِ کرب و بلا جری ہے
قلم نے خونِ جگر بھی مانگا تو اس نے خونِ جگر دیا ہے

وہ قوم زندہ ہے، کامراں ہے، جسے پتہ ہو یہ رازِ ہستی
قلم کی صورت میں ہم کو حق نے نشانِ فتح و ظفر دیا ہے

جہاں میں انساں کی مشکلوں کا جو حل ملے گا تو علم ہی سے
مدینۂ علم پر تو آؤ، خدا نے آخر یہ در دیا ہے

فرازِ دار و رسن سے تا مطلعِ تفکر ہے راہِ مدحت
جو منزلیں اس پہ بے نشاں تھیں انھیں چراغِ نظر دیا ہے

ولا کے گلشن کی خوشبوؤں سے ادب کا آنگن مہک رہا ہے
کہ نخلِ کلکِ ضمیر نے اب وہ معجزانہ ثمر دیا ہے

پڑھے ہیں دانش کدۂ سلونی میں جس نے اسباق زندگی کے
ضمیر صاحب کو باکمال ایسا کبریا نے پسر دیا ہے

پیمبرانِ سخن پہ آئے جو، وہ صحیفے جدا جدا تھے
بنامِ حیدرؑ انھیں کو اخترؔ نے لوحِ محفوظ کر دیا ہے

سید قمر عباس قمر عظیم آبادی

ہیں خطابت اور ادب میں منفرد اور بے مثال

مشغلہ تصنیف اور تالیف ہے شام و سحر
یوں ضمیر اختر ہوئے اردو ادب میں نام ور
ہیں خطابت اور ادب میں منفرد اور بے مثال
ہے تخیل بھی بلند اور ژرف ہے فکر و نظر
کام تھا جو کہ اداروں کا، وہ تنہا کر دیا
معرکے کتنے کیے ہیں آپ نے اس طرح سر
زندگی ہے وقف ان کی علم و دانش کے لئے
اس لئے دانش وروں میں ہیں نہایت معتبر
نخلِ اردو آپ کا مرہونِ احساں کیوں نہ ہو
پھول کتنے ہی کھلائے ہیں ادب کی شاخ پر
آپ کی تصنیف سے آخر یہ عقدہ حل ہوا
ہے علی سے عشق اردو شاعروں کو کس قدر
تذکرے کو پڑھ کے دل سے یہ دعا کرتے ہیں ہم
اے خدا! ان کو عطا کر ان کی محنت کا ثمر
زیبِ منبر جب ضمیر اختر ہوں مجلس میں تو پھر
اے قمر! اپنی سماعت گوش بر آواز کر

قطعات

نسیم امروہوی

تاریخِ مرثیہ ہے

جتنے ہیں مرثیہ گو اس پاک سرزمین پر
زیرِ نظر یہ ان کی تاریخ بے بہا ہے
تاریخ چاہتے ہیں اس کی ضمیر اختر
لکھ دو، نسیم! لکھ دو "تاریخ مرثیہ ہے"
۱۹۸۱ء

یکتا امروہوی

تذکرۂ شاہِ ولایت

یہ ضمیر اختر محقق نے کیا تفصیل سے
تذکرہ شاہِ ولایت کا، زہے زورِ قلم
مستند ہر لفظ، ہر فقرہ، ہر اک اِس کی سطر
ہر ورق یکتا ہے، تاریخی حوالوں کی قسم

سیف حسن پوری

تاریخِ مرثیہ

کس دور میں حوالے سے اس ارضِ پاک کے
لکھا گیا نہ مرثیہ گویوں کا تذکرہ
لیکن ضمیر اختر نقوی کا کیا جواب
ہے لاجواب اُن کی "یہ تاریخِ مرثیہ"
۱۹۸۱ء

پروفیسر ظلِ صادق

عزائے زہراؑ

حق نے کیا ممتاز ضمیر اختر کو
ہونا تھا سرافراز ضمیر اختر کو
ہر سال مناتے ہیں عزائے زہراؑ
حاصل ہے یہ اعزاز ضمیر اختر کو

ذکی عابدی

جنت کے خریدار

مومن سے کوئی مومن دیندار بنے
مومن ہی نہیں ذاکرِ کرّار بنے
صدقے میں حسینؑ کے ضمیر اختر نقوی
سب بچ کے جنت کے خریدار بنے

اقبال حسین اقبالؔ

معجزے کی زباں

بولے ہیں ضمیر اختر معجزے کی زباں
فرشِ عزا پہ ہم کو دکھاتے ہیں وہ سماں
جیسے کہ ہر اک دور میں موجود رہے ہوں
تاریخ، تشیع کی کرتے ہیں یوں بیاں

سیّد حسن کاظمی

تحقیق کے جھرنے

وقت کی آنچ سے نکھرا ہوا نگینہ ہیں اخترؔ
تحقیق کے جھرنوں سے ابھرتا ہوا آبگینہ ہیں اخترؔ
معرفتِ آلِ محمدؐ سے ہے شاداب غنچۂ دل ان کا
پہنچا دے جو بامِ آلِ عبا تک وہ زینہ ہیں اخترؔ

حسن لکھنوی

کون ہے بہتر

دقائق کے دلائل میں جو پوچھو کون ہے بہتر
تو میں برجستہ کہہ دوں گا ضمیر اختر، ضمیر اختر

نیّر مجیدی لکھنوی

علم کی اِک انجمن

صدقے میں پنجتن کے زمانے میں، اے ضمیر!
ہے تیرا نام علم کی اک انجمن کا نام
شاہِ زمن کا نام مٹائے گا کیا کوئی
مٹتا نہیں ہے ذاکرِ شاہِ زمن کا نام

مظہر پنجتنی مرحوم

صدقے وقار ہے

اس صدرِ بزمِ شاہ کا کیا افتخار ہے!
مولانا ضمیر اختر پہ صدقے وقار ہے
مظہر ثنا اس عالمِ دیں کی کرے گا کیا
حیدرؑ کا سایہ جس پہ کہ لیل و نہار ہے

کلام میں اثر

اللہ رے! کلام میں، اختر، تیرے اثر
مانندِ موم ہوتا ہے پتھر کا بھی جگر
اللہ کا ہے فیض تو تائیدِ پنجتن
مدّاحِ اہلِ بیتؑ میں جو تُو ہے نامور

ooo

کلیم آلِ عبا شاہد نقوی

اے اہلِ نظر.....!

کیا بات کریں ان سے، جو بغضِ ازلی میں
کرتے ہیں نقائص کی تلاش ایک ولی میں
اے اہلِ نظر! دیدۂ بینا سے یہ دیکھو

.........۱۴۱۳ھ.........

کیا کہتے ہیں اردو شعرا عشقِ علیؑ میں

.........۱۹۹۳ء.........

سیّد اشتیاق حسین ساغر لکھنوی

قطعہ در صنعتِ مقلوب

(جس میں دو مصرعے صنعتِ مقلوب میں ہیں)

شیرِ پاکستان بھی ہے کب ضمیر اختر فقط
ہے یہ خورشید ادب علم و سخن کے روح و جاں
بارش ماح و قریب بیرق و جامِ شراب
نائبِ روحِ کلام و مالکِ حور بیاں

محسن نقوی امروہوی

تاریخ کا دفتر

ذاکرِ آلِ عبا، تاریخ کا دفتر ضمیر
مخزنِ علم و ادب کے بے بہا جوہر ضمیر
ذکرِ اہلِ بیتؑ ان کا ہے شعارِ زندگی
زیرِ سایہ ہیں علم کے بر سرِ منبر ضمیر

سیّد اشتیاق حسین ساغر لکھنوی

در صنعتِ توشیح

ض۔ ضمیر اختر یہاں مختار نامے کو سنائیں گے
م۔ بلیں ہیں ظالموں کو کیا سزائیں یہ بتائیں گے
ی۔ یقیں ہے انتقامِ قتلِ شہ سُن کر خوشی ہوگی
ر۔ رجز اور نعرۂ مختار سوتے دل جگائیں گے
ا۔ اعانت کس نے کی مختار کی اس امرِ محسن میں
خ۔ خدا کے فضل سے وہ نام ان کے لب پہ لائیں گے
ت۔ تہوّر اور تدبّر عاشقانِ شاہِ والا کا
ر۔ رفاقت ان کی کہہ کر دشمنوں کے دل جلائیں گے

ضمیر اختر

سید اشتیاق حسین ساغر لکھنوی

در صنعتِ توشیح

ض۔ ضو فشاں تحقیق کے ہے آسماں پر مثلِ شمس
م۔ مرد میداں ہے تجسس کا یہی جادو بیاں
ی۔ یاورِ حق آگہی ہمدردِ ملت ، شیر دل
ر۔ رونقِ بزمِ ادب باطل شکن ، عزمِ جواں
ا۔ آبروئے پاک ہے توشیح کی منزل میں یہ
خ۔ خاص آلِ عبا کا ہے ازل سے مدح خواں
ت۔ تبصرے تنقید کا تقریظ کا بھی ہے قمر
ر۔ رہبرِ راہِ ادب ساغر ہے یہ عرشِ آسماں

ضمیر اختر

محسن رضا (ملتان)

ضمیرِ علم

ضمیری فکر سے جو آشناس ہو جائے
ضمیرِ علم سے وہ روشناس ہو جائے

لب اس کے چُوم لے لب ہائے اوجِ مہرِ فلک
نگاہ آپ کی جس پر کہ خاص ہو جائے

خدایا غم نہیں تنقید کا کسی کی مگر
حسد جو آپ سے رکھے وہ ناس ہو جائے

بن آپ کے یوں پریشان ہوتی ہے حکمت
کہ جیسے ہنس کا جوڑا اداس ہو جائے

یہ دیکھا ہے جو کوئی تشنگیِ علم بجھائے
بجھے تو اور زیادہ ہی پیاس ہو جائے

بفیضِ حق ہو میسر جسے بھی آپ کا قرب
تو علم و فن بھی اسی کی اساس ہو جائے

دعا یہ ہے کہ ہو ہر دل میں آپ کی الفت
کہ قُرب آپ کا ہر دل کی آس ہو جائے

ہے مثلِ لُو لُو و مرجاں نگیں ضمیر اختر
خدایا جوہری بھی روشناس ہو جائے

اے کاش سب کو ملے اسوۂ ضمیر اختر
بلند خُلق ہر اک خوش قیاس ہو جائے
اسی میں خیر ہے محسنؔ سے بے سہاروں کی
سروں پہ سائباں گر پرچمِ عباسؑ ہو جائے

دو قصیدے ہیں مولا کے مشہور
اک کو قرآں اک کو حدیث سَرور کہتے ہیں
اک قصیدہ اور بھی ہے ان کے سوا
وہ جسے لوگ علامہ ضمیر اختر کہتے ہیں

mooblib.org

ڈاکٹر ریحانؔ اعظمی:

ضمیرِ فکر

علم گستر، فیض گستر، محترم، عزت مآب
شاعرِ آلِ محمدؐ ، ذاکرِ گردوں خطاب
رونقِ منبر ، عزادارِ امامِ انقلاب
دسترس تاریخ پر بے حد بہ فیضِ بوترابؑ

ان کے جیسا عصرِ نو میں صاحبِ منبر نہیں
بے ضمیروں سے جو ڈر جائے ضمیر اختر نہیں

دوستی ان کی کتابوں سے قلم سے یاریاں
حرف و معنی سے بڑی مضبوط رشتہ داریاں
روز و شب تحقیق کی کرتے ہیں یہ گلکاریاں
بند ہیں مٹھی میں ان کے علمی ورثہ داریاں

لفظ کی معراج ہے جو ان کے لب تک آگیا
بے ادب ان کے تصور میں ادب تک آگیا

کتنے بے توقیر ذرّے بن گئے ہیں آفتاب
آپ سے تعلیم پا کر سیکھ کر فنِ خطاب
آپ کے دستِ عطا سے لے گئے تعبیرِ خواب
کتنے کانٹے تھے جو مہکے شہر میں بن کر گلاب
مفلسانِ علم کو علمی جواہر دے دیے
مرثیے کے روپ میں الفاظ طاہر دے دیے
ان کے خامے کی متاعِ بے بہا ژرفِ ادب
حاشیہ بردار اِن کے ہو گئے مشہور سب
یہ وفا پرور وفا اِن سے کسی نے کی ہے کب
لے کے کشکولِ سخن پھرتا ہے وہ غیروں میں اب
جس کو اپنے خونِ دل سے ماہِ کامل کر دیا
ظرف کا مفلس تھا اُس نے اِن کو گھائل کر دیا
اَن گنت علمی کتابیں ان کی فکری منزلت
اَن گنت غزلیں سلام و مرثیے اور منقبت
آپ کی شعلہ بیانی ہے کثیر المملکت
عِلم کے میدان میں قائم ہے ان کی سلطنت
مثلِ شاخِ گُل کہیں اِن کا قلم تلوار ہے
اِن کے جیسا اہلِ فن ملنا بہت دشوار ہے

بے عقیدہ لوگ اِن کی بزم سے ہیں دور دور
آ نہیں سکتا کوئی نزدیک اِن کے بے شعور
خاور علم و ادب کا اِن کے سینے میں ہے نور
انکساری ہے طبیعت میں نہیں کوئی غرور

اس قدر ہر دور میں کی ہیں رثائی کاوشیں
ہر کتب خانے میں ہیں ان کی عزائی کاوشیں

یہ ضمیرِ فکر ہیں کہتا ہے ریحانِ عزا
یہ مُبلّغ کربلا کے اِن کے دل میں کربلا
کچھ نہیں علم وادب سے ہٹ کے ان کا مشغلہ
رونقِ منبر رئیسِ منبرِ آلِ عبا

ہیں خطیبِ آلِ اطہر صاحبِ کردار ہیں
ناشرِ کرب و بلا ہیں زندہ و بیدار ہیں

mablib.org

نشاط واسطی:

شہنشاہِ ادب

اے ضمیراختر شہنشاہِ ادب عالی وقار
تیرے اوصافِ حمیدہ کا نہیں کوئی شمار

منفرد اس دور میں تیرا ہے اندازِ خطاب
جھومتے ہیں سن کے سب تیرا بیاں دیوانہ وار

تیرے ہر اک لفظ میں بحرِ معانی ہے رواں
گلشنِ علم و ادب میں ذات تیری نو بہار

تو خطیبِ منبرِ ساقیٔ کوثر لاکلام
میکدے میں تیرے حاضر ہیں ہزاروں بادہ خوار

سامعیں میں تیرے شامل خود ذواتِ پنجتنؑ
عرش سے آتے ملک بھی ہیں قطار اندر قطار

بے شبہ تائید بابِ علم کی حاصل تجھے
بنتا ہے اس در سے ہی اعلیٰ شاہکار

یہ روانی یہ فصاحت اور یہ طرز ادا
بہہ رہی ہے گویا اک علم و ادب کی آبشار

یا خدا ایں واعظ معجز بیاں پائندہ باد
ہر کجا باشد ، عمائد یا ترقی بامراد

سیّد کلب جواد نقوی

مکرمی.........سلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ!

امید ہے کہ مزاج گرامی مقرون بصحت ہوگا۔ آپ کو علم ہوگا کہ تقسیم ہند کے بعد قوم کی زبوں حالی، تعلیمی پسماندگی ودیگر مسائل کو ملحوظ رکھتے ہوئے "کل ہند مجلس علماء وخطباء" کی بنیاد رکھی گئی تھی۔ جس کا پہلا اجلاس ۱۹۶۵ء میں اور آخری اجلاس ۱۹۶۹ء میں ہوا تھا۔

بزرگ علماء کے ارتحال کے بعد یہ ادارہ ختم ہوگیا اور اسی باعث علماء خطباء اور عوام کے درمیان رابطہ کمزور ہوتا گیا۔ اقلیت در اقلیت ہونے کی وجہ سے قوم سیاسی استحصال کا بھی شکار ہوئی اور سماجی اختلاف وانتشار میں اضافہ بھی ہوا۔

یہ دگرگوں حالات ایک مضبوط ادارہ کے متقاضی تھے جس کے پیش نظر دو سال قبل علما وخطبا کا اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا جس میں بزرگ علما نے "مجلس علماء وخطبا" کے احیاء پر زور دیا تھا۔

اسی ضرورت کے پیش نظر انشاء اللہ ۲۵، ۲۶ نومبر کو حسینیہ غفراں مآبؒ لکھنؤ میں دو روزہ اجلاس منعقد کئے گئے ہیں جس میں قوم کے تمام افراد خواہ شہروں سے علاقہ رکھتے ہوں یا قصباتی ودیہی زندگی گزارتے ہوں ان کے مسائل کے مثبت حل کے لئے پیش رفت کرنے کی سعی کی جائے گی اسی اجلاس میں عہدیداران کے باتفاق آرا انتخاب بھی ہوں گے۔

لہٰذا جناب والا سے گزارش ہے کہ ان اجلاس میں خود بھی شرکت فرمائیں اور اپنے علاقہ کے دیگر علماء وذاکرین کو بھی مدعو فرمائیں۔

والسلام

کنوینر۔ (سید کلب جواد نقوی)

سیّد حسین شرف الدّین شاہ ولایت

(حالات و کرامات)

"خبر نامہ، مرکزِ سادات امروہہ کراچی" اپریل ۱۹۸۹ء

سیّد کمال نفیس

یوم شاہ ولایتؒ کے موقع پر محفل مذاکرہ اور محفل سماع شایان شان طریقے سے منایا گیا

مطبوعہ "خبر نامہ کراچی" انجمن سادات امروہہ اپریل ۱۹۸۹ء سے اقتباس

حسب سالہائے گزشتہ "یوم شاہ ولایت" نہایت ادب و احترام کے ساتھ منایا گیا۔ جس میں محفل مذاکرہ اور محفل سماع کے دو پروگرام منعقد ہوئے۔ اس محفل کی صدارت جناب سیّد خورشید احمد شاہ نے کی جب کہ مہمان خصوصی جناب میر منور علی تالپور وزیر آب پاشی و ہاؤسنگ حکومت سندھ تھے۔

تقریب کا آغاز ۸ بجے شب تلاوت کلام پاک سے ہوا۔ جناب سیّد علی نقوی سیکریٹری جنرل خطبۂ استقبالیہ پیش کرتے ہوئے حضرت سیّد حسین شرف الدین شاہ ولایت کی حیات طیبہ و معجزات کرامات اور انجمن کی کارکردگی بیان کی۔ جناب سیّد علی باقر نقوی نے حضرت شاہ ولایت کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے نہایت ہی مدلل اور

معلوماتی مقالہ پیش کیا آپ نے فارسی میں منقبت اور قطعہ پیش کیا جسے بے حد سراہا گیا۔

ڈاکٹر علامہ الحاج ضمیر اختر نقوی نے صوبائی وزراء کو نوتالیف کتاب پیش کی۔ آپ کی یہ کتاب حضرت شاہ ولایتؒ کے کرامات و معجزات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں حضرت شاہ ولایت کے علاوہ آپ کے ہم عصر حضرت نظام الدین اولیاء، علامہ حلّی (نجف)، حضرت شیخ سعدی (ایران) اور حضرت امیر خسرو (انڈیا) جیسی عظیم شخصیات کی حیات پر اوران کے عظیم کارناموں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تقریب رونمائی کے بعد صدر انجمن جناب سید شعیب الحسن نے حاضرین کرام، بزم کے صدر اور مہمان خصوصی کا شکریہ ادا کیا۔ اور انجمن سادات امروہہ کا مختصراً تعارف کرایا۔

سیّد ہاشم رضا

(سابق گورنر مشرقی پاکستان)

میں ضمیر اختر نقوی کی تخلیقی اور تنقیدی قابلیت کا معترف رہا ہوں۔ صاحب نظر حضرات اس معاملے میں مجھ سے اتفاق کریں گے، میرے بھائی سید آل رضا، ضمیر اختر نقوی کی بڑی قدر کرتے تھے۔

سید محمد عباس نقوی (امروہوی)

تحقیق اور تعصب

ہمارے یہاں کسی کتاب کی تالیف میں عموماً دو قوتیں کارفرما ہوتی ہیں، لوگوں تک علم پہنچانا، یا علم سے بدکانا، علامہ ضمیر اختر نقوی نے ۱۹۸۹ء میں "سید حسین شرف الدین شاہ ولایت حالات کرامات" کے زیرِ عنوان ایک کتاب شائع کی جسکے بارے میں اس وقت کے صدر انجمن سادات امروہہ جناب شبیب الحسن زیدی صاحب کے تاثرات اس کتاب کے ساتھ شائع ہوئے، جنھوں نے علامہ ضمیر اختر صاحب کا اس کتاب لکھنے پر شکریہ ادا کیا تھا اور اس کتاب کو ایک عمدہ تحقیق گردانا تھا۔ نیز کیتا امروہوی (جو آج سادات امروہہ کا ادبی اثاثہ ہیں اور ماشاءاللہ حیات ہیں، خدا انکی عمر دراز فرمائے)، کے چار مصرعے اس کتاب کی اہمیت وافادیت کی داد دیتے نظر آئے۔

یہ ضمیر اختر محقق نے کیا تفصیل سے
تذکرہ "شاہِ ولایت" کا زہے زورِ قلم
مستند ہر لفظ ہر فقرہ، ہر ایک انکی سطر
ہر ورق کیتا ہے تاریخی حوالوں سے رقم

اس کتاب کا اجراء ۱۹۸۹ء میں یوم شاہ ولایت منعقدہ مرکز سادات امروہہ کراچی کے موقع پر کیا گیا تھا، اس موقع پر علامہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب نے ڈاکٹر فرمان فتحپوری صاحب کی موجودگی میں ایک مقالہ بھی پڑھا تھا جس کے بعد محترم فرمان فتحپوری

صاحب کہ جنکی علمی حیثیت میں کوئی شک نہیں لیکن شاید وہ اُس وقت علامہ صاحب کی تقریر پر غور نہ کر سکے جسکے باعث انھوں نے محض مُلا ازم پر لمبی چوڑی تقریر فرمائی اور علامہ ضمیر اختر جو یہ سمجھ رہے تھے کہ فرمان فتحپوری صاحب انکی بات کو آگے بڑھائیں گے ایسا نہ ہو سکا۔ اسکا شکوہ قبلہ ضمیر اختر صاحب نے کتاب کی ابتدا میں ہی کیا ہے، میں عرض کروں کہ اب سے چند روز پہلے انجمن سادات امروہہ کراچی کے سابق صدر جناب قمر رضی صاحب سے شرف ملاقات حاصل ہوا، اور اُن سے دادا شاہ ولایت کے موضوع پر مختصر بات چیت ہوئی، انھوں نے بھی اسی قسم کا ایک واقعہ سنایا کہ کسی موقع پر جناب قمر رضی نے مقالہ پڑھتے ہوئے ڈاکٹر حسن رضوی کی موجودگی کا فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور "تصوف اور عرفان" کے موضوع پر ایک علیحدہ فلسفہ پیش کیا لیکن، ہوا یہ کہ ڈاکٹر حسن رضوی اُسوقت قمر رضی صاحب کی منشا نہ سمجھ سکے اور اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار نہ کیا، جس سے بات آگے نہ بڑھ سکی۔

اسی موضوع پر علامہ ضمیر اختر نے بھی اپنی کتاب میں مختصر انشاندہی کی ہے اور لکھا ہے کہ "تصوف کی ابتدا در اصل رسولؐ کی اہمیت کم کرنے کے لئے کی گئی تھی۔۔۔۔۔۔" اور ہم تصوف کے بجائے "عرفان" کے قائل ہیں۔

اس قسم کے علمی نکات کو بعض کج بحث نہ سمجھ سکے اور علامہ کی کتاب کے جواب میں تقریباً ۱۳ سال بعد ۶۵۶ صفحے کی کتاب شائع کر ڈالی، ملاحظہ ہو امان علی صاحب کی جانب سے ایک مایہ ناز محقق کی تحقیق کے مقابلے میں کمزور کوششیں۔

موصوف اپنی کتاب کی وجہ تالیف دو کتابوں ۱۹۸۷ء کی شائع شدہ جناب تقی خاں نقوی کی "اثبات حقیقت" اور ۱۹۸۹ء میں شائع شدہ جناب ضمیر اختر نقوی کی "سید حسین شرف الدین شاہ ولایت حالات وکرامات" کو گردانتے ہوئے حرف چند کے

زیرِ عنوان لکھتے ہیں۔

''دوسری تالیف کراچی سے ۲۸ فروری سنہ ۱۹۷۹ء مطابق ۲۱ رجب سنہ ۱۴۰۹ھ کو شائع ہونیوالی تالیف موسومہ ''سید حسین شرف الدین شاہ ولایت حالات و کرامات'' مؤلفہ سید ضمیر اختر نقوی لکھنوی ثم کراچوی غیر اولاد گر شیعہ۔۔۔۔۔

خط کشیدہ الفاظ موصوف کے متعصب انداز کو شروع کے صفحات پر ہی ظاہر کر رہے ہیں، اسکے علاوہ غور کیجئے ۱۳ سال بعد جس کتاب کا جواب لکھا گیا، اس کا سنہ ۱۹۸۹ء کی جگہ ۱۹۷۹ء تحریر فرما رہے ہیں۔

میں نے اس کتاب کو مکمل تو نہیں پڑھا البتہ چند جگہوں سے خاص خاص مضامین دیکھے اور احساس ہوا کہ مؤلف نے علامہ ضمیر اختر نقوی کو شہرت کا زینہ سمجھ کر استعمال کیا، دیکھئے شہرت حاصل کرنے کے خواہاں حضرات بعض اوقات جبکہ خود کسی ہنر کے حامل نہ ہوں تو مشہور افراد کی مخالفت کر کے مشہور ہونے کی کوشش فرماتے ہیں کہ،

بدنام جو ہونگے تو کیا نام نہ ہوگا

انہوں نے کتاب میں جگہ جگہ علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کی کتاب کے اقتباسات شامل کیے اور انکے جواب میں غیر مستند اور کمزور دلیلوں کے ذریعے جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

متذکرہ کتاب سے بحث یہ نہیں کہ حضرت سید حسین شرف الدین شیعہ تھے یا اہلسنت اصل واقعہ یہ ہے کہ اس کتاب میں بعض ایسے ایسے موضوعات پر خامہ فرسائی نظر آئی کہ واقعتاً افسوس ہوا، مثلاً اولی الامر، اہلِ بیت، ظہور امام زمانہ، الغرض اس طرح مؤلف موصوف نے اہلِ تشیع نہیں بلکہ معصوم اہلِ سُنت حضرات کو بھڑکانے کی کوشش کی ہے۔

صفحہ ۱۹۴ پر ''اولی الامر'' کے عنوان کے تحت امان علی صاحب، سید تقی نقوی کی دلیلوں کو غلط اور خود کو علم قرآن میں اکمل ثابت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اطیعو اللّٰہ و اطیعو الرّسول و اولی الامر

یہ قرآن کریم کی پارہ پنجم کی سورۂ نسا کے رکوع نمبر پانچ کی آیت ۷۱ ہے جو نامکمل ہے۔

پوری آیت حسب ذیل ہے:

"یا یھاالذین آمنو الطیعواللّٰہ و اطیعو الرّسول و اولی الامر منکم ج فان تنازعتم فی شی فردو ہ الی اللّٰہ والرّسول."

اوّل تو عرض کروں کہ محترم امان علی صاحب جب دوسرے کی غلطی کی جانب نشاندہی فرما رہے ہیں تو اپنی تحریر میں غلطیاں اس قدر کیوں؟ دیکھئے نہ تو آپ نے مکمل آیت لکھی ہے کہ مکمل آیت حسب ذیل ہے:

"یا یھاالذین آمنو الطیعواللّٰہ و اطیعو الرّسول و اولی الامر منکم ج فان تنازعتم فی شی فردو ہ الی اللّٰہ والرّسولِ ان کنتم تومنون باللّٰہ والیومِ الاخر ذٰلک خیر و احسن تاویلاً."

دوم متذکرہ بالا آیت پارہ پنجم کی سورۂ نسا کے رکوع نمبر پانچ نہیں ہے بلکہ چار اور آیت ۷۱ نہیں ۵۹ ہے۔

ترجمہ: ایمان والو اللہ کی اطاعت کرو رسولؐ اور صاحبانِ امر کی اطاعت کرو جو تمھیں میں سے ہیں پھر اگر آپس میں کسی بات میں اختلاف ہو جائے تو اسے خدا اور رسولؐ کی طرف پلٹا دو اگر تم اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھنے والے ہو۔ یہی تمہارے حق میں خیر اور انجام کے اعتبار سے بہترین بات ہے۔

۱۔ تفسیر از علامہ جوادی:۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ اطاعت مطلقہ کے لئے عصمت ضروری ہے اور معصوم سے مراد اجماع ہے۔

میری گذارش یہ ہے کہ اس طرح عصمت کی ضرورت ثابت ہوگئی اور یہ طے ہوگیا کہ عصمت کی ضرورت کا تصور صرف مذہب شیعہ میں نہیں ہے بلکہ اہلِ سنت میں بھی ہے، رہ گیا اجماع یا اہلِ بیت کا مراد ہونا تو اس مسئلہ کو بھی خدا اور رسول کی طرف پلٹا دینا چاہئے۔ خدا نے اہلِ بیتؑ کو مرکزِ تطہیر بنایا ہے اور رسولؐ نے انھیں ہمسر قرآن اور احد الثقلین کہا ہے اور اجماع کے بارے میں ایسی کوئی صریحی ہدایت نہیں ہے لہٰذا صرف اہلِ بیت معصومینؑ کی اطاعت واجب ہے اور ہر حاکم وقت کی اطاعت واجب نہیں ہے کہ یہ تصور حزب الشیطان، عملاً الاستعمار اور وعاظ السلاطین کی دین ہے۔۔۔ اور بس۔۔۔!

۲۔ آسان اردو ترجمہ مع ضروری تشریحات از ڈاکٹر محمد حسن رضوی:

اس کا دوسرا ثبوت یہ بھی ہے کہ خدا نے "اولوالامر" کی اطاعت کو رسولؐ کی اطاعت کے ساتھ ایک ہی لفظ "اطیعو" کے تحت بیان فرمایا ہے۔ یعنی جیسی مطلق بلا شرط اطاعت رسول کی ہے، ویسی ہی مطلق بلا شرط اطاعت اولوالامر کی قرار دی گئی ہے اور بلا شرط مطلق اطاعت صرف معصوم ہی کی لازمی قرار دی جا سکتی ہے۔ ایسا انسان جس کے بھولنے، غلطی کرنے یا پست خواہشات کی رو میں بہہ جانے کا کوئی امکان ہی نہ ہو۔

(از تفسیر مجمع البیان)

یہ تو تھا دو علماؑ کے حوالے سے قرآن کی اس آیت کی وضاحت، میں اپنے علم کی خاطر قبلہ امان علی صاحب سے پوچھنا چاہوں گا، کہ قرآن کسی خاص دور کے لئے تو تھا

نہیں، لہٰذا اپنے ترجمے کے لحاظ سے جس میں آپ "اولی الامر" کا ترجمہ "صاحب اقتدار" فرما رہے ہیں، اسکے تحت مجھے پچھلے ۵۰ برسوں کے دوران کسی دو صاحب اقتدار کے نام فراہم کر دیجئے جن پر اس آیت کا اطلاق ہو سکے میں زندگی بھر مشکور رہوں گا۔

اسکے بعد دیکھئے موصوف کا ایک اور دعویٰ جو آج تک شاید ہی کسی نے کیا ہو، صفحہ ۱۹۵ پر لکھتے ہیں، "متذکرہ صدر پہلی آیت سے متعلق اپنی تالیف "گلدستہ سادات امروہہ" کے صفحات ۱۱۸ اور ۱۱۹ پر مفصل بحث کر چکا ہوں۔"

ماشاءاللہ کیا بات ہے، میرا تو خیال ہے کہ متذکرہ آیت میں صرف "اطیعو الرّسول" اور" اولی الامر" پر کئی صفحات بھی لکھ دیے جائیں تو شاید آپ کی طرح مطمئن نہ ہوا جا سکے، آپ صرف دو صفحات میں اس اہم ترین آیت پر مفصل بحث کا دعویٰ فرما رہے ہیں۔

اب صفحہ ۲۸۶ پر اطیعو الرسول کی وضاحت میں سنت رسولؐ اور "اہل بیتؑ یا عترت" کو علیحدہ کرتے نظر آتے ہیں، جبکہ صفحہ ۲۸۷ پر "شیعوں کے ائمہ سے سنیوں کی عقیدت" کے عنوان کے تحت امام غائب سے کنارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"اب رہے گیارہ امام، اوّل حضرت علی کرم اللہ وجہ کو یہ صمیم قلب اور بہ شرح صدر "باب العلم" جانتے، سمجھتے اور کہتے ہیں۔ باقی رہے دس امام ان میں سے چند کو واقعی اعلیٰ ریسرچ اسکالر کی حیثیت سے امام یعنی ڈاکٹر کے درجہ پر فائز جانتے، سمجھتے اور کہتے ہیں۔ لیکن بعض کو انکے اعلیٰ اوصاف کی بنیاد پر اعزازی امام یا ڈاکٹر کے درجے پر فائز جانتے سمجھتے اور کہتے ہیں۔۔۔۔

جناب امان علی صاحب، مجھے حیرت ہے کہ آپ سنیوں کی عقیدت تو جتا رہے ہیں،

اپنا عقیدہ ظاہر نہیں کر رہے، کہ آپ کیا جانتے، سمجھتے اور کہتے ہیں۔ یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ تین لفظ "جانتے، سمجھتے اور کہتے" خصوصاً استعمال کر کے لفظ "مانتے" کو غائب رکھ کر اپنی فکر کی بلندیوں کی منہ دکھائی فرما رہے ہیں، میرے خیال میں آپ اہلِ سنت کا عقیدہ نہ بتاتے اپنا بتا دیتے تو شائد زیادہ اہم ہوتا۔ کیوں کہ اہلِ سنت کی عقیدت کے بارے میں مَیں اگلے صفحات پر وضاحت ضرور کروں گا۔

دیکھئے جناب سنت رسولؐ کا صحیح علم یا تو رسولؐ کا عمل دیکھ کر ممکن ہے، یا انکے بعد جو ان سے سب سے زیادہ قریب ہو انکے بیان سے ممکن ہے، لہٰذا اہلِ بیت اطہار کے بغیر کام نہیں چل سکے گا۔

اسکے بعد صفحہ ۲۷۳ پر امام مہدیؑ کے ظہور سے متعلق لکھتے ہیں، "راسخ العقیدہ شیعہ حضرات جو ان باتوں پر یقین کرتے رہے ہیں اور بولنے اور لکھنے میں ان کے ذکر کے ساتھ "عجل اللہ فرجہ" لازمی طور پر کہتے اور لکھتے ہیں (جس کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ جلد ان کو باہر لے آئے)۔"

حضور جب آپ لکھ رہے ہیں کہ "راسخ العقیدہ شیعہ" تو کم از کم ساتھ ہی ساتھ صحیح العقیدہ شیعہ حضرات کا بھی عقیدہ بتا دیتے تو بہتر نہ تھا، لیکن کیا کیا جائے کہ آپ موٹے موٹے ادق الفاظ استعمال کرنے کے چکر میں جملے کی صحت پر غور ہی نہیں فرما رہے، بہرحال اگر کوئی شیعہ یا اہلِ سنت فرد اس عقیدے سے فرق رکھتا ہوا نظر آ جائے تو آپ تحریر فرمادیں ورنہ میں درج ذیل میں ۲۸ دسمبر ۱۹۹۳ء کو مولانا جاوید اکبر ساقی، چیئرمین تحریکِ وحدت اسلامی، پاکستان، ابدالی چوک نزد سید ہاسٹل، سنت نگر، لاہور سے شائع ہونے والے "البیان فی اخبار مہدیؑ" کا اردو ترجمہ پڑھنے کی صلاح دوں گا، جس میں اہلحدیث، بریلوی اور دیوبندی جید علما کرام کے جانب سے عقیدہ ظہور پر

وضاحت کی گئی ہے، جن میں ڈاکٹر سرفراز نعیمی (جامعہ نعیمیہ لاہور)، (قائد اہلسنت خطیب اسلام) مفتی اللہ بخش اظہر ایم اے (جامع مسجد رضائے حبیب لاہور)، حضرت علامہ عبدالغفور (جامعہ فاروقیہ رضویہ لاہور)، حضرت مفتی عبدالقیوم ہزاروی (لاہور) مولانا محمد اسلم رضوی (جامعہ رضویہ ظہر الاسلام فیصل آباد) اور دیگر کے جوابات شامل کتاب ہیں۔ نیز درج ذیل میں حضرت امام مہدیؑ کی عظمت کتب اہل سنت صحاح ستہ کی روشنی میں دیکھ لیجئے۔

فرمایئے کچھ اہل سنت کی عقیدت سے آگاہی ہوئی یا مزید کی ضرورت ہوگی۔

آخر میں عرض کروں کہ جناب امان علی صاحب نے محترم علامہ ضمیر اختر نقوی کی تحقیق کی اہمیت کو تعصب کا الزام لگا کر کم کرنے کی کوشش کی کہ علامہ صاحب نے سید حسین شرف الدین کو شیعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے، میں عرض کروں کہ ایک محقق کی نظر میں شیعہ، سنی کچھ نہیں ہوا کرتا اسکی نظر میں صرف حقائق کی اہمیت ہوتی ہے، اگر محقق کو تاریخ میں کسی کے بارے میں اہل بیتؑ اطہار سے محبت یا مودت کا پہلو نظر آئے تو کیا وہ اسے تحریر نہ کرے، کیا حقائق دنیا کے سامنے نہ لائے۔ آپ نے علامہ ضمیر اختر پر تعصب کا الزام تو لگا دیا، خود آپ صفحہ اول سے آخر تک شیعہ ازم کے خلاف ہی لکھتے نظر آئے، صفحہ ۳۰۱ سے ۳۰۵ تک آپ قرآن میں لفظ شیعہ کا ترجمہ "فرقہ" "گروہ" کرتے نظر آتے ہیں، ساتھ ہی صفحہ ۳۰۱ پر کس قدر اعتماد سے فرماتے ہیں کہ "قرآن کریم میں جہاں بھی لفظ شیعہ مستعمل ہوا ہے وہ اچھے معنی میں نہیں ہوا" لیکن اسکے بعد صفحہ ۳۰۵ پر لکھتے ہیں۔

وان من شیعة لابراهیم

(یعنی اور انہی نوح) کے "پیروں" میں ابراہیم علیہ السلام تھے۔

یہاں لفظ شیعہ کے معنی "پیروں" کیسے استعمال کر گئے۔

خرد کا نام جنوں رکھ لیا جنوں کا خرد

جو چاہے آپکا حسن کرشمہ ساز کرے

آپ کی بے جا کوششوں سے نہ تو معصوم عوام اہلسنت بھٹکیں گے اور نہ ہی علامہ ضمیر اختر نقوی کی تحقیق پر کوئی الزام ثابت ہو سکے گا، البتہ اتحاد بین المسلمین کے مخالفوں کی جانب سے علامہ صاحب کی کتاب پر ۱۳ سال بعد جواب ثابت کرتا ہے کہ اس کتاب کی کیا اہمیت ہے، یہ ایک تاریخ ہے، جو رقم ہو چکی اور سادات امروہہ اور آئندہ کے محققین کے لئے ایک بہترین دستاویز کی حیثیت رکھے گی۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کے بارے میں یہ ضرور کہوں گا کہ "جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے" کیا اپنے کیا پرائے، انکے علم و دانش کے گرویدہ ہیں۔ خود امان علی صاحب صفحہ۔۔۔۔۔۔ پر ایک مثنوی میں امروہہ کے نام کے بارے میں لکھتے ہیں۔۔ حیرت ہے ضمیر اختر نقوی جیسے اہل علم و اہل دانش نے مثنوی پر اپنی جانب سے تحقیق نہ کی، جبکہ مثنوی کے سرورق پر ترمیم و تصحیح شدہ لکھا گیا ہے۔

امروہہ کے نام کے بارے میں آپ کی تحقیق اپنی جگہ، لیکن میں یہاں صرف فیضان سادات مؤلفہ سید فیضان علی نقوی، سید نذر حسنین نقوی شائع شدہ دسمبر ۱۹۹۱ء میں جناب سید فیضان علی نقوی کے مضمون "امروہہ کا تعارف" سے ایک اقتباس درج کروں گا جو اس سلسلے میں بہت مکمل ہے۔

"تاریخ ایک ایسا مضمون ہے کہ جو مورخ کے مشاہدات، اُس دور کے واقعات اور سنی سنائی باتوں پر مشتمل ہوتا ہے مورخ جو کچھ بھی دیکھ کر اور سنکر لکھتا ہے وہ آنیوالی نسلوں کے لئے تاریخ بنتی ہے۔ چنانچہ امروہا نام کے سلسلہ میں ایک واقعہ تقریباً سات

سو سال سے سینہ بہ سینہ چلا آ رہا ہے یہ کہ جب حضرت سید حسین شرف الدین شاہ ولایت امروہہ قدم رنجاں ہوئے تو اس بستی کے رہنے والوں نے آپ کی خدمت میں آنبہ (آم) پیش کئے۔ آپ تبسّم فرما کر محظوظ ہوئے موسم سرما میں آپ کی خدمت عالی میں روہو مچھلی پیش کی گئی جو کہ امروہہ کے تالابوں اور بان ندی میں کثرت سے پائی جاتی تھی تناول فرما کر خوشی کا اظہار کیا اور ان دونوں نعمتوں کی مناسبت سے اس بستی کا نام پہلے جو کچھ بھی رہا ہو انبروہا تجویز فرمایا اور یہی نام بگڑتے بگڑتے آج امروہہ ہے۔

پس جناب علامہ ضمیر اختر نقوی نے بھی متذکرہ مثنوی میں لفظیات کے اعتبار سے کچھ ترمیم یا تصحیح ضروری ہے اسکے علاوہ ۷۰۰ سے برس سے چلی آنے والی سینہ بہ سینہ روایت کو کس طرح جھٹلا سکتے تھے۔

محسن نقوی امروہوی

تاریخ کا دفتر

ذاکرِ آلِ عبا، تاریخ کا دفتر ضمیر
مخزنِ علم و ادب کے بے بہا جوہر ضمیر
ذکرِ اہلِ بیتؑ ان کا ہے شعارِ زندگی
زیرِ سایہ ہیں علم کے برسرِ منبر ضمیر

❀❀❀

مظہر پنجتنی مرحوم

صدقے وقار ہے

اس صدرِ بزمِ شاہ کا کیا افتخار ہے!
مولانا ضمیر اختر پہ صدقے وقار ہے
مظہر ثنا اس عالمِ دیں کی کرے گا کیا
حیدرؑ کا سایہ جس پہ کہ لیل و نہار ہے

کلام میں اثر

اللہ رے! کلام میں، اختر، تیرے اثر
مانندِ موم ہوتا ہے پتھر کا بھی جگر
اللہ کا ہے فیض تو تائیدِ پنجتن
مدّاحِ اہلِ بیتؑ میں جو تُو ہے نامور

❀❀❀

تاریخِ مرثیہ نگاری

ڈاکٹر شوذب کاظمی

تبصرہ

نوادراتِ مرثیہ نگاری

جلد اوّل

"نوادرات مرثیہ نگاری" علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی کے پینتیس ۳۵ تحقیقی و حوالہ جاتی مقالات کا مجموعہ ہے جو دو جلدوں میں مرکزِ علومِ اسلامیہ کراچی کی جانب سے حال ہی میں شائع ہوا ہے۔ مرثیے سے ضمیر اختر کا تعلق خاطر دیرینہ ہے یوں رثائی ادب میں ان کی محققانہ کاوشوں کا شہرہ چار دانگِ عالم میں ہے اسی لیے ناقدین علم و ادب علامہ صاحب کا شمار ایشیا کے نامور محققین میں کرتے ہیں۔ "نوادرات مرثیہ نگاری" سے قبل رثائی ادب سے متعلق اُن کی جن متعدد تصنیفات و تالیفات نے عالمی شہرت حاصل کی ہے اُن میں تاریخ مرثیہ نگاری (۱۴ جلدیں)، میر انیس حیات اور شاعری، اشاریہ مرزا دبیر" جوش ملیح آبادی کے مرثیے، شعرائے اردو اور عشق علی، اردو مرثیہ پاکستان میں، خاندانِ انیس کے نامور شعرا، اردو ادب پر واقعہ کربلا کے اثرات، تذکرہ شعرائے لکھنؤ، میر انیس کی شاعری میں رنگوں کا استعمال، The Study of Elegies of Mir Anees جیسے نادر موضوعات پر تحقیقی سواد کی یکجائی و فراہمی ڈاکٹر ضمیر اختر ہی سے خاص سمجھی جاتی ہے۔ ان غیر معمولی کارناموں کے لیے جس جگر کاوی اور وقت

نظری کی ضرورت ہے اس کے تمام عناصر قدرت نے علامہ ضمیر اختر کے مخفی وجود میں ابتدا سے ودیعت کئے ہیں۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ دیدہ ریزی اور محنت شاقہ سے اپنے پسندیدہ موضوعات کو دستاویزی دلائل و براہین سے آراستہ و پیراستہ کر کے موضوع کے تمام تر زاویے قاری پر آسان کرنے میں ید طولیٰ رکھتے ہیں اسی باعث علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی مدظلہ العالی کی ہر تحقیقی کاوش کو ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا ہے اور مختلف و متنوع شعبہ ہائے حیات کے علاوہ زعما اور طلبہ و طالبات اس سمندر سے نایاب موتی دریافت کر کے اپنا مورال بلند کرنے کا سامان فراہم کرتے رہتے ہیں۔ "نوادرات مرثیہ نگاری" کو ایسی زنبیل قرار دیا جا سکتا ہے جس میں عہد بہ عہد رثائی ادب کو سرمایہ فراہم کرنے والی نابغہ تخلیقی شخصیات کے اصول رشحات قلم پہلی بار اکٹھے کر کے منظر عام پر لائے گئے ہیں۔ اس طرح انہوں نے قلمی مخطوطات کو صدیوں کی گرد جھاڑ کر تشنگان علم و ادب کی سیرداری میں دینے کے ازلی عزم کو عملی صورت دینے کے بلند و عظیم المرتبت منصوبے کی زرالی شکل نکالی ہے۔ اس طرح تحقیق کے گرتے ہوئے معیار کو سنبھالا دینے کی جس تحریک کو وقت کا اہم ترین تقاضا سمجھا جا سکتا ہے اس کا آغاز نئی صدی کی دہلیز پر علامہ صاحب کی ذات گرامی کے ذریعے ہوا ہے۔

"نوادرات مرثیہ نگاری" کا پہلا مقالہ مرزا ہادی رسوا کی مرثیہ نگاری" سے متعلق ایسی نایاب معلومات کا مظہر ہے جو اس موضوع کے محققین (ڈاکٹر میمونہ انصاری اور ڈاکٹر ظہیر فتحپوری) کو بھی تلاش بسیار کے باوجود میسر نہ آسکیں اور وہ رسوا کی مرثیہ نگاری سے انکاری رہے۔ اس تحقیقی تساہل کا نتیجہ یہ نکلا کہ اس سلسلے کے تمام تنقید نگار اور سوانح نگار اسی غلط بحث کو عام کرتے رہے۔ آج سے بیس پچیس سال پہلے بھی علامہ ضمیر اختر کے ذخیرۂ کتب میں رسوا لکھنوی کے دو قلمی مرثیے موجود تھے اور انہوں نے اس بات کو

پردۂ اخفا میں بھی نہیں رکھا تھا بلکہ اس کا حوالہ اس دور کی تصنیف "اردو مرثیہ پاکستان میں" بھی جناب حر کے حال کے لاجواب مرثیے کے اولین بند کے ہمراہ آچکا تھا۔ علامہ ضمیر اختر نے اس مقالے میں کم و بیش سوا سو بند کا یہ مرثیہ ہی محفوظ نہیں کیا بلکہ رسوا کے نایاب سلام اور نوحے بھی اہم حوالوں کے ہمراہ شامل کیے ہیں۔

"نوادرات مرثیہ نگاری" کے دوسرے مقالے میں علامہ صاحب نے جرأت و مصحفی کے ہم عصر حنفی العقیدہ شاعر سعادت یار رنگین کے انڈیا آفس لندن میں محفوظ "دیوان ریختہ" سے مربع مرثیے کے پینتیس[۳۵] بند، ایک نامکمل سلام اور ایک نامکمل مسدس مرثیے کے مطلع کی یکجائی کا فریضہ سرانجام دیا ہے واضح رہے کہ اس موضوع کے اسکالر ڈاکٹر صابر علی خان کے مطبوعہ تحقیقی مقالے میں مذکورہ مراثی کا صرف ایک ایک بند ہی درج ہے۔ علامہ ضمیر اختر کا اصل کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے ۱۹۸۰ء میں تاریخ مرثیہ کا یہ نادر اضافہ فراہم کر کے اپنے مجلے "القلم" کے ذریعے عام کیا۔ اس کا ایک بند ملاحظہ کیجیے۔

حضرت شہ نے کہا پانی کی خاطر تو نہ جا   اس سے کچھ حاصل نہیں، تقدیر کو پھیرے گا کیا
پانی لانے کا نہیں مت ہاتھ جی سے دھو بھلا   پانی پینا ہے نہیں قسمت میں اب اپنے یہاں

میر حسن کے استاد "میر ضیاء الدین ضیا دہلوی کی مرثیہ نگاری" کے حوالے سے جو مقالہ علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی نے تحریر کیا ہے اس میں تذکروں کے حوالے بہ افراط آئے ہیں۔ یہ مقالہ ضیا دہلوی کی دینی شاعری ہی نہیں غزلیہ سرمائے کے بارے میں بھی اسناد کا درجہ رکھتا ہے مقالے میں ایک مربع مرثیہ اور دو مسدس مراثی شامل کیے گئے ہیں۔

"ظہیر دہلوی کے غیر مطبوعہ مرثیے" یکجا کرتے ہوئے علامہ صاحب نے اس

حقیقت کو نمایاں رکھا ہے کہ ظہیر کے والد مرصع رقم جلال الدین حیدر خطِ نسخ میں بہادر شاہ ظفر کے استاد تھے۔ مقالے میں ظہیر کے احاطۂ فن میں آنے والی اصناف غزل، مرثیہ، قصیدہ، مثنوی، قطعہ رباعی، حمد، نعت، منقبت وغیرہ تفصیلاً زیر بحث آئی ہیں بعد ازاں ان کی مرثیہ گوئی کے اجزا کی دلیلیں مختلف مراثی سے فراہم کی گئی ہیں۔ مقالے کے متن اور حواشی سے ظہیر کے ہمعصر شعرا بلکہ پورے عہد سے متعلق نادر معلومات بھی مل جاتی ہیں۔

آغا ذہین کے حالات اور شعری اظہار کے مختلف و متنوع زاویے زیر بحث لاتے ہوئے اپنے تنقیدی مضمون میں علامہ ضمیر اختر نے موضوعِ مقالہ شخصیت کی ولادت، وفات، خاندان، ماحول ذات وضع قطع، ذوق عبادت، حلقہ احباب، مرثیہ خوانی، معاصرین سے روابط، شادی، اولاد کے بارے میں مستند حوالوں سے معلوماتی مواد یکجا کیا ہے نیز مراثی و سلام کی فہرستیں تک مرتب کر ڈالی ہیں۔ اشاریہ سازی کی یہی روش آغاز ہی سے ان کے تحقیقی کاموں کو برصغیر کے پورے تحقیقی مزاج سے الگ اور نمایاں ثابت کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکیلی ذات کو انسٹی ٹیوٹ اور علمی ایجنڈ کا درجہ حاصل ہے۔

سرزمین کربلا کے موضوع پر محزون دہلوی کا غیر مطبوعہ مرثیہ اس کتاب میں ایک الگ مقالے کے ذریعے محفوظ کیا گیا ہے جس دیگر حقائق کے علاوہ تخلص تک کی وجہ تسمیہ بیان کر دی گئی ہے۔ مقالے کی خاص بات یہ ہے کہ مرثیے سے پہلے اس فارسی گو شاعر کے اردو غزلیہ کلام کا ایک انتخاب بھی دے دیا گیا ہے جو محزوں اپنے شاگردوں کی درخواست پر کبھی کبھی کہا کرتے تھے۔

میر تقی دہلوی کی مرثیہ گوئی پر علامہ کا اظہار نسبتاً مختصر ہے اس کی وجہ تحقیقی مواد کی

عدم دستیابی بھی ہو سکتی ہے۔ پھر بھی چھ تذکروں سے کام کی باتیں نکال کر شائقین مرثیہ کے لیے پہلی بار دستاویزی صورت میں سامنے لائے ہیں اور ایک غیر مطبوعہ مرثیے کے اقتباسات بھی درج کیے ہیں شاہ اکبر دہلوی کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے جو مقالہ "نوادرات مرثیہ نگاری" میں شامل ہے بدون حواشی ہونے کے باعث بعض حقائق کی تفصیلات میں خلط بحث کا شائبہ چھوڑتا ہے ص ۲۷۴ پر چار مراثی کی فہرست میں نمبر ۱ اور نمبر ۳ کی بحور میں تعداد ارکان کا تعین درست نہیں کیا جا سکا۔ مزید یہ کہ اس مقالے میں دو مراثی کی شمولیت سے پہلے مصحفی کے "تذکرہ ہندی گویان" کی عبارت کا یہ ترجمہ دیا گیا ہے "جب مصحفی ۱۷۷۶ء (مقالے میں اسے سن ہجری لکھا گیا ہے) دہلی پہنچے تو سب سے پہلے اکبر دہلوی نے ان کی شاگردی اختیار کی" جبکہ مصحفی کے اصل الفاظ یہ ہیں کہ۔

طرح مشاعرہ انداختہ اول برائے

"در آں ایام کہ فقیر در شاہجہان آباد
اصلاح شعر رجوع بہ فقیر آوردہ بود"

یہ درست ہے کہ اکثر تذکرہ نگاروں نے انہیں دہلوی ہی لکھا ہے تاہم اکبر علی نام کے یہ شاعر حاتم کے تلامذوں میں آنے سے پہلے اپنے استاد اول کی نسبت سے خود کو امروہوی لکھا کرتے تھے اور ان کا رنگ غزل یہ تھا۔

ہمارے دل میں خنجر ناز کے کیا کیا نہ گڑتے ہیں	یہ کافر خوبرو جس وقت تن کر تک اکڑتے ہیں
یہ جتنے خوبرو سرکش ہیں ان کو خوب دیکھا ہے	گئے پر حسن کے ہر ایک کے پھر پاؤں پڑتے ہیں
خدا چاہے سو ہووے اب ہمارے حق میں اے اکبر	صنم سا اپنے ہم بھی آج اک سے پڑتے ہیں

اپنے مقالے "خادم دہلوی کے غیر مطبوعہ مرثیے" میں علامہ صاحب نے خادم کے

چودہ مراثی کی فہرست حروف تہجی کے اعتبار سے بحور کے تعین کی وضاحت کرتے ہوئے شامل مقالہ کی ہے۔ جس سے مراثی کے ردیف وار ہونے کا گمان ہوتا ہے جبکہ شاعری میں اس کا تعین مصرع کے آخری لفظ سے کیا جاتا ہے نہ کہ پہلے لفظ سے جیسا کہ فہرست سے ظاہر ہوتا ہے۔ قارئین اس مقالے سے چار مراثی اور ایک نایاب سلام کا نمونہ ملاحظہ کر سکتے ہیں۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی تحقیق پسند طبیعت نے ایک ہندی مرثیے کی کتاب میں شمولیت کا جواز فراہم کیا ہے اور وہ ہے مہدی علی خاں عاشق دہلوی کا۔ میر و سودا کے دور کے اس شاعر کے رنگ مرثیہ کو واقعی بقول علامہ صاحب اسی عہد کے تناظر میں دیکھنا چاہیے مظہر جان جاناں کے شاگرد بیان دہلوی کے دو غیر مطبوعہ مرثیے "نوادرات مرثیہ نگاری" کا حصہ ہیں۔ جن کا دیوان قلمی کراچی میوزیم میں محفوظ ہے یہ دونوں مرثیے اسی دیوان سے لیے گئے ہیں ان مراثی کے علاوہ بیان کے ایک قصیدے اور انتخاب مثنوی کو علامہ صاحب پہلے ہی اپنی کتاب "شعرائے اردو اور عشق علی" میں درج کر چکے ہیں۔

حافظ ممتاز دہلوی جو سودا کے تلامذہ میں سے تھے ان کا مرثیہ محفوظ کرتے ہوئے علامہ صاحب نے بتایا ہے کہ وہ قائم چاند پوری کے ہم عصر تھے اور ریاضی کے علوم و فنون پر مکمل دسترس رکھتے تھے۔ ان کا شامل کتاب مربع مرثیہ، بحر رمل مثمن محذوف میں ہے۔ یہ مرثیہ بھی قومی عجائب گھر کراچی میں موجود شاعر کے ایک قلمی نسخے سے لیا گیا ہے۔

فورٹ ولیم کالج بحر کی نثری تحریک کے حوالے سے شہرت رکھنے والے شاعر و نثر نگار مظہر علی خان ولا دہلوی کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ مع نمونہ سلام شامل نوادرات کے جوشِ عاشور کے موضوع پر ہے اور بحر مضارع میں موزوں کیا گیا ہے۔ شریف دہلوی

کے ایک مربع ہیئت کے ہندی مرثیے کو نوادرات میں مکمل صورت میں شامل کیا گیا ہے
اس سے پہلے اس کے چند بند علامہ صاحب سے لے کر دہلوی مرثیہ گو جلد دوم میں
شائع کیے گئے تھے۔

مقبولؔ دہلوی کے جو غیر مطبوعہ مرثیے "نوادرات مرثیہ نگاری" میں محفوظ کیے گئے
ہیں اُن کی تعداد دو ہے۔ مراثی سے پہلے حالات زندگی کے حوالے تذکروں سے دے
کر منتخب اشعار کا حصہ رکھا گیا ہے جو مقبولؔ کی غزلیہ شاعری سے کیا گیا ہے۔ دونوں
مرثیے شہزادہ علی اصغر کے حال میں ہیں اور علامہ صاحب کے کتب خانے سے لیے گئے
ہیں اس طرح کتاب کے اولین سوا دو سو صفحات میں دہلی کی مختلف ادوار پر مشتمل مرثیہ
نگاری کی تاریخ محفوظ کی گئی ہے۔ "العلم" سے متعلق مقالے میں علامہ ضمیر اختر نقوی
نے وہ تمام تسامحات اور غلط مبحث رفع کیے ہیں جو اس مجلے کے مضمون نگاروں سے جنم
لیتے رہے ہیں۔ ایسا کرتے ہوئے علامہ صاحب نے دستاویزی دلائل فراہم کیے ہیں
البتہ ایک مقام پر ان کا ایک بیان اسی سلسلے کے اپنے ہی ایک اور بیان سے مختلف ہو گیا
ہے۔ اکبر دہلوی کے ضمن میں رقم طراز ہیں۔ "اکبر دہلوی کا ایک مرثیہ سید محمد رشید
صاحب (لکھنؤ) کے کتب خانے میں موجود ہے اور تین مرثیے ذخیرۂ ادیب میں محفوظ
ہیں"۔ (ص ۲۳۸)

علامہ صاحب نے اکبر دہلوی کی مرثیہ نگاری پر اسی کتاب میں شامل ایک الگ
مقالے میں سید محمد رشید صاحب کے کتب خانے کا سرے سے تذکرہ نہیں کیا بلکہ یہ لکھا
کہ: ذخیرۂ مسعود حسن ادیب میں اکبر دہلوی کے چار مرثیے قلمی ہیں (جو) شمس آباد
کے ذخیرے سے (انہیں) حاصل ہوئے تھے" (ص ۱۷۴) نیز علامہ صاحب نے اپنے
کتب خانے سے جو مربع مرثیہ شامل کتاب کیا اس کا ایک مصرع ص ۱۷۵ پر یہ لکھا"

کیونکہ وہ تنہائی سے اور پھر رہا رونا سدا"۔ جبکہ زیر نظر مقالے میں یوں درج ہے
"کیونکہ وہ تنہائی ہے اور یہ ہا رونا سدا"

مرحمت خان واؔلہ دہلوی کی دس رباعیات علامہ صاحب نے ایک حوالہ جاتی مقالے میں یکجا کی ہیں اور احتیاط سے درج کی گئی ہیں تاہم دوسری رباعی میں کمپوزیٹر کی غلطی سے یہ مصرع کچھ سے کچھ ہو گیا ہے۔ یہی حال آٹھویں رباعی کے مصرع اول کے ساتھ ہوا ہے۔

امید دوا زمصطفےٰ می خواہم

بہار کے معروف مرثیہ گو شاہ آیت اللہ جوہریؔ کے دو مشہور مرثیے علامہ صاحب نے ایک مقالے میں درج کیے ہیں جو کھڑی بولی اور پوربی کی آمیزش سے یقیناً نئے رنگ و آہنگ کے مرثیے ہیں۔ فارسی کلام میں ان کا تخلص شورشؔ اور مرثیے میں مذاقؔ تھا، مذاقؔ دہلوی کا غیر مطبوعہ مرثیہ نوشاہ قاسم کتاب کے آخری صفحات میں شامل ہے جو بحر بسیط کے مترنم آہنگ میں کہا گیا ہے۔ سپہرؔ دھولپوری کے دو مرثیے جو طباعت کی منزل سے ہمکنار نہیں ہوئے علامہ صاحب نے اُن کی تمام فہرست کے ساتھ دو مراثی کا انتخاب شامل کتاب کیا ہے۔ نواب رستم علی خان سپہرؔ دھولپوری جوشؔ ملیح آبادی کے ماموں تھے۔ جوشؔ نے ان کا تخلص تمہرؔ بتایا ہے جسے علامہ صاحب نے مغالطے پر محمول کیا ہے۔ جوشؔ سے اسی تعلق کے باعث مقالے میں "یادوں کی برات" کے حوالے زیادہ ہیں۔ امروہہ کے ایک قدیم مرثیہ نگار زماںؔ امروہوی کا ایک مربع مرثیہ علامہ صاحب نے صدیوں کی گرد سے ڈھونڈ نکالا ہے واضح رہے کہ "مرثیہ نگاران امروہہ" تک میں اس شاعر کا ذکر نہیں کیا گیا۔ ایسی ہی خصوصیات کی بنا پر علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کو بجا طور پر مرثیے کا متخصص مانا جاتا ہے۔

تقسیم ہندوستان سے دو سال قبل انتقال فرمانے والے مرثیہ گو مشتاق مصطفےٰ آبادی کے چھ مراثی کی نشاندہی کی ہے جو علامہ صاحب کے فراہم کرنے کے باوجود شاعر محترم کے اقربا سے شائع نہ ہو سکے۔ علامہ صاحب نے جلد اوّل کا اختتام انہی کے مرثیوں سے انتخاب اور ایک غیر مطبوعہ مرثیے پر کیا ہے۔ اس پہلی جلد میں محقق کی جانب سے جس قدر محنت و عقیدت کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے۔ اس کو سراہنے سے اجتناب زیادتی کے مترادف ہوگا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ "نوادرات مرثیہ نگاری" کے ذریعے علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی مدظلہ العالی صدیوں کی دبی ہوئی آوازوں کو آفاقیت سے ہمکنار کرتا اور دنیا بھر کو یہ بتا دینا چاہتے ہیں کہ رثائی ادب کوئی وقتی یا محدود موضوع نہیں بلکہ آج بھی اس میں تحقیق کی ان گنت گنجائش موجود ہیں۔ اس طرح انہوں نے مرثیہ نگاروں کو عالمی سطح پر اجاگر کر کے اس الزام کو بھی رد کر دیا ہے جو "اردو مرثیہ پاکستان میں" کے حوالے سے ان کی ذات پر لگایا گیا تھا کہ ضمیر اختر جیسے وسیع النظر دانشور بھی مخفی خواہشوں اور پوشیدہ تقاضوں کے تحت یہ کوشش کر رہے ہیں کہ..... بہت سے شاعروں، ادیبوں اور مصنفوں کو ہندوستان کی تاریخ ادب سے توڑ لیں اور پاکستان کی تاریخ ادب میں مدغم یا ضم کر دیں" اس سلسلے میں علامہ ضمیر اختر کو مورد الزام ٹھہرانا قطعی درست نہیں اس لیے کہ انہوں نے تاریخی حقائق کو کہیں بھی تبدیل کرنے کی بھی کوشش نہیں کی اور نہ ہی کسی شاعر کی شہریت بدلنے کی بلکہ جس شاعر کا جس مقام پر جتنا ارتقائی سفر طے ہوا اتنا ہی لکھا۔

ڈاکٹر شوذب کاظمی:

تبصرہ

نوادراتِ مرثیہ نگاری

﴿جلد دوم﴾

نوادرات مرثیہ نگاری کی جلد دوم میں شامل بائیس تحقیقی مقالات رثائی ادب سے متعلق علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی کے ادبی کمالات کی دستاویزی شہادتیں فراہم کرتے ہیں۔ ان مقالات میں تحقیق کا جوہر اس طور نمایاں رکھا گیا ہے کہ تاریخ مرثیہ کے بارے میں وقتاً فوقتاً پیدا ہونے والے تسامحات کا ازالہ دلائل و براہین سے از خود ہوتا چلا جاتا ہے اور یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ گذشتہ صدیاں رثائی ادب پر کس کس انداز سے گراں گزرتی رہی ہیں۔

اس جلد کے پہلے مقالے "غیر مطبوعہ مرثیوں کی تلاش" میں علامہ صاحب نے واضح کیا ہے کہ مرثیے کا موضوع جس قدر محترم ہے اس سے کہیں زیادہ مظلوم بھی رہا ہے۔ صدیوں کے عمل میں اس دینی ورثے کے سینکڑوں امین منظر عام پر آئے لیکن بدقسمتی سے انہی کی مختلف و متنوع طبائع کے باعث نایاب و نادر بستوں کی کرم خوردگی میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ تساہل تحقیق کے ہاتھوں اردو ادب کی اس قدیم ترین مگر معتبر صنف شاعری پر دُہرا وار ہوا۔ ایک طرف تو مرثیے کے آفاق محدود متصور کیے جانے

گئے دوسری طرف تشنگانِ دین وعلم دنیائے ادب کی اس عالمگیر سرگرمی کے لمحہ بہ لمحہ ارتقا سے محروم رکھے گئے اور نتیجہ یہ ہوا کہ بقول پروفیسر کرار حسین "زمانے نے جب اپنا ورق الٹا تو قدیم مرثیے کے سرمائے پر بھی افتاد پڑی"...... اس سرمائے میں سے کم تر ہمارے پاس موجود ہے، بہت کچھ ضائع ہو چکا اور کچھ اب بھی کوٹوں کھدروں میں پڑے ہوئے پرانے بستوں میں دیمک کی نذر ہو رہا ہے"۔ علامہ ضمیر اختر نقوی نے اس الیے کو تہذیب کے ضمیر کی پکار سمجھ کر قبول کیا ہے اور مرثیے کے قدیم وجدید سرمائے کو جمع ومحفوظ کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ اس پر طرہ یہ کہ وہ اس صنف سے متعلق تنقیدی شعور بیدار کرنے اور اس کے بارے میں نسلِ نو کی درست سمت رہنمائی کا فریضہ بھی بطریق احسن ادا کر رہے ہیں۔ غیر مطبوعہ مرثیوں کی تلاش کے ضمن میں تین قلمی تذکروں کا تذکرہ کیا ہے جن میں ساتویں صدی ہجری سے چودھویں صدی ہجری تک کے مرثیہ نگاروں کے حالات زندگی اور مرثیے شامل ہیں ان تذکروں کے حوالے سے تین سو چار شعرا کی فہرست معہ تعداد مراثی علامہ صاحب نے شامل مقالہ کی ہے اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ اب بھی ہزاروں مرثیوں کے مصنفین کے نام وحالات پردۂ اخفا میں ہیں اسی طرح تذکروں میں ایسے مرثیہ گو شعرا کے حالات دستیاب ہیں جن کے مرثیے تلاش کے باوجود اب تک نہیں مل سکے ہیں۔ اس لئے ضرورت اس امر کی ہے کہ دونوں باتوں کو بنیاد بنا کر تاریخ مرثیہ مرتب کی جائے۔ علامہ صاحب نے "نوادرات مرثیہ نگاری" کی دونوں جلدوں کو تحقیق کے اسی لامتناہی سفر کا نقطۂ آغاز قرار دیا ہے۔

"مرثیے کی تاریخ میں بیگماتِ اودھ کا حصہ" ایک اہم مقالہ ہے جس میں علامہ صاحب نے مرثیے کی تحقیق کے سلسلے میں روا رکھی جانے والی زیادتیوں کو موضوع بنایا ہے اور نتیجہ یہ اخذ کیا ہے کہ تحقیق وتنقید کے اصولوں سے بے خبر رہ کر اس موضوع سے

انصاف نہیں کیا جا سکتا۔ سب سے پہلے انہوں نے میر عشق کے مرثیے پر قلم اٹھایا ہے جسے گوہر آرا بیگم سے محض قیاس اور بودے دلائل کی بنا پر منسوب کر دیا گیا علامہ صاحب نے مقطع کے دو بند شامل مقالہ کر کے اس غلط بحث کو دور کیا ہے۔

پھر عالم آرا بیگم عالم اور مرزا محمد عالم کے مراثی کی تفریق ظاہر کی ہے بعد ازاں انہوں نے تفصیل سے نواب زہرہ بیگم، تاجدار بہو، نواب ملکہ زمانی بیگم، نواب سلطان عالیہ بیگم کی سلام گوئی و مرثیہ نگاری سے مفصل بحث کی۔

نوادرات مرثیہ نگاری کا ایک نادر مضمون غیر منقوط مرثیوں کے بارے میں ہے جس کے آغاز میں حضرت علی علیہ السلام کا ایک غیر منقوط خطبہ شامل مضمون کیا گیا ہے۔

علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب نے مقالے کے آغاز میں یہ واضح کیا ہے کہ دنیا میں بہت کم شاعر ایسے ہیں جو اس فن پر پورا اتر سکتے ہیں اور جنہوں نے بغیر نقطوں کے مرثیے کہے ہیں، اس مضمون میں سب سے پہلے انہوں نے جس شاعر کی مثال پیش کی ہے وہ انشاء اللہ خاں انشاء ہیں۔ جنہوں نے اس فن کے نمونے کے طور پر حضرت علی کی تعریف میں ایک قصیدہ کہا ہے بعد ازاں علامہ صاحب نے مرثیہ نگاری کے ذکر سے پہلے بعض شعرا کی سلام نگاری کا ذکر کیا ہے جو غیر منقوط ہے۔ جن شاعروں کی غیر منقوط مرثیہ نگاری کا تذکرہ علامہ صاحب نے اس مقالے میں تفصیل سے کیا ہے ان میں مرزا دبیر، نواب تقی اختر، سید محمد شمیم، زائر زید پوری، قاری یعقوب علی نصرت، میر عشق حسرتی ہاشمی اور دیگر شاعر شامل ہیں۔ اس فہرست کے آخری شاعر کا ایک غیر منقوط مرثیہ بھی علامہ صاحب نے تلاش کر کے مقالے کا حصہ بنایا ہے۔

"نوادرات مرثیہ نگاری" کا ایک اہم مقالہ مرزا محمد حسن مذنب لکھنوی کے غیر مطبوعہ مرثیوں کے بارے میں ہے۔ جنہیں چھوٹے مرزا کے نام سے بھی پکارا جاتا

تھا۔ پہلے علامہ صاحب نے شاعر کے حالات بیان کیے ہیں، پھر ان کے مرثیوں پر تنقیدی رائے ظاہر کی ہے۔ اس مقالے میں شاعر محترم کے چند شاگردوں کا تذکرہ بھی تحقیقی حوالوں کے ساتھ آتا ہے اس طرح یہ مقالہ ایک تحقیقی دستاویز کی صورت اختیار کرگیا ہے۔ آخر میں حواشی بھی دیے گئے ہیں۔

محمد اعظم تجلی لکھنوی کی غیر مطبوعہ مرثیہ نگاری کو زیر بحث لاتے ہوئے علامہ صاحب نے کئی تذکروں کو حوالہ بنایا ہے۔ اُن کا جو مرثیہ شامل کتاب ہے اس کا قلمی نسخہ علامہ صاحب کے کتب خانے میں محفوظ ہے۔ یاد رہے کہ اس شاعر کا ذکر بہت سے تذکروں میں آیا مگر مرثیے کے نمونے کوئی بھی تذکرہ نگار نہ دے سکا یہ علامہ صاحب کا تحقیقی کارنامہ ہے کہ انہوں نے بڑی کاوش سے شاعر محمد اعظم تجلی لکھنوی کا ایک ایسا نمونہ شاعری عوام کے سامنے پیش کیا ہے جو بیک وقت دو بحروں میں پڑھا جاسکتا ہے۔ یہ مرثیہ حضرت عباسؑ کی شہادت کے بارے میں ہے۔

ایک مقالے میں علامہ صاحب نے ہوشؔ لکھنوی کے ہندی مرثیے کو موضوع بنایا ہے جو میر سوزؔ دہلوی کے تلامذہ میں سے تھے ان کا پہلا مرثیہ مربع ہیئت میں ہے اور بحر متقارب میں کہا گیا ہے۔ اس میں بی بی صغریٰ کی زبانی وطن چھوڑنے کے مضامین بڑی خوبی سے لائے گئے ہیں۔ ہوشؔ لکھنوی کا دوسرا مرثیہ اسی ہیئت میں اور بحر مضارع مثمن اخرب میں کہا ہوا ہے جو امام عالی مقام کی شہادت کے احوال میں ہے۔

راجہ چندو لال شاداںؔ کا ایک کمیاب مرثیہ جو سفر شام کے موضوع پر ہے علامہ صاحب نے شامل کتاب کرتے ہوئے تحقیقی حوالوں کے ساتھ مع حالات زندگی نذر قارئین کیا ہے۔ اسی مقالے میں شاعر کے غزلیہ رنگ و تنغ کے نمونے بھی دستیاب ہیں۔

نواب محمد تقی ترقیؔ کی سخاوت اور رثائی ادب سے تعلق کے بارے میں معلومات

علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی کے اس تحقیقی مقالے کا حصہ ہیں جو انہوں نے شاعر مذکور کے ایک غیر مطبوعہ مرثیے پر تحریر کیا ہے۔ اس شاعر کی تاریخ وفات کئی شعراء نے اپنی منظومات میں نکالی ہے علامہ صاحب نے نمونے کے طور پر تاریخ کے اردو اور مرزا افطر علی کے فارسی قطعہ ہائے تاریخ اپنے مقالے میں درج کیے ہیں۔ اور بتایا ہے کہ ترقی کے حالات زندگی اور مرثیہ نگاری کے تحقیقی حوالے تلاش کرنے کے لیے انہیں ملکوں ملکوں گھومنا پڑا۔ آخر ان کا دیوان انڈیا آفس لندن میں نظر سے گذرا۔ مقالے میں ترقی کے مراثی کی فہرست اور تمام مراثی کے نمونے ملاحظہ کیے جاسکتے ہیں۔ مقالے کے اختتام پر حواشی درج ہیں۔

مرزا دبیر کے ایک شاگرد حکیم مرزا احمد علی مسیح لکھنوی کی مرثیہ گوئی علامہ صاحب کے ایک نسبتاً مختصر مقالے میں زیر بحث آئی ہے تاہم اختصار کے باوجود یہ مقالہ بھی کئی تذکروں اور ذخیروں کے حوالوں سے مرصع ہے اور ایک حکایت کی شمولیت سے شاعر کی حیات کے اس پہلو پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ وہ شاہی حکیم تھے۔

شاہ اودھ بادشاہ نصیر الدین حیدر کی مرثیہ نگاری کے حوالے سے شامل کتاب مقالے میں علامہ صاحب نے اس امر پر تفصیل سے اظہار خیال کیا ہے کہ شجاع الدولہ سے واجد علی شاہ اختر تک اودھ کے آٹھ حکمرانوں میں سے کوئی بھی بادشاہ مذہبی خلوص سے بیگانہ نہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ایک صدی سے زائد مدت کے دوران وہاں علوم و فنون، ادب اور مذہب کو بے مثال عروج حاصل ہوا۔ علامہ صاحب نے بتایا ہے کہ موضوع مقالہ شاعر اپنی شاعری میں "علی حیدر" کے علاوہ "جاں نثار" اور "بادشاہ" کے تخلص بھی اپنے مقطعوں میں استعمال کرتے تھے اور ان کا مذہبی لگاؤ کمال کا تھا۔ اس مقالے میں شاہ نصیر الدین حیدر کے مرثیوں کے علاوہ ان کے عہد کے مرثیہ نگاروں کی

مکمل فہرست بھی مقالے کا حصہ ہے۔

جرأت کے تلامذہ میں سے ایک اہم شاعر شوکت لکھنوی کی سلام و مرثیہ گوئی کی اُن مثالوں سے جنہیں علامہ صاحب کے ایک مقالے سے تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ شوکت گریے کا عنصر اپنی دینی شاعری میں غالب رکھتے تھے۔

لکھنؤ کے ایک اور شاعر جن کی غیر مطبوعہ جاگیر سلام و مرثیہ علامہ صاحب کی تحقیق کا بطور خاص موضوع قرار پائی ہے، مرزا ودھنے حسن طاہر تھے جو فتح پور ہنسوا سے لکھنؤ آ کر آباد ہوئے۔ ان کے ہاں فارسی روایت کے ساتھ ساتھ ہندی الفاظ کی شمولیت ان کے رنگِ سخن سے خاص ہے وہ اپنے مسدس میں بیت کو بطور خاص ہندی میں لاتے ہیں اور بیت کی بحر بھی پہلے چار مصرعوں سے الگ رکھتے ہیں، اور وہ بالعموم دوہے کی ہوتی ہے مثلاً

ہوئے راہی جو سوئے شام عابد غریب و بیکس و ناکام عابد
یہ کہتے جاتے تھے ہر گام عابد اٹھائے کس طرح آرام عابد

رکت جوت ہے تروان سے پڑت جات ہیں گھاؤ
چھٹی رات کے لکھن کا کون بھلا اوپاؤ

منشی صابر لکھنوی کے بارے میں تمام تذکرہ نگار اس بات پر متفق ہیں کہ ان کے مراثی دستیاب نہیں ہیں لیکن علامہ ضمیر اختر نقوی نے نہ صرف یہ کہ دنیا کے مختلف کتب خانوں میں موجود ان کے مرثیوں کے مطلع درج کیے بلکہ تعداد بند اور بحر سے متعلق بھی معلومات بڑی کاوش سے فراہم کی ہیں اور آخر میں اپنے گوشۂ نوادر سے نکال کر ایک ایسا مرثیہ رثائی ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لیے شامل "نوادرات مرثیہ نگاری" کیا ہے جو ۱۸۷۱ء میں بمقام دہلی تحریر کیا گیا یہ مرثیہ امام کے چہلم کے بارے میں ہے۔

اسی طرح ایک اور مضمون میں دیوانہ بنارسی کے مراثی کی فہرست درج کی ہے۔ اس کتاب میں ان کا وہ مرثیہ شامل ہے جو شہزادہ علی اکبر کے احوال پر ہے۔ بنارس کے مرثیہ نگاروں ہی میں دیوانہ کے خلف الرشید نجف بنارسی کی مرثیہ نگاری کو بھی علامہ صاحب بالتفصیل زیر بحث لائے ہیں جنہوں نے مرثیوں میں جنون تخلص اختیار کیا بقول علامہ ضمیر اختر ذخیرہ مسعود حسن ادیب میں ان کے سات مراثی محفوظ ہیں۔ علامہ صاحب ان کے مرثیے کے اجزا اور سلام نگاری کو مع امثلہ زیر بحث لاتے ہیں اور ایک نوحہ بھی شامل مقالہ کیا ہے۔

اس سے اگلا مقالہ شیخ امداد علی بحر لکھنوی کے غیر مطبوعہ مرثیوں اور سلاموں کے بارے میں ہے جو ناسخ کے شاگرد تھے اور رشک کے بعد ناسخ کے تلامذہ میں مستند گردانے جاتے تھے۔ تذکرہ نگاروں نے ان کے حال احوال اور عہد کے بارے میں جو معلومات فراہم کی ہیں وہ علامہ صاحب کے پیش نظر رہی ہیں اور انہوں نے ہر شہادت سے نتائج اخذ کیے ہیں۔ مقالے میں ان کی غزل گوئی بھی موضوع بنی ہے۔ یہ بسیط مقالہ اُن پر ایک سند کا درجہ رکھتا ہے۔ جو لوگ بحر لکھنوی کی دینی شاعری کے نمونوں کی تلاش میں ہیں اس مقالے سے استفادہ کر سکتے ہیں۔

جدید اردو مرثیے کے اولین معماروں میں شامل ایک اہم شاعر سید محمد اطہر زائر سیتاپوری کے بارے میں علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی نے جو مقالہ شامل کتاب کیا ہے۔ اس میں شاعر کی حیات کے علاوہ ان کی دیگر جہات کا تذکرہ بھی شامل ہے۔ علامہ صاحب نے بتایا ہے کہ زائر غزل کے بھی پر گو شاعر تھے مگر آخری عمر میں انہوں نے مرثیہ، سلام، نوحہ اور قصائد ہی سے اپنے تخلیقی عمل کا تعلق برقرار رکھا۔ ان کی گیارہ تصانیف کا ذکر علامہ صاحب نے کیا ہے جس میں سے بیشتر کے موضوعات رثائی ادب

سے مخصوص ہیں۔ زائر کے ۱۹ مرثیوں کے اولین مصرع درج کر کے یہ معلومات بھی فراہم کی گئی ہیں کہ کون سا مرثیہ انہوں نے کس حال میں کہا ہے۔ آج زائر سیتاپوری کا کلام نایاب ہے تقسیم کے بعد ۱۹۶۳ء تک جو ان کی وفات سے تین سال پہلے تک کا زمانہ ہے وہ تصنیفی میدان میں بہت سے کام کر چکے تھے۔ مگر رثائی ادب کے ناقدین کو بہت کم دستیاب ہو سکے۔ اس صورتحال میں علامہ کو ان کے جتنے مرثیے سلام اور نوحے مل سکے وہ سب کے سب شائع کرنے کا اعزاز علامہ ضمیر اختر نقوی ہی کو حاصل ہے۔

مرثیے کے جدید تر عہد میں جو شعرا علامہ صاحب کی توجہ کا باعث ہوئے ہیں ان میں مسعود رضا خاکی کا نام اہم ہے "نوادرات مرثیہ نگاری" میں انہوں نے خاکی کے حالات زندگی کے علاوہ ادبی خدمات اور تصانیف کو بھی اپنے مقالے کا موضوع بنایا ہے اور ۱۹ مرثیوں کی فہرست شامل مقالہ کی ہے مسعود رضا خاکی کے چند نایاب مراثی مکمل طور پر اس مقالے میں ملاحظہ کیے جا سکتے ہیں۔

میر انس جو میر خلیق کے صاحب زادے تھے ان کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ اس کتاب کا اہم حصہ ہے یہ مرثیہ کم و بیش سوا سو بند کا ہے اور حضرت علی المرتضیٰ کی شہادت کے حال میں ہے مرثیے سے پہلے شاعر کے مختصر کوائف درج کیے گئے ہیں۔ جس کے مطابق میر انس کی وفات ۱۸۹۲ء میں ہوئی اور ان کے مرثیوں کی کل تعداد ۳۳ ہے۔

"نوادرات مرثیہ نگاری" کے آخری صفحات میں جو چند مقالات قارئین کی توجہ کا باعث بنتے ہیں ان میں سے ایک اولاد حسین شاعر لکھنوی کے بارے میں ہے جو خاندانِ اجتہاد لکھنوی کے ایک اہم فرد تھے۔ شاعر لکھنوی جس عارضے میں مبتلا ہو کر فوت ہوئے اس کا آغاز ایک مجلس کے دوران ہوا تھا۔ علامہ صاحب نے شاعر لکھنوی عرف للّن صاحب کا جو پہلا مرثیہ نمونہ کے طور پر دیا ہے وہ ۷۰ بند کا ہے اور اس میں

تاریخ مرثیہ منظوم کی گئی ہے۔ایک اور مرثیے میں تاریخ شیعیت موضوع بنی ہے۔

کتاب کے آخری حصے میں میر انیس کے ایک مرثیے کے حوالے سے اُٹھنے والی بحث کے دوران جو خطوط لکھے گئے ان میں سے ڈاکٹر نیر مسعود، قاصد سرسوی اور شیدا حسن زیدی کے خطوط اس کتاب میں شامل ہیں خود علامہ صاحب نے اس مرثیے کی ترتیب "نسخۂ ضمیر اختر" کے نام سے کی ہے۔انیس کا یہ غیر مطبوعہ مرثیہ "دو شیروں کی نیزوں کے نیستاں میں ہے آمد" ادبی دنیا میں تا دیر زیر بحث رہا۔علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی کو اس مرثیے کے تین نسخے ہندوستان کے سفر کے دوران دستیاب ہوئے۔ علامہ صاحب نے ایک الگ مقالے میں اس مرثیے کے متعدد مخطوطات کا ذکر کیا ہے تاہم سب سے اہم مخطوطہ اس نسخے کو قرار دیا ہے جو کاتب سید حسین علی کے ہاتھ سے ۱۲۶۷ھ میں لکھا گیا علامہ صاحب اس مقالے سے تمام غلط مبحث دور ہو جاتے ہیں جو اس مرثیے کے سلسلے میں جنم لیتے رہے ہیں۔مقالے میں مرثیے کی بحر اس کے موضوعات و مندرجات سے تفصیلی بحث کی گئی ہے۔علامہ ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی جو اپنی ذات میں میر انیس کے محققین میں ایک بلند درجہ رکھتے ہیں کتاب کے اس آخری مقالے میں ان کے تحقیقی اور تنقیدی جوہر آسمان کی بلندیوں کو چھوتے محسوس ہوتے ہیں۔کیونکہ اس مقالے میں ان کی انیس شناسی کے وہ تمام جوہر یکجا ہوتے بلکہ عروج آشنا معلوم ہوتے ہیں۔

"المختصر نوادرات مرثیہ نگاری" کی ان دونوں جلدوں کی شکل میں علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی نے اس لا متناہی سفر کا آغاز کیا ہے جو تحقیق و تنقید میں ان کا محبوب ترین موضوع رہا ہے اور ہے۔خود مجھے ان کے کتب خانے سے استفادے کے مواقع کئی بار حاصل ہوئے۔جن کے دوران میرا تاثر ہمیشہ یہ رہا ہے کہ یہاں دنیائے علم و ادب اور

دین کے وہ نوادرات یکجا ہیں جو دنیا کی بڑی بڑی اور مستند لائبریریوں میں بھی تلاش بسیار کے باوجود دستیاب نہیں ہوتے۔ مگر علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر کی فیاض طبیعت ان نوادرات کو عوام الناس میں عام کرنے کے لیے بے چین و بے قرار رہتی ہے۔ آج تحقیقی دنیا کے لیے میرا مشورہ یہ ہے کہ نایاب ترین مواد کو علامہ صاحب کی نظر سے ضرور گزاریں اس کا تذکرہ کسی نہ کسی صورت میں عام ہوتا رہے۔ میں نے خود یہ فیصلہ کیا ہے کہ بطور ممتحن نئے تحقیقی کام بالخصوص رثائی ادب سے متعلق تحقیقی کام ان کے سپرد کرتا رہوں تاکہ اس خوشبو کے عام ہونے کا سامان ہوتا رہے اور ایک صدقہ جاریہ کا دروازہ علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی ہی کی راہ سے صبح تا ابدالآباد کھلا رہے۔

آلِ محمد رزمی

ضمیر اختر نقوی تاریخ کا بھی گہرا شعور رکھتے ہیں وہ اپنے تجربے اور مشاہدے کو اپنی تقریر و تحریر میں اس قدر پُر تاثیر انداز میں سموتے ہیں کہ سامع یا قاری بے ساختہ داد دینے پر مجبور جاتا ہے ان کے یہاں جابجا بے ساختگی ان کے "Behaviour of Writing" سادہ، شائستہ، شگفتہ اور سلیس ہے، وہ دو ٹوک بات کہنے کے عادی ہیں انھوں نے اوائل عمری سے سن شعور کا زمانہ اودھ کی آغوش میں بسر کیا، لہٰذا اودھ کی گنگا جمنی تہذیب و ثقافت و تاریخ اور وہاں کے اہلِ فن کے بارے میں مکمل آگہی و معلومات رکھتے ہیں۔ وہ ایک علمی و عملی انسان ہونے کے ناطے مذہب، عزائیہ، مرثیہ نگاری اور خصوصاً شاعرِ انقلاب حضرت جوشؔ ملیح آبادی اعلی اللہ مقامہٗ کے بارے میں بہت کچھ لکھ چکے ہیں اور بہت کچھ لکھ رہے ہیں۔

ڈاکٹر شارب ردولوی (لکھنؤ، انڈیا)

یہ کتاب منفرد ہی نہیں سنگِ میل ہے

عزیز گرامی ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب

نئے سال پر آپ نے ایسا نادر تحفہ عنایت کیا ہے کہ شاید ہی کسی نے کسی کو ایسا تحفہ دیا ہو۔ ۳۱ ردسمبر ۲۰۰۳ کی سہ پہر کو ڈاک کے ہرکارے نے دستک دی۔ دروازہ کھولا تو اس نے ایک پیکٹ دیا۔ اس پر آپ کی مہر دیکھ کر جلدی جلدی پیکٹ کھولا۔ کتابیں پاکر جی خوش ہو گیا۔ اب جو کتابیں پلٹنی شروع کیں تو حیران رہ گیا کہ اس میں ایک کتاب میرے نام "معنون ہے غالب نے تو صرف توقع کے اظہار میں کہا تھا کہ:۔

اک برہمن نے کہا ہے کہ یہ سال اچھا ہے

مجھ پر تو علم و قلم کے فیضان کی بارش ہو گئی۔ اس سے زیادہ کسی سال سے کیا توقع کی جاسکتی ہے۔ اور اس سے بہتر سال کی ابتدا کیا ہو گی۔

یہ تمام کتابیں مرثیے اور میر انیس سے متعلق ہیں۔ آج میر انیس کی دوسو سالہ یادگار کا آخری دن اور نئے سال (2004) کی ابتدائی شام ہے۔ ان رعائتوں نے تحفہ کی قدر و قیمت میں اضافہ اور اضافہ کر دیا۔ یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ آپ نے برسوں پہلے کی تصاویر اور اخبار کی رپورٹ کو محفوظ رکھا اور اسے کس سلیقہ سے استعمال کیا۔ تصاویر کو دیکھ کر 1986 کا وہ جلسہ نگاہوں میں گھوم گیا۔ پروفیسر کرار حسین صاحب سے یہ میری پہلی ملاقات تھی لیکن جس محبت سے وہ ملے اس سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھ سے عرصے

سے واقف ہیں۔ اہل علم کی یہی ادائیں انھیں بڑا بناتی ہیں۔ آپ نے ''نوادرات مرثیہ نگاری'' کا انتساب میرے نام کر کے مجھے علم والوں کی صف میں لا کھڑا کیا۔ آپ کی اس محبت اور عنایت کے لیے ممنون ہوں۔

''نوادرات مرثیہ نگاری'' کی دونوں جلدیں واقعی نوادرات میں ہیں۔ یہ مرثیے کی تاریخ بھی ہیں، تحقیق بھی اور تعیین قدر بھی۔ اس زمانے میں مرثیہ پر جو کام ہوا ہے اس میں اس کی حیثیت صرف منفرد ہی نہیں سنگ میل کی ہے۔ یہ ایسی کتابیں ہیں جن سے ہمیشہ لوگ کسب فیض کرتے رہیں گے۔ ان کے موضوعات اردو مرثیے کی تاریخ کو جوڑنے والے اور گمشدہ کڑیوں کو ملانے والے ہیں۔ انگریزی میں میر انیس پر جو کتاب آپ نے مرتب کی ہے وہ مطالعۂ انیس میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہے اور غیر اردو داں طبقہ کے لیے انیس شناسی کا معتبر اور اہم ذریعہ ہے۔

میں ان کتابوں کے لیے آپ کو مبارک باد دیتا ہوں۔ بہت عرصے سے ''العلم'' کے بارے میں نہیں معلوم ہوا۔ میں انشاء اللہ اس سال مئی میں آنے کا ارادہ کر رہا ہوں۔ پروگرام طے ہونے پر آپ کو مطلع کروں گا۔

خدا کرے آپ اچھے ہوں۔

جوشؔ ملیح آبادی

''اگر میرا اللہ کا سا مزاج ہوتا تو میں آپ کے دامن کو موتیوں سے بھر دیتا۔''

ڈاکٹر نیّر مسعود (لکھنؤ، انڈیا)

آپ تاریخِ مرثیہ لکھنے کا حق رکھتے ہیں

۳؍جنوری ۲۰۰۰ء

برادرم ضمیر اختر صاحب

آداب!

آپ کی تینوں کتابیں مل گئیں۔ بہت بہت شکریہ۔ "نوادرات مرثیہ نگاری" کا آپ نے بہت اہم کام شروع کیا ہے۔ اس سے ایک طرف تو بہت سے ایسے شاعروں کے مرثیے سامنے آئیں گے جو مرثیہ گو کی حیثیت سے مشہور نہیں تھے یا جن کے مرثیے دستیاب نہیں تھے۔ دوسری طرف ان مرثیوں سے تاریخ مرثیہ کے کئی باب کھلیں گے۔ آپ کے پاس مرثیے، اور رثائی ادب سے متعلق مواد بہت ہے، اس پر مستزاد آپ کا قابلِ رشک حافظہ۔ اس میں شک نہیں کہ اس وقت آپ مرثیے کی تاریخ لکھنے کا سب سے زیادہ حق رکھتے ہیں۔

مرثیہ گویوں کے کئی تذکروں کا آپ نے سراغ لگایا ہے۔ پڑھ کر حیرت ہوئی۔ سید علی حامد جون پوری کے ناتمام "تذکرے کا بھی ذکر ہونا چاہیے۔ یہ بہت اہتمام سے اور بڑے پیمانے پر تیار ہو رہا تھا۔ اس کی کچھ تفصیل میں نے "دولھا صاحب عروج" میں دے دی ہے۔

آپ کا یہ جملہ بھی پسند آیا "دل کی لگی کہوں تو مجھے غیر مطبوعہ مرثیوں سے کوئی خاص دلچسپی نہیں ہے۔" یہ میرے بھی دل کو لگتی بات ہے۔ زیادہ ضروری کام یہ ہے کہ مطبوعہ مرثیوں کا متن اور ترتیب درست کی جائے۔ ابھی کچھ ایسے لوگ موجود ہیں جو یہ کام کر سکتے ہیں۔ ان کے بعد سناٹا ہو جائے گا، یعنی ابھی آپ کو بہت کام کرنا ہے۔

آپ کی صحت کے لیے دعا گو۔

علامہ فروغ کاظمی

علامہ ضمیر اختر نقوی کا آبائی وخاندانی تعلق (بھارت) اتر پردیش کے شہرہ آفاق ضلع رائے بریلی کی شرق وجنوبی سرحد پر واقع علم خیز قصبہ "مصطفےٰ آباد" کے ایک ایسے معزز، باوقار، رئیس، اور متدین گھرانے سے ہے جس کی سیادت، نجابت، شرافت اور وضعداری وملنساری کے نقوش وقت کی کایا پلٹ کے باوجود اب تک روشن ومنور اور مسلّم ومستحکم ہیں۔ علامہ موصوف کا بچپن اور تعلیم کا زمانہ لکھنؤ میں گزرا جس کی سرزمین نے جلالؔ، چکبستؔ، نسیمؔ، سرشارؔ، صفیؔ، آرزوؔ، ثاقبؔ، عزیزؔ، اور آل رضاؔ، نیز بڑے بڑے نامور شاعروں ادیبوں اور دانش وروں کو جنم دیا، اردو ادب کو انیسؔ و دبیرؔ اور ناسخؔ و آتشؔ جیسے باکمالوں سے نوازا، نیز جس کو علم وادب، شعر وسخن اور زبان وبیان کا مرکز ہونے کا امتیاز حاصل ہے۔ خداوند عالم نے علامہ ضمیر اختر کو علم وحلم اور ذہانت وذکاوت کی لازوال نعمت کے ساتھ ساتھ اعلیٰ ترین اخلاقی وانسانی قدروں سے بھی مالا مال کیا ہے۔ ایسا کوئی واقعہ میرے سننے میں نہیں آیا کہ موصوف نے کسی سے ترش لہجے میں بات کی ہو، کسی سے کوئی گستاخی کی ہو، کسی کی شان میں نازیبا کلمات استعمال کیے ہوں، یا کسی کا دل دکھایا ہو۔

شمس الرحمٰن فاروقی (الہ آباد، انڈیا)

حافظہ، تلاش اور رسائی کا اعتراف

۱۲ر جنوری ۲۰۰۲ء

برادر عزیز گرامی علامہ ضمیر اختر، سلام علیکم و رحمۃ اللہ و برکاتہٗ

آپ کی ارسال کردہ تین نہایت عمدہ کتابیں ملیں۔ سراپا سپاس ہوں۔

The Study of Elegies of Mir Anis

نوادرات مرثیہ نگاری (جلد اول)

نوادرات مرثیہ نگاری (جلد دوم)

میں ہمیشہ آپ کے حافظے، تلاش، اور رسائی کا معترف رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ فی زمانہ مرثیے کے فن، تاریخ، جزئیات اور معلومات مخطوطات پر آپ سے بڑھ کر کوئی عالم نہیں اور آئندہ بھی ایسا شخص پیدا ہونا مستبعد معلوم ہوتا ہے۔ یہ تین کتابیں مرتب کر کے آپ نے اس کام میں کئی اہم قدموں کی پیشرفت کی ہے جو "میر انیس کے کلام میں رنگوں کا استعمال"، اور خاندان میر انیس کے نامور شعرا" کی تصنیف سے شروع ہوا تھا۔

انگریزی کی کتاب مجھے اتنی موثر اور وثوق انگیز نہیں لگی جتنی کہ ممکن تھی۔ افسوس کہ اس زمانے میں ہمارے یہاں اچھی انگریزی لکھنے والے اور جدید طرز و طرق نقد سے واقف لوگوں کی بہت کمی ہے۔ مضامین مشمولہ تنقیدی شعور سے زیادہ عقیدت مندی کا اظہار نظر آتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ انگریزی میں میر انیس پر تنقید انھیں اصولوں اور

نظریات کے تحت نہیں لکھی جاسکتی جنھیں ہم اردو میں بکار لاتے ہیں۔ لیکن پھر بھی، اس قحط علم کے زمانے میں اس کتاب کا شائع ہونا بسا غنیمت ہے۔

دوسری دونوں کتابوں میں آپ نے دریافت اور تحقیق دونوں میدانوں میں وہ وہ گلکاریاں کی ہیں کہ بس منہ تکتے رہیے۔ آپ کے دریافت کردہ کچھ مرثیے میں نے آپ کے رسالے میں دیکھے تھے لیکن یہاں تو بالکل گنج باد آورد ہے۔ مذنب لکھنوی کے بارے میں کئی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔ میں ان کے مراثی سے بالکل بے خبر تھا، اگرچہ ان کے شاگرد سعادت خاں ناصر خود بڑے مذہبی شخص تھے اور کئی مذہبی تصانیف ان سے یادگار ہیں۔ اس پر مزید یہ کہ آپ نے میر انیس اور میر انس کے بھی نئے مرثیے دریافت کر لیے۔ **فجزاکم اللہ خیر الجزا۔**

کچھ مدت ہوئی میں نے اجمل کمال کی معرفت اپنی کتاب "لغات روزمرہ" آپ کی خدمت میں بھجوائی تھی۔ شاید پہنچی ہو اور نظر سے گذری ہو۔

امید کرتا ہوں کہ آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ ہاں "اقلم" کی زیارت بہت دن سے نہیں ہوئی۔

مکرر آنکہ اگر انگریزی والی کتاب دوبارہ چھپوانا چاہیں تو مجھے بتایئے گا۔ میں نے مسعود حسن رضوی صاحب ادیب مرحوم کی فرمائش پر میر انیس پر ایک مضمون انگریزی میں لکھا تھا۔ وہ میرے پہلے مجموعے میں شامل ہے۔ ممکن ہے آپ اسے شائع کرنا چاہیں۔ میرے اردو مضامین میں سے ایک نسبتاً چھوٹے مضمون کا انگریزی ترجمہ بھی ممکن ہو سکتا ہے۔

آپ کا نیاز مند

سید قمر حیدر قمرؔ (جدّہ، سعودی عرب)

"رہِ نوردِ شوق"

ڈاکٹر علاّمہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب

کبھی ہوا، کبھی دیا، چراغ سا وہ آدمی
فسوں، کمال، معجزہ، چراغ سا وہ آدمی!

اِن سطور کو قلمبند کرنے کا نہ تو یہ مقصد ہے کہ میں کسی فردِ واحد کو خوش کرنا چاہتا ہوں اور نہ میرا ہدف صرف یہ ہے کہ میں اپنا نام اُن عظیم علماء، خطباء، اُدباء، شعراء و اساتذہ میں شامل کرنا چاہتا ہوں جنھوں نے علاّمہ ضمیر اختر نقوی کی فکر انگیز شخصیت اور اُن کے علمی، ادبی، فکری اور مذہبی کارناموں پر ہر ہر زاویئے سے لکھا ہے۔ مجھے تو ان سطور کو لکھنے پر صرف اس بات نے مائل کیا ہے کہ مجھ سے "شعورِ علم" متقاضی ہے کہ میں علاّمہ صاحب پر کچھ ضرور قلمبند کروں۔ کس قدر بڑی ناانصافی ہو جاتی اگر میں یہ مضمون لکھ کر اپنے شعورِ علم کے تقاضوں کو پورا نہ کرتا۔ اور اگر ایسا ہو جاتا تو شاید میرا "ضمیرِ علم" مجھے کبھی معاف نہ کرتا۔

ڈاکٹر ظہیر فتحپوری کے جملے میں ذرا سا تصرف کر کے اگر میں یہ کہوں "ہمیں فخر کرنا چاہئے کہ ہم فکر و فن اور علم و شعور کے "عہدِ ضمیری" میں جی رہے ہیں" تو یہ بات حقیقت سے نہایت قریب ہوگی۔

''خطابت کی پوچھو تو وہ توسنِ منبر'' کا ایک ماہر و مشاق شہسوار ہے جس سے سر بُر ہونا آسان نہیں۔ تلاش و تحقیق کی بات کرو تو وہ تہ خانۂ حقائق کی گہرائیوں تک جا کر رموز و معارف کے مصادر کو باہر لا کر صفحۂ قرطاس پر سجا دینے والا ہے۔ اس کی یادداشت دیکھو تو ایسا لگے تاریخ کا آبشار اس کے بیان سے جاری و رواں ہے۔ اس کی تنقیدی و تجزیاتی بصیرت میں جھانکو تو احساس ہو کہ وہ کتنی انجانی حقیقتوں کا نباض ہے۔ اس کی نظر ''سطح شے'' سے سفر کرتی ہوئی ''ضمیر شے'' تک پہنچنے والی اور اس کا ذہن ہمہ وقت صداقتوں کا متلاشی ہے۔ وہ سچائیوں کا سفیر اور دانائیوں کا ضمیر ہے!!۔

مرثیے پر اُن کا کام سب سے افضل و اعلیٰ ہے۔ مولانا مرتضیٰ حسین فاضل اُن کے بارے میں رقم طراز ہیں ''ضمیر اختر نقوی کلاسیکی مرثیے کے دلدادہ اور محقق ہیں۔ انیس و دبیر پر ان کی عرق ریزی کے جوہر محققین ادب سے داد و ستائش حاصل کر چکے ہیں اور اب جدید مرثیے کے عظیم شاعر جوشؔ کے مرثیوں پر تحقیقی کتاب مرتب کر کے ضمیر اختر نقوی نے جدید مرثیے پر پی ایچ ڈی کرنے والے اسکالر کے لئے راہیں متعین کر دی ہیں''۔

ڈاکٹر سبطِ حسن رضوی صاحب اُن کے بارے میں یوں رطب اللسان ہیں ''رثائی ادب کی تاریخ و تحقیق میں پاکستان کے جواں سال ادیب و خطیب ضمیر اختر نے جو کام کیا ہے وہ قابلِ توجہ اور لائقِ تحسین ہے۔ انہوں نے قدیم و جدید مرثیہ نگاروں پر یکساں محنت کی ہے۔ اور خدائے سخن میر انیسؔ سے لے کر شاعرِ انقلاب جوشؔ تک اپنے قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں''۔

تاریخ مرثیہ نگاری، خاندانِ میر انیس کے نامور شعراء، اردو مرثیہ پاکستان میں (۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۷ء تک) اور جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے'' جیسی معتبر اور انتہائی مفید کتابوں کے بعد اب اُن کی تازہ تالیفات میں نہایت دقیع و رفیع کتابیں ''نوادرات

مرثیہ نگاری (جلد اوّل تا جلد سوئم) اور انگریزی میں اُن کا نہایت اہم کام "THE STUDY OF ELEGIES OF MIR ANEES" مرثیے کے طلباء اساتذہ و شائقین کے لیے عہد حاضر کا سب سے بڑا تحفہ ہیں۔

بیجا نہ ہوگا اگر میں یہ کہوں کہ "نوادرات مرثیہ نگاری" کی تینوں جلدوں اور انگریزی کتاب کی سب فہرستوں کو دیکھتے ہی آپ فوراً اندازہ لگالیں گے کہ علامہ کی اِن تالیفات میں کتنے گہر ہائے آبدار پوشیدہ ہیں۔

فہرستوں سے قبل نوادرات مرثیہ نگاری۔ جلد اوّل کے صفحہ نمبر ۶ سے میں یہاں علامہ کا ایک پُر مغز پیراگراف نقل کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

"سچ پوچھئے تو پاکستان میں قلمی مرثیوں کا سب سے قیمتی اور نایاب ذخیرہ ہمارے کتب خانے میں ہے۔ "تاریخ مرثیہ نگاری" جب ہم نے لکھنا شروع کی تو ہمارے پاس مختلف ذرائع سے قلمی مرثیوں کا ذخیرہ معجزاتی طور سے پہنچتا رہا۔ اسی سلسلے میں متعدد حضرات کے ذخیرے دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ ۱۹۸۳ء میں فرخ آباد، قائم گنج، راج گڑھ ہوتے ہوئے شمس آباد پہنچے۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ یہاں کا قدیم مرثیوں کا ذخیرہ پروفیسر مسعود حسن ادیبؔ کے کتب خانے میں منتقل ہو گیا تھا۔ شمس آباد میں کچھ نہیں مل سکا۔ شمس آباد کے ذخیرے میں مرزا دبیرؔ اور ان کے شاگردوں کے مرثیوں کا ذخیرہ ڈاکٹر ذاکر حسین فاروقی پہلے ہی لے آئے تھے۔ اس ذخیرے کا کچھ حصہ مہاراشٹر کالج بمبئی میں اور بچا کھچا حصہ محمد رشید صاحب (جعفر منزل لکھنؤ) کے پاس ہے۔ پروفیسر مسعود حسن ادیب کا ذخیرہ مولانا

آزاد لائبریری علی گڑھ میں محفوظ کر دیا گیا ہے۔ یہ ذخیرہ میں نے علی گڑھ جا کر دیکھا۔ اس ذخیرے کی فہرست اور شمس آباد کے ذخیرے کی فہرستیں میں پہلے ڈاکٹر نیر مسعود صاحب سے لے کر دیکھ چکا تھا۔ لکھنؤ میں جتنے دن قیام رہا یہ فہرستیں میرے پاس رہیں۔ اس فہرست کی ایک نقل میرے پاس محفوظ ہے۔

پروفیسر مسعود حسن ادیبؔ "تاریخ مرثیہ نگاری" لکھنا چاہتے تھے لیکن کام پایۂ تکمیل تک نہ پہنچ سکا اور آخر مرثیوں کا ذخیرہ علی گڑھ منتقل ہو گیا"

انہوں نے تنِ تنہا مرثیہ پر اس قدر کام کیا ہے کہ اتنا کام ایک پورے ادارے سے بھی ممکن نہ ہو سکتا۔ اگر ان کو مرثیے کا ورثہ دار اور نباض و مسیحا کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اُن کا یہ سفر پوری توانائی کے ساتھ جاری و ساری ہے اور اپنی اس لگن میں وہ علامہ اقبالؔ کے اس مطلع کی جیتی جاگتی تصویر بن گئے ہیں۔

تو رہ نوردِ شوق ہے منزل نہ کر قبول
لیلیٰ بھی ہم نشیں ہو تو محمل نہ کر قبول!

اور اگر اُن کی شخصیت کے انفرادی پہلوؤں کو دیکھا جائے تو میرا یہ شعر اُن کی وضاحت کرتا نظر آئے گا۔

قدم قدم ، سفر سفر ، سخن سخن ، نظر نظر
جمال بانٹتا رہا ۔ "چراغ سا وہ آدمی"

وہ ایک نہایت دُبلے پتلے نرم و نازک انسان ہیں اور اُن کا لباس اور غذا ناقابلِ یقین حد تک سادہ۔ اُن کے چہرے پر اُن کی چمکدار آنکھیں، اُن کی علمی بصیرت اور عظیم عزائم و اہداف کا پتہ دیتی ہیں۔

چٹان اپنے ارادوں میں، کوہ وعدوں میں
وہ ایک نرم و ملائم سا شخص، خوب ہے وہ!

وہ اپنی ذات میں علم کا ایک مکمل دریائے فیض ہیں جو ہمارے درمیان نہایت قلندرانہ اور والہانہ انداز میں۔ بہہ رہا ہے۔ کہیں وہ منبر کے تقاضوں کی پیاس کو سیراب کر رہے ہیں تو کہیں تحقیق و تنقید کے خرمنوں میں "مضامینِ نو" کے انبار لگا رہے ہیں۔ وہ ایک انتھک کسان ہیں جس کی محنت نے علم کے کشت زاروں کو الماس و جواہر سے بھر دیا ہے۔ مگر.......... اس تمام محنتِ شاقہ، ذہانت اور فراست اور خدمت و اکرام کے باوجود وہ ایک ایسے معاشرے کے فرد ہیں جو "مردہ پرست" اور اقربا نواز ہے۔ وہ جس توقیر و تکریم کے مستحق ہیں یہ معاشرہ انھیں دینے سے پہلو تہی کر رہا ہے۔ یورپ و امریکہ میں کوئی اس پائے کا ادیب و خطیب اور محقق ہوتا تو بادشاہوں کی طرح رہ رہا ہوتا۔ حکومت اُسے تمام تفکراتِ زمانہ اور کشمکشِ روز و شب سے آزاد کر کے صرف لکھنے پڑھنے کے کاموں پر مامور رکھتی اور اس کی ذہانت و فراست سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اُٹھاتی۔ لیکن۔ اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!

میں علم کے نام پر اپنے اربابِ حل و عقد سے نہایت دردمندی اور علم دوستی کے جذبے سے سرشار ہو کر یہ اپیل کروں گا کہ خدارا ایسے نابغۂ روزگار انسانوں کی قدر کریں۔ انھیں معاشرے میں اُن کا جائز مقام دیں اور اُن کے آرام و آسائش اور اُن کی مکمل حفاظت کا پورا پورا انتظام حکومتی مصارف پر کریں۔ علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب جیسے مرتبے اور مقام کے ادیبوں خطیبوں اور محققوں کی سرکاری حیثیت کم سے کم ایک وزیر کے برابر سمجھی جائے اور اُسے ایک وزیرِ مملکت جیسی ہی facilities and privileges دی جائیں تاکہ وہ فکرِ معاش اور "خوفِ عدمِ تحفظ" سے آزاد

ہو کر پوری دلجمعی اور یکسوئی کے ساتھ علمی خدمات انجام دے سکیں۔ حکومت کے لئے یہ کام کوئی بہت بڑا یا مشکل کام نہیں ہے۔ بس ذرا احساس اور توجہ کی ضرورت ہے۔ اربابِ اقتدار کو یہ بات ہمیشہ پیشِ نظر رکھنی چاہئے کہ زندہ قومیں اپنے علمی سرمائے کی حفاظت کرتی ہیں اور اربابِ علم و دانش کی قدر و توقیر ہی سے قومیں سرفراز ہوتی ہیں۔ دنیا کے کسی بھی ترقی یافتہ قوم و ملک کو دیکھ لیجئے وہاں آپ علماء، اساتذہ، ادباء، شعراء اور دوسرے فنونِ لطیفہ سے تعلق رکھنے والوں اور ڈاکٹروں، انجینئروں اور سائنس دانوں کو نہایت خوش حال، دولت مند، مالدار اور امیر پائیں گے۔

وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغ !!
سید قمر حیدر قمر۔ جدہ۔ سعودی عربیہ
یکم جنوری ۲۰۰۳ء

جگن ناتھ آزاد

(شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی کشمیر)

"ضمیر اختر نقوی کے علمی اور ادبی کارناموں سے پاکستان اور ہندوستان کی تمام یونیورسٹیاں اور تمام اہلِ نظر مستفید ہو رہے ہیں"۔

انیسؔ و دبیرؔ

ڈاکٹر فرمان فتح پوری:

اُنسِ انیسؔ

برادر محترم و برادر عزیز۔ سلام اور دعائیں، محترم اور سلام اس لئے کہ آپ تنہا اس دور میں انیس شناس ہیں، کم از کم مجھ سے تو بہت زیادہ میر انیس کو جانتے پہچانتے ہیں، ''عزیز اور دعائیں'' اس لئے کہ آپ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں گو یہاں بھی میں غلطی کر گیا، بزرگی کا تعلق عمر و سال سے ہے یا علم و عقل سے؟

(۶ر ستمبر ۱۹۷۷ء)

○

آپ کے شغف ادبی اور اُنس انیس پر رشک آتا ہے۔ آپ انیس پر کوئی کام کر جائیے، آپ سے بہتر اس کام کو کوئی نہیں کر سکتا، میرا کام تو صرف کام کا احساس دلانے کے لئے ہے''۔

(۲ر جون ۱۹۷۳ء)

○

انیسیات سے آپ کی دلچسپی میرے لئے قابل رشک ہے، یقین ہو چلا ہے کہ میر انیس کو نئی نسل آپ کی توجہ سے پہچانے گی اور شہرت عام و بقائے دوام کے اس منصب پر لے جائے گی جس کے وہ مستحق ہیں، اللہ تعالیٰ آپ کے علم و عمر میں برکت دے اور انیس کے سلسلے میں آپ کی کوششوں کو بار آور کرے''۔

۲۹ نومبر ۷۳ء

(پدم شری) علی جواد زیدی (لکھنؤ)

رباعیاتِ انیسؔ کی تدوین اور ضمیر اختر نقوی کا تحقیقی کام

کلامِ انیسؔ ہی پر موقوف نہیں، بیشتر مرثیہ گویوں کے کلام کی تدوین بڑی احتیاط کی طالب ہے۔ مختلف مرثیہ گویوں کا کلام آپس میں بُری طرح خلط ملط ہو گیا ہے۔ کئی جگہ، بہت سا کلام الحاقی ہے اور اکثر جگہوں پر قطع و برید اور فک و اصلاح کا عمل ہوا ہے۔ کچھ تو کم سواد مرثیہ خوانوں کا کرشمہ ہے اور کچھ کاتبوں یا مرتبوں کا۔ شہرتِ عام نے عوام و خواص کو کلامِ انیسؔ کا گرویدہ بنا دیا تھا۔ پڑھنے والے اور سننے والے انیسؔ کے نئے کلام کی تلاش میں رہتے تھے۔ غیر محتاط لوگ دوسروں کا کلام انیسؔ کے نام سے پیش کرنے میں عار نہ رکھتے تھے۔ اس لیے ان کے کلام کی حد تک صورتِ حال اور بھی ناصاف ہو گئی ہے۔ اُن کا خاندان مرثیہ گویوں کا خاندان تھا۔ سبھی اس صنف میں طبع آزمائی کرتے رہے ہیں۔ بزرگوں میں میر حسنؔ اور خلیقؔ نمایاں طور پر سامنے آتے ہیں۔ دوسرے پیشروں میں ضمیرؔ، فصیحؔ اور دلگیرؔ وغیرہ ہیں۔ طرزِ جدید کے مرثیوں میں الحاق کی گنجائش کم تھی لیکن طرزِ قدیم کے مراثی سلاموں اور رباعیوں میں ساری

دیواریں گرتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ رباعی گویوں میں اہل خاندان میں میر حسن اور خلیق ہیں۔ میر حسن کی رباعیاں تو ان کے کلیات میں موجود بھی ہیں لیکن خلیق کی رباعیوں کا پتہ نہیں چلتا۔ آخر وہ سب رباعیاں کس کی تحویل میں ہو سکتی ہیں؟ یہ مان لینے کا قرینہ نہیں ہے کہ خلیق جیسے باضابطہ شاعر اور مرثیہ گو نے رباعی کی طرف توجہ ہی نہ کی ہوگی۔ ایک گمان یہ ہوتا ہے کہ وہ ورثا میں تقسیم ہو گئی ہوں گی۔ فصیح کی رباعی گوئی مسلم ہے۔ ان کے مرثیوں ہی کی طرح رباعیوں پر بھی آفت آئی۔ ان سب کو کون پرکھے اور کیسے؟ انیس و دبیر و مونس و فصیح کا کلام بھی گھل مل گیا ہے۔ ان سب کی چھان پھٹک جتنی ضروری ہے اتنی ہی مشکل ہے۔

جہاں تک انیس کی رباعیوں کا تعلق ہے، ان کی تدوین ایک صدی پہلے شروع ہو گئی تھی۔ ابتدا میں یہ رباعیاں الگ سے نہیں بلکہ مراثی کے مجموعوں کے ساتھ ضمنی طور پر شائع ہوئیں۔ مطبع نول کشور لکھنؤ سے ۱۸۸۰ء میں مراثی انیس کی اشاعت شروع ہوئی۔ یکے بعد دیگرے مراثی کی چار جلدیں طبع ہوئیں۔ ان میں مجموعی طور پر تین سو اٹھہتر (۳۷۸) رباعیاں بھی نیچے درج کی ہوئی صراحت کے ساتھ شامل تھیں۔

۱۔ جلد اول میں ۸۷ رباعیاں

۲۔ جلد دوم میں ۳۴ رباعیاں

۳۔ جلد سوم میں ۳۰ رباعیاں

۴۔ جلد چہارم میں ۱۱۷ رباعیاں

اس کے بعد ۱۹۰۱ء میں سید علی حسین نے ۹۶۰ رباعیوں کا ایک مجموعہ یوسفی پریس دلی سے "مجموعہ رباعیات" کے نام سے شائع کیا۔ یہ تنہا انیس کی رباعیوں کا مجموعہ نہیں تھا۔ بلکہ اس میں انیس، دبیر، مونس وغیرہ کی رباعیاں بھی یکجا کی گئی تھیں۔ اس

کے بعد تنہا انیس کی رباعیوں کے مجموعے شائع ہونے لگے۔ اب تک حاصل شدہ اطلاع کے مطابق سید محمد حسن بلگرامی کا مرتب کیا ہوا مجموعہ سب سے پہلے طبع ہوا۔ اس کے بعد متعدد مجموعے اور شائع ہوئے۔ ان کی تفصیل یوں ہے۔

۱۔ رباعیات انیس: مرتبہ سید محمد حسن بلگرامی (۱۹۰۹ء)۔ اسے ۱۹۷۹ء میں اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ نے دوبارہ چھپوایا۔

۲۔ انیس اخلاق: مجریہ دار التصنیف امیریہ محمود آباد (نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۹ء)

۳۔ رباعیات انیس: مرتبہ عالم حسین (نظامی پریس لکھنؤ، سنہ ندارد) اس کے ایک سے زیادہ ایڈیشن شائع ہوئے۔

۴۔ رباعیات انیس: عمر فیضی (لاہور، ۱۹۵۶ء)

۵۔ رباعیات انیس: مرتبہ سید محمد عباس (نول کشور پریس، لکھنؤ، ۱۹۳۷ء)

اس طرح سب سے پہلا مجموعہ ۱۹۰۹ء کا مطبوعہ ہے اور سب سے آخری ۱۹۳۷ء کا۔ پہلے مجموعے میں صرف ایک سو پینتالیس رباعیاں تھیں اور محمد عباس کے مرتبہ مجموعے میں، جو راجہ صاحب محمود آباد کے ایما پر مرتب ہوا تھا، پانچ سو بارہ رباعیاں شامل تھیں۔ سید محمد عباس نے اس کے بعد بھی تلاش جاری رکھی اور وہ اپنے ذاتی نسخے میں اضافے کرتے رہے۔ لیکن وہ صرف چار اور رباعیوں کی نشاندہی کر پائے۔ اس طرح چند قطعات کو شامل کر کے انیس کی دریافت شدہ رباعیوں کی تعداد پانچ سو سولہ (۵۱۶) ہو گئی۔ جو حضرات رباعیوں پر مزید کام کرنا چاہیں وہ نظامی پریس، بدایوں، نول کشور پریس، لکھنؤ؛ غلام علی اینڈ سنز، لاہور، اور بک لینڈ کراچی سے شائع شدہ مراثی کی جلدوں میں شامل رباعیوں کو دیکھ سکتے ہیں۔ ضمیر اختر نقوی کے اشاریے میں ان کا احاطہ کر لیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ "روح انیس"، "یادگار انیس"، "حیات انیس" اور

"واقعاتِ انیس" میں کچھ رباعیاں شامل ہیں۔

کچھ دن پہلے ضمیر اختر نقوی نے "کلید گنجینۂ انیس" کے عنوان سے انیس کے مراثی، سلام اور رباعیوں کے الگ الگ اشاریے مرتب کیے جو جریدۂ "ماہِ نو" کراچی کے انیس نمبر کے اضافی شمارے میں طبع ہوئے۔ محنت اور تلاش سے مرتب کیے ہوئے یہ اشاریے بڑی حد تک جامع ہیں۔ اس میں ۵۵۳ رباعیوں کی نشان دہی کی گئی ہے۔ اس کے اشاعت کے کچھ عرصے بعد ڈاکٹر اکبر حیدری نے "باقیاتِ انیس" طبع کرائی جس میں انیس کی اڑتالیس مزید رباعیاں اس دعوے کے ساتھ پیش کیں کہ یہ ضمیر اختر کے مرتب اشاریے کے علاوہ ہیں۔ اس دریافت کو صحیح باور کیا جاسکتا تو میر انیس کی معلوم رباعیوں کی تعداد بڑھ کر چھ سو دو ہو جاتی، لیکن صورت حال مختلف نکلی۔

پہلے ضمیر اختر نقوی کے اشاریے کو لیجیے۔ بدقسمتی سے ان کا اشاریہ ہندوستان تک بہت دیر میں پہنچا۔ اس وقت میرا مرتب کردہ مجموعہ رباعیات پریس جانے کو تیار تھا۔ اسی منزل پر اس اشاریے کا تفصیلی جائزہ ممکن نہیں ہوسکا۔ یہاں بعض انھیں باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے جو بادی النظر میں کھٹکتی ہیں۔

۱۔ رباعی ع "مجلس میں جو باریاب ہو جاتا ہے" اشاریے میں مکرر درج ہو گئی ہے۔ ایک بار اشاریے کے شمارہ ۳۳۵ کے مقابل "بزم عزا" کے زیر عنوان اور دوسری بار شمارہ ۳۶۹ کے سامنے "اہلِ مجلس کا پسینہ" کے تحت۔

۲۔ اسی طرح رباعی ع "مضمون گہر ہیں اور صدف سینہ ہے" شمارہ ۴۹۳ کے تحت بھی "توصیف سخن" کے ذیل میں درج ہے اور شمارہ ۳۳۰ کے سامنے "حاسدوں کی شکایت" کے ضمن میں بھی۔

۳۔ ایک اور رباعی ع "یاں دولتِ فقرِ مصطفیٰ دیوں گے" شمارہ ۵۵۳ کے سامنے اور

دوبارہ "یاں" کو "ہاں" میں تبدیل کر کے شمارہ ۴۹۳ کے مقابل درج کیا گیا ہے۔

۴۔ ایک اور رباعی تغیرِ قوافی کے ساتھ مکرر درج ہوئی ہے۔ مع "روتے ہیں نہ فریاد و فغاں کرتے ہیں" ایک سے زیادہ ماخذ میں موجود ہے۔ لیکن مع "روتے ہیں نہ فریاد و فغاں کرتے ہیں" عالم حسین کے مرتب کیے ہوئے مجموعۂ رباعیات سے نقل ہوئی ہے۔ مجموعہ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ پہلے دو مصرعوں میں علی الترتیب "فغاں" اور "جہاں" کے قوافی "بکا" اور "سرا" کی تصحیف ہیں۔ چوتھے مصرعے میں عالم حسین نے بھی "فدا" کا قافیہ جوں کا توں رہنے دیا ہے۔ اس کو مجموعے سے خارج سمجھنا چاہیے۔

۵۔ مع "ایک روز فراق جان وتن میں ہوگا" یہ مطلع ضمیر اختر نقوی نے عالم حسین کے مجموعۂ رباعیات سے نقل کیا ہے۔ لیکن اس کی صحیح شکل مع "دردا کہ فراق جان وتن میں ہوگا" ہے۔ "اودھ اخبار" لکھنؤ کی ہم عصر شہادت ہے کہ میر نفیس نے یہ رباعی اسی طرح میر انیس کی مجلس چہلم میں پڑھی تھی۔ اس کی صحت میں شک نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ضمیر اختر نے اس روایت کو مسترد کر کے عالم حسین کی روایت پر اس کی جگہ مع "اک روز فراق جان وتن میں ہوگا" کو ترجیح دی ہے۔ یہ نا قابل قبول ہے۔ سید محمد عباس نے "دردا" ہی کو بجا طور سے قبول کیا ہے۔ اس سے، بہر حال، شمار رباعیات پر فرق نہیں پڑتا کیوں کہ ضمیر اختر نے "دردا" کی روایت کو اشاریے میں شامل ہی نہیں کیا ہے۔

۶۔ بعض رباعیات دوسرے شعرا سے بھی منسوب ہیں۔ ان کی فہرست نیچے درج کی جاتی ہے۔

(۱) میر ضمیر سے بھی منسوب

۱۔ آرام سے کسی دن تہہ افلاک رہے (بادنیٰ تغیر)

(ب) مرزا دبیرؔ سے بھی منسوب

۱۔ احساں نہیں گر بزمِ عزا میں آئے

۲۔ دنیا عجیب کارخانہ دیکھا (خارج)

۳۔ حیدرؑ نے دم بذل نہ کیا کیا بخشا (خارج)

۴۔ ہر چند کے خستہ و حزیں ہے آواز

۵۔ مولا جو وہاں تم قدر سے پایا (خارج)

۶۔ میزانِ سخن سچ میں تُلتا ہوں میں

۷۔ بندوں پہ کرم حضرتِ باری کا ہے

(ج)۔ مونسؔ سے بھی منسوب

۱۔ مظلوم نہ شاہ بحر و بر سا ہوگا

۲۔ دنیا میں محمدؐ سا شہنشاہ نہیں

۳۔ دولت کا ہمیں خیال آتا ہی نہیں

۴۔ ضائع نہ کر آغوش کے پالے دل کو

۵۔ عمر اپنی غم شہ میں بسر کرلے تو

۶۔ اسی ملک سے دنیا کی ہوس میں آئے

۷۔ تیر غم شہ سینے میں پیوستہ ہے

۸۔ جب شام کے زنداں میں حرم قید ہوئے

۹۔ خاموشی میں یاں لذّت گویائی ہے

۱۰۔ لفظوں میں نمک سخن میں شیرینی ہے (تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ)

ان میں سے تین رباعیاں اس مجموعے میں اس لیے شامل نہیں کی گئیں کہ ان کے کلام دبیر ہونے کے قوی شواہد موجود ہیں۔ رع "دنیا کا عجب کارخانہ دیکھا" یہ رباعی دبیر کے مجموعہ کلام "سبع مثانی" اور "رباعیات دبیر" دونوں جگہ موجود ہے۔ اگرچہ بعض نسخوں میں انیس سے بھی منسوب ہے لیکن خود خاندان انیس کے ایک باخبر فرد سید محمد عباس نے اس کا کلام دبیر ہونا تسلیم کر کے اپنے مرتبہ مجموعے سے اس کو خارج کر دیا ہے۔ اسی طرح رع "حیدر نے دم بذل نہ کیا کیا بخشا" ایک قدیم اور معتبر ماخذ۔ کاشف الحقائق (۲: ۲۹۵) میں دبیر کے نام سے درج ہے۔ امداد امام اثر رثائی ادب پر نظر رکھتے تھے۔ ان کی شہادت کو قوی تر شہادت کے بغیر مسترد نہیں کیا جا سکتا۔

اسی عنوان سے رباعی رع "مولا جو وہاں حکم قدر سے پایا" بھی دبیر کی ملکیت قرار پائی ہے۔ اوپر ان تینوں رباعیوں کے مطلعوں کے آگے میں نے لفظ "خارج" قوسین میں لکھ دیا ہے اور اس مجموعے میں شامل نہیں کیا ہے۔[1]

اس کے برعکس دبیر سے منسوب اور رباعیاں جیسے رع "ہر چند کہ خستہ وحزیں ہے آواز" قطعی اور حتمی طور سے دبیر کی ثابت نہیں ہوتی۔ انھیں اس مجموعے میں شامل

---

[1] ان تینوں نکالی ہوئی رباعیوں کے متون صرف حوالے کی غرض سے یہاں حاشیے میں دیے جا رہے ہیں:-

مولا جو وہاں حکم قدر سے پایا   کعبے نے شرف علی کے در سے پایا
ہاتھوں پہ لیے نبی یہ کہتے نکلے   لو، ہم نے وہی خدا کے گھر سے پایا

دنیا کا عجب کارخانہ دیکھا   بس بس کا نہ یاں ہم نے زمانہ دیکھا
برسوں رہا جن کے سر پہ چتر زریں   تربت پہ نہ ان کی شامیانہ دیکھا

بندوں پہ کرم حضرت باری کا ہے   مقدور کسے شکر گزاری کا ہے
دی ہے جو خدا نے سرفرازی مجھ کو   ثمرہ یہ خیال خاکساری کا ہے

(مراثی دبیر)

رہنے دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر اسی رباعی ع "ہر چند کہ خستہ و حزیں ہے آواز" کو لے لیجیے۔ یہ یوسفی پریس کے شائع کردہ (۱۹۰۱ء) مجموعے میں موجود ہے اور پھر انیس کے مراثی کی جلد اول (نول کشور) میں بھی نقل ہوئی ہے۔ ان قدیم تر مآخذ کی موجودگی میں اس کو انیس کے مجموعے سے کیسے خارج کیا جا سکتا ہے؟۔

مدوّن کی حیثیت سے جس کشادہ دلی اور وسیع النظری کا ثبوت سید محمد عباس نے دبیر کی مشکوک رباعیوں کے سلسلے میں دیا تھا اور جس کا مظاہرہ تحسیر کے اشتراک کے سلسلے میں بھی کسی حد تک کیا ہے، وہ مونس کی رباعیوں کے سلسلے میں نظر نہیں آتا۔ مونس ایک خوش گو اور خوش فکر شاعر تھے۔ یہ ان کی خوش نصیبی اور بد نصیبی دونوں ہی تھی کہ وہ انیس کے چھوٹے بھائی تھے اور اپنا کلام احتراماً بھی اور ادبی ضرورت کے ماتحت بھی، انیس کو دکھاتے تھے لیکن اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ ان کی جو رباعیاں ان کے مطبوعہ ہائے مراثی و سلام وغیرہ میں پائی جائیں، اُن پر اُن کا حق تسلیم کرنے میں مدتوں بعد پس و پیش ہی نہ کیا جائے بلکہ سرے سے ان کی ملکیت سے انکار کر دیا جائے، قرین انصاف نہیں معلوم ہوتا۔ میں نے یہ رباعیاں اس مجموعے میں شامل تو کر لی ہیں مگر چاہتا ہوں کہ ارباب تحقیق اس حقیقت کو نظر میں رکھیں کہ ان کی نسبت فی الحال نزاعی ہے اور ان کا شمول کسی ایک کے مصنف ہونے یا نہ ہونے پر دلالت نہیں کرتا۔

مزید تحقیق و تفتیش کے بغیر ان مشکوک یا مشترک رباعیوں کو حتمی طور پر انیس کی رباعیاں قرار دینا صحیح نہ ہوگا۔ انیس پر اس طرح کی تحقیق کا کام اب شروع ہوا ہے۔ اس کی ابتدا مرحوم پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب نے کی تھی۔ اب کئی حضرات میدان میں آ گئے ہیں۔ پاکستان میں سید مرتضیٰ حسین فاضل صاحب تحقیقی مزاج کے ساتھ اس کام میں مصروف ہیں اور ہندوستان میں ڈاکٹر نیر مسعود اور ڈاکٹر اکبر حیدری

چھان بین میں لگے ہوئے ہیں۔ اور حضرات بھی متوجہ ہو رہے ہیں، لیکن یہ کام ایک دو دن میں انجام نہیں پا سکتا۔ انیس کے کلام کے ذخیرے، مخطوطات اور مطبوعات دونوں، برِ صغیر ہند و پاکستان میں ہر طرف بکھرے پڑے ہیں۔ ان میں سے بیشتر کا احاطہ کرنے کے لیے بھی وقت اور ریاض درکار ہے۔ نہ کاروانِ تحقیق کو رُکنا چاہیے اور نہ جتنا کام، انفرادی یا اجتماعی طور پر اس وقت ہو سکتا ہے، اُسے بند ہونا چاہیے۔ اسی خیال سے میں نے انیس کے سلاموں، رباعیوں، نوحوں، مناجاتوں اور قصیدوں وغیرہ کو انیس صدی کے موقعے پر یکجا کرنے کی ذمہ داری قبول کی تھی۔ اس میں کہیں بھی حرف آخر کی منزل نہیں آئی ہے اور میں کھلے دل سے اس کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس مجموعے میں بھی الحاق وتصحیف کی گنجائش باقی ہیں اور ان پر تحقیق کو نہر جاری کی طرح آگے چلتے بڑھتے رہنا چاہیے تاکہ آنے والے زمانے میں بہتر متن کی تیاری ممکن ہو سکے۔ پھر بھی جہاں کہیں شک وشبہ کی گنجائش نکلی ہے اس کی نشان دہی کر دی ہے اور حتی الوسع اختلافات متون بھی ظاہر کر دیے ہیں۔ اس سے کسی حد تک مزید تحقیق کی راہ میں آسانی پیدا ہونے کا امکان ہے۔

اس گفتگو کا خلاصہ یہ ہے کہ ان تمام تحفظات، شبہات اور امکانات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اور دبیر کی خارج کردہ تین رباعیوں کو ہٹا دینے کے بعد، ضمیر اختر نقوی کے اشاریے میں صرف ۵۶۵ رباعیاں بچ جاتی ہیں۔ ان میں بھی سب رباعیاں نہیں ہیں۔ کم سے کم یہ چار تو قطعات ہیں۔

۱۔ غافل تجھے کیوں خواہش دنیائے دنی ہے

۲۔ غفلت میں نہ عمر کو بسر کر

۳۔ میرے مولا قل ھو اللہ احد کے واسطے

۴۔ مومنو یہ مقام زاری ہے

حتّٰاط مرتبین مثلاً سید محمد حسین بلگرامی نے اپنی مرتبہ "رباعیات انیس" میں ان میں سے (۲) اور (۴) کو قطعات ہی کے تحت درج بھی کیا ہے۔ لیکن میں نے انھیں مجموعے میں اس لیے رہنے دیا ہے کہ انیس کے معلوم قطعات کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے اور رباعیوں کے ساتھ شائع کرنے کے علاوہ ان کی جمع آوری کی کوئی معقول صورت نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ با مطلع قطعات کو اچھے خاصے لوگ بھی رباعیات کے زمرے میں گن لیا کرتے ہیں۔ میں نے اتنی احتیاط اور برتی ہے کہ قطعات کے آغاز میں واضح طور سے لفظ "قطعہ" لکھ دیا ہے۔

ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی نے مندرجۂ ذیل چار رباعیوں اور ایک قطعے کے صرف مطلع دیے ہیں اور ان کا ماخذ نہیں بتایا ہے۔ ان کے متون دستیاب نہیں ہیں، اس لیے ان کو مجموعے میں شامل نہیں کیا جا سکا۔ میں نے ان کو کئی بار یاد دہانی کرائی لیکن ع "واں ایک خامشی تری سب کے جواب میں" ویسے وہ مجھے اس کے پہلے معلومات فراہم بھی کرتے رہے ہیں لیکن اس معاملے میں ان کی عنایتوں نے میری گزارشوں کا ساتھ نہ دیا۔ بہر حال، وہ مطلع یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

۱۔ اقبال کا در حسام حیدر سے کھلا

۲۔ حقا فلک شرف کا خاور ہے علی

۳۔ ذرّے کو فروغ مہر تاباں بخشے

۴۔ فردوس میں رہنے کو علی گھر دیں گے

۵۔ میرے مولا قل ھو اللہ احد کے واسطے (قطعہ)

(اگر متون دستیاب ہو گئے تو ان شاء اللہ آئندہ ایڈیشن میں اس کی تلافی کر دی جائے گی)

نقوی صاحب نے کئی رباعیوں کا ذکر عالم حسین کے مرتبہ مجموعے کے حوالے سے کیا ہے۔ چھان بین کے بعد، ان میں صرف بارہ رباعیاں ایسی ملیں جو کہیں اور نظر سے نہیں گزریں۔ یہ سب ضمیمہ (ب) میں درج کرلی گئی ہیں۔ عالم حسین کے مجموعے کے سلسلے میں ابھی تصدیق کی ضرورت ہے کیوں کہ خود انھوں نے اپنے ماخذ کا کہیں حوالہ نہیں دیا۔

اب "باقیاتِ انیس" مرتبہ ڈاکٹر اکبر حیدری کا تجزیہ اور باقی رہ جاتا ہے۔ انھوں نے یہ دعوا کیا ہے کہ جو اڑتالیس رباعیاں "باقیاتِ انیس" میں شائع کی گئی ہیں وہ سب کی سب غیر مطبوعہ ہیں اور ان کا ذکر ضمیر اختر نقوی کے اشاریے میں بھی نہیں آیا ہے۔ جب نظر غور سے دیکھا تو کم از کم حسب ذیل سات رباعیاں صرف جزوی اختلاف متن کے ساتھ اشاریے میں موجود ملیں۔

باقیاتِ انیس	اشاریہ ضمیر اختر نقوی
۱۔ رونے میں نہ فریاد و بکا کرتے ہیں	۱۔ روتے ہیں نہ فریاد و بکا کرتے ہیں
۲۔ وحشت سایے سے ہے وہ دیوانہ ہوں	۲۔ سایے سے بھی وحشت ہے وہ دیوانہ ہوں
۳۔ عازم طرف عالم بالا ہوں میں	۳۔ راہی طرف عالم بالا ہوں میں
۴۔ یکتا ہے جو مداح مدام اس کا ہوں واحد ہے جو عہد نیک نام اس کا ہوں	۴۔ واحد ہے جو عہد نیک نام اس کا ہوں
۵۔ افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے	۵ افسوس جہاں سے دوست کیا کیا نہ گئے
۶۔ لے زیر قدم لحد کا باب آپہنچا	۶۔ اب زیر قدم لحد کا باب آپہنچا
۷۔ ہر آن گھٹی جاتی ہے طاقت میری	۷۔ ہر لحظہ گھٹی جاتی ہے طاقت میری

اس کے علاوہ (۸) ع "دل میں جب مُسلم بیکس کا خیال آتا ہے" اور

(۹) ع ''محرم آیا، الم کا پیام آپہنچا'' قطعات ہیں رباعیاں نہیں۔

ان میں ایک اور رباعی ہے:

بستی کو اُجاڑ کر بسایا ہے اسے
گھر اپنا بگاڑ کر بنایا ہے اسے
سوئیں گے لحد میں پاؤں پھیلا کے انیسؔ
کھویا ہے جو نقدِ جاں تو پایا ہے اسے

اس سے ملتی جلتی انیسؔ کی ایک اور رباعی ہے۔

مرمر کے مسافر نے بسایا ہے تجھے
رخ سب سے پھرا کے منہ دکھایا ہے تجھے
کیوں کر نہ لپٹ کے تجھ سے سوؤں اے قبر!
میں نے بھی تو جان دے کر پایا ہے تجھے

اسی مضمون کی دبیر کی بھی رباعی ہے:

گھر اپنا اُجاڑ کر بسایا تجھ کو
ڈھانپا جو کفن منھ نہ دکھایا تجھ کو
اے قبر کہاں کہاں نہ کی تیری تلاش
جب خاک میں مل گئے تو پایا تجھ کو

انیسؔ کے مرتبے کے شاعر سے صرف لفظی اُلٹ پھیر کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ اس کا بھی امکان ہے کہ ایک ہی رباعی کی یہ دو شکلیں ہوں جو انیسؔ کی نظر ثانی اور ابتدائی مسودے کی عکاس ہوں یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ ''باقیات انیسؔ'' میں درج رباعی دبیر و انیسؔ کی ان متحد المضامین رباعیوں کو دیکھنے کے بعد تحریف و الحاق کے وسیلے سے وجود میں آئی ہو۔ بہر صورت، یہ ناقابل قبول ہے۔ آخری مصرعہ انیسؔ ہی کے مصرعے ع ''میں نے بھی تو جان دے کے پایا ہے تجھے'' سے ماخوذ ہے۔ اور دوسرا بادنیٰ تغیر جیوں کا تیوں دبیر کا ہے۔ اس مشکوک رباعی کا یہاں مقدمے میں ذکر تو کر دیا گیا ہے لیکن اس مجموعے کے متن میں شامل نہیں کیا گیا ہے۔

اس کے علاوہ ''باقیات انیسؔ'' میں ایک اور رباعی کا مطلع ہے ع ''جو قصر کرے دل کو قیصر وہ ہے'' مصرع ناموزوں اور بے معنی ہے۔ میں نے کسی جگہ اس مصرعے کو

یوں بھی پڑھا تھا۔ ع ''جو قصر کرے امل تو قیصر وہ ہے۔ غالباً ''دل'' ''امل'' ہی کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ مولف ''المیزان'' نے یہ رباعی دبیر سے منسوب کی ہے اور وہاں مصرعۂ اولیٰ کی شکل یہ بتائی ہے۔ ع ''جو قصر کرے حرص کو قیصر وہ ہے'' 'حرص' کو گھٹانے کا نہیں ختم کرنے کا مطالبہ ہوتا ہے صرف 'قصر امل' (خواہش کے گھٹانے) کا اخلاقی درس اسلام نے دیا ہے۔ 'خواہش' اور 'حرص' کا فرق واضح ہے۔ ممکن ہے کہ اصلی شکل وہی ہو جو میں نے کہیں پڑھی تھی۔ خیر، یہ ضمنی بحث ہے۔ جب رباعی ہی دبیر کی ہے تو اس پر مزید خیال آرائی بے سود ہے اور میں نے ''باقیات'' کے مقابلے میں ''المیزان'' اور ''رباعیات دبیر'' کی روایات کو صحیح تسلیم کیا ہے۔

ان دو رباعیوں کو نکال لینے کے بعد ''باقیات انیس'' سے حاصل شدہ مواد کی بنا پر صرف سینتیس (۳۷) رباعیوں کا اضافہ ہوتا ہے۔ اس میں ایک قطعہ بھی شامل ہے۔ اکبر حیدری نے ان رباعیوں کا ماخذ سید محمد رشید کے ذخیرۂ مراثی کو بتایا ہے لیکن خود رشید صاحب کے نزدیک ان کی حیثیت غیر یقینی اور نا استوار ہے۔ پھر بھی، متون کی موجودگی، رشید صاحب کے یہاں بعض نسخوں میں ان کا سراغ ملنا اور ابھی تک کہیں اور ان کا نہ پایا جانا ایسے امور تھے جن کے پیش نظر ان رباعیوں کو ایک سوالیہ نشان کے ساتھ ضمیمہ (الف) میں شامل کر لیا گیا ہے۔

ضمیمہ 'ج' میں ایک رباعی ''روح انیس'' کے حوالے سے نقل کی گئی ہے۔ یہ ہم سب بچپن سے پڑھتے اور سنتے چلے آئے ہیں اور بے شرکت غیرے انیس کی تسلیم کی جاتی رہی ہے۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان کے کسی مجموعۂ مراثی یا مجموعۂ رباعیات میں یہ رباعی شامل نہیں ہے۔ اگر ''روح انیس'' میں شامل نہ ہوتی تو میں اسے اس مجموعے میں شامل نہ کرتا لیکن مسعود حسن رضوی جیسے انیس شناس اور اعلا پایے کے محقق کی کتاب

میں اسے دیکھ کر اس لیے شامل کر لیا ہے کہ انھوں نے ضرور تحقیق کر لی ہوگی۔ اُن کے نانا سے انیس کے خاصے تعلقات تھے۔ ممکن ہے کہ انھیں سے معلوم ہوا ہو۔

اب اس مجموعے میں پانچ سو تراسی ۵۸۳ رباعیاں ہیں، جن میں چند قطعے بھی شامل ہیں۔ اگر ان پانچ رباعیوں کو بھی شامل کر لیا جائے جن کے پورے متن حاصل نہیں ہو سکے ہیں اور صرف مطلعے، حوالے کے بغیر ضمیر اختر نے دیے ہیں تو یہ تعداد ۵۸۸ ہو جائے گی۔ اس پر مستزاد رباعی ۸ ع افسوس کہ شمع عیش خاموش ہوئی۔ اس کا مطلع مطبع یوسفی کے مجموعۂ رباعیات کے حوالے سے ضمیر اختر نے اشاریے میں شامل کیا ہے۔ یہ مجموعہ میری دست رس سے دور ہی رہا اور اس رباعی کی نقل بھی حاصل نہ ہو سکی۔ مل جاتی تو کل تعداد بڑھ کر ۵۸۹ ہو جاتی۔ اب تک انیس کے مطبوعہ مجموعہ رباعیات میں صرف ۵۲۱ رباعیاں تھیں۔ اب ان میں ۶۷ رباعیوں کا اضافہ ہوا ہے۔ یہاں یہ بات ایک بار اور دہرانے کی ہے کہ یہ سارا مواد مزید تحقیق و تفتیش کا طالب ہے۔

پروفیسر مرزا علی اظہر برلاس

”ضمیر اختر نقوی نے علمی اور ادبی خزانوں کی کھوج میں جس عرق ریزی اور جانفشانی سے کام لیا ہے اس کو وہ ہی حضرات محسوس کر سکتے ہیں جنھوں نے اس میدانِ خارزار میں کبھی قدم رکھا ہو۔“

پروفیسر عبدالقوی دسنوی (بھوپال)

انیسؔ نُما

اردو میں اشاریہ سازی کا کام ابھی بہت کم ہوا ہے۔ البتہ غالب[۱] اور اقبال[۲] سے متعلق اشاریے کتابی صورت میں مرتب کیے گئے ہیں۔ لیکن دوسرے ادباء اور شعراء کی طرف سے سوائے حالی، شبلی، عبدالحق اور ابوالکلام آزاد کے اس قسم کے کام کے لیے توجہ نہیں کی گئی ہے۔ کچھ لوگوں نے بعض رسائل کے مضامین کے اشاریے تیار کیے ہیں، جو ان رسائل کے معیار اور مزاج کے سمجھنے میں مدد کردیتے ہیں۔ اس قسم کا کام اگرچہ بظاہر زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتا، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ اشاریہ سازی کا کام نہ تو آسان ہے اور نہ اہمیت ہی میں کم۔ اس سے نہ صرف تحقیقی کام کرنے والوں کے لیے آسانیاں پیدا ہوتی ہیں، بلکہ ان میں ترتیب و تہذیب کا سلیقہ بھی پیدا ہوتا ہے۔ اس کام سے اس بات کا بھی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ کسی موضوع سے متعلق کس حد تک کام ہوچکا ہے اور کن پہلوؤں پر مزید کام کرنے کی گنجائش ہے۔ اس لیے اشاریہ سازی کے کام کی طرف توجہ کی ضرورت ہے۔

۱۔ غالبیات مرتب عبدالقوی دسنوی نسیم بک ڈپو لکھنؤ، ۱۹۶۹ء، غالب نامہ ترتیب ابن حسن قیصر ۱۹۶۹ء،
اشاریہ غالب سید معین الرحمٰن، پنجاب یونیورسٹی لاہور، ۱۹۶۹ء،
غالب بلوگرافی۔ محمد انصار اللہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ ۱۹۷۲ء،

۲۔ کلیاتِ اقبال مرتب ملک نذیر احمد، اردو اکادمی، بہاولپور۔

گزشتہ سال میر انیس صد سالہ تقریبات کمیٹی کی طرف سے جناب پروفیسر سید مسعود حسن رضوی ادیب کا ایک خط میرے نام آیا تھا، جس میں انھوں نے بھوپال میں انیس کی صد سالہ تقریبات کے سلسلے میں دریافت کیا تھا۔ بدقسمتی سے اب تک اس سلسلے میں یہاں کچھ نہیں کیا جا سکا۔ البتہ میں نے اپنے طور پر ''انیس نما'' کے سلسلے میں کام شروع کر دیا تھا۔ لیکن اس کی رفتار بھی بہت سست رہی۔ ''انیس نما'' کی ترتیب کا کام ابھی جاری تھا کہ عزیزم اقبال مسعود کی عنایت سے ''ماہ نو'' کا انیس نمبر ملا جس میں یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی کہ ضمیر اختر نقوی صاحب نے میر انیس سے متعلق اشاریہ ''گنجینۂ انیس'' بڑی محنت سے مرتب کیا ہے، جس میں ''شجرۂ انیس'' مرثیہ گوئی کا ادواری ارتقا (اشاریہ مرثیہ گویان)''، ''صریر کلک'' (انیس کی زندگی، شخصیت اور فن و کلام پر اہم اور قابل ذکر کتابیں)، ''کانٹوں کو ہٹا کر پھول چن لیتا ہوں (تذکرے تنقیدیں، تبصرے اور دیگر کتابیں جن میں میر انیس کے حالات و کلام پر کام کرنے والوں کو بہت کچھ مل سکتا ہے)''۔

گلہائے مضامین (ہندوستان و پاکستان کے ہزاروں ماہناموں، پندرہ روزہ ہفت روزہ اور روزناموں میں ہزاروں مضامین میر انیس کی حیات و فن سے متعلق شائع ہو چکے ہیں، ان کا اشاریہ بنانا اتنی جلد ممکن نہیں تھا، چند اہم مضامین کے حوالے ملاحظہ ہوں)''، ''اشاریہ مراثی انیس''، ''اشاریہ رباعیات انیس''، ''اشاریہ سلام''، ''اشاریہ نوحہ جات'' ''قصیدہ و مناجات'' مختلف عنوان قائم کیے گئے ہیں۔

ضمیر اختر نقوی صاحب قابل مبارک باد ہیں کہ انھوں نے انیسیات کے سلسلے میں ایسا اچھا کام کیا ہے، جس سے انیس پر کام کرنے والوں کو بڑی آسانی ہوگی۔ البتہ ''صریر کلک''، ''کانٹوں کو ہٹا کر پھول چن لیتا ہوں'' اور ''گلہائے مضامین'' کے حصے

بہت کچھ اضافہ چاہتے ہیں، جس کا شدید احساس ضمیر اختر نقوی صاحب کو بھی ہے

(......ان کا اشاریہ بنانا اتنی جلد ممکن نہیں تھا، چند اہم مضامین کے حوالے ملاحظہ ہوں)

ان حصوں کی ترتیب میں بھی کچھ خامیاں رہ گئی ہیں۔ مجھے اطمینان ہے کہ میں "انیس نما" بہت بہتر ترتیب اور بہت زیادہ حوالوں کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ اب بھی اس میں اضافے کی گنجائش ہے۔ کوشش کروں گا کہ آئندہ اسے اور بہتر اور مفید بنا سکوں۔ انیسیات کی ترتیب کے سلسلے میں برادرم شکیل الرحمٰن کا شکر گزار ہوں کہ انھوں نے میری بہت مدد کی ہے۔

۲۵، اپریل ۱۹۷۳ء

علی سردار جعفری (بمبئی)

"ضمیر اختر نقوی کے علمی اور تحقیقی کارنامے ہر لحاظ سے بلند پایا اور قابلِ قدر ہیں"۔

حسین مجتبیٰ (ضیا ندیم)

"کلامِ ضمیر" کا اجمالی جائزہ

علامہ ضمیر اختر نقوی ہمارے عہد کی ایک انتہائی اہم شخصیت ہیں جن کی ذات کئی سمتوں اور جہتوں میں منقسم ہے۔ آپ ایک ادیب بھی ہیں اور محقق بھی، شاعر بھی ہیں اور خطیب بھی اور کمال یہ ہے کہ آپ کی شخصیت کا ہر پہلو اور ہر گوشہ بے مثل و بے نظیر ہے آپ کی بے شمار علمی و تحقیقی تصانیف ہیں جن میں "شعرائے اُردو اور عشقِ علی"، "خاندانِ میر انیس کے نامور شعرا"، "میر انیس" (انگریزی)، "کلامِ انیس میں رنگوں کا استعمال" اور "ہر صدی کا شاعرِ اعظم میر انیس" بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔

"کلامِ ضمیر" علامہ ضمیر اختر نقوی کا مجموعۂ کلام ہے جس میں سلام اور نوحوں کے علاوہ تین مرثیے بھی شامل ہیں۔ ابتداء مرثیہ فقط واقعۂ کربلا کے بیان تک محدود تھا چنانچہ میر انیس اور مرزا دبیر ان کے خانوادے سے متعلق کم و بیش ہر شاعر نے واقعاتِ کربلا کے بیان ہی کو اپنے مرثیوں کا موضوع بنایا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ مرثیے کی ہیئت تو نہ بدل سکی البتہ موضوع میں تنوع آ گیا، جدید مرثیہ گو شعرا نے واقعاتِ کربلا ہی کے پس منظر اور مرثیے کی پوری کیفیت اور فضا میں نئے نئے موضوعات کو بیان کیا ہے۔ اس ضمن میں جوش ملیح آبادی بطورِ خاص اہمیت کے حامل ہیں جنھوں نے روایتی مرثیوں سے ہٹ کر نئے نئے موضاعات پر بڑے فکر انگیز اور متاثر کن مرثیے لکھے، جدید مرثیہ نگاروں میں سید آلِ رضا، نسیم امروہوی، جوش ملیح

آبادی، صبا اکبر آبادی، ڈاکٹر صفدر حسین، قیصر بارہوی، پروفیسر سردار نقوی، شاہد نقوی اور دیگر بہت سے لوگ شامل ہیں۔ انھیں میں سے ایک اہم اور معتبر نام علامہ ضمیر اختر نقوی کا ہے جن کی علمی وتحقیقی تصانیف اور تخلیق کردہ مراثی اُردو ادب اور بالخصوص اُردو کے رثائی ادب میں گراں قدر سرمائے کی حیثیت رکھتے ہیں۔

''نقوشِ معجزات''، ''بیتِ معمور'' اور ''سلیمانِ امامت'' یہ تین مرثیے ہیں جو علامہ صاحب کے اس مجموعہ کلام میں شامل ہیں۔

''نقوشِ معجزات'' میں انھوں نے انبیائے کرام علیہم السلام کے معجزات کو تاریخی تسلسل سے آیات قرآنی کے حوالے کے ساتھ دلکش شعری پیرائے میں بیان کیا ہے حضرت آدمؑ سے لے کر حضرت موسیٰؑ وحضرت عیسیٰؑ اور پھر جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے معجزات اور پھر مولائے کائنات کی تیغ یعنی ذوالفقار کی معجزاتی شان اور پھر اس تیغ علیؑ کے امام حسینؑ کے دستِ مبارک میں آکر میدانِ کربلا میں معجزاتی کرامات کے بیان کے ساتھ ساتھ ناقۂ صالحؑ اور اس کے ضمن میں دُلدُل کا بیان اپنی تاریخی نوعیت واہمیت کے لحاظ سے بے مثال ہے۔ پھر ایک ہاتھ کی معجزاتی کرامات کا ذکر ہے اور آخر میں ایک معجزے کا ذکر ہے جس کا تعلق ایک عاشقِ عزائے حسینی ضعیفہ نابینا سے ہے کہ وہ کس طرح مجبوری اور بے سروسامانی کے عالم میں تن تنہا اپنے امام سے صفِ عزا نہ بچھا سکنے پر فریاد کناں ہے اور دوسرے ہی لمحے میں شہزادی کونینؑ اپنے خانوادے کی اور بیبیوں کو لے کر آتی ہیں اور یوں اس ضعیفہ کے یہاں عزاداری سید الشہدا کا اہتمام ہو جاتا ہے۔

مرثیے کا آغاز کس قدر خوبصورت اور مسحور کن انداز میں ہوتا ہے ملاحظہ کیجیے۔

اے کلکِ سخن مدح کا اعجاز دکھا دے

اے نورِ ولا فکر کی پرواز دکھا دے
اے ذوقِ نظر نقشِ فسوں ساز دکھا دے
اے چشمِ خرد قلب کی آواز دکھا دے
الفاظ کی چلمن سے وہ جنت نظر آئے
مجلس کی فضا خلدِ مودّت نظر آئے

دراصل شاعری کا حسن ہی الفاظ کے انتخاب، ان کے برمحل اور برجستہ استعمال محاورات واستعارات کے موثر بیان، تراکیب کی بندش، تخیل کی کرشمہ سازی اور سب سے بڑھ کر دلکش اور دل نشیں شعری اسلوب میں پنہاں ہے جس کے ذریعے شاعر جذبات بیان کرتا ہے یا جس چیز کا ذکر کرتا ہے اس کی زندہ اور متحرک تصویر ہمارے سامنے پیش کر دیتا ہے اور مرثیے میں یہ چیز بے حد اہمیت کی حامل ہے مثلاً تیغِ حسینی کی شان ملاحظہ ہو۔

میدانِ وغا گرم تھا چلتی تھی ہوا گرم
بن پھنکتا تھا تپتی تھی زمیں چرخ بھی تھا گرم
اعدا کے بدن سرد تھے بازار قضا گرم
اڑتے تھے شرر، اتنی تھی شمشیرِ خدا گرم
تیغِ اسد اللہ کی عجب عشوہ گری تھی
دریا میں جو پانی تھا وہیں آگ لگی تھی

اسی طرح ذوالجناح کے بارے میں کہتے ہیں:۔

ناقے کی طرح آیتِ اللہ ہے ذلدل
منجملۂ رمزِ شہِ ذی جاہ ہے ذلدل

ہر گام پہ مولا کے جو ہمراہ ہے ذوالجناح
صاحب کے ہر انداز سے آگاہ ہے ذوالجناح

ذی شان ہے حامی ہے شہِ ہر دوسرا کا
ذی رتبہ ہے ناصر ہے یہ منصور خدا کا

پھر ایک ہاتھ کے معجزوں کا بیان ملاحظہ ہو:۔

ایماں کا علم بدر شکن جس کی تھی طلعت
خیبر میں جو اُبھرا تھا سرِ دستِ ولایت
صفین میں تھا مظہرِ انوار امامت
عباسؑ کے ہاتھوں نے عطا کی جسے رفعت

جو دیدۂ بیدار کو ایماں کا سبق تھا
جو بدر سے تا کرب و بلا مظہرِ حق تھا

غرض علامہ ضمیر اختر نقوی نے اپنی پوری شاعرانہ مہارت اور فن کارانہ پختگی کے ساتھ ایک اہم موضوع کو جس خوبصورت انداز میں مرثیے کی شکل میں پیش کیا ہے وہ ان کی بے پناہ تخلیقی و شعری صلاحیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

مرقوم کتب ہے کہ اجنہ ہوں کہ انساں
جنگل کے درندے کہ طیور چمنستاں
ہر غنچہ و گل نخل و شر کوہ و بیاباں
ہر گوشہ امکاں تھا تہہ حکم سلیماں

چلتی تھی اطاعت کی قضا ان کے جلو میں
تھے آتش و خاک آب و ہوا ان کے جلو میں

کس عمدگی اور دل موہ لینے والے شعری اسلوب میں حضرت سلیمانؑ کی حکومت و اقتدار و شکوہ کا نقشہ کھینچ رہے ہیں اور پھر ایک دم اس تخت و تاج اور حکومت و اقتدار کا مقابلہ کرنے لگتے ہیں مولائے کائنات کے اختیار و اقتدار سے اور وہ بھی کس طرح، ملاحظہ کیجئے۔

اس تخت کی سدرہ پہ رسائی تو نہیں تھی
تھا زیرنگیں ملک خدائی تو نہیں تھی
معبود نے مہر اس پہ لگائی تو نہیں تھی
معراج سلیماں نے یہ پائی تو نہیں تھی
وہ تخت نشیں خیلفہ داور تو نہیں تھا
اک تخت تھا وہ دوش پیمبرؐ تو نہیں تھا

پھر تخت بلقیس کی طرف اشارہ ہے جسے ہدہد نے پرواز کے دوران دیکھا اور اس کے ہی توسط سے ملکہ بلقیس کی تخت و حکومت اور حسن و جمال کی خبر حضرت سلیمان تک پہنچی اور پھر تخت بلقیس کو اپنے دربار میں لانے کی خواہش اور آصف بن برخیا کا فقط اک ذرہ علم مولائے کائنات کے بل پر چشم زدن میں تخت بلقیس کا حضرت سلیمانؑ کے دربار میں لانا، غرض ان تمام واقعات کو تاریخی تسلسل کے ساتھ بڑی عمدگی اور فنی مہارت کے ساتھ شعری اسلوب میں بیان کیا جارہا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ الفاظ کی نشست و برخاست، زبان کی شستگی، انداز بیان کی دلکشی، طبیعت کی روانی، شاعرانہ مہارت اور فنی ترتیت کے سہارے علامہ صاحب نے جس طرح ہر بات، ہر واقعے، اور موضوع کے ہر پہلو کی جس طرح بہترین تصویر کشی کی ہے اس نے مرثیے کے حُسن میں اضافہ اور اثر انگیزی میں جان ڈال دی ہے۔

تیسرا مرثیہ "بیت معمور" کے عنوان سے ہے یعنی خانۂ فاطمۃ الزہرا سلام اللہ علیہا مرثیے کی ابتدا میں علامہ ضمیر اختر نقوی نے مخدومۂ کونین کی ذات مقدسہ کے بارے میں عقیدت ومحبت میں ڈوبے ہوئے جذبات واحساسات کے ساتھ جس طرح تعارفی کلمات بیان کیے ہیں وہ بے مثل وبے نظیر بھی ہیں اور حق وصداقت کا آئینہ بھی، ملاحظہ ہو:-

حرمتِ دیں ، شرفِ کون و مکاں ہیں زہراؑ
مرضیِ حق ہیں محمدؐ کی زباں ہیں زہراؑ
نقشِ قرآن ہیں اعجازِ بیاں ہیں زہراؑ
زوجِ کونین ہیں خاتونِ جناں ہیں زہراؑ
ان کا دشمن ہے رسولؐ دوسرا کا دشمن
دیں کا ، قرآں کا ، شریعت کا خدا کا دشمن

اسی طرح جناب سیدہ سلام اللہ علیہا کے گھر کا نقشہ عمدہ، نفیس، اور دلآویز تشبیہات کی صورت میں کس شاعرانہ حسن ومہارت کے ساتھ کھینچتے ہیں ملاحظہ فرمایئے۔

چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسم ہے یہ گھر
سازِ توحید کے نغموں کا تلاطم ہے یہ گھر
نکہتِ غنچہ ہے بلبل کا ترنم ہے یہ گھر
وحی والہام کے ہونٹوں کا تکلم ہے یہ گھر
راہِ فردوس کا یہ نقطۂ آغاز بھی ہے
پرِ جبریل کی جولاں گہہِ پرواز بھی ہے

غور فرمایئے کس طرح قدرتِ بیان اور ندرتِ خیال کے سہارے علامہ صاحب

جنابِ سیدہ سلام اللہ علیہا کے خانۂ بابرکت کی عظمت و بلندی، منزلت و مرتبے اور تقدس کو یوں بیان کرتے ہیں۔

جس سے دنیا کو ملی دولتِ ایمان وہ گھر
جس سے سب کام ہوئے دین کے آسان وہ گھر
جس سے پایا ہے مسلمانوں نے قرآن وہ گھر
جس سے حاصل ہوئی ہر نعمتِ رحمان وہ گھر

یوں ہے ضوبار یہ گھر دہر کے کاشانے میں
جیسے اک پھول ہو تنہا کسی ویرانے میں

مدحتِ جنابِ سیدہؑ کے بعد افرادِ خانہ کا ذکر ہے۔ دیکھیے علامہ صاحب کس طرح جنابِ مخدومۂ کونین کے اہلِ خانہ کا تذکرہ کر رہے ہیں۔

باعثِ خلقتِ آفاق ہے زہراؑ کا پدر
مالکِ مرضیِ اللہ ہے اِن کا شوہر
اور سردارِ جوانانِ جناں اِن کے پسر
بیٹیاں زینبؑ و کلثومؑ جو فخرِ مادر

وارثِ چادرِ تطہیر ہیں بعدِ زہراؑ
صافِ زہراؑ کی جو تصویر ہیں بعدِ زہراؑ

پھر چادرِ تطہیر، شادی اور جہیز کے سامان کی تفصیل بیان کی گئی ہے اور یہیں سے ربطِ مصائب علامہ صاحب نے قدیم و جدید انداز اور روایت اور جدت کو جس خوبصورتی اور عمدگی نفاست اور مہارت کے ساتھ اپنے مرثیوں میں سمویا ہے وہ انھیں کا کمالِ فن ہے۔

علامہ صاحب کے تحقیقی مضامین، علمی وادبی وفکری تصانیف اور پُر مغز تقاریر تو ان کی شخصیت کی شناخت اور پہچان ہیں ہی تاہم ان کی لاجواب مرثیہ نگاری اُردو شعری ادب بالخصوص رثائی ادب میں ان کے بلند مرتبے کی نشاندہی کرتی ہے۔ علامہ صاحب کے مرثیے فصاحت و بلاغت، شوکتِ الفاظ، قدیم طرز اور روایات سے متمسک رہتے ہوئے جدید انداز میں نئے نئے موضوعات کو نئے شعری پیکر میں ڈھالنے کے ہنر، زندہ اور متحرک کردار نگاری، واقعات و مناظر کی حسین و دل نشیں منظر نگاری، زبان وبیان پر قدرت، اور موقع ومحل کے لحاظ سے الفاظ وتراکیب کے استادانہ استعمال سے عبارت ہیں، زیرِ نظر مجموعہ کلام ''کلامِ ضمیر'' میں شامل تینوں مرثیے ان خصوصیات سے پوری طرح معمور ہیں، سلام اور نوحے بھی کم وبیش اسی کیفیت کے حامل ہیں۔ بلاشبہ علامہ ضمیر اختر نقوی کا یہ مجموعہ ''کلامِ ضمیر'' اُردو ادب کے شعری سرمایے میں ایک اہم، معتبر اور گراں قدر اضافہ ہے۔

☆ ☆ ☆

پروفیسر سحر انصاری

(شعبۂ اُردو کراچی یونیورسٹی)

''مقامِ شکر ہے کہ ضمیر اختر نقوی صاحب ''ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں میں'' کے ذیل میں آتے ہیں۔

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری

"ماہِ نو" کا انیس نمبر ۱۹۷۲ء

"راقم ضمیر اختر نقوی صاحب کو اس کام کے لئے دل سے ماہر انیسیات تسلیم کرتا ہے"

اکبر حیدری

انیس اور دبیر اردو کے عظیم ترین شاعر ہیں۔ دونوں باکمال مرثیہ کہتے تھے۔ اور اپنے کلام فصاحت بیان سے اردو شاعری کو آبرو اور معراج بخشی۔ دونوں لکھنو کے باشندے تھے لیکن مقام افسوس ہے کہ اہل لکھنو نے دونوں کی بیش بہا ادبی خدمات کو طاق نسیاں پر رکھ دیا۔ انیس کا انتقال ۱۸۷۴ء اور مرزا دبیر کا ۱۸۷۵ء میں ہوا۔ اس طرح دونوں کو مرے ہوئے سو سال سے کچھ اوپر ہی گزرے۔ اس سو سال کے طویل عرصے میں دونوں پر کوئی خاطر خواہ کام نہیں ہوا آجکل جبکہ ملک کے طول و عرض میں بڑی بڑی ہستیوں کے جشن صد سالہ تقریبات بڑی دھوم سے منائی جاری ہیں کس قدر دل خراش بات ہے کہ انیس و دبیر جیسے خدائے سخن شعرا کو خود ان لوگوں اور اداروں نے فراموش کیا جنھوں نے ان کے نام پر ہزاروں روپیہ کمایا ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ اخبار سرفراز لکھنو کے قومی ادارے نے بھی ان کی صد سالہ برسی پر کوئی خصوصی نمبر آج تک شائع نہیں کیا۔ ع "تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو" اگر یہ قومی ادارہ محرم اور رجب نمبر کے بجائے انیس اور دبیر نمبر شائع کرتا تو کم از کم راقم الحروف کو اس وقت شکایت

کرنے کا موقع نہ ملتا۔ ان دونوں خصوصی شماروں کے ذریعہ سے بھی سرفراز کا مدعا پورا ہو جاتا یعنی ان میں بھی آل محمدؐ کے فضائل ومصائب انیسؔ و دبیرؔ کی زبان سے بیان کئے جاتے۔ اتر پردیش اردو اکادمی اور نیا دور لکھنو نے بھی ان بزرگوں کی یاد میں جنہوں نے مرثیہ میں ہندوستانی تہذیب اور معاشرت کو محفوظ کر کے قومی یک جہتی اور وطن دوستی کا نمایاں ثبوت فراہم کیا ہے کوئی توجہ نہیں دی۔ لکھنو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کے صدر مولانا ڈاکٹر شبیہ الحسن نونہروی اور شیعہ ڈگری کالج کے پرنسپل سید شرافت حسین سے ہماری امیدیں وابستہ تھیں لیکن انہوں نے بھی آج تک انیسؔ و دبیرؔ کی صد سالہ یادگار منانے کا کوئی اہتمام نہیں کیا جناب سید مسعود حسن رضوی ادیب کی آخری تمنا یہ تھی کہ انیسؔ کا جشن صد سالہ ان کی زندگی میں ۱۳۹۱ ہجری مطابق ۱۹۷۱ء میں منایا جائے۔ اس زمانہ میں ان کی صحت اطمینان بخش تھی۔ لیکن دہلی سے مرکزی انیسؔ کمیٹی نے ان کے ساتھ اس تجویز پر اتفاق نہیں کیا۔ اور انہیں۔ مطلع کیا کہ دسمبر ۱۹۷۲ء میں انیسؔ کی صد سالہ یادگار منائی جائے۔ اتنے میں مسعود صاحب کی صحت روز بروز جواب دینے لگی اور آخر کار نومبر ۱۹۷۵ء میں ان کا چراغ زندگی ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔ مرحوم نے مرکزی انیسؔ کمیٹی کو بار بار یہ بھی لکھا تھا کہ مراثی انیسؔ جو وہ شائع کرنا چاہتی ہے ان کی صحت مستند نسخوں سے ہونی چاہئے۔ اس سلسلہ میں انہوں نے اپنے مکمل تعاون کی پیش کش بھی کی تھی لیکن مرکزی انیسؔ کمیٹی نے مرحوم کی یہ مخلصانہ پیش کش بھی ٹھکرا دی۔

مرکزی انیسؔ کمیٹی دہلی نے انیسؔ کے نام ہزاروں روپیہ جمع کیا ہے۔ نظام حیدر آباد نے صرف مراثی انیسؔ کی اشاعت کے لئے پچاس ہزار روپیہ کا عطیۂ گراں دیا لیکن کس قدر افسوسناک امر ہے کہ اس کمیٹی نے آج تک میر انیسؔ پر نہ تو کوئی کتاب

شائع کی اور نہ مرثیہ کی کوئی جلد ہی۔ اس کے برعکس جب میں دیکھتا ہوں کہ سرحد پار ملک غیر میں انیسؔ و دبیرؔ کی صد سالہ یادگار پر بڑے بڑے سیمینار منعقد کئے گئے اور کالجوں، یونیورسٹیوں اور چھوٹے بڑے بھی اداروں نے خصوصی نمبر شایان شان طریقے پر شائع کئے تو مجھے اپنی قوم کی غفلت اور بے حسی پر آٹھ آٹھ آنسو رونا آتا ہے۔ بہر حال انہی جذبات کے تحت ذیل میں ماہِ نو کراچی کے شاندار شمارے انیسؔ اور دبیرؔ نمبر پر نقد و تبصرہ پیش کیا جاتا ہے۔

(۱) انیسؔ نمبر۔ سائز ۱۰"×۸" فی صفحہ ۳۰ سطر۔ کاغذ، کتابت و طباعت بہترین، گٹ اپ خوبصورت اور دیدہ زیب، سال اشاعت ۱۹۷۲ء قیمت چار روپے مدیر۔ فضل قدیر، نائب مدیر۔ وصی احمد۔

راقم الحروف کو یہ انیسؔ نمبر لکھنؤ کے ایک شریف النفس اور ادب نواز جناب محمد رشید صاحب سے مطالعہ کے لئے ملا۔ انہوں نے اسے تیس (۳۰) روپے میں خریدا تھا میں رشید صاحب کا بے حد ممنون ہوں کہ مجھے بھی انیسؔ نمبر کی زیارت کا شرف حاصل ہوا اس شمارے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ جناب سید مسعود حسن رضوی مرحوم کی نظر سے بھی گزرا ہے۔ کیونکہ اس میں ان کے ہاتھ کی بعض مفید تحریریں بھی درج ہیں۔

زیر نظر شمارے میں اہل قلم حضرات کی تعداد ۲۲ ہے۔ مشہور حضرات کے اسم گرامی اور مضامین یہ ہیں ۱۔ میر انیسؔ کی سیرت (مسعود حسن رضوی) میر انیسؔ کا تاریخی ماحول اور شخصیت (مرتضیٰ حسین فاضل) خاندان انیسؔ کے باکمال شعرا (ڈاکٹر ذوالفقار حسین) انیسؔ کا غم (ڈاکٹر سید عبداللہ) میر انیسؔ کی منظر نگاری (ناظر حسین زیدی) میر انیسؔ اور صبح عاشور (ڈاکٹر وزیر آغا) میر انیسؔ کی ڈرامہ نگاری (شان الحق حقی) میر انیسؔ کی رباعیات (ڈاکٹر فرمان فتحپوری) انیسؔ اور اقبال (وقار عظیم)

انیس۔ایک مصلح (فضل قدیر) دیگر مضامین کی فہرست یہ ہے:۔

اجداد انیس (سید یوسف حسین) میر انیس کی اخلاقیات (انور سدید) کچھ اردو مرثیے کے بارے میں (سجاد باقر رضوی) جدید مرثیہ اور میراث انیس (رضا کاظمی) میر انیس اور دنیا کے رزم نگار (امیر امام حر) انیس کی رزمیہ شاعری (حسنین کاظمی) میر انیس ایک عظیم شاعر (ڈاکٹر سلیمان پاشا) کلام انیس کی اشاعتوں میں غلطیاں (سید یوسف حسین) انیس مرثیہ اور سلام (زاہد فارانی) ضمیر اختر نقوی کے یہ دو مقالے (۱) میر انیس کے حالات زندگی (۲) کلید گنجینۂ انیس۔

ابتدائیہ کے بعد صفحہ ۸ اور صفحہ ۹ میں میر انیس کے ایک مشہور مرثیہ کے چند بند ہیں۔ جس کا مطلع یہ ہے۔ع "یارب چمن نظم کو گلزار ارم کر" اور مرزا دبیر کے قطعۂ تاریخ ع طور سینا بے کلیم اللہ و منبر بے انیس" کا انتخاب درج ہے۔ صفحہ ۱۰ پر میر انیس کے ہاتھ کی لکھی ہوئی اس رباعی کا عکس چھپا ہے۔ میر انیس اس رباعی میں غالب کے انتقال پر اس طرح خراج تحسین پیش کرتے ہیں۔

گلزار جہاں سے باغ جنت میں گئے   مرحوم ہوئے جوار رحمت میں گئے
مداح علی کا مرتبہ اعلا ہے   غالب اسداللہ کی خدمت میں گئے

رباعی کے پہلو میں اسی صفحہ پر میر انیس کے مرثیہ کا عکس بھی ہے۔ اس میں چار بند ہیں اور پہلا بند اس مصرع سے شروع ہوتا ہے۔

وجہ آرائش گلدستۂ مضموں میں ہوں

صفحہ ۱۱ سے صفحہ ۱۶ تک "ثنا خواں تیرے" کے عنوان سے میر انیس کے نام اکابر اہل قلم کا خراج عقیدت درج ہے۔ اس صفحہ پر مرزا غالب کا فوٹو بھی ہے۔ اس کے ساتھ یادگار غالب، واقعات انیس اور "نقوش" لاہور مطبوعہ ۱۹۶۹ء دسمبر کے حوالے سے

ذیل کی عبارت درج ہے۔

"مرزا غالب۔ اردو زبان نے انیس اور دبیر سے بہتر مرثیہ گو نہیں پیدا کئے ایسے مرثیہ گو نہ ہوئے ہیں اور نہ آئندہ ہوں گے اور جس میں انیس کا مرتبہ نہایت بلند ہے"۔

غالب کے علاوہ جن لوگوں نے میر انیس کو خراج عقیدت پیش کیا ہے ان کی تصاویر بھی درج ہیں اور ان کے نام یہ ہیں۔ شاد عظیم آبادی، شرر لکھنوی، آزاد دہلوی، حالی، شبلی، چکبست لکھنوی، ڈپٹی نذیر احمد اور امداد امام اثر۔ صفحہ ۲۴ اور صفحہ ۲۵ کے درمیان کئی تصویریں ہیں پہلی تصویر میر انیس کے والد میر خلیق کی بتائی گئی ہے۔ تصویر کے صفحہ کی پشت پر دو تصویریں ہیں (۱) میر انیس کے مجھلے بھائی میر انس اور مجھلے بھائی میر مونس کی۔

جناب مسعود حسن رضوی نے ان تینوں تصویروں کی تردید کی ہے۔ جو تصویر میر انس کی دکھائی گئی ہے وہ دراصل میر مونس کی ہے اسی طرح میر مونس کی جو تصویر ہے وہ اصل میں میر انس کی ہے۔ مسعود صاحب نے میر خلیق کی تصویر پر اپنے دستخط سے لکھا ہے کہ "یہ تصویر میر خلیق کی نہیں ہے"۔ برادران انیس کے بعد ایک پورے صفحہ پر میر خورشید علی نفیس انیس کے بڑے صاحبزادے کی تصویر ہے۔ اس کے دوسری طرف میر انیس کے پڑپوتے لڈن صاحب فائز، انیس کے پوتے دولہا صاحب عروج، میر عارف کے صاحبزادے بابو صاحب فائق، انیس کے نواسے پیارے صاحب رشید اور میر نفیس کے نواسے میر عارف کی تصویریں ہیں۔ صفحہ ۳۰ اور ۳۱ کے درمیان ایک اور تصویر ہے۔ اس میں میر انیس مجلس پڑھ رہے ہیں تصویر کے نیچے یہ عبارت درج ہے:۔

"محل شاہی میں میر انیس مجلس پڑھ رہے ہیں۔ ان کی تکریم کے لئے تاجدار اودھ واجد علی شاہ مورچھل لئے بازو میں استادہ ہیں"

یہ اسی تصویر کا عکس ہے جو جناب مسعود حسن رضوی صاحب نے روح انیس میں پہلی مرتبہ شائع کی تھی۔ تصویر کے نیچے تاجداران اودھ امجد علی شاہ اور واجد علی شاہ جان عالم کی تصویریں بھی ہیں۔ اس کے دوسری طرف میر حسنؔ اور میر ضاحک کی وہ تصویریں ہیں جو چند سال پہلے مسعود حسن رضوی ادیب مرحوم نے ماہنامہ 'آجکل' دہلی مطبوعہ ۱۹۶۵ میں کلیات میر حسن کے مقالے کے ساتھ شائع کی تھیں۔ صفحہ ۱۸۸ اور ۸۹ کے درمیان ایک اور تصویر درج ہے۔ یہ میر انیسؔ کی بتائی جاتی ہے اس کے نیچے یہ عبارت درج ہے:-

''تصویر میر انیسؔ ۱۸۴۳''

''یہ تصویر مرزا عباس علی بیگ صاحب ساکن ٹنڈو آغا حیدر آباد سندھ کے ذاتی البم سے ملی ہے۔ مرزا عباس علی بیگ صاحب کے پردادا مرزا فتح علی بیگ میر حسن علی خان والی سندھ کے درباری مرثیہ گو تھے یہ تصویر میر حسن علی خان نے مرزا فتح علی بیگ کو دی تھی۔ جو ان کے اخلاف میں محفوظ رہی۔ عباس علی بیگ کا اصرار ہے کہ یہ تصویر میر انیسؔ کی ہے'' جناب سید مسعود حسن رضوی صاحب کو میر انیسؔ کی اس تصویر سے بھی انکار ہے۔ انہوں نے تصویر کے نیچے اپنے دستخط سے لکھا ہے کہ ''یہ تصویر ہرگز میر انیسؔ کی نہیں ہے'' اس کے علاوہ میر انیسؔ کے نو تعمیر مقبرہ، مکان واقع سبزی منڈی لکھنؤ اور تعمیر مقبرہ سے قبل مقبرۂ انیسؔ کی تصویریں ہیں۔

جناب فضل قدیر صاحب مدیر ماہِ نو نے صفحہ ۶ میں ذیل کے دو شعر میر خلیقؔ کے نام منسوب کئے ہیں۔ مزید وہ فرماتے ہیں کہ ''میر خلیقؔ کے لب و لہجہ میں ایک خاص گھلاوٹ تھی جو ان کے دہلوی اجداد کا ورثہ تھی۔ نمونہ ملاحظہ ہو۔

مرتا ہے باپ اے علی اکبرؑ ابھی نہ جا   دل مانتا نہیں مرے دلبر ابھی نہ جا

اے لال اُسوئے نیزہ و خنجر ابھی نہ جا　　ہے ہے نہ جا شبیہ پیمبرؐ ابھی نہ جا

یہ مرثیہ میر خلیق کا نہیں بلکہ میر انیسؔ کا ہے۔ شبلی نے بھی اسے موازنۂ انیسؔ و دبیر میں خلیق کی طرف منسوب کیا ہے۔ تفصیل کے لئے راقم کی کتاب "اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا" ملاحظہ ہو۔ جناب فضل قدیر صاحب اپنے مقالہ "انیسؔ ۔ایک مصلح (انیسؔ نمبر صفحہ ۲۱۲) میں لکھتے ہیں کہ

"خوشامد اور درباداری کا جو ماحول لکھنؤ میں پیدا ہو گیا تھا انیسؔ کو اس سے شدید نفرت تھی وہ خود کو دربار حسینؑ کا شاعر سمجھتے تھے اور کسی دوسرے دربار سے وابستگی ان کی نظر میں ہیچ تھی۔ اس سلسلے میں ایک اہم واقعہ خالی از دلچسپی نہیں۔ آخری تاجدار اودھ واجد علی شاہ نے ایک بار امام باڑہ سبطین آباد کی ایک مجلس میں انیسؔ و دبیرؔ دونوں کو مجلس میں پڑھنے کی دعوت دی۔ دبیرؔ نے مرثیہ سے پہلے بادشاہ کی تعریف میں ایک رباعی پڑھی انیسؔ کو یہ روش شاق گزری۔ ان کی باری آئی تو انہوں نے سلام میں یہ کہہ کر اس روش کی مذمت کی۔

غیر کی مدح کروں شاہ کا ثنا خواں ہو کر
مجرئی اپنی ہوا کھوؤں سلیماں ہو کر"

یہ بے بنیاد واقعہ سب سے پہلے حیات انیسؔ اور واقعات انیسؔ کے مولفین نے گڑھ لیا یہ کہیں ثابت نہیں ہوتا ہے کہ انیسؔ اور دبیرؔ نے یکے بعد دیگرے بادشاہ واجد علی شاہ یا کسی اور کی مجلس میں کبھی پڑھا ہو۔ سلام کا یہ شعر دراصل میر مونس کا ہے نہ کہ انیسؔ کا۔ ذیل میں سلام کا مطلع حسن مطلع اور مقطع پیش کیا جاتا ہے۔

مطلع

مجرئی بہتے ہیں آنسو در غلطاں ہو کر　　آبرو پائی ہے کیا چشم نے گریاں ہو کر

غیر کی مدح کریں شہ کے ثنا خواں ہوکر | بھری اپنا حشم کھوئیں سلیماں ہوکر

مقطع

رہبری کی جو مقدر نے تو ہم اے مونس | روضۂ شاہ پہ جائینگے خراساں ہوکر

سلام میں ۳۸ شعر ہیں تفصیلات کے لئے راقم کی کتاب تحقیق نوادر ملاحظہ فرمایئے۔

میر انیس کی تصویر مجلس پڑھتے ہوئے جو ہے، در اصل یہ امام باڑہ جتولی بیگم صاحب کا تھا۔ موصوفہ نواب سالار جنگ برادر بہو بیگم صاحب کے خاندان سے تھیں۔ نواب خادم حسین خان عرف نواب جتولی بیگم کے نواسے اور نواب امین الدولہ کے پڑپوتے تھے راقم الحروف نے اس امام باڑہ کے بارے میں پیارے نواب صاحب برادر زادہ نواب سے دو سال پہلے مرزا علی خان کے احاطہ (مفتی گنج) میں دریافت کیا تھا پیارے نواب صاحب امام باڑہ جتولی بیگم کے حصہ دار تھے۔ اب ان کا انتقال سال گزشتہ ہوگیا۔ اس وقت اس میں پیارے نواب صاحب کی بہن عرف بیوی جانی رہتی ہیں اور پورا امام باڑہ انہی کی ملکیت میں ہے۔ داروغہ محمد خان جتولی بیگم کے منتظم تھے۔ بعض ناواقف لوگ اسے غلطی سے امام باڑہ داروغہ محمد خان کہتے ہیں۔ اس مجلس اور امام باڑہ کی قلمی تصویر راقم نے جناب مہاراجکمار صاحب کے پاس محمود آباد ہاؤس قیصر باغ میں دیکھی۔ اور اس کا عکس امیر الدولہ راجا امیر حسن خان والی محمود آباد کی بنا کردہ امیر الدولہ پبلک لائبریری قیصر باغ لکھنؤ میں محفوظ ہے۔ اس پر ۱۲۷۲ ہجری (مطابق ۱۸۵۵ء) کی تاریخ بھی درج ہے۔ پیارے نواب صاحب نے راقم الحروف سے یہ بھی کہا تھا کہ ان کے پاس ایک مجلس کی قلمی تصویر تھی جس میں میر انیس مجلس پڑھ رہے تھے اب وہ تصویر راجہ صاحب محمود آباد کے پاس محفوظ ہے۔

یہ بات قابل ذکر ہے کہ لکھنؤ میں واجد علی شاہ سلطان عالم کا امام باڑہ "قصر العزا" کے نام سے قیصر باغ میں اب تک موجود ہے۔ لکھنؤ کے لوگ اس سے نابلد ہیں۔ "قصر العزا" وہ امام باڑہ ہے جو آجکل "بارہ دری" کے نام سے مشہور ہے اور جہاں شادیوں اور پارٹیوں کی تقریبات کے سلسلے میں روز چراغاں ہوتا ہے۔ یہ امام باڑہ ۱۲۷۰ ہجری مطابق ۱۸۵۳ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔ تاریخ دیوان مہدی علی خان قبولؔ مطبوعہ ۱۲۷۲ ہجری مطابق ۱۸۵۵ء مطبع سلطانی لکھنؤ میں درج ہے۔ ذیل میں دو شعر پیش کیے جاتے ہیں۔

شروع امسال کرد شاہ ہندستاں عزاداری	بہ قیصر باغ در قصر العزا از نیت خالص
کند تا یک صدوی سال ایں سلطاں عزاداری	دعا لایہ قبولؔ ایں مصرع تاریخ ہاتف گفت

مزید تفصیلات کے لئے راقم کا تحقیقی مقالہ "اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا" ملاحظہ ہو۔ واجد علی شاہ نے دوسرا امام باڑہ سبطین آباد کے نام سے مٹیا برج کلکتہ میں بنایا۔ لکھنؤ میں امجد علی شاہ نے حضرت گنج میں اپنے امام باڑہ کے لئے دس (۱۰) لاکھ روپے مخصوص کئے تھے۔ جو بعد میں سبطین آباد کے نام سے مشہور ہوا۔ یہ امام باڑہ انہوں نے عوام کے لئے بنوایا تھا۔ بادشاہ بھی اسی میں دفن ہیں۔ قوم کے ہاتھوں جو ناقابل بیان توہین اس امام باڑے اور امجد علی شاہ بادشاہ کی ہوئی وہ اس بات سے ظاہر ہے کہ اب نہ تو کوئی امام باڑہ دیکھ سکتا ہے اور نہ بادشاہ کی قبر ہی۔

زیر نظر انیس نمبر صفحہ ۱۱ پر مرزا غالبؔ کی تصویر کے ساتھ جو عبارت مرزا غالبؔ سے منسوب ہے وہ بھی غلط ہے۔ اس بات کی کوئی ٹھوس شہادت نہیں ملتی ہے کہ غالبؔ نے مرثیہ گوئی میں انیسؔ کی تعریف کی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ غالبؔ نے مرثیہ کے فن میں مرزا دبیرؔ کی تعریف کی تھی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

"یہ حصہ دبیر کا ہے اور وہ مرثیہ گوئی میں فوق لے گیا۔ ہم سے آگے نہ چلا۔ نا تمام رہ گیا" غالب نے یہ اس وقت کہا تھا جبکہ ۶ محرم ۱۲۷۷ ہجری مطابق اگست ۱۸۶۰ء کو انہوں نے اپنے مکان واقع بلی ماران دہلی میں مجلس عزا میں اپنے مرثیہ کے تین بند پڑھے تھے۔ لوگ یہ بند سن کر روئے اور پیٹے اور پھر مرثیہ کے یہ تین بند انہوں نے اپنے دست خاص سے لکھ کر محمد ریاض الدین امجد تخلص ریاض کو دے دیئے تھے تفصیل کے لئے "سرور ریاض" مطبوعہ ۱۲۷۷ھ مطابق ۱۸۶۰ء مطبع حیدری آگرہ ملاحظہ ہو۔ اس کا ایک نسخہ لکھنؤ یونیورسٹی کے کتاب خانے میں محفوظ ہے۔

انیس نمبر میں بھی مضامین بڑی محنت اور عرق ریزی سے لکھے گئے ہیں اور یہ خصوصی شمارہ انیسیات کے لئے بے حد کارآمد ہے۔ اس سے انیس کے بارے میں بعض ایسے گوشے نمایاں ہوئے ہیں جن پر آج تک پردہ پڑا ہوا تھا۔ راقم کی رائے میں ضمیر اختر نقوی صاحب کے زور قلم اور ذوق جستجو نے اس شمارے کو پائندگی اور تابندگی بخشی ہے۔ اس میں ان کے دو معرکہ آرا تحقیقی مقالے ہیں (۱) میر انیس کے حالات زندگی اور (۲) کلید گنجینۂ انیس۔ پہلے مقالے کے بارے میں ادارہ نے جو نوٹ لکھا ہے راقم کو اس سے اتفاق ہے۔ ذیل میں یہ نوٹ درج کیا جاتا ہے:-

"ضمیر اختر صاحب نے یہ مضمون میر انیس کی حیات پر موجودہ تمام کتب و مضامین سے استفادہ کے بعد تحریر کیا ہے۔ یہ اتنا جامع مضمون ہے کہ اس سے پہلے انیس کی حیات و شخصیت پر شاید ہی کسی نے ایسا مضمون لکھا ہو"۔

اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ مضمون نگار نے یہ مقالہ تحقیق و جستجو اور دیدہ ریزی سے سپرد قلم کیا ہے۔ یہ مقالہ انیس کے سوانح حیات کے لئے سنگ میل کا کام دے گا۔ اس کی تیاری میں حسب ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔

یادگار انیسؔ، واقعات انیسؔ، حیات انیسؔ، روح انیسؔ، میر انیس مغفور نوبت روئے نظر مطبوعہ زمانہ کانپور فروری ۱۹۰۷ء، فکر بلیغ شاد عظیم آبادی، مشاطۂ سخن صفدر مرزا پوری، رد واقعات انیسؔ سردار مرزا، یادگار غالب، انیسؔ کی مرثیہ نگاری اثر لکھنوی، آب حیات، تجلیات عزیز لکھنوی تاریخ تاج الخواتین میر محمد رضا رضی، تاریخ مرثیہ سید سفارش حسین نقوش لاہور غالب نمبر مطبوعہ اپریل ۱۹۶۹ء، حیات دبیرؔ ثابت لکھنوی۔

فاضل مقالہ نگار نے صفحہ ۳۹ میں میر انیسؔ کے دو اساتذہ میر نجف علی فیض آبادی اور مولوی حیدر علی کا ذکر کیا ہے۔ موخر الذکر کے بارے میں فرماتے ہیں کہ مولوی حیدر علی کی ایک تصنیف "منتہی الکلام" نہایت مشہور ہے"۔ راقم کو مولوی حیدر علی کی استادی مشکوک نظر آتی ہے۔ اس نام کے دو علما تذکروں میں درج ہیں۔ ایک فیض آباد اور دوسرے لکھنو کے۔ یہ دونوں مولوی صاحبان عمر میں میر انیسؔ سے چھوٹے تھے۔ لہٰذا ان میں سے کسی ایک کے استاد ہونے کا امکان ہی نہیں ہو سکتا۔ اول الذکر نے میر انیسؔ کے عقاید کے خلاف کئی کتابیں لکھیں۔ ان میں "منتہی الکلام" بھی شامل ہے اور یہ شیعہ مذہب کی رد میں لکھی گئی۔ رشک لکھنوی نے ایک مثنوی بغیر نام کے لکھی۔ اور یہ مثنوی بے نام ۱۲۶۱ ہجری مطابق ۱۸۴۵ء میں مطبع احمدی لکھنو میں چھپی۔ اس میں مولوی حیدر علی فیض آبادی صاحب "منتہی الکلام" کی ہجو کی گئی۔ ایک شعر پیش کیا جاتا ہے۔

ایک فیض آباد کا حیدر علی وہ خفی مردود ہے مرتد جلی

آزاد اور دیگر لوگوں نے اسی مولوی صاحب کو میر انیسؔ کا استاد قرار دیا ہے۔

دوسرے مولوی حیدر علی صاحب کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ لکھنؤ کے عالم جید تھے۔ اور ان کے نام سے ایک مسجد محلہ کٹرہ حیدر حسین خان میں اب تک موجود

ہے۔ راقم نے اس مسجد کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ معلوم ہوا کہ اس نام کی مسجد لکھنؤ میں کوئی نہیں ہے۔ مولوی نجف علی فیض آبادی کشمیری تھے۔

"ماہ نو" کا انیس نمبر نہ صرف انیسیات کے لئے کارآمد ہے بلکہ اردو تنقیدی ادب میں ایک گراں قدر اضافہ ہے انیس نمبر میں ضمیر اختر نقوی صاحب کا بیش بہا مقالہ "کلید گنجینۂ انیس" قابل توجہ ہے۔ یہ مقالہ صفحہ ۲۲۶ سے شروع ہو کر صفحہ ۳۰۴ پر ختم ہوتا ہے اور آٹھ چھوٹے چھوٹے عنوانات پر مشتمل ہے۔ ہر عنوان کی تفصیل درج ذیل ہے۔

(۱) مرثیہ گوئی کا ادواری ارتقا (اشاریہ مرثیہ گویان)

اس میں قطب شاہی دور سے موجودہ زمانے تک کوئی ۳۲۳ شعرا کے نام درج کئے گئے ہیں۔ پہلا نام سلطان قلی قطب شاہ اور آخری نام امیر امام ثر کا ہے جو پاکستان میں بقید حیات ہیں۔ عنوان کی تمہید میں ضمیر اختر صاحب فرماتے ہیں:۔

"سولھویں صدی سے بیسویں صدی تک تقریباً ۵۰۰ مرثیہ گو شعراً کا کلام اور حالات آسانی سے مل جاتے ہیں۔ میرے مختصر سے کتب خانے میں ۳۲۳ مرثیہ گو شعراً کا کلام اور سوانح حیات موجود ہے۔ ان مرثیہ گو شعراً کے اسماء مع زمانہ ملاحظہ ہوں۔ ۵۰۰ سالہ تاریخ میں "انیس" صرف ایک ہے۔ ایسی ہزاروں صدیاں گزرتی جائیں گی لیکن اپنی عظمتوں کو لئے ہوئے "انیس" ہمیشہ ایک ہی رہے گا۔ ہومر بھی ایک ہی گزرا ہے۔ ورجل بھی کوئی دوسرا نہیں فردوسی بھی تنہا ہے۔ اسی طرح انیس بھی دوسرا نہیں بن سکتا"۔

(۲) صریر کلک

اس عنوان کے تحت انیس کی زندگی، شخصیت اور فن و کلام پر جو اہم اور قابل قدر کتابیں ۱۸۷۴ء سے ۱۹۷۱ء تک لکھی گئی ہیں درج ہیں۔ ان کتابوں کی وجہ تصنیف

بھی بیان کی گئی ہے۔ ان کتابوں نے اردو تنقیدی ادب کو مالا مال کیا ہے۔

(۳) کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں

اس حصے میں تذکرے، تنقیدیں، تبصرے و دیگر ادبی کتابیں جن سے میر انیس کے حالات و کلام پر کام کرنے والوں کو بہت کچھ مل سکتا ہے درج ہیں۔ ضمیر اختر نقوی صاحب نے کتاب اور مصنف کا نام سال تصنیف اور تذکرۂ انیس کے تحت ہر کتاب کا مختصر خلاصہ بھی درج کیا ہے۔ مطبوعہ کتابوں کی تعداد ۵۶ ہے۔ ان کے علاوہ تین قلمی نسخوں سے بھی استفادہ کیا گیا ہے ان کے نام یہ ہیں (۱) خاندان انیس (سید محمد عباس)، (۲) چشمۂ کوثر (تذکرہ مرثیہ گویاں) صفیر بلگرامی (۳) مرثیہ کا ماضی اور حال ڈاکٹر صفدر حسین۔

(۴) گلہائے مضامین

اس عنوان کے تحت ۱۹۰۶ء سے ۱۹۷۱ء تک جو مطبوعہ مضامین انیس سے متعلق ضمیر اختر نقوی صاحب کو دستیاب ہوئے ہیں ان کے عنوانات، مضمون نگار کا نام، رسائل کا نام مقام اشاعت، شمارہ اور سنین درج کئے گئے ہیں مضامین کی تعداد ۱۰۶ ہے۔ پہلا مضمون فروری ۱۹۰۶ء میں مخزن لاہور میں "احسن لکھنوی کے نام خطوط بسلسلۂ واقعات انیس" شائع ہوا تھا۔ مضمون نگار پیارے صاحب رشید اور میر علی محمد عارف ہیں۔ آخری مضمون "میر ببر علی انیس" ریاست حسین بدایونی پروفیسر سندھ مسلم کالج پاکستان کا ہے اور یہ "نئی روشنی" کراچی میں ۱۶ ستمبر ۱۹۷۱ء کو شائع ہوا۔

(۵) اشاریہ مراثی انیس

یہ حصہ مضمون بڑا تحقیق اور پر از معلومات ہے۔ اس میں ضمیر اختر صاحب نے

میر انیسؔ کے جملہ مطبوعہ مراثی کے مطلع، موضوع، بحر، تعداد بند، کیفیت (یعنی یہ مرثیہ کہاں ملے گا) کا نقشہ بڑی محنت سے مرتب کیا ہے۔ موصوف نے مراثی انیس کے مختلف مجموعوں کی نشان دہی بھی کی ہے۔ اور ۶۷۱ مراثی کی فہرست مرتب کی ہے۔

ضمیر اختر صاحب نے جو اشاریہ انیسؔ نمبر میں مرتب کیا ہے اُسے میں ایک کارنامہ سمجھتا ہوں۔ اشاریہ دیکھنے کی ترکیب کے لئے ضمیر اختر صاحب کہتے ہیں:-

''انیسؔ کے کل مطبوعہ مرثیوں کے مصرعہ اولیٰ ایک جگہ حروف تہجی کے حساب سے جمع کئے جا رہے ہیں ''الف'' سے شروع ہونے والے مرثیے سب ایک جگہ ہیں اور اس کے بعد ''ب، پ، ت'' وغیرہ سے اس طرح ''ی'' تک ۱۸۰ مرثیوں کے پہلے مصرع دیکھتے جائیے صرف ایک غیر مطبوعہ مرثیہ کا پہلا مصرعہ ۱۲۸ نمبر پر ملے گا۔ مصرعہ اولیٰ کے سامنے موضوع لکھ دیا گیا ہے۔ اس کے بعد مرثیہ کی بحر لکھی گئی ہے۔ مرثیہ میں تعداد بند بتانے کے لئے ہر مرثیہ کے بندوں کی تعداد ''بحر'' کے بعد لکھی ہوئی ملے گی۔ پانچویں کالم میں تعداد اشعار درج ہے اس کے بعد حوالہ جات درج ہیں۔ غلام علی اینڈ سنز (۱۹۶۷ء) بک لینڈ کراچی (۱۹۶۱ء) دبدبۂ احمدی (۱۹۰۴ء)

ان جلدوں کو خاص کر مدنظر رکھا گیا ہے۔ جلد کا نمبر اور صفحے کا نمبر ہر مصرعہ کے آگے یکے بعد دیگرے درج ہے۔ تاکہ مرثیہ تلاش کرنے میں سہولت ہو جائے۔ مثال کے لئے ملاحظہ ہو۔ اشاریہ کا پہلا مصرعہ ہے۔

آمد ہے جگر بند شہ قلعہ شکن کی

اس مصرع کا موضوع ''جنگ و شہادت جناب عباس'' ہے یہ مرثیہ بحر ''ہزج'' میں ہے۔ اس مرثیہ میں ۱۵۱ بند ہیں۔ پورے مرثیے میں ۱۳۵۳ اشعار ہیں۔ یہ مرثیہ غلام علی اینڈ سنز کی جلد اول صفحہ ۹۷ پر ملے گا۔ نظامی پریس بدایون کی جلد دوم صفحہ ۲۸ پر

ملے گا نول کشور کی جلدوں میں یہ مرثیہ نہیں ہے۔ اس لئے کالم خالی ہے۔ پورے اشاریہ میں نو کالم ہیں اسلئے ہر ایک عنوانات پر مختصر تبصرہ بھی ضروری ہے"

(۶) اشاریہ رباعیات

اس کے بارے میں ضمیر اختر نقوی کہتے ہیں کہ

"انیس کی ۵۵۳ مطبوعہ رباعیات کے مصرعہ اولیٰ کا اشاریہ ملاحظہ فرمایئے۔ جس رباعی کی تلاش ہو حروف تہجی کے حساب سے "الف" سے "ے" تک مصرعہ اولیٰ کا پہلا حرف دیکھ کر مصرعہ تلاش کر سکتے ہیں مصرعہ کے آگے ہی موضوع رباعی تحریر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد وہ رباعی کہاں ملے گی حوالہ جات درج ہیں۔ اشاریہ میں جن کتابوں سے مدد لی گئی ہے وہ درج کی جا رہی ہیں۔ انیس کی سب رباعیاں ان مجموعوں میں مل سکتی ہیں" اس کے بعد آٹھ کتابوں کی تفصیل درج کی گئی ہے۔

(۷) اشاریہ سلام

اس عنوان کے تحت ابتدا میں سلام پر ایک مختصر مگر جامع مضمون درج ہے پھر مراثی کی طرح ہر سلام کا مصرع اولیٰ جو جس حرف سے شروع ہوتا ہے ے تک درج کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ، بحر کا نام سلام کے اشعار کی تعداد سلام جس جلد میں چھپا ہے اس کا نام اور پریس کا نام بھی دیا گیا ہے۔ اشاریہ سے معلوم ہوتا ہے کہ میر انیس کے مطبوعہ سلام کی تعداد ۷۹ ہے۔

(۸) اشاریہ نوحہ جات

اس حصہ عنوان میں ۱۳ نوحوں کی تفصیل درج ہے۔

راقم الحروف مضمون نگار جناب ضمیر اختر نقوی کو اشاریہ مراثی انیس مرتب کرنے

لئے مبارکباد پیش کرتا ہے کہ انہوں نے تن واحد وہ صبر آزما اور مشکل کام نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیا ہے جو ایک ادارہ سے بھی اتنے کم وقت میں نہیں ہو سکتا۔ راقم ضمیر اختر نقوی صاحب کو اس کام کے لئے دل سے ماہر اقبالیات تسلیم کرتا ہے۔

اجلال حیدر زیدی

محترم علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب...... السلام علیکم!

مجھے یقین ہے کہ آپ ولایت علیؑ کے دل سے قائل ہیں جس کا ثبوت آپ کی مجالس سے عیاں ہیں۔ آپ کی گذشتہ ۸ مجالس سماعت کیں بے شک آپ نے ہماری استطاعت سے زیادہ مولا علیؑ کی مدح فرمائی اور آپ کی سب باتوں سے زیادہ ایک بات نے بہت متاثر کیا کہ علیؑ کی ولایت کو زبردستی کسی سے نہیں منوایا جا سکتا۔ بس صرف پیغام رسائی کرنی ہے جس طرح کہ رسولؐ اللہ کو حکم تھا کہ اے رسولؐ گر علیؑ کی ولایت کا پیغام نہ دیا تو گویا رسالت کا کوئی امور انجام نہیں دیا۔ مولانا آپ کی ۷ ویں مجلس تو ساری مجلسوں کا نچوڑ تھی اس میں کوئی شک نہیں آپ نے اتنی خوبصورتی سے ولایت علیؑ کے موضوع کو تمام کیا جس کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔ ہم اس بات پر کامل یقین رکھتے ہیں کہ آپ مولا علیؑ کی ولایت کے نہ صرف اذان اور اقامت میں قائل ہیں بلکہ آپ نماز میں بھی شہادت ثالثہ کے حد درجہ قائل ہیں۔ مولانا آپ سے صرف ہم ایک درخواست کرتے ہیں کہ جس طرح رسولؐ اللہ نے حضرت علیؑ کی ولایت کا اعلان کیا اور پیغام کل انسانیت کو پہنچایا تو آپ بھی قوم شیعہ کو پیغام پہنچا دیں کہ شہادت ثالثہ واجب ہے کہ جہاں آپ دو گواہیاں دیتے ہیں وہاں تیسری گواہی اور مولا کے ابیٹوں کی ولایت کا اقرار واجب ہے۔ ہم امید کرتے ہیں جس طرح کہ آپ ایک بے باک خطیب ہیں آپ لوگوں کی ناراضگی کا بالکل خیال نہیں کریں گے جیسا کہ رسولؐ اللہ نے اعلان ولایت میں کوئی خیانت نہیں کی آپ بھی سنت رسولؐ پر عمل پیرا ہوں گے۔ بی بی سلام اللہ علیہا آپ کو اپنی حفظ و امان میں رکھیں اور قیامت کے دن سرخرو ہوں گے۔ والسلام...... اجلال حیدر زیدی، وقار حیدر نقوی

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری:

”ماہِ نو“ کا دبیر نمبر ۱۹۷۵ء

ضمیر اختر نقوی نے مرزا دبیر کی زندگی کے بعض تاریک پہلوؤں کو مستند حوالوں سے اجاگر کیا ہے۔ اکبر حیدری

پاکستان کے طول و عرض میں میر انیس کی طرح مرزا دبیر کی صد سالہ برسی بھی ۱۹۷۵ء میں بڑے جوش و خروش اور خلوص و عقیدت کے ساتھ منائی گئی۔ اس سلسلے میں بڑے بڑے جلسے، سیمنار اور محفلیں منعقد ہوئیں، جن میں مرزا دبیر کی حیات اور فن پر مقالے پڑھے گئے۔ ملک بھر میں دبیر نمبر کے خصوصی شمارے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کئے گئے۔ ماہِ نو کراچی کا دبیر نمبر خاصی توجہ کا حامل ہے۔ ذیل میں اس شمارے پر نقد و تبصرہ حاضر ہے:۔

سائز۔ ۱۳"×۹"، فی صفحہ ۲۷ سطر، کتابت و طباعت عمدہ اور نفیس، کاغذ۔ درجہ اوّل، گٹ اپ۔ شاندار اور خوبصورت، صفحات ۲۱۲، مدیر اعلیٰ۔ بیگم عشرت برکی، مدیر۔ فضل قدیر، نائب مدیر۔ سید علی محمد حسینی، سال اشاعت۔ ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۵ء، قیمت ۵ روپے۔

زیر نظر شمارہ اردو مرثیہ گوئی کی تاریخ میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ ادارہ ماہِ نو کراچی قابل مبارک باد ہے کہ اس نے زر کثیر صرف کر کے اردو کے اس شاعر اعظم کی صد سالہ

برسی کا نمبر شاندار طریقے سے شائع کر کے قابل قدر کام کیا ہے۔ اس میں کئی یادگار تصویریں اور تاریخی دستاویز کے عکس بھی شائع کئے گئے ہیں۔ دبیر نمبر کے شمارے میں حسب ذیل مضامین ہیں:۔

(۱) مرزا دبیر کی زندگی (ضمیر اختر نقوی)، (۲) مرزا دبیر کے کچھ خاندانی حالات (مرزا علی اظہر برلاس لکھنوی)، (۳) نوادر مرزا دبیرؔ (سید مرتضیٰ حسین فاضل)، (۴) مرزا دبیر۔ اخلاقی پہلو (ڈاکٹر مظفر حسن ملک)، (۵) خصوصیات و اولیات مرزا دبیرؔ (ضیاء الحسن موسوی)، (۶) ایوان شاعری میں دبدبۂ دبیرؔ (سیّد ہاشم رضا)، (۷) مرزا دبیر سیتاپور میں (نادم سیتاپوری)، (۸) کلام دبیرؔ سے شخصیت دبیر کی چند جھلکیاں (علی محمد حسینی)، (۹) مرزا دبیر از سر نو مطالعہ کرنے کی ضرورت (پروفیسر کرار حسین)، (۱۰) رباعیات مرزا دبیرؔ (پروفیسر سید وقار عظیم)، (۱۱) دبیرؔ کی فنی عظمت (ڈاکٹر ناظر حسن زیدی)، (۱۲) مرزا دبیر کا منفرد ادراک (ڈاکٹر محمد احسن فاروقی)، (۱۳) دبیرؔ کی تمثالیں اور تصویریں (ڈاکٹر اسد اریبؔ)، (۱۴) مرزا دبیر کی شاعری (ڈاکٹر صفدر حسین)، (۱۵) مرزا دبیرؔ اور کتاب "المیزان" (رضا علی عابدی)، (۱۶) دبیرؔ کا فن عربی ادب کے آئینے میں (محمد ناصر قاسمی)، (۱۷) مقام دبیرؔ (پروفیسر صفی حیدر دانش) (۱۸) جدید مرثیے کی ترقی۔ مرزا اوجؔ (پروفیسر محمد رضا کاظمی)

ان مضامین کے علاوہ دبیرؔ کے کلام کا انتخاب، بجیرؔ لکھنوی کا انیس و دبیر کے بارے میں خراج تحسین، اوجؔ لکھنوی، شاد عظیم آبادی، نیساںؔ اکبر آبادی، عون محمد رضوی، بہترؔ لکھنوی اور شیخ وحیدؔ کی مرزا دبیرؔ کے فن کی تعریف میں چند مختصر نظمیں بھی ہیں۔ ان نظموں کے ساتھ ملکہ زمانی کے دو غیر مطبوعہ سلام بھی ضمیر اختر نقوی کے حوالے سے درج کیئے گئے ہیں۔

ماہِ نو کراچی کا دبیرؔ نمبر مرثیہ کے طالب علم کے لئے بڑا کار آمد ہے۔ اس میں مرزا دبیرؔ کی زندگی (ضمیر اختر نقوی) مرزا دبیرؔ کے کچھ خاندانی حالات (مرزا علی اظہر برلاس) اور نوادر مرزا دبیرؔ (مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی) کے مقالے قابلِ توجہ ہیں۔

ضمیر اختر صاحب نے مرزا دبیرؔ کی زندگی کے بعض تاریک پہلوؤں کو مستند حوالوں سے اجاگر کیا ہے۔ مرزا علی اظہر برلاس نے مرزا غلام حسین والد مرزا دبیرؔ کی حیات کے بعض واقعات بیان کیئے ہیں جن پر آج تک کسی نے اس وضاحت کے ساتھ قلم نہیں اٹھایا تھا۔ جناب مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی نے مرزا دبیرؔ کے دو خط مولانا عنایت علی ساماتوی تخلص حشمتؔ اور ایک خط مولوی سید علی کے نام اور مرزا دبیرؔ کے کئی غیر مطبوعہ مرثیے کے عکس پہلی مرتبہ شائع کیے ہیں۔ فاضل لکھنوی کا مقالہ دبیریات میں ایک گراں مایہ اضافہ ہے۔

ڈاکٹر پروفیسر فاضل زیدی

(صدر شعبۂ اردو سکرنڈ گورنمنٹ کالج سندھ)

"میں ضمیر اختر نقوی کی عظمت کو سلام کرتا ہوں۔"

ندیم شبلی ایڈووکیٹ (لاہور ہائی کورٹ)

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کے خطوط سے اقتباسات

ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری کے تقریباً ۲۲ خطوط ضمیر اختر نقوی صاحب کے کتب خانہ میں محفوظ ہیں۔ یہ خطوط سری نگر کشمیر اور لکھنؤ سے لکھے گئے ہیں۔ اقتباسات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب ہمارے ممدوح ضمیر اختر نقوی صاحب سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے یار کھتے ہیں۔ ملاحظہ ہو......

میں نے ''انیسؔ سیمینار'' دہلی میں اپنے مقالے کی تائید میں میر انیسؔ کی قلمی مراثی کی آٹھ جلدیں اور بہت پرانی کتابیں میز پر سامنے رکھی تھیں۔ میرے مقالے کا عنوان ''میر انیس بعض نئی معلومات'' تھا۔ اس مقالے نے سیمینار میں تہلکہ مچایا۔ میرے پاس پورے مقالے کی نقل ہے میں نے اس میں کچھ مزید اضافے کئے ہیں، انیسؔ سیمینار میں، میں نے فخر سے آپ کا نام لیا اور یہاں تک کہدیا تھا کہ ضمیر اختر صاحب نے انیسؔ پر تن تنہا جو کام کیا ہے اگر انیسؔ سینٹرل کمیٹی وہ کرتی تو میں بڑا کارنامہ سمجھتا۔ میں بلا مبالغہ کہتا ہوں کہ آپ نے وہاں انیسؔ پر قابلِ قدر اور معرکۃ آرا کام کیا ہے۔ ماہِ نو میں جو ''کلید گنجینۂ انیسؔ'' آپ نے مرتب کیا ہے اس نے آپ کے سر پہ سہرا

میات کا تاج رکھ دیا ہے۔ ایسا صبر آزما کام یہاں نہیں ہو سکتا ہے، آپ نے واقعی ایک ادارے کا کام کیا ہے۔ (۱۰ اگست ۱۹۷۶ء)

"میرے کرم فرما جناب ضمیر صاحب، تسلیم، عید مبارک قبول ہو، گرامی نامہ مورخہ ۱۳ نومبر مجھے کل موصول ہوا، مرثیے کی تصحیح فرما کر آپ نے مجھ پر بڑا احسان کیا، بہر حال آپ نے مجھے بہت بڑے اعتراض سے بچایا، مجھے یہ سن کر بڑی مسرت ہوئی کہ آپ ۷، دسمبر کو لکھنؤ پہنچ رہے ہیں۔ انشاء اللہ میں بھی ۱۰، دسمبر تک یا اس سے پہلے ہی پہنچنے کی کوشش کروں گا۔ مجھے اس بات پر بے حد افسوس ہو رہا ہے کہ آج تک انیس کے مراثی کا صحیح متن نہیں چھپا ہے۔ نائب حسین نقوی صاحب اور چوپٹ کر رہے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ہم لوگ مشترکہ طور پر یہ کام کریں۔ پاکستان میں مرثیہ پر جو بھی کتابیں شائع ہوئیں میرے لئے ان کتابوں کا ایک سیٹ ضرور لائیےگا"۔

(۲۳ نومبر ۱۹۷۶ء)

"میرا مقالہ "میر انیس کے نایاب اور غیر مطبوعہ مرثیے" قومی آواز میں چھپنا شروع ہوا ہے۔ کئی قسطوں میں چھپے گا۔ ۲ قسطیں مورخہ ۶، فروری اور ۱۳، فروری چھپ گئی ہیں۔ آپ کا ذکر خیر ہم نے ایمان داری سے کیا ہے۔ (۱۳، فروری ۱۹۷۷ء)

سال گزشتہ میں نے آپ کو ایک مرثیہ میر انیس کا دیا تھا

یارب عروسِ فکر کو حسن و جمال دے

آپ نے اس کے متن کو درست بھی کیا تھا۔ کیا یہ کہیں چھپا کہ نہیں، ماہ نو کے انیس اور دبیر نمبر میں نے جو طویل تبصرے آپ کو دیے تھے ان کا کیا ہوا۔ براہ کرم مفصل لکھیں (۱۶، اکتوبر ۱۹۷۷ء)

"دبیر کا جو مرثیہ میں نے شائع کیا تھا وہ مطبوعہ نکلا۔ اس بات کا اعتراف مجھے ہے۔ اتر پردیش اردو اکادمی نے میرے ذمے مرزا دبیر کے ۲۰ مراثی کا انتخاب کا کام سونپا ہے۔ آجکل اسی چکر میں ہوں۔ آپ کی نظر میں مرزا دبیر کے جو بہترین مرثیے ہیں ان کے مطلع لکھ کر بھیج دیں"۔ (۲۸، دسمبر ۱۹۷۷ء)

"ہاں ایک بات لکھنے سے رہ گئی تھی وہ یہ ہے کہ میں نے اشاریہ مرزا دبیر کا دیباچہ لکھا تھا۔ امیر علی صاحب نے اُسے بہت غلط شائع کیا ہے۔ میری عبارت دیباچہ کے ساتھ کسی اور آدمی سے بے جوڑ عبارت جوڑ کر شائع کی ہے۔ اس پر میں امیر علی صاحب سے بہت بگڑا۔ غرضیکہ انھوں نے میرے دیباچہ اور آپ کے اشاریہ اور مرزا دبیر تینوں کو بڑی بے رحمی سے قتل کیا ہے۔ اس کا ذکر میں نے انتخاب مراثی دبیر کے مقدمے میں بھی کیا ہے"۔ (۱۹، ستمبر ۱۹۷۸ء)

"فن مرثیہ کے ممتاز ماہر اور محقق جناب سید ضمیر اختر نقوی صاحب کی خدمت گرامی میں ہدیۂ خلوص...... میری ڈی لٹ کی مطبوعہ تھیسس برائے تبصرہ حاضر ہے، آپ نے خط لکھنا چھوڑ دیا ہے۔ میں آپ کی طرف خط لکھنے کی پہل کرتا ہوں۔ میں آپ کو فن مرثیہ کا ممتاز اور زبردست محقق سمجھتا ہوں۔ پاکستان میں آپ کے دم قدم سے اردو مرثیہ پروان چڑھ رہا ہے۔ خدا آپ کو بطفیل آلِ عبا سلامت رکھے۔

مجھے رسالہ "وحی و الہام" کی سخت ضرورت ہے۔ اس میں ڈاکٹر اقبالؔ اور علامہ شیخ عبدالعلی ہروی کے مقالات درج ہیں اس رسالہ کو کہیں تلاش کر کے مجھے بھیج دیں۔ میں ایک کتاب "علامہ ہروی اور اقبالؔ" لکھ رہا ہوں۔ اقبالؔ اور آلِ رسولؑ کے بارے میں اگر آپ کے پاس کوئی مواد ہے تو جلد از جلد بھیج دیں۔ جوشؔ پر بھی لکھنا چاہتا ہوں۔ ان کے انتقال پر جو لٹریچر وہاں اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوا ہے روانہ کریں۔ یہ

کتاب میں آپ ہی کے نام منسوب کروں گا۔ جوشؔ کا فوٹو بھی بھیج دیں"۔

(۲۰ مئی ۱۹۸۲ء)

میرے کرم فرما جناب ضمیر اختر صاحب! تسلیم و آداب۔۔۔۔۔۔ بھئی مولا علی کی قسم آپ کا خط ملتے ہی میں نے شکرانے کی نماز پڑھی۔ آپ کو یہ سن کر بے حد مسرت ہوگی کہ ۲۳ سال کے خاموش جہاد کے بعد میرا تقرر یونیورسٹی میں بطور سینئر ریڈر کے ہوا ہے۔ میں کسی عہدے کا متمنی نہیں ہوں صرف خاموش اور پرامن ماحول میں اردو کی خدمت کرنا چاہتا ہوں۔ آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ میں نے کشمیر یونیورسٹی سری نگر (بھارت) کے شعبہ اردو میں ایم اے کے لئے مرثیے کا ایک مکمل پرچہ رکھا ہے نصاب میں میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے علاوہ جوشؔ کے مرثیوں کو بھی شامل کیا ہے۔ آپ کی کتاب "جوشؔ ملیح آبادی کے مرثیے" ایم اے اردو کے نصاب میں شامل کی گئی ہے۔ ۱۲ اگست ۱۹۸۲ء کو میں نے ایم۔اے کے طلبا کو آپ کی کتاب کی زیارت کرائی اور پھر آپ کے بارے میں ایک نوٹ لکھوایا ہے۔ ایم۔اے پریوس میں ۵۲ اور فائنل میں ۴۴ طلبا ہیں۔ ریسرچ اسکالرس کی تعداد ۲۲ ہے۔۔۔۔۔ انشاء اللہ ایم۔اے اردو مرثیہ کے پرچے میں آپ کی شخصیت اور ادبی کارناموں کے بارے میں بھی سوالات ہوں گے۔ ایم۔اے کے نصاب کے لئے اپنے حالات زندگی بھی فوراً روانہ کریں تاکہ طلبا کو مزید نوٹس لکھوا سکوں۔ اگر آپ میری مدد کریں گے تو میں آپ کی خواہش کے مطابق جوشؔ پر ایک کتاب تیار کروں گا جس میں بہترین انتخاب اور حالات زندگی کے علاوہ معرکہ آرا مقدمہ فرہنگ شامل ہوگا۔ یہ کتاب میں آپ کے نام نامی سے منسوب کروں گا۔ آپ کی تصویر کے علاوہ جوشؔ کی تصویریں بھی ہوں گی اس سلسلے میں آپ مجھے جلد از جلد جوشؔ سے متعلق تمام ضروری مواد اور لٹریچر براہ راست بھیج دیں۔ بھئی ضمیر صاحب!

جوش کے ساتھ بڑا المیہ ہوا ہے میں ان کو انیس کے بعد اردو کا سب سے بڑا قادرالکلام شاعر سمجھتا ہوں۔

آپ میری ڈی لٹ والی کتاب (اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا) پر سیر حاصل ریویو لکھیں اور پھر اسے کراچی میں ہی کسی رسالے یا اخبار میں شائع کریں۔ تراشہ رجسٹری ڈاک سے مجھے فوراً بھیج دیں، جن چیزوں کی نشاندہی آپ نے کتاب سے متعلق اپنے خط میں کی ہیں انہیں بھی تبصرے میں شامل کر لیجئے، تحقیق کوئی حرف آخر نہیں ہے، میں چاہتا ہوں کہ اس پر ایمان داری سے تبصرہ ہو...... بھئی یہ تو کسی کو آج تک معلوم نہیں تھا کہ سکندر کی تین جلدیں "دفتر غم" کے نام سے ۱۸۹۰ء میں شائع ہوئی تھیں، کیا یہ جلدیں آپ کے پاس ہیں؟ آپ کا یہ کہنا صحیح ہے کہ احسان اور شیخ احسان کے مرثیے خلط ملط ہو گئے ہیں۔ اس بات کا علم مجھے تھیسس مکمل کرنے کے بعد ہی ہوا تھا...... آپ میری کتاب "اودھ میں اردو مرثیے کا ارتقا" پر سیر حاصل ریویو لکھئے گا۔ اس میں جو کوتاہیاں نظر آئیں ان کی بھی نشاندہی کیجئے گا۔ اس ریویو کو آپ وہاں کسی رسالہ یا اخبار میں ضرور شائع کریں اور دو چار تراشے رجسٹری ڈاک سے مجھے بھیج دیں۔

براہ کرم جوش اور اقبال پر ضروری مواد اور تصاویر جلد از جلد ارسال کریں۔ رجسٹری ڈاک سے اگر ہو سکے تو علامہ شیخ عبدالعلی ہروی کے حالات زندگی وغیرہ بھی فراہم کریں۔ مجھے ان کے بھی فوٹو کی سخت ضرورت ہے۔

آپ کے ادبی کارناموں اور "اردو مرثیہ پاکستان میں" پر تبصرہ حاضر ہے۔ پسند آئے تو داد دیجئے گا، تبصرہ کیا ہے آپ کے بارے میں میری مخلصانہ رائے ہے...... انشاء اللہ میں آپ پر ایک بھرپور مقالہ لکھوں گا۔ یہ وعدہ ہے۔

آپ پر جو تبصرہ میں نے کیا ہے اس کو آپ وہاں شائع کریں اور تراشے یہاں بھیج

دیں، میرے پاس اس کی نقل نہیں ہے، یہ طلبا کے کام آئے گا...... اس کا ایک ایک لفظ کئی کئی چھلنیوں سے چھان کے استعمال کیا ہے...... (۱۲؍اگست ۱۹۸۲ء)

جناب نقوی صاحب، تسلیمات۔ بھئی مجھے آپ پر رشک آتا ہے کہ یہ گراں قدر اور نایاب چیزیں آپ کہاں سے دریافت کرتے ہیں۔ رشکؔ کا ''نفس اللغۃ'' راجہ صاحب محمود آباد کے کتاب خانے میں میری نظر سے بھی گزرا ہے۔ واقعی کام کی چیز ہے...... آپ نے اپنے حالات زندگی نہیں بھیجے ہیں۔ جوشؔ کے مرثیے ایم۔اے کے نصاب میں شامل کر دیے گئے ہیں، مختصر حالات زندگی بھیج دیں۔ میر سوز کی مرثیہ گوئی پر ایک مضمون لکھ دیجیے گا...... اپنی کتاب ''اردو مرثیہ پاکستان میں'' رجسٹری ڈاک سے بھیج کر ممنون فرمائیے گا...... ضمیر صاحب یقین کیجیے گا میں آپ کو ہندوستان اور پاکستان کا ممتاز ترین ناقد اور محقق سمجھتا ہوں۔ آپ اپنی چیزیں مجھے بھیج دیں تو تحقیقی مضمون لکھوں گا۔ آپ نے اردو پر گراں بار احسان کیا ہے۔

مرثیے کے فن پر آپ اس وقت حرفِ آخر ہیں...... مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔ مجھے بھی امام مظلوم کے غم میں شریک کیجیے گا۔ ۱۸؍اکتوبر ۱۹۸۲ء)

''میں بھی پاکستان دیکھنے کا مشتاق ہوں، خاص کر آپ کو دیدۂ دل سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ آپ میرے کرم فرماؤں میں ہیں۔ دعا کیجیے کہ جلد از جلد ملاقات ہو۔

(۳۰ نومبر ۱۹۸۲ء)

میں نے آپ کی کتاب ''اردو مرثیہ پاکستان میں'' کی زیارت شیعہ کالج میں کی۔ آج کل میں میر خلیق کے مرثیوں پر کام کر رہا ہوں۔ انشاء اللہ جلد ہی ایک جلد مرتب ہو جائے گی۔ (۷؍فروری ۱۹۸۳ء)

آج میں پرانے کاغذات دیکھ رہا تھا تو آپ کا ۱۹۸۳ء کا ایک خط نکل آیا، اس پر آپ کا ایڈریس درج تھا۔ خدا کرے کہ یہی ایڈریس ہو، بھئی آپ نے مجھے سراسر فراموش کر دیا۔ آپ نے اس عرصے میں خیریت تک نہیں پوچھی کہ ہم پر کیا گزر رہی ہے۔ یہ خط میں سری نگر سے لکھ رہا ہوں۔ ایک ہفتے بعد لکھنؤ جا رہا ہوں۔ وہاں انشاء اللہ اپریل تک میرا قیام رہے گا۔ آپ خط موصول ہوتے ہی مجھے لکھنؤ کے پتے پر خط لکھیے گا۔ لکھنؤ کا ایڈریس پشت خط پر درج کیا ہے۔۔۔۔۔ آپ مجھے براہِ راست "القلم" نہیں بھیجتے ہیں۔ سال گزشتہ نیز صاحب کو بھیجا تھا جو مجھے اپریل میں موصول ہوا۔ براہِ نوازش مجھے بغیر کسی معرفت کے گھر کے ایڈریس پر بھیجا کریں۔۔۔۔۔ آپ نے "عشق علی" کتاب اور دوسری کتابیں نہیں بھیجی ہیں۔

علامہ نصیر ترابی صاحب کو میں جانتا نہیں ہوں۔ یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کیا ہیں اور کتنی کتابیں لکھی ہیں۔ کرم ہوگا اگر آپ مجھے ان کی کتابوں کی تفصیلات وغیرہ سے آگاہ کریں۔ (یکم اکتوبر ۱۹۹۷ء)

"آپ ضمیر صاحب وسیع النظر محقق ہیں اور امید ہے کہ آپ جلد از جلد زنجانی مرحوم کے حالاتِ زندگی مجھے بھیجیں گے۔ معلوم ہوا ہے کہ رحلت الامام الزنجانی جوان کا سفرنامہ ہے اس میں بھی ان کے حالات درج ہیں۔ اگر آپ توجہ فرمائیں گے تو میرا کام ضرور آسان ہو جائے گا۔ کراچی میں مندرجہ بالا کتابیں ضرور ہوں گی۔ لکھنؤ میں ان کا نام و نشان نہیں مل رہا ہے۔ توجہ فرمائیں۔

ہندوستان میں مرثیہ پر کوئی کام نہیں ہو رہا ہے۔ یوں سمجھئے کہ رثائی ادب کا فقدان ہے۔ کوئی رسالہ کوئی غیر مطبوعہ مرثیہ یا مضمون نہیں چھاپتا ہے۔ (۵، مارچ ۱۹۹۹ء)

"ایک فرشتہ انسانی لباس میں مورخہ ۹ فروری کو نازل ہوا اور آپ کی درج ذیل چار کتابیں مجھ تک پہنچائیں (۱) خاندان میر انیسؔ کے نامور شعراء، (۲) حضرت جعفرؓ طیار، (۳) مجلّہ شعرائے اردو اور عشق علیؑ، (۴) اعتراف و تحسین...... ابھی کچھ دن پہلے میں نے یہاں ایک مولانا کے پاس آپ کی کتاب "شعرائے اردو اور عشق علیؑ" دیکھی۔ میں اسے دیکھ کر بڑا متاثر ہوا۔ واقعی آپ نے ایک کارنامہ انجام دیا ہے۔ میں کئی برسوں سے ایک کتاب ترتیب دے رہا ہوں "شعرائے متصوفین فارسی اور مدحت علی مرتضیٰ" ایک قلمی نسخہ ۱۱۷۹ھ کا "کتاب المناقب" راجہ صاحب محمود آباد کے کتب خانے میں دستیاب ہوا تھا اسی کو بنیاد بنا کر میں نے کام شروع کیا۔ اگر آپ کے پاس فریدالدین عطار، حکیم سنائی، امیر خسرو، نظام الدین اولیا وغیرہ کے فضائل علیؑ کے بارے میں اشعار موجود ہیں تو براہِ کرم زیراکس کر کے مجھے رجسٹری کر کے روانہ کریں......

شیخ عبدالکریم زنجانی کے حالات فراہم کر کے آپ نے مجھے سکونِ قلب سے ہمکنار کیا، میں یہاں فرداً فرداً علماء سے ملا۔ افسوس اس پر ہو رہا ہے کہ لوگ ان کے نام گرامی سے بے خبر ہیں...... زنجانی کے جو حالات آپ نے ترتیب دے کر بھیجے ہیں، میں اپنی کتاب "علامہ اقبالؔ اور شیخ عبدالکریم زنجانی" میں آپ کے حوالے سے شامل کروں گا۔ اگر ان کے بارے میں مزید کچھ معلوم ہوگا تو مطلع کریں"......

(۸ فروری ۱۹۹۹ء)

"آپ نے آیت اللہ زنجانی کے حالات بھیج کر میرا کام نہایت آسان کیا ہے یہ فرما دیجئے کہ علامہ اقبال نے زنجانی صاحب کی کس کتاب کا ترجمہ انگریزی میں کیا تھا"......۲۱ فروری ۱۹۹۹ء

ڈاکٹر اکبر حیدری کا آخری خط

جناب اقبال حسین کاظمی صاحب کے خط سے معلوم ہوا کہ آپ کے والد گرامی انتقال کر گئے ہیں۔ اس خبرِ ملال کے سننے سے مجھے شاق ہوا۔ مرحوم کے بارے میں میں نے سنا ہے کہ وہ عزاداری اور غمِ حسینؑ میں اوائل عمر سے ہی منہمک رہتے تھے۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انھیں جنت الفردوس عطا کرے۔ آپ کو اور پس ماندگان کو اس حادثۂ عظیم کی برداشت کے لیے صبرِ جمیل عطا کرے۔ (آمین)

(۲۷، ستمبر ۱۹۹۹ء)

قارئین باتمکین نے ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کا حسن عقیدت ملاحظہ فرمایا کیا وجہ ہوئی کہ ڈاکٹر صاحب ایک دم سے چراغ پا ہو گئے اور اب ضمیر اختر صاحب کے خلاف مسلسل لکھ رہے ہیں۔

اس قضیے کی مختصر روداد یہاں لکھنا مناسب ہے۔

"رثائی ادب" کراچی میں میر انیس کے ایک غیر مطبوعہ مرثیے پر بحث شروع ہوئی تو ایک مضمون جناب نصیر ترابی کا شائع ہوا جس میں انھوں نے ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کے خلاف ایک بے ادبی کی عبارت لکھ دی جو نصیر ترابی صاحب کو ایک بزرگ محقق کے لیے نہیں لکھنا چاہیے تھی عبارت یہ تھی:-

"میں اکبر حیدری کاشمیری کو بلاشبہ ایک "مشفقی دانشور" سمجھتا ہوں۔ بقول ایک جید محقق و شاعر "اُن کے ہاں شعر کا خانہ ہی یکسر خالی ہے"...... اس قول کو یوں بھی تقویت پہنچتی ہے کہ اکبر حیدری کاشمیری نے جتنے بھی متن شائع کیے ہیں ان میں اکثر مقامات پر مصرعے ناموزوں ملتے ہیں۔ جو آدمی موزوں اور ناموزوں مصرعوں کے درمیان فرق ہی نہ سمجھتا ہو وہ کسی شاعر کا اسلوب کیسے سمجھے گا اور پھر وہ بھی انیس کا

اسلوب...... اکبر حیدری کی یہ رائے کہ "مرثیہ کا اسلوب بار بار منادی کرتا ہے کہ یہ میر انیس کا ہی ہے"۔ کوئی ایسی قابل توجہ رائے نہیں ہے۔

(رثائی ادب کراچی تیسرا شمارہ ۱۹۹۷ء)

جناب نصیر ترابی نے زندگی کا پہلا مضمون لکھا اور اس میں اپنے مزاج کے مطابق ادیبوں اور شاعروں پر تنقید کی بھرمار کر دی، اُن کو یہ بات زیب نہیں دیتی، ایک ادب کے نادان دوست اقبال کاظمی صاحب نے ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کو کراچی سے خط لکھ دیا کہ نصیر ترابی صاحب کے اس مضمون کے پیچھے ضمیر اختر نقوی صاحب کا ہاتھ ہے۔ حالانکہ سب سے بڑی غلطی اس میں رثائی ادب کے ایڈیٹر ہلال نقوی صاحب کی ہے انھوں نے یہ اندازہ ہی نہیں کیا کہ نصیر ترابی صاحب محقق نہیں ہیں اس لئے اُن کی یہ عبارت حذف کر دیتے انھیں یہ سوچنا چاہیے تھا کہ ایک بزرگ محقق کے لئے ایسے جملے بے ادبی اور بدتہذیبی کے زمرے میں آتے ہیں۔ دوسرے اقبال کاظمی صاحب کو ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کی ہمدردی میں نصیر ترابی صاحب سے بازپرس کرنا چاہیے تھی جو انھوں نے نہیں کیا اور جھگڑے کو بڑھا دیا۔

ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب نے پہلے تو معاملات کی تفتیش کرنا چاہی اور یکم اکتوبر ۱۹۹۷ء کے اپنے خط میں ضمیر اختر صاحب سے لکھ کر دریافت کیا کہ:۔

"علامہ نصیر ترابی صاحب کو میں جانتا نہیں ہوں، یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کیا ہیں اور کتنی کتابیں لکھی ہیں۔ کرم ہوگا اگر آپ مجھے ان کی کتابوں کی تفصیلات وغیرہ سے آگاہ کریں"۔

اکبر حیدری صاحب کا یہ خط "القلم" (شمارہ ۲ ۱۹۹۸ء) میں شائع ہوا اور ضمیر اختر صاحب نے القلم میں جواب لکھا:۔

"آپ نے علامہ نصیر ترابی کے بارے میں پوچھا ہے تو وہ پاکستان کے مشہور غزل گو شاعر ہیں۔ ان کی ابھی تک کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی مجموعہ تیار تو کر لیا تھا مگر نہیں معلوم کیا بات ہے کہ اب تک نہیں چھپا"۔

اس خط سے پہلے اکبر حیدری صاحب نے "طلوع افکار ستمبر ۱۹۹۷ء" میں جناب حسین انجم کے نام ایک خط میں لکھا کہ۔

"میں ہمیشہ اپنے کو ایک طالب علم سمجھتا ہوں، میں نے کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ میں کسی چیز میں ماہر ہوں، میں غائبانہ طور پر علامہ رشید ترابی قبلہ کو جانتا تھا۔ ریڈیو سے ان کی شام غریباں کی مجلسیں سنتا تھا۔ میں ان کے صاحبزادے علامہ نصیر ترابی کا نام تک نہیں جانتا ہوں۔ یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ کیا ہیں کتنی کتابوں کے مصنف ہیں؟ جناب اقبال حسین کاظمی صاحب نے مجھے مطلع کیا کہ انھوں نے میرے متعلق ستمبر کے رثائی ادب میں کچھ لکھا ہے میں نے رثائی ادب کا وہ پرچہ دیکھا ہی نہیں...... بڑا کرم ہوگا کہ اگر آپ مطلع کریں کہ علامہ نصیر ترابی محقق ہیں یا ناقد۔ انھوں نے کتنی کتابیں لکھی ہیں"۔ (طلوع افکار ستمبر ۱۹۹۷ء)

حسین انجم صاحب نے اکبر حیدری صاحب کو گول مول جواب دیا مسئلے کو حل کرنے کے بجائے الجھا دیا، حسین انجم صاحب جواب میں لکھتے ہیں:-

"رشید ترابی مرحوم تو علامہ لکھے اور کہے جاتے تھے۔ ان کے ایک اور صاحبزادے عقیل ترابی صاحب اپنے والد مرحوم کی طرح عالم دین وخطیب ہیں، علامہ کے سابقہ سے یاد کیے جاتے ہیں۔ نصیر ترابی صاحب کے لیے ہم نے عربی کے اس اسم مبالغہ کو آپ کے قلم سے پہلی بار استعمال ہوتے دیکھا ہے۔ کیا وہ بھی اس کے مدعی ہیں یہ تحقیق طلب ہے۔ جہاں تک آپ کے اس استفسار کا تعلق ہے کہ وہ محقق ہیں یا ناقد اور انھوں

نے کتنی کتابیں لکھی ہیں تو اس کے متعلق ہم اپنے بیشتر احباب کی طرح لاعلم ہیں البتہ بحیثیت شاعر ان کی شہرت سے ضرور آگاہ ہیں"۔ (طلوع افکار ستمبر ۱۹۹۷ء صفحہ ۲۷)

ضمیر اختر صاحب نے اس بات کا جواب کس قدر شائستہ دیا ہے، جبکہ حسین انجم صاحب نے طنز و مزاح کے تیر چلائے ہیں اور نصیر ترابی صاحب کو مضحکہ خیز شخصیت بنا دیا ہے۔

اکبر حیدری صاحب صرف یہ جاننا چاہتے تھے کہ ایک ایسا شخص جو محقق ہے اور نہ نقاد ہے نہ ادیب ہے اس نے اکبر حیدری صاحب پر سخت تنقید کیوں لکھی ہے اور وہ بھی تہذیب کو بالائے طاق رکھ کر کیوں اس طرح لکھا۔

ضمیر اختر صاحب نے اس معاملے کو دبانے کے لئے لکھنؤ ڈاکٹر نیر مسعود صاحب کو لکھا کہ اکبر حیدری صاحب کو سمجھا دیں کہ نصیر ترابی صاحب نے ناسمجھی میں اور بہ حالت جوش ایسی تحریر لکھی ہے۔ ڈاکٹر نیر مسعود صاحب نے ڈاکٹر صاحب کو سمجھایا ہوگا، ڈاکٹر نیر مسعود صاحب نے (القلم شمارہ ۳۔ ۱۹۹۹ء) کو ضمیر اختر صاحب کو لکھا کہ:۔

"ڈاکٹر اکبر حیدری کی آزردگی آپ سے بھی اور "رثائی ادب" سے بھی کم ہو چلی ہے وہ دل کے برے آدمی نہیں ہیں اور اپنے ملال کا اظہار کر دیتے ہیں اور واقعی بہت کام کر رہے ہیں"۔

ضمیر اختر نقوی صاحب جناب نصیر ترابی کی نادانی اور بدتہذیبی پر پردہ ڈالنا چاہتے تھے تاکہ یہ معاملہ رفع دفع ہو جائے لیکن اکبر حیدری صاحب اقبال کاظمی کے سحر میں گرفتار ہو چکے تھے انھوں نے اس صلح صفائی کا غلط مطلب نکالا اور اپنے مضمون میں لکھا کہ

"جب میرا مضمون ان کی تردید میں طلوع افکار کے دسمبر ۱۹۹۷ء کے شمارے میں شائع ہوا تو بوکھلا گئے اور ڈاکٹر نیر مسعود کو فون کیا کہ "میں حیدری صاحب کا انتہائی

احترام کرتا ہوں"۔(طلوعِ افکار نومبر ۱۹۹۹ء)

ضمیر اختر نقوی صاحب نے کیا غلط لکھا؟ یہ ہے اس دنیا میں خلوص کی قدر ضمیر اختر صاحب جناب نصیر ترابی صاحب کو بھی بچانا چاہتے تھے اور ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کی خدمات کو بھی سراہنا چاہتے تھے۔ لیکن دونوں طرف کے لوگوں نے ایسی آگ لگائی کہ جو ہوا سو ہوا، اب اکبر حیدری دیکھ لیں کہ کیا ہوا اور آئندہ کیا ہوگا۔ نصیر ترابی صاحب نے گھبراہٹ میں ایک لغو قسم کا پمفلٹ گالم گلوچ سے بھرپور ضمیر اختر صاحب کے خلاف شائع کیا اور ۸ ربیع الاوّل کے جلوسِ چپ تعزیہ میں یومِ غم کا احترام بالائے طاق رکھ کر خود کھڑے ہو کر تقسیم کروایا۔ ڈاک کے ذریعے گھر گھر بھیجا گیا۔ بحث ادب سے ہٹ کر ذاتیات پر آ گئی۔ نصیر ترابی صاحب نے ادب میں ایک خطرناک کھیل کو داخل کرنے کی کوشش کی ہے۔ خدا کرے، سمجھدار ادیب اور شعرا اس کا سدِّباب کر سکیں ورنہ گرم ہوا بہت تیز چل رہی ہے۔ آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے۔

یہ ہوا سارے چراغوں کو اُڑا لے جائے گی
رات ڈھلنے تک یہاں سب کچھ دھواں ہو جائے گا

پروفیسر ظلِ صادق زیدی (کراچی)

جلوۂ کوہ طور بھول گئے
جو تھا نزدیک و دور، بھول گئے
نثر پڑھ کر ضمیر کی صادقؔ!
رنگ اپنا سرورؔ بھول گئے

شفیع عقیل:

قابلِ قدر کام

ہر صدی کا شاعرِ اعظم میر انیسؔ

اگر اردو کے کلاسیکی ادب کا مطالعہ کیا جائے اور اس کے شعری حصے کا جائزہ لیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ قدیم ادب میں یا کلاسیکی دور میں بھی بڑے شاعروں کی فہرست محدود نہیں ہے۔ متعدد نام نظر آتے ہیں۔ ان میں غزل گو بھی ہیں، داستان نویس بھی ہیں، مثنویاں لکھنے والے بھی ہیں اور مرثیہ نگار بھی ہیں۔ اردو زبان میں رثائی ادب یا مرثیہ نگاری کی روایت بہت قدیم ہے اور ابتدائی دور ہی سے شاعروں نے مرثیہ نگاری کی طرف بھی توجہ دی، جس میں سے بعض نے نام وری حاصل کی اور یہ روایت آج بھی جاری و ساری ہے۔ یوں تو اس سلسلے میں بہت سے شعرا کا تذکرہ آتا ہے، لیکن دو نام ایسے ہیں جو سب سے نمایاں ہیں۔ میرا تو یہ خیال ہے کہ ان دونوں کی تخلیقات کا مطالعہ کیے بغیر اردو ادب کا مطالعہ مکمل نہیں ہوتا۔ ان میں ایک مرزا دبیرؔ ہیں اور دوسرے میر انیسؔ ہیں۔ دونوں اپنی اپنی جگہ صاحب کمال ہیں۔ اگرچہ دونوں کا بنیادی یا مرکزی موضوع ایک ہی ہے، تاہم انداز بیاں اور طرز اظہار جدا جدا ہیں۔ بعض نقادوں نے دونوں کے فن کا موازنہ و مقابلہ بھی کیا ہے، مگر دونوں کا ادبی مرتبہ و مقام اپنی جگہ مستند ہے۔ جس طرح میر انیسؔ کو پسند کرنے والوں کی کمی نہیں ہے، اسی طرح مرزا دبیرؔ کے

پرستار بھی بے شمار ہیں۔ اس وقت جس کتاب کا تعارف مقصود ہے وہ میر انیس کے بارے میں ہے۔ میری رائے میں اگر زبان و بیان کا حسن اور الفاظ کی نشست و برخاست اور محاوروں کو برتنے کا سلیقہ و قرینہ جاننا ہو تو ادب کے طالب علم کو انیس کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اردو زبان کی وضاحت و بلاغت کیسی ہوتی ہے؟ الفاظ کی معنوی پرت کیسے کھلتی ہے؟ یہ جاننے کے لیے انیس کو پڑھنا ضروری ہے۔ پروفیسر ڈاکٹر نورالحسن کے بقول:

"ان کی شاعری کی اہمیت کا سبب محض مذہبی اور جذباتی عقیدت ہی نہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ انیسویں صدی کے لکھنؤ کی تہذیب اور اسی تہذیب کے مختلف النوع مظاہر کی ایک بڑی مؤثر تصویر مرتب ہوتی ہے۔ انیس کے مرثیوں میں فن کی عظمتوں کے نشان بھی ہیں۔ اعلیٰ اقدار اور روایات کا پرتو بھی اور اجتماعی قیمتی، تاریخی اور تہذیبی مواد بھی۔ انیس کی بڑائی اس میں ہے کہ انھوں نے واقعات کربلا کے بیان میں آفاقیت پیدا کردی ہے"۔

یہ کتاب میر انیس کی ادبی شخصیت اور فن کا احاطہ کرتی ہے، مگر یہ تصنیف نہیں تالیف ہے اور اس کے مؤلف ہیں علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی، جن کا نام مذہبی حوالے کے علاوہ انیس شناسی میں کسی تعارف کا محتاج نہیں۔ میں سید ضمیر اختر نقوی صاحب کو اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ ابھی ڈاکٹر اور علامہ کے مرتبے تک نہیں پہنچے تھے۔ یوں تو آپ نے مذہب کے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں لکھی ہیں، لیکن اس کے ساتھ ساتھ شروع ہی سے خصوصیت سے ان کا موضوع انیس کی شاعری رہی ہے۔ اس سلسلے میں وہ تقریباً چار دہائیوں سے مسلسل تحقیق و تلاش کر رہے ہیں اور اس موضوع پر قابل قدر کام کیا ہے۔ پیش نظر کتاب ایسے مضامین و مقالات اور منظومات پر مشتمل ہے، جو

مختلف اہل قلم کی تحریریں ہیں۔ یہ مواد رسائل و جرائد میں چھپا تھا یا پھر کتابوں میں شامل تھا اور یہ میر انیس کے ضمن میں لکھا گیا تھا۔ سید ضمیر اختر نقوی نے ان بکھری ہوئی منظوم اور منثور تحریروں کو تحقیق و تلاش کے بعد جمع کر کے ایک جگہ مرتب کر دیا ہے۔ اس کے مطالعے سے میر انیس کی شاعری کے کئی پہلو سامنے آتے ہیں۔

(روزنامہ جنگ کراچی "نئی کتابیں"..... اتوار ۳۱ راگست ۲۰۰۸ء)

ڈاکٹر نیر مسعود، لکھنؤ (یوپی۔ انڈیا)

۲۰ مارچ ۲۰۰۹ء

برادرم ضمیر اختر صاحب آداب اور انیس والی کتاب کا پارسل ملا تھا۔ پھر منو میاں کے ہاتھ انیس کی دو مزید جلدیں ایک جلد "شہزادہ قاسم بن حسنؑ" کی اور ایک "ذوالجناح" کی پہنچی۔ اوّل الذکر دونوں جلدیں میرے پاس آپ بھیج چکے تھے۔ "ذوالجناح" مجھے سب سے بہتر معلوم ہوئی۔ آپ کا یہ خاص انداز ہے کہ جس موضوع پر کام کرتے ہیں اس کے جملہ اطراف کا اس طرح احاطہ کر لیتے ہیں کہ دوسروں کے لیے اس پر مزید کام کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ "ذوالجناح" میں یہ خصوصیت آپ کی دوسری کتابوں سے زیادہ ہے۔ گھوڑوں کے بارے میں تاریخی معلومات، رسولؐ اللہ کی سواری کے گھوڑے، میدان کربلا میں ذوالجناح کی فداکاریاں، پھر مرثیوں میں ذکر، خطیبوں کے یہاں ذکر، ظاہر ہے اس کتاب کی مدد سے پوری پوری مجلسیں پڑھی جا سکتی ہیں۔ یہی حال شہزادہ قاسم بن حسنؑ اور جناب ام البنینؑ پر کتابوں کا ہے۔ میر انیس پر آپ نے اچھے مضامین اور نظمیں جمع کر دی ہیں، دوسرے ان سے فائدہ اٹھائیں گے، جن میں صرف آپ کے قلم سے انیس پر کتاب کا منتظر ہوں اور تاریخ عزاداری کا بھی۔ "القلم" اب شاید نہیں نکل رہا ہے۔ اسے بھی جاری رکھیے۔ میں کولھے کی ہڈی ٹوٹنے کے بعد سے معذور ہو گیا ہوں۔ آنکھ کمزور ہو گئی ہے اور ہاتھ کی گرفت بھی باقی نہیں رہی۔ یہ سب عمر اور فالج کے تقاضے ہیں۔ خدا آپ کو تندرست رکھے۔ ماجد رضا عابدی کو میری دعا کہیے۔ آپ کا..... نیر مسعود
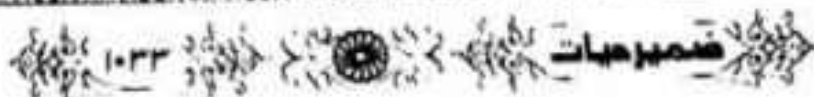
Dawn Karachi, 29th February, 2004

Exponent of Karbala

The Study of Elegies of MIR ANEES

BOOK REVIEW

By: Rizwana Naqvi

The Study of Elegies of Mir Anees

Compiled by

Dr. Allama Syed Zamir Akhtar Naqvi

Mohsina Memorial Foundation, London

Available with

Markaz-e-Uloom-e-Islamia, I-4, Noman Terrace, Phase-III, Gulshan-e-Iqbal, Block-11, Karachi Pakistan.

Ph: 021-4612868 , Pages 367, Price Rs. 500

MARSIA or elegy is a medium of tribute and eulogy presented to the deceased and a form of expressing sorrow and grief at someone's passing away. This genre of poetry is found in all languages of the world in one form or another. Urdu marsia is influenced by the marsia in Arabic and Persian. In the Arabia of pre-Islamic days it was a short poem of about 15-20 verses. In Persia, too, the marsia meant an elegy in the ordinary

sense of the term. In India during the Muslim rule, marsia took a different turn and was made exclusive for the projection and remembrance of the martyrdom of Karbala.

The Urdu marsia reached its highest stage of development in lucknow during the first half of the 19th century. One of the highest exponents of this genre was Mir Babr Ali Anees, who came from a long line of distinguished poets originating in Delhi.

On the occasion of the second birth centenary of this great poet, the book under review titled The Study of Elegies of Mir Anees is a compilation of various articles on Mir Anees. This book compiled by Dr Allama Syed Zamir Akhtar Naqvi contains articles and translations of Anees, poetry by authors like Padum Shiri Ali Jawwad Zaidi, Syed Ghulam Imam, Dr. David Mathews, G. Allana, Fazal Fatehpuri, Syed Hashim Raza, Dr. Mohammad Ali Siddiqui, prof Syed Faizi, Dr. Akbar Naqvi and Murtaza Hussain. Allama Zamir Akhtar Naqvi is the author of more than 300 books and is the founder and president of the Mir Anees Academy.

Mir Babr Ali Anees was born in Faizabad (UP), the first capital of the Nawab of Oudh, at the Dawn of the 19th century. Poetry came to him as an ancestral heritage. His forefathers, going back to his great grandfather, were eminent poets and men of letters. Anees was the grandson of Mir Hasan who is remembered for his great masnavi, Sehrul Bayan. Anees' father, Mir Khaleeq, who himself was a famous poet, took personal interest in his son's education and upbringing and entrusted him to the care of reputed contemporary teachers, Mir Najaf Al Faizabadi and Maulvi Hyder Ali Lucknavi.

The poetic atmosphere at home had kindled in him a

passion for poetry even as a child. Anees started writing very early in life. His early compositions were corrected by his father. He began with the ghazal, the most popular verse form in Urdu at that time and wrote several ghazals, but soon changed over to salams on the advice of his father. It was a turning point in his literary career, as it diverted his attention to marsia and rubai as well. Though he is mostly known as marsia writer, he has written over a hundred salams and over 500 rubais. He is believed to have written around two thousand marsias, though it is not easy to determine their exact number.

Once he switched over from ghazal to marsia writing, he emerged as the master of this art and introduced new horizons to Urdu language and literature and soon established a high reputation, equaled sometimes only by Mirza Salamat Ali Dabir.

Initially the marsia was written in four lines called murabba (quatrains). Mirza Sauda for the first time wrote marsias of six-line stanza called musaddas (hexameter), the first four lines having the same rhyme and the last two a different one. Anees, ancestors adopted it as the prosaic structure for their marsias.

Originally the marsia was of forty stanzas, but Mir Zamir (a contemporary of Mir Khaliq) discarded the old pattern. He added the descriptive element and increased the length of the marsia to seventy to hundred stanzas. Anees further broadened the scope of this genre by including in its body, in addition to the customary lamentation and mourning, realistic scenes of the battlefield, graphic delineations of the hero's face and figure, lively portrayal of the emotional states of the combatants, accurate descriptions of the landscape and occasional interludes of moral edification. With the help of such devices, and the use

of pathos and action, Anees gave the marsia a certain epic element, and by exploiting human emotions he gave the story a heroic touch.

Mir Anees' contribution to the development of Urdu language is immense. He took special care in the chastity of phrases and idioms and introduced new phrases and idioms in the language which are adored by both the literary schools of Delhi and Lucknow.

He consummately draws vivid word pictures portraying nature, battle scenes, emotion packed events and grief stricken dialogues. Dr Graham Baily pays tribute to Mir Anees in his famous book History of Urdu literature in the following words:

"Anees employed an enormous number of words but preferred a simple, easy and flowing style. His family is famous for the use of pure and idiomatic Urdu. He had a wonderful power of description. This is seen best when he depicts human feelings, specially pathos and bravery or scenes of nature and fighting. He writes as if he had been present himself on the occasion which he describes and as if the people had spoken the very words which he has put down".

Though various forms of reciting poetry were in vogue, marsia was mostly recited in tahtul-lufz -a plain form of solo, non musical recital with emphasis on narration. Anees adopted this style and averse as he was to gesticulation or motions of the body that would deflect attention from the poetic qualities of his composition, he rarely raised his hand, moved his head or resorted to a forced movement of the eyes in the course of recitation.

A lot of research work done on Mir Anees has been translated into many languages of the subcontinent like Hindi,

Bengali, Gujarati, Punjabi and Sindhi, as well as outside the subcontinent in Persian, Arabic and English.

The book under review is an important treatise on Anees as it not only covers his life and various aspects of his works but also discusses Urdu Marsia and its composite features, defining various parts of the marsia like the chehra, sarapa, rukhsat, aamad, rajaz, jung, shahadat and bain, which helps the reader understand this genre of poetry, in the perspective of the historical background of the event of Karbala.

Two articles, "Mir Anees and Spencer" by S.A.H. Naqvi and "Anees and Shakespeare: a comparison" by Syed Ghulam Imam, compare Anees with two great names in English poetry, Spencer and Shakespeare. Both the articles provide good reading, specially to students of literature.

Some discrepancy in the dates which do not correspond in the two articles create confusion in the minds of serious readers. His date of death is given as December 1874, whereas the articles by Dr Mohammad Ali Siddiqui (printed in Dawn in October 1971 and January 1977) seem to be written in the year of his centenary likewise the editing could have been better. Allama Naqvi has done a great service to Anees and Urdu literature by taking the trouble to compile this book.

ڈاکٹر ضیاء الحسن (لاہور)

اُردو کا عالمی تصور

The Study of Elegies of Mir Anees

مرتبہ: ڈاکٹر علامہ ضمیر اختر نقوی　　مبصر: ڈاکٹر ضیاء الحسن

سنِ اشاعت: 2004ء　　صفحات: 368 قیمت 500 روپے

ادارہ: محسنہ میموریل فاونڈیشن پاکستان، یو۔کے، یو۔ایس۔اے

یہ کتاب میر انیس کی زندگی اور مرثیہ نگاری پر لکھے گئے انگریزی مضامین کا ایک انتخاب ہے۔ یہ کتاب خصوصاً مغربی دنیا میں میر انیس کی لافانی شاعری کو متعارف کرانے کا اچھا ذریعہ ہے۔ پہلا مضمون علی جواد زیدی کا ہے جو میر انیس کے تفصیلی حالات زندگی پیش کرتا ہے۔ یہ طویل مضمون ان کی زندگی کے متعدد گوشوں کو وا کرتا ہے اس کے علاوہ ڈیوڈ میتھیوز اور این میری شمل کے مضامین بھی اس میں شامل ہیں جن سے مستشرقین کی اس عظیم شاعر کے بارے میں آراء کا پتہ چلتا ہے۔ اس کتاب میں انیس پر ہونے والے کام پر لکھے گئے تبصروں کا احاطہ بھی کیا گیا ہے اور اخبارات میں لکھے جانے والے کام بھی اس میں شامل ہیں۔ اس کتاب میں ایس۔اے ایچ نقوی کے چار مختصر مضامین کے علاوہ محمد علی صدیقی، سید ہاشم رضا، سید فیضی، سید غلام امام، سید مرتضیٰ حسین، امیر امام حر، جی الانہ، پروفیسر احمد علی اور شہاب الدین رحمت اللہ

کے مضامین بھی شامل ہیں۔ سید شاکر علی کی کتاب پر ڈاکٹر احسن فاروقی اور کرار حسین کے تبصروں کے علاوہ انتظار حسین اور کے۔ سی۔ کانڈا کے کالم بھی شامل ہیں۔ یہ کتاب میر انیس کے دو سو سالہ یوم وفات کے موقع پر ترتیب دی گئی ہے۔ اس میں علی جواد زیدی کے طویل مضمون کے علاوہ اور تفصیلی مضامین شامل ہیں۔ ڈیوڈ میتھیوز کا مضمون ساٹھ صفحات پر پھیلا ہے جبکہ سید غلام امام کا مضمون بھی ساٹھ صفحات کی ضخامت کا حامل ہے۔ جس میں انہوں نے انیس اور شیکسپیئر کی شاعری کا موازنہ پیش کیا ہے۔ شیکسپیئر کے علاوہ ہربرٹ اسپینسر کا انیس سے موازنہ ایس۔ اے۔ ایچ نقوی نے پیش کیا ہے۔ یہ کتاب اُردو دان طبقے سے زیادہ انگریزی سمجھنے والے قارئین کو میر انیس کے فن اور شخصیت سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کرے گی۔ مغرب میں اُردو شاعری کے حوالے سے مرثیے کا کوئی خاص تصور نہیں پایا جاتا۔ اس قسم کی کتابیں اور کوششیں مستحسن ہیں کہ اُردو کا عالمی تصور قائم کرتی ہیں۔

ماہنامہ "ادبِ لطیف" لاہور

ستمبر ۲۰۰۳ء

آغا عبدالحسن سرحدی (فیصل آباد)

ترے ضمیر کے اختر کی ہر طرف ہے چمک
یہ شمع نور فشاں تو نے ہی جلائی ہے
قلم کی نوک ستاروں کی روشنائی سے
حکایت ایسی لکھی جو سبھی کو بھائی ہے

شفیع عقیل

کتاب "کلامِ ضمیر" پر تبصرہ

جنگ سنڈے میگزین ۲۳ر نومبر ۲۰۰۸ء

شاعر : علامہ ضمیر اختر نقوی

ناشر : مرکزِ علومِ اسلامیہ 4-I نعمان ٹیرس فیز III
گلشن اقبال بلاک 11، کراچی

صفحات : ۲۹۶

قیمت : دو سو روپے

علامہ سید ضمیر اختر نقوی مذہب کے حوالے سے ایک صاحب علم و فضل شخصیت ہیں اور معروف ذاکر ہیں۔ آپ شاعر بھی ہیں، ادیب بھی ہیں، محقق بھی ہیں اور اب تک آپ کی متعدد تصانیف و تالیفات شائع ہو چکی ہیں۔ ادب میں میر انیس یا انیسیات ان کا مخصوص موضوع ہے، جس پر انہوں نے مختلف پہلوؤں سے کام کیا ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو رثائی ادب کے بارے میں آپ نے بہت کام کیا ہے۔ یہ کتاب بھی رثائی کلام پر مشتمل ہے مگر یہ ان کی اپنی شاعری ہے، جس میں ان کے مرثیے، سلام اور نوحے شامل ہیں، ادب کے سنجیدہ قارئین اس حقیقت سے یقیناً آگاہ ہوں گے کہ

مرثیہ نگاری اردو زبان و ادب میں قدیم دور سے ہوتی آ رہی ہے اور ہمارے ادب کا وقیع حصہ ہے۔ اگرچہ کلاسیکی دور میں رثائی شاعری نے جو عروج حاصل کیا تھا، وہ آج نہیں ہے، اس کے باوجود اس جدید دور میں بھی مرثیہ لکھا جا رہا ہے اور بعض شاعروں کو اس میں اختصاص حاصل ہے۔ جنہوں نے اپنے عہد کے تناظر میں مرثیے لکھے ہیں۔ علامہ ضمیر اختر نقوی کے مرثیوں کے بارے میں کوئی رائے دینا میرا منصب نہیں ہے۔ چنانچہ کتاب کے شروع میں ان کی شاعری اور ادبی شخصیت کے متعلق جو آٹھ مضامین شامل ہیں، ان میں سے ایک لکھنے والے کی چند سطور پیش ہیں۔ ڈاکٹر سید ماجد رضا عابدی اپنے مضمون میں لکھتے ہیں۔ ''جس طرح علامہ ضمیر اختر نقوی کی خطابت میں میر انیسؔ کا رنگ نمایاں ہے اسی طرح ان کے مرثیوں میں بھی اتباعِ میر انیسؔ نظر آتی ہے اور یہ ان کے عارفِ فن ہونے کی دلیل ہے۔ گو کہ تعداد میں تین مرثیے ہیں لیکن طرزِ نگارش، اسلوب، الفاظ کی نشست و برخاست، حسنِ تراکیب، اعلیٰ مضامین اور مرثیے کے اصول و قواعد کی پابندی کی وجہ سے کئی دوسرے مرثیہ نگاروں کی جلدوں پر بھاری ہیں''۔

پروفیسر کرار حسین

''اگر ضمیر اختر نقوی کی محنت کی داد نہ دی جائے تو یہ ایسی ناقدری ہوگی جو احسان فراموشی کی حدود کو چھوتی ہے۔''

شفیع عقیل

کتاب "احساس" پر تبصرہ

جنگ سنڈے میگزین ۲۳ر نومبر ۲۰۰۸ء

مرتب : محمد عباس نقوی

ناشر : مرکز علوم اسلامیہ 4-I نعمان ٹیرس فیز III
گلشن اقبال بلاک 11، کراچی

صفحات : ۳۳۸

قیمت : تین سو روپے

اس کتاب پر کسی تبصرے کی گنجائش نہیں ہے۔ صرف اتنا جان لیں کہ اس میں علامہ سید ضمیر اختر نقوی کی وہ تقریریں، انٹرویوز، خبریں، تبصریں اور اسی طرح کی دیگر تحریریں مرتب کی گئی ہیں جو مختلف اوقات میں اخباروں اور رسالوں میں شائع ہوتی رہی ہیں۔ تاہم بعض تحریروں میں ان کے خیالات ونظریات سے آگاہی ہوتی ہے۔ اس کا ایک مختصر حصہ انگریزی میں ہے، جس میں ان کی بعض کتابوں پر کیے گئے تبصرے بھی شامل ہیں۔

سید کمال حیدر رضوی

شہیدِ علمائے حق

ہماری علمی تاریخ میں کچھ شخصیتیں ایسی ہیں جن کے نام تو بہت معروف ہیں لیکن ان کی زندگی، شخصیت، کردار اور کارناموں کے بارے میں بہت کم لوگ جانتے ہیں بلکہ جس لقب سے وہ شخصیات معروف ہیں اس لقب کا سبب بھی لوگ نہیں جانتے اور حیرت ناک اور افسوس ناک بات یہ ہے کہ خود ان شخصیات کی روایت کو آگے بڑھانے والے بھی اس معاملے میں عوام الناس کی صف میں نظر آئیں گے۔

یہ ہستیاں شہدائے خمسہ کی ہیں یعنی شہید اوّل شیخ شمس الدینؒ، شہید ثانی شیخ زین الدینؒ، شہید ثالث حضرت قاضی نور اللہ شوستریؒ، شہید رابع مرزا محمد کامل دہلوی اور شہید خامس آیت اللہ محمد باقر الصدر ہیں۔

تاریخ علم و ادب کی نامور شخصیت حضرت علامہ ضمیر اختر نقوی مدظلہٗ نے جہاں اور موضوعات پر قلم اٹھایا ہے وہاں ان ہستیوں کی حیات پر یہ کلیدی کتاب تصنیف فرما کر صاحبان فقہ و شریعت پر احسان عظیم کیا ہے۔

آپ نے اس کتاب میں ان ہستیوں کے حالات زندگی، ان کی علمی خدمتیں، اور کارناموں کے بارے میں تحریر فرمایا ہے علاوہ ازیں اس بات کی بھی صراحت کی ہے کہ انہیں شہید اوّل، شہید ثانی کیوں کہتے ہیں کیا ان سے قبل تاریخ علماء میں کوئی شہید نہ تھا؟

ساتھ ساتھ آپ کی یہ کتاب اردو زبان میں اس موضوع پر لکھی جانے والی پہلی اور واحد کتاب ہے الگ الگ نامکمل حالات تو ان ہستیوں کے اردو میں کہیں کہیں مل جاتے ہیں لیکن اس طرح یکجا ہو کر نہ تھے۔

❁❁❁

آغا عبدالحسن سرحدی

(فیصل آباد)

تیرے ضمیر کا اختر بڑے عروج پہ ہے
خدا کرے کہ سدا یونہی بے زوال رہے

❁

پروفیسر ڈاکٹر ظفر ہاشمی

(کراچی)

کہاں میں اور کہاں "القلم" کی بزم ادب
کمال میرا نہیں، معجزہ "ضمیر" کا ہے

وحید الحسن ہاشمی

حضرتِ جعفرِ طیار

مندرجہ بالا کتاب جناب جعفرِ طیارؑ کی سوانح حیات ہے جسے مولانا ضمیر اختر نقوی نے تحریر کیا ہے اور مرکزِ علومِ اسلامیہ کراچی نے شائع کیا ہے۔ کتاب ۲۰۸ صفحات پر مشتمل ہے اور کاغذ، کتابت اور جلد دیدہ زیب ہے۔ جس عرق ریزی اور جاں فشانی سے یہ کتاب مکمل ہوئی ہے، اس کی داد نہ دینا بخل ہے۔ مولانا نے اپنے پیش لفظ میں قوم کا جو نوحہ پیش کیا ہے، اسے انہی کی زباں سے سنتے چلئے۔

"ملتِ تشیع میں جو با اثر اور پیسے والے مشہور ہیں، ان کی توفیقات تو پروردگار نے سلب کرلی ہیں، نہ جانے شیعہ قوم کے خمس کا پیسہ کہاں جا رہا ہے، جو ادارے خمس کے مال سے چل رہے ہیں تو وہ اہلِ بیتؑ ہی کے خلاف کتابیں چھاپ رہے ہیں جن میں توہینِ وقارِ اہلِ بیتؑ ہوتی ہے اور قوم انہی کو پیسہ دیئے جا رہی ہے یا پھر ان کے ہاتھوں میں کھیل رہی ہے۔"

اگر مولانا کا درج بالا قول درست ہے تو قوم کے مقتدر حضرات کو اس پر سنجیدگی سے غور کر کے اس کا مداوا کرنا چاہئے۔ اگر خود شیعہ ہی شیعیت کشی کر رہے ہیں تو ہم اغیار کی غیر مہذب اور غیر مصدقہ باتوں کا جواب کس طرح دے سکتے ہیں۔

کتاب میں بڑی تفصیل سے حضرت جعفرِ طیارؑ کے آبا و اجداد کا ذکر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ حضرت جعفرِ طیارؑ خلقت اور سیرت میں رسالت مآبؐ کی شبیہ تھے اور

آپ نے پہلی نماز حضور اکرم کی امامت میں ادا کی۔ تمام آئمہ اہل بیت نے کہا ہے کہ حضرت جعفر طیارؑ کو خدا نے دو پر دیئے ہیں اور وہ جنت میں اُڑتے پھرتے ہیں۔ کتاب میں ہجرت حبشہ کا تفصیلی تذکرہ ہے۔

جعفر طیارؑ نے جس بے باکی اور جواں مردی سے شاہ حبش کے دربار میں اسلام کا موقف پیش کیا ہے، کتاب میں اس کی روداد موجود ہے۔ جنگِ موتہ میں حضرت جعفر طیارؑ شہید ہو گئے۔ جب رسول اکرم کو یہ خبر ملی تو آپؐ نے جناب فاطمہؑ سے کہا کہ جعفرؑ کے گھر تین دن تک کھانا پہنچائیں، یہ رسم سادات کے گھرانوں میں آج تک رائج ہے۔ حضرت علیؑ نے اپنی بیٹیوں کی شادی جعفرِ طیارؑ ہی کے فرزندوں سے کی تھی۔ کتاب میں نماز جعفرِ طیارؑ کی تفصیل اور مشہور شعراء کا جناب جعفرؑ کو نذرانہ عقیدت بھی درج ہے۔ کتاب کا ہدیہ مبلغ سو روپے ہے اور ملنے کا پتہ 4-1 نعمان ٹیرس فیز-III گلشن اقبال بلاک ۱۱ کراچی ہے۔ (ماہنامہ ''پیامِ عمل'' لاہور فروری ۱۹۹۹ء)

حاجی ممنون حیدر جعفری علیگ (گونڈہ، انڈیا)

جناب ضمیر بھائی السلام علیکم! مزاج گرامی!

ضمیر بھائی! نقن صاحب قبلہ کا میں علی گڑھ میں شاگرد رہ چکا ہوں جبکہ ڈاکٹر کلب صادق صاحب میرے ہم عصر رہے ہیں، لیکن اگر آج بھی مجھ سے کوئی سوال کرے کہ ممنون! تم سب سے زیادہ ذاکرین میں کس سے متاثر ہوئے تو میں صرف اور صرف ضمیر اختر صاحب کا نام لوں گا جو جسمانی حالت میں سب سے کمزور لیکن آواز اور صلاحیت کی دنیا کا سب سے بڑا شیر۔ خدا آپ کو سلامت رکھے!

وحید الحسن ہاشمی

کتاب حضرت اُم البنینؑ پر تبصرہ

نام کتاب	:	حضرت اُم البنین سلام اللہ علیہا
نام مصنف	:	علامہ سید ضمیر اختر نقوی
سال اشاعت	:	2006ء
ناشر	:	مرکز علوم اسلامیہ
قیمت	:	پانچ سو روپے
ملنے کا پتہ	:	1-4 نعمان ٹیرس فیز III بلاک 11 گلشن اقبال، کراچی

یہ کتاب 512 صفحات پر مشتمل ہے جس پر جناب آغا روحی لکھنوی اور عباس نقوی نے دیباچے تحریر کئے ہیں۔ یہ کتاب ۲۳ ابواب میں تقسیم کی گئی ہے اور مصنف نے متعدد کتابوں اور رسالوں کو پڑھ کر پوری تحقیق کے ساتھ جناب ام البنین کے کوائف ہمارے سامنے پیش کئے ہیں آپ نے ان بد اعتقاد مصنفوں کا بھی تذکرہ کیا ہے جو محمدؐ و آل محمدؐ کی شان میں گستاخیاں کرتے رہتے ہیں۔

مصنف نے اس بی بی کے خاندان کا بھی بڑی تفصیل سے تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس بی بی کا لقب باب الحوائج ہے حضرت عباسؑ کو بھی باب الحوائج کہا جاتا ہے اس

طرح یہ ماں بیٹے دونوں مومنین کی حاجتوں کو بر لانے والے ہیں۔ جناب اُم البنین کے والد حزام کلابیہ تھے۔ محترمہ پانچویں ہجری میں پیدا ہوئیں اور واقعہ کربلا کے تین سال بعد وفات پا گئیں آپ کا مزار جنت البقیع میں جناب فاطمہ زہرا کی قبر کے بالکل نزدیک ہے۔ ایک بار رسولِ خدا نے فرمایا تھا کہ میں فواطم (فاطمہ کی جمع) کا بیٹا ہوں اسی بنا پر جناب اُم البنین کے والدین نے آپ کا نام فاطمہ رکھا تھا چونکہ آپ کے چار فرزند پیدا ہوئے اس لئے عربوں کے رواج کے مطابق آپ کو اُم البنین یعنی زیادہ بیٹوں کی ماں کہا جانے لگا۔

علامہ ضمیر اختر تاریخ داں کے علاوہ محقق بھی ہیں انھوں نے اس کتاب میں جس واقعے کا تذکرہ کیا ہے اس کا حوالہ دینا ضروری سمجھا۔ جناب اُم البنین کے خاندانی حالات اور ان کی حضرت علی سے شادی کے واقعات جتنی تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں اردو کی کسی ایک کتاب میں نہیں ملتے اسی کتاب میں حضرت عباس کی ولادت ان کی جوانی اور شہادت کا بھی ذکر ہے۔ مصنف نے ہم پر بڑا احسان کیا ہے کہ ذاکروں کے اس قول کو رد کر دیا کہ شمر ملعون کی جناب اُم البنین سے رشتہ داری تھی انھوں نے تحریر کیا ہے کہ شمر خناز بنتِ حارث کے بطن سے ۱۱ ہجری میں پیدا ہوا خناز بدبودار عورت کو کہا جاتا ہے اسے برص کا مرض تھا شمر بھی برصی تھا بھلا اس کا خاندان اُم البنین سے کیا تعلق۔ حضورؐ نے ایک مرتبہ شمر کے بارے میں پیشنگوئی کی تھی کہ میں ایک مبروص کتے کو دیکھ رہا ہوں جو میرے اہل بیت کا خون چاٹ رہا ہے۔

مولانا کا طرز تحریر استدلالی ہے کتاب نہایت سلیس انداز میں لکھی گئی ہے اور جگہ جگہ اردو شعرا کے اشعار کے حوالوں سے دلچسپی قائم کی گئی ہے۔ آپ کے طرز تحریر کا صرف ایک نمونہ قارئین کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

جناب حمیدہ (اُم البنین) محافے میں رات کو حضرت بلقیس کی صورت جلوہ گر تھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا جیسے قرآن کے سورہ واللیل میں آفتاب چمک رہا ہو۔ (ص ۱۰۹)

کتاب کے آخر میں میر خلیق، میر انیس، مرزا دبیر، میر مونس، وحید الحسن ہاشمی، ڈاکٹر خاکی، سردار نقوی اور شاہد نقوی صاحبان کے جناب اُم البنین کے متعلق مرثیے پیش کئے گئے ہیں۔ (ماہنامہ پیام عمل لاہور۔ اپریل ۲۰۰۶ء)

سبطِ حسن انجم

"بہادر شاہ ظفرؔ نے مرزا غالبؔ کے لئے بیسنی روٹیاں بھجوائیں۔ غالبؔ نے اپنے ایک قطعے میں ذکر فرمایا۔ میرے لئے علامہ ضمیر اختر صاحب نے ازراہِ نوازش پان بھجوائے میں نے قطعے میں موصوف کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو:"

قطعہ

فرض اظہار تشکر مجھے کرنا ہے ادا
مجھ پہ احساں کیا اک میرے گرم گستر نے
بھیج کر پان کیا سرخرو مجھ کو انجم
مشفقی حضرت علامہ ضمیر اختر نے

(۱۰ مئی ۱۹۹۶ء)

چوہدری تبسم نواز احمد (آفیسر یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ)

مطبوعہ مجالسِ ترابی کے اثرات

مکرمی و محترمی علامہ سید ضمیر اختر نقوی صاحب!

السلام علیکم!

آپ کے موقر ادارے کی طرف سے شائع کردہ علامہ رشید ترابی مرحوم کی تقاریر کے مجموعہ جات، بعنوان "حیات طیبہ" "کفران نعمت" "توحید اور شرک" "علم معصوم" "ملک عظیم" "قیامت اور قرآن" وغیرہ پڑھنے کا موقع ملا، یقین جانیں میرے دل کی بیٹری ری چارج (Recharge) ہو گئی۔ میری طرف سے شکریہ قبول کریں کہ آپ اس گئے گزرے دور میں اس طرح دل جمعی اور تن دہی سے دین وملت کی خدمت اور اشاعت اسلام کا فریضہ سرانجام دے رہے ہیں۔

آپ کو یہ سن کر خوشی اور حیرت کا ملا جلا احساس ہوگا کہ احقر اہل سنت والجماعت سے تعلق رکھتا ہے، لیکن میرے کتب خانے میں زیادہ تر کتب اور وڈیو اور آڈیو کیسٹ شیعہ علمائے کرام کی ہیں اور میں ان کو اپنے حلقہ احباب میں circulate کرتا رہتا ہوں، تاکہ اتحاد بین المسلمین کی فضا پیدا کی جاسکے اور ایک دوسرے کو زیادہ بہتر طور پر سمجھا جاسکے۔

ڈاکٹر ماجد رضا عابدی:

دانشوروں، ادیبوں، ماہرینِ تعلیمات، شعرا، اسکالرز، طلبا اور احباب کے خطوط علّامہ ضمیر اختر نقوی کے نام

کسی معروف شخصیت کی حیات وخدمات پر کام کے حوالے سے خطوط کا گوشہ بہت اہمیت اور دلچسپی کا حامل ہوتا ہے۔ اس شخصیت کے نام دنیا کے مختلف ممالک سے دانشوروں، ادباء، اور معروف شخصیات اور احباب کے خطوط سے دنیا کے دانشوروں کے ناموں کا ایک اشاریہ بھی مرتب ہو جاتا ہے۔ علّامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کے نام جو خطوط ہیں وہ اپنے موضوعات کے ذیل میں اگر تقسیم کیے جائیں تو بھی بڑی دلچسپ صورتِ حال سامنے آتی ہے۔ ان میں کچھ خطوط مشاہیر کے ہیں جنہوں نے علّامہ صاحب کے کاموں پر علّامہ صاحب کو خراجِ عقیدت پیش کیا ہے، کچھ خطوط ایسے ہیں جن میں ادب اور ادبی شخصیات کے حوالے سے سوالات کیے گئے ہیں اور علّامہ صاحب سے معلومات حاصل کی گئی ہیں ان میں محققین بھی ہیں، شعراء بھی ہیں، اسکالرز بھی ہیں، مولفین بھی ہیں، مصنفین بھی ہیں اور مترجمین بھی ہیں۔ ایک بات جو سامنے آئی ہے ان مشاہیر نے علّامہ صاحب سے جو استفسارات کیے ہیں ان میں کتابی حوالہ جات کے متعلق بھی دریافت کیا گیا ہے اور بعض ایسی معلومات ہیں کہ جو کتابوں سے

ہٹ کر وہ ہیں جو صرف علامہ صاحب کے ذہن میں محفوظ ہیں۔ کچھ خطوط ایسے ہیں جن میں کچھ اسکالرز پی ایچ ڈی کی تکمیل کے لیے علامہ صاحب کی رہنمائی چاہتے ہیں۔ کچھ خطوط ایسے ہیں جن میں مشاہیر نے معاشی اور معاشرتی حوالوں سے علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب سے امداد طلب کی ہے۔ کچھ خطوط ایسے ہیں کہ جن میں شاعری اور شعراء کے حوالے سے گفتگو ہے اور اسی طرح دیگر خطوط بھی ہیں، اور ان خطوط سے علامہ ضمیر اختر نقوی کی شخصیت کی گمبھیرتا اور وسعت کا اندازہ ہوتا ہے، مثلاً سینکڑوں کتابوں کے مصنف اور عالم مولانا آغا مہدی لکھنوی جو عمر میں علامہ ضمیر اختر نقوی سے بہت بڑے تھے لیکن علم عمر کی قید میں مقید نہیں ہوتا علامہ صاحب کی علمیت کے قائل تھے کیونکہ علامہ صاحب کے ذہن میں بھی انکشافات کا زاویہ رہتا ہے اور یہی مزاج آغا مہدی اعلیٰ اللہ مقامہٗ کا بھی تھا اسی لیے آغا مہدی سے بھی خط و کتابت جاری تھی۔ آغا مہدی علامہ صاحب کو اس طرح مخاطب کرتے تھے۔

"واعظ و ذاکر شیریں بیاں ضمیر اختر صاحب سلمہٗ"

یہ خط ۱۹۸۳ء کا ہے نہ صرف علامہ صاحب بلکہ ان کے والد سید ظہیر حسن نقوی اعلیٰ اللہ مقامہٗ سے بھی مراسم تھے چنانچہ لکھتے ہیں۔

"آپ کے والد ماجد جب ولایت سے آئیں تو مجھے اطلاع ضروری ہے، میرے زندگی کے مشوروں میں ان کا زبردست ہاتھ ہے"۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی شہرت بحیثیت ماہر انیس آج سے نہیں بلکہ برسہا برس سے ہے۔ ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا خط ۱۹۷۰ء کا ہے جب علامہ صاحب صرف ۲۸ برس کے تھے، اس وقت علامہ صاحب کی شہرت ادب کے معتبر حلقوں تک پہنچ چکی تھی۔

"آپ کے خط نے بہت متاثر کیا" "آج کل" انیس نمبر میں مشمولہ میرا مضمون آپ

کو پسند آیا، یہ میری خوش بختی ہے، یہاں کے ادبی حلقوں میں بھی اُسے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا، یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ نگار، سیپ، ماہِ نو، اردو اور اردو نامہ نے بھی انیسؔ نمبر شائع کیے، اگر ان نمبروں میں سے کچھ بھجوا سکیں یا انیسؔ پر کوئی کتاب وہاں کی مطبوعہ بھجوا سکیں تو۔ حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کو"

انیس اور انیسیات کے حوالے سے انور سدیدؔ کے ایک خط کے اقتباسات ملاحظہ ہوں۔

"آپ نے جن اشعار کا تذکرہ کیا ہے۔ میں نے ڈاکٹر سہیل بخاری کی وساطت سے سلاموں کی ایک بوسیدہ کتاب میں سے لیے تھے۔ یہ کتاب نہ معلوم کس صاحبِ ذوق نے تالیف کی، شروع کے اوراق پھٹ چکے تھے۔ البتہ کتاب میں متذکرہ اشعار میر انیسؔ سے ہی منسوب تھے۔ یعنی ان کی صحت پر قطعاً اصرار نہیں۔ اگر یہ الحاقی اشعار ہیں تو مطلع کیجیے تا کہ قلم زد کردوں۔ اس توجہ کے لیے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا"

میر انیسؔ کی صد سالہ برسی کی تقریبات علامہ ضمیر اختر نقوی نے پاکستان کے مختلف شہروں میں ۷۳-۱۹۷۲ء میں منعقد کیں یہی وہ دور تھا اور علامہ صاحب کی کوششیں تھیں کہ آج جدید مرثیے کے حامی جو کل تک انیسؔ کا نام نہیں لیتے تھے وہ بھی انیس کی یاد میں کانفرنس، سیمینار اور جلسے کر رہے ہیں اور یہ علامہ ضمیر اختر نقوی کی کامیابی کا بیّن ثبوت ہے۔ چنانچہ انور سدید اپنے اسی خط میں انیسؔ صدی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

"آپ میر انیسؔ کی صد سالہ برسی پر جو محنت کر رہے ہیں اور رسائل اور مسلسل نمبر شائع کروا رہے ہیں۔ یہ بے حد قابلِ قدر ہے۔ "ماہِ نو" میں آپ کا عمدہ مقالہ نظر سے گذرا اور میں نے اس کی ستائش سب اہلِ ادب

سے کی اور اس سے متعدد بار استفادہ بھی کیا۔ ازراہ کرم یہ سلسلہ جاری رکھیے"۔

ایک اور خط ممتاز دانشور ممتاز حسن کا ملاحظہ ہو یہ خط بھی علامہ ضمیر اختر نقوی کی ان کوششوں کی طرف اشارہ کرتا ہے جو آپ نے میر انیسؔ کی صد سالہ برسی کے انعقاد کے لیے ستر کی دہائی میں انجام دیں۔ ممتاز حسن صاحب رقم طراز ہیں۔

"گرامی نامہ موصول ہوا، میں نے میر انیسؔ پر مقالہ لکھنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ البتہ لکھنا ضرور چاہتا ہوں اس لئے لازم ہے کہ انیسؔ کو دوبارہ پڑھوں اور ان کے کلام پر ازسر نو غور کروں۔ انیسؔ اتنا بڑا شاعر ہے کہ اس پر سطحی طور سے کچھ کہنے یا لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ خدا مدد کرے تو میرا لکھنے کا ارادہ تکمیل کو پہنچے گا مگر اس میں دیر لگے گی۔

مقالہ جب بھی مکمل ہوا۔ آپ سے براہ راست یا مشفق خواجہ کی وساطت سے رجوع کروں گا"۔

اسی ذیل میں ڈاکٹر فرمان فتح پوری کے ایک خط کے اقتباسات ملاحظہ فرمائیں۔

"برادر محترم و برادر عزیز سلام اور دعائیں، محترم اور سلام اس لئے کہ آپ تنہا اس دور میں انیسؔ شناس ہیں۔ کم از کم مجھ سے تو بہت زیادہ میر انیسؔ کو جانتے پہچانتے ہیں عزیز اور دعائیں اس لیے کہ آپ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں، گو یہاں بھی میں غلطی کر گیا، بزرگی کا تعلق عمر و سال سے ہے یا علم و عقل سے؟"

"میرا پختہ ارادہ تھا کہ کتاب ملتے پر سب سے پہلے آپ کو بھیجوں گا کہ آپ ہی اس کے اصل حقدار ہیں۔ لیکن ایک طرح سے میرا ارادہ

تکمیل کو پہنچا کہ کتاب سب سے پہلے آپ کو پہنچ گئی"۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی علمیت کا ایک جہاں معترف ہے اور لوگ جانتے ہیں کتاب کے مغز تک پہنچنا، اس کے مقصد و مفہوم کو سمجھنا علامہ ضمیر اختر نقوی کا خاصہ ہے۔ میں نے بھی اس بات کا مشاہدہ کیا ہے کہ علامہ ضمیر اختر نقوی کی روحانیت اور ان کی علمی کشش کا حصار ایسا ہے کہ کتاب خواہ قلمی ہو، خواہ مطبوعہ ہو، قدیم ہو یا جدید اپنا سفر طے کرتی ہوئی علامہ صاحب تک پہنچ جاتی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ دانشوروں کو بھی اس بات کا ادراک ہے کہ اگر کوئی قیمتی کتاب ہے تو اس کا قدردان اس وقت دنیا کے کس گوشے میں موجود ہے۔ لہٰذا معروف ادیب اور مصنف تحسین سروری (انجمن ترقی اردو) کا ایک خط اس ضمن میں ملاحظہ ہو۔

"پرانی کتابوں کے تاجر کے یہاں میں نے آل انڈیا شیعہ کانفرنس ۱۹۱۳ء کے مختلف مقامات پر ہونے والے مختلف اجلاسوں کی مفصل رپورٹ پر مشتمل ایک نسخہ دیکھا۔ اور اس کو میں نے روک لیا ہے۔ یہ رپورٹ بڑی ضخیم ہے۔ قطع نظر مذہبی اور ثقافتی معلومات کے اس کی مجھے تاریخی اور ادبی حیثیت بھی محسوس ہوئی۔ اس میں شعرائے لکھنؤ کی چند منظومات بھی ہیں۔ کانفرنس کے سلسلے میں چند مشاہیر ہند کے نام بھی آتے ہیں اس لحاظ سے مجھے خیال ہوا کہ شاید یہ نسخہ آپ کے کام کا ہو"۔

ابتدا میں میں نے عرض کیا کہ جب علامہ صاحب لکھنؤ پہنچ جاتے ہیں تو لکھنؤ میں محرم ہو جاتا ہے۔ وہاں کے اس ماحول کی عکاسی لکھنؤ کی ایک معروف شخصیت مسعود حسین زیدی کے خط سے اجاگر ہوتی ہے۔ وہ اپنا خط اس بند کے ساتھ شروع کرتے ہیں جو علامہ صاحب کی ہی مدح میں ہے۔

"صبح ادب کا نیر تاباں ضمیر ہے　　شام سخن کا ماہ درخشاں ضمیر ہے
صد افتخار بزمِ سخنداں ضمیر ہے　　منبر گواہ، میثم دوراں ضمیر ہے

تقریر میں تھا رنگ عیاں اجتہاد کا
ہر دل پہ نقش چھوڑ گیا اپنی یاد کا

میاں صاحبزادے ادب، تحقیق فن خطابت کے چند روزہ آفتاب کے ضیا بار ہونے سے جو روشنی ملی تھی وہ آپ کے فراق میں دلوں پر بجلیاں گرا رہی ہے راستہ چلنا دوبھر ہو گیا مجھے مومنین، شائقین بے تابانہ راستوں پر روک کر خیریت دریافت کرتے ہیں۔ میں نے یہ سوچا ہے کہ ایک تختی گلے میں لٹکا کر نکلوں"۔

"آپ کے مندرجہ احکام میں جلد از جلد بجالاؤں گا۔ دل نہیں مانتا پھر سن لیجئے کہ "قومی آواز" کی میگزین میں آپ کی تعریف اکبر حیدری نے جو کی ہے وہ بھی ناقابل فراموش ہے۔ میں فرداً فرداً واقعات نہیں تحریر کر سکتا آپ کے قریبی دوستوں کے علاوہ تمام لوگوں نے جو آپ کے قصیدے پڑھے وہ یادگار ہیں بلکہ یوں کہیئے کہ آپ کے بعض احباب شہرت کے طالب حاسد ہوتے جارہے ہیں۔ میں نے آپ کا مقبول عطیہ "انیس نمبر" کم از کم پانچ چھ ادیبوں کو دکھایا اس میں وہ منظر قابل دید ہے جو دربار واجد علی شاہ کی مجلس کا موقع ہے"۔

علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کے نام بہت سے خطوط ایسے ہیں جن میں علامہ صاحب سے کچھ معلومات کا سوال کیا گیا ہے۔ ان خطوط میں ایک خط مثال کے طور پر پیش کیا جارہا ہے۔ واضح رہے کہ خطوط کا یہ حصہ بہت مختصر طور پر کتاب میں شامل کیا گیا

ہے۔ ہر ادیب کا ایک ایک خط شامل کیا گیا ہے۔ عبدالقوی دسنوی بھوپال سے تعلق رکھنے والے ایک ادیب اپنے ۱۳ مارچ ۱۹۷۶ء کے خط میں علامہ ضمیر اختر نقوی سے مرزا دبیر کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔

"میں "دبیر نما" تیار کر رہا ہوں۔ سنا ہے کہ وہاں دبیر پر کچھ نمبر شائع ہوئے ہیں۔ اگر آپ آسانی سے وہ نمبر بھجوا سکیں تو بے حد شکر گزار رہوں گا۔ لیکن اگر دشواری ہو تو کم سے کم یہ آگاہ فرمایئے کہ کن کن رسائل کے دبیر نمبر کب کب شائع ہوئے ہیں اور ان کے مضامین کی فہرست بھی عنایت کیجئے اور اس کے ساتھ دوسرے رسائل میں دبیر پر جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان کی فہرست بھی بھیج دیں تو بے حد ممنون ہوں گا اس طرح آپ کی مدد سے میرا کام زیادہ بہتر ہو جائے گا"۔

سید الطاف علی بریلوی سرسید ایجوکیشنل کانفرنس کی طرف سے رسالہ "العلم" نکالتے تھے۔ انیس صدی پر علامہ ضمیر اختر نقوی کی جو کاوشیں تھیں ان میں ایک "العلم" کا انیس نمبر نکلوانا بھی تھا۔ اسی سلسلے میں سید الطاف علی بریلوی کو "العلم" کے انیس نمبر کے سلسلے میں مواد اور رسالے کے Getup کے متعلق لکھا، انہوں نے ۵ جون ۱۹۷۳ء کو جواباً لکھا۔

"آپ کا کیم جون کا دوسرا خط ملا۔ اس کے ساتھ مجوزہ انیس نمبر کے "عنوانات" کی فہرست ملی۔ جن اصحاب کو مضامین کے واسطے خطوط آپ یا میں لکھیں گے اُن کے پتے بھی ملے۔ ساتھ ہی جو مضامین آپ کے پاس محفوظ ہیں اُن کی تفصیل معلوم ہوئی۔ یہ سب چیزیں تو ماشاءاللہ ایک بحر ذخار ہیں کئی ہزار صفحات درکار ہوں گے"۔

وَتَعَاوَنُوا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى

نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرو

علم و ادب کا فروغ، معلومات کا اجراء، تحقیق و انکشاف کا احیاء ایک مخلص ادیب اور اسکالر کی پہچان ہوتے ہیں یہ اور اس جیسی خصوصیات اور صفات نہ صرف انسان کی خود شناخت بن جاتے ہیں بلکہ معاشرے کے لیے بھی فیض رساں ہوتے ہیں۔ حضرت علیؑ کا ارشاد مقدس ہے کہ دولت خرچ کرنے سے کم ہوتی ہے اور علم خرچ کرنے سے بڑھتا ہے۔ یہی وہ فارمولا ہے۔ جس نے علامہ ضمیر اختر نقوی کو علم کی ان بلندیوں پر پہنچا دیا ہے کہ جہاں حریف بھی علامہ ضمیر اختر نقوی کی علمی حیثیت کے معترف نظر آتے ہیں۔ دنیا کے مختلف حصوں میں جو لوگ پی ایچ ڈی کر رہے ہیں وہ علامہ صاحب سے گاہے بگاہے اپنے مقالے کے سلسلے میں رہنمائی لیتے رہے۔ بعض پی ایچ ڈی ایسے ہیں کہ جو تمام کے تمام علامہ ضمیر اختر نقوی کی ذاتی لائبریری سے تیار کر کے روانہ کر دیے گئے اور مقالہ نگار کا کام صرف ڈگری کا حصول رہ گیا۔ بعض لوگوں نے سوالنامے بھیجے، بعض نے اپنے مقالے کے لیے Synopsis کی درخواست کی، بعض نے یہ پوچھا کہ پی ایچ ڈی کا موضوع کیا ہونا چاہیے، بعض نے یہ دریافت کیا کہ جس موضوع پر ہم پی ایچ ڈی کر رہے ہیں اس کو کن خطوط پر استوار کیا جائے۔

بعض خطوط ایسے ہیں جن میں اپنی ذاتی تصنیف اور تالیف کے لیے سوالات کیے گئے۔ چنانچہ ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی ہمشیرہ محترمہ تہذیب سجاد کا خط اسی سلسلے میں ملاحظہ ہو۔

"میں سجاد باقر رضوی کی بہن ہوں۔ آپ کے پاس اس سلسلے میں آئی تھی کہ میں میرانیس کے مرثیوں پر ریسرچ کرنا چاہتی ہوں۔ سجاد باقر رضوی

(میرے بھائی) نے مجھے جو موضوع (میر انیسؔ کے مرثیوں میں معاشرتی پہلو) دیا تھا اسے ڈاکٹر حسنی نے بتایا کہ اس پر ہندوستان میں ریسرچ ہو چکی ہے میں ایک مہینے سے کراچی یونیورسٹی کے چکر لگا رہی ہوں۔ ڈاکٹر حسنی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا کہ آپ مجھے دو تین مناسب موضوع بتا دیں''۔

محمد رفیق اسلم دہلی انڈیا کے ایک ادیب اپنی تحقیق کے سلسلے میں رقم طراز ہیں۔

۲۸ جون ۱۹۸۷ء

''بندہ شعبۂ اردو دلی یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہے اس سلسلے میں سرزمین پاک کی زیارت کی ہے، موضوع ''دیوان انشاءؔ کی ترتیب و تدوین'' ہے سنا تھا کہ یہاں انشاءؔ پر دو ریسرچ کے مقالے پیش کئے جا چکے ہیں یہاں آ کر معلوم ہوا کہ لاہور میں نہیں کراچی میں ہوا ہوگا، کراچی آنے سے مجبور ہوں از راہ کرم اس سلسلے میں میری بھی مدد فرمائیں کہ یہ مقالے کہاں کہاں ہیں اور یہاں کلیات، دیوان مطبوعہ و قلمی ہے؟''

ڈاکٹر ہلال نقوی کے مقالے کا بیشتر حصہ علامہ ضمیر اختر نقوی کی رہنمائی کا مرہون منت ہے وہ کہیں بھی رہے علامہ ضمیر اختر نقوی سے ان کا رابطہ مقالے کے سلسلے میں جاری رہا چنانچہ ڈاکٹر ہلال نقوی گھوٹکی سے ۱۱ ستمبر ۱۹۸۲ء کو لکھتے ہیں۔

''آپ کی دعاؤں سے زندہ ہوں گھوٹکی کی دم گھوٹنے والی فضا میں رہ کر مقالہ مکمل کر رہا ہوں۔ دو بہت ضروری زحمتیں دے رہا ہوں۔ جوابی لفافہ ساتھ ہے۔ جواب ابھی ابھی لکھ دیجئے۔

(۱) آپ نے ایک بار سنایا تھا کہ ذوق کے شاگرد ظہیر دہلوی (متوفی ۱۹۱۱ء) نے بھی مرثیے لکھے تھے اور کو لیسار میں کسی کے پاس ہیں۔ اس کے متعلق آپ کی کیا معلومات ہیں۔

(۲) جوش صاحب کے مرثیے کے پیش لفظ میں آپ نے لکھا تھا کہ رسوا کے مرثیے موجود ہیں آپ کے پاس، اس کا ذکر بھی کر دیجئے خط میں۔ میں ان دونوں شعرا کے ذکر میں آپ کے خط ہی کا حوالہ اپنے مقالے میں دے دوں گا۔ فوراً اور اسی وقت جواب لکھ دیجئے"۔

ملت کے نوجوانوں اور محرک لوگوں کی امداد بھی علامہ ضمیر اختر نقوی کی حیات کا ایک تابندہ گوشہ ہے اور معاشرے میں یہ بات بہت پہلے شہرت پا چکی تھی کہ فلاح و بہبود کے کاموں میں بھی علامہ ضمیر اختر نقوی کی ذات ہی Practical ہونے کے زمرے میں آتی ہے۔ علامہ طالب جوہری کا ایک خط اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ (کراچی ۱۹۸۰ء)

"دوبارہ پھر حاضر ہوا تھا اس شب میں جناب والا (اطلاع کے مطابق) رضویہ سوسائٹی میں کسی اجتماع میں تشریف رکھتے تھے۔

حامل رقعہ میرے دوست ہیں اور اہم کام کے سلسلے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں اپنے طور پر اس مسئلے کو حل فرما دیں تو نوازش ہوگی"۔

علامہ ضمیر اختر نقوی نے میر انیس کی صفات، ان کے فن اور شخصیت کو اجاگر کیا اور لوگوں کے دلوں میں میر انیس کی محبت اس طرح بٹھا دی کہ مخالفین انیس سے لوگ نفرت کرنے لگے۔ چنانچہ بمبئی کے ادیب جناب صفدر آہ اس سلسلے میں اپنے جذبات کا

اظہار یوں کرتے ہیں۔

"ڈاکٹر جعفری نے مجھے لکھ دیا تھا کہ کسی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو نے کہہ دیا تھا کہ انیس کا موضوع ڈاکٹریٹ کے لیے پست ہے۔ اس اطلاع پر میں آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ میں نے تو کہا تھا کہ ایسے صدر شعبۂ اردو کو یہاں کی یونیورسٹی سے ٹھوکریں مار کر نکال دیا جاتا"۔

علامہ ضمیر اختر نقوی کی خطابت تاریخ کا ایک ایسا سنگ میل ہے جو بذات خود نشان منزل ہے۔ علامہ صاحب نے خطابت کو ادب، تاریخ، قرآن، فلسفہ عمرانیات، لسانیات، تحقیقات، انکشافات، افکار، جدیدیت، جدت، سائنس اور علوم سے منسلک کر کے خطابت کے موضوعات کو اس قدر وسعت دے دی ہے کہ اختلافی مسائل ثانوی حیثیت اختیار کر گئے، علامہ صاحب نے مناظرے سے بچتے ہوئے ایسے تاریخی حقائق پر روشنی ڈالی اور اس انداز سے کہ سننے والا خواہ کسی مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا ہو سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ علامہ صاحب کی خطابت کا سب سے بڑا وصف منبر پر ان کا لب و لہجہ، اُن کا انداز، اُن کی زبان سادہ اور سلیس، اور کسی مسئلے کو سمجھانے کا طریقہ ہے۔ علامہ ضمیر اختر نقوی کی خطابت نے شیعہ اور سنی کو فکری طور پر بہت قریب کر دیا۔ لاہور میں عشرۂ مجالس سے جب علامہ ضمیر اختر صاحب خطاب کرتے ہیں تو لاہور کے بہت سے ادیب اور دانشور علامہ صاحب کی اردو سننے کے لیے ہی آتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ اب سے چھ سات برس قبل آٹھ محرم کی مجلس تھی پنجاب کے پیر طریقت سجادہ نشین حجرہ شاہ مقیم جناب آصف علی شاہ گیلانی جو پابندی سے ہر سال مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں وہ آئے اور انھوں نے علامہ صاحب سے درخواست کی کہ حضور آج آپ کی مجلس سننے پنجاب کے مشاہیر ادیب اور دانشور آئے ہوئے ہیں۔ اور اُن کی

فرمائش ہے کہ آج آپ اردو زبان پر تقریر کردیں۔ پنجاب میں علامہ ضمیر اختر نقوی نے جو Work اتحاد بین المسلمین کے لیے کیا ہے وہ دس برسوں کی انتھک محنتوں اور کاوشوں کا نتیجہ تھا جس کا پھل آج تک وہاں کے خطیب کھا رہے ہیں، پیر سید آصف علی شاہ گیلانی کا گرامی نامہ ملاحظہ ہو۔

"امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے کل بہت فون کیا مگر کوئی اُٹھا نہیں رہا تھا بہرحال آپ جیسے قابلِ قدر انسان بہت کم ملتے ہیں لیکن یہاں قدر شناس نہیں کہتے۔ بہرحال ہم تو آپ کے قدر شناس ہیں اور آپ کو پیار بھی کرتے ہیں کاش اہلِ سنت میں بھی آپ جیسا کوئی عالم پیدا ہو جائے تو لڑائی ختم ہو جائے۔ آپ کے علم سے استفادہ کرنا ان لوگوں کے لیے بہت ضروری ہے"۔

اسی ضمن میں لاہور ہائی کورٹ کے سینیر وکیل یوسف کاظمی ایڈووکیٹ کا ایک بیان جو انھوں نے ایک پریس کانفرنس میں دیا درج ذیل ہے۔

"جناب محترم ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب وہ بے مثال خطیب ہیں جو اسلام کے مختلف فرقوں کے درمیان اتحاد کے لیے کوشاں ہیں۔ اپنی تقاریر سے علمیت سے، مطالعہ تاریخ اور ریسرچ سے انھوں نے وہ مقام پیدا کرلیا ہے کہ شیعہ قوم کے علاوہ پڑھے لکھے اہلِ سنت بھی ان کی تقاریر سننے آتے ہیں۔ اور اکثر بذریعہ خطوط سوالات کرکے کئی چیزوں کی وضاحت بھی کراتے ہیں۔ لاہور میں چار برسوں کے اندر انھوں نے اپنے بے شمار مداح پیدا کرلئے ہیں۔ یہ مقبولیت کم خطیبوں کے حصے میں آتی ہے۔ انھوں نے کبھی فرقہ واریت کو ہوا نہیں دی اور نہ ہی مقبولیت

حاصل کرنے کے لئے اشتعال انگیزی کی ہے"۔

(ڈاکٹر) اکبر حیدری کشمیری کی ادبی لغزشوں سے ایک زمانہ واقف ہو چکا ہے، اس ضمن میں میں ایک تحقیدی، تفتیشی وتشویشی مضمون سہ ماہی ''القلم'' کے شمارے میں تحریر کر چکا ہوں میں نے کچھ استفسارات اکبر حیدری صاحب سے کیئے تھے لیکن خوشی اس بات کی ہے کہ وہ کسی کا بھی جواب نہ دے سکے یہی میرے اثبات وصدق کی دلیل ہے۔ بہر حال اب محترم اکبر حیدری صاحب کے پاس اس صداقت کا ایک ہی جواب ہے''فتمنّو الموت ان کنتم صٰدقین ''(سورۂ جمعہ) ڈاکٹر اکبر حیدری صاحب کی علمی، فکری، تحقیقی وتنقیدی امداد علامہ ضمیر اختر نقوی صاحب کی طرف سے گاہے بگاہے ہوتی رہی ابھی حال ہی میں آیت اللہ زنجانی پر جو ان کی کتاب آئی ہے۔ اس کا تمام بنیادی مواد علامہ ضمیر اختر نقوی نے ہی فراہم کیا۔ (حوالے کے لیے دیکھئے سہ ماہی القلم۔ شمارہ نمبر ۳) اکبر حیدری صاحب علامہ ضمیر اختر نقوی کی ان امدادی سرگرمیوں کا وقتاً فوقتاً شکریہ بھی ادا کرتے رہے وہ علامہ صاحب کی کتاب اشاریہ مرزا دبیر کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں۔

> ''جناب ضمیر اختر نقوی صاحب پاکستان کے جوان شاعر، ناقد اور ہونہار محقق ہیں۔ پاکستان میں جتنے بھی انیس نمبر اور دبیر نمبر شائع ہوئے ہیں۔ ان تمام شماروں میں وہ بہ اعتبار مضامین چھا گئے ہیں۔ انھوں نے ماہ نو میں مراثی انیس کا اشاریہ شائع کر کے ایک ادارے کا کام تنہا انجام دیا ہے''۔

''ماہ نو'' کے مدیر جناب فضل قدیر اپنے ایک خط مورخہ ۱۷، جون ۱۹۷۵ء میں تحریر طراز ہیں۔

"برادر وابستہ کام جاری رکھیے۔ کاش فرہنگ دبیر بھی بن جائے تو جان پڑ جائے...... الٰہی زورِ قلم اور زیادہ۔" افق پہ چھایا ہوا ہے ضمیر"

نہ معلوم یہ مصرع ہوا یا نہیں۔ لیکن بہر حال آپ اس صنف پر چھائے ہوئے ہیں"۔
علامہ ضمیر اختر نقوی کی ہر کتاب ایک پی ایچ ڈی اور ڈی لٹ کا مقالہ ہے گویا علامہ صاحب سیکڑوں P.H.D کر چکے ہیں اور کئی P.H.D اور D.Lit. کروا چکے ہیں۔
۶ مارچ ۱۹۹۷ء کو ڈاکٹر شارب ردولوی اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"آپ نے جی خوش کر دیا، میرا بس چلتا تو مبارک باد کے خط کے بجائے "خاندان میر انیس کے نامور شعراء" پر آپ کو ڈی لٹ کی سند دیے جانے کی سفارش کرتا۔ آپ کی یہ تصنیف تاریخ ادب اردو میں ہمیشہ یاد رکھی جائے گی"۔

خوش اخلاقی، ملنساری، حسن سلوک، خوش مزاجی، بذلہ سنجی ایک پر امن اور خوشگوار معاشرے اور ماحول کے لیے بہت ضروری ہے۔ یہی وہ رویے ہوتے ہیں جس سے ادب اور ادبی فضا پروان چڑھتے ہیں۔ مشہور تحت اللفظ خواں اور شاعر مرحوم سبط حسن انجم صاحب سے بھی علامہ صاحب کے دیرینہ اور دوستانہ مراسم تھے۔ اکثر تحائف علامہ صاحب اُن کی خدمت میں پیش کرتے تھے۔ میجر منور جعفری اپنے فارم کے پان علامہ ضمیر اختر نقوی کو بھجوایا کرتے تھے، اسی پس منظر میں سبط حسن انجم کا ایک خط ہدیہ بصارت ہے۔ ۶ نومبر ۱۹۹۰ء۔

"بہادر شاہ ظفر نے مرزا غالب کے لیے بیسنی روٹیاں بھجوائیں، غالب نے اپنے ایک قطعے میں ذکر فرمایا۔ میرے لیے علامہ ضمیر اختر

صاحب نے ازراہِ نوازش پان بھجوائے میں نے قطعے میں موصوف کا شکریہ ادا کیا ہے۔ ملاحظہ ہو۔

قطعہ

مجھ پہ احساں کیا اک میرے کرم گستر نے　　فرض اظہارِ تشکر مجھے کرنا ہے ادا
مشفقی حضرتِ علامہ ضمیر اختر نے　　بھیج کر پان کیا سرخرو مجھ کو انجم

علامہ ضمیر اختر نقوی نے شاہزادیٔ کونین خاتونِ جنت حضرت فاطمہ زہرا صلوٰۃ اللہ علیہا کی شہادت کے دنوں کی یادگار مجالس میں ایک تحریک جدید مرثیہ کہلوانے کی شروع کی اور اس سلسلے میں اعلانات کیے گئے۔ ہر سلام نگار اور نوحہ نگار کو =/۱۰۰۰ روپے فی کس اور ہر مرثیہ نگار کو =/۵۰۰۰ روپے فی کس ادا کیے گئے۔ کیونکہ ادب عالیہ جو مرثیے کا ادب ہے اس میں اس سے پہلے جناب سیدہؑ پر لکھے گئے مرثیوں کی تعداد بہت کم تھی اسی کے پیش نظر علامہ ضمیر اختر نقوی نے یہ تحریک شروع کی تھی اس سلسلے میں ہر مرثیہ نگار شاعر سے رابطہ بھی کیا گیا اور سب کو ترغیب دلائی گئی کچھ نے قبول کی اور کچھ نے عذر خواہی کی اور وہ مقصد کہ مرثیہ کی تعداد میں اضافہ ہو کچھ حد تک پورا ہوا۔ لاہور کے مشہور مرثیہ نگار عالی جناب وحید الحسن ہاشمی مدظلہ العالی کا ایک جوابی خط ملاحظہ ہو۔ ۹ ستمبر ۱۹۹۰ء۔

"آپ کی محبت و شفقت کا میں شروع ہی سے معترف ہوں شعرائے حق کی سرپرستی علمائے فن کا وتیرہ رہا ہے۔ آپ کے اس عمل نے مولانا سبط حسین جونپوری مرحوم اور مولانا محسن نواب مرحوم کی یادوں کو از سر نو تازہ کر دیا ہے۔

میں مرثیہ گوئی کے میدان میں ابھی طفلِ مکتب ہوں۔ آپ کے قیام

لاہور کے زمانے میں جو مرثیہ "کشمکش" میں نے شروع کیا تھا ابھی تک ناکمل ہے اس کو مکمل کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ جناب فاطمہؑ پر دو مرثیے کہہ چکا ہوں۔ اس لئے نئے مواد کی فراہمی میں بھی مہینے صرف ہوں گے پھر میری رفتار مرثیہ نگاری بہت سست ہے اس لیے وقتِ مقررہ تک کوئی نیا مرثیہ نہیں کہہ سکوں گا۔ اگر زندگی رہی تو سالِ آئندہ آپ کے حکم کی تعمیل بجالاؤں گا"۔

یہ خطوط ایک مختصر حصہ ہیں ان خطوط کا جو علامہ ضمیر اختر نقوی کے نام موجود ہیں۔ وہ تمام خطوط الگ کتابی شکل میں بھی شائع کیے جائیں گے۔ یہ خطوط پڑھنے سے علامہ ضمیر اختر نقوی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے اور علامہ صاحب پر کام کرنے والوں کے لیے نئی Dimensions بھی فراہم کرتی ہیں یہ خطوط دوسرے رُخ سے آپ بیتی والی دلچسپی اور جاذبیت رکھتے ہیں اور مکالے کا مزہ دیتے ہیں۔

سبطِ محمد نقوی (لکھنؤ)

محترم علامہ سید ضمیر اختر نقوی...... السلام علیکم!

میر مونس مرحوم کے حالات لکھ اور چھاپ کے آپ نے ایک اہلِ قلم کے سر سے ایک بڑے قرضے کا بار اُتارا۔ حضرت باری جزائے خیر سے مالا مال فرمائے! آمین۔ مضمون سیر حاصل ہے۔ اگلی فرصت میں مرحوم کے کلام پر بھی ایک جامع نظر...... اے برادر! تیری توفیق زیادہ ہوئے آمین۔ خداوندِ علیم آپ کی سربراہی میں مرکزِ علوم اسلامیہ اور اس کے مطبوعات و منشورات کو مقبولیت و مرجعیت ارزانی کرے۔ آمین۔

دانشوروں، ادیب، ماہرِ تعلیمات، شعرا، اسکالرز اور طلباء، احباب کے خطوط علامہ ضمیر اختر نقوی کے نام

(الف)

نمبر شمار	نام		صفحہ نمبر
۱۔	آل رضا (سید)	کراچی	۱۰۷۶
۲۔	آغا مہدی (مولانا)	کراچی	۱۰۷۷
۳۔	انور سدید (ڈاکٹر)	سرگودھا	۱۰۸۳
۴۔	الطاف علی بریلوی (سید)	کراچی	۱۰۹۰
۵۔	اسعد اریب (ڈاکٹر)	ملتان	۱۰۹۱
۶۔	احمد ندیم قاسمی	لاہور	۱۰۹۸
۷۔	امیر امام حر	لندن	۱۱۱۸
۸۔	اقبال احمد (ڈاکٹر)	لکھنؤ	۱۱۰۹
۹۔	اقبال کاظمی	کراچی	۱۱۱۳
۱۰۔	آصف علی گیلانی (مولانا)	لاہور	۱۱۱۵
۱۱۔	امجد علی خاں	لکھنؤ	۱۱۲۲

۱۲۔	افگار عارف	اسلام آباد	۱۱۳۲
۱۳۔	اخلاق حسین عارف (ڈاکٹر)	لکھنؤ	۱۱۳۹
۱۴۔	آفتاب حیدر بلگرامی (مولانا)	الٰہ آباد	۱۱۳۶
۱۵۔	ارشاد امروہوی	لکھنؤ	۱۱۳۶
۱۶۔	آل محمد رزمی	کراچی	۱۱۳۸
۱۷۔	امیر علی جونپوری	لکھنؤ	۱۱۳۹
۱۸۔	احسن فاروقی (ڈاکٹر محمد)	کراچی	۱۱۵۹
۱۹۔	انور شعور	کراچی	۱۱۵۹
۲۰۔	آغا روحی (علامہ)	لکھنؤ	۱۱۵۹

(ب)

۲۱۔	بابر علی خاں ثاقب	جھنگ	۱۱۴۷

(پ)

۲۲۔	پرویز ممتاز شیخ	لاہور	۱۱۳۵

(ت)

۲۳۔	تابش دہلوی	کراچی	۱۱۳۴
۲۴۔	تحسین سروری	کراچی	۱۰۸۱
۲۵۔	تہذیب سجاد (ہمشیرہ سجاد باقر رضوی)	کراچی	۱۱۹۳
۲۶۔	تقی عابدی (ڈاکٹر)	کینیڈا	۱۱۳۱
۲۷۔	تسنیم حسین زیدی	امریکہ	۱۱۳۸

(ج)

۲۸۔	جوش ملیح آبادی	اسلام آباد	۱۰۷۵
۲۹۔	جمیل جالبی (ڈاکٹر)	کراچی	۱۰۸۳
۳۰۔	جیمس آر سٹرانگ	اسلام آباد	۱۱۳۰

(ح)

۳۱۔	حاتم علوی	کراچی	۱۱۵۳
۳۲۔	حمیدالدین شاہد (خواجہ)	کراچی	۱۱۱۰
۳۳۔	حامد حسین سید	کراچی	۱۱۵۳
۳۴۔	حیدر طباطبائی	لندن	۱۱۵۵
۳۵۔	حسن مہدی	ایران	۱۱۵۷

(خ)

۳۶۔	خاور رضوی گرامی (ڈاکٹر)	کراچی	۱۱۱۹

(ر)

۳۷۔	ریحان اعظمی	کراچی	۱۱۳۴
۳۸۔	رضی جعفر نقوی (مولانا)	کراچی	۱۱۳۴

(ز)

۳۹۔	زیڈ اے بخاری	کراچی	۱۱۱۹
۴۰۔	زبیر عابدی	کراچی	۱۱۳۳
۴۱۔	زبیر حسین	آسٹریلیا	۱۱۶۰

۴۲۔ زاہد نقوی	کراچی	۱۱۶۴

(س)

۴۳۔ سحر فتح پوری	کراچی	۱۰۸۳
۴۴۔ ساحر لکھنوی	کراچی	۱۰۹۳
۴۵۔ سکندر آغا (ڈاکٹر)	لکھنؤ	۱۱۰۳
۴۶۔ سید حسن فاضل زیدی (ڈاکٹر)	نواب شاہ	۱۱۰۶
۴۷۔ سید حسن رضوی (ڈاکٹر)	اسلام آباد	۱۱۱۶
۴۸۔ سالک نقوی	کراچی	۱۱۳۱
۴۹۔ سحر انصاری (پروفیسر)	کراچی	۱۱۳۳

(ش)

۵۰۔ شاہد نقوی (ایڈووکیٹ)	لاہور	۱۱۰۱
۵۱۔ شمس الدین صدیقی (محمد، ڈاکٹر)	پشاور	۱۱۰۳
۵۲۔ شمس الرحمٰن فاروقی	الٰہ آباد	۱۱۳۳
۵۳۔ شارب ردولوی (ڈاکٹر)	لکھنؤ	۱۱۶۶
۵۴۔ شریف الحسن	ترکی	۱۱۰۷
۵۵۔ شوکت رضا شوکت	ملتان	۱۱۱۱
۵۶۔ شبیہ الحسن (ڈاکٹر)	لاہور	۱۱۳۹

(ص)

۵۷۔ صبا اکبرآبادی	کراچی	۱۰۸۰
۵۸۔ صفدر آہ (ڈاکٹر)	بمبئی	۱۰۹۶

۵۹۔	صفدر حسین (ڈاکٹر)	لاہور	۱۱۲۹

(ض)

۶۰۔	ضیاء الحسن موسوی (مولانا)	کراچی	۱۰۸۱

(ط)

۶۱۔	طیب آغا الموسوی الجزائری (آیت اللہ)	قم	۱۱۳۱
۶۲۔	طالب جوہری (علامہ)	کراچی	۱۰۹۵
۶۳۔	طاہر تونسوی (ڈاکٹر)	لاہور	۱۱۲۰

(ظ)

۶۴۔	ظفر الحسن (مرزا)	کراچی	۱۰۸۳
۶۵۔	ظفر جونپوری (پروفیسر)	کراچی	۱۰۸۷

(ع)

۶۶۔	عبدالقوی دسنوی (پروفیسر)	بھوپال	۱۰۸۸
۶۷۔	علی جواد زیدی (پدم شری)	لکھنؤ	۱۰۹۹
۶۸۔	عظمت بلگرامی	کراچی	۱۱۰۲
۶۹۔	عبادت بریلوی (ڈاکٹر)	لاہور	۱۱۰۸
۷۰۔	علی احمد دانش (آل میر انیس)	لکھنؤ	۱۱۱۳
۷۱۔	عباس حیدر عابدی (علامہ)	کراچی	۱۱۳۳
۷۲۔	علی ضیاء رضوی	امریکہ	۱۱۵۰
۷۳۔	عاصمہ زیدی (ڈاکٹر)	اٹلی	۱۱۶۳

(ف)

۷۴۔	فرمان فتح پوری (ڈاکٹر)	کراچی	۱۰۸۷
۷۵۔	فضل قدیر (ایڈیٹر ماہنو)	راولپنڈی	۱۱۳۱
۷۶۔	فیض بھرت پوری	کراچی	۱۱۵۰

(ق)

۷۷۔	قسیم ابن نسیم امروہوی	کراچی	۱۰۹۵
۷۸۔	قمقام حسین جعفری (ڈاکٹر)	کراچی	۱۱۱۶

(ک)

۷۹۔	کاظم علی خاں (پروفیسر)	لکھنؤ	۱۱۳۱

(گ)

۸۰۔	گوپی چند نارنگ (ڈاکٹر)	دہلی	۱۰۷۸

(ل)

۸۱۔	لیاقت علی یاسر (مولانا)	جھنگ	۱۱۳۵

(م)

۸۲۔	مرتضیٰ حسین فاضل (سید)	لاہور	۱۱۲۵
۸۳۔	مصطفےٰ نصرت (ڈاکٹر)	لکھنؤ	۱۱۰۱
۸۴۔	محمد علی خاں	امروہہ	۱۱۰۰
۸۵۔	ممتاز حسن	کراچی	۱۰۸۳
۸۶۔	مسعود حسین زیدی ظفر (سید)	لکھنؤ	۱۰۸۵

۸۶۔	محمد حیات خاں سیال (پروفیسر)	جھنگ	۱۰۹۳
۸۸۔	محمد رفیق اسلم (ڈاکٹر)	دہلی	۱۰۹۹
۸۹۔	مسعود رضا خاکی (ڈاکٹر)	لاہور	۱۱۲۳
۹۰۔	مشفق خواجہ	کراچی	۱۱۳۳
۹۱۔	محمد زماں آزردہ (ڈاکٹر)	کشمیر	۱۱۳۶
۹۲۔	ماجد حسین رضوی	کراچی	۱۱۵۲
۹۳۔	مجاہد حسین حسینی (ڈاکٹر)	بمبئی	۱۱۵۴
۹۴۔	محمد سیادت نقوی (ڈاکٹر سید)	امروہہ	۱۱۹۱

(ن)

۹۵۔	نسیم امروہوی	خیرپور	۱۰۷۹
۹۶۔	نیر مسعود (ڈاکٹر)	لکھنؤ	۱۱۲۸
۹۷۔	ناظر حسن زیدی (ڈاکٹر)	لاہور	۱۰۹۸
۹۸۔	نعیم تقوی (ڈاکٹر)	کراچی	۱۱۰۳
۹۹۔	نسیم درانی (ایڈیٹر سیپ)	کراچی	۱۱۰۵
۱۰۰۔	نواز حسن زیدی (ڈاکٹر)	لاہور	۱۱۲۳
۱۰۱۔	نادم سیتاپوری	کراچی	۱۱۵۸

(و)

۱۰۲۔	وحید الحسن ہاشمی	لاہور	۱۱۱۷

(ہ)

۱۰۳۔	ہاشم رضا (سید)	کراچی	۱۱۱۳

۱۰۴۔ بلال نقوی (ڈاکٹر) کراچی ۱۱۱۴

(ی)

۱۰۵۔ یاور عباس (ڈاکٹر) کراچی ۱۱۳۵

جوشؔ ملیح آبادی

اسلام آباد......۲۳ اپریل ۱۹۷۸ء

عزیزی نقوی صاحب

کتابوں اور خط کا شکریہ قبول کیجئے۔طوالت سے بچنے کے لئے،آپ کا محبت نامہ واپس کر رہا ہوں،اس سے میری رباعیوں پر روشنی پڑ جائے گی۔

یہ رباعیاں میری ہیں

۱۔ اے بار الٰہ نوحہ سناتا پھرتا

۲۔ کچھ پھول سے تا دور کھلے جاتے ہیں

۳۔ لب خشک رہے چشمہ ابلتا ہی رہا

۴۔ کیا صرف مسلمان کے پیارے ہیں حسین

۵۔ مقتل ہے رواں زینب خوددار کے ساتھ

۶۔ کیا خوب تمنائے شہادت نہ ملے

۷۔ سینے پہ مرے نقش قدم کس کا ہے

یہ دو رباعیاں مشتبہ ہیں،شاید میری نہیں ہیں:-

۱۔ فروغ داغ جگر مہر و ماہ پا نہ سکے

۲۔ یہ رات جو گنگنا رہی ہے ساقی

سلام کے مطلع جو آپ نے لکھے ہیں سب میرے ہیں،وحدت انسانی،موجد و مفکر،اور قلم کے سنہ تصنیف مجھے یاد نہیں،حسین اور انقلاب میں میرے مصرعے کو

مولانا ناصر حسین صاحب نے تبدیل کر دیا تھا یہ بات مجھے یاد نہیں۔

اصل مصرع:

شاہد ہے جو خدا کے مذاق سلیم کا

مولانا کا مصرع:

اللہ رے انتخاب ، خدائے حکیم کا

لکھنؤ میں ایک میرے شاگرد تھے شریف الحسن ناظر یہ مولانا الحسن صاحب کے صاحبزادے ہیں۔ رباعیاں زیادہ کہتے تھے۔

مجلہ بیاد نجم آفندی ملا ہے لیکن تصویریں نہیں ملیں۔

میری صحت، خدا کے فضل و کرم سے، اس قدر خراب ہو چکی ہے کہ اب زیادہ مدت تک جی نہیں سکوں گا۔ ضعف کا عالم یہ ہے کہ میں سنبھل کر لکھ رہا ہوں، مگر حرف ہیں کہ مسخ ہوتے چلے جا رہے ہیں، سانس اکھڑ اور دل بفضلہ دھڑک رہا ہے۔ اور موت کی چاپ سنائی دے رہی ہے۔ دیکھوں تو۔ موت ڈھونڈ رہی ہے بہانہ کیا؟

یا رب کا پ......جوش

سیّد آلِ رضا

کراچی......۱۷ نومبر ۱۹۷۳ء

عزیز محترم سلامت رہیے۔

گرامی نامہ مورخہ ۱۳ نومبر ۱۹۷۳ء موصول ہوا۔ ہاشم سلمہٗ کی دی ہوئی اطلاع کے مطابق میں آپ کی آمد کا منتظر تھا تا کہ مفصل زبانی گفتگو ہو جائے۔

سال گزشتہ جو جلسہ آپ نے اس سلسلے میں کیا تھا میں اس میں مدعو نہ تھا اس وجہ سے عدم حاضری واقع ہوئی۔ امسال آپ نے بلایا ہے تو بشرط حیات و درستی صحت حاضری کا

شرف ان شاء اللہ حاصل کروں گا۔

میاں، میں اب اس موقع کی نظم ونثر مرتب کرنے کے قابل ہی نہیں رہا۔ اب میں مرثیہ ہی اپنی پسند کے مطابق نہیں کہہ پاتا۔

جو کچھ کہتا ہوں اس کے متعلق فوراً یہ خیال ہوتا ہے کہ اس سے بہتر ہونا چاہیے مگر پھر یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ بہتر شکل کیا ہو۔ یہ ایک قسم کا ذہنی فالج ہے جولا علاج ہے۔

جناب انیس اعلی اللہ مقامہٗ کی شاعری اور مرثیہ گوئی کا صاف، شفاف اُبلتا ہوا چشمہ اسقدر حیرت انگیز ہے کہ میرے لئے ''خاموشی از ثنائے تو بہتر ثنائے ست'' خدا آپ کو آپ کی کوشش میں کامیاب کرے اور آپ کا یہ جلسہ اس عظیم ہستی کے شایان شان ہو جس کی گراں قدر یاد آپ تازہ کرتے رہتے ہیں۔

خاک پائے اہل ادب.....آل رضا

مولانا آغا مہدی صاحب لکھنوی

کراچی.....۲۲، ربیع الاول ۱۹۸۴ء

واعظ و ذاکر شیریں بیاں ضمیر اختر صاحب سلمہٗ

دعائیں۔ خدا کا شکر ہے کہ آپ کی موجودگی میں جو ذکر ہوا تھا وہ ذوالجناح پر کتاب چھپ گئی اور آپ جب آئیں گے تحفتہً دی جاسکتی ہے بڑی محنت اور کافی دوڑ پڑی، اس نوید کے ساتھ آپ کو یہ بھی بتاتا ہے کہ خواجہ مشفق صاحب کی تمام اخلاص آمیز باتیں یاد، تصویر کیسی، آواز محفوظ کرنا، گھر پر لے جانا کیا (چونکہ مجھے اس کی ضرورت نہ تھی) خط کا جواب بھی نہ دیا۔ اگر ملاقات ہوئی تو اس کا راز بتاؤں گا۔

ضروری امر یہ ہے کہ موصوف نے اُس وقت دو جلدیں بحساب تمیں روپے جلد جو خریدی تھیں وہ پہلا سودا تھا بعد میں ۲۵ فی جلد کتاب فروخت ہوئی اس لئے اُن کا کوئی

خادم آجائے تو "ذوالجناح" کی دو جلدیں بلا قیمت دیکر اپنا فرض ادا کر دوں گا دیباچہ میں اُن کا شاندار ذکر بھی ہے۔ لہٰذا آپ سے توقع ہے کہ یہ اطلاع بھی اُن کو اگر کر دیجئے تو میرا بار سبک ہوتا ہے۔

اس مہینے میں بلڈ پریشر کا بھی ایک سخت حملہ ہوا اور ضعف بڑھتا جاتا ہے۔ "الحسین" ضخیم کتاب جو بلا قیمت تقسیم ہوئی تھی اس کی طبع دوم بڑی شاندار طباعت اور اضافے کے ساتھ دوستوں نے شروع کی ہے کتابت شدہ ہے، موجودہ تشکیل اور کام ختم ہونے والے دس ہزار سے کم صرف ہوں گے، مگر مسبب الاسباب پر بھروسہ ہے۔ آپ کے والد ماجد جب ولایت سے آئیں تو مجھے اطلاع ضروری ہے، مرے زندگی کے مشوروں میں اُن کا زبردست ہاتھ ہے۔ ایک اشتہار بھی بھیجتا ہوں آپ کے پاس رہے۔

اچھا رخصت..... آغا مہدی

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ

نئی دہلی...... ۳۰ راکتوبر ۱۹۷۵ء

مکرمی ضمیر اختر نقوی صاحب..... سلام شوق

امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ آپ کا بہت پیارا خط ستمبر میں ملا۔ رسالہ پیام عمل کے انیس اور دبیر نمبر جو آپ نے دہلی کالج کے رضوی صاحب کے ذریعے بھجوائے تھے، وہ بھی مل گئے۔ اس گراں قدر ادبی تحفے کے لئے اور آپ کی یاد فرمائی اور بے پایاں خلوص اور لطف و کرم کے لئے بدل ممنون ہوں۔ آپ کے خط نے بہت متاثر کیا۔ آجکل انیس نمبر میں مشمولہ میرا مضمون آپ کو پسند آیا، یہ میری خوش بختی ہے۔ یہاں کے ادبی حلقوں میں بھی اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہ معلوم ہو کر خوشی ہوئی کہ نگار، سیپ، ماہ نو، اردو، اور اردو نامہ نے بھی انیس نمبر شائع کیے۔ اگر ان نمبروں میں سے

کچھ بھجوا سکیں یا غیّس پر کوئی کتاب وہاں کی مطبوعہ بھجوا سکیں تو۔

حج کا ثواب نذر کروں گا حضور کو

ادھر خط تو آ جا رہے ہیں، لیکن کتابوں کے تحائف کا سلسلہ منقطع ہو گیا ہے، میرے ایک عزیز شاگرد لندن میں ہیں، آپ کو مجھے اگر کچھ رسائل یا کتب بھجوانی ہوں تو ان کی معرفت بھجوائیے۔ بحفاظت تمام مجھ تک پہنچ جائیں گی۔

مشفق خواجہ میرے بڑے کرم فرما ہیں۔ ان سے ملاقات ہو تو میرا سلام کہیے۔

ایک ضروری گزارش آپ سے کرنی ہے۔ سنا ہے پنجاب یونیورسٹی نے "تاریخ اسلامی ادبیات ہند و پاک" کئی جلدوں میں شائع کی ہے۔ اس میں اردو ادب کی تاریخ پر بھی دو تین جلدیں ہیں۔ مجھے اس جلد کی فوری طور پر ضرورت ہے جس میں اقبالؔ اور مابعد اقبالؔ کے اردو ادب کا تذکرہ ہے، یعنی بیسویں صدی کے اور دورِ حال کے اردو ادب کا ذکر ہے۔

اگر آپ کسی طرح اس کتاب کو لندن کے پتے کی معرفت بھجوا سکیں تو زندگی بھر ممنون رہوں گا۔ دو چار دس پندرہ روپے کی بات ہوتی تو صرفے کے ذکر کی بے ادبی نہ کرتا لیکن شاید یہ کتاب گراں ہو گی اور ڈاک پر بھی صرف ہو گا، اس لیے اگر کوئی ایسی صورت ہو کہ ہندوستان میں اس کا بدل آپ کے کسی عزیز یا رشتے دار کے ہاں پہنچا دوں تو مجھے خوشی ہو گی، ورنہ یہ کہ اگر آپ کی ضرورت کی کتابیں معلوم ہوں تو ان کو بھجوا دوں تاکہ مجھے کچھ کرنے کا موقع ملے۔ خط کے جواب سے جلد شاد کام فرمائیے۔

اخلاص شعار..... گوپی چند نارنگ

پروفیسر و صدر شعبۂ اردو

نسیم امروہوی

کوٹ ڈی جی۔ ضلع خیرپور میرس (سندھ)..... ۲۲ دسمبر ۱۹۸۰ء

عزیزم ضمیر اختر صاحب

دعا و سلام! جب میں حج سے واپس آیا تو آپ بیرون پاکستان تھے اس لئے ملاقات نہ ہوسکی۔ ماشاء اللہ جوش صاحب کا مجموعہ کلام شائع کرکے اور اس کے متعلق لکھ کر آپ نے بڑی خدمت کی ہے۔ جس کے لئے ایک مرثیہ گو کی حیثیت سے میں بھی آپ کا شکر گزار ہوں، خدا تعالیٰ مزید خدمات کی توفیق دے۔

۹ جنوری کو ڈاکٹر یاور عباس صاحب کی منعقد کردہ سالانہ مجلس پڑھنے کے لئے آرہا ہوں قیام صرف ایک ہی دن رہے گا۔ اگر ملاقات ہوسکے تو اچھا ہے۔

والد کی خدمت میں بھی سلام کہہ دیں۔ والسلام..... نسیم امروہوی

صبا اکبرآبادی

کراچی..... ۱۰ مئی ۱۹۷۷ء

مکرمی۔ تسلیم

آپ کا مکتوب محررہ ۷ ماہ حال آج ملا۔ میں گزشتہ تین ہفتے سے ہائی بلڈ پریشر میں مبتلا ہوں۔ نوبت یہاں تک آگئی تھی کہ چار دن اسپتال میں بھی گزارنے پڑے۔ آپ نے جو تفصیلات طلب کی ہیں اُن میں سب سے بڑا مسئلہ مرثیوں کو تلاش کرنا ہے۔ کیونکہ ایک مرتبہ پڑھنے کے بعد میں نے کبھی اُن کی حفاظت کا اہتمام نہیں رکھا تھا۔ کیونکہ میں طبعاً غزل کا شاعر ہوں اور اسی کی مشق و مدارات میں گذشتہ نصف صدی سے زیادہ صرف کی ہے۔

بہر نوع طبیعت روبہ اصلاح ہونے پر آپ کی فرمائش کی تعمیل کرسکوں گا۔ ابھی تو طبی ہدایات کے مطابق بستر پر پڑا ہوں۔ دعا کیجئے گا کہ خدا اپنا فضل کرے۔

نیاز مند..... صبا اکبرآبادی

تحسین سروری

بابائے اردو روڈ۔ کراچی......۱۶، جون ۱۹۷۰ء

برادر مکرم سلام مسنون!

پرانی کتابوں کے تاجر کے ہاں میں نے آل انڈیا شیعہ کانفرنس ۱۹۱۳ء کے مختلف مقامات پر ہونے والے مختلف اجلاسوں کی مفصل رپورٹ پر مشتمل ایک نسخہ دیکھا۔ اور اس کو میں نے روک لیا ہے۔ یہ رپورٹ بڑی ضخیم ہے۔ قطع نظر مذہبی اور ثقافتی معلومات کے اس کی مجھے تاریخی اور ادبی حیثیت بھی محسوس ہوئی۔ اس میں شعرائے لکھنؤ کی چند منظومات بھی ہیں۔ کانفرنس کے سلسلے میں چند مشاہیر ہند کے نام بھی آئے ہیں۔ اس لحاظ سے مجھے خیال ہوا کہ شاید یہ نسخہ آپ کے کام کا ہو۔ اگرچہ آپ آجکل مجالس کے سلسلے میں مصروف ہوں گے۔ کسی طرح وقت نکال کر آل انڈیا شیعہ کانفرنس کی رپورٹ کو دیکھ جایئے۔ امید کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ والسلام

مخلص...... تحسین سروری

ضیاالحسن موسوی

شفاخانہ امراض قلب۔ کراچی.....۲۹، اپریل ۱۹۷۴ء

برادرم ضمیر اختر صاحب

تقریباً ایک ہفتے سے علیل ہوں اور ڈاکٹروں نے چلنے پھرنے سے بھی منع کر دیا ہے۔ آپ کی والدہ مرحومہ کی مجلس چہلم میں شرکت نہیں کر سکتا تیم کر کے چند سورے اُن کی روح کو ہدیہ کر دیئے ہیں۔ مگر آپ سے جو دلی رابطہ ہے اُس نے رات کو ایک قطعہ تاریخ کی شکل اختیار کی ہے۔ اگر مجلس سے پہلے کوئی پہنچانے والا آ گیا، اور یہ پڑھ دیا

گیا تو خیر ورنہ آپ کے والد محترم اور آپ سب پسماندگان کی نظر سے گزر جائے یہی کافی ہے۔ طالب دعائے صحت ...ضیاء الحسن موسوی

انور سدید

واں ایم سب ڈویژن سرگودھا......۱۲، جولائی ۱۹۷۳ء

محترمی نقوی صاحب سلام مسنون!

گرامی نامہ موصول ہوا۔ یاد فرمائی کے لئے شکر گزار ہوں۔ "نیا دور" میں "میر انیس کی غزل" پر آپ نے میری ناچیز کاوش پر تحسین فرمائی اور یہ داد مجھ تک پہنچانے کی سعی بھی کی۔ اس کیلئے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں۔ میر انیس کی صد سالہ برسی پر میں نے ایک کتاب لکھنے اور میر انیس کو عام ناقدین سے الگ زاویوں سے پرکھنے کی کوشش کی تھی۔ کتاب مکمل نہ ہو سکی۔ جو ابواب لکھے جا سکے ہیں فرداً فرداً رسائل کے حوالے کر رہا ہوں۔

آپ نے جن اشعار کا تذکرہ کیا ہے یہ میں نے ڈاکٹر سہیل بخاری صاحب کی وساطت سے سلاموں کی ایک بوسیدہ کتاب میں سے لئے تھے۔ یہ کتاب نہ معلوم کس صاحب ذوق نے تالیف کی شروع کے اوراق پھٹ چکے تھے۔ البتہ کتاب میں متذکرہ اشعار میر انیس سے ہی منسوب تھے۔ یعنی ان کی صحت پر قطعاً اصرار نہیں۔ اگر یہ الحاقی اشعار ہیں تو مطلع کیجئے تاکہ قلم زد کر دوں۔ اس توجہ کیلئے میں آپ کا بے حد شکر گزار ہوں گا۔ میر انیس پر اب تک میں پانچ مضامین لکھ چکا ہوں۔ ان میں سے اب صرف ایک غیر مطبوعہ ہے۔ اور وہ صحیفہ کی تحویل میں ہے۔ حال ہی میں مجھے پی ایچ ڈی کیلئے مقالہ لکھنے کی منظوری ملی ہے۔ سو اب اس میں زیادہ مصروفیت ہو گی۔ اور اگر مزید مضامین لکھے بھی گئے تو انہیں چھاپے گا کون؟ اسی بنا پر میر انیس پر مزید کام رک گیا

ہے۔ آپ میر انیس کی صد سالہ برسی پر جو محنت کر رہے ہیں اور رسائل سے مسلسل نمبر شائع کروا رہے ہیں یہ بے حد قابل قدر ہے۔ ماہِ نو میں آپ کا عمدہ مقالہ نظر سے گزرا اور میں نے اُس کی ستائش سب اہلِ ادب سے کی اور اس سے متعدد بار استفادہ بھی کیا۔ ازراہِ کرم یہ سلسلہ جاری رکھیے!

امید ہے کہ آپ کے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو لکھئے!

مخلص......انور سدید

سخن فتح پوری

کراچی.....۷، فروری ۱۹۹۰

سلام علیکم!

بخیر ہوں خیر و عافیت آنجناب کا طالب۔ کل جن صاحب کے انتقال کے سلسلے میں میں حاضر خدمت ہوا تھا مرحوم کا سوم کل ۸ فروری مسجد آل عبا میں ہو رہا ہے۔ مجلس سوم کی زحمت آپ کو دے رہا ہوں ۵ بجے شام آپکو مجلس پڑھنا ہے۔

امید کہ جناب میری گزارش رد نہ فرمائیں گے۔ جواب باصواب سے مطلع فرمائیں۔ میں کل رات میں آپ کے پروگرام میں حاضر ہو رہا ہوں بشرطیکہ قائم سلمہٗ مجھے لینے آجائیں میں منتظر رہوں گا۔ فقط

خیر اندیش جناب کا مخلص...سخن فتحپوری

ڈاکٹر جمیل جالبی

کراچی یونیورسٹی......۱۵، اکتوبر ۱۹۸۳ء

مکرمی، تسلیم

گرامی نامہ ملا، جس کے لیے شکرگزار ہوں آپ نے میر انیس اکاڈمی اور اپنی طرف سے جس خلوص کے ساتھ مبارکباد دی ہے اس کے لئے تہ دل سے شکرگزار ہوں۔ خدا آپ کو خوش رکھے اور جزائے خیر دے۔

احقر...... ڈاکٹر جمیل جالبی

مرزا ظفر الحسن

ادارہ یادگارِ غالب کراچی.....۲۰ اپریل ۱۹۷۲ء

محبی......تسلیم!

خیال تھا کہ آپ نقش فریادی والی تقریب میں آئیں گے اور شام انیس کی بات ہو سکے گی۔ ہفتہ ۲۹ اپریل کو پونے چھ بجے غالب لائبریری میں شام انیس منائی جائے گی جسکی صدارت پروفیسر کرار حسین کریں گے۔ اور ڈاکٹر فرمان فتحپوری اور ڈاکٹر حنیف فوق مقالے پڑھیں گے۔ ناصر جہاں، حمایت علی شاعر اور احمد رئیس مرثیے سنائیں گے۔ میرا یہ خط ملتے ہی اگر صبح نو اور ایک کے درمیان ۲۱۵۳۶۰ پر یا شام ۵ اور ۶ بجے کے درمیان ۲۲۷ ۔۔۔ پر فون کرسکیں تو موجب تشکر ہوں گا۔ شام انیس کے سلسلے میں آپ سے مشورہ بھی کرنا چاہتا ہوں اور مدد بھی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

مخلص.....ظفر الحسن

ممتاز حسن

کراچی

مکرمی ومحترمی

گرامی نامہ موصول ہوا۔ میں نے میر انیس پر مقالہ لکھنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ البتہ

لکھنا ضرور چاہتا ہوں اس لئے لازم ہے کہ انیس کو دوبارہ پڑھوں اور ان کے کلام پر از سرِ نو غور کروں۔ انیس اتنا بڑا شاعر ہے کہ اس پر سطحی طور سے کچھ کہنے یا لکھنے کی گنجائش نہیں ہے۔ خدا مدد کرے تو میرا لکھنے کا ارادہ تکمیل کو پہنچے گا مگر اس میں دیر لگے گی۔

مقالہ جب بھی مکمل ہوا آپ سے براہ راست یا مشفق خواجہ کی وساطت سے رجوع کروں گا۔ امید ہے مزاج بخیر ہوگا۔ مخلص..... ممتاز حسن

سیّد مسعود حسین زیدی عرف مُنّن

فراش خانہ وزیر گنج لکھنؤ، انڈیا

صبح ادب کا نیرِ تاباں ضمیر ہے
شامِ سخن کا ماہِ درخشاں ضمیر ہے
صد افتخارِ بزمِ سخنداں ضمیر ہے
منبر گواہ، میثم دوراں ضمیر ہے

تقریر میں تھا رنگ عیاں اجتہاد کا
ہر دل پہ نقش چھوڑ گیا اپنی یاد کا

میاں صاحبزادے ادب، تحقیق فن خطابت کا چند روزہ آفتاب کے ضیا بار ہونے سے جو روشنی ملی تھی وہ آپ کے فراق میں دلوں پر بجلیاں گرا رہی ہے راستہ چلنا دوبھر ہوگیا مجھے مومنین، شائقین بے تابانہ راستوں پر ٹوک کر خیریت دریافت کرتے ہیں میں نے یہ سوچا ہے کہ ایک تختی گلے میں لٹکا کر نکلوں۔ بہر حال آپ یہ سمجھ لیجئے کہ لکھنؤ والوں پر جولا تعداد الزامات ہیں ان میں ایک بے وفائی کا الزام بھی تھا لیکن دنداں شکن جواب بصورت وفاداری وقدر دانی جو آپ کے سلسلہ میں دیا ہے اسکے بعد اب کوئی یہ حق نہیں رکھتا کہ کہے لکھنؤ کے لوگ احسان فراموش ہیں یا ادب نوازی میں انکا کوئی ہمسر ہے، جن لوگوں نے اپنی کم ظرفی کا ثبوت بوجہ نجاست نسب دیا تھا وہ بھی کسی حیثیت سے لکھنؤ کے نہیں کہے جا سکتے۔ بھیا آپکا ایک خط ہفتہ قبل ضرور موصول ہوا لیکن

میری عدیم الفرصتی نے مجھے اتنی مہلت نہ دی کہ میں آپکو چند فقرے بھی تحریر کرسکتا۔

آپکے جانے کے بعد کافی دنوں تک تو بالکل مفلوج رہا یعنی ایک نعمت عظمیٰ کا سلب ہو جانا جسکے دوبارہ ملنے کی بظاہر کوئی امید نہیں ہے۔ اسکا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ خدانخواستہ میں آپکی خدمت میں حاضری سے مایوس ہوں بلکہ وہاں پہنچنے پر وہ مواقع فراہم نہ ہونگے جو لکھنؤ میں رہ کر کمالات کے نظارے کا سنہرہ موقع مل گیا تھا۔ اب میں سوچ رہا ہوں کہ میری بکواس سے آپکا قیمتی وقت برباد ہو رہا ہے لہٰذا مختصر لفظوں میں یہ سن لیجئے کہ جسد خاکی لکھنؤ میں رہ گیا...... آپکے مندرجہ احکام میں جلد از جلد بجالاؤں گا۔ دل نہیں مانتا پھر سن لیجئے کہ "قومی آواز" کی میگزین میں آپکی تعریف اکبر حیدری نے جو کی ہے وہ بھی ناقابل فراموش ہے۔ میں فرداً فرداً واقعات نہیں تحریر کرسکتا آپکے قریبی دوستوں کے علاوہ تمام لوگوں نے جو آپکے قصیدے پڑھے وہ یادگار ہیں بلکہ یوں کہیئے کہ آپ کے بعض احباب شہرت کے طالب حاسد ہوتے جارہے ہیں۔ میں نے آپکا مقبول عطیہ انیس نمبر کم از کم پانچ چھ ادیبوں کو دکھایا اس میں وہ منظر قابل دید ہے جو دربار واجد علی شاہ کی مجلس کا موقع ہے۔ آپکی فرمائش میں کسی حد تک کامیاب ہو چکا ہوں۔ کلب صادق صاحب نے بہت بے نیازی سے آپکا ذکر مومنین کے بار بار اصرار پر کیا میرا یہ قطعاً دل نہیں چاہ رہا ہے کہ میں برادران یوسف کا تذکرہ غلامان قمر بنی ہاشم علیہ السلام کے ذکر میں کروں لہٰذا اب خط کو ختم کرتا ہوں اور درگاہ معصومین علیہ السلام میں دست بہ دعا ہوں کہ مولا اپنے کرم سے کمالات میں روز افزوں ترقی دے اور ساتھ ہی ساتھ ہم لوگوں کو بھی کسب ضیا کے شرف سے ہمکنار کرے۔ گزشتہ ہفتہ کو میرے غریب خانہ پر شب بیداری و مجلس عزا تھی جس میں ذوالفقار جونپوری نے مرثیہ پڑھا مجلس زندگی میں پہلی مرتبہ اتنی کامیاب ہوئی اتوار کو صبح ۹ بجے اولاً ولی حیدر سوز

خوان نے ذاکری کی اسکے بعد شیر ہندوستان خطیب الایمان طاہر جرولی نے مجلس کو خطاب کیا زبان قاصر ہے تعریف میں اور جلوس ضریح اقدس برآمد ہو کر شبیہ روضہ جنت البقیع برنگ اسٹریٹ لکھنؤ گیا۔ آپ کا مخلص.....سید مسعود حسین زیدی (منقن)

ظفر جون پوری

کراچی.....۱۷ فروری ۱۹۸۵ء

محترم جناب ضمیر اختر نقوی صاحب.....سلام مسنون!

آپ کا بھیجا ہوا Souvenir بنام "اردو مرثیہ پاکستان میں" ملا۔ یاد آوری کا شکریہ۔ آپ جس لگن اور دل سوزی سے "اردو ادب" کی عموماً اور "رثائی کاوش قلم" کی خصوصاً خدمت کر رہے ہیں اُس کا اعتراف نہ کرنا کفران حقیقت ہے۔

میں آپ کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں کہ جو کام ایک ادارے کو کرنا چاہیے تھا، وہ آپ نے تنہا کر ڈالا، اور لطف یہ کہ خوش اسلوبی کے کسی گوشے کو تشنہ نہیں چھوڑا۔ آپ کی کاوشوں کو سوچ کر بے ساختہ کہنا پڑتا ہے کہ:-

این سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد • خدائے بخشندہ

اس Souvenir کے ساتھ "عشرۂ شہادت فاطمۃ الزہرا" کا پروگرام بھی ملا۔

امید کہ آپ ہمہ وجوہ خیر و عافیت سے ہوں گے۔ بفضلہٖ یہاں سب خیریت ہے۔ فقط

راقم.....مظفر حسن ظفر جونپوری

فرمان فتح پوری

کراچی.....۶ ستمبر ۱۹۷۷ء

برادرم محترم و برادر عزیز سلام اور دعائیں، محترم اور سلام، اس لئے کہ آپ تنہا اس دور میں انیس شناس ہیں، کم از کم مجھ سے تو بہت زیادہ میر انیس کو جانتے پہچانتے ہیں عزیز اور دعائیں، اسلئے کہ آپ عمر میں مجھ سے چھوٹے ہیں، گو یہاں بھی میں غلطی کر گیا، بزرگی کا تعلق عمر و سال سے ہے یا علم و عقل سے؟۔

میں حد درجہ شکر گزار ہوں کہ آپ نے "میر انیس حیات اور شاعری" کو پسند فرمایا۔ مجھے حیرت ہے کہ یہ کتاب، آپ کو کس طرح مل گئی، مجھے تو اکیڈمی والوں نے بتایا تھا کہ سرورق کے بعد کتاب بازار میں جائے گی اور اسی وقت مجھے بھی ملے گی۔ آپ کے خط ملنے پر میں گیا اور چند کتابیں سرورق بغیر لے آیا۔ یقین کیجئے میرا پختہ ارادہ تھا کہ کتاب ملنے پر سب سے پہلے، آپ کو بھیجوں گا کہ آپ ہی اس کے اصل میں حقدار ہیں۔ لیکن ایک طرح سے میرا ارادہ تکمیل کو پہنچا کہ کتاب سب سے پہلے آپ کو پہنچ گئی۔ بہر حال آپ کے نام سے ایک کتاب اب بھی میرے پاس محفوظ ہے جب چاہئے لے لیجئے۔ اگر ممکن ہو تو اس کتاب پر واضح اظہار خیال، "جریدۂ غالب" کے لئے کر دیجئے۔ تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ میر انیس پر ایک تازہ کتاب آئی ہے۔

میں آخر میں پھر آپ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے "میر انیس حیات اور شاعری " کی اشاعت پر تہنیت نامہ ارسال فرمایا ورنہ اس طرح کے خطوط ہمارے یہاں تو عید تو عید یا عقیقہ و ختنہ اور شادی و نکاح کے موقع پر ہی بھیجے جاتے ہیں، والسلام

فرمان فتح پوری

عبدالقوی دسنوی

بھوپال...... ۱۳، مارچ ۱۹۷۶ء

برادرم ضمیر اختر نقوی صاحب...... السلام علیکم

اچانک ایک صاحب شعبہ اردو میں داخل ہوئے اور آپ کا خط لائے۔ مسرت ہوئی کہ آپ نے یاد کیا، حسب فرمائش ''انیس نما'' بھیج رہا ہوں۔ اسکے ساتھ کچھ اور مطبوعات ''بھوپال اور غالب''، ''قادر نامہ غالب''، ''نسخہ بھوپال اور نسخہ بھوپال ثانی''، اور ''مطالعہ خطوط غالب'' بھی ہیں۔ رسید سے آگاہ فرمائیں گے۔ کرم ہوگا۔

یہ جان کر بے حد مسرت ہوئی کہ اشاریہ انیس کو آپ نے اور زیادہ مکمل اور بہتر کر دیا ہے۔ کب تک شائع کرنے کا ارادہ ہے۔ یہاں انیس سے متعلق ''آج کل'' کا ایک نمبر آیا تھا۔ کچھ کتابیں اور مضامین بھی اِدھر اُدھر شائع ہوئے ہیں۔ ''میر انیس۔ ایک تعارف'' اور ''خواتین کربلا (کلام انیس کے آئینے میں)'' محترمہ صالحہ عابد حسین کی شائع ہوئی ہیں۔ سنا ہے کچھ کتابیں اور شائع ہونے والی ہیں

''دہلی سے ''انڈو پاک انیس سیمینار'' کا دعوت نامہ میرے پاس بھی آیا تھا لیکن میں نہ جا سکا۔ آج کل کالج کی مصروفیات زیادہ ہیں۔

سنا ہے آپ کے یہاں سے کوئی نہیں آیا۔ البتہ وزیر آغا اور انتظار حسین صاحبان کے مضامین بھیج گئے تھے جو وہاں پڑھے گئے، یہ مضامین مجھے بھی پڑھنے کو مل گئے ہیں۔ ٹھیک ہی ہیں لیکن مجھے کچھ تسکین نہیں ہوئی۔ آج کل کس قسم کا علمی کام کر رہے ہیں۔ آگاہ کیجئے گا۔ میں ''دبیر نما'' تیار کر رہا ہوں۔ سنا ہے کہ وہاں دبیر پر کچھ نمبر شائع ہوئے ہیں اگر آپ آسانی سے وہ نمبر بھجوا سکیں تو بے حد شکر گزار ہوں گا۔ لیکن اگر دشواری ہو تو کم سے کم یہ آگاہ فرمایئے کہ کن کن رسائل کے دبیر نمبر کب کب شائع ہوئے ہیں اور ان کے مضامین کی فہرست بھی عنایت کیجئے اور اس کے ساتھ دوسرے رسائل میں دبیر پر جو مضامین شائع ہوئے ہیں ان کی فہرست بھی بھیج دیں تو بے حد ممنون ہوں گا اس طرح آپ کی مدد سے میرا کام زیادہ بہتر ہو جائیگا۔ لیکن یہ ساری

عنایتیں جتنی جلدی ممکن ہو کیجئے۔ اس لئے کہ میں جلد سے جلد اس کام کو ختم کرنا چاہتا ہوں۔ آپ بھی کیا کہیں گے کہ میں نے تو ایک معمولی سی کتاب "انیس نما" کی فرمائش کی اور اسکے بدلے میں اس طرف سے فرمائشوں کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ عزیزم آپ کے پر خلوص خط نے مجھ میں یہ جرأت پیدا کر دی۔

نوٹ: عبدالواحد معین صاحب اور مشفق خواجہ صاحب کے نام بھی خطوط بھجوا رہا ہوں۔ ان تک پہنچوا دیں شکر گزار رہوں گا۔ آپ کے جواب کا بے چینی سے منتظر

عبدالقوی دسنوی

سیّد الطاف علی بریلوی

کراچی......۵ر جون ۱۹۷۳ء

مکرمی وعلیکم السلام

آپکا یکم جون کا دوسرا خط ملا۔ اُسکے ساتھ مجوزہ انیس نمبر کے "عنوانات" کی فہرست ملی۔ جن اصحاب کو مضامین کے واسطے خطوط آپ یا میں لکھیں گے اُنکے پتے بھی ملے۔ ساتھ ہی جو مضامین آپکے پاس محفوظ ہیں اُنکی تفصیل معلوم ہوئی۔

یہ سب چیزیں تو ماشاء اللہ ایک بحرِ ذخار ہیں کئی ہزار صفحات درکار ہونگے۔ جن کو موجودہ کاغذ کی کمیابی و انتہائی گرانی کے زمانہ میں بہ یک وقت چھاپنا نا ممکن ہے (۱۲۸) صفحات کے "العلم" میں گیارہ سو روپے کا کاغذ لگتا ہے اور اسی مناسبت سے کتابت، طباعت، ٹائٹل، تصاویر اور صرفۂ ڈاک میں بے حساب روپیہ خرچ ہوتا ہے۔ ادارہ کی اسکے برعکس یہ حالت ہے کہ اللہ کا دیا سب کچھ ہے۔ روپیہ کے سوا......

چست یارانِ طریقت بعد ازیں تدبیر ما

کم از کم پانچ ہزار روپے کی بالائی یافت ہو تو کام چلے۔ بالفصل مراثی انیس کے

"مقدمے" مجھے بھیج دیجئے۔

گر نہیں وصل تو حسرت ہی سہی

مخلص سید الطاف علی بریلوی

ڈاکٹر اسد اریب

ملتان......۵ فروری ۲۰۰۱ء

جناب عالی! جناب ضمیر اختر نقوی! تسلیمات

جنوری ۲۰۰۱ء لکھنؤ میں گزرا، پروفیسر نیر مسعود صاحب سے ملاقات میرے لئے ایک بڑا اعزاز تھی۔ پروفیسر صاحب آپ کے معترف ہیں، مرثیے پر آپ کے کام کی بڑی تعریف کرتے تھے۔ اکبر حیدری صاحب کا ذکر کرتے ہوئے آپ کا نام بھی آیا، فرماتے تھے ضمیر اختر صاحب نے وہ کام کیا ہے جو اگلی صدیوں تک زندہ رہنے والا ہے۔ میرا لکھنؤ جانا، میر انیسؔ مرحوم سے اظہار عقیدت کرنا بھی تھا۔

اُن کے ایوانِ عالی بھی گیا۔ گھر کے صدر دروازے پر نقش چوبی کام دیکھا، حوض دیکھا، میر صاحب کی وہ نشست بھی دیکھی جہاں سلطان سخن نے لاکھوں شعر قلمبند کیئے، تسبیح، جو وہ پڑھا کرتے تھے، ہاتھوں سے مس کی، پتھر کی وصلی پر وہ شبیہ انیس بھی دیکھی جسکا چربہ آجکل چھپتا ہے۔ اور وہ مسودہ بھی نظر سے گزرا جسکے ایک مصرع کو یوں شائع کیا گیا ہے۔

ریحاں ہے یہی راح یہی روح یہی ہے

لیکن میر صاحب مرحوم کے لکھے پر یہ مصرع یوں تھا

ریحاں ہے یہی، تقویت روح یہی ہے

مرزا دبیر والوں نے گھر دیکھنے نہیں دیا، اور نہ اُن کی لحد دیکھ سکا، شاید میری رسائی کا

ذریعہ ناقص رہا ہو۔ "نشانِ میرؔ" پر اظہار عقیدت کر آیا۔ خود میر صاحب تو سٹی اسٹیشن کی پٹریوں تلے آسودہ خاک ہیں۔

قبر مطہر میر انیس بھی دیکھی۔ جس احاطے میں واقع ہے، بچے پتنگیں اُڑا رہے تھے اور قبر کے حظیرہ اور بیرونی جالی کے درمیان جو لوہے کی سلاخیں لگی تھیں وہاں زمین پر تاش کے دو تین پتے بھی پڑے تھے، میر صاحب کے پڑنواسے سے اس بابت پوچھا کہنے لگے، باوجود روک ٹوک کے بھی یہاں لوگ اپنی مرضی سے آتے جاتے رہتے ہیں۔

راقم.....اسد اریب

پروفیسر محمد حیات خاں سیال

گورنمنٹ کالج جھنگ.....۳دسمبر ۱۹۸۱ء

محترم ضمیر نقوی صاحب.....سلام مسنون!

اتفاقاً مقامی نیوز ایجنسی پر جوشؔ کے مرثیے پر نظر پڑی، میں کئی دنوں سے جوشؔ کے مرثیے تلاش کر رہا تھا۔ آپ نے بڑا احسان کیا کہ ان مرثیوں کو ترتیب دے دیا۔ کتاب بھی خوبصورت چھپی ہے۔ اس سے پہلے مولوی سید ظہیر الدین حیدر نے آپ کے بارے میں بتایا تھا، اس کتاب میں آپ کی دیگر کتابوں کا اشتہار بھی پڑھا، براہِ کرم مطلع فرمایئے کہ کون سی کتابیں شائع ہو چکی ہیں اور ان کی قیمت کیا ہے؟

میں نے نیوز ایجنسی (شیخ محمد حسین اینڈ سنز) کو کہہ دیا ہے کہ پورا سیٹ منگوا لیا جائے تاکہ لائبریری کے لئے خریدا جا سکے۔ میرے ایک شاگرد کوثر جعفری ہیں، میں نے انھیں "ڈاکٹر صفدر حسین، احوال و آثار" پر مقالہ پنجاب یونیورسٹی سے دیا ہے۔ امید ہے آپ اس سلسلے میں بھی تعاون فرمائیں گے۔ آپ نے پاکستان کے اساتذہ اور طلبا کی بے حسی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ یونیورسٹی بورڈ آف اسٹڈیز میں یہ موضوع زیر

بحث آیا، وقت یہ ہے کہ زندہ شعراو مصنفین پر کسی پاکستانی یونیورسٹی نے کام کرنے کی اجازت نہیں دی۔ خیال یہ ہے کہ شعراو مصنفین کو بحمد اللہ ابھی لکھنا پڑھنا ہے اور وہ مقالہ کسی لحاظ سے مکمل نہیں ہو سکتا، ویسے ہم نے کوشش کر کے بہت سے ایسے موضوعات دیے ہیں، مثلاً عابد علی عابد، مسعود حسن رضوی ادیب، ڈاکٹر صفدر حسین، یوسف حسین خاں، میری لڑکی شیم سیال جھنگ کے مشہور شاعر اور مداح اہل بیت جعفر طاہر پر کام کر رہی ہے۔ اسی دوران میرے دوست سید حسن عباس نقوی ملے وہ جوش کے مرثیے دیکھ کر نہایت خوش ہوئے اور اسی وقت مقامی بک سیلر سے کاپی حاصل کر لی۔ وہ بتا رہے تھے کہ آپ سے ان کی ملاقات بھاولپور میں ہوئی تھی شاید آغا سکندر مہدی کے ہاں۔ اس زمانے میں وہ اسسٹنٹ کمشنر تھے آج کل میانوالی میں تعینات ہیں۔

اپنے پبلیشرز سے کہیں کہ مجھے اطلاع دے کہ کون کون سی کتابیں چھپ چکی ہیں، آپ جس تندہی سے کام کر رہے ہیں اس کی داد دینا پڑتی ہے خصوصاً محبان اہل بیت کے لئے یہ کتابیں بڑی نعمت ہیں۔ مخلص...... محمد حیات خاں

تہذیب سجاد

کراچی...... ۳۱، جنوری ۱۹۹۱ء

محترم نقوی صاحب آداب

میں سجاد باقر رضوی کی بہن ہوں۔ آپ کے پاس اس سلسلے میں آئی تھی کہ میں میر انیس کے مرثیوں پر ریسرچ کرنا چاہتی ہوں۔ سجاد باقر رضوی (میرے بھائی) نے مجھے جو موضوع (میر انیس کے مرثیوں میں معاشرتی پہلو) دیا تھا اسے ڈاکٹر حسنی نے بتایا کہ اس پر ہندوستان میں ریسرچ ہو چکی ہے۔ میں ایک مہینے سے کراچی یونیورسٹی کے چکر لگا رہی ہوں۔ ڈاکٹر حسنی نے مجھے آپ کے پاس بھیجا کہ آپ مجھے دو تین مناسب

موضوع بتا دیں۔ آپ اسی کاغذ پر موضوع لکھ دیجیے گا میں کسی کو بھیج کر منگالوں گی۔ اگر میں آپ کے برابر والوں کو ٹیلیفون کروں تو کیا آپ میرا جواب فون پر دینگے۔ بہر حال میں فون کروں گی۔ میرے لئے وہاں آنا بہت مشکل ہے۔

حفظ ادب.... تہذیب سجاد

ڈاکٹر سجاد باقر رضوی کی بہن

ساحر لکھنوی

کراچی.... ۲۳ اکتوبر ۱۹۷۸ء

برادرم ضمیر اختر نقوی مدظلہ... تسلیمات! مزاج عالی۔

گرامی نامہ کا شکریہ۔ بھی شرمندہ ہوں کہ ایفائے وعدہ میں تاخیر ہوئی۔ مگر خداوند تعالی کا شکر کہ اس نے سرخروئی کا سامان بہم پہنچادیا۔ متعلقہ اخبار یعنی ''اعلان'' کراچی کا وہ شمارہ مل گیا جس میں جد امجد حضرت فاخر لکھنوی اعلی اللہ مقامہٗ کے متعلق میرا مضمون گذشتہ محرم میں شائع ہوا تھا۔ فوٹو کاپی کے بجائے پورا اخبار بھیج رہا ہوں تاکہ آپکے ریکارڈ میں رہے۔ میرے پاس دوسری کاپی بھی موجود ہے۔ آپکو فوٹو کاپی کرانے کی ضرورت نہیں۔ فاخر صاحب کا جو مطلع آپ نے لکھا ہے وہ مرثیہ میرے پاس بھی ہے۔ اسکے علاوہ محترم جناب ڈاکٹر صفدر حسین قبلہ کے پاس جو مرثیے حضرت فاخر کے موجود ہیں اسکے مطلع انھوں نے مجھکو اپنے ایک حالیہ خط میں لکھے ہیں۔ اُن میں سے صرف ایک مرثیہ میرے پاس ہے باقی نہیں ہیں۔ ان مرثیوں کے مطلع بھی لکھے دے رہا ہوں۔

(۱) اے باغبان طبع ریاض سخن دکھا	درحال	حضرت علی اکبر
(۲) یارب بہار میں کوئی گلشن خزاں نہ ہو		ایضاً

(۳) ہے تاج حمد خدا راس افتخار سخن (۱۲۹) ایضاً

(۴) خزاں ریاض نبیؐ پر بہار میں آئی (۱۵۲) درحال حضرت عباس

ان کے علاوہ کچھ مرثیے محترم راحت حسین ناصری صاحب قبلہ کے پاس بھی ہیں۔میں نے ابھی دیکھے نہیں،نہ ان کے مطلع معلوم ہیں۔

تاخیر کے لئے ایک بار پھر معذرت چاہتا ہوں امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا اور کوئی خدمت میرے لائق.....والسلام.....نیاز مند ساحر لکھنوی

علّامہ طالب جوہری

کراچی.....۱۹۸۰ء

برادرم ضمیر اختر صاحب.....سلام مسنون!

دوبارہ پھر حاضر ہوا تو اس شب میں جناب والا (اطلاع کے مطابق) رضویہ سوسائٹی میں کسی اجتماع میں تشریف رکھتے تھے۔

حامل رقعہ میرے دوست ہیں اور اہم کام کے سلسلے میں آپ کی خدمت میں حاضر ہو رہے ہیں۔اپنے طور پر اس مسئلے کو حل فرما دیں تو نوازش ہوگی۔

طالب جوہری

قسیم ابن نسیم امروہوی

کراچی.....۳۰جنوری ۱۹۸۰ء

جواں فکر و جواں سال ذاکر اہل بیت برادرم ضمیر اختر نقوی صاحب...تسلیمات!

کل آپکی خدمت میں (دفتر) حاضر ہوا تھا۔یہ میری بدقسمتی ہے کہ ملاقات سے محروم رہا۔عرض خدمت یہ ہے کہ اراکین "امام باڑہ امام زمانہ" پیپلز کالونی این

بلاک نارتھ ناظم آباد۔ اور منتظم امام باڑہ کی خواہش تھی کہ آپکی تقریر اس علاقہ کے مومنین کو سنوائی جائے اس سلسلے میں منتظم امام باڑہ جناب تقی صاحب نے مجھ سے رابطہ قائم کیا۔ میں نے اُن سے کہہ دیا کہ آپ جمعرات یعنی ۱۹ جنوری۔ جامعہ امامیہ تشریف لے آیئے وہاں ضمیر اختر صاحب سے ملاقات ہو جائے گی۔ میری یقین دہانی پر انہوں نے جگہ جگہ آپکی مجلس کا اعلان کر دیا۔ لیکن اب تک آپ سے رابطہ قائم نہ ہو سکا۔ اس علاقے کے مومنین بہت غریب ہیں۔ اور کم از کم ہم نوجوان ذاکرین اور شعرا کو ان کی خدمت کرنا چاہئے۔ مجھے یقین کامل ہے کہ آپ میری رائے سے متفق ہونگے۔ چنانچہ حسب پروگرام۔ (۲۲ جنوری) آج ۸ بجے شب۔ آپکو اسی امام باڑہ میں مجلس پڑھنا ہے۔ آپ رکشہ ٹیکسی میں تشریف لے جایئے وہاں تقی صاحب آپکا استقبال کریں گے۔ شکریہ......تسیم ابن تسیم

صفدر آہ

بمبئی......۲۹ مئی ۱۹۷۵ء

محترم......آداب

حضور یہ دو امام نیچے نقوی سید نے دو امام او بھی رضویہ انجمن پر قبضہ کیونکر کرلیا۔ میں بھی رضوی ہوں اور میری رگ رضویت بھڑک اٹھی ہے۔ اس مزاج المومنین کے بعد عرض یہ ہے کہ ڈاکٹر جعفری نے مجھے لکھ دیا تھا کہ کسی یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو نے کہہ دیا تھا کہ انیس کا موضوع ڈاکٹریٹ کیلئے پست ہے۔ اس اطلاع پر میں آپے سے باہر ہو گیا تھا۔ میں نے تو کہا تھا کہ ایسے صدر شعبۂ اردو کو یہاں کی یونیورسٹی سے ٹھوکریں مار کر نکال دیا جاتا۔ شکر ہے آپ کی فہرست متعلق انیس دیکھ کر میری بدگمانی رفع ہو گئی۔

یہاں انیس پر اتنی کتابیں اور اتنے ضخیم مجلّے کہاں نکل سکتے ہیں۔ میری نظر میں سارے موضوع انیس پر صرف دو کتابیں معیاری ہیں ایک شبلی کا موازنہ دوسری اشہری کی حیات انیس اور افسوس یہ ہے کہ دونوں حضرات سنّی تھے۔ احسن کے واقعات انیس سے یہاں اب تک جو کچھ حیات انیس پر نکلا ہے وہ اس قابل نہیں کہ انیس سے منسوب کیا جائے۔ ادھر سال بھر میں میری نظر میں انیس پر دو کام غالباً قابل ذکر رہیں گے ایک ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کا مضمون جو انہوں نے لکھنؤ کے سیمینار میں پڑھا تھا۔ موصوف جامعہ ملیہ میں صدر شعبۂ اردو ہیں۔ اُن سے اب میرے حوالے سے مزید معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ دوسری ایک کتاب انیسیات پروفیسر مسعود حسن ادیب ہے جسکی اشاعت کا اعلان چند روز قبل یو۔ پی اردو اکیڈمی نے کیا ہے۔ بہرحال یہ کتاب قطعاً معیاری ہوگی۔ ادیب صاحب علیل ہیں۔ انکے صاحبزادے ڈاکٹر نیر مسعود رضوی۔ ادبستان۔ دین دیال روڈ۔ لکھنؤ سے اس کتاب کی تفصیل مانگئے۔

یہاں جابجا جشن انیس ہوا۔ لیکن جمعراتی مجلسوں کی سطح پر جسکو میں کوئی اہمیت نہیں دیتا۔ آپکا یہ سوال اس موقع پر بالکل حق بہ جانب ہوگا کہ بڑے میاں آپ بھی تو وہیں تشریف رکھتے تھے۔ آپکے قلم صاحب کیوں کند ہوگئے تھے۔ اسکے جواب میں ایمان اللہ آپ نادم صاحب سے میری علالت اور کبرسنی کی شہادت لے لیجئے۔ اسکے علاوہ جس موضوع پر میرے احباب کام کرتے ہیں اس میں میں کبھی ہاتھ نہیں لگاتا۔ انیس پروفیسر ادیب کا موضوع تھا۔ جسکے وہ ہر اعتبار سے اہل تھے۔ میں خواہ مخواہ دخل در معقولات کیوں کرتا۔ اور بھی بہت سے اسباب ہیں جن کو بخیال طوالت نظر انداز کرتا ہوں۔ بڑی مسرت کی بات ہے کہ آپکی چھوٹی بہن انیس پر ڈی فل کر رہی ہیں۔ اللّٰھم زد فزد عندالضرورت صاحبزادی اپنے سوالات بھیج دیا کریں۔ میں جلد سے

جلد جواب دینے کی کوشش کرونگا۔

انیس پر یہاں کے کام میں دو چیزیں قابل قدر ہیں۔ ایک تو مزار انیس بن گیا۔ دوسرے میر انیس کا دانشکدہ محفوظ کر لیا گیا۔ میری تصنیفات کی فہرست میری آخری کتاب "میر اور میریات" کے آخر میں موجود ہے انیس کا جو غیر مطبوعہ مرثیہ میں نے شائع کیا تھا۔ میں اسکے استناد کا قائل نہیں۔ اسی لئے میں نے اسے اپنی تصنیفات کی فہرست میں نہیں رکھا۔ میر اور میریات ڈاکٹر جعفری یا نادم صاحب کے پاس شائد مل جائے۔ امید ہے آپ مع الخیر ہوں گے۔ نیاز مند..... صفدر آہ

احمد ندیم قاسمی

لاہور.....۱۳، مئی ۱۹۷۲ء

مکرمی نقوی صاحب، تسلیم.....

آپ کا خط ملا ممنون ہوں۔ "فنون" زندگی اور موت کی کشمکش میں مبتلا ہے۔ اس کے بارے میں قارئین "فنون" بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ اس صورت میں میر انیس کے سے استاد فن کے بارے میں ایک ضخیم اور شایانِ شان نمبر شائع کرنا "فنون" کے بس کی بات نہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ بحالات موجودہ میں یہ نمبر شائع کرنے کا اعزاز حاصل نہیں کر سکوں گا، اگرچہ میں میر انیس کو ایک بڑا صاحب فن سمجھتا ہوں۔ مجھے امید ہے ان کی روح میری بے بسی کے پیش نظر مجھے معاف کر دے گی۔ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔ احمد ندیم قاسمی

ڈاکٹر ناظر حسن زیدی

پنجاب یونیورسٹی، لاہور.....۷، ستمبر ۱۹۷۲ء

مکرمی تسلیم۔ تعطیل کے سبب کالج میں آنا جانا کم ہوا۔ اسی لئے آپ کے والا نامے کا جواب دیر سے لکھ رہا ہوں۔ میں انیس پر کام کرنے کو منجملہ اعمال ثواب سمجھتا ہوں۔ تاہم مکروہات دنیا سے گھرا ہوا ہوں۔ جی چاہتا ہے کہ مبسوط کتاب لکھوں۔ اللہ تعالیٰ مددگار ہے۔ آپ حوصلہ افزائی کرتے رہیں تو یہ کام بھی ضرور ہو رہے گا۔

امید ہے مزاج عالی بخیر ہوگا.... نیاز مند ناظر حسن

علی جواد زیدی

لکھنؤ..... ۳، اگست ۱۹۸۱ء

برادر عزیز۔ سلام و دعا

آپ کا خط آیا تھا لیکن ادھر کچھ طبیعت بے لطف رہی اور آپ کو تفصیل سے نہ لکھ سکا۔ اس سے پہلے عالمی کانفرنس کے سلسلے میں بھی بے حد مشغول تھا اور مشکل سے خط و کتابت کے لئے وقت نکالتا تھا۔ اس خط کو اس لئے لکھ رہا ہوں کہ موجودہ دور کے مرثیہ نگاروں کے بارے میں آپ کی کتاب کے سلسلے میں میں نے جناب ثمر حلوری کو خط لکھا تھا اور ان سے درخواست کی تھی کہ وہ اپنے مرثیہ کے کچھ اقتباسات بھیج دیں۔

اب تک پانچ مرثیے لکھ چکے ہیں۔ انھوں نے اپنے کلام کے جو اقتباسات بھیجے ہیں اور خود ثمر صاحب کے بارے میں اطلاعات اسی کے ساتھ ملفوف کی ہیں۔

رسید سے مطلع کیجئے گا۔ باقی پھر کبھی۔ مخلص..... علی جواد زیدی

محمد رفیق اسلم

لاہور..... ۲۸، جون ۱۹۸۷

مکرمی و محترمی تسلیمات و آداب

سری نگر سے گرامی پروفیسر اکبر حیدری صاحب نے ماہ نو کے لئے قابل قدر اور قابل فخر مقالہ "میر انیس کا غیر مطبوعہ مرثیہ" دیا ہے چونکہ میرا قیام صرف ۱۰ جولائی تک ہے اور کراچی آنے سے مجبور ہوں اس لئے مشورہ دیں کہ یہ گراں قدر مقالہ کس طرح بحسن وخوبی آپ تک پہنچایا جائے موصوف نے اشارۃً یہ ہدایت بھی کی تھی کہ محترم مشفق خواجہ صاحب کو دیدوں اور وہ آپ تک پہنچادیں گے۔ اب جیسا آپکا حکم ہو مقصد صرف تحفظ مقالہ اور جلد از جلد طباعت ہے۔ حیدری صاحب کی خواہش ہے کہ ماہ نو "میر انیس نمبر" کے علاوہ انیس و دبیر پر جس قدر لڑیچر چھپا ہے وہ بھی اپنے ساتھ لیجاؤں اس سلسلے میں مجھکو کیا کرنا چاہیے اور یہ تمام لڑیچر کس طرح جمع کر کے ان تک پہنچاؤں ازراہ تشکر پہلی فرصت میں جواب دینے کی زحمت فرمائیں کیونکہ میں ۱۰ جولائی کو ہر صورت میں انڈیا واپس چلا جاؤں گا۔ مکرر جناب۔ جوش ملیح آبادی کا تازہ فوٹو بھی منگایا ہے اسکی کیا صورت ہوگی۔ حضرت جوش کا پتہ بھی لکھ دیں تو ممنون رہونگا۔

بندہ شعبہ اردو دلی یونیورسٹی میں ریسرچ اسکالر ہے اس سلسلے میں سرزمین پاک کی زیارت کی ہے موضوع "دیوان انشا کی ترتیب و تدوین" ہے سنا تھا کہ یہاں انشا پر دو ریسرچ کے مقالے پیش کیے جاچکے ہیں یہاں آکر معلوم ہوا کہ لاہور میں نہیں کراچی میں ہوا ہوگا، کراچی آنے سے مجبور ہوں ازراہ کرم اس سلسلے میں میری بھی مدد فرمائیں کہ یہ مقالے کہاں کہاں ہیں اور یہاں کہیں کلیات، دیوان مطبوعہ وقلمی ہے؟

زیادہ آداب... نیاز مند... محمد رفیق

محمد علی خاں

امروہہ...... ۲۵ر اپریل ۱۹۸۱ء

مکرمی ضمیر صاحب سلام علیکم

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ یہاں پر آپ کی مجلس کا اعلان ہو گیا ہے۔ امید ہے کہ آپ حسب پروگرام ۲۹ ذی الحج امروہہ پہنچیں گے میں اسٹیشن پر ملوں گا۔ عظیم حیدر سب کو مطلع کر دیا ہے۔ یہاں سے میں آپ کے ساتھ دہلی چلوں گا۔ دہلی میں نے ذہین صاحب کو مطلع کر دیا ہے۔ پرسان حال کو سلام۔ فقط آثم.... محمد علی خاں

شاہد نقوی (ایڈوکیٹ، ہائیکورٹ)

کلفٹن، کراچی

محترم و مکرم ضمیر اختر..... صاحب تسلیمات

امید ہے آپ بفضلہ مع الخیر ہوں گے۔ دونوں شعری مجموعے آپ کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں۔ رسید سے مطلع فرمائیگا۔ الظم کے سلسلے میں میں نے پہلے بھی عریضہ ارسال خدمت کیا تھا مگر اب تک اسکی دید سے محروم ہوں۔

خیر اندیش..... شاہد نقوی

ڈاکٹر مصطفےٰ فطرت (ایم، اے)

لکھنؤ.... ۱۲، اپریل ۱۹۸۱ء

مکرمی جناب سید ضمیر اختر صاحب خطیب اہل بیت..... سلام علیکم۔ مزاج گرامی ۷، اپریل ۱۹۸۱ء برادرم رشید صاحب کے دولت کدہ پر آپ سے ملاقات ہوئی تھی۔ یاددہانی کے لئے عرض پرداز ہوں کہ مولانا صفی کا کلام، خطوط اور نثری ذخیرے میں سے جو کچھ پاکستان میں شائع ہو چکا ہے یا اگلے جو قصائد اور مراثی کسرٰی منہاس صاحب کے پاس موجود ہیں، برائے مہربانی اُن سب کے متعلق تفصیل سے مطلع فرمانے کی زحمت اپنی اولین فرصت میں گوارہ کیجئے مجھے یقین ہے کہ جب تک آپکی

اطلاعات صحیح دستیاب نہ ہوں گی، میرا تحقیقی مقالہ نامکمل رہے گا۔

میرے جو پھوپھی زاد بھائی رضویہ میں قیام پذیر ہیں، ان کا پتہ حسب ذیل ہے۔

جناب سید حامد رضا صاحب نقوی F-41۔ رضویہ سوسائٹی، ناظم آباد نمبر ا کراچی نمبر ۱۸ پاکستان۔ کسریٰ منہاس صاحب کو میں نے کئی خط تحریر کئے مگر کسی خط کا جواب نہ ملا۔ ممکن ہے کہ میں نے جس پتہ پر ان کو خطوط بھیجے وہ پتہ ہی غلط ہو۔ اسلئے آپ ان کا صحیح پتہ ضرور بھیج دیں تاکہ ایک بار اور ان سے تحریری درخواست کرسکوں۔

میرے خیال میں محترمی کسریٰ منہاس، حضرت جوش ملیح آبادی اور جناب نسیم امروہوی سے آپ بذات خود مولانا صفی کی حیات وشاعری کے متعلق دریافت کریں تو بہت ممکن ہے ان حضرات سے کچھ مزید حالات کا علم ہوسکے، جو میرے لئے مشعل راہ بن سکیں۔ "شعر و نغمہ" اور "صحیفہ عقیدت" کی ایک ایک کاپی بشرف نگاہ پیش خدمت ہیں۔

آپ کی چشم کرم کا منتظر..... مصطفےٰ فطرت

عظمت بلگرامی

کراچی

کرم فرما..... مولانا صاحب..... سلام مسنون!

حاضر ہوا۔ ملاقات نہ ہوسکی۔ کل شام آپکے پاس ریحان نہ آسکا مشغول تھا۔ میں کارحیات چھوڑ کر حاضر خدمت ہوا۔ تاخیر کی معافی درکار ہے

آپ متحمل ہیں معاف کردیں گے۔ آج آپکا میرے غریب خانے پر تشریف لانا اشد ضروری ہے مجھکو امید قوی ہے کہ آپ زحمت گوارا فرمائیں گے۔

میں نے بھی آج ایک ولیمہ بایں سبب منقطع کردیا۔ چاہتا ہوں منصوبے میں جھول نہ پیدا ہونے پائے اسلئے محنت تو ہو رہی ہے۔ آپکا کرم رہا تو سب ٹھیک ہوگا

میں ۷ ، بجے شام کے بعد منتظر رہوں گا۔ آپکے لئے دعا کرنے والا

عظمت بلگرامی

ڈاکٹر سکندر آغا

لکھنؤ......۱۲، جولائی ۱۹۸۱ء

محترمی جناب ضمیر اختر صاحب

تسلیمات عرض ہے۔ آپکا عنایت نامہ بہت انتظار کے بعد موصول ہوا۔ آپ نے مرزا اوؔج مرحوم کے ۳۵ مراثی کے مطلعے لکھے ہیں ان میں یہاں صرف ۱۹ دستیاب ہوسکے۔ جن میں ۱۳ معراج الکلام کے ہیں۔ اگر ممکن ہو تو اُن ۱۳ کے علاوہ ایک یا دو کرکے نقل بھیج دیں۔ اضافہ ہوجائیگا۔

مجھے جس چیز کا انتظار ہے وہ مرزا محمد ہادی رسوؔا کے مراثی ہیں کیونکہ میرے علم میں تھا کہ انھوں نے کوئی مرثیہ نہیں نظم کیا البتہ سلام اور رباعیات کہیں جبکہ آپ نے فرمایا تھا کہ ان کے مراثی آپ دے سکتے ہیں۔ مہربانی ہوگی اگر یہ عنایت بھی ہوجائے۔

میں آجکل ہندی میں ایک مضمون لکھنے کی تیاری کررہا ہوں عنوان وہی ہے "خاندان انیسؔ کا ایک پر سدہ مرثیہ گو"۔ میری نظر کے سامنے اس وقت دولہا صاحب عروؔج اور میر علی محمد عارؔف ہیں۔ میں ابھی یہ فیصلہ نہیں کرسکا کہ زیادہ بہتر کس کو سمجھا جائے بہرحال یہ فیصلہ مجھے ایک یا دو روز میں کرلینا ہے علی احمد دانش صاحب کہہ رہے ہیں کہ عارؔف پر لکھا جائے جبکہ میں عروؔج پر لکھنا چاہتا ہوں۔

امجد علی خاں صاحب اور رشید صاحب بخیر ہیں۔ امجد صاحب سے اکثر لیکن رشید صاحب سے کبھی کبھی ملاقات ہوجاتی ہے۔ مرزا اوؔج / مرزا دبیر پر کسی صاحب نے اگر کوئی کتاب لکھی ہو۔ تو عنایت فرمائیں۔ یا مرثیہ پر کوئی نئی کتاب آئی ہو تو بھیجیں۔

باقی حالات بدستور ہیں۔امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔اور جلد خیریت سے مطلع فرمائیے۔فقط والسلام.....نیاز مند سکندر

ڈاکٹر نعیم تقوی

کراچی.....۱۳، جولائی ۱۹۸۰ء

عزیز محترم ضمیر اختر صاحب.....سلام مسنون!

آپ کی نئی کتاب "جوش ملیح آبادی کے مرثیے" ملی واقعی اس موضوع پر آپ نے خصوصی توجہ دے کر ایک کارنامہ سرانجام دیا ہے۔اس کتاب کی اشد ضرورت تھی۔ہمیں آپ کی اعلیٰ تحقیقی صلاحیتوں سے بڑی امیدیں وابستہ ہیں۔اس دور میں جن موضوعات پر آپ شب و روز محنت کر رہے ہیں ایک حد تک نقش و نگار طاق نسیاں ہوتے جا رہے ہیں۔آپ کی ذہنی کاوشوں سے نہ صرف پاکستان میں بلکہ برصغیر میں انشاءاللہ روشن انقلاب آئے گا اور مرثیہ کے فن کو جائز مقام حاصل ہوگا۔میری دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ آپ کو سلامت رکھے۔فقط.....نعیم تقوی

ڈاکٹر شمس الدین صدیقی

(صدر شعبہ اردو، پشاور یونیورسٹی)

پشاور.....۳، نومبر ۱۹۷۳ء

گرامی قدر.....سلام مسنون!

اس سے پیشتر خیابان کے "انیس نمبر" کے سلسلے میں آپ سے مقالہ لکھنے کی گزارش کی جا چکی ہے جس کے جواب میں آپ نے مقالہ لکھنے کا وعدہ فرمایا تھا۔تادم تحریر آپ کے مقالے کا انتظار ہے۔گزارش ہے کہ اپنی پہلی فرصت میں اس طرف توجہ فرمائیں اور انیس کی زندگی یا فن کے کسی پہلو پر اپنا گراں بہا مقالہ سپرد قلم فرما کر جلد بھیج دیں۔

تا کہ ہم گزشتہ شماروں کی طرح "انیس نمبر" کا بھی اعلیٰ معیار قائم رکھ سکیں اور وقت مقررہ پر رسالہ چھپ سکے۔ رسالے کی کتابت شروع ہو چکی ہے۔

نیاز کیش...... ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی

نسیم درّانی

کراچی.....۹، اپریل ۱۹۷۱ء

محترمی نقوی صاحب.... تسلیمات

آپ کا خط ملا تھا۔ یاد فرمائی کا شکریہ، جواب تاخیر سے دے رہا ہوں، اس کے لئے معذرت چاہوں گا، پچھلے دنوں میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔

جی ہاں آپ نے "سیپ" کے "میر انیس نمبر" کے بارے میں صحیح سنا ہے، سیپ انیس کی صد سالہ برسی کے موقعہ پر انیس کو خراج عقیدت پیش کر رہا ہے، ان دنوں میں انیس نمبر پر کام کر رہا ہوں۔ ملک اور بیرون ملک کے ممتاز لکھنے والے انیس پر مضامین لکھ رہے ہیں۔ آپ میر انیس کی صد سالہ برسی کے پروگرام میں سیپ کے انیس نمبر کا نام شامل کریں۔ انیس نمبر کے لئے آپ نے جس خلوص سے تعاون کی پیشکش کی ہے میں اس کے لئے آپ کا بے حد ممنون ہوں۔ آپ کے پاس انیس کی کچھ غیر مطبوعہ تحریریں۔ ہوں تو وہ ہمیں عنایت فرمادیں۔ اس کے علاوہ آپکے پاس جو مضامین ہوں وہ بھی بھجوادیں۔ یا اگر زحمت نہ ہو تو کسی دن ملاقات فرمالیں۔ تا کہ گفتگو کر کے انیس نمبر کے لئے بہتر سے بہتر کام کیا جا سکے۔ شمس زبیری صاحب مدیر نقش کے نام بھی آپ کا خط مل گیا ہے۔ سیپ کا انیس نمبر ہم سب احباب کی مشترکہ کوششوں کا نتیجہ ہوگا۔

امید ہے مزاج بخیر ہونگے...... خلوص کار..... نسیم درانی

ڈاکٹر سبطِ حسن فاضلؔ زیدی

نواب شاہ (سندھ)......۱۶، جون ۱۹۸۰ء

برادر عزیز ضمیر اختر نقوی صاحب سلمہٗ

بہت بہت دعا۔ آپ کا نوازش نامہ ملا۔ شکریہ۔ اس اطلاع سے مسرت ہوئی کہ میرے لئے کتابوں کا انتظام آپ نے کیا ہے۔ تلاش دبیر اور باقیات انیس منگوا رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جہاں جہاں ہندوستانی کتب فروخت ہو رہی ہیں وہاں سے نئی کتب کی فہرست آتے ہی روانہ کریں گے۔ اس کرم بالائے کرم کا شکریہ کس زبان سے ادا کروں۔ اللہ پاک آپ کو اس نیکی کی جزا دے۔ آمین۔

بھائی! میں اپنی اہلی زندگی کی تباہی کی داستان تفصیلاً آپ کو بتا چکا ہوں۔ میرے دونوں بچے بیوی کے پاس ہیں جن کے ملنے کی کوئی امید نہیں۔ وہ اپنے بیس ہزار روپے مہر کے بدلے دونوں بچے مانگتی ہے۔ مہر کی رقم ادا کرنے کی مجھ میں سکت نہیں اس لئے دونوں بچے (لڑکا۔ لڑکی) دے کر پیچھا چھڑانا پڑے گا۔ اور کوئی صورت ممکن نہیں۔

میں نے ایک چھوٹی بہن کا لڑکا (عمر ۱۵ سال) متعلم انٹر سائنس پری میڈیکل اور ایک چھوٹی بہن کی لڑکی عمر تین سال گود لے رکھی ہے یہ سب دل بہلانے کی باتیں ہیں۔ بھانجہ سائنس کا طالب علم ہے اُسے ادب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ بھانجی ابھی بہت چھوٹی ہے۔ میں درد گردہ کا مریض ہوں جب درد کا دورہ پڑتا ہے تو کئی کئی دن کے لئے بے کار ہو جاتا ہوں۔ کسی دن یہ درد میری جان لے لے گا۔

اس حالت میں خدا معلوم میرے بعد میرے ذخیرۂ کتب کا کیا ہو۔ یقین ہے کہ ردّی کے بھاؤ بیچ دیا جائے گا۔ پانچ پانچ سو روپے کی قدیم مرثیہ نگاروں کی قلمی مجلات خریدنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ مجھے مرثیہ پر کام نہیں کرنا ہے کہ ان کی خریداری

ضروری ہو۔ اور تحت اللفظ کے مرثیہ سو روپے فی مرثیہ خریدنا میری قوت خرید سے باہر ہے۔ البتہ میر انیس کے تین سو قلمی (مطبوعہ) مرثیے اگر مناسب قیمت پر مل جائیں گے تو میں خرید لوں گا۔ میر انیس کے مراثی کی چھ جلدیں میرے پاس موجود ہیں۔ یقین ہے اُس میں سب مرثیے ہوں گے۔ لیکن قلمی ہونے کی وجہ سے میں انھیں خرید لوں گا۔ چوں کہ یہ سب مرثیے مطبوعہ ہیں غیر مطبوعہ نہیں ہیں۔ اس لیے ان کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہے۔ بس جو کچھ اہمیت ہے یہ ہے کہ قلمی ہیں۔ اگر یہ آپ کی توجہ سے مناسب قیمت پر مل گئے تو میں خریدنے کو تیار ہوں۔ مجموعی مناسب قیمت معلوم کر کے مجھے اطلاع دیجیے تاکہ غور کر سکوں۔ ماہ نو کے دبیر نمبر کے متعلق آپ نے کچھ نہیں لکھا کہ آپ نے لے لیا ہے یا نہیں۔ اب کے ضرور لکھیے۔ کلیات میر مطبوعہ الہ آباد (ہر دو حصہ) ۱۰۰/ روپے میں میرے بھائی لینا چاہتے ہیں اگر آپ اپنا نسخہ دے سکیں تو ممنون ہوں گا۔ آپ اپنے لیے ہندوستان سے پھر منگوالیں۔ پہلے بھی لکھا تھا لیکن آپ نے کچھ جواب نہیں دیا۔ اس مرتبہ ضرور جواب دیجیے۔ زیادہ خیریت۔ والسلام۔ آپ کا مخلص

فاضل زیدی

شریف الحسن

انگورہ (ترکی)...... ۱۶ مارچ ۱۹۷۳ء

مکرمی و محترمی ضمیر اختر نقوی صاحب،

تسلیم، امید ہے آپ جناب بخیر و عافیت ہوں گے، آپ کی زحمت قلم فرسائی کا ممنون ہوں مگر "زبروینہ" کی وجہ تسمیہ سمجھ میں نہیں آئی، نیز ابجدی عدد کے شمار میں جو کونہ جدت ہے وہ تو سمجھ میں آگئی مگر اس اُپج کی ضرورت عقل میں نہیں آئی۔

برادر عزیزم جناب ضیاء الحسن موسوی صاحب کو میرا بہت بہت سلام، عندالملاقاۃ

میں ان سے ماونو کا انیس نمبر مستعار لیکر پڑھوں گا۔ ترکی میں میری سہ سالہ مدت قیام
اواخر اپریل میں پوری ہو رہی ہے ورنہ میں میر انیس کی صد سالہ برسی کی مناسبت سے
کوئی مضمون لکھتا آپ کے لئے اردو میں جس میں ترکی زبان میں مرثیہ نگاری کا اجمالی
خاکہ پیش کیا جاتا۔ یہ میرے دوست پروفیسر عبدالقادر قرہ خان (استنبول یونیورسٹی) نے
اپنی پی ایچ ڈی کی ڈگری کے لئے اس موضوع پر کام کیا تھا مگر حق تو یہ ہے کہ ترکی میں
جو مقاتل حسین یا مرثیے لکھے گئے ہیں وہ اردو کے مرثیوں کے پاسنگ بھی نہیں بلکہ اس
صنف سخن میں ایران بھی ہم سے بہت پیچھے ہے، میں نے پروفیسر عبدالقادر قرہ خان کو
ایک صحبت میں مختصراً اردو مرثیہ نگاری سے متعارف کیا تھا تو وہ دنگ رہ گئے تھے، ان کا
یہاں آنا کم ہوتا ہے ورنہ میرا ارادہ تھا کہ ہم دونوں ترکی میں انیس پر مضمون لکھیں، اب
میرے پرانے دوست محمد حنیف فوق صاحب اس خدمت کو انجام دیں، میں اُن سے
بات کروں گا آپ بھی ان کو لکھئے۔ مجھے خوشی ہوئی کہ تین سو برس پرانی اردو لغات پر
جنگ (۲۸، جنوری ۱۹۷۴ء) میں میرا مختصر تعارفی مقالہ آپ نے پسند کیا، اب میں
سوچتا ہوں کہ قدرے مفصل تر مضمون کسی کثیر الاشاعت ہفتہ وار پرچہ مثلاً اخبار جہاں
یا یہاں کو بھیجوں تاکہ عام پڑھا لکھا طبقہ بھی اس علمی کارنامے سے جو فراموش ہو چکا تھا
کچھ نہ کچھ آگاہ ہو۔ انیس کی برسی کیسے منائی جائے اس موضوع پر جنگ میں آپ سے
بہتر کون لکھ سکتا ہے، میرا لکھنا چھوٹا منہ بڑی بات ہوگا کہ میں نہ اس دشت کا سیاح ہوں
نہ اس میدان کا مرد، والسلام مع الاکرام..... احقر شریف الحسن

ڈاکٹر عبادت بریلوی

پنجاب یونیورسٹی، لاہور.......۱۵، نومبر ۱۹۷۳ء

محترم ضمیر اختر نقوی صاحب آداب

آپ کا نوازش نامہ ملا.....میں ۳۰، ۳۱ دسمبر کو کراچی نہیں پہنچ سکتا۔ یہاں مصروف ہوں۔ میرے چھوٹے بھائی کی شادی ہے اس لئے معذرت خواہ ہوں۔

ہم لوگ یہاں ۶ دسمبر کو یوم انیس منا رہے ہیں سینیٹ ہال میں جلسہ ہوگا۔

امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ دعا گو...ڈاکٹر عبادت بریلوی

ڈاکٹر افضال احمد

لکھنؤ......

مخدومی جناب ضمیر اختر صاحب! مزاج گرامی

تسلیم بعد تعظیم!

عالیجناب نے ظہیر اقبال کی درخواست پر وعدہ فرمایا تھا کہ ایک مضمون ماچس لکھنوی پر عطا فرمائیں گے۔ امید ہے مضمون تحریر فرما دیا ہوگا۔ براہ کرم اسے بھیجنے کی زحمت گوارہ فرمائیں یا میرے دوست سید یاور مہدی کا جو ریڈیو پاکستان کراچی میں ہیں ان کو دے دیجئے اور ارشاد فرما دیں کہ وہ مجھے بھیج دیں۔

راحیل میاں کو ظہیر اقبال نے یاور صاحب کے لئے کچھ کلام ماچس بھیجا تھا براہ نوازش راحیل سے کہئے کہ اگر انہوں نے یاور صاحب کو وہ نہ پہنچایا ہو تو یاور کو 481627 نمبر پر فون کر دیں وہ خود آ کر لے جائیں گے لیکن ان سے کہیں کہ افضال نے بھیجا ہے۔ یاور صاحب کا پتہ ہے۔ (۱) ریڈیو پاکستان۔ کراچی

اور گھر کا پتہ ہے: 58 Sadat Colony,Karachi-25

امید ہے جواب سے سرفراز فرمائیں گے

خاکسار.....افضال احمد

خواجہ حمید الدین شاہد

کراچی.....۱۷، جون ۱۹۸۲ء

مکرمی ضمیر اختر نقوی صاحب۔ زادلطفہٗ

السلام علیکم۔ مزاج گرامی

آپ کا کرم نامہ ابھی ابھی ملا۔ یادفرمائی کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ آپ نے یادرفتگان حصہ دوم بازار سے خرید کر مجھے ممنون فرمایا۔ میں اس قدر افزائی کا کس طرح شکریہ ادا کروں۔ میں تو یہ نمبر آپ کو تحفۃً پیش کرتا۔ میں تنہا سارے کام انجام دیتا ہوں۔ جلد ساز نے ابھی پورے پرچے نہیں دیے۔ سو سو دو سو کر کے آ رہے ہیں۔

آپ جب تشریف لائیں گے تو "دربار دُربار" نذر کروں گا۔

براہ کرم آنے سے پہلے فون ضرور کرنے کی زحمت فرمائیں۔ یا پھر کسی دن بھی صبح ۹ بجے تک تشریف لائیں یا شام ۳ تا ۵۔ میں بہت کم باہر جاتا ہوں لیکن آج کل شام میں کوئی نہ کوئی جلسہ ہوتا ہے۔ جس میں بہ مجبوری شریک ہونا پڑتا ہے۔

جناب نادم سیتاپوری صاحب کو اللہ تعالیٰ سلامت رکھے۔ مجھے خود جب حقیقت حال کا علم ہوا تو دلی صدمہ ہوا۔ میں نے "جسارت" میں معذرت شائع کرا دی جسے ایک ہفتے سے زائد ہو گیا۔ قصہ یہ ہوا کہ مشہور پریس کے صابر صاحب جو نادم صاحب کے قریبی ملنے والوں میں سے ہیں مجھ سے بڑے دکھ سے کہا کہ دیکھئے نادم سیتاپوری انتقال کر گئے کسی اخبار میں دو سطریں خبر بھی شائع نہیں ہوئی۔ مجھے یہ سن کر دلی افسوس ہوا اور میں نے ان سے کہا کہ "سب رس" میں تعزیت شائع کروں گا۔ چونکہ صابر صاحب کے بیان پر شک کی گنجائش نہ تھی اس لئے کسی سے معلوم کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ جب تک نادم صاحب نصیر آباد میں تھے تو میں بھی ہر ماہ ان کے ہاں جاتا تھا

پھر معلوم ہوا کہ وہ کہیں اور منتقل ہو گئے ہیں۔ مجھے تو ان کی علالت کا بھی علم نہیں تھا۔ ان کی بیگم صاحبہ کی ناراضی بجا ہے۔ میں قصوروار ہوں۔ ضرور ہوں لیکن اس میں میری نیت پر ہرگز شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ میں خود دل کا مریض ہوں اس لئے کسی کو بیماری کی حالت میں نہیں دیکھ سکتا اور وہ بھی کسی دوست کو۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک نادم صاحب کو صحت عطا فرمائے۔ آمین مخلص.... خواجہ حمید الدین شاہد

شوکت رضا شوکت

ملتان

محترم المقام عالیقدر جناب الحاج پروفیسر ڈاکٹر علامہ ضمیر اختر صاحب!

تسلیم ویا علی مدد

بعد از آگاہی خیریت عرض ہے کہ 8110645 پر فون کر کر کے تھک گیا ہوں۔ سمجھ نہیں آتی کہ رابطہ کیوں نہیں ہو رہا۔ بہر حال اولاً تو جناب کی مزاج پرسی اور احباب کی خیریت کا طلبگار ہوں۔ اور دعا گو ہوں کہ آپ لوگ سدا ظلِ آل محمدؐ میں رہیں۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ رمضان المبارک کے پروگرام سے بالتفصیل آگاہ فرمائیں تا کہ میں کوئٹہ اور ٹیکسلا والوں کو کوئی حتمی جواب دے سکوں۔

برادر محترم "قائم بھائی" عالیقدر علامہ ذوالفقار نقوی صاحب قبلہ، شاعرِ آلِ محمدؐ جناب کمال صاحب، فقیہ ملت سرکار علامہ ماجد صاحب، تسکین بزم سخن ہمجلیسوں کے داتا بلکہ ان داتا جناب زیدی انکل، نبض شناسِ ادب ڈاکٹر صاحب اور میر کاروانِ مجالس عالیقدر ناصر انکل کی بارگاہ اقدس میں سلام خاص

والسلام... آپ کا بیٹا

شوکت رضا شوکت ملتان

ڈاکٹر ہلال نقوی

گھوٹکی.....۱۱، ستمبر ۱۹۸۲ء

بھائی ضمیر اختر نقوی صاحب.....آداب

آپ کی دعاؤں سے زندہ ہوں گھوٹکی کی دم گھوٹنے والی فضا میں رہ کر مقالہ مکمل کر رہا ہوں۔ دو بہت ضروری زحمتیں دے رہا ہوں، جوابی لفافہ ساتھ ہے جواب ابھی ابھی لکھ دیجئے

(۱) آپ نے ایک بار سنایا تھا کہ ذوق کے شاگرد ظہیر دہلوی (متوفی ۱۹۱۱ء) نے بھی مرثیے لکھے تھے اور گوالیار میں کسی کے پاس ہیں۔ اس کے متعلق آپ کی کیا معلومات ہیں۔

(۲) جوش صاحب کے مرثیہ کے پیش لفظ میں آپ نے لکھا تھا کہ رسوا کے مرثیے موجود ہیں آپ کے پاس، اس کا بھی ذکر کر دیجئے خط میں۔ میں ان دونوں شعرا کے ذکر میں آپ کے خط ہی کا حوالہ اپنے مقالے میں دے دوں گا۔ فوراً اور اسی وقت جواب لکھ دیجئے۔ جوش صاحب کی بیٹی سعیدہ اور ان کے نواسوں سراج، خسرو اور فرخ کے انٹرویوز چھٹی ستمبر کو ریکارڈ کرنے تھے۔

اردو مرثیہ پاکستان میں۔ خدا کرے اس بار بھی مل جائے۔ جواب کا بے چینی سے منتظر رہوں گا۔ جواب اسی وقت دے دیجئے...ڈاکٹر ہلال نقوی

اقبال کاظمی

کراچی.....۳۱، جنوری ۱۹۹۸ء

جناب مولانا ضمیر اختر نقوی صاحب.....سلام علیکم مزاج گرامی

میں اور نیر اسعدی آپکی خدمت میں عید کی مبارک باد دینے کے لئے حاضر ہوئے تھے۔ کل بھی ٹیلیفون پر رابطے کی کوشش کی تھی لیکن کوئی ٹیلیفون نہیں اٹھا رہا تھا ممکن ہے آپ گھر پر تشریف نہ رکھتے ہوں یا ٹیلیفون خراب ہو۔ بہر حال آپ کو بہت بہت عید مبارک۔ میاں ماجد اور کمال صاحب اور دیگر احباب اور پرسان حال کی خدمت میں بھی عید کی مبارکباد پہونچادیں۔

امید ہے کہ آپ بخیر و عافیت ہوں گے رثائی ادب میں آپ کا معرکتہ آلارا مضمون پڑھا۔ سبحان اللہ! تاریخ مرثیہ گوئی پر آپکی کتاب کی جلدوں کی اشاعت کا اعلان پڑھ کر از حد مسرت ہوئی خداوند عالم کی بارگاہ میں دعا کرتا ہوں کہ جلد یہ کتابیں اشاعت پذیر ہوں۔ القلم کی اشاعت کا بھی انتظار ہے۔ اچھا اب اجازت۔ (امید ہے کہ آپ غریب خانہ پر تشریف لا کر عزت افزائی فرمائیں گے)۔ خیر اندیش.... اقبال کاظمی

سیّد ہاشم رضا

کراچی.... ۹، مئی ۱۹۷۸ء

عزیز مسلمہ، سلام و دعائیں

آج جناب جوش کا مضمون بہ عنوان "ہائے آل رضا" مجھے مل گیا جس کی نقل بھیج رہا ہوں۔ میری دعا ہے کہ جناب جوش کی آخری التجا پوری نہ ہو اور وہ کئی برس ہم سے جدا نہ ہوں۔ سید راحت حسین صاحب نے مجھ سے پوچھا تھا کہ وہ اپنا مضمون کسے بھیجیں میں نے ان سے کہا کہ ضمیر اختر صاحب ہی ان مضامین کو جمع کر رہے ہیں اور ان سے بہتر کوئی مرتب کرنے والا نہیں۔ خدا کرے کہ آپ اچھے ہوں اپنے والد ماجد کو میری تسلیم پہنچا دیجئے گا۔ دعا گو ہاشم رضا

سید علی احمد دانش (آل انیس)

لکھنؤ.....۲۰، جون ۱۹۷۷ء

محترمی جناب ضمیر اختر بھائی.....آداب

امید ہے کہ آپ مع متعلقین بخیر و عافیت ہوں گے۔ آپ کا خط مورخہ ۲، جون ملا، یہاں ۵، جون کو چالیسویں کی مجلس تھی جس میں مختلف لوگوں نے قطعات، تاریخ اور نظمیں وغیرہ پڑھیں۔ پیش خوانی میں ہم اور مرثیہ انیس بھائی صاحب پڑھے۔ چھوٹے چچا کی تاریخ انہی تاریخوں کے ساتھ محفوظ کر لی ہے۔ آپ کی اطلاع کے مطابق ۱۲ تاریخ کو اصغر بھائی اور چھوٹے چچا رضویہ امام باڑے میں ابا کے سلسلے میں مجلس ایصال ثواب کر رہے ہیں۔ یہ خبر سن کر میں مطمئن ہوا کہ آپ لوگوں کو ایسا کرنا ہی چاہئے تھا۔ خدا ان کو اس کا اجر دے گا اور یہ بھی خوشی ہوئی کہ آپ مرثیہ پڑھیں گے۔ خدا آپ کو عزت و شہرت عطا فرمائے۔ قبر کے بارے میں جو آپ نے لکھا ہے اس سلسلے میں تحریر ہے کہ ابا کی وصیت کے مطابق ان کو دادا آبا میر علی محمد عارف کی قبر کے پاس دفن کیا۔ یہ جگہ انہوں نے جب وہ ٹھیک تھے خود تجویز کی تھی۔ منظور بھائی آج کل بمبئی گئے ہوئے ہیں اور آبا کی وفات کے دن بھی یہاں نہیں تھے۔ ابا کے سلسلے میں میں ایک مضمون لکھ رہا ہوں اور چاہتا ہوں کہ آپ زحمت کر کے اسے کسی رسالے یا اخبار میں چھپوا دیں جس سے وہاں کے لوگوں کو معلومات ہو جائے۔ امید ہے آپ میری یہ تمنا پوری کر دیں گے۔ آئندہ اپنے گھر والوں کی خیریت سے مطلع کیجئے گا کہ سب لوگ کیسے ہیں یہاں اماں کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ ابا کی طرف سے تو اطمینان تھا مگر ہم بد نصیب ہیں کہ وہ چاہنے والا باپ ہمارے درمیان نہ رہا اور اچانک دنیا سے رخصت ہو گیا۔ اب سوائے صبر کے اور کیا کیا جائے۔ باقی یہاں حسب دستور ہے۔ کار لائقہ

سے یاد فرمائیں۔آپ کا اپنا.....سید علی احمد عرف منا

سید آصف علی شاہ گیلانی

لاہور.....۱۹، جنوری ۱۹۹۹ء

قبلہ ڈاکٹر ضمیر اختر صاحب!.....خدا آپ کو عمر نوح عطا فرمائے آمین

السلام علیکم

امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے کل بہت فون کیا مگر کوئی اٹھا نہیں رہا تھا بہر حال آپ جیسے قابل قدر انسان بہت کم ملتے ہیں لیکن یہاں قدر شناس ہیں کتنے۔ بہر حال ہم تو آپ کے قدر شناس ہیں اور آپ کو پیار بھی کرتے ہیں کاش اہل سنت میں بھی آپ جیسا کوئی عالم پیدا ہو جائے تو لڑائی ختم ہو جائے۔آپ کے علم سے استفادہ کرنا ان لوگوں کے لئے بہت ضروری ہے۔جن تک آپ کا پیغام اس لئے نہیں پہنچ رہا ہے کہ آپ شیعہ ہیں اور شیعہ اس لئے آپ کو بہت زیادہ اسٹیج دینے سے کتراتے ہیں کہ آپ سچ بولتے ہیں اور پھر اجارہ داریاں بھی تو کسی چیز کا نام ہے۔جو نہیں چاہتیں کہ آپ جو کہ فیس کے قائل نہیں مگر لوگوں کا بجٹ تو خراب کر دیتے ہیں۔

بہر حال ہم اَن پڑھ سنی ہمیں کیا لینا ہے شیعہ کی اندرونی سیاست سے ہم تو شیعہ ازم کے حصار کو پیار کرتے ہیں۔یہ کیا کرتے ہیں ہمیں ان سے سروکار نہیں۔بس شیعہ خوش رہیں۔اور اپنے آقاؤں کا نام لیتے رہیں۔خواہ عزاداری سے خواہ مجالس سے۔بس ان کا نام رہے۔کچھ بھی ہو اور جو ان کا دشمن ہے ہم ان کے دشمن ہیں اوپر کی بات تو ہم کرتے نہیں کہ ہم اہل بیت اطہار علیہ السلام سے محبت کرتے ہیں بھئی ہم تو ان کو اپنے سر کا تاج سمجھتے ہیں جو ان کو مانتے ہیں۔بہر حال بھائی آپ کی کیسٹس مجھے چاہئیں براہ کرم مجھے بھیج دیں اس کا جو بھی سلسلہ جمنٹ ہوگا وہ میری سر آنکھوں پر امید ہے اب

کے مایوس نہیں کریں گے۔ قائد اہلسنت ... پیر آصف علی گیلانی

زیب سجادہ حجرہ شاہ مقیم

قائد تحریک وحدت اسلامی، پاکستان

ڈاکٹر تمقام حسین جعفری

کراچی ...... ۲۳ جنوری ۱۹۷۸ء

ضمیر اختر صاحب! سلام مسنون

مجھے آپ کی مصروفیات کا احساس ہے اس لئے قبل از وقت مطلع کر رہا ہوں تا کہ آپ مجلس کے لئے وقت نکال سکیں۔ ۲۷ جنوری ۷۸ء بروز جمعہ انشاء اللہ دس بجے غریب خانے پر مجلس عزا برپا ہوگی۔ امید ہے آپ شریک ہو سکیں گے۔ دل تو چاہتا تھا کہ آپ کے والد ماجد کو بھی مجلس میں شرکت کے لئے لکھوں لیکن بعد مکانی کے ماسوا یہ بات بھی مانع ہے کہ مجلس نہایت اختصار سے ہوگی۔ میں خود مرثیے کے چند بند پڑھوں گا بہر حال ان کی خدمت میں آداب کہئے۔ والسلام ... تمقام جعفری

ڈاکٹر سبط حسن رضوی

اسلام آباد ... ۲۵، مئی ۱۹۷۲ء

جناب ضمیر اختر نقوی صاحب ... سلام مسنون!

"ماہِ نو" کا "انیس نمبر" دیکھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کی محنتیں ضائع نہیں ہوئیں اور اس امر کا افسوس ہوا کہ دبستان انیس آپ کی صلاحیتوں سے خاطر خواہ استفادہ نہ کر سکا۔ دبستان کا رسالہ بھی پریس میں ہے اگر کوئی مواد آپ کے پاس تازہ اور ہو تو ضرور روانہ کر دیں خواہ وہ نظم کا ہو یا نثر کا۔ اصغر حسین اصغر صاحب کا فوٹو درکار ہے کیوں کہ سلسلہ

نسب میں سب کی تصویریں آپ کے تعاون سے حاصل ہو گئی ہیں لیکن ان کی تصویر نہیں ہے۔ اگر وہ یا ان کے عم محترم یوسف صاحب کوئی مقالہ لکھ سکیں تو ابھی گنجائش ہے۔ اصغر صاحب تو اپنا کہا ہوا مرثیہ بھی طباعت کے لئے روانہ کر سکتے ہیں۔ یہ رسالہ چھپ جائے تو پھر جلسوں کی بھی صورت از سر نو نکل آئے گی اور انیس اور دبیر کے سلسلوں سے اس سال بھی یہ جلسے ہو سکیں گے۔ آپ نے ایک مرتبہ لکھا تھا کہ آپ بھی کوئی مقالہ روانہ کرنا چاہتے ہیں اگر اب تک بچ گیا ہو تو جلد روانہ کر دیں۔ سنا تھا کہ بہت سے رسائل نمبر نکال رہے ہیں۔ نگار، سیپ اور ماہ نو کے علاوہ جن رسالوں نے نمبر نکالے ہوں ان کی ایک فہرست بھی روانہ کر دیں۔ اپنی خیریت سے بھی مطلع کریں۔ دبستان کا دوسرا شمارہ دبیر نمبر ہوگا۔ جس کے لئے ابھی سے مواد اکٹھا کر رہا ہوں جو بھی انیس نمبر کے لئے مقالے، یا نظمیں ہوں، جلد آنا چاہئیں کیونکہ کتابت شروع ہو چکی ہے۔

جواب فوراً دیجئے گا۔ سبط حسن

وحید الحسن ہاشمی

لاہور.....۹، ستمبر ۱۹۹۵ء

گرامی قدر تسلیم!

آپ کی محبت و شفقت کا میں شروع ہی سے معترف ہوں شعرائے حق کی سرپرستی علمائے فن کا وتیرہ رہا ہے۔ آپ کے اس عمل نے مولانا سبط حسین جونپوری مرحوم اور مولانا محسن نواب مرحوم کی یادوں کو از سر نو تازہ کر دیا ہے۔ میں مرثیہ گوئی کے میدان میں ابھی طفل مکتب ہوں۔ آپ کے قیام لاہور کے زمانے میں جو مرثیہ "کشمکش" میں نے شروع کیا تھا ابھی تک نامکمل ہے اس کو مکمل کر رہا ہوں۔ اس کے علاوہ جناب فاطمہؑ پر دو مرثیے کہہ چکا ہوں۔ اس لئے نئے مواد کی فراہمی میں بھی مہینے صرف ہوں

گے پھر میری رفتارِ مرثیہ نگاری بہت سست ہے۔ اس لئے وقت مقررہ تک کوئی نیا مرثیہ نہیں کہہ سکوں گا۔ اگر زندگی رہی تو سال آئندہ آپ کے حکم کی تعمیل بجالاؤں گا۔ عزیزی تسنیم سلمہ کو نہیں بھولے گا۔ شاید ستمبر کے آخری ہفتے میں ملاقات ہو جائے۔ علامہ جوہری صاحب لاہور میں ہیں۔ خدا آپ کو شرِ اعداء سے محفوظ رکھے۔

خیر طلب.....وحید الحسن ہاشمی

امیر امام حر

لندن......۱۹۹۳ء

جناب ضمیر اختر نقوی صاحب سلمک اللہ.....والسلام علیکم ورحمۃ اللہ،

آپ نے جو میرا تعارف میرے ہنوز ناتمام طویل مسدس کرب و بلا پر تحریر فرمایا ہے اس کا صمیم قلب سے تشکر و امتنان عرض کرتا ہوں۔ آپ کی اس تحریر سے جو قدر دانی و ذرہ نوازی و ہمدردی و خلوص مترشح ہوتا ہے اس کا اجر آپ کو محمدؐ و آل محمدؐ سے ملے انشاء اللہ خدا آپ کو محمدؐ و آل محمدؐ خدمت کرنے کا مدت دراز تک موقع و تحصیل سعادت کا شرف دے انشاء اللہ۔ اس مسدس کے ایک ہزار تین سو پینتیس (۱۳۳۵) بند اب تک میں نے نظم کر لئے ہیں اور بشرطِ حیات انشاء اللہ ڈیڑھ سو یا دو سو بند (تقریباً) مزید نظم کر کے اس کی تکمیل انشاء اللہ کرلوں گا۔ جناب کا تعارف بھتیجی بھائی مرحوم کے تعارف اور انجم حسین سلمہ صاحب اور عسکری بھائی مدظلہ (عسکری حسین صاحب) کے تعارف کے ساتھ مسدس کی تمہید کے طور پر انشاء اللہ طبع ہوگا۔ میرا داہنا ہاتھ اور داہنا بازو شل خفیف (MILD STROKE) کے نتیجے میں ذرا کمزور ہو گیا ہے اور میرا خط بد سے بدتر ہو گیا ہے جس کے لئے معذرت قبول فرمایئے۔ اپنے والد گرامی مدظلہ کی خدمت میں میرا سلام پیش کر دیجئے۔ مخلص.....سید محمد امیر امام حر

زیڈ اے بخاری

کراچی.....۴، دسمبر ۱۹۷۲ء

مکرمی، سلام مسنون

حکم نامہ ملا میں دسمبر کی دسویں کو بشرط زندگی حاضر ہوں گا اور آپ کے ارشاد کے مطابق جب "قطع کی مسافت شب آفتاب نے" پڑھنے کی کوشش کروں گا اب دم خم کہاں، مگر کوشش ضرور کروں گا، یہ مرثیہ زور مانگتا ہے اللہ مددگار رہو۔

مجھے شروع میں پڑھوا دیجئے۔ نسیم صاحب کے بعد کیا خاک پڑھوں گا۔

زیادہ دعا.....خاکسار.....ذوالفقار

ڈاکٹر خاور رضوی نگرامی

کراچی.....۸، جولائی ۱۹۸۰ء

برادر محترم سید ضمیر اختر نقوی صاحب، احترامات

آپ نے اپنی مرتب کردہ کتاب "مراثی جوش ملیح آبادی" مجھے عنایت فرمائی جس کے لئے میں آپ کا سپاس گزار ہوں۔ میں نے اس کتاب کے ایک ایک لفظ کو غور سے پڑھا۔ جوش صاحب کی ان مہکتی ہوئی نظموں نے مجھے بہت مسرور کیا۔ اس میں فلسفہ بھی ہے، مضمون آفرینی بھی ہے، شعریت بھی ہے، جدت بھی ہے لیکن مرثیت نہیں ہے جو رثا کی جان ہے۔ پھر بھی میں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اور سینکڑوں مقامات پر میری روح جھوم اٹھی "جادو نگاری" بہت مشکل فن ہے جو لاکھوں میں سے چند کے حصہ میں آتی ہے۔ انہی نظموں میں بعض بند ایسے بھی ہیں جن میں حضرت جوشؔ کے قلم کی جادو نگاری ہے اور اس میں چند نظمیں اردو ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ لیکن

میری بصیرت یہ کہتی ہے کہ حضرت جوشؔ باوجود انتہائی کوشش وسعی بسیار حضرت انیس اعلیٰ اللہ مقامہ کے قدموں تک پہنچنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ وہ حضرت انیسؔ کے سینہ و سر تک ابھی نہیں پہنچے۔ حضرت انیس صنف مرثیہ نگاری میں اب بھی اس مقام بلند پر کھڑے ہیں جہاں وہ بالکل تنہا ہیں اور کوئی ان کا مقابل نہیں ہے۔ طربیہ نظم لکھنا آسان ہے المیہ لکھنا دشوار تر ہے اور پھر جوشؔ کو نفسیات نگاری، منظر نگاری (ان مرثیوں میں) ڈرامائی پیچ اور رزمیہ کی تو ہوا تک نہیں لگی ہے۔ ابھی وہ انیسؔ اعظم سے بہت نیچے ہیں۔ لیکن انیسؔ کے علاوہ دوسرے مرثیہ نگاروں سے اونچے ہیں۔ یہی ان کا کمال ان کو ادب میں ہمیشہ زندہ رکھے گا۔ انیسؔ اعظم زندہ باد = شبیر حسن خان جوشؔ پائندہ باد۔ براہ کرم اس خط کی رسید ضرور روانہ فرمایئے گا۔ کتابت کی جو غلطیاں اس کتاب میں ہیں ان کی نشاندہی اور اصلاح علیحدہ ملفوف ہے۔ دونوں کی رسید بھیج کر ممنون فرمایئے۔ آپ کا مداح...... خاور نگرامی

طاہر تونسوی

لاہور...... ۲۶ مارچ ۱۹۷۸ء

برادرم ضمیر اختر نقوی صاحب، تسلیمات

اس دن کے بعد آپ سے ملاقات کے لئے حاضر نہ ہو سکا۔ معذرت خواہ ہوں آپ کو علم ہے کہ وہاں کتنا کام تھا اور فاصلے بھی بہت تھے۔

امید ہے کہ آپ نے میرا فوٹو اسٹیٹ والا کام کروا لیا ہوگا۔ از راہ کرم مجھے ارسال فرما دیجئے میں ممنون ہوں گا۔ میں اس تعاون کے لئے بھی جو آپ نے مجھ سے کیا بہت احسان مند ہوں۔ آپ نے انڈیا کی کتابوں کے لئے لکھ دیا ہوگا۔ یاد دہانی کے

لئے پھر نام لکھ رہا ہوں۔ واجد علی شاہ (سید مسعود حسن رضوی) سید مسعود حسن رضوی ادیب (مرزا محمد جعفر ایڈووکیٹ) میں فوٹو اسٹیٹ کا منتظر ہوں۔ لاہور سے جو کتابیں آپ کو درکار ہوں، مجھے تحریر کر دیجئے میں یہاں سے بھیج دوں گا۔ میرے لائق لاہور کی اور کوئی خدمت؟.....خیر اندیش.....طاہر تونسوی

فضل قدیر

راولپنڈی.....۲۳، جولائی ۱۹۷۶ء

برادر عزیز ضمیر اختر صاحب.....تسلیم

آپ کا خط مرقومہ ۱۵ جولائی موصول ہوا۔ ممنون کرم ہوں حسب ارشاد سید سردار نقوی صاحب کا مضمون انہیں واپس ارسال کر دیا ہے۔ آپ نے اشاریہ دبیر کے متعلق لکھا ہے تو برادر گرامی اتنی دور بیٹھ کر آپ یقیناً میری مجبوریوں کا تصور نہیں کر سکتے ۔ اشاریہ بڑے کام کی چیز ہے اور میں اسے نظر انداز نہیں کر سکتا تھا مگر کیا کروں یہ ناگزیر ہو گیا۔ بہرحال اسے کسی اور موقع پر شائع کرنے کی کوشش کی جائے گی۔ اس لئے بے صبر نہ ہوں قائداعظم پر آپ نے کیا کام کیا ہے؟ کس نوعیت کا ہے؟ تفصیل لکھئے اور جلد لکھئے اگر کوئی خاص چیز تیار ہو تو بھیج دیجئے۔

مخلص.....فضل قدیر

پروفیسر کاظم علی خاں

لکھنؤ.....۱۹، مئی ۱۹۷۹ء

عزیزی دعائیں!

عرصے کے بعد خط لکھ رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ ٹھیک ہوں گے اور اپنے ادبی

کاموں میں لگے ہوں گے۔ اس خط کے ذریعے اپنے ایک دوست اور کالج کے شریک کار جناب عباس حیدر صاحب مضطر جونپوری لیکچرار شعبہ ریاضی شیعہ اردو کالج لکھنؤ کو آپ سے متعارف کرانا مقصود ہے۔ مضطر جونپوری مسدس اور دوسرے اصناف سخن میں خاصے عرصے سے مشق کر کے اب ادبی اور مذہبی حلقوں میں معروف و مشہور ہو چکے ہیں۔ ان کی تخلیقات کی تفصیلات آپ کو خود ان کے خط سے معلوم ہو جائیں گی۔ آپ اگر مرثیہ نگاروں پر کوئی کام کر رہے ہیں تو اس میں مضطر جونپوری کا ذکر خیر بھی کر دیں۔ یہ خط بہ عجلت لکھا جا رہا ہے کالج بند ہو رہا ہے۔ کل مسوری، رام پور، دہلی کے سفر پر روانہ ہو رہا ہوں۔ دو کتابوں کی کتابت سے نبرد آزما ہوں گرمی میں پیسٹا لیتھو کی زرد کتابت کی کاپیوں کے لئے پریشانی کا باعث ہو رہا ہے۔ ایک کتاب تو "مطالعہ تاریخ ادب ہندی" (طبع اول ۱۹۷۳ء) کا دوسرا ایڈیشن ہے اور دوسری کتاب "تلاش دبیر" (تحقیقی مضامین کا مجموعہ) ہے جس کے لئے یوپی اردو اکیڈمی نے مالی امداد کی منظوری دے دی ہے۔ یہ دونوں کتابیں اردو پبلشرز سے آپ کو مل جائیں گی چھپ جانے پر ان کو ہدایت کر دوں گا کہ آپ کو ایک ایک جلد مل جائے۔ خدا کرے آپ بہ خیر ہوں۔

آپ کا..... کاظم علی

امجد علی خاں

لکھنؤ..... ۹، اپریل ۱۹۸۲ء

بھائی ضمیر اختر صاحب..... آداب عرض!

آپ کا والا نامہ آیا مگر میں مظفر علی کی نئی فلم " آگمن " کی فلم بندی کے سلسلے میں لکھنؤ سے باہر گیا ہوا تھا۔ اس فلم میں میرا اچھا رول ہے۔ تصاویر، مضمون اور " مثنوی حزن

اختر" پر آپ کی رائے اور مشوروں کا بہت بہت شکریہ آپ نے جو دی کتابیں مجھے مرحمت فرمائی تھیں اس سلسلے میں ایک شکریہ کا خط میں نے آپ کی خدمت میں ارسال کیا تھا جس میں مزید کتابوں کے لئے التجا بھی کی تھی۔ مگر آپ کو میرا وہ خط نہیں ملا۔ مجھے تاریخ فرشتہ (اردو) کی دونوں جلدوں کی سخت ضرورت ہے۔ براہ کرم جلد از جلد ارسال فرمادیں آج کل میں نواب وزیر علی خان پر کام کر رہا ہوں۔ جناب مرزا علی اظہر برلاس کا بھی خط آیا تھا آج ان کو بھی جواب لکھا ہے۔ بیگم حضرت محل پر فلم کے لئے میں نے کہانی مکمل کر لی ہے۔ مظفر علی کو کہانی پسند ہے مگر کوئی Financer نہیں مل رہا۔ تقریباً ایک کروڑ روپیہ اس فلم پر خرچ ہوگا۔ حضرت واجد علی شاہ کے صد سالہ جشن کی تقریب ۱۹۸۷ء میں منعقد ہوگی۔ اس درمیان واجد علی شاہ پر ایک دستاویزی فلم بنانے کا ارادہ ہے۔ بیرون ملک کا دورہ خدا کرے آپ کو راس آئے اور مبارک ہو جب آپ لکھنؤ تشریف لائیں گے تبھی اپنی کتابیں نذر کروں گا۔ کچھ مراثی بھی میں نے آپ کے لئے لے رکھے ہیں۔ امید ہے کہ مزاج عالی بخیر ہوگا فقط والسلام

نیاز مند.... امجد علی خاں

ڈاکٹر نواز حسن زیدی

لاہور......

محترم جناب ضمیر اختر نقوی صاحب مدظلہ..... السلام علیکم

امید ہے آنجناب مع الخیر ہوں گے۔ جناب نجم آفندی کا نام اردو شاعری خصوصاً رثائی ادب میں ایک اہم مقام کا حامل ہے۔ شاعر موصوف کی شخصیت اور فن کے حوالے سے ایم فل کی سطح پر تحقیقی مقالہ زیر ترتیب ہے جس کے لئے مجھے آپ کا خصوصی تعاون درکار ہے۔ اس سلسلے میں ایک سوالنامہ آپ کی خدمت میں ارسال کیا جا رہا ہے

جس کے جوابات مطلوب ہیں۔ براہ کرم ان سوالات (یا ان میں سے جو آپ پسند فرمائیں) کے جوابات اپنی اولین فرصت میں تحریر کر کے ارسال فرما دیں۔

میں اس کرم فرمائی پر آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔تعارف مقالہ نگار:۔
ا۔گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور میں ایم۔اے اردو کی تدریس سے وابستہ ۲۔مرتب کتاب "حالی واکبر ایک جائزہ" والسلام مخلص..... سید نواز حسن زیدی

مسعود رضا خاکی

لاہور.....۱۷فروری ۱۹۸۰ء

برادرم!

سلام مسنون کے بعد گزارش ہے کہ اس سے قبل میں نے ایک خط آپ کو ڈاکٹر تقاام کو اور ایک آغا آفتاب صاحب کو بھیجا تھا بلکہ ایک خط اور بھی فیض بھرت پوری صاحب کو بھیجا تھا۔ چاروں لفافے ایک ہی ساتھ سپرد ڈاک کئے تھے۔ آغا آفتاب صاحب کا خط آیا ہے کہ انہیں خط نہیں ملا۔ شاید یہی حشر دوسرے خطوط کا بھی نہ ہوا ہو، اس لئے دوبارہ خط لکھ رہا ہوں۔ شیخ ضیاء اللہ حیدر صاحب ضیاء کا جو مرثیہ حضرت عباس علیہ السلام کے حال میں ہے اس کا مطلع جو آپ کو لکھوایا تھا وہ اب مطلع نہیں ہے بلکہ پانچواں یا ساتواں بند ہے۔ مرثیہ کا نیا مطلع حسب ذیل ہے۔

ارباب وفا مشعل ایماں کی ضیا ہیں
ارباب وفا صاحب تسلیم و رضا ہیں
عاجز ہے زباں کیا کہے ان کو کہ یہ کیا ہیں
تعریف یہی ہے کہ یہ ارباب وفا ہیں
رفعت کی نظر میں ہیں یہ وہ طور شمائل

فطرت کی زباں جن کو کہے نور شمائل

ضیاء صاحب کا یہ مرثیہ ایک سو چھیالیس (۱۴۶) بند تک پہنچ چکا ہے۔ دوسرا مرثیہ حضرت زینب سلام اللہ علیہا کے حال میں ہے وہ بھی ایک سو بند کا ہے اور ابھی جاری ہے۔ تیسرا مرثیہ حضرت امام حسن علیہ السلام کے حال میں ہے اس کے چھیانوے بند وہ کہہ چکے ہیں اور ابھی مرثیہ جاری ہے۔ اس مرثیہ کو مکمل کر کے سب سے پہلے شائع کرائیں گے اور آپ کی خدمت میں جتنی جلدیں آپ فرمائیں بھیج دی جائیں گی۔

آج کل ڈاکٹر صفدر مرحوم کے ایصال ثواب کے لئے مجالس کا سلسلہ جاری ہے۔

اسیر خلوص..... خاکی

سید مرتضٰی حسین فاضل

لاہور

۲۵، جولائی ۱۹۷۲ء

جناب ضمیر اختر صاحب زید مجدکم..... سلام علیکم

مزاج مبارک..... محبت نامہ ملا یاد آوری کا شکریہ

''اشاریہ انیس'' پر ہدیہ تبریک قبول کیجئے۔ بڑی محنت کی ہے اور بہت مفید کام کیا ہے۔ علمی و ادبی حلقوں میں آپ کی تعریف فرض جانتا ہوں۔ اپنے جذبات محبت و آفرین آپ کے والد بزرگوار سے عرض کر چکا ہوں۔ ادارہ ''نقوش'' ''انیس نمبر'' نکالنے کے لئے تیار ہے بشرطیکہ انیس کے شایان شان مواد مل جائے خط، تصویریں، نادر کلام، نادر تاریخی مواد، انیس کی ذاتی تحریریں، سو دو سو صفحات یہ ہوں، پھر مقالات مشاہیر کی فکر مشکل نہیں۔ سنا ہے کراچی میں جناب پروفیسر سروش صاحب کے پاس وافر ذخیرہ ہے۔ وہ توجہ فرمائیں اور بھی بعض حضرات کے پاس کچھ نوادر

ہیں۔ میرے پاس خلیق کے دو مرثیے غالباً غیر مطبوعہ ایک معاصر نسخہ، ایک متاخر لیکن قدیم، انیس کے تین چار معاصر نسخے ہیں۔ ایک کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ انیس کی اصلاح اور چار بند بقلم انیس ہیں لیکن انیس کی متعدد تحریروں کا تقابل کئے بغیر کچھ کہنا مشکل ہے۔ دبیر کے چند معاصر خطی نسخے ہیں۔ یہ سب ذخیرہ مطبوعہ ہے، بالکل نادر نہیں۔ لاہور میں ایک نمائش کرنے کو دل چاہتا ہے، لاہور میوزیم کے ڈائریکٹر صاحب تیار ہیں، لیکن ذخیرہ مسعود حسن صاحب کے پاس ہے۔ سنا ہے کہ آپ کے پاس کچھ چیزیں ہیں کیا کراچی کے ذخائر لاہور آسکتے ہیں۔

میں انیس کے مراثی ایڈٹ کر رہا ہوں "فرہنگ انیس" بھی زیر قلم ہے متعدد مضامین بھی لکھنا ہیں، وقت عنقا ہے۔ بہر حال کچھ نہ کچھ کرتا ہی رہتا ہوں۔

واقعات مراثی کی سند؟ میری نزدیک غیر اہم سوال ہے شعر و تاریخ دو الگ الگ فن ہیں۔ اگر کسی شاعر کا موضوع تاریخ ہو تو وہ شاعر نہیں مورخ ہے۔ اس پر تاریخی جرح ہونا چاہئے لیکن فردوسی، نظامی، خسرو، جامی شاعر ہیں۔ ان کا کلام براہ راست تاریخ نہیں بلکہ وہ تاریخ سے شعری استفادہ کرتے ہیں۔ وہ تاریخ کا تجریدی اور فنی خیال سامنے رکھتے ہیں۔ شعری استعارہ، شعری استنباط، واقعہ کے اسباب، وقوع، اور نتائج کے سیاق و سباق، اس کے تسلسل، واقعیت اور جرح و تعدیل مورخ کا کام ہے اور ان سب باتوں کا مجموعی تاثر تاریخی سائنس و فلسفہ بھی ہو سکتا ہے۔ جیسے ابن خلدون اور ٹائن بی کی تالیفات میں ہے اور جذبہ و عقیدہ و تخیل بھی جیسے ملا باذل کی "حملہ حیدری" جامی کی "یوسف زلیخا" یا فردوسی کا "شاہنامہ" وغیرہ۔

انیس مورخ نہیں ہیں، وہ شاعر ہیں۔ ان کا موضوع تاریخ کربلا نہیں۔ المیہ کربلا کا تاثراتی اور جذباتی شعور انیس کا موضوع ہے۔ اس تاثر کو وہ حکایتی پیرایہ نہیں دیتے

جس کے جزیات کی صحت وعدم صحت استناد وعدم استناد پر بحث کی جائے۔ ان کا مقصد
المیہ کربلا کے رزمیہ و بزمیہ والمیہ تاثرات کا اظہار ہے جس کے ذریعے وہ واقعہ کے
تار و پود سے صرف خاصیت اور معین کرداروں کو خاص زاویے سے دیکھتے ہیں۔ جیسے
کوئی مبصر کسی گھمسان کی جنگ کو بہت دور کھڑے ہو کر دوربین سے دیکھے اور اس سے
جوش وجذبہ پیدا کرنے کے لئے اپنے لفظوں میں بیان کرے۔ انیسؔ، وقائع نگار نہیں
ہیں وہ تاثرات کے مصور ہیں۔ آپ نے "کربل کتھا" کا ہندوستانی ایڈیشن دیکھا
ہوگا۔ مختارالدین احمد صاحب نے ملا فضلی کی تحریروں کے مصادر و مراجع دریافت کئے
ہیں اور واقعات پر جرح کی ہے۔ میں نے ان کو محنت کی داد دیتے ہوئے لکھا تھا کہ
بھائی ادب میں تاریخ کی جزیاتی بحث مناظرہ کا کام ہے۔ ادب کا تقاضا نہیں۔ آپ
اس پر لسانی اسلوب کی بحث کریں یہ کیا ہوا کہ حدیث "انا مدینۃ العلم وعلی بابہا" بیہقی
نے لکھی ہے اور بیہقی غیر محقق محدث ہیں۔ اعتراض و بحث کا دائرہ بہت وسیع ہے۔
مدتوں سے یہ مطالبہ ہے کہ انیس کے تذکرہ عونؑ و محمدؑ کے مقابلے و امیدواری علم کا کوئی
ماخذ بتایئے اب اس کا ماخذ تلاش کیجئے پھر مطالبہ ہوتا ہے کہ یہ تو کوئی ماخذ نہیں۔ پورا
واقعہ غلط ہے۔ لیجئے دوسری بحث شروع ہوگئی خلاصہ یہ ہے کہ تاریخی استناد، واقعاتی و
تاریخی خشک مثنوی وقصیدہ وغیرہ میں تو شاید موزوں ہو۔ رزمیہ و بزمیہ خالص شعری
ذخیرے کے لئے موزوں نظر نہیں آتا۔ خیر یہ میری ذاتی رائے ہے اور تحقیقی نقطہ نظر۔

انیس کی کردار نگاری اور پس منظر کا غیر عربی ہونا بلاشبہ ادبی بحث ہے۔ اس پر کام
ہو چکا ہے مزید کام ہونا چاہئے۔ اس سلسلے میں ایک مضمون کا وعدہ کر چکا ہوں انشاء اللہ
اپنی بے بضاعتی بھر کوشش کروں گا کیا اچھا ہوتا کہ کوئی انگریزی ادب کے پروفیسر
صاحب بھی اس طرف توجہ کرتے۔ انیسؔ کے کردار، شیکسپیئر، ملٹن، روسو اور ناول

نگاروں یا ڈرامہ نویسوں کے کردار نہیں ہیں۔ ضرورت ہے کہ جدید تنقیدی اصولوں پر انیس کے اصول کردار نگاری متعین کئے جائیں۔ تقلیدی اور اجتہادی کرداروں کا فرق بتایا جائے اور بھرپور مقالات سامنے آئیں۔ ہمارا کام خالص مشرقی فکر کا ہے۔ کیا مغربی علوم کے ماہر اپنے فن پاروں کو نئی روشنی میں نہیں چمکا سکتے۔

لیجئے میں مختصر خط لکھنے بیٹھا تھا بات بہت بڑھ گئی دعا کیجئے خدا توفیق عنایت فرمائے۔ انیسؔ و دبیرؔ کا ہم پر بڑا حق ہے۔ کوشش کر رہا ہوں کہ کوئی خدمت انجام دے سکوں۔ آپ سے مجھے بڑی توقعات ہیں۔ انشاء اللہ آپ بہت کام کریں گے فقط والسلام علیکم

خاکسار..... مرتضیٰ حسین

ڈاکٹر نیر مسعود

لکھنؤ..... ۲۳ جنوری ۱۹۹۵ء

برادرم ضمیر اختر صاحب! آداب عرض

علی عباس صاحب کے توسط سے آپ کی کتاب ''خاندان میر انیس کے نامور شعراء'' ملی۔ بہت ممنون ہوں۔ ابھی شعرائے اردو اور عشق علی ہی کے مطالعے کا لطف اٹھا رہا تھا کہ دوسرا گراں قدر تحفہ موصول ہوا۔ مجھے تو حیرت ہوتی ہے کہ آپ اتنا علمی اور تحقیقی کام کس طرح کر لیتے ہیں خاندان میر انیس کے کتابت شدہ اجزا جو آپ نے مجھے دکھائے تھے اسی وقت اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ بڑا کام ہو رہا ہے۔ اب تصاویر اور انتخاب کلام سے مزین کر کے آپ نے کتاب کو واقعی ایک کارنامہ بنا دیا ہے۔ اب لوگوں کو خاندان میر انیس میں مرثیہ نگاری کے سلسلۃ الذہب کا صحیح علم ہو سکے گا یا ایک کتاب کئی تحقیقی مقالوں کے برابر ہے اور اس کی بہت سی تحقیق ایسی ہے جس میں اضافہ آسان نہ ہوگا۔ اب میر انیس پر آپ کی کتاب کا شدید انتظار ہے۔ مجھے یقین ہے کہ

اس میں آپ انیس سے متعلق نئی اور مستند معلومات کا بڑا ذخیرہ پیش کریں گے اور مجھے اپنی حیات انیس کی تکمیل میں اس سے بہت مدد ملے گی۔ کچھ عرصہ ہوا یہاں آپ کے بارے میں ایک بری خبر مشہور ہو گئی تھی۔ غنیمت یہ ہوا کہ خبر اپنی تردید سمیت مشہور ہوئی تھی۔ معلوم نہیں کس نے اور کیوں یہ خبر اڑائی لیکن اس طرح کی افواہیں نیک شگون ثابت ہوتی ہیں۔ خداوند تعالیٰ کو ابھی آپ سے بہت کام لینا ہے اور اس میں تاریخ عزاداری کو خاص اہمیت حاصل ہوگی۔ یہاں کئی حضرات نے اس کام کا بیڑا اٹھایا لیکن اس کے پھیلاؤ سے ہار گئے۔ آپ نے یقیناً موضوع کا حق ادا کر دیا ہوگا۔

ہم لوگ خیریت سے ہیں امید ہے آپ بھی مع متعلقین بہ عافیت ہوں گے یہاں کوئی کام میرے لائق ہو تو بلا تکلف لکھئے۔ آپ کا.... نیر مسعود

ڈاکٹر سید صفدر حسین

لاہور.....۳۰، جنوری ۱۹۷۲ء

عزیز گرامی! دعائیں۔ آپ کا پہلا خط میرے راولپنڈی کے پتے پر موصول ہوا تھا جواب دینے کی بہت آرزو تھی لیکن وہ جگہ انتہائی مصروفیت اور ذہنی انتشار کی تھی۔ اس لئے آپ کے خط کا جواب نہ لکھا جا سکا تھا۔ آپ کا شوق و ذوق اور آپ کا مرثیہ سے انہماک نہایت درجہ قابل ستائش ہے۔ خدا اس ذوق کو برقرار رکھے اور آپ کو مزید توفیق عطا فرمائے۔ آپ کے خاندان کے بعض ان اعزہ سے مجھے قربت نصیب رہی ہے۔ جو وقتاً فوقتاً راولپنڈی آتے رہے ہیں یا وہاں مقیم ہیں اس لئے آپ کی ترقی علم و اقبال سے مجھے بہت خوشی ہوتی ہے اور یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے آپ نے خود میری ہی ذمہ داری سنبھال لی ہے۔ میں کچھ اپنی سرکاری مصروفیت کی وجہ سے اور کچھ ناسازی صحت کے باعث اپنے کام کی رفتار بڑھا نہیں سکا ہوں لیکن کچھوے کی رفتار

سے کام پھر بھی جاری ہے۔ میں نے حسب ذیل تین کتابوں کی کتابت کرائی ہے جو پہلی فرصت میں طبع ہو جائیں گی۔ (۱) واقعات انیس (مہدی حسن احسن) کتاب کی صحت کرانی باقی ہے یعنی کتابت کا اصل کتاب سے مقابلہ نہیں کرایا جا سکا۔ آپ یہ ذمہ داری لے لیں تو کتاب جلد چھپ سکتی ہے۔ (۲) مرثیہ نگاروں کی کہانی (شاد عظیم آبادی) ۲۴۰ صفحات۔ ہر کام مکمل ہے صرف طباعت باقی ہے توقع ہے کہ دوران محرم یہ کتاب طبع ہو جائے گی۔ (۳) اردو مرثیہ کا ماضی اور حال۔ میرے آٹھ مقالات کا مجموعہ ہے۔ اس کی کتابت ہو چکی ہے ایک مقالہ جوش ملیح آبادی پر لکھنا چاہتا ہوں۔ کتاب کی تکمیل کی صورت نظر نہیں آ رہی ہے۔ اس کے علاوہ دو کتابیں مطبوعہ صورت میں موجود ہیں۔ آپ کراچی میں ان کی فروخت کی نگرانی کر سکیں تو اطلاع دیجئے۔ جتنے نسخے آپ لکھیں گے، میں بھیج دوں گا۔ دوکاندار کو جتنا کمیشن آپ دینا چاہیں دے دیجئے گا۔

(۱) عرفان جمیل (جمیل مظہری صاحب کی چھ مراثی، چھ قصائد، چھ سلام، چھ رباعیات، چھ قطعات) قیمت چھ روپے (۲) جلوہ تہذیب (حضرت علی اکبر کے حال میں میرا تصنیف شدہ ایک مرثیہ) قیمت چھ روپے۔ آپ ہفتہ عشرہ کے لئے لاہور آسکیں تو اطلاع دیجئے گا۔ "ادب لطیف" کے ایڈیٹر ناصر زیدی میرے عزیز ہیں۔ آپ کی فرمائش پر وہ انیس نمبر نکالنے کے لئے آمادہ ہیں۔

معروف مرثیہ نگار شعراء کے تقریباً ایک ہزار غیر مطبوعہ مراثی کو طبع کرانے کے لئے میں نے ایک جامع پروگرام بنایا ہے۔ اس سلسلے کا پہلا مجموعہ "رنگ شہادت" ہے جو بیانؔ و یزدانی میرٹھی کے تین مراثی اور بارہ سلاموں پر مشتمل ہے۔ اس کی کتابت ہو رہی ہے۔ اس کے بعد میر نفیسؔ کے تمام مراثی اور پھر عارفؔ کے تمام مراثی کی

کتابت کا سلسلہ شروع کراؤں گا۔ آپ کو اگر مرزا اوج کے مراثی کا مجموعہ "معراج الکلام" مل جائے تو مطلع کیجئے۔ "تنسیخ الاوساخ" اور "حیات دبیر" کی طباعت کا بھی قصد ہے۔ فی الحال مرزا دبیر کے پانچ غیر مطبوعہ مراثی میں جلد ہی چھپوانا چاہتا ہوں۔ یہ لاہور ہی میں ایک دوست کے پاس سے مل گئے ہیں۔ مخلص..... صفدر حسین

جناب آیت اللہ طیب آغا الموسوی الجزائری

قم، ایران.... ۲۵، رمضان ۱۴۲۰ھ

خطیب اہلِ بیت رسولؐ، عندلیب بوستانِ بتولؑ

جناب سید ضمیر اختر نقوی صاحب زید کمالہٗ

بعد از سلام مع الاکرام وادعیہ وافیہ دارین ماہ مبارک صیام، آں کہ گذشتہ دنوں آپ کا ایک خوبصورت و خوب سیرت مجلہ (القلم) شمارہ ۳ موصول ہوا جس کے مطالعہ سے یہ محصول ہوا کہ جناب والا صرف میدان تقریر کے شہسوار نہیں بلکہ جہانِ تحریر کے بھی فنکار ہیں، خدا زورِ قلم اور خطابت کے دم خم میں اور اضافہ عطا فرمائے۔ آمین۔

اس سے پہلے آپ کا ایک اعلامیہ 'آلامیہ' بھی ملا تھا جس سے آپ کے والد ماجد جناب سید ظہیر حسن نقوی کی وفات حسرت آیات کا علم ہو کر بڑا افسوس ہوا تھا، میں دیر سے تعزیت پیش کرنے کی معذرت چاہتا ہوں، مرحوم میرے مخلص دوست تھے جب میں رضویہ کالونی میں سید ببر حسن صاحب مرحوم کے مکان پر ٹھہرا کرتا تھا تو بعد نماز فجر، میں اور ببر حسن صاحب جعفری (برادر سید محسن جعفری صاحب) اور آپ کے والد اور دیگر مومنین باہم چہل قدمی کیلئے جایا کرتے تھے راہ میں مہذب مذاق شستہ گفتگو، حق کی تلاش، علم کی جستجو، افکار خیال انگیز، اذکار عنبر بیز، باتیں میٹھی، راہیں سیدھی، نہ کسی سے جلن نہ کینہ، آئینہ کی طرح سے صاف سینہ، ہائے افسوس جن کی باتیں دل کو گرماتی

تھیں، اب ان کی یادیں جگر کو برماتی ہیں، بہر حال اس حادثہ میں میں آپ کا شریک غم بلکہ آپ کے احساسات کے ساتھ مدغم ہوں، خداوند کریم و رحیم مرحوم و مغفور کو جوار آئمہ معصومینؑ میں جگہ عطا کرے اور آپ کو اور دیگر پسماندگان کو صبر و اجر کی دولت سے نوازے۔آمین.....دعاگو......طیب الموسوی الجزائری

تابشؔ دہلوی

کراچی

محترم جناب ضمیر اختر صاحب! تسلیم و نیاز

والد صاحب کے انتقال کی خبر سے صدمہ ہوا، بزرگ شجر سایہ دار ہوتے ہیں آپ اس سایہ سے محروم ہو گئے، اللہ تعالیٰ آپ پر اپنا فضل رکھے اور اس صدمہ کے برداشت کی توفیق عطا فرمائے، میں آپ کے غم میں برابر کا شریک ہوں۔

آنکھ کی جراحی کی وجہ سے پڑھنے لکھنے اور زندگی کے دوسرے معمولات میں دقت ہوتی ہے خط بھی اٹکل سے لکھتا ہوں۔دعاؤں میں یاد رکھیے۔

قبلہ والد صاحب کی تاریخ وفات کا قطعہ حاضر ہے۔قبول کیجیے!

بخشش ہوئی ظہیر حسن کی زہے نصیب
بخشش
بس وجہ مہربان، خدائے انام ہے

افزوں ہے اُمید عطا کا صلہ ملا
۱۳۵
فردوس میں ظہیر حسن کا قیام ہے
۱۸۶۴+۱۳۵=۱۹۹۹ء

طالب دعا.....نیاز مند تابشؔ دہلوی

مشفق خواجہ

کراچی......۳ نومبر ۱۹۹۹ء

بخدمت جناب.....سید ضمیر اختر نقوی صاحب ابراور مکرم۔ تسلیمات!

میں لاہور چلا گیا تھا وہاں طبیعت ناساز ہوئی تو مجبوراً بہت دنوں تک وہیں رہا۔ اب واپس آیا ہوں تو "القلم" کا شمارہ نمبر ۴ دیکھا آپ کے والد محترم کے سانحہ ارتحال کا علم ہوا، بے حد افسوس ہوا، اُن کے لئے مغفرت کی اور آپ کے لئے صبر کی دُعا کرتا ہوں۔ آج سے تقریباً ۲۴۔۲۵ برس قبل آپ کے رضویہ سوسائٹی والے مکان میں مرحوم سے شرف ملاقات حاصل ہوا تھا۔ اُن کا نورانی چہرہ اب تک میری آنکھوں میں ہے۔

مرنے والے ہم سے کبھی جدا نہیں ہوتے بشرطیکہ ہم اُن کے کردار کی خوبیوں کو اپنی ذات کا جزو بنالیں۔ مجھے یقین ہے کہ مرحوم آپ کی صورت میں ہمیشہ موجود رہیں گے اور اُن کی نیکیاں آپ کے توسط سے دوسروں کو چراغ راہ کی طرح نیکی کا راستہ دکھاتی رہیں گی۔ مرحوم خوش قسمت تھے کہ آپ جیسی سعادت مند اولاد ملی اور آپ کی خوش قسمتی کا کیا ٹھکانا کہ نہایت عمدہ تعلیم و تربیت سے آپ کی شخصیت تابدار ہوگئی "القلم" میں مرحوم کے بارے میں مضامین پڑھ کر اُن کی شخصیت کی ہمہ جہتی کا اندازہ ہوا۔

"القلم" مل رہا ہے۔ اس کے ذریعے آپ مفید علمی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ خصوصاً گم شدہ ادبی نوادر کی بازیافت لائق تحسین ہے۔ خیر اندیش..... مشفق خواجہ

علامہ عباس حیدر عابدی

کراچی.....۱۲ فروری ۱۹۸۳ء

نذر بہ خدمت قوت قلب وجگر و چراغ بصر حضرت ضمیر اختر

دل کے ٹکڑوں کو بغل بیچ لئے پھرتا ہوں
کچھ علاج اس کا بھی اے چارہ گراں ہے کہ نہیں

عباس حیدر عابدی

افتخار عارف

اسلام آباد.....۲۳راکتوبر۱۹۹۹ء

محترم جناب سید ضمیر اختر نقوی کی خدمت میں.....بصد ادب

برادر عزیز و مکرم اسلام و رحمت۔

میں لندن سے ابھی ابھی واپس آیا ہوں وہاں مجھے والد مرحوم و مغفور کے انتقال کی خبر ملی اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔ وہ بلاشبہ ہماری تہذیبی روایات کے بہت معتبر امانت داروں میں تھے۔ محمدؐ و آل محمدؐ سے ان کی محبت سب پر واضح تھی۔ میں نے ان کو اپنی نوجوانی کے دنوں میں بھی دیکھا تھا اور بعد میں بھی، سراپا شائستگی مجسم تہذیب۔ خداوند کریم ان کو جوار معصومینؑ میں جگہ عطا فرمائے اور تمام اہل خانہ کو اس بڑے غم کو برداشت کرنے کا حوصلہ دے۔ کوشش کروں گا کہ رسم چہلم میں شرکت کی کوئی صورت نکلے۔ آپ بھی اپنے آپ کو سنبھالیے گا۔ برادر مکرم سید محسن اختر، عزیزم تنویر اور بہنوں سے میری طرف سے تعزیت کر دیجیے گا۔ شریک غم.....افتخار عارف

شمس الرحمٰن فاروقی

الٰہ آباد، بھارت.....۲۷، مئی ۱۹۹۹ء

برادرم علامہ ضمیر اختر نقوی اسلام علیکم

کچھ دن ہوئے "القلم" کا تیسرا شمارہ ملا۔ اس کرم گستری کے لئے ممنون ہوں۔

رسالے کا عام معیار بہت بلند ہے لیکن بعض مضامین ذرا ابھرتی کے معلوم ہوئے۔ آپ نے رسالے کو غالباً صرف مرثیے کی صنف پر بحث اور مراثی کی اشاعت کے لیے محدود رکھا ہے۔ ایسی صورت میں بعض ایسی تحریروں کی اشاعت کا امکان بڑھ جاتا ہے جن میں عقیدت زیادہ ہو تنقیدی نظر کم۔ ویسے یہ بات بھی ہے کہ ہر شخص آپ کے معیار پر پورا اتر بھی نہیں سکتا۔ کہیں نہ کہیں مفاہمت کرنی ہی پڑتی ہے۔

آپ نے خطوط کے صفحات میں بہت سے لوگوں کی مجبوریوں اور کمزوریوں کو طشت از بام کر دیا۔ میرا خیال ہے کہ مصنفین نے اگر یہ خیال کیا ہوتا کہ ان کا مراسلہ تمام و کمال شائع ہو جائے گا تو اظہار مدعا و حسرت میں ذرا تکلف سے کام لیتے۔ میری رائے مانیں تو مضامین اور مراسلات دونوں پر تقطیع کا عمل جاری کریں۔

آپ نے الہ آباد تشریف لا کر مجھ حقیر کے کلبۂ خانے کو رونق بخشی۔ اس نوازش کے لئے مدت العمر متشکر رہوں گا۔ عزیزی ماجد رضا کو دعا سلام کہیں۔ امید ہے آپ کا مزاج بخیر ہوگا۔ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بے تکلف ارشاد فرمائیں۔

نیازمند.....

شمس الرحمٰن فاروقی

ڈاکٹر یاور عباس

کراچی،

محبی ضمیر اختر صاحب..... سلام علیکم!

اس جمعہ کو میں نیا مرثیہ پیش کر رہا ہوں۔ عنوان ہے "منظر منظر" آپ تشریف لائیں تو خوشی ہوگی۔ منبر سے اعلان فرما دیں تو کرم ہوگا۔ پروگرام منسلک ہے۔

نیازمند..... یاور عباس

ڈاکٹر محمد زماں آزردہ

سری نگر، کشمیر.....۴، ستمبر ۱۹۸۴ء

برادر گرامی ضمیر اختر نقوی صاحب..... تسلیم و نیاز

مصروفیت کے باعث خط بہت دیر سے لکھ رہا ہوں۔ تصویریں ارسال کر رہا ہوں صرف دو ہیں۔ آپ نے وعدہ فرمایا تھا کہ آپ خط لکھیں گے اور میری کتاب مرزا سلامت علی دبیر سے متعلق اپنے مشوروں سے نوازیں گے۔ اس کا دوسرا ایڈیشن شائع کرانا چاہتا ہوں۔ اب کے آفسٹ سے چھپواؤں گا۔ انشاء اللہ اکتوبر کے آخر تک پریس کو بھیج دوں گا۔ ازراہ کرم آپ فوراً ہی اپنی رائے سے آگاہ فرمائیں۔ دوسرے یہ کہ الگ سے تبصرہ فرمائیں تا کہ اس کا ایک اقتباس کتاب میں شامل کیا جائے۔

مزید عرض ہے کہ اگر کراچی میں اس کتاب پر کوئی تبصرہ ہوا ہو تو مجھے عنایت فرمائیں۔ اس کی بھی ضرورت ہوگی۔ کار لائقہ سے یاد فرمائیں۔ میری جانب سے بھی اہل خانہ کی خدمت میں مناسبات۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔

فقط..... محمد زماں آزردہ

ارشاد امروہوی

لکھنؤ، بھارت.....۶ اگست ۱۹۸۰ء

محبی و مکرمی جناب ضمیر اختر صاحب تسلیمات

آپ جیسے بالغ نظر، فن شناس، قدر داں، باظرف اور انتہائی مخلص شخصیت سے محض دو دن میں چند گھنٹوں کی ملاقات کا شدید ملال رہا اور ہے۔ کاش رضویہ میں رہتے ہوئے آپ کے دولت کدہ کا صحیح جغرافیہ معلوم ہو جاتا اور یہ واضح ہو جاتا کہ آپ بھائی سے

نہ صرف دلی طور پر بہت قریب ہیں بلکہ رہائش کے اعتبار سے بھی آپ دونوں کے درمیان مختصر سا فاصلہ ہے تو نہ جانے کتنی منفعت بخش شامیں آپ کے ساتھ بسر ہو جاتیں اور مجھے پتہ نہیں کیا کیا حاصل ہو جاتا۔ بہر کیف آپ سے جتنی دیر جادلۂ خیالات و اظہار ہوا ہے میں نے ایک عجیب سی اپنائیت کا ماحول پایا اور جیسے اس مختصر سے وقت میں بڑی وسعتیں سما گئی ہوں۔ آپ کا وہ کمرہ گہوارہ علم و ادب اور مرکز اخلاق و اخلاص محسوس ہوا۔ آپ کی قربت سے سرشار گفتگو کے درمیان مجھے ایسا محسوس ہونے لگا تھا جیسے آپ سے برسوں پرانی ملاقات ہو۔ میرے چار ناول ایک دن میں پڑھ کر واپس کرتے وقت ان سے متعلق تفصیلی بات چیت ہونے پر میں نے آپکی نظر بچا کر آپ کے بظاہر منحنی اور مختصر وجود کی طرف متعجب نظروں سے دیکھا اور سوچنے لگا۔ اس مختصر سے انسان میں کتنی عظیم اور صحت مند شخصیت پوشیدہ ہے۔ آپ کا وہ کمرہ جو ایک دبستان نظر آ رہا تھا اس کے درمیان آپ کو رونق افروز دیکھ کر ایسا احساس ہو رہا تھا جیسے گلدستۂ ادب کا ایک مہکتا ہوا پھول نمایاں اور پرکشش نظر آ رہا ہو۔ اور میں اس مہک سے بہت مختصر سے وقفہ کے بعد دور بہت دور ہو گیا لیکن ذہنی طور پر بہت قریب۔

آپ نے میری تخلیقات اور طرز تحریر سے متعلق جو بھی رائے قائم کی ہو مجھے ضرور بذریعہ تحریر مطلع کریں۔ زبانی طور پر آپ نے میری توصیف سے متعلق جو کچھ ارشاد فرمایا میں اپنے کو اس کے لائق نہیں سمجھتا لیکن چونکہ آپ کی شخصیت رہی نہیں حقیقت پسند تھی اس لیے میرے دل و دماغ کو بڑی تقویت پہنچی اور میں ایک بار پھر محنت سے لکھتے رہنے کے عزائم کے ساتھ آپ کے پاس سے اٹھا تھا اور اس مجموعی ہمت افزائی اور خلوص کے ماحول میں ایک خواہش کی جسارت کر رہا ہوں۔ اور وہ یہ کہ اگر میرے وہ ناول جو آپ کی نظر میں پاکستان میں قابل اشاعت ہوں تو ڈائجسٹ وغیرہ میں قسط وار

یا کسی پبلیشر کے سپرد کردیں تو میں وہاں بھی متعارف ہو جاؤں گا۔ بھائی جون مجھے شمن کے نام سے جانتے ہیں وہ بھی اب بحیثیت ارشاد امروہوی ضرور مدد فرمائیں گے۔

اب اجازت اور مستقبل قریب میں جواب کا منتظر رہوں گا۔

خیر اندیش.....ارشاد امروہوی

آلِ محمد رزمی

کراچی.....۱۳، اپریل ۱۹۹۳ء

ضمیر بھائی، سلام و نیاز

حالات کے جلتے ہوئے شعلوں میں کچھ اس طرح گھرا کہ آپ سے ملاقات نہ ہو سکی قربت رفاقت سے بدل جانے کا احساس بھی اور افسوس بھی۔

پھر آپ کا فون بھی نہ آیا تو میں سمجھ گیا کہ خلش و فاصلے دونوں طرف سے بڑھ گئے ہیں یا پھر انا کا پل درمیان میں آ گیا ہے۔

بہر صورت آپ سے محبت و تعلقات ویسے ہی رہیں گے۔ فکری و نظری اختلاف کا حق آپ کو بھی ہے اور ناچیز کو بھی۔ لیکن یہ موسم کی طرح بدلنے اور سائے کی طرح ڈھلنے والے حاشیہ برداروں اور ان قدامت پسند ناصحین و ناقدین کی آراء کا احترام کرنا میرے بس میں نہیں میں نے خطابت والی کتاب کو تقویم پارینہ سمجھ کر فراموش کر دیا ہے اور آپ پر کتاب کا آغاز کر دیا ہے اگر مجھے زیارات کیلئے جانا نہ ہوتا تو شائد اس ماہ میں یہ کتاب مکمل ہو جاتی۔ لیکن اب شائد یہ آنے کے بعد پایۂ تکمیل تک پہنچے اس عرصے میں آپ اپنی تعلیمی کیفیات و دیگر یادداشتیں جمع کرلیں بمعہ ان آراء و خطوط کے جو اہل فکر و نظر نے آپ کے لئے تحریر کی ہیں تاکہ کتاب کی ضخامت میں اضافہ ہو سکے۔ اگر خدا کو منظور ہے تو انشاء اللہ مشہد میں ملاقات ہوگی بیتے ہوئے لمحات کی یادوں اور اچھی

امیدوں کے ساتھ۔ کتاب شیخ صدوق کا پروف ریڈ کر کے شیعہ بھائی کی وساطت سے ارسال کر رہا ہوں۔ والسلام محتاج دعا...... آل محمد رزمی

امیر علی جونپوری

لکھنؤ، بھارت......۲۰ مارچ ۱۹۸۱ء

معظم و محترم جناب ڈاکٹر ضمیر اختر صاحب.... سلام و مسنون

کئی خط میں نے اور ارشاد صاحب نے روانہ کئے مگر آپ نے کسی کا جواب ہی نہیں دیا۔ میرے حالات بہت ہی ابتر ہو گئے ہیں۔ مائل صاحب سے آپ کو حالات معلوم ہو جائیں گے۔ دو سال کے اندر میں بالکل تباہ ہو چکا ہوں جو کچھ بچا بچایا تھا اکبر حیدری نے پورا کر دیا۔ میرے ساتھ نہایت ہی کمینہ پن کیا۔ میں بیماری کی حالت میں اسپتال داخل تھا۔ اس نے سوچا کہ اب زندہ تو لوٹیں گے نہیں۔ خوب اچھی طرح تباہ کیا۔ ایک کتابچہ اسی دماغی پریشانی میں شائع کیا تھا۔ لیکن پھر بھی اس شخص کو شرم نہ آئی۔ اب حالات ٹھیک ہونے پر (روپیہ کا انتظام ہونے پر) مقدمہ دائر کروں گا۔ میرے پاس تمام ثبوت تحریری موجود ہیں۔ میرے تمام قلمی مخطوطات دبا کر بیٹھ گیا اور اب کہتا ہے کہ رسید دکھلاؤ۔ میں نے اعتبار کیا اور ہر چیز اس شخص کے حوالہ کر دیا کرتا تھا جس کا یہ نتیجہ نکلا۔ انشاء اللہ جب ملاقات ہوگی تفصیل کے ساتھ بات ہوگی (اگر زندہ رہا) اس وقت میرے ساتھ تعاون فرمائیں اور کچھ نہیں کہہ سکتا۔ امید ہے جناب کا مزاج بخیر ہوگا۔ فقط... نیاز مند..... امیر علی جونپوری

ڈاکٹر اخلاق حسین عارف

لکھنؤ، بھارت......۲۰ جنوری ۱۹۸۲ء

محترمی نقوی صاحب تسلیم!

خدا کرے آپ مع الخیر ہوں۔ اور ظہیر بھائی بھی مع متعلقین بعافیت تمام ہوں۔

میں اب تک آپ کے عنایت نامہ کا منتظر ہوں اور مایوس نہیں ہوا ہوں حالانکہ حامل رقعہ ہٰذا میرا چھوٹا بھائی سید بشارت حسن رضوی آپ سے مئی ۷۸ء میں ملا تھا جبکہ وہ پاکستان گیا تھا آپ اسے دیکھ کر پہچان لیں گے۔ اس تمام پورے چار سالہ عرصہ میں آپ نے بتوسط سید محمد رشید صاحب جعفر منزل امین آباد لکھنؤ مجھے امانت کے مراثی میں سے ایک مرثیہ "جب ہند کو ورود حرم کی خبر ہوئی" عنایت فرمایا بقیہ کے لئے جب آپ لکھنؤ تشریف لائے تھے تو وعدہ کر گئے تھے کہ روانہ کریں گے مگر ایسا نہ ہو سکا۔

اب صورت حال یہ ہے کہ مراثی نہ ہونے کی وجہ سے امانت پر کی جانے والی پی ایچ ڈی کا کام جمود کا شکار ہے اور آپ کی فوری توجہ کا طالب ہے۔

میری دانست میں سب سے بہتر صورت یہ ہوگی کہ بقیہ مراثی جو آپ مجھے بھیجنا چاہیں ان کی فوٹو اسٹیٹ کاپی کروا کر بھائی کے ہمراہ روانہ فرمادیں میں نے ان سے کہہ دیا ہے کہ اس سلسلہ میں جو خرچہ ہوگا وہ اپنی جیب سے اسے برداشت کریں گے کیا ہی اچھا ہوتا کہ آپ اپنے قیمتی اوقات میں سے تھوڑا وقت انھیں دے کر ان سے بتا دیجئے کہ فلاں دن فلاں وقت تم آجاؤ اور ساتھ میں چل کر فوٹو اسٹیٹ کاپیاں کرالیں۔

میں حد درجہ ممنون رہوں گا اگر اس ادبی کام میں اپنا بھرپور تعاون دیں گے انشاء اللہ دیباچہ میں آپ کے مراثی عنایت کئے جانے کا تذکرہ شکریہ کے ساتھ درج کیا جائے گا۔ فقط والسلام ظہیر بھائی کو سلام مسنون اور تنویر سلمہٗ کو دعا۔

خاکسار...... اخلاق حسین عارف

James C. Armstrong

Library of Congress Office,
American Embassy, Islamabad.

March 22, 2001.

Dear Sir,

This is a request for you to provide copies of the material noted on the approval memorandum which indicates an AM number and the number of copies required.

If this is a priced publication, please forward the invoice/bill with the material mentioning the AM number.

Sincerely Yours,
James C. Armstrong
field Director

ڈاکٹر تقی عابدی

نیویارک.....۱۱؍۱ اکتوبر ۱۹۹۷ء

حضور محترم سرور گرامی جناب سید ضمیر اختر نقوی مدظلہ العالی

مدیر علی۔ القلم۔ کراچی

سلام علیکم۔ منسلکہ تحقیقی مقالہ آپ کے گراں قدر علمی تحقیقی جریدہ کے لئے روانہ کر رہا ہوں۔ جیسا کہ موصوف پر واضح ہے کہ اس بحر بیکراں میں غوطہ زن ادیب و نقاد انگشت شمار ہیں جبکہ یہ سمندر لولوو مرجان و در و صدف سے بھرپور ہے۔

سلام پر ایک مفصل بحث ادبی اور تحقیقی شروع کی جائے تاکہ قارئین کی تشنگی کی خاطر کم از کم کچھ آب خوشگوار اس چشمہ شیریں سے پیش کیا جاسکے۔ خدانگہدار

مخلص و دعاگو.....سید تقی عابدی

سالک نقوی

کراچی.....۱۰؍۱ اکتوبر ۱۹۷۸ء

مکرمی و محترمی.....سلام مسنون

گرامی نامہ ملا۔ قدر افزائی کا شکریہ۔ بھائی مسعود الحسن نقوی سلمہٗ نے بھی ذکر کیا تھا۔ تقریباً ایک ڈیڑھ سال قبل نسیم صاحب قبلہ نے بھی ارشاد فرمایا تھا چنانچہ آٹھ دس بند مرثیہ کے پیش کر دیے گئے تھے غالباً جناب کو نہیں ملے۔

میں انشاء اللہ خود حاضر خدمت ہو کر بند بھی پیش کر دونگا اور قصائد و مناقب کا مجموعہ بھی جو حال ہی میں۔ "صحیفہ سالک" کے نام سے شائع ہوا ہے۔ اس مجموعہ میں میرے مختصر حالات بھی ہیں۔ قدر افزائی کا مکرر شکریہ۔ والسلام..... سالک نقوی

ریحان اعظمی

کراچی

ضمیر بھائی..... آداب!

حاضر ہوا تھا ملاقات نہ ہو سکی ۲۸، تاریخ کا پروگرام آپ کی مرضی کے مطابق ہے تاجدار صاحب سے فون پر گفتگو کر لیں۔ آپکا..... ریحان اعظمی

مولانا رضی جعفر نقوی

کراچی..... ۵، ستمبر ۱۴۱۰ھ

بخدمت بابرکت ذی رفعت و عالی مرتبت جناب مولانائے مکرم و محترم دام مجدکم

سلام علیکم..... مزاج مبارک

بارگاہ معبود میں دست بہ دعا ہوں کہ آپ کو صحت و تندرستی کی نعمت سے مالا مال رکھے اور آپ کو عمر خضر عطا فرمائے تاکہ صاحبان ایمان تا دیر آپ کے چشمۂ فیض سے اپنی علمی و فکری، اخلاقی و روحانی، دینی و مذہبی، اور ایمانی و معنوی تشنگی دور کر سکیں۔

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے، اس سال ۱۸، ذی الحجہ (۱۴۱۰ھ) کو "اعلان غدیر" کے چودہ سو برس مکمل ہو جائیں گے جسے حضرت امام جعفر صادق علیہ السلام نے اہل ایمان کے لئے "عید اکبر" کے نام سے یاد فرمایا ہے۔

اس مناسبت سے دنیا بھر کے اہل ایمان اس سال "چودہ سو سالہ جشن عید غدیر" منانے کی تیاریوں میں مصروف ہیں جو ایک نہایت ہی خوش آئند امر ہے۔

ادارہ تنظیم المکاتب (پاکستان) بھی اس بات کے لئے کوشاں ہے کہ انشاء اللہ یہ جشن شایان شان طریقہ سے منایا جائے تا کہ وہ گمراہ فرقے اور افراد جو اس دن کی اہمیت کو ختم کرنے اور اس عظیم الشان اعلان کو پردۂ خفا میں رکھنے کی مذموم سازشیں کر رہے ہیں ان کی آنکھیں بھی خیرہ ہو جائیں اور دنیا بھر کے مسلمانوں پر یہ بات واضح ہو جائے کہ ملت جعفریہ اعلان غدیر کو اپنے لئے شہ رگ حیات سمجھتی ہے اور اس دن کی روشنی کو کبھی ماند نہیں پڑنے دے گی۔

البتہ یہ بات واضح ہے کہ یہ کام جسے ملک گیر پیمانے پر انجام دینا ہے۔ کسی کے لئے تنہا انجام دینا ممکن نہیں ہے بلکہ تمام اہل ایمان خصوصاً جملہ اہل علم کے تعاون ہی سے ممکن ہو سکے گا۔ اس سلسلہ میں جناب عالی سے سوزیانہ التماس ہے کہ ہمیں ایسی تجاویز سے سرفراز فرمائیں جو اس جشن کو کامیاب اور زیادہ سے زیادہ اثر انگیز بنانے میں مفید ثابت ہوں۔ پروردگار عالم آپ کا سایۂ عاطفت سلامت رکھے۔ آمین

والسلام خادم۔ رضی جعفر نقوی (وارکان مجلس عاملہ)

زُہیر عابدی

جناب استاد محترم..... ضمیر اختر نقوی بھائی صاحب..... السلام علیکم

امید ہے آپ خیریت سے ہونگے حسب معمول اپنی مصروفیات کی وجہ سے آپ

سے ملاقات نہ ہو سکی معافی کا خواستگار ہوں۔ ابھی اشرف اور سہیل سے معلوم ہوا کہ آپ شام کو مجلس پڑھیں گے یہ لوگ میرے پاس آئے ہیں لیکن میں سائٹ پر مصروفیات کی وجہ سے نہیں آسکتا۔ انشاء اللہ شام کو مجلس میں ملاقات کروں گا۔ امید ہے کہ شام کو آپ مجلس سے ضرور خطاب کریں گے۔ فقط..... ذہیر عابدی

پروفیسر سحر انصاری

کراچی..... یکم محرم ۱۴۰۵ھ

بھائی ضمیر اختر صاحب..... تسلیم!

مجھے آپ کی مصروفیات کا اندازہ ہے۔ تاہم دو ضروری باتیں آپ سے کرنی تھیں۔ اب بزبان قلم ہی سہی۔

۱۔ ریڈیو پاکستان سے پندرہ منٹ کا ایک مذاکرہ نشر ہونا ہے اردو ادب اور مرثیہ کا ارتقا کے زیر عنوان۔ اس میں میرے علاوہ برادرم ہلال نقوی ہیں۔ میں نے آپ کا بھی نام تجویز کر دیا ہے اس لئے سنیچر کے دن ڈھائی بجے ریڈیو پاکستان میں صفیہ کاظم یا انصار صدیقی کے پاس تشریف لے آیئے۔ بہت ضروری ہے۔ وقت بھی زیادہ صرف نہیں ہوگا۔

۲۔ مجھے تعشق اور عشق دو فیچر لکھنے ہیں۔ ظاہر ہے کہ میرے پاس مواد اتنا زیادہ نہیں۔ آپ براہ کرم ان کے سوانح اور کلام مراثی نکال لیجئے۔ میں آج رات یا کل دن میں کسی وقت لے لوں گا۔ اگر آپ نہ بھی ہوں تو گھر پر ہدایت کر دیجئے گا۔ تو یہ باتیں جیسا کہ اندازہ ہوا ہوگا۔ ضروری تھیں نا؟ امید ہے آپ بخیر ہوں گے۔

مخلص سحر انصاری

پرویز ممتاز شیخ

لاہور

قبلہ ڈاکٹر صاحب... السلام علیکم امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔

اعجاز بخاری صاحب کی زبانی معلوم ہوا آپ بیت السادات میں عشرہ پڑھیں گے۔ بے حد خوشی ہوئی تجمل حیدر کملا صاحب نے مجھ سے رابطہ کیا تھا کہ محرم میں صبح ساڑھے ۷ بجے امام بارگاہ قصر بتول شادمان میں ڈاکٹر صاحب کی بھی خواہش ہے کہ آئندہ محرم میں صبح کا عشرہ آپ پڑھیں انہوں نے آپ کے فون پر بات کرنے کی بہت کوشش کی ہے مگر آپ کا فون کوئی اٹینڈ نہیں کرتا شائد آپ کہیں گئے ہوں گے۔ براہ کرم مجھے یا تجمل کملا صاحب کو مطلع کریں کہ آپ صبح شادمان کا عشرہ پڑھیں گے۔ ریزہ نجف والا ہی وقت ہوگا۔ قصر بتول سارا گرا دیا گیا ہے اور نیا بڑا ہال بن گیا ہے۔ آپ کی وجہ سے ساؤنڈ سسٹم بالکل نیا تقریباً ایک لاکھ روپے کی رقم سے لگ رہا ہے محرم تک مسجد وہال مکمل ہوگا۔ آج کل فائنل کام ہو رہا ہے۔

تجمل حیدر کملا کو خط لکھ دیں یا فون کر دیں یا مجھے مطلع کر دیں۔

باقی سب خیریت ہے۔ جواب سے مطلع فرمائیں نوازش ہوگی۔ قائم بھائی و تمام احباب کو سلام.... نیاز مند.... پرویز ممتاز شیخ

مولانا لیاقت علی یاسر

جھنگ.... ۲۰ ستمبر ۱۹۸۱ء

قبلہ شاہ صاحب

تحفہ یا علی مدد: آپ کی ترتیب شدہ کتاب حضرت جوش ملیح آبادی کے مرثیے۔

میرے سامنے زیر مطالعہ ہے ماشاء اللہ آپ کی کاوش بڑی عظیم ہے۔ خداوند عالم بحق محمدؐ وآل محمدؐ آپ کو اس کا اجر دیں گے۔ انشاء اللہ آپ کی شخصیت اس لائق تو تھی کم از کم کہ آپ کی خدمت میں بند لفافہ ارسال کیا جاتا۔ مگر بدقسمتی سے پنجاب میں لفافوں کی Shortage ہے۔ امید ہے آپ میری اس گستاخی کو معاف فرمادیں گے۔

قبلہ نقوی صاحب صفحہ نمبر ۴ پر لکھا ہوا تھا ضمیر اختر نقوی کی دوسری کتابیں۔ پڑھ کر از حد درجہ دلی مسرت ہوئی۔ لیکن اس پر ملنے کا پتہ درج نہیں۔ اس لئے براہ راست آپ سے رشتۂ تحریر اور سلسلۂ خط و کتابت منسلک کر رہا ہوں۔

عالی حضور یہ فرمایئے کہ آپ کی کتاب ''شعرائے اردو اور عشق علیؑ'' کراچی میں کہاں مل سکتی ہے۔ اور پنجاب میں کہاں مل سکتی ہے۔

پنجاب کے کتب خانوں کے لئے جوابی کارڈ پر تحریر فرمانے کی تکلیف ضرور گوارا فرمائیں کیونکہ کراچی والے بذریعہ وی۔ پی کتب شاذ و نادر ہی بھیجتے ہیں۔

بواسطہ محمدؐ وآل محمدؐ ضرور تکلیف فرمادیں۔ آپ کو حسینؑ کی مظلومی کا واسطہ ضرور تکلیف فرمادیں۔ آپ کے جواب کا منتظر.....لیاقت علی یاسر

مولانا آفتاب حیدر بلگرامی

لکھنؤ، انڈیا.....۵ ستمبر ۱۹۷۰ء

برادرم.....سلام خلوص قبول فرمائیں

ایک عریضہ حاضر خدمت کر چکا ہوں جواب سے محروم ہوں آپ کے بے تاج سلطان صاحب کو خط دے دیا جواب کچھ نہیں دیا ایک مرتبہ ملے تو کہنے لگے اس وقت جلدی میں جا رہا ہوں پھر ملنے گا جیسے میں کوئی ضرورت مند ہوں اور ان سے امداد کا طالب ہوں اس کے بعد پھر ملاقات نہیں ہوئی چھوڑیئے آپ کی فرمائش کی کتابیں میں

خود خرید لوں گا اور لے آؤں گا ادھر شدید صاحب کے ۲ مرثیے شائع ہوئے ہیں اس پر مولانا سید احمد صاحب کی تقریظ لکھی ہے۔ بہت ہی لاجواب تحریر ہے فن ہے ندرت ہے رعایت لفظی شاعرانہ انداز نے بڑی چاشنی پیدا کردی ہے کسی وقت نقل کر کے روانہ کر دوں گا مگر پہلے جوش کا مسدس نقل کر کے روانہ کیجئے لکھنؤ کے حالات اب بہت ابتر ہو گئے ہیں۔ یہاں مولوی صاحبان کے درمیان شدید کشمکش چل رہی ہے۔ بمبئی سے ایک پرچہ کاروان حیات نکلتا ہے جو طاہر میاں اور اس گروپ پر بہت زیادہ حملے کر رہا ہے کاروان حسینی اور تفنگ کلب عابد گروپ پر لعن طعن کر رہا ہے غرض بس یہی سارا تماشا یہاں آ کر دیکھا تہذیب و ادب کا درس تار تار نظر آتا ہے اخلاق گر چکا ہے معاشیات کی بری حالت ہے اقتصادیات سخت کشمکش میں ہے اب لکھنؤ رہنے کی جگہ نہیں نہ کوئی ادبی ذوق ہے نہ مذہبی شوق۔ بس سارا وقت فضول تباہ کرنا یہاں کا مشغلہ ہے اگر یہاں کوئی کتاب یا مسدس شائع کیا بھی جائے تو خریدنے والے کم مفت کے طالب زیادہ نظر آتے ہیں۔ بہر حال بہت اچھا ہوا کہ آپ مستقل وہاں کے ہو گئے میں تو بہت مجبور تھا ورنہ رہ جاتا خیر اب آپ اپنی سنایئے جوش کی کتاب یادوں کی بارات کسی کے ہاتھ روانہ کیجئے اکمال صاحب کے ذریعہ بھیجئے اور مسدس نقل کیجئے میرے لائق مزید کوئی خدمت ہو تو تحریر کیجئے گا۔ والدین کا مزاج کیسا ہے بھائی تنویر کو ہمارا سلام کہیے گا جنوں کو حسب مراتب دعا یا سلام کہیے گا۔ اچھا خدا حافظ جواب کا طالب... سید آفتاب حیدر

بابر علی خان ثاقب

جھنگ.....۶، ستمبر ۱۹۹۱ء

محترم و مکرم ذاکر معصومین الحاج ضمیر اختر نقوی صاحب... السلام علیکم!

میں نے گذشتہ ماہ جمعتہ المبارک کا دن آپ کے ساتھ گزارا میں یقین سے کہہ سکتا

ہوں کہ ایک دن میں میں نے کچھ ایسی باتیں سیکھیں جو کئی برسوں کے مطالعہ سے نہیں سیکھ سکا تھا، بے شک کسی عالم کے پاس چند گھنٹے بیٹھنا کتنے ماہ کے مطالعہ سے افضل ہے، آپ کے حسن سلوک سے از حد متاثر ہوا آپ کا اخلاق میں تا زندگی فراموش نہیں کر سکوں گا۔ میری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ بطفیل محمدؐ و آل محمدؐ ہمیں اپنے مقدس دین پر ثابت قدم رکھے۔ اور آپ کی توفیقات میں اضافہ فرمائے۔ (آمین یارب العالمین)

والسلام.... خیر اندیش خاکپائے در اہلِ بیت بابر علی خان ثاقبؔ

تسنیم حسین زیدی

نیوجرسی، امریکہ...... ۲۳ مارچ ۱۹۸۵ء

ضمیر بھائی.... تسلیمات!

بہت دنوں کے بعد حاضرِ خدمت ہو رہا ہوں اگر چہ اکثر و بیشتر آپ یاد آئے ہیں بہر حال آپ سے محمدی ڈیرہ ملیر کی مجلس میں آخری ملاقات اور مجلس میں آپ کا سورۂ یوسف کا بیان اور اشعارِ فردوسیِ ہند میر انیسؔ مجھے خوب یاد ہیں۔

یقیناً آپ کو اس خبر سے مسرت ہوگی کہ "پیام امن" اس وقت شمالی امریکہ کا واحد پرچہ ہے جو نشر و اشاعت پیغام محمدؐ و آل محمدؐ کر رہا ہے۔ پرچہ بیک وقت اردو اور انگریزی میں شائع ہوتا ہے۔ ضمیر بھائی میں پہلی مرتبہ آپ سے گزارش کر رہا ہوں اُمید ہے قبول فرمائیں گے اور وہ یہ کہ پرچہ ہذا کا "محرم نمبر" آپ تحریر عالی شان کا منتظر ہے۔ انشاءاللہ تازہ شمارہ ارسالِ خدمت ہوگا۔ میں بے چینی سے آپ کے گرامی نامہ کا انتظار کروں گا۔ میری طرف سے تمام اہلِ خانہ کو سلام کہیئے۔ مظاہر خالو اگر ملیں تو ان کو بھی۔

فقط والسلام...... تسنیم حسین زیدی

ڈاکٹر سید شبیہ الحسن

لاہور

مکرمی..... سلام مسنون!

امید ہے آنجناب مع الخیر ہوں گے

میں پنجاب یونیورسٹی لاہور کے تحت ''لکھنؤ کی اردو شاعری ۱۹۰۰ء سے ۱۹۴۷ء تک'' کے موضوع پر ڈاکٹر سہیل احمد خاں صاحب کی نگرانی میں پی ایچ۔ ڈی کا تحقیقی مقالہ تحریر کر رہا ہوں۔ میں اس موضوع کے حوالے سے خاصا مواد جمع کر چکا ہوں تاہم بعض معاملات میں آپ کی رہنمائی کی ضرورت شدت سے محسوس کرتا ہوں۔ آپ نے میرے مقالے کے مندرجات دیکھ لیے تھے آپ کے پاس اس سلسلے میں جو مواد ہے وہ کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟ کیا منقاد حیدر ہاشمی صاحب وصول کر کے فوٹو اسٹیٹ کرالیں!؟ عرفان عباسی صاحب کی چند کتابیں ''آپ'' ''آپ تھے'' وغیرہ آپ کے پاس ہیں براہ کرم ان کی فوٹو کاپیاں کسی طرح وی۔ پی۔ فرمادیں یہ کام امیر صاحب کے سپرد کر دیں۔ دیگر مواد کے لیے بھی امیر صاحب موزوں رہیں گے۔ آپ لاہور کب آئیں گے؟

اگر کچھ بھی ممکن نہ ہو تو میں کراچی آجاؤں؟ تاہم آپ اپنے پروگرام سے مطلع فرمادیں میرا مقالہ آخری مرحلے میں ہے۔ اس سلسلے میں چند استفسارات ارسالِ خدمت ہیں۔ براہ کرم اپنی مصروفیات میں سے کچھ وقت نکال کر ان کے جوابات تحریر فرمادیجیے۔ میں آپ کا بے حد ممنون ہوں گا۔ دیگر احباب کی خدمت میں تسلیمات۔

والسلام..... مخلص... شبیہ الحسن

فیض بھرت پوری

کراچی

جناب سید ضمیر اختر نقوی سلام علیکم!

فیض بھرت پوری حاضر ہوا۔ باوجود متعدد دستک کوئی نہیں ملا۔ خیر ایک پیغام پہنچانا تھا یعنی سید علی جواد زیدی صاحب جو لکھنؤ سے آئے ہوئے ہیں۔ انھوں نے فرمایا ہے کہ آپ کو یہ بتادیا جائے کہ وہ ۱۵، جنوری کو ذریعہ ہوائی جہاز لاہور کیلئے روانہ ہو جائینگے۔ ان کا ٹیلیفون نمبر 615817 ہے۔۔۔ فقط خیر اندیش۔۔۔۔ فیض بھرت پوری

علی ضیا رضوی

الطائف (سعودی عرب)۔۔۔۳۰، مئی ۱۹۸۳ء

پیارے ضمیر بھائی۔۔۔ سدا خوش رہیں!

مدتیں ہوئیں آپ کا مکتوب ملا تھا میں بتا نہیں سکتا کس قدر خوشی ہوئی اتنے خوبصورت خط بہت کم دیکھنے میں آتے ہیں آپ نے جس خوبصورت انداز میں طائف سے مجھے متعارف کرایا ہے وہ واقعی خوبصورت انداز تھا مجھے یوں لگ رہا تھا کہ جیسے میں کسی مجلس میں بیٹھا ہوں اور آپ مجلس پڑھ رہے ہیں پھر کراچی کے ہنگاموں کا تذکرہ۔ ہاں بھئی کیوں نہ ہو؟ آپ کا لکھنے کا انداز اچھا نہیں ہوگا تو پھر کس کا ہوگا۔ آپ کہ جس کی تحریروں کو انڈیا کے نصاب میں شمولیت حاصل ہو آپ کہ جس کی مقبولیت ہی صرف یہ ہو کہ لوگ دور سے دیکھ کر کہہ اٹھیں کہ میر انیس پر اتھارٹی رکھنے والا شخص آرہا ہے۔ حافظے اور یادداشت کی تعریف یقیناً نہیں کرسکتے اخلاق مروت وانسانیت جو آپ کو قدرت کے علاوہ لکھنؤ کے ماحول نے بخشی اس سے یقیناً نہ صرف ہم لوگ

فیضیاب ہوتے رہے بلکہ اگر سچ پوچھیں تو خصوصاً میں نے آپ کو ان چیزوں میں Follow کیا ہے اور یوں بھی آپ میرے استاد تھے، ہیں اور رہیں گے کہ میں نے نہ صرف آپ سے اردو پڑھی بلکہ آپ کی ذہانت، ادبی ماحول اور نشستوں نے مجھے بہت کچھ دیا ہے۔ کسی دوسرے کے منہ سے آپ کی برائی نہیں سن سکتا تھا اور نہ کرتا تھا۔

ضمیر بھائی اپنا حال یہ ہے کہ تنہائی اور وحشت کا اب بھی وہی حال ہے جو ریاض ائیر پورٹ پر اترتے ہی ہوا تھا۔ اس کے علاوہ اس عرصہ وحشت میں ہم تین عمرے کر چکے ہیں اور یہ بات کہنا بالکل بیکار ہے کہ آپ تمام لوگوں کے لئے خصوصاً دعائیں کیں۔ ضمیر بھائی بس کیا بتاؤں کہ گذشتہ دنوں میں کراچی کے ہنگاموں کی طرف سے بے انتہا پریشان تھا بس جب بھی کراچی سے کسی کا خط آتا تھا خود بخود آنکھیں بھیگ جاتی تھیں ان دنوں میں نے بہت کوشش کی کہ کسی طرح مجھے چھٹی مل جائے لیکن نہیں ملی۔ لیکن اس کے باوجود دل کا یہ عالم ہے کہ اب بھی ایسا لگنے لگتا ہے کہ جیسے کراچی کے امام بارگاہ پکار پکار کر کہہ رہے ہوں کہ اے حسینیت کے علمبردارو، اے عباس کے پرچم کو اونچا رکھنے کے نعرے لگانے والو تمہاری غیرتوں کو کیا ہوا کہاں گئے تمہارے وہ جوش اور ولولے، کہاں گئے تمہارے وہ بلند و بانگ نعرے کہ ہم حسینیت کے نام پر سر کٹا تو سکتے ہیں جھکا نہیں سکتے کہاں ہیں اس قوم کے بڑے بڑے فقیہہ؟ کیا ان کی نگاہوں میں جناب عابد بیمار کی اس جوانی کا تصور نہیں آتا جو چند ساعتوں میں ضعیفی میں بدل گئی تھی۔ کیا ان کو جناب علی اصغر کی کمسنی کی شہادت، حضرت علی اکبر و قاسم و عون محمد کی نوجوانیوں، جناب حضرت عباس کے کٹے ہوئے شانوں، جناب سکینہ کے گوشواروں، جناب زینب و ام کلثوم کی رداؤں کا ذرہ برابر بھی غم نہیں ہے کیا یہ تمام قربانیاں صرف اس لئے پیش کی گئیں تھیں کہ ہمارے امام بارگاہ جلتے رہیں علم و تعزیے اور قرآن پاک کو

بے دردی سے پھاڑا جائے اور تمام شیعہ اتنے المناک واقعات ہونے کے باوجود بھی اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش نہ کریں اچھا اب اس کے ساتھ ہی اجازت۔

حسب مراتب تمام لوگوں کو میرا سلام اور محبتیں "اللہ نگہبان امام زمانہ کا سایہ"

آپکا بھائی.....علی ضیار ضوی

ماجد حسین رضوی

کراچی.....۳ فروری ۱۹۸۶ء

محترم و معظم......تسلیم عرض ہے!

ہمہ وقت بارگاہ رب العزت سے خیریت کا خواستگار۔ عجب اتفاق کہ گذشتہ پنجشنبہ کو بھی ساڑھے چھ بجے حاضر خدمت ہوا تھا لیکن ملاقات نہ ہوسکی۔ کسی روز ۹ بجے صبح کو حاضر خدمت ہونے کا ارادہ ہے کہ تا کہ تفصیلی ملاقات ہوسکے۔ بہر حال ایک گذارش پہلے بھی کی تھی اور پھر کر رہا ہوں کہ دن میں دو سے چار بجے تک ملاقات کا وقت متعین فرمادیں تا کہ عام طریقہ پر لوگوں کے علم میں رہے آپ سے محافل و مجالس کیلئے وعدہ لے سکیں مزید کسی کو نہ ملنے کی پھر شکایت ہی نہ ہوسکے۔ میں نے دو بجے سے چار بجے تک اس لئے عرض کیا کہ یہ ایسا وقت ہوگا جو مجالس و محافل کے وقت سے بالکل جدا ہوگا۔

فقط.....ماجد عفی عنہ

ڈاکٹر مجاہد حسین حسینی

بمبئی، انڈیا.....۳ نومبر ۱۹۹۵ء

میرے مکرم بھائی ضمیر اختر نقوی صاحب

مزاج گرامی۔ عزیزی منیر حیدر سلمہٗ خلف برادرم جناب سید ظہیر حیدر سلمہٗ کے

ہاتھ آپ کی دو وقیع تصانیف موصول ہوئی تھیں خط بھی ملا۔ شکر گزار ہوں۔ چند ناگزیر وجوہ کی بنا پر فوری طور پر رسید نہ لکھ سکا۔ حامل رقعہ مولوی سید احسن رضوی صاحب ماہر عملیات روحانی ہیں۔ اگر آپ ان کی سرپرستی فرما کر اپنے حلقۂ احباب میں متعارف فرمائیں تو نوازش ہوگی۔ موصوف ہی کے ہاتھ تفصیلی کوائف تحریر فرمائیں منتظر ہوں۔

آپ کی کتابیں اور خط محترم علی جواد زیدی صاحب کو مل چکے ہیں شکر گزار ہیں سلام کہتے ہیں۔ طالب خیر... آپ کا..... مجاہد حسین حسینی

حاتم علوی

گورنر ہاؤس، پریڈی اسٹریٹ، کراچی.....۸، جون ۱۹۷۲ء

جناب ضمیر اختر نقوی

آپ کا خط ملا جس میں آپ نے میر انیس کی سو (۱۰۰) سالہ یادگار کا ذکر کیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ایک صاحب کچھ مہینے پہلے مجھ سے اس سلسلے میں ملے تھے لیکن یہ صحیح نہیں ہے کہ بات چیت بے نتیجہ رہی۔ افسوس ہے کہ آگے کا لائحہ عمل معلوم نہ ہو سکا جس کی وجہ سے میرے ذہن میں خیالات اُبھرے کہ کیا کرنا چاہیے کہ جب آپ اب سے ڈھائی سال بعد ۱۰ دسمبر ۱۹۷۴ء میں میر انیس کی یادگار منانے کا سوچ رہے ہیں۔

آپ "انجمن یادگار میر انیس" کے بانی ہیں۔ میرا مشورہ ہے کہ آپ اس ادارے کو وسعت دیں اور موٴثر شخصیات پر مشتمل ایک کمیٹی بھی تشکیل دیں تا کہ یادگاری تقریبات کامیابی سے ہمکنار ہو سکیں اس سلسلے میں ممکنہ چیئرمین کے لئے میرے ذہن میں سید ہاشم رضا کا نام ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ وہ اردو کے غیر معمولی ادیب ہیں اور میر انیس کی شاعری پر ان کا مطالعہ گہرا اور عمیق ہے۔

کلینڈر کے حساب سے میر انیس کی سو (۱۰۰) سالہ برسی کی تاریخ گذر چکی لیکن

آپ نے ڈھائی سال کا وقت لے کر اچھا کیا تا کہ ۱۹۷۳ء کے اختتام تک تقریبات احسن طریقے سے منعقد کی جاسکیں۔ نیک خواہشات کے ساتھ

آپ کا خیر خواہ.....حاتم علوی

حامد حسین سید

کراچی.....۸، جولائی 1995

جناب محترم ضمیر اختر نقوی صاحب

کئی دفعہ آپ کی تقاریر سننے کا موقع ملا۔ آپ کی تحقیقی کاوش جو کتابی شکل میں شائع ہوئی ہیں ان کے متعلق بھی مختلف ذرائع سے آگاہی ہوئی۔ تصنیف وتالیف کے سلسلے میں میری معلومات نہ ہونے کے برابر ہے لیکن مجھے لکھنے کا بہت شوق ہے اور اس سلسلے میں جو موضوع میں نے چنا ہے وہ ہے "اہل بیت کا اثر۔ غیر مسلم ممالک پر" آپ کی چند مجالس میں ایران، کشمیر اور ناروے وغیرہ میں شہادت کربلا کے اثرات اور مختلف واقعات سن کر اشتیاق اور بڑھا۔ اس کے علاوہ ایک کتاب بنام "صرف ایک راستہ" میں کینیڈا کے جنگلوں میں بی بی پاک کی برکت اور کرامت کے متعلق بھی پڑھا۔ (کچھ عرصے قبل جنوبی امریکہ کے ملک بولیویا میں ایک تہوار کا نام جوان کے ہاں غالباً مئی میں منایا جاتا ہے اور جو Great Lady Vigin Fatima کے نام سے مشہور ہے پڑھا) ان تمام چیزوں سے اور آپ کی تحقیقی تقاریر نے دل کو اس جانب بہت زیادہ مائل کیا کہ زمینوں اور آسمانوں میں ہر وقت ذکر اہل بیتؑ کسی نہ کسی شکل میں ہر وقت ہوتا رہتا ہے اتفاق سے مجھے بھی تقریباً دس سال پہلے ترکی، اسکاٹ لینڈ (گلاسگو)، انگلینڈ (لندن) مارا ماس (وینیز ویلا) اور میکسیکو ڈی ایف جانے کا موقع ملا تھا وہاں سے آنے کے بعد ارادہ مصمم کرلیا کہ جب بھی موقع ملا اس مقدس کام کی طرف ضرور

بھرپور قدم اٹھاؤں گا۔ خط کی طوالت کے خوف سے اپنی اس دعا کے ساتھ آپ کی زحمت کو تمام کرتا ہوں کہ آپ کی عمر دراز ہو اور آپ کی تحقیقی کاوشوں میں اور ترقی ہو۔ (آمین)....احقر و ناچیز.....حامد حسین سید

حیدر طباطبائی

تہران (ایران)....۱۲؍اکتوبر ۱۹۸۶ء

برادر عزیز ضمیر میاں

بھائی آپ آئے بھی اور گئے بھی لیکن اس امید پر کہ ختم فسانہ نہیں ہوا زندہ ہوں، طرفہ تماشہ یہ کہ جب ہم گھر جاتے ہیں تو بیاباں میں بہار آجاتی ہے اور جب ہم بیاباں میں رہتے ہیں تو گھر میں بہاراں کا سماں رہتا ہے۔ یہاں پر تہران کو بیاباں اور حضور کا ورود تہران تصور بہار ہے۔

آپ کا خط بھی عرصۂ دراز کے بعد مجھ کو ملا اور میں نے بھی بطور کمینگی آپ کو جواب نہیں دیا۔ بھی لڑکپن کی باتیں ایک ایک کر کے یاد آرہی ہیں، وہ آپ کی جادو بیان آنکھیں، حسین آباد اسکول میں کتابیں لے کر آپ کا آنا، پھر یوں ہوا کہ ہم تم جدا ہو گئے اور عرصۂ دراز کے بعد پھر شیعہ کالج لکھنؤ میں عباس بہادر حرامی، خالد خاں حرامی، شیخ نسیم حرامی غرض کہ حرامیوں کے جمگھٹ میں ہم دو شریف زادوں کا پھر ملن ہوا اور پھر آپ کی اور رحمت کی دوستی عروج پر تھی بعد میں سلطان آغا آپ کی جان پر سوار ہو گئے۔ پھر یہ جان لیوا خبر آئی کہ ہندوستان میں ضمیر کی اہمیت نہیں یا یوں کہیں کہ ہندیوں کا ضمیر مر گیا لہٰذا اپنا ضمیر ہجرت کر کے ارض پاک چلا گیا۔ پھر آپ کی ادبی و مذہبی سرگرمیوں کی گاہ گاہ خبریں آتی رہیں اور ۱۹۷۲ء میں، میں نے بھی سرزمین امام رضا علیہ السلام کا رخ کیا، سوچا پاکستان کیا جاؤں تو بہ توڑوں تو ٹوٹے ہوئے پیمانے

سے اور فرنگستان میں بھی جانا ناممکن تھا کیوں کہ بحمد اللہ ناظر نیازی کا ہم مشرب نہیں ہوں غرض کہ اجداد کی سرزمین میں بھی کیا معلوم تھا کہ ہمہ جانب چوتیا آباد ہیں۔

لئے پھری مجھے قسمت کہاں کہاں میری
کسی نے قدر نہ کی زیر آسماں میری

اور پھر ایک دن ایک ترکن سے دل لگا بیٹھے، آپ کی بھابھی اور دو بچوں کے ساتھ تہران میں ہی آباد ہوں، کام سوداگری ہے اس لئے تنگ حرص و ہوا نہیں چھوٹی اور پھرے ہوں دیس بدیس مارامارا، اس لئے کبھی ارجنٹائنا اور کبھی سنگاپور، تائیوان و لندن وغیرہ لکھنؤ عرصۂ دراز سے نہیں گیا اور کیا جاؤں

تھی جو کل تک جلوہ افروزی میں شمع انجمن
آج وہ شکلیں چراغ زیر داماں ہوگئیں

ہائے وہ اپنا وطن وہ مجالس، وہ توپوں کی محافل مقبرے اور نصیر منزل میں سولوی امداد کا پڑھنا۔

اب کے بادل بہت چوڑے برسے
اور اعجاز تو دیکھو سولا کا.......... کے گھروں میں .... برسے

لیکن اب وہ لکھنؤ نہیں رہا، جب تک ہم لوگ تھے، تب تک صحن چمن میں کچھ دھوپ باقی تھی اور اب

غیرت حور مہ جبیں نہ رہے
ہیں مکاں گر تو وہ مکیں نہ رہے

آستانہ انقلاب خمینی (ایران) پر آغا روحی آئے اور بہت بے آبرو ہو کر میرے کوچے سے وہ نکلے، پھر طاہر میاں زیارات کے لئے آئے اپنی گاڑی سے اُن کو مشہد مقدس لے گیا بہت اچھا وقت گزرا۔

اگر میں تہران میں ہوتا تو آپ کو تفصیل سے یہاں کی اجتماعی و فرہنگی سیر کراتا۔ آج کل مشہور مرثیہ گو شاعر ڈاکٹر وحید اختر بھی تہران میں ہیں، اُن کے مرثیے کا ایک ٹیپ جب کراچی گیا تھا آپ کے لئے لے گیا تھا جب ملاقات نہ ہوئی تو برادرم محترم نواب عسکری صاحب نے وہ ٹیپ لے لیا، اس میں ڈاکٹر صاحب کے دو مرثیے ٹیپ ہیں اگر ہو سکے تو اُن سے ورنہ اُن کے بڑے بیٹے علی عابد میاں یا حسن میاں سے طلب کرلیں۔ مرثیے سُن کر اپنی رائے سے مطلع کریں، والد مرحوم (احسن طباطبائی) چچا (سروش طباطبائی) میرے پر دادا (اعظم طباطبائی) کے مرثیے میرے پاس موجود ہیں، میرے والد کے سگے ماموں نواب جعفر علی خاں اثر لکھنوی کے مرثیوں کی قلمی جلد تہران میں میرے پاس ہے۔ اس جلد میں عہد قدیم کے ایک صوفی بزرگ حضرت احسن جائسی کے مرثیے جو نہایت ہی ادبی شہ پارے ہیں میرے پاس تہران میں ہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی اُن کی فوٹو کاپی آپ کو روانہ کروں گا۔

جیو جگ جگ جیو، اچھا تو ہم چلتے ہیں، آپ کے لیے اپنا و آپ کی بھابھی کا فوٹو ارسالِ خدمت ہے، کیا پہچان سکیں گے۔

دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو

گھر میں محترم والد صاحب اور دیگر درجہ بہ درجہ سلام آپ کے چھوٹے بھائی تنویر کو سلام و دعائیں۔ فقط تمہارا حیدر طباطبائی

حسن مہدی جعفری

ریڈیو زاہدان (ایران)

ڈیئر ضمیر بھائی

سلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ آپ لوگ بخیریت ہونگے۔ کافی عرصہ ہوا آپ نے

مولانا طالب جوھری صاحب کے صاحب زادے کے ہاتھ ایک خط بھیجا تھا۔ لیکن میں اُس دوران انڈیا گیا ہوا تھا۔ اور پھر جب وہاں سے واپس آیا تو اسد جوہری سے ملاقات ہوئی لیکن اس دوران میں آپ کا وہ خط ان سے کہیں اِدھر اُدھر ہو گیا۔ اور میں آپ کی تحریر کی زیارت سے محروم ہو گیا۔ لیکن پھر بھی آپ کے خط کی روح سے واقف ہوں اسلئے میں آپ کے خط کا جواب دے رہا ہوں امید کرتا ہوں کہ اپنی محرم کی مشغولیات کے باوجود آپ خطوط کے ذریعہ مجھ سے رابطہ برقرار رکھیں گے۔ ویسے اگر ممکن ہو تو خالو ابا اور شہباز آپا کو لے کر یہاں زیارت کے لئے آئیں اور مجھ سے بھی ملاقات ہو جائے۔

کچھ دن ہوئے میرے ایک بہت ہی عزیز دوست مولانا حسن ظفر صاحب کراچی جانے سے پہلے زاہدان میں مجھ سے ملنے آئے تو میں نے موقع غنیمت جانا اور آپ کو خط روانہ کر رہا ہوں۔

آپ کو ایک اطلاع اور دے دوں کہ اب میں رضوی یونیورسٹی، مشہد چھوڑ کر زاہدان آگیا ہوں۔ اور فی الحال ریڈیو زاہدان کی اردو سروس میں News Reader کی Job کر رہا ہوں اور یہاں زاہدان یونیورسٹی میں بھی اگر خدا نے چاہا تو ستمبر سے پڑھانا شروع کر دونگا۔ فی الحال وہاں امتحانات ہو رہے ہیں۔ ہندوستان میں سب خیریت ہے۔ فقط..... آپ کا بھائی... حسن مہدی جعفری

نادم سیتاپوری

کراچی

عزیزی ضمیر اختر صاحب

کل آپ میرے یہاں گئے تھے ملاقات نہیں ہو سکی۔ فضل قدیر ایڈیٹر "ماہ نو" کا خط

آیا ہے وہ شاکی ہیں کہ آپ نے ان کے خطوط کا جواب نہیں دیا۔ پتہ نیچے لکھ رہا ہوں انھیں خط لکھ دیجیے جلد۔ فضل قدیر ایڈیٹر "ماہ نو" مطبوعات پاکستان عادل چیمبر۔ جنجوعہ روڈ، راولپنڈی پوسٹ بکس 255، راولپنڈی..... نادم سیتاپوری

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی

کراچی..... ۷، فروری ۱۹۷۵ء

ضمیر اختر سلمہٗ۔ دعا

میں ۶، فروری سہ پہر کو یہاں آیا تھا۔ مجھے میر انیس والے ٹی وی ڈرامہ کا مسودہ لینا تھا۔ وہ کوئٹہ سے نشر ہوگا۔ پھر آؤں گا۔ اگر آپ کے گھر پر ہونے کا امکان نہ ہو تو مسودہ کسی کو دے جایئے گا۔ میں لے لوں گا۔ فقط..... محمد احسن فاروقی

انور شعور

۱۰، ستمبر ۱۹۷۱ء

بھائی ضمیر اختر!

آپ عاشق انیس ہیں۔ انیس کا اسکیچ شکریے کے ساتھ قبول کیجیے..... شعور

حجتہ الاسلام مولانا سیّد علی ناصر سعید عبقاتی (علامہ آغا روحی)

لکھنؤ..... ۹، اگست ۱۹۹۷ء

ضمیرم تعظیم و تسلیم کے بعد!

اگر آپ اور ماجد میاں بعد مجلس ادھر ہی چلے آئیں تو بے حد احسان ہوگا۔ "ایک رات واردات کے نام" گزار لی جائے۔

کھانا نوش فرما چکے ہوں تو خوشی ہوگی اور اگر نہ نوش فرمایا ہو تو بے حد خوشی ہوگی۔

اگر آنا ہے تو دس بج کر پینتالیس منٹ یعنی پونے گیارہ بجے تک ہر حال میں تشریف لائیں۔ طالب خیر:..... آغا روحی

زُہیر حسین

کراچی.....۲۱ر مارچ ۲۰۰۷ء

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم (ساری تعریف اللہ کے لیے درود وسلام محمد وآل محمد پر)

منڈے ویک میگزین میں آپ کا انٹرویو پڑھا تو معلوم ہوا کہ ۲۴ر مارچ کا دن وہ دن ہے جس کے لیے خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس دن اللہ تعالیٰ نے ہمارے پیارے (ضمیر اختر نقوی صاحب) کو دنیا میں بھیجا۔ (کیونکہ ہمارے گھرانے میں اور ویسے بھی بزرگوں کو ان کے نام سے بلانا اچھا نہیں سمجھا جاتا تو میں آگے ان کے لیے "سر" کا لفظ استعمال کروں گا) جہاں تک مجھے یاد آتا ہے کہ میں بارہ یا تیرہ برس کا ہوں گا جب میرے والد مجھے لاہور لٹن روڈ لے جایا کرتے تھے تا کہ سر کی مجلس سنیں۔ پھر کچھ عرصہ تک شاید سر لاہور لٹن روڈ نہیں آئے یا پھر ہم سر کی مجلس میں نہ آ پائے۔ ابھی چار سال کا عرصہ ہوا ہے کہ ہم سر کے شہر کراچی آئے تو سر کی مجالس میں حاضری کا سلسلہ جو ٹوٹ گیا تھا مولا کے فضل سے پھر جڑ گیا۔ بس پھر جیسے جیسے آپ کی مجالس میں آتے رہے آلِ محمد کے بارے میں زیادہ سے زیادہ جانتے رہے۔ دل و دماغ آپ کی محبت سے سرشار ہوتا رہا۔ اب کیا کروں کہ وہ محبت آہستہ آہستہ عشق کی صورت اختیار کر گئی۔ اب شاید آپ کی محبت ہی تھی جس نے مجھ سے کہا کہ اٹھاؤ قلم اور سر کے لیے کچھ دعائیں لکھ بھیجو۔ آپ کا وجود ہمارے لیے باعث فخر ہے تو پروردگار آپ کے وجود کو قائم ودائم رکھے۔ (آمین) پروردگار آپ کو صحت وتندرستی دے اور آپ کی عزت اور مرتبے کو بلند کرے۔ (آمین) مولا آپ کو ایسے ہزاروں ۲۴ مارچ دیکھنا نصیب فرمائے اور

آپ اسی طرح آلِ محمد کے ذکر کو عام کرتے رہیں جب وہ وقت آجائے کہ "ہر قوم پکارے گی ہمارے ہیں حسین" (آمین) پروردگار آپ کی اور ہماری توفیقات میں اضافہ فرمائے کہ آپ اسی طرح محبتِ اہلِ بیتؑ، علم، ایمان اور انسانیت کے چراغ جلاتے رہیں اور ہم ان چراغوں کی روشنی سے منور ہوتے رہیں۔ (آمین)

آپ کی باتیں، آپ کا استدلال اور آپ کے دلائل، بس سب کچھ آپ ہی کے پاس ہے۔ اور علم میں آپ کا کوئی ثانی نہیں ہے جو درحقیقت ایک سمندر ہے۔

پھر اگر آپ مجھ سے کہیں کہ "تم مجلس بڑی اچھی سنتے ہو" تو میں جواب دوں گا کہ یہ سلیقہ بھی آپ کی مجلس میں آکر ملا کہ مجلس کیسے سنتے ہیں، کیسے نعرہ لگاتے ہیں، کیسے واہ واہ کرتے ہیں۔ سب آپ کی عطا ہے۔ مولا سلامت رکھے۔

آپ کی صحت وسلامتی کے دعا گو

میرے بڑے بھائی مظاہر حسین، فیضان

اور میں زہیر حسین

ڈاکٹر سیّد محمد سیادت نقوی

امروہہ.....۱۳ر مئی ۲۰۰۸ء

بسمہ تعالیٰ! ادامت معالیکم السامیہ.....السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

امید کہ مزاج گرامی مع الخیر ہوگا کل عابدی صاحب کے ذریعے جناب کی مرسلہ کتب موصول ہوئیں جن میں سے ایک میرے لئے ہے اور دوسری عظیم صاحب کے لئے جسے میں عظیم صاحب کو جو دہلی میں رہتے ہیں ارسال کردوں گا۔

جناب والا کی مسلسل نوازشات ہوتی رہتی ہیں بھائی چمن صاحب کے ذریعے بھی

جناب کی مصروفیات کا علم ہوتا رہتا ہے حقیقت یہ ہے کہ جو خدمات آپ انجام دے رہے ہیں وہ آپ ہی کا مقام ہے اور یہ ایسا زندہ کام ہے جو آنے والی نسلوں کی بہترین رہنمائی کرنے والا ہے۔

میں آج کل UGC کی طرف سے اپنے پروجیکٹ پر کام کر رہا ہوں میرا موضوع ''فرہنگ مراثی دبیرؔ'' ہے جس میں آج کل ہمہ تن مصروف رہتا ہوں دعا فرمائیں خداوند تعالیٰ میری اس سلسلے میں مکمل رہنمائی و مدد فرمائے۔

تمام پرسان احوال کو میرا اسلام و نیاز خصوصاً بھائی چمن کو میری طرف سے جب ان سے ملاقات ہو تو سلام خصوصی پہنچانے کی زحمت فرمائیں۔ فقط والسلام

محمد سیادت نقوی

زاہد نقوی

کراچی......۲۵ر اکتوبر ۲۰۰۸ء

محترم علامہ صاحب کی خدمت میں۔ آداب!

آپ کا مجموعہ کلام کافی تاخیر سے دو تین ہفتے پہلے مجھ تک پہنچا۔ آپ کی شخصیت کا ایک اور روشن پہلو سامنے آیا کتاب کے عنوان ہی سے ذہانت کی ابتدا ہوگئی ذو معنی الفاظ کی ایک اور شکل سامنے آئی تصویر پہ نظر پڑی تو سوچا کہ اگر میر انیسؔ جناح کیپ پہن کر سائیڈ پوز کی تصویر کھنچواتے تو ضمیر اختر صاحب کی طرح لگتے۔

کتاب جستہ جستہ پڑھی کلام کے بارے میں بھلا میرا ایسا کم علم کیا کہہ سکتا ہے اردو اچھی ہوتی اور کچھ کہنے کا سلیقہ آتا تو زبان کھولتا۔ میں ڈاکٹر ماجد رضا کے مضمون پر تو مہر سے پوری طرح متفق ہوں۔ سوائے ایک بات کے کہ انہوں نے مرثیہ ''سلیمان، امامت'' کے ابتدائی بند کو فنی تعلّی سمجھا۔ تعلّی میں تو مبالغہ بھی ہوتا ہے جبکہ حقیقت میں

پورا بند آپ کی شخصیت اور صفات کا عکاس ہے کمال یہ ہے کہ کتاب میں شاعری کی ہر صنف موجود ہے یہاں تک کہ قطعات تاریخ بھی۔ کیا ایسا ممکن ہے کہ آپ فنون لطیفہ کا کوئی شعبہ دوسروں کے لئے بھی چھوڑ دیں مجھے یقین ہے کہ آپ کو فن موسیقی میں بھی دسترس ہوگی اس لئے کہ میں شعبہ صدا کے حوالے سے پندرہ منٹ کی تشریح آپ سے سن چکا ہوں۔ میں اپنی ذات کے بارے میں تو یہ کہہ سکتا ہوں سوز وسلام پڑھ لیا کرتا تھا شاید کسی نے جھکی میاں کی طرح مجھے سیندور کھلا دیا آواز جاتی رہی لے دے کر میر انیس کے مرثیوں کو تحت اللفظ پڑھنے کا جو تھوڑا بہت دم باقی تھا وہ آپ نے ختم کر دیا۔ اللہ اللہ اور خیر صلیٰ۔

میں آپ سے ناراض اس لئے نہیں ہو سکتا کہ مجھے دنیا خراب کرنی ہے نہ عاقبت۔

''ناراض تو نہیں ہیں؟'' میرا خیال ہے یہ جملہ تلمیح ضمیریت کے زمرے میں آتا ہے جس کی تفصیل یوں ہو سکتی ہے۔

''آپ نے تو مجھے خطیب عصر کا خطاب دیا تھا۔ آپ کو میری ہر مجلس میں جانے کی خواہش ہوتی تھی۔ آپ کی خطابت سے بہت کچھ مل جاتا ہے۔ بہت سی نئی باتیں وغیرہ وغیرہ لیکن مہینوں گذر گئے ملاقات تک نہ ہو سکی۔ ''ناراض تو نہیں ہیں؟''

اگر آپ اس طرح سوچتے رہے ہیں تو اس کی وضاحت مختصر طور پر یہ ہے کہ میری بچی اب بھی بسر علالت پر چلنے پھرنے سے معذور ہے میرا اس کے پاس سے زیادہ دیر دور رہنا نامناسب ہے۔

آپ ایسی ہمہ گیر شخصیت کو دیکھ کر نہ جانے یہ کیوں دل چاہتا ہے کہ کاش آپ کا تعلق میرے وطن مصطفےٰ آباد سے ہوتا اور آپ کے دادا اور میرے والد آپس میں سگے خالہ زاد بھائی ہوتے لیکن انسان کی ہر خواہش کب پوری ہو سکتی ہے۔

میں آپ کے لہجۂ خراماں اور اپنی مفلسی کے پیش نظر فون پر اتنا سب کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ لہٰذا خط ارسال کر رہا ہوں۔

خدا آپ کو حاسدوں اور دشمنوں سے محفوظ رکھے اپنا ہر طرح خیال رکھئے اس لئے کہ ضمیر اختر ایک فرد کا نام نہیں ہے ضمیر اختر علمی، ادبی اور مذہبی درسگاہ ہے۔ اس دانش گاہ کی حفاظت کی سب سے زیادہ ذمہ داری آپ کی ہے۔ آپ کا.....زاہد تقوی

ڈاکٹر عاصمہ زیدی

کراچی

محترم قبلہ!

ہم نے جب سے ہوش سنبھالا ہے، آپ کی مجالس زندگی کے ہر موڑ پر ہماری رہنمائی کرتی آئی ہیں۔ آپ نے ہماری سوچ کو سیدھی راہ سے متعارف کرایا۔ وہ حقائق سمجھائے جو ہماری فکر سے بالاتر تھے۔ آپ کی مجالس کے ذریعے ہم نے تاریخ کو اس کے حقیقی رنگوں کے ساتھ سمجھا۔ آپ نے اس خوبی سے حقائق کی منظر کشی کی کہ یوں گماں ہوتا تھا کہ ہم کھلی آنکھوں سے وہ حقیقت دیکھ رہے ہیں۔

آپ نے جن موضوعات پر مرثیے پڑھے وہ موضوعات ہم سب کے لئے خصوصاً نوجوان نسل کے لئے صراطِ مستقیم پر چلنے کے لئے ہدایت بنے۔ آپ کے علم کی، انداز گفتگو کی، جتنی بھی تعریف کی جائے وہ کم ہے۔

کل ۱۷ ارصفر کی مجلس کی تعریف بیان کرنے کے لئے مجھ ناچیز کے پاس الفاظ نہیں۔ آپ نے جس طرح حقائق سے پردہ اٹھایا، وہ قابلِ ستائش ہے۔ مجلس سن کر دل عش عش کر اٹھا۔ دل چاہتا تھا کہ آپ صرف پڑھتے جائیں اور ہم سنتے جائیں۔ وقت تھم جائے اور آپ صرف فضائلِ مولاؑ علی بیان کرتے رہیں۔

آپ سے گذارش ہے کہ آپ مستقبل میں بھی ایسے ہی موضوعات پر گفتگو کیجیے تاکہ ہم زیادہ سے زیادہ اپنی بنیادوں سے روشناس ہوسکیں۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ محمدؐ اور آلِ محمدؐ کے صدقے میں آپ کو لمبی عمر عطا فرمائے۔ تاکہ اس چشمۂ علم سے ہم زیادہ سے زیادہ سیراب ہوسکیں۔

آپ کی بیٹی... ڈاکٹر عاصمہ زیدی

ڈاکٹر نیر مسعود

لکھنؤ...... ۲۳ر مئی ۲۰۰۸ء

برادرم ضمیر اختر صاحب.... آداب!

آپ کی تینوں کتابیں "حضرت امام حسنؑ کی فتح اور خدا کے دشمن کی شکست، غم امام حسینؑ اور عزاداروں کی شفاعت" "جناب زینب کبریٰؑ اور تاریخِ ملک شام" محمد احسن صاحب نے پہنچا دیں۔ لیکن اُن سے ملاقات نہ ہوسکی۔ میری طبیعت آج کل پھر خراب ہوگئی ہے۔ آپ کی بھیجی ہوئی کتابیں میں نامزد اشخاص کو پہنچاتا رہوں گا۔ ان میں دو نام اور شامل ہیں۔ ایک آصف عباس صاحب (مدیر سالنامہ محرم نمبر، مہندی) دوسرے اسلم محمود صاحب (جن کا بہت بڑا کتب خانہ ہے اور اس میں رثائیات سے متعلق بہت اچھا ذخیرہ ہے)۔ آپ کی تینوں کتابیں بہت مفید موضوع پر ہیں۔ خصوصاً حضرت زینبؑ پر کتاب اور اس میں شامل سفرنامہ شام۔ شام کے سفر میں کہیں پر آپ کی ملاقات اُن اندھے حافظوں سے ہوئی جن کی آنکھوں پر چہرے کی کھال منڈھی ہوئی ہے۔ میرے دوست مشتاق نقوی نے اپنے سفرنامے "گومتی سے گومتی تک" میں ان کا ذکر کیا ہے۔ کاظم علی خاں صاحب نینی تال میں ہیں، اُن سے فون پر بات ہوئی، اُن کا کہنا ہے کہ مولانا آغا روحی صاحب سے اُن کو کوئی ناراضگی نہیں، اصل میں وہ اپنے

اخبار "آگ" میں اُلجھ گئے ہیں اور اُن کی اہلیہ کا کینسر کا آپریشن ہوا ہے، غالباً اسی لئے وہ آپ کو کتاب کی رسید نہیں بھیج سکے۔ امید ہے مزاج بہ خیر ہوگا۔ (آپ کا نیر مسعود)

ڈاکٹر شارب ردولوی

لکھنؤ.....۱۹؍جون ۲۰۰۸ء

محبی ضمیر اختر نقوی صاحب

تسلیم و نیاز آپ کی بھیجی ہوئی چاروں کتابیں "مجالس محسنہ جلد اول و دوم" اور سید محسن نقوی صاحب کی انگریزی تصانیف "Understanding Karbala" اور "The House of Love" مل گئیں اس عنایت کے لیے ممنون ہوں۔ ادھر چند دنوں سے یہی کتابیں زیر مطالعہ ہیں "مجالس محسنہ" پڑھ کر مرحومہ کے لیے دعائے مغفرت کی۔ کیسی محترم خاتون تھیں خدا انھیں اپنے جوار رحمت میں جگہ دے۔ ایسی صاف ستھری مجالس کم پڑھنے میں آتی ہیں آپ نے بڑا کمال یہ کیا کہ ان مجالس کو جمع کر کے شائع کر دیا۔ میں نے کتاب کا وہ حصہ بھی پڑھا جو مرحومہ کے خاندان اور حالات سے متعلق ہے اس سے ان کے خاندان اور معتبر سلسلۂ سیادت کا اندازہ ہوتا ہے۔ دونوں کتابیں ایسی ہیں کہ انھیں خاص طور پر لڑکیوں کو تعلیمی نصاب کے ایک حصہ کے طور پر پڑھایا جانا چاہیے۔

سید محسن نقوی صاحب کی دونوں کتابیں اپنے موضوع اور تحریر دونوں اعتبار سے بہت اہم ہیں۔ Understanding Karbala کی سب سے بڑی خصوصیت اس کا علمی اور سائنٹفک approach ہے۔ House of Love میں انھوں نے جن موضوعات پر قلم اُٹھایا ہے اور جس سلیقے انداز اور صاف ستھری زبان میں گفتگو کی ہے وہ ان موضوعات پر ان کی دسترس کی علامت ہے۔ مذہبی اور فقہی مسائل پر

اظہار خیال بہت مشکل کام ہے، لیکن محسن نقوی صاحب نے بڑی غیر جانب داری کے ساتھ ان مسائل پر اظہار خیال کیا ہے، ان کی کتابوں کے مطالعہ سے میرے علم میں اضافہ ہوا۔ ان کتابوں کے بہانے بہت عرصے کے بعد آپ کا خط آیا جس کی خوشی ہوئی، خدا کرے آپ بخیر و عافیت ہوں۔ آپ کے لکھنؤ آنے کا انتظار ہے، نومبر تک میں بھی کراچی کا ایک چکر لگانا چاہتا ہوں...... مخلص..... شارب ردولوی

علّامہ ضمیر اختر نقوی کے علمی، ادبی، تحقیقی مضامین

علّامہ ضمیر اختر نقوی کے تحقیقی مقالے و مضامین کا اشاریہ بہ اعتبار حروفِ تہجی مندرجہ ذیل ہے

الف ممدودہ

۱۔ آنسو

"ارشاد" کراچی ۵ فروری ۱۹۷۳ء

۲۔ آغا خان کی علمی، ادبی خدمات

طلوعِ افکار کراچی، دسمبر ۱۹۷۷ء

۳۔ آغا ذہین کی مرثیہ گوئی و سلام نگاری

رثائی ادب کراچی، دسمبر ۱۹۹۸ء

۴۔ آہ! عمو جان سیّد ظہیر حسن نقوی

انجم (کراچی شمارہ ۳) ۱۹۹۹ء

(الف مقصورہ)

۵۔ اصحابِ حسینؑ کلامِ میر انیسؔ کے آئینے میں

"ارشاد" کراچی ۱۶ نومبر ۱۹۸۱ء

۶۔ اشاریہ میر انیسؔ

قومی زبان کراچی، دسمبر ۱۹۷۳ء

۷۔ اک ذاکر حسینؑ تھے عرفان عابدی

القلم کراچی (تیسرا شمارہ) ۱۹۹۹ء

۸۔ انتقالِ پُرملال سید ظہیر حسن نقوی (تعزیت)

القلم کراچی (شمارہ ۵)، مئی ۲۰۰۰ء

۹۔ اردو زبان کا عظیم شاعر انیسؔ

جنگ کراچی، ۸ دسمبر ۱۹۷۵ء

۱۰۔ اردو کا نامور شاعر میر انیسؔ

جنگ کراچی ۱۱ دسمبر ۱۹۷۲ء

۱۱۔ ابنِ صفی، اردو کا مقبول ناول نگار

جنگ کراچی ۱۵ ستمبر ۱۹۸۰ء

۱۲۔ اقبال کی نظر میں امامت

الحبیب کراچی، ۱۹۷۷ء

۱۳۔ انیسؔ سے پہلے کی نوحہ نگاری

انیس کربلا، کراچی، ۱۹۸۷ء

(ب)

۱۴۔ بیس دن امریکہ میں

الفقم کراچی، اپریل ۲۰۰۱ء

(ت)

۱۵۔ تعزیت نامے اور تشکر

الفقم کراچی (شمارہ ۵) مئی ۲۰۰۰ء

(ج)

۱۶۔ جناب سیدہؑ کی شہادت

ارشاد کراچی، ۱۶، مارچ ۱۹۸۶ء

۱۷۔ جوشؔ ملیح آبادی کی مرثیہ نگاری

ارشاد کراچی، ۱۶، جنوری ۱۹۷۸ء

۱۸۔ جوشؔ آج بھی زندہ ہے

حیات کراچی

۱۹۔ جوشؔ کے مرثیوں کی ترتیب وتدوین

ہم قلم کراچی، جون ۱۹۹۱ء

۲۰۔ جوشؔ کی مرثیہ نگاری

صحافی دہلی، جولائی ۱۹۸۲ء

۲۱۔ جاوید لکھنوی کی مرثیہ نگاری

عظیم کراچی ۲۳، دسمبر ۱۹۷۸ء

(ح)

۲۲۔ حسینؑ اور نماز، میر انیس کی نظر میں

"الحیدر" کراچی، ۳۰ مئی ۱۹۸۴ء

۲۳۔ حضرت زینبؑ (۱۴ سو سالہ جشن ولادت)

جنگ کراچی، ۱۷ مئی ۱۹۸۵ء

۲۴۔ حالاتِ عزت لکھنوی

مجلہ یادِ عزت لکھنوی کراچی ۱۹۸۱ء

(خ)

۲۵۔ خطیب اور فنِ خطابت

"ارشاد" کراچی، یکم جنوری ۱۹۷۹ء

۲۶۔ خطوط اور ان کے جواب

العلم کراچی (دوسرا شمارہ)، ۱۹۹۹ء

۲۷۔ خطوط اور ان کے جواب

العلم کراچی (تیسرا شمارہ)، ۱۹۹۸ء

۲۸۔ خطوط اور ان کے جواب

العلم کراچی (شمارہ۔۴)، ۱۹۹۹ء

۲۹۔ خطوط اور ان کے جواب

العلم کراچی (شمارہ۔۵) مئی ۲۰۰۰ء

۳۰۔ خطوط اوران کے جواب

الفلم کراچی، اپریل ۲۰۰۱ء

۳۱۔ خاموش ہوگیا ہے چمن بولتا ہوا نسیالحسن موسوی کی یاد میں

جنگ کراچی ۳۰،اکتوبر ۱۹۷۸ء

۳۲۔ خیر النسا کی سعیٔ خیر

حالات وواقعات جناب قمر ۲۰۰۱ء

(ڈ)

۳۳۔ ڈاکٹر سبط حسن رضوی اوران کے ادبی خطوط

الفلم کراچی، جون ۲۰۰۱ء

(ر)

۳۴۔ رباعیاتِ انیسؔ

قومی زبان کراچی، جنوری ۱۹۷۳ء

۳۵۔ راجہ چندولال شاداں کا نایاب مرثیہ

الفلم بمبئی، اکتوبر ۱۹۹۳ء

۳۶۔ راجہ صاحب محمود آباد

جنگ کراچی، ۱۶،اکتوبر ۱۹۷۳ء

(س)

۳۷۔ سادات کی ایک مشہور بستی کلاں پور

الفلم کراچی (دوسرا شمارہ)، ۱۹۹۸ء

۳۸۔ سید ظہیر حسن نقوی کے حالات زندگی

العلم کراچی (شمارہ۔۳) ۱۹۹۹ء

۳۹۔ سعادت یار خاں رنگین کا ایک غیر مطبوعہ مرثیہ

العلم کراچی (شمارہ۔۳) ۱۹۹۹ء

۴۰۔ سپہر دھولپوری کے مرثیے

العلم بمبئی، جون ۱۹۹۳ء

۴۱۔ سردار نقوی کی مرثیہ نگاری

گریہ فرات کراچی، ۱۹۹۵ء

(ش)

۴۲۔ شامِ غریباں کی آواز (نوحہ)

"ارشاد" کراچی

۴۳۔ شدید لکھنوی

عظیم کراچی ۲۳، اکتوبر ۱۹۷۸ء

۴۴۔ شاداں دہلوی کی مرثیہ نگاری

سید اینڈ سید کراچی، ۱۹۹۵ء

۴۵۔ شجرہ میر انیس

سہ ماہی اردو، کراچی، ۱۹۷۳ء

(ظ)

۴۶۔ ظہیر دہلوی کے غیر مطبوعہ مرثیے

العلم کراچی (دوسرا شمارہ) ۱۹۹۸ء

(ع)

۴۷۔ علمدار لشکر حسینی اور میر انیسؔ

"ارشاد" کراچی

۴۸۔ علامہ رشید ترابی اور کلامِ انیسؔ

جنگ کراچی، ۳، ۱۹۷۳ء

۴۹۔ علامہ جمیل مظہری

جنگ کراچی ۶، ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۰ء

۵۰۔ عہدِ جدید کا بہترین مرثیہ نگار

حریم عقل کراچی، ۲۰۰۱ء

(غ)

۵۱۔ غزل گو شعراء کے مرثیے آرزوؔ سے آرزو تک

ارشاد کراچی، یکم مارچ ۱۹۷۔ء

۵۲۔ غیر منقوط مرثیے

الحکم کراچی (تیسرا شمارہ)، ۱۹۹۹ء

(ک)

۳۵۔ کراچی میں عزاداری امام حسینؑ

"ارشاد" کراچی

۳۶۔ کردار امام حسینؑ اور انیسؔ کی شاعری

شیعہ لاہور فروری ۱۹۷۴ء

۳۷۔ کلامِ میر انیسؔ کی روشنی میں سیرتِ جناب فاطمۃ الزہرا

جنگ کراچی ۱۶ اپریل ۱۹۸۳ء

۳۷۔ کلامِ میر انیسؔ کی روشنی میں سیرتِ جناب فاطمۃ الزہرا

جنگ کراچی ۲ جون ۱۹۷۸ء

۳۷۔ کلامِ میر انیسؔ کی روشنی میں سیرتِ جناب فاطمۃ الزہرا

جنگ کراچی ۱۹۷۶ء

۳۸۔ کلیدِ گنجینۂ انیسؔ

ماہِ نو کراچی، اضافی شمارہ

۱۔ مرثیہ گوئی کا ادواری ارتقاء
۲۔ صریرِ کلک
۳۔ کانٹوں کو ہٹا کے پھول چن لیتا ہوں
۴۔ گلہائے مضامین
۵۔ اشاریہ مراثی انیسؔ
۶۔ اشاریہ رباعیات
۷۔ اشاریہ سلام
۸۔ اشاریۂ مدحیات

(ل)

۳۹۔ لندن جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب

الفلم کراچی (شمارہ۔۴) ستمبر ۱۹۹۹ء

۴۰۔ لندن جو ایک شہر ہے عالم میں انتخاب (دوسری قسط)

الفلم کراچی (شمارہ۔۵) مئی ۲۰۰۰ء

۴۱۔ لندن کا سفرنامہ

الفلم کراچی، اپریل ۲۰۰۱ء

(م)

۴۲۔ ماجد رضا عابدی کی مرثیہ نگاری

مرثیہ نسل اشرف کراچی، ۱۹۹۶ء

۴۳۔ مرثیے کا فن اور مرزا دبیرؔ

''ارشاد'' کراچی، ۱۹، فروری ۱۹۷۲ء

۴۴۔ میر ببر علی انیسؔ

''اخبار جہاں'' کراچی، ۲۱ جنوری ۱۹۷۶ء

۴۵۔ میر انیسؔ، عظیم شاعر کا کلام ہر دور کے حالات پر صادق آتا ہے

''شہاب'' راولپنڈی ۲۰ دسمبر ۱۹۷۵ء

۴۶۔ میر انیسؔ کے مرثیوں میں عباسؑ کا علم

سرفراز لکھنؤ، جنوری ۱۹۷۶ء

۴۷۔ میر انیسؔ کی صد سالہ برسی

پیام عمل لاہور فروری ۱۹۷۳ء

۴۸۔ مرزا دبیرؔ کی زندگی

ماہ نو، راولپنڈی، اکتوبر ۱۹۷۵ء

۴۹۔ میر انیسؔ اور ان کا فن شاعری

خیابان انیس پشاور، دسمبر ۱۹۷۲ء

۵۰۔ مرقع چمنستان انیسؔ

دبستان انیسؔ، راولپنڈی، ۱۰ دسمبر ۱۹۷۳ء

۵۱۔ میر انیسؔ کے حالاتِ زندگی

ماہِ نو، کراچی، اضافی شمارہ ۲، ۱۹۷۲ء

۵۲۔ مرزا محمد حسن مذنب لکھنوی

اعظم بمبئی، دسمبر ۱۹۹۳ء

۵۳۔ میر انیسؔ کا غیر مطبوعہ مرثیہ

رثائی ادب کراچی، مارچ ۱۹۹۸ء

۵۴۔ میر مونسؔ کے حالاتِ زندگی

القلم کراچی، مارچ ۱۹۹۷ء

۵۵۔ مرثیہ نو تصنیف (سلیمان امامت)

القلم کراچی (تیسرا شمارہ) ۱۹۹۹ء

۵۶۔ مجلس عزا بہ چہلم زینِ محفل سید ظہیر حسن نقوی

القلم کراچی (شمارہ۔۳) ۱۹۹۹ء

۵۷۔ میر انسؔ کا غیر مطبوعہ مرثیہ

القلم کراچی (شمارہ۔۳) ۱۹۹۹ء

۵۸۔ مرزا محمد ہادی رسواؔ کی مرثیہ نگاری

القلم کراچی (شمارہ۔۵) مئی ۲۰۰۰ء

۵۹۔ مجلس سوئم تنویر نصیر مرحوم (تقریر)

القلم کراچی، اپریل ۲۰۰۱ء

۶۰۔ مکرم لکھنوی کی علمی و ادبی خدمات

القلم کراچی، جون ۲۰۰۱ء

۶۱۔ مرثیے کی تاریخ میں بیگمات اودھ کا حصہ

القلم کراچی، جون ۲۰۰۱ء

۶۲۔ مرحمت خاں والہؔ دہلوی کی غیر مطبوعہ رباعیات

القلم کراچی، جون ۲۰۰۱ء

۶۳۔ میر انیسؔ نے اپنی زندگی میں کیا کیا دیکھا!

جنگ کراچی، ۱۰ دسمبر ۱۹۷۳ء

۶۴۔ میر مشتاقؔ دہلوی کی مرثیہ گوئی

العلم بمبئی، جون ۱۹۹۳ء

۶۵۔ عاشقؔ دہلوی کا ہندی مرثیہ

العلم بمبئی، جون ۱۹۹۳ء

۶۶۔ میر انیسؔ کا غیر مطبوعہ مرثیہ (ایک جائزہ)
(کھولا علم جو خسرو زریں کلاہ نے)

شیخ شوکت علی، کراچی، ۱۹۹۵ء

۶۷۔ مرزا ثاقبؔ لکھنوی اور ان کا غیر مطبوعہ کلام

طلوع افکار کراچی، ستمبر ۱۹۷۰ء

(ن)

۶۸۔ نواب محمد تقی ترقی

العلم بمبئی، فروری ۱۹۹۳ء

(و)

۶۹۔ واقعاتِ کربلا شعرائے اردو کی نظر میں

ارشاد کراچی، ۱۶، ۱ مارچ ۱۹۷۰ء

۷۰۔ وحید الحسن ہاشمی اور مرثیہ

القلم کراچی (تیسرا شمارہ) ۱۹۹۹ء

(ہ)

۷۱۔ ہائے فیض بھرتپوری

مجلّہ بیادِ فیض بھرتپوری، کراچی ۱۹۸۹ء

(ی)

۷۲۔ یورپ میں امام حسینؑ کی یاد (ہالینڈ، بلجیم، انگلینڈ کا سفرنامہ)

ارشاد کراچی، ۱۶، انومبر ۱۹۸۱ء

علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی
www.allamazameerakhtar.com
منجانب مرکز علوم اسلامیہ (کراچی)

١١٨١
اخبارات اور رسائل میں
ذکرِ ضمیر اختر

ذکرِ ضمیر اختر

علامہ ضمیر اختر نقوی کی شخصیت اور علمی و ادبی خدمات پر جو ادیب اور اسکالر تحقیقی مقالے لکھ رہے ہیں ان حضرات کے لئے مندرجہ ذیل کتب اور رسائل میں علامہ ضمیر اختر نقوی کا تذکرہ اور حوالہ جات موجود ہیں۔ یہ کتابیں ان کے کام میں معاون ہوں گی۔ تمام کتب کا اشاریہ حروف تہجی کے اعتبار سے ترتیب دیا گیا ہے۔

الف ممدودہ

۱۔ آلِ رضا کا فنِ غزل گوئی — ڈاکٹر شبیہ الحسن

سفینہ پبلی کیشنز لاہور، ۱۹۸۹ء

۲۔ آئینۂ حقیقت — سید امان علی نقوی شجر

شاہ ولایت اکیڈمی، کراچی، ۲۰۰۰ء

الف مقصورہ

۳۔ العلم (دوماہی) جلد:۳، شمارہ ۱ — علی جواد زیدی

العلم پبلی کیشنز، بمبئی، ۱۹۹۳

۴۔ العلم (دوماہی) جلد:۳، شمارہ ۲ — علی جواد زیدی

العلم پبلی کیشنز، بمبئی، ۱۹۹۳

۵۔ العلم (دو ماہی) جلد: ۳، شمارہ ۴ — علی جواد زیدی
العلم پبلی کیشنز، بمبئی ۱۹۹۴ء

۶۔ اردو مرثیے کی سرگزشت — ڈاکٹر اسد اریب
کاروانِ ادب، لاہور ۱۹۸۹ء

۷۔ اردو انیس نمبر (سہ ماہی) — مشفق خواجہ
انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی ۱۹۷۴ء

۸۔ اردو مرثیہ میر انیس کے بعد — ڈاکٹر سید طاہر حسین کاظمی
ایرانین آرٹ پرنٹرز، دہلی ۱۹۹۷ء

۹۔ اردو مرثیہ — ڈاکٹر شارب ردولوی
اردو اکادمی، دہلی ۱۹۹۱ء

۱۰۔ اردو مرثیہ اور پاکستان میں اس کی روایت — پروفیسر ایس جی عباس
اسلامک ریسرچ سینٹر، کراچی ۱۹۹۱ء

۱۱۔ انکل نظر — شادان دہلوی
سید اینڈ سید پبلشرز، کراچی ۱۹۹۵ء

۱۲۔ انیس نما — عبد القوی دسنوی
شعبۂ اردو سیفیہ کالج بھوپال ۱۹۷۴ء

۱۳۔ انیس ایک مطالعہ — ڈاکٹر اعجاز نقوی
مکتبہ میری لائبریری، لاہور ۱۹۸۸ء

۱۴۔ انیس (سوانح) — ڈاکٹر نیر مسعود
قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دہلی ۲۰۰۲ء

۱۵۔ انیس شناسی — پروفیسر گوپی چند نارنگ
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۱ء

۱۶۔ انیس شاعرِ انسانیت — کوثر نیازی
دبستانِ انیس، راولپنڈی، ۱۹۷۵ء

۱۷۔ اودھ میں اُردو مرثیے کا ارتقا — ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری
نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۸۱ء

۱۸۔ اوراقِ کربلا — سیّد اقبال حسین کاظمی
مرثیہ فاؤنڈیشن، کراچی، ۱۹۹۷ء

ب

۱۹۔ باقیاتِ انیس — ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری
محمدی پبلیشرز لکھنؤ، ۱۹۷۹ء

۲۰۔ باقیاتِ دبیر — ڈاکٹر اکبر حیدری کاشمیری
نظامی پریس لکھنؤ، ۱۹۹۲ء

۲۱۔ باقیاتِ آلِ رضا — ڈاکٹر سیّد شبیہ الحسن
الحسن پبلیکیشنز، لاہور، ۲۰۰۰

۲۲۔ بیسویں صدی اور جدید مرثیہ — ڈاکٹر ہلال نقوی
محمدی ٹرسٹ، کراچی، ۱۹۹۴ء

پ

۲۳۔ پیامِ عمل (انیس نمبر) — پروفیسر سیّد کوثر حسین (ایم اے)
انارکلی لاہور فروری ۱۹۷۴

ت

۲۴۔ تہذیبِ غم — ڈاکٹر اسد اریب
کتاب نگرستان، ۲۰۰۲ء

۲۵۔ تذکرہ و تاریخ کلاں پور — الحاج سید ظہور مہدی رضوی
محبان کلاں پور، کراچی، ۱۹۹۸ء

۲۶۔ تلاش و تحقیق — پروفیسر کاظم علی خاں
نظامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۹ء

۲۷۔ تلاشِ دبیر — پروفیسر کاظم علی خاں
نامی پریس، لکھنؤ، ۱۹۷۹ء

ث

۲۸۔ ثاقب لکھنوی (حیات اور شاعری) — ڈاکٹر ظفر الحسنین خیال لکھنوی
اردو پبلشنگ ہاؤس، لکھنؤ، ۱۹۸۳ء

ج

۲۹۔ جواہرِ دبیر — مرتضیٰ حسین فاضل لکھنوی
شیخ غلام علی اینڈ سنز لمیٹڈ، پبلشرز، لاہور، ۱۹۸۶ء

۳۰۔ جدید اُردو مرثیہ — ڈاکٹر محمد رضا کاظمی
مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۱ء

۳۱۔ جوش ملیح آبادی — خلیق انجم
انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی، ۱۹۹۲ء

۳۲۔ جوشؔ شناسی — پروفیسر کاظم علی خاں

شیعہ کالج، لکھنؤ، ۱۹۸۶ء

چ

۳۳۔ چاند کا قرض — ڈاکٹر پیارے جعفری

شیراز ادبی سوسائٹی، لکھنؤ، ۱۹۹۹ء

ح

۳۴۔ حالات و واقعات جناب قمرؔ — خیر النساء نازک اعظمی

محفوظ بک ایجنسی، کراچی، ۲۰۰۱ء

۳۵۔ حسین پر سلام — سید علی رضوی

فضلی سنز لمیٹڈ، کراچی، ۱۹۸۶ء

۳۶۔ حروفِ معلیٰ — صفدر حسین ڈوگر

ادارۂ القائم، لاہور، ۱۹۸۳ء

د

۳۷۔ دائرۃ المعارف الحسینیہ معجم المصنفات الحسینیۃ (الجزء الاول)، (محمد صادق محمد الکرباسی) (عربی)

مرکز الحسینی، لندن، ۱۹۹۹ء

۳۸۔ دبستانِ انیسؔ (یادگاری مجلہ)

نسیم پرنٹنگ پریس، راولپنڈی، ۱۹۷۳ء — مرتب: ڈاکٹر سبط حسن رضوی

۳۹۔ دفترِ دبیر — ڈاکٹر ہلال نقوی

محمدی ایجوکیشن اینڈ پبلی کیشنز، کراچی، ۱۹۹۵ء

۳۰۔ دُرِ یگانہ (مولانا سید عنایت حسین جلالوی) مرتب سلمان جلالوی

ابوالحسن اصفہانی روڈ، کراچی، ۱۹۹۵ء

۳۱۔ دہلوی مرثیہ گو (جلد اول) علی جواد زیدی

سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۶

۳۲۔ دہلوی مرثیہ گو (جلد دوم) علی جواد زیدی

مطبع سرفراز قومی پریس، لکھنؤ، ۱۹۸۷ء

۳۳۔ ذخیرۂ مجالس (حصہ چہارم) حکیم غلام حیدر کرار (نظر ثانی مولانا اعجاز حسین نقوی فاضل)

افتخار بک ڈپو، لاہور، ۱۹۹۳ء

ر

۳۴۔ رباعیاتِ انیس علی جواد زیدی

ترقی اردو بیورو، نئی دہلی، ۱۹۸۵ء

۳۵۔ رموزِ کلامِ انیس ڈاکٹر سید رضوان حیدر

کاشانۂ رضویہ، الہ آباد، انڈیا، ۱۹۹۷ء

۳۶۔ راجستھان میں اُردو مرثیہ ڈاکٹر سید یاد علی جعفری

نفیس آفسیٹ پریس، جے پور، ۱۹۹۹ء

۳۷۔ رفیقِ دلِ فگاراں ڈاکٹر عالیہ امام

مہران کلچرل رائٹرز گلڈ، کراچی ۱۹۹۳ء

رثائی ادب کراچی محمدی ٹرسٹ شائع کرتا ہے جس کے ایڈیٹر ڈاکٹر ہلال نقوی ہیں۔

مندرجہ ذیل شماروں میں علامہ ضمیر اختر نقوی کا تذکرہ موجود ہے۔

۳۸۔ رثائی ادب سہ ماہی کراچی (پہلا شمارہ) ۱۹۹۶ء

(مضمون: ضمیر اختر نقوی کے تحقیقی کارنامے از اکبر حیدری کشمیری)

۴۹۔ رثائی ادب سہ ماہی کراچی (دوسرا شمارہ)، ۱۹۹۶ء

(مضمون: ''ایک خط'' ضمیر اختر نقوی)

۵۰۔ رثائی ادب سہ ماہی کراچی (چوتھا شمارہ)، ۱۹۹۶ء

(مضمون: جوش کے مرثیوں کی ترتیب و تدوین، ضمیر اختر نقوی)

۵۱۔ رثائی ادب سہ ماہی کراچی (ساتواں شمارہ)، ۱۹۹۷ء

(تعزیتی خط وفات سید حسن انجم از ضمیر اختر نقوی)

(مضمون: پاکستان میں جدید مرثیے کی تنقید کے پچاس سال از ڈاکٹر محمد رضا کاظمی)

۵۲۔ رثائی ادب سہ ماہی کراچی (آٹھواں شمارہ)، ۱۹۹۷ء

(۱) کاظم علی خاں کا ایک خط (۲) میر انیس کے غیر مطبوعہ مرثیے کی تحقیق)

۵۳۔ رثائی ادب سہ ماہی کراچی (انیس نمبر) ۱۹۹۸ء

(مضمون: میر انیس کا غیر مطبوعہ مرثیہ از ضمیر اختر نقوی)

۵۴۔ رثائی ادب سہ ماہی کراچی (دسواں شمارہ) ۱۹۹۸ء

(دیکھیے خطوط۔ عاشور کاظمی، ڈاکٹر اکبر حیدری، ڈاکٹر فرمان فتح پوری، ڈاکٹر نیر مسعود، قاصد سرسوی، رشید احسن زیدی، نصیر ترابی، محمد حسین رضوی، ہلال نقوی)

۵۵۔ رثائی ادب سہ ماہی کراچی (گیارھواں شمارہ)، ۱۹۹۸ء

(خطوط: ڈاکٹر اکبر حیدری، مضمون: جوش کا مطبوعہ مرثیہ ''پانی'' اغلاط سے متعلق چند وضاحتیں از سید عباس حسین کاظمی، راولپنڈی)

۵۶۔ رثائی ادب سہ ماہی کراچی (بارھواں شمارہ)، ۱۹۹۸ء

(مضمون: آغا ذہین کی مرثیہ گوئی و سلام نگاری از ضمیر اختر نقوی)

۵۷۔ ریثائی ادب سہ ماہی کراچی (تیرھواں شمارہ)، ۱۹۹۹ء

(خطوط: افتخار عارف، عظیم امروہوی، علی احمد دانش، علی اختر کمیل)

۵۸۔ ریثائی ادب سہ ماہی کراچی (چودھواں شمارہ)، ۱۹۹۹ء

(خطوط: قیصر نجفی)

۵۹۔ ریثائی ادب سہ ماہی کراچی (۱۷واں شمارہ)، ۲۰۰۰ء

(ڈاکٹر نیر مسعود کا انٹرویو، پدم شری علی جواد زیدی کا خط، آل رضا مرحوم پر مضمون از ڈاکٹر شبیہ الحسن)

۶۰۔ ریثائی ادب سہ ماہی کراچی (۱۸واں شمارہ)، ۲۰۰۰ء

(ضمیر اختر نقوی کی کتاب اردو مرثیہ پاکستان میں از پروفیسر کرار حسین)

ز

۶۱۔ زنجیر غم — سید قمر عباس موسوی

طلوع افکار، کراچی، ۲۰۰۰ء

س

۶۲۔ سانحہ کربلا بطور شعری استعارہ — پروفیسر گوپی چند نارنگ

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۶ء

۶۳۔ سرفراز لکھنؤ (محرم نمبر) — مصطفےٰ حسن رضوی

لکھنؤ، ۱۹۷۶ء

۶۴۔ سلامت علی دبیرؔ (شاعر اعظم) — ڈاکٹر اکبر حیدری کشمیری

اردو پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۷۶ء

۶۵۔ سیّد جعفر طاہر — انور سدید

(ماہنامہ اوراق، لاہور، مئی ۱۹۸۴ء)

ش

۶۶۔ شاعر آخر الزماں جوشؔ ملیح آبادی — ڈاکٹر فضل امام

موڈرن پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء

۶۷۔ شورِ ماتم — محرم لکھنوی

سیکریٹری انجمن محافظ اردو، کراچی، ۱۳۰۶ھ

۶۸۔ شاخِ طوبیٰ — روشن علی عشرتؔ

دبستانِ آرزو، پاکستان، ۱۹۹۷ء

۶۹۔ شیعہ ہفت روزہ لاہور (محرم دوانیس نمبر) — مدیر: صادق عرفانی

ایم رضا علی پبلشرز، لاہور، ۱۹۷۲ء

ص

۷۰۔ صحیفۂ مدحت — ساحرؔ لکھنوی

ایجوکیشنل ایڈز، کراچی، ۱۹۹۷

ظ

۷۱۔ ظہیر دہلوی حیات و فن — مختار عظیم

نصرت پبلشرز، لکھنؤ، ۱۹۹۰

غ

۷۲۔ غیر مسلم مرثیہ نگار — سید امجد حسین

اسکائی لائن پرنٹرس، لکھنؤ، ۱۹۹۵

۷۳۔ غمِ جاوداں — قمر جلالوی

شیخ شوکت علی اینڈ سنز، کراچی، ۱۹۷۳ء

ف

۷۴۔ فیض بھرت پوری (معاصرین کی نظر میں) — ادارۂ فیض ادب، کراچی

عالمگیر بکڈپو ناظم آباد نمبر ۲، کراچی، ۱۹۸۹ء

گ

۷۵۔ گریۂ فرات — پروفیسر سردار نقوی

ادارۂ یادگار یاور، کراچی، ۱۹۹۵ء

م

۷۶۔ میر انیس (شمارہ۔۸) — ڈاکٹر شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر مرتضیٰ اختر جعفری

شاہین برقی پریس، پشاور، ۱۹۷۴ء

۷۷۔ مرزا دبیر نمبر (ماہنامہ کتاب نما) — عبدالقوی دسنوی

مکتبۂ جامعہ، دہلی، ۱۹۷۷ء

۷۸۔ مرزا سلامت علی دبیر — ڈاکٹر مرزا محمد زماں آزردہ

مرزا پبلی کیشنز، سری نگر کشمیر، ۱۹۸۱ء

۷۹۔ میر انیس کی اقلیم سخن — انور سدید

اردو رائٹرس، الٰہ آباد، ۱۹۸۶ء

۸۰۔ میر انیس کی خوشنویسی — مولانا آغا مہدی لکھنوی

مطبوعہ شہید لاہور کربلا نمبر ۶، ۱۹۷۶ء

۸۱۔ مرثیہ نظم کی اصناف میں جدید مرثیہ اور آغا سکندر مہدی — سید عاشور کاظمی

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۹۶ء

۸۲۔	میر انیس کا مطبوعہ لیکن غیر مطبوعہ مرثیہ شیخ شوکت علی اینڈ سنز، کراچی، ۱۹۹۵ء	پروفیسر ڈاکٹر سید مظفر حسین کاظمی
۸۳۔	مرثیہ (نسل اشرف) مرکز علوم اسلامیہ، کراچی، ۱۹۹۶ء	سید ماجد رضا عابدی
۸۴۔	مرثیہ نگاران امروہہ الاتحاد کمیٹی رجسٹرڈ، کراچی، ۱۹۸۴ء	عظیم امروہوی
۸۵۔	مرثیہ نگاران اردو مرزا امیر علی جونپوری، لکھنؤ، ۱۹۸۵ء	مرزا امیر علی بیگ جونپوری
۸۶۔	مراثی فیض (جلد دوم) عالمگیر پبلیکیشنز، کراچی، ۱۹۷۹ء	جعفر زیدی
۸۷۔	مراثی نسیم (جلد سوم) اظہار سنز، لاہور، ۱۹۸۶ء	نسیم امروہوی
۸۸۔	میرے غمکدے میں فیض الاسلام پرنٹنگ پریس، راولپنڈی، ۱۹۹۲ء	سید فیضی
۸۹۔	ماہ نو (دبیر نمبر) ادارہ مطبوعات پاکستان، راولپنڈی، ۱۹۷۵ء	مدیر: فضل قدیر
۹۰۔	ماہ نو (انیس نمبر) مطبوعات پاکستان، کراچی، ۱۹۷۴ء	مدیر: فضل قدیر
۹۱۔	میر خورشید علی نفیس (حیات اور شاعری) دانش محل، لکھنؤ، ۱۹۹۵ء	سبطین فاطمہ رضوی

۹۲۔ مرزا غالب اور مفتی میر محمد عباس — ڈاکٹر کاظم علی خاں
غیر مطبوعہ مقالہ ۱۹۹۵ء

ن

۹۳۔ نماز سخن — قسیم ابن قسیم امروہوی
اراکین بزم قاسمی، کراچی، ۱۹۹۸ء

۹۴۔ نجم آفندی۔ فکر و فن — سید نواحسن زیدی
الحسن پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۰ء

۹۵۔ نقوش (میر انیس نمبر) — محمد طفیل
ادارۂ فروغ اردو، لاہور، ۱۹۸۱ء

و

۹۶۔ واجد علی شاہ ان کی شاعری اور مرثیے — پروفیسر ڈاکٹر سید مظفر حسین کاظمی
سندھ آفسٹ پرنٹرز، کراچی، ۹۲۔۱۹۹۱ء

ھ

۹۷۔ ہم قلم سہ ماہی، کراچی (جوش نمبر) — نقوش نقوی
ابن حسن پریس، کراچی، ۱۹۹۱ء

۹۸۔ ھما اردو ڈائجسٹ (شاعر انقلاب نمبر) — خالد مصطفیٰ صدیقی
سنٹرل روڈ جھنگپورہ، نئی دہلی، ۱۹۸۲ء

ی

۹۹۔ یادگار انیس — مرتبہ: ضمیر اختر نقوی
انجمن یادگار انیس، کراچی، ۱۹۷۱ء

کوثر نقوی:

عکسِ ضمیر

بے شک ضمیر اختر اِک ایسا خطیب ہے
جس کا ادب نہال ہے، شجرہ نجیب ہے
بہرِ عدو، کلام میں گرمی عجیب ہے
روئے سخن کو حُسنِ لطافت نصیب ہے
اعجاز ہے، تضاد کے سنگم کو دیکھیے
یکجا مزاج شعلہ و شبنم کو دیکھیے

ہر سانس خُلد کا ہے قبالہ لیئے ہوئے
ہے زیست، پُرشکوہ حوالہ لیئے ہوئے
مہرِ سخن ہے، فکر کا ہالہ لیئے ہوئے
یوں زیرِ تک ہیں، اوج ہمالہ لیئے ہوئے
مقصود کر لیا ہے جنابِ امیر کو
معنی ملے ہوئے ہیں حیاتِ ضمیر کو

دل میں نجف ہے اس کے، دل اس کا نجف میں ہے
خورشیدِ فکر، اس لیے بُرجِ شرف میں ہے
آگے ہے اس سے اور نہ کوئی اس کی صف میں ہے
ہر کان موتیوں کی، فقط اک صدف میں ہے
کیسے بھرا ہوا ہو، نہ کاسہ ضمیر کا
لطف و کرم ہے اس پہ، جنابِ امیر کا

ہاں ہاں ضمیر اختر اک ایسا ہے ذی ہنر
قائل نظر کا اس کی ہے، ہر صاحبِ نظر
اتنا لکھا ہے جوشؔ و انیسؔ و دبیرؔ پر
پی ایچ ڈی کے جس سے مقالے ہیں مختصر
تحریر بھی، زباں کی روانی سے کم نہیں
برش قلم کی، تیغ کے پانی سے کم نہیں

اس کے رقیب، اس کا نگوں سر نہ کرسکے
قد اپنا، اس کے قد کے برابر نہ کرسکے
کاوش سے، قطرے شور کو سمندر نہ کرسکے
لرزیدہ اس کو، بغض کے خنجر نہ کرسکے
مقصد کسی بھی طور، یہ حاصل ہوا ہے کیا
فولاد، موم سے کبھی گھائل ہوا ہے کیا

بے شک ضمیر اختر اک ایسا ہے خوش چلن
ہر ایک انجمن میں ہے ، مقبولِ انجمن
کوثر سا قطرہ ، اِس کا جو ہو موضوعِ سخن
فی الاصل کوثر اس کو کہیں صاحبانِ فن
جنبش دے گر ، یہ اپنی زبانِ خطاب کو
یہ ناطقہ ، کہ بحر بنا دے حباب کو

maablib.org

اشاریہ (افراد و اشخاص)

بہ ترتیبِ حروفِ تہجی

کتاب "ضمیرِ حیات"

(آ)

آبرو...۱۰۶

آتش (خواجہ حیدر علی)...۲۵۹، ۲۶۶، ۲۶۸، ۳۲۸، ۳۳۳، ۳۳۵، ۳۸۷، ۴۲۳، ۴۳۲، ۵۲۷، ۵۵۰، ۹۶۳

آرزو لکھنوی ... ۲۵۹، ۲۶۶، ۲۷۱، ۳۲۸، ۳۹۳، ۴۲۳، ۷۹۷، ۹۶۳

آزاد دہلوی...۱۰۰۳

آزاد (محمد حسین)...۸۴۷، ۱۰۰۸

آصف رضا آصف...۹۰۳

آصف عباس...۱۱۶۵

آغا ذہین...۹۳۳

آغا روحی (مولانا)......۱۳۰، ۵۶۰، ۶۸۵، ۶۸۸، ۶۹۲، ۱۰۲۷، ۱۱۵۶، ۱۱۶۵، ۱۰۶۸، ۱۱۵۹

آغا سروش (پروفیسر)...۷۸۶، ۱۱۲۵،

آغا کمیل...۷۸۶

آغا شاعر قزلباش...۱۰۶

آغا عبدالحسن سرحدی...۸۵۰، ۱۰۳۳

آغا محمد باقر...۳۲۸

آفتاب حیدر بلگرامی (مولانا)...۱۰۶۸، ۱۱۳۶

آفتاب علی کاظمی (سوز خوان)...۸۶

آل محمد رزمی...۵، ۱۰، ۱۱، ۱۳، ۱۵، ۱۶، ۳۲، ۴۰، ۴۳، ۴۴، ۴۷، ۹۶، ۱۳۳، ۳۱۱، ۳۱۵، ۳۲۳، ۳۳۴، ۴۱۰، ۴۷۶، ۴۷۸، ۵۱۰، ۵۵۱، ۵۸۳، ۶۳۰، ۷۳۶، ۷۸۰، ۷۸۱، ۷۸۹، ۷۹۶، ۸۱۹، ۸۳۸، ۸۴۵، ۹۵۸، ۱۰۶۸، ۱۱۳۸

آل رضا (سید)... ۳۹، ۸۵، ۱۰۶، ۱۳۶، ۱۳۸، ۱۹۱، ۱۹۳، ۱۹۵، ۲۰۹، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۲۳، ۲۳۰، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۴۵، ۲۴۹، ۲۷۳، ۲۷۵، ۵۹۷، ۶۲۳، ۷۰۰، ۹۶۲، ۹۹۰، ۱۱۱۳، ۱۰۶۷، ۱۰۷۶

آر کے نیرن...۵۶۳

(ا)

ابرار حسین پاروی (مولانا)...۱۱۹، ۹۸۷

ابرار عابد...۷۸۶

ابوالخیر کشفی...۴۵۳

ابوسعید ابوالخیر...۴۴۳

ابوالکلام آزاد...۳۹۸، ۶۳۹، ۹۸۷

ابوالکلام قاسمی (پروفیسر)...۲۸۳، ۸۵۳

ابن حسن جارچوی (مولانا)...۱۳۵، ۳۰۰، ۷۹۷،

ابن حسن قیصر...۹۸۷

ابن حسن نجفی (مولانا)...۱۳۵

ابن حسن رضوی (صوفی سید)...۱۰، ۳۰، ۳۲

ابن خلدون...۱۱۳۶

ابن صفی...۱۲۸

ابوالامتیاز ع۔ س۔ مسلم...۸۵۸

ابواللیث صدیقی (ڈاکٹر)...۳۹۲، ۵۳۸

اثیم جرولی (شاگرد دبیر)...۴۳۵

اجلال حیدر زیدی...۱۰۱۳

احتشام حسین (پروفیسر)...۱۴۳، ۳۳۱، ۳۳۸، ۳۴۸، ۹۴۳

احراز نقوی (ڈاکٹر)...۳۴۳

احسان علی احسان...۱۰۲۱

احسان لکھنوی...۱۰۶، ۳۲۵

احمد رئیس...۱۰۸۳

احمد زین الدین...۳۸

احمد عباس (مولانا مرزا)...۱۳۵

احمد ندیم قاسمی...۶۳۷، ۱۰۶۷، ۱۰۹۸

ابو نصر قطب الدین...۴۴۳

احمد فراز...۵۳۸

احمد نوید...۱۰۳

احسن جائسی...۱۱۵۷

احسن طباطبائی...۱۱۵۷

احسن فاروقی (ڈاکٹر محمد)...۵۸، ۱۳۶، ۳۳۸، ۷۸۷، ۱۰۱۵، ۱۰۶۸، ۱۱۵۹

احسن لکھنوی...۱۰۱۰، ۱۰۹۷، ۱۱۳۰

اختر شیرانی...۳۳۷

اختر وصی علی (سوزخوان)...۸۶

اخلاق حسین عارف (ڈاکٹر)...۱۰۶۸، ۱۱۳۹

اخلاق مہدی زید پوری (مولانا)...۱۱۹

ادیب الہندی (مولانا)...۸۳۰

ادیب کیفی...۱۵، ۵۰، ۵۶۵

ارتضیٰ حسین رضوی...۷۷

ازل لکھنوی (آغا حسن)...۶۱۷، ۸۵۵

اسد القادری (مولانا)...۴۹۱

ارشاد امروہوی...۱۰۶۸، ۱۱۳۶

ارم لکھنوی.....۷۸۷

اپشر.....۷۰۳، ۱۰۳۷، ۱۰۳۹

اسد اریب (ڈاکٹر)...۱۰، ۲۰، ۲۱، ۲۷۰، ۳۵۶، ۴۲۸، ۸۵۹، ۱۰۱۵، ۱۰۵۳، ۱۰۹۱

اسد جعفری.....۷۷

اسد جوہری (علامہ)...۱۱۵۸

اسد عباس نقوی...۶، ۷۷، ۱۶۹

اسکندر مرزا (مرحوم صدرِ پاکستان)...۴۳۶

اسلم محمود.....۱۱۶۵

اسیر لکھنوی...۲۵۹، ۲۶۶، ۳۲۸، ۴۲۳

اسیر فیض آبادی...۱۱۳۹

اصغر گونڈوی...۴۷۱

اصغر نقوی (مصطفےٰ آباد)...۷۸۰، ۸۵۳

اطہر رضا بلگرامی...۸۳۶، ۸۵۷

اطہر برلاس (مرزا علی)...۷، ۳۳، ۳۹۴، ۴۰۶، ۳۵۶، ۹۸۶، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶،

اعتزاز احسن (سابق وزیر قانون)...۱۹۰

اعجاز ثقلین بخاری...۵۵، ۹۰

اعجاز حسین (ڈاکٹر)...۴۲۸

اعجاز رحمانی...۳۱۵

افتخار عارف...۵۳۴، ۸۱۶، ۸۴۳، ۱۰۶۸، ۱۱۳۴

افسردہ، مرزا پنجا علی بیگ...۱۰۶، ۴۲۵

افسوس، شیر علی...۱۰۶، ۴۲۴

افضال احمد (ڈاکٹر)...۱۰۶۷، ۱۱۰۹

افگار دہلوی...۴۲۳، ۴۲۴

اقبال امام (محسن بھائی)...۴۳۶

اقبال حسین اقبال...۴۲، ۵۴، ۸۶۰، ۹۱۱

اقبال مسعود...۹۸۸

اقبال ظفر (فرزند مانی جائسی) ۴۲، ۵۴، ۴۲۸، ۸۱۳، ۸۴۷

اقبال کاظمی...۴۰، ۲۵، ۳۵۶، ۴۲۳، ۴۲۸، ۶۴۲، ۸۱۳، ۱۰۲۵، ۱۰۳۶، ۱۰۶۷، ۱۱۱۳

اکبر اعظم (بادشاہ)...۱۳۳، ۴۳۱

اکبر الٰہ آبادی...۲۲۶، ۳۳۰، ۳۹۳، ۴۲۵، ۵۰۳

اکبر حیدری کاشمیری (ڈاکٹر)...۶، ۱۶، ۲۷، ۳۳، ۴۳، ۵۱، ۵۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۹۸، ۳۰۵، ۲۶۳، ۳۲۸، ۳۵۶، ۶۱۳، ۶۹۳، ۸۳۰، ۸۵۷، ۹۸۰، ۹۸۳، ۹۹۸، ۱۰۱۳، ۱۰۱۷، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۸، ۱۱۳۹، ۱۰۶۳، ۱۰۸۶، ۱۰۹۱، ۱۱۰۰

اکبر نقوی...۱۰۴۳

اکمال لکھنوی...۱۱۴۷

الطاف علی بریلوی (سید)...۱۰۵۷، ۱۰۹۰

امانت لکھنوی...۲۲۶، ۳۲۸، ۳۴۳، ۱۱۳۰

امان دہلوی...۴۳۳

امجد علی اشہری...۱۰۹۷

امجد علی خاں...۱۱۰۳، ۱۰۶۷، ۱۱۳۳

امجد علی شاہ (بادشاہ اودھ)...۱۰۰۶

امداد امام اثر...۶۸۳، ۹۷۹، ۱۰۰۳

امداد حسین لکھنوی (مولوی شاہ حسن)...۱۱۵۶،

اُمید فاضلی...۲۳۲

امراؤ طارق...۸۳۰

امیر الدولہ راجا امیر حسن خاں...۱۰۰۵

امیر زبیر رضوی (لندن)...۸۳۵

امیر خسرو...۵۷، ۲۶۶، ۳۲۵، ۳۲۶، ۳۲۸، ۳۳۰، ۳۹۵، ۳۹۶، ۴۳۵، ۵۰۲، ۹۲۷، ۱۰۲۳، ۱۱۳۶

امیر علی جونپوری...۳۹۱، ۶۹۳، ۱۰۶۸، ۱۱۳۹

امیر مینائی...۳۳۱، ۳۹۳، ۴۴۳، ۵۲۸

انتظار حسین...۱۳، ۱۵، ۴۷، ۵۰، ۳۳۸، ۳۵۶، ۳۸۴، ۵۵۶، ۷۹۱، ۱۰۸۹

انجم وسیم احسن...۴۳۲، ۷۲۵، ۷۳۶، ۷۷۸، ۱۰۳۹، ۱۰۶۳

اُنس (میر)...۱۰۶، ۲۰۹، ۲۸۰، ۳۲۵، ۳۸۷، ۳۸۹، ۳۹۳، ۵۰۰، ۵۰۵، ۵۰۷، ۵۲۰، ۸۳۶، ۸۳۹، ۹۵۶، ۹۹۳، ۱۰۰۳

انشاء اللہ خاں انشاء...۲۵۹، ۲۶۶، ۳۲۸، ۳۴۴، ۳۸۷، ۱۰۵۹، ۱۱۰۰

انصار حسین (شیخ)...۱۵، ۵۰، ۵۹۳، ۶۴۲، ۷۸۶

انصار صدیقی...۱۱۳۳

انور سدید...۳۹۸، ۴۳۶، ۴۵۶، ۱۰۰۱، ۱۰۶۷، ۱۰۸۴

انور شعور...۱۰۶۸، ۱۱۵۹

انیس (میر)...۳۷، ۳۸، ۴۰، ۴۸، ۵۱، ۵۷، ۵۸، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۱۵، ۱۳۶، ۱۸۵، ۱۸۱، ۱۸۴، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۹۱، ۱۹۵، ۱۹۷، ۲۰۲، ۲۰۳، ۲۰۵، ۲۱۱، ۲۱۳، ۲۱۴، ۲۱۵، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۲۱، ۲۲۵، ۲۲۷، ۲۲۹، ۲۳۶، ۲۴۳، ۲۵۳، ۲۵۸، ۲۷۰، ۲۸۲، ۲۹۳، ۳۱۹، ۳۲۷، ۳۳۳، ۳۳۴، ۳۳۵، ۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۶، ۳۵۶، ۳۵۷، ۳۶۸، ۳۶۹، ۳۷۹، ۳۸۱، ۳۸۴، ۳۸۶، ۳۸۷، ۳۹۱، ۳۹۳، ۴۰۲، ۴۱۶، ۴۱۷، ۴۲۲، ۴۳۳، ۴۳۵، ۴۳۸، ۴۵۳، ۴۶۳، ۴۶۴، ۴۷۰، ۴۷۹، ۴۸۰، ۴۸۲، ۴۸۳، ۴۸۴ سے ۴۸۷ تک ۴۸۹، ۴۹۰، ۴۹۱، ۴۹۲، ۴۹۳، ۴۹۶، ۴۹۷، ۴۹۸، ۵۰۰، ۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۵، ۵۰۶، ۵۰۷، ۵۰۸، ۵۱۱، ۵۱۲، ۵۱۳، ۵۱۵، ۵۱۶، ۵۱۷، ۵۱۸، ۵۱۹، ۵۲۰، ۵۲۱، ۵۲۳ سے ۵۲۶ تک، ۵۲۸، سے ۵۲۹ تک ۵۳۳، ۵۳۴، ۵۵۵، ۵۵۶، ۵۵۷، ۵۵۸، ۵۵۹، سے ۵۶۶ تک ۵۶۸ سے ۵۷۳ تک ۵۷۶ سے ۵۸۰ تک ۵۸۲، ۵۸۳، سے ۵۹۱ تک ۶۰۳، ۶۱۴، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۱۹، ۶۲۳، ۶۲۶، ۶۲۸، ۶۲۵، ۶۲۷، ۶۳۱، ۶۳۵، ۶۳۶، ۶۷۷، ۶۷۸، ۶۷۹، ۶۸۴، ۶۸۷، ۶۸۹، ۶۹۵، ۶۹۶، ۶۹۷، ۶۹۹، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۰۲ سے ۷۱۷ تک ۷۲۷، ۷۳۰، ۷۳۱، ۷۳۲، ۷۳۰، ۷۳۶، ۷۸۰، ۷۸۷، ۷۸۸، ۷۹۲، ۷۹۳، ۷۹۸، ۷۹۹، ۸۰۳، ۸۰۷، ۸۱۰، ۸۱۱، ۸۱۸، ۸۲۲، ۸۲۷، ۸۳۱، ۸۳۵، ۸۳۶، ۸۳۷، ۸۴۳، ۸۴۵، ۸۴۸، ۸۴۹، ۸۵۰، ۸۵۱، ۸۵۴، ۸۵۵، ۹۳۰، ۹۵۷، ۹۵۹، ۹۶۰، ۹۶۲، ۹۶۳، ۹۶۴، ۹۶۶، ۹۶۷، ۹۷۱، ۹۷۲، ۹۷۳، ۹۷۶، ۹۷۹، ۹۸۰، ۹۸۱، ۹۸۳، ۹۸۵، ۹۸۶، ۹۸۸، ۹۹۰، ۹۹۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۱،

۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۰۵، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸،
۱۰۰۹، ۱۰۱۰، ۱۰۱۱، ۱۰۱۲، ۱۰۱۳، ۱۰۱۷، ۱۰۱۸،
۱۰۲۱، ۱۰۲۴، ۱۰۲۵، ۱۰۳۰، ۱۰۳۱، ۱۰۳۲،
۱۰۳۳، ۱۰۳۶، ۱۰۳۸، ۱۰۴۰، ۱۰۴۱، ۱۰۴۹،
۱۰۵۲، ۱۰۵۳، ۱۰۵۴، ۱۰۵۶، ۱۰۵۹، ۱۰۶۳،
۱۰۶۴، ۱۰۷۷، ۱۰۷۸، ۱۰۸۲، ۱۰۸۳، ۱۰۸۴،
۱۰۸۸، ۱۰۸۹، ۱۰۹۰، ۱۰۹۱، ۱۰۹۲، ۱۰۹۳،
۱۰۹۶، ۱۱۰۰، ۱۱۰۳، ۱۱۰۴، ۱۱۰۵، ۱۱۰۷، ۱۱۰۸،
۱۱۰۹، ۱۱۱۳، ۱۱۱۶، ۱۱۱۷۔۱۱۲۰، ۱۱۲۵، ۱۱۲۶،
۱۱۲۸، ۱۱۲۹، ۱۱۳۸، ۱۱۵۰، ۱۱۵۳، ۱۱۵۹، ۱۱۶۲،

انیس اشفاق (ڈاکٹر)...۷۹

انیس حسن کاظمی...۷۷

انیق احمد...۷۸

اوج (مرزا)...۱۸۶، ۲۰۹، ۲۳۱، ۲۳۳،
۳۴۵، ۱۰۱۵، ۱۱۰۱، ۱۱۳۱

(ب)

بادشاہ نصیر الدین حیدر (شاہِ اودھ)...۹۵۳

بابر علی خاں ثاقب...۱۰۶۸، ۱۱۴۷

باقر حسن (مولانا)...۷۸۷، ۸۴۴

بتول بیگم...۱۰۰۵

بحر لکھنوی (شیخ امداد علی)...۹۵۵

برق لکھنوی...۲۶۶، ۳۲۸، ۳۴۴

برٹرینڈ رسل...۵۱۰

بشیر انصاری (مولانا)...۱۳۵، ۱۷۰

بشیر ناظم...۸۵۲

بقا دہلوی...۳۴۴

بندرا ناگے...۳۶۴

بنیاد تیموری...۷۸۶

بو علی شاہ قلندر...۳۴۴

بہادر شاہ ظفر...۲۵۹، ۲۶۶، ۳۲۸، ۱۰۴۹، ۱۰۶۴

بیخود موہانی...۲۵۹، ۲۶۶، ۳۴۴

بیان دہلوی...۳۴۴، ۹۲۵

بیان میرٹھی...۱۱۳۰

بیدار دہلوی...۳۴۴

بیرم خاں...۳۴۴

(پ)

پرویز بلگرامی...۱۲، ۳۰، ۸۳، ۳۶۹

پرویز ممتاز شیخ...۱۰۶۸، ۱۱۳۵

پروین نقوی...۳۱، ۱۱۵، ۳۲۸

پنڈت گرداس آچاریہ (ہندو پنڈت)...۱۷۸،

پنڈت شیو نرائن...۳۹۰

پنڈت نیک رام (مولانا)...۱۳۵

پیارعلی الانت...۱۳۶

پیارے نواب صاحب...۱۰۰۵

پیر آصف علی شاہ گیلانی (مولانا)...۷۶،
۱۰۶۱، ۱۱۱۵

پیکر جعفری...۸۲۰

(ت)

تابش دہلوی...۱۰۶۸، ۱۱۳۲

تاثیر لکھنوی...۲۱، ۵۴

تاجدار بیو...۹۵۱

تاجدار عادل...۱۱۳۲

تجسم نواز احمد...۲۸، ۶۱، ۱۰۵۰

تجمل حیدر کملا (شیخ)...۱۱۳۵

تجمل لکھنوی (محمد اعظم)...۹۵۳

تحسین سروری...۱۰۵۵، ۱۰۸۱

ترقی لکھنوی (نواب محمد تقی خاں)...۹۵۲، ۹۵۳

تقی سجاد عابدی...۵۸۸

تسلیم دہلوی...۳۴۳

تنویر احمد علوی (ڈاکٹر)...۱۲۸

تنویر نقوی (سید)...۳۱، ۱۵، ۱۱۳۲، ۱۱۳۰، ۱۱۳۷

تسبیحی (آقائے) ایرانی دانشور...۱۲۸

تسنیم حسین زیدی...۱۰۶۸، ۱۱۳۸

تشفی نواب باقر علی خاں...۳۲۵

تشنہ (میرزا)...۶۸۷، ۱۱۳۳

تقی عابدی (ڈاکٹر)...۱۰۶۸، ۱۱۳۱

تلسی داس...۵۱۰

تہذیب سجاد (ہمشیرہ سجاد باقر رضوی)...۱۰۵۸، ۱۱۹۳

تیمور (بادشاہ)...۳۴۳، ۷۳۲

(ٹ)

ٹامس کارلائل...۳۱۹

ٹائن بی...۱۱۳۶

ٹی ایس ایلیٹ...۵۱۰

ٹیگور، رابندر ناتھ...۵۱۰، ۹۳۲

ٹیپو سلطان...۷۳۲

(ث)

ثابت علی شاہ...۳۲۷

ثابت لکھنوی...۳۲۵

ثاقب لکھنوی...۲۶۶، ۲۷۱، ۳۲۸، ۳۹۳، ۳۹۵، ۹۶۲، ۳۲۵

ثمر بلوری...۱۰۹۹

ثناء الحق صدیقی...۱۳، ۵۵۰

(ج)

جامی (ملا)...۲۷۶، ۲۷۹، ۳۶۵، ۹۲۳، ۱۱۳۶

جارج جرداق...۳۱۹

جبران خلیل...۳۱۹

جامی ردولوی...۳۰۷، ۳۱۳، ۳۵۶

جاوید عباس جعفری...۳۶۰۶، ۷۷، ۱۵۱

جاوید مہدی...۶۹۳

جبار علی کل...۳۲۳

جرأت قلندر بخش...۱۰۶، ۲۵۹، ۲۶۶، ۳۲۸،
۳۸۷، ۴۲۳، ۹۳۲، ۹۵۳

جعفر رضا (ڈاکٹر)...۲۰، ۷۹، ۸۰۰، ۸۵۸

جعفر علی حسرت دہلوی...۱۰۶، ۳۲۳

جعفر علی خاں اثر لکھنوی...۳۳۲، ۱۱۵۷

جعفر زیدی...۳۰۳

جعفر طاہر...۲۳۶، ۳۲۵، ۱۰۹۳

جگر مرادآبادی...۲۱۳، ۲۷۱

جگن ناتھ آزاد...۲۶، ۳۳، ۳۸، ۱۳۰،
۱۸۵، ۳۵۶، ۹۷۰

جلال اصغر (سید)...۳۱

جلال الدین سرخ بخاری (سید)...۲۸۰، ۳۲۳

جلال لکھنوی...۳۲۳، ۹۹۲

جلالی (آیت اللہ)...۱۲۸

جلیس (میر اکو صاحب)...۳۸۷، ۵۰۰، ۵۰۵،
۵۰۷، ۵۲۰

جلیل (میر فرزند حسن)...۳۸۷، ۳۹۰، ۵۰۰،
۵۰۵، ۵۲۰

جمال الدین اصفہانی...۳۱۹

جمیل لکھنوی (آل میر انیس)...۳۸۹

جمیل احمد رضوی (ڈاکٹر)...۹، ۱۳، ۲۰، ۳۱، ۳۷،
۲۶۵، ۳۵۶، ۳۸۵، ۸۳۱

جمیل جالبی (ڈاکٹر)...۸، ۳۹، ۲۳۵، ۳۵۶،
۴۳۸، ۱۰۶۹، ۱۰۸۳

جمیل مظہری...۱۰۶، ۳۱۹، ۳۲۳، ۳۳۵، ۳۳۹،
۳۴۷، ۵۹۷، ۱۱۳۰

جوش ملیح آبادی...۳۰، ۳۳، ۳۸، ۴۰،
۵۱، ۵۴، ۵۸، ۶۱، ۷۱، ۷۲، ۷۳، ۱۰۵، ۱۰۶،
۱۲۲، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۵۹، ۱۸۵، ۱۹۱، ۱۹۹، ۲۱۱،
۲۱۳، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۱۹، ۲۲۲، ۲۳۰، ۲۳۲،
۲۳۳، ۲۴۰، ۲۴۱، ۲۴۳، ۲۴۵، ۲۴۷، ۲۴۹،
۲۴۴، ۲۵۳، ۲۵۸، ۲۶۶، ۲۷۶، ۲۸۰، ۲۹۳،
۳۰۰، ۳۳۳، ۳۳۵، ۳۳۷، ۳۳۹، ۳۵۶،
۳۵۷، ۳۷۳، ۳۷۸، ۳۸۲، ۴۰۲، ۴۱۷، ۴۲۲،
۴۲۵، ۴۲۹، ۴۳۰، ۴۵۵، ۴۹۳، ۴۹۴، ۴۹۹،
۵۰۲، ۵۰۳، ۵۰۶، ۵۲۳، ۵۵۷، ۵۸۱،
۵۹۵، ۵۹۶، ۵۹۷، ۶۰۰، ۶۰۲، ۶۰۳ سے
۶۳۱، ۶۴۷، ۶۸۲، ۷۰۰، ۷۰۱، ۷۲۵، ۷۲۶،
۷۷۸، ۹۳۰، ۹۵۸، ۹۶۰، ۹۶۶، ۹۹۰، ۱۰۲۰،
۱۰۴۱، ۱۰۴۲، ۱۰۸۰، ۱۱۲۷، ۱۰۶۰، ۱۰۷۵

جون ایلیا...۴۳۹، ۷۸۶، ۱۱۳۸

جوہری (آیت اللہ) ۹۴۷

جوہر (مولانا شیخ محمد مصطفیٰ)...۷۵، ۱۲۵

جہانیاں جہاں گشت...۳۲۳

جی الانہ...۱۰۳۳، ۱۰۳۷، ۱۰۳۸

جیمس آرمسٹرانگ...۱۰۶۹، ۱۱۳۰

(چ)

چراغ دہلی...۳۲۳

چکبست لکھنوی...۹۹۲، ۱۰۰۲

(ح)

حاتم علوی...۱۰۶۹، ۱۱۵۳

حافظ شیرازی...۲۷۶، ۲۷۹، ۳۶۵

حافظ علی صابر (مولانا)...۱۱۹، ۶۸۶، ۶۸۷

حافظ کفایت حسین (علامہ)...۱۷۰

حافظ ممتاز دہلوی...۹۳۵

حالی (الطاف حسین)...۲۳۰، ۲۶۶، ۳۳۰، ۳۲۵، ۳۹۷، ۳۹۸، ۳۹۵، ۵۰۳، ۹۳۷، ۹۸۷، ۱۰۰۲

حامد جونپوری...۸۰۸، ۹۶۱

حامد حسین سید...۱۰۶۹، ۱۱۵۳

حامد حسن قادری...۳۸۸

حبیب الحسن حشمی...۷۷

حر (امیر امام)...۱۳۳، ۱۰۰۱، ۱۰۰۹، ۱۰۶۷، ۱۱۱۸

حر عاملی (شیخ)...۱۰۳

حزیں (میر ہاشم حسین لکھنوی)...۲۸۷، ۵۰۱، ۵۰۵، ۵۲۰

حسرت موہانی...۲۵۹، ۲۶۶، ۳۲۸، ۳۳۳، ۳۳۳، ۵۰۲

حسن امام رضوی (ایڈووکیٹ)...۸۰۸

حسن رضا شہید (لاہور)...۱۹۲، ۸۰۳

حسن رضا زیدی (سید)...۱۳، ۳۶، ۲۷۵

حسن عابد...۷۸۶، ۸۳۰

حسن عابدی...۱۳، ۳۹، ۵۵، ۵۲۸

حسن رضوی...۳۳۹

حسن ظفر (مولانا)...۱۱۵۸

حسن عباس رضوی (مجتہد)...۷۸۳

حسن عباس گوپالپوری (سید)...۸۱۷، ۸۵۵

حسن عباس نقوی (کمشنر)...۲۵۳، ۱۰۹۳

حسن عسکری کاظمی...۱۳، ۳۹، ۳۲۸، ۵۳۶

حسن کاظمی (سید)...۲۵، ۵۳، ۵۹۳، ۹۱۱

حسن لکھنوی...۲۵، ۵۳، ۸۵۹، ۹۱۲

حسن مہدی...۱۰۶۹، ۱۱۵۷

حسنین جعفری...۱۰۳

حسنین کاظمی...۱۰۰۱

حسین شرف الدین شاہ ولایت (امروہہ)...
۳۱، ۲۹۲، ۳۳۲، ۹۲۵، ۹۲۶، ۹۲۷

حسین رضا...۸۸

حسین مجتبیٰ (ضیا ندیم)...۲۷، ۹۹۰

حشمت حسین جعفری...۲۹۱

حضرت گل...۱۱۲۳

حفیظ جالندھری...۳۹۰

حکیم سنائی...۳۲۳، ۱۰۴۲

حمایت علی شاعر...۱۰۸۳

حمیدالحسن (مولانا)...۷۹،۸۰،۶۹۲،

حمیری...۵۱۰

حنیف اسعدی...۸۱۹

حنیف فوق (ڈاکٹر)...۱۰۸۳،۱۱۰۸

حیدر امام رضوی...۷۸۷

حیدر بخش حیدری...۱۰۶،۴۴۳

حیدر طباطبائی...۱۰۶۹،۱۱۵۵

حیدر علی اختر...۱۲،۳۰،۳۶۷

حیدر علی (بادشاہ)...۷۳۲

حیدر علی یوبی...۱۹۳

حیدر علی (مولوی)...۱۰۰۸،۱۰۳۳

حیدر نواب جعفری...۱۷۵،۳۶۹،۳۷۵،
۴۰۹،۴۳۸

(خ)

خادم دہلوی...۹۳۳

خاقانی...۳۱۹

خان آرزو...۳۱۸

خاور رضوی نگرامی (ڈاکٹر)...۵۰۶،۱۰۶۹،۱۱۱۹

خبیر لکھنوی...۱۰۶،۳۲۵،۱۰۱۵

خلش پیر اصحابی...۸۵۱

خلیل (آل میر انیس)...۳۸۹

خلیق (میر)...۸۶،۱۰۶،۲۸۳،۲۸۴

۲۸۷، ۳۸۸، ۵۰۰، ۵۰۵، ۵۰۷، ۵۲۰،
۹۵۶، ۹۷۳، ۹۷۳، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۳،
۱۰۳۴،۱۰۳۹،۱۱۳۶

خواجہ احمد عباس...۳۳۸،۳۴۵

خواجہ بختیار کاکی...۴۴۳

خواجہ بندہ نواز گیسو دراز...۲۷۶،۴۴۳

خواجہ حسن نظامی...۲۶۳،۲۹۳

خواجہ حمید الدین شاہد...۸،۳۹،۲۲۵،۳۵۶،
۱۰۶۹،۱۱۱۰

خواجہ عبداللطیف انصاری (مولانا)...۱۳۳

خواجہ غلام الثقلین...۳۹۷

خواجہ معین الدین چشتی ... ۴۴۳، ۵۹۶،
۶۸۸،۸۴۳

خورشید احمد شاہ (سید)...۹۳۶

خوشحال خاں خٹک... ۳۴۷

خوئی آقائے سید ابوالقاسم الموسوی (آیت اللہ)...
۱۲۸،۵۸۳

خیال امروہوی...۸۳۱

(د)

داغ دہلوی...۲۳۱،۳۹۳،۵۳۸

دانش (صفی حیدر)...۱۰۱۵

دانش علی احمد (آل میر انیس)...۷۹،۶۹۷،۸۱۰،
۸۴۱،۸۳۵،۸۵۳،۱۱۰۳،۱۰۷۱،۱۱۱۴

دبیر (مرزا)...۳۸،۳۹،۴۰،۵۷،۷۹،۵۸،
۱۰۵،۱۰۶،۱۸۶،۱۹۱،۱۹۷،۲۰۲،۲۰۳،۲۰۵،

۲۰۷، ۲۰۹، ۲۱۱، ۲۱۶، ۲۱۷، ۲۲۷، ۲۲۹، ۲۳۱،
۲۳۵، ۲۴۳، ۲۵۳، ۲۹۰، ۲۹۳، ۳۳۳، ۳۳۴،
۳۳۵، ۳۸۷، ۳۹۳، ۴۱۷، ۴۲۵، ۵۳۸،
۳۶۳، ۳۹۲، ۳۹۳، ۳۹۶، ۵۱۱، ۵۲۹، ۶۱۶،
۶۴۸، ۶۸۷، ۸۰۷، ۹۵۱، ۹۵۳، ۹۶۲، ۹۶۷،
۹۷۱، ۹۷۳، ۹۷۸، ۹۷۹، ۹۸۵، ۹۹۰،
۹۹۸، ۱۰۰۰، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۷، ۱۰۰۸،
۱۰۱۳، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۱۸، ۱۰۱۹، ۱۰۲۰،
۱۰۳۰، ۱۰۳۵، ۱۰۳۹، ۱۰۵۷، ۱۰۷۸، ۱۰۸۹،
۱۰۹۱، ۱۱۰۷، ۱۱۲۱، ۱۱۲۲، ۱۱۲۸، ۱۱۳۶، ۱۱۶۳،
۱۰۶۳، ۱۰۹۳

ذر حسن جالوی... ۲۲، ۵۳، ۳۳۸، ۸۷۷

درگاہ قلی خاں... ۳۴۳

دلاور حسین (چیف ایڈیٹر نیشنل ہیرلڈ)... ۶۹۳

دلدار علی نقوی... ۵۹۲

دلگیر... ۱۰۶، ۴۲۵، ۹۷۳

دیانت حسین نقوی (سید)... ۳۱، ۸۷، ۱۱۳

دیوانہ بخاری... ۹۵۵

(ڈ)

ڈپٹی محمد عظیم (وزیر گنج لکھنؤ)... ۱۱۸

ڈی ایف کراکا... ۲۶۱، ۲۶۳

ڈیوڈ میتھیوز (ڈاکٹر)... ۵۸۹، ۵۹۰، ۷۸۰،
۱۰۳۲، ۱۰۳۸، ۱۰۳۹

(ذ)

ذاکر (سید فرزند حسین)

ذاکر حسین فاروقی (ڈاکٹر)... ۹۶۷

ذکی (منے صاحب)... ۴۳۵، ۵۰۱، ۵۰۵، ۵۴۰

ذکی، مولانا سید محمد ذکی (تاج العلما)... ۵۹

ذکی عابدی... ۴۳، ۸۶۰، ۹۱۱

ذکی کاظمی... ۵۳

ذوق دہلوی (شیخ ابراہیم)... ۳۱۸، ۳۱۹، ۳۵۹،
۳۶۶ ۳۲۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۷، ۴۰۱، ۴۴۳،
۴۵۳، ۹۳۶، ۱۱۱۲

ذوالفقار حسین (ڈاکٹر)... ۱۰۰۰

ذوالفقار حیدر نقوی (علامہ)... ۱۱، ۳۰، ۴۳،
۷۹۶، ۱۱۱۱

ذوالفقار علی بخاری (زیڈ اے بخاری)... ۵۸،
۱۳۹، ۷۴۳، ۱۰۶۹، ۱۱۳۲

ذوالقدر جونپوری... ۱۰۸۶

ذہین حیدر امروہوی... ۱۱۰۱

ذیشان حیدر ذیشان... ۴۴، ۵۳، ۸۷۶

ذیشان حیدر جوادی (مولانا)... ۸۳۰

(ر)

راجا نرپت چندر ناتھ... ۴۹۰

راجہ محمود آباد (امیر احمد خاں)... ۱۴۳، ۱۸۷،
۲۲۳، ۲۳۵، ۲۳۶، ۲۴۷، ۲۴۸، ۷۴۴، ۱۰۳۲،
۱۰۴۳

رچرڈ کیوریس... ۵۸۹

راحت حسین ناصری...۱۰۹۵،۱۱۱۳

راقب مرادآبادی...۷۸۶

رام بہاری لال صبا جے پوری...۵۹۸

رام پرکاش ساحر...۵۹۸

رجب علی...۵۲۷

رسمی...۳۲۳

رسوا (مرزا محمد ہادی)...۳۷۳،۸۲۵،۸۳۶،
۹۳۱،۹۳۲،۱۰۶۰،۱۱۰۳،۱۱۱۴

رشک لکھنوی...۳۶۶،۳۲۸،۹۵۵،۱۰۰۸،۱۰۲۲

رشید (پیارے صاحب)...۱۰۶،۳۲۵،۱۰۰۴،
۱۰۱۰

رشید ترابی (علامہ)...۳۱،۱۰۶،۱۰۷،۱۲۳،
۱۲۵،۱۳۵،۱۷۰،۲۶۲،۳۶۷،۳۹۹،۶۸۶،
۶۹۷،۱۰۲۷،۱۰۵۰

رشید حیدر رضوی...۱۰،۲۰،۲۲،۳۱۲،۳۵۳،
۳۵۶،۳۲۸،۶۳۰،۷۹۶

رشید منظر...۶۳۰

رشید وارثی...۸۱۵

رضا شبر (مولانا سید محمد)...۹۳۳۱۷

رضا علی عابدی...۱۰۱۵

رضا مہدی (یوپی)...۷۷

رضوان نقوی...۲۸،۱۰۳۳

رضی (میر محمد رضی)...۱۰۰۸

رضی جعفر نقوی (مولانا)...۳۵۰، ۶۹۷،

۱۰۶۹،۱۱۳۲

رفیق رضوی...۲۲۳،۸۳۳،۸۳۶

رند لکھنوی...۲۵۹،۲۶۶،۳۲۸،۳۲۳

روپ کماری...۳۰۳

روسو...۱۱۲۷

روش صدیقی...۶۳۰،۶۳۱

روشن لکھنوی (باقر علی عطش)...۸۲۸

رہبر ہاشمی...۲۲،۵۳،۸۷۲

رئیس (میر)...۲۸۷،۵۰۰،۵۰۵،۵۲۰

رئیس اختر...۸۱۸،۸۲۷،۸۳۶،۸۴۳

رئیس امروہوی...۱۲،۳۳،۳۲،۱۲۹،۲۹،۲۳۲،
۳۵۶،۵۳۲

ریاض الدین امجد ریاض...۱۰۰۷

ریاست حسین بدایونی...۱۰۱۰

ریاض خیرآبادی...۲۵۹،۲۶۶،۳۲۳،۳۳۲،

ریحان احمد...۱۹،۷۳۶

ریحان اعظمی...۳۶،۹۱۹،۱۰۶۹،۱۱۳۲

(ز)

زاہد بخاری...۸۳۰

زاہد علی...۶۷۹

زاہد نقوی...۱۰۷۰،۱۱۹۲

زائر امروہوی (آغا محمد نقوی)...۶۳۲

زائر زیدپوری...۹۵۱

زائر سیتاپوری...۴۳۳،۹۵۵،۹۵۶

زکی دہلوی...۴۳۳

زماں امروہوی...۹۴۷

زوار حسین...۶۹۳

زوار حسین شاہ...۸۴۴

زبیر عابدی...۱۰۶۹،۱۱۳۳

زبیر حسین...۱۰۶۹،۱۱۶۰

(س)

ساحر فیض آبادی...۹۳۴

ساحر لکھنوی...۱۱،۳۰،۳۳۴،۳۷۰،۱۰۷۰،۱۰۹۳

ساغر لکھنوی...۲۱،۲۵،۳۳،۵۳،۱۳۴،۶۳۶،
۸۶۵،۹۱۳،۹۱۵،۹۱۶

سالار جنگ (مؤتمن الدولہ)...۴۳۳

سالک لکھنوی...۳۳۷،۱۰۷۰،۱۱۳۱

سبط حسن جونپوری (مولانا)...۱۰۶۵،۱۱۱۷

سبط حسن رضوی (ڈاکٹر)...۱۷،۵۲،۱۲۶،۳۳۸،
۳۵۶، ۳۶۶، ۳۷۰، ۶۲۸، ۷۷۸، ۹۲۶،
۱۰۷۰،۱۱۱۶

سبط حسن (مولانا)...۱۰۶،۹۹۷

سبط حسن فسوی (مولانا) ۱۴۳

سبط محمد نقوی...۸۰۹،۸۲۶،۱۰۶۶

سپہر دھولپوری (نواب رستم علی خاں)...۹۴۷

سجاد باقر رضوی (پروفیسر)...۳۳۸،۱۰۵۸

سجاد شبیر رضوی...۱۲،۲۰،۲۵،۳۱،۵۵،۳۵۶،
۳۳۸،۴۷۱،۷۷۶،۷۸۴

سچل سرست...۳۴۷

سحر انصاری (پروفیسر)...۸،۱۵،۱۸،۳۳،
۲۸، ۵۰، ۱۳۴، ۳۴۱، ۳۵۶، ۵۲۸، ۵۶۱،
۶۳۹، ۶۳۱، ۶۳۴، ۶۴۷، ۶۵۴،۷۸۵،
۷۹۵،۹۹۷،۱۰۷۰،۱۱۳۳

سحر لکھنوی...۲۶۶،۳۳۸

سخن لکھپوری...۲۲،۲۳،۵۳،۸۵،۳۳۸،۶۸۰،
۸۶۹،۸۸۵،۱۰۷۰،۱۰۸۳،۱۰۷۰،۱۰۸۳

سراج الحسن (سید)...۷۶

سراج اورنگ آبادی...۴۳۳

سردار زیدی (ڈاکٹر)...۵۶

سردار نقوی (پروفیسر)...۱۰،۱۶،۳۰،۳۲،۵۱،
۵۴،۵۸،۷۴،۸۳،۴۳۴،۲۹۳،۳۳۸،۳۵۶،
۳۳۸،۶۰۰،۶۳۰،۷۹۶،۹۹۱،۱۰۳۹،۱۱۴۱،

سرسید احمد خاں... ۳۳۵،۵۰۳

سرشار رتن ناتھ...۳۷۴،۹۶۲

سرور رجب علی بیگ...۸۱۲

سر عبدالقادر...۳۹۰

سعادت امروہوی...۳۹۳،۴۳۴

سعادت یار خاں رنگین...۴۳۳،۸۳۸،۹۳۴

سعید الملت (مولانا سید محمد سعید)...۱۳۰

سعید حسین عابدی...۳۳، ۵۸، ۱۳۲، ۴۳۹

سفارش حسین رضوی...۱۰۰۸

سقراط...۷۲۰

سکندر اعظم...۱۰۲۱

سکندر آغا (ڈاکٹر)...۱۰۷۰، ۱۱۰۳

سکندر پنجابی (خلیفہ محمد علی)...۱۰۶

سلطان آغا شیرازی...۱۱۳۶، ۱۱۵۵

سلطانہ ذاکر ادا...۵۶

سلمان حیدری زیدی (مولانا)...۶۴۳، ۷۷۸،

سلمان کتائی مدیر...۳۱۶

سلیس محب علی...۳۲۵

سلیس (میر)...۱۰۶، ۵۰۰، ۵۰۵

سلیمان پاشا (ڈاکٹر)...۱۰۰۱

سلیمان عباس بخاری (مولانا)...۱۱۹

سلیم احمد...۳۹۷، ۱۹۶، ۳۵۶، ۳۷۹

سلیم اختر...۵۷، ۵۸، ۱۲۸، ۳۵۶

سلیم فاروقی...۱۲، ۳۰، ۳۵۶، ۳۴۳

سمائکہ رضا...۸۹

سمیع الحسن...۱۶، ۵۱، ۵۲، ۶۱۳

سودا مرزا رفیع...۱۰۶، ۲۱۸، ۲۵۹، ۲۶۶،
۳۲۳، ۳۲۸، ۳۳۳، ۳۸۷، ۳۹۹، ۴۳۳،
۴۸۳، ۵۳۶، ۹۲۵

سوز دہلوی (میر)...۲۵۹، ۲۶۶، ۳۲۸، ۳۳۳

۹۵۲، ۱۰۲۲

سید احمد جعفر...۳۲۳

سہیل احمد خاں (ڈاکٹر)...۱۱۳۹

سید اصغر حسین (فرزند بابو صاحب فائق)...
۸۳، ۱۰۰۲، ۱۱۱۳، ۱۱۱۶

سید سالار مسعود غازی...۳۴۴

ظہیر الدین حیدر...۱۰۹۴

سید ظہیر حسن نقوی...۳۱، ۷۶، ۸۷، ۸۸،
۸۹، ۱۱۳، ۲۵۱، ۳۹۸، ۹۳۱، ۹۳۶، ۷۹۹،
۸۳۱، ۸۳۶، ۸۳۸، ۸۴۴، ۸۴۸، ۱۰۵۴،
۱۱۳۱، ۱۱۳۲، ۱۱۳۳، ۱۱۳۴، ۱۱۳۰

سید عبداللہ (ڈاکٹر)...۱۰۰۰

سید فیضی...۱۰۳۳، ۱۰۳۸

سید محمد تقی...۳۳۸

سید محمد دہلوی (مولانا)...۱۴۱، ۳۰۰، ۶۸۶

سید محمد رشید (امین آباد لکھنؤ)...۳۹۱، ۹۳۶،
۹۶۷، ۱۰۰۰، ۱۱۰۱، ۱۱۰۳

سید محمد رضی (عماد العلما)...۳۵۰

سید محمد زیدی (ایڈووکیٹ)...۸۴۷

سید محمد شمیم...۹۵۱

سیادت نقوی (ڈاکٹر)...۳۰، ۵۶، ۸۰۲،
۱۰۷۳، ۱۰۷۹

سید دہلوی...۳۴۳

سید علی (مولوی)...۱۰۱۵

سید علی رضوی...۷۵

سید محمد احمد...۶۹۳

سیف حسن پوری...۲۳، ۵۳، ۷۷۳، ۹۱۰

(ش)

شاداں، چندو لال...۹۵۲

شاداں دہلوی...۳۲۸

شاد عظیم آبادی...۲۱۳، ۲۳۳، ۲۶۶، ۳۳۰، ۳۴۵، ۵۰۳، ۱۰۰۲، ۱۰۰۸، ۱۰۱۵، ۱۱۳۰

شارب ردولوی (ڈاکٹر)...۱۵، ۲۶، ۵۰، ۳۵۶، ۵۵۹، ۷۷۹، ۷۹۹، ۸۰۰، ۸۳۱، ۸۳۶، ۹۵۹، ۱۰۶۳، ۱۱۲۶

شاعر، اولاد حسین عرف مولوی لطیف الحسن صاحب...۳۸، ۱۳۵، ۲۳۶، ۲۷۳، ۳۲۵، ۹۵۶، ۱۰۷۶، ۱۱۲۳

شارع قدوائی (ڈاکٹر)...۲۸۳، ۸۵۳

شاکر ناجی دہلوی...۳۲۳

شان الحق حقی...۱۰۰۰

شاہ اکبر دہلوی...۹۳۳، ۹۳۶

شاہ حاتم دہلوی...۳۱۸، ۳۲۳، ۹۳۳

شاہد احمد دہلوی...۲۳۵

شاہد جعفر...۱۲، ۳۰، ۳۶، ۳۵۶، ۳۳۸، ۳۶۸،

شاہد حسین...۶۹۳

شاہد ملک (ملتان)...۶۱، ۸۲۸

شاہد نقوی (کراچی)...۲۲، ۲۵، ۵۳، ۱۷۳، ۱۷۵، ۳۲۸، ۳۵۶، ۶۷۶، ۸۳۲، ۸۳۶، ۸۷۰، ۸۷۵، ۹۱۳، ۹۹۱، ۱۰۳۹، ۱۰۷۰، ۱۱۰۱

شاہ عالم آفتاب...۳۲۳

شاہ نعمت اللہ...۳۲۳، ۳۶۵

شاہ ولی اللہ...۳۰۸

شاہین اکرام...۸۰۳

شاہین بدر...۳۸، ۵۰۸

شائق، سید یوسف حسین...۸۵، ۱۰۰۱

شباب نقوی (مولانا)...۸۲۱

شبیر حسن گھگی...۱۰۳

شبلی شمیل...۳۱۶

شبلی نعمانی...۲۰۳، ۲۲۰، ۲۳۰، ۲۹۳، ۵۵۶، ۷۳۴، ۹۸۷، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳

شبیہ الحسن، ڈاکٹر (لاہور)...۳۳۰، ۱۰۷۰، ۱۱۳۹

شبیہ الحسن رضوی (علامہ)...۲۳، ۵۳، ۳۲۸، ۹۰۲

شبیہ الحسن نونہروی (ڈاکٹر لکھنؤ)...۸۳۹، ۹۹۹

شجاع الدولہ...۹۵۳

شدید لکھنوی...۱۰۶، ۱۲۲، ۳۲۵، ۱۱۳۷

شرافت حسین (سابق پرنسپل شیعہ کالج لکھنؤ)...۹۹۹

شریف الحسن (ترکی)...۱۰۷۰، ۱۱۰۷

شریف الحسن ناظر (مظفر بھائی)...۱۱۷، ۱۰۷۶، ۱۱۵۶

شریف دہلوی...۹۳۵

شریف رضی (علامہ)...۳۱۶

شرر لکھنوی، عبدالحلیم...۳۵۳، ۱۰۰۲

شفیع عقیل...۱۳، ۱۵، ۱۸، ۲۰، ۲۷، ۲۸، ۴۷،
۵۵، ۵۹، ۵۰۳، ۵۶۲، ۶۷۷، ۶۹۸، ۸۳۱،
۱۰۳۰، ۱۰۳۰، ۱۰۴۲

شفیع بریلوی...۲۸۸

شفیق رضوی...۶۹۳، ۷۷۷، ۷۸۳، ۷۸۳،

شکیل الرحمٰن...۹۸۹

شکیل عابدی...۶۹۳

شمس الدین گرویزی...۳۴۳

شمس الدین شمس...۵۸۱

شمس الدین صدیقی (محمد، ڈاکٹر)...۱۰۷۰، ۱۱۰۳

شمس الحسن بجنوری (سوز ع)...۱۱۹

شمس الرحمٰن فاروقی...۳۶، ۷۹، ۶۹۳، ۱۰۷۰، ۱۱۳۳

شمس تبریزی...۲۷۹، ۳۶۵، ۴۴۳

شمس الحسن شمسی...۳۵۳

شمس زبیری...۱۱۰۵

شمشاد حسین رضوی...۸۱۳

شمیم امروہوی...۳۳۵

شوپن ہار...۵۱۰

شوذب کاظمی (ڈاکٹر)...۳، ۵، ۱۷، ۳۶، ۳۹،
۸۴، ۶۳۶، ۷۳۶، ۹۳۰، ۹۳۹

شوکت رضا شوکت...۱۰۷۰، ۱۱۱۱

شوکت لکھنوی...۹۵۳

شوق لکھنوی (مولانا مرزا احمد اشفاق)...۱۸،
۵۵، ۷۹، ۸۰، ۱۱۹، ۲۰۸، ۳۳۸، ۶۸۴، ۸۴۳،

شہاب الدین گرویزی...۳۴۳

شہاب کاظمی...۷۸۰

شہید صفی پوری...۶۹۳

شہید اوّل شیخ شمس الدین...۱۰۴۳

شہید ثانی شیخ زین الدین...۱۰۴۳

شہید ثالث قاضی نوراللہ شوستری...۳۱۹، ۳۴۱،
۴۴۳، ۸۰۸، ۱۰۴۳

شہید خامس آیت اللہ محمد باقر الصدر...۱۰۴۳،

شیخ احسان...۱۰۴۱

شیخ عبدالعلی ہروی...۱۰۱۹، ۱۰۴۱، ۱۰۴۱

شیخ سعدی...۵۷، ۲۷۹، ۳۶۵، ۳۱۹، ۳۴۳،
۵۱۰، ۹۴۷

شیخ صدوق (علامہ)...۷۵، ۱۱۳۹

شیخ محمد اکرم...۳۰۸

شیخ محمد کریم خان کرمانی...۵۷۳

شیخ مفید (علامہ)...۷۵

شیخ وحید...۱۰۱۵

شیر افضل جعفری...۴۳۶

شیدا حسن زیدی...۹۵۷

شیکسپیئر...۵۰۱، ۶۳۷، ۷۰۳، ۱۰۳۷، ۱۰۳۹،
۱۱۴۷

(ص)

صابر تھاریانی...۵۸
صابر علی خاں (ڈاکٹر)...۹۳۲
صابر لکھنوی (منشی)...۹۵۳
صادق امام زیدی...۱۸،۵۵،۹۸۳
صادق حسین...۳۳۲
صالح ترمذی کشفی...۳۳۳
صالحہ عابد حسین...۱۰۸۹
صائم رضا...۶۳۲
صبا اکبر آبادی...۱۰۷۰،۱۰۸۰
صبا لکھنوی...۳۶۶،۳۲۸،۳۲۳
صبا اکرام...۴۸
صفدر حسین (ڈاکٹر)...۱۵۰،۲۰۳،۳۲۸،۳۹۱، ۶۴۴،۹۹۱،۱۰۱۰،۱۰۱۵،۱۰۹۲،۱۰۹۳،۱۱۰۰، ۱۱۰۲،۱۱۰۳،۱۱۱۲،۱۱۱۳،۱۱۱۹،۱۱۲۰،۱۱۳۰، ۱۱۳۵،۱۰۷۱،۱۱۳۹
صفدر حسین آہ (ڈاکٹر)...۱۰۶۰،۱۰۹۶،
صفدر رضا...۶۹۳
صفدر علی حسرتی...۸۲۷،۹۵۱
صفدر فیض آبادی...۳۲۵
صفدر مرزاپوری...۱۰۰۸
صفیر بلگرامی...۲۶۹، ۳۳۰، ۳۹۳، ۳۲۵، ۵۰۳،۱۰۱۰
صفی لکھنوی...۲۵۹،۲۶۶،۲۷۱،۳۲۸،۳۲۳، ۹۶۴،۱۱۰۱
صفیہ کاظم...۱۱۳۳
صہبا اختر...۶۳۲
صہبا لکھنوی...۶۳۶

(ض)

ضاحک (میر)...۱۰۶،۳۲۳،۴۸۳،۵۰۰، ۵۰۵،۵۰۷،۱۰۰۳
ضمیر (میر)...۱۰۶،۳۲۵،۹۷۳،۹۷۷، ۹۸۰،۱۰۳۳
ضمیر اختر نقوی (علامہ)...۵،۶،۹،۱۳، ۱۴،۱۵،۱۶،۱۷،۱۸،۱۹،۲۰،۲۱،۲۲،۲۳،۲۴، ۲۵، ۲۶، ۲۷، ۲۸، ۲۹، ۳۳، ۳۴، ۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۹، ۴۰، ۴۱، ۴۴، ۴۶، ۴۷، ۴۸، ۵۰، ۵۱، ۵۲، ۵۳، ۵۵، ۵۷، ۵۸، ۵۹، ۶۱، ۶۲، ۶۶، ۶۷، ۷۳، ۷۴، ۷۵، ۷۶، ۷۷، ۷۸، ۷۹، ۸۱، ۸۲، ۸۴، ۸۵، ۸۶، ۸۷، ۸۸، ۹۰، ۹۴، ۹۵، ۹۶، ۹۷، ۹۹، ۱۰۰، ۱۰۱، ۱۰۳، ۱۰۴، ۱۰۵، ۱۰۶، ۱۰۷، ۱۰۸، ۱۰۹، ۱۱۰، ۱۱۱، ۱۱۴، ۱۱۵، ۱۱۶، ۱۱۸، ۱۱۹، ۱۲۰، ۱۲۲، ۱۲۴، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۳۰، ۱۳۱، ۱۳۲، ۱۳۳، ۱۳۴، ۱۳۵، ۱۳۶، ۱۳۷، ۱۳۸، ۱۳۹، ۱۴۰، ۱۴۱، ۱۴۴ سے ۱۵۰ تک، ۱۶۰ سے ۱۶۸ تک، ۱۶۹ سے ۱۷۶ تک، ۱۷۷ سے ۱۸۹ تک، ۱۹۰ سے ۲۰۱ تک، ۲۰۲ سے ۲۰۵ تک، ۲۰۶ سے ۲۰۸ تک، ۲۰۹ سے ۲۱۵ تک، ۲۱۶ سے ۲۲۸ تک، ۲۲۹ سے ۲۳۴ تک، ۲۳۵ سے ۲۳۹ تک، ۲۴۰ سے ۲۴۹ تک، ۲۵۰ سے ۲۶۰ تک، ۲۶۱ سے ۲۶۹

تک، ۲۷۰ سے ۲۸۲ تک، ۲۸۳ سے ۲۹۷ تک
۲۹۸ سے ۳۱۱ تک، ۳۱۲ سے ۳۳۰ تک،
۳۳۱ سے ۳۳۸ تک، ۳۳۹ سے ۳۵۷ تک،
۳۵۸ سے ۳۶۹ تک، ۳۷۰ سے ۳۸۲ تک،
۳۸۳ سے ۴۰۳ تک، ۴۰۴ سے ۴۳۲ تک،
۴۳۳ سے ۴۴۳ تک، ۴۴۴ سے ۴۵۶ تک،
۴۵۷ سے ۴۶۷ تک، ۴۶۸ سے ۴۷۶ تک،
۴۷۷ سے ۴۹۱ تک، ۴۹۲ سے ۵۰۳ تک،
۵۰۴ سے ۵۲۱ تک، ۵۲۲ سے ۵۳۱ تک،
۵۳۲ سے ۵۴۳ تک، ۵۴۴ سے ۵۵۵ تک،
۵۵۶ سے ۵۶۴ تک، ۵۶۵ سے ۵۸۳ تک،
۵۸۴ سے ۵۹۹ تک، ۶۰۰ سے ۶۱۲ تک،
۶۱۳ سے ۶۲۷ تک، ۶۲۸ سے ۶۳۹ تک،
۶۴۰ سے ۶۷۶ تک، ۶۷۷ سے ۶۸۳ تک،
۶۸۴ سے ۷۱۷ تک، ۷۱۸ سے ۷۲۴ تک،
۷۲۵ سے ۷۳۶ تک، ۷۳۷ سے ۷۴۴ تک،
۷۴۵ سے ۷۷۵ تک، ۷۷۶ سے ۷۸۵ تک،
۷۸۶ سے ۷۹۹ تک، ۸۰۰ سے ۸۱۷ تک،
۸۱۸ سے ۸۳۰ تک، ۸۳۱ سے ۸۳۹ تک،
۸۴۰ سے ۸۵۶ تک، ۸۵۷ سے ۸۶۴ تک،
۸۶۵ سے ۸۶۹ تک، ۸۷۰ سے ۸۷۹ تک،
۸۸۰ سے ۸۸۹ تک، ۸۹۰ سے ۹۰۰ تک، ۹۰۱
سے ۹۰۹ تک، ۹۱۰ سے ۹۱۴ تک، ۹۱۵ سے
۹۴۷ تک، ۹۴۸ سے ۹۶۰ تک، ۹۶۱ سے ۹۷۱ تک،
۹۷۲ سے ۹۸۹ تک، ۹۹۰ سے ۹۹۷ تک،
۹۹۸ سے ۱۰۱۴ تک، ۱۰۱۵ سے ۱۰۲۹ تک،
۱۰۳۰ سے ۱۰۴۲ تک، ۱۰۴۳ سے ۱۰۵۰ تک،
۱۰۵۱ سے ۱۱۶۷ تک، ۱۱۶۸ سے ۱۱۸۰ تک،
۱۱۸۱ سے ۱۱۹۶ تک، ۱۲۱۲ سے ۱۲۱۳ تک

ضمیر حسین جعفری...۹۱۵

ضیاء الحسن (ڈاکٹر)...۱۰۳۸

ضیاء الحسن موسوی...۵۸، ۱۰۵، ۱۲۳، ۱۲۴، ۱۳۶،
۱۴۸، ۲۳۲، ۳۴۸، ۳۶۷، ۵۶۰، ۷۰۰،
۷۴۷، ۷۸۶، ۱۰۱۵، ۱۱۰۷، ۱۰۷۱، ۱۰۸۱

ضیاء اللہ ضیاء (شیخ)....۱۱۳۳، ۱۱۳۵

ضیاء دہلوی.... ۹۳۴

(ط)

طارق چھتاری (علی گڑھ)...۸۵۴

طارق حبیب (سرگودھا) ۸۵۷

طارق وحید...۱۹، ۷۳۵

طالب پانی پتی...۵۹۷

طالب جوہری (علامہ)...۱۶۰، ۳۵۰، ۶۹۷، ۷۹۷،
۱۱۵۸، ۱۰۶۰، ۱۰۹۵

طاہر تونسوی (ڈاکٹر)...۸۴۴، ۱۰۷۱، ۱۱۴۰

طاہر جرولی (مولانا)...۴۳، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۰،
۱۲۱، ۱۳۱، ۶۸۶، ۷۹۷، ۱۰۸۷، ۱۱۵۶، ۱۱۳۷،
۱۱۵۶

طاہر فتح پوری (مرزا بندے حسن)...۸۸۳

طپش دہلوی...۴۴۳

طہیر نقسی (پروفیسر)...۱۰، ۴۰، ۴۲، ۵۴، ۲۸۳،
۲۵۶، ۳۴۸، ۸۸۳

طیب آقا الموسوی الجزائری (آیت اللہ)...
۱۰۷۱، ۱۱۳۱

(ظ)

ظاہر دہلوی...۴۴۳

ظفر اقبال (ڈاکٹر)...۹،۲۵۳،۳۵۶

ظفر الحسن (مرزا)...۱۰۷۱،۱۰۸۳

ظفر الحسن جلالپوری...۸۵۳

ظفر حسین جعفری...۷۶

ظفر جونپوری (پروفیسر)...۱۹۲،۱۰۷۱،۱۰۸۷

ظفر عباس نقوی (سید) ایڈووکیٹ...۳۱،۱۱۳

ظفر علی خاں...۲۳۰

ظفر مہدی (مولانا)...۱۱۷

ظفر ہاشمی (ڈاکٹر)...۴۳،۵۳،۶۳۲،۸۵۶، ۸۸۳

ظل حسنین...۷۷

ظل رضا...۷۷

ظل صادق زیدی...۴۲،۴۳،۵۳،۱۷۵،۷۷۳، ۷۷۸،۸۷۸،۸۱۱،۸۵۸،۹۱۰،۱۰۲۹

ظہور مہدی (سید)...۴۰،۴۳،۵۳،۵۶،۸۰۵، ۸۱۳،۸۹۷

ظہیر دہلوی...۲۱۸،۲۵۹،۳۴۸،۳۴۳، ۷۷۸،۷۷۹،۹۳۲،۹۳۳،۱۰۶۰،۱۱۱۴

ظہیر فتحپوری (ڈاکٹر)...۹۳۱،۹۶۵

(ع)

عابدہ رضا رضوی...۵،۳۲،۱۳۵،۳۵۶

عابد علی عابد...۱۰۹۳

عابد حسین بیگ ([illegible])...۱۰۰۳

عاجز دہلوی...۳۴۳

عارف حسن خاں (ڈاکٹر) مرادآباد...۲۸۳، ۸۵۴

عاشور علی خاں لکھنوی...۳۴۳

عاصی...۱۰۶

عاصمہ زیدی، ڈاکٹر (اٹلی)...۱۱۶۳

عاقل رضوی...۶۹۳

عالم حسین...۹۷۵،۹۷۷،۹۸۳

عالم آرا بیگم عالم لکھنوی...۹۵۱

عالم لکھنوی، مرزا محمد عالم...۹۵۱

عالیہ امام (ڈاکٹر)...۵،۳۲،۹۵،۳۵۶،۵۲۸، ۶۴۳،۶۳۸،۷۹۳

عارف لکھنوی (میر)...۱۰۶،۲۸۰،۲۸۷،۲۹۳، ۵۰۱،۵۰۵،۵۰۷،۵۲۰،۱۱۰۳،۱۱۱۳

عارف (میر علی محمد)...۱۰۱۰،۱۱۳۰

عاشق دہلوی...۹۳۵

عاشور کاظمی...۹،۲۸،۲۳۳،۲۳۹

عبادت بریلوی (ڈاکٹر)...۱۰۷۱،۱۱۰۸

عباس حیدر زیدی...۲۹۳

عباس حیدر عابدی (علامہ)...۱۰۷۱،۱۱۳۳

عباس رضا...۸۸

عباس رضا نیر (پروفیسر)...۲۸۳، ۳۶۹، ۸۴۳،۸۳۹،۸۴۵،۸۵۳

عباس فضیل...۱۲۵

عباس کمیلی (علامہ)...۹۳۲
عبدالحکیم بوترابی (علامہ)...۱۶۱
عبدالکریم زنجانی...۱۰۲۳
عبدالستار ایدھی...۷۸۳،۲۱۲
عبدالسلام ندوی...۳۵۳
عبدالعزیز طباطبائی (آیت اللہ)...۱۲۸
عبدالعزیز خالد...۷۸۶،۳۲۵،۲۴۲،۲۹۰
عبدالقادر قرۃ خان (ترکی پروفیسر)...۱۱۰۹
عبدالقوی دسنوی (پروفیسر)...۹۸۷،۵۷،۲۷،
۱۰۸۸،۱۰۵۷
عشرت حسین عاشق...۸۵۲
عشرتی...۳۴۳
عثمان علی خاں (نظام دکن)...۲۹۲،۲۹۳
عرفان حیدر عابدی (علامہ)...۷۷۸،۱۶۱،
۷۸۰
عرفان عباسی...۱۱۳۹
عرفی شیرازی...۳۶۵،۳۴۲،۳۴۳
عروج (دولھا صاحب)...۱۰۶،۲۴۳،۲۴۳،
۹۶۱،۵۰۵،۵۰۰،۳۸۷،۳۲۵،۲۹۳،۲۸۰،
۱۱۰۳
عروج (عبدالرؤف)...۸۶
عروس (سید حسن کاظم)...۷۷۷
عزا لکھنوی...۳۲۵
عزت لکھنوی...۱۲۵،۱۱۳
عزم جونپوری...۸۳
عزیز حامد مدنی...۳۷۶
عزیز عباس (ڈاکٹر، امرتسر)...۸۵۸
عزیز لکھنوی...۹۹۲،۳۲۸،۲۶۱،۲۶۶،۲۵۹
عشق (میرزا)...۱۱۳۳،۹۵۱،۶۸۷،۳۲۵
عشق دہلوی...۳۴۳
عطار (شیخ فریدالدین)...۱۰۲۳،۳۴۳،۳۶۵
عطاء اللہ شاہ بخاری...۳۹۹
عظمت بلگرامی...۱۰۹۹،۱۰۷۱
عظیم (شاگرد دبیر)...۳۲۵
عظیم امروہوی...۱۱۶۱،۱۱۰۱،۸۳۹،۸۳۸
عقیل حسین رضوی (ڈاکٹر)...۳۳۸
عقیل نجمی...۸۳۸
علامہ اقبال...۲۰۰،۲۱۳،۲۳۰،۲۲۵،۲۶۶،
۲۷۳،۲۷۶،۲۸۰،۲۸۱،۳۳۳،۳۳۵،۳۳۰،
۳۷۷، ۳۷۸، ۳۸۰، ۳۸۷، ۴۰۱، ۴۲۲،
۴۲۵،۴۵۳،۴۶۲،۴۶۳،۴۹۰،۴۹۹،۵۰۳،
۵۱۱، ۵۳۶، ۵۴۳، ۵۴۷،۵۶۵، ۹۲۲،
۹۲۶،۹۴۳،۹۶۸،۱۰۱۹،۱۰۲۱،۱۰۲۳،۱۰۷۹
علامہ علی...۵۷،۷۵،۷۹۷،۹۲۷
علمدار حسین سید دہلوی...۳۱۱
علی اختر زیدی (سید)...۱۱۵،۳۱
علی اختر تلہری...۱۴۳

علی اکبر (ایرانی اسکالر)...۱۲۸

علی اظہر رضوی...۲۲،۲۳،۵۳،۸۸۰،۸۸۶

علی جواد زیدی (پدم شری)...۷،۱۳،۲۷،۳۳، ۳۴،۴۳۲،۷۴۳،۹۷۳،۱۰۳۳،۱۱۵۰،۱۱۵۳،۳۹، ۳۹، ۵۷، ۱۳۱،۲۰۳، ۳۳۸، ۵۳۳، ۵۳۸، ۶۳۰،۷۴۲،۹۷۳،۱۰۷۱،۱۰۹۹

علی حاکم (مولانا)...۱۳۳،۱۳۵

علی حیدر ملک...۱۳،۱۸،۲۷،۲۸،۵۰۷،۶۷۸

علی رضا شاہ نقوی (پروفیسر)...۳۳۸

علی سردار جعفری...۶،۳۳،۳۳، ۳۸، ۱۳۰، ۳۳۸،۳۵۶،۹۸۹

علی سعید رضا نقوی (ڈاکٹر)...۳۳۸

علی ضیا رضوی (امریکہ)...۸۸،۱۰۷۱،۱۱۵۰،

علی رضا حسن (پروفیسر)...۳۳۸

علی عباس حسینی...۱۳۰

علی عباس لکھنوی (مولانا)...۱۱۲۸

علی مہدی (سید)...۳۰۷،۳۱۶،۳۵۶

علی نصرت (جسٹس)...۳۳۸

عمر خیام...۳۳۰

عمران رضا نقوی...۱۹

عمر فیضی...۹۷۵

عنایت حسین جلالوی (مولانا)...۳۵۲

عین الرضا...۶۳۰

عون محمد رضوی...۱۰۱۵

(غ)

غالب (مرزا)...۲۷،۲۱۳،۲۱۴،۲۳۰،۲۳۵، ۲۵۹، ۲۶۶، ۲۶۷،۲۷۶،۲۸۰، ۲۸۱،۳۲۳، ۳۲۸،۳۳۳،۳۳۴،۳۳۵، ۳۶۳، ۳۷۷، ۳۷۸، ۳۷۹، ۳۸۰، ۳۸۱، ۳۸۷، ۴۰۱، ۴۳۲، ۴۴۴، ۴۵۳، ۴۵۵، ۴۹۳، ۴۹۶، ۴۹۸،۵۱۱،۵۰۲،۵۶۵،۵۹۸،۵۹۹،۶۱۵، ۶۲۶، ۶۸۷، ۶۸۹، ۷۳۹، ۸۰۱، ۸۰۳، ۸۳۶، ۹۵۹، ۹۸۷، ۱۰۰۱، ۱۰۰۴، ۱۰۰۶، ۱۰۰۸،۱۰۳۹،۱۰۶۳،۱۰۸۹

غفار مہدی (کرنل)...۳۳۸

غفران مآب (سید دلدار علی)...۵۹۳

غلام امام...۱۰۳۳،۱۰۳۷

غلام عسکری (مولانا)...۱۱۷،۱۱۹

غواصی...۳۳۳

غیور لکھنوی...۳۸۰،۳۸۷،۵۰۰،۵۰۵

(ف)

فادر جے ڈی پاسکل (عیسائی پادری)...۷۸

فاخر لکھنوی (نواب سید اصغر حسین)...۱۰۹۳

فارغ دہلوی...۳۳۳

فاضل زیدی (ڈاکٹر سید حسن)...۷،۳۳،۳۰، ۱۳۱، ۱۸۶، ۲۱۱، ۲۳۶، ۳۵۶، ۱۰۱۵، ۱۰۷۰، ۱۱۰۶

فاضل لکھنوی (سید مرتضیٰ حسین)...۱۷، ۱۲۳، ۱۲۶، ۱۲۸، ۳۳۸، ۳۵۶، ۹۲۸، ۹۲۶، ۹۸۰، ۱۰۰۰، ۱۰۱۵، ۱۰۱۶، ۱۰۷۲، ۱۱۳۵

فاضل مشہدی...۳۹۰

فانی بدایونی...۲۱۳، ۲۷۱، ۷۳۲

فائز دہلوی...۳۲۳

فائز (للن صاحب)...۱۰۶، ۳۸۷، ۵۰۵، ۵۲۰، ۱۰۰۲

فائق حسین (سوز خوان)...۸۶، ۵۰۱، ۵۰۵، ۵۰۷

فائق (بابو صاحب)...۳۸۷، ۵۰۱، ۵۰۵، ۵۰۷، ۵۲۰

فتح علی بیگ (مرزا)...۱۰۰۳

فدوی دہلوی...۳۲۳

فراست زید پوری...۳۲۵

فراق دہلوی...۳۲۳

فراق گورکھپوری...۲۱۳

فردوسی...۳۲۳، ۳۶۵، ۳۸۲، ۵۲۳، ۵۲۵، ۱۱۳۶

فرقان ادریسی...۳۸، ۵۰۸

فرقان حیدر عابدی (علامہ)...۶۳۲

فرمان فتحپوری (ڈاکٹر)...۵، ۲۷، ۳۲، ۵۷، ۹۳، ۳۵۶، ۵۲۸، ۶۳۷، ۷۸۷، ۷۹۳، ۷۹۴، ۹۲۸، ۹۷۳، ۱۰۰۰، ۱۰۸۳، ۱۰۵۳، ۱۰۸۷

فروغ کاظمی (علامہ)...۳۳۱، ۳۵۶، ۶۹۲

فرید لکھنوی (سلطان صاحب)...۳۸۰، ۵۰۱، ۵۰۵، ۵۳۰

فخر امام (سید)...۶۳

فصیح (مرزا جعفر علی)...۱۰۶، ۳۳۵

فضل حق...۲۹۰، ۳۳۵

فضل فتحپوری (افضال حسین نقوی)...۱۵، ۵۰، ۵۵، ۵۶، ۵۷، ۵۶۷، ۸۳۷

فضل قدیر...۳۳۵، ۵۲۹، ۱۰۰۱، ۱۰۰۳، ۱۰۰۴، ۱۰۱۳، ۱۱۵۸، ۱۰۹۳، ۱۱۲۱

فضل لکھنوی...۱۰۶، ۳۲۷، ۳۳۷

فغاں دہلوی...۳۲۳

فوق بلگرامی...۲۲۰، ۳۱۸

فیاض حسین ولید پوری (مولانا)...۱۱۹

فیروز طغرائی...۳۹۰

فیض احمد فیض...۵۸، ۱۲۸، ۲۱۳، ۲۱۳، ۷۰۰

فیض بھرتپوری...۱۰۵، ۳۰۳، ۱۱۳۳، ۱۰۷۲، ۱۱۵۰

فیضی (سید فیض الحسن)...۸۰۹

(ق)

قاسم دہلوی...۳۲۳

قاصد سرسوی...۸۳۱، ۹۵۷

قاضی نذر الاسلام...۳۲۷

قائم چاند پوری...۲۶۶، ۳۲۸، ۳۳۳، ۹۳۵
قائداعظم محمد علی جناح...۳۰۰، ۷۲۳، ۱۱۲۱
قائم رضا نقوی...۵، ۳۲، ۳۳، ۷۶، ۷۷،
۱۳۹، ۱۷۵، ۸۳۰، ۱۰۸۳، ۱۱۱۱
قبول لکھنوی (مہدی علی خاں)...۱۰۰۶
قدرت دہلوی...۳۳۳
قدیم لکھنوی...۱۰۶، ۲۸۰، ۲۸۷، ۲۸۹،
۵۰۰، ۵۰۵، ۵۳۰
قرۃ العین حیدر...۳۳۹
قریں دہلوی...۳۳۳
قسیم (ابن قسیم امروہوی)...۱۸، ۳۸، ۵۳،
۳۵۶، ۶۳۳، ۶۳۹، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۵۲، ۶۵۳،
۶۵۴، ۶۷۷، ۶۷۹، ۷۷۷، ۷۸۴، ۷۸۵،
۷۹۰، ۷۹۷، ۱۰۷۲، ۱۱۱۶
قلق لکھنوی...۲۶۶، ۳۲۸، ۳۳۳
قلی قطب شاہ...۱۰۶، ۲۶۶، ۲۷۶، ۳۲۸،
۳۹۶، ۳۹۷، ۴۴۴، ۴۸۲، ۵۰۲، ۱۰۰۹
قمرالہدیٰ فریدی (ڈاکٹر)...۸۵۳
قمر جلالوی...۲۳۰، ۲۳۱، ۳۰۲، ۳۲۷، ۳۲۷،
۹۲۳
قمر حسین رضوی...۸۳۷، ۸۵۲
قمر حیدر قمر...۲۷، ۹۶۵، ۹۷۰
قمر عباس عظیم آبادی...۲۳، ۵۳، ۲۲۸، ۹۰۸
قمقام حسین جعفری (ڈاکٹر)...۹، ۲۵۱، ۲۵۶،
۳۶۰، ۱۱۲۳، ۱۰۷۲، ۱۱۱۶

قیصر بارہوی...۳۳۸، ۹۹۱
قیصر حسین مشہدی...۱۳، ۳۹، ۵۲۱
قیصر نجفی...۸۲۰، ۸۲۵

(ک)

کاشف رضا زیدی...۵۹۱
کاشف نقوی...۷۷
کاظم حسین کھرل (رائے)...۱۹، ۷۳۷
کاظم علی خاں (ڈاکٹر)...۹، ۷۹، ۸۰، ۱۶۸،
۲۵۰، ۲۵۸، ۳۳۸، ۳۵۶، ۴۳۶، ۴۴۱،
۶۹۳، ۷۷۷، ۷۷۹، ۸۰۰، ۸۱۰، ۱۱۶۵،
۱۰۷۲، ۱۱۲۱
کامل علی میاں...۳۳۷، ۳۲۵، ۴۷۶، ۵۰۹،
کمن صاحب (مولانا سید کلب حسین صاحب
قبلہ)...۱۰۶، ۱۱۷، ۱۱۹، ۱۲۰، ۳۱۳، ۳۲۸، ۶۹۷
کرار حسین (پروفیسر)...۷، ۳۳، ۳۴، ۳۹،
۵۸، ۱۳۰، ۱۹۷، ۲۹۳، ۳۵۶، ۴۳۸، ۷۸۶،
۸۳۶، ۹۵۰، ۹۵۹، ۱۰۱۵، ۱۰۳۱، ۱۰۸۳
کرار حسین (مولانا)...۸۳۰
کرشن گوپال مغموم...۵۹۸
کسریٰ منہاس...۱۱۰۱، ۱۱۰۳
کفایت حسین (سوز خوان)...۱۲۵
کلب حسین نادر لکھنوی...۶۵۲
کلب جواد نقوی (مولانا)...۹۲۳

کلب صادق (مولانا)...۳۳،۳۴،۷۹،۸۰،
۱۳۱،۳۵۶،۶۹۳،۸۱۴،۱۰۳۶

کلب عابد (مولانا)...۱۱۳۷

کلیم الدین احمد...۳۷۹

کلیم رحمانی...۱۳،۳۸،۳۹،۵۳۹

کلینی، ابو جعفر علامہ...۷۵

کمال حیدر رضوی (سید)...۱۳،۳۴،۳۸،۴۱،
۷۷،۱۷۵،۲۱۵،۳۵۶،۳۷۷،۹۰۶،۱۰۳۴،
۱۱۱۳

کمال نفیس...۳۶

کنور مہندر سنگھ بیدی...۳۰۴،۳۴۷،۵۹۷

کنیز مہدی نقوی...۳۱،۱۱۵

کوثر الٰہ آبادی...۱۵،۵۴،۵۸۲

کوثر پانی پتی...۳۸۳

کوثر نقوی...۳۶۹

کیفی اعظمی...۱۳۸

(گ)

گارساں دتاسی...۵۸۹

گاریل واگیری...۳۱۶

گرد علی گدا...۱۰۶،۳۲۵

گراہم بیلی (ڈاکٹر)...۵۸۹،۱۰۳۶

گلام حسین ہاشمی...۱۶۱

گوہر آرا بیگم...۹۵۱

گوہر نوشاہی (ڈاکٹر)...۱۸،۶۸۳

(ل)

لالہ سکند سنگھ...۳۴۳،۳۴۴

لعل شہباز قلندر...۲۷۶،۲۸۰،۳۴۳

لیاقت حسین آرٹسٹ...۹۵۲

لیاقت علی خاں...۷۳۳

لیاقت علی یاسر (مولانا)...۱۰۷۲،۱۱۳۵

لعل شہباز قلندر...۲۷۶،۲۸۰،۳۴۳

لیڈی ہارون...۱۹۳

(م)

ماجد رضا عابدی...۵،۱۱،۱۹،۲۳،۳۰،۳۸،۵۵،
۶۲،۶۳، ۶۸، ۷۱،۹۴،۱۷۳، ۲۰۸،۳۳۳،
۳۵۶، ۳۶۶،۳۸۳، ۴۳۸، ۵۲۷، ۶۳۰،
۶۳۴، ۶۴۸، ۶۹۵، ۷۱۶، ۷۷۸، ۷۸۸،
۷۹۴،۷۹۶،۸۰۳،۸۱۱،۸۱۴،۸۳۸،۸۳۹،
۸۹۹،۹۰۳، ۱۰۳۱، ۱۰۵۱، ۱۱۱۱،۱۱۱۳، ۱۱۳۵،
۱۱۵۹،۱۱۶۲

ماجد حسین رضوی...۸،۱۱،۳۰،۳۴،۱۳۲،
۲۳۳،۳۵۶،۳۶۷،۴۳۸،۶۳۴،۷۴۷،
۱۰۷۳،۱۱۵۲

ماجس لکھنوی...۱۱۰۹

مانوس لکھنوی (میر)...۴۸۷،۵۰۰،۵۰۵

مانی جائسی...۳۳۷،۸۱۳

مائل ملیح آبادی...۱۱۳۹

مجتبیٰ...۵۱۰

محسن (عنایت علی ساماناتوی)...۱۰۱۵

مجاز (اسرار الحق)...۸۵۳

مجتبیٰ حسین...۵۸، ۳۳۸، ۷۸۶

مجتبیٰ حسین کاسوپوری...۱۳۳

مجدد الف ثانی...۳۰۷، ۳۳۳

مجلسی، علامہ محمد باقر...۷۵، ۳۱۸

مجنوں گورکھپوری...۵۳۸

محبت شجاع رانا...۱۹، ۵۵، ۷۱۸، ۷۳۳،
۷۴۳

محدث دہلوی...۴۵۳

محروم دہلوی...۹۳۳

محسن رضا...۴۵

محسنہ بیگم نقوی سیّدہ...۳۱، ۱۱۳، ۸۷۹، ۱۱۲۶

محسن نقوی امروہوی (سوز خوان)...۹، ۵۳،
۸۶، ۶۳۳، ۶۷۸، ۷۸۵، ۹۱۳

محسن اختر نقوی (امریکہ)...۳۱، ۷۵، ۳۸،
۷۵، ۱۱۵، ۲۵۰، ۷۷۸، ۷۸۰، ۱۱۳۳، ۱۱۲۶،
۱۱۹۷

محسن نواب لکھنوی (محسن الملک)...۷۵، ۱۱۹،
۳۰۳، ۳۳۸، ۶۸۷، ۱۰۶۵، ۱۱۱۷

محشر لکھنوی (کاظم حسین)...۲۵۹، ۳۳۰، ۳۳۳

محشر لکھنوی (کراچی)...۶۳۲، ۴۳، ۵۳، ۹۰۱

محمد انصار اللہ نظر...۹۸۷

محمد تقی اختر...۳۲۵، ۹۵۱

محمد حیات خان سیال (پروفیسر)...۳۸۴

محمد حسن بلگرامی...۵، ۹۸۳

محمد عباس صادق جعفری...۲۳، ۵۳، ۶۳۱،
۵۹۹، ۸۹۰، ۸۹۳، ۸۹۶

محمد رفیق اسلم (ڈاکٹر)...۱۰۵۹، ۱۰۹۹

محمد رضا کاظمی (پروفیسر)...۸، ۱۱، ۱۷، ۳۹،
۳۰، ۴۳، ۵۳، ۱۷۵، ۲۱۸، ۳۵۶، ۳۷۶،
۳۳۸، ۵۰۸، ۵۲۸، ۶۲۹، ۶۳۰، ۷۹۶،
۱۰۰۱، ۱۰۱۵

محمد عباس (ڈاکٹر)...۶۱۲

محمد عباس (آل قیس)...۹۷۵، ۹۷۷،
۹۷۹، ۱۰۱۰

محمد عباس نقوی...۱۶، ۵۸۹

محمد علی خاں...۱۰۷۲، ۱۱۰۰

محمد علی سیّد...۱۱، ۳۵۶، ۳۰۷، ۳۳۸

محمد علی صدیقی...۷، ۳۳، ۳۳، ۱۳۱، ۲۰۲، ۳۵۶،
۷۴۳، ۱۰۳۳، ۱۰۳۸

محمد علی کاظم (ملتان)...۵۹

محمد مہدی (علی گڑھ)...۸۵۳

محمد ناصر زیدی...۱۰۱۵

محمد نصیر (پروفیسر سیّد)...۱۰، ۳۰، ۳۱، ۲۷۳،
۷۸۰، ۸۵۴

محمد تقی سہارنپوری (مولانا)...۱۳۵، ۳۵۳

محمود الحسن رضوی...۱۰، ۱۳، ۳۰، ۳۲، ۴۷،
۳۰۱، ۳۵۳، ۳۵۶، ۴۳۸، ۴۹۳

محمود الٰہی (ڈاکٹر)...۹۳۰

محمود حسین (ڈاکٹر)....۱۳۶

محمود شیرانی...۹۳۷

محمود خاور (سید)...۱۱، ۳۰، ۴۳۹

محمود فاروقی...۴۸۸

مختار الدین احمد...۱۱۴۷

مذنب لکھنوی (مرزا محمد حسن)...۹۵۱

مرزا علی جعفری...۱۲، ۳۰، ۳۶، ۳۵۶، ۴۳۸،
۴۶۱

مرتضیٰ حسین....۱۰۳۳، ۱۰۳۸

مرتضیٰ حسین (جسٹس لکھنؤ)...۵۸

مرحمت خاں والہ دہلوی...۹۴۷

مرزا امام علی بیگ افسر...۸۱۳

مرزا جعفر رضا اکمل شہید...۴۹۷

مرزا جعفر حسین (ایڈووکیٹ)...۱۱۳۱

مرزا جعفر حسین (مولانا)...۳۰۳

مرزا حیدر شکوہ...۴۴۳

مرزا سلیمان شکوہ...۴۴۳

مرزا محمد اطہر (مولانا)...۷۹، ۸۰، ۱۱۹

مرزا محمد تقی ہوس...۴۴۳

مرزا محمد عالم (مولانا)...۱۱۹

مسعود الحسن نقوی (مولانا)...۵۱۳۲

مسعود حسن رضوی ادیب...۱۴۳، ۴۳۸، ۹۳۷،
۷۷۹، ۷۹۳، ۸۴۲، ۹۳۶، ۹۶۷، ۹۶۸،
۹۸۰، ۹۸۵، ۹۸۸، ۹۹۹، ۱۰۰۰، ۱۰۰۲،
۱۰۰۳، ۱۰۹۲ تا ۱۰۹۷، ۱۱۴۱، ۱۱۳۶

مسعود رضا خاکی...۹۵۶، ۱۰۳۹، ۱۰۴۳، ۱۱۳۶،

مسیح لکھنوی (حکیم مرزا محمد علی)...۹۵۳

مشتاق مصطفےٰ آبادی...۹۳۸

مشتاق نقوی...۱۱۹۵

مشفق خواجہ...۳۹، ۱۴۸، ۲۳۷، ۳۵۶،
۱۰۷۷، ۱۰۷۹، ۱۰۸۵، ۱۰۹۰

منظور حسین یاد...۳۵۱

مشیر لکھنوی...۳۴۵

مصاحب علی خطیب...۱۵۹

مصحفی امروہوی...۲۵۹، ۳۶۶، ۴۳۸، ۴۸۶،
۵۴۷، ۹۳۲، ۹۳۳

مصحف رضا نقوی...۲۵۱

مصطفےٰ (فطرت، ڈاکٹر)...۱۰۷۴، ۱۱۰۱،

مظفر جونپوری...۱۱۴۴

مظفر حیدری...۴۳۸

مظاہر کاظمی سوز خوان...۸۹

مظفر حسن ملک...۱۰۱۵

مظفر علی (فلم پروڈیوسر)...۱۱۴۳
مظہر مجتبیٰ...۲۵، ۵۳، ۳۳۸، ۹۱۳
مظہر جان جاناں دہلوی...۹۳۵
مظہر علی خاں (ڈاکٹر)...۳۳۸
مظہر علی خاں ولا دہلوی...۹۳۵
معجز جونپوری...۱۴۳، ۷۷۸
معراج جامی (سید)...۱۳، ۳۰، ۴۷، ۳۹۲
معین الرحمٰن...۹۸۷
مکرم لکھنوی...۲۰، ۵۵، ۷۸۶، ۸۴۳
مُلّا باذل...۱۱۳۶
مُلّا طاہر (مولانا)...۱۱۹، ۱۲۰
مُلّا فضلی...۱۱۴۷
مُلّا کاشی...۳۹۰
ملتن...۷۰۳، ۱۱۴۷
ملک نذیر احمد...۹۸۷
ممتاز احمد خاں (ڈاکٹر)...۳۸، ۵۰۸
ممتاز حسن...۷، ۱۰۵۳، ۱۰۸۳
ممتاز حسین (پروفیسر)...۳۳، ۳۳، ۳۹، ۵۸،
۱۳۰، ۱۹۹، ۳۰۲، ۳۵۶، ۷۱۷
ممتاز حسین جونپوری...۳۹۹، ۵۰۱، ۵۳۳
ممتاز حسین زیدی (شوق)...۱۹، ۵۵، ۷۷
ممنون حیدر جعفری...۸۱۳، ۸۱۹، ۱۰۳۶
ممنون دہلوی...۲۵۹، ۲۶۶، ۳۳۸، ۳۴۳

منتصر زیدپوری...۱۳۰
منتظر عباس نقوی...۱۱۵
منشی شیو پرشاد لکھنوی...۵۹۷
منظر حسین کاظمی (ڈاکٹر)...۷، ۱۷، ۳۰، ۵۱،
۵۴، ۱۳۲، ۳۰۹، ۳۵۶، ۶۱۸، ۸۰۱، ۸۰۷،
۷۸۸، ۷۸۹
منظور احمد (ڈاکٹر)...۹۲۵
منظور نقوی...۶۹۳
منّن صاحب (مسعود حسین زیدی)...۱۹، ۳۳،
۵۵، ۱۱۸، ۱۳۳، ۵۵۳، ۶۸۵، ۱۰۵۵، ۱۰۸۵،
منور جعفری (میجر)...۷۶، ۱۰۶۳
منور علی تالپور (میر)...۹۳۶
منور عباس (ایڈووکیٹ)
منیب الرحمان (مفتی)...۷۸
منیر اختر ملک...۸۲۵
منیر نیازی...۵۳۶
منیر شکوہ آبادی...۲۶۶، ۳۳۸، ۳۹۳، ۴۴۳
مولانا آغا مہدی لکھنوی...۳۸۸، ۱۰۵۴، ۱۰۷۷
مولانا روم...۲۷۳، ۲۷۹، ۳۶۵، ۴۴۳
مومن خاں مومن...۲۵۹، ۲۶۶، ۳۳۸، ۴۴۳،
۹۲۵
مونس (میر)...۱۰۶، ۳۰۹، ۳۸۰، ۳۵۰، ۴۸۷،

۳۸۹،۳۹۳،۵۰۰،۵۰۵،۵۰۷،۵۲۰،۵۲۹،
۷۸۸،۸۱۶،۸۱۱،۹۷۳،۹۷۸،۹۸۰،۱۰۰۲،
۱۰۰۳،۱۰۳۹،۱۰۶۶

مہاراج کمار (امیر حیدر خاں)...۱۰۰۵

مہاراجہ جسونت سنگھ پروانہ...۵۳۶

مہاراجہ محمود آباد...۱۳۲

مہذب لکھنوی...۱۳۰،۱۳۲،۳۲۵

مہدی نظمی...۲۰۹،۲۳۰،۳۷۵

میاں سکین...۱۰۶

میکائل نقی...۳۱۶

میر تقی میر...۱۰۶،۲۱۳،۲۱۳،۲۳۰،۲۳۱،۲۵۹،
۲۶۶،۲۷۶،۲۸۰،۲۸۱،۳۲۸،۳۳۳،۳۳۳،
۳۳۵،۳۸۷،۴۰۱،۴۳۲،۴۴۳،۴۶۳،۵۰۲،
۵۱۱، ۵۳۳، ۵۳۶، ۵۵۰، ۵۶۵، ۶۳۶،
۶۸۷،۶۸۹،۸۳۵،۹۳۵،۱۰۹۳،۱۰۹۸

میر ضحی میر...۹۳۲

میر حسن...۱۰۶،۲۳۱،۲۵۹،۳۲۸،۳۹۵،۴۲۳،
۳۸۳، ۳۸۶، ۳۸۸، ۵۰۰، ۵۰۵، ۵۰۷،
۹۷۳،۹۷۳،۱۰۰۳،۱۰۳۳

میر حسن علی خاں...۱۰۰۳

میر لائق لکھنوی...۳۸۳،۳۸۷،۵۰۱،۵۰۵،

میر شمس دہلوی...۹۳۳

میر مہدی مجروح...۲۶۶،۳۳۰،۳۳۵،۵۰۳،

میکسم گورکی...۵۱۰

میمونہ انصاری (ڈاکٹر)...۹۳۶

(ن)

نادم سیتاپوری...۳۳۳،۷۸۶،۱۰۱۵،۱۱۱۰،
۱۰۷۳،۱۱۵۸

نارنگ (ڈاکٹر گوپی چند)...۱۰۹۷،۱۰۵۲،۱۰۷۸

ناصر رضا رضوی (سید)...۱۳،۳۱،۵۲،۱۱۵،
۳۳۷،۹۳۱،۹۳۲،۱۱۱۱،

ناصر مہدی رضوی (علامہ)...۱۱،۳۵۶،۳۰۳،
۳۲۸

نشاط واسطی...۳۶،۹۳۲

ناسخ... ۲۵۸، ۲۵۹، ۲۶۶، ۳۲۸، ۳۳۵،
۳۸۷،۳۹۳،۴۰۰،۴۰۲،۴۳۲،۴۴۳،۴۵۳،
۴۹۹،۵۳۳،۵۳۸،۹۵۳،۹۵۵،۹۹۳

ناصر جہاں...۷۸۶،۱۰۸۳

ناصر حسین (مولانا ناصر الملت)...۱۳۰،۳۶۳،
۶۸۳،۱۰۷۶

ناصر زیدی...۱۱۳۰

ناصر کاظمی...۵۳۶

ناطق لکھنوی...۳۳۰

ناظر، ناظم حسین...۱۰۶

ناظر حسن زیدی (ڈاکٹر)... ۱۰۰۰، ۱۰۱۵،
۱۰۷۳،۱۰۹۸

ناظم لکار پوری...۳۲۵

ناظم (میر عبداللہ)...۳۲۵

نائب حسین نقوی...۱۲۸،۱۰۱۸

نثار احمد (پروفیسر ڈاکٹر)...۲۸۳، ۸۵۳

نثار نقوی...۸۳۶

نجف خاری...۹۵۵

نجف علی فیض آبادی...۱۰۰۸، ۱۰۰۹، ۱۰۳۳

نجم آفندی...۱۰۶، ۱۲۶، ۱۲۸، ۱۸۷، ۱۸۸، ۱۹۱، ۲۲۳، ۲۳۲، ۲۳۰، ۲۳۵، ۲۳۹، ۲۷۱، ۳۰۲، ۳۲۷، ۳۳۷، ۳۵۳، ۳۷۳، ۴۰۲، ۴۳۸، ۵۹۷، ۷۰۰

نجم الحسن (نثار)...۱۰۶، ۱۱۷، ۱۲۲، ۱۲۳

ندیم شبلی ایڈووکیٹ...۶، ۲۷، ۶۱، ۶۲، ۸۳، ۹۱، ۱۹۰، ۶۸۲، ۷۳۷، ۱۰۱۷

ندیم الحسن (ڈاکٹر)...۳۵۲

نرسیان...۳۱۶

نرجس خاتون (نرجس باجی)...۸۵۲

نذیر احمد (ڈپٹی)...۱۰۰۲

نسرین نقوی...۳۶، ۱۱۵

نسیم امروہوی...۲۳، ۵۳، ۵۸، ۸۵، ۱۲۸، ۱۹۱، ۲۰۹، ۲۲۳، ۲۳۰، ۲۳۰، ۲۳۱، ۲۳۲، ۲۴۷، ۳۳۸، ۳۷۳، ۴۲۵، ۴۷۳، ۵۹۷، ۶۲۲، ۶۵۰، ۶۵۱، ۶۹۰، ۷۹۷، ۸۲۲، ۹۰۹، ۱۱۰۱، ۱۱۱۹، ۱۱۳۲

نسیم حسن امروہوی (زیبائی ...)...۵، ۲۳، ۳۵، ۱۳۲، ۷۸۰، ۸۰۳، ۸۳۹، ۱۱۶۱

نسیم حیدر زیدی محمد پوری...۱۲، ۳۰، ۳۵۷

نسیم درانی...۱۰۷۳، ۱۱۰۵

نسیم عباس (علامہ)...۶۳، ۶۶، ۶۷، ۱۶۱

نسیم لکھنوی (دیا شنکر)...۹۶۳

نصرت بھٹو (محترمہ)...۲۷۳، ۷۸۳

نصرت لکھنوی، قاری یعقوب علی...۳۳۵، ۹۵۱

نصیر اجتہادی (علامہ)...۱۶۱

نصیر ترابی...۱۰۲۳، ۱۰۲۵، ۱۰۲۶، ۱۰۲۸، ۱۰۲۹

نصیر رضا رضوی...۱۷۵، ۶۱۷، ۸۱۶، ۸۵۵، ۸۵۶

نصیر الدین ہاشمی...۳۹۲

نصیر الدین ہمایوں...۳۴۳

نصیر دہلوی...۳۴۳

نظام الدین اولیا...۵۷، ۳۲۵، ۳۴۳، ۹۲۷، ۱۰۴۳

نظامی...۱۱۳۶

نظم طباطبائی...۲۵۹، ۳۲۸، ۳۹۳، ۳۴۳، ۱۱۵۷

نظیر اکبر آبادی...۲۵۹، ۲۶۶، ۲۸۱، ۲۸۲، ۳۰۲، ۳۲۸، ۳۲۹، ۳۳۳، ۳۸۷، ۳۹۳، ۳۴۳، ۳۹۳، ۵۱۱، ۵۵۷، ۹۲۲

نظیر حسنین زیدی (ڈاکٹر)...۸، ۱۶، ۳۹، ۵۱، ۵۲، ۳۲۹، ۳۳۹، ۶۰۸

نعمت خان عالی...۳۴۳

نعیم تقوی (ڈاکٹر)...۸، ۳۹، ۲۲۷، ۲۴۲، ۲۷۲

۳۳۸، ۳۵۶، ۱۰۷۳، ۱۰۹۸

نفیس (میر)...۲۰۹، ۲۸۰، ۳۲۵، ۳۸۷، ۳۹۳، ۵۰۰، ۵۰۵، ۵۰۷، ۵۲۰، ۵۲۹، ۸۳۷، ۸۵۳، ۹۷۷، ۱۱۳۰،

نفیس عابدی...۶۹۳

نقوش کاظمی...۱۳، ۲۷، ۲۸، ۳۳۹، ۳۹۸، ۶۳۹، ۷۹۵

نقن صاحب (مولانا سید علی نقی)...۱۷۰، ۳۶۳، ۸۱۳، ۱۰۳۶

نقی عابدی...۷۸۰، ۸۳۹

نگاہی دہلوی...۹۲۷

نواب آصف الدولہ...۷۳۳

نواب احمد حسین پریانواں...۳۱، ۱۱۳، ۱۱۷

نواب امین الدولہ...۱۰۰۵

نواب خادم حسین خاں...۱۰۰۵

نواب سلطان عالیہ بیگم...۹۵۱

نواب عسکری...۱۱۵۷

نواب محمد علی قزلباش...۳۹۰

نواب ملکۂ زمانی بیگم...۹۵۱

نواز حسن زیدی (ڈاکٹر)...۱۰۷۳، ۱۱۲۳

نورالحسن (ڈاکٹر)...۱۰۳۱

نورالحسن ہاشمی...۳۹۲، ۴۳۰

نونہروی (ابن حسن) مولانا...۱۰۶، ۱۱۹، ۶۹۷

نیر اسعدی...۱۰، ۳۰، ۳۳۹، ۳۳۸، ۶۳۲، ۱۱۱۳

نیر مجیدی...۲۵، ۵۳، ۳۳۸، ۵۹۳، ۹۱۲

نیر مسعود (ڈاکٹر)...۶، ۱۳، ۱۹، ۳۶، ۳۸، ۵۱، ۵۲، ۵۹، ۷۹، ۱۲۸، ۳۳۸، ۳۵۶، ۳۸۰، ۳۸۴، ۳۹۳، ۶۱۶، ۶۱۷، ۶۳۰، ۸۱۳، ۸۱۸، ۸۳۵، ۹۵۷، ۹۶۱، ۹۸۰، ۱۰۲۸، ۱۰۳۳، ۱۰۹۱، ۱۰۹۷، ۱۰۷۳، ۱۱۲۸

نیساں اکبر آبادی...۸۲۳، ۸۳۳، ۸۳۷، ۸۵۵، ۱۰۱۵

نیلما سرور...۱۳، ۳۹، ۵۳۳

(و)

واجد علی تسخیر لکھنوی...۳۲۵

واجد علی شاہ (بادشاہ)...۱۰۶، ۲۵۹، ۲۶۶، ۳۲۸، ۳۶۳، ۳۸۷، ۴۲۲، ۶۸۷، ۶۵۳، ۱۰۰۲، ۱۰۰۳، ۱۰۰۶، ۱۰۵۶، ۱۱۲۳

وارث رضا...۱۲، ۳۰، ۳۶، ۲۵۰

وجی (ملا)...۳۹۶، ۴۲۳

وحشت کلکتوی (رضا علی)...۳۳۰

وحشی محمود آبادی...۷۸۷

وحید (میر)...۱۰۶، ۳۲۵، ۵۰۵، ۵۲۰، ۶۸۷

وحید اختر (ڈاکٹر)...۱۱۵۷

وحیدالحسن ہاشمی...۱۰، ۲۸، ۳۰، ۳۲، ۶۱، ۱۷۵، ۲۳۹، ۲۹۸، ۳۳۸، ۳۰۶، ۴۳۸، ۸۲۸، ۱۰۳۵، ۱۰۳۷، ۱۰۳۹، ۱۰۶۵، ۱۱۶۷

ورجل.....۱۰۰۹

ورنن جیمز شوئل (امریکہ)....۳۳۹، ۳۴۰، ۳۴۰،

۱۲۹، ۲۵۵، ۲۵۶، ۳۵۶، ۷۳۰

وزیر آغا.....۱۰۰۰

وزیر الحسن عابدی (پروفیسر)...۳۲۸

وزیر الحسن عابدی لکھنوی (مولانا)..۱۱۹

وفا کانپوری...۷۸۶

وکٹر.....۵۱۰

وقار حسین شیخ.....۷۸۶

وقار عظیم.....۱۰۰۰، ۱۰۱۵

ولی حیدر (سوزخوان)....۱۰۸۶

ولی دکنی...۲۶۶، ۲۷۶، ۳۲۸، ۳۴۳، ۵۰۲

(ہ)

ہاشم رضا (سید)...۶، ۹، ۱۶، ۳۳، ۳۴، ۳۹،
۳۰، ۳۱، ۵۱، ۸۱، ۸۲، ۱۲۶، ۱۳۰، ۱۹۳، ۲۶۱،
۳۲۸، ۳۵۶، ۳۲۸، ۵۲۹، ۹۳۶، ۹۳۲،
۹۳۵، ۹۳۶، ۹۷۸، ۹۷۹، ۷۹۳، ۹۷۷،
۱۰۱۵، ۱۰۳۸، ۱۰۷۶، ۱۱۵۳، ۱۰۷۳، ۱۱۱۳

ہارون کارادود.....۳۱۶

ہدایت دہلوی....۳۴۳

ہلال نقوی.....۳۹،۸، ۳۲۸، ۳۴۳، ۹۳۴،

۱۰۳۶، ۱۱۳۳، ۱۰۵۹، ۱۱۱۴

ہنر لکھنوی.....۱۰۱۵

ہوش لکھنوی...۹۵۲

ہومر.....۷۰۳، ۱۰۰۹

(ی)

یاس لکھنوی (ذاکر حسین)....۲۵۹، ۲۶۶،
۳۲۸، ۳۹۳، ۳۴۳

یاور امان.....۳۸

یاور عباس (ڈاکٹر)....۵۸، ۳۳۴، ۷۸۶، ۱۰۸۰،
۱۰۷۳، ۱۱۳۵

یاور مہدی (سید)....۱۱۰۹

یکدل دہلوی.....۳۴۳

یگانہ امروہوی.....۲۳، ۵۳، ۹۰۹، ۹۲۸

یگانہ چنگیزی...۲۷۱، ۳۲۷، ۳۳۷، ۳۰۲

یوسف حسین خاں...۱۰۹۲

یوسف شاہ جمال الدین گردیزی...۳۴۳

یوسف کاظمی (ایڈووکیٹ).....۲۰۱، ۸۱۴، ۱۰۶۴

یوسف نقسی (مولانا).....۳۵۱

یونس حسنی ڈاکٹر.....۱۰۵۹

❁❁❁

ماہنامہ "ادبِ لطیف" لاہور... اپریل ۲۰۰۹ء

کتاب "احساس" پر تبصرہ

نام کتاب: احساس — ترتیب: محمد عباس نقوی

نتیجہ فکر: علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی — مبصر: شاہد بخاری

قیمت: 300

ملنے کا پتہ: I-4 احسان ٹیرس، فیز III، گلشن اقبال، بلاک 11، کراچی

علامہ ضمیر اختر نقوی کا نام و کام محتاج تعارف نہیں۔ آپ کے مفید اور پُر مغز مضامین قومی اخبارات و رسائل میں ایک مدت سے شائع ہو رہے ہیں۔ بیسیوں اخبارات و رسائل سے غواصی کر کے منتشر مضامین، بیانات، مذاکروں، محافل و مجالس وغیرہ میں سے علامہ کی فکر انگیز تحریروں کو جو 1981ء سے 2006ء تک مختلف رواں موضوعات پر شائع ہوتی رہی ہیں کو محمد عباس نقوی نے "احساس" میں یکجا کر کے نئی نسل پر احسان کیا ہے تاکہ قارئین علامہ صاحب کے نقطۂ نظر جدید تحقیق، ادبی رجحانات اور مذہبی موضوعات سے مستفید ہوتے رہیں۔ یہ کتاب ریسرچ کرنے والوں کے لیے بھی ریفرنس بک کا کام دے گی۔ اسے ہر لائبریری کی زینت بننا چاہیے۔

زیرِ نظر مجموعے میں روشن خیالی، فرقہ وارانہ ہم آہنگی، دہشت گردی، اجتہاد کی اہمیت، رویت ہلال، تعصبات کا خاتمہ، فنِ خطابت کے اسرار و رموز، شہادت مولائے

کائنات کے جلوس کی بنیاد، عزاداری کے بنیادی آداب، شیعیت اور عراق، میر انیس کی شخصیت وفن، جنت البقیع کے چند تاریخی حقائق، ادبی منظر نامے، مسالمے، تقاریب رونمائی، شعرا کو خراج عقیدت، تاریخی یادگاروں کا تحفظ جیسے بہت سے موضوعات شامل ہیں جو علامہ صاحب کی بیدار مغزی کا ثبوت ہیں۔

''احساس'' میں اُن تاثرات کا اظہار ہے جو معاشرے کے حوالے سے تخلیقی ذہن کے اس کرب سے پیدا ہوئی ہے جس سے نئی نسل دوچار ہے۔ یہ عمل خارج میں نہیں بلکہ باطن کے نہاں خانوں میں ہو رہا ہے۔ علامہ صاحب نے اپنے مضامین و مذاکروں میں وہ فنی اثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے جس سے دل کشی، جاذبیت اور پراسراریت پیدا ہو سکے۔

ڈاکٹر ضمیر اختر نقوی صاحب کی عمر کراچی جیسے بڑے شہروں میں گذری ہے، اس لیئے وہ ان سب مسائل سے آگاہ ہیں جن کا تعلق جدید شہری زندگی سے ہے جہاں تضاد کا عفریت اور بدلتی دنیا کے اثرات، سماجی زندگی کو لمحہ بہ لمحہ بدل رہے ہیں جہاں زندگی پیچیدہ ہے، اس لیئے آپ کے مضامین وغیرہ پیچیدہ تہذیبی، ذہنی اور مادی صورت حال کے عکاس ہیں۔

اس کتاب کے مطالعے سے علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی کی شخصیت وفکر کے وہ تمام گوشے سامنے آجاتے ہیں جس سے آپ عبارت ہیں۔ اس لیئے یہ کتاب سب کو پڑھنی چاہیئے تاکہ لوگ ایک سچے مسلمان، اچھے انسان، ایک معتمد ساتھی، ایک شفیق عالم اور مخلص مفکر کے کارناموں سے واقف و متعارف ہو سکیں اور ان مضامین وغیرہ کی بدولت اپنی زندگی کو بہتر بنا سکیں۔

ضمیر حیات
۱۴۳۹
علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی کی معرکتہ آلارا تصنیف
بعنوان
عظمتِ حضرتِ زینبؑ
شائع ہوگئی ہے

علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی کی معرکتہ آلارا تصنیف

ذوالجناح

حضرت امام حسینؑ کے اسپِ وفادار کی مکمل تاریخ

دوسرا ایڈیشن شائع ہو گیا ہے

علامہ ڈاکٹر سیّد ضمیر اختر نقوی کی معرکتہ آلارا تصنیف

شہزادہ قاسمؑ کی مہندی

تصنیف

علامہ ڈاکٹر سیّد ضمیر اختر نقوی

ضمیر حیات
۱۴۳۲
علامہ ڈاکٹر سید ضمیر اختر نقوی کی معرکتہ آلارا تصنیف
اردو غزل
اور
کربلا
دوسرا ایڈیشن شائع ہوگیا ہے

جوشؔ ملیح آبادی کی عطا کردہ ترکیب ''ضمیرِ حیات'' کا مکمل پس منظر آپ کو اس کتاب کے مقدمے سے ہاتھ آئے گا، یہاں بس اتنا سمجھ لیجیے کہ جوشؔ کو اس تخلیقی تجربے پر اکسانے والی یہ روح پرور ترکیب پہلے پہل خود علامہ صاحب کے نیچ میں ترتیب پائی تھی کہ وہ اسم بامسمّٰی شخصیت ہیں علامہ صاحب کا اسم تابندہ ''ضمیر'' اپنی معنویت میں وہ فکر انگیز تخلیق ہے کہ آدمی اس میں جتنا غور کرے ششدر و دنگ ہوتا جاتا ہے، چار حرفوں کے اس حیرت کدے میں قوسِ قزح کے رنگ، آسمانوں کی وسعت، سمندروں کی گہرائی و گیرائی جیسی صفات کی یکجائی دیکھنے میں آتی ہے، غرض جس جوہر کے دم سے حیات حیات کہلاتی ہے وہ ''ضمیر'' ہی ہے۔ تفہیم لفظی کے لحاظ سے ''ضمیر'' ہی احساسِ شعورِ باطنی اور نفسِ لوامہ کے نفسِ مطمئنہ کی جانب معراج کی منزل تاباں ہے۔ ''ضمیر'' کی ''حیات'' ہی ریب و گماں، لغزش و کج روی سے بچ نکلنے اور صبر و استقامت سے ہمکنار ہونے کا باعث ہے اس اعتبار سے دیکھا جائے تو ''ضمیر'' شادابی و کامرانی حیات کی اصل روح ہے علامہ ضمیر اختر کے خانوادے کی علمی، دینی، روحانی اور ادبی خدمات کو ماہ و سال کے آئینے میں دریافت کرنے کی سعی کی جائے تو بے ساختہ ہونٹوں پر یہ مشہور مصرع آجاتا ہے کہ

''یہ نصف صدی کا قصہ ہے دو چار برس کی بات نہیں''